تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

جلد ۳

شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
سابق امیر مرکزیہ نائب
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)
بیسمنٹ مگو سنٹر ٥ اردو بازار ٥ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نوراللہ مرقدہ

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا

سابق صدر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء

شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب نوراللہ مرقدہ

سابق نائب صدر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)

۵- لوئر مال ○ بیسمنٹ مکہ سنٹر ○ اردو بازار ○ لاہور

فون : 042-37361460, 0321-320-9464017

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق بحق ناشر نفیس قرآن کمپنی محفوظ ہیں۔

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان د تفسیر القرآن

---------------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمہ اللہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ۔۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ۔ نفیس قرآن کمپنی ۵۔ ازرمال ۰ بیسمنٹ ... ۰ اردو بازار ۰ لاہور

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی وعلمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

ملنے کے پتے

جامعہ اسلامیہ باب العلوم

کہروڑپکا۔ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی

جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد

فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم

جڑانوالہ روڈ۔فیصل آباد

فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اردو بازار۔لاہور

اسلامی کتب خانہ

بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی

سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن۔کراچی

021-34130020

021-24125590

بیت الکتب

بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اردو بازار۔کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ ملتان

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
سورۃ المائدۃ	۲۱	شکار رکھنے کی جائز اور ناجائز صورتیں	۴۳
		شکار کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم کا سوال	۴۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۴	ذبحِ اضطراری کے اَحکام وشرائط	۴۴
تفسیر	۲۹	''طیبات'' اور ''خبائث'' کا مصداق	۴۷
ماقبل سے ربط	۲۹	غیر منصوص اشیاء کی حلت وحرمت کیسے ثابت ہوگی؟	۴۷
''ایمان'' کا مفہوم	۲۹	غیر ذبیحہ میں اہلِ کتاب کی تخصیص نہیں	۴۸
''عقود'' اور ''عہود'' کا مصداق	۳۰	قرآن کی اِصطلاح میں ''اہلِ کتاب'' کا مصداق	۴۸
''اَنعام'' اور ''اَنعام'' کے مشابہ چوپایوں کا حکم	۳۱	''اہلِ کتاب'' کہلانے کے لئے کیا چیز ضروری ہے؟	۴۹
حالتِ اِحرام میں شکار کی ممانعت	۳۲	''اہلِ کتاب'' کے ذبیحہ کے حلال ہونے کی چند شرائط	۵۰
''شعائر اللہ'' کی تفصیل اور ان کی تعظیم کا حکم	۳۲	کیا آج کے یہودی وعیسائی ''اہلِ کتاب'' ہیں؟	۵۰
کافر کے لئے حرم میں داخلے کا شرعی حکم	۳۳	''اہلِ تشیع'' اور ''مرزائیوں'' کے ذبیحہ کا حکم	۵۱
اِنسانی زندگی میں باہمی تعاون کی اہمیت	۳۴	پاک دامن عورتوں سے نکاح کی ترغیب	۵۲
تعاون کی جائز اور ناجائز صورتیں	۳۵	موجودہ ''اہلِ کتاب'' کی عورتوں سے نکاح کا حکم	۵۳
حرام جانوروں کی تفصیل	۳۶	نکاح کی چند شرائط	۵۳
''مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ'' اور ''مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ'' میں فرق	۳۷	''اہلِ کتاب'' کے ساتھ اختلاط میں اندیشہ	۵۴
تکمیلِ دِین کی نعمت اور اس کا تقاضا	۳۸	خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۵۶
حرام چیزوں کے اَحکام کی اِستثنائی صورتیں	۳۹	تفسیر	۵۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۰	ماقبل سے ربط	۵۸
تفسیر	۴۲	اگر طہارت پہلے سے حاصل ہو تو پھر تطہیر کی ضرورت نہیں	۵۹
ماقبل سے ربط	۴۲	وضو کے فرائض، سنن اور مستحبات	۶۰
شکار کی تاریخ اور اِنسانی زندگی میں شکار کی اہمیت	۴۲	غُسل کا طریقہ اور فرائض	۶۰

مضمون	صفحہ
تیمم کن صورتوں میں جائز ہے؟	۶۱
اَحکامِ طہارت نازل کرنے کا مقصد	۶۳
"لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ" میں تحیۃ الوضوء کی طرف اِشارہ	۶۳
اَحکام کی پابندی کے لئے ترغیبی پہلو	۶۴
اِجتماعی زندگی میں حاکم کی ضرورت	۶۴
صحیح ادائے شہادت کی اہمیت	۶۵
غلط بیانی اور حق پوشی کے محرکات	۶۵
اِحسان کی یاد دہانی اور اس کا مقصد	۶۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۰
تفسیر	۷۳
ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضامین	۷۳
قرآنِ کریم میں بیان کردہ واقعات سے مقصود	۷۴
بنی اسرائیل سے لیے گئے ایک عہد کا تذکرہ	۷۵
اِنفاق فی سبیل اللہ کو قرض سے تعبیر کرنے میں حکمت	۷۵
عہد کی پابندی پر اِنعامِ خداوندی	۷۶
عہد شکنی کے نتیجے میں لعنت	۷۶
لعنت کے نتیجے میں قساوت، قساوت اور رِقّت کا مفہوم	۷۷
قساوت کے نتیجے میں دین کی تحریف	۷۸
یہود کی خیانتوں کا تسلسل	۷۹
خیانت کار یہود سے درگزر کا حکم اور اس کی وجہ	۷۹
یہود کے بگاڑ کے بعد نصاریٰ کے بگاڑ کا تذکرہ	۸۰
اہلِ اسلام اور نصاریٰ کے اختلافات میں فرق اور اس کی وجہ	۸۱
کیا عیسائیت قیامت تک رہے گی؟	۸۱
تمام اہلِ کتاب کو دعوتِ ایمان، اور رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کی دلیل	۸۲

مضمون	صفحہ
اِنسان کے کردار میں نیت و ارادے کی اہمیت	۸۳
نصاریٰ کے ایک گروہ کے عقیدۂ حلول کی تردید	۸۴
یہود و نصاریٰ کا محبوبِ خدا ہونے کا دعویٰ اور اس کی تردید	۸۴
"مشیتِ الٰہی" کے ذکر کرنے کا مقصد	۸۶
یہود و نصاریٰ پر اِتمامِ حجت	۸۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۸۸
تفسیر	۸۹
ماقبل سے ربط	۸۹
ایک اِشکال کا جواب	۸۹
قومِ بنی اِسرائیل کا شام سے مصر منتقل ہونا	۹۰
مصر میں بنی اِسرائیل پر ظلم اور فرعون سے نجات	۹۱
بارہ اِسرائیلی سرداروں کی شام میں جاسوسی کے لئے روانگی	۹۲
جاسوسوں کی واپسی اور موسیٰ علیہ السلام کی اُن کو ہدایت	۹۲
اکثر جاسوسوں نے موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کی پروا نہ کی	۹۳
نبوت اور بادشاہت کی نسبت میں فرق	۹۴
"فقراء" کون کہلاتے ہیں	۹۵
محکوم قوم کی حالت	۹۶
اِسرائیلی قوم کا موسیٰ علیہ السلام کو بزدلانہ جواب	۹۶
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جواں مردی و جاں نثاری	۹۷
دونوں طبقوں کا انجام	۹۸
بنی اسرائیل کے جواب پر موسیٰ علیہ السلام کو صدمہ اور اللہ کے حضور عرض	۹۸
بنی اسرائیل صحرائے سینا میں	۹۹
صحرائے سینا میں موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی حیثیت	۹۹
یوشع علیہ السلام کی زیرِ قیادت فلسطین کی فتح	۱۰۰

مضمون	صفحہ
بنی اسرائیل کے واقعے سے مقصود	۱۰۰
خلاصۂ آیات	۱۰۰
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۰۵
تفسیر	۱۰۷
ماقبل سے ربط اور رُکوع کا مضمون	۱۰۷
قابیل اور ہابیل کا واقعہ	۱۰۸
ایک نفس کا قتل تمام اِنسانوں کے قتل کے برابر ہے	۱۱۰
''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ'' کا شانِ نزول	۱۱۰
ڈاکوؤں کی سزا کی تفصیل	۱۱۰
تفسیر	۱۱۲
ماقبل سے ربط	۱۱۲
مسئلۂ توسل پر دلائل، اور اکابرین کا مسلک	۱۱۲
مسئلۂ توسل پر ''ہدایہ'' کی عبارت کا تسلی بخش جواب	۱۱۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۱۷
تفسیر	۱۱۹
''سرقہ'' کا لغوی وشرعی مفہوم	۱۱۹
حدود ثابت ہونے کے بعد معاف نہیں ہوسکتیں	۱۲۱
''تعزیر'' کا اِختیار حاکم کو دیا گیا ہے	۱۲۲
''حدِ سرقہ'' پر اِعتراض اور مدلل جواب	۱۲۲
لطیفہ	۱۲۴
''حدود'' کی اہمیت اور منکر کا حکم	۱۲۴
فعلِ سرقہ کی نسبت پہلے مَرد کی طرف اور فعلِ زِنا کی نسبت پہلے عورت کی طرف کیوں؟	۱۲۵
نحوی قاعدہ	۱۲۵
ہاتھ کون سا کاٹا جائے گا؟	۱۲۶
بار بار چوری کرنے والے کا حکم	۱۲۶
''حدود'' گناہ کے لئے کفارہ ہیں یا نہیں؟	۱۲۷
اَحکام کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے قدرتِ اِلٰہی کا ذکر	۱۲۷
ماقبل سے ربط	۱۳۱
آیات کا شانِ نزول	۱۳۱
شانِ نزول کا دُوسرا واقعہ	۱۳۲
منکرین کے تخریبانہ طرزِ عمل پر سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی	۱۳۴
یہود عوام کے مزاج میں بگاڑ کیسے آیا؟	۱۳۴
یہود علماء کے مزاج میں بگاڑ کیوں آیا؟	۱۳۵
آیاتِ بالا کا دُوسرا مفہوم	۱۳۶
آج کل کے وکلاء کی عمومی حالت	۱۳۷
خلاصۂ آیات	۱۳۸
حرام خوری کے نتائج	۱۳۹
خلاصۂ آیات	۱۴۰
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۴۵
تفسیر	۱۴۸
ماقبل سے ربط اور رکوع کا مضمون	۱۴۸
توراۃ اور یہود کا تعارف	۱۴۹
''اولیاء'' اور ''علماء'' میں فرق اور ان دونوں طبقات کا طرزِ عمل	۱۴۹
''عابد'' افضل ہے یا ''عالم''؟	۱۵۱
''عالم'' و ''عابد'' میں فرق شیخ سعدی رحمہ اللہ کی نظر میں	۱۵۲
کتاب اللہ کی حفاظت کا صحیح طریقہ	۱۵۲
''فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ...الخ'' کی دو تفسیریں	۱۵۳
شرائعِ سابقہ کے متعلق اُصول	۱۵۴

مضمون	صفحہ
"قصاص اور دیت" کے کچھ اُحکام	۱۵۴
تمام انبیاء ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں	۱۵۵
تمام کُتبِ آسمانی درحقیقت ایک ہیں	۱۵۶
کُتبِ سابقہ کی حقانیت کی حفاظت قرآنِ کریم نے کی ہے	۱۵۶
شریعت اور طریقت میں فرق	۱۵۷
ہر زمانے میں الگ الگ اُحکام بھیجنے کا مقصد	۱۵۷
قانونِ خداوندی کو عملاً اپنانے کی تاکید	۱۵۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۶۰
تفسیر	۱۶۲
ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضامین	۱۶۲
کافروں کے ساتھ تعلقات کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم	۱۶۵
کُفار سے ہمدردی رکھنے والے کامیاب نہیں ہو سکتے	۱۶۵
منافقینِ مدینہ کے یہود سے تعلقات کی وجہ اور ان کا اَنجامِ بد	۱۶۶
منافقین کو تنبیہ	۱۶۸
مؤمنین کی پہلی صفت: "تعلق مع اللہ"	۱۶۸
دُوسری صفت "آپس میں رحمدلی"	۱۶۹
تیسری صفت: "کُفار پر سختی"	۱۶۹
چوتھی صفت: "جہاد فی سبیل اللہ"	۱۷۰
پانچویں صفت: "کسی کی ملامت کی پروانہ کرنا"	۱۷۰
مذکورہ صفات کا مصداقِ اُتم صحابہ کی جماعت ہے	۱۷۱
مؤمنین کو دوستی کس کے ساتھ لگانی چاہیے؟	۱۷۱
کن مؤمنین کے ساتھ دلی دوستی لگانی چاہیے؟	۱۷۲
یہود و نصاریٰ مؤمن کی دوستی کے لائق نہیں	۱۷۳
اہلِ کتاب کو باقی کُفار سے علیحدہ ذکر کیوں کیا گیا؟	۱۷۴
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۷۷
تفسیر	۱۷۹
اہلِ کتاب کے اِستہزا کا مسکت جواب	۱۷۹
یہود کی طرف سے مؤمنین کو دھوکا دینے کی کوشش	۱۸۱
یہود کا قومی مزاج	۱۸۲
یہود کے علماء اور مشائخ کا بگاڑ اور اس کا سبب	۱۸۳
اللہ کی شان میں یہود کی گستاخی اور اس کی سزا	۱۸۳
"اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" کا مفہوم	۱۸۴
یہود کی طرف سے سازشوں کی ناکام کوششیں	۱۸۵
اہلِ کتاب اگر ایمان لاتے تو ان پر کیا کیا انعامات ہوتے؟	۱۸۶
قرآنِ کریم کا انصاف	۱۸۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۹۰
تفسیر	۱۹۲
رُکوع میں بیان کردہ مضامین	۱۹۲
اللہ کی طرف سے تبلیغِ دین کی تاکید اور سرورِ کائنات ﷺ کا اس پر عمل	۱۹۲
سرورِ کائنات ﷺ کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمے لے لی	۱۹۳
"اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ" کے دو مفہوم	۱۹۴
اہلِ کتاب کے بارے میں قرآن کا واشگاف اعلان	۱۹۵
قرآن اُترنے سے یہود و نصاریٰ کے کُفر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟	۱۹۶
اللہ کے ہاں مقبولیت کا معیار عنوان نہیں بلکہ حقیقت ہے	۱۹۷
گمراہی دو طرح سے آتی ہے: افراط اور تفریط	۱۹۸
بنی اسرائیل کی بیماریاں اُمتِ محمدیہ میں	۱۹۹

مضمون	صفحہ
سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اِفراط اور تفریط کرنے والے دونوں گمراہ ہیں	۲۰۰
رجال اللہ کے متعلق اِفراط وتفریط یہود ونصاریٰ سے مشابہت ہے	۲۰۰
نقطۂ اِعتدال کیا ہے؟	۲۰۱
یہود کی تفریط اور اس پر بے خوفی	۲۰۱
عیسائیوں کا اِفراط اور اُمتِ محمدیہ میں اس کے نمونے	۲۰۲
سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کی وضاحت	۲۰۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِلٰہ نہ ہونے کی حسی دلیل	۲۰۴
غیر اللہ کے اِلٰہ نہ ہونے کی ایک اور واضح دلیل	۲۰۵
مذکورہ دلیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کا اِبطال	۲۰۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۰۹
تفسیر	۲۱۱
ماقبل سے ربط	۲۱۱
"بدعت" بظاہر نیک کام ہونے کے باوجود مذموم کیوں؟	۲۱۲
یہود کے ملعون ہونے کی وجوہات	۲۱۴
اہلِ کتاب کی مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہمدردی کیوں تھی؟	۲۱۵
"اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً" کا مصداق اور اس کی وضاحت	۲۱۶
انگریز کے خلاف "ہندو مسلم اتحاد" اور قرآنی آیات کی وضاحت	۲۱۷
دورِ نبوت کے نصاریٰ کی صفات	۲۱۹
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۲۳
تفسیر	۲۲۴
ماقبل سے ربط	۲۲۴
تحریم کی تین صورتیں اور ان کے اَحکام	۲۲۵
"لَا تَعْتَدُوْا" کے دو مفہوم	۲۲۷
"قسم" کی اَقسام اور ان کے اَحکام	۲۲۸
کفارۂ قسم کے متعلق اَحکام	۲۲۹
آیاتِ قسم پر ایک نظر اور	۲۳۰
"خمر" کا مصداق اور حرمت کی تاریخ	۲۳۱
"میسر" (جوا) کی تعریف، صورتیں اور ان کے اَحکام	۲۳۲
"خمر" اور "میسر" کو حرام کیوں کیا گیا؟	۲۳۳
"خمر" اور "میسر" کے نقصاناتِ کثیرہ	۲۳۳
اللہ اور رسول کی اطاعت کی تاکید	۲۳۵
حرمتِ شراب سے قبل شراب نوشی میں وفات پانے والوں کا حکم	۲۳۵
بار بار تقویٰ کے ذکر کرنے کی وجہ	۲۳۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۳۹
تفسیر	۲۴۰
ماقبل سے ربط	۲۴۰
اہلِ عرب کے لئے شکار کی ممانعت بڑا امتحان کیوں تھا؟	۲۴۰
اللہ تعالیٰ آزمائش میں کیوں ڈالتے ہیں؟	۲۴۲
اِحرام کی حالت میں شکار کی سزا اور محرِم کے ذبیحہ کا حکم	۲۴۳
حالتِ اِحرام میں بری اور بحری شکار کا حکم	۲۴۶
ماقبل سے ربط	۲۴۷
بقائے عالم بقائے بیت اللہ سے وابستہ ہے	۲۴۷
اَحکامِ خداوندی میں مصلحتیں کیا ہیں؟	۲۴۹
ایمان کے اندر کمال کب پیدا ہوتا ہے؟	۲۴۹
رسول کی ذمہ داری	۲۵۰
ماحول کے ساتھ موافقت کا فتنہ	۲۵۰

مضمون	صفحہ
مذکورہ فتنے کا سدِّباب	۲۵۱
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۵۵
تفسیر	۲۵۸
ماقبل سے ربط	۲۵۸
آیتِ بالا کے شانِ نزول کے متعلق مختلف واقعات	۲۵۹
یہود کی غیرضروری سوالات کی عادت اور اُس کا بھیانک انجام	۲۶۰
شرک کی حقیقت اور موجودہ دور میں اس کے کچھ نمونے	۲۶۱
جانوروں کے متعلق مختلف شرکیہ رسمیں	۲۶۲
غیراللہ کے نام پر مزارات پر چھوڑے ہوئے جانور کا حکم	۲۶۴
شرک فی التشریع	۲۶۵
آیتِ بالا سے غیرمقلدین کا غلط اِستدلال اور اس کا جواب	۲۶۶
اِتباع میں قابلِ اِعتماد اُصول	۲۶۷
سرورِ کائنات ﷺ کے لئے مضمونِ تسلی	۲۶۷
مذکورہ آیت پر ایک اِشکال اور اس کا جواب	۲۶۸
"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَۃُ بَیْنِکُمْ" کا شانِ نزول	۲۷۱
خلاصۂ آیات	۲۷۲
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۷۷
تفسیر	۲۸۰
ماقبل سے ربط	۲۸۰
قیامت کے دن انبیاء اور ان کی اُمتوں سے سوال	۲۸۱
"لَاعِلْمَ لَنَا" کی چار توجیہات	۲۸۲
روزِ قیامت ہر شخص سے اِنفراداً پانچ سوال	۲۸۴
عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور اس کا مقصد	۲۸۴
عیسیٰ علیہ السلام کی بوقتِ رفع اور کل عمر کے متعلق مختلف اقوال	۲۸۵
عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے قرآن وسُنّت کا علم بھی دیا ہے	۲۸۶
حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مزید اِنعامات	۲۸۶
حواریوں کی طرف سے مائدہ کا مطالبہ کرنے کا واقعہ	۲۸۷
پکاپکایا کھانا اُترا یا نہیں؟	۲۸۸
عیسیٰ علیہ السلام کا روزِ قیامت عیسائیوں سے اِعلانِ لاتعلقی	۲۸۸
اہلِ بدعت سے سرورِ کائنات ﷺ کا اِعلانِ لاتعلقی	۲۸۹
جنتیوں کے لئے سب سے بڑی نعمت	۲۹۰
سُوْرَۃُ الْاَنْعَام	۲۹۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۲۹۶
تفسیر	۲۹۸
سورۂ اَنعام کا ماقبل سے ربط	۲۹۸
مکی سورتوں کے مضامین کا رُخ	۲۹۸
تین بنیادی عقیدوں کا مختصر تعارف	۳۰۰
مشرکینِ مکہ کے ساتھ مسئلۂ توحید میں اختلاف کی نوعیت اور شرک کی حقیقت	۳۰۱
اِنسان کے اِعراض کی شکایت	۳۰۲
کیا اُممِ گزشتہ پر تباہی کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ تھی؟	۳۰۳
سوال کا جواب دینے کے متعلق بلاغت کا اُصول	۳۰۴
مشرکین کے سوالات کا رَدّ	۳۰۴
حضور ﷺ کو تسلی	۳۰۵
انبیاء کی وراثت میں تکالیف کا سہنا بھی شامل ہے	۳۰۶
مستہزئین کے لئے وعید	۳۰۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۳۱۱
تفسیر	۳۱۶

مضمون	صفحہ
مکی اور مدنی سورتوں کے اُسلوب میں فرق	۳۱۶
رَدِّ شرک کے لئے اللہ کی مالکیت کا ذِکر	۳۱۶
قیامت کا قائم ہونا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے	۳۱۷
ایمان نہ لانے والے خسارے میں کیسے ہیں؟	۳۱۸
اللہ کی صفات کا ذِکر اور رَدِّ شرک	۳۱۹
حقیقی کامیابی کیا ہے؟	۳۱۹
عقیدۂ توحید کی وضاحت اور رَدِّ شرک	۳۲۰
حضور ﷺ کی رِسالت پر سب سے بڑی شہادت	۳۲۲
مشرکین کا دعویٰ بلا دلیل ہے	۳۲۳
رِسالتِ مصطفیٰ ﷺ پر اہلِ کتاب کی شہادت	۳۲۳
روزِ قیامت مشرکین کا حال	۳۲۴
کُفار کی ضد اور اس کا اَنجام	۳۲۴
جہنم کے کنارے پر کافروں کی جھوٹی آرزو	۳۲۵
قیامت کے دِن کُفار کی بدحالی کا ذِکر اور اس کا مقصد	۳۲۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۳۳۱
تفسیر	۳۳۶
ماقبل سے ربط	۳۳۶
کُفار کی تکذیب پر حضور ﷺ کی بے چینی اور اللہ کی طرف سے تسلی	۳۳۶
ایک اور پہلو سے تسلی	۳۳۷
مطالباتی معجزات نہ دِکھانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں	۳۳۸
زبردستی ہدایت پر لانا اللہ کی حکمت نہیں ہے	۳۳۹
''لَاتَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ'' کے مختلف مفہوم	۳۳۹
رَدِّ شرک کے لئے آفاقی دلائل	۳۴۰
رَدِّ شرک پر دلیلِ نفسی	۳۴۱

مضمون	صفحہ
خوش حالی اور بدحالی حق و باطل کی علامت نہیں	۳۴۲
خوش حالی پر اِترانے والوں کے لئے وعید	۳۴۳
منصبِ رِسالت کی وضاحت	۳۴۴
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۳۴۸
تفسیر	۳۵۰
قرآنِ کریم کے ذریعے کن لوگوں کو ڈرانے کا حکم ہے اور کیوں؟	۳۵۰
''جاہل'' اور ''عالم'' کے مقصدِ زندگی میں فرق	۳۵۱
انبیاء کی دعوت پر لبیک کہنے والے زیادہ تر غرباء کیوں ہوتے ہیں؟	۳۵۲
سرمایہ دار کُفار کی طرف سے غرباء کو دُور رکھنے کا مطالبہ کیوں ہوتا ہے؟	۳۵۳
مؤمنینِ مخلصین مساکین کے متعلق ہدایاتِ خداوندی	۳۵۳
غربت و مالداری عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں ہے	۳۵۵
اصل دولت دولتِ ایمان ہے جو مؤمنین کو حاصل ہے	۳۵۵
توبہ اور اِصلاح پر مغفرت کا وعدہ	۳۵۵
اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ سے چند باتوں کا اِعلان	۳۵۶
غیب کے خزانوں کا مالک صرف اللہ ہے	۳۵۷
''علمِ غیب'' کی صحیح تعریف	۳۵۸
اللہ تعالیٰ کے ''اِحاطۂ علمی'' کا ذِکر	۳۵۹
اللہ تعالیٰ کے ''اِحاطۂ قدرت'' کا ذِکر	۳۵۹
تفسیر	۳۶۲
ماقبل سے ربط	۳۶۲
اللہ تعالیٰ کے غلبے کا ذِکر اور اس کا مقصد	۳۶۲

مضمون	صفحہ
مصیبت کے وقت مشرکین کی حالت کا ذکر اور اس کا مقصد	۳۶۲
اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تین قسمیں	۳۶۳
کون سا اختلاف باعثِ محرومی اور کون سا باعثِ رحمت ہے؟	۳۶۴
اہلِ باطل کی مجلسوں سے اعراض کا حکم اور اعراض کی مختلف صورتیں	۳۶۴
تفسیر	۳۶۶
شانِ نزول	۳۶۶
تفسیر	۳۶۸
ابراہیم علیہ السلام کے واقعے سے مشرکین پر اتمامِ حجت	۳۶۸
سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعارف	۳۶۹
''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد تھا یا چچا؟	۳۷۰
سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کو خطاب اور ابراہیمی اُصول	۳۷۱
ابراہیم علیہ السلام کو عجائبات دکھانے سے مقصود کیا تھا؟	۳۷۲
زمین و آسمان میں غور کر کے حق کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟	۳۷۳
انبیاء ہمیشہ فطرتِ صحیحہ پر ہوتے ہیں	۳۷۳
ستارے وغیرہ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو فکری ارتقا نہیں تھا	۳۷۴
ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو ''ارخاءِ عنان'' کے طور پر تھی	۳۷۴
مودودی صاحب کی زبردست لغزش	۳۷۵
سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ستارہ پرستی کی تردید	۳۷۵
چاند پرستی کی تردید	۳۷۷
سورج پرستی کی تردید	۳۷۷
شرک سے براءت اور توحید کا اعلان	۳۷۸
قوم کی دھمکی اور ابراہیم علیہ السلام کا دوٹوک جواب	۳۷۸
دلیل مشرک کے ذمے ہے (علامہ شمس الحق افغانی کا واقعہ)	۳۷۹
امن میں موحد ہے یا مشرک؟	۳۸۰
تفسیر	۳۸۲
سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی رفعتِ شان اور گروہِ انبیاء کا تذکرہ	۳۸۲
گروہِ انبیاء کے ذکر کے بعد شرک کی مذمت	۳۸۴
حضور ﷺ کو تسلی، مخالفین کے لئے وعید، اور صحابہ کی عظمت	۳۸۴
حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ہدایات، اور عظمتِ قرآن	۳۸۴
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۳۸۷
تفسیر	۳۸۹
ماقبل سے ربط اور پچھلے رکوع پر اجمالی نظر	۳۸۹
رکوع ہذا کا خلاصہ اور آیات کا شانِ نزول	۳۹۰
یہود کی ناشکری اور ناقدر شناسی	۳۹۲
یہود کے اعتراض کا علمی جواب	۳۹۳
یہود کا تورات سے غیر منصفانہ رویہ	۳۹۳
قرآنِ کریم حقانیت کی دلیل	۳۹۴
اہلِ کتاب کے معتدل لوگ	۳۹۴
وحیِ الٰہی کے مقابلے میں مشرکین سرداروں کی ڈینگیں	۳۹۵
موت اور حشر کے وقت کفار کی نمائشی عزت رفتہ ہو جائے گی	۳۹۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۰۰
تفسیر	۴۰۲
مذکورہ دو رکوع میں بیان کردہ مضامین	۴۰۴
قدرتِ باری کے ارضی دلائل	۴۰۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
زندہ سے مُردہ اور مُردہ سے زندہ کو نکالنے کے متعدد مفہوم	۴۰۵	قرآن کریم کی شانِ محفوظیت	۴۲۶
قوموں کے عُروج وزوال کی چند مثالیں	۴۰۶	حق پہچاننے کے لئے اکثریت کا اُصول غلط ہے	۴۲۷
شمس وقمر میں آیاتِ قدرت اور قمری تاریخ کی اہمیت	۴۰۷	جانوروں کی حلت وحرمت کے متعلق مشرکین کے	
ستاروں میں قدرت کے دلائل	۴۰۸	پروپیگنڈوں کا جواب اور اہلِ ایمان کو ہدایات	۴۲۸
اِنسانی تخلیق کے متعلق تمام آسمانی مذاہب کا نظریہ اور		عقیدۃً اور عملاً ترکِ معصیت کا حکم	۴۳۰
موجودہ دَہریت	۴۰۹	متروک التسمیہ جانور کے متعلق ائمہ کا اِختلاف	۴۳۰
بارش ونباتات میں آیاتِ قدرت	۴۰۹	تفسیر	۴۳۳
رَدِّ شرک اور مزید دلائلِ قدرت	۴۱۰	ماقبل سے ربط۔ مؤمن اور کافر کی حالت ایک مثال کی	
دُنیا وآخرت میں رُؤیتِ باری تعالیٰ کے متعلق تفصیل	۴۱۱	روشنی میں	۴۳۳
سرورِ کائنات ﷺ کو ہدایات اور تسلی	۴۱۲	ہر دور میں بستی کے رُؤساء ہی مجرم کیوں رہے؟	۴۳۴
تبلیغ کا ایک بہترین ادب اور اُصول	۴۱۳	رُؤسائے مشرکین کی طرف سے ایک مطالبہ اور اس	
میدانِ تبلیغ میں ایک دُوسرے پر اِستہزا کا نقصان۔ایک		کا جواب	۴۳۵
عبرت آموز واقعہ	۴۱۴	اِسلام کے لئے ''شرحِ صدر'' اور ''ضیقِ صدر'' کا مفہوم	۴۳۶
منہ مانگا معجزہ نہ دینے کی حکمت	۴۱۵	جس طرف باطنی نسبت ہوگی ترقی اسی طرف ہوگی	۴۳۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۱۸	ظاہری عادات باطنی جذبات کی عکاس ہوتی ہیں	۴۳۸
تفسیر	۴۲۱	مکمل سلامتی صرف جنت میں ہوگی	۴۳۸
ماقبل سے ربط۔۔مشرکین کا منہ مانگی نشانی سے مقصد	۴۲۱	روزِ محشر کفار اور ان کے معبودانِ باطلہ کا حال	۴۳۹
مشرکین کو منہ مانگی نشانیاں کیوں نہیں دکھائی گئیں؟	۴۲۱	تفسیر	۴۴۳
مؤمنین کو تسلی	۴۲۲	جہنمی جن وانس کو تنبیہ	۴۴۳
سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی	۴۲۳	سرورِ کائنات ﷺ جن وانس کے نبی ورسول ہیں	۴۴۳
حضور ﷺ کی رسالت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی اور اس		''رُسل'' سے کیا مُراد ہے؟	۴۴۴
کی صورتیں	۴۲۴	جن وانس کا دربارِ خداوندی میں اِعترافِ جرم اور وجۂ جرم	۴۴۴
قرآن کی خصوصیات اور اس کی حقانیت پر منصف اہلِ		بغیر تنبیہ کے اللہ تعالیٰ نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا	۴۴۵
کتاب کی شہادت	۴۲۵	اللہ بے نیاز بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ رحمت والا بھی ہے	۴۴۵
قرآنِ کریم کی شانِ تمامیت	۴۲۶	قدرتِ الٰہی کے اِظہار کا انداز	۴۴۶

مضمون	صفحہ
منکرین سے جھگڑا ختم کرنے کے لئے آخری بات	۴۴۶
مشرکانہ رُسومات کی تردید	۴۴۷
مشرکین بچوں کو کیوں قتل کرتے تھے؟	۴۴۸
جانوروں کی حلت وحرمت کے متعلق مشرکانہ قواعد اور دورِ حاضر میں اس کے نمونے	۴۴۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۵۳
تفسیر	۴۵۷
ماقبل سے ربط اور آیات کا مضمون	۴۵۷
اِحسانات باری تعالیٰ کا ذکر	۴۵۸
"اٰتُوا حَقَّهٗ" میں "حق" کا مصداق کیا ہے؟ مختلف اقوال	۴۵۸
"عشر" کی مقدار	۴۵۹
اِنفاق فی سبیل اللہ کے تذکرے میں اِسراف کی ممانعت کی وجہ	۴۵۹
چوپائے اللہ تعالیٰ کا مستقل اِنعام ہیں	۴۶۱
شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے کے نقصانات	۴۶۱
مشرکین کے پاس جانوروں کی حلت وحرمت کے متعلق کوئی دلیل نہیں	۴۶۲
چار چیزوں میں حرمت کا حصر کیوں؟	۴۶۲
عارض کی وجہ سے یہود پر حرام ہونے والی چیزیں	۴۶۳
دُنیا کا نظام جزا وسزا کے اُصول پر نہیں بلکہ اِبتلا کے اُصول پر ہے	۴۶۴
دُنیا میں کسی طریقے کا وجود اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں	۴۶۶
"شہادت" کے صحیح ہونے کا معیار	۴۶۷
سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ کی طرف سے مشرکین کے متعلق ہدایات	۴۶۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۶۹
تفسیر	۴۷۱
ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضمون	۴۷۱
تحلیل وتحریم کے غلط اُصول	۴۷۱
والدین کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم	۴۷۲
مشرکین میں قتلِ اولاد کے مختلف مروّج طریقے	۴۷۲
"مِنْ اِمْلَاقٍ" اور "خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" کا فرق	۴۷۳
"خاندانی منصوبہ بندی" مشرکانہ نظریہ ہے	۴۷۴
اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور رزّاقیت میں تناسب ہے	۴۷۵
چند بُنیادی منہیات کا ذکر	۴۷۶
چند بُنیادی مأمورات کا ذکر	۴۷۶
"صراطِ مستقیم" کی اِتباع کی تاکید	۴۷۷
توراۃ کا تذکرہ اور اس کا مقصد	۴۷۸
قرآنِ کریم کا تذکرہ اور اس کا مقصد	۴۷۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۸۱
تفسیر	۴۸۳
ماقبل سے ربط	۴۸۳
ایمان کب نافع ہوتا ہے اور کب نہیں؟	۴۸۳
"بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ" کا مصداق	۴۸۴
"فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ" کا مفہوم اور مصداق	۴۸۵
ایک اہم سوال اور اس کا جواب	۴۸۶
"صراطِ مستقیم" کیا ہے اور اس سے بھٹکنے کی صورت کیا ہے؟	۴۸۷
بطورِ نمونہ ستائیسویں رجب میں مروّجہ چند بدعات کا ذکر	۴۸۷
"فی سبیل اللہ" خرچ اور نیکی کی برکات	۴۸۹

مضمون	صفحہ
"ملتِ ابراہیمی" اور "صراطِ مستقیم" کی نشاندہی	۴۹۰
عقیدۂ ربوبیت توحید کی بنیاد ہے	۴۹۱
دنیا کا نظام ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے	۴۹۲
سورۃ الاعراف	۴۹۳
سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کا مفہوم	۴۹۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۹۷
تفسیر	۴۹۹
مکی اور مدنی سورتوں میں فرق	۴۹۹
مکی سورتوں کے مضامین پر اجمالی نظر	۴۹۹
اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان دونوں واسطے قابلِ اعتماد ہیں	۵۰۰
مکی سورتوں میں ترغیب وترہیب کا انداز ومقصد	۵۰۰
سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی	۵۰۲
اُممِ سابقہ کے واقعات کے ذریعے ترہیب	۵۰۳
آخرت میں رسولوں اور ان کی اُمتوں سے سوال	۵۰۵
"یومئذٍ" کا مفہوم	۵۰۵
چاروں طرف قدرت کے کیمرے نصب ہیں	۵۰۶
گناہ کا مدار جذبۂ اخفاء پر ہے	۵۰۸
انسان اللہ کا خوف اور اپنی ذمہ داری کب محسوس کرے گا؟	۵۰۹
انسانی زندگی میں انقلاب کیسے آئے گا؟	۵۰۹
وزنِ اعمال کی کیفیت کے متعلق مختلف اقوال	۵۱۰
وزنِ اعمال کا نتیجہ	۵۱۳
قیامت کے دن مسکین کون ہوگا؟	۵۱۳
قرآنِ کریم ایک انقلابی کتاب	۵۱۴
خسارے میں پڑنے کی وجہ	۵۱۵
تمام اسبابِ معیشت اللہ نے زمین سے پیدا کئے ہیں	۵۱۵
اسبابِ معیشت کا غلط استعمال ہلاکت کا باعث ہے	۵۱۶
نعمتوں کی قدر دانی کیسے ہوگی؟	۵۱۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۵۲۰
تفسیر	۵۲۴
ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضمون	۵۲۴
ابلیس جن تھا، استاذِ ملائکہ نہیں تھا	۵۲۵
سجدے کا حکم ابلیس کو بھی تھا	۵۲۶
حسد کی وجہ سے ابلیس کا انکار، پھر اس پر ڈھٹائی، اور اللہ کی طرف سے پھٹکار	۵۲۶
ابلیس کا چیلنج اور اللہ کی طرف سے حاکمانہ جواب	۵۲۷
جنت میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ کی آدم علیہ السلام کو نصیحت	۵۲۸
ابلیس نے آدم علیہ السلام کو کس طرح پھسلایا	۵۲۸
دوسرے کو متاثر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟	۵۳۰
آدم علیہ السلام نے شیطان کی بات پر اعتبار کیوں کیا؟	۵۳۰
بنی آدم پر شیطان کا طریقۂ واردات آج بھی وہی ہے	۵۳۱
جہنم میں ابلیس کا اپنے متبعین کو خطاب، اور ان سے اعلانِ لاتعلقی	۵۳۲
شیطان کے چکر سے بچنے کا طریقہ	۵۳۳
ممنوعہ درخت کھانے کے نتیجے میں جنت کی نعمتوں سے محرومی	۵۳۳
فطرتِ آدم اور فطرتِ شیطان میں فرق	۵۳۴
یہ دنیا بنی آدم اور شیطان کا میدانِ جنگ ہے	۵۳۴

مضمون	صفحہ
مذکورہ رُکوع پر ایک نظر اور!	۵۳۶
حضرت آدم علیہ السلام کے خلق اور تصویر کا مفہوم	۵۳۶
کیا شیطان کو مانگی ہوئی مہلت پوری ملی یا کچھ کم ملی؟	۵۳۶
’’صراطِ مستقیم‘‘ کا مفہوم اور شیطان کے اس پر بیٹھنے کا مقصد	۵۳۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۵۴۱
تفسیر	۵۴۳
گزشتہ رُکوع سے ربط	۵۴۳
مشرکینِ مکہ کی دورانِ طواف بے حیائی	۵۴۳
آج کی نئی تہذیب اور عریانی کی جدید صورتیں	۵۴۴
تنگ اور باریک لباس کا حکم	۵۴۵
لباس کے مقاصد اور شرعی حدود	۵۴۵
شلوار اور چادر ٹخنوں سے نیچے رکھنے کی ممانعت	۵۴۶
فساق کی شکل اپنانا کس بات کی عکاسی ہے؟	۵۴۷
واقعۂ آدم علیہ السلام کے بعد اَحکامِ لباس کے ذِکر کی وجہ	۵۴۸
لباس کے دو مقصد	۵۴۸
’’لِبَاسُ التَّقْوٰی‘‘ کے دو مفہوم	۵۴۸
شیطان ہمیشہ خیرخواہی کے عنوان سے حملہ کرتا ہے	۵۴۹
شیطانی حملوں سے بچنے کا طریقہ	۵۴۹
شیطان کے دوست، اور صالحین کے دوست	۵۵۰
بے حیائی پر مشرکین کی دو دلیلیں اور ان کا رَدّ	۵۵۰
ہر چیز میں اعتدال کی رعایت کا حکم	۵۵۱
سارے عمل کی بنیاد انسان کے اِرادے سے اُٹھتی ہے	۵۵۱
آخری آیات پر ایک نظر دوبارہ	۵۵۲
تفسیر	۵۵۲
غلط رُسوم پر مشرکین کی دو دلیلیں	۵۵۲
کس حکم کی نسبت اللہ کی طرف دُرست ہے اور کس حکم نسبت اللہ پر اِفترا ہے؟	۵۵۳
عبادت کے ظاہر اور باطن کو دُرست رکھنے کا حکم اور ریا کی مذمّت	۵۵۳
مَعاد کا ذِکر اور اس کا مقصد	۵۵۵
اِنسان جدھر رُخ کرتا ہے وہی کیفیت اللہ کی طرف سے پیدا ہو جاتی ہے	۵۵۶
تعلق مع اللہ کی علامت، اور تعلق مع الشیطان کی علامت	۵۵۷
توبہ کی توفیق کسے ملتی ہے، کسے نہیں ملتی؟	۵۵۸
’’زینت‘‘ کا معیار	۵۵۹
اِسراف سے بچنے کا حکم	۵۶۰
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۵۶۲
تفسیر	۵۶۶
ماقبل سے ربط اور رُکوع ھٰذا میں بیان کردہ مضامین	۵۶۶
دُنیا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مؤمن اور کافر میں فرق	۵۶۶
دُنیا کی ساری نعمتیں اصل میں کس کے لئے مفید ہیں؟	۵۶۷
مشرکین اپنی اُلٹی چال کی وجہ سے حق سے دُور ہوتے جا رہے ہیں	۵۶۸
اللہ نے کن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے؟	۵۶۹
موت کے تقدّم وتأخر کی نفی پر ایک اِشکال کا جواب	۵۷۰
آدم علیہ السلام کی وساطت سے بنی آدم کو ہدایت	۵۷۱
اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والوں کا عبرتناک انجام	۵۷۱
جہنم میں جانے کے بعد آپس میں لعنت کا منظر	۵۷۲

مضمون	صفحہ
بدعملی کی وجہ سے اِنسان پر دو طرح سے عذاب آتا ہے	۵۷۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۵۷۶
تفسیر	۵۸۱
ترغیب اور ترہیب کو ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا مقصد	۵۸۱
موت کے وقت مؤمن اور کافر کی حالت میں فرق	۵۸۱
اَصحابِ اَعراف کی جہنم والوں سے گفتگو	۵۸۲
تفسیر	۵۸۴
کُفار پر جنت کی نعمتیں حرام ہیں	۵۸۴
جنتی نعمتوں سے محروم ہونے والوں کا تعارف	۵۸۵
''لہو'' اور ''لعب'' میں فرق	۵۸۵
اِنسان کو دھوکا کس طرح لگتا ہے؟	۵۸۶
اللہ کو بھلانے والوں کا آخرت میں انجام	۵۸۷
قرآن ہدایت ورحمت اور واقع کے مطابق ہے	۵۸۷
کُفار کی قیامت کے دن بے فائدہ حسرتیں	۵۸۷
کافروں نے قیمتی چیز ''عمر'' ضائع کر کے مقابلے میں اللہ کا عذاب لے لیا	۵۸۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۵۹۰
تفسیر	۵۹۲
ماقبل کا مضمون	۵۹۲
مسئلۂ معاد کے متصل قدرتِ باری کے ذکر کرنے کی وجہ	۵۹۲
آیاتِ قدرت سے توحید اور معاد دونوں چیزیں ثابت ہوتی ہیں	۵۹۳
اللہ تعالیٰ کا تعارف لفظ ''ربّ'' سے کیوں؟	۵۹۳
کائنات کی تخلیق کے ذکر میں ''چھ دن'' سے کیا مراد ہے؟	۵۹۴
کائنات کی تدریجاً تخلیق حکمت پر مبنی ہے	۵۹۵
صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ایک اُصولی بات	۵۹۶
کائنات کا سارا نظام اللہ کے حکم کے تابع ہے	۵۹۹
اِحساناتِ باری تعالیٰ کا تقاضا	۶۰۰
آدابِ دُعا اور اس کے ثمرات	۶۰۱
دُعا میں اِعتداء کیا ہے؟	۶۰۳
اِصلاح کے بعد فساد فی الارض کی ممانعت	۶۰۴
نفع ونقصان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے	۶۰۴
''اِحسان فی العبادۃ'' کا مفہوم	۶۰۷
بارش کے نظام میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اِحسان	۶۰۷
اِحیائے اَرض کو اَحیائے موتی کے لئے بطور مثال ذِکر کیا گیا ہے	۶۰۸
بارش برسنے کے بعد زمین کے مختلف حالات	۶۰۹
ظاہری بارش زمین پر اور باطنی بارش قلوب پر	۶۰۹
نزولِ وحی کے بعد لوگ مختلف حصوں میں بٹ جاتے ہیں	۶۱۰
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۶۱۳
تفسیر	۶۱۶
ماقبل سے ربط وتعلق	۶۱۶
واقعات کے ذریعے اُصولوں کی تائید	۶۱۶
دُنیا میں بت پرستی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے شروع ہوئی	۶۱۷
اُممِ سابقہ کے واقعات میں سبق	۶۱۸
تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کا عقائد ونظریات میں اتحاد	۶۱۸
حضرت نوح علیہ السلام کا اندازِ دعوت وتبلیغ	۶۱۹
انبیاء اور وارثینِ انبیاء کا طرزِ تبلیغ	۶۲۰

مضمون	صفحہ
منکرینِ انبیاء کا رَدّ ...... انبیاء علیہم السلام کا انسانوں میں سے ہونے کی وجہ	۱۲۰
ایک پولیس افسر کا ایمان افروز واقعہ	۱۲۲
اِنسانوں کے جذبات سے اِنسان ہی واقف ہوتے ہیں	۱۲۲
نوح علیہ السلام "آدمِ ثانی" کیوں کہلاتے ہیں؟	۱۲۳
قومِ عاد کا پس منظر اور تعارف	۱۲۳
دعوتِ حق قبول کرنے کی صلاحیت کن لوگوں میں ہوتی ہے؟	۱۲۴
حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کا حال	۱۲۴
قومِ ہود کی بے حیائی کی انتہا	۱۲۵
قومِ ہود کا عبرتناک انجام	۱۲۷
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۲۹
تفسیر	۱۳۲
شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ پر ہونے والے اِعتراض کا جواب	۱۳۲
حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت	۱۳۴
ناقۂ صالح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں؟	۱۳۴
"نَاقَةُ اللهِ" کے حالات	۱۳۵
اُونٹنی کا قتل اور قوم پر عذاب	۱۳۵
فنِ تعمیر میں قومِ ثمود کی مہارت	۱۳۶
قومِ ثمود کو اِحسانات کی یاد دہانی	۱۳۷
اکثر و بیشتر حق سے ٹکرانے والا طبقہ	۱۳۷
قومِ ثمود کی ڈھٹائی پر اللہ کی طرف سے عذاب	۱۳۸
حضرت صالح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب	۱۳۹
حضرت لُوط علیہ السلام کے علاقے کا مختصر تعارف	۱۳۹
لُوط علیہ السلام کے وعظوں میں زیادہ تر کس چیز کا ذکر ہے؟	۱۴۰
لفظ "لواطت" مُحدَث ہے	۱۴۱
عملِ قومِ لُوط خالص شیطنت ہے	۱۴۲
خلاصۂ آیات	۱۴۲
تفسیر	۱۴۳
لُوط علیہ السلام کا تعارف، قومِ لُوط کا علاقہ	۱۴۳
لُوط علیہ السلام کی تقریروں میں توحید کی بجائے زیادہ تر ان کے فعلِ بد پر اِنکار کیوں ہے؟	۱۴۴
لفظِ "لواطت" مُحدَث ہے	۱۴۴
"لواطت" حیوانی فطرت کا تقاضا بھی نہیں، بلکہ یہ خالص شیطانی حرکت ہے	۱۴۵
عملِ قومِ لُوط کی اِبتدا	۱۴۶
عملِ قومِ لُوط کا معاشرتی و اخلاقی نقصان	۱۴۶
عملِ قومِ لُوط زنا سے زیادہ بُرا فعل ہے	۱۴۷
عملِ قومِ لُوط کی سزا	۱۴۷
قومِ لُوط کی ہٹ دھرمی اور ان کا انجام	۱۴۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۵۳
تفسیر	۱۵۵
قومِ شعیب کی بدمعاملگی	۱۵۵
تاجر طبقے کی بیماری اور اس کا دُنیا و آخرت میں نقصان	۱۵۶
حضرت شعیب علیہ السلام کی وعظ و نصیحت	۱۵۶
قوم کی ضد اور اس کا انجام	۱۵۷
آیات پر ایک نظر	۱۵۸
"خاندانی منصوبہ بندی" اللہ کے اِحسان کی ناشکری ہے	۱۵۹
حضرت شعیب علیہ السلام کی جگرسوزی اور دل سوزی	۱۶۰
انبیاء کی تحریک کے مدِمقابل کون اور کیوں؟	۱۶۰
انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اثر کیا ہوتا ہے؟	۱۶۱

مضمون	صفحہ
مولوی حکومت سے کیوں نہیں ڈرتا؟ اور سرمایہ دار کیوں ڈرتے ہیں؟	۶۶۲
کیا مال دار کو سلام کرنا ممنوع ہے؟	۶۶۳
قوم کی دھمکی اور شعیب علیہ السلام کا جواب	۶۶۴
سرداروں کی ہٹ دھرمی اور انجام	۶۶۵
تکذیب کی وجہ سے قومِ شعیب بے نام ونشان	۶۶۵
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۶۶۷
تفسیر	۶۷۰
ماقبل سے ربط اور مذکورہ بالا آیات لانے کا مقصد	۶۷۰
تنبیہی واقعات کا مقصد	۶۷۱
تنبیہی واقعات کی لپیٹ میں نیک وبد کا اِمتیاز نہیں ہوتا	۶۷۱
تنبیہی واقعات کی حقیقت نیک وبد کے لئے مختلف ہوتی ہے	۶۷۱
تفہیم بصورتِ خوش حالی اور اس میں نیک وبد کا فرق	۶۷۲
مثال سے وضاحت	۶۷۳
باعثِ برکت مال کون سا ہوتا ہے؟	۶۷۶
گزشتہ قوموں کا حال بیان کرنے کے بعد موجودہ کُفّار کو تنبیہ	۶۷۷
بدکرداری کے نتیجے میں دِل پر مہر لگ جاتی ہے	۶۷۸
کُفّار کی ضد اور بدعہدی	۶۷۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۶۸۱
تفسیر	۶۸۶
موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کا سبب	۶۸۶
آیات کا حق ادا نہ کرنے والوں کا انجام	۶۸۷
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کو دعوتِ حق	۶۸۷
مولانا جامی رحمہ اللہ کا دلچسپ واقعہ	۶۸۸
کبھی واقعے کو قرآنِ کریم اِجمالی انداز میں نقل کرتا ہے	۶۸۹
دربارِ فرعون میں معجزات کا مظاہرہ	۶۹۰
''عصائے موسیٰ'' کا تعارف	۶۹۰
معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا سیاسی رنگ دینا	۶۹۱
فرعون اور اس کے حواریوں کی سیاسی چال	۶۹۲
فرعونیوں کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے کے لئے تیاریاں اور جائزہ	۶۹۳
حق پرست کی علامت	۶۹۴
باطل پرست کی علامت	۶۹۵
جادوگروں کے مقابلے کے لیے تیاریاں اور میدان کا منظر	۶۹۵
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگر مقابلے کے لیے آمنے سامنے	۶۹۷
جادوگروں کی شکست	۶۹۹
جادوگروں کا ایمان قبول کرنا اور اس کی وجہ	۶۹۹
جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون کی سیاسی چال	۷۰۱
اِیمان کی نشانی	۷۰۲
اہلِ حق کی نظر اللہ پر ہوتی ہے	۷۰۳
خلاصۂ آیات	۷۰۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۰۷
تفسیر	۷۱۰
ماقبل سے ربط ...... فرعون کا مرعوب ہونا مستقل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے	۷۱۰
فرعون کے اراکینِ سلطنت کا فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے خلاف برانگیختہ کرنا	۷۱۱

مضمون	صفحہ
فرعون کا اپنے اراکینِ سلطنت کو جواب	۷۱۲
"فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!"	۷۱۲
موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو تسلی دینا، اور قوم کا شکوہ در شکوہ	۷۱۳
"إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ" سے سوشلسٹ لوگوں کا غلط اِستدلال	۷۱۴
فرعونیوں پر تنبیہات کا سلسلہ	۷۱۵
خوش حالی اور تنگی کے متعلق فرعونیوں کا بے ہودہ نظریہ	۷۱۵
فرعونیوں پر آنے والے مختلف تنبیہی عذابات	۷۱۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو (۹) معجزات	۷۱۷
فرعونیوں سے انتقامِ خداوندی	۷۱۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۲۰
تفسیر	۷۲۳
ماقبل سے ربط اور رکوع میں بیان کردہ مضمون	۷۲۳
بنی اسرائیلیوں کی سیاسی بدحالی اور اللہ کی طرف سے اِنعام	۷۲۳
مسجدِ اقصیٰ کی جغرافیائی حیثیت	۷۲۴
ماتحت اپنے حاکم کے اثرات قبول کرتا ہے	۷۲۵
اِسرائیلوں کی طرف سے مجسم خدا کا مطالبہ اور موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ	۷۲۵
"فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ" کی وضاحت	۷۲۶
بنی اسرائیل کو اِحسان کی یاددہانی اور اس کا مقصد	۷۲۶
حضرت حکیم العصر رحمہ اللہ کی سفرِ حج پر روانگی	۷۲۷
سفرِ حج سے واپسی	۷۲۹
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۲۹
تفسیر	۷۳۲
ماقبل سے ربط	۷۳۲
چالیس دن کو دو حصوں میں ذکر کرنے کی وجوہات	۷۳۲
موسیٰ علیہ السلام کی چلہ گاہ اور وہاں موجود معبد خانے	۷۳۳
خلوت گزینی کی ضرورت واہمیت	۷۳۳
"چالیس دن" کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟	۷۳۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور خلیفہ بنانا	۷۳۶
موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کو ہدایات دینا	۷۳۷
موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے دیدار کا مطالبہ	۷۳۸
دیدارِ الٰہی عقلاً ممکن ہے، شرعاً ممتنع ہے	۷۳۸
لیلۃ المعراج میں حضور ﷺ کو دیدارِ الٰہی کا ہونا اِس آیت کے منافی نہیں	۷۳۹
اِنسان کی جسمانی اور قلبی طاقت میں فرق	۷۴۱
اِنسان کی ظاہری آنکھ کمزور ہے	۷۴۱
عدم رُؤیت باری تعالیٰ پر موسیٰ علیہ السلام کا تاثر	۷۴۲
توراۃ کے متعلق موسیٰ علیہ السلام کو ہدایات	۷۴۳
تکبر کی نحوست اور متکبرین کا انجام	۷۴۴
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۴۶
تفسیر	۷۴۸
ماقبل سے ربط اور مذکورہ رُکوع میں بیان کردہ واقعہ	۷۴۸
حاکم قوم کی عادات واطوار کا محکوم پر اَثر انداز ہونا	۷۴۸
بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے اثرات	۷۴۹
سامری کی سازش اور اس کا بنی اسرائیلیوں کو شرک میں مبتلا کرنا	۷۴۹
سامری کا کرتب اور قوم میں اِنتشار	۷۵۱
قوم کے شرکیہ عمل پر حضرت ہارون علیہ السلام کا رَدِ عمل	۷۵۲
واپسی پر موسیٰ علیہ السلام کا قوم کو سمجھانا، اور ہارون علیہ السلام پر غصے کا اظہار	۷۵۲

مضمون	صفحہ
ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے عذر	۷۵۴
موسیٰ علیہ السلام کا اپنے لیے اور ہارون علیہ السلام کے لئے دُعا کرنا	۷۵۴
خلاصۂ آیات	۷۵۵
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۵۹
تفسیر	۷۶۶
ماقبل سے ربط، اور بچھڑے کے پجاریوں کا دُنیا وآخرت میں انجام	۷۶۶
"ایجادِ بدعت" اِفترا علی اللہ ہے	۷۶۶
درگاہِ باری تعالیٰ نا اُمیدی کی جگہ نہیں	۷۶۸
قومِ موسیٰ کے ستر نمائندوں کا عجیب واقعہ	۷۶۸
توراۃ وانجیل میں سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق آج بھی پیش گوئیاں موجود ہیں	۷۶۹
قومِ موسیٰ کے ستر نمائندوں والے واقعے کی ایک اور تعبیر	۷۷۰
مضمون کا موسیٰ علیہ السلام سے حضور ﷺ کی طرف انتقال	۷۷۱
"إصر وأغلال" کا مفہوم ومصداق	۷۷۱
خود عائد کردہ پابندیاں بھی "اِصر واغلال" میں شامل ہیں	۷۷۲
آخری آیات کا مضمون	۷۷۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۷۵
تفسیر	۷۷۷
ماقبل سے ربط	۷۷۷
"ایلہ" بستی کا محلِ وقوع	۷۷۷
یہود ونصاریٰ کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے آسانی	۷۷۸
اَذانِ جمعہ کے وقت کے متعلق خطباء کے لئے لمحۂ فکریہ!	۷۷۸
یہودیوں کا اِمتحان اور ان کا "کلابی تقویٰ"	۷۸۰
اِمتحان کے نتیجے میں قوم کے تین گروہ	۷۸۰
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۸۳
تفسیر	۷۸۴
یہود کی ذِلّت ایک مسلمہ تاریخی حقیقت	۷۸۴
کیا "مہدی" دُنیا میں صرف ایک ہے؟	۷۸۵
آخر زمانے میں یہود کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ اور یہود کا خاتمہ	۷۸۶
اسرائیل ریاست اِسرائیلوں کی ہلاکت گاہ ہے!	۷۸۷
حسنات وسیئات دونوں یہود کے لیے ہمیشہ آزمائش کا سبب	۷۸۸
یہود اپنے بڑوں کے بُرے جانشین	۷۸۸
یہود کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ	۷۸۹
بنی اسرائیل کی بدعہدی اور اُن پر پہاڑ کا معلق ہونا	۷۸۹
ایک اہم اِعتراض کا اِزالہ	۷۹۰
تفسیر	۷۹۱
ماقبل سے ربط اور "عہدِ اَلست" کی تفصیل	۷۹۱
سوالات اور ان کے جوابات	۷۹۲
"عہدِ اَلست" کیوں کیا لیا گیا؟	۷۹۲
تفسیر	۷۹۴
ایک عالم مقتدا کی گمراہی کا واقعہ	۷۹۴
اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی سزا	۷۹۷
اِنسان ہدایت یا گمراہی میں مجبور نہیں ہے	۷۹۷
سرورِ کائنات ﷺ کے لئے کلماتِ تسلی	۷۹۸
رفعِ تعارض وتطبیق بین الآیات	۷۹۹
اکثریت کا قول حق ہونے کی دلیل نہیں	۷۹۹
اِنسان کو حیوان سے کون سی چیز ممتاز کرتی ہے؟	۸۰۱

مضمون	صفحہ
انسان "بَلْ هُمْ اَضَلُّ" کا مصداق کب بنتا ہے؟	۸۰۴
حیوانی حدود سے باہر نکلنے کے لئے عبادت کا طریقہ	۸۰۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۸۰۸
تفسیر	۸۱۱
ماقبل سے ربط..... حق قیامت تک ایک طائفہ کی صورت میں ضرور رہے گا	۸۱۱
کفار کے پاس کثرتِ اموال نعمت نہیں، عذاب ہے	۸۱۲
خواجہ سلیم چشتی رحمہ اللہ کا کمالِ استغناء	۸۱۴
ایمان وعلم کے قلب پر اثر انداز ہونے کی علامت	۸۱۶
دُنیوی زندگی میں امیر، غریب کا کوئی فرق نہیں، صرف سوچ کا فرق ہے	۸۱۸
"استدراج" اور اس کا مفہوم	۸۱۹
تدبر وفکر کی دعوت	۸۲۱
ہر کیفیت اور ہر حال کا خالق اللہ ہے لیکن انسان مجبور نہیں ہے	۸۲۲
اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ	۸۲۴
قیامت کے وقوع کے علم کو مخفی رکھنے میں حکمت	۸۲۴
سرورِ کائنات ﷺ کے پاس ہر چیز کا علم اور مستقل اختیار نہیں تھا	۸۲۵
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۸۲۷
تفسیر	۸۲۹
ماقبل سے ربط اور گزشتہ آیات پر ایک نظر	۸۲۹
حضرت حواء کی تخلیق کس طرح ہوئی؟	۸۲۹
زوجین کے تعلق سے اصل مقصود	۸۳۰
"فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا" کی آسان تشریح	۸۳۱
مشرکین نے اپنا معبود بے جان چیزوں کو بھی بنایا ہے	۸۳۴
مذکورہ دعویٰ پر قرآنی دلائل	۸۳۶
زیرِ درس آیات کا تعلق بے جان معبودوں کے ساتھ ہے	۸۳۷
خلاصۂ آیات	۸۳۹
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۸۴۱
تفسیر	۸۴۲
ماقبل سے ربط، مذکورہ آیات کا مضمون	۸۴۲
متبعینِ سرورِ کائنات (ﷺ) کو نصیحت	۸۴۳
اچھے اخلاق کے مظاہرے کا فائدہ	۸۴۳
بوقتِ وسوسۂ شیطانی متقی لوگوں کی شان	۸۴۴
منہ مانگے معجزے کے متعلق عادۃ اللہ	۸۴۵
آدابِ تلاوتِ قرآنِ کریم	۸۴۶
ذکر اللہ تمام کامیابیوں کے لیے مفتاح	۸۴۶
ذکر اللہ کے لئے بہتر طریقہ اور اوقاتِ مفیدہ	۸۴۷
فرشتوں کی تسبیح کا ذکر اور اس کا مقصد	۸۴۸

***

سُورَةُ المَائِدَةِ

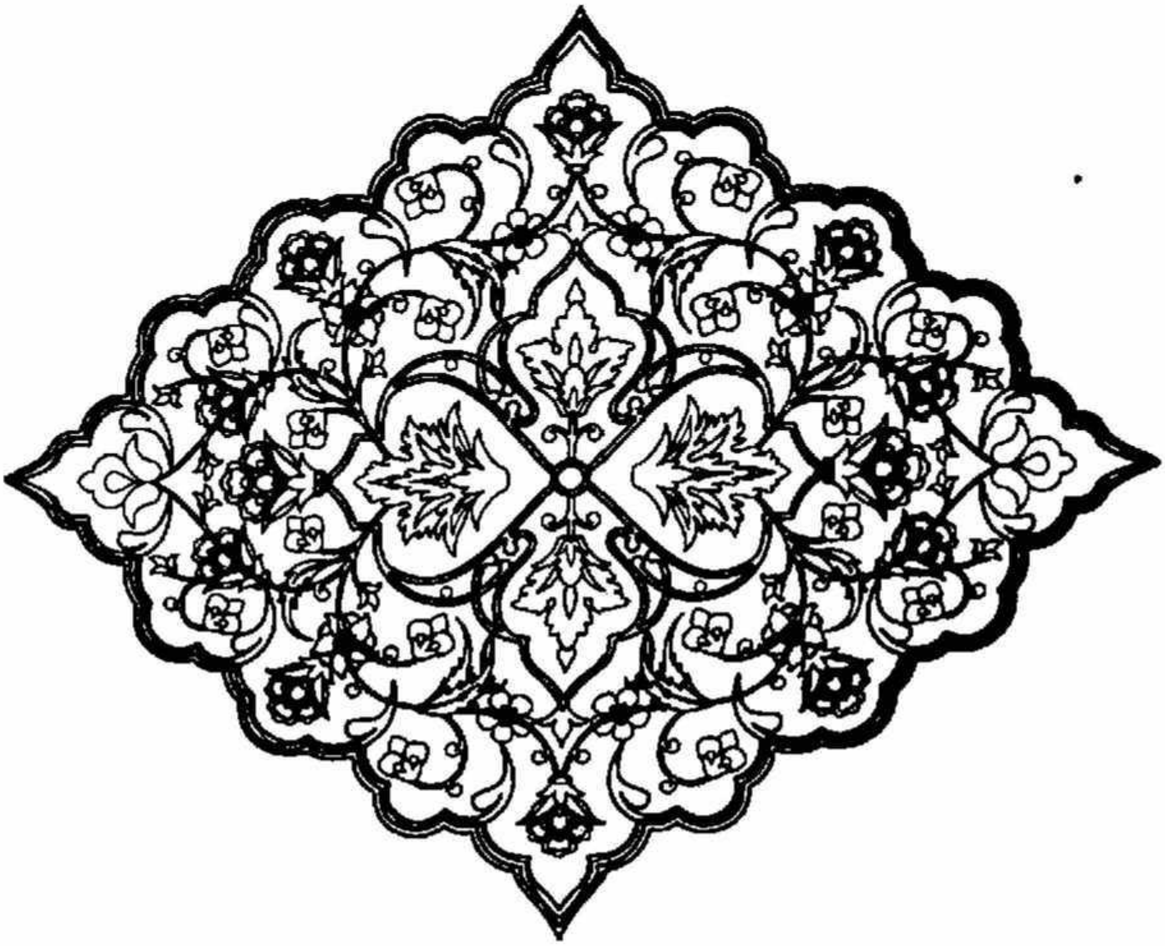

آیاتھا ۱۲۰ ۵ سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِیَّةٌ ۱۱۲ رکوعاتھا ۱۶

سورۂ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ۱۲۰ آیتیں ہیں اور ۱۶ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۬ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ

اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو، حلال کیے گئے ہیں تمہارے لیے وہ تمام چوپائے جو انعام کے مشابہ ہیں

اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌؕ

سوائے اُن کے جو تم پر پڑھے جاتے ہیں اس حال میں کہ تم نہ حلال قرار دینے والے ہو شکار کو تمہارے مُحرِم ہونے کی حالت میں،

اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ ① یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىٕرَ

بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے ① اے ایمان والو! حلال قرار نہ دو اللہ کے دِین کی نشانیوں کو

اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ

اور نہ حُرمت والے مہینے کو اور نہ ہدی کو اور نہ قلادے والے جانوروں کو، اور نہ اُن لوگوں کو جو کہ قصد کرنے والے ہیں

الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًاؕ وَ اِذَا

حُرمت والے گھر کا طلب کرتے ہیں وہ اللہ کا فضل اور اُس کی رضا، اور جس وقت

حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْاؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ

تم اِحرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کر لیا کرو، نہ برانگیختہ کرے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس سبب سے کہ انہوں نے روکا تمہیں

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْاۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ

مسجدِ حرام سے (برانگیختہ نہ کرے) کہ تم حد سے بڑھ جاؤ، آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو نیکی

وَ التَّقْوٰى۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَؕ اِنَّ

اور تقویٰ پر، اور ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو گناہ پر اور ظلم پر، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک

اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝٢ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ
اللہ سخت سزا والے ہیں ② حرام کردیا گیا تم پر میتہ اور خون

وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ
اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور کہ آواز بلند کی جائے اللہ کے غیر کے لئے اس پر، اور وہ جو گلہ گھٹنے کی وجہ سے مرجائے اور چوٹ لگایا ہوا

وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ
اور گرنے والا اور جس کے ٹکر ماری گئی ہو اور وہ جس کو درندہ کھاجائے مگر جس کو تم ذبح کرلو،

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ
اور حرام کی گئی ہے وہ چیز جو ذبح کی جائے نُصب پر اور یہ بھی حرام کردیا گیا ہے کہ تم قسمت طلب کرو تیروں کے ساتھ، یہ گناہ ہے،

الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ
آج مایوس ہوگئے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا تمہارے دِین سے پس تم اُن سے اندیشہ نہ کیا کرو

وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي
اور مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دِین کامل کردیا اور اپنی نعمت تم پہ پوری کردی

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ
اور میں نے تمہارے لیے اسلام از روئے دِین کے پسند کرلیا، پھر جو شخص مجبور کردیا گیا بھوک میں اس حال میں کہ وہ

مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝٣
کسی گناہ کی طرف میلان کرنے والا نہ ہو، پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ③

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ سورۂ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ۱۲۰ آیتیں ہیں اور ۱۶ رُکوع ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: اے ایمان والو!، أَوْفُوا بِالْعُقُودِ: عقود عقد کی جمع، عقد کا لفظی معنی ہوتا ہے گرہ لگانا، باندھنا، اس لیے عُقدہ گانٹھ کو کہتے ہیں، اور یہاں عقد سے عہد مراد ہے، أَوْفُوا بِالْعُقُودِ کا مفہوم ہے أَوْفُوا بِالْعُهُودِ، عہدوں کو پورا کرو، أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ:

انعام نَعَم کی جمع ہے،نَعَم کا لفظ ان چوپایوں پر بولا جاتا ہے جو عادۃً گھر میں پالے جاتے ہیں،سورۂ انعام میں آئے گا بھیڑ بکری اور گائے اُونٹ، یہ جو گھر میں عام طور پر پالے جاتے ہیں،اور بھینس گائے کے حکم میں ہے،توان پر اَنعام کا لفظ بولا جاتا ہے،اور بہیمہ مطلقاً چوپائے کو کہتے ہیں،بہیمہ عام ہے اور اَنعام خاص ہے،تو یہ عام کی اضافت خاص کی طرف کی گئی ہے،اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق یہ اضافت تشبیہی ہے جس کی بنا پر ترجمہ اس کا یوں کیا جائے گا کہ ”حلال کیے گئے تمہارے لیے وہ تمام چوپائے جو کہ اَنعام کے مشابہ ہیں“ یعنی اَنعام کی تو حلت ہے ہی، اس میں تو شبہ ہی کوئی نہیں، اِن اَنعام کے علاوہ دوسرے چوپائے،ان کی حلت بیان کرنا مقصود ہے کہ جو اَنعام کے مشابہ ہیں وہ تم پہ حلال کردیے گئے، تفصیل اس کی بعد میں آجائے گی، اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ: سوائے ان کے جو تم پہ پڑھے جاتے ہیں،اس کا اشارہ آنے والی آیت کی طرف ہے کہ جن کی عنقریب تم پہ تلاوت کی جائے گی وہ ان سے مستثنیٰ ہیں، غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ: اس حال میں کہ تم شکار کو حلال قرار دینے والے نہ ہو، وَاَنْتُمْ حُرُمٌ: اس حال میں کہ تم محرِم ہو۔حُرُم حرام کی جمع ہے،یعنی بہیمۃ الأنعام کے اندر چونکہ شکاری جانور بھی آئیں گے، جو اَنعام کے مشابہ ہیں وہ تمہارے لیے حلال کردیے گئے،لیکن اتنی بات ہے کہ اِحرام کی حالت میں تم شکار کو حلال نہ قرار دینا۔غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ: اس حال میں کہ تم نہ حلال قرار دینے والے ہو شکار کو، وَاَنْتُمْ حُرُمٌ: حُرُم حرام کی جمع بمعنی مُحْرِم ،اور اسی طرح سے حُرُم کا اطلاق داخلِ حرم پر بھی ہوگا، ”تمہارے محرِم ہونے کی حالت میں تم شکار کو حلال قرار دینے والے نہ ہو“ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ: بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے، حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تُحِلُّوْا: حلال نہ قرار دو شَعَآئِرَ اللّٰہِ: شعائر شعیرہ کی جمع ،شعیرہ علامت کو کہتے ہیں۔اللہ کی علامات، یعنی اللہ کے دین کی علامات، ایسی چیزیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام میں سے کسی حکم کی تعیین کے لئے بطور نشان کے متعین کی ہوئی ہیں، جو دین کی علامتیں ہیں، جن کو دیکھ کے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز دینِ اسلام کی چیز ہے۔حلال قرار نہ دو کا مطلب یہ ہے کہ ان کا احترام کرو، ان کی حرمت کے خلاف ان سے کوئی برتاؤ نہ کرو، جس کا حاصل ترجمہ یہ ہوگا کہ بے ادبی نہ کرو اللہ کے شعائر کی، لَا تُحِلُّوْا کا یہاں مفہوم یہ ہے، ان کا احترام کرو، ان کی حرمت کا لحاظ رکھو، ان کو حلال نہ قرار دو کہ ان کی حرمت کی زائل کردو، بے ادبی نہ کرو اللہ کے دین کی نشانیوں کی، وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ: شعائر اللہ کے اندر بہت ساری چیزیں شامل ہوگئیں جن میں سے بعض کا خصوصیت کے ساتھ ذکر آ رہا ہے، وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ: اور نہ بے ادبی کیا کرو شہر حرام کی، نہ حلال قرار دو شہر حرام کو، حرمت والے مہینے کو، اس کا مصداق چار مہینے ہیں، رجب، ذیقعد، ذی الحج، محرم، ان کو حلال قرار نہ دو، یعنی ان کا بھی ادب کرو، ان کے اندر بھی ان کے ادب کے خلاف کوئی حرکت نہ کرو، جیسے لڑائی کی ممانعت کردی گئی، تو اگر تم اَز خود لڑائی چھیڑو گے، چھیڑ چھاڑ کرو گے تو ان کے احترام کے خلاف ہے، وَلَا الْهَدْیَ: اور نہ حلال قرار دو ہدی کو، یعنی ہدی کی بھی بے ادبی نہ کرو، ھدی سے مراد وہ جانور ہیں جن کو بیت اللہ کی طرف بطور قربانی کے بھیجا جائے، یہ بھی عام ہیں اور ان میں سے وَلَا الْقَلَآئِدَ: اس کا ذکر خاص طور پہ کردیا۔قلائد قِلادۃ کی جمع ہے، قلادہ کہتے ہیں اس پٹے کو جو جانور کے گلے کے اندر ڈال دیا جاتا ہے، یا عورت جو ہار پہنتی ہے اس کو بھی قلادہ کہہ دیتے ہیں، یہاں وہ پٹے مراد ہیں، اور مضاف اس سے پہلے محذوف ہے

وَلَا الْقَلَآئِدَ، قلادے والے جانوروں کو بھی حلال قرار نہ دو، جن کے گلے کے اندر پٹہ ڈالا ہوا ہے بطور نشانی کے، وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ: آٰمِّيْنَ یہ اَمَّ يَؤُمُّ سے ہے قصد کرنے کے معنی میں۔ اور نہ حلال قرار دو ان لوگوں کو جو کہ قصد کرنے والے ہیں بیتِ حرام کا، قصد کرنے والے ہیں حرمت والے گھر کا، بیتِ حرام سے بیت اللہ مراد ہے، آٰمِّيْنَ قاصدین کے معنی میں، ان کی بھی بے ادبی نہ کرو، ان کی بھی عزت کا خیال کرو، ان کا احترام کرو، تو آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ کا مصداق ہوں گے وہ لوگ جو کہ حج یا عمرہ کی نیت کے ساتھ بیت اللہ کی طرف سفر کر رہے ہیں، يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا: قصد کرنے والے ہیں بیت اللہ کا طلب کرتے ہیں وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا۔ وَاِذَا حَلَلْتُمْ: اور جس وقت تم احرام سے نکل جاؤ، جب تم حلال ہو جاؤ۔ حلال ہونا یہ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے مقابلے میں ہے۔ جس وقت تم احرام سے نکل جاؤ، فَاصْطَادُوْا: پھر تم شکار کر لیا کرو۔ اِصْطَادَ يَصْطَادُ: شکار کرنا۔ جب تم حلال ہو جاؤ تو پھر شکار کر لیا کرو، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: شَنَاٰنُ: عداوت۔ نہ برانگیختہ کرے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس سبب سے کہ انہوں نے روکا تمہیں مسجدِ حرام سے، عداوت اس سبب سے کہ انہوں نے روکا تمہیں مسجدِ حرام سے، یہ عداوت تمہیں برانگیختہ نہ کرے کہ تم حد سے بڑھ جاؤ، حد سے نکلنے پر تمہیں برانگیختہ نہ کرے، اِعتداء پر برانگیختہ نہ کرے، کہ تم زیادتی کرنے لگ جاؤ اس بات پہ برانگیختہ نہ کرے، وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى: ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو نیکی پر اور تقویٰ پر۔ تعاون: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ یہ لفظ عون سے لیا گیا ہے۔ اعانت: مدد کرنا۔ تعاون: آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ''آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو نیکی اور تقویٰ پر'' وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ: اور نہ ایک دوسرے کی مدد کیا کرو گناہ پر اور ظلم پر، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا والے ہیں۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ: حرام کر دیا گیا تم پر میتہ، یعنی میتہ کا کھانا، وَالدَّمُ: اور خون، خون سے یہاں دمِ مسفوح مراد ہے، جیسے دَمًا مَّسْفُوْحًا کی قید سورۂ انعام میں آئے گی، بہنے والا خون، جو رگوں وغیرہ کے کٹنے سے خون بہنے لگ جاتا ہے، وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ: اور حرام کر دیا گیا تم پر خنزیر کا گوشت، وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: اور حرام کر دی گئی تم پر وہ چیز کہ آواز بلند کی جائے اللہ کے غیر کے لئے اس پر، اِہلال آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں، وَالْمُنْخَنِقَةُ: اور حرام کر دیا گیا وہ جو گلا گھٹ کے مر جائے، ایسا جانور جو کہ گلا گھٹنے کی وجہ سے مر جائے۔ خَنَقَ گلا گھونٹنے کو کہتے ہیں، اِنْخِنَاق کا معنی ہوتا ہے گلا گھٹ جانا، تو مُنْخَنِقَہ وہ جانور ہو جائے گا جس کا گلا گھٹ جائے، وَالْمَوْقُوْذَةُ: چوٹ لگایا ہوا۔ وَقَذَ مارنے کو کہتے ہیں۔ چوٹ لگانے سے جو مر جائے، وَالْمُتَرَدِّيَةُ: گرنے والا، جو پہاڑ سے، چھت سے، کسی بلند جگہ سے گرنے کی بنا پر مر جائے، وَالنَّطِيْحَةُ: جس کے سینگ مارا گیا ہو یا ٹکر ماری گئی ہو، ٹکر لگنے سے مر جائے، وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ: اور حرام کر دیا گیا وہ جس کو درندہ کھا جائے، جیسے بلّی نے مرغی پکڑی آدھی کھا لی آدھی چھوڑ دی، تو جو بقیہ ہے وہ حرام ہے، اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ: اس کا تعلق یا تو الْمُنْخَنِقَةُ سے لے کے مابعد کے ساتھ لگایا گیا ہے، یا مَآ اَكَلَ السَّبُعُ کے ساتھ لگایا گیا ہے، اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ مگر جس کو تم ذبح کر لو، یعنی اگر کسی جانور کا گلا گھٹ گیا، گلا گھٹنے کی بنا پر وہ تڑپنے لگ گیا، قریب ہے کہ وہ مر جائے، لیکن تم نے زندگی زندگی میں اس کو ذبح کر لیا، تو چاہے وہ منخنقہ ہے لیکن ذبح ہو جانے کے بعد وہ حلال ہو گیا، کہ اگر تم ذبح نہ کرتے تو وہ

مرجاتا، لیکن زندگی کے آثار اس میں موجود تھے کہ تم نے ذبح کرلیا پھر وہ حلال ہے، اسی طرح سے چوٹ اس کے لگ گئی، تڑپنے لگ گیا، اور قریب تھا کہ وہ مرجائے، اور اس کو ذبح کرلیا جبکہ زندگی کے آثار اس میں تھے، تو ایسی صورت میں پھر وہ حلال ہوجائے گا۔ متردیہ بھی اسی طرح سے کہ بلندی سے کوئی جانور گر گیا اور گرنے کی بناء پر اس کے اتنی چوٹ لگی، قریب ہے کہ مرجائے، لیکن اس میں حرکت باقی تھی، حیات کے آثار تھے تو ایسی صورت میں ذبح کرلیا جائے تو وہ بھی حلال ہے۔ نطیحہ بھی اسی طرح سے، کہ ایک جانور نے دوسرے کے سینگ مارا، ٹکر ماری، اور وہ اس ٹکر کے ساتھ قریب الموت ہوگیا، تو ایسی صورت میں اگر اس کو ذبح کرلیا جائے جب اس میں زندگی کے آثار ہوں تو وہ بھی حلال ہے۔ درندے نے کسی جانور کو پکڑ لیا زخمی کردیا، لیکن آپ نے چھڑا لیا، اور ابھی وہ زندہ ہے کہ اس کو ذبح کرلیا، تو اس صورت میں وہ حلال ہوجائے گا۔ اور اگر ذبح کرنے کی نوبت نہیں آئی، گلا گھٹنے کی بنا پر جانور مرگیا اس کی زندگی نکل گئی، حیات ختم ہوگئی، چوٹ کے ساتھ وہ مرگیا، اسی طرح سے دوسری صورتیں جو آپ کے سامنے ذکر کی گئی ہیں، یا درندے نے اس کو کھایا اور اس کی جان نکل گئی، وہ مرگیا تو پھر بقیہ چیز حلال نہیں ہے، اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ: مگر جس کو تم ذبح کرلو۔ اور یا اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کا تعلق مَآ اَكَلَ السَّبُعُ کے ساتھ ہی ہے، اور پہلے لفظوں کے مفہوم میں موت داخل ہے، کہ منخنقہ کہیں گے ہی اسے جو گلا گھٹنے کی بنا پر مرجائے، اور اس کے بعد پھر ذبح کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ موقوذہ کہیں گے ہی اس جانور کو جو چوٹ لگنے کی بنا پر مرجائے، اور اسی طرح سے متردیہ اور نطیحہ، تو جب اس کے اندر موت کا مفہوم لے لیا جائے گا تو پھر اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کی گنجائش نہیں رہے گی، تو پھر اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کا تعلق صرف مَآ اَكَلَ السَّبُعُ کے ساتھ ہوجائے گا، کہ جس جانور کو جس حیوان کو کوئی درندہ کھالے اور تم پھر اس کو زندگی میں ذبح کرلو تو ایسی صورت میں پھر وہ تمہارے لیے حلال ہے، اور اگر ذبح نہ کرسکو تو پھر حلال نہیں ہے، لیکن اس میں اتنی قید ہوگی، فقہ کے اندر آپ پڑھیں گے، ''ہدایہ رابع'' کے اندر تفصیل آئے گی کہ اگر درندے نے اس جانور کو اتنا زخمی کردیا کہ اگر آپ اس کو ذبح نہ کریں تو وہ اتنی دیر تک ہی زندہ رہ سکتا ہے جتنی دیر تک آپ کسی اچھے جانور کو ذبح کرنے کے بعد رگیں کاٹنے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں تو وہ تڑپتا ہے، اگر اس میں اتنی سی حیات ہے جتنی کہ مذبوحہ میں ہوتی ہے پھر اس کے ذبح کرنے کی گنجائش نہیں، پھر ذبح کروگے بھی تو حلال نہیں، البتہ اگر اتنا زخمی کردیا کہ وہ بچ تو نہیں سکتا لیکن ذبیحہ سے زیادہ دیر تک وہ زندہ رہ سکتا ہے، ایسی صورت میں اگر اس کو ذبح کرلیا جائے گا تو پھر وہ حلال ہے، مثلاً بلی نے پنجہ مارا اور مرغی کا پیٹ پھاڑ دیا، اور آپ جانتے ہیں کہ پیٹ پھٹنے کے بعد وہ بچے گی تو نہیں، لیکن وہ گھنٹہ دو گھنٹے چار گھنٹے زندہ رہ سکتی ہے، فوراً اس کی جان نہیں نکلے گی، ایسی صورت میں اگر اس کو ذبح کرلیا جائے اور اس کی رگیں کاٹ لی جائیں تو وہ مرغی حلال ہوجائے گی، لیکن اگر بلی نے اس کو اس طرح سے جھپٹا ہے کہ اس کا سر ہی توڑ کے لے گئی اور گردن اس کی کٹ گئی، اب اگرچہ ابھی مرغی تڑپتی پھرتی ہے، چلتی پھرتی ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب اس میں زندگی اتنی سی ہے کہ جیسے آپ اگر اچھی مرغی کو پکڑ کے اس کی رگیں کاٹتے تو جتنی دیر وہ تڑپا کرتی اتنی دیر ہی وہ تڑپے گی، اس سے زیادہ وہ نہیں زندہ رہ سکتی، ایسی صورت میں اگر اس کو پکڑ کے اس کی بقیہ گردن جو بچی ہوئی ہے اس کو اگر آپ ذبح کریں گے رگیں کاٹیں گے تو یہ حلال نہیں ہے۔ تو اس میں معیار یہی ذکر کیا فقہاء نے کہ اگر اس زخمی جانور میں

مذبوحہ جیسی حیات ہے پھر تو ذبح کرنے کی گنجائش نہیں، پھر وہ حلال نہیں ہے، البتہ اگر مذبوحہ سے زائد اس میں حیات ہو یعنی چاہے زخمی ہونے کے بعد اب وہ بچ نہیں سکتا، لیکن مذبوحہ سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہے، اس میں حیات کے آثار مذبوحہ سے زیادہ ہیں، پھر اس کو اگر ذبح کر لیا جائے گا تو ٹھیک ہے، اور اگر اس کے ویسے ہی بچنے کا امکان ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ مرجائے تو پھر تو بدرجۂ اولیٰ ذبح کرنے سے حلال ہو جائے گا، اتنا سا زخمی ہو گیا کہ وہ بچ سکتا ہے، ضروری نہیں کہ یہ مرے، ایسی صورت میں ذبح کر لیں گے تو بھی ٹھیک ہے، تو مذبوحہ سے زیادہ اگر حیات ہو تو پھر ذبح کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، اگر اس میں اتنا سا اضطراب ہے جتنا کہ مذبوحہ میں ہوا کرتا ہے، اور وہ اس سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا جتنی دیر تک کہ ذبیحہ رہتا ہے، تو پھر اس کے ذبح کرنے کی گنجائش نہیں، پھر یوں سمجھو کہ حکماً وہ مرچکا۔ تو اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے اندر اس تفصیل کو آپ نے مستحضر رکھنا ہوگا۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: نُصب گاڑے ہوئے پتھروں کو کہتے ہیں، یہ نُصب اگر جمع ہے تو اس کا مفرد آئے گا نصاب، اور اگر یہ مفرد ہے تو اس کی جمع آتی ہے اَنصاب، دونوں طرح سے اس لفظ کو ذکر کیا گیا ہے، نصب کو جمع بنالیں تو نصاب اس کا مفرد آئے گا جیسا کہ کتاب کُتب کتب جمع ہے اور کتاب اس کا مفرد آ گیا، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ اس کو مفرد کہیں اور اس کی جمع اَنصاب آجائے گی، اَنصاب کا لفظ بھی قرآنِ کریم میں استعمال ہوا ہوا ہے۔ "اور حرام کی گئی ہے وہ چیز جو ذبح کی جائے نصب پر" وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ: اَزلام یہ زَلَم کی جمع ہے اور زلم کہتے ہیں تیر کو، اور استقسام: قسمت طلب کرنا، یا حصہ طلب کرنا۔ اور یہ بھی حرام کر دیا گیا ہے کہ تم قسمت طلب کرو تیروں کے ساتھ، فال نکالو، مشرکین کی جس طرح سے عادت تھی کہ کوئی کام کرنا ہوتا تو کچھ تیر رکھے ہوتے تھے فال کے، جن میں سے کسی پہ "نَعَمْ" لکھا ہوتا، کسی پہ "لَا" لکھا ہوتا، کسی پہ ہوتا "اَمَرَنِیْ رَبِّیْ"، کسی پہ ہوتا "نَهَانِیْ رَبِّیْ"، تو پھر وہ فال نکالتے کہ اس میں سے ایک تیر کھینچتے تو جو کچھ اس کے اوپر لکھا ہوتا اس کے مطابق عمل کرتے، "یہ بھی تم پہ حرام کر دیا گیا"۔ یا استقسام بالازلام کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ مشترکہ اُونٹ وغیرہ ذبح کر کے اس کے گوشت کو جوئے کے طور پر تقسیم کیا کرتے تھے، تو یہ جوئے کے تیر ہیں، کہ دس آدمی اکٹھے ہو جاتے، دس ہی تیر ہوتے، کسی پہ کتنا حصہ لکھا ہوتا، کسی پہ کتنا حصہ لکھا ہوتا، کسی کو خالی چھوڑا ہوا ہوتا، تو ایک ایک کے نام پر تیر نکالتے جاتے، جس کے نام پر خالی تیر نکل آتا گویا کہ وہ ہار گیا، اس کو گوشت کا کوئی حصہ نہ ملتا، اور جس کے نام پہ جو تیر نکلا اس کے اوپر جتنا حصہ لکھا ہوا ہوتا اتنا اس کو دے دیا جاتا، تو بعض جیت جاتے تھے حصے سے زائد ان کو گوشت مل جاتا تھا، مثلاً پیسے تو برابر برابر ڈالے لیکن کوئی بالکل محروم ہو گیا، کسی کو اس کے حصے سے زائد مل گیا، یہ جوا ہے، میسر ہے، تو استقسام بالازلام کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے۔ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ: یہ گناہ ہے، یعنی استقسام بالازلام یا جو اَحکام ذکر کیے گئے ہیں ان کی خلاف ورزی یہ فسق ہے، فسق سے یہاں وہ فقہاء والا مراد نہیں جو کفر سے نیچے درجے کا ہوتا ہے، بلکہ یہ فسق عام ہے جو نافرمانی اور بغاوت کے معنی میں ہے، جس کے اندر کفر، شرک بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اَلْیَوْمَ یَىِٕسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِیْنِكُمْ: آج مایوس ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تمہارے دین سے، فَلَا تَخْشَوْهُمْ: پس تم ان سے اندیشہ نہ کیا کرو، وَاخْشَوْنِ: اور مجھ سے ڈرو، اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا، وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ: اور اپنی نعمت تم پہ پوری کر دی، وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اور میں نے تمہارے

لیے اسلام از روئے دِین کے پسند کرلیا۔ فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ: پھر جو شخص مجبور کر دیا گیا بھوک میں، غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ: اس حال میں کہ وہ کسی گناہ کی طرف میلان کرنے والا نہ ہو۔ مُتَجَانِف جَنَف سے ہے، میلان۔ گناہ کی طرف میلان کرنے والا نہ ہو، فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ مائدہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی، بلکہ سرورِ کائنات ﷺ کی حیات کے آخری دور کی یہ سورت ہے، آپ کے سامنے پہلی جو بڑی بڑی سورتیں گزری ہیں بقرۃ، آل عمران، نساء، وہ بھی مدنی تھیں، اس لئے اِن سورتوں کے اندر کثرت کے ساتھ احکام مذکور ہوئے ہیں، سورۂ بقرۃ میں فروعی احکام بھی تھے اصول کا ذکر بھی تھا، آل عمران میں زیادہ تر اصولی احکام تھے جن کا تعلق عقائد اور نظریات کے ساتھ تھا اور باطل کے رد کرنے کے ساتھ تھا اِحقاقِ حق کے ساتھ تھا، یہ گزرے ہیں، اور پھر سورۂ نساء میں بھی احکام کی بہت ساری جزئیات آئی تھیں، فروعی احکام مذکور تھے، خاص طور پر وہ جن کا تعلق آپس کے معاملات اور معاشرت سے تھا، تفصیل آپ کے سامنے گزر چکی، سورۂ مائدۃ کے اندر بھی احکام کثرت کے ساتھ آرہے ہیں، دیگر مباحث بھی آئیں گی لیکن احکام بھی کثرت سے آئیں گے، اور یہ احکام بھی اکثر فروعی ہیں، اور اصولی مباحث بھی ہوں گی۔ اور سورۂ نساء کی آخری آیت آپ کے سامنے آئی تھی یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا: اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، سیدھے راستے سے نہ بھٹک جاؤ، تو اگلی سورت اسی قسم کے احکام پر ہی مشتمل ہے جو آپ کو ضلالت اور گمراہی سے بچانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیے جارہے ہیں۔

''ایمان'' کا مفہوم

پہلی آیت یوں سمجھئے کہ سورت کے لئے متن کا درجہ رکھتی ہے، ''اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کیا کرو'' یہ ایک جامع عنوان ہے، ''ایمان والو!'' کا لفظ کہہ کر جو خطاب کیا تو آپ کے سامنے پہلے پارے میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا (سورۂ بقرۃ: ۱۰۴) آیت جس وقت آئی تھی تو اس وقت آپ کے سامنے ایمان کا مفہوم ذکر کیا تھا، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا عہد کرلیا، وہ گویا کہ مؤمن بن گیا تو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے لفظ کے ساتھ وہی عہد یاد دلایا جارہا ہے، کہ جنہوں نے اطاعت کا عہد کیا ہے ہم انہیں کہتے ہیں کہ اب عہدوں کی پابندی کرو، یہ عنوان اختیار کرنے کے ساتھ گویا کہ ایفائے عہد کی ترغیب بھی ہوگئی، کہ جب تم نے اللہ تعالیٰ سے اطاعت کا عہد کرلیا، ایمان لے آئے، اور ایمان لے آنا یوں کہہ دینا کہ ''آمنت باللہ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اللہ کے سب احکام کو قبول کرلیا۔ بظاہر دیکھنے میں یہ عنوان مختصر سا ہے، لیکن یہ عنوان

ایسے ہی ہے کہ جس طرح سے ایک شخص کسی لڑکی کے ساتھ نکاح کرتا ہے، تو نکاح کا ظاہر اتنا سا ہی ہے: نَکَحْتُ قَبِلْتُ، ایک طرف سے ہوا کہ میں نے تیرے ساتھ نکاح کر دیا، دوسرے نے کہہ دیا کہ قبول کیا، تو نکاح ہو گیا، اب دیکھنے میں اگرچہ یہ عنوان مختصر سا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ازدواجی زندگی کی پوری ذمہ داریوں کو انسان قبول کر لیتا ہے اس ''قَبِلْتُ'' کہنے کے ساتھ، اب کسی ذمہ داری سے اگر وہ جان چھڑاتا ہے یہ کہتا ہوا کہ میں نے تو اس کا عہد نہیں کیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاح کے مفہوم کو نہیں سمجھتا، مثلاً جس وقت وہ لڑکی اس کے گھر چلی جائے گی تو وہ کھانے کے لئے مانگے گی، اُس کو کپڑے چاہئیں، اُس کو اُس کے حال کے مناسب رہائش کی ضرورت ہے، اب جس وقت وہ کسی چیز کا مطالبہ کرے، کھانے کا، پینے کا، کپڑے کا، رہنے کا، تو خاوند آگے سے یہ عذر کرے کہ میں نے تو ان چیزوں کا تیرے سے کوئی عہد نہیں کیا، میں نے تو تجھے قبول کیا ہے، اب دنیا کی ہر عدالت اس کو جھوٹا قرار دے گی، اور ہر سمجھدار اسے کہے گا کہ اس پاگل کو یہ معلوم نہیں کہ اس قبول کرنے کے پیٹ میں کیا کیا پڑا ہوا ہے، جس وقت آپ نے یہ کہہ دیا کہ میں نے قبول کیا، اُس کا کپڑا بھی آپ نے اپنے ذِمّے لے لیا، اُس کی روٹی بھی آپ نے اپنے ذِمّے لے لی، اور اس کی دیگر ضروریات بھی آپ نے اپنے ذِمّے لے لیں، اس لئے ''قَبِلْتُ'' کے تقاضے کے ساتھ ہی ان سب کا پورا کرنا آپ کے ذِمّے ہے۔ بالکل اسی طرح سے جس وقت ایک شخص ''لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ کر مؤمنین کی صف میں شامل ہوتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کا ''قَبِلْتُ'' ہے، کہ اللہ کے سارے احکام کو قبول کر لیا، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے وصول کرنے کا ذریعہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، کہ جو کچھ یہ کہیں گے میں اُن کو اللہ کا حکم سمجھتے ہوئے پورا کروں گا، بس یہ ہے بنیادی کلمہ جس کے ساتھ ایک شخص کافروں کی صف سے نکل کر مؤمنوں کی صف میں آتا ہے، تو جب یہ لفظ اس بات پر مشتمل ہو گئے کہ احکام سارے کے سارے قبول کیے جائیں گے، تو یہ عنوان اختیار کر کے آپ کو آپ کا یہی اقرار یاد دلایا ہے کہ جنہوں نے اطاعت کا عہد کیا ہے انہیں کہا جا رہا ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ، کہ اب عقود کو پورا کرو، عہود کو پورا کرو۔

''عقود'' اور ''عہود'' کا مصداق

''عقود'' اور ''عہود'' سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس میں تین قسم کے مفہوم شامل ہو سکتے ہیں، تمام کے تمام احکامِ شریعت، وہ بھی عقود میں آ گئے، کیونکہ وہ اللہ اور بندے کے درمیان معاہدے ہیں، کہ بندہ جس وقت ایمان قبول کرتا ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہے کہ میں ان احکام کی بجا آوری کروں گا، اور میں ان کو پورا کروں گا، ان پر عمل کروں گا، عقود کا مصداق یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ اے ایمان لانے والو! اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تمہیں ہدایات دی جاتی ہیں، جن کے پورا کرنے کا تم نے اللہ کے ساتھ معاہدہ کیا ہے ایمان لانے کے ضمن میں، اب اُن احکام کی پابندی کرو، اور اُس معاہدے کے پابند رہو۔ اور اسی طرح سے ''عقود'' اور ''عہود'' کا مصداق وہ ''عہود'' بھی ہو سکتے ہیں جو اپنے ذِمّے خود لازم کر لیے جاتے ہیں، جس طرح سے آپ نے کسی کام کے کرنے کے لیے قسم کھالی، بشرطیکہ وہ جائز کام ہو، کیونکہ اگر جائز نہیں پھر تو شریعت کے تقاضے کے مطابق اس قسم کو توڑا جائے گا اور کفارہ دیا جائے گا، وہ کام نہیں کیا جائے گا، لیکن اگر وہ جائز ہے تو قسم کھانے کے بعد آپ اُس کے پابند ہو گئے، (جیسے) نذر

مان لی، اپنے اوپر خود آپ نے کوئی چیز لازم کر لی، تو "عہود" کا مصداق وہ نذور بھی ہو سکتی ہیں، ان کا ایفاء بھی ضروری ہے۔ اسی طرح سے عقود کا مصداق وہ معاملات بھی ہیں جو دو فرد آپس میں طے کر لیں، کچھ لینا کچھ دینا کر کے جو آپس میں عہد کر لیا جاتا ہے، جس میں بیع بھی آ گئی، اجارہ بھی آ گیا، اور اس قسم کی دوسری چیزیں جو آپس میں عہد معاہدے کر لیے جاتے ہیں، چاہے وہ دو افراد کے درمیان میں ہوں، چاہے دو قوموں کے درمیان میں ہوں، چاہے دو جماعتوں کے درمیان میں ہوں، چاہے دو حکومتوں کے درمیان میں ہوں، دو ملکوں کے درمیان میں ہوں، جتنے آپس میں معاہدات کیے جاتے ہیں عقود کا مصداق وہ بھی بن سکتے ہیں، تو اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان معاہدات کی بھی پابندی کرو۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لفظ جمیع احکام کے لئے جامع ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکام ہیں وہ بھی "عقود" کا مصداق بن گئے، اور اسی طرح سے انسان اپنے اُوپر جو چیزیں لازم کر لیتا ہے قسم اور نذر کے ذریعے سے، وہ بھی "عقود" کا مصداق ہو گئے، اور معاملات میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جو عقد اور عہد ہو جاتا ہے، چاہے وہ بیع کے ضمن میں ہے کہ فلاں چیز دوں گا فلاں چیز لوں گا، چاہے وہ اجارے کے ضمن میں ہے اور اسی طرح سے دوسرے معاملات، یا دو جماعتیں آپس میں کسی بات پہ معاہدہ کرتی ہیں، یا دو ملک آپس میں کسی بات پہ معاہدہ کرتے ہیں، ان سب کے ایفاء کی اِس کے اندر تاکید کر دی گئی، تو یہ آیت گویا کہ اس سورت کے لئے بطورِ متن کے ہے، باقی جتنے احکام آئیں گے وہ سارے کے سارے اس کے لئے شرح کا درجہ رکھتے ہیں۔

"اَنعام" اور "اَنعام" کے مشابہ چوپایوں کا حکم

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ: اب یہ احکام دینے شروع کیے۔ اَنعام: چوپائے جو کہ گھروں کے اندر رکھے جاتے ہیں، وہ تو یقیناً حلال ہیں، ان کے اندر تو کوئی حرمت کی بات ہے ہی نہیں، بھیڑ ہو گئی، بکری ہو گئی، گائے بھینس اونٹ ہو گئے، یہ "اَنعام" کا مصداق ہیں یہ حلال ہیں، اور "بہیمہ" عام ہے، یہ مطلقاً چوپائے کو کہتے ہیں، تو بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ میں اضافت تشبیہی مراد لینے کے بعد اس کا معنی یوں کیا جائے گا، کہ وہ وحشی چوپائے جو "اَنعام" کے مشابہ ہیں وہ تمہارے لئے حلال کر دیے گئے، "اَنعام" کے مشابہ کس بات میں؟ یعنی غیر شکاری ہونے میں، لہٰذا جنگل کا جو جانور شکاری نہیں ہے، نباتات کھا کر گزارہ کرتا ہے، اپنے منہ کے ساتھ شکار نہیں کرتا، وہ "اَنعام" کے مشابہ ہے، جب وہ "اَنعام" کے مشابہ ہو گیا تو وہ بھی حلال۔ ہاں! البتہ بعض چوپائے ایسے ہیں کہ جو "اَنعام" کے مشابہ ہیں، غیر شکاری ہیں، شکار نہیں کرتے، اپنے دانتوں کے ساتھ وہ شکار کر کے نہیں کھاتے، لیکن حدیث شریف کی دلیل کے ساتھ ان کو حرام قرار دے دیا گیا، وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے، جس طرح سے گدھا ہے، گدھا شکاری جانور نہیں ہے، یہ اپنے منہ کے ساتھ شکار نہیں کرتا، تو غیر شکاری ہونے میں یہ "اَنعام" کے مشابہ ہے، لیکن حدیث شریف میں آ گیا کہ کہ گھریلو گدھا حرام ہے،[1] تو اس لئے اس کو اس سے مستثنیٰ کر لیا جائے گا، خچر اور گدھا دونوں اس میں شامل ہیں۔ باقی! جنگلی اور وحشی جانوروں میں معیار یہی ہوگا کہ جو درندے نہیں وہ "اَنعام" کے مشابہ ہیں، جب "اَنعام" کے مشابہ ہیں تو حلال ہیں، ہاں! البتہ ان میں سے بعض چیزیں

---

(۱) بخاری ۲/ ۸۳۰ باب لحوم الحمر الانسیة۔ مشکوٰۃ ۲/ ۳۵۹ باب ما یحل اکلہ وما لا یحل۔ ولفظ الحدیث: عَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ

حرام ہوں گی جن کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے، کہ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ میں سے کوئی مر گیا یعنی میتہ ہو گیا، یا مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کا مصداق بن گیا، یا منخنقة، متردیة، موقوذة، نطیحة کا مصداق بن گیا، یا مَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ کا مصداق بن گیا تو پھر یہ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ بھی حلال نہیں ہے، تو اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے، "مگر جو تم پر پڑھے جاتے ہیں۔"

حالتِ اِحرام میں شکار کی ممانعت

اور بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کے اندر چونکہ شکاری جانوروں کی حلت کا ذکر آ گیا، کہ یہ شکاری جانور جو کہ "اَنعام" کے مشابہ ہیں تمہارے لئے حلال ہیں، اس میں بھی ایک پابندی لگا دی گئی، کہ ان کا پکڑنا، شکار کرنا اور کھانا تمہارے لئے اُس وقت حلال ہے جب تم نے احرام نہ باندھا ہوا ہو، اسی طرح سے روایات کی دلیل کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ وہ جانور حرم میں نہ ہو، اگر وہ جانور حرم میں ہو گا پھر بھی پکڑنا ٹھیک نہیں، اور اگر تم احرام کی حالت میں ہو پھر بھی شکار کرنا تمہارے لئے حلال نہیں ہے، احکام کی تفصیل پوری طرح سے فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، آپ نے خود شکار نہیں کیا کسی کو شکار کرنے کے لئے نہیں کہا، اشارہ نہیں کیا، دلالت نہیں کی، کسی غیر محرِم نے از خود شکار کیا، اور خود ذبح کر کے وہ گوشت اگر محرِم کو دیتا ہے تو وہ کھانا حلال ہے، خود شکار کرنا حلال نہیں، اسی طرح سے شکاری جانور اگر کوئی دوسرا شخص زندہ پکڑ کر محرِم کو دے دے تو اُس کا ذبح کرنا بھی محرِم کے لئے حلال نہیں ہے، اگر محرِم شکاری جانور کو ذبح کرے گا تو وہ بھی "میتہ" کا مصداق ہے، اس کا کھانا پھر کسی کے لئے جائز نہیں ہے، گھریلو جانور کو محرِم ذبح کر سکتا ہے، مرغی ذبح کر سکتا ہے، بکری ذبح کر سکتا ہے، شکاری جانور کو ذبح نہیں کر سکتا۔ تو غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کا مصداق یہ ہو گیا، کہ شکاری جانور تمہارے لئے حلال کر دیئے گئے، وحشی جانور تمہارے لئے حلال ہیں، لیکن احرام کی حالت میں تم شکار کو حلال نہ سمجھنا، اور اسی کے ساتھ ہی شامل ہو جائے گا کہ جس وقت وہ شکار حرم میں ہو تو بھی اُس کو حلال نہیں سمجھنا، تب بھی شکار کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ: اس میں ان اَحکام کی عظمت آ گئی، کہ اس میں تمہیں کسی قسم کی اینچ پینچ کی اجازت نہیں ہے، کہ اللہ تعالیٰ جو حکم چاہے دے سکتا ہے، اُس کا یہ منصب ہے، اور تمہیں اُس کی پابندی کرنی ہے۔

"شعائرُ اللہ" کی تفصیل اور ان کی تعظیم کا حکم

"اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کو حلال نہ قرار دیا کرو" حلال نہ قرار دیا کرو کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حرمت اور احترام کے خلاف کوئی حرکت نہ کیا کرو، جس کا حاصل ترجمہ آپ کے سامنے کر دیا گیا کہ اُن کی بے ادبی نہ کیا کرو۔ "اللہ کے شعائر" اللہ کے دین کی علامات یعنی جو اپنے ظاہری وجود کے ساتھ اللہ کے دین کی علامتیں ہیں، نماز کو اس میں شامل کیا گیا، اَذان کو اس میں شامل کیا گیا، مساجد کو اس میں شامل کیا گیا، مسنون طریقے کے مطابق داڑھی جو ہے یہ بھی شعائر میں داخل ہے، اللہ کی کتاب شعائر میں داخل ہے، بیت اللہ شعائر میں داخل ہے، صفا مروۃ اللہ کے شعائر میں داخل ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں جن کی تفصیل مختلف جگہوں میں مذکور ہے یہ سب "شعائر" کا مصداق ہیں، ان کی بے ادبی نہ کیا کرو، ان کا احترام کیا کرو، ان کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں اُن کی رعایت رکھا کرو۔ اور خصوصیت سے ذکر کر دیا کہ شہرِ حرام کا ادب کرو، ان کی بے ادبی نہ کرو، کیونکہ ان چار مہینوں کے

اندر لڑائی حرام ہے، اگرچہ اب روایات کی طرف دیکھتے ہوئے بعض مفسرین نے قول کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے، اب ان مہینوں کے اندر لڑائی کرنا جائز ہے، لیکن پھر بھی بہتر یہ ہے کہ ابتدا نہ کی جائے، اگر کوئی چھیڑ چھاڑ کرلے تو پھر مقابلے میں لڑائی کی جاسکتی ہے، جیسے کہ سورۂ بقرۃ کے اندر اس کی تفصیل آئی ہے، اپنی طرف سے ابتدا نہ کرنا آج بھی ادب کا تقاضا ہے اگرچہ وہ حرمت منسوخ ہوگئی، اگر کوئی لڑائی کرے تو پہلے کی طرح حرام نہیں ہے۔ ’’اور ہدی کو حلال قرار نہ دیا کرو‘‘ یعنی اس کا بھی ادب کرو، احترام کرو، اگر بیت اللہ کی طرف کوئی جانور بھیجے جارہے ہیں، تو اُس وقت چونکہ عرب کے اندر مشرک بھی تھے اور مسلمان بھی تھے، اور پہلے جب مشرکوں کو غلبہ تھا تو مسلمانوں کو بیت اللہ تک نہیں جانے دیتے تھے، حتیٰ کہ ایک دفعہ سرورِ کائنات ﷺ بمع قافلہ کے گئے تو حدیبیہ میں روک لیا گیا، آگے نہیں بڑھنے دیا، اور جب مکہ معظمہ فتح ہوگیا تو ابھی مکہ معظمہ میں مشرکوں کی آبادی تھی، اب ایسا ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کے دل میں انتقامی جذبات آجائیں، کہ جب ان کو اقتدار حاصل تھا تو انہوں نے ہمیں بیت اللہ کے پاس نہیں آنے دیا، اب ہمیں اقتدار حاصل ہوگیا ہے تو اب ہم ان کو نہ آنے دیں، ان کے راستے روکیں، اور بیت اللہ کی طرف کوئی قربانی کا جانور لیے آرہا ہو تو چھین لیں، اور اسی طرح سے کوئی احرام باندھے آرہا ہو تو اس کو ماریں، روکیں، تو اللہ تعالیٰ ہدایات دیتے ہیں کہ نہیں! یہ اللہ کے دین کے شعائر اور ہدی اور قلائد، ان کا ادب کرو، اور جو لوگ بیت اللہ کا قصد کرکے آرہے ہیں اپنے خیال کے مطابق اللہ کی رضاجوئی کے لئے، ان کے ساتھ بھی کسی قسم کا تعرض نہ کرو، اگر ایک وقت انہوں نے تمہیں روکا تھا تو تمہیں حوصلہ چاہیے کہ آج تم ان کو اس جذبے سے نہ روکو کہ چونکہ انہوں نے ہمیں نہیں آنے دیا تھا تو ہم بھی نہیں آنے دیں گے، یہ عداوت تمہیں ان حالات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم یہ راستے روک لو۔

کافر کے لئے حرم میں داخلے کا شرعی حکم

اُس وقت تک اِن لوگوں کو آنے جانے کی اجازت تھی، بعد میں پھر ممانعت کردی گئی، اب اگر کوئی مشرک حج کرنے کے لئے جائے بھی تو اس کو روکا جاسکتا ہے، روایات کے اندر اس کی صراحت ہے، حضور ﷺ نے اعلان اپنے حج سے پچھلے سال میں اعلان کروا دیا تھا کہ آئندہ کوئی مشرک حج کرنے کے لئے نہ آئے، اور نہ کوئی ننگے ہونے کی حالت میں بیت اللہ کا طواف کرے،(۱) اب اگر کوئی عیسائی یہودی یا کوئی مشرک بیت اللہ کی طرف عمرہ کرنے کے لئے یا حج کرنے کے لئے جائے تو اُس کو روکا جاسکتا ہے، حرم میں داخل ہونے کی اُس کو اجازت نہیں دی جاتی، موجودہ حکومت جو ہے ان کے نزدیک تو مطلقاً حرم میں داخلہ ہی جائز نہیں ہے، اس لئے جہاں جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتی ہیں سڑکوں پر میں نے دیکھا، وہاں بڑے بڑے بورڈ لکھ کر لگائے ہوئے ہیں، عربی میں اور انگریزی میں ان پر لکھا ہوا ہے کہ اس سے آگے کافر کا داخلہ ممنوع ہے، تو اگر پتہ چل جائے کہ یہ کافر ہے تو وہ پکڑ لیتے ہیں، حرم کے اندر اس کو رہنے نہیں دیتے، اس لئے مرزائیوں وغیرہ کے متعلق نشاندہی ہوجائے تو ان کو گرفتاری ہوجاتی ہے۔

’’ھدی‘‘ کو بھی حلال نہ قرار دو، اور اس طرح سے ’’قلائد‘‘ کو یعنی ’’ذوات القلائد‘‘، وہ جانور جن کے گلوں کے اندر

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۲۰ باب لا یطوف بالبیت عریان/ صحیح مسلم ۱/۴۳۵ باب لا یحج البیت مشرک/ مشکوٰۃ ۲۲۷/۱ باب دخول مکۃ.

پٹے ڈال دیئے گئے ہیں، بطور نشانی کے کہ یہ ہدی ہیں، ''اور نہ ان لوگوں کو حلال قرار دو'' ان کے بھی ادب کے خلاف کوئی حرکت نہ کرو ''جو بیت اللہ کا قصد کر کے آنے والے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُس کی رضا مندی چاہتے ہیں'' یہ علیحدہ بات ہے کہ حقیقت میں کافر ہونے کی بناء پر نہ ان کو فضل ملے نہ رضا مندی، لیکن آ اس جذبے سے رہے ہیں، تو ایسی صورت میں ان کے ساتھ بھی کسی قسم کا تعرض نہ کیا کرو۔ باقی یہ جو ہم نے کہا غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ، جس وقت تمہارا اِحرام ختم ہو جائے گا پھر تمہیں شکار کرنے کی اجازت ہے فَاصْطَادُوْا، بالاتفاق یہ اَمر اِباحت کے لئے ہے، کیونکہ پہلے پابندی لگ گئی تھی کہ جب اِحرام باندھا ہوا ہو تو تم شکار نہیں کر سکتے، تو اِذَا حَلَلْتُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تمہارا اِحرام ختم ہو گیا تو ایسی صورت میں پھر وہ پابندی ختم جائے گی، تمہیں شکار کرنے کی اجازت ہے۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ: کسی قوم کی عداوت تمہیں اِس بات پر برانگیختہ نہ کرے، اور عداوت بھی اس وجہ سے کہ انہوں نے تمہیں مسجدِ حرام سے روکا، اس سے وہی مشرک مراد ہیں جو مانع بنے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو بیت اللہ کے قریب تک نہیں جانے دیتے تھے، ''اس سبب سے کہ روکا انہوں نے تمہیں مسجدِ حرام سے'' یعنی عداوت اس سبب سے، ''یہ عداوت تمہیں برانگیختہ نہ کرے کہ تم حد سے بڑھ جاؤ'' یعنی اگر ایک طرف سے ناجائز حرکت کرتے ہوئے تمہارے حقوق تلف کیے گئے ہیں، تو تمہیں چاہیے کہ جب تمہیں اختیار حاصل ہو گیا تو تم ان کا انتقام لینے کے لئے حد سے تجاوز نہ کرو، ظلم کے مقابلے میں ظلم نہیں ہے، اگر ایک شخص نے ایک وقت تم پر ظلم کیا تمہارے حق تلف کیے تو اس کا یہ معنی نہیں کہ جب تمہیں اقتدار مل جائے تو تم بھی ان کے حقوق تلف کرنا شروع کر دو، اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو غلطی کی ہے، اور تم ایسا کرو گے تو تمہاری بھی غلطی ہوگی، اس ضد کی بنا پر اِعتداء نہ کرنا، حد سے تجاوز نہ کرنا۔

اِنسانی زندگی میں باہمی تعاون کی اہمیت

تَعَاوَنُوْا: ایک دوسرے کی مدد کیا کرو نیکی کے کاموں پر، ''تعاون'' کا مطلب ایک دوسرے کی اعانت، ''عون'' سے یہ لفظ لیا گیا ہے، جیسے ترجمے میں پہلے میں نے ذکر کیا۔ انسان اس دُنیا کے اندر جو زندگی گزارتا ہے تو آپ خیال فرمائیے کہ جس وقت تک ہم آپس میں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اعانت نہیں کریں گے تو کوئی شخص زندگی نہیں گزار سکتا، اللہ تعالیٰ نے انسان کا مزاج مدنی الطبع بنایا ہے، یہ تمدّن کو چاہتا ہے، آپس میں مل جل کر رہنے کو چاہتا ہے، جنگل میں جانور پیدا ہوتے ہیں تو اپنے طور پر گھاس چرتے ہیں، اپنا گھونسلا خود بنا لیتے ہیں، اور اپنا گھر ناو غیرہ کھود کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی طرح سے بچے جنتے ہیں، کھاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی ایسی ہے کہ ایک جانور اکیلا جنگل میں گزارہ کر سکتا ہے، اُس کو کسی دوسری چیز کا احتیاج نہیں ہے، لیکن انسان کی طرزِ معاشرت ایسی ہے کہ اب آپ اندازہ کریں کہ صرف روٹی کے لئے آپ کو کتنے لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے، زمین ہے، اس کے اندر آپ بیج بوئیں گے، ہل چلائیں گے، ہل بنانے والے اور اسی طرح سے دوسرے سارے کے سارے کام کرنے والے، بڑھئی کیا، لوہار کیا، اور کام کرنے والے لوگ سب کا تعاون ساتھ ہوگا، پھر اُس کے کاٹنے کے وقت میں، پھر اُس کو مشینوں میں پیسنے کے وقت میں، آپ دیکھیں گے کہ کئی ایک ایک ضرورت پورا کرنے کے لئے

ساری کی ساری کائنات کی مختلف چیزیں آپ کے اردگرد چکر کاٹتی ہیں، تب جا کے ایک لقمہ تیار ہو کے آپ کے منہ تک آتا ہے تو یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہوا ہے تو آپ کو یہ لقمہ نصیب ہوا۔ کپڑا پہننے کے لئے آپ کو کتنے لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے، کہاں سے یہ رُوئی پیدا ہوتی ہے، یہ تاگا بنتا ہے پھر کس طرح سے چلتا ہوا مشینوں میں سے گزرتا ہوا پھر درزی سے سلائی ہو کر آپ اس کو پہن سکتے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک آدمی دوسرے سے غیر متعلق ہو کر اپنی ساری ضرورتیں پوری کرلے ایسا ممکن ہی نہیں ہے، کہے کہ میں کسی سے کوئی کام نہیں لوں گا، اور اپنی ہر ضرورت خود پوری کرلوں گا، بالکل نہیں! اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے اندر آپس میں ایک دوسرے کی طرف احتیاج کی صفت رکھی ہے، اور یہ احتیاج کی صفت ایسی ہے جو انسان کو انسان کے ساتھ جوڑتی ہے، غریب آدمی کے پاس بدنی قوت ہے تو وہ مال دار آدمی کا محتاج ہے، کہ یہ مجھ سے کام لے اور مجھے پیسے دے تاکہ میں اپنی ضرورت پوری کروں، ایک آدمی کے پاس پیسے ہیں لیکن بدنی قوت نہیں ہے تو وہ غریب آدمی کا مزدور کا محتاج ہے، کہ کوئی شخص آئے میرا کام کرے اور میں پیسے دے کر اس سے یہ کام کروالوں، تو صبح سے لے کر شام تک آپ کی زندگی جتنی بھی چل رہی ہے وہ اسی احتیاج کی بنا پر ایک دوسرے کی طرف ہم متوجہ ہیں، اپنی ضرورت پورا کرنے کے لئے ہم ایک دوسرے سے تعاون حاصل کرتے ہیں تب جا کے زندگی گزرتی ہے۔

تعاون کی جائز اور ناجائز صورتیں

تو اللہ تعالیٰ نے اسی تعاون کو برقرار رکھتے ہوئے یہ اُصول قائم کردیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون تو کرو، اس کے بغیر تو اِنسانی معاشرہ تشکیل ہی نہیں پاسکتا جب تک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں ہوگا، لیکن اس میں بِر اور تقویٰ کی رعایت رکھو۔ نیکی کا مفہوم جہاں پایا جائے، جہاں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا مفہوم پایا جائے وہاں تو ایک دوسرے کے ساتھ اعانت کیا کرو، تعاون کیا کرو، اور اگر کسی جگہ گناہ اور عدوان کی بات آجائے وہاں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں کرنا، روٹی کمانے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرو، کپڑا بنانے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرو، اور بھوک پیاس دُور کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، لیکن اگر ایک آدمی چاہتا ہے کہ میں فلاں گھر سے چوری کر کے لاؤں تاکہ مفت میں مجھے مال مل جائے، وہ آپ سے تعاون چاہتا ہے تو اس بارے میں تعاون نہ کرو، کیونکہ اثم اور عدوان کے بارے میں اگر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگ جاؤ گے، اور چوروں کی ایسی کمیٹیاں بنی شروع ہوجائیں جس طرح سے دوسرے کاروبار کے اندر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ امدادِ باہمی کے اُصول پر اکٹھے ہوتے ہیں، جیب تراش اکٹھے ہونے شروع ہوجائیں، تو آپ جانتے ہیں کہ اِس کے نتیجے میں اِس عالم کے اندر فساد ہی فساد آئے گا، جیسے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، آج کل باقاعدہ یونینیں بنی ہوئی ہیں چور چوروں کے حامی ہیں، جیب تراش جیب تراشوں کے حامی ہیں، اور غلط کار آدمی دوسرے غلط کار کے حامی ہیں، تو انفرادی طور پر ایک شخص اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا، جب وہ جماعت تشکیل پاجاتی ہے تو جتنا وہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ جب بھی دوسرے کے ساتھ تعاون کی نوبت آئے تو دیکھ لیا کرو کہ تمہارے اس تعاون کے اندر کوئی گناہ کا پہلو تو نہیں ہے؟ جس شخص کی تم اعانت کرنے لگے

ہو اُس کے اِس کام کے اندر کوئی ظلم کا پہلو تو نہیں ہے، اگر اُس کے اندر گناہ کا پہلو ہے، ظلم کا پہلو ہے تو پھر قطعاً اُس کی اعانت نہ کرو، ہاں! البتہ اگر اس میں گناہ کا پہلو نہیں ہے اور ظلم کا پہلو نہیں ہے، تو ایسی صورت میں آپس میں تعاون کیا کرو، کیونکہ انسانی معاشرے کے اندر تعاون ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے ساتھ انسان کی زندگی آسانی سے گزر سکتی ہے۔ تو تعاون کے بارے میں گویا کہ یہ حد بندی کردی گئی کہ برّ اور تقویٰ کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے، ایک شخص کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہے، کسی پہلو سے وہ نیکی ہے، چاہے معاشرتی نیکی ہے، دینی نیکی ہے، اخلاقی نیکی ہے، اور وہ تم سے کہتا ہے کہ میرا تعاون کرو، میں یہ کام کروں، تو اُس کی طرف ہاتھ بڑھاؤ، اُس کے ساتھ تعاون کرو۔ لیکن اگر ایک آدمی کسی لڑکی کو اغوا کرنا چاہتا ہے، کسی کا مال چرانا چاہتا ہے، کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے کوئی ایسا گناہ کرنا چاہتا ہے، جو شرعاً جرم ہے، اخلاقاً جرم ہے، معاشرتی جرم ہے، جس کے ساتھ کسی دوسرے کے حقوق تلف ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں پھر اُس کی اعانت نہ کرو، یہ دونوں طرف سے حد بندی کردی گئی تعاون کے لیے، کہ تعاون کس صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ جائز ہے، اور کس صورت میں جائز نہیں ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اور اللہ کا تقویٰ ہی ہے جو انسان کو پورے اَحکام کی بجا آوری پر مجبور کرتا ہے، ''ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے۔''

حرام جانوروں کی تفصیل

اب یہ آیت جو شروع کے اندر آئی تھی، اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ کے لفظ جس کے اندر آئے تھے، تو اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ کی تفصیل اب ان الفاظ میں ذکر کی جارہی ہے۔ ''حرام کردیا گیا تم پر میتۃ'' یہ آیت چونکہ سورۂ بقرۃ کے اندر گزر چکی ہے تو وہاں ان الفاظ کی تشریح بھی آگئی تھی۔ میتہ اُس جانور کو کہتے ہیں کہ جو واجب الذبح تھا لیکن بغیر ذبح کرنے کے مرگیا، واجب الذبح کی قید ہم نے مچھلی اور ٹڈی کو نکالنے کے لئے لگائی، کہ وہ واجب الذبح نہیں ہیں وہ اگر بغیر ذبح کے مرجائیں تو وہ حلال ہیں، جو شرعاً واجب الذبح تھا پھر بغیر ذبح کے مرگیا تو اُس کو میتہ کہیں گے اور یہ بھی حرام ہے۔ وَالدَّمُ: اور بہنے والا خون بھی حرام ہے، دم کے ساتھ مسفوح کی قید سورۂ اَنعام میں لگی ہوئی ہے، یعنی زخم ہونے کے بعد جو خون بہنے لگ جاتا ہے یہ بھی نجس ہے، یہ بھی رگوں کا خون ہے، نجس ہے ناپاک ہے، اس کا استعمال ٹھیک نہیں، ذبح کرتے وقت جو رگیں کاٹی جاتی ہیں تو خون جو اچھل کر نکلتا ہے تو وہ بھی ناپاک ہے، ہاں! البتہ ویسے جو گوشت کے ساتھ تھوڑا بہت خون لگا ہوا ہوتا ہے وہ حرام نہیں ہے، اس لئے اگر گوشت کو بغیر دھونے کے پکالیا جائے تو بالکل ٹھیک ہے، دھونا بطور نظافت کے ہو تو علیحدہ بات ہے، گوشت اگر آپ کسی کپڑے میں لائے ہیں اور کپڑے کے اوپر خون کا نشان لگ گیا وہ بھی پاک ہے، اس کپڑے کو ناپاک نہیں کہیں گے، تو بہنے والا خون ناپاک ہے اور اس کا استعمال ٹھیک نہیں ہے۔
''اور خنزیر کا گوشت'' یہاں چونکہ ماکولات کا ذکر ہے، تو اس کو گوشت کے طور پر ذکر کردیا، ورنہ خنزیر نجس العین ہے اور اِس کا ہر ہر جزء نجس ہے، اُس کا استعمال ٹھیک نہیں ہے، میتہ نجس العین نہیں ہے، اُس کا کھانا حرام ہے یعنی گوشت کا، چمڑا دباغت کرلیا جائے تو پاک ہوجائے گا، اس کی ہڈی رطوبات سے صاف کرلی جائے تو اُس کو استعمال کیا جاسکتا ہے، بال اس کے استعمال کئے جاسکتے ہیں لیکن خنزیر کا کوئی جزء استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِهٖ: اس کی تفصیل بھی آپ کے سامنے آگئی، اس کا قطعی مصداق جس

میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں وہ یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے، جیسے کہ آپ نے عربی تفسیروں کے اندر لفظ پڑھا ہوگا کہ ''مَاذُبِحَ بِاسْمِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰی''(۱) اسم اللات والعزیٰ کے ساتھ اس کو ذبح کر دیا گیا، یہ قطعی حرام ہے جس کے اندر کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں، اور ایک صورت وہ ہے کہ ذبح کرنے سے مقصد ہے کسی غیر اللہ کا قرب حاصل کرنا اُس کی رضا جوئی، لیکن ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھ لی گئی، تو جمہور فقہاء کے نزدیک اور اکثر علماء دیوبند کے نزدیک یہ بھی حرام ہے، جیسے تفصیل آپ کے سامنے آ گئی، لیکن یہ دوسرے درجے میں ہے، بہرحال یہ مجتہد فیہ ہے پہلے کی طرح قطعی نہیں، ''وہ جانور کہ آواز بلند کر دی گئی اللہ کے غیر کے لئے اس کے ساتھ''۔ وَالْمُنْخَنِقَةُ: گلا گھٹ کر مرنے والا جانور، وَالْمَوْقُوْذَةُ: چوٹ لگ کر مرنے والا جانور، وَالْمُتَرَدِّيَةُ: کسی بلند جگہ سے نیچے گر کر مرنے والا جانور، وَالنَّطِيْحَةُ: جس کے سینگ مار دیا جائے ٹکر مار دی جائے ٹکر کھا کر یا سینگ کھا کر مرنے والا جانور، وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ: جس کو درندہ کھا جائے، یہ بھی سارے کے سارے حرام ہیں، اِلَّا مَاذَكَّيْتُمْ: مگر جس کو تم حیات کی موجودگی میں ذبح کر لو، جس کی تفصیل آپ کے سامنے آ گئی۔ وَمَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: اور حرام کر دیا گیا وہ جانور بھی جس کو نُصُبْ پر ذبح کیا گیا ہو، نصب پر ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے، آپ کے ملک میں بھی ایسی چیزیں موجود ہیں کوئی درخت ہے کسی بزرگ کی طرف منسوب ہے، لوگ جاتے ہیں اور وہاں جا کر اُس بزرگ کے نام پر جانور دیتے ہیں، یہ مرغے ورغے چھوڑ دیتے ہیں، جا کے ذبح کرتے ہیں۔

''مَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ'' اور ''مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' میں فرق

اب نُصب پر ذبح کرنا اور مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ، ان دونوں کے درمیان فرق اس طرح سے کیا جائے گا، کہ اگر تو ذبح کرتے وقت اس غیر کا نام بھی لے لیا گیا تو ایسی صورت میں تو مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کا مصداق بن گیا، اور اگر اُس پیر کی قبر پر یا کسی ایسی جگہ پر جو کسی جن کی طرف یا کسی فرشتے کی طرف منسوب قرار دی ہوئی ہے، وہاں جا کر وہ لوگ ذبح کرتے تھے، چاہے پھر ذبح کے وقت غیر کا نام نہ ہی لیا جائے تو بھی وہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ میں شامل ہوگا، دونوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے بات کر رہا ہوں، ایک اِہلال قولی ہے اور ایک اِہلال فعلی ہے، مشرکین کا طریقہ یہی تھا کہ کبھی تو وہ لات اور عزیٰ کا نام لے کر ذبح کرتے تھے، کبھی ان بُت کدوں پر جا کر ذبح کر دیا کرتے تھے، چاہے وہ ذبح کرتے وقت لات عزیٰ کا نام بھی نہ لیں، تب بھی وہ غیر اللہ کے لئے سمجھا گیا اور وہ بھی حرام، اور اسی طرح سے ہمارے ہاں بھی اگر کوئی شخص ذبح کرتا ہے ''بسم اللہ'' پڑھ کر، لیکن ذبح کرتا ہے کسی پیر کی جگہ لے جا کر، نیت اُس کی یہ ہے کہ میں تقرّب کے طور پر ذبح کر رہا ہوں تو مَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ میں یہ بھی شامل ہے۔ لیکن دو درجے میں نے آپ کے سامنے نکال دیئے کہ ایک تو قطعی ہے جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہے، اور ایک ایسا درجہ ہے جس میں نیت اگرچہ یہ ہو، لیکن ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ'' پڑھ لیا جائے تو جمہور فقہاء اور اکثریت علمائے دیوبند کی اس کو بھی پہلے کی طرح حرام قرار دیتی ہے، لیکن اس میں کسی درجے میں اختلاف کی گنجائش ہے بعض چیزوں کی طرف دیکھتے ہوئے، لہٰذا یہ اس

(۱) ای رفع الصوت لغیر اللہ بہ کقولھم: باسم اللات والعزی عند ذبحہ (بیضاوی) والإھلال رفع الصوت وھو قولھم عند الذبح باسم اللّات والعزی (مظھری) ای رفع الصوت لغیر اللہ تعالیٰ عند ذبحہ والمراد بالإھلال ھنا ذکر ما یذبح لہ کاللات والعزی (روح المعانی)

درجے کی نہیں کہ اس کا انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیں، اس میں تاویل کی کسی درجے میں گنجائش ہے۔ مشرکین کے ہاں جو عمل تھا وہ یہی تھا کہ یا تو ذبح کرتے وقت وہ غیر اللہ کا نام لیتے تھے، یا ان کے تھانوں پر جا کر ذبح کر دیا کرتے تھے چاہے وہ غیر اللہ کا نام بھی نہ لیں، اور جانوروں پر اللہ کا نام لینے کا ان کے ہاں رواج ہی نہیں تھا۔ یہ تیسری قسم بعد میں پیدا ہوئی کہ نیت تو کر لی جائے غیر اللہ کی، اور پھر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے ''بسم اللہ'' پڑھ لی جائے، اس قسم کا وجود بعد میں ہوا، جس وقت قرآنِ کریم کی آیات اُتر رہی تھیں اُس وقت مشرکین کے اندر یہ تیسری قسم موجود نہیں تھی، اب خبثِ نیت کی طرف دیکھتے ہوئے جمہور اس کو حرام قرار دیتے ہیں، اور ہمارے اکابر میں سے بھی اکثریت قریب الکل کا یہی قول ہے، چونکہ بعض کی طرف اس کے خلاف قول کی نسبت کی گئی ہے اس لئے میں اس کو مجتہد فیہ حرام قرار دیتا ہوں، پہلے کی طرح اس کو قطعی حرام قرار نہیں دیتا، کہ جس کے انکار کی بناء پر ہم کہہ دیں کہ کُفر آ گیا، اور مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ دونوں کے درمیان فرق بھی ہو گیا کہ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ یہ بھی اِہلال کی ایک صورت ہے لیکن یہ اِہلال فعلی ہے، اور جب زبان کے ساتھ نام لے لیا جائے گا تو یہ اِہلال قولی ہے۔ ''اور حرام کر دیا گیا تم پر کہ تم تیروں کے ذریعے سے تقسیم کرو، یا حصہ طلب کرو، یا قسمت طلب کرو'' یہ مضمون بھی آپ کے سامنے آ گیا۔ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ: یہ سب نافرمانی ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی بغاوت ہے، یعنی جو پیچھے ذکر کیا گیا اُس کی مخالفت، یا یہ استقسام بِالْاَزْلَامِ، یہ فسق ہے، گناہ کا کام ہے۔

تکمیلِ دِین کی نعمت اور اس کا تقاضا

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس دِین کی تکمیل کا احسان جتلایا جا رہا ہے، تاکہ اس کی قدر کرتے ہوئے ہم اس کی پابندی کریں۔ ''آج کافر مایوس ہو گئے تمہارے دِین سے'' کیا مطلب؟ کہ اب تمہارا دین اتنا نمایاں ہو گیا ہے، کہ وہ جو حوصلے بنائے پھرتے تھے کہ ہم اس دِین کو مٹا دیں گے، اب وہ مایوس ہو گئے کہ یہ مٹایا نہیں جا سکتا، اور پہلے جو ان کو توقع تھی کہ ہم کسی طرح سے مسلمانوں سے مصالحت کر کے کچھ اِن سے تبدیل کروا لیں گے، اب وہ تبدیلی کروانے سے بھی مایوس ہو گئے۔ ''پس تم ان سے کوئی اندیشہ نہ رکھو'' اب یہ تمہارے دِین کو مٹا نہیں سکتے؛ ''مجھ سے ڈرتے رہو'' کہ میرے اُحکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دِین کو کامل کر دیا، ہر لحاظ سے کامل ہو گیا، اب اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے، بہت ساری جزئیات صراحتاً بیان کر دی گئیں، ورنہ اُصول ایسے قائم کر دیئے گئے کہ اب ان اُصولوں سے باہر نکل کر کوئی حکم معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لئے جتنے بھی واقعات قیامت تک آتے چلے جائیں گے وہ انہی اُصولوں سے نکلتے آئیں گے جو قرآن اور حدیث کے اندر واضح کر دیئے گئے ہیں۔ ''اور میں نے تم پر اپنی نعمت تام کر دی'' کہ دِین بھی کامل ہو گیا، ظاہری طور پر اس کا غلبہ بھی ہو گیا، یہ بھی اِتمامِ نعمت ہے۔ ''اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو از روئے دِین کے پسند کر لیا'' یعنی ہمیشہ کے لئے، اب اِس کو منسوخ نہیں کیا جائے گا، یہ دِین کا اِکمال اب اس طرح سے ہو گیا ہے، کہ پہلے جو نبی دِین لاتے تھے

اُس زمانے کے اعتبار سے وہ بھی کامل ہوتا تھا، کسی نبی کے لائے ہوئے دین کو اُس دور کے اعتبار سے ناقص نہیں کہہ سکتے، جس قسم کی ضرورتیں اُن کی اُمت کو ہوتی تھیں وہ ساری کی ساری اس میں پوری کردی جاتی تھیں، لیکن اس وقت چونکہ معاشرے میں تنگی تھی، اتنی وسعت نہیں تھی تو تھوڑی سی ضرورتیں ہوتی تھیں، تھوڑے سے اَحکام آ گئے، تو ان کے لئے وہ کامل ہے، لیکن جیسے جیسے معاشرے میں وسعت پیدا ہوتی گئی، تو اُس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ آئے ہوئے اَحکام کافی نہیں ہوتے تھے، جس کی بنا پر دوسرا نبی آتا، پھر وہ اور اَحکام لاتا، اب یہ معاشرہ اپنے کمال کو پہنچ گیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین بھی کمال کو پہنچا دیا، یوں سمجھیں کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا لایا ہوا دین اس دین کے مختلف اجزاء ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر اس کی تکمیل ہوگئی۔ جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ختمِ نبوت کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جو نبی آتا گیا یوں سمجھو کہ قصرِ نبوت کی بنیاد میں اینٹوں کے طور پر سب فٹ ہوتے چلے گئے، محل بنتا چلا گیا، تو آخر ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی، میں آ گیا تو وہ اینٹ بھی فٹ ہوگئی[1] اور محل کامل ہو گیا۔ تو جس طرح سے تمام انبیاء علیہم السلام ملے تو قصرِ نبوت تیار ہوا، اور آپ آخری جزء ہیں کہ اس کے بعد اب کوئی گنجائش نہیں ہے، اسی طرح سے دین بھی درجہ بدرجہ ترقی کرتا چلا آیا، ترقی کرتا چلا آیا، اپنے وقت کے اعتبار سے، اپنے مخاطبین کی ضرورت کے لئے ہر دین کامل اور کافی ہوتا تھا، لیکن اس میں ترقی کی گنجائش تھی، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں وہ انتہا کو پہنچ گیا، اب اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے، اب جو بھی واقعات پیش آئیں گے ہر ایک کا حکم انہی اُصولوں سے اخذ کیا جائے گا جو اُصول بیان کردیے گئے ہیں، کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا کہ کوئی چیز ایسی سامنے آجائے کہ جس کا حکم ہم ان اُصولوں سے نہ نکال سکیں۔

حرام چیزوں کے اَحکام کی اِستثنائی صورتیں

درمیان میں یہ احسان جتلایا، اور پھر اُس حکم کی تکمیل کردی جو پیچھے حرمت کا آیا تھا کہ یہ چیزیں حرام کردی گئیں، لیکن اس میں اتنی گنجائش چھوڑ دی گئی، کہ جو شخص بھوک میں مضطر ہو جائے اس حال میں کہ وہ گناہ کی طرف میلان رکھنے والا نہ ہو، "میلان رکھنے والا نہ ہو" اُس میں وہی دو صورتیں شامل ہیں: غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ والی، دوسری آیت کے اندر یہ لفظ: غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے ساتھ آیا تھا (سورۂ بقرہ: ۱۷۳، وغیرہ)، نہ طالبِ لذّت ہو نہ ضرورت سے زیادہ کھانے والا ہو، اگر وہ طالبِ لذّت ہوگا تو بھی وہ مُتَجَانِفٌ لِّاِثْمٍ سمجھا جائے گا، ضرورت سے زیادہ کھانے والا ہوگا تو بھی وہ مُتَجَانِفٌ لِّاِثْمٍ سمجھا جائے گا، تو یہ لفظ ان دونوں صورتوں کو شامل ہے، "جو گناہ کی طرف میلان کرنے والا نہ ہو" فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: پس اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، یعنی اگر وہ اپنی ضرورت کے تحت اس حرام چیز کو استعمال کرے گا تو باوجود اس بات کے کہ ہے وہ حرام، لیکن اللہ بخش دے گا رحم کرے گا، اس کے اُوپر کسی قسم کی گرفت نہیں کرے گا، یہ رخصت حاصل ہوگئی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) صحیح البخاری ۱/۵۰۱، باب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم/ صحیح مسلم ۲/۲۴۸، باب کونہ خاتم النبیین/ مشکوٰۃ ۲/۵۱۱، باب فی المعجزات۔ عن ابی ھریرۃؓ

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ

آپ سے پوچھتے ہیں کیا چیز حلال کی گئی ان کے لئے؟ آپ کہہ دیجئے! حلال کردی گئیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں، اور جن شکاری

مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫

جانوروں کو تم تعلیم دو، اس حال میں کہ تم ان کو چھوڑنے والے ہو، سکھاتے ہو تم ان جانوروں کو اُس چیز سے جو اللہ نے تمہیں سکھائی،

فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

پس کھالیا کرو اُس جانور سے جو روک رکھا اُن شکاری جانوروں نے تم پر، اور ذکر کیا کرو اللہ کا نام اُس پر، اللہ سے ڈرتے رہو،

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ

بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں ۝۴ آج حلال کردی گئیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں، اور وہ لوگ جو کتاب دیے

اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ

گئے ان کا طعام بھی تمہارے لیے حلال ہے، اور تمہارا طعام ان کے لیے حلال ہے، اور پاک دامن عورتیں

مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ

مؤمن عورتوں میں سے، اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں سے جو کتاب دیئے گئے

قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ

تم سے قبل، جبکہ دے دو تم انہیں ان کے اُجر اس حال میں کہ تم قید نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ محض مستی نکالنے والے ہو،

وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ

اور نہ تم ان کو خفیہ دوست بنانے والے ہو، جو کوئی شخص ایمانیات کا انکار کرے گا پس تحقیق اس کا عمل

عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵

ضائع ہوگیا، اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہے ۝۵

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ: آپ سے پوچھتے ہیں کیا چیز حلال کی گئی ان کے لئے؟ قُلْ: آپ

کہہ دیجیے، اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ: حلال کردی گئیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں، وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ: جوارح یہ جارحہ کی جمع ہے، جارحہ کا لفظی معنی ہے زخمی کرنے والا، جَرَحَ یَجْرَحُ: زخمی کرنا، اور یہاں جارحہ سے مراد شکاری جانور ہے جو اپنے منہ کے ساتھ یا پنجے کے ساتھ کسی چیز کو زخمی کو کر دیتا ہے، تو اس میں کتا بھی شامل ہے باز بھی شامل ہے، اور جو درندہ بھی شکار کرنے کے لئے رکھ لیا جائے جوارح کا مصداق بن سکتا ہے، مِّنَ الْجَوَارِحِ یہ "ما" کا بیان ہے، "جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو، سکھالو، سدھالو" مُکَلِّبِیْنَ: اس حال میں کہ تم ان کو چھوڑنے والے ہو، تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ: سکھاتے ہو تم ان جانوروں کو اس چیز سے جو اللہ نے تمہیں سکھائی، فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَیْكُمْ: پس کھالیا کرو اس جانور سے جو روک رکھا ان جوارح نے، ان شکاری جانوروں نے تم پر، وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ: اور ذکر کیا کرو اللہ کا نام اس پر یعنی مَا عَلَّمْتُمْ، میں جو مَا آیا ہوا ہے جس کا مصداق جوارح کو بنایا گیا، تو اس مَا کے لفظوں کی رعایت رکھتے ہوئے وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ میں ضمیر مفرد کی لوٹائی گئی، یعنی ان شکاری جانوروں پر اللہ کا نام ذکر کیا کرو، ان جوارح پر اللہ کا نام لیا کرو، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ: بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ: آج حلال کردی گئیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں، وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ: اور وہ لوگ جو کتاب دیے گئے اُن کا طعام بھی تمہارے لیے حلال ہے، وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ: اور تمہارا طعام اُن کے لئے حلال ہے، وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ: محصنات: پاک دامن عورتیں۔ پاک دامن عورتیں مؤمن عورتوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں سے جو کتاب دیے گئے تم سے قبل یہ بھی حلال کردی گئیں، حلال کردی گئیں تمہارے لیے پاک دامن عورتیں مؤمن عورتوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان لوگوں کی جو دیے گئے کتاب تم سے قبل، اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ: جبکہ دے دو تم انہیں ان کے اجر، مُحْصِنِیْنَ: اس حال میں کہ تم ان کو قیدِ نکاح میں لانے والے ہو، غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ: شہوت رانی کرنے والے نہیں، قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے ہو، محض شہوت رانی کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ ان کو بیوی بنا کے رکھنا مقصود ہے، وَلَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ: اور نہ تم ان کے ساتھ خفیہ آشنائی لگانے والے ہو، "وَلَا مُتَّخِذِیْنَ" تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا، اخدان خِدْن کی جمع ہے، خدن کہتے ہیں خفیہ یار کو، یعنی علی الاعلان نکاح نہ کیا جائے بلکہ خفیہ طور پر آشنائی قائم کر لی جائے، ایسا نہیں۔ "تم قیدِ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ محض مستی نکالنے والے ہو، اور نہ تم ان کو خفیہ دوست بنانے والے ہو، خفیہ آشنائی کرنے والے ہو" وَمَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ: اور جو کوئی انکار کرے ایمان کا، ایمان سے مراد یہاں ایسی چیز ہے جس کے اوپر ایمان لانا ضروری ہو، یعنی ایمانیات، "جو کوئی شخص ایمانیات کا انکار کرے گا، ان باتوں کا انکار کرے گا جن پر ایمان لانا ضروری ہے" فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ: پس تحقیق اس کا عمل ضائع ہو گیا، وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ: اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں ماکولات میں سے کچھ مُحَرَّمات کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی گئی، اور ابتدا میں مُحَلَّلَات کو ذکر کیا گیا تھا، جس میں یہ لفظ آئے تھے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ ، اور میں نے عرض کیا تھا کہ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ میں چونکہ اضافت تشبیہ کے لئے ہے تو یہاں جو جانور باہر سے شکار کئے جاتے ہیں ان کے حلال ہونے کا ذکر کرنا مقصود ہے، کہ جنگلی جانور جو کہ ان گھریلو پالتو جانوروں کے مشابہ ہیں، درندہ نہ ہونے میں، شکاری نہ ہونے میں، تو وہ تمہارے لیے حلال کردیے گئے۔ تو جنگل کے شکار کے حلال ہونے کا ذکر آیا، اور آگے پھر کچھ محرمات کا ذکر آگیا کہ وہی حیوانات جو تمہارے لیے حلال ہیں، ان میں سے اگر اس قسم کا کوئی مصداق بن جائے جس کی تفصیل آپ کے سامنے آگئی، مثلاً میتہ ہوگیا، منخنقة ہوگیا، موقوذة ہوگیا، متردية ہوگیا، یا اُس کو کوئی درندہ پھاڑ جائے، ایسی صورت میں وہ حرام ہے، تو مُحَلَّلَات کے ذکر کے ساتھ یعنی ماکولات میں سے محرمات کا ذکر تھا۔

شکار کی تاریخ اور اِنسانی زندگی میں شکار کی اہمیت

اگلی بات اِسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ عرب میں اُس وقت عام طور پر چونکہ بدویانہ زندگی تھی، جنگلوں میں لوگ زیادہ وقت گزارتے تھے، شہروں کی آبادی کم تھی، خانہ بدوش قسم کے لوگ، ان کے معاش کا زیادہ تر دارومدار شکار پر تھا، وہ باہر سے جنگلی جانور پکڑتے، شکار کرتے، اور اُس کو کھاتے تھے، اسی طرح سے اپنا وقت گزارتے، پُرانی تاریخ آپ اُٹھا کر دیکھیں گے تو ابتدائی دور میں جبکہ انسان نے زیادہ تمدن اختیار نہیں کیا تھا اور اس طرح سے اجتماعی زندگی، شہری زندگی، اور تجارت وزراعت والی زندگی نے جس وقت زور نہیں پکڑا تھا، تو زیادہ تر لوگوں کا گزران یا غلہ بانی پر تھا کہ بکریوں کے، بھیڑوں کے، اُونٹوں کے، گائیوں کے ریوڑ رکھتے تھے، اور ان کو باہر چراتے اور پالتے، ان کے دُودھ، بال، کھال، گوشت پر گزارہ کرتے، اور یا پھر وہ شکار کرتے تھے، اور شکاری جانوروں کے گوشت سے اور اُن کے چمڑے سے اور اُن کی ہڈیوں سے فائدہ اُٹھاتے، اس طرح سے ان کا وقت گزرتا تھا، گویا کہ انسان کے شکار کرنے کی تاریخ اُتنی پُرانی ہے جتنی پُرانی انسان کی تاریخ ہے، اِبتدا سے ہی یہ شکار والا شغل انسان نے اختیار کیا ہے، اپنی غذا مہیا کرنے کے لئے درندوں کو اور چوپایوں کو وہ شکار کرتا ہے، شکار کر کے اُس کو کھاتا ہے، تو عرب کے اندر بھی یہی چیز تھی، تو ''صید'' یعنی شکار کو جو حلال کیا گیا تو اس وقت شکار کرنے کے ذرائع جو تھے، ان میں ایک ذریعہ تو تیراندازی تھا، کہ تیر کے ساتھ لوگ شکار کرتے تھے، چوپایوں کا بھی اور پرندوں کا بھی، اور دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتے پالتے تھے اور اُن کتوں کے ذریعے سے شکار کرتے تھے، اور آج بھی اس دور میں آپ دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کو شکار کا شوق ہے وہ بندوق کے ساتھ بھی شکار کرتے ہیں، اور کتوں کے ساتھ شکار کرنے کا رواج آج بھی ہے، جو لوگ بھی ایسی جگہوں میں آباد ہیں جہاں شکار ملتا ہے، ریگستانی علاقے ہوگئے، جنگلات کے علاقے ہوگئے، تو وہاں شکار کرنے کے لئے آج بھی لوگ کتا پالتے ہیں، اور شریعت نے

چونکہ شکار کرنے کو حلال قرار دیا، جب حلال قرار دیا تو جن ذریعوں سے شکار کیا جاتا ہے ان کو بھی جائز قرار دیا، اس لئے شکار کے لئے تیر اندازی بھی درست ہے، اور شکار کرنے کے لئے کتا پالنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔

کتا رکھنے کی جائز اور ناجائز صورتیں

کتا رکھنے کی مذمت ہے، اُس کے اوپر بہت ساری وعیدیں آئی ہیں، لیکن تین قسم کے کتوں کا اِستثنا فرمایا کہ یہ رکھنے جائز ہیں، ایک تو ہے کھیتی باڑی کی نگہبانی کے لئے، جیسے باہر کھیتوں میں جنگلی جانور آجاتے ہیں اور آکر نقصان کر جاتے ہیں، یا چور وغیرہ آتے ہیں تو زمین داروں کی عادت ہے کہ باہر اپنے باغات میں کھیتوں کے اندر کتے کو رکھتے ہیں، اور یا بھیڑ بکریوں کی حفاظت کے لئے کلبِ زرع و کلبِ ماشِيَة۔ماشية: مواشی۔ مواشی کی حفاظت کے لئے جیسے یہ لوگ چونکہ ریوڑ رکھا کرتے ہیں، تو ریوڑوں کی نگرانی کے لئے ساتھ کتے بھی پالتے ہیں، جہاں بھیڑ بکریاں بٹھائی ہوں وہاں کتا بطور نگرانی کے چھوڑ دیا، تو یہ کتا بھی جائز ہے جو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی حفاظت کے لئے رکھا جائے، اور تیسرے نمبر پر کتا جس کی اجازت دی گئی ہے وہ ''کلبِ صید'' ہے شکار کرنے کے لئے جو کتا رکھا جائے۔[1] تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کتے کی مذمت آئی ہے، جس کے رکھنے سے منع کیا گیا ہے، یہ محض وہ کتا ہے جو شوق کے طور پر پالا جائے، اُس کی ضرورت نہیں ہے، جیسے آج کل لوگ کوٹھیوں میں اپنی کاروں میں ان کو ساتھ بٹھا کر چلتے ہیں، قیمتی سے قیمتی کتے لاتے ہیں، بس ان کے بھونکنے سے خوش ہوتے ہیں، یا ان کو کبھی دوڑا لیتے ہیں اور دوڑانے سے خوش ہوتے ہیں، اس قسم کے کتے جو شوقیہ طور پر رکھے جاتے ہیں یہ کتے رکھنے حرام ہیں، اور ان کے رکھنے کے ساتھ ہر روز انسان کی نیکی میں کمی آتی ہے، اور جہاں یہ کتے رکھے ہوئے ہوں وہاں فرشتے نہیں آتے، اس قسم کے کتے کی ممانعت آتی ہے جو کہ اس طرح سے شوق کے طور پر رکھا ہوا ہو، اور جو کتا ان ضرورتوں کے لئے رکھا ہوا ہے اس کا جواز حدیث شریف کے اندر صراحتاً آیا ہوا ہے، کھیتی کی نگہداشت کے لئے، باغات کی نگہداشت کے لئے ہو، یا اپنے حیوانات اور مواشی کی نگہداشت کے لئے، بھیڑوں بکریوں کے غلے کی حفاظت کے لئے ہو، اور یا شکار کے لئے رکھا ہوا ہو۔

شکار کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم کا سوال

اب یہ شکار جس وقت کتے کے ذریعے سے کریں گے، یا تیر کے ذریعے سے کریں گے، تو بسا اوقات ایسی نوبت بھی آجاتی ہے کہ آپ نے ایک پرندے کے تیر مارا، اور آپ اُس کو قاعدے کے مطابق ذبح نہیں کر سکے، آپ کے وہاں پہنچنے تک وہ خود ہی مر گیا، یا ایک شکار کے اُوپر آپ نے کتا چھوڑا، اور کتے نے اُس کے ساتھ جا کر جو لڑائی کی، اُس کو عاجز کرنے کے لئے وہ زخمی کرتا ہے، پھاڑتا ہے، تو پھاڑنے کے ساتھ بسا اوقات شکاری آدمی وہاں تک پہنچتے نہیں پاتا کہ وہ شکار پہلے ہی مر جاتا ہے، اب یہ جو شکار ہو گیا یہ حلال ہے یا حلال نہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سوال کیا کہ جب محرمات کا تذکرہ چلا آرہا تھا کہ فلاں چیز بھی تمہارے لئے حرام، فلاں چیز بھی تمہارے لئے حرام، تو اپنی ضرورت کے تحت یہ سوال اُٹھایا گیا کہ اِس صید کے مسئلے میں کون کون سی چیزیں

---

(۱) صحیح مسلم ۲۱/۲ باب الامر بقتل الكلاب/مشکوٰۃ ۳۵۹/۲ باب ذکر الکلب۔ ولفظ الحدیث: مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ أَوْ صَيْدٍ أَوْ زَرْعٍ الخ۔

ہمارے لئے حلال ہیں؟ کس طرح سے شکار کی ہوئی چیزیں حلال ہیں؟ کس طرح سے حلال نہیں ہیں؟ یَسْئَلُوْنَكَ کا یہاں یہ معنی ہے، شکار کے متعلق یہ سوال کیا گیا ہے۔

ذبحِ اضطراری کے اَحکام وشرائط

تو کُتبِ حدیث میں مستقل باب آتا ہے: ''بَابُ الصَّيْدِ وَالذَّبَائِحِ'' اس میں اس کی تفصیل موجود ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اگر تیر ''بسم اللہ'' پڑھ کر چھوڑا جائے اور چھوڑنے والا مسلمان ہو، یا کتابی ہو، جس کا ذبیحہ جائز ہے، جیسے مسئلہ آپ کے سامنے آرہا ہے، ''بسم اللہ'' پڑھ کر تیر چھوڑا جائے اور وہ کسی پرندے کے لگ جائے، پھر اگر آپ کے وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے پرندہ مر بھی جائے تو بھی وہ حلال ہے، اُس کو آپ کھا سکتے ہیں، اِس کو ''ذبحِ اضطراری'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ایسے ہی اگر کوئی شکاری کتا وغیرہ چھوڑا ہے اور ''بسم اللہ'' پڑھ کر چھوڑا ہے، اور وہ کتا سکھایا ہوا ہو، مُعلَّم ہو، جاہل نہ ہو، تو وہ پھر اگر اُس جانور کو پکڑے، پکڑ کر وہ آپ کے پاس آنے سے پہلے پہلے مر جائے، یا آپ نے باز چھوڑ دیا اور وہ باز مُعلَّم ہے، ''بسم اللہ'' پڑھ کر اُس کو چھوڑ دیا، اور اُس نے جا کے کسی پرندے کو دبوچا، اور آپ کے پاس آنے سے قبل قبل پرندہ مر گیا، تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا ان آیات کی روشنی میں، کہ وہ شکار انسان کے لئے حلال ہے، کتے کا زخمی کر دینا یا کتے کا اس کو مار لینا یا باز کا مار لینا یہ انسان کے ذبح کے قائم مقام ٹھہرا دیا گیا، اس کو ''ذبحِ اضطراری'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کہ کہیں بھی اُس کے زخم ہو جائے، یا بعض فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک زخم کوئی ضروری نہیں، زخم کی قید صرف ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے، باقیوں کے نزدیک زخم بھی ضروری نہیں ہے، تو ایسی صورت میں جو مر جائے گا اُس کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

لیکن اس میں چند شرطیں ہیں جو یہاں ان آیات کے اندر واضح کی گئی ہیں:

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ ''جوارح'' اختیار کیا گیا، اسی سے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ اخذ کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ زخم ضرور ہونا چاہیے، تب جا کے جوارح کا تحقق ہوگا، اور باقیوں کے نزدیک جوارح سے مراد صرف شکار کرنے والا جانور ہے، آگے لغوی دلالت کے تحت زخم کا پایا جانا ضروری نہیں، وہ جارحۃ بمعنی کاسبہ کے لیتے ہیں، کام کرنے والے، جو شکار کا کام کرنے والے ہیں وہ جوارح کا مصداق بن جائیں گے، جرح سے وہ زخمی کرنا مراد نہیں لیتے، ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اس کو زخمی کرنے کے معنی میں لیتے ہیں، تو اس لئے وہ کہتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ زخم اُس جانور پر ضرور ہو جانا چاہیے جس کے اُوپر آپ نے شکاری کتا یا شکاری باز چھوڑا ہے۔

۲۔ پھر وہ معلَّم ہوں، معلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کتے کو سدھایا ہوا ہو، اور کتے کے سدھانے کا معیار یہ ہے کہ جو شکار پکڑے وہ خود نہ کھائے بلکہ اپنے مالک کے پاس لے کر آئے، اگر وہ چھوٹی چیز ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتا، خرگوش وغیرہ پکڑتا ہے تو اُس کو کھاتا نہیں بلکہ اُسی طرح سے اُس کو پکڑ کر مالک کے پاس لے آتا ہے، اور گر وہ چیز وزنی ہوتی ہے جیسے ہرن وغیرہ، تو پھر وہ کتا اُس کو گرا لے گا اور گرا کر وہیں نگرانی کے طور پر بیٹھ جائے گا، اُس کو کھائے گا نہیں، تاکہ اُس کا مالک آجائے اور آکر اُس کو سنبھال لے، تو کتے کے سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شکار کیے ہوئے جانور میں سے کھائے نہ، بلکہ اپنے مالک کے پاس لے

آئے یا مالک کے لئے محفوظ رکھ لے تو یہ کتا معلّم ہے۔ اور اگر کتا شکار کرنے کے بعد خود کھانے لگ جاتا ہے تو یہ جاہل ہے، اس جاہل کا شکار جائز نہیں ہے، تبھی جائز ہوگا کہ اگر اس کے کے مارے ہوئے کو آپ زندہ زندہ ذبح کرلیں، ذبح کرلیں گے تو ٹھیک ہوگا ورنہ نہیں، جاہل کتے کے شکار کا ذبح کرنا ضروری ہے، اگر ذبح نہیں کیا تو پھر اُس کا شکار حلال نہیں ہے تو "ذبح اضطراری" کے لئے اس کا معلّم ہونا ضروری ہے۔ اور باز وغیرہ پرندے جو کہ شکار کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں، شکرا ہو گیا، باز ہو گیا، تو اُن کے معلّم ہونے کی علامت یہ قرار دی گئی ہے کہ اگر آپ اُس کو شکار پر چھوڑ دیں، پھر بعد میں اُس کو آواز دیں تو آپ کی آواز پر وہ واپس آجائے، آواز پر واپس آنا یہ معیار ہے اُس باز یا شکرے کے معلّم ہونے کا، اگر آپ اُس کو چھوڑ دیتے ہیں، مثلاً کبوتر پر آپ نے اُسے چھوڑ دیا، پھر آواز دی اور وہ واپس نہیں آیا، بلکہ وہ اپنے جذبات کے تحت کبوتر کی طرف ہی چلا گیا تو وہ جاہل ہے، اُس کا پکڑا ہو شکار آپ کے لئے حلال نہیں ہوگا، ہاں! البتہ اگر ذبح کرنے کی نوبت آگئی تو پھر آپ کے لئے حلال ہوگا، لیکن شکار پر چھوڑا ہوا کتا آواز دینے پہ واپس نہ آئے تو یہ اُس کے جاہل ہونے کی علامت نہیں، وہاں دار و مدار ہے کھانے نہ کھانے پر، اور باز اگر پکڑ کر اُس میں سے کچھ کھالیتا ہے تو بھی وہ جاہل نہیں، کیونکہ باز کے معلّم ہونے کا مدار ہے آواز دینے پہ واپس آنے پر، وہ بلانے پر واپس آجائے تو یہ اُس کے معلّم ہونے کی علامت ہے، اور کتا کھائے نہ تو یہ اُس کے معلّم ہونے کی علامت ہے۔

٣- اور پھر ایک شرط یہ بھی ہے کہ چھوڑتے وقت اُس کو قصداً چھوڑا جائے، مثلاً کتا آپ کے پاس پکڑا ہوا ہے، شکار دیکھ کر آپ نے اُس کو چھوڑا، اور اگر وہ کتا آپ کا ہے، آپ اس کو باہر لے گئے، آپ نے شکار کو دیکھا ہی نہیں، کتے نے از خود دیکھ لیا اور وہ چھوٹا پھر رہا تھا، خود جا کے شکار پکڑ لایا، یہ شکار بھی حلال نہیں ہے، اس کی نسبت آپ کی طرف نہیں ہوگی، اس شکار کی نسبت آپ کی طرف تب ہوگی جس وقت کہ آپ نے اُس کتے کو قصداً چھوڑا ہو، پکڑا ہوا ہو تو شرط یہ ہے کہ آپ نے چھوڑا ہو، اور اگر پکڑا ہوا نہیں ہے، ویسے ہی آپ کے ساتھ چل رہا ہے، تو آپ نے اُس کو شُش کر کے شکار پر برانگیختہ کیا ہو، تو پھر بھی اُس کی نسبت آپ کی طرف ہوجائے گی، اور اگر از خود چلتے پھرتے کتا پکڑ لائے تو ایسی صورت میں پھر وہ شکار حلال نہیں ہے، اس لئے "مُكَلِّبِيْنَ" کے اندر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ تم ان کو چھوڑنے والے ہو، از خود چھوڑو تب جا کے شکار حلال ہوگا۔

٤- پھر چھوڑتے وقت اُس کے اوپر "بسم اللہ" پڑھو، "بسم اللہ" پڑھنا بھی ضروری ہے، تو جس وقت یہ چیزیں متحقق ہوجائیں گی، تو ایسی صورت میں وہ باز کا مارا ہوا شکار، یا کتے کا مارا ہوا شکار حلال ہوجائے گا، اسی طرح سے تیر کے ساتھ مارا ہوا شکار بھی حلال ہوجائے گا۔

٥- اور اگر وہ چیز جس کے ساتھ آپ نے اس شکار کو مارا ہے وہ دھار دار نہیں ہے، بلکہ ایسے ہے کہ جس طرح آپ غلیل کے اندر غلیلہ چلاتے ہیں، بٹی مار دیتے ہیں، تو پھر یہ چوٹ کے ساتھ مرا ہوا جانور ہے، ایسا جانور حلال نہیں، چنانچہ یہ بندوق جو شکار کے لئے استعمال ہوتی ہے اس کے اندر بھی چونکہ وہ چھرّے گول گول ایسے ہوتے ہیں جس طرح سے بٹیاں، تو یہ چھرّا اگر جا کے لگ کر زخمی بھی کردے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے لاٹھی مارنے کے ساتھ بھی زخم ہوجاتا ہے، چمڑا پھٹ جاتا ہے اور خون نکل آتا ہے، اس کا

کوئی اعتبار نہیں، یہ بھی "وقیذ" میں شامل ہے، جیسے کہ چوٹ لگ کر مرا ہے، اس جانور کو بھی حلال قرار نہیں دیا جائے گا، جو گولی کے ساتھ جس میں دھار نہیں ہوتی، یا غلیلے کے ساتھ جو عام طور پر یہ ربڑ کی غلیل میں رکھ کر چلایا جاتا ہے یا کمان میں رکھ کر چلایا جاتا ہے، اِس کے ساتھ مرا ہو شکار یہ "وقیذ" ہے، چوٹ کے ساتھ مرا ہے یہ حلال نہیں ہے، البتہ دھار دار چیز جیسے تیر، اس کے آگے دھار ہے، اگر تیر میں بھی دھار نہیں ہے اور ایسے ہی اُس کو چلا دیا، لاٹھی کی طرح جا کر لگا اور جانور کو مار دیا تو وہ بھی حلال نہیں ہے۔ تو یہ ہے کچھ تفصیل اِس شکار کی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال اُٹھایا تھا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کے اندر اِس کی وضاحت کردی۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ: آگے جواب کی تفصیل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال یہی ہے، کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ حلال جانوروں میں سے ان کے لئے کون سا شکار کیا ہوا، کس طرح سے شکار کیا ہوا جانور حلال ہے؟ جواب کی تفصیل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال یہ ہوا۔ آپ کہہ دیجئے کہ جو چیزیں عام طور پر ذبح کرنے کی صورت میں تمہارے لئے حلال ہیں، شکار کی صورت میں بھی حلال ہیں، "طیبات تمہارے لئے حلال کردی گئیں" یعنی شکار کی صورت میں بھی طیبات تمہارے لئے حلال ہیں، جو عام حالات میں حلال ہیں وہ شکار کی صورت میں بھی حلال ہیں۔ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ: اور جن شکار کرنے والے جانوروں کو تم تعلیم دے لو، سکھا لو۔ مِّنَ الْجَوَارِحِ "مَا" کا بیان ہے، جوارح کا معنی کواسب، یا جوارح کا معنی زخم کرنے والے، جیسے میں نے دونوں مفہوم آپ کے سامنے ذکر کردیئے، کہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زخم کرنے کو بھی شرط ٹھہراتے ہیں، باقیوں کے نزدیک زخم شرط نہیں ہے، چاہے گلا گھونٹ کر کتا مار دے تو بھی ان کے نزدیک حلال ہے، چاہے خون کچھ بھی نہ نکلا ہو، "جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دے لو اس حال میں کہ تم ان کو چھوڑنے والے ہو، اور سکھاتے ہو تم ان کو اس چیز سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا" یعنی جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے شریعت کے اندر تمہیں تعلیم کیا ہے، سکھایا ہے اُس طریقے کے مطابق ان کو سکھاؤ، جس کی تفصیل میں نے آپ کی خدمت میں کردی۔ "پس کھا لیا کرو اُس جانور میں سے جس کو وہ شکاری جانور تم پر روک رکھیں" تو "اَمْسَكْنَ" کے اندر یہ آگیا کہ وہ خود نہ کھائیں بلکہ تمہارے لئے روک رکھیں، اُس کو کھا لیا کرو۔ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ: اور ان جانوروں کو چھوڑتے وقت ان کے اوپر اللہ کا نام لیا کرو، عَلَيْهِ کی ضمیر مفرد لوٹ گئی مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ میں "مَا" کی وجہ سے، چاہے اس کا مصداق جوارح ہے جمع، لیکن لفظوں میں چونکہ مفرد ہے تو یہ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ کی ضمیر مفرد اس کی طرف لوٹا دی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرتے رہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ شکار وغیرہ کے شغل میں لگ کر اللہ تعالیٰ کے باقی اَحکام کو فراموش نہ کردو، کہ وقت پر نماز نہ پڑھو، اور دیگر چیزوں میں کوتاہی کرو، ایسا نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مَنِ اتَّبَعَ الصَّيْدَ غَفَلَ عام طور پر جو لوگ شکار کے پیچھے لگ جاتے ہیں غافل ہوجاتے ہیں،[1] ان کو باقی باتیں یاد نہیں رہتیں، اس لئے تنبیہ فرمائی ہے کہ شکار کی صورت میں بھی اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی رعایت رکھو۔ "بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔"

(۱) ابوداؤد ۳۹/۲ باب فی اتباع الصید/ترمذی ۵۱/۲/مشکوۃ ۳۲۲/۲، کتاب الامارۃ فصل ثانی عن ابن عباس۔

''طیبات'' اور ''خبائث'' کا مصداق

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ: آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں، آج سے مراد ہے زمانہ نزول قرآن، جس وقت یہ سورت اُتر رہی ہے، حلال کردی گئیں کا مطلب ہے کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے حلال کردی گئیں، اب ان کے اُوپر کسی قسم کا کوئی نسخ نہیں آئے گا، قیامت تک کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں۔ پاکیزہ چیزوں کا کیا مصداق ہے؟ یہاں ''طیبات''، ''خبائث'' کے مقابلے میں ہے، جیسے يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ: حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات کو، وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (سورۂ اعراف: ۱۵۷) کچھ اِس قسم کے لفظ غالباً سورۂ اعراف میں آتے ہیں، نبی کا ذکر اس سے پیچھے آیا ہوا ہے کہ تمہارے اُوپر وہ ''طیبات'' کو حلال ٹھہراتا ہے اور ''خبائث'' کو تمہارے اُوپر حرام ٹھہراتا ہے، تو ''خبائث'' کے مقابلے میں ''طیبات'' کو لایا گیا، خبائث خبیثہ کی جمع ہے، جس چیز کے اندر کسی قسم کا خبث ہو وہ حرام ہے، اور جس چیز کے اندر کسی قسم کا خبث نہ ہو وہ طیب ہے، وہ حلال ہے، تو جن چیزوں کو قرآن اور حدیث نے صراحتاً حلال قرار دے دیا وہ بالیقین ''طیبات'' کا مصداق ہیں، اور جن کو صراحتاً حرام ٹھہرا دیا وہ بالیقین ''خبائث'' کا مصداق ہیں، اس میں تو کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہوئی۔

غیر منصوص اشیاء کی حلت وحرمت کیسے ثابت ہوگی؟

اور جن چیزوں کا قرآن وحدیث کے اندر ذکر نہیں آیا اب اس کو جاننے کے لئے کہ یہ حلال ہے یا حرام، تو اس کا یہی قرار دینا ضروری ہوا کہ ''طیبات'' کا مصداق ہے یا نہیں، اگر عقلی دلیل کے ساتھ اُس میں ''خبث'' ثابت ہوجاتا ہے تو ہم اُس کو ''طیبات'' میں شامل نہیں کریں گے، اس کو حرام قرار دے دیں گے، اور اگر عقلی دلیل اس چیز کو ''طیب'' ثابت کرتی ہے تو ہم اُس کو حلال قرار دے دیں گے، ''طیب'' ثابت ہونے کے لئے یہ ہوگا کہ اس میں کسی قسم کی نجاست نہ ہو، اور اُس کے اخلاق کے اندر اس قسم کی کوئی خرابی نہ ہو کہ کھانے کے ساتھ انسان اُس سے متأثر ہوجائے اور اُس کے اندر بھی وہی خرابیاں آجائیں، جس طرح سے درندگی ہے دوسرے پر ظلم کرنے کا جذبہ، دوسرے کو پھاڑ کھانے کا جذبہ، اگر انسان اس قسم کے جانوروں کو کھائے گا تو اُس کے اندر بھی درندگی آئے گی جو انسانیت کے منافی ہے، اس لئے حدیث میں یہ اُصول ہی قائم کردیا گیا کہ درندے تمہارے لئے حرام ہیں[1] یا وہ نجاست خور جانور ہے، یا اس کا رُجحان انتہائی پستی اور ذلت کی طرف ہے جیسے حشرات الارض ہیں، زمین کے کیڑے مکوڑے، یا ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو یہ قتل کرنے کا حکم دینا جیسے سانپ، بچھو اور اس قسم کی چیزیں، یہ (قتل کا حکم) بھی ان کے ''خبث'' پر دلالت کرتا ہے، بہرحال رُوحانی طور پر مضر ہو یا جسمانی طور پر وہ نقصان پہنچانے والی چیز ہے، یا اس سے بُرے اخلاق کا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، تو یہ چیزیں ''خبائث'' میں شامل ہوں گی اور حرام ہوجائیں گی، اور جن کے اندر اس قسم کی کوئی بات نہیں ان کو پاکیزہ قرار دیں گے اور ان کو حلال قرار دے دیں گے۔ تو جو منصوص نہیں ہیں، غیر منصوص اشیاء، ان کے حلال اور حرام ہونے کا مدار اس بات پر ہوگا کہ یہ ''طیبات'' کا مصداق ہیں یا ''خبائث'' کا، دلائل کے ساتھ اس بات کی تعیین کرنی ہوگی، دلیل

(۱) بخاری ۲/۸۳۰ / مسلم ۲/۱۴۷ / مشکوۃ ۲/۳۵۹ باب ما یحل اکلہ الخ۔ ولفظ الحدیث: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَهٰى عَنْ أَكْلِ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ.

کے ساتھ اگر کسی چیز کا ''خبث'' ثابت ہو جائے تو ہم اُس کو حرام قرار دیں گے، اگر اُس کا ''خبث'' ثابت نہ ہو سکے تو ہم اُس کو حلال قرار دیں گے، یہ چیزیں مجتہد فیہ ہوں گی، اور جن کو صراحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں حلال قرار دے دیا گیا وہ بالیقین ''طیبات'' کا مصداق ہیں، اور جن کو قرآن وحدیث میں صراحۃً حرام قرار دے دیا گیا وہ بالیقین ''خبائث'' کا مصداق ہیں۔ تو ''تمہارے لئے طیبات حلال کردی گئیں'' یعنی اب ان کے اُوپر نسخ نہیں ہوگا بلکہ ''طیبات'' تمہارے لیے حلال ہی رہیں گی۔

غیر ذبیحہ میں اہلِ کتاب کی تخصیص نہیں

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ: یہاں ''طعام'' کا مصداق بالاتفاق ذبیحہ ہے، کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال کر دیا گیا، کیونکہ اگر غیرِ ذبیحہ مراد لیا جائے جیسے خشک غلہ ہوگیا، سبزیاں ہوگئیں، فروٹ ہوگئے، پھل ہوگئے، اس میں اہلِ کتاب کی تخصیص نہیں ہے، وہ کافر ہو، وہ مشرک ہو، وہ بت پرست ہو، جو بھی ہو اس کے ہاتھ کا لے کر کھانا جائز ہے۔ ہندو کی فروٹ کی دُکان ہے، وہاں سے آپ مالٹا خرید لیجئے، کیلا خرید لیجئے، کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آپ اُس کی دُکان سے دُودھ لے لیجئے، کوئی حرج نہیں ہے، البتہ عارض کے طور پر یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کے برتن پاک نہیں یا اس کا ہاتھ پاک نہیں ہوگا، آپ احتیاط کریں تو وہ ایک علیحدہ بات ہے، لیکن اُس کی دُکان کی یہ چیزیں جیسے غلہ جات ہوگئے، دالیں ہوگئیں، سبزیاں ہوگئیں اور اس قسم کی چیزیں جو کھانے پینے کی ہوا کرتی ہیں، وہ بالاتفاق جائز ہے، چاہے دُکان دار مشرک ہی کیوں نہ ہو، اُس کے ہاتھ سے لے کر کھایا جاسکتا ہے، اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے، فرق اگر ہے تو ذبیحہ کے بارے میں ہے کہ ذبیحہ اسی شخص کا حلال ہے جو یا تو مسلم ہو یا اہلِ کتاب میں سے ہو، اور مشرک بت پرست جو اہلِ کتاب کا مصداق نہیں ہیں ان کا ذبیحہ حرام ہے۔

قرآن کی اِصطلاح میں ''اہلِ کتاب'' کا مصداق

اب یہ بات کہ ''اہلِ کتاب'' کون لوگ ہیں؟ ''اہلِ کتاب'' کن کو کہا جاتا ہے؟ تو ''اہلِ کتاب'' کا مصداق قرآنِ کریم کی اِصطلاح میں عیسائی اور یہودی ہیں، اور اگر ''اہلِ کتاب'' کی تعریف کرنی ہو تو یہ ہے کہ ایسی کتاب جس کا نزول من جانب اللہ یقینی ہے، یقینی طور پر اور قطعیات کے تحت معلوم ہے کہ فلاں کتاب اللہ کی طرف سے اُتری، وہ لوگ اس کتاب کو مانتے ہوں اور اس کی اِتباع کا دعویٰ کرتے ہوں، دعویٰ کرتے ہوں! آگے عمل کیسا ہو؟ اس سے ہمیں بحث نہیں ہے! جس طرح سے ایک مسلمان اللہ کی کتاب قرآن کو مانتا ہے اور اِس کی اِتباع کا دعویٰ کرتا ہے، اِس کا ذبیحہ حلال ہے، باقی عملی زندگی میں کیسا ہو؟ ہمیں اس سے کیا؟ اسی طرح سے جو شخص اس کتاب کو تسلیم کرے جو اللہ کی طرف سے بالیقین آئی ہوئی ہے، اور بالیقین اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کتابیں زبور، توراۃ اور انجیل ہے، اور قرآنِ کریم میں اگرچہ صحفِ موسیٰ اور صحفِ اِبراہیم کا ذِکر بھی ہے، لیکن صحفِ موسیٰ اور صحفِ اِبراہیم کوئی متشکل شکل میں آج موجود نہیں ہیں، جس کی بناء پر ہم اس کا مصداق کسی کو نہیں بنا سکتے کہ فلاں کتاب صحیفۂ اِبراہیمی ہے، یا فلاں کتاب صحیفۂ موسوی ہے، ہم بالیقین کچھ نہیں کہہ سکتے اگر ہم سابقہ کُتب میں سے اللہ کی طرف سے اُتری ہوئی کتاب کہہ سکتے ہیں تو انجیل کو کہہ سکتے ہیں، یا توراۃ کو کہہ سکتے ہیں، یا زبور کو کہہ سکتے ہیں، تو جو لوگ اپنی نسبت ان کی طرف

کرتے ہیں، توراۃ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، انجیل کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ کہلائیں گے ''اہلِ کتاب''، باقی دُوسری کتابیں جس طرح سے سکھوں کا گرنت ہوگیا، یا ہندؤں کی پوتھیاں اور وید ہوگئے، یا اسی طرح سے آتش پرستوں کی کتابیں ہوگئیں، چاہے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ الہامی کتابیں ہیں، اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہیں، لیکن ہمارے پاس ان کے الہامی ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے، جس کی بنا پر ہم ان کو من جانب اللہ نہیں مانیں گے، جب ان کا من جانب اللہ ہونا یقینی نہیں تو ان کتابوں کی طرف نسبت رکھنے والے ''اہلِ کتاب'' بھی نہیں کہلائیں گے۔ باقی یہ کہ عیسائی، انجیل کی طرف نسبت رکھتے ہیں، یہودی، توراۃ کی طرف نسبت رکھتے ہیں، زَبور کی طرف نسبت رکھنے والا ابھی کوئی قبیلہ یا کوئی گروہ موجود نہیں، البتہ ایک لفظ آیا کرتا ہے آپ کی فقہ میں ''صابئین'' کا، صابیوں کے متعلق اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک یہ زَبور کے ماننے والے ہیں، تو ان کے نزدیک یہ ''اہلِ کتاب'' میں شامل ہیں، اور بعض کے نزدیک یہ ستارہ پرست ہیں، اور زَبور کے ماننے والے نہیں ہیں، پھر وہ ''اہلِ کتاب'' میں شامل نہیں ہوں گے، ان کا ذبیحہ حرام ہوگا، اور اسی طرح سے ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی جائز نہیں ہوگا، تو ''صابیوں'' کے بارے میں جو فقہ کے اندر اِختلاف لکھا ہوا ہے، اس اختلاف کا مدار بھی اس بات پر ہے کہ یہ زَبور کو ماننے والے ہیں یا نہیں؟ جن کے نزدیک وہ زَبور کو ماننے والے ہیں، ان کے نزدیک وہ ''اہلِ کتاب'' میں شامل ہو جائیں گے، جن کے نزدیک وہ زَبور کو ماننے والے نہیں ہیں، ان کے نزدیک وہ ستارہ پرست مشرک ہوں گے، ان کو ''اہلِ کتاب'' میں نہیں رکھا جائے گا۔ تو یہ دو گروہ بالیقین ایسے ہیں جو کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کتاب کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں، ایک نصرانی ہوگئے اور دُوسرے یہودی ہوگئے، تو ''اہلِ کتاب'' جس وقت بھی بولا جائے گا، قرآنِ کریم کی اِصطلاح میں، تو اس کا مصداق یہی دو گروہ ہوں گے۔

''اہلِ کتاب'' کہلانے کے لئے کیا چیز ضروری ہے؟

باقی رہی یہ بات کہ ''اہلِ کتاب'' کہلانے کے لئے کیا صحیح طور پر کتاب کا حامل ہونا ضروری ہے؟ یا یہی محرّف توراۃ اور محرّف اِنجیل جس کے اندر شرک، کفر بھی شامل کرلیا گیا، اِن کا مان لینا بھی ''اہلِ کتاب'' کہلانے کے لئے کافی ہے؟ یہ دُوسری بات ہوئی تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ جو لوگ بھی ادھر نسبت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ''اہلِ کتاب'' کا مصداق ہوں گے، چاہے ان کے نظریات کے اندر کفر اور شرک ہی شامل ہوگیا ہو، وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم ان ''اہلِ کتاب'' پر یہ الزام قائم کرتا ہے اُترتے وقت، کہ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کہ انہوں نے کتاب کو بدل کر رکھ دیا، کتمانِ حق کیا، تحریف کرتے ہیں، تو تحریف کی نسبت بھی ان کی طرف کی ہے، وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ: یہود کی طرف عزیر کو ابن اللہ قرار دینے کا کفر جو ہے یہ بھی قرآن نے اُن کی طرف منسوب کیا ہے۔ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۰) مسیح کے اِبن اللہ ہونے کا عقیدہ قرآنِ کریم نے نصاریٰ کی طرف منسوب کیا ہے، لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (سورۂ مائدہ: ۱۷) مسیح اِبنِ مریم کو ''اِلٰہ'' قرار دینے والوں کا کفر قرآنِ کریم میں مُصرّح ہے، اسی طرح سے ''ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ'' قرار دینے والے بھی کافر ہیں، یہ نظریات سارے کے سارے قرآنِ کریم کے اندر یہود اور نصاریٰ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اس کے باوجود ان کو ''اہلِ کتاب'' قرار دے کر ان کے ذبیحہ کو

حلال قرار دیا گیا۔ اس لئے وہ جن نظریات پر موجود تھے حضور ﷺ کے زمانے میں، چاہے وہ کفر تھا، شرک تھا، لیکن وہ ایک نبی پر ایمان کا اور کتاب کی اِتباع کا دعویٰ رکھتے ہیں، ایسی صورت میں ان کو ''اہلِ کتاب'' قرار دیں گے اور ان کا ذبیحہ حلال ہوگا۔ بالکل صحیح طور پر کتاب کا حامل ہونا، موحد ہونا، نبی کے اُوپر صحیح ایمان، صحیح تعلیمات کے تحت ہونا یہ ضروری نہیں، کیونکہ ان کا ایسا ایمان تو حضور ﷺ کے زمانے میں بھی نہیں تھا جس زمانے میں ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا جارہا ہے۔

''اہلِ کتاب'' کے ذبیحہ کے حلال ہونے کی چند شرائط

لیکن اِس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ ذبح کریں ''بسم اللہ'' پڑھ کر، اللہ کا نام لے کر، کیونکہ ''اہلِ کتاب'' میں جیسے کہ مفسرین نے صراحت کی ہے، کہ آج بھی جو کتابیں موجود ہیں تو راۃ اور اِنجیل، باوجود اس بات کے وہ محرّف ہوگئیں، لیکن آج بھی ان کے اندر صراحت ہے کہ ان کو حکم یہی تھا کہ اللہ کے نام پر ذبح کریں، ذبح کرنے کے اَحکام توراۃ، اِنجیل، قرآن میں ایک جیسے ہیں، ان کو بھی حکم یہی تھا کہ ''بسم اللہ'' پڑھ کر ذبح کریں، جو اللہ کا نام لے کر ذبح نہیں کریں گے، جو بھی ان کے الفاظ ہیں، بہرحال اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے تو ان کے نزدیک بھی وہ حرام تھا، گویا کہ ذبح کرنے کا طریقہ کہ رگیں کاٹی جائیں اور خون بہایا جائے اور اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے، یہود و نصاریٰ کے اندر طریقہ یہی تھا۔ پھر ایک اور بات بھی تو سوچنے کی ہے کہ مسلم، جس کا ایمان صحیح ہے، اگر یہ اللہ کے نام پر ذبح نہیں کرتا تو اِس کا ذبیحہ بھی حرام، تو ''اہلِ کتاب'' کو ان کے مقابلے میں تو شرف نہیں دیا جاسکتا، کہ ''اہلِ کتاب'' چاہے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے رہیں تو بھی حلال، یا اللہ کے نام کے بغیر ذبح کرتے رہیں تو بھی حلال، اور جو صحیح ایمان والے مسلمان ہیں وہ اللہ کے نام پر ذبح کریں تو حلال ہے اور اللہ کے نام کے بغیر یا کسی غیر کے نام پر ذبح کریں تو حرام ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اہلِ کتاب'' کو اس مسئلے میں اہلِ اسلام پہ فوقیت دے دی گئی، اس لیے یہ قیدیں ضروری ہیں کہ ذبح صحیح طریقے پر کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کیا جائے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے اندر بھی تعلیم یہی ہے، اگر اس کے خلاف کوئی کرتا ہے تو ایسے ہی ہے جس طرح سے ہمارے جاہل مسلمان شریعت کے اَحکام کو چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح سے یہود و نصاریٰ کے جاہل بدعمل بھی اس کو چھوڑ دیں گے، تو اس پر مدار نہیں ہے، اگر ہم میں سے کوئی جاہل غلط کاری اختیار کرتا ہے تو اُس کا ذبیحہ حرام ہے تو اگر ''اہلِ کتاب'' میں سے کوئی جاہل اس طرح سے کرے گا تو اُس کا ذبیحہ بھی حرام ہوگا، تو اس قید کا ساتھ رکھنا ضروری ہے کہ وہ اسی طریقے سے ذبح کریں جس طریقے سے ذبح کرنے کا حکم ہے، ''بسم اللہ'' پڑھ کر ذبح کریں، رگیں کاٹیں، اس لئے اگر وہ کوئی جھٹکا کرتے ہیں، یا چوٹ لگا کر جانور کو مار دیتے ہیں، یا ''بسم اللہ'' نہیں پڑھتے یا عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں، یا کسی غیر کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں، تو جس طرح سے مسلم کا ذبیحہ حرام ہے اِن کا ذبیحہ بھی اسی طرح سے حرام ہوگا۔

کیا آج کے یہودی وعیسائی ''اہلِ کتاب'' ہیں؟

اور پھر ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی ہوگی، کہ آج کل خاص طور پر بعض لوگ کہلاتے تو اپنے آپ کو ''عیسائی'' ہیں، کہلاتے تو ''یہودی'' ہیں، جس طرح سے بعض مسلمان ایسے ہیں کہ فہرست کے طور پر ووٹیں بنتی ہیں تو وہ ان کا نام مسلمانوں میں شمار

ہوتا ہے، لیکن اگر ان سے بات کرو گے تو نہ وہ خدا کے قائل ہیں نہ آخرت کے قائل ہیں، نہ قرآن کے قائل ہیں نہ حضور ﷺ کے قائل ہیں، ہر چیز کے منکر ہیں، اب اس قسم کے لوگ اگر سیاسی طور پر مسلمان بھی شمار ہوں تو یہ مسلمان نہیں، یہ مرتد ہیں اوران کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔ اسی طرح سے اگر کوئی شخص سیاسی طور پر اپنے آپ کو عیسائیوں میں شمار کرتا ہے، اوراسی طرح مردم شماری کے طور وہ یہودیوں میں ہے، لیکن نہ وہ تورات کا قائل، نہ انجیل کا قائل، نہ نبیوں کا قائل، نہ اللہ کا قائل، نہ آخرت کا قائل، ایسی صورت میں اُس کے اُوپر عنوان جو عیسائیت کا یا یہودیت کا لگا ہوا ہے یہ کافی نہیں ہے۔ اور آج کل اکثر و بیشتر یہ عیسائی یہودی اسی قسم کے ہیں، کہ اگرچہ ان کا شمار عیسائیوں میں ہوگا یہودیوں میں ہوگا، لیکن اِن کے نظریات عیسائیوں یہودیوں والے نہیں، عیسائیوں کے نظریات میں اللہ کا وجود، اللہ کی توحید کا دعویٰ، رسالت کا اقرار، اللہ کی طرف سے کتابوں کا نزول یہ سب چیزیں موجود ہیں، وہ کافر اگر بنے ہیں تو حضور ﷺ کا انکار کرنے کی بناء پر بنے ہیں، ورنہ باقی ان کے نظریات ویسے ہی ہیں جیسے اہلِ کتاب کے ہوتے ہیں، اور انبیاء ﷺ تلقین کرتے ہیں، چاہے انہوں نے اپنے نظریات میں غلطیاں شامل کرلی ہوں اور اس قسم کی گڑبڑ ہوگئی ہو، لیکن ان بنیادی چیزوں کو مانتے ہوں تب جا کے وہ ''اہلِ کتاب'' کہلائیں گے، اگر وہ ان بنیادی چیزوں کو نہیں مانتے تو یہ ''اہلِ کتاب'' میں شامل نہیں ہیں۔

اور پھر وہ ''اہلِ کتاب'' بھی اصلی ہونا چاہیے کہ یا تو وہ پیدائشی طور پر عیسائی اور یہودی ہے، یا کسی کافر قوم میں سے اُس نے عیسائیت اور یہودیت قبول کی ہے، ایسی صورت میں وہ ''اہلِ کتاب'' کا مصداق ہوں گے اوران کا ذبیحہ حلال ہے، مثلاً پہلے بت پرست تھا پھر عیسائی ہوگیا، یا پہلے مجوسی تھا پھر یہودی ہوگیا، تو ان کو تو ہم ''اہلِ کتاب'' شمار کریں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان ''عیسائی'' ہوجائے تو یہ مرتد ہے اوراِس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے، کوئی مسلمان ''یہودی'' ہوجائے تو یہ مرتد ہے اور مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہے، اب اس کو ہم ''اہلِ کتاب'' میں شامل نہیں کریں گے، کیونکہ اِس کو اُس نظریے پر جمے رہنے کا حق نہیں ہے، یا تو یہ اپنے نظریے (یعنی اسلام) کی طرف واپس آئے گا یا اِس کو قتل کردیا جائے گا، جدھر یہ منتقل ہوا ہے اُس کے مذہب کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اسلام اِس کے پاس رہا نہیں، جدھر منتقل ہوا ہے اُس کا اعتبار نہیں، تو مرتد لامذہب ہوتا ہے، اس کا ذبیحہ جائز نہیں ہے۔ تو یہ تفصیل ہے ''اہلِ کتاب'' میں کہ ''اہلِ کتاب'' سے کون مراد ہوئے؟ اوران کا ذبح کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کہ ذبح اگر صحیح طریقے کے ساتھ کرتے ہیں تو تب ہم ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیں گے ورنہ نہیں، اور ''اہلِ کتاب'' کا مصداق وہ لوگ ہیں کہ جس کتاب کا نزول من جانب اللہ یقینی اور قطعی ہے، اس کو ماننے کا وہ دعویٰ رکھتے ہوں، چاہے پھران کے نظریات کے اندر اور عمل کے اندر گمراہی کفر، شرک شامل ہی ہوگیا ہو تو بھی وہ ''اہلِ کتاب'' کا مصداق رہیں گے۔

''اہلِ تشیع'' اور ''مرزائیوں'' کے ذبیحہ کا حکم

مرزائی جو پہلے مسلمان تھے پھر مرزائی ہوئے، ان کے مرتد ہونے میں کوئی شبہ نہیں، چاہے دعویٰ کرتے ہوں قرآن کو

ماننے کا، ان کو ہمارے علماء مرتدوں میں ہی شمار کرتے ہیں، یہ بالکل مرتد ہیں، واجب القتل ہیں یا تو یہ دوبارہ اسلام قبول کریں یا ان کو قتل کر دیا جائے، شرعی طور پر حکم یہی ہوگا۔ اور ایک یہ ہے کہ کوئی مرزائیوں کے گھر پیدا ہوتا ہے، یہ نہیں کہ پہلے مسلمان تھا بعد میں مرزائی ہوا، بلکہ پیدا ہی مرزائی کے گھر ہوا تو یہ پیدا ہوتے ہی کافر ہے اس لئے اس کو مرتد تو نہیں کہا جائے گا، البتہ یہ کافر اور زندیق ہے۔ ''شیعہ'' کا حکم بھی یہی ہے کہ اگر کوئی آدمی سُنّی ہو اور پھر شیعہ ہو جائے اور کُفریہ عقائد اختیار کر لے تو وہ مرتد ہوگا اور اس کا ذبیحہ بھی حرام ہوگا، لیکن جو ابتدا سے ہی شیعہ ہو اس کے بارے میں محققین حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ وہ بھی کافر اور زندیق ہے، پھر ایسے مرزائیوں اور شیعوں کو ''اہلِ کتاب'' میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن کریم کی اصطلاح ان پر صادق آتی ہے یا نہیں؟ تو حضرت مولانا عبدالستار تونسوی صاحب زید مجدہم نے فرمایا تھا کہ قرآن کریم جن کو ''اہلِ کتاب'' کہتا ہے اور ان کا ذبیحہ حلال قرار دیتا ہے ان ''اہلِ کتاب'' سے ''اہلِ قرآن'' قطعاً مراد نہیں، اس سے صرف ''اہلِ توراۃ'' اور ''اہلِ اِنجیل'' مراد ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ جہاں جہاں ''اہلِ کتاب'' کا لفظ بولا گیا ہے تو اس کا مصداق توراۃ اور اِنجیل والے ہی ہیں، لہٰذا جو مرزائی اور شیعہ اِبتدا ہی سے مرزائی ہوں یا شیعہ ہوں اور کُفریہ عقائد رکھتے ہوں، وہ ''زندیق'' ہیں، وہ نہ ''اہلِ کتاب'' میں شامل ہیں، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے، اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

تو یہاں ''اہلِ کتاب'' کا ذبیحہ حلال قرار دے دیا گیا، وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ: اور تمہارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے۔ ''ہمارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہمارا ذبیحہ کھائیں گے تو اُن کے جرم کے اندر اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر ہم اپنا ذبیحہ ''اہلِ کتاب'' کو کھلا دیں گے تو ہم پر بھی گناہ نہیں ہوگا، ورنہ اگر کوئی چیز حرام ہے اور وہ ہم کسی کو کھلائیں گے تو ہم بھی جرم کرنے والے ہوں گے، لیکن جب ہمارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے تو ہم اپنا ذبیحہ ان کو کھلا سکتے ہیں، جیسے اپنی قربانی کے گوشت میں سے ان کو دے دیا جائے، اپنے ذبح کیے ہوئے جانور میں سے دے دیا جائے۔

پاک دامن عورتوں سے نکاح کی ترغیب

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ: اسی طرح سے پاک دامن عورتیں مؤمنات میں سے، مؤمنات کا مصداق وہ ہیں جو سرورِ کائنات ﷺ پر اِیمان لانے والی ہیں، پاک دامن کا عنوان جو اختیار کیا گیا ہے یہ محض ترغیب دینے کے لئے ہے کہ انسان جس وقت بھی عورت اختیار کرے پاک دامن اختیار کرے، نکاح کے لئے پاک دامن عورت کو اختیار کرنا چاہیے، یہ بطور ترغیب کے ہے، اور اگر کوئی عورت فاحشہ ہے، زانیہ ہے، بدکارہ ہے، نکاح تو اس کے ساتھ ہو جائے گا لیکن بہتر نہیں ہے، اُس کے ساتھ نسب گندہ ہوتا ہے، آنے والی نسل کے اخلاق تباہ ہوتے ہیں، تو ایسی عورتوں کو نکاح کے لئے اختیار نہیں کرنا چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص زانیہ سے (جیسے یہ رنڈیاں وغیرہ ہوتی ہیں) اگر ان کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے تو نکاح ہو جاتا ہے، نکاح کے جواز میں شبہ نہیں ہے لیکن ایسی عورتوں سے نکاح کرنا نہیں چاہیے، جس طرح سے آپ کے سامنے سورۂ نور میں آئے گا حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔

موجودہ ''اہلِ کتاب'' کی عورتوں سے نکاح کا حکم

تو مؤمنات میں سے پاک دامن عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئیں، اور اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتیں تمہارے لیے حلال کر دی گئیں، یعنی اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ بھی تم نکاح کر سکتے ہو۔ اور قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آ گیا کہ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ (سورۂ بقرہ:۲۲۱) مشرکات کے ساتھ نکاح نہ کیا کرو، اسی طرح سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک یہی ہے کہ موجودہ ''اہلِ کتاب'' چونکہ مشرک ہیں اور قرآنِ کریم کے اندر صراحۃً آ گیا: لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ کہ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کیا کرو، لہٰذا ان عیسائی، یہودی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں، بعض دیگر تابعین کا قول بھی آتا ہے، لیکن جمہور صحابہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک جو بھی ''اہلِ کتاب'' کا مصداق ہیں جس کی تفصیل آپ کے سامنے ذکر کر دی گئی، چاہے ان کے نظریات کے اندر کفر اور شرک شامل ہو گیا ہو، وہ مشرکات کا مصداق نہیں ہیں، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ''اہلِ کتاب'' کا مصداق علیحدہ ہے، اور قرآنِ کریم نے ان کو مشرکین اور مشرکات کے عنوان کے تحت ذکر نہیں کیا، تو نظریات میں اس قسم کی گڑبڑ ہونے کے باوجود ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح حلال ہے، جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے، جمہور صحابہ کا یہی مسلک ہے، اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا نکاح کرنا بھی ثابت ہے، لیکن مصلحت کے خلاف ہے، کہ اگر غیر مذہب والی عورتیں اپنے گھر کے اندر لے آئیں گے تو بچوں پر بھی برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، خاص طور پر آج کل تو سیاسی طور پر بھی انتہائی نقصان ہے، کہ غیر مذہب والے اپنی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں دے کر بھیجتے ہیں، پھر وہ جاسوسی کرتی ہیں، سازشیں کرتی ہیں، اس طرح سے کتنی سلطنتیں تباہ ہو گئیں، اور کتنے گھرانے تباہ ہو گئے، یہ واقعات چونکہ مسلسل پیش آتے ہیں، اس لئے مصلحت کے خلاف ہونے کی بنا پر روکا جائے گا۔ اور نکاح کرتے وقت صرف عیسائی، یہودی کا عنوان کافی نہیں، جیسے پہلے ذبیحہ کے مسئلے میں عرض کر دیا کہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے نظریات اس قسم کے ہیں یا نہیں، خدا کے قائل ہوں، توحید کا دعویٰ رکھتے ہوں، رسالت کے قائل ہوں، اور اس کتاب کو من جانب اللہ مانتے ہوں، اور اس کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہوں، تب جا کے ان کی عورتیں حلال ہوں گی، اگر محض سیاسی انداز کے ساتھ ہی عیسائی اور یہودی شمار ہوتے ہیں، باقی وہ نظریاتی طور پر خدا کے منکر ہیں، جس طرح سے سوشلسٹ قسم کے لوگ ہو گئے یہ بھی اصل کے اعتبار سے یہودی تھے، کارل مارکس یہودی ہے، لینن یہودی ہے، سٹالن یہودی ہے، تو اس قسم لوگ جتنے ہیں چاہے وہ یہودی ہیں لیکن خدا کے وجود تک کے بھی منکر ہو گئے، جب وہ خدا کے وجود تک کے منکر ہو گئے تو ان کی عورتوں کو حلال نہیں قرار دیا جائے گا۔

نکاح کی چند شرائط

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ: یہ قید تو ایسی ہی ہے جیسے پانچویں پارے میں آپ کے سامنے ذکر ہو گئی تھی، کہ نکاح کے اندر چونکہ مہر متعین کرنا ضروری ہے، پھر وہ مہر ادا بھی کرنا چاہیے، ''جبکہ تم انہیں دے دو ان کے اجر اس حال میں کہ تم ان کو قیدِ نکاح میں لانے والے ہو'' یعنی نکاح کر کے ان کو بیوی بنا کر رکھنا مقصود ہے محض وقتی طور پر مستی نکالنا مقصود نہیں ہے، غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: تم ایسے ہی شہوت رانی کے طور پر پانی گرانے والے نہیں ہو، یعنی وقتی جوش کم کرنا مقصود نہیں کہ مٹانے کا بوجھ ہی ہلکا کرنا ہے، بیوی بنا کر رکھنا

کوئی مقصود نہیں ہے، جس طرح پیشاب سے مثانہ بھر جائے تو پیشاب خانہ تلاش کیا جاتا ہے، اسی طرح سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے لئے انسان کوئی مکان محل تلاش کرے وہ ''مُسٰفِحِیْنَ'' کا مصداق ہے، ایسے نہ ہو، بلکہ اس کو بیوی بنا کر رکھنا مقصود ہے، وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ کا معنی یہ ہے کہ پھر علی الاعلان قاعدے کے مطابق نکاح کیا جائے، چنانچہ اہلِ کتاب کے ہاں بھی نکاح کا طریقہ ایسے ہی تھا، ایجاب وقبول علی الاعلان ہوتا ہے تو اہلِ کتاب کے ہاں نکاح ہوتا ہے، تو ان کے ہاں ذبح کے اَحکام بھی ویسے ہیں جیسے کہ اسلام میں ہیں، اور نکاح کے اَحکام بھی ایسے ہیں جیسے کہ اسلام میں ہیں۔ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ: اور نہ تم ان کو خفیہ یار بنانے والے ہو، خفیہ طور پر آشنائی لگانے والے نہ ہو۔

''اہلِ کتاب'' کے ساتھ اختلاط میں اندیشہ

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ: اب اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے کی، ان کے ذبیحہ کے استعمال کرنے کی، اور ان کی عورتوں کو نکاح میں لانے کی جب اجازت دے دی گئی تو اس اختلاط میں اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان سے متاثر ہو کر کُفر اختیار کرلے، تو ساتھ ہی اس پر وعید ذکر کردی، کہ ان کے ساتھ میل جول اور ان کے ساتھ بیاہ شادی میں مشغول ہونے کی وجہ سے اگر کسی ایسی بات کا انکار کردیا جس پر ایمان لانا ضروری ہے (ایمان سے مؤمن بہ مراد ہے، یعنی ایمانیات) اگر کسی ایسی بات کا کوئی انکار کرے گا جس پر ایمان لانا ضروری ہے تو اُس کا عمل ضائع ہوجائے گا، اُس کی نیکیاں برباد ہوجائیں گی، وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ: اور یہ شخص آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ
اے ایمان والو! جس وقت تم اُٹھو نماز کی طرف تو دھو لیا کرو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو
اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ وَاِنْ
کہنیوں تک اور اپنے سَروں کو مَل لیا کرو، اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں کو دھو لیا کرو، اور اگر
كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ
تم جنبی ہو تو خوب اچھی طرح سے اپنے آپ کو پاک کر لیا کرو، اور اگر تم مریض ہو یا تم سفر پر ہو یا
جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا
تم میں سے کوئی پیشاب پاخانے سے فارغ ہو کر آیا ہے، یا تم نے عورتوں سے جماع کیا ہے، پھر تم پانی نہیں

مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ

پاؤ، تو تم قصد کرلیا کرو پاک مٹی کا، پھر تم مل لیا کرو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو

مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ

اس مٹی سے، نہیں ارادہ کرتا اللہ کہ کرے تمہارے اوپر کسی قسم کی تنگی، لیکن ارادہ کرتا ہے

لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٦

کہ تمہیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دے، تاکہ تم احسان مانو ⑥

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور یاد کرو اللہ کے اس میثاق کو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا

اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ

جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں

الصُّدُوْرِ ۝٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ

کو جاننے والا ہے ⑦ اے ایمان والو! تم اللہ کے لیے احکام کو سنبھالنے والے ہو جاؤ، انصاف کے ساتھ گواہی دینے

بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ

والے ہوجاؤ، کسی قوم کی عداوت تمہیں برانگیختہ نہ کرے اس بات پر کہ تم انصاف نہ کرو،

اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ

انصاف کیا کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝٨ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

ان کاموں کی جو تم کرتے ہو ⑧ وعدہ کیا اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٩ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ

ان کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے ⑨ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ
یہی جہنم والے ہیں ⑩ اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے احسان کو
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ
جو تم پر ہے جبکہ قصد کیا تھا ایک قوم نے کہ تمہاری طرف وہ دست درازی کریں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو
اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪
تم سے روک لیا، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور مؤمنوں کو اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ⑪

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ: اے ایمان والو! جس وقت تم اٹھو نماز کی طرف۔ ''قیام'' کا صلہ جس وقت ''الیٰ'' آئے تو اس کا معنی ''متوجہ ہونا، قصد کرنا'' ہوجایا کرتا ہے، اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت تم نماز ادا کرنے کا قصد کرو، ''اے ایمان والو جس وقت تم نماز کی طرف اٹھو'' یعنی نماز کے ادا کرنے کا، نماز کے پڑھنے کا قصد کرو، نماز کی طرف توجہ کرو، فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ: تو اپنے چہروں کو دھولیا کرو، وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ: اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولیا کرو۔ مرافق مِرْفَق کی جمع ہے، وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ: مَسَح: ملنا، ہاتھ پھیرنا۔ اور اپنے سروں کو مل لیا کرو، وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ: لام کے اُوپر چونکہ فتحہ آ گیا، یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ اس کا عطف ''رؤس'' پر نہیں ہے بلکہ ''وُجُوْهَكُمْ'' پر اور ''اَيْدِيَكُمْ'' پر ہے، تو یہ بھی ''فَاغْسِلُوْا'' کے نیچے داخل ہے۔ اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں کو دھولیا کرو۔ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا: اور اگر تم جنبی ہوو، یعنی تمہیں حدثِ اکبر لاحق ہوگیا جس میں غسل کی حاجت ہوتی ہے۔ اگر تم جنبی ہو، جنابت والے ہو، فَاطَّهَّرُوْا: تو پھر مبالغے کے ساتھ اپنے آپ کو پاک کرلیا کرو، جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے بدن کی طہارت حاصل کرو۔ خوب اچھی طرح سے اپنے آپ کو پاک کرلیا کرو، وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى: مرضیٰ مریض کی جمع ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی بیماری ہے، اگر تم مریض ہو، اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: یا تم سفر پر ہو، اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ: یا مرض اور سفر کا عذر نہیں، بلکہ عام حالات میں بھی تم میں سے کوئی شخص غائط سے آیا ہے۔ غائط کا لفظی معنی ہے پست زمین، اور عام طور پر چونکہ قضائے حاجت کے لئے انسان باہر جائے تو کوئی گڑھا وغیرہ پست زمین ہی تلاش کرتا ہے، تاکہ اردگرد چلنے پھرنے والوں کی نگاہ نہ پڑے تو پھر یہ جائے ضرورت سے کنایہ ہوگیا، تو مطلب اس سے یہ ہے کہ پیشاب پاخانے سے کوئی فارغ ہو کے آیا، اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ: یا تم نے عورتوں سے ملامست کی ہے، اور ملامست سے مراد مجامعت۔ تم نے عورتوں سے جماع کیا ہے۔ جیسے غائط سے آنا حدثِ اصغر کا ذریعہ ہے، تو عورتوں کے ساتھ ملامست یہ حدثِ اکبر کا ذریعہ ہے، ان سب صورتوں میں فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً: پھر تم پانی نہیں پاتے، پانی کے استعمال کرنے پر تمہیں قدرت نہیں، یہاں وِجدان سے قدرت مراد ہے، پانی کے

استعمال کرنے کا تمہیں موقع نہیں ہے، چاہے اس لیے کہ پانی موجود نہیں، چاہے اس لیے کہ بیماری وغیرہ کے عذر سے پانی کا استعمال کرنا نقصان دیتا ہے، عدمِ وجدانِ ماء دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ ''پھر تم پانی استعمال کرنے کا موقع نہ پاؤ، تمہیں پانی استعمال کرنے پر قدرت نہ ہو'' فَتَيَمَّمُوْا: تو تم قصد کرلیا کرو، صَعِيْدًا طَيِّبًا: پاک مٹی کا۔ ''تیمم'' قصد کرنے کو کہتے ہیں جیسے یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے سورۂ بقرۃ کے اندر بھی گزرا تھا وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (آیت:۲۶۷)۔ ''تو قصد کرلیا کرو تم پاک مٹی کا'' فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ: پھر تم مل لیا کرو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو، مِّنْهُ: اس مٹی سے، اس صعید طیب سے، مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ: نہیں ارادہ کرتا اللہ کہ کرے تمہارے اُوپر کسی قسم کی تنگی، وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ: لیکن ارادہ کرتا ہے کہ تمہیں صاف ستھرا کرے، وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ: اور تا کہ وہ اپنی نعمت کو تم پر پوری کردے، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تا کہ تم شکر گزار ہوجاؤ، تا کہ تم احسان مانو۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے، وَمِيْثَاقَهُ: اور یاد کرو اللہ کے عہد کو جو اللہ نے تم سے لیا، الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ: وہ عہد کہ جس کے ساتھ اللہ نے تمہارے ساتھ میثاق کیا ہے، تمہارے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ ''یاد کرو اللہ کے اس میثاق کو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا'' اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا: جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سُن لیا اور مان لیا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بیشک اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے، باقوالٍ ذاتِ الصُّدور، باُمورٍ ذاتِ الصُّدور۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ: ہوجاؤ تم اللہ کے لئے قوّام۔ قوّام قام یقوم سے لیا گیا ہے، قوام اصل میں سنبھالنے والے کو کہتے ہیں، جس سے قیّام آتا ہے، قیّام السموات، قیّم السموات، قوام بھی اسی میں سے ہے، قوام حاکم کے معنی میں بھی ہوتا ہے، اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (سورۂ نساء:۳۴) لیکن وہاں بھی وہی سنبھالنے والا معنی ہے، مرد عورتوں پر کنٹرول کرنے والے ہیں، مرد عورتوں کو سنبھالنے والے ہیں۔ تو تم بھی اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے ہوجاؤ، اللہ کے لئے اللہ کے احکام کو قائم کرنے والے، سنبھالنے والے ہوجاؤ، شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ: انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے ہوجاؤ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ: نہ برانگیختہ کرے تمہیں، شَنَاٰنُ قَوْمٍ: ''شَنَاٰنُ'' کا لفظ اسی سورت میں پہلے گزرا ہے عداوت کے معنی میں۔ ''شَنَأَ'' دشمنی کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے ''اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۞ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۞ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۞ '': وہاں ''شَانِئ'' اسم فاعل کا صیغہ ہے، آپ سے عداوت رکھنے والا هُوَ الْاَبْتَرُ: ابتر وہی ہے۔ تو ''شَنَاٰنُ'' کا معنی عداوت۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ: کسی قوم کی عداوت تمہیں برانگیختہ نہ کرے، عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا: اس بات پر کہ تم انصاف نہ کرو۔ عدمِ عدالت اور انصاف نہ کرنے پر کسی قوم کی عداوت تمہیں برانگیختہ نہ کرے، باعث نہ بن جائے تمہارے لیے کسی قوم کی عداوت کہ تم انصاف نہ کرو، اِعْدِلُوْا: انصاف کیا کرو، هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى: یہ عدل، یہ انصاف کرنا یہ تقویٰ کی طرف زیادہ قریب ہے، تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم کرتے ہو۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ: ان کے لئے مغفرت ہے، وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ: اور بڑا اجر ہے، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ: اور ہماری آیات کو جھٹلایا، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ: یہی جہنم والے ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم

پر ہے، اِذْهَمَّ قَوْمٌ: جبکہ قصد کیا تھا ایک قوم نے، اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ: کہ تمہاری طرف وہ دست درازی کریں، پھیلائیں وہ تمہاری طرف اپنے ہاتھوں کو، تمہاری طرف دست درازی کرنے کا قصد کیا تھا، فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ: پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک لیا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اور مؤمنوں کو اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

ابتدائے سورت سے ہی اَحکام کا سلسلہ شروع ہوا، اور یہ جتنے بھی اَحکام ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ بندے کے عہد کے تحت آتے ہیں، جیسے کہ اس رُکوع میں بھی ذکر کیا جائے گا کہ جب تم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ دیا تو اللہ کے ساتھ ایک عہد و میثاق کرلیا، اور اسی کے ایفاء کی تاکید اس سورت کی اِبتدا کے اندر کی گئی تھی، جس کی تفصیل آپ کی خدمت میں کردی گئی تھی کہ ''لا الٰه الا الله محمد رسول الله'' جو بنیادی کلمہ ہے، جس کو پڑھ کر انسان مؤمن بنتا ہے اور مؤمنین کی صف میں شامل ہوتا ہے، یہ حقیقت کے اعتبار سے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا عنوان ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور اس کی حکومت کو تسلیم کرلیا، میرا اِلٰہ اور حاکم اللہ ہے، میں اس کی باتوں کو سنوں گا اور ان کو مانوں گا، اور اللہ تعالیٰ کی باتیں سننے کا ذریعہ اللہ کا رسول ہے، محمد رسول اللہ، وہ ترجمان ہیں اللہ تعالیٰ کے، اس لئے حضور ﷺ کی اطاعت اصل کے اعتبار سے اللہ کی ہی اطاعت ہے، تو جب تم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ لیا، احکام ماننے کا میثاق اور عہد کرلیا، تو تم اُس کو پورا کرو، جب تم پورا کرو گے تو پھر مقابلے میں اس عہد کی دوسری شق کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ دنیا اور آخرت میں یہ معاملہ کریں گے، اُس کو بھی یہاں پر ذکر کیا جارہا ہے کہ اگر تم اس عہد کی پابندی کرو گے جو سمع وطاعت کا عہد تم نے کیا ہے، احکام کو سنو گے اور مانو گے، تو پھر میری طرف سے بھی وعدہ ہے کہ میں تمہیں دنیا اور آخرت کے اندر کامیابی دوں گا، اسی عنوان کے تحت مختلف قسم کے احکام آپ کے سامنے ذکر کئے جارہے ہیں۔ تو پہلے رکوع کے اندر جن چیزوں کا ذکر آیا ہے وہ زیادہ تر ازدواجی زندگی کے ساتھ اور بطنی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، یعنی کھانے پینے کے معاملات، پیٹ کے معاملات اور فرج کے معاملات، اس کے بارے میں کچھ ہدایات دی گئی تھیں، تو اس میں کھانا پینا بھی آگیا اور اَزواج کے ساتھ تعلق کا بھی کچھ ذکر آگیا، اب یہ جو اَحکام اِس رُکوع کی اِبتدا میں دیے جارہے ہیں ان کا تعلق براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ہے، اس میں معاملہ کا پہلو نہیں ہے، پہلی جو باتیں تھیں ان کے اندر معاملہ بھی تھا جیسے ازدواجی زندگی ہوگئی، اور یہ خاص طور پر خالص عبادت کے احکام ہیں جو یہاں ذکر کیے جارہے ہیں، اور ویسے بھی جب انسان کھانے پینے میں مشغول ہوتا ہے یا ازواج کے ساتھ تعلق رکھتا ہے تو یہ دونوں صورتیں ہی ایسی ہیں جو انسان کو مَلَکِیَّت سے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نفسانی تقاضوں کی طرف قریب کردیتی ہیں اور انسان شیطنت کی طرف قریب ہوجاتا ہے، اور اَحداث جتنے بھی ہیں جن کے نتیجے میں انسان میں

کسی قسم کی ناپاکی آتی ہے، وہ انہی دو کاموں کا نتیجہ ہے، یا کھانے پینے کا نتیجہ ہے یا ازواج کے ساتھ تعلقات کا نتیجہ ہے، تو یہ کھانے پینے میں جس طرح سے ایک نفس پروری ہو جاتی ہے، بیویوں کے ساتھ تعلقات میں ایک نفسانی شہوت کا پورا کرنا ہے، تو اُس کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے بُعد کا ذریعہ نہ بنایا جائے، بلکہ ان میں بھی اللہ کے احکام کی پابندی کی جائے، تو عبادت کا معنی ان میں بھی پیدا ہو جائے گا، اور پھر کھانے پینے کے ساتھ اور ازواج کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے انسان کے اُوپر جو احداث وغیرہ کے اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کو زائل کرنے کا طریقہ بتادیا، اور زائل کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف انسان کو متوجہ کردیا، طہارت سے دوری جو ہوتی ہے وہ انہی دو راستوں سے ہوتی ہے، یا کھانے پینے کے راستے سے یا ازواج کے ساتھ تعلقات کے راستے سے، مثلاً آپ کے سامنے نواقض وضو میں کیا ہے؟ پیشاب ہے پاخانہ ہے، خروجِ ریح ہے اس قسم کی نجاسات کا بدن سے خارج ہونا یہ سارا کھانے پینے کا نتیجہ ہے، اسی طرح خروجِ مذی اور مباشرتِ فاحشہ وغیرہ کے ساتھ سے جو وضو ٹوٹتا ہے اور نزولِ منی سے جو غسل واجب ہوتا ہے تو یہ سارے اَحداث ایسے ہیں کہ جن کا تعلق شہوانی جذبے سے ہے جس کا رخ عورتوں کی طرف ہوا کرتا ہے، تو یہ چیزیں جو انسان کو طہارت سے دُور لے جاتی ہیں، تو اس طہارت کے حاصل کرنے کے لئے اور اس حدث اور نجاست کو زائل کرنے کے لیے اب طریقے کی تعلیم دی جارہی ہے، کہ اس طرح سے طہارت حاصل کر کے تم مَلَکِیّت کے کی طرف قریب ہو جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ صفائی اور ستھرائی کے ساتھ ہونا چاہیے تو یہ آیات طہارت کے مسئلے پر مشتمل ہیں۔

اگر طہارت پہلے سے حاصل ہو تو پھر تطہیر کی ضرورت نہیں

خطاب تو اسی طرح سے کیا گیا جیسے آپ کے سامنے وضاحت کردی تھی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا یہ بڑی محبت کا خطاب بھی ہے، اور عہد کی یاددہانی کا خطاب بھی ہے، تفصیل آپ کے سامنے بار بار کی جاچکی، ''جب تم نماز کی طرف اٹھو'' اٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ادا کرنے کا قصد کرو، نماز کا وقت آگیا اور تم نماز پڑھنا چاہتے ہو تو دیکھا کرو کہ نماز میں حاضر ہونے کے لئے جس قسم کی طہارت مطلوب ہے، کیا وہ تمہیں حاصل ہے؟ اگر طہارت حاصل ہو تو نئے سرے سے حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ اگر انسان پہلے باوضو ہے ایک نماز پڑھ چکا ہے، وضو ٹوٹا نہیں، دوسری نماز کا وقت آگیا تو پھر دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اسی طہارت کی حالت میں انسان نماز پڑھ سکتا ہے جو اُس کو پہلے سے حاصل ہے، لیکن اگر وضو کرلے گا تو یہ زیادتِ نُور کا ذریعہ ہے اور باعث ثواب ہے، لیکن ضروری نہیں، اگر وضو پر وضو کرنے کا حکم دیا جائے تو یہ تحصیل حاصل ہے، اس لئے حکم کے درجے میں تو نہیں ہے، لیکن جس طرح سے ظاہری سطح عموم کو چاہتی ہے کہ جب بھی تم نماز کی طرف متوجہ ہو، تو اس لیے اگر وضو پر وضو کرلیا جائے تو یہ زیادتِ نُور کا باعث ہے، اس میں فضیلت ہے جس طرح سے آپ حدیث شریف کی کتابوں میں پڑھیں گے اگرچہ فرض نہیں، آگے اس کی حکمت آئے گی وَّلٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ جس سے معلوم ہوگا، کہ یہ حکم تطہیر کے لئے دیا جارہا ہے، اور اگر طہارت پہلے ہی حاصل ہو تو پھر تطہیر کی ضرورت نہیں، جس کی بنا پر اس آیت کے مفہوم میں یہ بات ہوگی اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ وَاَنْتُمْ مُحْدِثُوْنَ فَاغْسِلُوْا، یہ وَاَنْتُمْ مُحْدِثُوْنَ کی قید سیاق وسباق کے قرینے کے ساتھ لگائی جائے گی، کہ اگر تمہیں

کسی قسم کا حدث ہو پھر تم نماز پڑھنے کا قصد کرو تو ایسی صورت میں تم وضو کرلیا کرو، یہ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ کے بعد جو کچھ ذکر کیا گیا ہے حدیث شریف میں اسی کے لئے وضو کا عنوان اختیار کیا گیا ہے، یہ طہارتِ صغریٰ کہلاتی ہے، یہ حدثِ اصغر کے زائل کرنے کا طریقہ ہے، ''دھولیا کرو تم اپنے چہروں کو، اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو، اور مل لیا کرو تم اپنے سروں کو' سروں پر مسح کرلیا کرو،'' اور دھولیا کرو تم اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک۔''

وضو کے فرائض، سنن اور مستحبات

آپ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ قرآنِ کریم میں ان چار چیزوں کو جو ذکر کیا گیا، تو اَحناف کے نزدیک فرض یہی چار ہیں، باقی ان کے اندر دھونے کا تکرار، اور کہاں تک ان کا استیعاب کرنا ہے، اور ان کے اندر ترتیب کیا ہے، یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہوں گی جو کہ سنن سے معلوم ہوں گی، سرورِ کائنات ﷺ کے بیان کردہ طریقوں سے، تو ان کا درجہ اِس سے اسفل ہوگا، جو کتاب اللہ سے ثابت ہے وہ فرض کے درجے میں آئیں گی، اور جو احادیث سے ثابت ہوں گی درجہ بدرجہ وہ سُنّت، مستحب اور آداب کے درجے کے اندر ہم ان کو شمار کرتے چلے جائیں گے، ان چاروں پر عمل کرلینے کے ساتھ کہ چہرے دھولیے، جہاں تک وجہ کا اطلاق لغوی طور پر آتا ہے، پیشانی کے بال اُگنے سے لے کر یہ جتنا انسان کے مواجہ ہوتا ہے ایک دوسرے کے سامنے، یہ ہے چہرے کی حد، اس کو دھولیا جائے، کہنیوں تک ہاتھوں کو دھولیا جائے، سر کے اوپر ہاتھ پھیر لیا جائے، اور ٹخنوں تک پاؤں کو دھولیا جائے تو فرض ادا ہوگیا، طہارت حاصل ہوگئی، نماز پڑھنی جائز ہوگئی، باقی اِس کے اُوپر اضافے جو سرورِ کائنات ﷺ کے عمل سے اور آپ کے اقوال سے اور روایات سے ثابت ہوں گے اُن کا درجہ اِن سے نیچے رکھا جائے گا وہ فرض کے درجے میں نہیں ہوں گے، سنن مستحب اور آداب کے اندر ان کو شمار کرلیا جائے گا۔

غُسل کا طریقہ اور فرائض

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا: یہ دوسری صورت آگئی کہ حدثِ اکبر تمہیں لاحق ہے، شدت کا حدث تمہیں آیا ہوا ہے، احتلام ہوا ہے، یا بیداری میں کسی وجہ سے اِنزال ہوا ہے، جنابت آگئی، تو اگر تم جُنب ہو تو پھر صرف اِن چار اعضاء کا دھولینا کافی نہیں بلکہ فَاطَّهَّرُوْا: مبالغے کے ساتھ طہارت حاصل کرو، اور مبالغے کے ساتھ طہارت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے بدن کے جس حصے تک تم پانی پہنچا سکتے ہو وہاں تک پانی پہنچا کر اس کو دھوؤ، اس لئے جنابت کی حالت میں ظاہر بدن سارے کا دھونا ضروری ہوتا ہے، بدن کا کوئی حصہ خالی نہیں ہونا چاہیے، ناف اگر گہری ہے تو اس کو بھی ذرا انگلی ڈال کر ٹھیک کرلو، کان کے سوراخوں کے اندر بھی اچھی طرح سے اُنگلی پھیرو، اپنی بغلوں وغیرہ کو، اور یہ سمجھیں جو بھی جوڑوں کے اندر ایسی جگہ ہوتی ہے جس کے سوکھے رہ جانے کا امکان ہوتا ہے کہ پانی نہ پہنچے تو اہتمام کے ساتھ وہاں پانی پہنچاؤ، ناک کے جس حصے تک بغیر خاص تکلف کرنے کے پانی پہنچایا جاسکتا ہے وہاں تک پانی پہنچاؤ، منہ کے اندر جہاں تک آسانی کے ساتھ پانی پہنچایا جاسکتا ہے وہاں تک پانی پہنچاؤ، اور جہاں پانی پہنچانے کا نقصان ہے، مثلاً آنکھوں کو اندر سے دھونا نقصان دہ ہے، اس چیز کو شریعت نے مستثنیٰ کردیا، اس لیے آنکھوں کو اندر سے دھونا کوئی

ضروری نہیں ہے، چہرے کو اُوپر اُوپر سے دھولیں، ناک میں بھی وہاں تک پانی چڑھائیں جہاں تک آسانی سے چڑھایا جاسکتا ہے، اور منہ کو بھی اُسی طرح سے مبالغے کے ساتھ دھوئیں کہ جہاں تک آسانی کے ساتھ دھویا جاسکتا ہے۔ اس لئے جنابت کے غسل کے اندر کلّی کرنا بھی فرض ہے، اور ناک میں پانی ڈالنا بھی فرض ہے، کیونکہ فَاطَّهَّرُوْا جس مبالغے کو چاہتا ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ بدن کا کوئی حصہ بچے نہ، جس کو تم دھو سکتے ہو بغیر کسی قسم کے نقصان پہنچانے کے اُس کا دھونا ضروری ہے، کانوں کے اندر کے حصے تک جہاں تک اُنگلی پھر سکتی ہے اِس کا دھونا، اور ایسے ہی باقی اعضا کے جوڑوں کے اندر جس قسم کی مخفی جگہیں ہوتی ہیں سب کا دھونا فرض ہے، اگر تھوڑی سی چیز بھی باقی رہ جائے گی تو غسل ادا نہیں ہوا، یہ سارے کا سارا مسئلہ فَاطَّهَّرُوْا سے نکلے گا، کہ زور لگا کر جتنی تم طہارت حاصل کر سکتے ہو اتنی طہارت حاصل کرو، جہاں جہاں پانی پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ، حدثِ اصغر اور حدثِ اکبر کے زائل کرنے کی یہ دونوں صورتیں اس وقت تھیں جس وقت کہ پانی موجود ہو، پہلے کا عنوان ہے وضو اور دوسرے کا عنوان ہے غسل، اور اس کا ذکر پہلے تَغْتَسِلُوْا کے لفظ کے تحت بھی آچکا ہے (سورۂ نساء: ۴۳)۔

تیمّم کن صورتوں میں جائز ہے؟

اب آگے! کبھی ایسی صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ آپ کو طہارت حاصل کرنے کی تو ضرورت پیش آگئی، مثلاً وضو ٹوٹ گیا اور نماز پڑھنے کا ارادہ کرلیا، یا غسل ٹوٹ گیا اور ادھر نماز پڑھنے کا ارادہ ہوگیا، نماز کا وقت آگیا، اب پانی یا تو موجود نہیں، آپ سفر میں ہیں، آبادی سے باہر ہیں، لیکن اِس میں یاد رکھیے کہ تیمّم میں سفرِ شرعی ہونا ضروری نہیں، اگر انسان گھر سے باہر ہے، جنگل میں، باہر علاقے میں، اور میل میل کے ایریے میں پانی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں شریعت اجازت دیتی ہے کہ تم تیمّم کرلو، اِس میں سفرِ اصطلاحی ضروری نہیں، سفر پر ہے یا کسی ایسے حال میں ہے کہ جہاں پانی موجود نہیں ہے، چاہے شرعی طور پر وہ مسافر نہیں، مقیم کے لئے بھی تیمّم جائز ہے، اگر کوئی ایسی جگہ موجود ہے جہاں میل میل ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے اندر پانی نہیں ہے تو ایسے وقت میں انسان مٹی کے ساتھ تیمّم کرسکتا ہے، فقہ کے اندر آپ نے اس مسئلے کی تفصیل پڑھی ہوئی ہے، وضو کی ضرورت پیش آگئی یا غسل کی، پانی موجود نہیں یا موجود ہے لیکن بدن میں کوئی ایسی بیماری ہے کہ جس میں پانی کے استعمال کرنے کے ساتھ ہلاکت کا اندیشہ ہے یا مرض کے اضافے کا اندیشہ ہے، ایسی صورت میں طہارت حاصل کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک آسان سا طریقہ بتادیا، تاکہ تم اپنی اس نجاست سے اور حدث سے جان چھڑالو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت وقت پر ادا کرلو اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے، ''صعید'' کہتے ہیں وجہ الارض کو یعنی زمین کی سطح، پاک جگہ دیکھ کر اس کے اُوپر ہاتھ مار کر اسی کے ساتھ ہی اپنے چہرے اور ہاتھوں کو مل لیا جائے، تو چونکہ اس طریقۂ طہارت کو اللہ تعالیٰ نے تَیَمَّمُوْا کے لفظ کے ساتھ ادا کیا ہے، تو فقہاء نے اس طریقۂ طہارت کا نام بھی ''تیمّم'' ہی رکھ لیا، ورنہ تیمّم کا لفظی معنی ہوتا ہے قصد کرنا، اور اس طریقۂ تطہیر کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ''تیمم'' کے لفظ سے ذکر کیا کہ قصد کرلیا کرو پاک مٹی کا، تو اِصطلاحی طور پر اس کے لئے ''تیمم'' کا لفظ اختیار کرلیا گیا، تو اب جس وقت آپ سے فقہی طور پر پوچھا جائے گا کہ ''تیمم'' کسے کہتے ہیں؟ تو اس کا معنی ہوگا صعیدِ طیب سے طہارت حاصل کرنا، اور ویسے ''تیمم'' کا لفظی معنی قصد کرنا

ہے، باقی اِس لفظ کو اِس طریقۂ تطہر کے لئے کیوں اختیار کرلیا گیا؟ اس لیے کہ قرآنِ کریم میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے، تو یہ اصطلاح یہیں سے لے لی گئی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى: اگر تم بیمار ہوؤ، مرضیٰ مریض کی جمع ہے، اور مطلقاً بیماری مراد نہیں، بلکہ ایسی بیماری مراد ہے کہ جس کے اندر پانی کا استعمال نقصان دیتا ہے، نقصان کا مطلب یہ ہے کہ مرض بڑھتی ہے یا اگر پانی استعمال کریں گے تو مریض کے آرام آنے میں دیر لگ جائے گی، یا پانی کے استعمال کرنے میں ہلاکت کا اندیشہ ہے، جس طرح سے کوئی سر میں زخم وغیرہ ہوگئے، حدیث شریف میں جیسے آتا ہے، کہ ایک صحابی زخمی ہوگئے سر میں زخم ہوگیا تھا، اور پانی استعمال کیا، سر میں ڈالا تو وفات پاگئے"[1] تو ایسا بھی ہوتا ہے، تو "مرض" سے ایسی مرض مراد ہے کہ جس میں پانی کا استعمال کرنا زیادتِ مرض کا باعث ہو یا ہلاکت کا باعث ہوجائے یا مرض کے ٹھیک ہونے میں دیری کا باعث ہوجائے، کہ اگر ہم پانی استعمال نہیں کریں گے تو مرض جلدی ٹھیک ہوجائے گی، پانی استعمال کریں تو دیر لگے گی، یہ بھی ایک نقصان ہے جس سے بچنے کے لئے شریعت نے اجازت دے دی ہے کہ پانی استعمال نہ کرو۔ اگر تم سفر پر ہوؤ اور پانی تمہیں میسر نہیں ہے، بیابان میں کہیں جا رہے ہو یا نہ مرض ہے نہ سفر ہے لیکن صورت پیش آگئی حدث کی، اور حدثِ اصغر جیسے غائط سے آئے ہو، پیشاب پاخانے سے کوئی اس قسم کی ضرورت پوری کر کے آئے ہو، اس سے حدثِ اصغر کی طرف اشارہ ہے کہ پیشاب پاخانے سے حدثِ آیا کرتی ہے، یا تم نے عورتوں سے ملامست کرلی، اور اَحناف کے نزدیک یہاں ملامست سے مراد جماع ہے، عورتوں سے جماع کرلیا تا کہ یہ حدثِ اکبر کی صوت پیش آجائے، پھر ان تمام صورتوں میں اگر پانی موجود نہیں تو تم پاک مٹی کا قصد کرلیا کرو، اور اُسی کے ساتھ ہی اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو مل لیا کرو، تو حدثِ اصغر یعنی پانی کی موجودگی میں وضو، اس کا ذکر آگیا، اور حدثِ اکبر یعنی پانی کی صورت میں غُسل، فَاطَّهَّرُوْا میں اس کا ذکر آگیا، اور حدثِ اصغر اور پانی موجود نہ ہونے کی صورت میں اس میں بھی تیمم آگیا، اور لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ میں حدثِ اکبر، پانی نہ ہونے کی صورت میں اس میں بھی تیمم آگیا، تطہیر کے جو چاروں طریقے تھے وہ سارے کے سارے اس آیت کے اندر آگئے، یہ آیت اپنے مفہوم کے اندر جامع ہوگئی۔

اور بعض دوسرے حضرات کے نزدیک لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے عورتوں کو چھونا مراد ہے، اس لئے ان کے ہاں اگر عورت کے وجود کو مس کرلیا جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، تو جس طرح سے غائط سے آنا طہارت حاصل کرنے کا باعث ہے، اسی طرح سے عورتوں کو مس کرنا بھی طہارت حاصل کرنے کا باعث ہے، پھر ان کے نزدیک جنبی کے لئے تیمم قرآنِ کریم سے ثابت نہیں ہوگا بلکہ روایات سے ثابت ہوگا، ویسے جنبی کے لئے تیمم ہے متفق علیہ، اس میں کسی فقیہ کا اختلاف نہیں ہے، ہمارے نزدیک یہ مسئلہ قرآنِ کریم سے ثابت ہے لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے، اور جنہوں نے اس کو مس بالید پر محمول کیا ہے جس طرح سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے نزدیک بھی جنبی کے لئے تیمم جائز ہے لیکن ان کے نزدیک جنبی کے لئے تیمم قرآنِ کریم سے ثابت نہیں ہوگا احادیث سے ثابت ہوگا، تو ہمارے ہاں اولیٰ یہی ہے کہ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کو مجامعت پر محمول کیا جائے، مس بالید یعنی عورت کا چھولینا، ہاتھ لگالینا، اس سے ہمارے ہاں وضو نہیں ٹوٹتا، روایات میں بھی اس کی دلیل موجود ہے، اس لئے جنبی کے لئے بھی تیمم قرآنِ کریم سے ہی ثابت ہوجاتا ہے۔

---

(۱) ابوداؤد ۱/ ۴۹ باب فی المجروح یتیمم / مشکوۃ ۱/ ۵۴ باب التیمم۔

اَحکامِ طہارت نازل کرنے کا مقصد

مَايُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ: اللہ تعالیٰ تم پر تنگی نہیں ڈالنا چاہتا، اس لئے اگر تو پانی موجود ہو تو پانی استعمال کرو، پانی استعمال کرنے کی قدرت ہے اور کوئی نقصان نہیں تو پانی استعمال کرو، اور اگر پانی موجود نہ ہو تو کوئی پابندی نہیں ہے کہ جہاں کہیں سے بھی ہو پانی لاؤ، جیسی تکلیف ہے پانی استعمال کرو، اگر ایسا حکم ہوتا تو یہ تنگی ہوتی، اللہ نے اس تنگی کو اٹھا دیا کہ ایسے موقع پر تمہیں ایک آسان سا طریقہ بتادیا۔ ''ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں صاف ستھرا کرنے کا'' تاکہ کسی قسم کی ظاہری معنوی نجاست تمہارے اندر موجود نہ ہو، جس کو ہم نجاست سے تعبیر کرتے ہیں یا حدث سے تعبیر کرتے ہیں، تاکہ تم اس کو زائل کرلو۔ ''ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں صاف ستھرا کرنے کا، اور تاکہ تم پر اپنی نعمت تام کردے'' یہ نعمت تام اسی طرح سے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے آسان آسان احکام دے دیئے کہ جن پر عمل کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہمارے لئے ہر حال میں ممکن ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے یہ دین والی نعمت ہمارے اُوپر تام کردی۔ ''اور تاکہ تم احسان مانو'' اور احسان ماننا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِن اَحکام کو سنو سمجھو اور ان کے مطابق عمل کرو، ان کی شکرگزاری یہی ہے۔

''لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' میں تحیۃ الوضو کی طرف اِشارہ

یہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ جو طہارت کے مسئلے کے بعد ذکر کیا گیا کہ تاکہ تم شکرگزار ہو جاؤ، تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اسی سے ایک اشارہ سمجھا جس پر ان کا عمل تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو تَطَهُّر کا طریقہ بتایا ہے یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے، بہت بڑا احسان ہے، تو حدث لاحق ہوجانے کے بعد جب بھی ہم اس طریقے سے فائدہ اٹھائیں کہ حدث کی صفت کو زائل کریں وضو کرلیں، تو اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کے طور پر دو رکعت پڑھنی چاہئیں، جس کو ''تحیۃ الوضو'' کے عنوان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، وہ گویا کہ اس نعمت کے حصول پر شکرگزاری کا ایک طریقہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ طریقہ بتایا، تم نجس تھے ناپاک تھے حدث لاحق تھی جس کی بنا پر شیطان کی طرف انسان قریب ہوتا ہے، ملکیت اور قربِ خداوندی سے ایک قسم کا بُعد ہوتا ہے، پھر اس طریقے سے پانی استعمال کرکے یا مٹی استعمال کرکے پھر ہم فرشتوں کی طرف زیادہ قریب ہوگئے، اللہ کا قرب ہمیں حاصل ہوگیا، اس قابل ہوگئے کہ ہم اللہ کے دربار میں حاضری دے سکیں، یہ طریقہ جو ہمیں بتایا گیا یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، جس کے اوپر نقد شکر یہ ہے کہ دو رکعت پڑھ لی جائیں، تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ عادت بنائی ہوئی تھی، حدیث شریف میں جس طرح سے آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ جنت میں گیا (معراج میں یا خواب میں، کئی سارے اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں) میں نے اپنے آگے کچھ آہٹ محسوس کی جیسے کوئی چلا جارہا ہے، جس وقت پتا کیا تو معلوم ہوا کہ بلال ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ مثال نمایاں کی کہ بلال کا داخلہ جنت کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھادیا گیا، تو آپ نے پھر بلال رضی اللہ عنہ کو بلاکر پوچھا تھا، کہ وہ کون سا عمل ایسا ہے جس کے متعلق تُو اُمید رکھتا ہے کہ یہ چیز تجھے حاصل ہوئی ہے، تو انہوں نے یہ ذکر کیا کہ میں جب بھی طہارت حاصل کرتا ہوں، تو دو رکعت ضرور پڑھ لیتا ہوں اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تجھے یہ

شان دی ہے۔[1] تو لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ کے اشارے سے یہ چیز اخذ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ طریقہ تمہیں بتایا ہے تا کہ تم شکرگزار ہوجاؤ، اور شکرگزاری کا ایک طریقہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ اخذ کیا کہ طہارت حاصل کرنے کے بعد دو رکعت ادا کرلی جائیں تو یہ گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس پانی کے استعمال کرنے اور طہارت کے حاصل ہوجانے پر شکرگزاری ہے۔

اَحکام کی پابندی کے لئے ترغیبی پہلو

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: یہ اَحکام کی پابندی کے لئے ترغیب کا پہلو ہے، ''اللہ تعالیٰ کا احسان جو تم پر ہے اُسے یاد کرو'' اللہ تعالیٰ کے احسانات کو یاد کیا جائے تو اس کے ساتھ اطاعت کا جذبہ اُبھرتا ہے، ''اور اس عہد کو یاد رکھو جو اللہ نے تمہارے ساتھ باندھا ہے'' اور وہ عہد یہی ہے جس کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا: جب تم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا، سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کب کہا؟ کہ جب بھی کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو یہی لفظ بولتا ہے کہ میں نے اللہ کے احکام کو تسلیم کیا، جو بھی احکام آتے جائیں گے میں سنوں گا اور مانوں گا، اور اگر یہ لفظ نہ بھی بولے جائیں تو یہ بنیادی کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اسی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا عنوان ہے، کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں دے دیتا ہے، تو ایمان لانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ کے اَحکام کو سنوں گا اور مانوں گا، ''جب تم نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا''۔ ''اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے'' جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندگی کے جذبے کے ساتھ، نیازمندی کے ساتھ ان احکام کو پورا کرو، یعنی خلوص کے ساتھ اور دل کے حضور کے ساتھ اِن چیزوں پر عمل کرو، صرف ظاہرداری نہ ہو، ظاہرداری تو اِنسان ایسے حاکم کے سامنے کرتا ہے جو دِلوں کی باتوں کو نہ جانتا ہو، اور اللہ تعالیٰ تو دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے، لہٰذا صرف ظاہری اطاعت اختیار نہ کرو بلکہ تمہارے دل بھی مطیع ہونے چاہئیں، دل کے اندر خلوص کا جذبہ ہو۔ یہ اَحکام تھے جن کا تعلق عبادت کے ساتھ تھا۔

اِجتماعی زندگی میں حاکم کی ضرورت

اب آگے پھر معاملات کے بارے میں ایک ہدایت دی جارہی ہے، یعنی اجتماعی نظم کے متعلق، پہلے یہ مضمون آپ کے سامنے سورۂ نساء میں آچکا ہے، کہ جس وقت انسان مل جل کر زندگی گزارتا ہے تو یہ انتظام تب ٹھیک رہ سکتا ہے کہ جس وقت عدل اور انصاف کا دوردورہ ہو، عدل کا معنی ہوتا ہے برابری، یعنی قاعدے طریقے اور قانون میں سب کے ساتھ برابری ہو، کسی کا حق تلف کرنے کی کسی کو اجازت نہ دی جائے، ایک آدمی دوسرے کے اُوپر تعدی نہ کرسکے، برابری کے حقوق سب کو حاصل ہوں، تو برابری کے حقوق حاصل ہونے کے لئے ایک تو دل کے اندر جذبہ ہو، کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی حق تلفی کی کوشش نہ کرے، اور اگر کوئی شخص شرارت کرتا ہے نفسانیت کی بنا پر، شیطنت کی بنا پر تو اُس اجتماعی زندگی کے اندر ایک حاکم ایسا موجود ہونا چاہیے، حکومت موجود ہونی چاہیے، جو مظلوم کو ظالم سے حق دلوائے اور ظالم سے مظلوم کا انتقام لے لے، حقوق کا تحفظ تبھی ہوتا ہے اجتماعی زندگی کے اندر کہ ایک

---

(۱) بخاری ۱/۱۵۴ باب فضل الطهور بالليل والنهار/ مسلم ۲/۲۹۲ باب من فضائل بلال/ مشکوٰۃ ۱/۱۱۶ باب التطوع کی پہلی حدیث۔

قوت قاہرہ موجود ہوتی ہے جس کو ہم حکومت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، وہ ان حالات کا جائزہ لے کر جو زیادتی کرنے والا ہے اُس کو تنبیہ کرتے ہیں، جس پر زیادتی کی گئی اُس کی تلافی کرتے ہیں، تو معاملات کو درست رکھنے کے لئے اور دنیا کا نظم قائم رکھنے کے لئے قوت کا موجود ہونا ضروری ہے، اور مسلمان مجموعی طور پر اس بات کے مکلف ہیں کہ ماحول پر اس طرح سے کنٹرول کر کے رکھیں کہ کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرنے پائے۔

صحیح ادائے شہادت کی اہمیت

لیکن یہ عدل والا نظم قائم کس طرح رہے گا؟ اس کی سب سے بڑی صورت یہ ہے کہ شہادت صحیح طور پر ادا کرنے کا جذبہ لوگوں کے اندر ہو، اس کی تفصیل آپ کے سامنے اُس آیت پر بھی کی تھی جو سورۂ نساء میں آئی تھی، کہ انصاف کا مدار شہادت پر ہے، جس قوم کے اندر صحیح اور سچی شہادت دینے کا جذبہ نہیں اُس قوم کے اندر انصاف کسی صورت میں قائم ہو ہی نہیں سکتا، اور آج آپ کے سامنے ہی ہے، جھوٹی گواہیوں پر جب جھوٹے فیصلے ہوتے ہیں تو اس میں حاکم کا قصور کم ہوتا ہے اور گواہی دینے والوں کا قصور زیادہ ہوتا ہے۔ اگر صحیح گواہی دینے کا جذبہ قوم کے اندر موجود ہو تو واقعہ جب صحیح سامنے آئے گا تو فیصلہ دینے والا فیصلہ بھی صحیح کرے گا، ورنہ حاکم فیصلہ تو سنے ہوئے حالات کے تحت دیتا ہے، ان کو تو کسی خبر کی حقیقت کی خبر ہونے کا کیا ہی امکان ہے، خود سرورِ کائنات ﷺ نے صحابہ کرام میں اعلان کیا تھا، کہ تم میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو، ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی میں قوتِ گویائی زیادہ ہے، وہ اپنے مدعیٰ کو زیادہ اچھی طرح سے واضح کر سکتا ہے بمقابلہ دوسرے کے، اور میں اُس کی باتوں سے متاثر ہو کر اُس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، لیکن وہ اگر جانتا ہے کہ اُس نے میرے سامنے غلط بیانی کی ہے تو میرے فیصلے کے ساتھ وہ چیز اُس کے لئے حلال نہیں ہو جائے گی، میں اُس کو ایک آگ کا انگارہ کاٹ کر دوں گا،[1] یعنی اگر انسان جانتا ہے کہ غلط بیانی کر کے یہ فیصلہ کروایا گیا ہے تو میرے فیصلے کے تحت بھی وہ دی ہوئی چیز حلال نہیں بلکہ حرام کی حرام ہے، اور جس کو وہ چیز میں دلاؤں گا تو یوں سمجھو کہ جہنم کی آگ دلاؤں گا، مطلب یہ ہے کہ میرے سامنے بھی صحیح بات کہو گے تو صحیح فیصلہ ہو گا، اور اگر غلط بیانی کرو گے تو میرے سے بھی ایسا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی کا حق دوسرے کو دلا دوں، لیکن اس کی ذمہ داری اُس شخص پر ہو گی جس نے زبان درازی کر کے حق کو باطل کر کے دکھا دیا اور باطل کو حق کر کے دکھا دیا۔ تو جب سرورِ کائنات ﷺ بھی یہ اعلان فرماتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری باتوں سے متاثر ہو کر کوئی فیصلہ کر دوں، تو باقی حکام کے متعلق کیا کہنا، ان کے سامنے جس قسم کے حالات رکھے جائیں گے ویسے وہ فیصلے کریں گے، اس لئے معاشرے کے اندر عدل وانصاف کو قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے نظامِ شہادت کو ٹھیک کیا جائے، لوگوں کے اندر یہ جذبات اُبھارے جائیں کہ وہ صحیح بات کہیں، غلط بیانی نہ کریں۔

غلط بیانی اور حق پوشی کے محرّکات

غلط بیانی اور حق پوشی میں دو جذبے کام کرتے ہیں، کبھی تو انسان کسی کی محبت میں آ کر غلط بیانی کرتا ہے اور شہادت کو چھپا

---

(۱) بخاری ۱/ ۳۳۲ باب اثم من خاصم الخ۔ ۱/ ۳۶۸ باب من اقام البینۃ/مشکوۃ ۲/ ۳۲۷ باب الأقضیۃ، فصل اول۔

جاتا ہے، اور کبھی کسی کی عداوت میں آ کر غلط بیانی کرتا ہے اور صحیح بات کو چھپا جاتا ہے، تو اُس میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ کسی کی محبت میں آ کر غلط بیانی نہ کرو، وہاں تھا: وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ (سورۂ نساء: ۱۳۵) اگرچہ تمہیں وہ گواہی اپنے خلاف دینی پڑے، والدین کے خلاف اور اقربین کے خلاف دینی پڑے تو بھی تم شہادت للہ قائم کیا کرو، اور گواہی ٹھیک ٹھیک دیا کرو، اور یہاں ذکر کیا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی دشمن قوم کے متعلق بھی گواہی دینی پڑے تو بھی ٹھیک دیا کرو، یعنی نہ محبت سے متاثر ہو کر غلط بیانی کیا کرو، اور نہ عداوت سے متاثر ہو کر غلط بیانی کیا کرو، تو بات جب صحیح طور پر ادا کرو گے، چاہے دوست ہے چاہے دشمن ہے، تمہارے ہاں دونوں کے لئے ایک ہی ترازو اور ایک ہی بٹا ہے، جس باٹ کے ساتھ دوست کے لئے تولنا ہے، اسی باٹ کے ساتھ تم نے دشمن کے لئے تولنا ہے، ترازو دونوں کے لئے صحیح ہو، تو پھر انصاف بھی قائم ہو گا اور حقوق بھی ادا ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہے کہ کسی کے لئے تو باٹ اور رکھے ہوئے ہیں، اور دوسرے کے لئے باٹ اور رکھے ہوئے ہیں، جب اپنے لئے تولنا ہو تو اور حساب سے تولو کسی اور کے لئے تولنا ہو، تو دوسرے حساب سے تولو تو پھر عدل وانصاف قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے یہی ایمان والوں کو خطاب کر کے اُن کی ذمہ داری ان کو یاد دلائی جا رہی ہے کہ اب آنے والے وقت میں اِس نظامِ عالَم میں عدل وانصاف کا قائم رکھنا تمہارے ذمے ہے، تم یہ جذبہ لے کر اٹھو کہ اللہ کے لئے تم نے احکام کو سنبھالنا ہے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شہادت کا نظام ٹھیک کرو، کہ جو واقعہ تمہیں صحیح طور پر معلوم ہے اُس کو صحیح ادا کرو، نہ کسی کی دشمنی سے متاثر ہو کر اس میں غلط بیانی کرو، نہ کسی کی دوستی سے متاثر ہو کر غلط بیانی کرو، اگر یہ جذبہ اپناؤ گے تو یہ ہے عدل، اور اس عدل کا اختیار کرنا تقویٰ کی طرف زیادہ قریب ہے، اس عدل وانصاف کے ساتھ ہی تم تقویٰ کا صحیح مقام حاصل کر سکتے ہو، اور اگر ویسے کہتے رہو کہ ہم بڑے متقی ہیں لیکن لوگوں کے حقوق غصب کرو، اور شہادتیں غلط دو، جھوٹ بولو، غلط بیانی کرو تو یہ کوئی تقویٰ نہیں، تو گویا کہ پورے تمدن کے اندر عدل وانصاف کے قائم کرنے کے لئے یہ تاکید کی جا رہی ہے، اسی سے معاشرے میں خوشحالی آئے گی، اسی سے امن وعافیت قائم ہوگی، اور لوگ امن وعافیت کے ساتھ رہیں گے، کسی کو یہ ڈر نہیں ہوگا کہ ہمارے حقوق کو کوئی تلف کر لے گا، انصاف ہوگا تو امن چین ہوگا، اور امن چین کے بعد دل جمعی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اندر انسان لگ جائے گا۔ ''اے ایمان والو! اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے ہو جاؤ'' یعنی اللہ کے احکام پورے کرنے کے لئے کمر کس لو، تیار ہو جاؤ، اللہ کے احکام کو سنبھالنے والے بن جاؤ، ''اور عدل وانصاف کے ساتھ گواہی دینے والے ہو جاؤ، نہ برانگیختہ کرے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس بات پر کہ تم انصاف نہ کرو'' عدمِ عدل پر، انصاف نہ کرنے پر تمہیں کسی قوم کی عداوت برانگیختہ نہ کرے، ''انصاف کیا کرو، یہی تقوے کے قریب ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ہے ان کاموں کی جو تم عمل کرتے ہو''۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اور نیک عمل میں یہی شہادت للہ، قوامیت اللہ، جس کا ذکر پیچھے آ گیا، عدل وانصاف کرنا، یہ سب اس میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے کہ ''ان کے گناہ بخشے جائیں گے، کوئی لغزش ہوگی تو اللہ تعالیٰ درگزر فرمائیں گے، اور اجرِ عظیم دیں گے، اور جو کفر کرتے ہیں اور ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں یہی جہنم والے ہیں۔''

اِحسان کی یاددہانی اور اس کا مقصد

آگے پھر دُنیوی نعمت کی تذکیر ہے کہ تم دیکھو! جس وقت تمہاری جماعت کی ابتدا ہوئی تھی تو تم کتنے کمزور تھے، اور ارد گرد تمہارے دُشمن کتنے مضبوط تھے، اور انہوں نے بڑی قوت اور شدت کے ساتھ تمہاری طرف ہاتھ پھیلانے چاہے تا کہ تمہیں پکڑ کر اس دُنیا سے نیست و نابود کر دیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ روک لئے اور انہیں تم پر قدرت نہیں دی، تو جب اس کمزوری کے زمانے میں بھی اللہ نے تمہاری حفاظت کی ہے تو اب تو ماشاء اللہ تم قوت والے ہو گئے، تمہیں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، دُشمن ہو دوست ہو ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو تو اللہ تعالیٰ دُنیا کے اندر اسی طرح سے روز افزوں تمہیں ترقی دے گا، اور تمہاری حفاظت بھی کرے گا، یہ خیال نہ کرنا کہ اگر دُشمن کے متعلق ہم نے صحیح بات کہہ دی، دُشمن کا حق ثابت ہو گیا تو ہمیں کوئی نقصان پہنچے گا، ایسی چیزوں سے نقصان نہیں ہوا کرتا، عدل وانصاف قائم کرنے سے بہر حال دُنیا کے اندر سرسبزی وشادابی حاصل ہوتی ہے، اور دُنیا کے اندر کامیابی کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ اس میں اُس ساری تاریخ کی طرف متوجہ کر دیا گیا، مکہ معظمہ کے اندر قریش کے ہاتھوں جو مظالم ہوئے، اور اسلام کو مٹانے کے لئے اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے جس طرح سے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اور پھر مدینہ منورہ میں آنے کے بعد جو جنگیں ہوئیں، بدر کے میدان میں، اُحد کے میدان میں، غزوۂ احزاب میں وہ اسی جذبے کے تحت ہی آئے تھے تا کہ اس جماعت کو ختم کر دیا جائے، لیکن ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے تا کہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں، نہ مکہ معظمہ میں حضور ﷺ کے قتل کرنے پر اور جماعت صحابہ کو ختم کرنے پر قادر ہوئے، اور نہ مدینہ منورہ میں بھرپور جنگوں کے ذریعے سے اس جماعت کو مٹانے میں وہ کامیاب ہوئے، تو جب اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس طرح سے حفاظت کی ہے تو آئندہ بھی اگر اللہ کے احکام کی اتباع کرو گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت رکھو گے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں ہر شر سے محفوظ رکھتا چلا جائے گا۔ ''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے، جب قصد کیا تھا ایک قوم نے'' اس قوم سے قریش مراد ہیں، کیونکہ براہِ راست ابتدا میں مقابلہ اسی قوم کے ساتھ ہی تھا، ''جبکہ قصد کیا ایک قوم نے کہ وہ پھیلائیں تمہاری طرف اپنے ہاتھوں کو'' ہاتھ پھیلانا پکڑ دھکڑ کرنے سے کنایہ ہے، تمہیں پکڑنے کے لئے تمہیں قتل کرنے کے لئے وہ تمہاری طرف دست درازی کرنا چاہتے تھے، فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ: اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ: اللہ پر ہی مؤمنوں کو توکل کرنا چاہیے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

مِنْهُمُ	وَبَعَثْنَا	اِسْرَآءِيْلَ ۚ	بَنِيْٓ	مِيْثَاقَ	اللّٰهُ	اَخَذَ	وَلَقَدْ
ان میں سے	اور متعین کیے ہم نے	اسرائیل کا میثاق،	نے بنی	تعالیٰ	اللہ	لیا	البتہ تحقیق

اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ

بارہ سردار، اور اللہ نے فرمایا بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز کو قائم رکھا

وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ

اور تم زکوۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہے اور ان کو قوت پہنچاتے رہے اور اللہ تعالیٰ کو اچھا

اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ

قرض دیتے رہے تو البتہ ضرور دُور کر دُوں گا میں تم سے تمہارے گناہ اور البتہ ضرور داخل کروں گا میں تمہیں

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ

ایسے باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اور جو اِس کے بعد کافر ہوا تم میں سے

فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ⑫ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ

پس تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھے راستے سے⑫ پھر بسبب توڑ دینے ان کے اپنے میثاق کو

لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ

ہم نے انہیں پھٹکار دیا اور کردیا ہم نے ان کے دِلوں کو سخت، پھیرتے ہیں کلمات کو

مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ

ان کی جگہ سے، بھول گئے وہ فائدہ اُٹھانا اُس چیز سے جس کے ساتھ وہ نصیحت کیے گئے تھے، ہمیشہ اطلاع پاتا رہے گا تو

عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ

ایسی خیانت پر جو ان کی طرف سے صادر ہونے والی ہو، مگر ان میں سے کچھ لوگ، آپ انہیں معاف کردیں، درگزر کر جائیں،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ⑬ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى

بے شک اللہ تعالیٰ اچھا برتاؤ کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں⑬ اور ان لوگوں سے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں

اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا

ہم نے ان کا میثاق لیا پس بھول گئے وہ فائدہ اُٹھانا اُس چیز سے جس کے ساتھ وہ نصیحت کیے گئے تھے، پس ہم نے ڈال دی

بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ

ان کے درمیان عداوت اور بغض قیامت کے دن تک، اور عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں خبر دے گا

اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿١٤﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ

ان کاموں کی جو یہ کیا کرتے تھے ﴿١٤﴾ اے کتاب والو! تحقیق تمہارے پاس ہمارا رسول

رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ

آگیا، کتاب میں سے جن چیزوں کو تم چھپاتے تھے ان میں سے بہت ساری باتوں کو واضح کرتا ہے،

وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴿١٥﴾

اور بہت ساری باتوں سے درگزر کرتا ہے، تحقیق آگیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب ﴿١٥﴾

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ

جو اللہ کی رضا کے تبع ہونا چاہتے ہیں اللہ اس کے ذریعے سے ان کی راہنمائی کرتا ہے سلامتی کے راستوں کی، اور انہیں نکالتا ہے

مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ

تاریکیوں سے نور کی طرف اپنی توفیق کے ساتھ، اور ان کو ہدایت دیتا ہے صراطِ

مُسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ

مستقیم کی ﴿١٦﴾ بیشک کافر ہوگئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ وہ مسیح ابن

مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ

مریم ہی ہے، آپ فرما دیجئے کون اختیار رکھتا ہے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرلے ہلاک کرنے کا

الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ

مسیح ابن مریم کو اور اُس کی ماں کو اور ان سب لوگوں کو جو زمین میں ہیں، اللہ ہی کے لیے ہے

مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ

سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اوراوران چیزوں کی جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، پیدا کرتا رہتا ہے جو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ⑰ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ

ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے⑰ یہود اور نصاریٰ نے کہا ہم

اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ

اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ کے محبوب ہیں، آپ کہہ دیجئے پھر تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے اللہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے، بلکہ تم

بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ

انسان ہو اللہ کی مخلوق میں سے، بخشے گا اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا، اللہ ہی کے لیے ہے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؗ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ⑱

سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو دونوں کے درمیان میں ہیں، اور اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے⑱

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰی فَتْرَةٍ

اے کتاب والو! بے شک تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا وہ واضح کرتا ہے تمہارے لیے رسولوں کی طرف

مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ ؗ

سے وقفہ کے بعد تاکہ تم یہ نہ کہو کہ نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا نہ کوئی ڈرانے والا،

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ⑲ ع

پس تحقیق تمہارے پاس بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آگیا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ⑲

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: البتہ تحقیق۔ لام بھی تاکید کا اور قد بھی تحقیق کا، اس لیے ''البتہ تحقیق'' یہ دو لفظ بول دیے جاتے ہیں، یعنی یہ ضروری اور پکی بات ہے جس میں کوئی شک شبہ کی گنجائش نہیں، اس قسم کی مؤکد کلام کے شروع میں یہ لفظ آجاتا ہے، ''لیا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا میثاق'' میثاق: پختہ عہد۔ وثوق سے یہ لفظ لیا گیا ہے، وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ: اور اٹھائے ان میں سے ہم نے، متعین کیے، مبعوث کیے، ''متعین کیے ہم نے ان میں سے'' اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا: نقیب کا لفظ نقب سے لیا گیا ہے، نقب عام طور پر اردو میں بھی مشہور ہے، نقب لگانا، کسی چیز کی کھوج لگانے کے لئے، تحقیق کرنے کے لئے، احوال سے واقف رہنے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، تو نقیب کہیں گے اس شخص کو جو حالات کی کھوج لگانے والا ہے، احوال کی نگہبانی

کرنے والا ہے، اور قوم کے سردار کی چونکہ یہی پوزیشن ہوا کرتی ہے کہ قوم کے حالات سے آگاہ رہے اور ان کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرے، ان کی حفاظت کرے، اس لیے لفظ نقیب سردار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، تو یہاں نقیب کا معنی سردار کے ساتھ ہی کیا گیا ہے، ''متعین کیے ہم نے اُن میں سے بارہ سردار'' وَقَالَ اللّٰهُ: اور اللہ نے فرمایا، اِنِّيْ مَعَكُمْ: بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ: اگر تم نے نماز کو قائم رکھا، وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ: اور تم زکوٰۃ دیتے رہے، وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ: اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہے، وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ: اور ان کو قوت پہنچاتے رہے، ان کی مدد کرتے رہے، وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: اور اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دیتے رہے، لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ: البتہ ضرور دور کردوں گا میں تم سے، سَيِّاٰتِكُمْ: تمہاری کوتاہیاں، تمہارے گناہ، وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ: اور البتہ ضرور داخل کروں گا میں تمہیں، جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ایسے باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ: اور جو اس اخذِ میثاق کے بعد کافر ہوا، مِنْكُمْ: تم میں سے، فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ: پس تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھے راستے سے۔ کُفر حقیقی بھی ہوسکتا ہے کہ سرے سے میثاق کا منکر ہی ہوجائے، اور کُفر عملی بھی ہوسکتا ہے کہ میثاق کا قائل تو ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہیں کرتا، تو میثاق کی عملی مخالفت کو بھی کُفر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: ما زائدہ ہے، اس لیے باء کی وجہ سے نقضِ مجرور آ گیا، پھر ان کے اپنے میثاق کو توڑ دینے کی وجہ سے۔ باء سببیہ ہے، نقض مصدر ہے، مصدر کے ساتھ ہی ترجمہ کیا جارہا ہے، پھر بسبب توڑ دینے ان کے اپنے میثاق کو لَعَنّٰهُمْ: ہم نے انہیں پھٹکار دیا، دھتکار دیا، ہم نے ان پہ لعنت کی، اپنی رحمت سے انہیں دُور کردیا، وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً: اور کردیا ہم نے ان کے دلوں کو سخت، قٰسِيَةً قسوۃ سے لیا گیا ہے، اَشَدُّ قَسْوَةً سورۂ بقرہ کے اندر یہ لفظ آیا تھا (آیت: ۷۴) قَسْوَةُ الْقلب: دل کی سختی۔ قَسْوَة قَسَاوَة دونوں طرح سے لفظ بولا جاتا ہے۔ ہم نے ان کے دلوں کو سخت بنادیا۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ: باتوں کی تحریف کرتے ہیں، پھیرتے ہیں کلمات کو، عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: کَلِم چونکہ اسم جمع کے طور پر آیا ہے اس لیے مَوَاضِعِهٖ کے اندر ضمیر مفرد لوٹ رہی ہے، ''اُن کے مواضع سے، ان کے مواقع سے''، لفظ کی جگہ لفظ بدل دیتے ہیں یا لفظ کے مفہوم کو صحیح بیان نہیں کرتے، اس کو کسی اور مفہوم پہ محمول کردیتے ہیں، ''ہٹاتے ہیں کلمات کو ان کی جگہوں سے، پھیرتے ہیں کلمات کو ان کی جگہوں سے'' وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ: مَا ذُكِّرُوا بِهٖ جس کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی تھی، حظ حصے کو بھی کہتے ہیں، اور حظ مصدر کے معنی میں بھی آتا ہے فائدہ اُٹھانا۔ نَسُوْا نسیان سے ہے۔ بھول گئے وہ فائدہ اٹھانا اس چیز سے جس کے ساتھ وہ نصیحت کیے گئے تھے، جس چیز کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کے ساتھ وہ فائدہ اٹھانا بھول گئے۔ یا۔ جس کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے ایک حصے کو انہوں نے فراموش کردیا، احکام کا ایک حصہ فراموش ہی کر گئے۔ حظ حصے کے معنی میں بھی آسکتا ہے۔ تو مَا ذُكِّرُوا بِهٖ سے تورات مراد ہوجائے گی، اور اس کے جو احکام انہوں نے چھوڑ دیے، ترک کردیے، چھپادیے، وہی احکام کا مجموعہ حظ کا مصداق ہوگا۔ مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ سے ایک حصے کو وہ بھول گئے، یا اس سے فائدہ اٹھانا بھول گئے۔ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ: خَآئِنَةٍ خیانت کے معنی میں ہے، اور مِّنْهُمْ یہ صادرۃ کے متعلق ہوکر خَآئِنَةٍ کی صفت ہے۔ لَا تَزَالُ افعال ناقصہ میں سے ہے۔ ''ہمیشہ مطلع ہوتا رہے گا تو، ہمیشہ اطلاع پاتا رہے گا تو ان کی طرف سے خیانت پر، ایسی خیانت پر جو ان کی طرف سے صادر ہونے والی ہو''، اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: مگر ان میں سے کچھ لوگ، اور یہ وہی لوگ ہیں جو دیانت دار ہیں، پھر اسلام سامنے آیا تو انہوں

نے اسلام کو قبول کرلیا۔'' ان میں سے کچھ لوگوں کے علاوہ باقی لوگوں کی طرف سے صادر ہونے والی خیانت پر آپ مطلع ہوتے رہیں گے'' فَاعْفُ عَنْهُمْ: آپ انہیں معاف کردیں، وَ اصْفَحْ: درگزر کرجائیں، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ اچھا برتاؤ کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ وَ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ: نصاریٰ نصرانی کی جمع۔ اور ان لوگوں سے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان کا میثاق لیا، فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ: پس بھول گئے وہ فائدہ اٹھانا اس چیز سے جس کے ساتھ وہ نصیحت کیے گئے تھے، یا، مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کا ایک حصہ انہوں نے فراموش ہی کردیا، بھلا ہی دیا، فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ: پس ہم نے ڈال دی ان کے درمیان عداوت اور بغض، اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ: قیامت کے دن تک، وَ سَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ: اور عنقریب اللہ تعالیٰ انہیں خبردے گا ان کاموں کی جو یہ کیا کرتے تھے۔ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے کتاب والو! اس کا مصداق یہود ونصاریٰ دونوں ہیں، قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا: تحقیق تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا، یُبَیِّنُ لَكُمْ: واضح کرتا ہے تمہارے لیے، كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ: کتاب میں سے جن چیزوں کو تم چھپاتے تھے ان میں سے بہت ساری باتوں کو وہ تمہارے سامنے واضح کرتا ہے، وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ: اور بہت ساری باتوں سے درگزر کرتا ہے، قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ: تحقیق آگیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب، اکثر مفسرین نے وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ کے اندر واؤ کو عطف تفسیر کے لئے لیا ہے، تو نور اور کتابِ مبین کا مصداق ایک ہی ہے، جیسے یَّهْدِیْ بِهِ کی ضمیر آگے مفرد ہی لوٹے گی، اس سے بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں لفظوں کا مصداق ایک ہے، تو گویا کہ کتابِ مبین کی ایک صفت جو نور والی ہے کہ وہ جہالت کی ظلمتوں کو دور ہٹاتی ہے اس کو مستقل طور پر ذکر کردیا۔ ''اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آگئی اور وہ روشنی واضح کتاب ہے، کتاب ہے جو کہ احکام کو واضح کرنے والی ہے'' یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ: اس نُور کے ذریعے سے یا اس کتاب کے ذریعہ سے، دونوں کا مصداق چونکہ ایک ہے اس لیے مفرد کی ضمیر لوٹ گئی۔ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے، راہنمائی کرتا ہے، مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ: ان لوگوں کی جو کہ اللہ کی رضا کی اتباع کرنا چاہتے ہیں، جو اللہ کی رضا کے متبع ہونا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے ان کی راہنمائی کرتا ہے، سُبُلَ السَّلٰمِ: سلامتی کے راستوں کی۔ سُبُلَ سبیل کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامتی کے راستے دکھاتا ہے جو اللہ کی رضا کی اتباع کرنا چاہتے ہیں، وَ یُخْرِجُهُمْ: اور انہیں نکالتا ہے، مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: تاریکیوں سے نور کی طرف۔ تاریکیوں سے مراد جہالت شرک گندے عقائد کی تاریکیاں ہیں، ان سے نور کی طرف نکالتا ہے، بِاِذْنِهٖ: اپنی توفیق کے ساتھ، وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: اور ان کو ہدایت دیتا ہے صراطِ مستقیم کی، چلاتا ہے ان کو صراطِ مستقیم پر۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ: بیشک کافر ہوگئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ وہ مسیح ابن مریم ہی ہے، یعنی اللہ مسیح ابن مریم کی ہی شکل میں آگیا، مسیح ابن مریم اللہ ہی ہے، قُلْ: آپ کہہ دیجیے، فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا: کون اختیار رکھتا ہے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا، اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ: اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرلے ہلاک کرنے کا مسیح ابن مریم کو، وَ اُمَّهٗ: اور اس کی ماں کو، وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا: اور ان سب لوگوں کو جو زمین میں ہیں، اگر اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور زمین کے اندر تمام بسنے والوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کوئی ہے جو سامنے کوئی اختیار رکھتا ہو ان کو بچانے کا؟ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وَ مَا بَیْنَهُمَا: اور ان چیزوں کی جو ان دونوں

کے درمیان میں ہیں، یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ: پیدا کرتا رہتا ہے جو چاہتا ہے، وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ: یہود اور نصاریٰ نے کہا یعنی دونوں کا یہ نعرہ ہے، یہود بھی کہتے ہیں اور نصاریٰ بھی، ''ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ کے محبوب ہیں''۔ بیٹا کہنا یہاں محبوب سے مجاز ہے، یعنی ہمارا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا ہے جیسے کسی شخص کے نزدیک اس کے بیٹوں کا ہوتا ہے، یہاں بیٹا اپنے حقیقی معنی میں نہیں، جس طرح سے ہم باپ بیٹا کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یہاں بیٹے سے مجازی معنی مراد ہے، وہی آجِبّاء والا مفہوم ہے، یعنی ہمارا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا ہے جیسے کسی شخص کے بیٹوں کا ہوتا ہے اور اس کے محبوبوں کا ہوتا ہے۔ قُلْ: آپ کہہ دیجیے، فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ: پھر تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے اللہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے، بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ: تم نہ بیٹے ہو نہ محبوب ہو، بلکہ تم انسان ہو اللہ کی مخلوق میں سے، مِّمَّنْ خَلَقَ، جن کو اللہ نے پیدا کیا تم بھی ان میں سے انسان ہو، یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ: بخشے گا اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا، وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ: اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا، وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وَمَا بَیْنَهُمَا: اور ان چیزوں کی جو کہ دونوں کے درمیان میں ہیں، وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ: اور اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے۔ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا: اے کتاب والو! بیشک تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا، یُبَیِّنُ لَكُمْ: واضح کرتا ہے تمہارے لیے عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ: فَتْرَة: سستی، کسی کام کے کرنے کے درمیان میں جو انقطاع آ جاتا ہے اس کو فترۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے باری کا بخار ہے کہ ایک دن بخار آیا ایک دن نہ آیا پھر اگلے دن آ گیا، تو جس دن بخار نہیں آتا اس دن کو بھی فترۃ کا دن قرار دیا جاتا ہے، کہ بخار کے درمیان میں یہ انقطاع کا دن ہے، تو یہاں بھی فترۃ سے یہی مراد ہے۔ عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ: رسولوں کی طرف سے انقطاع پر، کہ رسول منقطع ہو چکے تھے اور اس کے بعد پھر ہمارا رسول تمہارے پاس آیا، یعنی رسولوں کے آنے کے درمیان میں وقفہ آ گیا تھا، بہترین مفہوم اس کا وقفہ ہے، دو کاموں کے درمیان میں جو وقفہ ہوتا ہے اس کو فترۃ سے تعبیر کرتے ہیں، ''رسولوں کی طرف سے وقفہ کے بعد'' یعنی رسولوں کے آنے میں وقفہ آ گیا تھا، درمیان میں بہت انقطاع آ گیا تھا، اس کے بعد یہ ہمارا رسول آ گیا، اَنْ تَقُوْلُوْا: لِئَلَّا تَقُوْلُوْا، تا کہ تم یہ نہ کہو کہ مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ: نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا نہ کوئی ڈرانے والا، فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ: پس تحقیق تمہارے پاس بشارت دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا، وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رکوع میں بیان کردہ مضامین

سورۂ مائدۃ کی ابتدا ایفاءِ عقود کی تاکید کے ساتھ کی گئی تھی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ، اور عقود کا ترجمہ آپ کے سامنے عہود کے ساتھ

ہی کیا گیا تھا، کہ اپنے عہدوں کو پورا کرو، اور اس عہد کے تحت تفصیل عرض کردی گئی تھی کہ چاہے اللہ کے ساتھ بندے کا عہد ہو، یا بندوں کا آپس میں ہو، اس لئے احکام خداوندی اور معاملات میں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہم عہد کر لیتے ہیں عقود کے تحت وہ سارے کے سارے داخل ہیں، اور ان کے ایفاء کی تاکید کی گئی ہے۔ اور جب ایک شخص ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ کر ایمان کو قبول کر لیتا ہے تو یہ اُس عہد کو قبول کرنے کا عنوان ہے، گویا کہ کلمہ پڑھنے کے بعد اُس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کر لیا کہ میں تیرے سارے کے سارے احکام مانوں گا، تو اس سورت کی اِبتدا اسی عنوان کے ساتھ ہی کی گئی تھی، اور آگے پھر صراحت کے ساتھ اس کا ذکر آیا تھا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ: اس میں میثاق کا ذکر آیا ہوا ہے، کہ اللہ کے احسان کو یاد کرو، اور اللہ کے ساتھ جو تم نے عہد کیا ہے، جو اللہ کا پختہ عہد تمہارے ساتھ ہے، جو تم نے اُس کے ساتھ پختہ عہد کیا ہے (کیونکہ واثق مفاعلہ ہے جو مشارکت کو چاہتا ہے، اس میں دونوں کی طرف سے ایک دوسرے کے ساتھ عہد ہوتا ہے) تو جو عہد ہوا ہے اُس کو یاد رکھو، اور جو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا تم نے کہا تھا یہی اُس عہد کو قبول کرنے کی بات ہے، اور اُس کی مخالفت میں اللہ سے ڈرتے رہو، پھر اس میثاق کا ذکر آیا تھا، اور اس میثاق کے ذکر کے بعد خصوصیت کے ساتھ عدل وانصاف کا حکم دیا گیا تھا، شہادت للہ کا حکم دیا گیا تھا کہ گواہی دینے کی نوبت آجائے تو صحیح صحیح دیا کر، دوست دشمن کے درمیان میں فیصلے ٹھیک کیا کرو، نہ کسی کی دوستی سے متاثر ہو کر غلط بیانی کرو اور فیصلہ غلط کرو، اور نہ کسی کی دشمنی سے متاثر ہو کر، اقتدار پر آجانے کے بعد کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہ کرو، اس قسم کی ہدایات دی گئی تھیں، تقویٰ اختیار کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اب اِس رکوع میں اُسی بات کو پختہ کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ ایک دوسرے پہلو سے ذکر فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس قسم کا میثاق جو تم سے لیا گیا ہے یہ کوئی تمہاری خصوصیت نہیں، اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں سے اس قسم کے میثاق لیے، اپنے پیغمبروں کی وساطت سے، اپنی کتابوں کی وساطت سے، تو جن لوگوں نے اس میثاق کو قبول کیا تھا اور اللہ کے ساتھ عہد کر لیا تھا پھر اس عہد کو نبھایا وہ دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہوئے، اور جنہوں نے اس عہد کو نہیں نبھایا توڑ دیا، مان لینے کے بعد پھر اللہ کے اَحکام کی مخالفت کی، تو وہ دُنیا اور آخرت میں معذب ہوئے، تو خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ دہرائی جارہی ہے کہ اِنہوں نے اللہ کے میثاق کو پس پشت ڈالا تو پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ یہود کا ذکر بھی کیا اور نصاریٰ کا بھی، اور ان دونوں کا ذکر کرنے کے بعد پھر ان کو ایمان لانے کی دعوت دی سرورِ کائنات ﷺ کا ذکر کر کے۔

قرآنِ کریم میں بیان کردہ واقعات سے مقصود

تو یہ تاریخ جو دُہرائی جارہی ہے یہ محض ایک واقعہ کی صورت ہی نہیں کہ قصہ کہانی آپ کو سنا دیا، بلکہ جہاں جہاں بھی قرآنِ کریم کے اندر واقعات ذکر کئے جایا کرتے ہیں، وہاں یہی نصیحت کرنی مقصود ہوتی ہے کہ دیکھو! انہوں نے ایسا کیا تھا اُس کا نتیجہ یہ نکلا، تم بھی اگر ایسا کرو گے تو نتیجہ یہی نکلے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اشخاص کے ساتھ ذاتی طور پر تعلق نہیں ہے، لوگوں کی ذات کی طرف دیکھتے ہوئے کہ یہ چونکہ فلاں ہے اس لئے بہر حال اللہ کا محبوب ہے، ایسی بات نہیں، جس نے بھی یہ عقیدہ بنایا اُس نے غلطی کی، اللہ تعالیٰ کے ہاں تقویٰ کی، اعمال کی، عہد کی پابندی کی قدر ہے، جو قوم، جو جماعت، جو فرد اس عہد کی پابندی کرے گا اور اللہ

کے اُحکام کو مانے گا وہ اللہ کا محبوب ہے، اور آخرت میں نجات پائے گا، اور اگر کوئی شخص عہد کی پابندی نہیں کرتا، اللہ کے اُحکام کے مطابق عمل نہیں کرتا، کسی کا بیٹا ہو کسی کا پوتا ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اس رکوع کے اندر یہی مضمون بیان ہوا ہے، خلاصہ اس کا یہی ہے۔ دوبارہ الفاظ پہ نظر ڈالیے!

بنی اسرائیل سے لیے گئے ایک عہد کا تذکرہ

''بیشک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور بارہ سرداران میں متعین کیے'' بارہ کے عدد میں حکمت یہ ہے کہ بنی اسرائیلیوں کے بارہ ہی قبیلے تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، اور ان بارہ بیٹوں کی جو اولاد پھیلی تو ہر ایک قبیلہ علیحدہ علیحدہ تھا، انتظامی اُمور میں ہمیشہ ان کی انفرادیت کی رعایت رکھی جاتی تھی، جہاں بھی کوئی نوبت آتی تو ہر قبیلے کے انتظام کے لئے انہی میں سے کوئی نہ کوئی منتظم متعین کر دیا جاتا تھا، تو بارہ قبیلے تھے، بارہ قبیلوں میں بارہ سردار متعین کر دیے، اور ان سرداروں کی وساطت سے عہد لیا گیا، اور ان سرداروں نے عہد کیا کہ ہم خود بھی اللہ کے اُحکام کی پابندی کریں گے، اور اپنے قبیلے کو اپنی جماعت کو بھی اس پر پابند رکھیں گے، اس طرح نگران بنا کر یہ بارہ آدمی متعین کر دیے گئے۔ بَعَثْنَا: ہم نے مبعوث کیے یعنی متعین کیے انہی میں سے بارہ سردار، میثاق کا مضمون کیا تھا؟ میثاق کا مضمون یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میں تمہارے ساتھ ہوں'' میری معیت میری نصرت تمہارے ساتھ ہے ''اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے'' اس سے معلوم ہو گیا کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پہلی اُمتوں کے اندر بھی بنیادی حیثیت رکھتے تھے، جس طرح سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے ساتھ بھی جو اللہ کا عہد ہے اس میں بھی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ''اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے'' چونکہ اِن ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے یہ عہد کا مضمون ہے جو اللہ نے لیا تھا، ''اگر تم نے نماز قائم کی اور تم نے زکوٰۃ دی'' وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ: اور جو رسول میرے آئے ان پر ایمان لاتے رہے، وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ: اور مخالفین کے مقابلے میں ان کو قوت پہنچاتے رہے وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: اور اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دیتے رہے، اچھے قرض کا کیا مطلب؟ کہ زکوٰۃ تو ہے فرض کے درجے میں، وہ تو بہرحال دینی ہے، لیکن اس فرض سے زائد مال اللہ کی رضا جوئی کے لئے دینی کاموں میں قومی خدمت میں صَرف کیا جائے، اور خلوص کے ساتھ کیا جائے، حلال مال خرچ کیا جائے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس قسم کے صدقات کو خیرات کو قرضے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کو قرض سے تعبیر کرنے میں حکمت

اور قرضہ کے ساتھ تعبیر کرنے کی حکمت آپ کے سامنے پہلے ذکر کر دی گئی تھی، کہ قرضے کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص قرضہ لیا کرتا ہے بشرطیکہ وہ مفلس نہ ہو، کسی کا حق مارنے کا جذبہ اُس میں نہ ہو، عدم اور ظلوم نہ ہو، تو وہ قرضہ لینے والا قرضے کو واپس یقیناً کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی چونکہ اس قسم کے مال کا ثواب یقیناً دے گا، دنیا اور آخرت میں اس کی برکات کو واپس لوٹائے گا، اس لئے ترغیب کے پہلو کے ساتھ اس کو قرضِ حسن کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ترغیب کا پہلو اس میں یہی ہے کہ دیا کرو تو اس جذبے

سے دیا کرو، اس خیال کے تحت دیا کرو کہ یہ آخر لوٹ کر آنے والا ہے، اور مزید فوائد کے ساتھ واپس لوٹے گا، تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے صرف فرض مقدار کا ادا کر دینا کافی نہیں ہوتا، بلکہ قومی ضرورتوں میں، خدمتِ خلق میں، دینی خدمات میں فرض سے کچھ زائد مال بھی خرچ کرنا چاہیے تب جا کر اَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کا مصداق بنے گا، جیسے دینی تعلیم کی اشاعت کے لئے خرچ کیا جائے، کسی غریب مسکین کی امداد کر دی، کسی کو کپڑا دے دیا، کسی کو جوتا پہنا دیا، جیسے یہ خدمات ہوا کرتی ہیں وہ سب اَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کے تحت داخل ہے۔

عہد کی پابندی پر اِنعامِ خداوندی

یہ تو ہو گیا کہ اگر تم نے یہ کام کیے، تو اللہ کی طرف سے اس عہد میں کیا بات ہے؟ ''البتہ ضرور دُور ہٹا دیں گے ہم تم سے تمہارے گناہ'' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اگر اپنے مذہب کے بنیادی مطالبے پورے کرتا ہے، اللہ کی طرف سے جو فرائض عائد ہیں جو شخص ان فرائض کو پورا کرتا ہے، اور جن محرمات سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ان محرمات سے وہ بچتا ہے، بنیادی مطالبوں کا یہی معنی ہے، چاہے وہ مثبت پہلو کے ہوں، چاہے وہ منفی پہلو کے ہوں، جو بنیادی مطالبوں کو پورا کرتا ہے، پھر اُس کی زندگی میں کچھ لغزشیں ہو جاتی ہیں، کچھ کوتاہیاں ہو جاتی ہیں، کوئی کمی بیشی ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ وہ اپنی طرف سے فضل فرما کر معاف فرما دیتے ہیں، بشرطیکہ بنیادی تقاضوں کو تم پورا کرتے رہو۔ جیسے کہ سورۂ نساء کے اندر یہی لفظ آئے تھے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ: جن چیزوں سے تم کو روکا گیا ہے اگر ان میں سے بڑی بڑی باتیں یعنی بنیادی باتوں سے تم رُکتے رہے تو چھوٹی موٹی باتیں ہم معاف کر دیا کریں گے، تو یہاں بھی یہی بات ہے کہ اگر تم ان بنیادی باتوں کے پابند رہے تو تمہاری لغزشیں تمہاری کوتاہیاں جو ہوں گی ہم انہیں دُور ہٹا دیں گے، وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ: اور البتہ ضرور داخل کریں گے ہم تمہیں باغات میں تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہوا کہ چھوٹی موٹی لغزشیں معاف کر دیں گے، اور تمہیں باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہی عنوان آخرت کی نعمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عہد شکنی کے نتیجے میں لعنت

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ: جو اس اخذِ میثاق کے بعد، اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کرنے کے بعد کافر ہو گیا، جس نے کُفر کیا، کُفر کے دو درجے ہیں، ایک کُفرِ حقیقی کہ سرے سے انکار ہی کر دے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد ہم نے کیا ہی نہیں، منکر ہی ہو گئے، یہ تو کُفرِ حقیقی ہے، اور ایک ہے کہ اقرار تو کرتے ہیں جیسے ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھتے ہیں یا وہ بنی اسرائیل ''لا الٰہ الا اللہ موسیٰ کلیم اللہ'' ''عیسیٰ روح اللہ''، اس قسم کا کلمہ وہ پڑھتے ہیں، لیکن ان ہدایات پر عمل نہیں کرتے تو اس کو کُفرِ عملی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، دونوں کو یہ شامل ہے، ''پس جو کوئی شخص کافر ہو گیا اس کے بعد تم میں سے پس وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا'' جب سیدھے راستے سے بھٹک گیا تو سیدھا راستہ تو اللہ کی رضا کے حاصل کرنے کا یہی اَحکام پر عمل کرنا تھا، اور جنّت کے حاصل کرنے کا

یہی سیدھا راستہ تھا، کہ ان احکام پر عمل کرو، جب وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا تو نہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی اور نہ وہ جنت میں جائے گا، جو سیدھے راستے سے بھٹک جائے وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچا کرتا، وہ پھر اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا جہاں پہنچنے کے لئے تمہیں یہ راستہ دکھایا گیا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا لیکن اس عہد کا نتیجہ کیا نکلا کہ وہ اس پر پابند نہ رہ سکے، جب پابند عہد ہے اور انہوں نے اس عہد کو توڑا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کرنا اللہ کا ایک بہت بڑا احسان ہے، کہ وہ تمہارے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے کہ تم یہ کرو میں یہ کروں گا، اللہ کی نعمت ہے جو اپنے بندے کے ساتھ اس قسم کی بات کر لیتا ہے، لیکن جب بندہ استغناء برتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کرنے کے بعد اُس کو توڑ دے تو پھر وہ شخص ملعون ہو جاتا ہے، پھٹکارا جاتا ہے، دُھتکارا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے پھر اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے محروم کر دیتے ہیں۔" پھر ان کے اپنے میثاق کو توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کر دی" لعنت کا یہی معنی ہے کہ ہم نے اُن کو پھٹکار دیا، دھتکار دیا، وہ ہمارے درباری نہ رہے، ہماری رضا ان کے ساتھ شامل نہ رہی، ہم نے اپنی خصوصی رحمت سے انہیں محروم کر دیا، نقض میثاق کا اثر تو یہ پڑا کہ ان پر لعنت ہو گئی۔

لعنت کے نتیجے میں قساوت، قساوت اور رِقّت کا مفہوم

جب کسی پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے تو پھر اس کا اگلا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کہ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً: ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا، تو قساوتِ قلبی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور پھٹکار کا اثر ہے، قساوتِ قلبی کا کیا مفہوم؟ دل کی سختی، یعنی دل سے رِقّت ختم ہو گئی، رِقّت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی باتوں کو سُن کر متاثر ہوتا ہے، نیکی کی ترغیب سامنے آتی ہے تو نیکی کا شوق پیدا ہوتا ہے، گناہ سے ڈرانا سامنے آتا ہے، ترغیب کی آیات سننے کے بعد انسان میں نیکی کا شوق ابھرے نیکی کرنے کی طرف رغبت ہو، اور آیات ترہیب سننے کے بعد گناہ چھوڑنے کی رغبت انسان کے دل میں پیدا ہو جائے، قلب متاثر ہو جائے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگ جائے، تو یہ علامت ہے کہ اس کے دل کے اندر رِقّت ہے، اور اس کا قلب وعظ نصیحت، انذار تبشیر، ترہیب ترغیب کو قبول کرتا ہے، یہ دل کے اندر رِقّت کی علامت ہے، رِقّت کا یہی معنی نہیں ہوتا کہ بات سنی تو فوراً رونے لگ جائے، اور پاؤ پاؤ کے آنسو بہانے لگ جائے، صرف رونے لگ جانا آنسو بہانے لگ جانا کوئی شرعی رِقّت نہیں ہے، کیونکہ رونے کا آنا اور آنسو بہانا بسا اوقات یہ اختیاری نہیں ہوتے، ایک آدمی کی طبیعت ایسی ہے کہ اُسے رونا نہیں آتا، قلب کی رِقّت جو مطلوب ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ترغیب و ترہیب سے متاثر ہوتا ہے، جب اُس کے سامنے نیکی کے شوق دلانے والی باتیں آتی ہیں تو اُس کے دل میں نیکی کا شوق پیدا ہوتا ہے، اور جب اُس کے سامنے گناہ سے ڈرانے والی آیات آتی ہیں تو اُس کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے اور وہ ڈرنے لگ جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گناہ سے بچتا ہے نیکی کرتا ہے، تو اس شخص کے دل میں رِقّت ہے، اور یہ رِقّت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور جس شخص کو شوق دلانے کے وقت میں نیکی کی طرف رغبت نہیں ہوتی، آیاتِ ترغیب سے اُس کے دل میں کوئی شوق پیدا نہیں ہوتا، نیکی کی طرف رغبت نہیں ہوتی، اور آیات ترہیب یعنی ڈرانے کی آیتیں، عذاب کی آیتیں، اللہ تعالیٰ کی گرفت کی آیتیں آتی ہیں تو اُس کا دل دھڑکتا نہیں ہے، اُس پر کپکپی طاری نہیں ہوتی، یہ ہے قساوت، تو جس شخص کا دل متاثر نہ ہو سمجھو کہ یہ

قاسی القلب ہے، اور ہر سعادت سے محرومی کی علامت یہی ہے کہ کسی کے قلب کے اندر قساوت آجائے، اور ہر سعادت کی بنیاد یہ ہے کہ کسی کے قلب میں رقت ہو کہ اچھی بات سمجھائی جائے تو وہ سمجھے اور اس سے متاثر ہو، بُری بات سے روکنے کے لئے اُس کے سامنے کوئی تفہیم کی جائے تو بُری بات سے رکنے کا جذبہ اُن کے اندر پیدا ہو جائے، یہ ہر سعادت کی بنیاد ہے، اور قساوت جو ہے یہ ہر خیر سے محرومی کی علامت ہے، کہ پھر انسان حیوانوں کی طرح گناہ کرنا چاہے گا تو گناہ کرتا چلا جائے گا، اُس کے دل میں کوئی دھڑکا پیدا نہیں ہوگا، اور نیکی چھوٹتی چلی جائے گی تو چھوٹتی چلی جائے گی، اِس میں اُس کو کوئی نقصان کا احساس نہیں ہوگا، ''لا یَعْرِفُ مَعْرُوفًا ولا یُنْکِرُ مُنْکَرًا'' والی کیفیت ہوگی، نہ وہ کسی نیکی کو پہچانتا ہے نہ کسی بُرے کام کا انکاری ہے، جو دل میں آئے گا وہی کرے گا، چاہے وہ اچھا ہے چاہے بُرا ہے، انسان کے دل میں اچھائی بُرائی کا فرق اٹھ جاتا ہے، قساوت کا مطلب یہ ہوتا ہے، تو جب کسی شخص پر یہ کیفیت طاری ہو کہ وہ اچھائی بُرائی سے متاثر نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی خواہشات پر چلتا ہے، تو سمجھ لو کہ اللہ کی دربار سے یہ شخص ملعون ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کا اثر ہے کہ اس کا قلب متاثر نہیں، تو قلب کے اندر تاثر نہ ہونا یہ ہے قساوتِ قلبی۔ ''ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا'' یعنی ان کے اندر یہ تاثر نہیں رہا کہ اچھی باتوں سے متاثر ہو کر اچھائی اختیار کریں، بُری باتوں کی وعید سے متاثر ہو کر بُری باتوں کو چھوڑ دیں، خیر و شر کی تمیز ان کے اندر رہے، ایسی بات نہیں، یہ اِس نعمت سے محروم ہو گئے۔

قساوت کے نتیجے میں دِین کی تحریف

اور جب دلوں میں قساوت ہی آگئی تو پھر اُس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کو بگاڑ بگاڑ کر اپنی مرضی کے مطابق بنانے لگ گئے، آج بھی جو لوگ اپنی خواہشات کے پابند ہیں وہ کوشش یہی کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی تعبیر ایسی کریں جو اپنی خواہشات کے مطابق ہو، یہ معنوی تحریف ہے، روایات کا مطلب اس طرح سے ذکر کریں جس کے ساتھ اپنی خواہش کو تائید ہو، یہ نہیں دیکھنا کہ اُمت کے اندر کیا بات چلی آرہی ہے، اسلاف نے اس کا کیا معنی لیا، اُمت میں کیا معمول ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے کیا بیان کیا، کیا عمل کر کے دکھایا، صحابہ نے کیا سمجھا، اور کیا کیا؟ یہ مقصد نہیں، الفاظ کی توڑ پھوڑ کر کے اس طرح سے اُس کا مطلب نکالنے کی کوشش کرنا کہ اپنی خواہش کی تائید اس میں ہو جائے یہ تحریفِ کَلِم ہے، اور قساوتِ قلبی آخر انسان کو یہیں پہنچایا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی باتیں، جب وہ اپنی خواہشات کے درمیان رکاوٹ بنتی ہیں تو انسان ان کو بھی موڑ توڑ کے اپنی خواہش کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ بدبختی پر آخری مہر ہے، کیونکہ ایک اللہ کی کتاب ہی تو ہے جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ گھر کا چراغ ہے، جس سے روشنی ہوتی ہے تو انسان اس میں نفع نقصان کی چیزوں کو، مفید اور مضر چیزوں کو پہچانتا ہے، اور اگر یہ گھر کا چراغ ہی گل کر دیا گیا، یا اِس کو کسی پردے میں رکھ دیا گیا، اور اس کی روشنی سے بھی محروم ہو گئے، تو اس تاریک گھر میں پھر انسان کو کیا نظر آئے گا؟ کچھ بھی نہیں، ایک تو یہ ہے کہ چراغ جل رہا ہے لیکن آپ نے آنکھیں بند کر لیں، تو بھی توقع ہے کہ کبھی آنکھیں کھل جائیں گی تو آپ کو کچھ نظر آجائے گا، لیکن اگر آنکھیں بھی بند کی تھیں اور پھر ساتھ پھونک مار کر چراغ بھی بجھا دیا تو اب روشنی کی کیا توقع رہی؟ تو قساوتِ قلبی تو ایسے ہے جیسے آنکھیں بند کر لیں، اور تحریفِ کلمات، اللہ تعالیٰ کی کتاب کے

مضمونوں کو بگاڑ کر رکھ دیا، آیات کو چھپا دیا، جو اپنی خواہشات کے خلاف تھیں، ان کو حذف کر دیا یا ان کے مطلب بگاڑ دیے، یا ایسے تھا جیسے گھر کا چراغ گل کر دیا، اب ہدایت پانے کی کون سی صورت رہ گئی، دیکھو العنت کے بعد بالترتیب یہ سب چیزیں ہوتی ہیں، اور یہ دیکھو! یہ قصے جو آپ کو سنائے جا رہے ہیں اپنے اُوپر بھی ان کو منطبق کر کے دیکھ لو، حقیقت اسی طرح سے ہے ۔

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں (۱)

کہ واقعات دوسروں کے ہیں، لیکن اپنے اُوپر بھی ان کو منطبق کر کے دیکھو کہ اپنا حال کیا ہے؟ اگر قلب کے اندر قساوت ہے تو یقیناً وہ اللہ کی باتوں میں تاویلیں کریں گے، رسول اللہ ﷺ کی ہدایات سامنے آئیں گی تو یقیناً تاویلیں کریں گے، یہ اسی قساوت کا اثر ہوتا ہے۔ اور پھر آخری بات یہ ہوئی کہ "جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس سے فائدہ اٹھانا بھول گئے" وہ نصیحتیں جتنی تھیں سب فراموش ہو گئیں، اس کے ایک حصے کو بھلا دیا، اِس حصے سے مراد وہی احکام ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف تھے، بُھلا دینے سے وہی ترک کرنا مراد ہے، فائدہ اُٹھانا بھول گئے۔

یہود کی خیانتوں کا تسلسل

لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ: یہ نہیں کہ ایک دفعہ کوئی گڑبڑ کر کے یہ بس ہو گئے، بلکہ جب انسان خواہشات کے پیچھے چلتا ہے تو بہت نئی نئی خواہشات اُبھرتی ہیں، انسان نئی نئی خیانتیں کرتا ہے، یہ بھی جب چاہیں آپ اپنے ماحول کے اندر اس کو مرتب کر کے دیکھ لیں، کہ ایک آدمی جب غلط راستے پر چل پڑتا ہے تو ہر روز اُس کو کوئی نہ کوئی نئی شرارت سوجھتی ہے، پھر وہ اپنے اُس کام کو پورا کرنے کے لئے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نئی نئی تدبیریں اختیار کرے گا، یہ نہیں کہ ایک دفعہ بدعملی کی راہ متعین کر کے پھر انسان بس ہو جائے، نہیں! بہت بدعملی میں ترقی ہوگی، بہت اس کے لئے جواز پیدا کرنے کے لئے نئی نئی تاویلیں ہوں گی، یہی مطلب ہے ان الفاظ کا، کہ آئے دن اِن کی طرف سے آپ کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہیں گے، یہ کوئی نہ کوئی حرکت کریں گے، پھر اُس کے جواز کے لئے اللہ کی کتاب کے اندر خیانت کریں گے، بددیانتی خیانت ان کی طرف سے صادر ہوتی رہے گی۔ ہاں البتہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو خائن نہیں اور بددیانت نہیں، بلکہ جو اللہ نے نصیحت کی تھی وہ انہوں نے یاد رکھی، اور اپنے زمانے میں بھی حتی الوسع جو ان کے پاس اللہ کے احکام تھے ان پر عمل کرتے رہے، اور جب ان کے سامنے اسلام ایک حقیقت کے طور پر آیا تو انہوں نے اُس کو بھی قبول کر لیا، تو یہود میں بھی ایسے لوگ تھے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، کہ جو اپنے زمانے میں نیک لوگ سمجھے جاتے تھے، حتی الوسع وہ اللہ کے احکام پر عمل کرتے تھے، اور جب اسلام ان کے سامنے آیا تو اس حقیقت کو انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔

خیانت کار یہود سے درگزر کا حکم اور اس کی وجہ

تو جب یہ ایسے خائن ہیں، یہ ملعون ہیں، یہ قاسی القلب ہیں، یہ محرّف کتاب ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھلائے بیٹھے ہیں، آئے دن ان کی خیانتیں جاری رہتی ہیں، ان باتوں کے سننے کے بعد لازماً دل کے اندر نفرت کے جذبات اُبھریں گے تو

(۱) مثنوی رومی، دفتر اول، عنوان نمبر ۶۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے اس قسم کے کردار پر نظر نہ رکھیے، اِس سے درگزر کیجئے، اور ان کے ساتھ معاملہ ٹھیک ٹھیک رکھیے، احسان کا، بھلائی کا، خوش اخلاقی کا، کیونکہ خوش اخلاقی اور بھلائی ایک ایسی چیز ہے کہ بسا اوقات دوسرا شخص چاہے وہ کتنا ہی قاسی القلب کیوں نہ ہو، دلائل کے ساتھ وہ متاثر نہیں ہوتا تو کبھی احسان کے ساتھ اور خوش معاملگی کے ساتھ ہی متاثر ہوجاتا ہے، تو ان کی اس بدکرداری کو دیکھ کر آپ ان کے ساتھ معاملہ اس قسم کا نہ کریں، درگزر کرو، وہ وقت آجائے گا جب ان کو سمیٹ لیا جائے گا، بہر حال آپ ان کے ساتھ معاملہ احسان کا رکھیں کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ تو کوئی شخص کتنا ہی بُرا ہو لیکن اگر اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ کسی وقت بھی سمجھ سکتا ہے تو اُس کی برائی سے درگزر کرتے ہوئے اُس کے ساتھ معاملہ اچھائی کا، بھلائی کا، اچھے برتاؤ کا رکھنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی متوجہ ہوجائے، ''ان کو معاف کیجئے، درگزر کر جائیے، بے شک اللہ تعالیٰ اچھا برتاؤ کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں'' یہ حضور ﷺ کو حُسنِ اخلاق سکھا دیا، کہ ان بدکرداروں کے ساتھ بھی معاملہ آپ نے احسان ہی کا رکھنا ہے، ہروقت ان کے اُوپر پکڑ دھکڑ، ہروقت ان کے اوپر تنقید، ہروقت ان کی خیانتوں کا ظاہر کرنا، اس کی کوئی ضرورت نہیں، دفع کرو، چھوڑو انہیں، آپ اپنی طرف سے ان کے ساتھ خوش اخلاقی کا معاملہ رکھیں۔

یہود کے بگاڑ کے بعد نصاریٰ کے بگاڑ کا تذکرہ

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى: تو جب قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى کا تذکرہ بعد میں آیا تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ جو ذکر کیا گیا تھا اس سے مراد یہود ہی ہیں، تو پہلا یہ کردار یہودیوں کا تھا، تحریفِ کلمات، قساوتِ قلبی، یہ ساری کی ساری چیزیں یہود کے متعلق ذکر کی گئی تھیں، اب اُن کے چھوٹے بھائی نصرانیوں کا ذکر آگیا، کہا کرتے ہیں کہ ''بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ!'' اور اِن کا حال بھی کوئی ان سے مختلف نہیں ہے، بلکہ ان سے بڑھ کر ہے، تو اُس معاہدے کے اندر سب سے بنیادی حیثیت توحید کو حاصل تھی، اور یہ بدبخت ایسے آئے کہ انہوں نے اسی کی بنیاد پر ہی کلہاڑا چلا دیا، اور اس طرح سے انہوں نے اللہ کے میثاق کا یہ حال کیا، خصوصیت کے ساتھ یہاں نصاریٰ کے شرک کو واضح کیا جا رہا ہے وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى: ان لوگوں سے جو کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے بھی ہم نے میثاق لیا، نتیجہ وہی نکلا کہ ''بھول گئے وہ اُس چیز سے فائدہ اٹھانا جس کے ساتھ نصیحت کیے گئے تھے'' تو ان کو پھر اللہ نے دنیا میں یہ سزا دی کہ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: ان کے درمیان ہم نے عداوت اور بغض ڈال دیا، یہ تاریخ اس بات سے بھری پڑی ہے کہ عیسائیت قبول کرنے والے لوگ مختلف فرقوں کے اندر بٹے، اور مختلف فرقوں کے اندر بٹنے کے بعد ان کی آپس میں مذہبی عداوت ہوئی، اور اس مذہبی عداوت کی بناء پر ان کی آپس میں لڑائیاں، ایک دوسرے کو زندہ جلا دینا، بچوں تک کو قتل کر دینا، یہ واقعات تاریخ میں بھرے پڑے ہیں، مذہبی لڑائیاں جتنی آپس میں نصرانیوں میں ہوئی ہیں شاید مذہبی لڑائیاں اتنی گروہ بندی کے ساتھ یہود میں نہیں ہوئیں، یہود میں اتنی گروہ بندی نہیں ہوئی جتنی نصاریٰ میں ہوئی ہے، نصاریٰ کے مختلف فرقے ہوئے، مختلف فرقے ہونے کے بعد مذہبی طور پر یہ آپس میں اُلجھے، اور اس کے نتیجے میں دنیا کے اندر یہ برباد ہوئے یہ دنیوی سزا دی اللہ تعالیٰ نے احکام کو فراموش کرنے کی۔

اہلِ اِسلام اور نصاریٰ کے اختلافات میں فرق اور اس کی وجہ

اب ذرا یہاں بھی غور فرما لیجئے، یہ جو نصاریٰ کا ذکر ہمارے جو نصاریٰ کا ذکر ہمارے سامنے کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم نے بھی میثاق کیا، اور اس میثاق کو فراموش کر دینے یا اس میں کوتاہی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بھی مختلف فرقے بنے، اور مختلف فرقے بننے کے بعد ان کے اندر آپس میں ٹکراؤ ہوا، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ایسا ٹکراؤ نہیں ہوا جس طرح سے نصاریٰ میں تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ چاہے ہمارے ہاں کتنے فرقے پیدا ہو گئے، چاہے اُمّتِ محمدیہ میں سے کتنے ہی لوگ اپنی خواہشات پر چلنے لگ گئے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نصیحت کو فراموش کر دیا، لیکن اس کے باوجود اِس اُمّتِ محمدیہ کے ہاتھ میں جو اللہ کا نُور تھا وہ گُل نہیں ہوا، یہ چراغ جل رہا ہے اور قرآنِ کریم اپنی صحیح پوزیشن میں محفوظ ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کی ہدایات صحیح طور پر ہمارے اندر باقی ہیں، اور ایک طائفہ ایسا ہے، ایک گروہ ہمیشہ سے ایسا رہا کہ جس نے اس روشنی کی حفاظت کی، تو جب یہ روشنی کا مینار ہمارے سامنے قائم ہے تو چاہے اختلافات کتنے بھی ہو جائیں لیکن اِس اُمّت نے راہ گم نہیں کیا، جس کی بناء پر اس میں اختلافات کی وہ شدت نہیں ہوئی جس قسم کی شدت ان لوگوں میں ہوئی کہ جو اپنے نُور کو گم کر بیٹھے، اور جہالت کی تاریکی میں وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھے پھر رہے ہیں، ہمارے ہاں وہ پوزیشن نہیں ہے، لیکن اس میثاق میں کمی آجانے کی وجہ سے اور اللہ کی ہدایات کی پوری پابندی نہ رہنے کی وجہ سے گروہ بندی ہمارے ہاں بھی ہوئی، اور اس گروہ بندی کے نتیجے میں آپس میں اختلافات ہوئے، لڑائیوں تک بھی نوبت آئی، لیکن وہ کیفیت نہیں ہے جو نصاریٰ پر گزری۔ تاریخی طور پر اگر آپ اس کو دیکھیں گے تو دونوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا، اور اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں ہدایت محفوظ ہے، یہ سرے سے گم نہیں ہوئی، اور وہ لوگ سرے سے صحیح راستے کو گم کر بیٹھے، جس کی بناء پر کسی بات پر اتفاق کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اور ہمارے ہاں جب حق ایک واضح مینار کی شکل میں قائم ہے، تو کتنے ہی لوگ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھریں، لیکن پھر بھی یہ حق کا مینار کسی نہ کسی درجے میں جوڑنے کے لئے ایک واضح دلیل ہے، تو اختلافات میں وہ شدت نہیں ہے جس قسم کی شدت اس حق کے گم کرنے کے بعد اور کتاب کی تحریف کرنے کے بعد اور جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکنے کے بعد جو اختلافات میں شدت ہوئی وہ اس اُمّت کے اندر نہیں پائی گئی، موجود بہرحال ہے۔

کیا عیسائیت قیامت تک رہے گی؟

''ڈال دی ہم نے ان کے درمیان عداوت اور بغض قیامت تک'' قیامت تک کا معنی یہ ہے کہ جب تک یہ رہیں گے، اس سے یہ دلیل نہیں ملتی کہ قیامت تک عیسائی باقی رہیں گے، کیونکہ روایاتِ صحیحہ کے اندر آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد عیسائیت باطل ہو جائے گی، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آ کر حق کو ظاہر کریں گے تو پھر ان کے نام پر جو ان لوگوں نے ڈھونگ رچا رکھا تھا، اپنے عقیدوں کا اور اپنے طرزِ عمل کا، وہ سب ختم ہو جائے گا، قیامت سے بہت پہلے یہ ختم ہو جائیں گے، یہ محاورہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس بات کا ثبوت قیامت تک نہیں لا سکتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قیامت تک زندہ رہا اور کوشش کرتا

رہا تو بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا، اُسی محاورے کے تحت یہ بات ہے کہ اگر یہ قوم قیامت تک بھی زندہ رہی تو ان کا آپس میں کبھی اتفاق نہیں ہوگا، اور کبھی آپس میں یہ عداوتوں سے باز نہیں آئیں گے، تو یہ حقیقتاً مراد نہیں کہ یہ واقعۃً قیامت تک باقی رہیں گے، مطلب یہ ہے کہ کبھی بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہوگا، جب تک یہ رہیں گے آپس میں مذہبی عقیدوں میں لڑتے رہیں گے، ہاں البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، پھر یہ عیسائی جو اس وقت موجود ہوں گے صحیح طور پر ایمان لائیں گے، پھر وہ عیسائی رہیں گے ہی نہیں، پھر تو وہ مسلم ہوں گے، محمدی بن جائیں گے، ایسے وقت میں پھر یہ بات ختم ہو جائے گی...... تو یہ دنیا میں اِن کو سزا ملی، وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللهُ: اور عنقریب اللہ تعالیٰ خبر دے گا انہیں ان کاموں کی جو یہ کیا کرتے تھے، یہ آخرت کی دھمکی آگئی۔

تمام اہلِ کتاب کو دعوتِ ایمان، اور رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کی دلیل

ان دونوں گروہوں کے ذکر کرنے کے بعد کہ یہود نے بھی میثاق توڑا، ملعون ہوئے، اور عیسائیوں نے بھی میثاق توڑا اور دنیا کے اندر بھی اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوئے، اب ان دونوں کو دعوت دی جارہی ہے، کہ ''اے کتاب والو!'' چاہے تم توراۃ والے ہو، چاہے انجیل والے ہو، یہودی ہو یا نصرانی ہو، ''تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا، جو واضح کرتا ہے تمہارے لئے ان باتوں میں سے بہت سی باتیں جن کو تم کتاب سے چھپاتے ہو'' یہ آیت حضور ﷺ کے معجزے کی نشاندہی کرتی ہے کہ تمہارے سامنے اس رسول کے برحق ہونے کی ایک یہی دلیل کافی ہے، کہ تم اہلِ علم اور وہ اُمّی، وہ کہیں پڑھا نہیں، اور اہلِ علم کی غلطیاں نکالنا کسی اَن پڑھ کا کام نہیں ہوتا، اہلِ علم کی غلطیاں وہی نکال سکتا ہے جو علم کے اندر ان سے فوق ہو، تو تم اتنے چابک دست خاندانی مولوی مُلاں اور ہوشیار قسم کے لوگ، تم نے جو کچھ گڑبڑ کر رکھی ہے یہ ہمارا رسول تمہارے سامنے ان میں سے کتنی باتوں کو واضح کرتا ہے، کہ تم نے یہ بات چھپالی، یہ گڑبڑ کردی، یہ چھپالی، یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ علم کے اعتبار سے تم سب پر بھاری ہے، اور بظاہر اُس نے کہیں سے پڑھا نہیں، کوئی مطالعہ کیا نہیں، لائبریریوں میں بیٹھا نہیں، تمہاری اُس نے صحبت نہیں اختیار کی، تو یہ سیدھی بات ہے کہ رَسُوْلُنَا وہ ہمارا رسول ہے، وہ آگیا تمہارے پاس جو واضح کرتا ہے تمہارے لئے ان باتوں میں سے، بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے ہو کتاب سے۔ ''اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے'' کیا مطلب؟ کہ گڑبڑ تو تم نے بہت کر رکھی ہے، لیکن وہ محض تمہیں ذلیل کرنے کے لئے تمہاری مخفی باتیں نہیں ظاہر کرتا، بلکہ تجدیدِ شریعت کے لئے اللہ کے احکام کو نمایاں کرنے کے لئے جن باتوں کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہے صرف وہی بیان کرتا ہے، اور جس کا تعلق اُس کے موضوع سے نہیں ہے، تم آپس میں خیانتیں کرو، بددیانتیاں کرو، تو ہر ہر بددیانتی کو واضح کرنا اس کا منصب نہیں، ''بہت ساری باتوں سے درگزر کر جاتے ہیں'' جن کا تعلق تجدیدِ شریعت کے ساتھ ہے اور دین کے واضح کرنے کے ساتھ ہے وہ باتیں تمہارے سامنے واضح کرتے ہیں، ''تمہارے پاس اللہ کا نُور آگیا اور واضح کتاب آگئی'' اب اس سے فائدہ اٹھالو، اگر تم نے اپنے گھر کا چراغ گُل کردیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور سورج چڑھادیا، اب اس میں آنکھیں کھولو، اور اس روشنی سے فائدہ اٹھاؤ، یہ نور بھی ہے جس سے ذہن کی ظلمت دُور ہوتی ہے، اور یہ کتابِ مبین بھی ہے جس میں لکھے لکھائے احکام سامنے آگئے، اور چلنے کے لئے راستہ واضح ہوتا ہے، چلنے کا طریقہ بتایا جارہا ہے۔

اِنسان کے کردار میں نیت و اِرادے کی اہمیت

''ہدایت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی اتباع کا ارادہ کرتے ہیں'' مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ: اَیْ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّتَّبِعَ رِضْوَانَهٗ، جو اللہ کی رضا کے متبع بننا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے ان کو دکھاتا ہے سلامتی کے راستے، کہ ان راستوں پر چلو گے تو سلامتی کو حاصل کرلو گے، جنت کا حاصل ہو جانا یہی کامل درجے کی سلامتی ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نکالتا ہے اس نُور کے ذریعے سے ان لوگوں کو (یعنی جو اتباعِ رضا کا ارادہ کرتے ہیں) نکالتا ہے تاریکیوں سے نُور کی طرف اپنی توفیق سے، اور انہیں صراطِ مستقیم کی راہنمائی کرتا ہے'' تو یہ نُور اور کتاب مبین جو تمہارے سامنے آ گیا اب اس سے فائدہ اٹھاؤ، اپنا ارادہ بدل لو، اپنی نیت تبدیل کرلو، پہلے تمہاری نیت اور تمہارا ارادہ سب خواہشات پورا کرنے کی طرف ہے، تم وہی چاہتے ہو جو تمہارے لئے اس دنیا کے اندر مفید ہے، اب اپنے ارادے اور نیت میں تبدیلی لاؤ، دل سے ٹھان لو کہ ہم نے اللہ کی رضا کی اتباع کرنی ہے، چاہے وہ ہماری خواہشات کے موافق ہو چاہے خواہشات کے خلاف ہو، اگر یہ جذبہ تمہارے اندر اُبھر آیا کہ تم اللہ کی رضا کے متبع ہو گئے، متبع شہوات نہ رہے، دنیا کے مفاد کو تم نے چھوڑا، آخرت کے مفاد کو مدنظر رکھا، خواہشات کو کچل دیا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کا ارادہ ہو گیا، تو قرآن تمہیں راہنمائی کرے گا، تمہیں راستہ دکھائے گا، صراطِ مستقیم پر چلائے گا، سلامتی کی جگہوں تک تمہیں پہنچائے گا، لیکن اگر تم نے ارادہ ہی نہیں بدلا تمہاری نیت میں ہی تبدیلی نہیں آئی، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیت اور ارادہ یہ ایک بنیادی چیز ہے انسان کے کردار کا رخ متعین کرنے کے لئے، یعنی انسان جو چلتا ہے اور عملی زندگی اختیار کرتا ہے، یہ پھوٹتی ہے نیت اور ارادے سے، اگر آپ نے ایک نیت کرلی تو آپ کے عمل کا رخ یہ ہو جائے گا، اس قسم کی نیت کرلی تو آپ کے عمل کا رخ یہ ہو جائے گا، تو سب سے پہلے تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اپنی نیت میں اور ارادے میں، اگر تمہاری نیت دنیا کمانے کی ہے ارادہ دُنیا کمانے کا ہے، اگر لذات پرستی اور شہوات پرستی تمہارا مقصود ہے، تو کسی طرح بھی تم اللہ کی ہدایت کو قبول کر کے سیدھے راستے پر نہیں چل سکتے، پھر تمہارے عمل کا رخ اور ہو گا، اور اگر تم نے ٹھان لی اور دل میں طے کرلیا کہ ہم نے تو اللہ کو راضی کرنا ہے، ہم نے تو اُس کے احکام کی پابندی کرنی ہے، چاہے ہماری خواہشات کے موافق ہو، چاہے ہماری خواہشات کے خلاف ہو، اگر یہ جذبہ اُبھر آیا تو تمہاری عملی زندگی ٹھیک ہو جائے گی، پھر یہ نُور اور کتاب مبین تمہارے لئے ہدایت کا باعث بن جائے گی۔ اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے ارادے کے اعتبار سے کتنی قوت دی ہے، کہ اگر کوئی شخص بُرائی کرنے کا ارادہ کرلے تو دُنیا کی کوئی دلیل اُس کو اچھائی کی طرف نہیں لا سکتی، ارادہ نہ کسی دلیل سے بدلا جا سکتا ہے اور نہ ظاہر کی طاقت اور زور سے بدلا جا سکتا ہے، اور اگر ایک شخص ارادہ کرلیتا ہے کہ میں نے حق پر قائم رہنا ہے اور نیکی کرنی ہے تو دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو بُرائی کی طرف نہیں لے جا سکتی، تو قوت کا منبع یعنی عملی زندگی کے لئے قوت جہاں سے مہیا ہوتی ہے وہ انسان کی نیت اور ارادہ ہے، اس لئے اتباعِ رضوان کا ارادہ کرلو، جو شخص یہ ارادہ کرے گا کہ ہم اللہ کو راضی کرنا چاہتے ہیں تو یہ نُور اور کتاب مبین اُس کو سیدھے راستے پر چلا کر انتہا پر پہنچا دے گی، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہیں راستہ نہیں مل سکتا اگر تمہارا ارادہ ہی خراب ہے، لذت پرستی اور شہوت پرستی کو ہی تم نے اپنا مقصود بنالیا ہے تو پھر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا سورج بھی سامنے آ جائے، روشنی کا مینار بھی سامنے آ جائے تو تم کبھی سیدھے راستے پر نہیں چل سکتے، یہ بنیادی چیز ہے کہ اپنے ارادے کو تبدیل کرو۔

نصاریٰ کے ایک گروہ کے عقیدۂ حلول کی تردید

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ: تحقیق کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، یہ نصرانیوں کے ایک گروہ کا عقیدہ تھا، وہ حلول کے قائل تھے، کہ عیسیٰ علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ حلول کئے ہوئے ہے، لہٰذا اللہ اور عیسیٰ علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اگر یہ مسیح ابن مریم اللہ ہو تو سارے اختیارات اسی کو ہونے چاہئیں، اس پر موت نہ آئے اور کوئی اس کو موت نہ دے سکے، لیکن اللہ تعالیٰ اگر اس کو ہلاک کرنا چاہے، اور اُس کی ماں کو ہلاک کرنا چاہے، اور سارے زمین کے باشندوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اللہ کا ہاتھ پکڑ لے گا؟ تو پھر یہ الٰہ کیسے ہوا؟ تو اُس کی اُلوہیت کو باطل کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات کہی ہے، ''آپ کہہ دیجئے کون اختیار رکھتا ہے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا، اگر ارادہ کر لے اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو ہلاک کرنے کا، اور اُس کی ماں کو ہلاک کرنے کا، اور ان سب لوگوں کو ہلاک کرنے کا جو کہ زمین میں ہیں'' چنانچہ ماں کو تو موت بالاتفاق ہو چکی، اور من فی الارض پر بھی آئے دن موت آتی رہتی ہے، اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق تو عیسیٰ بھی فوت ہو چکا، تو جس کو اللہ تعالیٰ موت کے گھاٹ اتار دے (لیکن یہاں موت دینے کا ذکر نہیں کیا کہ عیسیٰ کو تو اللہ نے مار دیا، تم کیسے کہتے ہو کہ عیسیٰ اللہ ہے، اگر اللہ تھا تو سولی پہ کیسے چڑھ گیا؟ مر کیسے گیا؟ یہ نہیں کہا، کیونکہ واقع کے اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام کو موت نہیں آئی، اس لیے اس کو بالفرض کے طور پر ذکر کیا جا رہا ہے) اور اُس کی ماں اگرچہ مر چکی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے ساتھ تذکرہ یوں ہی ہوا کہ اگر ان سب اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ ایک ہی دفعہ فنا کے گھاٹ اتار دے تو کون روکنے والا ہے؟ ''اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، پیدا کرتا رہتا ہے جو چاہتا ہے'' اس سے اس شبہ کا ازالہ کر دیا جس کی بنا پر وہ عیسیٰ علیہ السلام کو عام انسانوں کی سطح سے اُوپر اٹھاتے تھے، کہ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ جو پیدا ہوئے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام انسانوں کی طرح نہیں، بلکہ یہ کوئی مافوق البشریت ہستی ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے شبہ کو تم ختم کرو، یہ میری قدرت ہے، میں جو چاہتا ہوں پیدا کرتا رہتا ہوں يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ: پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

یہود ونصاریٰ کا محبوبِ خدا ہونے کا دعویٰ اور اس کی تردید

آگے ان کے نظریہ کی بنیادی غلطی کا ذکر ہے، یہ بھی مشترکہ ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کا عقیدہ تو نصرانیوں کا تھا، اور اِس اگلے نظریے میں یہ دونوں شریک تھے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں ہی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اللہ کے محبوب ہیں، چونکہ اللہ

کے محبوبوں کی اولاد ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارا منصب ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کے بیٹے ہوتے ہیں، کسی کے محبوب ہوتے ہیں، مطلب ان کا یہ تھا کہ جیسے انسان اپنے بیٹوں کی بیسیوں غلطیوں سے درگزر کرتا ہے، ہم کتنے ہی گناہ کرتے رہیں اللہ ہمیں آخرت میں پکڑے گا نہیں، اپنے جو محبوب ہوا کرتے ہیں ان کی لغزشیں انسان کو نظر ہی نہیں آیا کرتیں۔ جیسے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیفہ ذکر کرتے ہیں، کہ ایک محبوب نے اپنے محب سے پوچھا تھا کہ جی! آپ میرے اُوپر نظر رکھا کیجئے، جو کوئی میں غلطی کروں مجھے اُس کی اطلاع دے دیا کریں، آپ میری اصلاح کیا کریں، وہ محبّ کہنے لگا کہ ''این سخن از دیگرے پرس'' بھائی! یہ بات کسی اور سے جا کر پوچھو کہ میں تو جو نظر تیرے پہ رکھتا ہوں اس میں سوائے خوبیوں کے کچھ نظر آتا ہی نہیں [گلستاں باب ۵، حکایت ۵]۔ محبت ایک ایسی چیز ہے کہ جب انسان کے دل میں آجاتی ہے تو زاویہ نگاہ ایسا بدل جاتا ہے کہ محبوب کی خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں اور اس میں کوئی عیب نظر ہی نہیں آتا، اور اس کے مقابلے میں بغض ایک ایسا جذبہ ہے کہ اگر کسی کے متعلق پیدا ہو جائے تو خوبی کوئی نظر ہی نہیں آتی، سارے عیب ہی عیب نظر آتے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے اندر خوبیوں کا نظر آنا یا کسی کے اندر عیبوں کا نظر آنا، اس میں بہت حد تک اپنے زاویہ نگاہ کا فرق ہوتا ہے، محبت کی نگاہ سے دیکھو گے تو تمہیں ایک شخص اور نظر آئے گا، بغض کی نگاہ سے دیکھو گے تو تمہیں ایک شخص اور نظر آئے گا، فرق آپ میں پڑا ہے وہ تو وہی ہے جیسا ہے، دیکھنے والے کی نگاہ میں فرق پڑا ہے۔ تو ان کا دعویٰ یہی تھا کہ ہم اللہ کے لئے محبوبوں کی طرح ہیں، اس لئے وہ ہماری خوبیوں کو دیکھے گا، ہم میں عیب کوئی نہیں نظر آئے گا اس لئے ہمیں سزا بھی نہیں ہوگی، تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ کیوں جھوٹ بولتے ہو، اور اپنی تاریخ کی تم کس طرح سے تکذیب کر سکتے ہو، تمہیں تو بار بار مارا گیا پیٹا گیا، تمہارے حلیے بگاڑ دیئے گئے، تمہیں مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کر دیا گیا، محبوبوں کا کوئی یہ حال کیا کرتا ہے جو تمہارا ہوتا ہے؟ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ میں ان کی تاریخ کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے محبوب ذرا دیکھو تو سہی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے، اور جہاں تم نے گڑبڑ کی کس طرح سے تمہارے اُوپر لعنت ہوئی، تمہیں بندروں کی شکل میں بدلا، تمہیں خنزیروں کی شکل میں بدلا، اور کس طرح سے صحرانوردی ہوئی، چالیس سال تک میں تمہیں دھکے دیئے اور تم وادیٔ تیہ کے اندر بھٹکتے پھرتے رہے، کبھی طور اُٹھا کر تمہارے سر پر کھڑا کر دیا، کیسے کیسے واقعات پیش آئے ہیں، تو محبوب ایسے ہوا کرتے ہیں؟ محبوبوں کو انسان سزا نہیں دیا کرتا، تو تمہیں اللہ عذاب کیوں دیتا ہے تمہارے گناہوں کی وجہ سے؟ جیسے دُنیا میں پٹے ہو اسی طرح سے اپنی غلطیوں کی بنا پر آخرت میں بھی پٹو گے، اور اس ذہن کو بدل دو کہ تم کوئی محبوب ہو، نہیں! باقی مخلوق کی طرح تم بھی انسان ہو، جیسا برتاؤ باقی انسانوں سے ہوگا ویسے تم سے ہوگا، تو گویا کہ اس عقیدے کی بنا پر جو وہ بدعملی کا شکار ہو رہے تھے، کہ ہم چونکہ اللہ کے محبوب ہیں ہمیں کوئی پکڑے گا نہیں، ہمیں کچھ کہے گا نہیں، پھر انسان شرارتوں پر تُل جاتا ہے، جب پتا ہو کہ فلاں شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے، میرے اُوپر کسی قسم کی کوئی گرفت نہیں کرے گا، تو وہ آئین کی، قانون کی، کسی چیز کی پابندی نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ بات غلط ہے، جیسے دُنیا میں تمہیں تمہاری غلطیوں کی بنا پر سزا ملتی رہی اسی طرح سے آخرت میں بھی تم ایسے ہی پکڑے جاؤ گے، بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ: اللہ کی مخلوق میں سے تم بھی بشر ہو۔

''مشیتِ الٰہی'' کے ذِکر کرنے کا مقصد

''بخشے گا اللہ جسے چاہے گا عذاب دے گا جسے چاہے گا'' اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی کی نسبت، کسی کا نسب، کسی کا فلاں کا بیٹا ہونا یہ کوئی مانع نہیں، اللہ اپنی مرضی کے ساتھ، اپنے آئین کے تحت اپنی حکمت کے تحت جسے چاہے گا پکڑے گا جسے چاہے گا چھوڑے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اور کا دخل نہیں ہوگا، ورنہ یہ نہیں کہ پکڑنے چھوڑنے کے لئے اللہ کے ہاں کوئی ضابطہ ہی نہیں، جسے چاہے پکڑ لے، چاہے نیکوں کو پکڑ کر جہنم میں پھینک دے، چاہے بُروں کو جنت میں بھیج دے، یہ مطلب نہیں ہے، پکڑے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے بنائے ہوئے آئین کے تحت، لیکن جب پکڑنا چاہے گا تو کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتا، جس کو چاہے گا پکڑے گا، لیکن پکڑے گا کس کو؟ جو اس کے آئین کے زد میں آ جائے گا، جس کو چاہے گا بخشے گا، بخشے گا کس کو؟ جہاں اُس کی حکمت کا تقاضا ہوگا، لیکن کوئی دوسرا آدمی دخل نہیں دے سکے گا۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو دونوں کے درمیان میں ہیں اور اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے، ہر چیز کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔

یہود و نصاریٰ پر اِتمامِ حجت

''اے کتاب والو! تمہارے پاس تمہارا رسول آ گیا جو احکام واضح کرتا ہے تمہارے لئے، اور آیا بھی ہے رسولوں کے درمیان وقفہ پیدا ہو جانے کے بعد'' کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک بعض روایات میں پانچ سو سال کا فاصلہ ہے بعض میں چھ سو سال کا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ پانچ اور چھ کے درمیان درمیان ہے، اس لئے کسی نے نسبت اُوپر پوری کر دی، کسی نے اوپر کے عدد کو چھوڑ کر نیچے کا عدد تام ذکر کر دیا، اور حقیقت کے اعتبار سے تاریخی روایات کی طرف دیکھتے ہوئے تقریباً پانچ سو ستر سال کا فرق معلوم ہوتا ہے، اس عرصہ میں کوئی پیغمبر نہیں آیا، اور رسولوں میں اتنا وقفہ پہلے کبھی نہیں ہوا، پہلے ہر دور کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی پیغمبر موجود ہوتا تھا، تو اب اتنی دیر وقفے کے بعد جبکہ تم اپنی ہدایت کو گم بھی کر چکے، اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا تو اس کو تو نعمت سمجھنا چاہیے اور اس کی قدر کرنی چاہیے، ''رسولوں کے انقطاع پر رسولوں کے وقفے پر آیا، واضح کرتا ہے تمہارے لئے''، اور یہ اللہ نے کیوں بھیجا؟ اَنْ تَقُوْلُوْا: لِئَلَّا تَقُوْلُوْا تاکہ تم یہ نہ کہنے لگ جاؤ کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا ڈرانے والا آیا ہی نہیں، اس لئے اگر ہم سے غلطیاں ہو گئیں تو وجہ یہ ہوئی کہ ہمیں کوئی سمجھانے والا نہیں آیا، فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ لو! بشیر نذیر آ گیا، اب یہ تمہارا عذر بھی ختم ہو گیا'' اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ	قَالَ	مُوْسٰى	لِقَوْمِهٖ	يٰقَوْمِ	اذْكُرُوْا	نِعْمَةَ اللّٰهِ

قابل ذکر ہے وہ وقت جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! یاد کرو اللہ کے احسان کو

عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ

جو تم پر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر انبیاء بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا، اور دی تمہیں

مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ

وہ چیز جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دی ﴿۲۰﴾ اے میری قوم! داخل ہو جاؤ پاکیزہ زمین میں

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا

ایسی پاکیزہ زمین جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دی، اور نہ لوٹو تم اپنی پشتوں کے بل پھر تم پھردگے

خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ

اس حال میں کہ خسارہ پانے والے ہوگے ﴿۲۱﴾ انہوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس ارضِ مقدسہ میں زور آور لوگ ہیں،

وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا

اور بیشک ہم ہرگز نہیں داخل ہوں گے اس علاقے میں جب تک کہ وہ اس علاقے سے نکل نہ جائیں، پس اگر وہ اس علاقے سے نکل جائیں

فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ

تو پھر بیشک ہم داخل ہونے والے ہیں ﴿۲۲﴾ کہا دو آدمیوں نے جوان لوگوں میں سے تھے جو ڈرتے ہیں، ان دونوں پر اللہ نے

عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ

اِنعام کیا، (انہوں نے کہا) کہ داخل ہو جاؤ ان پر دروازے میں، جس وقت تم اس دروازے میں داخل ہوؤ گے پس بیشک تم ہی

غٰلِبُوْنَ ۬ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا

غلبہ پانے والے ہوگے، اور اللہ پر ہی بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو ﴿۲۳﴾ وہ کہنے لگے کہ

يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ

اے موسیٰ! بے شک ہم ہرگز نہیں داخل ہوں گے اس علاقے میں کبھی بھی جب تک وہ لوگ اس علاقے میں ہیں، جا تو

وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ

اور تیرا رب، پس تم دونوں لڑائی کرو بیشک ہم یہاں سے سرکنے والے نہیں ﴿۲۴﴾ موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب! بیشک میں

لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾
نہیں اختیار رکھتا مگر اپنی جان کا اور اپنے بھائی کا، پس تو جدائی ڈال دے ہمارے درمیان اور فاسق لوگوں کے درمیان ﴿۲۵﴾
قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي
اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس بے شک یہ زمین حرام ٹھہرادی گئی ان لوگوں پر چالیس سال، حیران سرگردان پھریں گے
الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾
زمین میں، پس تو غم نہ کر ان بدمعاش لوگوں پر ﴿۲۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ: قابل ذکر ہے وہ وقت جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا، يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اے میری قوم! قومِ کے نیچے کسرہ یہ دال ہے یائے متکلم پر۔ اے میری قوم! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے، اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ: جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر انبیاء بنائے، وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا: اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ ملوك مَلِك کی جمع ہے۔ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: اور دی تمہیں وہ چیز جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دی، يٰقَوْمِ: اے میری قوم!، ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ: داخل ہو جاؤ پاکیزہ زمین میں، الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ: ایسی پاکیزہ زمین جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دی، وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ: اور نہ لوٹو اپنی پشتوں کے بل۔ اِدبار دُبر کی جمع ہے۔ یعنی جدھر سے آئے ہو ادھر واپس نہ لوٹو، یا جہاد چھوڑ کر واپس نہ لوٹو۔ ''نہ لوٹو اپنی پشتوں پر'' فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ: پھر تم پھرو گے اس حال میں کہ خسارہ پانے والے ہو گے، خسارہ پانے کی حالت میں تم لوٹو گے پھرو گے، قَالُوْا: انہوں نے کہا، يٰمُوْسٰٓى: اے موسیٰ!، اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ: بیشک اس ارضِ مقدسہ میں زورآور لوگ ہیں۔ جبار سے زبردست اور زورآور مراد ہے۔ بیشک اس ارضِ مقدسہ میں زورآور زبردست لوگ ہیں، وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا: اور بیشک ہم ہرگز نہیں داخل ہوں گے اس زمین میں، اس علاقے میں، حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا: جب تک کہ وہ اس علاقے سے نکل نہ جائیں۔ حتّٰی کے بعد محاورۃً نفی کا ترجمہ ہوتا ہے۔ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا: پھر اگر وہ اس علاقے سے نکل جائیں، فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ: پھر بیشک ہم داخل ہونے والے ہیں، قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ: کہا دو آدمیوں نے جو ان لوگوں میں سے تھے جو ڈرتے ہیں، اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا: اُن دونوں پر اللہ نے انعام کیا، قَالَ کا مقولہ یہ ہے ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ: ان دو آدمیوں نے کہا کہ داخل ہو جاؤ ان پر دروازے میں، فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ: جس وقت تم اس دروازے میں داخل ہو گے، فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ: پس بیشک تم ہی غلبہ پانے والے ہو گے، وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا: اور اللہ پر ہی بھروسہ کرو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان والے ہو۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى: وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ!، اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا: بیشک ہم ہرگز نہیں داخل ہوں گے اس علاقے میں کبھی بھی، مَّا دَامُوْا فِيْهَا: جب تک وہ لوگ اس علاقے

میں ہیں، فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ: جاتو اور تیرا رب، فَقَاتِلَآ: پس تم دونوں لڑائی کرو، اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ: بیشک ہم یہاں بیٹھنے والے ہیں، اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ چونکہ یہ لفظ دعوتِ جہاد کے مقابلے میں بولا جارہا ہے اس لیے "بیان القرآن" میں حضرت تھانوی ؒ نے اس کا مفہوم بیان کیا کہ بیشک ہم یہاں سے سرکنے والے نہیں، ہم تو یہیں جم کے بیٹھے رہیں گے، ہم یہاں سے سرکنے والے نہیں ہیں، کیونکہ قعود یہاں لغوی حقیقی مراد نہیں کہ ہم یہیں بیٹھے رہیں گے، جو بیٹھنا قیام کے مقابلے میں ہوتا ہے یہاں وہ مراد نہیں، مقصد یہ ہے کہ ہم یہاں سے جدھر تو کہتا ہے ادھر نہیں سرکیں گے، یہیں ٹھہریں گے، تو ٹھہرنے والے مفہوم کو اس کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب! بیشک میں نہیں اختیار رکھتا مگر اپنی جان کا اور اپنے بھائی کا، فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ: پس تو فرق ڈال دے ہمارے درمیان اور فاسق لوگوں کے درمیان۔ فاسق فِسق سے لیا گیا ہے یعنی خروج عن الطاعت، یہ جو فرمانبرداری سے نکلنے والے ہیں، یہ باغی لوگ، نافرمان لوگ، ہمارے اور ان کے درمیان میں فرق کردے، جدائی ڈال دے، یا ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کردے۔ قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ: پس بیشک یہ زمین حرام ٹھہرادی گئی ان لوگوں پر، اَرْبَعِیْنَ سَنَةً: چالیس سال، یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ: حیران سرگردان پھریں گے زمین میں۔ تَاهَ یَتِیْهُ: حیران ہونا۔ حیران پریشان پھریں گے علاقے میں، فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ: پس تو غم نہ کر ان بدمعاش لوگوں پر، ان نافرمان لوگوں پر، فسق اختیار کرنے والوں پر تو غم نہ کر۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں آپ کے سامنے آچکا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ کتاب سے اپنے عہد اور میثاق کا ذکر کیا تھا، اور ان کے نافرمانی کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قوم پر جو پھٹکار پڑی تھی اس کی تفصیل آئی تھی، اور پھر اس رکوع سے قریبی آیات میں یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ نقل کیا گیا تھا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بڑے چہیتے بڑے لاڈلے ہیں، اس لئے ہم جو کچھ بھی کرتے رہیں ہمارے اوپر کسی قسم کی گرفت نہیں آئے گی۔

ایک اِشکال کا جواب

اور آپ (طلبہ) یہ جو اشکال پیش کر رہے ہیں کہ جو چہیتے ہوتے ہیں ان پر تو گرفت زیادہ ہوا کرتی ہے، یہ گرفت ہوا کرتی ہے بطور تربیت کے اور بطور تادیبِ نفس کے، اور تادیبِ نفس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو جھڑک کر تنبیہ کر کے ان کی بُری عادتیں چھڑائی جاتی ہیں، اور اچھی عادتیں ان کو اختیار کرنے کے لئے کسی درجے میں مجبور کیا جاتا ہے، لیکن ان بنی اسرائیل کا جو دعویٰ تھا وہ دُنیا اور آخرت دونوں کے متعلق ہی تھا، آپ جانتے ہیں کہ آخرت میں جس قسم کی بھی سزا دی جائے اُس کا تعلق تادیب کے ساتھ

نہیں ہے، تادیب اُس سزا کو کہتے ہیں کہ جس سے اس عادت کا چھڑانا مقصود ہو، وہاں سزا مقصود نہیں ہوتی، عادت چھڑانی مقصود ہوتی ہے، اور آخرت میں جب ان کو جہنم میں ہی ڈال دیا جائے گا تو وہاں تو کوئی تادیب کا سوال نہیں، وہ تعذیب ہے تادیب نہیں ہے، اسی طرح سے دُنیا کے اندر جن سزاؤں کے ساتھ ان کو برباد کر دیا گیا مثلاً بندر بنا دیے گئے، تو اس کے بعد ان کے سنبھلنے کی کیا صورت رہی، یا بعض روایات میں بعض واقعات کے اندر ان کو خنزیر کی شکل میں مسخ کیا گیا، اس کے بعد وہ تباہ ہو گئے پھر ان کے سنبھلنے کی کیا صورت رہی؟ تو یہ چیزیں جو ہیں یہ تعذیب ہیں تادیب نہیں، اور پیاروں اور لاڈلوں کو تادیب تو ہوا کرتی ہے تعذیب نہیں ہوا کرتی، تو تادیب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طور پر تنبیہ کی تاکہ یہ بُری عادت کو چھوڑ کر اچھی عادت اختیار کر لیں، اور ان کو ایسی بھی کی گئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو تادیب کرتا ہے، جیسے کہ مؤمنین کی جماعت پر، سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت پر بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں، ہم ان کو تادیب قرار دیتے ہیں، اور ان کے اندر ان کو بالکل ایک مجرم قرار دے کر مجرمانہ حالت میں ان کو فنا ہی کر دیا جائے، اور اس دُنیوی عذاب کو پیش خیمہ بنا لیا جائے اُخروی عذاب کا، یہ چیز تعذیب کہلاتی ہے تادیب نہیں کہلاتی، بنی اسرائیل پر جو واقعات آئے ہیں ان کے اندر اکثر و بیشتر تعذیب کا پہلو ہے، اس لئے ان کا یہ جو خیال تھا کہ ہم اللہ کے محبوب ہیں، اللہ کے لاڈلے ہیں اللہ ہمیں کسی قسم کا عذاب نہیں دے گا، یہ بات ان کی غلط ہے، اور آخرت میں جب ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، جیسے کہ آیات کے اندر واضح کر دیا گیا، تو وہ تو سراسر تعذیب ہی تعذیب ہے، اس میں تو تادیب کا پہلو ہے ہی نہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیت میں بھی اس کی تردید کی اسی طرح سے کہ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ: یہاں دیکھو! یُعَذِّبُکُمْ، تعذیب کا لفظ آیا ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہاری کوتاہیوں کی وجہ سے تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے؟ لاڈلوں کو عذاب نہیں دیا جایا کرتا، ادب سکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ تنبیہ ہوتی ہے، اور عذاب میں تو بالکل فنائیت ہے، کہ اس قوم کو فنا کر کے رکھ دیا گیا، پھر سنبھلنے کا موقع ہی دیا گیا، یہ صورت عذاب کی ہوتی ہے۔ اب یہ رکوع جو آپ کے سامنے پڑھا گیا اس میں بھی ان لاڈلوں اور چہیتوں کا ایک حال واضح کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں یہ اللہ کی گرفت میں آئے، تو جس واقعہ کے تحت یہ بتایا جا رہا ہے کہ دیکھو! جس وقت بھی عہد کی خلاف ورزی کی گئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس طرح سے گرفت ہوئی، اور اس قوم کا مزاج ان آیتوں کے اندر نمایاں کیا گیا ہے۔

قومِ بنی اِسرائیل کا شام سے مصر منتقل ہونا

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اصل کے اعتبار سے تو عراق کے علاقے کے رہنے والے ہیں، اور جب عراق کے علاقے میں آپ کی دعوت نہ پھیل سکی، گھر کے افراد، ملک کے باشندے، وقت کی بادشاہت، وقت کی حکومت سب خلاف ہو گئے، تو ایسے وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے علاقے کو چھوڑا اور ہجرت کی، اور ہجرت کر کے شام کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے، یہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زندگی کا آخری حصہ گزارا ہے، حضرت اسحاق علیہ السلام کو یہیں مرکز بنا کر دیا جس کو بیت المقدس کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اپنے پہلے صاحبزادے اسماعیل علیہ السلام کو حجاز میں مرکز بنا کر دیا جس کو بیت اللہ کے

عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ دونوں مرکز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کئے، مکہ معظمہ کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بٹھا دیا، شام کے علاقے میں بیت المقدس کے مقام پر اسحاق علیہ السلام کو متعین کر دیا، تو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد اسی علاقے میں پھیلی، اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہوئے اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام پیغمبر ہوئے، تو یعقوب علیہ السلام کی اولاد جو یہاں آباد ہوئی تھی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی وساطت سے پھر یہ سارے کے سارے بارہ کے بارہ خاندان مصر کے اندر منتقل ہو گئے، یوسف علیہ السلام کی وساطت سے! جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ یوسف میں آئے گی، تو پھر یہ علاقہ جو شام کا تھا جو مہاجر ابراہیم ہے، ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کا علاقہ ہے، پیغمبروں کی جگہ تھی یہ علاقہ بنی اسرائیل سے خالی ہو گیا، اور مصر کے اندر جا کر یہ سارے کے سارے جا کر آباد ہو گئے۔

مصر میں بنی اسرائیل پر ظلم اور فرعون سے نجات

اور مصر کے اندر یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد ان خاندانوں نے بدویانہ زندگی اختیار کی، اور جو وقت کی حکومت تھی اُس کے اندر ان کی کوئی مداخلت نہ رہی، تو اُس حکومت نے ان کے ساتھ غلاموں والا برتاؤ کیا، اور بہت ذلت آمیز حالات کے اندر ان کو رکھا، جس طرح سے غلاموں کو رکھا جاتا ہے، بیگار لی جاتی تھی اور ہر قسم کے سخت سے سخت کاموں میں ان کو استعمال کیا جاتا تھا، ان کی زندگی مصر میں ایسے تھی جیسے يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ ان لفاظ کے اندر ان کی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا، اور شام کے علاقے میں ایک قوم آباد ہو گئی جس کو عمالقہ کہتے ہیں، اور یہ قوم عاد کی کوئی شاخ ہے، اس لئے ان کے قدوقامت بظاہر دیکھنے میں عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ تھے، ڈیل وڈول والے تھے جسمانی قوت ان میں کافی تھی، کیونکہ قوم عاد کا تعارف جو قرآنِ کریم میں کرایا گیا ہے اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ قدوقامت میں یہ لوگ عام مخلوق کے مقابلے میں ممتاز تھے، اسی لئے وہ نعرہ لگاتے تھے: مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ فصلت:۱۵) ہم سے قوت میں کون زیادہ ہے؟ قوت میں ہم ہی سب سے زیادہ ہیں، اُن کو اپنی قوت پر بڑا ناز تھا، تو یہ لوگ عذاب سے تباہ کر دیے گئے جو حضرت ہود علیہ السلام کے زمانے میں تھے، انہی کی کوئی بچی بچائی شاخ تھی قوم عمالقہ جو شام کے علاقہ میں آباد تھی، اس علاقے پر وہ قابض تھے، یہاں ان کی بادشاہت تھی حکومت تھی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت تشریف لائے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان اسرائیلیوں کو اس ذلت سے رسوائی سے نجات دی، یہ فرعون کی غلامی سے چھوٹے، اور ان کی ہر قسم کی تکلیفیں جو تھیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے دُور ہوئیں، سمندر کو عبور کر کے یہ دوسرے علاقے میں پہنچے، فرعون جو ان کا دشمن تھا وہ مع لاؤ لشکر کے ڈبو دیا گیا، گویا کہ مصر کا علاقہ بھی ایک وجہ سے بالقوۃ اسرائیلوں کے قبضے میں آ گیا، کیونکہ ان کا دشمن مع اپنی کابینہ کے اور مع اپنی فوج کے جب غرق ہو گیا تو ایک قسم کا وہ علاقہ ان کا اپنا ہو گیا، جیسے قرآنِ کریم میں اشارہ ہے کہ ہم نے ان کا وارث ان لوگوں کو بنا دیا، أَوْرَثْنٰهَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (سورۂ شعراء:۵۹) ہم نے ساری کی ساری نعمتیں جن کو فرعونیوں نے چھوڑا تھا ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

بارہ اسرائیلی سرداروں کی شام میں جاسوسی کے لئے روانگی

اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ ہوا، کہ شام کا علاقہ جو اصل کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا علاقہ تھا، اب اُس کے اندر قوم عمالقہ کافر مشرک آباد ہیں، تو ان اسرائیلیوں کو ساتھ لے کر جہاد کرو، اور وہ علاقہ میں تمہیں دے دوں گا، جہاد کے نتیجے میں وہ علاقہ فتح ہو جائے گا، تم اپنے اس وطن کو حاصل کرلو، یہی فلسطین کا علاقہ، اُردن کا علاقہ جو آج ''شام'' کہلاتا ہے، یہ سارے کا سارا اُس وقت ''شام'' ہی کہلاتا تھا، اُردن بھی اسی میں تھا، فلسطین بھی اسی میں تھا، بیت المقدس کا علاقہ، پُرانی تاریخ کے اندر یہ سب ''شام'' ہے، تو یہ علاقہ دینے کا وعدہ کیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اس علاقہ کو فتح کرنے کے لئے ترغیب دیتے ہوئے تقریر کی، ساری قوم کو وہاں مصر سے جو نکال کر لا رہے تھے، اب وہ شام کے علاقے کے قریب آ گئے تو جہاد کی ترغیب دی، اور جس طرح سے قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم کے خلاف لڑائی لڑنی ہوتی ہے تو اُس علاقے کے حالات معلوم کیے جاتے ہیں، قوم کے حالات معلوم کیے جاتے ہیں تاکہ محاذ کی تعیین ہو سکے، کہ محاذ جنگ کہاں بنانا ہے؟ اور ان لوگوں کا طرز وطریق کیا ہے؟ ہم نے ان کے ساتھ کس طرح سے مقابلہ کرنا ہے؟ ان حالات کو جاننے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ قبیلوں میں سے بارہ سردار متعین کر کے بطور جاسوسی کے اس علاقے میں بھیجے جس علاقے پر جہاد کرنا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو شام میں نہیں گئے تھے، اور باقی قوم بھی بہت پہلے سے مصر میں آئی ہوئی تھی، تو وہاں کے لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے، علاقے کے احوال معلوم کرنے کے لئے تاکہ محاذ جنگ کی تعیین ہو سکے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ آدمی ادھر بھیج دیئے، وہ بارہ آدمی اس علاقے میں گئے، جا کے انہوں نے اس علاقے کی سرسبزی شادابی آبادی سب کچھ دیکھی، اُس سے تو بڑے خوش ہوئے کہ یہ علاقہ تو واقعی حاصل کرنے کے قابل ہے، یہاں کی فصلیں یہاں کے باغات دل کشی کا باعث ہیں، لیکن جو لوگ وہاں آباد تھے جب ان کو دیکھا تو بڑے پہلوان قسم کے بڑے مضبوط بڑے طاقتور، بلکہ بعض اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارہ شخص جب اس علاقے کے اندر چکر کاٹتے پھر رہے تھے تو اُس قوم کے بعض افراد کو شبہ پڑ گیا کہ یہ کوئی جاسوس ہیں دوسرے ملک کے، تو ایک آدمی ان بارہ کو پکڑ کر لے گیا، اور اپنے بادشاہ کے سامنے، اپنے سردار کے سامنے لے جا کر ان کو پیش کر دیا، اور کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ جگہیں تاڑتے پھر رہے ہیں، جاسوسی کرتے پھر رہے ہیں، یہ کوئی ہمارے ساتھ لڑائی کا ارادہ کر رہے ہیں، اس لئے ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن اس وقت کے بادشاہ نے ان کو قتل نہ کیا بلکہ اس خیال سے چھوڑ دیا کہ انہوں نے ہماری قوت اور طاقت تو دیکھ ہی لی کہ یہ بارہ تھے، اور ہمارا ایک آدمی تھا ان کو گھیر گھار کے لے آیا جیسے بھیڑوں کو گھیر لیتے ہیں، اب یہ جائیں گے اور جا کر اپنی قوم کے سامنے جس وقت ہمارا حال بیان کریں گے تو وہ قوم جرأت ہی نہیں کرے گی کہ ہمارے مقابلے میں آئے، اس خیال سے انہوں نے ان بارہ آدمیوں کو چھوڑ دیا، اور یہ بارہ کے بارہ اس علاقے سے واپس آ گئے۔

جاسوسوں کی واپسی اور موسیٰ علیہ السلام کی اُن کو ہدایت

آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انہوں رپورٹ دی، گویا کہ یہ تفتیشی مہم تھی، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھیجی تھی تفتیشِ احوال کے

لئے، انہوں نے آکر اپنی تفتیش کے دوران جو کچھ ذہنی طور پر اخذ کیا تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کیا، علاقے کی خوبیاں بیان کیں، وہاں کے چشموں کا اور باغات کا ذکر کیا، کہ وہاں بڑے پھل ہیں، بڑے فروٹ ہیں اور بڑی سبزی ہے، یہ ساری چیزیں ہیں لیکن وہاں جو لوگ قابض ہیں وہ بس میں نہیں ہیں، وہ بڑے طاقت ور ہیں، اور ان کا مقابلہ کرنا اپنے بس کی بات نہیں ہے، بڑے ڈیل وڈول والے قوت والے طاقت والے ہیں، بلکہ ایک روایت میں تو لفظ یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم اس قوم کے مقابلے میں تو ایسے معلوم ہوتے تھے، اپنے آپ کو ہم یوں سمجھتے تھے کہ جس طرح سے ٹڈیاں ہوتی ہیں، ان کے مقابلے میں ہماری حیثیت ٹڈیوں جیسی ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ باتیں سنی تو ان بارہ کے بارہ آدمیوں کو سمجھا دیا کہ یہ تمہاری قوم جو ہے یہ بڑی عجیب قسم کی قوم ہے، اس لئے ان کے سامنے اس علاقے کی خوبیاں تو بیان کرنا، تا کہ ان کے دل کے اندر شوق پیدا ہو، لیکن یہ جو تم اس قوم کا حال ذکر کر رہے ہو، تو جب اللہ نے وعدہ کر لیا ہے ہمارے ساتھ کہ یہ علاقہ میں تمہیں دوں گا تو فتح یقیناً ہماری ہوگی، اس لئے تم اس قوم کی قوت طاقت سرکشی ان کا جبر یہ چیزیں بیان نہ کرنا، ورنہ تمہاری قوم کا دل بیٹھ جائے گا، وہ بزدل ہو جائیں گے، پھر جہاد کے لئے تیار نہیں ہوں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن آدمیوں کو یہ تاکید کر دی کہ قوم کے سامنے اس علاقے کی تعریف کرو، باقی ان آدمیوں کی قوت اور طاقت کا ذکر نہ کرنا تا کہ قوم بزدل نہ ہو جائے۔

اکثر جاسوسوں نے موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کی پروانہ کی

تو جب وہ اپنی قوم میں خلط ملط ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایات پر صرف دو آدمی پابند رہے، ایک کا نام یوشع بن نون، اور ایک کا نام کالب بن یوحنا یا یوقنا، اور توراۃ کی روایت کے مطابق لفظ ذکر کیا ہے ''یافنا'' یا ''یاقنا''، اور ہمارے مفسرین نے ''یوقنا'' نقل کیا ہے،(۱) کالب بن یوقنا، بہر حال ایک کا نام یوشع ہے اور ایک کا نام کالب ہے، یہ بھی انہی بارہ میں سے تھے جن پر اس قوم کی ہیبت اثر انداز ہوئی تھی، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ پابند رہے اور اپنی قوم کے سامنے بزدلی کی باتیں نہیں کیں، یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا انعام تھا، اللہ کا احسان تھا کہ وہ ثابت قدم رہ گئے، ورنہ یہ تھے انہی میں سے ہی جو ان کی ہیبت اور دبدبہ اور سب کچھ دیکھ کر آئے تھے، لیکن وہ باقی دس جو تھے انہوں نے کھسر پھسر کرتے ہوئے اپنے خاص خاص آدمیوں کو اس قسم کے حالات جو بیان کرنا شروع کیے، تو یاروں دوستوں کی وساطت سے ساری قوم کے اندر یہ بات مشہور ہوگئی، کیونکہ انسان جس وقت کسی راز کا اِفشا کیا کرتا ہے تو بظاہر تو ایسے لوگوں کے سامنے کرتا ہے، کہ جن پر اعتماد ہوتا ہے کہ یہ آگے نہیں بتائیں گے، لیکن ''آگے نہیں بتائیں گے، آگے نہیں بتائیں گے'' کرتے ہوئے ساری بات نکل جاتی ہے، میرے یہ معتمد علیہ ہیں، میں نے ان کو کہہ دیا بتا دیا، اور ساتھ یہ کہہ دیا کسی اور کو نہ بتانا، اور انہوں نے سُن لی، ان کا آگے وہ معتمد علیہ ہے اس کو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی دیکھنا تجھے ایک راز کی بات بتا رہا ہوں، آگے نہ بتانا، ہر کوئی آگے کہتا بھی جائے گا اور آگے نہ بتانا کی تلقین کرتا چلا جائے گا، اور بنیاد غلط اٹھی ہے پہلے شخص سے کہ اگر ''آگے نہ بتانا'' یہ بات ایسی ہے کہ ظاہر کرنے کی نہیں، تو تم بھی آگے اس کو چلتی نہ کرو، اگر تم نے آگے چلتی

(۱) ''یافنا'' طبری میں ہے، اکثر تفاسیر میں ''یوقنا'' ہے بعض میں ''یوحنا'' ہے، ''یاقنا'' نہیں ملا۔ واللہ اعلم۔

کردی پھر تو یہ دھکا لگے گا اور آگے چلتی چلی جائے گی، اور اسی لفظ کے ساتھ ہی چلتی چلی جائے گی کہ ''کسی اور کو نہ بتانا!'' اور وہ سب میں پھیل جائے گی، اسی لئے عقلاء کہا کرتے ہیں کہ: ''اَلسِّرُّ اِذَا جَاوَزَ الْاِثْنَيْنِ شَاعَ'' روضۃ الادب کے اندر یہ محاورہ آپ نے پڑھا ہوگا، بھید جب دو سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر یہ شائع ہو جایا کرتا ہے، اور دو سے تجاوز کا کیا مطلب؟ دو سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس اثنین سے مراد یہ دو ہونٹ ہیں، کہ دل کی بات جب ان دونوں ہونٹوں سے باہر آ گئی، اس کے بعد پھر یہ سنبھالنے کی نہیں ہے، پھر تم اس پر کیسی ہی پابندیاں کیوں نہ لگاؤ، پھر یہ چلتی چلتی آخر پھیل ہی جاتی ہے، اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ راز کی بات اور بھید کی بات دُنیا کے اندر شائع نہ ہو تو ان ہونٹوں سے اس کو نکلنے نہ دو، یہ بند ہے کسی راز کو محفوظ رکھنے کے لئے، اور جس وقت یہ بند کھل جاتا ہے اور راز کی بات منہ سے باہر آ جاتی ہے تو پھر وہ چھپی نہیں رہتی، چاہے ہزار پابندیاں لگاؤ، وہ پھر خصوصیت کے بنا پر ایک دوسرے کے سامنے منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح سے ان لوگوں نے اپنے خصوصی لوگوں کے سامنے باتیں کی، اُنہوں نے اپنے خصوصیوں کے سامنے کیں، بات ساری کی ساری قوم کے اندر پھیل گئی، جب قوم کے اندر پھیل گئی تو قوم جو ساری زندگی فرعونیوں کے جوتے کھاتی رہی، ہمت ان میں نہیں تھی، اُولوالعزمی ان میں نہیں تھی، تو ان کے دل بیٹھ گئے، وہ بزدل ہو گئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اب قوم کے سامنے تقریر کی اس قوم کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے، اس تقریر کو چند الفاظ میں قرآنِ کریم نے نقل کیا ہے۔

نبوّت اور بادشاہت کی نسبت میں فرق

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر میں مضمون کچھ اس قسم کا ہے کہ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کے انعامات یاد دلائے، کہ دیکھو! اللہ نے تم پر کیسے کیسے اِنعام کیے، رُوحانی اور دِینی اِنعام بھی، اور ظاہری اور دُنیوی اِنعام بھی، رُوحانی اور دِینی اِنعام تو یہ کیے کہ تمہارے اندر انبیاء بھیجے، اور کسی قوم کے اندر نبی کا آ جانا یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے، کہ ایک روشنی مہیا ہو گئی جس کے ساتھ ظلم اور جہالت دُور ہوتی ہے، تو تمہارے اندر نبی بھیجے، اللہ تعالیٰ کا کتنا اِنعام ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری راہنمائی کی، اور پھر دُنیوی اور ظاہری اِنعام اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ کیا کہ تمہیں بادشاہ بنا دیا، غلامی سے نکالا، خود مختار ہو گئے، اب تم بادشاہ ہو۔ دیکھو! انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے تو یہ کہا کہ تمہارے اندر نبی بھیجے، معلوم ہو گیا کہ نبی تو وہی چند اشخاص ہیں جو اللہ نے بنائے، کسی قوم کا ایک فرد اگر نبی بن جائے، تو نبوّت کی نسبت ساری قوم کی طرف نہیں ہوتی، کہ یہ قوم ہی نبی ہے، نبوّت کی نسبت صرف اس ایک فرد کی طرف ہوتی ہے جس کو نبی بنایا گیا ہے، ہاں البتہ یہ کہیں گے کہ فلاں قوم میں فلاں شخص نبی آیا، نبوّت کی نسبت اُسی ایک کی طرف ہوگی، ایک نبی آنے کے ساتھ ساری قوم نبی نہیں بن جایا کرتی، لیکن بادشاہت کی نسبت ساری قوم کی طرف کی، کیونکہ محاورہ یہی ہے کہ جس خاندان کا فرد بادشاہ ہو تو کہتے ہیں کہ فلاں خاندان کی حکومت ہے، مغلیہ خاندان کی حکومت ہے، بنی تغلق کی حکومت ہے، بنواُمیہ کی حکومت ہے، بنو عباس کی حکومت ہے، تو گویا کہ جس قوم کا خلیفہ ہوا کرتا ہے بادشاہ ہوا کرتا ہے اسی قوم کی حکومت ہوتی ہے، جیسے آج کل لوگ ہمیں[1] کہتے ہیں کہ اب پاکستان پر ارائیوں کی حکومت ہے، چونکہ آپ کا صدرِ مملکت جو ہے وہ خوش قسمتی سے کہہ لو کہ وہ

(۱) حضرت حکیم العصر ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور صدر ضیاء الحق بھی ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ارائیں قوم سے تعلق رکھتا ہے، اب جو کچھ بھی کہیں، تو لوگ کہتے ہیں ارائیں ایسے ہوتے ہیں، صدر ایسی باتیں اس لیے کر رہا ہے کہ ارائیں ایسے ہوتے ہیں، بس ارائیوں کی حکومت ہے اس کی وجہ سے یوں ہو گیا، تو یہ قاعدہ ہے کہ جس قوم کا فرد صاحب اقتدار ہوتا ہے، تو اقتدار کی نسبت ساری قوم کی طرف ہو جایا کرتی ہے، اس لئے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں بادشاہ بنا دیا۔ یہ تقریر تو تب کرنی پڑے گی کہ جب مُلُوْکًا سے حقیقی بادشاہ ہی مراد ہوں، تو گویا کہ اقتدار کے اندر قوم بھی شریک ہوتی ہے، خاص طور پر آج کل تو آپ جانتے ہیں کہ جب بھی کوئی نمائندہ آتا ہے تو عوام کی حکومت ہوتی ہے، ایک اکیلے نمائندے کی حکومت تو ہوتی نہیں، بھٹو صاحب کی حکومت جو تھی عوام کی حکومت تھی، اس وقت سارے عوام ہی صدر مملکت تھے اور عوام ہی وزیر اعظم تھے، جو کچھ ہوتا تھا عوام کی ذمہ داری پر ہوتا تھا، عوام کی بادشاہت آ گئی، عوام کا اقتدار آ گیا، تو نسبت اس طرح سے سب کی طرف کر دی جاتی ہے۔

''فقراء'' کون کہلاتے ہیں

لیکن مَلِك کا معنی ایک اور بھی ہوتا ہے، مَلِك کہتے ہیں خوشحال کو، با اختیار، خوشحال، جو کسی کا غلام نہ ہو اس کو بھی کہہ دیا جاتا ہے، کہ بھائی ہم تو بادشاہ ہیں، فلاں شخص تو بادشاہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشحال ہے، کسی کا غلام نہیں بادشاہوں کی طرح زندگی گزارتا ہے، چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ ایک روایت میں آیا ہوا ہے، مشکوۃ شریف میں ایک روایت موجود ہے کہ حضرت عبداللہ عمرو رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے آ کر پوچھا کہ اَلَسْنَا مِنَ الْفُقَرَاءِ؟ کہ کیا ہم فقراء میں شامل نہیں؟ کہ جو فضیلتیں فقراء کی آتی ہیں وہ ہمیں حاصل نہیں ہوں گی؟ تو عبداللہ رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں: ''اَلَكَ اِمْرَاَةٌ تَاْوِيْ اِلَيْهَا؟'' کیا تیری بیوی ہے جس کے پاس تُو جا کر ٹھکانہ لیتا ہے؟ وہ کہنے لگا: ہاں جی! بیوی تو ہے۔ پھر پوچھتے ہیں کہ: ''اَلَكَ مَسْكَنٌ تَسْكُنُ فِيْهِ؟'' کیا تیرے پاس کوئی کوٹھا، گھر بھی ہے جس میں جا کر تُو رہتا ہے؟ وہ کہنے لگا: ہاں جی! ایک مکان بھی ہے، جس میں رہتا ہوں۔ تو فرمانے لگے: ''اَنْتَ مِنَ الْاَغْنِيَاءِ!'' تُو اغنیاء میں سے ہے فقراء میں سے نہیں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ جن فقراء کی فضیلتیں حدیث میں آتی ہیں وہ تو اصحاب صفہ تھے بیچارے، نہ بیوی نہ مکان، کچھ بھی نہیں، وہ وقف مدرسہ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپر ڈال کر دیا ہوا تھا، وہیں پڑے رہتے تھے، صدقہ خیرات جو کچھ مل جاتا تھا کھا لیتے تھے، یہ ہیں فقراء، اور جن کے پاس بیویاں ہیں، جن کے پاس رہنے کے لئے مکان ہیں وہ تو اغنیاء میں سے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ حضرت! میرے پاس تو ایک خادم بھی ہے کام کرنے کے لئے، تو آپ نے فرمایا: ''فَاَنْتَ مِنَ الْمُلُوْكِ!'' پھر تو تم بادشاہوں میں سے ہو،(1) بیوی ہے، رہنے کے لئے مکان ہے، کام کرنے کے لئے خادم ہے، تو تم تو بادشاہ ہو، تو وہاں جو ''اَنْتَ مِنَ الْمُلُوْكِ'' کہا گیا، تو وہاں ملک سے صاحب اقتدار مراد نہیں، خوشحال لوگ مراد ہیں، کہ پھر تو تمہاری زندگی بادشاہوں جیسی ہے۔ تو اسی طرح سے بنی اسرائیل کو جو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی گئی، اور ان کو آزاد کر دیا گیا، وہ اپنی مرضی کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں، کسی کے غلام نہیں ہیں، تو اس طرح سے ان کو ملوک کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا، کہ اللہ نے تمہیں خوشحال کر دیا جس طرح سے بادشاہ ہوتے ہیں، اب تم کسی کے غلام نہیں ہو، خود مختار ہو، عوامی حکومت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔

---

(1) صحیح مسلم ۲/۴۱۰، کتاب الزہد والرقائق/ مشکوۃ ج ۲ ص ۴۴۸ باب فضل الفقراء، فصل ثالث، عن ابی عبد الرحمن۔

یہ تقریر کی، اور اس کے بعد پھر یاد دلایا کہ جیسے فرعون کی غلامی سے نجات پانے میں تم نے وقتاً فوقتاً اپنے ساتھ اللہ کی معیت دیکھی ہے، اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ (سورۂ شعراء: ۶۲) کا نعرہ جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک جگہ لگایا تھا، جب قوم کہتی تھی کہ آگے دریا ہے سمندر کی موجیں ہیں اور پیچھے فرعون کی فوجیں ہیں، اب ہم کس طرح سے بچیں گے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ میرے ساتھ میرا رَبّ ہے مجھے وہ راستہ دے گا، تو رَبّ کی معیت کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں کیا، تو یہ بتایا ہوگا کہ دیکھو! ایسے ایسے واقعات سے ہم نکلے، اور ایسے ایسے وقت میں اللہ کی معیت ہمیں نصیب ہوئی، تو اب بھی میرے ساتھ میرا رَبّ ہے تو ہم اگر جہاد کریں گے، اور اس علاقے پر حملہ کریں گے تو اللہ کی معیت کے ساتھ ہم اس علاقے کو فتح کرلیں گے، تم اللہ کی نصرت پر اعتماد رکھو، خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرو، اور اللہ نے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ یہ علاقہ میں نے تمہیں دے دیا، بس تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے، کہ جہاد کرو، جہاد کرنے کے ساتھ یہ علاقہ فتح ہوجائے گا، سرسبز علاقہ ہے، شاداب علاقہ ہے، تمہاری مملکت وسیع ہوجائے گی، مصر تمہارے قبضے میں، شام تمہارے قبضے میں، اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعظ کی اور تقریر کی، اور ان کو جہاد کی ترغیب دلائی۔

محکوم قوم کی حالت

اور وہ ان نمائندوں سے اس قوم کا حال سُن چکے تھے، اور جو شخص بہت مدت تک کسی کا محکوم رہ چکا ہو، اور ہر وقت جُوتے کے نیچے ہو، صبح شام بے عزتی کرواتا ہو، اور ڈنڈے کے ساتھ ہی کام کرنے کا عادی ہوگیا ہو، یہ قدرتی بات ہے نفسیاتی طور پر کہ اُس شخص میں ہمت اور حوصلہ نہیں رہتا، اس کی ہمت اور حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے، اسرائیلیوں میں بھی اسی طرح سے مسکنت اور خست طبیعت میں آئی ہوئی تھی کہ رگڑے دے دے کر فرعونیوں نے ان کی جڑوں کے اندر یہ بات رچادی تھی کہ تم کسی کام کے نہیں ہو، ہمت اور حوصلہ ان کا چھوٹ گیا تھا، اب ان کے ساتھ کتنے ہی وعدے کئے جائیں اور اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کو یاد دلائی جائے، لیکن اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے یہ تیار نہیں ہیں۔

اِسرائیلی قوم کا موسیٰ علیہ السلام کو بزدلانہ جواب

مفسرین نے روایاتِ توراۃ کے تحت ہی نقل کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے وہ قوم واویلا کرنے لگ گئی، وہ کہنے لگے کہ تُو تو ہمیں مصر سے نکال کرلے آیا، وہاں کم از کم ہم امن سے بیٹھے تھے، ہماری جان کو کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا، ان کی تلواروں کا لقمہ بنانے کے لئے تم ہمیں لے آئے ہو؟، وہ تو بہت زبردست لوگ ہیں، ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے، ہم اس علاقے میں جاتے ہی نہیں جب تک وہ وہاں ہیں، ہاں! ہمارے وہاں تشریف لے جانے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ وہاں سے نکل کر چلے جائیں، جب وہ چلے جائیں گے علاقہ خالی کردیں گے تو ہم وہاں جاکر براجمان ہوجائیں گے، ایسے تو ہم نہیں جاتے، بالکل نہیں جائیں گے: لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا: یہ تاکید ہے، ہرگز کبھی بھی داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ وہاں ہیں، ہاں وہ نکل جائیں، ان کے نکل جانے کے بعد پھر ہم آجائیں گے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر ان کو اللہ کی نصرت یاد دلائی، اپنے ساتھ اللہ کی معیت کا تذکرہ کیا ہوگا، جس طرح سے ایک

عادت ہے کہ ایسے وقت میں انسان کہتا ہے کہ تم ڈرو نہیں، وہ کتنے طاقتور سہی لیکن اللہ کے مقابلے میں تو طاقتور نہیں ہیں، اللہ نے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ علاقہ ہمیں دے گا، اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وہ دو جو تھے انہوں نے بھی تائید کی کہ بھائی! تم شہر کے پھاٹک تک تو چلو، فصیل کے پھاٹک تک تو چلو، چل کے ایک دفعہ ہلا بولو تو سہی، دروازے تک تم پہنچو، دیکھو! تم سے ڈر کر ان کے دل بیٹھ جائیں گے، وہ مرعوب ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ وہ زیر ہوجائیں گے، علاقہ تمہارا ہے، تم چلو تو سہی، شہر کے دروازے تک تو چلو، شہر کے دروازے سے مراد وہی ہے جو پرانے زمانے میں فصیلیں بن جاتی تھیں اور اس کے بڑے بڑے دروازے ہوتے تھے۔ تو وہ قوم آگے سے کہتی ہے کہ موسیٰ! تیرے ساتھ تو تیرا خدا ہے، ہمیں اس کا انکار نہیں، اس لئے مہربانی کر کے تُو جا اور اپنے رَبّ کو ساتھ لے جا، اور جا کے تم لڑلو، ہم تو یہاں سے نہیں سرکتے، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، ہم یہاں سے سرکنے والے نہیں ہیں۔ اب یہ لفظ جو انہوں نے کہا کہ تُو جا اور تیرا رَبّ جائے اور جا کر لڑ بھڑلو، جو کچھ کرنا ہے جا کے تم دونوں کرلو، اب یہ جملہ کفریہ ہے یا نہیں؟ اس پر بھی مفسرین نے تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی معیت کا تذکرہ سُن کر مذاق اُڑایا، کہ تُو کہتا ہے میرے ساتھ میرا رَبّ ہے تو جا، پھر ہماری کیا ضرورت ہے؟ جاؤ، جا کے دونوں لڑلو، لڑ بھڑ کے علاقہ خالی کرالو، پھر ہم آجائیں گے، اگر بطورِ استہزاء کے کہا تو یہ جملہ کفریہ ہے، اور اگر انہوں نے اپنی بزدلی کے اظہار کے طور پر کہا کہ موسیٰ! ہمیں تو لگتا ہے ڈر، ہم تو نہیں جاتے، تُو جا اور تیرا اللہ تیرے ساتھ، جاؤ، تم دونوں جا کر مقابلہ کرو، اور جس وقت وہ علاقہ فتح ہوجائے گا، اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قہر کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ تیرے ذریعے سے ہلاک ہوجائیں گے تو اس وقت ہم آجائیں گے، تو ایسی صورت میں یہ گستاخی تو کہی جاسکتی ہے، بہت بھونڈا سا جواب تو کہہ سکتے ہیں لیکن یہ کُفر نہیں ہے، لیکن یہ جملہ اس قوم کے لئے ایک بزدلی کا نشان بن گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جواں مردی وجاں نثاری

اس لئے پُرانی تاریخ میں جہاں بھی کہیں بزدلی کا تذکرہ آتا تھا تو اسرائیلیوں کا یہی جملہ نقل کرتے تھے، حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ جس وقت مشرکین کے مقابلے کے لئے مدینہ منورہ سے نکلے تھے، قافلے کا راستہ روکنے کے لئے جس کے نتیجے میں غزوۂ بدر پیش آیا، مکہ معظمہ کی طرف سے ایک ہزار آدمی کا مسلح لشکر آگیا تھا، اور آپ ﷺ کوئی خاص لڑائی کی تیاری سے نہیں نکلے تھے، اللہ تعالیٰ نے اختیار دے دیا کہ چاہے قافلے سے جا کے ٹکرا جاؤ چاہے اس لشکر سے ٹکرا جاؤ، جس سے ٹکراؤ گے اللہ تمہیں فتح دے گا، سرورِ کائنات ﷺ کی طبیعت کا افتاد یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فتح کا وعدہ کرلیا ہے تو ہمیں طاقتور لشکر سے ٹکرانا چاہیے، لڑنے کا مزہ بھی آئے، اور اس پر جب غلبہ حاصل ہوجائے گا تو قوت کا مظاہرہ بھی ہوجائے گا، اور قافلے میں ساٹھ آدمی ہیں، ان کے پاس بھی پتا نہیں کیا ہے کیا نہیں، تو اگر تین سو تیرہ جا کر ان ساٹھ پر غلبہ بھی پالیں گے تو یہ کوئی ایسی بہادری کا نشان نہیں ہے، حضور ﷺ کا رُجحان اِدھر تھا، لیکن جو قوم ساتھ تھی مہاجرین اور انصار کی، آپ ان کی رضا معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ کیونکہ انصار کے ساتھ جو معاہدہ تھا رسول اللہ ﷺ کا وہ یہ تھا کہ انصار نے کہا تھا کہ اگر مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے آپ پر کوئی

حملہ کرے گا تو ہم مدافعت کریں گے، باہر نکل کر لڑنے کا معاہدہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھا، اس لئے آپ ان کی رضا معلوم کرنا چاہتے تھے، تو سب کو بٹھا کر آپ نے صورت حال واضح کی کہ مکہ معظمہ سے بھی ایک ایسا لشکر آ گیا، تو کیا خیال ہے تمہارا، ان سے ٹکرانا چاہیے یا اُن سے ٹکرانا چاہیے؟ جس سے بھی ٹکراؤ گے اللہ تمہیں فتح دے گا، اس طرح سے آپ ﷺ نے ان کے سامنے تقریر کی، مہاجرین میں سے اکثر افراد نے تائید کی، کہ ٹھیک ہے جس طرح سے آپ کا خیال ہو، یہ مشرکین کی طرف سے جو لشکر آیا ہے مکہ معظمہ سے ہم اس سے ٹکرائیں گے، لیکن حضور ﷺ مطمئن نہیں ہوئے، بار بار آپ جھانک رہے تھے انصاریوں کی طرف کہ انصار کیا جواب دیتے ہیں، مہاجرین کے جواب سے آپ کی طبیعت میں وہ بشاشت نہیں آئی، تو پھر انصار میں سے غالباً مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے، ان کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوئے، کہنے لگے یا رسول اللہ! ہمیں آپ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے افراد نہ سمجھ لیجئے کہ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ، ہمیں ان جیسا نہ سمجھ لیجئے، ہم تو آپ کے دائیں لڑیں گے، بائیں لڑیں گے، آگے لڑیں گے، پیچھے لڑیں گے، اگر آپ ہمیں حکم دیں گے سمندروں میں گھوڑے گھسیڑ دینے کا تو ہم سمندروں میں بھی گھوڑے ڈال دیں گے، ہمیں آپ قومِ موسیٰ علیہ السلام کی طرح نہ سمجھ لیجئے۔ جب مقداد رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی تو حضور ﷺ کا چہرہ خوشی کے ساتھ کھل گیا، چنانچہ بخاری شریف میں آتا ہے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مقداد کی ایک بات جس کے ساتھ حضور ﷺ کی طبیعت پر اتنا سرور طاری ہوا تھا، میرے لئے باعثِ رشک ہے کہ ہائے کاش! یہ سعادت مجھے نصیب ہوتی، یعنی میں ایسی کوئی بات کہتا جس سے حضور ﷺ کی طبیعت پر اتنا سرور آ جاتا، مقداد رضی اللہ عنہ کی بات پر حضور ﷺ اتنا خوش ہوئے تھے۔[1] چنانچہ پھر ایسے ہی ہوا کہ جب جہاد کا موقع آیا تو اس قوم نے بہادری دکھائی اور حضور ﷺ کے آگے پیچھے اپنی جانیں نچھاور کیں، اور کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا، کہ کہہ دیا ہو کہ جی! ہماری ہمت نہیں ہے آپ جائیں، ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا۔

دونوں طبقوں کا انجام

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قوم جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اس قسم کی گستاخی کی تھی، چالیس سال کے لئے وہ ریگستان میں اور ایک بنجر علاقے کے اندر ان کو مقید کر دیا گیا، اور وہ پریشان پھرتے رہے چالیس سال تک، اور اِدھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چالیس سال سے بھی کم مدت کے اندر ساری دُنیا کو فتح کر لیا، چالیس سال بھی نہیں لگے دنیا کے سمندروں کے کناروں تک پہنچ گئے، جہاں تک رسائی ہو سکتی تھی وہاں تک پہنچ گئے اور علاقوں کے علاقے کھینچ لئے، اِس جذبے کا یہ نتیجہ نکلا اور اُس جذبے کا یہ نتیجہ نکلا کہ چالیس سال کے لیے وہاں محصور کر دیئے گئے۔

بنی اسرائیل کے جواب پر موسیٰ علیہ السلام کو صدمہ اور اللہ کے حضور عرض

جب اسرائیلیوں کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا گستاخی کا جواب ملا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی، اور یہ وقت ہوتا ہے کہ دیکھو! ایک شخص اپنی قوم پر محنت کرتا ہے کیسی کیسی مصیبتوں سے ان کو نکال کر لاتا ہے، اپنے خیال کے مطابق ان

(۱) صحیح البخاری ج ۲ ص ۵۶۴، کتاب المغازی باب قول اللہ اذ تستغیثون عن ابن مسعود۔

کی تربیت پوری کرتا ہے، پھر ان کو وعدۂ خداوندی یاد دلاتا ہے، لیکن پھر قوم اُس کا ساتھ دینے سے انکار کردے، کہ نہیں جی! ہم تو جاتے نہیں، تُو جا اور تیرا رَبّ جائے، تو ایسے وقت میں اندازہ کیجئے کہ اس قائد پر اس راہنما پر اس ہادی پر پھر کیا گزرے گی؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت کے اندر بھی یہی دُکھ اور صدمہ آیا تو اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ یا اللہ! مجھے تو اپنی جان کا اختیار ہے یا اپنے بھائی کا، کیونکہ بھائی ہارون نبی تھے، ان سے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ کوئی ایسی بات کر گزریں جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، وہ دو بھی اگرچہ فرمانبردار تھے لیکن چونکہ وہ نبی نہیں تھے اس وقت، بعد میں یوشع کو نبوت ملی ہے، اس وقت چونکہ وہ نبی نہیں تھے تو اس لئے ان کے معصوم ہونے کا یقین نہیں کیا جاسکتا تھا، تو ان پر بھی اعتماد نہیں کیا، کہ یہ بھی آخر اسی قوم کے فرد ہیں، کیا معلوم، بس میں اپنی جان کا اختیار رکھتا ہوں اور اپنے بھائی کا، باقی کسی پر میرا زور نہیں چلتا، ہم میں اور ان کے درمیان میں فرق کردے، فرق کرنے کا مطلب؟ کہ ہم میں جدائی ڈال دے، یا مطلب یہ ہے کہ جس برتاؤ کے مستحق ہم ہیں ہمارے ساتھ وہ برتاؤ کر، اور جس برتاؤ کے وہ مستحق ہیں ان کے ساتھ وہ برتاؤ کر، ہمارے درمیان فیصلہ کردے۔

بنی اسرائیل صحرائے سینا میں

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر پیغام آیا کہ اس کوتاہی کے نتیجے میں یہ علاقہ جو ہم نے ان کو دینے کا ارادہ کیا تھا جہاد کے نتیجہ میں، وہ چالیس سال کے لئے ان پر حرام کردیا گیا، اب یہ اس علاقے کو حاصل نہیں کرسکیں گے، اور پھر یہ ہے کہ واپس بھی نہیں جاسکیں گے کہ گھر میں جاکر آرام سے وقت گزار لیں، اسی علاقے کے اندر حیران اور پریشان پھرتے رہیں گے، چنانچہ وہ علاقہ جس کو "صحراسینا" کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، آج کل اخباروں میں آپ دیکھتے رہے ہوں گے، جو پچھلے دنوں میں اسرائیل کے قبضے میں تھا، اور آہستہ آہستہ "انورالسادات" نے اُس کو آزاد کروالیا ہے، یہی علاقہ ہے جس کو آج صحرائے سینا کہتے ہیں، وادئ تیہ بھی ہے، اسی کے اندر پھر یہ چالیس سال تک حیران پریشان پھرتے رہے۔

صحرائے سینا میں موسیٰ وہارون علیہما السلام کی حیثیت

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بھی ان سے جدا نہیں کیا گیا، یہ بھی وہیں ٹھہرے، باقی قوم کے لیے یہ سزا تھی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بطور مصلح کے وہاں ٹھہرائے گئے تھے، ان کے لئے وہ سزا نہیں تھی، اگرچہ جگہ وہی ہے، جہاں وہ تھے وہیں یہ تھے، لیکن یہ سزا یافتہ نہیں، باقی قوم سزا یافتہ ہے یہ مصلح ہونے کی حیثیت سے اس قوم کے اندر موجود تھے، بالکل آپ اس کی مثال آپ اس طرح سے سمجھ لیجئے کہ ہر ملک کے اندر ایک جیل ہوتی ہے، جس میں مجرموں کو داخل کیا جاتا ہے، لیکن اس جیل کے اندر حکومت کے کارندے بھی تو ہوتے ہیں، جو ان کو کھانا پہنچاتے ہیں پانی دیتے ہیں، ان کی نگرانی کرتے ہیں، ان کو کھولتے ہیں باندھتے ہیں، کام پر لگاتے ہیں وہ بھی تو اسی چاردیواری کے اندر ہوتے ہیں، لیکن سارے جانتے ہیں کہ وہ سزا یافتہ ہیں، یہ سزا یافتہ نہیں ہیں۔ جہنم کے اندر کافر جائیں گے تو وہاں فرشتے بھی تو ہوں گے عذاب دینے والے، وہ بھی تو اسی چاردیواری کے اندر ہوں گے، لیکن کافروں کو کہیں گے کہ جہنمی ہیں معذب ہیں، لیکن جو فرشتے وہاں کارندے ہیں وہ معذب نہیں۔

ہیں، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے ان بیماروں کے کیمپ میں ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور ہارون علیہ السلام کو پھر ٹھہرایا ہوا تھا، پھر وہ بے چارے اس طرح سے محنت کرتے اور ان کے مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ سے درخواستیں کر کے پھر ان کے لئے مراعات حاصل کرتے۔

یوشع علیہ السلام کی زیر قیادت فلسطین کی فتح

بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علاقہ ان پر حرام کر دیا گیا چالیس سال تک یہ وہیں رہے، اسی دوران میں حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہو گیا، سب سے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا، چھ مہینے کے بعد یا سال کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو گیا، اور پھر وہ پرانے پرانے اسرائیلی جن کا فرعون کے ساتھ زیادہ وقت گزرا تھا وہ مر مرا گئے، چالیس سال کے اندر نئی نسل پیدا ہوئی، اور وہ جوان ہوئی، اور ان کے اُوپر وہ غلامی کے اثرات نہیں تھے جیسے بڑوں کے اُوپر تھے، تو پھر یوشع علیہ السلام کو نبوّت ملی چالیس سال کے بعد، پھر حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت کے اندر اس علاقے میں جہاد ہوا، اور اس جہاد کے نتیجے میں پھر یہ شام کا علاقہ اسرائیلیوں نے فتح کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے جب یہ فیصلہ سنایا کہ اب یہ چالیس سال تک پریشان پھریں گے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طبعی طور پر غم طاری ہوا ہوگا، کہ ان نالائقوں کی اس نالائقی کی وجہ سے کتنی بڑی سعادت سے محروم ہو گئے، کہ اب یہ علاقہ تو فتح نہیں ہوگا اور چالیس سال تک یہ دھکے کھاتے پھریں گے، تو اللہ تعالیٰ نے پھر کہا کہ یہ لوگ نافرمان ہیں یہ فاسق ہیں، ان کے اُوپر آپ غم نہ کریں، فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ یہ بطور تسلی کے ہے۔

بنی اسرائیل کے واقعے سے مقصود

تو اس میں یہ بات واضح ہوگئی، کہ یہ لاڈلے چہیتے جو اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ دیکھو! جب انہوں نے اللہ کے احکام کے مقابلے میں کوتاہی کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوں گرفت آئی، تو جیسے دنیا کے اندر ان پر گرفت کی گئی ہے اسی طرح سے اگر یہ باز نہیں آئیں گے تو آخرت میں بھی ایسے ہی معذب ہوں گے، تو یہ زعمِ باطل اپنے دماغ سے نکال دیں، اور ان واقعات کو بیان کر کے ہمیں یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ نے کسی قوم سے عہد و میثاق کیا، وہ قوم اگر اس عہد و میثاق کی پابند ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی و کامرانی ملتی ہے، اور اگر اس عہد و میثاق کو وہ توڑ بیٹھتے ہیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں، تو تمہیں بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے عہد و میثاق کی رعایت رکھیں، اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں ان کی پابندی کریں تا کہ دُنیا اور آخرت کی سعادت نصیب ہو، اس واقعہ کو ذکر کر کے اہلِ ایمان کو یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے۔

خلاصۂ آیات

الفاظ دیکھیے..... ''یاد کیجئے جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنی قوم کو، اے قوم! یاد کیجئے اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے'' اب اس میں سب کچھ لپٹا ہوا ہے، فرعون کے زمانے کے عذاب کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ان کو نجات ملی، اور جس طرح سے ان

کو کامیابی ہوئی نِعْمَةَ اللّٰهِ کے اندر سب کچھ ہے، جیسے جیسے موقع پر اللہ نے ان کی دستگیری کی، قرآن کریم کے اندر وہ واقعات سارے کے سارے پھیلے ہوئے ہیں، ''جبکہ اللہ نے تمہارے اندر انبیاء بنائے، اور تمہیں بادشاہ بنا دیا'' اس کی تفصیل آپ کے سامنے آچکی، ''اور تمہیں ایسی ایسی چیزیں دیں جو اللہ تعالیٰ نے عالمین میں سے کسی کو نہیں دیں'' اللہ تعالیٰ کا تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ ہے کہ اس موجودہ دور میں ایسا برتاؤ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہے، کیونکہ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ سے اُس زمانے کے لوگ مراد ہیں، ورنہ تو سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت کی خیریت وافضلیت قرآنِ کریم کے اندر دوسری آیات میں نمایاں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا برتاؤ اسرائیلیوں کے ساتھ بعض جزئیات کے اندر جزوی جزوی واقعات میں ایسا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں، اس طرح سے آپ عالمین سے عام بھی مراد لے سکتے ہیں جزوی فضیلت کے طور پر، کہ دھوپ کے وقت میں بادل دیئے گئے ہوں، بھوک کے وقت میں من وسلویٰ دیا گیا ہو، اور دشمن کو بغیر کسی ظاہری سبب کے دریا کے اندر غوطے دے دے کر مار دیا گیا ہو، اس قسم کے برتاؤ اللہ تعالیٰ نے جو ان اسرائیلیوں کے ساتھ کیے ہیں وہ واقعی قومی سطح پر کسی دوسرے کے ساتھ نہیں کیے، تو ایسے طور پر اگر عالمین کو عام لے لیا جائے تو بھی گنجائش ہے، پھر یہ ان کی جزوی فضیلت ہوگی، یا اس زمانے کے لوگ مراد ہیں۔ گویا کہ یہ جہاد کی ترغیب دینے کے لیے تمہید ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باندھی ہے، ''اے میری قوم! داخل ہو جاؤ ارضِ مقدسہ میں'' شام کے علاقے کو ''ارضِ مقدسہ'' کہا گیا، اس وجہ سے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے سکونت ہے، اسحاق علیہ السلام کی جائے سکونت ہے، اور اسی طرح سے یعقوب علیہ السلام کی جائے سکونت ہے، تو اس کو ''ارضِ مقدسہ'' کہا، کہ توحید کی آواز پہلے یہیں سے ہی بلند ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے، تو گویا کہ وہ علاقہ پاکیزہ علاقہ ہو گیا، چاہے بعد میں وہاں مشرک آباد ہیں اور غیر اللہ کی پوجا کرنے والے آباد ہیں، لیکن ایک دفعہ جب اس زمین کو تقدس حاصل ہو گیا تو بعد والا کفر اور شرک اس کے تقدس کو ختم نہیں کر سکا، جیسے بیت اللہ، کعبۃ اللہ جس وقت مکرم بن گیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے میں اس کو ''بیت اللہ'' کا عنوان دے دیا گیا، تو جب اس میں بت ہی بت رکھے ہوئے تھے، پانچ سو بت تھے یا تین سو ساٹھ تھے، جتنے بھی تھے، جب اس کے ارد گرد بت ہی بت تھے، تو بھی کعبۃ اللہ مکرم اور محترم تھا، بعد میں آنے والی اس قسم کی نجاستیں اس ارضِ مقدس کو نقصان نہیں پہنچاتیں، تو یہاں وہی بات ہے کہ یہ زمین چونکہ نعرۂ توحید کے ساتھ گونجی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہیں مدفون اور یہیں اُن کی تبلیغ، حضرت اسحاق علیہ السلام یہیں مدفون اور یہیں ان کا علاقہ، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا سارے کا سارا علاقہ یہی تھا، اس لئے اس کو ''ارضِ مقدس'' کہا گیا، چاہے بعد میں وہ مشرکوں کے قبضے میں آگئی، ''جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے'' یعنی اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہیں دے گا۔ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ: اپنی پشتوں کے بل واپس نہ لوٹو، پیچھے کو نہ بھاگو، یعنی مصر کی طرف لوٹ کر نہ جاؤ، یا جہاد کو چھوڑ کر واپس نہ آؤ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ: یہ تمہارا انقلاب خسارے کا انقلاب ہوگا، آگے بڑھنے کی بجائے اگر تم پیچھے ہٹو گے تو یہ انقلاب خسارے کا انقلاب ہے، اور اگر آگے بڑھتے چلے جاؤ گے تو علاقہ جو تمہیں ملے گا وہ انقلاب نفع کا انقلاب ہے، ''پس لوٹو گے تم خسارہ پانے والے۔ کہنے لگے کہ اے موسیٰ علیہ السلام بیشک

اس میں لوگ ہیں زبردست" ان نمائندوں سے سن کر یہ باتیں انہوں نے معلوم کر لی تھیں، "اور ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، پھر اگر وہ نکل جائیں اس سے تو بے شک ہم داخل ہونے والے ہیں، کہا ان دو آدمیوں نے جو ان میں سے تھے جو ڈرتے ہیں" اَلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ: یَخَافُوْنَ کا یہاں مفعول ظاہر نہیں کیا گیا کس سے ڈرتے ہیں، عام طور پر مفسرین نے یہاں یہ بات کہی کہ یَخَافُوْنَ سے مراد ہے یَخَافُوْنَ اللہَ، یعنی یہ دو جو تھے یہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے، اس لئے کسی غیر کا ڈر ان کے دل میں نہیں تھا، اور واقعہ بھی ہے کہ جو شخص صرف اللہ سے ڈرے باقی مخلوق کا ڈر اُس کے دل سے نکل جاتا ہے، چاہے خوف کی کیفیت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ سے، لیکن باقی مخلوق کے مقابلے میں اس کا دل مضبوط ہوتا ہے، تو یہ خوفِ الٰہی رکھنے والوں میں سے تھے اس لئے دوسری قوم سے یہ ڈرے نہیں، عام طور پر مفسرین نے یہی بیان کیا ہے، لیکن بعض نے یوں بھی کہا کہ اَلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ سے مراد ہے کہ وہ لوگ جن پر اس قوم کی ہیبت طاری ہو گئی تھی اور وہ خوف زدہ ہو گئے تھے، یعنی بارہ کے بارہ، ان میں سے یہ دو تھے، چاہے تھے یہ بھی ڈرنے والوں میں سے، لیکن اللہ نے ان پر انعام کیا اور یہ اس خوف سے متاثر ہو کر قوم کے سامنے بزدلی کا اظہار نہیں کر پائے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر پابند ہونے کی وجہ سے چاہے وہ دل سے ڈرے ہوئے تھے وہاں کے حالات کو دیکھ کر، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے حوصلہ دلانے سے انہوں نے حوصلہ پکڑا اور قوم کے سامنے بات اسی قسم کی کہی جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہنے کے لئے انہیں مامور کیا تھا، تو یَخَافُوْنَ سے مراد ہو جائے گا ڈرنے والے لوگ یعنی ان عمالقہ کو دیکھ کر جن پر خوف اور ہیبت طاری ہوا تھا یہ انہی میں سے ہی تھے، لیکن اللہ نے انعام کیا اور ان کو ثابت قدم رکھا، تو جیسے غزوۂ احد کی آیات آپ کے سامنے گزریں تو اس میں یہ لفظ آیا تھا: اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا: کہ تم میں سے دو گروہوں نے بزدل بننے کا ارادہ کیا تھا، ہمت چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن اللہ ان کا دوست ہے، اس لئے ان کو بزدل بننے نہیں دیا، اسی طرح سے یہ تھے اگرچہ انہی ڈرنے والوں میں سے، لیکن اللہ نے ان پر انعام کیا کہ خوف کے اثرات ظاہر نہ ہوئے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق یہ ثابت قدم رہے، تو یہاں یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ "جن پر اللہ نے انعام کیا" انعام یہی تھا کہ ثابت قدم رہے اور مخلوق سے ڈر کر انہوں نے حوصلہ نہیں چھوڑا، "کہ داخل ہو جاؤ ان پر دروازے میں" دروازے سے شہر کا پھاٹک مراد ہے، "اور جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو بیشک تم غلبہ پانے والے ہو، اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو" جب تمہارا ایمان ہے تو پھر تم ظاہری طور پر کیوں دیکھتے ہو کہ ہمارے وجود چھوٹے چھوٹے ہیں ان کے وجود بڑے ہیں، ہم میں اتنی طاقت نہیں ان میں طاقت زیادہ ہے، ان چیزوں پر نظر نہ ڈالو، اللہ پر بھروسہ کرو۔ "وہ کہنے لگے اے موسیٰ! بیشک ہم ہرگز اس علاقے میں داخل ہونے والے نہیں کبھی بھی" اِنَّا، لَنْ، اَبَدًا یہ سب لفظ دیکھو! کتنے زوردار ہیں، "بیشک ہم ہرگز داخل ہونے والے نہیں اس علاقے میں کبھی بھی جب تک کہ وہ اس علاقے میں ہیں" فیصلہ سن لو ہماری طرف سے، ہم نہیں جائیں گے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ: تو اور تیرا رب جاؤ، فَقَاتِلَآ: تم دونوں مل کر لڑو، اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ: ہم تو یہاں سے سرکنے والے نہیں، ہم تو یہیں جم کر بیٹھیں گے، اس سے آگے بالکل قدم نہیں

اٹھائیں گے، ہمارا آخری حتمی فیصلہ ہے۔ ''موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رَبّ! بیشک میں نہیں اختیار رکھتا مگر اپنی جان کا اور اپنے بھائی کا، پس تو جدائی ڈال ہمارے درمیان اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان'' فیصلہ کردے ہمارے اور ان کے درمیان، ''اللہ تعالیٰ نے کہا کہ بیشک یہ علاقہ حرام کر دیا گیا ان پر چالیس سال تک ''یَتِیۡہُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ: یہ جس علاقے میں اس وقت ہیں اسی میں حیران سرگرداں پھریں گے، اس لئے اس علاقے کو وادیٔ تیہ کہا جاتا ہے، حیرانی کا علاقہ، اور وہ کتنا بڑا علاقہ ہے؟ تفسیری روایات کے تحت زیادہ سے زیادہ اس کا طول و عرض جو ہے وہ نوے میل لمبا اور اٹھارہ میل چوڑا ہے، اتنا سا علاقہ ہے جس کے اندر یہ چالیس سال گھومتے پھرتے رہے، اور ان کو واپس آنے کا راہ نہیں ملا، سارا دن چلتے، جب شام ہوتی تو دیکھتے جہاں سے چلے تھے وہیں کے وہیں پہنچے ہوئے ہیں، ایسا دماغ کو چکر ہوتا کہ وہاں سے نکلنے کے لئے ان کو بالکل راستہ نہیں ملا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو جیل میں ڈال دیا، لیکن اللہ کی جیل کے لئے ظاہری اسباب ضروری نہیں، کہ ارد گرد فصیل بنائی ہوئی ہو، یا ان کو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو، یا وہاں کوئی پہرے دار کھڑے کر دیے گئے ہوں، کہ اس علاقے سے نکلنا نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے حواس ہی ایسے مختل کر دیئے اور کائنات کے آثار ہی اس قسم کے بنا دیئے کہ جدھر کو بھی نکلتے بھاگتے، شام کو وہیں پہنچ جاتے جہاں سے صبح چلے تھے، چالیس سال ان کے اسی طرح سے حیرانی اور پریشانی میں گزر گئے، گویا کہ یہ تکوینی جیل تھی جس کے اندر ان کو ڈال دیا گیا، ''حیران پھریں گے علاقے میں'' فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ: ان نافرمان لوگوں پر غم نہ کریں۔

سُبۡحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمۡدِكَ اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُكَ وَاَتُوۡبُ اِلَيۡكَ

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ ابۡنَىۡ اٰدَمَ بِالۡحَقِّ ۘ اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا

پڑھیے ان پر آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ ٹھیک ٹھیک، جب ان دونوں نے قربانی پیش کی، ان میں سے ایک کی طرف سے وہ قبول کر لی گئی

وَلَمۡ يُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقۡتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ

اور دوسرے کی طرف سے قبول نہ ہوئی، اُس نے کہا میں البتہ ضرور تجھے قتل کر دوں گا، اُس نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ قبول کرتا ہے

اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنۡۢ بَسَطْتَّ اِلَىَّ يَدَكَ لِتَقۡتُلَنِىۡ مَاۤ

اللہ تعالیٰ متقین کی طرف سے ﴿۲۷﴾ اگر تُو نے پھیلایا میری طرف اپنا ہاتھ تاکہ تُو مجھے قتل کر دے، نہیں ہوں

اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِىَ اِلَيۡكَ لِاَقۡتُلَكَ ۚ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ

میں پھیلانے والا اپنے ہاتھ کو تیری طرف تاکہ میں تجھے قتل کروں، بے شک میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو رَبّ

الْعٰلَمِيْنَ ۝٢٨ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ

العالمین ہے ۝٢٨ بے شک میں ارادہ کرتا ہوں کہ لوٹ جائے تُو میرے گناہ کے ساتھ اور اپنے گناہ کے ساتھ پھر تُو ہو جائے

اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝٢٩ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ

آگ والوں میں سے، اور ظالمین کا یہی بدلہ ہے ۝٢٩ پھر اچھا کر دکھایا اس شخص کے لئے اُس کے نفس نے

قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٣٠ فَبَعَثَ اللّٰهُ

اپنے بھائی کے قتل کرنے کو، پھر اُس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، پھر ہو گیا وہ خسارہ پانے والوں میں سے ۝٣٠ پھر اللہ نے بھیجا

غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ

کوا، وہ کھود کرید کرتا تھا زمین میں تاکہ دِکھائے اُس کو کہ کیسے چھپائے وہ اپنے بھائی کی لاش،

قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ

اُس (قاتل) نے کہا کہ ہائے میری خرابی! کیا میں عاجز ہو گیا کہ میں اِس کوے جیسا ہوتا کہ میں چھپاتا

سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝٣١ ۚۛ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ

اپنے بھائی کی لاش کو، پس ہو گیا وہ شرمساروں میں سے ۝٣١ اسی وجہ سے

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ

لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ بے شک جو شخص قتل کرے گا کسی جان کو بغیر کسی جان کے

اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا

یا قتل کرے گا کسی نفس کو بغیر فساد فی الارض کے پس گویا کہ اُس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا، اور جو اُس نفس کو زندہ رکھے

فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ز

گویا کہ اُس نے زندہ رکھا سب لوگوں کو، البتہ تحقیق آ گئے ان کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل لے کر

ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝٣٢ اِنَّمَا

پھر بھی بے شک ان میں سے بہت سے لوگ اس کے بعد زمین میں البتہ زیادتی کرنے والے ہیں ۝٣٢ اس کے سوا کچھ نہیں،

جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ	
بدلہ ان لوگوں کا جو اللہ اور اللہ کے رسول سے محاربہ کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں زمین میں	
فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ	
فساد کی، (ان کا بدلہ یہ ہے) کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا ان کو سُولی دے دیا جائے یا کاٹ دیا جائے ان کے ہاتھوں کو اور پاؤں کو	
مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا	
مختلف جانب سے یا ان کو نکال دیا جائے علاقے سے، یہ ان کے لئے رُسوائی ہے دُنیا میں	
وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ لا اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ	
اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے ﴿۳۳﴾ مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں قبل اس کے	
اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ع	
کہ تم ان پر قدرت پاؤ، پس جان لو تم کہ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۳۴﴾	

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ: تلاوت کیجیے، پڑھیے ان لوگوں پر آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ۔ ''نبأ'' خبرِ عظیم مہتم بالشان واقعہ کو کہتے ہیں۔ آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ اِن پر صحیح صحیح پڑھیے، بِالْحَقِّ: ٹھیک، یعنی واقع کے مطابق، اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا: جب ان دونوں نے قربانی پیش کی، قربان کہتے ہیں ایسی چیز کو جس کو کسی کے تقرب کا ذریعہ بنایا جائے، کسی کے قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے، تو اللہ کے نام پر ہم جو چیز دیا کرتے ہیں وہ بھی قربان ہے۔ ''جب ان دونوں نے قربانی پیش کی'' یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی نذر و نیاز پیش کی، فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا: ان دونوں میں سے ایک کی طرف سے وہ قربان قبول کر لی گئی، وہ نذر و نیاز قبول کر لی گئی، وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ: اور دوسرے کی طرف سے قبول نہ ہوئی، قَالَ: جس کی طرف سے قبول نہیں ہوئی تھی اس نے کہا، لَاَقْتُلَنَّكَ: کاف ضمیر کے ساتھ خطاب اس کو ہے جس کی قربانی قبول ہوگئی۔ میں البتہ ضرور تجھے قتل کر دوں گا، قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ: اس نے کہا یعنی جس کو قتل کی دھمکی دی گئی تھی اس نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ قبول کرتا ہے اللہ تعالیٰ متقین کی طرف سے، لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ: اگر تُو نے پھیلایا میری طرف اپنا ہاتھ، لِتَقْتُلَنِيْ: تا کہ تُو مجھے قتل کر دے، مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ: نہیں ہوں میں پھیلانے والا اپنے ہاتھ کو، اِلَيْكَ: تیری طرف، لِاَقْتُلَكَ: تا کہ میں تجھے قتل کر دوں، اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ: بیشک میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو ربّ العالمین ہے، اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ: بیشک

میں ارادہ کرتا ہوں کہ لوٹ جائے تُو میرے گناہ کے ساتھ اور اپنے گناہ کے ساتھ، فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ: پھر ہو جائے تُو جہنموں میں سے، آگ والوں میں سے، وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ: اور ظالمین کا یہی بدلہ ہے۔ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ: طَوَّعَ: خوش گوار کر دیا، مرغوب کر دیا، مرغوب فیہ بنا دیا۔ پھر اچھا کر دکھایا، خوشگوار کر دیا اس شخص کے لئے اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل کرنے کو، فَقَتَلَهٗ: پھر اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ: پھر ہو گیا وہ خسارہ پانے والوں میں سے، فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا: پھر اللہ نے بھیجا ایک کوا، یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ: وہ کھود کرید کرتا تھا زمین میں۔ بحث کھود کرید کرنے کو کہتے ہیں، یہ مشکل مسئلے پر آپ جو بحث کیا کرتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ آپس میں خیالات کا تبادلہ کر کے کھود کرید کر لی جائے کہ اس کی حقیقت کیا ہے، تو بحث کے نتیجے میں حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ''وہ زمین میں کھود کرید کر رہا تھا'' لِیُرِیَهٗ: تا کہ دکھائے اس قاتل کو، كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ: کہ کیسے چھپائے وہ اپنے بھائی کی لاش۔ سَوْءَة بدن کو اور وجود کو کہتے ہیں، یہاں مراد لاش ہے۔ قَالَ: اس قاتل نے کہا، یٰوَیْلَتٰۤی: کہ ہائے میری خرابی! اصل میں یَاوَیْلَتِیْ ہے، یائے متکلم کو الف سے بدل دیا۔ اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ: کیا میں عاجز ہو گیا کہ میں اس کوے جیسا ہوتا، اس کوے جیسا ہونے سے میں عاجز آ گیا؟ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ: کہ میں چھپاتا اپنے بھائی کی لاش کو، فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ: پس ہو گیا وہ شرمساروں میں سے۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ: اسی وجہ سے، كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کے آگے پیچھے آپ دیکھ رہے ہیں کہ تین تین نقطوں کا نشان دیا ہوا ہے، یہ پہلے بھی میں نے آپ کی خدمت میں میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں یہ اشارہ دیا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اپنی ترکیب کے لحاظ سے ماقبل سے بھی لگ سکتے ہیں مابعد سے بھی لگ سکتے ہیں، جیسے کہ سورۂ بقرہ کی پہلی آیت میں یہ بات آپ کی خدمت میں عرض کی تھی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ، وہاں فِیْهِ کے دونوں طرف نقطے لگے ہوئے ہیں، تو لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ پڑھ لیجیے اور اس فِیْهِ کو ماقبل کے ساتھ جوڑ لیجئے، مفہوم کے لحاظ سے یہ بھی ٹھیک ہے، فِیْهِ ۛۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی مابعد کے ساتھ جوڑ لیجیے یہ بھی ٹھیک ہے۔ اسی طرح سے یہاں بھی مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ کا تعلق دونوں طرف ہو سکتا ہے، فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ اس واقعہ کی وجہ سے وہ نادمین میں سے ہو گیا، شرمساروں میں سے ہو گیا۔ یا: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ، اسی وجہ سے ہم نے لکھ دیا بنی اسرائیل پر، مفہوم دونوں طرح سے ادا ہو سکتا ہے، ترکیب کے لحاظ سے اس کو ماقبل کے ساتھ جوڑ لیں تو بھی مفہوم صحیح ہے، مابعد کے ساتھ جوڑ لیں تو بھی مفہوم صحیح ہے، ''لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر'' اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ: کہ بیشک جو شخص قتل کرے گا کسی جان کو بغیر کسی جان کے، یعنی جان کے بدلے کے بغیر، اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ: یا قتل کرے گا کسی نفس کو بغیر فساد فی الارض کے، فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا: پس گویا کہ اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا، بِغَیْرِ نَفْسٍ کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کے طور پر اگر قتل کیا جائے تو پھر یہ وعید نہیں ہے، اسی طرح سے اگر کوئی شخص فساد فی الارض کا باعث بن رہا ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے تو پھر یہ وعید نہیں ہے، نہ تو کوئی شخص فساد فی الارض کا باعث بن رہا ہے نہ اس نے کسی اور کو قتل کیا ہے کہ اس کے بدلے میں اس کو قتل کر دیا جائے، بلاوجہ بغیر گناہ کے اگر کسی نفس کو قتل کر دیا جائے تو ایسا ہے گویا کہ اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا، وَمَنْ اَحْیَاهَا: اور جو اس نفس کو زندہ رکھے، یعنی بچا لے، قتل نہ ہونے دے، فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا: گویا کہ اس نے زندہ رکھا سب لوگوں کو، وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ: البتہ تحقیق آ گئے ان

کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل لے کر، ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ: پھر بھی بیشک ان میں سے بہت سے لوگ اس کے بعد زمین میں البتہ زیادتی کرنے والے ہیں۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اس کے سوا کچھ نہیں (اِنَّمَا حصر کا فائدہ دیتا ہے) بدلہ ان لوگوں کا جو اللہ اور اللہ کے رسول سے محاربہ کرتے ہیں۔ محاربہ: آپس میں لڑنا، لڑائی کرنا۔ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا: اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد کی، تو وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا یہ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کی ایک قسم کی تفسیر ہے، کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے امن کا ضابطہ نافذ کر دیا، تو جو لوگ زمین کے اندر فساد مچانے کی کوشش کرتے ہیں گویا کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ لڑائی لڑتے ہیں، یہ بغاوت اللہ اور اللہ کے رسول سے ہے، چاہے فساد کا رُخ لوگوں کی طرف ہے، ''کوشش کرتے ہیں زمین میں، علاقے میں فساد کی، ان کی جزاء یہ ہے'' اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا: کہ ان کو قتل کر دیا جائے، اَوْ يُصَلَّبُوْٓا: یا ان کو سُولی دے دیا جائے۔ صلب: سُولی دینا۔ صلیب کا لفظ جو عیسائیوں سے آپ سنتے رہتے ہیں وہ ''سُولی'' کے معنی میں ہوتا ہے، اسلامی طریقہ سُولی دینے کا یہی ہے کہ دو لکڑیاں باندھ دی جاتی ہیں، جس طرح عیسائیوں کے پاس سُولی بنی ہوئی ہوتی ہے، اس پر زندہ انسان کو باندھ کر لٹکا دیا جاتا ہے، اور باندھنے کے بعد پھر نیزے کے ساتھ اس کا پیٹ چاک کیا جاتا ہے، اور اس طرح سے پھر وہ لٹکا ہوا مر جاتا ہے، گلے میں رَسّا ڈال کر یہ جو آج کل جیلوں کے اندر سُولی دی جاتی ہے، سُولی کا یہ طریقہ نہیں، سُولی دینے کا طریقہ یہ ہے کہ لکڑیوں کے اُوپر باندھ کر نیزے وغیرہ کے ساتھ اس کا پیٹ چاک کرتے ہیں، اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ: یا کاٹ دیا جائے ان کے ہاتھوں کو اور پاؤں کو مختلف جانب سے، مِّنْ خِلَافٍ کا معنی مختلف جانب سے، یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ: یا ان کو نکال دیا جائے علاقے سے۔ الْاَرْض سے علاقہ مراد ہے۔ جس علاقے کے وہ رہنے والے ہیں، جس علاقے میں وہ فساد کرتے ہیں اس علاقے سے ان کو نکال دیا جائے، ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا: یہ ان کے لئے رسوائی ہے دُنیا میں، وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ: مگر وہ لوگ جو توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قدرت پاؤ، فَاعْلَمُوْٓا: پس جان لو تم، اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع کا مضمون

پیچھے سے مضمون چلا آ رہا ہے بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ کے معاہدے کی پرواہ نہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو اپنی خواہشات کے تحت توڑ دینا، اور عہد کو توڑنے اور نافرمانی کے ساتھ ساتھ آخرت کے عذاب سے اپنے آپ کو بے خوف قرار دینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے مرتبے اور مقام کی وجہ سے، نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کے تحت جس طرح سے ذکر کیا گیا تھا، کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لئے اس طرح سے قرار دے رکھا ہے جس طرح سے کسی کے محبوب ہوتے ہیں یا کسی کے چہیتے بیٹے ہوتے ہیں، اور وہ

سمجھتے ہیں کہ اوّل تو ہمیں عذاب ہوگا نہیں، اور اگر سزا ہوئی بھی تو معمولی ہوگی، جس کی وجہ سے وہ بے باک ہو گئے اور آخرت کے عذاب سے وہ ڈرتے نہیں ہیں، اس کی تردید کے لئے کچھ باتیں پیچھے ذکر کی گئی تھیں، اور اس متصل رکوع میں جہاد کا ذکر آیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو جہاد کی ترغیب دی اور انہوں نے جی چرایا، اور جو معاہدہ انہوں نے کیا تھا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اطاعت کا، اور ایمان لانے کی صورت میں جو اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کیا تھا اُس کی خلاف ورزی کی، تو دیکھو! اللہ تعالیٰ نے ان کو کس طرح کی سزا میں مبتلا کیا کہ چالیس سال تک وہ دھکے کھاتے پھرتے رہے، اور ان کو کوئی عزت کا ٹھکانہ نہ ملا، تو عہد کی خلاف ورزی کے نتیجے میں یہ بھی ان کو سزا دنیا کے اندر ہوئی تھی۔ اور یہ آیات جو اس وقت آپ کے سامنے پڑھی گئیں اِس کے ابتدائی حصے میں جیسا کہ آپ نے ترجمے میں سن لیا، آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے واقعہ کا تذکرہ ہے، جن میں سے ایک بچہ تقویٰ کا حامل تھا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والا تھا، اور ایک ایسا تھا جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی، اور اس نافرمانی کے نتیجے میں اُس نے اپنے بھائی کو ناحق قتل کر دیا، تو جس کی وجہ سے دنیا میں بھی اس نے خسارہ پایا اور پچھتانے والوں میں سے ہوا، اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ سزا کا مستحق ہوگا، جس طرح سے حدیث شریف میں ظاہر کیا گیا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاں کہیں بھی کوئی شخص ظلماً قتل ہوتا ہے تو قاتل تو مجرم ہے ہی، لیکن آدم علیہ السلام کا پہلا بیٹا قابیل جس نے اس قتل کے طریقے کو جاری کیا تھا، جو اس طریقے کا بانی بنا، وہ بھی اس گناہ کے اندر برابر کا شریک ہوتا ہے،[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں وہ مجرم ہی ہے، اُس کا گناہ معاف نہیں ہوا، اور آئندہ ظلماً جو بھی قتل ہوگا اس سے بھی سبب بننے کے طور پر گناہ کا حصہ اس کو بھی ملتا ہے، چونکہ یہ طریقہ جاری اس نے کیا ہے، اچھا طریقہ جاری کرنے والے کو عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ملا کرتا ہے، اور بُرا طریقہ جاری کرنے والوں کو عمل کرنے والوں کے برابر وبال ہوتا ہے، وہاں (حدیث) سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں بھی وہ شخص معذب ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا، تو دنیا کا نقصان بھی اٹھایا اور آخرت کا بھی۔

قابیل اور ہابیل کا واقعہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ: سے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کا قصہ بیان کیا گیا ہے، تاریخی طور پر بہت مشہور واقعہ ہے، روایات میں آتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں جو اولاد ہوتی تھی تو ایک ہی حمل سے لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تھے، دوسری بار دوسرے حمل سے پھر لڑکا لڑکی پیدا ہوتے تھے، اب چونکہ حقیقت میں تو سب آپس میں بہن بھائی ہیں، کیونکہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، اگرچہ پیدائش میں تقدیم وتاخیر ہے، لیکن چونکہ نسلِ انسانی کی ابتدا تھی، اور اس سلسلے کو آگے بڑھانا مقصود تھا، اس لیے اس حمل سے جو لڑکا پیدا ہوتا اُس کا نکاح پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی سے کر دیا جاتا، البتہ ایک ہی حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا نکاح آپس میں درست نہ تھا، ہوا یہ کہ قابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ کچھ خوبصورت تھی، اور ہابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ اتنی خوبصورت نہ تھی، اب جب قانونِ شریعت کے مطابق قابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی کا

(۱) صحیح البخاری ۱/۴۶۹ باب خلق آدم/صحیح مسلم ۲/۶۰ باب بیان اثم من سن القتل/مشکوۃ ۱/۳۳، کتاب العلم، فصل اول، عن ابن مسعود

نکاح ہابیل سے ہونے لگا تو قابیل نے ضد کی اور انکار کر دیا اور کہا کہ اس کا نکاح میرے ساتھ ہی ہوگا، بات حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا دونوں قربانی کرو، جس کی قربانی قبول ہوگئی وہ حق پر ہوگا، اور آپ جانتے تھے کہ ہابیل چونکہ حق پر ہے، اس لیے اسی کی قربانی قبول ہوگی، ہابیل کے پاس کچھ جانور تھے اُس نے ان میں سے ایک عمدہ قسم کا دُنبہ قربانی کے لیے پیش کر دیا، اور قابیل کاشتکاری کرتا تھا اُس نے غلے میں سے کچھ چیزیں گندم وغیرہ قربانی کے لیے دی، اور ان دونوں کو پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا، اُس وقت طریقہ یہ ہوتا تھا کہ قربانی کی چیز پہاڑ پر رکھ دی جاتی تھی، آسمان سے آگ آتی تھی جو قربانی قبول ہوتی اُس کو کھا جاتی تھی، اور جو قبول نہ ہوتی اُس کو ویسے ہی چھوڑ جاتی تھی، اور فوراً پتہ چل جاتا تھا کہ قربانی قبول ہے یا نہیں؟ اب دیکھو کتنا عجیب معاملہ ہے دنیا میں ہی پتہ چل جاتا تھا، اور جس کی قبول نہ ہوتی اس کے لیے رسوائی کا باعث ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اللہ نے ان کے معاملے کو دنیا کے اندر ظاہر نہیں فرمایا، بلکہ حکم ہے کہ قربانی کرو اور فقراء میں تقسیم کردو، قبول ہے یا نہیں، اس کا علم اللہ کو ہے، تاکہ دنیا میں رسوائی نہ ہو، یہ اُمتِ محمدیہ پر بہت بڑا احسان ہے۔ جب دونوں نے قربانی کی تو ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی اور قابیل کی قربانی ویسے ہی پڑی رہی، جس سے پتہ چل گیا کہ قابیل کی ضد ناحق ہے اور شریعت سے بغاوت ہے، اب اس کو غصہ آیا کہ ایک تو میری بات نہیں مانی گئی، اور دوسرا میری رسوائی بھی ہوگئی، تو اُس نے ہابیل کو دھمکی دی کہ میں تجھے قتل کردوں گا، ہابیل نے بڑے صبر وتحمل سے جواب دیا: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ: قربانی متقی لوگوں کی طرف سے قبول ہوتی ہے، اگر تُو بھی متقی ہوتا تو تیری طرف سے بھی قبول ہو جاتی، اور پھر کہا: اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا تو میں جواباً تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو رَبّ العالمین ہے۔ روایات میں ہے کہ ہابیل قوت میں قابیل سے زیادہ تھا، لیکن اُس نے مظلوم بن کر قتل ہونا گوارا کرلیا، لیکن قاتل بننا پسند نہیں کیا، اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ قیامت کے قریب فتنے بہت ہوں گے، انسان صبح مؤمن ہوگا اور شام کو کافر، شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کو کافر، اتنی کثرت کے ساتھ فتنے آئیں گے، اُس وقت آدم کے بیٹوں میں جو اچھا بیٹا تھا اُس کی طرح ہو جانا[1] کیا مطلب؟ کہ مظلوم بن کر قتل بھی ہونا پڑے تو ہو جانا لیکن قاتل نہ بننا۔ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ پھر اچھا دکھایا اُس کے لیے اُس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل کرنے کو، یعنی دل میں آیا کہ قتل ہی کردوں تو اچھا ہے، فَقَتَلَهٗ: پھر اُس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، اور پھر وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگیا۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ: اب اُس نے اپنے بھائی کو قتل تو کر دیا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اُس کے ساتھ کیا کرے، کیونکہ اس سے پہلے اُس نے کوئی میت دیکھی نہ تھی، کہ جس کو دفن کیا جاتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے راہنمائی کے لیے کوّا بھیجا جو دوسرے کوّے کے ساتھ لڑ رہا تھا، اُس نے لڑتے ہوئے دوسرے کو مار دیا اور پھر زمین کریدنے لگا، زمین میں گڑھا بنا کے اُس کوّے نے دوسرے کو اُس میں ڈال کے اُوپر سے مٹی ڈال دی، قابیل یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، تو اُس کو بھی پتا چل گیا کہ ایسے کرنا

---

(۱) ترمذی ۲/۴۴، مشکوٰۃ ۲/۴۶۳، کتاب الفتن، فصل ثانی، عن ابی موسیٰ ۔ ولفظ الحدیث: قال فی الفتنۃ کسروا فیھا قسیکم ۔۔۔ و کونوا کابن آدم۔

ہے، پھر حسرت اور افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا: یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ: افسوس میری حالت پر، کیا میں اس سے بھی عاجز ہو گیا کہ اس کوے کی طرح ہو جاؤں اور پھر اپنے بھائی کی لاش کو چھپاؤں؟ یعنی مجھ سے تو یہی اچھا ہے جس کو اس چیز کا پتہ ہے اور مجھے اتنا بھی پتہ نہیں کہ اپنے بھائی کی لاش کہاں چھپاؤں؟

ایک نفس کا قتل تمام انسانوں کے قتل کے برابر ہے

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ: حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے ظلم کرتے ہوئے چونکہ اپنے بھائی کو قتل کر دیا، اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ بات لکھ دی، یعنی ان کی شریعت کا قانون بنا دیا، اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ: جو شخص کسی دوسرے کو جان کے بدلے کے علاوہ قتل کرے اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ: یا وہ قتل زمین میں فساد کو روکنے کے لیے نہیں ہے، یعنی شریعت جن صورتوں میں قتل کا حکم دیتی ہے ان کے علاوہ قتل کیا ہے، فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا: تو یہ ایسے ہے جیسے اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا، کیا مطلب؟ ایک شخص کو قتل کرنے کا گناہ ایسا ہے جیسا کہ سب لوگوں کو قتل کرنے کا گناہ ہے، اور جس نے کسی ایک کو زندہ رکھا اُس نے گویا کہ سب کو زندہ رکھا، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ایک نے ظلماً ایک شخص کو قتل کر دیا، جواب میں انہوں نے ان کا بندہ مار دیا، یوں لڑائی شروع ہو گئی، اور بہت سارے لوگ قتل ہو گئے، تو پہلا شخص جس نے قتل کیا ہے وہ قاتل ہے ایک کا، لیکن سبب بننے کی وجہ سے سب قتل اُس کے ذمے ہوں گے، کیونکہ ابتدا اسی سے ہوئی ہے اور دوسرے لوگوں کے قتل کا سبب وہ بنا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص بھی ظلماً قتل ہوگا حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا اس گناہ میں شریک ہوگا کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کی بنیاد ڈالی، وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ: ان کے پاس ہمارے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے پھر بھی ان میں سے بہت سارے لوگ زمین میں اسراف یعنی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، یہ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں اور ان کی حکم عدولیوں کا ذکر کر دیا۔

"اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ" کا شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں ایک واقعہ لکھا ہے، کہ قبیلہ عرینہ کے چند لوگوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر اسلام قبول کر لیا، پھر مدینہ منورہ کی ہوا ان کے موافق نہ آئی تو وہ بیمار ہو گئے، حضور ﷺ کو پتا چلا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنگل میں چلے جاؤ اور وہاں جو ہمارے صدقے کے اُونٹ چرتے ہیں وہاں رہو، ان کا دودھ بھی پیو اور پیشاب بھی، وہ جنگل میں چلے گئے، انہوں نے اُونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیا تو وہ ٹھیک ہو گئے، پھر انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اُونٹ بھگا کر لے گئے، حضور ﷺ کو پتا چلا تو آپ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجے، جب ان کو پکڑ کر لایا گیا تو ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں، اور ان کو دھوپ میں ڈال دیا گیا جس سے وہ مر گئے، یہ آیت اسی واقعے کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

ڈاکوؤں کی سزا کی تفصیل

اس آیت میں ڈاکوؤں کی سزا بیان کی گئی ہے، جو طاقت اور قوت کے ساتھ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، زمین میں فساد

پھیلاتے ہیں، ان کے لیے چار قسم کی سزائیں بیان کی گئی ہیں، اور یہ سزائیں مختلف جرائم کے اعتبار سے ہیں، جس قسم کا جرم ہوگا ویسی ہی سزا ہوگی، اگر ڈاکوؤں نے قتل بھی کیا ہو اور مال بھی لوٹا ہو تو ان کو قتل بھی کیا جائے گا اور سُولی پر بھی لٹکایا جائے گا، اور اگر صرف قتل کیا ہے مال نہیں لوٹا تو بدلے میں صرف قتل کیا جائے گا، اور اگر مال لوٹا ہے قتل نہیں کیا تو ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں گے، اور اگر نہ قتل کی نوبت آئی ہے اور نہ ابھی تک مال لوٹا ہے، بلکہ صرف رہزنی کے لیے ابھی بیٹھے ہی تھے، جس سے لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا ہو تو ان کو زمین سے نکال دیا جائے، یہ چار قسم کی سزائیں چار مختلف جرائم کی ہیں۔ اور پھر یہ جو آیا ہے کہ اُس کو زمین سے نکال دیا جائے، حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو جیل میں ڈال دیا جائے جب تک توبہ نہ کرے جیل میں ہی رکھا جائے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، اور فقہ حنفی کی بنیاد اسی پر ہے، ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے، جبکہ دوسرے بعض علماء کہتے ہیں کہ حاکم کو اختیار ہے، چار سزاؤں میں سے جو سزا بھی اختیار کرلے کرسکتا ہے، ان کے نزدیک یہ مختلف احوال پر محمول نہیں ہیں، بلکہ حاکم وقت کی صوابدید پر محمول ہیں۔

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا: یہ تو ان کی دنیا کی زندگی کی سزا اور رسوائی ہے، اس سے گناہ معاف نہیں ہوا جب تک کہ توبہ نہ کریں، وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے، یہی دلیل ہے ان حضرات کی جو کہتے ہیں کہ سزائیں کفارہ نہیں بنتیں، سزا کی معافی کے لیے توبہ ضروری ہے، اگر دنیا کی سزا سے ہی گناہ معاف ہو جائے تو آخرت کا عذاب کیوں ہو؟ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ: سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کرلی قبل اس کے کہ تم ان پر قدرت پاؤ، یہ پچھلے حکم کی ایک استثنائی صورت بیان کردی کہ اگر کوئی ڈاکو حاکم کی گرفت میں آنے سے پہلے توبہ کرلیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی توبہ قبول ہے، توبہ کرنے سے شرعی حد معاف ہو جائے گی، البتہ حق العبد معاف نہیں ہوگا، اگر کسی کو قتل کیا ہے تو اولیاء کی رضا کے ساتھ قصاص یا دیت یا معافی ہوسکتی ہے، اور جو مال لوٹا ہے اس کا واپس کرنا بھی ضروری ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تلاش کرو اُس کی طرف وسیلہ اور جہاد کرو اُس کی راہ میں

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿٣٥﴾ بے شک جن لوگوں نے کُفر کیا اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے

وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ

اور اُس کے ساتھ اتنا ہی اور، تاکہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت کے دن کے عذاب سے تو قبول نہیں کیا جائے گا

مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ

ان سے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿٣٦﴾ وہ ارادہ کریں گے کہ دوزخ سے نکلیں

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۘ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٧﴾

حالانکہ وہ اُس سے نکلنے والے نہیں، اور ان کے لیے ہمیشہ باقی رہنے والا عذاب ہے ﴿٣٧﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط

گزشتہ آیات میں ڈاکوؤں کی سزا کا ذکر تھا آئندہ آیات میں چور کی سزا کا ذکر آ رہا ہے، درمیان میں اطاعت عبادت اور تقویٰ کی طرف متوجہ کر دیا تاکہ ان جرائم سے رُکنا آسان ہو جائے۔

مسئلۂ توسل پر دلائل، اور اکابرین کا مسلک

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اس آیت میں تقویٰ کے ساتھ ساتھ وسیلہ کو تلاش کرنے کا حکم ہے۔[1] اور ایسے ہی اس توسل کے مسئلے میں عام طور پر علماء اس روایت کو بھی ذکر کیا کرتے ہیں جو مشکوٰۃ میں ''باب فضل الفقراء'' میں ہے یہ اصل کے اعتبار سے بخاری کی روایت ہے: ''عَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ رَاٰی سَعْدٌ اَنَّ لَهٗ فَضْلًا عَلٰی مَنْ دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَآئِكُمْ'' رواہ البخاری، یعنی سعد رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ اس کو اپنے سے کم درجے کے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے، چونکہ بہت سخاوت کرتے تھے اور اچھے آدمی تھے، ان کے دل میں ایسا خیال آ گیا کہ مجھے دوسروں پہ فوقیت حاصل ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں مدد دیے جاتے ہو تم اور نہیں رزق دیئے جاتے ہو تم مگر اپنے ضعفاء کی برکت سے۔ گویا کہ تکوین میں اللہ تعالیٰ نے ضعفاء کو ذریعہ اور سبب بنایا ہوا ہے رزق ملنے کا اور نصرت کے حاصل ہونے کا، اور جب سرورِ کائنات ﷺ نے اس کا اظہار فرما دیا تو گویا کہ تشریعاً بھی اس کو گوارا کر لیا گیا، اب اسی تکوینی واسطہ کو اگر کوئی شخص اپنی دُعا میں ذکر کرے، اور یہ کہے کہ اے اللہ! ہمارے ضعفاء کی برکت سے ہمیں نصرت عطا فرما، یا رزق عطا فرما، تو یہ کوئی شریعت کے مزاج کے خلاف نہیں ہے۔

اور قرآنِ کریم میں اہل کتاب کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ بقرۃ میں یہ جو لفظ آئے ہیں وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (آیت:۸۹) کہ یہ یہود اس سے قبل یعنی قرآنِ کریم کے نازل ہونے سے قبل یا سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لانے سے قبل فتح طلب کیا کرتے تھے ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے کفر کیا، استفتاح کے یہاں دو معنی بیان کیے گئے ہیں، ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تو یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ کفار پر یہ کھول کھول کر بیان کیا کرتے تھے، آنے والی کتاب کا تذکرہ بھی کھلے

(۱) اس سے پہلے کا حصہ ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ ناقل

الفاظ میں کرتے تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ کا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے، کہ ایک ایسے ایسے پیغمبر آنے والے ہیں، پھر ہم ان کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ قتال کریں گے اور فتح پائیں گے، تو اس طرح سے ان حالات کو کھول کھول کر بیان کیا کرتے تھے، لیکن دیگر مفسرین نے، عربی مفسرین نے بھی اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے بھی یہاں یہی مطلب ذکر کیا کہ چونکہ ان کی کتابوں میں نبی آخر الزمان کا ذکر تھا اور آنے والی کتاب کا ذکر تھا، تو اپنی دُعاؤں کے اندر وہ یوں کہا کرتے تھے کہ اے اللہ! نبی آخر الزمان کے طفیل ہمیں کافروں کے خلاف فتح نصیب فرما، تو بطفیل کے لفظ اور اس طرح کے دوسرے لفظ، بحرمت فلاں، بطفیل فلاں، اس قسم کی روایات اس آیت کی تفسیر کے اندر بھی علماء نے نقل کی ہیں۔

اور ہمارے قریبی بزرگ علمائے دیوبند کے سرخیل حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، ان کا قصیدہ جو چھپا ہوا ہے اُس کے اندر بھی اس قسم کے الفاظ آتے ہیں، توسل مشائخ کے سلسلے میں جو ان کا قصیدہ چھپا ہوا ہے، اس میں الفاظ ہیں:

بہ حقِ مقتدائے مقتدایاں حسن بصری امامِ پیشوایاں
بہ حقِ شیرِ یزداں شاہِ مرداں در علمِ لدنی فیضِ رحماں
بحقِ آنکہ او جانِ جہان است فدائے روضہ اش ہفت آسمان است
بہ حقِ آنکہ محبوبش گرفتی برائے خویش مطلوبش گرفتی
بہ حقِ سرورِ عالم محمد بہ حقِ برترِ عالم محمد

(''شہابِ ثاقب'' ص ۲۳۵)

تو اس طرح سے ''بحقِ فلاں'' کے ساتھ دُعا کرنے کا ذکر حضرت نانوتوی نے بھی اپنے قصیدے میں کیا ہے۔ بالکل اسی طرح سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کے متعلق بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ''شہابِ ثاقب'' (ص ۲۳۶) میں اس قسم کے الفاظ ہیں کہ ''مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز متوسلین کو ہمیشہ توسلِ اولیاء طریقت کا ارشاد فرماتے تھے، اور شجرۂ طیبہ خاندانِ چشتیہ قدوسیہ امدادیہ ان کو عطا فرماتے تھے، جس میں یہ الفاظ ہوتے تھے: الٰہی! بحرمت سیّدنا و مولانا فلاں بن فلاں الخ'' تو اس قسم کے الفاظ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے طریق کے اندر بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ بہر حال روایاتِ حدیث کے اشارے سے یہ بات ثابت ہے اور اسی طرح سے روایاتِ تفسیر کے اندر اس چیز کا ذکر آتا ہے، علماء کی کلام کے اندر ''بحقِ فلاں'' کے ساتھ دُعا ذکر آیا ہوا ہے، تو علمائے دیوبند کے نزدیک اس طرح سے دُعا کرنی جائز ہے اور اس کو باعثِ برکت سمجھتے ہیں، اور قبولیت کے لئے اس کو ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، جس طرح سے باقی چیزوں کو ذریعے کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے تو اسی طرح سے توسل کرنے کو بھی قبولیتِ دُعا کے لئے ایک ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔

مسئلۂ توسل پر ''ہدایہ'' کی عبارت کا تسلی بخش جواب

اس بارے میں اگر کوئی اشکال کیا جا سکتا ہے تو وہ ''ہدایہ'' کی عبارت سے ہے کہ ''ہدایہ'' جلد رابع میں ''کتاب

الکراهیة'' (مسائل متفرقہ) میں صاحبِ ہدایہ کہتے ہیں: ''وَيُكْرَهُ اَنْ يَّقُوْلَ فِیْ دُعَائِهٖ بِحَقِّ فُلَانٍ اَوْ بِحَقِّ اَنْبِيَآئِكَ وَرُسُلِكَ لِاَنَّهٗ لَا حَقَّ لِلْمَخْلُوْقِ عَلَى الْخَالِقِ'': کہ دُعا کے اندر یہ الفاظ بولنا کہ بحقِ فلاں میری دُعا قبول کرلی جائے، بحقِ انبیاء علیہم السلام قبول کرلی جائے، یہ مکروہ ہے، ناپسندیدہ ہے، کیونکہ مخلوق کا کوئی حق خالق کے ذِمّے نہیں کہ جس کا واسطہ دیا جائے۔ اس عبارت کی حقیقت کو سمجھ لیجئے! حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ''تفسیرِ عزیزی'' میں اس آیت کے تحت جہاں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کرنے کا ذکر ہے: فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ، اس کے تحت روایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دُعا کی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے وہ دُعا قبول فرمائی، اور پھر اس ضمن میں انہوں نے توسل کے مسئلے پر بھی بحث کی، اور فقہاء کی اس عبارت کو بھی نقل کیا، کہ فقہاء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ حق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف، کہ بندوں کا حق اُس کے ذِمّے ہے یہ عنوان صحیح احادیث میں بھی آیا ہے اور قرآنِ کریم میں بھی، ایک متفق علیہ روایت ہے بخاری مسلم کی، کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حمار پر سوار تھے اور پیچھے معاذ رضی اللہ عنہ تھے، تو معاذ کو خطاب کرکے کہا کہ ''يَا مُعَاذُ! تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ'': اے معاذ! تجھے پتا ہے؟ کہ اللہ کا حق بندوں کے ذِمّے کیا ہے اور بندوں کا حق اللہ کے ذِمّے کیا ہے؟ یہ لفظ ہے: ''حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ'' بندوں کا حق اللہ کے ذِمّے کیا ہے؟ تو یہاں یہ لفظ آیا ہوا ہے ''حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ''، تو یہاں ''حق علی اللہ'' کا لفظ ہے، اگرچہ اس میں توجیہ کی گئی ہے کہ حق تفضلی ہے وجوبی نہیں، اللہ کا حق بندوں کے ذِمّے تو وجوبی ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے، باقی! بندوں کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ اللہ کے ذِمّے ضروری نہیں، وہ اُس کی اپنی حکمت اور مصلحت پر ہے، چاہے کرے چاہے نہ کرے، مشاکلۃً اس کو حق سے تعبیر کردیا گیا، بہرحال حق کی نسبت بندوں کے لئے اللہ کے ذِمّے یہ آئی ہوئی ہے ''مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ''۔ اور قرآنِ کریم میں بھی اس قسم کے الفاظ ہیں: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ روم: ۴۷) مؤمنین کی مدد کرنا ہمارے ذِمّے حق ہے، تو یہاں بھی حق کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا، تو یہ کہنا کہ مخلوق کا خالق کے ذِمّے حق نہیں، یہ عبارت ان روایات اور آیات کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف حق کی نسبت کی گئی ہے کہ بندوں کا حق اللہ تعالیٰ کے ذِمّے ہے، لیکن وہ حق تفضلی ہے، یہ تشریح کرنی پڑے گی اہلِ سُنّت والجماعت کے عقیدے کے تحت، باقی فقہاء نے یہ جو لکھا ہے کہ ''لَا حَقَّ لِلْمَخْلُوْقِ عَلَى الْخَالِقِ'' یہاں ''حق'' سے حقِ وجوبی مراد ہے، اصل بات یہ ہے کہ معتزلہ کا ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا، جو اللہ تعالیٰ کے ذِمّے جزا وسزا کو واجب قرار دیتا تھا، کہ اگر بندہ اس کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق عمل کرتا ہے تو پھر اُس کی جزا اللہ کے ذِمّے واجب ہے، گویا کہ وہ بندے کا حق اللہ کے ذِمّے اسی طرح سے لگاتے تھے جس طرح سے اللہ کا حق بندے کے ذِمّے لگا ہوا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان اور اُس کی عظمت کے منافی ہے، کہ بندوں کے حق کو اس کے ذِمّے لازم قرار دیا جائے، لازم نہیں، بندہ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جتنی دنیا کے اندر کھاتا ہے، ساری زندگی عبادات کرتا رہے انہی نعمتوں کا حق ادا نہیں کرسکتا، تو ثواب اُس کے لیے اللہ کے ذِمّے واجب کس طرح سے ہوگیا، یہ بات

اہلِ سُنّت والجماعت کے عقیدے کے خلاف ہے اور عقلاً بھی بعید ہے، تو جب اس گروہ کا چرچا تھا تو وہ حق کا لفظ بولتے تھے تو حق وجوبی مراد لیتے تھے، تو اس لئے اہلِ حق علماء نے، علمائے حنفیہ نے اس لفظ کے استعمال کرنے کی ممانعت کردی، کہ ''بحق فلاں'' کے ساتھ دُعا نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ سننے والا سمجھے گا کہ شاید یہ بھی معتزلہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے ذمے کسی حق وجوبی کا قائل ہے، اس تشبہ کی بنا پر اور اس مشابہت سے بچنے کے لئے یہ لفظ بولے گئے کہ ''لَا حَقَّ لِلْمَخْلُوقِ عَلَى الْخَالِقِ''، اس لئے دُعا کے اندر بحق فلاں کے ساتھ دُعا نہیں کرنی چاہیے، یہ ایک وقتی مصلحت تھی، اور جب اُس مسلک کے لوگ جو حق وجوبی کے قائل تھے نہ رہے، نہ لوگوں کے ذہن کے اندر اس قسم کی بات ہے، تو قرآنِ کریم کے اندر بھی جب یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا، اور حدیث شریف میں حق العباد علی اللہ کا عنوان اختیار کیا گیا ہے تو بحق فلاں کہنے میں کوئی حرج نہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمہ اللہ نے اس عبارت کی شرح اس طرح سے فرمائی، لہٰذا فقہاء کی اس عبارت سے مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیے، یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، اب بھی اگر کسی شخص کا عقیدہ ہو کہ حق سے حق وجوبی مراد ہے تو اس کے لئے حق فلاں کا لفظ استعمال کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذمے مخلوق کے لئے کوئی حق واجب نہیں ہے، تو علمائے اہلِ حق کے مسلک کے تحت اس طرح سے دُعا کا جواز ہے، اور واقع ہے، وہ اس طرح سے کرتے تھے، اس لئے کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، اور خواہ مخواہ تعصب کے اندر مبتلا ہو کر ان عبارات کو غلط قرار دینا کم از کم اپنے علماء کے ساتھ نسبت کو کمزور کرتا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا
وہ شخص جو چوری کرتا ہے اور وہ عورت جو چوری کرتی ہے پس تم کاٹ دیا کرو ان دونوں کے ہاتھ، جو کچھ انہوں نے کیا اس کے
كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۳۸ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ
بدلے کے طور پر، اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ۳۸ پھر جو شخص توبہ کرلے اپنے ظلم
ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۹
کے بعد اور اپنے حال کو دُرست کرلے پس بیشک اللہ تعالیٰ اُس پر متوجہ ہوتے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۳۹
اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ
اے مخاطب! کیا تجھے معلوم نہیں کہ بیشک اللہ، اُسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، عذاب دے گا جس کو چاہے گا

وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤٠ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ
اور بخشے گا جس کو چاہے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۝۴۰ اے رسول
لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا
غم میں نہ ڈالیں آپ کو وہ لوگ جو کفر میں دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے کہا
اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ
اپنے مونہوں کے ساتھ ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے، اور خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو یہودی ہیں،
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۗ يُحَرِّفُوْنَ
بہت قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو، سننے والے اور لوگوں کے لئے جو کہ آپ کے پاس نہیں آئے، کلمات کو اپنی جگہ سے پھیر
الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ
دیتے ہیں ان کلمات کے اپنی جگہوں پر واقع ہونے کے بعد، کہتے ہیں اگر تم یہ دیئے جاؤ تو اُس کو قبول کرلو
وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۗ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ
اور اگر تمہیں یہ نہ دیا جائے تو پھر بچ کے رہنا، اور وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرلے اُس کو فتنے میں ڈالنے کا پھر
تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ
تُو اختیار نہیں رکھے گا اُس کے لئے اللہ کی طرف سے کچھ بھی، یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ ان کے دلوں کو
قُلُوْبَهُمْ ۗ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
پاک کردے، ان کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے، اور ان کے لئے آخرت میں بڑا
عَظِيْمٌ ۝٤١ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۗ فَاِنْ جَآءُوْكَ
عذاب ہے ۝۴۱ جھوٹ کو سننے والے ہیں، حرام کو کھانے والے ہیں، پھر اگر یہ لوگ آپ کے پاس آجائیں
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ
تو ان کے درمیان فیصلہ کیجئے یا ان سے منہ موڑ جایئے، گر آپ ان سے اعراض کریں گے تو ہرگز یہ آپ کو

يَضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ

کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اور اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو پھر ان کے درمیان فیصلہ انصاف کے ساتھ کیجئے، بیشک

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ

اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں انصاف کرنے والوں کو ﴿۴۲﴾ کیونکر فیصل ٹھہراتے ہیں وہ آپ کو حالانکہ ان کے پاس توراۃ ہے،

فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

اس میں اللہ کا حکم ہے، پھر پیٹھ پھیر جاتے ہیں وہ اس کے بعد، اور یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ﴿۴۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ وَالسَّارِقُ: سارق اسم فاعل کا صیغہ ہے، اور اس پر جو الف لام داخل ہے وہ الذی کے معنی میں ہے تو السَّارِقُ کا معنی الذی یَسْرِقُ وہ شخص جو چوری کرتا ہے، وَالسَّارِقَةُ: اور وہ عورت جو چوری کرتی ہے، فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا: پس تم کاٹ دیا کرو ان دونوں کے ہاتھ، جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا: یہ فَاقْطَعُوْٓا کا مفعول لہ ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے بدلے کے طور پر، نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ: یہ جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا سے بدل ہے۔ اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر۔ نکال ایسی سزا کو کہتے ہیں جو دوسرے لوگوں کو جرم سے روکنے کا ذریعہ بن جائے، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ: پھر جو شخص توبہ کر لے اپنے ظلم کے بعد، وَاَصْلَحَ: اور اپنے حال کو درست کر لے، فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ: پس بیشک اللہ تعالیٰ اس پر متوجہ ہوتے ہیں یعنی اس کی توبہ قبول کرتے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ: اے مخاطب! کیا تجھے معلوم نہیں؟ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کہ بیشک اللہ، اسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ: عذاب دے گا جس کو چاہے گا، وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ: بخشے گا جس کو چاہے گا، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ: اے رسول!، لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ: غم میں نہ ڈالیں آپ کو وہ لوگ جو کفر میں دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں، جلدی کے ساتھ کفر میں واقع ہونے والے ہیں۔ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا - یہ مِنْ بیانیہ ہے الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ کے لئے۔ وہ لوگ جو کفر میں جلدی جلدی واقع ہوتے ہیں خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے کہا اپنے مونہوں کے ساتھ، ہم ایمان لے آئے، حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے، اور خواہ وہ ان لوگوں سے ہوں جو یہودی ہیں۔ تو یہ مِنْ بیانیہ ہے، اس لیے الَّذِيْنَ هَادُوْا اور الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ یہ دونوں الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ کا مصداق ہیں، اسی بیان کو واضح کرنے کے لئے یہ لفظ بول رہا ہوں اردو محاورے کے طور پر، ''خواہ وہ ان لوگوں سے ہوں جو اپنے

منہ سے بولتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے (اس کا مصداق ہوگا منافقین) خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو یہودی ہیں' سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: سَمَّاع مبالغے کا صیغہ ہے، سَمِعَ يَسْمَعُ: سننا۔ اسی طرح سننے سے مراد ہوتا ہے قبول کرنا، دونوں طرح سے یہاں ترجمہ کیا گیا ہے، جھوٹ سننے والے ہیں، بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، یعنی جھوٹ سننے کے عادی ہیں، اور یہ بھی اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے کہ جھوٹ کو قبول کرنے والے ہیں، بہت زیادہ قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو، سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ: اور سننے والے ہیں اور لوگوں کے لئے جو کہ آپ کے پاس نہیں آئے۔ سننے والے ہیں، لِقَوْمٍ: ایک قوم کے لئے جو اور ہے، لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ: اور لوگوں کے لئے، لَمْ يَاْتُوْكَ: ایسے وہ اور لوگ جو آپ کے پاس نہیں آئے، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ: باتوں کی تحریف کرتے ہیں، کلمات کو اپنی جگہ سے پھیر دیتے ہیں، مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ: اَلْكَلِمَ چونکہ اسم جمع کے طور پر آیا ہے تو اس لیے مَوَاضِعِهٖ کی ضمیر اس کی طرف مفرد لوٹ رہی ہے۔ ان کلمات کے اپنی جگہوں پر واقع ہونے کے بعد، یعنی بعد اس کے کہ وہ کلمات اپنے موضع پہ واقع ہوتے ہیں، یہ ان کو ہلا دیتے ہیں پھیر دیتے ہیں، يَقُوْلُوْنَ: کہتے ہیں، اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا: اگر تم یہ دیے جاؤ، فَخُذُوْهُ: تو اس کو قبول کرلو، لے لو، وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ: اور اگر تمہیں یہ نہ دیا جائے، فَاحْذَرُوْا: تو پھر بچ کے رہنا، وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ: اور وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرلے اس کی گمراہی کا، فتنے میں ڈالنے کا، فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا: پھر تو اختیار نہیں رکھے گا اس کے لئے اللہ کی طرف سے کچھ بھی، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ: یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ ان کے دلوں کو پاک کردے، لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ: ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے، وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ: سُحت کہتے ہیں حرام کو، اصل میں سَحَتَ يَسْحَتُ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ کے ختم کردینا، چنانچہ اس معنی میں یہ لفظ فرعونیوں کے قصے میں ایک جگہ آیا ہوا ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ، غالباً سورۂ طٰہٰ میں ہے (آیت: ۶۱) پھر وہ تمہیں ختم کردے گا بالکل استیصال کردے گا تمہارا عذاب کے ساتھ۔ اور اس سُحت کا مصداق اس جگہ عام طور پر مفسرین نے رشوت کو بنایا ہے، تو سُحت: حرام مال، اور پھر خاص طور پر اس کا مصداق رشوت، اس کو سحت کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ رشوت خوری بھی عدل وانصاف کو جڑ سے ختم کردیتی ہے جیسے کہ اس کی تفسیر ابھی آپ کے سامنے آئے گی، بہر حال سحت کا مصداق حرام مال ہے، اور حرام مال کے افراد میں سے یہاں رشوت متعین ہے۔ کھانے والے ہیں رشوت، کھانے والے ہیں حرام مال۔ ''جھوٹ کو سننے والے ہیں، حرام کھانے والے ہیں''، فَاِنْ جَآءُوْكَ: پھر اگر یہ لوگ آپ کے پاس آجائیں، فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ: تو ان کے درمیان فیصلہ کیجیے، اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ: یا ان سے منہ موڑ جائیے، وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ: اگر آپ ان سے اعراض کریں گے، فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا: تو ہرگز یہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، وَاِنْ حَكَمْتَ: اور اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں، فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ: تو پھر ان کے درمیان فیصلہ انصاف کے ساتھ کیجیے، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں انصاف کرنے والوں کو۔ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ: یہ تعجب کے لئے ہے۔ تحکیم: دوسرے کو فیصل قرار دینا۔ کیونکر فیصل ٹھہراتے ہیں وہ آپ کو،

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ: حالانکہ ان کے پاس تورات ہے، فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ: اس میں اللہ کا حکم ہے، ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: پھر پیٹھ پھیر جاتے ہیں وہ اس کے بعد، اس کے بعد کا معنی یہ ہے کہ آپ کو حاکم ٹھہرانے کے بعد پھر پیٹھ پھیر جاتے ہیں، وَمَآ أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ: اور یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

تفسیر

''سرقہ'' کا لغوی وشرعی مفہوم

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ: اس آیت میں سرقہ صغریٰ کی سزا ذکر کی گئی ہے، جس طرح سے کہ پچھلے رکوع کی آخری آیات میں سرقہ کبریٰ کی سزا ذکر کی گئی تھی، پہلی بات تو یہ ہے کہ ''سرقہ'' کسے کہتے ہیں؟ اس کا لفظی معنی کر دیا جاتا ہے چوری، لیکن چوری کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، کسی کے پاس کوئی امانت رکھی ہوئی ہو اس میں سے کوئی نکال لے وہ بھی ہمارے ہاں ''چوری'' کہلاتا ہے، دو شریک مشترکہ کاروبار کرتے ہیں تو اس میں سے ایک شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر کوئی چیز لے لیتا ہے تو اس کو بھی ''چوری'' کہہ دیتے ہیں، اور اسی طرح سے عام عمارات جو ہوا کرتی ہیں، جیسے سرائے ہوگئی، مسافر خانہ ہو گیا، مدرسہ ہو گیا، مسجد ہوگئی، جہاں ہر کسی کو آنے جانے کی اجازت ہوتی ہے اور وہاں کی ملکیت کسی خاص شخص کے لئے نہیں ہوتی، وہاں سے کوئی چیز اٹھالے تو اس کو بھی ''چوری'' سے تعبیر کر دیتے ہیں، غرضے کہ جس طرح سے بھی انسان بددیانتی کے ساتھ ناحق دوسرے کا مال لے لے اس کو ہمارے محاورے میں ''چوری'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن شرعی مفہوم ''چوری'' کا یہ نہیں ہے، ''سرقہ'' کا شرعی طور پر مفہوم ہے: ''أَخْذُ مَالٍ مُحْرَزٍ خُفْيَةً'' مالِ محفوظ کو خفیۃً لینا، چھپ چھپا کر لینا مال محفوظ کو، اس میں پہلی قید تو لگائی گئی کہ وہ مال محفوظ ہو یعنی اس چرانے والے کے مقابلے میں اُس مال کی حفاظت کی گئی ہے، پھر چاہے وہ محفوظ ہو کہ کسی کمرے میں بند کر کے تالا لگایا ہوا ہے تو بھی وہ محفوظ ہے، یا کسی جگہ اُس کا ڈھیر لگا کر کوئی نگران متعین کیا ہوا ہے، جس طرح سے چوکیدار ہو، دونوں طرح سے مال محفوظ ہو جاتا ہے، اور پھر اُس کو لیا جائے خفیۃً، چھپ چھپا کر اُسے لیا جائے، ان دونوں لفظوں میں بہت سارا مفہوم بند کر دیا گیا، اب ایسی جگہیں جہاں عوام کو آنے جانے کی اجازت ہوتی ہے، جیسے مساجد ہوگئیں، مدرسے ہوگئے، مسافر خانے ہوگئے، ایسی عمارات جو کہ رفاہِ عامہ کے لئے بنی ہوئی ہوتی ہیں، وہاں کسی کے آنے جانے کے لئے کوئی پابندی نہیں ہوتی، وہاں جو مال پڑا ہوا ہوتا ہے وہ اس آنے جانے والے کے حق میں محفوظ نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص وہاں سے کوئی چیز اٹھا کر لے جاتا ہے، جیسے مسجد میں سے قرآن اٹھا کر لے گیا، مسجد میں سے لاؤڈ اسپیکر اٹھا کر لے گیا، یہ بھی شرعی طور پر ''سرقہ'' کے مفہوم میں نہیں آتا۔ اسی طرح سے دو شریک اکٹھے کاروبار کرتے ہیں تو وہ مال دونوں میں سے کسی کے حق میں محفوظ نہیں ہوتا، ہر کسی کو اس میں تصرف کرنے کی

اجازت ہوتی ہے، تو ایک شریک اگر خیانت کر کے گلے میں سے کچھ پیسے اٹھالیتا ہے، یا کوئی مال اس میں سے چھپالیتا ہے، تو وہ بھی شرعی طور پر ''سرقہ'' کا مصداق نہیں ہے، دُکان پر ملازم کام کرتے ہیں، گھروں کے اندر نوکر کام کرتے ہیں، ان کے حق میں بھی گھر کا مال اور دُکان کا سامان محفوظ نہیں ہوتا، اس لئے اگر وہ لوگ مالک کی اجازت کے بغیر وہاں سے کوئی چیز اٹھا کر لے جائیں اور اُس کو چھپالیں تو وہ بھی شرعی طور پر ''سرقہ'' کے مفہوم میں نہیں آتا۔ جیسے حدیث شریف میں ایک واقعہ آتا ہے، کہ ایک گھر کا خادم تھا، جیسے گھر میں غلام ہوتے ہیں، اُس نے گھر سے شیشہ چرالیا، غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارا خادم تھا، اُس نے تمہارا مال اٹھالیا، اس پر حد نہیں ہے۔[1] وجہ اُس کی یہی ہے کہ گھر کے خادم کے حق میں گھر کا مال محفوظ نہیں ہوتا، دُکانوں کے ملازمین کے حق میں دُکان کا مال محفوظ نہیں ہوتا، اسی طرح سے اور اس کی مثالیں بن سکتی ہیں، کہ جہاں وہ مال محفوظ نہ ہو بلکہ آنے جانے کی اجازت ہے، اس میں کسی درجے میں تصرف کرنے کی اجازت ہے، آپ کے پاس ایک امانت رکھی ہوئی ہے آپ اُس امانت میں سے خیانت کر لیتے ہیں، اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر چھپالیتے ہیں، تو وہ مال چونکہ آپ کے حق میں محفوظ نہیں ہے، اس لئے اُس امانت میں سے لے لینا، یہ بھی شرعی طور پر سرقہ کے مفہوم میں نہیں آتا۔ اور پھر لینا خفیۃً ہو، چھپ چھپا کر ہو، علی الاعلان کوئی شخص کسی سے کوئی چیز جھپٹ کر لے جاتا ہے جس کو نُہبہ کہتے ہیں، کسی سے کسی چیز کو اُچک لینا، یہ بھی ''سرقہ'' کی تعریف میں نہیں آتا، کوئی زبردستی کر کے طاقت کے ساتھ دوسرے سے کوئی چیز چھین کر لے جاتا ہے، جس کو غصب کرنا کہتے ہیں، وہ بھی ''سرقہ'' کی تعریف میں نہیں آتا، اور اسی طرح سے اور بھی ایسی صورتیں بن سکتی ہیں کہ جس میں سے انسان اگر لیتا ہے تو اس لینے کو خفیۃً نہیں کہا جاتا، یہ غصب، لوٹ مار، اُچک لینا، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو خفیۃً لینا نہیں کہتے، تو جس کی بنا پر یہ بھی ''سرقہ'' کی تعریف میں نہیں آتے۔ اور یہ جیب تراشی جو ہے، چلتے ہوئے جیب جو کاٹ لیا کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے اس پر بھی ''سرقہ'' صادق نہیں آتا، البتہ فقہاء نے اس طرار کو جیب تراش کو چور کے حکم میں رکھا ہے دلالۃً، اور نباش جو کفن چور ہے، جو قبروں کو کھود کر کفن اتار لایا کرتے ہیں، یہ بھی سارق کے حکم میں نہیں، نباش کفن چور، کیونکہ مردہ جو ہے وہ اس کفن کا محافظ نہیں ہوتا، اور قبر کے اندر جو چیز مٹی میں دبادی گئی وہ محفوظ نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی قبر کھود کر کفن اتار کے لے آتا ہے تو وہ بھی سارق نہیں ہے۔ باہر کوئی باغ ہے، اس باغ میں کوئی پھل لگا ہوا ہے، چلتے ہوئے کسی مسافر نے پھل توڑ لیا، یا جنگل کے اندر بکریاں پھر رہی ہیں، وہاں کوئی نگران نہیں ہے، اور وہاں سے جاتے ہوئے کوئی بکری پکڑ کر لے گیا، یہ ساری کی ساری صورتیں ہیں جو شرعی طور پر ''سرقہ'' کے مفہوم میں نہیں آتیں، لہٰذا ان میں سے اگر کسی جرم کا کوئی شخص ارتکاب کرلے تو اس پر یہ حد نہیں لگے گی جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ الماری میں کوئی مال بند ہے تالا لگا ہوا ہے، کمرے میں بند ہے اور تالا لگا ہوا ہے، یا کوئی نگران موجود ہے پھر کوئی شخص نقب زنی کر کے یا چھپ کر دروازے میں سے داخل ہو کر، یا رات کی تاریکی میں مال اٹھا کر لے گیا، یہ شرعی طور پر ''سارق'' ہے، تو اس سارق پر تو حد لگے گی، یعنی اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا گٹ سے، تو یہ ہاتھ جو ہے یہاں سے کاٹ دیا جائے گا۔

---

(۱) موطا امام مالک کتاب السرقہ باب مالا قطع فیہ / موطا امام محمد کتاب الحدود کی پہلی حدیث۔

حدود ثابت ہونے کے بعد معاف نہیں ہوسکتیں

اور حد کا مسئلہ آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، کہ جس وقت یہ جرم حاکم کے سامنے ثابت ہوجائے، تو پھر حاکم کو بھی معاف کرنے کا حق نہیں ہے، نہ اس میں کسی قسم کی کوئی سفارش قبول کی جایا کرتی ہے۔ خود حدیث شریف میں واقعہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ مکہ معظمہ میں تشریف لائے جس وقت مکہ فتح ہوا تھا، اُس موقع کی بات ہے یا یہ حجۃ الوداع کی بات ہے، بہرحال آپ ﷺ مکہ میں تشریف لائے ہوئے تھے، ایک عورت بنو مخزوم میں سے جس کا نام فاطمہ ہے، اُس کو کچھ بُری عادت پڑی ہوئی تھی، لوگوں کا سامان لے لیتی مستعار، اور پھر دبالیتی اور انکار کردیا کرتی تھی، اس موقع پر وہ چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی، سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے مقدمہ ثابت ہوگیا، جس وقت مقدمہ ثابت ہوا تو آپ ﷺ نے قطع ید کا فیصلہ فرمادیا، تو چونکہ بنو مخزوم معزز خاندان تھا تو انہیں اس بارے میں بڑا خیال آیا کہ اگر ہماری لڑکی کا یوں ہاتھ کاٹ دیا گیا تو یہ تو بڑی رسوائی کی بات ہے، اس لئے کوئی تدبیر اختیار کرنی چاہیے کہ سرورِ کائنات ﷺ اس سزا کو معاف فرمادیں، لیکن بات کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا تھا، آخر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو آمادہ کیا گیا، چونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھے، حضور ﷺ ان سے محبت فرمایا کرتے تھے، روایاتِ حدیث میں ان کو حِبُّ رسولِ اللہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کا محبوب، محبوب کا بیٹا تھا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا، اُسے کہا گیا کہ تُو جاکر رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سفارش کر، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ گئے، جاکے اس سلسلے میں بات کرنا چاہی، تو سرورِ کائنات ﷺ غصے میں آگئے اور فرمایا کہ ''أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ'': اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے اندر سفارش کرتے ہو؟ پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوگئے کہ جب ان میں سے کوئی غریب آدمی مسکین آدمی چوری کرتا تھا اُس کو تو وہ سزا دے دیتے تھے، اور اگر کوئی شریف آدمی چوری کرلے، کوئی معزز آدمی چوری کرلے تو اُس کو سزا نہیں دیتے تھے، یہ جو انہوں نے قانون میں تفریق شروع کردی تھی، کہ امیر کے لئے قانون اور تھا، غریب کے لئے قانون اور تھا، یہی چیز ان کے لئے تباہی کا باعث بنی، اور مقصد یہ تھا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم بھی اسی طرح سے کریں کہ چونکہ یہ معزز خاندان کی عورت ہے اس لئے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ آگے آپ نے ایک بہت بڑا لفظ بولا جس میں نشاندہی ہوتی ہے، کہ اسلام میں قانون کی پابندی کی حیثیت کیا ہے، کہ اس میں امیر غریب کا فرق نہیں، چھوٹے بڑے کا فرق نہیں، خاندانی غیر خاندانی کا فرق نہیں، آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا''(۱) کہ فاطمہ بنت بنی مخزوم کی تم بات کرتے ہو، اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا چوری کرلیتی اور اسی طرح سے پکڑی جاتی تو میں تو اُس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا، جس سے معلوم ہوگیا کہ حاکم کو پھر معافی کا حق نہیں ہے، وہ معاف نہیں کرسکتا جس وقت کہ حد ثابت ہوجائے، نہ اس بارے میں کسی کے لیے سفارش کرنی جائز ہے، پھر اس حد کو جاری کیا جاتا ہے، حد کا مسئلہ تو یہ ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱/ ۴۹۳، باب حدیث الغار/ صحیح مسلم ۲/ ۶۴، باب قطع السارق الشریف/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۱۴، باب الشفاعۃ فی الحدود کی پہلی حدیث۔

”تعزیر“ کا اختیار حاکم کو دیا گیا ہے

اور ”حد“ کے علاوہ جو جرم سرقہ کی تعریف میں نہیں آتا، جس طرح سے لمبی فہرست آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئی، اگر ان جرموں میں سے کسی جرم کا ارتکاب کیا گیا تو اُس پر ”حد“ نہیں ہے، اس کے لئے ”تعزیر“ ہے، ”تعزیر“ یہ ایک سزا ہے جس کا اختیار حاکم کو دیا گیا ہے، اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے، اس میں سفارش بھی چل سکتی ہے، اور حاکم اس کو معاف بھی کر سکتا ہے، موقع محل کے مطابق جیسے مناسب ہو حاکم اس میں تصرف کر سکتا ہے، باقی ان جرائم پر جن کی فہرست آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے ”تعزیر“ ہے۔ ”تعزیر“ کے بارے میں اُصول یہی ہے کہ حکومت اگر یوں چھوڑ دے کہ حاکم مناسب سمجھ کر جیسے مصلحت ہو ویسے سزا دے دے، یا ایک فوجداری ضابطہ بنا دیا جائے کہ جس سے اس قسم کا جرم صادر ہو اس کو اتنی سزا دی جائے، اور وہ عدالتوں میں بھیج دیا جائے اور حاکم اس کے مطابق فیصلہ کرتا رہے، تو یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، تو جن کے متعلق ہم نے کہا کہ یہ چوری کی فہرست میں نہیں آتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت کی نظر میں جرم بھی نہیں ہیں، جرم ہیں لیکن ان پر ”حد“ نہیں، ان پر جو سزا آئے گی وہ حاکم کی صوابدید پر ہے، کہ جس طرح سے مناسب سمجھے جرم کی کمی بیشی کی طرف دیکھتے ہوئے، شدت اور خفت کی طرف دیکھتے ہوئے اس میں سزا تجویز کر سکتے ہیں، اس کو سزا اس طرح سے دی جائے گی، ”تعزیر“ کا مسئلہ اس طرح سے ہوا۔

”حدِ سرقہ“ پر اعتراض اور مدلل جواب

باقی بظاہر بددین قسم کے لوگ جس وقت بھی حدود کا تذکرہ آتا ہے وہ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے یہ سزائیں بہت سخت رکھی ہیں، کہ ایک آدمی چوری کرے اور اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، جرم تو اُس نے اتنا سا کیا ہے اور زندگی بھر کے لئے اُس کو ٹنڈا کر دیا، ہاتھ سے محروم کر دیا، تو یہ سزا جو ہے نعوذ باللہ! کبھی اس کو کہتے ہیں کہ یہ وحشیانہ سزا ہے، ظالمانہ سزا ہے، یا کہتے ہیں کہ یہ سزا بہت سخت رکھی گئی ہے، اس قسم کی باتیں فساق، فجار، کفار کی طرف سے ہر دور کے اندر کہی گئی ہیں، چنانچہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک عالم کے سامنے کسی زندیق نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلام کے آئین کے اندر بھی عجیب بے اعتدالی ہے، کہ اگر کوئی شخص ظلماً کسی کا ہاتھ کاٹ دے اور اُس کی دیت آ جائے تو دیت میں نصف دیت ادا کرتے ہیں، جیسے آپ نے کتابوں میں پڑھا کہ اگر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور قصاص والی صورت نہ ہو تو نصف دیت آیا کرتی ہے ایک ہاتھ کاٹنے پر، دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو پوری دیت آتی ہے، اور نصف دیت اگر دراہم کے ساتھ ادا کی جائے تو پانچ ہزار درہم ادا کرنا پڑتا ہے، یعنی اگر ایک ہاتھ کسی کا کٹ گیا اور دیت دینی پڑ گئی تو پانچ ہزار درہم، درہم چاندی کا ہوتا ہے تو اُس کی مالیت آج کل دیکھی جائے گی کہ کتنی مالیت بنتی ہے؟ ایک درہم تین ماشے سے کچھ زائد چاندی کا ہوتا ہے، تو وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی قیمت کے اندر تغیر تبدل ہوتا رہتا ہے، تو پانچ ہزار درہم چاندی کی مالیت کا حساب لگا کر پیسے ادا کئے جائیں گے، اور اگر اُونٹوں کے ساتھ ہو تو پانچ سو اُونٹ اس زمانے کے اعتبار سے۔ تو ایک جگہ تو ہاتھ کی قیمت اتنی زیادہ قرار دی، اور دوسری طرف اگر کوئی چوری کرلے تو چوری میں کتنی مقدار چوری کی جاتی ہے

تو ہاتھ کاٹا جاتا ہے، سب سے زیادہ وسعت اس بارے میں اَحناف ﷭ کے ہاں ہے، اَحناف نے مدار رکھا ہے دس دِرہم پر، کہ اگر دس دِرہم مقدار کوئی چوری کرے گا تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، یہ تقریباً پونے تین تولے چاندی بن جاتے ہیں، تو اگر سو روپے تولہ ہو تو تین سو روپے بن جائیں گے کچھ کم، اور اگر بیس روپے تولہ ہو تو ساٹھ روپے بن جائیں گے کچھ کم، یعنی چاندی کی قیمت کے اعتبار سے، دس روپے تولہ ہو تو تیس روپے سے کچھ کم بن جائیں گے، ہر زمانے میں چاندی کی مالیت دیکھی جائے گی، اس مالیت کے حساب سے تقریباً پونے تین تولے چاندی کی قیمت لگالی جائے گی، اور اس قیمت پر ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، یہ زیادہ سے زیادہ مقدار ہے کہ اتنی مقدار فقہاء میں سے کسی دوسرے نے نہیں کی، ورنہ شوافع ﷭، اِمام مالک ﷫ اور دیگر اَئمہ ﷭ میں سے کسی کے نزدیک تین دِرہم ہیں، کسی کے نزدیک چار دِرہم ہیں، اب تین دِرہم اور چار دِرہم آپ جانتے ہیں کہ یہ تو دس کے نصف سے بھی کم ہیں، تو حنفی جس وقت ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کرتے ہیں اُس وقت اُمت کے کسی فرد کو بھی اختلاف نہیں ہوتا کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹنا چاہیے، اور کوئی روایت اس کے خلاف نہیں ہوتی، لیکن اگر تین دِرہم پر مدار رکھا جائے تو چار دِرہم والی روایت اس کے خلاف ہے، چار دِرہم پر دار و مدار رکھا جائے تو جن روایات سے استدلال دس دِرہم کے لئے کیا جاتا ہے، وہ ٹکراتی ہیں، تو ہمارے ہاں اُصول ہے کہ شبہ پیدا ہو جانے کے بعد چونکہ حد ساقط ہو جاتی ہے، تو ہم نے یقینی سے یقینی مقدار پر مدار رکھا ہے، کہ اتنی مقدار پر اُس کا ہاتھ کاٹ دو، کہ جب وہ دس دِرہم کی چوری کرلے گا تو کوئی روایت خلاف نہیں، ہر روایت کا تقاضا ہوگا کہ ہاتھ کاٹ دیا جائے، اور کسی اِمام کا قول اس کے خلاف نہیں ہے، دس دِرہم کی چوری ہو جانے کے بعد پھر یہ مسئلہ متنازع فیہ نہیں رہتا، دس دِرہم سے کم مقدار میں چوری ہو جائے تو کسی نہ کسی درجے میں نزاع کی گنجائش ہے، اور دس دِرہم کے قیمت کے لحاظ سے، جیسے آج کل میں نے عرض کیا، ڈھائی سو کے قریب یا دو سو کے قریب بن جائیں گے، اور پانچ ہزار دِرہم کا اندازہ لگاؤ کہ ہزار ہا روپے بنتے ہیں، تو ایک جگہ تو ہاتھ کی قیمت دس دِرہم قرار دے دی، اور ایک جگہ ہاتھ کی قیمت پانچ ہزار دِرہم قرار دے دی، کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ ہاتھ ایک ہی ہے، ایک وقت میں اُس کی قیمت پانچ ہزار دِرہم ہے، اور ایک وقت اس کی قیمت دس دِرہم ہے، تو جس وقت اس عالم کے سامنے یہ بات آئی تو وہ کہنے لگے بالکل انصاف کا تقاضا اسی طرح سے ہے، کہ جس وقت یہ ہاتھ ''اِذَا کَانَتْ اَمِیْنَۃً کَانَتْ ثَمِیْنَۃً'' جب یہ ہاتھ امانت دار تھا اس وقت یہ قیمتی تھا، جب اس کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی دوسرے نے زیادتی کی ہے، یہ مظلوم ٹھہرا، یہ امانت دار تھا، امین تھا، ''کانت ثمینۃ'' اس وقت یہ قیمتی تھا، ''اذا خَانَتْ ھَانَتْ''[1] جب یہ خیانت کر بیٹھا اور یہ ہاتھ کسی دوسرے کے مال کی طرف بڑھ گیا تو خائن ہونے کے بعد یہ ذلیل ہو گیا، اب اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، جس وقت اس نے خیانت کا صدور کیا، مسلمان کے مال کی طرف یہ ہاتھ خفیۃً بڑھا ہے تو اب اس ہاتھ کا مسلمان کے بدن کے ساتھ رہنا شریعت گوارا نہیں کرتی، اس قسم کے خائن عضو کو اڑا دیا جاتا ہے اس انداز کے ساتھ انہوں نے اس اعتراض کو دفع کیا۔ لیکن ویسے ہی اگر آپ عقل کے ساتھ سوچیں کہ سزا جو کسی جرم پر تجویز کی جایا کرتی ہے اس کا جاری کرنا مقصود نہیں ہوتا، جرم سے روکنا مقصود

(۱) دیکھیں: تفسیر ابن کثیر مقام ہذا۔ ولفظہ: فَکَانَ جَوَابُ الْقَاضِیْ عَبْدِ الْوَھَّابِ الْمَالِکِیْ رحمہ اللہ ان قال: لما کانت امینۃ کانت ثمینۃ، ولما خانت ھانت.

ہوتا ہے، اگر سارے کے سارے لوگ اس جرم کو چھوڑ دیں تو سزا کسی کو بھی نہیں ہوگی، اگر کوئی اس بات سے بچنا چاہتا ہے کہ میں لنڈا نہ ہو جاؤں تو اُسے چاہیے کہ چوری نہ کرے، یہ شریعت کا مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کے ہاتھ کاٹے جائیں، یا شریعت کا مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو سنگسار کیا جائے اور اس طرح سے مارا جائے، شریعت کا مقصد تو جرائم سے روکنا ہے، اگر کوئی شخص جرم نہیں کرتا تو اُس کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا، اگر کوئی شخص زنا نہیں کرتا تو اُسے سنگسار بھی نہیں کیا جائے گا، تو جب جرم سے روکنا مقصود ہے تو پھر اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ سزا جتنی سخت تجویز کی جائے اتنی ہی مفید ہوتی ہے، اور اگر سزا ایسی تجویز کریں جو قابلِ برداشت ہے، اور دوسرا آدمی اُس کو آسانی کے ساتھ برداشت کرلے تو وہ سزا جرم سے روکنے کے لئے کافی نہیں ہوتی، جیسے کہ آج کا آئین آپ کے سامنے ہے، سزائیں بھی ہیں، سب کچھ ہے، لیکن وہ سزائیں ہیں کہ چند دِن کے لئے جیل بھیج دیا، یا تھوڑا بہت کوئی جرمانہ کردیا، تو جو شخص اس کو برداشت کرنے کی اپنے اندر ہمت پاتا ہے وہ اس جرم پر جری ہو جاتا ہے اور جرم کا ارتکاب کرلیتا ہے، دس دفعہ پکڑے ہوئے جائیں گے، جیل کے اندر مزے کے ساتھ وقت گزار کر آجائیں گے، اور پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہوکر آتے ہیں، کیونکہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس جرم کرنے میں لطف اتنا ہے، اور اگر کبھی پکڑے گئے تو سزا اتنی سی ہے جو برداشت کی جاسکتی ہے، تو لہٰذا جرم کو وہ کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟

لطیفہ

پچھلے دنوں ایک لطیفہ سُنا تھا، بس ایک لطیفے کی بات ہی ہے، حقیقت کے اعتبار سے تو یہ ''کثیفے'' ہیں، ''لطیفے'' کیا ہیں! کہتے ہیں کہ کالج میں ایک دفعہ ایک لڑکے نے ایک لڑکی کو پکڑ کر زبردستی اُس کا بوسہ لے لیا، پرنسپل کے سامنے شکایت چلی گئی تو اُس نے لڑکے کو بھی بُلایا اور لڑکی کو بھی بُلایا، بات پوچھی، لڑکے نے اقرار کرلیا کہ ہاں میں نے یہ جرم کیا ہے، تو پرنسپل نے ایک سو روپیہ اُسے جرمانہ کیا، کہتے ہیں کہ وہیں دفتر میں کھڑے کھڑے وہ دو سو روپے جیب سے نکالتا ہے، ایک سو اس کی میز پر رکھتا ہے کہتا ہے، جی! یہ تو پچھلے کی سزا ہے، اور ایک سو پیشگی ہے، دوبارہ پکڑ کر اُس نے وہیں ایک اور بوسہ لے لیا۔ یعنی اب اس قسم کے جرم کی سزا ایسی رکھی جائے، یعنی سو روپیہ تو دیا پچھلے جرم کا، جب یہ تجویز ہوگئی کہ بوسہ کی قیمت سو روپیہ ہے، تو سو تو پہلے کا دے دیا اور دوسرا نوٹ میز پہ رکھ کے کہتا ہے جی! یہ سو پیشگی، اور وہیں پرنسپل کے سامنے پکڑ کر دوسرا بوسہ لے لیا۔ اب اس قسم کی سزائیں اگر تجویز کی جائیں، کہ جو دوسرا آدمی خوشی کے ساتھ برداشت کرلے تو بھلا جرم کس طرح سے چھوٹ سکتا ہے؟

''حدود'' کی اہمیت اور منکر کا حکم

اور آج یہ مہذّب سزائیں جو ہیں وہ اس قسم کے وحشی جرائم کو ختم کرنے کے لئے ناکام ہوگئیں، دنیا ساری کی ساری جہنم کدہ بن گئی انہی وحشی جرائم کی بنا پر، تو جس وقت یہ جرم وحشی ہے تو پھر یہ مہذّب سزا اس کو روکنے کے لئے کیسے کافی ہوسکتی ہے؟ اور یہ سزا اگر جاری کی جائے تو اس کے نتیجے میں ایک دو کے ہاتھ کٹنے کے بعد اگر ملک میں امن اور سکون پیدا ہو جائے، لوگوں کا مال

محفوظ ہو جائے، تو ایک دو ہاتھ کٹنے کے بعد معاشرے کا سدھر جانا یہ سستا سودا ہے، یہ مہنگا سودا نہیں ہے، باقی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ ہاتھ نہ کٹے تو وہ چوری نہ کرے، ہاتھ کاٹنا مقصود نہیں، چوری سے روکنا مقصود ہے، اور یہ ایک سزا ایسی ہے کہ جس کو واقعتاً اگر نافذ کر دیا جائے دیانت داری کے ساتھ، تو پھر یہ سارے کے سارے جرائم ختم ہو سکتے ہیں، اور بظاہر چوری دیکھنے میں ایک معمولی سی بات ہے، لیکن یہ معمولی بات نہیں، معاشرے کے اندر بدنظمی بے اطمینانی بے چینی اکثر و بیشتر اسی چوری کے نتیجے میں ہے، لڑائیاں ہوتی ہیں، قتل غارت تک نوبت پہنچتی ہے، مالی نقصان ایک دوسرے کا ہوتا ہے، پکڑ دھکڑ، یہ کتنا سارا سلسلہ چلتا ہے، تو اس جرم کے روکنے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے تجویز کردہ سزا ہی مؤثر ہو سکتی ہے، اور اپنے طور پر نرم سزائیں اس جرم کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے یہ سزا بالکل موزون ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعیت کے طور پر کتاب اللہ میں ذکر کر دی گئی، اب جو شخص اس سزا کو وحشی سزا کہے، کہنے والا چاہے مسلمان ہو، لیکن اس کہنے کے بعد وہ کافر ہو گیا، قرآنِ کریم کی قطعیت کا انکار ہے، اور بااختیار ہونے کے بعد اگر کوئی اس قسم کی سزائیں جاری نہیں کرتا تو وہ فاسق یقیناً ہے۔

فعلِ سرقہ کی نسبت پہلے مَرد کی طرف اور فعلِ زِنا کی نسبت پہلے عورت کی طرف کیوں؟

وَالسَّارِقُ: اس میں ابتداءً مذکر کا صیغہ ذکر کیا، چوری کرنے والا مَرد، اور بعد میں ذکر کیا عورت کا۔ اور سورۂ نور میں جہاں زنا کا مسئلہ مذکور ہوگا: ''اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ'' وہاں عورت کا ذکر پہلے ہے، مَرد کا ذکر بعد میں ہے، یہ دونوں قسم کی تعبیر جو قرآنِ کریم نے اختیار کی، کہ ایک جرم کا ذکر کرتے ہوئے مذکر کو پہلے ذکر کیا اور مؤنث کو بعد میں، اور دوسرے جرم کا ذکر کرتے ہوئے عورت کو پہلے ذکر کیا اور مَرد کو بعد میں، تو کہتے ہیں کہ دونوں جرموں کی نوعیت ایسی ہے کہ مَرد حوصلے والا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو کمانے کی صلاحیت دی ہے، محنت کر سکتا ہے، مشقت کر سکتا ہے، تو چوری مَرد کی طرف سے زیادہ قبیح ہے بمقابلہ عورت کے، اس لئے اس کا ذکر پہلے کیا۔ اور زنا کا تعلق بے حیائی کے ساتھ ہے، اور حیا کا غلبہ مَرد کے مقابلے میں عورت کی طبیعت پر زیادہ ہوتا ہے، تو اس فعل کا صدور عورت کی طرف سے زیادہ قبیح ہے، تو سرقہ مَرد کی طرف سے زیادہ قبیح ہے، اس لئے اُس کا ذکر یہاں آ گیا امامت کے درجہ میں، اور زنا عورت کی طرف سے زیادہ قبیح ہے تو وہاں آیت میں ابتداءً عورت کو ذکر کر دیا، تو دونوں قسم کے عنوان میں فرق ڈالنے کی وجہ یہ ہے، کہ جس جرم کے اندر جس شخص کی طرف نسبت کرتے ہوئے قباحت زیادہ ہے، اس کو اوّلیت دے دی گئی، تو یہاں مَرد کو اوّلیت دی گئی اور وہاں عورت کو اوّلیت دی گئی۔

نحوی قاعدہ

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا: ان کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔ ایدی یہ جمع ہے، اور ''ھُمَا'' یہ تثنیہ ہے، اور نحو کے اندر آپ نے قاعدہ پڑھا ہے، کہ جس وقت مضاف مضاف الیہ کا جزء ہو تو پھر تثنیہ کو اگر تثنیہ کی طرف مضاف کر دیا جائے تو پہلے جزء کو جمع کر کے ذکر کیا جاتا ہے، یہاں بھی ''ید'' یہ ''ھما'' کا جزء ہے، ہدایۃ النحو میں آپ نے مثال پڑھی ہوگی فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا، وہاں ''کما'' کی طرف

قلوب کو منسوب کیا گیا ہے تو وہاں بھی یہی بات ہے، اسی طرح سے یہاں آ گیا اَیْدِیَهُمَا، اس میں تثنیہ کی اضافت تثنیہ کی طرف کرنی تھی، کہ ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، لیکن مضاف چونکہ مضاف الیہ کا جزء ہے، ایسے وقت میں پہلے جزء کو جمع کے طور پر ذکر کر دیا گیا۔

ہاتھ کون سا کاٹا جائے گا؟

قرآنِ کریم نے یہاں اَیْدِیَ کا مصداق متعین نہیں کیا، کہ کون سا ہاتھ کاٹنا ہے؟ اور کتنی چوری کی مقدار پر کاٹنا ہے، یہ ساری کی ساری تفصیلات حدیث شریف سے ماخوذ ہوں گی، اور سرورِ کائنات ﷺ کا عمل اور آپ ﷺ کے اقوال اس آیت کی تشریح بنیں گے، اس قسم کی جتنی بھی آیتیں ہیں یہی دلالت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کے اقوال افعال احوال جتنے بھی ہیں وہ حجت ہیں، کہ جب تک ان کو سامنے نہ رکھا جائے اُس وقت تک قرآنِ کریم کی آیات کی تفصیل نہیں کی جاسکتی، تو حدیث میں آ گیا کہ اَیْدِیَهُمَا سے دایاں ہاتھ مراد ہے، اور کاٹنا بھی اس کو گٹ سے ہے، یہاں سے اس کو کاٹ دیا جائے گا، ورنہ ید کا لفظ انگلیوں سے لے کر کندھے تک بولا جاتا ہے، لیکن سرورِ کائنات ﷺ نے جس کا ہاتھ کاٹا وہ گٹ سے کاٹا ہے، جس میں ہتھیلی اور انگلیاں آجاتی ہیں۔ جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا: کیوں کاٹ دیا جائے؟، کاٹنے کی وجہ؟ یہ اُن کے کردار کا بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے۔

بار بار چوری کرنے والے کا حکم

اور نکال کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سزا کے اندر یہ چیز ملحوظ ہے کہ اس کے جاری ہونے کے بعد لوگ عبرت پکڑیں اور اس جرم سے رُک جائیں، پھر اس کے اوپر اضافہ حدیث شریف میں یہ بھی ہوا، کہ اگر پہلی دفعہ چوری کی ہے تو دایاں ہاتھ کاٹ دیں گے، اور اگر دوبارہ چوری کی ہے تو اُس کا ذکر یہاں قرآنِ کریم میں نہیں، جب ''اید ی'' کا مصداق یمین متعین کر دیا گیا تو یمین تو بدن میں ایک ہی ہے، تو جب وہ دوبارہ چوری کرے گا تو دوبارہ چوری کرنے کے بعد دایاں ہاتھ تو کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ تو پہلے ہی اُڑ چکا، اور بایاں ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ پھر دونوں ہاتھ کٹ جانے کے بعد کلیۃً ایک فنائیت آجاتی ہے، گویا کہ اس کے وجود کو فنا ہی کر دیا گیا، دونوں ہاتھ ہی اگر نہ ہوں تو زندگی ختم کرنے والی بات ہے، ایسا بھی نہیں، کیونکہ جرم کی سزا ایسے طور پر دینی مقصود ہے کہ جرم چھوٹ جائے، باقی! وہ انسان کسی نہ کسی درجے میں زندگی سے فائدہ بھی اُٹھاتا رہے، اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے، کہ پھر اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا، دونوں ایک جانب کے نہیں کاٹیں گے کہ دونوں ایک جانب کے کٹے ہوئے ہوں، تو بھی چلنا ہی مشکل ہے، باقی ضروریات پوری کرنی مشکل ہیں، تو دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں۔ اور اگر وہ تیسری دفعہ چوری کر لیتا ہے، تو پھر باقی ائمہ کے نزدیک تو اس تیسری دفعہ چوری کرنے کے نتیجے میں اُس کا بایاں ہاتھ کاٹ دیں گے، اور اگر وہ چوتھی دفعہ چوری کرتا ہے تو پھر اُس کا دایاں پاؤں کاٹ دیں گے، اس کے چاروں عضو ہی کٹ جائیں گے، اور اگر اس کے بعد بھی باز نہیں آتا تو تعزیراً اس کو قتل کیا جاسکتا ہے، لیکن اَحناف کے ہاں، ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کٹنے کے بعد پھر عضو کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ دونوں ہاتھ کٹ جائیں تو بھی ایک قسم کی فناء ہے، دونوں پاؤں کٹ جائیں تو بھی ایک قسم کی فناء ہے، ہاں! البتہ اس کو تعزیر کے طور پر جیل میں ڈال دیں گے، تکلیف پہنچائیں گے، ماریں گے،

پٹائی کریں گے، حتیٰ کہ اُس کے اُوپر صلاحیت کے آثار نمایاں ہو جائیں پھر اُس کو چھوڑ دیں گے ورنہ وہیں پڑا پڑا مرجائے، اور اگر وہ شرارت سے باز نہیں آتا تو تعزیر کی حدود تو حاکم کے لئے وسیع ہیں، کہ ایسی صورت میں وہ پھانسی بھی دے سکتا ہے، اور اُس کو قتل بھی کرسکتا ہے، تعزیر کی حدود متعین نہیں ہیں، وہ مصلحت کے مطابق کسی شخص کے اندر خبث محسوس کرتا ہوا اُس کے اندر خباثت کو دیکھتا ہوا سخت سے سخت سزا بھی دے سکتا ہے، یہ تفصیل بھی حدیث شریف سے معلوم ہوگی، قرآنِ کریم کے اندر اس سے زیادہ تفصیل نہیں ہے۔ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ: یہ صفت کا ذکر آ گیا، پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے کہ اَحکام کے بعد جو صفات آیا کرتی ہیں اُس میں اللہ تبارک وتعالیٰ اَحکام کی وقعت قلوب میں بٹھاتے ہیں، کہ اللہ زبردست ہے اس لئے جو حکم چاہے دے، اور اس کا حکم جو بھی ہوگا وہ حکمت پہ مبنی ہے، اس لئے بندہ ہونے کی حیثیت سے ماننا ضروری، اور اُس کو حکمت کے مطابق جاننا ضروری، اس لئے اللہ تعالیٰ کی تجویز کردہ یہ سزا حکمت کا تقاضا ہے۔

''حدود'' گناہ کے لئے کفّارہ ہیں یا نہیں؟

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ: جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرلے اور اپنے حال کو درست کرلے پس بیشک اللہ اُس پر متوجہ ہوگا، تو یہ آیت بھی ان آیات میں سے ہے جن سے اَحناف استدلال کیا کرتے ہیں کہ حد لگنا گناہ کے معاف ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، آخرت کے عذاب سے انسان نہیں بچے گا، تو حد کی حیثیت دنیا کے اندر زجر کی ہے، جرم سے روکنا مقصود ہے، باقی آخرت میں گناہ بھی معاف ہوگا یا نہیں ہوگا، وہ اس کی اپنی قلبی کیفیت پر ہے، اگر تو اس سزا کے جاری ہوجانے کے بعد قلب میں وہ نادم ہوگیا، کہ میں نے بہت بُرا کام کیا، دیکھو! دنیا کی رسوائی بھی ہوئی اور آخرت کی رسوائی بھی ہوسکتی ہے، دل سے اگر نادم ہوگیا پھر تو گناہ بھی معاف ہوجائے گا، اور اگر وہ حد جاری ہوجانے کے بعد بھی اپنے دل کے اندر اُسی قسم کا حوصلہ رکھتا ہے، اور دوبارہ اسی جرم کے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، دل کے اندر وہ نادم نہیں ہوا، ایسی صورت میں پھر اُس کا گناہ معاف نہیں ہوتا، بلکہ آخرت میں اُس کو سزا ہوگی، چنانچہ اس حد کے جاری ہونے کے بعد پھر یہاں توبہ کا ذکر آیا ہوا ہے، اس سے اَحناف کے اس مسئلے کی تائید ہوتی ہے، ''جو توبہ کرلے اپنے ظلم کے بعد اور اپنے حال کو درست کرلے'' فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ: پھر اللہ تعالیٰ اُس پر متوجہ ہوں گے اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اَحکام کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے قدرتِ اِلٰہی کا ذِکر

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے مخاطب! کیا تُو جانتا نہیں کہ بیشک اللہ، اُسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، جب سلطنت کا مالک وہی ہے، بادشاہ وہی ہے تو جو قانون وہ بنائے اُس کو حق ہے، اور زمین وآسمان کے اندر بسنے والوں کو اُس کے قانون پر مطمئن ہونا ضروری ہے، اور اُس کے اَحکام کی اِتباع ضروری ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے اَحکام پسند نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے آئین کی تم پابندی نہیں کرنا چاہتے، اللہ تعالیٰ کی حکومت تمہیں گوارا نہیں، اور اس کا قانون تمہیں سازگار نہیں، تو اُس کی سلطنت سے باہر چلے جاؤ، زمین وآسمان چھوڑ کر کوئی اور دُنیا بسالو، اگر جاسکتے ہو، اور اگر تم اُس کی حدود سے

باہر نہیں جا سکتے، تم نے یہیں رہنا ہے، تو پھر جس کی سلطنت ہے بھائی! اُس کے آئین کی پابندی بھی کرنی پڑے گی۔ اَلَمْ تَعْلَمْ: کیا آپ کو معلوم نہیں، اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کہ اللہ، اُسی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ: عذاب دے گا جس کو چاہے گا، وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ: بخشے گا جسے چاہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کے مختار مطلق ہونے کی طرف اشارہ ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلاتمیز جس کو چاہے عذاب میں ڈال دے، جس کو چاہے بخش دے یہ مقصد نہیں ہوتا، میں نے کئی دفعہ آپ کے سامنے وضاحت کی ہے، یہاں اللہ تعالیٰ اپنے اختیار کو ذکر فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی کو معاف کروں تو درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، میں کسی کو عذاب دُوں تو درمیان میں کوئی کسی قسم کی آڑ نہیں قائم کرسکتا، میں جسے چاہوں عذاب دُوں کوئی روکنے والا نہیں، جسے چاہوں معاف کردُوں کوئی اعتراض کرنے والا نہیں، لیکن عذاب کسے دُوں گا؟ جو کہ میرے آئین کے پابند نہیں ہوں گے، معاف کسے کروں گا؟ بخشوں گا کسے؟ جس نے میرے اَحکام کی رعایت رکھی ہوگی، یعنی اللہ کا عذاب دینا اور اللہ کا بخشا ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حکمت اور قانون کے تحت، جو اللہ نے اپنی کتاب کے اندر واضح کردیا، باقی لِمَنْ يَّشَآءُ کا لفظ جو ہے، يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ، يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کارگر صرف میری مشیت ہوگی، دوسرا کوئی شخص میرے فیصلے میں تبدیلی نہیں کرواسکتا، کہ میں عذاب دینا چاہوں کوئی دوسرا شخص مجھے مجبور کردے عذاب نہ دینے دے، یا میں کسی کو بخشا چاہوں تو کوئی آدمی رُکاوٹ بن جائے بخشنے نہ دے، ایسی کوئی بات نہیں، یہ عذاب کا سلسلہ مغفرت کا سلسلہ جو ہوگا سب میری مشیت پر ہے، میں جیسے چاہوں گا کروں گا، لیکن کروں گا کیسے؟ جیسے کہ اس نے اپنی کتاب میں واضح کردیا، کہ جو اس قسم کے کام کرے گا اُس کو میں عذاب دُوں گا، اور جو اس قسم کے کام کرے گا اسے میں بخش دُوں گا، تو جو فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ فرمائیں، چاہے کسی کو عذاب دینے کا، چاہے کسی کو بخشنے کا، مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے درمیان میں رُکاوٹ پیدا نہیں کرسکتا، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

سوال جواب:- آپ کا سوال یہ ہے کہ حدیث شریف تو ظنی ہوتی ہے اور قرآنِ کریم قطعی ہے، اور اگر حدیث شریف کے ساتھ قرآنِ کریم کی تفسیر کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قطعی کو ہم نے ظنی بنادیا، اس لئے حدیث شریف کے ساتھ قرآنِ کریم کی تفسیر درست نہیں ہونی چاہیے، یہ جیسے سرقہ کے مسئلے میں قطعِ ید کے مسئلے میں میں نے تفصیل احادیث کی روشنی میں کی ہے، تو یہ گویا کہ ظنی کو قطعی پر حاکم بنادینے والی بات ہے، یہی ہے آپ کا سوال؟ تو اَصل بات یہ ہے کہ ہماری فقہ کے اندر ایک ضابطہ لکھا ہوا ہے، کہ کتابُ اللہ پر زیادتی خبرِ واحد کے ساتھ دُرست نہیں، اور اس کی وجہ یہی بیان کرتے ہیں کہ خبرِ واحد ظنی ہوتی ہے اور کتابُ اللہ قطعی ہے، اور اگر ہم اس خبرِ واحد کے ساتھ کتابُ اللہ پر زیادتی کردیں گے، اور جو مسئلہ کتابُ اللہ سے ثابت ہے اور جو خبرِ واحد سے ثابت ہے دونوں کو ایک درجہ دے دیں گے، تو ایسی صورت میں ظنی اور قطعی میں کوئی فرق نہیں رہتا، بلکہ ظنی کو بھی قطعی کے ساتھ ملا کر یا قطعی کو ظنی بنالیا یا ظنی کو قطعی بنالیا، بہرحال فرقِ مراتب نہیں رہا، ہماری فقہ کے اندر مسئلہ اسی طرح سے لکھا ہوا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں قرآنِ کریم کا مفہوم بالکل واضح ہے، اور اس مفہوم پر عمل کرنے میں ہمیں کسی قسم کا کوئی اشکال

نہیں، پھر اس سے ایک زائد چیز حدیث شریف سے ثابت ہوتی ہے، اور وہ حدیث ہے ظنی، خبرِ واحد، تو ہم قرآنِ کریم کے مفہوم کو قطعیت کے درجے میں رکھیں گے، اس کا جو منکر ہوگا وہ کافر، اور جو بات حدیث شریف سے ثابت ہوگی اُس کو ظنی درجے میں رکھیں گے، اس کا وہ درجہ نہیں ہوگا جو قرآنِ کریم سے ثابت ہوا ہے۔ اسی لئے شیخنا الانور (حضرت کشمیری) رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حنفیوں کا یہ عنوان مُوحِش ہے، کہ دوسرا آدمی سُن کر اس سے گھبراتا ہے کہ یہ حدیث کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کرتے، حالانکہ حدیث تو قرآنِ کریم کی تشریح کرتی ہے، تو کہتے ہیں یہ عنوان ایسا ہے کہ جس کو سُن کر دوسرا آدمی کچھ وحشت زدہ سا ہو جاتا ہے، جب کہ شوافع کا عنوان یہ ہے کہ خبرِ واحد کے ساتھ بھی کتاب اللہ پر زیادتی ہو سکتی ہے، مسئلہ وہ ہوگا جو کتاب اللہ اور حدیث کو ملا کر ثابت ہوگا، جیسے اُس کی مثال آپ کے ہاں ذکر کی جاتی ہے: فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (سورۂ نور: ۲) کہ زانی مرد ہو یا عورت ہو، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارا کرو، اور حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے ''جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ''[۱] ان کو سال بھر کے لئے علاقے سے بھی نکال دیا کرو، جس کی صورت یہ ہے کہ جیل میں بھیج دو، اب یہ ''تَغْرِيبُ عَامٍ'' کا اضافہ ہے، ''جَلْدُ مِائَةٍ'' میں کوئی اِشکال نہیں کہ جس کی وضاحت تغریبِ عام کے ساتھ کرنی ہے، تو ان کے نزدیک یہ دونوں مل کر زِنا کی سزا بن گئی، حد کا جزء بن گئی یہ سو کوڑے مارنا بھی اور جلاوطن کرنا بھی، اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو حیثیت سو کوڑے کی ہے وہی حیثیت تغریبِ عام کی یعنی جلاوطن کرنے کی ہے، تو یہاں ظنی کا مرتبہ جو تھا اُونچا کر کے قطعی کے برابر کر دیا گیا۔ ہمارے ہاں یہ عنوان نہیں ہے، ہم کہتے ہیں کہ تغریبِ عام چونکہ حدیث شریف سے ثابت ہے اور وہ حدیث ظنی ہے، اس کا وہ درجہ نہیں ہو سکتا جو ''جَلْدُ مِائَةٍ'' کا ہے، تو ''جَلْدُ مِائَةٍ'' ''حد'' ہے اور ''تغریبِ عام'' ''تعزیر'' ہے، حاکم سو کوڑا معاف نہیں کر سکتا، لیکن مناسب سمجھے تو تغریبِ عام کے اندر تغیّر کر سکتا ہے، دونوں کے درجے ہم نے علیحدہ علیحدہ کر دیئے، تو سیّد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے خبرِ واحد کو قبول تو کر لیا اور زیادتی تو کر دی چاہے تعزیر کے درجے میں ہی سہی، (ان کے قول کی وضاحت کر رہا ہوں کہ ان کا مفہوم یہ ہے) تو پھر یہ کہنا کہ کتاب اللہ پر زیادتی دُرست نہیں، یہ خواہ مخواہ کا عنوان ایسا ہے جس سے سننے والا گھبراتا ہے، بلکہ عنوان اس میں یہ ہونا چاہیے کہ کتاب اللہ پر زیادتی خبرِ واحد کے ساتھ درست ہے، لیکن درجہ وہ نہیں جو کتاب اللہ سے ثابت شدہ حکم کا ہوتا ہے، یعنی مثبت عنوان اختیار کر لو کہ زیادتی ہو جاتی ہے کتاب اللہ پر، لیکن دونوں کا درجہ علیحدہ علیحدہ ہوگا، تو خواہ مخواہ ایسا عنوان قائم کر کے ٹکراؤ پیدا کر لینا یہ بلاوجہ کی لڑائی ہے، زیادتی ہم بھی کرتے ہیں لیکن دونوں کے درجے کو ممتاز کرتے ہیں، کہ جو کتاب اللہ سے ثابت ہوگا اُسے قطعی کہیں گے جس میں تغیّر تبدل کی گنجائش نہیں، جو اُس کا انکار کرے گا تو کافر ہوگا، اور جو بات حدیث شریف سے ثابت ہوگی اُس کو بھی مانیں گے لیکن اس کا درجہ دوسرا رکھیں گے، جس کی بناء پر نہ اس کا اِنکار کُفر ہے، اور نہ اس کی وہ حیثیت ہے جو کتاب اللہ سے ثابت شدہ چیز کی ہے، اس طرح سے دو درجے نکل آئیں گے۔ لیکن اگر قرآنِ کریم کے اندر ایک لفظ آیا ہوا ہے اور اُس کی مراد واضح نہیں، اور اس وقت تک اُس پر عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سرورِ کائنات ﷺ کی تشریح کو ساتھ نہ لے لیا جائے، اس قسم کا اِجمال جو قرآنِ کریم میں آیا ہے اُس کی تشریح کے طور پر جو حدیث آئی ہے چاہے وہ اصل کے اعتبار سے خبرِ واحد ہی ہو، لیکن وہ اپنے

(۱) صحیح البخاری ۲/۱۰۱۰ باب البکران یجلدان وینفیان/مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۰۹، کتاب الحدود، فصل اول، عن زید بن خالد۔

اس مجمل کی تشریح ہو جانے کے بعد قطعیت کا درجہ اختیار کر جائے گی، مثال کے طور پر کتاب اللہ میں آ گیا: ''اٰتُوا الزَّکٰوۃَ'': زکوٰۃ دیا کرو۔ یہ حکم قطعی ہے، لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی مراد واضح نہ ہو کہ زکوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ کس چیز میں سے دینی ہے؟ کتنی مقدار دینی ہے؟ اس پر عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کی یہ تشریح نہ لیں، تو پھر یہ تشریح اگرچہ اَخبارِ آحاد کے اندر ذکر کی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ قرآنِ کریم کے اس اجمال کی تشریح ہے، لہٰذا وہ تفصیل جو بھی آئے گی وہ سب قطعی ہے، اب اگر کوئی چالیسویں حصے کا انکار کرتا ہے، یا گائے بھینس کی زکوٰۃ میں جو مقدار اَحادیث میں ذکر کی گئی ہے اگرچہ وہ اَخبارِ آحاد کے ساتھ ثابت ہو، اُس کا انکار کرتا ہے تو یہ ایسا ہوگا گویا کہ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا انکار ہے، وہاں یہ تشریح جو ہے یہ قطعیت اختیار کر جائے گی، کہ اس کے بغیر قرآنِ کریم کے لفظ پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اور سو کوڑے مارنا، اس میں کوئی اجمال نہیں کہ سو کوڑے مار سکتے ہیں، اور اسی طرح سے یہاں آ گیا، یہ سرقہ کا مفہوم، کتنی مقدار کی چوری ہوگی کتنی کی نہیں ہوگی، اور ہاتھ کون سا کاٹنا ہے؟ کہاں سے کاٹنا ہے؟ جس وقت تک یہ تفصیلات ہمارے سامنے نہیں آئیں گی اس وقت تک اُس پر عمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا مقدار کے لحاظ سے کہ ہاتھ کی مقدار کیا کاٹنی ہے؟ اب یہی قطعی صورت ہے جس کے اندر تغیر تبدل کرنے کی اجازت نہیں، تو یہ دو باتیں ہو گئیں، ایک ہے کہ قرآنِ کریم کا مفہوم واضح ہے اُس پر عمل ہو سکتا ہے، پھر اَخبارِ آحاد کے ساتھ جو کچھ ثابت ہوگا ہم اُس کے ساتھ اس مسئلے پر زیادتی کریں گے لیکن دوسرے نمبر پر، ان دونوں کا درجہ ایک نہیں قرار دیں گے، اور اگر وہ بات قرآنِ کریم میں اس انداز سے ذکر کی گئی ہے کہ اُس پر عمل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ حدیث کی تشریح کو قبول نہ کیا جائے، تو وہاں جو حدیث سے تشریح ثابت ہوگی وہ قطعیت کے درجے میں آئے گی، یوں سمجھو کہ قرآنِ کریم کے اجمال کی ہی تفصیل کی گئی ہے، جو حکم قرآن سے نکلا وہی حدیث میں واضح کیا گیا ہے، تو گویا کہ وہ مقدارِ زکوٰۃ کی جو روایات ہیں وہ یوں سمجھو کہ کا: اٰتُوا الزَّکٰوۃَ مصداق ہیں، اس لئے اُس کا انکار نہیں کر سکتے، اب اگر کوئی سونے کی زکوٰۃ کا چاندی کی زکوٰۃ کا انکار کرے کہ چالیسواں حصہ نہیں دیا جائے گا، قرآنِ کریم نے تو اٰتُوا کہا ہے، یہ اسی طرح سے کافر ہے جس طرح سے کوئی سرے سے اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا انکار کرے۔ یہی حیثیت ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کی کہ نماز قائم کرو، کس طرح سے پڑھنی ہے؟ کن اوقات میں پڑھنی ہے؟ کتنی رکعت پڑھنی ہے؟ جس وقت تک یہ تفصیل نہیں لی جائے گی اس وقت تک اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ پر عمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس کے اوقات بھی قطعی ہیں، اس کی رکعات بھی قطعی ہیں اور جو تفصیلات آپ کے سامنے آئی ہوئی ہیں، حدیث شریف میں اگر ایک ہی صورت متعین ہے تو وہ قطعی ہے، دو صورتیں ہیں تو چاہے اس طرح سے کر لو، چاہے اس طرح سے کر لو، اس کا درجہ اس طرح سے نکل آئے گا، یعنی بالا جمال کیفیت قطعی، آگے حضور ﷺ کے اختیار دینے کے ساتھ اگر دو اختیار ہیں تو دو پہ عمل کیا جا سکتا ہے، چار ہیں تو چار پہ عمل کیا جا سکتا ہے، بہر حال یہ تشریح ساری کی ساری اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے درجے میں ہوگی، تو یہ فرق ہو جائے گا، ہر جگہ یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ حدیث ظنی کے ساتھ اگر قرآنِ کریم کی تفصیل کی جائے تو قرآنِ کریم قطعی کو ظنی بنانے والی بات ہے، یہ کلیہ نہیں ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ماقبل سے ربط

اگلی آیات میں اہلِ کتاب کا تذکرہ آرہا ہے، سورت کی ابتدا میں بھی چند رُکوع کے بعد ان کا ذکر شروع ہوا تھا، پھر بعض مناسبات کے ساتھ دیگر مضامین آتے چلے گئے، اب آگے پھر اہلِ کتاب کا ذِکر شروع ہو رہا ہے، اور سورت کے اختتام تک تقریباً مختلف پہلوؤں سے اِنہی کا ذِکر ہی آئے گا۔

آیات کا شانِ نزول

مدینہ منوّرہ میں سرورِ کائنات ﷺ تشریف لے گئے تو وہاں یہود کے دو مشہور قبیلے تھے بنوقُریظہ اور بنونضیر، اور قبائل بھی تھے چھوٹے موٹے لیکن زیادہ مشہور یہی تھے، ان میں سے بنوقریظہ اپنی افرادی قوت کے اعتبار سے کچھ کمزور سمجھے جاتے تھے، اور بنونضیر ہر لحاظ سے غالب تھے، یہ دونوں یہودی تھے اور دونوں ہی تورات پر ایمان رکھتے تھے اور تورات کے قانون کے پابند تھے، لیکن ان یہودیوں نے اپنی بدعملی کی بناء پر تورات کے بعض اَحکام کو چھوڑ دیا تھا، اور ان کے اندر من مانی تحریفات کرلی تھیں، جن اَحکام کے اندر تحریف کی تھی ان میں سے ایک حکم دیت اور قصاص کا بھی تھا، تورات کا حکم بالکل اسی طرح سے ہے جس طرح سے قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا، نفس کے بدلے میں نفس کو قتل کیا جاتا ہے، جیسے کہ الفاظ آپ کے سامنے آئیں گے، آزاد کے بدلے میں آزاد کو قتل کیا جائے، غلام کے بدلے میں غلام کو قتل کیا جائے، عورت کے بدلے میں عورت کو قتل کیا جائے، قصاص کا آئین تورات میں بھی اسی طرح سے ہے، تو بنونضیر چونکہ بنوقریظہ پر غالب تھے، تو انہوں نے بنوقریظہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہوا تھا، جس میں اُن کی کمزوری سے اور ان کی پستی سے فائدہ اٹھایا تھا، کہ اگر تو کوئی شخص بنوقریظہ میں سے بنونضیر کے کسی شخص کو قتل کردے تو پھر وہ ایک کے مقابلے میں دو کو قتل کرتے تھے، اگر بنوقریظہ کا کوئی غلام بنونضیر کے غلام کو قتل کردے تو اُس کے مقابلے میں وہ آزاد کو قتل کرتے تھے، اور عورت کو قتل کردے تو اُس کے مقابلے میں مرد کو قتل کرتے تھے، اور اگر دیت لینے دینے کی بات آجائے تو بنوقریظہ دگنی دیت ادا کرتے تھے بنونضیر کو، اور بنونضیر جس طرح سے قصاص میں ایک کے مقابلے میں ایک کا خون دیتے تھے اسی طرح سے دیت بھی کم دیتے تھے، یہ انہوں نے مجبور کر رکھا تھا بنوقریظہ کو اس معاہدہ پر ان کی پستی کی وجہ سے اور ان کمزوری کی وجہ سے، دیت کی مقدار غالباً روایات میں ذکر کی گئی ہے کہ اگر تو بنوقریظہ قتل کریں اور دیت دینے کی نوبت آجائے تو ایک سو چالیس وسق کھجوریں وہ ادا کرتے تھے، اور اگر بنوقریظہ کا کوئی آدمی قتل ہوجائے بنونضیر کے ہاتھ سے تو ستر وسق ادا کرتے تھے، گویا کہ بنونضیر والے جتنی دیت دیتے تھے اس سے نصف دیت بنوقریظہ کو دیتے تھے، تو قصاص اور دیت دونوں میں ہی انہوں نے من مانے اَحکام منوار کھے تھے، اور بنوقریظہ اپنی کمزوری کی بناء پر ان کو تسلیم کیے ہوئے تھے۔ سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد جب آپ کو وہاں کچھ سیاسی غلبہ حاصل ہوا تو ایک واقعہ پیش آگیا کہ بنوقریظہ کے ہاتھ سے بنونضیر کا ایک آدمی مارا گیا، تو بنونضیر نے اپنے اسی قانون کے تحت جو ان کا خود ساختہ تھا بنوقریظہ سے بدلے کا مطالبہ کیا، بنوقریظہ نے آگے سے انکار کردیا کہ اب وہ دور گزر چکا جب تم ہماری کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے تھے، اب تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ فیصلہ کروانا ہے تو حضور ﷺ سے کروالو، ہم تو جو تم سے لیتے ہیں

وہی دیں گے، اس سے زائد دینے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں، چونکہ حضور ﷺ ایک قوت کے ساتھ اُبھر آئے تھے، اور یہود سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اگر فیصلہ چلا جائے تو وہ صحیح فیصلہ کریں گے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ ان یہود قبائل کا ترکِ جنگ کا معاہدہ تھا، اگرچہ یہ باقاعدہ ذِمّی نہیں تھے، ایسے موقع پر وہ فصلِ خصومات کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف رُجوع کر سکتے تھے۔ تو بنونضیر نے چاہا کہ حضور ﷺ کا خیال معلوم کر لیا جائے کہ اگر ہم مقدمہ وہاں لے جائیں تو کیا ہمارے دستور کی رعایت رکھتے ہوئے، جو ہم نے ضابطہ پہلے قبائلی زندگی میں بنا رکھا ہے اُس کی رعایت رکھتے ہوئے اگر وہ فیصلہ ہمارے حق میں دیدیں تو ٹھیک ہے کہ ہم فیصلہ وہاں لے جائیں گے اور وہیں سے فیصلہ کروالیں گے، اور اگر معلوم یہ ہو کہ ویسا فیصلہ نہیں دیں گے جیسا ہم چاہتے ہیں تو پھر ہم اُس فیصلے کو قبول کرنے میں احتیاط کریں گے، اور اُس فیصلے کو منوانے کے لئے بنوقریظہ پر کسی اور طرح سے دباؤ ڈالیں گے، انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا، تو پھر مدینہ منورہ میں کچھ لوگ تھے جن کو ہم منافقین کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں، ان کا میل جول یہودیوں کے ساتھ تھا، تو بنونضیر نے ایسے لوگوں کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا، تاکہ اس واقعہ کا ذکر کر کے معلوم کر لیا جائے کہ اگر یہ مقدمہ ہم حضور ﷺ کے پاس لے جائیں تو حضور ﷺ کیا فیصلہ دیں گے؟ ساتھ انہیں تاکید کر دی کہ اگر تو فیصلہ اسی طرح سے ہونے کی توقع ہو جس طرح سے ہم پہلے کیا کرتے ہیں، جو ہمارا اپنا بنایا ہوا دستور ہے، توراۃ کے خلاف ہے لیکن ہم نے اپنے طور پر بنایا ہوا ہے، اگر تو فیصلہ اس طرح سے ہونے کی توقع ہو تو اُس کو قبول کرنے کا وعدہ کر لینا، جو آدمی بھیجے گئے تھے ان کو کہا کہ اس قسم کا فیصلہ ہونے کی توقع ہو تو وعدہ کر لینا کہ ہم اس کو قبول کریں گے اور اس پر عمل کریں گے، اور اگر فیصلہ اپنے اس دستور کے مطابق نہ ہو، اپنی خواہشات کے خلاف فیصلہ ہو جائے تو پھر ماننے کا وعدہ نہ کرنا، اس قسم کی چالیں سمجھا کر انہوں نے کچھ آدمیوں کو سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ ایک واقعہ تو یہ پیش آیا۔

شانِ نزول کا دُوسرا واقعہ

دُوسرا واقعہ ان آیات کے شانِ نزول میں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ یہودیوں میں ایک مرد اور ایک عورت نے آپس میں زِنا کر لیا، اور زِنا کی سزا رجم توراۃ میں بھی ایسے ہی ہے، جس طرح سے کہ ہماری شریعت میں ہے، کہ اگر وہ شادی شدہ ہوں تو پھر ان کو رجم کر دیا جاتا ہے، لیکن یہود نے اس میں بھی گڑبڑ کر رکھی تھی، کہ اگر کوئی آدمی معزز ہو، شرفاء میں سے ہو، باحیثیت ہو تو وہ اگر کوئی اس قسم کا جرم کر لے تو پھر وہ اُس کو ہلکی سزا دیتے تھے، منہ کالا کر دیا، گدھے پر چڑھا دیا، ذرا اس طرح سے چکر دے دیا، رُسوا کر دیا، حدیث شریف میں اسی طرح سے ذکر آتا ہے کہ یہود اس کے ساتھ یہ معاملہ کرتے تھے، اور اگر کوئی غریب آدمی اس قسم کی حرکت کرتا ہوا پکڑا جاتا تو اُس کو سزا دے دیتے تھے۔ لیکن بعد میں پھر جو گھٹیا درجے کے لوگ سمجھے جاتے تھے انہوں نے بھی احتجاج کیا کہ یہ کیا ہے کہ ایک ہی جرم ہے، کسی کو سزا کیسی دیتے ہو کسی کو کیسی دیتے ہو؟ تو پھر انہوں نے مل جل کر سب کے لئے ایک ہی سزا متعین کر دی، یعنی تھوڑی سی تعزیر کر دیتے تھے، یہی کہ منہ کالا کر دیا، گدھے پر چڑھا دیا، جلوس نکال دیا اور اس طرح سے اس کو رُسوا کر دیا، باقی جو توراۃ کی سزا تھی وہ انہوں نے چھوڑ دی، منسوخ کر دی، عملاً اس کو ترک کر دیا، تو یہ واقعہ جس وقت پیش آیا تو یہ مقدمہ

آ گیا سرورِ کائنات ﷺ کے پاس، بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے کہ یہود کی طرف سے حضور ﷺ کی خدمت میں مقدمہ بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھتے تھے کہ عام طور پر اسلام کے اَحکام بڑے آسان آسان ہیں، تو شاید زِنا کی سزا کی بارے میں بھی کوئی آسان حکم ہوگا، تو ہم اپنے سر پر کیوں لیں، فیصلہ وہیں سے کروالیں، اگر کوئی فیصلہ آسان سا ہوا تو ہم اُس پر عمل کرلیں گے، اور اگر کوئی کہے گا کہ تم توراۃ پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ تو ہم کہیں گے کہ بھائی! یہ بھی نبیِ وقت کا فیصلہ ہے، حاکمِ وقت کا فیصلہ ہے جس کی بنا پر ہم اس کے مطابق چلتے ہیں، نہ مسلمان الزام دے سکیں گے نہ غیر مسلم، غیر مسلموں کو یہ کہہ دیا جائے گا کہ وقت کی حکومت کا فیصلہ ہے، حاکمِ وقت کا فیصلہ ہے، اور مسلمانوں کو یہ کہہ دیا جائے گا کہ تمہارے خیال کے مطابق وقت کے نبی کا فیصلہ ہے لہٰذا ہمارے پر کوئی اِعتراض نہیں ہے، لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اگر یہ مقدمہ حضور ﷺ کے پاس چلا گیا تو آپ کیا برتاؤ فرمائیں گے؟ چند آدمی بھیجے کہ اس واقعے کا تذکرہ کرکے سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے حقیقت معلوم کرلی جائے، کہ آپ کا رجحان کیا ہے؟ کہ اگر یہ زانیوں کا مقدمہ ہم آپ کی خدمت میں لے آئیں تو آپ کیا فیصلہ فرمائیں گے، تو آپ کی مجلس کے اندر جب یہ ذکر ہوا تو آپ نے یہودیوں کو بلایا، بلانے کے بعد ان سے پوچھا کہ توراۃ میں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ وہ کہنے لگے کہ جی! ہم تو منہ کالا کرتے ہیں اور اس طرح سے یوں کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا توراۃ لاؤ، اور لاکر اُس کا حوالہ دو، وہ توراۃ لے آئے، ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان کو بلایا اور وہ آئے، اور ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ خود ان کے مدرسے میں تشریف لے گئے، بیت المدراس میں جہاں پڑھنے پڑھانے کا تذکرہ ہوتا ہے، وہاں خود تشریف لے گئے تاکہ وہاں ان کے علماء کی موجودگی میں اس بات پر بحث اچھی طرح سے ہوجائے، اور دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے دونوں باتیں آپس میں صحیح ہوسکتی ہیں، کہ پہلے ان کو بلایا ہو اور ان میں سے کچھ آگئے ہوں کچھ نہ آئے ہوں، اور سرورِ کائنات ﷺ نے پھر مناسب سمجھا ہو کہ یہاں بحث کی بجائے ان کے مدرسے میں چل کر بحث کریں جہاں یہ سارے کے سارے اہلِ علم موجود ہوں گے، تو بات ذرا زیادہ صاف ہوجائے گی، تو پھر آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے، وہاں جاکر گفتگو ہوئی تو آپ ﷺ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کہ یہودی عالم ہیں، تو جب حضور ﷺ نے توراۃ منگوائی اور کہا کہ یہاں رکھ کر تلاش کرو کہ یہ مسئلہ کہاں ہے؟ تو پڑھتے پڑھتے کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اُس آیت پر جس میں رجم کا مسئلہ تھا وہ ہاتھ کے نیچے چھپالی، اور اردگرد سے پڑھنی شروع کردی، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ توراۃ کے اندر یہ سنگسار کرنے کا اور رجم کرنے کا مسئلہ نہیں ہے، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی نظر پڑگئی، کہنے لگے کہ ہاتھ اُٹھاؤ! اور جس وقت ہاتھ اُٹھایا تو کہا: یہاں سے پڑھو! تو جس وقت پڑھی تو اُس کے اندر رجم کا ذکر تھا، کہنے لگے ہاں جی! یہ بات تو صحیح ہے اس کے اندر تو رجم کا ذکر ہے، تو سرورِ کائنات ﷺ نے اُن کے متعلق فیصلہ انہی کی شریعت کے مطابق کیا، چونکہ یہی فیصلہ ہماری شریعت کا ہے کہ زانیوں کو رجم کیا جائے، تو ان دونوں یہودیوں کو مرد کو اور عورت کو حضور ﷺ نے رجم کروایا۔[1] اب یہ جو ان یہود کا طرزِ عمل تھا کہ

---

(۱) بخاری ۱/ ۵۰۳، باب قول الله يعرفونه كما يعرفون الخ/ مسلم ۲/ ۶۹، باب رجم اليهود الخ/ مشكوة ۲/ ۳۰۹، كتاب الحدود، فصل اول، عن عبد الله بن عمر۔

اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں جستجو کے لئے جاسوسی کے لئے لوگوں کو بھیجتے تھے، کہ دیکھو! اگر یہ مقدمہ آپ کے پاس چلا جائے تو ہماری مرضی کے مطابق فیصلہ دیں گے یا نہیں دیں گے؟ اگر ہماری مرضی کے مطابق فیصلہ دیں تو ہم قبول کرلیں، اور اگر ہماری مرضی کے مطابق فیصلہ نہ دیں تو ہم عذر کردیں، یا کسی طرح سے حیلہ بہانہ کرلیں، یہ مزاج جو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کے اندر اس مزاج پر تبصرہ فرمایا ہے۔

منکرین کے تخریبانہ طرزِ عمل پر سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

پہلے تو سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دی کہ یہ جو دوڑ دوڑ کر کفر کی باتوں کی طرف جاتے ہیں، ایمان کی بات کو قبول نہیں کرتے، ان کا یہ طرزِ عمل آپ کے لئے باعثِ حزن نہ ہو، کیونکہ ان کی فطرت ہی ایسی ہے، آپ غم نہ کیجئے۔ آپ کو غم کس وجہ سے ہوتا تھا؟ یہ بات تو واضح ہے، کہ ایک داعیٔ حق، مصلح، پورے خلوص کے ساتھ کوشش یہ کرتا ہے کہ لوگ اللہ کے اُحکام کے پابند ہو جائیں، اور پھر آگے سے جماعت بھی ایسی مخاطب ہے کہ جو اللہ کے اُحکام کی پابندی کی دعویدار ہے، اور اللہ کی کتاب پر ایمان کا دعویٰ رکھتی ہے، اور وہ نبی حق کی طرف بلاتا ہے، اور مصلحانہ مخلصانہ کوشش کرتا ہے، اور وہ لوگ ان اُحکام سے بچنے کے لئے حیلہ جوئی کرتے ہیں، مختلف قسم کے بہانے کرتے ہیں، اور اس حق کے فیصلے کے جاری ہونے کے اندر رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، تو ایسے وقت میں جو شخص بھی مصلح ہوگا، اور وہ اپنی اصلاحی کارروائی کے اندر مخلص ہوگا، اُس کو یقیناً صدمہ ہوتا ہے کہ دیکھو! میری کوئی غرض نہیں، میں جو کچھ کرتا ہوں ان کے فائدے کے لئے کرتا ہوں، ان کو راہِ راست پر چلانے کے لئے کرتا ہوں، تو پھر جب وہ آگے سے رکاوٹیں پیش کرتے ہیں، حیلہ جوئی کرتے ہیں، مختلف بہانوں کے ساتھ اس حق سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسے وقت میں داعیٔ مخلص کو یقیناً تکلیف ہوتی ہے، پھر ایسے وقت میں تسلی دی جاتی ہے کہ آپ ان کی کارروائیوں سے کیا متاثر ہوتے ہیں؟ ان کی تو فطرت ہی ایسی ہے آپ اپنا کام کیجئے، اور ان کو ان کے حال پر چھوڑیے، اس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کو تو تسلی دی گئی۔

یہود عوام کے مزاج میں بگاڑ کیسے آیا؟

پھر آگے ان کے مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ اصل میں ان کا مزاج بگڑ گیا ہے، عوام کا بھی بگڑ گیا علماء کا بھی بگڑ گیا، عوام کا تو اس لئے بگڑ گیا کہ یہ لوگ جھوٹ سننے کے عادی ہو گئے، ان کے سامنے جھوٹ موٹ کے قصے کہانیاں اور ادھر اُدھر کی باتیں مارو تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں، اور حق بات قبول کرنے کی اور سننے کی ان کے اندر صلاحیت نہیں رہی، اور کیوں نہیں رہی؟ اس لئے نہیں رہی کہ ان کے علماء نے ان کو بگاڑ دیا، ان کے علماء ان کو سناتے ہیں جھوٹے قصے کہانیاں ہیں، جن کے اندر ان کے ذہن کو عیاشی ملتی ہے، اور ان کے دل کے اندر جس قسم کی جھوٹی طلب ہے وہ پیاس ان کے جھوٹے قصے کہانیوں سے بجھتی ہے، اُنہوں نے ایسی ہی باتیں ان کو سنانی شروع کردیں جس میں ان کو اُمیدیں دلاتے ہیں کہ تم بخشے جاؤ گے، یوں کرو گے ووں کرلو گے، اس طرح سے سہارے دے دے کر مطمئن کرتے ہیں۔ بالکل اس کی مثال آپ کے سامنے ہے، کہ جاہلوں کے سامنے اس قسم کے جاہل واعظ ہمارے ہاں بھی جب جاتے ہیں تو ایسے قصے کہانیاں سناتے ہیں کہ جس میں عوام پر کوئی اُحکام کا بوجھ نہیں پڑتا، اور مختلف ہلکی

ہلکی سی تدبیریں بتلا کر ان کو خوفِ آخرت سے بے نیاز کر دیا جاتا ہے، کہ یوں کرلو گے بخشے جاؤ گے، یہ کرلو گے فلاں بزرگ چھڑا لے گا، یوں کرلے گا وہ یوں کرلے گا، اب اگر کوئی صاحبِ شریعت واعظ چلا جائے جس نے جا کر ان کے سامنے حق بیان کرنا ہے، ان کو نماز کی تاکید کرے، زکوٰۃ کی تاکید کرے، حج کی تاکید کرے، اور چوری ڈاکہ بے حیائی چھوڑنے کی تلقین کرے، تو یقیناً عوام اُس کی باتیں سننے کے لئے تیار نہیں، اور دوسری قسم کا آدمی جوان کی تعریفیں کرتا رہے اور اس قسم کی باتیں بتاتا رہے کہ یوں کرلو گے چھوٹ جاؤ گے، یوں کرلو گے چھوٹ جاؤ گے، کوئی بات نہیں، تم تو ایسے نبی کی اُمت میں ہو کہ جیسے حال میں بھی چلے جاؤ گے تم چھڑا لیے جاؤ گے، حضور ﷺ جس کو چھڑا لیں گے تو کون دوسرا پکڑنے والا ہے، اس قسم کی ہلکی پھلکی سی تدبیریں کر کرا کر جب باتیں سناتے ہیں تو عوام بغلیں بجاتے ہیں، یہ مزاج آج بھی آپ کے سامنے جس طرح سے عوام کا بگڑا ہوا ہے، اور اس کے بگاڑ کے اندر علماء کا دخل ہے، بالکل اسی طرح سے یہودی علماء لوگوں کو ایسے جھوٹے قصے کہانیاں سناتے تھے جن میں ان کے اُوپر سے احکام کی پابندی کا بوجھ ٹلتا تھا، اور ان کو مختلف امیدیں دلاتے تھے، اور وہ اس قسم کی باتیں سن کر خوش ہوتے رہتے تھے، تو جھوٹ سننے کے یہ عادی ہو گئے، اس لئے اب ان کے کان جو ہیں وہ حق بات جس کی وجہ سے ان پر ذمہ داری آتی ہو وہ بات سننے کے لئے تیار نہیں۔

یہود علماء کے مزاج میں بگاڑ کیوں آیا؟

اور علماء کے مزاج میں بگاڑ کیوں آ گیا؟ کہ وہ بھی جھوٹ موٹ سنانے کے عادی ہو گئے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہیں آکال للسحت، حرام خور، ان کو مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت پڑ گئی، اب وہ سمجھتے ہیں کہ اگر عوام کو ہم صحیح حکم بتائیں گے تو ہمیں کہاں سے وظیفہ ملے گا؟ اور ہمارے پاس نذرانے کہاں سے آئیں گے؟ تو وہ بھی ایسے ہی جھوٹے موٹے قصے سناتے ہیں، قصے سنا کر ان سے بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ حرام خوری کی عادت ہے جس نے علماء کو حق کہنے سے روک دیا، تو جب یہ حق کہنے سے رُک گئے، علماء کو حق کہنے کی عادت نہ رہی، عوام کو حق سننے کی عادت نہ رہی، تو پھر وہ ایسی شرارتیں نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے، اس انداز کے ساتھ اگر آپ چاہیں تو ان آیات میں جوان کے مزاج پر تبصرہ کیا گیا ہے تو ان الفاظ کے ساتھ بھی اس کو ادا کیا جا سکتا ہے، کہ ان کا مزاج اس قسم کا بن گیا ہے، کہ عوام بھی جھوٹ موٹ پر مطمئن ہوتے ہیں، ان کی پیاس اسی قسم کے قصے کہانیوں سے بجھتی ہے، اور علماء بھی غلط بیانی کے عادی ہو گئے، اللہ کے احکام جو کہ اپنے موقع محل پر واقع ہوتے ہیں ان میں تحریف کرتے ہیں، کہیں مفہوم بگاڑتے ہیں کہیں لفظ بدلتے ہیں، اور علماء کی اس کارروائی کا مقصد ہے حرام کمانا اور لوگوں کے مالوں سے فائدہ اٹھانا، جس کی بناء پر یہ علماء کی طرف سے کیا، عوام کی طرف سے کیا، دونوں طرف سے ہی قوم کے اندر بگاڑ آیا ہوا ہے، تو ایسے لوگ حق قبول کر نہیں کیا کرتے، اگر آپ کے پاس یہ فیصلہ لے کر آ بھی جائیں تو آپ پابند ہیں کہ آپ حق کے مطابق فیصلہ کریں، چاہے کسی کو پسند ہو کسی کو نہ ہو، اور اگر آپ آثار ایسے معلوم کریں کہ محض یہ معلوم کرنے کے لئے آئے ہیں کہ کیا نظریہ ہے؟ ان کا قبول کرنے کا ارادہ نہیں ہے، ان کی نیت نہیں ہے، تو پھر ان کو جواب دے دیا کرو کہ جاؤ، جا کر خود فیصلے کرتے رہو، میں تمہارا فیصلہ نہیں کرتا، اور اگر فیصلہ کریں تو کریں حق کے مطابق۔ آگے پھر ان کے اُوپر اظہارِ تعجب ہے کہ توراۃ پر ایمان ہے، توراۃ کے متعلق ایمان کا دعویٰ رکھتے

ہیں، پھر آپ کے پاس فیصلہ لے کر آتے ہیں، خود ان کے حال پر تعجب ہے، اور اگر آتے بھی ہیں تو پھر ان کو چاہیے کہ آپ کا فیصلہ بھی مان لیں، لیکن فیصلہ لانے کے بعد پھر پیٹھ پھیر جاتے ہیں، تو اصل یہ ہے کہ ان کو عقیدت ہے ہی نہیں، نہ آپ کے ساتھ، نہ توراۃ کے ساتھ، نہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، یہ اصل میں اپنی خواہشات کے بندے ہیں، جہاں خواہش پوری ہوتی نظر آئے گی، وہ بات مانیں گے، چاہے آپ کی مجلس میں ملے چاہے توراۃ میں، اور جو ان کی خواہشات کے خلاف بات ہوگی وہ نہیں مانیں گے چاہے وہ توراۃ کی ہو چاہے آپ کی ہو۔

آیاتِ بالا کا دُوسرا مفہوم

اور اگر آپ چاہیں تو ان آیات کے مفہوم کو اس انداز کے ساتھ بھی ادا کر سکتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسی سورت میں پچھلی آیات کے اندر تاکید کی تھی کہ تم شہداء للہ اور قائم بالقسط ہو جاؤ، انصاف کو قائم کیا کرو اور اللہ کے لئے گواہی دیا کرو، یہ مضمون آپ کے سامنے مختلف انداز کے ساتھ دو جگہ گزر چکا ہے، ایک جگہ کہا گیا تھا کہ کسی کی محبت تمہیں اس راستے سے نہ ہٹائے، اگر اپنے خلاف بھی گواہی دینی پڑ جائے تو صحیح دو، ماں باپ کے خلاف دینی پڑ جائے، اقرباء کے خلاف دینی پڑ جائے تو بھی صحیح گواہی دو، کسی کے ساتھ محبت یا کسی کے ساتھ عقیدت یا کسی کا فقر یا کسی کا غنا، کسی کا مالدار ہونا یا کسی کا مسکین ہونا، کوئی چیز بھی تمہیں اس حق سے نہ روک سکے، کہ جب بھی گواہی کا موقع آئے گواہی صحیح دیا کرو۔ اور حاکموں کے متعلق بات یہ تھی کہ جب بھی فیصلہ ہو تو انصاف کے مطابق ہو، انصاف کے مطابق فیصلہ کیجئے، تو جب حاکم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کی قوت ہو، اور اس کا ارادہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ہو، اور عوام کے اندر اقامتِ شہادت کا جذبہ ہو، کہ شہادت للہ ادا کرنی ہے اور صحیح ادا کرنی ہے، تو دنیا کا نظم ٹھیک رہ سکتا ہے، معاملات ٹھیک چلتے ہیں، سارے کا سارا حساب ٹھیک ہو جاتا ہے، کہ گواہی دینے والے سچ بولیں اور صحیح انداز کے ساتھ گواہی ادا کریں، اور حاکم وقت انصاف پر تل جائے، کہ جو واقعات اس کے سامنے آئیں گے وہ صحیح طور پر ان کا اندازہ کر کے فیصلہ کرتا ہے، یہ دو باتیں اگر ہوں گی تو دنیا کا نظم ٹھیک رہے گا، آئینِ شریعت عملاً نافذ ہو جائے گا، اور اگر گواہی دینے والے جھوٹ کے عادی ہو جائیں، گواہی کو چھپانے کے عادی ہو جائیں، اور حاکم رشوت کے عادی ہو جائیں، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ فیصلۂ حق اور باطل یہ بھی خریدنے اور بیچنے کی چیز بن جائے، کہ جو چاہے جس طرح سے چاہے فیصلہ کروالے، یہ خریدنی فروختنی چیز ہے، حاکم سودا بازی کرے کہ میں یہ فیصلہ کروں گا اتنے پیسے لوں گا، تو انصاف اور حق جو تھا یہ ایک بازاری چیز بن گیا، اور اسی طرح سے جھوٹی گواہی دینے والوں کے گروہ بھی پیدا ہو جائیں، جن کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے، جھوٹ سننے کی عادت ہے، تو پھر نہ تو صحیح طور پر شہادت ادا ہو سکتی ہے اور نہ صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے، تو پھر دنیا کا نظم کیسے ٹھیک رہے گا؟ تو اہل کتاب پر بھی پہلے یہی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اقامتِ حق کی، کہ تم نے حق سننا ہے حق بیان کرنا ہے حق قبول کرنا ہے اور فیصلہ حق کے مطابق کرنا ہے، لیکن ان بدبختوں کے مزاج میں ایسی تبدیلی آئی کہ سراسر یہ جھوٹ کے بیوپاری بن گئے، اور یہ رشوت خور ہو گئے، جس کے نتیجے کے اندر نہ حق ان کی زبان پر آتا ہے، نہ حق سن کر قبول کرتے ہیں، بلکہ حق کو انہوں نے ایک بازاری جنس بنا دیا، جو پیسوں کے ساتھ بکتی ہے، اور فیصلہ حاکم کی

مرضی پر رشوت کے تحت ہوتا ہے، کہ جو زیادہ پیسے دے دے جیسے چاہے انصاف کروالے، تو اس طرح سے ان کا قومی مزاج بگڑ گیا اور یہ سارے کے سارے خراب ہو گئے، اب اگر آپ کے پاس آتے ہیں تو اسی مزاج کے تحت آتے ہیں، نہ وہ حق کہنے کے لئے تیار ہیں نہ حق سننے کے لئے تیار ہیں، اور اپنے ہاں وہ فیصلے چونکہ غلط کرتے ہیں تو چاہتے یہ ہیں کہ آپ سے بھی وہ فیصلے غلط کروالیں، آپ ان کی خواہش کی قطعاً پابندی نہ کیجئے، اگر فیصلہ آپ کے پاس آئے تو آپ حق کو بیان کریں، صحیح واقعات کا تجزیہ کر کے صحیح فیصلہ کریں، پھر یہ مانیں یا نہ مانیں، اس پر آپ کوئی ذمہ دار نہیں ہیں، اقامتِ حق آپ کا فریضہ ہے، آپ نے اس کو بہر حال ادا کرنا ہے۔ تو اہل کتاب کا جو قومی مزاج بگڑا تھا وہ اسی رشوت خوری کے نتیجے میں بگڑا تھا، اور رشوت خوری ایک ایسی بیماری ہے کہ جس وقت کسی قوم کے اندر یہ آجاتی ہے وہ قوم حق کی پابند نہیں رہ سکتی، دینے والے غلط بیانی کر کے پیسے دیں گے، فیصلہ کرنے والے غلط فیصلہ کریں گے، پھر یہ بازاری جنس ہے، جس طرح سے بھیڑ بکریوں کے سودے ہوتے ہیں، پھر حاکموں کے دربار میں فیصلے اسی طرح سے بکتے ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کو ان اہل کتاب کی حالت کے بگاڑ کا تذکرہ کر کے حق قائم کرنے کے لئے تاکید کرنا مقصود ہے، اس انداز کے ساتھ بھی ان آیات کی تقریر کی جاسکتی ہے۔

آج کل کے وکلاء کی عمومی حالت

اس کا نمونہ بھی اگر آپ دیکھنا چاہیں تو آج ہماری عدالتوں میں موجود ہے، یہ وکلاء کا طبقہ جو آج ہے اس کی بنیاد اگرچہ کتنی ہی صحیح نظریات پر کیوں نہ رکھی گئی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج اس طبقے کے اندر جھوٹ کا بیوپار ہوتا ہے، جو بھی مقدمہ ان کے پاس جاتا ہے یہ سنتے ہیں، سننے کے بعد مدعی کو خود بتاتے ہیں کہ یہ بات اپنی زبان سے نہ نکالیو، ورنہ پھنس جاؤ گے، بلکہ اس بیان کو یوں دینا ہے، جھوٹ سکھاتے ہیں، اور جھوٹی پٹیاں پڑھا کر پھر یہ کیس لے جاتے ہیں عدالت میں، اور ادھر حکام ایسے بیٹھے ہوتے ہیں جو کہ انصاف کے بیوپاری ہیں، اور وہاں ان کو رشوت دو اور جس طرح سے چاہو بیان الٹے پلٹے جیسے کیسے ہوں جیسا چاہو فیصلہ کروالو۔ تو یہ طبقہ آج ہمارے ہاں دانشوروں کا طبقہ کہلاتا ہے، جس وقت آپ اخباروں میں پڑھیں کہ دانشور لوگ، تو دانشور لوگوں سے آج کل یہ قانون دان یہ وکلاء مراد ہوتے ہیں، جن کی مجلس میں صبح سے لے کر شام تک سوائے اس جھوٹ سازی کے، جھوٹ سکھانے کے، جھوٹ بلانے کے اور جھوٹے فیصلے کروانے کے اور کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ تو یہ طبقہ جس کے متعلق اکبر الٰہ آبادیؒ نے کہا تھا، اکبر الٰہ آبادیؒ ایک انگریزی خواں گزرے ہیں، لیکن بہت قومی جذبہ رکھنے والے شاعر تھے، اور وقت کے جج تھے، نئی تہذیب سے اچھی طرح سے واقف تھے، جج ہونے کی وجہ سے ان کو وکلاء کے ساتھ واسطہ بھی پڑتا تھا، تو انہوں نے اپنے ایک شعر میں وکلاء کا منصب واضح کیا ہے، کہتے ہیں کہ۔

پیدا ہوئے وکیل تو شیطان خوش ہوا   کہ لو آج میں بھی صاحبِ اولاد ہو گیا

یعنی جس دن یہ وکیل پیدا ہوئے تو شیطان خوش ہو گیا، کہ لو! اللہ نے مجھے بھی اولاد دے دی، تو جس میں اُس نے بتادیا کہ یہ خالص شیطان کی اولاد ہیں، اور ان کے پیدا ہونے کے ساتھ اور اس طبقہ کے وجود میں آنے کے ساتھ شیطان خوش ہو گیا، کہ

میرے جانشین آگئے، وہ اسی لئے کہ یہ انصاف کا خون کرتے ہیں، مدّعی کو مدعا علیہ کو جس کو بھی ہے ایسی پٹیاں پڑھاتے ہیں جس میں یہ خود کہتے ہیں کہ یہ بات کہیو، یہ نہ کہیو، اور حق چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں۔ تو حاکم اگر منصف بھی بیٹھا ہوا ہو، تو بھی ان کی کارروائیوں کے تحت وہ صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا، کیونکہ اس کے سامنے تو واقعہ جیسا جاتا ہے اُس نے ویسا ہی فیصلہ کرنا ہے، اور اگر حاکم بھی ماشاء اللہ آگے بیوپاری ہو، وہ بھی خرید و فروخت کا عادی ہے، پھر اُس قوم کے اندر انصاف کیسے قائم ہوسکتا ہے؟ تو وہی اسرائیلیوں والی بیماریاں جس وقت ہماری قوم کے اندر آگئیں تو قوم کے اندر نظم جس طرح سے برباد ہو یا ہوا ہے، اور آئین جس طرح سے ہماری ان عدالتوں میں ذبح ہوتا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے، کتنا اچھے سے اچھا قانون کیوں نہ ہو، لیکن جب اُس کو صحیح انداز کے ساتھ اپنایا نہیں جائے گا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، تو یہ مزاج جو ان کے اندر تھا جو کسی نہ کسی طرح ہماری قوم کے اندر بھی آگیا، ان آیات کے اندر اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اِن آیات کا ترجمہ پہلے ہو گیا تھا، مطلب دیکھ لیجئے۔

خلاصۂ آیات

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ: اے رسول!، لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ: آپ کو غم میں نہ ڈالیں وہ لوگ جو کُفر کی باتوں میں دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔ ''کُفر میں دوڑ کر جاتے ہیں!'' وہ تو پہلے ہی کافر ہیں، یہ یہود ہو گئے منافق ہو گئے، لیکن کُفر کی باتوں کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں، یعنی کُفری بات کو بڑی جلدی قبول کرتے ہیں، ایمان کی بات کی طرف نہیں آتے، ''جو دوڑ دوڑ کر واقع ہوتے ہیں کُفر میں'' مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ: یہ ''مِن'' بیانیہ ہے، وَمِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا کے اندر بھی ''مِن'' بیانیہ ہے، یعنی یہ دو طبقے ہیں، بعض تو وہ ہیں جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے، اس سے مراد تو منافقین ہو گئے، اور دوسرا طبقہ تھا جو کہ علی الاعلان یہودی تھے، اس لئے اس کا مفہوم یوں ادا کریں گے، کہ ''جو لوگ کُفر میں دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں، کُفریات میں بڑھتے ہیں، وہ آپ کو غم میں نہ ڈالیں، خواہ وہ منافقوں میں سے ہوں، خواہ یہودیوں میں سے ہوں'' مفہوم ان الفاظ سے ادا کر دیا جائے گا، دونوں طبقے تھے، منافق بھی اور یہودی بھی۔ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: یہ لوگ جھوٹ سننے کے عادی ہیں، جھوٹ قبول کرنے کے عادی ہیں۔ سمّاع: زیادہ سننے والا، یا زیادہ قبول کرنے والا، جیسے کہ ترجمے کے اندر یہ بات واضح کی گئی تھی، سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ: اور یہ سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کے لئے، جیسے واقعہ کے تحت آیا کہ ان کے نمائندہ بن کر آئے تھے جاسوسی کرنے کے لئے کہ حضور ﷺ کے خیالات معلوم کریں، معلوم کرنے کے بعد پھر دوسروں کو پہنچائیں، کہ اگر یہ مقدمہ آپ کی خدمت میں چلا گیا تو آپ فیصلہ کس طرح سے کریں گے کس طرح سے نہیں کریں گے؟ یہ رپورٹ دینے کے لئے حضور ﷺ سے حالات معلوم کرنے کے لئے وہ آئے تھے، ''سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کے لئے جو آپ کے پاس نہیں آئے۔'' ان کی عادت ہے کہ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ: ''ہ'' ضمیر اَلْكَلِمَ کی طرف لوٹ گئی، مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ بعد اس کے کہ کلمات اپنے موضع پر واقع ہوتے ہیں، ان کا استعمال صحیح انداز پہ ہو یا ہوا ہوتا ہے، صحیح محمل پر محمول ہوتے ہیں، لیکن یہ ان کو کھسکا دیتے ہیں، معنوی طور پر اس میں تحریف کرتے ہیں یا اس کے الفاظ بدل دیتے ہیں، دونوں قسم کی تحریف وہ توراۃ کے اندر کرتے تھے، ''بدل دیتے

ہیں وہ کلمات کو ان کے موقع پر واقع ہونے کے بعد"۔ کہتے ہیں اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا: اگر تمہیں یہ بات دی گئی، یعنی اگر فیصلہ اس انداز سے دیا گیا جیسا فیصلہ وہ خود کرتے تھے تحریف کرنے کے بعد، غلط انداز کے فیصلے جیسے خود کرتے تھے، جو ان کا منشا تھا، جیسے واقعے کے تحت تفصیل عرض کر دی، "اگر تمہیں یہ بات دی جائے" فَخُذُوْهُ: پھر اُس کو تو لے لینا، یعنی قبول کر لینا، وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ: اگر تمہیں یہ بات نہ دی جائے، اگر فیصلہ اس انداز کا نہ کیا جائے فَاحْذَرُوْا: پھر اُس کے قبول کرنے سے بچنا، پھر اُس کو قبول نہ کرنا۔ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ: جس کی گمراہی کا اللہ ارادہ کرلے ہرگز مالک نہیں تو اس کے لئے اللہ کی طرف سے کسی شی کا، کیا مطلب؟ کہ دل کے فساد کی بنا پر، نیت کے فساد کی بنا پر اللہ کا فیصلہ یہ ہو گیا کہ یہ لوگ گمراہی میں ہی رہیں، تو پھر آپ ان کو گھسیٹ گھسیٹ کر حق کی طرف کیسے لا سکتے ہیں؟ جب تک ان کا ارادہ نہ بدلے، جب تک ان کی نیت صاف نہ ہو، اس وقت تک یہ ہدایت کی طرف نہیں آسکتے، نہ آپ ان کو زبردستی لا سکتے ہیں، اللہ کا ارادہ انسان کے اپنے ارادے اور اُس کی نیت پر موقوف ہے، کہ جب ایک آدمی ڈٹ جاتا ہے کہ میں نے یہ گمراہی اختیار کرنی ہے تو پھر زبردستی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گھسیٹ کر کسی کو حق کی طرف نہیں لایا جاتا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ: یہی لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ کیا اللہ نے کہ ان کے دلوں کو پاک کر دے، لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ: ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔ تو جو لوگ حق سنتے نہیں، حق کے مطابق فیصلے کو قبول نہیں کرتے، دنیا میں بھی ان کے لئے رسوائی ہوتی ہے، اور یہ منافقین بھی دنیا میں رسوا ہوئے، ان کا نفاق کھلا، اور یہود بھی رسوا ہوئے، وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

حرام خوری کے نتائج

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو یا بہت قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو، یہ تو وہی عوام کی کیفیت ہے یا مشترکہ قومی مزاج ہے، اور اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ یہ ان کے علماء کی حالت ہے، حرام کھانے والے ہیں سُحت مالِ حرام کو کہتے ہیں، اصل میں سَحت کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کا استیصال کر دینا، اس کو جڑ سے اکھیڑ دینا، جیسے کہ دوسری جگہ اس لفظ کا حوالہ دیا تھا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ (سورۂ طٰہٰ: ٦١) اس میں بھی ماخذ یہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ تمہارا استیصال کر دے گا، رگڑا نکال دے گا تمہارا عذاب کے ساتھ۔ اور اس حرام مال کو خاص طور پر اس کا مصداق جیسے شارحین اور مفسرین نے رشوت بنایا ہے، اس کو سحت کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا جاتا ہے کہ یہ رشوت اور یہ مالِ حرام حق وانصاف کو جڑ سے اُکھیڑ دیتا ہے، کہ جس وقت بھی اہلِ علم کو فیصلہ کرنے والوں کو حرام کھانے کی عادت پڑ جائے پھر حق اور انصاف کا نام ونشان باقی نہیں رہ سکتا۔ یا خیر کا خاتمہ کر دیتا ہے، کہ حرام خوری ایک ایسی چیز ہے کہ انسان کے اندر کسی خیر کا نام ونشان نہیں چھوڑتی، باقی اعمال خوراک کے تابع ہوتے ہیں، کوئی شخص حلال کھائے گا تو اس سے اعمال بھی اچھے صادر ہوں گے، حرام اگر کھائے گا تو اول تو اس سے بُرے اعمال صادر ہوں گے، اور اگر کوئی نیکی کر بھی بیٹھے گا تو جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ حرام خور کی کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی،[1] اس طرح سے اُس کی نیکی برباد ہو جاتی ہے، کھانے میں پہننے میں اگر حرام کی

(۱) مشکوٰۃ ۱/ ۲۴۲۔ ولفظہ: لا یکسب عبد مال حرام فیتصدق منه فیقبل منه ولا ینفق منه فیبارك له فیه ولا یترکه خلف ظهره إلا کان زاده إلی النار

آمیزش آجائے تو اس بدن کے ساتھ کی ہوئی نیکیاں اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہیں۔ جیسے ایک روایت میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس درہم کا کپڑا خریدتا ہے، اور اس میں ایک درہم حرام کا ہے، نو درہم چاہے اس میں حلال کے ہیں، یعنی دسواں حصہ اس میں حرام کی آمیزش آگئی، تو جس وقت تک وہ کپڑا اس پہننے والے کے بدن پر رہے گا اللہ تعالیٰ اُس کی کوئی نماز قبول نہیں کرتا۔(۱) تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ لباس میں حرام آیا تو جو نیکیاں اس لباس کو پہن کر کی جائیں گی اُن کے اندر بھی خبث آگیا اور نقص آگیا، اللہ تعالیٰ اس نیکی کو قبول نہیں کرتے۔ اور ایسے ہی ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، کہ ایک آدمی مسافر ہو، پراگندہ حال میں ہو، اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کے ''یارِبِّ! یارِبِّ!'' کہہ کر وہ دُعائیں کرتا ہے، یعنی حالات سارے ہی ایسے ہیں کہ جس میں قبولیت کی توقع ہے، کہ مسافر بدحال ہوتا ہے، اس میں عجز زیادہ ہوتا ہے، اور پھر ہاتھ پھیلاتا ہے، پھیلا کے ''یارِبِّ! یارِبِّ!'' ، اس طرح سے دُعائیں کرتا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اُس کی غذا حرام ہے، اُس کا کھانا حرام ہے، اُس کا پہننا حرام ہے، ''فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهٗ؟'' تو پھر اُس کی دُعا کیونکر قبول ہوگی؟(۲) تو اگر اُس کی خوراک میں اور غذا کے اندر حرام کی آمیزش آجائے تو کتنا ہی چلا چلا کر ''یارِبِّ! یارِبِّ!'' پکارے، اللہ تعالیٰ دُعا قبول نہیں فرماتے، تو اسی طرح سے حرام خوری ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے ساتھ انسان کی طبیعت سے سرے سے خیر کا خاتمہ ہی ہوجاتا ہے، تو اَکلِ حلال نیکی کے لئے ایک بہت بڑی بنیاد ہے، کہ حلال کھاؤ گے تو نیکی کی توفیق ہوگی، حرام کھاؤ گے تو نیکی کی توفیق ختم ہوجائے گی۔ اِن لوگوں کو حرام خوری کی عادت پڑ گئی، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورۂ توبہ: ۳۴) غلط طریقوں کے ساتھ یہ درویش اور یہ علماء لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور یہ غلط طریقے سے جو کھانے کی جو عادت پڑ گئی تھی اِسی نے ان کی زبانوں پر تالے لگادیے تھے، نہ حق بول سکتے تھے نہ حق کہہ سکتے تھے، عوام کے تیور دیکھ کر وہ بات کرتے تھے، کہ کس طرح سے لوگ خوش ہوں گے، اور کس طرح سے ہماری دعوتیں کریں گے اور نذرانے ملیں گے، ایسی بات ہم زبان سے کیوں نکالیں کہ ہمارے وظیفے بند ہوجائیں، لوگ ہمارے پاس آنا چھوڑ دیں، ہدیے دینے ترک کردیں، ایسی بات وہ نہیں کہتے تھے، اب ان کی زبان پر وہی بات آتی تھی جس سے ان کے عوام خوش ہوجائیں، حرام خوری کی عادت کا آخر نتیجہ یہی ہوتا ہے۔

خلاصۂ آیات

فَاِنْ جَآءُوْكَ: پھر اگر یہ لوگ آپ کے پاس آجائیں فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ: تو پھر آپ اِن کے درمیان فیصلہ کیجئے یا ان سے اعراض کرجایئے، آپ مصلحت دیکھا کیجئے، اگر مصلحت یہی ہے کہ فیصلہ کرنے میں بہتری ہے تو فیصلہ کردو، اعراض کرنے میں بہتری سمجھتے ہو تو اعراض کرجاؤ، کہتے ہیں کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ وہ باقاعدہ ذمّی نہیں بنے تھے، ان کے ساتھ معاہدہ ترکِ جنگ کا تھا، باقاعدہ ذمّی نہیں تھے، اور اگر وہ باقاعدہ ذمّی بن جائیں تو جیسے آگے آیت آئے گی، تو پھر اگر وہ فیصلہ لے کر آجائیں تو پھر مسلمان

---

(۱) مشکوۃ ۱/ ۲۴۳، باب الکسب وطلب الحلال کی آخری حدیث۔ من اشتری ثوبا بعشرۃ دراھم وفیہ درھم حرام لم یقبل اللہ لہ صلاۃ ما دام علیہ الخ.

(۲) مسلم ۱/ ۳۲۶، باب قبول الصدقۃ الخ/ مشکوۃ ۱/ ۲۴۱، باب الکسب وطلب الحلال عن ابی ھریرۃ.

حاکم کے ذمے ضروری ہے کہ فیصلہ ان کے درمیان کرے، اور آئینِ اسلامی کے تحت کرے، ہاں البتہ جو ان کے نجی معاملات ہیں زندگی کے جو مذہبی اُمور ہوا کرتے ہیں، ان کا فیصلہ ان کے سپرد کر دیا جاتا ہے، وہ اپنی زندگی اپنے مذہب کے مطابق گزار سکتے ہیں، لیکن معاملات ہو گئے، تعزیرات ہو گئیں، حدود ہو گئیں، ان کا فیصلہ ان کے ساتھ وہی کیا جائے گا جو کہ اسلامی شریعت کا ہے، پھر خاص طور پر قتل، دیات اور حدود وغیرہ، یہ توراۃ میں بھی ایسی ہی ہیں جس طرح سے قرآنِ کریم میں ذکر کی گئی ہیں۔ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ: اور اگر آپ ان سے اعراض کرنا چاہیں، اعراض کریں، کہیں کہ میں نہیں فیصلہ کرتا تمہارے درمیان، تو اس میں کوئی اندیشہ نہ کرنا کہ آپ کا کچھ بگاڑ لیں گے، آپ کا کچھ نقصان نہیں کر سکتے فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا: پس ہرگز آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کچھ بھی، ''اور اگر آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو فیصلہ کریں آپ ان کے درمیان بالکل انصاف کے ساتھ''، واقعات کی طرف دیکھتے ہوئے جو انصاف کا تقاضا ہے، اور انصاف سے مراد یہاں آئینِ شریعت ہے جو آپ کو دے دیا گیا ہے، آپ اس کے مطابق فیصلہ کیجئے، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ: یہ وہی ان کے حال پر تعجب ہے، كَيْفَ میں استفہام تعجب کے لئے ہے، ''کیسے فیصل بناتے ہیں یہ آپ کو حالانکہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے'' فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ: اور اس کے اندر اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے، اگر وہ واقعہ زنا والا تھا تو بھی بات صحیح ہے کہ توراۃ کے اندر صراحتاً حکم مذکور ہے، اور اگر وہ واقعہ قتل کا تھا جیسے شانِ نزول میں دونوں واقعے آپ کے سامنے ذکر کیے گئے، تو قتل کے متعلق اور قصاص کے متعلق بھی احکام سارے کے سارے توراۃ میں موجود ہیں، اگر ان کو حق قبول کرنے کا کوئی خیال ہے تو پھر یہ اپنی توراۃ پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اس میں صاف صاف بات لکھی ہوئی ہے، ''کیسے فیصل بناتے ہیں آپ کو، منصف بناتے ہیں آپ کو حالانکہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے'' فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ: اور اس کے اندر اللہ کا حکم ہے، ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: مِنْ بعدِ تحکیمک، ذٰلِكَ کا اشارہ اسی تحکیم کی طرف ہے جو يُحَكِّمُوْنَكَ کے اندر مذکور ہے، آپ کو فیصل بنانے کے بعد پھر اعراض کر جاتے ہیں، پیٹھ پھیر جاتے ہیں، پھر آپ کا فیصلہ بھی قبول نہیں کرتے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ: یہ کوئی عقیدت رکھنے والے ہیں ہی نہیں، یہ تصدیق کرنے والے نہیں ہیں، نہ ان کا پورا پورا ایمان توراۃ پر ہے، نہ ان کا ایمان آپ پر ہے، اس لئے یہ اپنی خواہشات کے بندے ہیں، اگر تو ان کی خواہش توراۃ سے پوری ہوتی ہے تو یہ توراۃ کے حکم کو لے لیتے ہیں، اور اگر توراۃ سے ان کی خواہش کے مطابق فیصلہ نہیں ملتا تو پھر یہ آپ کی مجلس میں آتے ہیں تاکہ اپنی خواہش کے مطابق آپ سے فیصلہ کروالیں، ان کا ایمان نہیں، نہ توراۃ پر نہ آپ پر، ورنہ چاہیے کہ چاہے خواہش کے مطابق ہو چاہے خواہش کے خلاف ہو فیصلہ وہی مانا جائے جو توراۃ کا ہے یا جو آپ کا ہے، وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ: یہ ایمان والے نہیں، ان کا ایمان نہیں کسی چیز پر، یہ خواہشات کے بندے ہیں، اس لئے آپ ان کی خواہشات کی رعایت نہ کیجئے، اگر آپ نے فیصلہ کرنا ہے تو فیصلہ صحیح صحیح کیجئے انصاف کے ساتھ جو انصاف کا تقاضا ہے، جس کا مصداق آج یہ قانونِ شریعت ہے۔

خصوصیت کے ساتھ اس موقع پر یہود کو جو اس قسم کی تاکیدات کی جارہی ہیں، یا ان کے مزاج کو واضح کیا جارہا ہے حق چھوڑنے کے متعلق، اس کا موقع محل خصوصیت کے ساتھ یہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پیچھے چونکہ حدود کا ذکر آیا، سرقہ کبریٰ کی حد مذکور تھی کہ ڈاکوؤں کا یہ سزا دیا کرو، اور سرقہ صغریٰ کی حد مذکور تھی کہ چور کا ہاتھ کاٹا کرو، اور ان حدود میں اکثر و بیشتر خواہشات کی پابندی سے لوگ کوتاہیاں کرجاتے ہیں، اور یہود کی اکثر کوتاہیاں بھی حدود کے سلسلے میں تھیں، جیسے کہ زنا کا قصہ آپ کے سامنے ذکر کیا گیا، کہ حد زنا جو ان کے لئے متعین کی گئی تھی یعنی رجم، انہوں نے اپنی خواہش کے ساتھ اس میں تغیر تبدل کرلیا تھا، اور یہاں چونکہ حد سرقہ کا ذکر آیا خواہ وہ سرقہ کبریٰ ہو خواہ وہ سرقہ صغریٰ ہو، تو ان کا حال یہاں جو بیان کیا جارہا ہے تو اس سے اس سلسلے میں بھی تاکید کرنی مقصود ہے، کہ اہل اسلام ان حدود کے اندر یہودیوں کی طرح کسی قسم کی کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ اور آج یہ بات بھی افسوس کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، کہ جیسے یہود نے وقتی مصلحتوں کے تحت اس قانون کو چھوڑ کر اپنے طور پر کچھ سزائیں متعین کرلی تھیں، اور تعزیرات کا ایک نیا سلسلہ کھڑا کرلیا تھا، اللہ کے احکام کی پرواہ نہیں کی، اور آج مسلمانوں میں بھی وہی صورت حال پیش آئی، کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کو چھوڑ دیا گیا، اور اپنے طور پر مصلحت کے ساتھ ہلکی ہلکی سی سزائیں متعین کرلیں، اور یہ اللہ کے احکام میں اُسی قسم کی تحریف ہے جس قسم کی تحریف یہود و نصاریٰ تورات و انجیل کے احکام کے اندر کیا کرتے تھے، اللہ کے احکام کو چھوڑتے تھے، تو اہلِ اسلام کی طرف سے یہ کوتاہی بھی ویسے ہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے کی اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ
بے شک ہم نے تورات کو اُتارا، اس میں ہدایت ہے اور روشنی ہے، فیصلہ کرتے رہے اِس تورات کے ساتھ ایسے انبیاء جو
اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا
اللہ کے فرمانبردار تھے، (فیصلہ کرتے رہے) ان لوگوں کے لئے جو یہودی تھے، اور (فیصلہ کرتے رہے) اہل اللہ اور علماء بسبب اس
اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ
کے کہ وہ اللہ کی کتاب کی حفاظت کا مطالبہ کیے گئے تھے، اور وہ لوگ اس پر گواہ تھے، پس لوگوں سے نہ ڈرا کرو اور مجھ سے ڈرو،
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اور میری آیات کے بدلے ثمن قلیل نہ لیا کرو، اور جو کوئی شخص فیصلہ نہیں کرے گا اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے مطابق

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ

پس یہی لوگ کافر ہیں (۴۴) اور ہم نے لکھا اُن یہودیوں پر اُس توراۃ میں کہ نفس کو نفس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا،

وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ

اور آنکھ کو آنکھ کے بدلے پھوڑا جائے گا، اور ناک کو ناک کے بدلے کاٹا جائے گا، اور کان کو کان کے بدلے کاٹا جائے گا،

وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ

اور دانت کو دانت کے عوض توڑا جائے گا، اور زخم بھی مساوات والے ہیں، پھر جو شخص اس قصاص کا صدقہ کردے تو یہ صدقہ کرنا

كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

اُس شخص کے لئے گناہوں کا کفارہ ہے، اور جو کوئی فیصلہ نہیں کرے گا اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے مطابق، پس یہی لوگ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ

ظالم ہیں (۴۵) ہم نے ان انبیاء کے نقشِ قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ

اس حال میں کہ وہ مصدِّق تھا اس توراۃ کا جو اس سے پہلے ہے، اور ہم نے اس کو اِنجیل دی،

فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ

اس اِنجیل میں بھی ہدایت اور نُور تھا، اور وہ اِنجیل تصدیق کرنے والی تھی اس توراۃ کی جو اس سے پہلے ہے،

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ؕ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ

اور راہنمائی کرنے والی تھی اور نصیحت تھی متقین کے لئے (۴۶) اہلِ اِنجیل کو چاہیے کہ فیصلہ کریں

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اس قانون کے مطابق جو اللہ نے اس اِنجیل میں اُتارا ہے، اور جو کوئی فیصلہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ کے اُتارے ہوئے قانون کے مطابق،

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

پس یہی لوگ فاسق ہیں (۴۷) اور ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری جو حق پر مشتمل ہے، تصدیق کرنے والی ہے

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

اُس کتاب کی جو اس سے پہلے ہے، اور یہ کتاب پہلی کتابوں پر نگہبان ہے، آپ فیصلہ کیجئے ان کے درمیان

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ

اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے مطابق، اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آگیا،

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے شریعت اور طریقت کو بنایا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تم سب کو ایک ہی جماعت

اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

بنا دیتا، لیکن تاکہ آزمائش کرے تمہاری اُس چیز میں جو تمہیں اُس نے دی ہے، بھلی باتوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلو،

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾

تم سب کا لوٹنا اللہ کی طرف ہی ہے، پھر خبر دے گا وہ اللہ تمہیں اُس چیز کی جس میں تم اختلاف کرتے تھے ﴿۴۸﴾

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور (ہم نے آپ کو حکم دیا ہے) کہ فیصلہ کریں آپ ان کے درمیان اس قانون کے مطابق جو اللہ نے اُتارا ہے،

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور ان کی خواہشات کے پیچھے نہ لگنا اور ان سے بچ کے رہنا کہیں آپ کو غلطی میں نہ ڈال دیں اس کے کسی حصے سے جو اللہ نے آپ کی

اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ

طرف اُتارا، پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھریں تو آپ یقین کر لیجئے کہ اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ

يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

مصیبت پہنچا دے ان کو ان کے بعض گناہوں کے عوض، اور بیشک بہت سے لوگ نافرمان ہی ہوتے ہیں ﴿۴۹﴾

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ تعالیٰ سے از روئے فیصلہ کے ان لوگوں کے نزدیک جو یقین رکھتے ہیں ﴿۵۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ: بیشک ہم نے تورات کو اتارا، اُس میں ہدایت ہے اور روشنی ہے۔ ہدایت اور روشنی دونوں کا مصداق علیحدہ علیحدہ بنالیں، عقائد ضروریہ کی راہنمائی ہے اور احکامِ عملیہ کی وضاحت ہے، یعنی اس میں عقائد بھی تلقین کیے گئے اور اس میں احکام جو عمل سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی بتائے گئے، يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ: فیصلہ کرتے رہے اس توراۃ کے ساتھ انبیاء، الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا: ایسے انبیاء علیہم السلام جو اللہ کے فرمانبردار تھے، لِلَّذِيْنَ هَادُوْا: فیصلہ کرتے رہے ان لوگوں کے لئے جو یہودی تھے، وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ: اس کا عطف النَّبِيُّوْنَ پر ہے، الرَّبّٰنِيُّوْنَ یہ جمع ہے رَبانی کی۔ ربانی: رب والا۔ یہاں سے صوفیہ اور درویش مراد ہیں جن کو عرف میں اہل اللہ کہا جاتا ہے، وَالْاَحْبَارُ: یہ حِبر کی جمع ہے اور حِبر عالم کو کہتے ہیں، تو احبار علماء کے معنی میں ہوگیا، تو ''اولیاء اور علماء'' ان دونوں لفظوں کا یہ مفہوم نکل آئے گا، جیسے کہ قرآنِ کریم میں انہی دو طبقوں کو ''رُھبان و اَحبار'' کے ساتھ دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا ہے، رُھبان سے مراد تارک الدنیا، درویش، اور اَحبار سے مراد اہلِ علم، مفتی، قاضی جو لوگوں کو مسئلے بتاتے ہیں، اور اس طرح سے ان کے فیصلہ جات کرتے ہیں، تو وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ کا عطف ہے النَّبِيُّوْنَ پر۔ ''فیصلہ کرتے رہے اسی تورات کے ساتھ انبیاء جو فرمانبردار تھے یہودیوں کے لئے اور اہل اللہ اور علماء'' بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ: اِسْتِحفاظ: حفاظت کا مطالبہ کرنا۔ بسبب اس کے کہ وہ حفاظت کا مطالبہ کیے گئے تھے اللہ کی کتاب کی، اللہ کی کتاب کی حفاظت کا مطالبہ کیے گئے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا، وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ: اور وہ لوگ اس تورات پر یا اس اللہ کی کتاب پر گواہ تھے، یا اس عہدِ استحفاظ پر اقراری تھے، کیونکہ شہادۃ علی النفس اقرار کے معنی میں ہے، اور وہ اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ہمیں اس کی حفاظت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، ''اللہ کی کتاب پر وہ گواہ تھے''، فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ: پس لوگوں سے نہ ڈرا کرو، وَاخْشَوْنِ: اور مجھ سے ڈرو، وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اور میری آیات کے بدلے ثمن قلیل نہ لیا کرو، وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جو کوئی شخص فیصلہ نہیں کرے گا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق، اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق جو شخص فیصلہ نہیں کرے گا، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ: پس یہی لوگ کافر ہیں۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ: اور ہم نے لکھا ان یہودیوں پر، فِيْهَآ: اس تورات میں، اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ: اَنَّ النَّفْسَ يُقْتَلُ بِالنَّفْسِ، کہ نفس کو نفس کے بدلے قتل کیا جائے گا، وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ: اور آنکھ کو آنکھ کے بدلے پھوڑا جائے گا، وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ: اور ناک کو ناک کے بدلے کاٹا جائے گا، وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ: اور کان کو کان کے بدلے کاٹا جائے گا، وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ: اور دانت کو دانت کے عوض توڑا جائے گا، وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ: اور ہم نے لکھا ان پر اس تورات میں کہ زخم بھی مساوات والے ہیں، ذاتُ قصاص، برابری والے ہیں یعنی زخموں کا بھی قصاص لیا جائے گا، فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ: پھر جو شخص اس قصاص کا صدقہ کردے، یعنی قصاص وصول نہ کرے بلکہ اللہ کی رضا کے لئے معاف کردے، فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ: تو یہ معاف کرنا، صدقہ کرنا اس شخص کے لئے گناہوں کا کفارہ ہے، لَهٗ کی ضمیر معاف کرنے والے کی طرف لوٹ گئی، اور اگر اس قاتل کی طرف یا جارح کی طرف لوٹائی

جائے تو بھی بات بن سکتی ہے کہ جو شخص اس قصاص کا صدقہ کردے تو یہ صدقہ کردینا اس قاتل کے لئے اس مجرم کے لئے اس کے گناہ کی تلافی ہے کہ اس نے جو جرم کیا تھا اس کے صدقہ کرنے کے ساتھ اس جرم کی تلافی ہوگئی، اب اس کو دوسری سزا نہیں ہوگی، وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جو کوئی فیصلہ نہیں کرے گا اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: پس یہی لوگ ظالم ہیں۔

وَقَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ: آثار اثر کی جمع نقشِ قدم۔ قَفّٰی: کسی کے پیچھے بھیجنا۔ ہم نے ان انبیاء کے نقشِ قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا، ان کے پیچھے بھیجا ان کے نقشِ قدم پر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو، مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ: مِنَ التَّوْرٰىةِ یہ ''مَا'' کا بیان ہے۔ اس حال میں کہ وہ مصدِّق تھا اس تورات کا جو اس سے پہلے ہے۔ مِنَ التَّوْرٰىةِ کو ''مَا'' کے ساتھ جوڑ کے ترجمہ کرلیا۔ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ: اور ہم نے اس کو انجیل دی، فِیْهِ هُدًی وَّنُوْرٌ: اس انجیل میں بھی ہدایت اور نور تھا۔ وہی بات! عقائد کی تفہیم، عقائد صحیحہ کی تلقین اور احکام عملیہ کی وضاحت، ہدایت اور نور اس میں بھی تھا، وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ: اور وہ انجیل تصدیق کرنے والی تھی اس تورات کی جو اس سے پہلے ہے، وَهُدًی وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ: اور راہنمائی کرنے والی تھی اور نصیحت تھی متقین کے لئے، مَوْعِظَةً مصدر میمی ہے وعظ کے معنی میں۔ ہدایت اور وعظ تھا متقین کے لئے۔ وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ: اہلِ انجیل کو چاہیے کہ فیصلہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے اس انجیل میں اتارا ہے، وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اور جو کوئی فیصلہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: پس یہی لوگ فاسق ہیں، فاسق یہ فسق سے لیا گیا ہے، فسق کا معنی ہوتا ہے: خروج عن الطاعة، یہ لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے کافر پر بھی بولا جاتا ہے، ظالم پر بھی بولا جاتا ہے اور فقہی فاسق اصطلاحی پر بھی بولا جاتا ہے، اس میں درجات نکل آئیں گے، اصل ہے: خروج عن الطاعة، طاعت سے نکل جانا، جو عقائد ضروریہ میں بھی طاعت نہیں کرتا وہ فاسق کافر بھی ہے، اور جو عقائد ضروریہ کے اندر تو طاعت کرتا ہے احکامِ عملیہ کے اندر مخالفت کرتا ہے تو ایسی صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا پھر فقہاء کے نزدیک وہ اصطلاحی فاسق کہلائے گا، تو قرآنِ کریم میں جو فسق کا لفظ آتا ہے یہ مشرک کافر ظالم سب پہ بولا جاسکتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: اور ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری واقع کے مطابق، ٹھیک ٹھیک، جو حق پہ مشتمل ہے، مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ: تصدیق کرنے والی ہے اِس کتاب کی جو اس سے پہلے ہے۔ تو یہاں کتاب جنس کے معنی میں ہو کے تورات وانجیل سب پہ بولا جائے گا، وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ: اور یہ آپ پر اتاری ہوئی کتاب اس پہلی کتاب کی مہیمن ہے۔ هَیْمَنَ: حفاظت کرنے اور نگرانی کرنے کے معنی میں، عربی میں محاورہ آتا ہے: ''هَیْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰی فِرَاخِهٖ'' جانور نے اپنے پرندوں کو اپنے احاطے میں لے کے محفوظ کرلیا، جس طرح سے مرغی اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو لے لیا کرتی ہے، اور پرندہ پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا اپنے بچوں کی نگہداشت کرتا ہے، اس کے لئے هیمن کا لفظ بولا جاتا ہے، تو یہ کتاب ایسی ہے کہ جس نے اپنے ضمن میں پہلی کتابوں کو لے کے ان کو محفوظ کرلیا، یہ معنی ہوگیا اس کا، یہ کتاب ان پہلی کتابوں کے لئے محافظ ہے، جو اس سے پہلی کتابیں اتری ہیں ان پر یہ نگہبان ہے، اِس نے اُن کو محفوظ کرلیا، فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: آپ فیصلہ کیجیے ان کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق، وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ: اور ان لوگوں کی

خواہشات کی اتباع نہ کیجیے، عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ: عَنْ تجاوز کے لئے ہے، مَا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ سے تجاوز کرتے ہوئے ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کیجیے، مَا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ جو حق آپ کے پاس آ گیا اس سے اعراض کرتے ہوئے اس کو چھوڑتے ہوئے ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کیجیے، یہ دو باتیں اکٹھی نہیں ہو سکیں گی کہ آپ اتباعِ حق بھی کریں اور اتباعِ اہواء بھی کریں، اگر ان کی خواہشات کے پیچھے لگ جائیں گے تو حق چھوٹ جائے گا۔ ''آپ ان کی خواہشات کی اتباع نہ کیجیے اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آ گیا'' یہ عن مجاوزۃ کے لئے ہے، ایک چیز سے درگزر کر جانا، چھوڑ جانا۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا: شِرْعَةً بھی راستے کو کہتے ہیں، منہاج بھی راستے کو کہتے ہیں، واضح راستہ، جرنیلی سڑک، تو شرعہ یہاں ہو جائے گا احکام کا مجموعہ، اور منہاج ہو جائے گا طرزِ عمل، ''ہم نے ہر ایک کے لئے تم میں سے شریعت اور طریقت کو بنایا۔'' ''بیان القرآن'' میں ترجمہ کرتے ہوئے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''منہاج'' کے لئے ''طریقت'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اور مفہوم اس کا یہی ہے راہِ عمل، طرزِ عمل، شرعہ ہو جائے گا احکام کا مجموعہ۔ ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے احکام متعین کیے اور ایک طرزِ عمل متعین کیا'' وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا، لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً: تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا، وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ: لیکن اس نے ابتداء سے ایک ہی جماعت نہیں بنائی، گاہے گاہے اَحکام کو بدلتا رہتا ہے، لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ، تاکہ آزمائش کرے تمہاری اس چیز میں جو تمہیں اس نے دی ہے، مَآ اٰتٰىكُمْ کا مصداق وہی اَحکام ہیں جو وقتاً فوقتاً اترتے رہتے ہیں، بسا اوقات پہلے اَحکام کے خلاف اتر آتے ہیں، پہلوں کو منسوخ کر دیا جاتا ہے، تو اس میں آزمائش کرنی مقصود ہے، فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ: اِسْتِبَاق: ایک دوسرے سے آگے نکلنا، سبقت لے جانا۔ بھلی باتوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلو، مفید باتوں کی طرف دوڑ دوڑ کے آؤ، فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کا لفظ مقابلۃً آ جائے گا يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ کے، کہ وہ لوگ تو کفر کی باتوں میں دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں، ہم تمہیں کہتے ہیں کہ مفید باتوں کی طرف اور بھلی باتوں کی طرف دوڑ دوڑ کے آؤ اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو، اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا: تم سب کا لوٹنا اللہ کی طرف ہی ہے، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: پھر خبر دے گا وہ اللہ تمہیں اس چیز کی جس میں کہ تم اختلاف کرتے تھے۔ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ: اَمَرْنَاكَ اَنِ احْكُمْ ہم نے آپ کو حکم دیا ہے کہ فیصلہ کر ان کے درمیان، بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اس اتارے ہوئے قانون کے مطابق جو اللہ نے اتارا ہے، اس کے مطابق جو اللہ نے قانون اتارا، وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ: اور ان کی خواہشات کے پیچھے نہ لگنا، وَاحْذَرْهُمْ: اور ان سے بچ کے رہنا، اَنْ يَّفْتِنُوْكَ: ان سے بچنا کے رہنا کہ یہ آپ کو غلطی میں ڈال دیں، لِئَلَّا يَفْتِنُوْكَ: کہیں آپ کو یہ غلطی میں نہ ڈال دیں، ان سے محتاط رہنا، عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ: آپ کو فتنے میں نہ ڈال دیں اس بعض سے جو اللہ نے آپ کی طرف اتارا، ''جو کچھ اللہ نے آپ کی طرف اتارا ہے اس کے کسی حصے سے آپ فتنے میں نہ ڈال دیں'' اس بارے میں محتاط رہیو، ہوشیار رہیو، یہ بڑے چالاک لوگ ہیں، باتوں میں چکر دے لیتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے کسی حصے سے غافل کر کے آپ سے کوئی غلط فیصلہ کروا لیں، یہ مفہوم ہے اس کا، ان کے ساتھ معاملہ ہوشیار ہو کے کرنا ہے، وَاحْذَرْهُمْ: ان سے محتاط رہیے لِئَلَّا يَفْتِنُوْكَ: تاکہ آپ کو پھسلا نہ دیں اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے کسی حصے سے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں، آپ کا حق فیصلہ قبول نہ

کریں، فَاعْلَمْ: تو آپ یقین کر لیجیے، اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّصِیْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ: کہ اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ مصیبت پہنچادے ان کو ان کے بعض گناہوں کے عوض، یعنی دنیا میں ان کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دے دے، باقی! اصل سزا ہر گناہ کی آخرت میں ہوگی، وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ: اور بیشک لوگوں میں سے بہت سے نافرمان ہی ہوتے ہیں، لوگوں میں سے کثیر البتہ فاسق ہیں، اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ: یہ جو آپ کے حق فیصلہ پر مطمئن نہیں ہوتے تو کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ تو جاہلیت یہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے خلاف ہے، یعنی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا فیصلہ نہیں چاہتے بلکہ اس کے خلاف وہ فیصلہ جو جہالت سے ناشی ہے، کیا یہ وہ فیصلہ چاہتے ہیں؟ جاہلیت والا فیصلہ چاہتے ہیں؟، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ: اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ تعالیٰ سے از روئے فیصلہ کے ان لوگوں کے نزدیک جو یقین رکھتے ہیں، یعنی کوئی نہیں، یقین والوں کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کسی کا نہیں ہوتا، اس لیے جو اللہ کا فیصلہ ہوگا اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا وہ نُور ہی نُور ہے، روشنی ہی روشنی ہے، اور اس کے خلاف جو فیصلہ بھی ہے وہ جاہلیت سے ناشی ہے، تو یہ اہل علم ہو کر اہل کتاب ہو کر کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ کون زیادہ اچھا ہے بمقابلہ اللہ کے از روئے فیصلہ کے ان لوگوں کے نزدیک جو کہ یقین لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رکوع کا مضمون

مضمون اہلِ کتاب کے متعلق چل پڑا تھا گزشتہ رکوع کی آخری آیات میں، جس میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ یہ لوگ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق فیصلے کے طالب ہیں، اگر وہ فیصلہ آپ کے ہاں ہو تو آپ کی طرف آجائیں گے، اور اگر آپ کے ہاں نہ ہو تو جہاں سے ان کو ان کی خواہش کے مطابق چیز ملے وہ ادھر کو بھاگتے ہیں، اور یہ چیز سراسر منافی ہے اُس عہد کے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا، اب اُسی کی تفصیل آگے بتائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بھی عہد لیا، اور انجیل میں بھی عہد لیا، اور اسی کا ان سے مطالبہ کیا گیا کہ تمہارے معاملات کا فیصلہ جو ہونا چاہیے اللہ کی کتاب کے مطابق ہونا چاہیے، لیکن یہ لوگ کُفر اختیار کرتے ہوئے ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے، فسق اختیار کرتے ہوئے اُن احکام سے روگردانی کررہے ہیں، انہوں نے وہ عہد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا باندھا تھا وہ توڑ دیا۔ اور پھر مقابلۃً سرورِ کائنات ﷺ کو تاکید کی جارہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف بھی ایک قانون اتارا ہے، آپ ہمیشہ اس قانون کے مطابق فیصلہ کیجئے، اگر آپ اُس قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ بھی راہِ راست سے ہٹ گئے، اور ان کی خواہشات کے متبع ہو گئے، سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے جو کچھ کہا جارہا ہے اصل کے اعتبار سے آپ کی اُمت کو سنانا مقصود ہے، کہ اہل کتاب والا طریق تم اختیار نہ کرنا کہ ہم نے انہیں کتاب دی تھی اور ان سے عہد لیا تھا کہ اس کے مطابق چلنا ہے، لیکن انہوں نے اُن احکام کو چھوڑا اور اپنی خواہشات کے متبع ہو گئے، ظلم کا ارتکاب کیا،

کُفر کا ارتکاب کیا، فسق کا ارتکاب کیا، تم اس راستے پر نہ چلنا، اگر ایسا کرو گے کہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کو چھوڑ کر اپنی مرضی کے ساتھ فیصلے کرو گے، تو تم علم سے جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ گے، یہ علم کا راستہ نہیں ہوگا، اس رکوع کے جو تین حصے ہیں تینوں کے اندر یہی بات بیان کی گئی، پہلا یہود کے متعلق ہے، دوسرا نصرانیوں کے متعلق ہے، اور تیسرا پھر اہلِ اسلام کے متعلق ہو جائے گا۔

توراۃ اور یہود کا تعارف .

پہلی آیات میں تو توراۃ کی عظمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ بے شک ہم نے توراۃ کو اُتارا، اِس حقیقت کا اعتراف ہے کہ توراۃ اللہ کی اتاری ہوئی ہے، اور ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ توراۃ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہے، اور اس کی عظمت یہ تھی کہ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ: اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر بہت ضروری ضروری باتوں کی وضاحت کر دی، عقائد بھی بتلائے اور احکام کی بھی وضاحت کی، اس میں راہنمائی ہے، روشنی ہے، جاہلیت کی تاریکی اس کتاب کے ساتھ دُور کی گئی، اور باطن میں جس قسم کے عقائد ضروری ہیں ان کی راہنمائی کی گئی، ''اُس میں ہدایت اور نُور ہے'' يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ: توراۃ اترنے کے بعد، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ اتری، تو اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی آئے ہیں وہ سارے کے سارے توراۃ کے ہی مبلغ تھے، اور ان کی عدالت میں فیصلے ہمیشہ اسی توراۃ کے مطابق ہی ہوتے تھے، اور یہ جو قوم تشکیل پائی تھی توراۃ کی طرف منسوب ہو کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتے ہوئے، یہ ''یہود'' کہلاتے تھے، یہ بنی اسرائیل کی قوم اُس وقت ''یہود'' کہلاتی تھی، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتے تھے، توراۃ کی طرف نسبت رکھتے تھے یہ یہودی ہیں، تو ان میں انبیاء علیہم السلام کثرت کے ساتھ آئے اور وہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ توراۃ کے مطابق ہی فیصلہ کرتے رہے یہودیوں کے لیے، یہودیوں کا کوئی معاملہ سامنے آتا تو فیصلہ توراۃ کے مطابق کرتے تھے، اور اُن نبیوں کے ساتھ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا کی قید کا اضافہ کر دیا، یہ صفت کاشفہ ہے، نبی ہمیشہ مسلم ہوتا ہے، اللہ کا فرمانبردار ہوتا ہے، وہ کبھی اللہ کے قانون کے خلاف نہیں کر سکتا، تو نبی کی شان ہے مسلم ہونا، فرمانبردار ہونا، یعنی وہ عظیم شخصیات جن کو ہم انبیاء علیہم السلام کے لفظ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں وہ سارے کے سارے اللہ کے فرمانبردار تھے، تو جب وہ اللہ کے فرمانبردار تھے اللہ کے قانون کے سامنے سرافگندہ تھے، تو پھر فیصلہ بھی تو انہوں نے اسی کے مطابق ہی کرنا تھا، تو جب انبیاء علیہم السلام مسلم ہیں اور اسلام کے حامل ہیں، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو نبھانے والے ہیں، تو جو ان انبیاء علیہم السلام کا نام لینے والے ہیں ان کو بھی مسلم ہونا چاہیے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کو اپنائیں اور اُسی کے مطابق فیصلہ کریں۔

''اولیاء'' اور ''علماء'' میں فرق اور ان دونوں طبقات کا طرزِ عمل

انبیاء علیہم السلام بھی ایسے کرتے رہے اور وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ: ان دونوں لفظوں کا معنی تو آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا، کہ ''اولیاء اللہ'' اور ''علماء'' یہ اس کا مصداق ہیں، لیکن ان دونوں لفظوں کی حقیقت کیا ہے؟ ''اولیاء اللہ'' جن کو ہم ''اللہ کے دوست'' کہتے ہیں، ہمارے عرف میں ان کے لئے ''صوفیہ'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، ''اولیاء اللہ'' بھی کہتے ہیں، ''صوفیہ'' بھی کہتے ہیں، ''صوفی'' میں اور ''عالم'' میں فرق کیا ہوتا ہے؟ یہ دو اصطلاحیں کس طرح سے بن گئیں؟ عرف کے اندر ''اولیاء اللہ'' اور ''علماء'' یہ دو

فرقے ممتاز کس طرح سے ہیں؟ تو اس کو آپ اس طرح سے سمجھئے، کہ صحیح علم حاصل کئے بغیر تو کوئی شخص بھی سیدھے راستے پر نہیں چل سکتا، صحیح علم حاصل کر لینے کے بعد پھر آگے دو طبقے بن جایا کرتے ہیں، بعض وہ ہیں جو عمل کی حیثیت کو ترجیح دیتے ہیں، اس لئے فرائض کے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ نوافل مستحبات کی بھی شدت کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اور اپنے اوقات کو نوافل اور مستحبات میں اور ذکر اذکار میں مشغول کر لیتے ہیں، جس کو عرف عام کے اندر عبادت کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، عبادت گزاری میں لگ گئے، اپنے تعمیرِ نفس میں لگ گئے، ذکر اذکار میں لگ گئے، پڑھنے پڑھانے کا اور علم کی اشاعت کا شغل وہ اختیار نہیں کرتے، علم ان کے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جہالت میں تو کوئی شخص بھی صحیح طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا، لیکن ان کی زندگی میں عملی پہلو غالب ہوتا ہے، ان کی زندگی علمی زندگی نہیں ہوتی کہ ہر وقت بحث مباحثے میں لگے ہوئے ہوں، لوگوں کے شکوک شبہات کے جواب دیتے ہوں، دلائل کے ساتھ کسی مدعا کو ثابت کرتے ہوں، لوگوں کو مسئلے بتاتے ہوں، اور اسی طرح سے کوئی غلط بات ماحول کے اندر رائج ہوگئی تو اُس کی دلائل کے ساتھ تردید کرتے ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ وعظ ونصیحت کے طور پر ادا کرتے ہوں، ایسے نہیں، بلکہ وہ گوشہ گیر ہو کر ہر وقت اللہ کی یاد میں اور فکرِ آخرت میں لگے ہوئے ہیں، اور مستحبات تک کی پابندی کرتے ہیں، ان کی زندگی کے اندر یہ عملی پہلو غالب آ جاتا ہے، علم کی نشر واشاعت ان کے ہاں زیادہ نہیں ہوتی، ان کو عرفِ عام کے اندر ''ولی اللہ'' کہہ دیتے ہیں، ''اولیاء اللہ'' کہہ دیتے ہیں، ''صوفیہ'' کہہ دیتے ہیں، ''درویش'' کہہ دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ ہوتے ہیں جو علمِ صحیح حاصل کر لینے کے بعد پھر اُن کی زندگی کے اندر یہ علم ہی رچ پچ جاتا ہے، فرائض ادا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے جو احکام عمل کے درجے میں ضروری ہیں ان کو پورا کرتے ہیں، پورا کرنے کے بعد نوافل اور مستحبات کی زیادہ پابندی نہیں کرتے، بلکہ پڑھنے پڑھانے میں، علم کی اشاعت میں، لوگوں کو سمجھانے میں، باطل کی تردید کرنے میں، حق کے ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں، ان کا رُجحان زیادہ تر مخلوق کی خدمت کی طرف ہوتا ہے علمی انداز میں، ان کو اصطلاح کے اندر ''علماء'' کہتے ہیں، اس طرح سے طرزِ عمل کے ساتھ یہ دو طبقے بن گئے، ایک ''صوفیہ'' کا اور ایک ''علماء'' کا، حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک ہی چیز ہیں، علم دونوں کے پاس ہوتا ہے، اگر کسی کے پاس علم نہ ہو تو وہ صحیح معنی میں ''درویش'' نہیں کہلا سکتا، اس کی درویشی قابلِ اعتماد نہیں ہوتی، جہالت میں اس کے عقیدے بھی خراب ہو جائیں گے اور اس کا عمل بھی سیدھا نہیں رہ سکتا، معلوم ہو گیا کہ ''اولیاء اللہ'' اور ''درویش'' یہ عالم ہوتے ہیں، ان کے پاس علم ہوتا ہے بقدرِ ضرورت، لیکن علم کا غلبہ نہیں ہوتا، اور جنہوں نے علم حاصل کیا وہ اگر عمل نہیں کریں گے تو وہ فاسق ہیں، قابلِ تعریف نہیں ہیں، اس لئے جو عالم فرائض پر بھی عمل نہیں کرتا، محرمات سے بھی نہیں بچتا، اُس کو تو کبھی بھی مدح کے عنوان سے ذکر نہیں کیا جائے گا، ایسا آدمی جاہل سے بھی بدتر ہوتا ہے جو جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی مخالفت کرے، وہ قابلِ تعریف نہیں ہوتے، ''علماء'' جن کی شان حدیث شریف کے اندر آتی ہے، اور جن کی تعریف آتی ہے، اس سے مراد وہی ہوتے ہیں کہ جن کی زندگی پر تو علم کا غلبہ ہے، لیکن عملی زندگی میں فرائض کے پابند ہیں، محرمات سے بچتے ہیں، اس درجے کا عمل ان کے اندر ہوا کرتا ہے، اگر وہ فرائض کے بھی پابند نہ ہوں محرمات سے بچتے نہ ہوں، اور ان پر ''فاسق'' کا لفظ صادق آئے تو ان کو مقامِ مدح

کے اندر ذکر نہیں کیا جاتا، تو ''علماء'' کو جو ''ورثۃ الأنبیاء'' کہا جاتا ہے تو اس جگہ ''علماء'' سے وہی ''علماء'' مراد ہوں گے جن پر ''فساق'' یا ''فجار'' کا لفظ نہ بولا جاسکے، ورنہ جب ان کے ساتھ ''فسق'' کا لفظ آجائے گا، ''فجور'' کا لفظ ان پر صادق آئے گا، تو انبیاء علیہم السلام کی وارثت سے ان کا کیا تعلق ہوا؟ لیکن فرق یہ ہوتا کہ وہ فرائض کی پابندی کرتے ہیں محرمات سے بچتے ہیں، لیکن باقی چیزوں میں، مستحبات اور نوافل وغیرہ کی، ذکر اذکار کی زیادہ پابندی نہیں کرتے، بلکہ اپنا باقی وقت علم کی نشر واشاعت میں لگادیتے ہیں، اس طبقے کو ''علماء'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

''عابد'' افضل ہے یا ''عالم''؟

اور سرورِ کائنات ﷺ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان دونوں طبقوں میں سے اہلِ علم کا مرتبہ زیادہ ہے، کیونکہ ان میں اِفادہ ہوتا ہے، اور دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی بات ہے، مخلوق کو راہِ راست پر لاتے ہیں، اس لئے ان کا درجہ اُس درویش کے مقابلے میں زیادہ ہے جو صرف اپنے تعمیرِ نفس میں لگا ہوا ہے، اللہ اللہ میں لگا ہوا ہے، اور لوگوں کے سامنے کوئی دِین کی اشاعت نہیں کرتا، ''مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم'' میں دو تین روایتیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے دو شخصوں کا ذکر آیا، ایک وہ تھا جس کو اِصطلاحاً ''عابد'' کہتے ہیں اور وہ ہر وقت عبادت میں لگا رہتا ہے، اور ایک وہ تھا کہ جس جو اِصطلاحاً ''عالم'' کہتے ہیں، کہ وہ اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور علم کی نشر واشاعت کرتا ہے، ان دونوں میں سے بہتر کون ہے؟ تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى أَدْنَاكُمْ'' عالم کی فضیلت عابد کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ کے مقابلے میں۔ اور وہاں (مشکوٰۃ میں) بین السطور میں لکھا ہوا ہوگا کہ ''فِيْهِ مُبَالَغَةٌ لَا تَخْفٰى'' اس میں اتنا مبالغہ ہے کہ جس میں کوئی خفاء نہیں، سرورِ کائنات ﷺ کی نسبت اُمتیوں میں سے ایک ادنیٰ کے ساتھ، کیا اندازہ کی جاسکتی ہے، عالم کی فضیلت عابد کے مقابلے میں اسی طرح سے ہے۔ پھر ایک روایت میں بیان فرمایا کہ عالم کے لئے ہوا کے اندر پرندے بھی اِستغفار کرتے ہیں، پانی کے اندر مچھلیاں بھی اُس کے لئے دُعا کرتی ہیں، بلوں کے اندر چیونٹیاں بھی اس کے لئے دُعا کرتی ہیں، اور فرشتے بھی اُس کی تعظیم کرتے ہیں کہ اس کے سامنے اپنے پَر چھوڑ دیتے ہیں، پَر جھاڑ دیتے ہیں، اپنے بازوؤں کو پست کرلیتے ہیں۔ یہ سارے کے سارے قصے جو ہیں عالم کے ساتھ ہوتے ہیں، جس سے کائنات کے اندر عالم کی عظمت کا نمایاں کرنا مقصود ہے، اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ عالم چونکہ دِین کا خادم ہوتا ہے، دِین کی نشر واشاعت کرتا ہے، اور نظامِ عالم قائم ہے اللہ کے نام کے ساتھ اور دِین کے ساتھ ہی، تو دِین کی بقاء چونکہ اہلِ علم کے طفیل ہے تو اس لئے ساری کائنات ان کا احسان مانتی ہے، جب تک یہ دِین باقی ہے، علم صحیح باقی ہے اس وقت تک زمین وآسمان اپنی جگہ قائم ہیں، اور جس دِن یہ علم صحیح ختم ہوجائے گا، اور گمراہی ہی گمراہی پھیل جائے گی تو زمین وآسمان ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، اللہ کا نام اگر باقی ہے تو انہی علمی خدمات کے ساتھ باقی ہے، جس کی بنا پر ساری کائنات ان کا احسان مانتی ہے، لیکن ہمیشہ یاد رکھئے کہ ''عالم'' سے مُراد وہی ہے جو کہ ضروری عمل کا پابند ہو، فرائض کا پابند ہو اور محرمات سے بچتا ہو۔

''عالم'' و ''عابد'' میں فرق شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

حضرت شیخ سعدیؒ نے اسی مضمون کو اپنے اس انداز کے ساتھ ادا کیا کہ:

صاحبدلے بمدرسہ آمد زخانقاہ بشکست عہد صحبتِ اہلِ طریق را

صاحبدل سے مُراد وہی جو ہر وقت دل کی طرف متوجہ رہتے ہیں، صوفی، مراقب، مراقبہ کرنے والے، مدرسہ کہتے ہیں طلبہ اور مولویوں کی جگہ کو، خانقاہ ہوگئی صوفیوں کی جگہ، درویشوں کی جگہ۔ وہ خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے آگیا، اہلِ طریقت کے ساتھ جو اس نے مصاحبت اختیار کی ہوئی تھی وہ مصاحبت اُس نے چھوڑ دی، صحبت کا عہد جو تھا وہ اس نے ترک کر دیا۔

گفتم میانِ عالم وعابد چہ فرق بود تا کردی اختیار ازاں ایں فریق را

میں نے اُس سے پوچھا کہ ''عالم'' اور ''عابد'' کے درمیان کیا فرق ہے کہ تو نے اُس گروہ کو چھوڑ کر اِس گروہ کو اختیار کرلیا، کیا وجہ ہے اس کی؟ دونوں کے درمیان میں کیا امتیاز ہے؟

گفت او گلیمِ خویش بدر میبرد زموج ویں جہد مے کند کہ بگیرد غریق را

وہ کہنے لگا کہ فرق یہ ہے کہ میں نے یوں دیکھا کہ جیسے سیلاب آیا ہوا ہو، ایک آدمی تو اپنی گدڑی کو سنبھال رہا ہے کہ کہیں یہ نہ بہہ جائے، وہ تو موج سے اپنے گلیم کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے، اور یہ شخص کوشش کر رہا ہے کہ ڈوبنے والوں کو پکڑ لے (گلستان، باب ۲، حکایت ۳۷)۔ تو عالم کی حیثیت ہے ڈوبنے والوں کو پکڑنے والے کی، کہ خود بھی نہ ڈوبے اور دوسروں کو ڈوبنے نہ دے۔ اور درویش کی حیثیت ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنی فکر میں لگا ہوا ہے اپنی گدڑی سنبھالنے میں، باقی مخلوق کو اُس کی طرف سے کوئی دینی افادہ نہیں ہوتا۔ تو جو اس طرح سے نوافل کی پابندی اور اس طرح سے اپنی عبادت کے اندر لگ جائے، کہ افادۂ دینی اُس کی ذات سے نہ ہو، یہ درویش کا مصداق ہے، راہب کا مصداق ہے، اور جو دین کی نشر و اشاعت کرتے ہیں وہ احبار اور علماء کا مصداق ہیں۔

کتاب اللہ کی حفاظت کا صحیح طریقہ

بہر حال اولیاء علماء اور انبیاء یہ سارے کے سارے ہی اس تورات کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ کیوں کرتے تھے؟ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ: کیونکہ ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم نے اللہ کی کتاب کی نگہبانی کرنی ہے، اللہ کی کتاب کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حفاظت یوں نہیں ہوتی کہ نسخہ لو اور کپڑے کے اندر لپیٹ کر الماری میں رکھ کر تالا لگا دو تا کہ اس کو چور نہ لے جائیں، یا تھوڑے دنوں کے بعد اٹھایا اور گرد جھاڑ دی اور دیکھ لیا کہ کہیں دیمک تو نہیں لگ گئی، اللہ کی کتاب کی حفاظت اس طرح سے نہیں ہوتی جس طرح سے ہم سمجھتے ہیں کہ ریشمی کپڑوں کے اندر لپیٹ لپیٹ کر رکھ لو، اور الماریوں میں بند کر کے رکھ لو کہیں اللہ کی کتاب ضائع نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حفاظت یوں ہوتی ہے، کہ اُس کو پڑھا جائے، سمجھا جائے اور اُس کے مطابق عمل کیا جائے، اور اگر پڑھنا چھوڑ دیا جائے، سمجھنا چھوڑ دیا جائے اُس کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دیا جائے تو اللہ کی کتاب ضائع ہوگئی، کیونکہ اللہ کی کتاب محض تبرک کے لئے نہیں اتری، کہ گھر

کے اندر اُس کو لپیٹ لپیٹ کر رکھ لو، یہ تو ایک عملی ہدایت نامہ ہے، جس کے مطابق اپنے عقیدوں کو ڈھالنا ہے اور جس کے مطابق عمل اختیار کرنا ہے، تو اس کی حفاظت اسی میں ہے کہ اس کو پڑھو، پڑھنے کے بعد اسی قسم کے عقیدے اختیار کرلو، اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کرو، تب تو آپ نے اللہ کی کتاب کو محفوظ رکھا، اور اگر اس کو پڑھا نہیں، سمجھا نہیں، اس کے مطابق عمل کیا نہیں، دوسروں کو اس کے مطابق چلانے کی کوشش نہیں کی، تو اللہ کی کتاب ضائع ہوگئی، تو ان سے یہ جو عہد لیا گیا تھا کہ تم نے اللہ کی کتاب کی حفاظت کرنی ہے، اسی عہد کا خیال کرتے ہوئے وہ ہمیشہ اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے، اور وہ اس عہدِ استحفاظ کے اقراری بھی تھے: وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ، یا اس کتاب اللہ پر وہ گواہ بھی تھے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اور وہ اس بات کو جانتے تھے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی ہے۔

''فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ...الخ'' کی دو تفسیریں

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ: اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام جو اس توراۃ کے حامل تھے، اسی طرح سے وہ ربانیون اور احبار جن کے اُوپر اس کتاب کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ اس کتاب پر عمل کرتے وقت، اس کو اپناتے وقت لوگوں سے نہیں ڈرنا مجھ سے ڈرنا ہے، لوگوں سے نہیں ڈرنا، کیا مطلب؟ کہ لوگوں سے ڈر کر اس حکم کی مخالفت نہیں کرنی، لوگوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس حکم کو چھوڑنا نہیں، مجھ سے ڈرتے رہنا ہے، کہ اگر کسی حکم کی مخالفت ہوئی تو میری طرف سے پکڑ ہوگی، تمہارے اوپر خوف اور خشیت میرا غالب ہونا چاہیے لوگوں کا نہیں، یہ گویا کہ عملی زندگی کو سیدھا رکھنے کے لئے ایک تاکید ہے، کہ اس کتاب کے مطابق چلو اور لوگوں سے اندیشہ نہ کرو، مجھ سے ڈرو، یہ نہ خیال کرنا کہ اگر ہم کتاب اللہ کے فلاں حکم پر چلیں گے تو لوگ ہمارا کچھ بگاڑ دیں گے، ہمارا نقصان کردیں گے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، میرا خوف تمہارے اُوپر غالب ہونا چاہیے۔ اس تقریر کے مطابق فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ کا خطاب اُس زمانے کے لوگوں کو ہی ہے جو کہ توراۃ کے حامل بنائے گئے تھے انبیاء، احبار، ربانیون۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کلام منتقل ہوگئی ہو موجودہ یہودیوں کی طرف، جو قرآنِ کریم کے نزول کے وقت میں موجود تھے، کہ ان پہلوں کا ذکر کر کے کہ تمہارے اَسلاف خواہ وہ انبیاء تھے، یا اولیاء تھے، یا علماء تھے، اس توراۃ کے مطابق چلتے رہے، اور دنیا کو چلاتے رہے، بدبختو! تم بھی اب لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو، تم نے لوگوں سے ڈرتے ہوئے اپنے مفاد کی خاطر جو اس کے اَحکام بدلنے شروع کردیئے، یہ تمہارے لئے مناسب نہیں ہے، تمہیں چاہیے کہ اپنے اسلاف کی طرح مجھ سے ڈرتے ہوئے ان اَحکام کی پابندی کرو، لوگوں سے اندیشہ نہ کرو، پھر یہ کلام متوجہ ہوجائے گی اُن یہودیوں کی طرف جو سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں موجود تھے، اور اپنے مفاد کی خاطر جنہوں نے احکام میں تحریف کرنی شروع کردی تھی، جس کا ذکر پچھلی آیات میں آپ کے سامنے کیا گیا۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا: اس کا بھی وہی مفہوم ہوا، کہ میری آیات کے بدلے دنیوی مفاد حاصل نہ کرو، دنیوی مفاد کی خاطر تم میری آیات کو بیچنا شروع کردو، رشوت لے لے کر تم احکام تبدیل کرنا شروع کردو، یہ تو تم لعلوں کو کوڑیوں کے بدلے بیچ رہے ہو، ان دونوں کی آپس میں مناسبت ہے؟ اللہ کے حکم کی کوئی قیمت ادا کرسکتا ہے؟ اس کے عوض میں جو بھی لوگے وہ ثمنِ قلیل

ہے، تو ایسا نہ کرو، اس کی قدر کرو، اللہ تعالیٰ کے احکام کو رشوت لے لے کر تبدیل نہ کرو۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا: دونوں طرح سے مفہوم ہوگیا، یا تو اُن کو یہ تاکید تھی یا اِن موجودہ لوگوں کو یہ کہا جا رہا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق جو فیصلہ نہیں کرے گا فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ: وہی لوگ کافر ہیں، اب یہاں ''کفر'' کا لفظ جو بولا گیا ہے تو کفر اصل کے اعتبار سے تو عقیدے کی خرابی کو کہتے ہیں، عقیدہ اگر صحیح ہو اور عمل کے اندر گڑبڑ ہو اس کے لئے اِصطلاحاً ''فسق'' کا لفظ بولا جاتا ہے، اور یہاں ''کفر'' میں دونوں طرح سے بات آسکتی ہے، غیر شرعی حکم کو شرعی حکم ظاہر کرتا ہے، یا شرعی حکم کو وہ مناسب نہیں سمجھتا، یہ عقیدے کی خرابی ہے تو حقیقتاً کافر ہے، اور اگر وہ دل سے اقرار تو کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسی طرح سے ہے، لیکن عملاً اُس کی مخالفت کرتا ہے تو یہ عملی کفر ہے، بہرحال ''کفر'' کا اطلاق دونوں طرح سے ہوسکتا ہے۔

شرائعِ سابقہ کے متعلق اُصول

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ: ان کے اُوپر ہم نے اس کتاب میں لکھ دیا تھا، چونکہ یہاں پیچھے وہی قتل کے معاملے میں دیت اور قصاص کے متعلق ان فریقوں کے درمیان کوئی غلط رَوِش تھی، جس معاملے کو وہ حضور ﷺ کے پاس لانا چاہتے تھے، تو اس کی مناسبت سے یہاں قصاص کے حکم کو واضح کردیا، اور جو حکم یہاں توراۃ کی طرف نسبت کرکے بیان کیا جارہا ہے ہماری شریعت میں بھی حکم یہی ہے، اُصولِ فقہ کی کتابوں میں آپ نے ایک اُصول پڑھا ہے، کہ انبیائے سابقین کی شریعت کا کوئی مسئلہ ہمارے سامنے نقل ہو کر آتا ہے اور قرآن وحدیث میں اس پر انکار نہیں کیا گیا، اُس کو نقل کیا گیا ہے اور اُس کے اوپر انکار نہیں کیا گیا، تو وہ حکم ہمارے لئے بھی باقی ہوتا ہے، شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا کا اُصول جہاں واضح کیا جاتا ہے وہاں یہ بات آپ کے سامنے ہوتی ہے، کہ جو حکم کتبِ سابقہ سے نقل کیا جائے، سرورِ کائنات ﷺ بیان فرمائیں یا اللہ تعالیٰ بیان فرمائے، اور اُس کے اُوپر انکار نہ کریں، یعنی اپنی کلام کے اندر اللہ نے یا اپنی کلام کے اندر حضور ﷺ نے اُس کے خلاف ہدایات نہیں دیں، ایسی صورت میں وہ حکم ہمارے لئے باقی ہے، تو یہاں بھی جو قصاص کا حکم ذکر کیا گیا ہے وہ حکم ہمارے لئے بھی اسی طرح سے باقی ہے، کہ اللہ نے یہاں اُس کو نقل کیا، نقل کرنے کے بعد اس کے اوپر کوئی انکار نہیں کیا۔

''قصاص اور دِیت'' کے کچھ اَحکام

''ہم نے ان کے اُوپر لکھ دیا توراۃ میں کہ جان جان کے بدلے ہے'' یعنی نفس قتل کیا جائے گا نفس کے بدلے، ''اور آنکھ آنکھ کے بدلے ہے'' یعنی آنکھ کو پھوڑا جائے گا آنکھ کے بدلے، آنکھ کے لئے ہمارے محاورے میں پھوڑنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے، ''اور ناک کو کاٹا جائے گا ناک کے بدلے'' یا ناک کو توڑا جائے گا ناک کے بدلے، ''کان کو کاٹا جائے گا کان کے بدلے، دانت کو توڑا جائے گا دانت کے بدلے'' دانت کے لئے توڑنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے، کاٹنے کا نہیں ہوتا۔ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ: اور یہ بات بھی ہم نے لکھ دی تھی کہ زخم بھی مساوات والے ہیں، کہ ایک شخص اگر کسی دوسرے کے زخم لگائے، جہاں مساوات ممکن ہو،

جہاں مساوات ممکن نہیں وہاں پھر دیت دی جایا کرتی ہے، زخموں کا قصاص وہیں لینا ہے جہاں مساوات ہو سکے، اور اس کی تفصیل آپ فقہ کے اندر پڑھتے ہیں، کہ کیسے زخم ہیں کہ جن کے اندر مساوات ہو سکتی ہے، اور کیسے زخم ہیں کہ جن کے اندر مساوات نہیں ہو سکتی، کمی بیشی کا اندیشہ ہوتا ہے، تو جن میں مساوات ہو سکے گی وہاں قصاص لیں گے، اور جن میں مساوات نہیں ہو سکے گی وہاں دیت ہوگی، یہ تفصیل آپ ''ھدایہ رابع'' میں ''کتاب الدیات'' میں پڑھیں گے۔ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ: اور جو کوئی شخص اس قصاص کا صدقہ کر دے، یعنی مقتول کے ورثاء معاف کر دیں، یا مجروح اپنے زخموں کا قصاص معاف کر دے، فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ: اس میں معاف کرنے کی ترغیب ہے، کہ یہ صدقہ کرنا معاف کرنا اُس کے لئے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، یا دوسرے ترجمے کے مطابق لَهٗ کی ضمیر قاتل کی طرف یا جارح کی طرف لوٹائی جائے، یعنی مجرم کی تاویل سے، تو معنی ہوگا کہ اُس کا معاف کرنا مجرم کے لئے اُس کے جرم کا کفارہ ہے، کہ پھر اُس کا جرم معاف ہو گیا، اب اُس کے جرم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی اگر صاحبِ حق معاف کر دے، اس طرح سے بھی اس کا مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔ ''اور جو کوئی شخص فیصلہ نہیں کرے گا اس قانون کے مطابق جو اللہ نے اُتارا ہے پس یہی لوگ ظالم ہیں'' تو ظالم کا لفظ بھی ایسے ہی ہے، ظلم بھی دونوں طرح سے بولا جاتا ہے کفر و شرک کے لئے بھی ظلم کا لفظ بولتے ہیں اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳)، اسی طرح سے عملی کوتاہی پر بھی ظلم کا لفظ بولا جاتا ہے۔

تمام انبیاء ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں

وَقَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ: ان کے نقشِ قدم پر، پہلے نبیوں کے نقشِ قدم پر ہم نے پیچھے بھیجا مریم کے بیٹے عیسیٰ کو۔ ''نقشِ قدم'' کی صراحت کر دی جس سے معلوم ہو گیا کہ ہر پیچھے آنے والا نبی اُسی قسم کے طرزِ عمل کا حامل ہوتا ہے جو پہلے انبیاء علیہم السلام کا تھا، ان کی آپس میں ایک قدم کے اندر بھی مخالفت نہیں ہوتی، وہ ایک دوسرے کے بالکل نقشِ قدم پر چلتے ہیں، اس لئے جب سے دُنیا بنی ہے حق کا سلسلہ مسلسل ہے، ہر پیچھے آنے والا نبی پہلے نبی کا مصدِّق ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی درخت کے یہ سارے کے سارے برگ و بار ہیں، ان کی آپس میں کوئی مخالفت نہیں ہے، ان میں ٹکراؤ نہیں ہوتا، ''انہی کے نقشِ قدم پر ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، وہ توراۃ کی تصدیق کرنے والے تھے جو ان سے پہلے ہے، اس کا مصداق بننے والے تھے، اور ہم نے اسے اِنجیل دی، اِنجیل میں بھی ہدایت اور نُور'' جس طرح سے توراۃ ہدایت اور نُور کی حامل تھی، اِنجیل بھی ہدایت اور نُور کی حامل ہے، یہ عظمت ہے اس کتاب کی، ''اور یہ اِنجیل اس کتاب کے لئے مصدق تھی جو اس سے پہلے اُتری'' یعنی توراۃ کی تصدیق کرنے والی ہے، ''اور راہنمائی ہے اور نصیحت ہے متقین کے لئے'' اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے اس میں وعظ موجود ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے اس میں راہنمائی موجود ہے، اِنجیل کی یہ عظمت ہے، اور ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اِنجیل بھی اللہ کی طرف سے آئی، اور وہ بھی ہدایت اور نُور کی حامل تھی، تو اصل چیز جو بھی اِنجیل کی ہے وہ اب بھی ہدایت اور نُور کا مصداق ہے۔ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ: اِنجیل والوں کو چاہیے کہ فیصلہ کریں وہ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق، یعنی جو حکم اللہ نے اِنجیل میں اُتارا، جو ضابطہ اللہ نے اِنجیل میں دیا، اُس

کے مطابق وہ فیصلہ کریں۔ "اور جو کوئی فیصلہ نہیں کرے گا اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے مطابق یہی لوگ فاسق ہیں" تو یہودیوں نے توراۃ کو عملاً ترک کر دیا وہ بھی کافر ٹھہرے، ظالم ٹھہرے، اور اہلِ انجیل نے انجیل کو عملاً ترک کر دیا تو وہ بھی فاسق ٹھہرے، "فاسق" کا لفظ اپنے مفہوم کے اندر ظلم اور کفر کو بھی لئے ہوئے ہے۔ یہ دو کتابیں ہو گئیں۔

تمام کُتبِ آسمانی درحقیقت ایک ہیں

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ: اب تیسرے نمبر پر یہ قرآنِ کریم آ گیا، ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری واقع کے مطابق، جس میں حق ہی حق ہے، یہ تصدیق کرنے والی ہے اُس کتاب کی جو اس سے پہلے گزری۔ الْكِتٰبَ کا لفظ مفرد اختیار کیا گیا، کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی جانب سے کتاب ایک ہی ہے، اس کے مختلف ایڈیشن ہیں جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ اُتارتا رہا، جس میں سے کسی حکم کو منسوخ کر دیا، کسی کا اضافہ کر دیا، تو اللہ تعالیٰ کتاب بنانے والا ہے، جو بھی کتاب ہے حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت کو لئے ہوئے ہے، باقی جس طرح سے ایڈیشن مختلف ہو جایا کرتے ہیں، آج کل کی اصطلاح میں، یہ پہلا ایڈیشن ہے، یہ دوسرا ہے، یہ تیسرا ہے، اور آخری ایڈیشن آ گیا قرآنِ کریم کی شکل میں، اب یہی کتاب ہے جس کی اتباع ہدایت ہے، نہ انبیاء علیہم السلام کے مزاج میں فرق، نہ انبیاء علیہم السلام کے طرزِ عمل میں فرق، سارے کے سارے اپنے وقت پہ اللہ کے احکام کے پابند ہوتے ہیں، مسلم ہوتے ہیں، اسلام کے حامل ہوتے ہیں، اسی طرح سے اللہ کی طرف سے جو کتاب آئے وہ ایک ہی حقیقت کو لیے ہوئے ہوتی ہے، جو لوگوں کو عبادت سکھاتی ہے اور فرمانبرداری سکھاتی ہے، باقی! وقت کے تقاضوں کے تحت اللہ تعالیٰ بعض اُحکام کے اندر تغیر تبدل کر دیتے ہیں۔

کُتبِ سابقہ کی حقانیت کی حفاظت قرآنِ کریم نے کی ہے

مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ کا یہی معنی ہے، یہ موجودہ کتاب جو ہم نے آپ پر اُتاری یہ پہلی کتاب کی محافظ ہے، محافظ ہونے کا یہ معنی کہ ان کی حقانیت پر اِس نے شہادت ثبت کر دی کہ وہ کتابیں صحیح ہیں، اور اُن کے اندر جو حقیقتیں تھیں وہ ساری کی ساری اِس نے اپنے اندر محفوظ کر لیں، اب اگر قرآنِ کریم نہ اُترا ہوتا، اور توراۃ کی صحیح حیثیت قرآن نے واضح نہ کی ہوتی، اسی طرح سے اِنجیل کا صحیح تعارف قرآن نے نہ کرایا ہوتا، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی صداقت کی شہادت اِس کتاب نے نہ دی ہوتی، آج ان حالات کو دیکھ کر جس میں یہودی مبتلا ہیں یا عیسائی مبتلا ہیں، یا ان کتابوں کو دیکھ کر جس حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہیں، کون یقین کر سکتا تھا کہ یہ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہیں، ایسی ایسی خرافات ان کتابوں کے اندر لوگوں نے تحریف کر کے بھر دیں کہ کوئی دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی توراۃ ہے جو اللہ نے اُتاری تھی جو نُور اور ہدایت کی حامل تھی، ان سب کتابوں کی حقانیت کی حفاظت اِس قرآن نے کی ہے، انبیاء علیہم السلام کے مقام کی عظمت اِسی قرآن نے محفوظ رکھی ہے، اور کتابوں کی حقانیت کو بھی اسی نے باقی رکھا ہے۔

"آپ اِن کے درمیان فیصلہ کیجئے اُس اتارے ہوئے قانون کے مطابق جو اللہ نے اتارا، اور ان کی خواہشات کے پیچھے نہ لگیں" اور قانونِ الٰہی کے خلاف جو بھی جذبہ ہوتا ہے وہ سب خواہشات ہیں، مَا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ کو چھوڑ کر، جو حق آپ کے پاس آ گیا اُس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے۔

شریعت اور طریقت میں فرق

لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا: ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے شریعت اور طریقت بنائی، شریعت اُحکام کا مجموعہ ہوگیا، اور طریقت سے مراد اس پر عمل کرنے کا طرز۔ ہمارے ہاں یہ دو لفظ جو بولے جاتے ہیں کہ ایک شریعت ہے ایک طریقت ہے، دونوں کے درمیان میں کوئی فرق نہیں، طریقت طرزِ عمل ہے، جب انسان احکامِ شریعت کے مطابق چلتا ہے تو اُس کا چلنا بھی طریقت ہے، ''اہلِ طریقت'' انہی کو کہا جاتا ہے جن کا تعارف پہلے میں نے آپ کو ''صوفیہ'' کے لفظ سے کروایا، وہ چونکہ عملی زندگی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، اس لئے وہ ''اہلِ طریقت'' کہلاتے ہیں، ورنہ شریعت اور طریقت میں فرق نہیں، شریعت علم ہے، طریقت عمل ہے، تو جو شخص اُحکام کا ماہر ہے اور اُس کے مطابق عمل کرتا ہے وہ اہلِ شریعت بھی ہے، اہلِ طریقت بھی ہے۔

ہر زمانے میں الگ الگ اُحکام بھیجنے کا مقصد

ہر زمانے کے لحاظ سے طرزِ عمل مختلف ہوا، ایک مثال کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ اصل مطلوب تو ہے اللہ تعالیٰ کے لیے بندے کی طرف سے عبادت، لیکن عبادت کا معنی ہے احکام کی فرمانبرداری، اس کی شکلیں مختلف دور میں بدل سکتی ہیں، جیسے ہمارے ہاں بھی ایک وقت میں فرمانبرداری کا اظہار نماز پڑھنے سے ہوتا ہے، اور ایک وقت میں فرمانبرداری کا اظہار نماز چھوڑنے سے ہوتا ہے، دوپہر کو نماز چھوڑنا فرمانبرداری ہے، اور وقت پر پڑھنا فرمانبرداری ہے، ایک وقت میں عبادت کا اظہار روزہ رکھنے سے ہوتا ہے، اور ایک وقت میں عبادت کا اظہار روزہ چھوڑنے سے ہوتا ہے، اس طرح سے حقیقت ایک ہے جس کا مطالبہ اللہ بندوں سے کرتا ہے، باقی اُس کے طرزِ عمل مختلف ہیں، عمل کا طریقہ کسی کو کس طرح سے دے دیا، کسی کو کوئی طریقہ دے دیا، یہ طرزِ عمل کا اختلاف ہے، یعنی حقیقت ایک ہے اس کی صورتیں مختلف ہیں جو اللہ تعالیٰ وقت کے تقاضے کے تحت اپنے بندوں کو دیتے ہیں۔ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ابتدا سے ایک ہی قانون اور ایک ہی طرزِ عمل متعین کر دیتا'' ایسا بھی ہوسکتا تھا، لیکن یہ جو آزمائش اللہ نے کرنی تھی، کہ مختلف اوقات میں مختلف انبیاء علیہم السلام آئیں، مختلف احکام آئیں، تاکہ لوگ اپنے خاندانی رسم و رواج کو اور پہلے جن کے ساتھ عقیدت ہے ان شخصیات کے طرزِ عمل کو چھوڑ کر دوسرے کے طرزِ عمل کو اختیار کریں، اور نئے آنے والے احکام کو قبول کریں، اس میں امتحان زیادہ ہے، ''لیکن اللہ تعالیٰ نے مختلف اُحکام بھیجے تاکہ تمہاری آزمائش کرے اس چیز میں جو تمہیں دی ہے'' فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ: پس تم دوڑ کر آیا کرو بھلی باتوں کی طرف، مفید باتوں کی طرف، نیکی کی باتوں کی طرف دوڑ دوڑ کر آؤ، یہود کی طرح کُفر کی طرف دوڑ دوڑ کر نہ جاؤ، خیرات میں مقابلہ کر و ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے، ''اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تم سب کا لوٹنا ہے، پھر وہ خبر دے گا تمہیں ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔''

قانونِ خداوندی کو عملاً اپنانے کی تاکید

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ: یہ دوبارہ پھر تاکید کر دی کہ ہم نے آپ کو یہ حکم دیا ہے، اور آپ کو حکم دینے کے ساتھ ساتھ

اُمت کواس بات کا پابند کرنا مقصود ہے کہ دیکھنا کہیں یہود ونصاریٰ کی طرح اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے، ''ان کے درمیان فیصلہ کیجئے آپ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق، اوران کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے، اور محتاط رہیے کہ یہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے کسی حصے سے آپ کو پھسلا نہ دیں'' کتنی بار بار تاکید کی جارہی ہے، لیکن حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ جس طرح سے پہلی اُمتوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توزینت طاق بنادیا، اوراپنی زندگی کے لئے طرزِ عمل خود تجویز کرلیا، آج ہماری اجتماعی زندگی میں بالکل وہی صورت آئی ہوئی ہے جو کہ یہود ونصاریٰ میں تھی، اسلامی ممالک جن کے اندر مسلمان مختار ہیں، جو چاہیں قانون بنائیں اوراس کے مطابق عمل کرلیں، آج بھی دیکھ لیں کہ کہاں تک مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی پابندی ہے، کتاب کی عظمت کا اقرار کریں گے، چوم چاٹ کررکھیں گے، کپڑوں میں سنبھال کررکھیں گے، لیکن طرزِ عمل اپنے طور پر تجویز کرلیا، قانون قاعدہ اپنے ذہن سے بنالیا یا یہود ونصاریٰ سے لے لیا، وہ ساری کی ساری بربادی جس طرح سے پہلی امتوں کے اندر آئی تھی اس اُمت کے اندر بھی اسی طرح سے سرایت کرآئی، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی رعایت ہم میں بھی نہیں رہی۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: پھر اگر یہ لوگ پیٹھ پھیریں فَاعْلَمْ: تو آپ یقین کرلیجئے کہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کوان کے گناہوں کی وجہ سے مصیبت پہنچانا چاہتا ہے۔ انفرادی گناہوں کی سزا تو زیادہ تر قیامت میں ہوگی، اور جو قوم اجتماعی فرض سے غفلت برتتی ہے، جیسے یہ اجتماعی فرض ہے کہ ساری کی ساری قوم مل کر اللہ کے قانون کے مطابق زندگی گزارے، اجتماعی فرض سے فروگزاشت جو ہوا کرتی ہے، اوراجتماعی کوتاہی جو ہوا کرتی ہے، اُس کی سزا اکثر وبیشتر امتیں قومیں دنیا میں بھگتتی ہیں، اور یہی حال ہورہا ہے مدعیانِ اسلام کا بھی۔ ''بے شک لوگوں میں سے بہت سارے لوگ نافرمان ہیں'' وہ اللہ کے اَحکام کی پابندی نہیں کرتے، یہ جو مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے حکم پر مطمئن نہیں ہوتے، تو ''کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟'' یعنی ان دونوں باتوں میں ذرا موازنہ تو کرکے دیکھو، ایک ہے ایسا فیصلہ جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نُور کے مطابق ہے، اور ایک ایسا فیصلہ ہے جو ظلمت ہی ظلمت ہے، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے خلاف جو فیصلہ ہوگا وہ جاہلیت ہے، اور جاہلیت کسی کو قبول نہیں کرنی چاہیے، اور جو بھی اللہ کے قانون کے خلاف فیصلہ چاہتے ہیں وہ سب جاہلیت کی طرف جانا چاہتے ہیں، گویا کہ ہروہ قانون جو کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق نہ ہو وہ جہالت ہے، چاہے وہ قرونِ مظلمہ کا، تاریک دور کا بنا ہوا ہو، آج سے چودہ سو سال پہلے کا، جہالت کے دور کا، جس کو ساری دنیا کہتی ہے کہ وہ بے علمی کا دور تھا، اور چاہے وہ آج بیسویں صدی کی مصنوعی روشنی کے ضمن میں بنایا گیا ہو، بہرحال وہ ساری کی ساری جاہلیت ہے، کوئی جاہلیتِ قدیمہ ہے، کوئی جاہلیتِ جدیدہ ہے، نُور اگر ہے تو اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے مطابق چلنے میں ہے، ورنہ ساری کی ساری جہالت ہے، ''تو کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟، کون زیادہ اچھا ہے اللہ کے مقابلے میں ازروئے فیصلہ کے ان لوگوں کے نزدیک جو کہ یقین لاتے ہیں۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بنایا کرو، ان میں سے بعض

اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي

بعض کے دوست ہیں، اور جو کوئی شخص ان سے دوستی لگائے گا تم میں سے، پس بیشک وہ انہی میں سے ہے، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ

لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۵۱﴾ پھر دیکھتا ہے تو ان لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں

فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ

ان (یہود ونصاریٰ) میں، کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی گردش پہنچ جائے، پھر اُمید ہے کہ لے آئے گا اللہ تعالیٰ

بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

فتح یا کوئی اور اَمر اپنے پاس سے، پھر ہو جائیں گے یہ لوگ اُس چیز پر جس کو یہ چھپاتے تھے اپنے دلوں میں

نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا

شرمسار ﴿۵۲﴾ اور کہیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کیا یہی لوگ ہیں جو اللہ کی قسمیں کھایا کرتے تھے

بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا

پختہ قسمیں، کہ بے شک وہ تمہارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال ضائع ہوگئے، پس وہ ہوگئے

خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ

خسارہ پانے والے ﴿۵۳﴾ اے ایمان والو! جو کوئی شخص پھر جائے گا تم میں سے اپنے دین سے

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ

پس قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا ایسی قوم کہ اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے، نرم ہوں گے وہ

عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا

مومنوں پر، دشوار ہوں گے کافروں پر، جہاد کریں گے اللہ کے راستے میں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا

يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

اندیشہ نہیں کریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، دیتا ہے یہ فضل جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے

عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

علم والا ہے ﴿۵۴﴾ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمہارا دوست اللہ ہے اور اُس کا رسول اور ایسے مؤمن لوگ جو نماز کو قائم

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ

کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں ﴿۵۵﴾ اور جو کوئی دوستی لگائے اللہ کے ساتھ

وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور اُس کے رسول کے ساتھ اور مؤمنوں کے ساتھ، پھر بے شک اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غلبہ پانے والا ہے ﴿۵۶﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا

اے ایمان والو! دوست نہ بناؤ ان لوگوں کو جو تمہارے دِین کو ٹھٹھہ اور کھیل

وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ

بناتے ہیں ان لوگوں میں سے جو کتاب دیئے گئے تم سے قبل اور نہ بناؤ کُفّار کو دوست،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان لانے والے ہو ﴿۵۷﴾ اور جب تم آواز دیتے ہو نماز کی طرف بُلانے کے لیے

اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

تو یہ اس کو ٹھٹھہ اور کھیل بناتے ہیں، یہ اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے ﴿۵۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ: اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بنایا کرو۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ ولی: دوست، خاص طور پر جس سے دِلی تعلق ہو۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: اُن میں سے بعض بعض کے دوست ہیں، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ: اور جو کوئی شخص ان سے دوستی لگائے گا، مِّنْكُمْ: تم میں سے، فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ: پس بیشک وہ انہی

میں سے ہے، إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّلِمِينَ: بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا، ان کے مقصد تک نہیں پہنچاتا، فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ: پھر دیکھتا ہے تو ان لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے، اور اس بیماری سے مراد ہے نفاق، يُسَارِعُونَ فِيهِمْ: دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں ان یہود ونصاریٰ میں، يَقُولُونَ: کہتے ہیں، نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ: ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی گردش پہنچ جائے۔ دَآئِرَةٌ: گردش، فَعَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ: پھر اُمید ہے کہ لے آئے گا اللہ تعالیٰ فتح، أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ: یا کوئی اور اَمر اپنے پاس سے، فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ: پھر ہوجائیں گے یہ لوگ اس چیز پر جس کو یہ چھپاتے تھے اپنے دلوں میں، ہوجائیں گے شرمسار، پچھتانے والے، وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا: اور کہیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ: کیا یہی لوگ ہیں جو اللہ کی قسمیں کھایا کرتے تھے پختہ قسمیں، جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ: مُجْتَهِدِينَ فِي تَوْكِيدِ أَيْمَانِهِمْ ''قسمیں کھاتے تھے اللہ کی اس حال میں کہ ان قسموں کے پختہ کرنے میں پوری کوشش کرنے والے تھے'' ترکیبی معنی اس طرح سے ہوگا، اور حاصل ترجمہ اس طرح سے ہوجاتا ہے کہ کیا یہی لوگ تھے جو اللہ کی پختہ قسمیں کھایا کرتے تھے؟، إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ: کہ بیشک وہ تمہارے ساتھ ہیں، حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ: ان کے اعمال ضائع ہوگئے، فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ: پس وہ ہوگئے خسارہ پانے والے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: اے ایمان والو!، مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ: جو کوئی شخص پھر جائے گا تم میں سے اپنے دین سے۔ اِرْتَدَّ: لوٹنا۔ رَدَّ يَرُدُّ: لوٹانا۔ اِرْتَدَّ: لوٹنا۔ مرتد ہوجانا جسے ہم کہتے ہیں، مُرتد اُسے کہتے ہیں جو اپنے دِین سے پھر جائے۔ ''جو کوئی لوٹ جائے گا تم میں سے اپنے دین سے'' فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ: پس قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا ایسی قوم۔ بِقَوْمٍ میں باءِ تعدیہ کی ہے اس لیے اَتیٰ یَاْتِیْ آنا اور جب باءِ تعدیہ کی آگئی تو ''لانا'' کا معنی ہوگیا۔ قریب ہے کہ لے آئے گا اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم، يُحِبُّهُمْ: اللہ ان سے محبت کرے گا، وَيُحِبُّونَهُ: اور وہ لوگ اللہ سے محبت کریں گے، أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ: أَذِلَّةٍ یہ ذلیل کی یا ذلول کی جمع ہے، نرم، مطیع، فرمانبردار۔ ''نرم ہوں گے وہ مؤمنوں پر'' أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ: أَعِزَّةٍ، عزیز کی جمع ہے، گراں اور بھاری۔ ''دُشوار ہوں گے کافروں پر'' يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ: جہاد کریں گے اللہ کے راستے میں، وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ: اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے، ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈریں گے نہیں، ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ: ان صفات کا حاصل ہوجانا یہ اللہ کا فضل ہے، يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ: دیتا ہے یہ فضل جس کو چاہتا ہے، وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے۔ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ: سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمہارا دوست اللہ ہے اور اس کا رسول، وَالَّذِينَ آمَنُوا: اور مؤمن لوگ، الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ: ایسے مؤمن لوگ جو نماز کو قائم کرتے ہیں، وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ: اور زکوۃ ادا کرتے ہیں، وَهُمْ رَاكِعُونَ: اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں، وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا: اور جو کوئی دوستی لگائے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور مؤمنوں کے ساتھ، فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ: یہ الفاظ دال بر جزاء ہیں، اور مَن يَتَوَلَّ کی جزاء محذوف ہے۔ ''جو کوئی اللہ سے دوستی لگائے اور اس کے رسول سے اور مؤمنوں سے وہ اللہ کا گروہ ہے'' یہ لفظ یہاں جزاء کے طور پر محذوف نکالے جائیں گے، یہ اللہ کی پارٹی ہے، اللہ کا گروہ ہے، فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ: پھر بیشک اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غلبہ پانے والا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ

اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا: اے ایمان والو! نہ بناؤ ان لوگوں کو جو تمہارے دین کو ٹھٹھہ اور کھیل بناتے ہیں، نہ بناؤ ان کو دوست، لَا تَتَّخِذُوا: نہ بناؤ تم، الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا، جو لوگ بناتے ہیں تمہارے دین کو هزو، ہنسی، وَّلَعِبًا: اور کھیل، مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ: یہ مِن بیانیہ ہے، یعنی وہ لوگ جو کتاب دیے گئے تم سے قبل اور کُفار، نہ بناؤ ان لوگوں کو جو تمہارے دِین کو ٹھٹھہ اور کھیل بناتے ہیں ان لوگوں میں سے جو کتاب دیے گئے تم سے قبل، اور نہ بناؤ تم کافروں کو، دوسرا مفعول آ گیا اَوْلِيَآءَ، دوست نہ بناؤ، نہ ان اہلِ کتاب کو دوست بناؤ جو تمہارے دِین کا مذاق اُڑاتے ہیں، اور نہ کافروں کو دوست بناؤ، تو کُفّار یہ عام آ گیا اور الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا ذکر پہلے خصوصیت کے ساتھ کر دیا گیا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان لانے والے ہو، وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ: اور جب تم آواز دیتے ہو نماز کی طرف بلانے کے لئے، نَادَيْتُمْ نداء سے ہے۔ نداء: بلند آواز دینا، اور یہاں سے اذان مراد ہے۔ ''اور جب تم پکارتے ہو نماز کی طرف'' اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا: تو یہ اُس نداء کو جو نماز کی طرف دی جاتی ہے یا اس نماز کو ٹھٹھہ اور کھیل بناتے ہیں، بناتے ہیں یہ اس اذان کو ہزو اور لعب، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ: اور یہ اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے، یا وہ لوگ سوچتے نہیں ہیں۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضامین

پچھلی آیات میں آپ کے سامنے یہ مضمون وضاحت کے ساتھ آیا، کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتاب میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَحکام آئے ہوئے تھے ان کو چھوڑ کر خواہشات کی اتباع اختیار کر لی، اور جب کوئی جھگڑا فساد ہوتا تھا تو فیصلہ اللہ کے اُتارے ہوئے آئین کے مطابق نہیں کرتے تھے، بلکہ انہوں نے اپنے فیصلے کے لیے اپنے ضابطے بنا لیے، اور اللہ تعالیٰ کے دِین کو اور اُس کے بتائے ہوئے قانون کو نظرانداز کر دیا، اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کوشش کرتے تھے، کہ اہلِ ایمان کو بھی ان کے طریقے سے پھسلا دیں، اور انہیں بھی اسی قسم کی غلطیوں میں ڈال دیں، جیسا کہ پچھلی آیت میں ذکر کیا گیا تھا وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ: سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا تھا کہ اس بات سے محتاط رہیے کہ کہیں آپ کو اللہ تعالیٰ کے اُتارے ہوئے قانون کے کسی حصے سے یہ پھسلا نہ دیں، جس کے پس منظر میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مغالطہ دے کر غلط فیصلہ کروانے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ تفاسیر میں اس آیت کے شانِ نزول میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے درمیان کوئی جھگڑا تھا، اور ان میں ایک فریق ایسا تھا جو اہلِ علم میں سے تھا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر کچھ اس قسم کی باتیں کرنے لگے کہ ہم فیصلہ آپ کے پاس لے کر آئیں گے، اور آپ کو معلوم ہے کہ ہم ذی حیثیت ہیں، لوگ ہمارے پیچھے چلتے ہیں،

اگر آپ نے فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق کردیا، تو ہم مسلمان ہو جائیں گے، اور ہماری وجہ سے پھر دوسرے لوگوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا، یعنی وہ سمجھتے تھے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو اسلام کی اشاعت سے زیادہ پسند کوئی چیز نہیں ہے، اور رشوت میں ہمیشہ وہی چیز دی جایا کرتی ہے جو پسندیدہ ہوتی ہے، تو اس طرح سے حضور ﷺ کو متأثر کر کے خاص طور پر اسلام کی اشاعت کا واسطہ دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ کروانا چاہتے تھے، تو اللہ نے محتاط کر دیا تھا کہ دیکھنا! کہیں یہ پھسلا نہ دیں، ہر مفاد نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے قانون کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے آئین کے مطابق فیصلہ کیجئے! یہ تاکید آئی تھی، تو اس قسم کی ان کی شرارتیں سازشیں مسلمانوں کو صحیح راستے سے بھٹکانے کے لئے آئے دن جاری رہتی تھیں، تو اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مسلمانوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اِن سے دوستی نہ لگایا کرو، اگر اِن سے دوستی لگاؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دن تم اپنے مذہب سے پھر جاؤ گے، اور انہی کے ہو کر رہ جاؤ گے، ان کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے دین سے برگشتہ ہو جاؤ گے، اِن کے ساتھ دوستی نہ لگاؤ۔ یہ آیات جہاں تک ترجمہ کیا گیا ہے وہاں تک یہی مضمون اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف انداز کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اور یہ آپ کے سامنے بارہا ذکر کیا جاچکا، کہ مدینہ منورہ میں اَوس وخزرج یہ دو قبیلے تو پہلے مشرکوں کے تھے جو بعد میں ایمان لے آئے اور یہ انصار کہلائے، اور ارد گرد کچھ قبائل یہود کے تھے، اور وہ یہود سرورِ کائنات ﷺ کے مخالف رہے، لیکن آپ کے ساتھ ترکِ جنگ وغیرہ کا معاہدہ کرلیا تھا، اور یہ اوس اور خزرج قدیم زمانے سے ان یہودیوں کے معاہد چلے آتے تھے، کسی کا معاہدہ کسی کے ساتھ تھا کسی کا معاہدہ کسی کے ساتھ تھا، جنگ میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تھے، اور خصوصیت کے ساتھ معاشی حالات میں یہود بہت خوشحال تھے، اور یہ سودی کاروبار کرتے تھے، اور یہ اَوس وخزرج جس وقت کوئی واقعہ پیش آتا یا قحط میں مبتلا ہوتے کسی رزق کی تنگی میں مبتلا ہوتے تو اپنے انہی یہودی دوستوں سے قرض وغیرہ لے کر اپنا کام نکالتے تھے، اور اب اسلام کے آجانے کے بعد اوس وخزرج نے اسلام تو قبول کرلیا، لیکن ان میں بعض لوگ ایسے تھے جن کو ہم منافقین کے عنوان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، ان کی درپردہ یہود کے ساتھ دوستیاں بحال تھیں اور اِن دوستیوں سے بڑا نقصان پہنچتا تھا، کہ مسلمانوں کے حالات بطورِ جاسوسی کے یہ منافق وہاں تک پہنچاتے، اور پھر وہ یہود ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے، مشرکینِ مکہ کے ساتھ ان کے روابط تھے، تو اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ دونوں کے درمیان میں لکیر کھینچ دی جائے، اور مسلمانوں اور یہود کو بالکل ممتاز کردیا جائے، تب جا کر یہ جماعت اندرونی سازشیوں سے بچ سکتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں یہی حکم دیا ہے، اور جو اپنے ایمان کی کمزوری کی بناء پر یہود کے ساتھ رابطہ رکھتے تھے اُس خیال سے کہ ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ آنے والے وقت میں اقتدار کس جماعت کو ملنے والا ہے، یعنی چاہے مسلمانوں کی حکومت کچھ قائم ہوگئی تھی، جماعتی حیثیت بن گئی تھی، لیکن ابھی یہود بھی اردگرد کے ماحول پر قابض تھے، اور کشاکشی ذہنی طور پر پوری طرح سے عروج پر تھی، کچھ معلوم نہیں تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، کل کو آنے والے وقت میں فتح مشرک کافر اور یہود پاتے ہیں اور اقتدار اس علاقے پر ان کو حاصل ہوجاتا ہے، یا اس کشمکش کے نتیجے میں اسلام غالب آجاتا ہے اور اقتدار اِن کا قائم ہوجاتا ہے، یہ صورت حال لوگوں کی نظر میں ابھی واضح نہیں تھی،

جس کی بنا پر اپنے عقیدے کی کمزوری کی وجہ سے کچھ لوگ اِن یہود کے ساتھ بھی اندرون طور پر ہمدردیاں رکھتے تھے، دوستیاں رکھتے تھے، ان کے پاس جاتے، ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے، مسلمانوں کی باتیں ان کو بتاتے، اور ان کے دل میں کمزوری یہ تھی کہ اگر کل کو یہی غالب آ گئے تو ہم نے آج اگر ان کے ساتھ بگاڑلی تو کل کو یہ ہمارے کام نہیں آئیں گے، پھر ہمارے اُوپر سختی کریں گے، تو ہو سکتا ہے کہ کل اقتدار ان کو مل جائے، تو ہم ان سے اپنے تعلقات کیوں خراب کریں، ان کے ساتھ بھی میل جول رکھنا چاہیے تاکہ مسلمانوں کی حکومت رہے تو ہم اس میں بھی خوشحال رہیں اور امن سے رہیں، اور اگر کل کو اقتدار اِن کا آ گیا تو ان کے ہاں بھی ہمیں کوئی خطرہ نہ ہو، بلکہ اپنی دوستیوں کی بناء پر ہم وہاں بھی امن چین کے ساتھ رہیں گے، دوسری بات وہ یہ دل میں رکھتے تھے کہ حالات کا کچھ پتہ تو ہے نہیں، آخر پہلے ہم یہاں مدینہ منورہ میں رہتے تھے، تو کوئی دفعہ ایسا ہوتا کہ قحط پڑ جاتا، مالی تنگی کے اندر مبتلا ہو جاتے، اور یہ مسلمانوں کی جماعت تو ساری مفلسوں کی جماعت ہے، اور یہود خوشحال ہیں اور پوری طرح سے ساہوکار ہیں، اور پہلے سے ان کا کاروبار اس قسم کا جاری ہے تو پھر ہو سکتا ہے کہ معاشی طور پر ہم کسی مشکل کے اندر مبتلا ہو جائیں، تو کل کو پھر ہمیں ان سے امداد لینے کی ضرورت پیش آئے گی، اگر ہم نے ان کے ساتھ بگاڑلی تو کل کو یہ ہمارے کام نہیں آئیں گے، اس ساری تفصیل کے تحت آپ کے سامنے یہ دو باتیں آرہی ہیں کہ گویا کہ وہ منافق سیاسی مفاد بھی اسی میں سمجھتے تھے کہ یہود کے ساتھ دوستی رکھی جائے، اور معاشی مفاد بھی اسی میں سمجھتے تھے کہ یہود کے ساتھ دوستی رکھی جائے، لیکن اس کا مدار اسی ضعفِ ایمانی پر تھا کہ حضور ﷺ کی بتائی ہوئی باتیں، آپ کی پیش گوئیاں، اور اللہ تعالیٰ اسلام کے بارے میں مستقبل کے اندر کامیابی کی جو پیش گوئیاں فرما رہے تھے اِن پر اُن کا اعتقاد صحیح نہیں تھا، اس لیے سیاسی اور معاشی دونوں طور پر ہی وہ اپنے آپ کو یہود سے متعلق رکھنا مفید سمجھتے تھے، تو اِن آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے اسی عقیدے کی اصلاح کی ہے کہ یہ خیال چھوڑ دو، اب وقت قریب آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ کن فتح ہوگی، یا کوئی اور حالات اس قسم کے پیش آئیں گے، پھر ان لوگوں کو دلی طور پر پچھتانا پڑے گا جو اپنے دل کے اندر اس قسم کے عقیدے رکھتے تھے، ظاہر چاہے وہ کچھ کرتے ہوں لیکن ان کے اندرون یہ ایمان کی کمزوری ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کل کو حکومت ان یہود کی ہوگئی تو بھی ہمارے تعلقات کام آئیں گے، ہم کسی معاشی مشکلات میں مبتلا ہو گئے تو بھی یہ ہمارے کام آئیں گے، یہ ایمان کی کمزوری ہے، پھر یہ باتیں ساری کی ساری ظاہر ہو جائیں گی، پھر یہ پچھتائیں گے کہ ہم نے نہ تو مسلمانوں کے ساتھ ہی پورے تعلق رکھے، اس لیے آج مسلمان بھی ہم پر اعتماد نہیں کرتے، اور یہود کے ساتھ ہم نے دوستی لگائی تھی وہ ویسے برباد ہو گئے، اس لیے ہم نہ تو اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے، اور یہ دو غلے جو ہوا کرتے ہیں اکثر و بیشتر ان کا انجام ایسے ہوا کرتا ہے، نہ پھر یہ اُدھر پوری طرح سے قابل اعتماد سمجھے جایا کرتے ہیں نہ دوسری طرف قابل اعتماد سمجھے جایا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں پھر پچھتانا پڑتا ہے، تو ان منافقین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ یہ تاکید کی ہے کہ یہ تعلقات چھوڑ دینے چاہئیں، اگر نہیں چھوڑ دگے تو نتیجتاً تم ان میں سے سمجھے جاؤ گے، مخلصین میں تمہارا شمار نہیں ہوگا، یہی مضمون ہے ان آیات کا جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں۔

کافروں کے ساتھ تعلقات کی مختلف صورتیں اور ان کا حکم

اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، ان کے ساتھ تمہاری دلی ہمدردیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ یہ آپ کے سامنے پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ ایک ہوتی ہے موالات، جس کا معنی ہوتا ہے دل سے کسی کے ساتھ ہمدردی رکھنا، دل سے محبت رکھنا، یہ تو کافروں کے ساتھ، یہود کے ساتھ، نصاریٰ کے ساتھ، فساق فجار کے ساتھ، مبتدعین کے ساتھ مؤمنین کے لیے جائز نہیں ہے کہ دل کے ساتھ محبت ان سے رکھی جائے، کیونکہ دل کی محبت کا مدار ہوتا ہے دوسرے کی مناسبت پر، اور دوسرے کے طور طریقے کی پسندیدگی پر، اور جب ایک مؤمن ان میں سے کسی کے ساتھ دِلی محبت رکھے گا تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے طور طریقے سے اس کو نفرت نہیں ہے، اس میں کسی درجے میں کفر کی پسندیدگی، بدعت کی پسندیدگی، اور فسق پر رضا پائی جاتی ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بعض اثرات کے اعتبار سے وہ بھی انہی میں سے سمجھا جائے گا۔ اور ایک ہے ظاہری طور پر مواسات، مدارات، خیر خواہی کے ساتھ پیش آنا، کسی مصیبت کے وقت میں تعاون کر لینا، بظاہر خوش اخلاقی سے پیش آنا، یا سیاسی معاملات میں مسلمانوں کے مفاد کے تحت ان کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ کر لینا، یہ چیزیں جائز ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ نے بھی یہود کے ساتھ معاہدات کیے تھے، اور اُس وقت سے لے کر اِس وقت تک ہمیشہ اہلِ اسلام اس قسم کے معاہدات کرتے رہتے ہیں، یعنی سیاسی سطح پر مسلمانوں کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کافروں کے ساتھ کوئی معاملہ کر لیا جائے، اور ان کے ساتھ کوئی اتحادِ عمل اختیار کر لیا جائے اس کی ممانعت نہیں ہے، یہ تو سرورِ کائنات ﷺ نے خود یہود کے ساتھ بھی کیا، اور صلح حدیبیہ کے اندر آپ کا معاہدہ کسی درجے میں ترکِ جنگ کا اور بعض دوسرے معاملات کا مشرکین کے ساتھ بھی ہوا، تو جہاں مسلمان کا مفاد اس میں سمجھا جائے کہ کافروں کے ساتھ کسی صورت میں بھی اتحادِ عمل اختیار کر لیا جائے یہ صورت ممنوع نہیں ہے، موالات جس کی یہاں ممانعت آ رہی ہے، یہ ہے دِلی ہمدردی اور دلی تعلق، اور وہ بھی مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کی قید کے ساتھ مقید ہے قرآنِ کریم کی آیات میں،[1] کہ مؤمنین کو چھوڑ کر مؤمنین کے مفاد کے خلاف کافروں کے ساتھ ہمدردی رکھنا، اور مؤمنین کے ساتھ دِلی تعلق نہ ہونا، اور کافروں کے ساتھ دِلی تعلق ہونا یہ حرام ہے، اور اس کی مختلف آیات کے اندر ممانعت کی گئی ہے، تو ان آیات سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کسی سطح پر بھی کافروں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھا جا سکتا، قرآنِ کریم کی آیات میں حدیث شریف کی روایات میں مضمون اسی تفصیل کے ساتھ ہی آیا ہے جس تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے ذکر کر رہا ہوں، سورۂ ممتحنہ کے اندر اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

کفار سے ہمدردی رکھنے والے کامیاب نہیں ہوسکتے

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ: حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا مطلب یوں ذکر کیا ہے، کہ یہ بات بالکل ہی واضح ہے، کہ کافروں کے ساتھ مؤمن کی دوستی نہیں ہوسکتی، اور دوستی جو ہوا کرتی ہے کسی نہ کسی باطنی مناسبت کی بنا پر ہوا کرتی ہے، اور دوست دوست کے طریقے پر ہی سمجھا جاتا ہے، اس لیے جو ان کے ساتھ دوستی لگائے گا وہ بعض وجوہ کے اعتبار سے انہی میں سے

(۱) پارہ ۳ سورۂ آل عمران آیت ۲۸ / پارہ ۵ سورۂ نساء آیت ۱۴۴۔ وغیرہ۔

سمجھا جائے گا، یہ بات بالکل واضح ہے، لیکن جو لوگ کافروں کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں، اتنا واضح مضمون بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتا، تو یہاں ہدایت سے راہنمائی اسی مضمون کی طرف مراد ہے، ''ظالم لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا'' یعنی ظالم لوگوں کی ایسی کیفیت ہو جایا کرتی ہے (کیفیت کا خالق چونکہ اللہ ہے اس لیے نسبت اللہ کی طرف کر دی گئی) کہ اتنی واضح بات بھی ظالموں کی سمجھ میں نہیں بیٹھتی، جو کافروں کے ساتھ دوستیاں لگا لگا کر اپنی فطرت کو مسخ کر لیتے ہیں، دلوں کے اندر کافروں کو جگہ دیتے ہیں، اس قسم کی واضح سے واضح بات بھی ان کے فہم میں نہیں بیٹھتی، اللہ تعالیٰ ان کو صحیح بات سمجھنے کی توفیق نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دیتا، چونکہ کیفیت کا خالق اللہ ہے اس لیے نسبت ادھر ہو گئی، لیکن مدار اس لَا یَهْدِی کا ظالم کے ظلم پر ہے، کہ انہوں نے اس غلط روش کے ساتھ اپنے دلوں کو اس طرح سے مسخ کر لیا کہ اب اس قسم کی صحیح بات ان کے دماغ میں نہیں آتی، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو ظالم ہیں، اپنے آپ پر ظلم ڈھانے والے، جو مسلمانوں سے تعلق نہیں رکھتے، مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ نہیں کافروں کے ساتھ ہیں یہ ظالم ہیں، اور یہ ہمدردیاں اس لیے رکھے ہوئے ہیں تا کہ ان کو دنیا میں سرخروئی حاصل ہو، یہ مقصد ان کو حاصل ہونے کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اس مقصد تک نہیں پہنچائے گا، یہ مقصد ان کو حاصل نہیں ہوگا، جس طرح سے یہ ظالم سمجھتے ہیں کہ اس طریقے کے ساتھ ہم دنیا کے اندر عزت حاصل کر لیں گے اور دونوں طرف سے ہم مفاد حاصل کر لیں گے، یہ مقصد ان کو حاصل ہونے کا نہیں ہے، یہ مفہوم بھی ان الفاظ کا ہو سکتا ہے۔

منافقینِ مدینہ کے یہود سے تعلقات کی وجہ اور ان کا انجامِ بد

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: یہ اُس طبقے کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا جو اس بیماری میں مبتلا ہے، اصل میں یہ منافق تھے، ''تُو دیکھے گا ان لوگوں کو جن کے دِلوں میں بیماری ہے دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں ان میں'' اب اس آیت کے اُتر آنے کے بعد یہ بات بہت واضح ہو جائے گی کہ جس کی ہمدردی یہود کے ساتھ معلوم ہو گی، لوگ دیکھنے والے خود سمجھ جائیں گے کہ یہ وہی ہے جس کی قرآن نے نشاندہی کی کہ ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے، ''دیکھتا ہے تو ان لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں وہ ان میں'' يَقُوْلُوْنَ: یہ ضروری نہیں کہ زبان سے کہتے ہوں، دل کے اندر خیالات اور جذبات جو پیدا ہوا کرتے ہیں ان کو بھی قول کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے آپ بھی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے دل میں کہا، دل کے سوچنے کو دل کے کہنے کے ساتھ ہر زبان میں تعبیر کر دیتے ہیں، یعنی وہ اپنے دلوں میں یوں خیال کرتے ہیں، تو دلوں میں کہتے ہیں نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ: کہ ہم اندیشہ رکھتے ہیں کہ ہمیں کوئی گردش پہنچ جائے، ہو سکتا ہے کہ ہم زمانے کی کسی گردش کا شکار ہو جائیں، پھر ہمیں ان کی ضرورت پیش آئے گی، تو اگر ان کے ساتھ ہمارے تعلقات نہیں ہوں گے تو پھر مشکل وقت میں یہ کام نہیں آئیں گے، اس طرح سے ان کو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ باتوں پر اعتماد نہیں، اللہ پر ان کو توکل نہیں، بلکہ دلی طور پر ان یہود کے ساتھ دوستی لگائے ہوئے ہیں

اس اندیشے کی بناء پر کہ مستقبل میں یہ کام آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ: قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح لے آئے گا، مسلمانوں کو، فتح دے دے گا، اور ان کا اقتدار بالکل مٹ جائے گا، یہ جو اس وقت مقابل بنے بیٹھے ہیں، یہ مقابلے کی حیثیت باقی نہیں رہے گی، یا کوئی اور امر اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ظاہر کردے گا، پھر یہ اپنے دل میں چھپائی ہوئی باتوں پر پچھتائیں گے، شرم سار ہوں گے کہ ہم کیا سمجھ رہے تھے اور ہو کیا گیا، ہم سمجھ رہے تھے کہ شاید یہود غالب آجائیں گے اور مسلمان مغلوب ہوجائیں گے، لیکن یہ معاملہ اُلٹا ہوگیا، ہم سمجھتے تھے کہ ہماری دِلی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوں گی تو کل کو یہ ہمارے کام آئیں گے، وہ تو خود اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے، ہمارے انہوں نے کیا کام آنا تھا، اس طرح سے حالات پیش آجانے کے بعد یہ پچھتائیں گے، پشیمان ہوں گے، یہ بھی ایک قسم کی پیش گوئی ہے، اور ایسے ہی ہوا کہ جب یہود کے قبائل ذلیل ہوئے، کوئی جلاوطن ہوا، کوئی قتل کردیے گئے، تو منافقین نے جو سہارے تلاش کر رکھے تھے وہ سارے کے سارے ختم ہوگئے، پھر لازماً انسان اپنے دل میں پچھتاتا ہے کہ میں کیا سمجھے ہوئے تھا اور ہو کیا گیا، اور جب یہ حالات واضح ہوجائیں گے اور پتہ چل جائے گا کہ یہ منافق تھے، ان کی ہمدردیاں یہود کے ساتھ ہیں ہمارے ساتھ نہیں ہیں، تو پھر مؤمن کہیں گے اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ: یہ استفہام ایسے ہی ہے جیسے حضرت تھانوی ﷫ نے مطلب بیان کرتے ہوئے ایک لفظ بولا محاورۃً، کہ جب ان کا حال کھلے گا تو مؤمن کہیں گے ارے! یہی لوگ تھے جو قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے ہیں؟ لیکن اب تو حالات کھل جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمیں دھوکا دیتے تھے اور یہ سارے کے سارے دل سے اُدھر تھے، یہ استفہام اظہارِ تعجب کے لیے ہے، جس کو ''ارے'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا، ارے! یہ لوگ تھے؟ جو ایسے قسمیں کھایا کرتے تھے ہمارے سامنے، اور کہا کرتے تھے کہ ہماری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں، لیکن آج تو سب کچھ بالکل کھل کر سامنے آگیا، کہ اندر اندر سے یہ اُن کے تھے ہمارے نہیں تھے، یہ بھی ان کی رسوائی کی پیش گوئی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب مؤمنین مخلصین کے سامنے یہ لوگ ذلیل ہوں گے، ''کیا یہی لوگ ہیں جو قسمیں کھایا کرتے تھے اللہ کی مضبوط قسمیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں'' حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ: یہاں اعمال سے ان کی وہ ساری کارروائیاں مراد ہیں جو کارروائیاں وہ یہود کے ساتھ دوستیوں کے سلسلے میں کرتے تھے، اس خیال کے ساتھ کہ یہ کل کو ہمارے کام آئیں گے، یہ ان کی ساری کی ساری کارروائیاں برباد ہوگئیں، مسلمانوں کو یہ نقصان نہ پہنچا سکے، اور اپنی ان کارروائیوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے، جتنی تدبیریں انہوں نے کی تھیں سب اکارت گئیں، کوئی فائدہ نہ ہوا، فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ: پس ہوگئے یہ خسارہ پانے والے، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے، خسارہ ان کا یہی تھا، جیسے کہا کرتے ہیں ''ازیں سُو راندہ ازاں سُو ماندہ'' اِدھر سے دھتکارے گئے اُدھر سے بھی رہ گئے، نہ اُن کے نزدیک ان کا کوئی مقام رہا، نہ اِن کے نزدیک کوئی مقام رہا، اس لیے ان کا خسارہ واضح ہوگیا، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ: اعمال سے یہاں یہی معاملاتی کارروائیاں مراد ہیں جو دنیا کے مفاد حاصل کرنے کے لئے وہ غیروں کے ساتھ کرتے تھے۔

منافقین کو تنبیہ

اب آگے یہی تنبیہ ہے کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، کہ ان سے تعلقات چھوڑ دو اور مؤمنوں کی جماعت کے ساتھ مخلص ہو جاؤ، یہ تمہارے مفاد کے لیے کہتے ہیں، ورنہ دِین کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، یہ تو ان کافروں کے ساتھ، یہود کے ساتھ تمہاری ہمدردیاں ہیں، اگر تم بالکل اسلام کو چھوڑ کر نمایاں ہو کر کُفر اختیار کر لو، دِین کا تو بھی کچھ نہیں بگڑے گا، تم چلے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کوئی اور مخلص جماعت کھڑی کر دے گا،''اے ایمان والو! جو کوئی تم میں سے مرتد ہو جائے اپنے دِین سے'' اپنے دِین کو چھوڑ کر جو چلا جائے، فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ: یہ اگلے الفاظ دال بر جزاء ہیں، جزاء یہاں محذوف نکلے گی، جو کوئی شخص اپنے دِین سے مرتد ہو جائے تو اس میں دِین کا کچھ نقصان نہیں، اسلام کا وہ کچھ نہیں بگاڑے گا، اللہ اور اللہ کے رسول کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ: اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن کی یہ صفتیں ہوں گی۔

مؤمنین کی پہلی صفت: ''تعلق مع اللہ''

پہلی صفت تو یہ ہوگی کہ وہ اللہ کے محبوب ہوں گے، اور اس کے ساتھ یہ بات ہوگی کہ وہ بھی اللہ سے محبت رکھیں گے، دو طرفہ محبت ہوگی، اللہ کو ان سے محبت ہوگی، اور وہ اللہ سے محبت رکھیں گے،''وہ لوگ اللہ سے محبت رکھیں گے'' اس کی نسبت تو ان کے عمل کی طرف ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھیں گے، محبت کی علامت کیا ہے؟ ان کا دِلی تعلق اللہ کے ساتھ ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہوں گے، کیونکہ محبت جو اختیاری ہے وہ اطاعت کے معنیٰ میں ہوتی ہے، محبوب کے حکم کو دوسروں کے حکم کے مقابلے میں ترجیح دینا یہ اختیاری محبت ہے، وہ لوگ ایسے ہوں گے جن کا قلبی تعلق محبت کا تعلق اللہ کے ساتھ ہوگا، اور اس کا معیار یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۱) جیسے قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا، کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، کہ اتباعِ سُنّت یہ اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کے دعوے کی واضح دلیل ہے، تو اللہ تعالیٰ سے محبت رکھیں گے، مطلب یہ ہوگا کہ صحیح طریقے پر چلنے والے ہوں گے، اللہ کے آئین کی پابندی کریں گے، اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلیں گے، یعنی حضور ﷺ کے طریقے کی اتباع کریں گے، اتباعِ سُنّت کے حامل ہوں گے، اور جس وقت وہ اتباعِ سُنّت کے حامل ہوں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ ان سے محبت کرنے لگ جائے گا، جیسے اُس آیت کے اندر معیار ذکر کیا گیا اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، تو دونوں باتوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقبول ہوں گے، ان کی زندگی اتباعِ سُنّت کے ساتھ گزرے گی، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کو بھی ان کے ساتھ محبت ہو جائے گی، تو محبت اختیاری یہ اطاعت ہے، اتباعِ سُنّت ہے، یہ بھی البتہ ہو سکتا ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرتا ہے، اُس کے فضل و احسان کو ہمیشہ مستحضر رکھتا ہے، تو طبعی محبت بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو جاتی ہے، لیکن طبعی محبت چونکہ اختیاری نہیں اس لیے انسان اس کے حاصل کرنے کا مکلف نہیں ہے، اگرچہ اختیاری محبت کو اپنا لینے کے بعد طبعی محبت بھی ہو جایا کرتی ہے، دونوں باتوں کے درمیان فرق سمجھ میں آ رہا ہے؟ کہ محبت اختیاری یہ اطاعت ہے، اور طبعی محبت وہ ہے جس میں کشش سی پیدا ہو جاتی ہے، ہر وقت یاد رہنے لگ جاتی ہے، تو اس اختیاری محبت کے اپنانے کے نتیجے میں یہ غیر اختیاری

محبت طبعی محبت بھی حاصل ہوجایا کرتی ہے، اور پھر اللہ بھی ان سے محبت کرنے لگ جائے گا، تو اُس جماعت کی جو بنیاد ہوگی وہ گویا کہ محبت پہ ہوگی، ان کے دل میں محبت اللہ تعالیٰ کی، اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا، پہلی صفت ان کی یہ ہوگی جس کا معنی کہ ان کا طریقہ صحیح ہوگا، وہ مقبولِ بارگاہ ہوں گے۔

دُوسری صفت ''آپس میں رحمدلی''

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: پھر دوسرے نمبر پر ان میں یہ بات نمایاں ہوگی کہ مؤمنوں کے حق میں بڑے نرم ہوں گے، مؤمنوں کے فرمانبردار، اَذِلَّة ذَلول کی جمع ہے مطیع، ناقۃٌ ذلولٌ ایسی ناقہ کو کہتے ہیں کہ جب چاہو اُس پہ سواری کرلو، جب چاہو اُس کا دُودھ دوہ لو، وہ ٹانگ مارنے کی عادی نہیں، اور کسی قسم کا نقصان پہنچاتی نہیں، تو اسی طرح سے یہ جماعت جو ہوگی یہ مؤمنوں کے حق میں ایسے ہی نرم ہوگی کہ مؤمنوں کے مفاد میں ان کی ساری صلاحیتیں صَرف ہوں گی، ان کا مال مؤمنوں کے مفاد میں جائے گا، ان کی جان مؤمنوں کے مفاد میں جائے گی، اِن کی قابلیت اہلیت جو کچھ بھی ہے سب مؤمنوں کے مفاد میں استعمال ہوگا، اور جب کسی مؤمن کو اِن تک کام پڑے گا اور وہ کہے گا کہ دیکھو! فلاں جگہ مجھے آپ کی اعانت کی ضرورت ہے، تو ہر طرح سے یہ اس کی اعانت کریں گے جتنی اِن کے بس میں ہوگی۔ یہ اس مقبول جماعت کی بنیاد ہے کہ آپس میں اِن کی اس طرح سے محبت ہوگی، جس کو دوسرے لفظوں میں ''رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' (سورۂ فتح) کے ساتھ تعبیر کیا ہے، آپس میں رحیم ہوں گے، ایک دوسرے پر ان کا دل پگھلے گا، ایک کی تکلیف کو دیکھ کر اِن کے دل کو ٹھیس پہنچے گی، اور ایک دوسرے کے کام آنے والے ہوں گے، مؤمنوں کے حق میں بڑے نرم، بڑے خوش اخلاق، بڑے فرمانبردار۔ آپس میں تو ان کا یہ تعلق ہوگا، جس میں بتایا جا رہا ہے کہ مقبول جماعت وہی ہوتی ہے جس کے افراد کا آپس میں اس طرح سے تعلق ہو۔

تیسری صفت: ''کفّار پر سختی''

اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: کافروں پر بڑے گراں ہوں گے اَعِزَّة عَزِيْز کی جمع ہے، گراں، بھاری، دشوار، جو قابو میں نہ آنے والا ہو، یہ ذَلول کے مقابلے میں آ گیا، ذَلول وہ ہوتا ہے جس کو جس وقت چاہو قابو کرلو، جس وقت چاہو اُس سے کام لے لو، عزیز وہ ہوگیا جو قابو میں نہ آئے، کسی کے بس میں نہ ہو، یعنی کافروں کے حق میں وہ ایک ٹھوس چٹان ہوں گے، کافر ان کے اندر کسی قسم کی انگلی داخل کرنا چاہیں گے تو اتنے مضبوط ہوں گے کہ انگلی داخل کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی، اُن کو مضبوط پائیں گے، کافر ان پر کنٹرول نہیں کرسکیں گے، جس کو آج کل محاورے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مؤمنوں کے حق میں تو وہ جاں نثار ہوں گے، لیکن کافروں کے سامنے وہ گردن تو کٹا سکتے ہیں لیکن کافروں کے ہاتھ میں بِک نہیں سکتے، ان کے مفاد میں استعمال نہیں ہوسکتے، اُن افراد کی یہ خصوصیت ہوگی، ان کو خریدا نہیں جاسکے گا، کسی اعتبار سے بھی ان کو راہِ راست سے ہٹایا نہیں جاسکے گا، جس طرح سے ایک بھاری چٹان ہوتی ہے، کافروں کے راستے میں وہ چٹان کی طرح ہوں گے، یہ صفت ہوگی ان مقبول بندوں کی۔

چوتھی صفت: ''جہاد فی سبیل اللہ''

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے، ''جہاد'' کا مفہوم آپ کی خدمت میں عرض کیا جا چکا، کہ حق کو غالب کرنے کے لیے باطل کو مغلوب کرنے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے وہ ''جہاد'' کا مصداق ہے، چاہے میدانِ جنگ میں باقاعدہ تلواروں کے ساتھ اور تیروں کے ساتھ لڑنا ہو، اور چاہے قلم کے ساتھ باطل کی تردید کرنی ہو اور اِحقاقِ حق کرنا ہو، چاہے زبان کے ساتھ، اور چاہے مال خرچ کرنا ہو، جو کوشش بھی کی جائے، اس لیے جہاد بالمال بھی ہوتا ہے، جہاد باللسان بھی ہوتا ہے، جہاد بالسیف بھی ہوتا ہے، تو جہاد کی یہ ساری کی ساری قسمیں ان میں پائی جائیں گی، ''اللہ کے راستے میں وہ جہاد کریں گے''

پانچویں صفت: ''کسی کی ملامت کی پروا نہ کرنا''

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جب وہ جہاد کے لیے نکلیں گے، کُفر کے مٹانے کے لیے کوشش کریں گے، تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک تحریک چلاتا ہے کافروں کے مقابلے میں، کُفر کے مقابلے میں، باطل کے مقابلے میں، حق کی حمایت میں، تو کافروں نے تو مقابلے میں آنا ہی ہے، بسا اوقات اِدھر اُدھر سے خیر خواہ لوگ آجاتے ہیں نصیحت کرنے کے لیے، کہ کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہو؟ کیوں نقصان اٹھاتے ہو؟ یہ وہ، اس قسم کی ملامت کرنے والے کہ اپنے رشتے داروں کے خلاف، اپنی برادری کے خلاف تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اس طرح سے ملامت کرنے والے ملامت کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن وہ جماعت ایسی ہوگی، اللہ تعالیٰ کے عشق میں اس طرح سے وہ مست ہوگی، جیسے کہ عشق کی خاصیت ہے کہ ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کیا کرتا، اسی طرح سے وہ لوگ بھی اللہ کے راستے میں کوشش کرتے وقت ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے، اور سچا عاشق وہی ہوا کرتا ہے کہ جس کو ملامت کرنے والے ملامت کرتے رہیں، لیکن وہ کسی کی نہ سنے، اور محبت کے تقاضوں کو پورا کرتا چلا جائے، اس لیے عربی شعراء جب بھی اپنی اس قسم کی بہادریوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ نشاندہی ساتھ ضرور کرتے ہیں، کہ ملامت کرنے والوں کی ہم کوئی پروا نہیں کرتے، ان کی ملامت ہمارے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی، صحیح محبت اور سچی محبت کا معیار یہی ہوتا ہے کہ اپنے محبوب کے راستے میں پھر انسان اندھا دھند چلتا ہے اُس کی مرضی کے مطابق، کوئی ملامت کرے کہ تم اپنے مفاد کے خلاف کر رہے ہو، وہ ہر چیز کو نظر انداز کر دے گا لیکن اپنے محبوب کے اشاروں پر جان دینے کو ترک نہیں کرتا۔ تو یہ ان کی صفت ہوگی لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ: کہ ملامت کرنے والے ملامت کریں گے تو اُن کی ملامت پر وہ کان نہیں دھریں گے، اس لیے اسلامی کام کرتے وقت اگر ماحول ناساز گار ہے، اور اس ماحول کے اندر کچھ لوگ تمہیں ملامت کریں کہ یہ کام یوں نہیں کرنا چاہئے، تو ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے، لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ کا یہی معنی ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ: یہ اللہ کا فضل ہے، یعنی ان صفات کا حاصل ہو جانا یہ اللہ کا فضل ہے، ''اور جس کو چاہتا ہے اللہ دیتا ہے'' تو یہ نعمت اگر کسی کو نصیب ہو جائے کہ مؤمنوں کے حق میں اس کے دل میں شفقت ہو، کافروں کے بارے میں اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ ہو، اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے کے اندر جہاد پر ہر طرح سے تلا ہوا ہو، اور اللہ تعالیٰ کے کام کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرے، تو

اس قسم کی صفات اگر کسی شخص کو مل جائیں تو یہ اللہ کا فضل ہے، جس میں نشاندہی کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں علم والے ہیں۔

مذکورہ صفات کا مصداقِ اَتم صحابہ کی جماعت ہے

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو جماعت تھی مخلصین کی، ان کے اندر یہ ساری صفتیں پائی جاتی تھیں، جس کا ظہور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی مختلف مقامات پر ہوا، لیکن اس کا اعلیٰ درجے کا ظہور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا، جبکہ واقعۃً کچھ لوگ مرتد ہوئے، کچھ مسیلمہ کذاب کی وجہ سے، کچھ اسود عنسی کی وجہ سے، کچھ انکارِ زکوٰۃ کی وجہ سے، کچھ حکومت کو زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے، بغاوت پھیل گئی، ارتداد پھیل گئی، اس وقت ایک جماعت اٹھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ، وہ ان صفات کی حامل تھی، جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کی، مؤمنوں کے حق میں نرم ثابت ہوئے، کافروں کے حق میں سخت ثابت ہوئے، اور پوری طرح سے جہاد کر کے میدان صاف کر کے رکھ دیا، یہ جماعت ساری کی ساری ایسی تھی جس پر لفظ بلفظ یہ صفات صادق آتی ہیں، ارتداد پھیلنے کے بعد جن لوگوں کو اللہ نے اٹھایا اور اس ارتداد کے فتنے کو ختم کرنے کی توفیق دی وہ سارے کے سارے ان الفاظ کے مصداق تھے۔ یہاں تک تو ممانعت کی ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ تم محبت نہ لگایا کرو۔

مؤمنین کو دوستی کس کے ساتھ لگانی چاہیے؟

اور آگے یہ دوسرا پہلو واضح کیا ہے کہ ان کے ساتھ تو محبت نہیں لگانی، پھر آخر آخر لگانی کس کے ساتھ ہے؟ کیونکہ یہ بھی ایک نفسیاتی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو ایک طرف سے روکا جائے تو اُس کو کسی دوسرے راستے کی نشاندہی بھی کی جائے، کہ ادھر نہ جاؤ ادھر جاؤ، تب جا کر بات مکمل ہوا کرتی ہے، اب دنیا کے اندر رہتے ہوئے کسی نہ کسی کے ساتھ تعلق تو رکھنا ہی ہے، محبت تو لگانی ہے، بغیر محبت کے تو رہ سکتے ہی نہیں، پھر اگر ایک طرف سے روکتے ہو کہ ان کے ساتھ محبت نہ لگاؤ، تو دوسرا راستہ دکھاؤ بھی کہ محبت کن کے ساتھ ہونی چاہیے، تب جا کے یہ مضمون مکمل ہو جائے گا۔ اب یہ دوسرا پہلو اگلے الفاظ میں واضح کیا جارہا ہے، پہلے ایمان والوں کو خطاب کر کے کہا تھا، کہ ان لوگوں سے دوستی نہ لگاؤ، اب کہا جارہا ہے کہ تمہاری دوستی تو اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے، تمہارا دوست تو اللہ ہے اور اللہ کا رسول اور وہ لوگ جو مخلص مؤمن ہیں، اور مخلص مؤمنوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، وَهُمْ رٰكِعُوْنَ: اور عاجزی اور تواضع کرنے والے ہیں، ان لوگوں کے ساتھ تمہاری دوستی ہونی چاہیے، وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دوستی رکھے گا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور مؤمنوں کے ساتھ دوستی رکھے گا، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، جس طرح سے دوسرے لوگوں کے ساتھ دوستی رکھنے والے حزب الشیطان ہیں، فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ: یہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

کن مؤمنین کے ساتھ دِلی دوستی لگانی چاہیے؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ: یہ الفاظ جو رکوع کے آخر میں آئے تھے، اس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ تو دوستی نہ لگاؤ، ان کے مقابلے میں دوستی کن کے ساتھ ہونی چاہیے یہ دوسری شق ذکر کی گئی تھی کہ اللہ کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے ساتھ تمہاری دوستی ہونی چاہیے، یہ تمہارے دوست ہوں، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور مؤمن۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھو، دلی دوستی اللہ کے ساتھ ہو، اللہ کے رسول کے ساتھ ہو، اور تیسرے نمبر پر ذکر کیا مؤمنین کا، لیکن مؤمنین کے ساتھ یہ قید لگائی: الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مؤمنین سے کاملین مراد ہیں، کہ جن کے اندر اقامتِ صلوٰۃ بھی پائی جائے، ایتائے زکوٰۃ بھی پائی جائے، بدنی عبادات کے پابند بھی ہوں، مالی عبادات کے پابند بھی ہوں، ایتائے زکوٰۃ یہ مالی عبادت ہے، تو مالی عبادات میں سے اصل اصول زکوٰۃ ہے، اس کا ذکر کر دیا، مراد مالی عبادات ہیں، اور اقامت صلوٰۃ یہ بدنی عبادت ہے، تو بدنی عبادات میں سے اقامتِ صلوٰۃ کو ذکر کر دیا جو اصل الاصول ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان اَحکام کے بھی پابند ہیں جو ان کے بدن سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان اَحکام کے بھی پابند ہیں جو مال سے تعلق رکھتے ہیں، تو عبادت بدنی اور عبادت مالی یہ ہر قسم کی عبادت کو جامع ہوگئی۔ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ کے اندر ان کے اخلاقِ باطنہ کے درست ہونے کی طرف اشارہ کر دیا، کہ وہ رکوع کرنے والے ہوں، یعنی تواضع عاجزی انکساری ان کی طبیعت کے اندر موجود ہو، یہ اخلاقِ باطنہ میں سے ایک بہت بڑا خلق ہے، یعنی اس کے مقابلے میں آیا کرتا ہے تکبر، خود بینی، تو جس شخص کے اندر تکبر اور خود بینی موجود ہو تو گویا کہ اُس کے اخلاقِ باطنہ برباد ہیں، تو صحبت کے قابل دوستی کے لائق وہ لوگ ہوں گے جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی رکھو۔ تو صحبتِ صالح کا اصول یہیں سے نکلا کہ صحبت کے لائق اور محبت کے لائق مؤمنین میں سے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاقِ باطنہ بھی ٹھیک ہوں، اور اعمالِ ظاہرہ بھی درست ہوں، تو کاملین کی صحبت اختیار کیجئے، یہ الفاظ جو بڑھائے گئے ہیں وہ اس لیے بڑھائے گئے ہیں۔ اور وَهُمْ رٰكِعُوْنَ سے اگرچہ بعض روایات میں یہ رکوع بھی مراد لیا گیا ہے جو نماز میں کیا جاتا ہے، تو معنی ہوگا ''رکوع کرنے والے ہیں''، کیونکہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے اندر رکوع یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے، اور یہود نے یا تو عملاً اس کو ترک کر دیا تھا، یا اصل کے اعتبار سے ان میں رکوع تھا ہی نہیں۔ لیکن اصح قول یہی ہے کہ یہاں رٰكِعُوْنَ سے رُکوعِ باطنی مراد ہے، جس کو تواضع اور انکسار کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں، تو اس سے اخلاقِ باطنہ کے درست ہونے کی طرف اشارہ ہے، تو جو لوگ اس قسم کے ہوں کہ اَحکامِ بدنیہ کی بھی پابندی کرتے ہیں، اور مالی اَحکام کی بھی پابندی کرتی ہے، باطنی اخلاق بھی ان کے ٹھیک ہیں، ان کے دل کے اندر تواضع انکسار ہے خشوع ہے خضوع ہے، یہ ہے اللہ کا گروہ، جب یہ اللہ کا گروہ ہے تو اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ تو اب دل میں یہ نہ رکھو کہ آنے والے وقت میں یہود نصاریٰ غالب آجائیں گے، ہمیں ان کے ساتھ دوستی رکھنی چاہیے، وقت پہ کام آئیں گے، بلکہ اللہ کے گروہ میں شامل ہونے کی کوشش کرو، اللہ کا

گروہ ہی غلبہ پانے والا ہے، اس طرح سے گویا کہ دوستی لگانے کا مثبت پہلو ذکر کر دیا گیا ہے اس منفی پہلو کے بعد کہ یہود ونصاریٰ کے ساتھ دوستی نہ لگاؤ۔

یہود ونصاریٰ مؤمن کی دوستی کے لائق نہیں

اگلے رُکوع کی پہلی آیت میں بھی اُسی سابقہ مضمون کی ہی تاکید ہے، کہ یہود ونصاریٰ یہ تمہارے لیے دوستی کے لائق کیسے ہو سکتے ہیں، جبکہ ان کی عادت یہ ہے کہ تمہارے دِین کا مذاق اُڑاتے ہیں، اِستہزا کرتے ہیں، اور مؤمن کے لیے اُس کا ایمان اور اُس کا دِین سب سے زیادہ عزیز ترین متاع ہے، اور اہلِ عرب کے جذبات ایسے معاملات میں بہت نازک تھے، ان کے تو کوئی گھوڑے کی تحقیر کرتا تو لڑائی ہو جاتی تھی، ان کی اونٹنی کے ساتھ کوئی سخت قسم کا معاملہ کرلے تو وہ لوگ تلواریں کھینچ لیتے تھے، قوم اور قبیلے کی طرف اگر کوئی تحقیر کے ساتھ اشارہ کرتا تو ان کے مقابلے میں وہ نکل آتے تھے اور برسوں لڑائی جاری رہتی تھی، اور سرورِ کائنات ﷺ کے آجانے کے بعد اور اِس دعوتِ ایمانی کے پھیل جانے کے بعد اُن کے نزدیک یہ ایمان اور دین اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا، قوم سے زیادہ عزیز، قبیلے سے زیادہ عزیز، گھوڑے اونٹ سے زیادہ عزیز، تو یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ جو لوگ تمہارے دِین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اُس کا استہزا کرتے ہیں وہ تمہاری دوستی کے لائق کس طرح سے ہو سکتے ہیں، تو یہ ایک ان کی خامی اور ایک نقص بتایا کہ جس کے بعد مؤمن آدمی جو اپنے ایمان کے اندر کامل ہے ایسے شخص کے ساتھ کبھی دوستی نہیں رکھ سکتا جو اس کے دین کا مذاق اُڑاتا ہو، اور دِین کے مذاق اڑانے میں پھر خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا جو اس وقت واقعہ پیش آتا تھا کہ جب تم اذان کہتے ہو تو یہ لوگ اُس کی نقلیں اتارتے ہیں اس کا مذاق اڑاتے ہیں، جب تم نماز پڑھتے ہو تو نماز کی نقلیں اتارتے ہیں اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اور یہ ان کی بے حد قسم کی بے عقلی ہے، ورنہ اگر یہ غور کریں تو اذان کے کلمات میں سے کون سا کلمہ ایسا ہے جو مذاق کے قابل ہے؟ اذان کی حقیقت اس کے بغیر کیا ہے کہ اس میں اللہ کی کبریائی کا اعلان ہے، خدا کی توحید کا اعلان ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا اعلان ہے، فلاح کی طرف بلایا گیا ہے، اور پھر بار بار اللہ کی توحید کا اعلان کرکے اللہ کی کبریائی پر اس کو ختم کر دیا گیا، تو باوجود اس بات کے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں ایمان کے دعوے کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان پاکیزہ کلمات کا مذاق اڑاتے ہیں، تو ایسے بے عقلوں کے ساتھ اور ایسے ضدیوں کے ساتھ تمہاری دوستی پھبتی نہیں ہے، تو خصوصیت کے ساتھ یہ الفاظ ذکر کر دیے جس سے نفرت دلانی مقصود ہے، اور اس سے یہ اصول نکل آیا کہ جو شخص بھی دِین کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کرتا ہو، اور دینی باتوں کا مذاق اڑاتا ہو، مؤمن کی دوستی اُس کے ساتھ نہیں ہو سکتی، اور اُس کے اس قسم کے کُفر کے معلوم ہونے کے باوجود اگر ان کے ساتھ دوستی رکھیں گے تو پھر گناہ میں ہم بھی شریک ہو جائیں گے، تو یہ الفاظ تھے، ''اے ایمان والو! نہ بناؤ تم ان لوگوں کو دوست (یہ دوسرا مفعول آئے گا آگے) ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ٹھٹھہ بناتے ہیں'' هُزُوًا یہ مَهْزُوًّا بِهَا

کے معنی میں ہے، کھیل اور ٹھٹھا بناتے ہیں، کھیل اور ٹھٹھا قرار دیتے ہیں، اِستہزا کا معاملہ کرتے ہیں، ''ان لوگوں میں سے جو کتاب دیئے گئے تم سے قبل، اور نہ بناؤ تم کافروں کو دوست'' وَالْكُفَّارَ کا عطف ہو جائے گا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا پر، چونکہ یہ منصوب ہے، تو الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا یہ لَا تَتَّخِذُوْا کا مفعول ہے تو وَالْكُفَّارَ کا عطف اس پر ہو جائے گا یہ بھی مفعول ہو گیا، ''ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ'' وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان والے ہو، تو تمہارے ایمان کا تقاضا یہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا تقاضا یہی ہے، کہ ایسے بد دین قسم کے لوگ جو دین کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں ان کو دوست نہ بناؤ۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ: اور جب تم نماز کی طرف آواز دیتے ہو، یہاں نداء سے اذان مراد ہے۔ اذان کی مشروعیت مدینہ منورہ میں ہوئی، اور اس کی ابتداء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خواب سے ہوئی ہے، جیسے کہ حدیث شریف میں تفصیل ہے، قرآنِ کریم میں براہِ راست اذان کے کلمات کی تلقین نہیں کی گئی، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو خواب آیا، فرشتے نے اذان دے کر دکھائی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر ہوا، آپ نے اُس کی تصویب فرما دی، اور سب سے پہلی اذان بلال رضی اللہ عنہ نے کہی، لیکن خواب دیکھنے والے عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ ہیں، وہ کلمات تلقین کرتے گئے، بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتے گئے، پھر یہ اسلام کا معمول بن گیا اسلام کا اعظم شِعار بن گیا، اور قرآنِ کریم میں ان الفاظ کے ساتھ گویا کہ اس کی تصویب ہوگئی کہ اس اذان کا اعتبار کیا گیا، اور جو شخص اس کا مذاق اڑاتا ہے وہ ایسے سمجھا گیا جیسے کہ دِین کے شعائر کا مذاق اڑاتا ہے، خصوصیت کے ساتھ اس کو یہاں ذکر کیا گیا ہے، تو یہاں نَادَيْتُمْ سے وہی معروف اذان مراد ہے جو نماز کے لیے کہی جاتی ہے، یہ لوگ اس کو هُزُوًا وَّلَعِبًا بناتے ہیں، جس طرح سے پیچھے دین کو هُزُوًا وَّلَعِبًا بنانے کا ذکر تھا، عام طور پر دِین کا مذاق اڑاتے ہیں پھر خصوصیت کے ساتھ دِین کے اس شعار کا جو کہ اذان ہے۔ اور اتَّخَذُوْهَا کی ضمیر صلوٰۃ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور کل واحد منهما کی تاویل سے دونوں کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، کہ اذان کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں، نماز کی بھی نقلیں اُتارتے ہیں، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ: یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے، ورنہ اگر یہ سوچتے، کچھ ان کے بھیجے میں عقل ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ نہ اذان مذاق اڑانے کے قابل ہے، اور نہ ہی نماز ایسی چیز ہے کہ جس پر اِستہزا کیا جائے، نہایت پاکیزہ کلمات ہیں، اور نماز اللہ تعالیٰ کے سامنے عبودیت ظاہر کرنے کی ایک کامل شکل ہے، تو یہ عقل سے کام نہیں لیتے، ضد کے اندر یہ اپنی عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اس لیے ایسے پاکیزہ کلمات اور ایسے پاکیزہ عمل کا مذاق اڑاتے ہیں، تو جن کی یہ فطرت ہے ان کے ساتھ تمہاری دوستی نہیں ہونی چاہیے۔

اہلِ کتاب کو باقی کُفّار سے علیحدہ ذِکر کیوں کیا گیا؟

سوال:- اہلِ کتاب کو کُفّار کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب کُفّار میں شامل نہیں ہیں۔

جواب:- دِین کے ساتھ اِستہزا کرنے والے دو گروہوں کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا، ایک الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور

دوسرا وَالْكُفَّارَ، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ کفار عام ہیں اور الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ خاص ہے، کافر دونوں ہیں، اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے سرورِ کائنات ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھا اور اس قرآن کو قبول نہیں کیا وہ بھی کافر ہیں، لیکن یہاں ان کو علی الخصوص علیحدہ کر کے ذکر کر دیا، اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا تو وجہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جہاں یہ اذان اور صلوٰۃ کا قصہ تھا وہاں اردگرد یہود کی آبادیاں تھیں، اور ان کی طرف سے اس قسم کا استہزا اور دین کا مذاق اُڑایا جاتا تھا، اور علی العموم باقی دُنیا کے کافر بھی مخالفت کرتے تھے، مشرکینِ مکہ ہو گئے اور اردگرد کے بسنے والے ہو گئے، تو چونکہ واقعہ ان کی طرف سے پیش آتا تھا اس لیے علی الخصوص ان کو ذکر کر دیا، یا دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عام کافر اگر مذاق اڑائیں تو اُس پر اتنا تعجب نہیں جتنا کہ اہلِ کتاب اہلِ علم کی طرف سے ان باتوں کے مذاق اڑانے پر تعجب ہے، کہ جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی ایک اچھی چیز ہے، توحید کا اعلان ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کے متعلق بھی ان کی کتابوں کے اندر دلائل صریحہ موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود اس دین کا یہ مذاق اڑاتے ہیں، تو ان پر تعجب زیادہ ہے، تو ان کے اس فعل کی شناعت کو زیادہ نمایاں کرنے کے لیے عام کافروں سے ان کو ممتاز کر کے ذکر کر دیا، ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ یہ کافر نہیں، بلکہ ان کا کفر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تعجب کا باعث ہے، چونکہ یہ اہلِ علم ہیں، اور عقائد کے لحاظ سے یہ اقرب تھے اسلام کی طرف، توحید کے یہ مدعی، آخرت کے یہ قائل، اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے یہ قائل، ایک فرق تھا تو یہ کہ سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت اور رسالت پر یہ ایمان نہیں لائے، ان کے کفر کی یہی وجہ تھی، باقی کافروں کے ساتھ اور بیسیوں باتوں میں اختلاف تھا، لیکن اِن کے ساتھ اختلاف صرف اس جزء کے اعتبار سے ہے کہ انہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کو قبول کر کے آپ کے لائے ہوئے دین کو قبول نہیں کیا، باقی دعویٰ توحید کا ان کا تھا، اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے قائل تھے، آخرت کے قائل تھے، یعنی یہ زیادہ قریب ہیں، اور زیادہ قریب ہونے کے بعد پھر ان کی دشمنی باقیوں کے مقابلے میں زیادہ اَشد ہو، اور وہ ایسی باتوں کا بھی مذاق اڑائیں جو ان کے نزدیک بھی مسلّم ہیں، تو اِس کے اُوپر زیادہ نفرت کا اظہار کیا گیا، تو ان کی شناعت کو ظاہر کرنے کے لیے اور ان کو قباحت کو ظاہر کرنے کے لیے کافروں میں سے ان کو ممتاز کر کے ذکر کر دیا، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ کفار کے اندر یہ شامل نہیں ہیں، جنہوں نے حضور ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھا وہ کافر ہیں، چاہے وہ اہلِ کتاب میں سے ہی ہوں۔ یہ وجہ ہے ان کو علیحدہ کر کے ذکر کرنے کی۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ
آپ فرمادیں کہ اے کتاب والو! ہم پر تم کیا عیب لگاتے ہو؟ سوائے اس کے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر، اور اُس چیز پر جو ہماری طرف
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝٥٩ قُلْ هَلْ
اُتاری گئی، اور اُس چیز پر جو اس سے پہلے اُتاری گئی، اور حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں ۝٥٩ آپ کہہ دیجئے کہ کیا

أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ

میں تمہیں خبر دوں اس سے زیادہ بُرے طریقے کی اللہ کی طرف سے بدلے کے طور پر۔ جن پر اللہ نے لعنت کی

وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ

اور جن پر اللہ کا غضب ہوا، جن میں سے اللہ تعالیٰ نے بندر اور خنزیر بنائے اور جنہوں نے شیطان کی پوجا کی،

أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۞٦٠ وَإِذَا جَآءُوْكُمْ

یہ لوگ زیادہ بُرے ہیں ازروئے ٹھکانے کے، اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں سیدھے راستے سے ﴿٦٠﴾ اور جس وقت یہ آپ کے پاس

قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ

آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، حالانکہ وہ داخل بھی کُفر کے ساتھ ہوئے اور نکلے بھی کُفر کے ساتھ، اللہ زیادہ جانتا ہے

بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۞٦١ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْإِثْمِ

اُس چیز کو جو یہ چھپاتے ہیں ﴿٦١﴾ اور آپ دیکھتے ہیں ان میں سے بہتوں کو دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں گناہ میں

وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞٦٢ لَوْلَا

اور ظلم میں اور حرام کھانے میں، البتہ بُری ہے چیز جو وہ کرتے ہیں ﴿٦٢﴾ مشائخ اور

يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ

علماء ان کو کیوں نہیں روکتے گناہ کی بات بولنے سے اور حرام کھانے

السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۞٦٣ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ

سے، بُرا ہے یہ کردار جو ان (علماء اور مشائخ) نے اختیار کر رکھا ہے ﴿٦٣﴾ اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ

مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ أَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ

بند کیا ہوا ہے، ان کے ہی ہاتھ بند کئے ہوئے ہیں، اور اپنی اس بات کی وجہ سے یہ ملعون ہوئے، بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں،

يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ

جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، البتہ ضرور زیادہ کرتا ہے ان میں سے بہتوں کو وہ دین جو آپ کی طرف اُتارا گیا

مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ

آپ کے رَبّ کی طرف سے (زیادہ کرتا ہے) از روئے سرکشی کے اور کُفر کے، اور ہم نے ڈال دی ان کے درمیان دشمنی اور بغض

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ

قیامت کے دن تک، جب کبھی یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اُسے بجھا دیتا ہے،

وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾

اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد کی، اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ﴿۶۴﴾

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

اگر بے شک یہ کتاب والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم دُور ہٹا دیتے ان سے ان کے گناہ

وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ

اور البتہ ضرور داخل کرتے انہیں خوشحالی کے باغات میں ﴿۶۵﴾ اور اگر بے شک یہ لوگ قائم کرتے توراۃ کو

وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ

اور اِنجیل کو اور اُس چیز کو جو ان کی طرف اُتاری گئی ان کے رَبّ کی طرف سے، تو کھاتے یہ جانب بالا سے بھی

وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۚ وَكَثِيْرٌ

اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی، ان میں سے ایک جماعت ہے اعتدال پہ رہنے والی، اور ان میں بہت

مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾

سے، بُرا ہے وہ کام جو وہ کرتے ہیں ﴿۶۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: آپ فرمادیں کہ اے کتاب والو!، هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ: نَقَمَ يَنْقِمُ: کسی پر عیب لگانا، نفرت کا اظہار کرنا، کسی کے طریقے کا انکار کرنا، اور انتقام لینا، یہ بھی اس کا مفہوم ہے۔ "ہماری طرف سے تم کس چیز کا انکار کرتے ہو؟ یا ہم پر تم کیا عیب لگاتے ہو؟ سوائے اس کے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ کے ساتھ اور اس چیز کے ساتھ جو ہماری طرف اتاری

گئی اور اس چیز کے ساتھ جو اس سے قبل اتاری گئی' وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ: اور حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ: آپ کہہ دیجیے کہ کیا میں تمہیں خبر دوں؟ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ: اس سے زیادہ برے طریقے کی، یعنی ہمارے طریقے کا تو تم مذاق اڑاتے ہو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ہمارے طریقے کو برا سمجھتے ہو، اور ہمارا طریقہ اس کے بغیر کیا ہے کہ ہم ایمان لے آئے، اللہ پر ایمان لے آئے اور اس کی اتاری گئی کتابوں پر ایمان لے آئے، تمہارا مذاق اڑانا دلیل ہے اس بات کی کہ تم اس کو عیب سمجھتے ہو، اور یہ طریقہ تمہارے نزدیک برا طریقہ ہے، اس لیے کہا جا رہا ہے کہ میں تمہیں اس سے بھی زیادہ برا طریقہ بتاؤں؟ یعنی ہمارا طریقہ تو تمہارے نزدیک برا ہے ہی، اس سے زیادہ برا طریقہ بتاؤں؟ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ: اللہ کی طرف سے بدلے کے طور پر، کہ اللہ کی طرف سے بدلہ ملنے کے طور پر اس سے زیادہ برا طریقہ کون سا ہے، مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ: یہ ہو جائے گا دِیْنُ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ، ان لوگوں کا دِین، ان لوگوں کا طریقہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اللہ کا غضب ہوا، جن میں سے اللہ تعالیٰ نے بندر اور خنزیر بنائے، قِرَدَةٌ قِرْدٌ کی جمع ہے بندر کو کہتے ہیں، خنازیر خنزیر کی جمع ہے۔ ''جن میں سے اللہ تعالیٰ نے بندر اور خنزیر بنائے اور جنہوں نے شیطان کی پُوجا کی، یہ لوگ زیادہ برے ہیں از روئے ٹھکانے کے اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں سیدھے راستے سے۔'' وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا: اور جس وقت یہ آپ کے پاس آتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ: حالانکہ وہ آئے بھی کُفر کے ساتھ، مجلس میں داخل بھی کُفر کے ساتھ ہوئے، وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ: اور نکلے بھی کُفر کے ساتھ، یعنی جیسے کُفر کی حالت میں آئے تھے ویسے کُفر کی حالت میں چلے گئے، نہ آتے وقت یہ مؤمن تھے نہ جاتے وقت مؤمن ہیں، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ: اللہ زیادہ جانتا ہے اس چیز کو جو یہ چھپاتے ہیں۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ: اور آپ دیکھتے ہیں ان میں سے بہتوں کو، يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ: دوڑ دوڑ کے جاتے ہیں گناہ میں، ظلم میں، وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ: اور حرام کھانے میں۔ سحت کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزرا ہے۔ سحت: حرام مال۔ ''اُن کے حرام کھانے میں'' لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: البتہ بُری ہے چیز جو وہ کرتے ہیں، بُرا ہے کام جو وہ کرتے ہیں، لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ: ربانیون اور اَحبار کا لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے آچکا۔ ربانی: اللہ والے۔ یہاں سے درویش، مشائخ مراد ہیں، اہل اللہ، اولیاء، جو اولیاء اللہ کا جامہ اوڑھے بیٹھے ہیں، ان کا بھیس اختیار کر رکھا ہے۔ اَحبار حِبر کی جمع، علماء۔ ''مشائخ اور علماء ان کو کیوں نہیں روکتے'' عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ: گناہ کی بات بولنے سے، وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ: اور حرام کھانے سے، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ: يَصْنَعُوْنَ کی ضمیر علماء اور مشائخ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بُرا ہے یہ کردار جو ان علماء اور مشائخ نے اختیار کر رکھا ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ: اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بند کیا ہوا ہے، یعنی اللہ بخیل ہو گیا، نعوذ باللہ! غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ: ان کے ہی ہاتھ بند کیے ہوئے ہیں، وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا: اور اپنی اس بات کی وجہ سے یہ ملعون ہوئے، لعنت کیے گئے یہ اپنی اس بات کی وجہ سے، بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ: اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں، يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ: جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ: البتہ ضرور زیادہ کرتا ہے ان میں سے بہتوں کو، مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: یہ لَيَزِيْدَنَّ کا فاعل ہے۔ ''جو دین آپ کی طرف اتارا گیا آپ کے رَبّ

کی طرف سے ان میں سے بہتوں کو بڑھاتا ہے ازروئے سرکشی کے اور کفر کے" وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: اور ہم نے ڈال دی ان کے درمیان دشمنی اور بغض، اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: قیامت کے دن تک، كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ: جب کبھی جلاتے ہیں آگ لڑائی کے لئے۔ نَارًا لِّلْحَرْبِ یہ لام کے اظہار کے ساتھ اضافت ہے۔ اَلْمَالُ لِزَيْدٍ جس طرح سے آپ کہیں۔ مالُ زیدٍ کہہ دو، یا المالُ لزیدٍ کہہ دو، دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ تو نَارًا لِّلْحَرْبِ کا معنی لڑائی کی آگ۔ جب کبھی یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں،"لڑائی کے لئے آگ جلاتے ہیں" جس کا آج کل کے محاورے میں ترجمہ ہوگا کہ "جب یہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں"، اَطْفَاَهَا اللّٰهُ: اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا: اور زمین کے اندر یہ فساد کی کوشش کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد کی، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ: اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا: اگر بیشک یہ کتاب والے ایمان لے آتے، وَاتَّقَوْا: اور تقویٰ اختیار کرتے، لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ: تو ہم دُور ہٹا دیتے ان سے ان کے گناہ، وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ: اور البتہ ضرور داخل کرتے انہیں خوشحالی کے باغات میں۔ نعیم: اچھی حالت، خوشحالی۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: اور اگر بیشک یہ لوگ قائم کرتے تورات کو اور انجیل کو، وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ: اور اس چیز کو جو ان کی طرف اتاری گئی ان کے ربّ کی طرف سے، لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ: تو کھاتے یہ جانبِ بالا سے بھی، یعنی آسمان کی طرف سے برکات اترتیں، سازگار موسم ہوتا، بارش ہوتی، تو ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام فوقانی جانب سے ہوتا، آسمان کی جانب سے، وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ: اور اپنے پاؤں کے نیچے سے، تحتانی جانب سے بھی ان کے لئے رزق کے اسباب مہیا ہوتے، زمین پیداوار دیتی، اچھی فصلیں اُگتیں، اور ہر قسم کی نعمتیں ان کو زمین کی طرف سے ملتیں۔ تو فوقانی تحتانی سارے اسباب ان کے لئے درست ہوجاتے اور ان کی عیش عشرت کا سامان ہوجاتا اگر یہ تورات کو، انجیل کو اور اس کتاب کو جو ان کی طرف ان کے ربّ کی طرف سے اتاری گئی ہے اس کو قائم کرتے، اور قائم کرنے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اپنی زندگی کے ساتھ قائم کرلیں، اپنی زندگی اس کے مطابق گزارنے لگ جائیں، یہ ہے اقامتِ کتاب۔ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ: ان میں سے ایک جماعت ہے اعتدال پہ رہنے والی، میانہ رَو، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ: اور ان میں سے بہت سے بُرا ہے وہ کام جو وہ کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

اہلِ کتاب کے اِستہزا کا مسکت جواب

اہلِ کتاب جو دین کا مذاق اُڑاتے تھے، نماز اور اَذان کا استہزا کرتے تھے، اس کے ذکر کے بعد سرورِ کائنات ﷺ سے کہا جارہا ہے، کہ ان اہلِ کتاب کو متوجہ کرکے یہ پوچھو کہ تم جو ہمارا مذاق اُڑاتے ہو، ہمارے دین کا مذاق اُڑاتے ہو، تم نے ہم میں

کیا عیب دیکھا ہے؟ ہم میں ایسی کون سی خرابی ہے جس کا تم مذاق اُڑا رہے ہو؟ ایک یہی بات ہی ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے، اور اس کتاب پر ایمان لے آئے جو ہماری طرف اتاری گئی، اور اس پر بھی ایمان لے آئے جو اس سے قبل اُتاری گئی، توراۃ انجیل پہ ہمارا ایمان، قرآن پہ ہمارا ایمان، اللہ پہ ہمارا ایمان، تو ان میں سے کون سی بات ایسی ہے جس کا تم عیب لگاتے ہو اور جس کا تم انکار کرتے ہو، اگر ہمارے اندر عیب ہے تو یہی ہے، اب یہ تم دیکھ لو کہ عیب ہے یا نہیں۔ اور دوسری جانب تمہارا حال یہ ہے کہ تم اکثر بدمعاش ہو، فاسق ہو، اللہ کے اَحکام کی خلاف ورزی کرنے والے، قابلِ استہزا تو تم ہو، قابلِ نفرت تو تم ہو، لیکن معاملہ اُلٹا ہے کہ ہماری خوبیاں تمہیں عیب نظر آ رہی ہیں اور اپنے عیب تمہیں خوبیاں نظر آ رہی ہیں، یعنی تمہارا فسق و فجور اتنا نمایاں ہے کہ جس کا تم بھی انکار نہیں کر سکتے کہ تم اَحکام کی خلاف ورزی کرتے ہو، اور اُدھر ہمارے ساتھ اگر تمہارا اختلاف ہے تو صرف اس ایمان کی بنا پر، کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے، اور اللہ نے جو کتاب اتاری اُس کو ہم نے مان لیا، اور جو پہلے سے کتابیں اتاری ہوئی ہیں اُن کو بھی ہم نے تسلیم کر لیا، تو عیب کی حالت ہماری ہے یا تمہاری ہے؟ اِستفہام کی صورت میں یہ بات نقل کی جا رہی ہے، کہ اس میں کون سی عیب کی بات ہے جو تم ہماری طرف منسوب کرتے ہو، اور اُدھر تمہارا حال یہ ہے کہ تم نافرمان ہو، فسق و فجور میں مبتلا ہو، یعنی جس کو آج کل کے محاورات میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس کی دو آنکھیں صحیح ہیں اُس کے اُوپر اندھے کو ہنسنے کا کیا حق؟ جس کی دونوں آنکھیں صحیح ہیں اُس کا مذاق ایسا شخص کیوں اُڑاتا ہے جس کے پاس ایک آنکھ بھی نہیں، اُس کو مذاق اُڑانے کا کیا حق ہے، ہمارے پاس تو ایمان ہے اللہ پر اور اس کی کتابوں پر، یہ صحیح کیفیت ہے، یہ تو قابلِ تعریف ہے، اور تم فسق میں مبتلا ہو گئے، اور اس نُور سے اور اس سعادت سے محروم ہو گئے، اور پھر تم ہمارے اُوپر زبان درازی کرو اور ہمارے عیب نکالو اور ہماری بُرائی کرو، یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اور اگر تمہیں ہمارا یہ طریقہ بُرا ہی نظر آ رہا ہے تو آؤ، ہم تمہیں ایسے لوگوں کی نشاندہی کریں کہ جن کا طریقہ ہمارے اس طریقے سے بھی زیادہ بُرا ہے، یعنی یہ جو مقابلہ کیا جا رہا ہے کہ ہمارے طریقے سے زیادہ بُرا، جس سے معلوم ہوتا کہ ہمارا طریقہ بھی بُرا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بقول تمہارے، کہ اگر تمہیں ہمارا طریقہ بُرا نظر آ رہا ہے کہ ہمارا طریقہ اچھا نہیں، تو آؤ، ہم تمہیں ایسے لوگوں کی نشاندہی کریں جو طریقے کے اعتبار سے ہم سے بھی زیادہ بُرے ہیں، وہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے طریقے کی بنا پر اللہ نے اُن پر لعنت کی، اللہ کا غضب ان پر برسا، جن کو اللہ نے کبھی بندروں کی شکل میں مسخ کیا، کبھی خنزیروں کی شکل میں مسخ کیا، جو اپنی بدکرداری کے اعتبار سے اللہ کی عبادت کی بجائے شیطان کی پُوجا کرنے لگ گئے، اُن لوگوں کا طریقہ سب سے زیادہ بُرا ہے، اب ہمیں نام لینے کی کیا ضرورت ہے کہ کن لوگوں کا طریقہ ہے؟ وہ خود ہی جانتے ہیں کہ یہ بات کن پہ صادق آ رہی ہے، مطلب کیا ہوا؟ کہ تم لوگ ایسے ہو کہ جن کے طریقے کی بنا پر اللہ کی لعنت تم پہ برسی، تمہارا طرزِ عمل ایسا ہے کہ جس کے نتیجے میں تم اللہ کے غضب کا شکار ہوئے، تمہارا کردار ایسا ہے کہ اللہ نے کبھی تمہیں بندر بنایا، کبھی تمہیں خنزیر بنایا، تو بندروں کی شکل میں مسخ ہونے والے، خنزیروں کی شکل میں مسخ ہونے والے، اللہ کی لعنت اور غضب کا نشانہ بننے والے وہ ہم پر ہنستے ہیں؟ انہیں ہمارا طریقہ بُرا نظر آ رہا ہے؟ اگر ہمارا طریقہ بُرا ہے تو ان لوگوں کا طریقہ اس سے ہزار درجے زیادہ بُرا ہے، تو جب تمہاری دونوں آنکھیں چوپٹ ہیں، تو تمہیں ہم پر ہنسنے کا کیا حق ہے؟ جن کے طریقے کے نتیجے میں، جن کے طرزِ عمل کے نتیجے میں ان کو لعنت ملی، غضب ملا، اور ان

کی شکلیں مسخ ہوئیں، اور وہ شیطان کے پجاری ثابت ہوئے، اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا: یہ لوگ مرتبے کے لحاظ سے زیادہ بُرے ہیں، ٹھکانے کے لحاظ سے زیادہ بُرے ہیں، اور سیدھے راستے سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ تو مذاق تم ہمارا اُڑاتے ہو، ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو، تم کس طور طریقے کے پابند ہو، تو چونکہ دین کا استہزا ایک بہت بُری حرکت ہے، تو اس کے جواب میں دیکھو جو بات کہی جارہی ہے اس میں کس حد تک تلخی نمایاں ہے، اور کتنا اس کے اندر غصّے اور نفرت کا اظہار ہے، کہ ایسے ہو کر تم پھر ہمارے طریقے کی عیب جوئی کرتے ہو؟

یہود کی طرف سے مؤمنین کو دھوکا دینے کی کوشش

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا: اور پھر ان کا نفاق، ان کی دھوکا بازی! کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں، تو آ کر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اب یا تو اس سے یہود میں سے وہ خاص افراد مراد ہیں جو کہ نفاق کے طور پر آ کر ایمان کا اظہار کرتے تھے، جن کا ذکر آپ کے سامنے بار ہا آیات کے اندر کیا جاچکا، معروف تفسیر ان الفاظ کی یہی ہے، کہ بعض یہود آتے تھے اور آ کے ایمان کا اظہار کرتے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ ایمان قبول کرنے والے نہیں ہوتے تھے، دھوکا دیتے تھے مسلمانوں کو کہ مسلمان ہمیں اپنا سمجھنے لگ جائیں، ہوتے تھے وہ منافق، پھر اِدھر کی اُدھر کی لگاتے تھے، اُدھر کی اِدھر لگاتے، فساد کا باعث بنتے تھے، معروف تفسیر اس کی یہی ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے یوں بھی کہا کہ یہ یہود مسلمانوں کو بایں معنیٰ دھوکا دینے کی کوشش کرتے تھے، کہ بھائی! اگر تم مؤمن ہو تو مؤمن تو ہم بھی ہیں، ہم بھی اللہ کو مانتے ہیں، اللہ کے پیغمبروں کو مانتے ہیں، اللہ کی کتابوں کو مانتے ہیں، فرق صرف اتنا سا ہی ہے کہ ہم حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہم تمہیں مؤمن کہیں تم ہمیں مؤمن کہو، تو اس طرح سے رَل مل کے رہ لیں، اور اتنے سے فرق کی بنا پر اگر تم ہمیں کافر کہو اور یہ کہو وہ کہو تو یہ تو خواہ مخواہ کی گڑبڑ ہے، ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس طرح سے مؤمنوں کو دھوکا دے کر گویا کہ اپنے طریقے پر ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے، تو پھر اٰمَنَّا کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کہتے تھے کہ اگر تمہارا ایمان ہے تو مؤمن تو ہم بھی ہیں، اللہ پر ہمارا ایمان، اللہ کے رسولوں کو ہم مانتے ہیں، اللہ کی کتابوں کو ہم مانتے ہیں، آخرت کو ہم مانتے ہیں، تو پھر ہم میں اور تم میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنی سی بات ہے کہ اللہ کے پیغمبروں میں سے موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے مان لیا، اور اپنے خیال کے مطابق محمد ﷺ کو تم نے مان لیا، تو جیسا ایمان تمہارا ویسا ایمان ہمارا، پھر ہم کافر کیسے اور تم مؤمن کیسے؟ اس طرح سے وہ کم علم لوگوں کو یا نو مسلم لوگوں کو دھوکا دے کر اپنے آپ کو مؤمنوں کی صف کے اندر شامل کرانا چاہتے تھے، یہی وہ خداع ہے چالبازی ہے جو وہ مؤمنوں کے سامنے آ کر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا دعویٰ ایمان کوئی چیز نہیں ہے، جب یہ آتے ہیں تمہارے پاس تو کافر، اُٹھ کے جاتے ہیں تو تو کافر، نہ آتے وقت ان کے پلے ایمان تھا نہ جاتے وقت ان کے پاس ایمان ہے، جیسے کُفر کے ساتھ آئے تھے ویسے کُفر کے ساتھ چلے گئے، یعنی سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لائے بغیر ایمان کا دعویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ایک پیغمبر کا انکار سارے پیغمبروں کے انکار کے برابر ہے، اس لیے حضور ﷺ کا انکار کر کے یہ مطمئن ہوں کہ ہمارا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے، یہ ایمان کوئی معتبر نہیں، اس طرح سے بھی ان الفاظ کی تقریر کی جاسکتی ہے، ورنہ منافقین پر تو یہ الفاظ

بہت ہی اچھی طرح سے چسپاں ہوتے ہیں، نفاق کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ وہ داخل بھی کُفر کے ساتھ ہوئے، اور وہ نکل کر بھی کُفر کے ساتھ ہی گئے، یعنی جب آئے تھے تب کافر، جب گئے تب کافر، ''اور اللہ زیادہ اچھی طرح سے جانتا ہے اُن خیالات وعقائد کو جس کو یہ اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں'' اور ایمان کا تعلق تو قلب کے ساتھ ہے، جب تک ان کا دل صاف نہیں ہوتا، اور دل کے اندر ان کے عقیدے اچھے نہیں ہوتے، دل کے اندر کُفر چھپائے ہوئے ہوں، تو اللہ ان کو مؤمن قرار نہیں دے گا، یہ جتنا چاہے چھپالیں لیکن اللہ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، تو ان کے دلوں کے خیالات دلوں کے عقیدے سب اللہ کے سامنے نمایاں ہیں۔

یہود کا قومی مزاج

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ: یہ بھی ان کا قومی مزاج مذکور ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ ان کا مزاج اتنا بگڑ گیا کہ نیکی کا شوق انہیں نہیں، بُرائی کی طرف بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ جب ایک آدمی ایک بُرائی کی طرف مائل ہوجاتا ہے، تو پہلے پہلے اُس کے قلب کے اندر تردد ہوتا ہے، وہ بچ بچ کر چلتا ہے، کبھی رکتا ہے کبھی آگے کو بڑھتا ہے، پھر وہ اس بُرائی میں مبتلا ہوجائے تو قلب کی مزاحمت کسی درجے میں کم ہوجاتی ہے، پھر وہ اس بُرائی کا عادی ہوجاتا ہے تو پھر اس کا دل متوجہ ہی بُرائی کی طرف ہوتا ہے، اُس کے برعکس اس کو نیکی کی طرف متوجہ کرو تو نیکی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، اس کی طبیعت کی رغبت جتنی ہے وہ سب بُرائی کی طرف ہوجاتی ہے، اس لیے اولیاء اللہ کہا کرتے ہیں کہ دل کی کیفیت کی ہمیشہ نگہبانی کرنی چاہیے، دل کی کیفیت اگر اچھی ہو تو عارضی طور پر اگر کسی گناہ کے اندر انسان مبتلا بھی ہوجائے تو اُس کے لیے سنبھلنا آسان ہے، لیکن اگر دل کی کیفیت ہی بدل گئی، مَلکات ہی تبدیل ہوگئے، اور وہ عادت بن گئی، طبیعت کا رجحان ہوگیا، پھر بُرائی آسان ہوجاتی ہے اور نیکی مشکل ہوجایا کرتی ہے، تو بُرائی کرنے کے نتیجے میں بُرائی مرغوب ہوجائے گی، پھر انسان اپنی طبعی رغبت کے ساتھ دوڑ دوڑ کر بُرائی کی طرف جاتا ہے، اور اگر نیکی کرنے کی عادت ڈال لو گے تو آہستہ آہستہ نیکی مرغوب ہوجائے گی، پھر بھاگ بھاگ کر نیکی کی طرف جاؤ گے، جیسے مؤمنین کی صفت ذکر کی تھی: ''يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ''[1] اِن کی صفت ہے: ''يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ'' (سورۂ مائدہ: ۴۱، آل عمران: ۱۷۶) کُفر کی باتوں کی طرف بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں، ان کا قومی مزاج اتنا فاسد ہوگیا کہ تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے گا کہ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں گناہ میں، عدوان میں، حرام کھانے میں، یعنی یہ ان کی مرغوب فیہ چیزیں بن گئیں، یہ ان کے مَن بھاتے کھاجے ہیں، اس کے بغیر ان کو سکون نہیں آتا، جب تک یہ کسی گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جب تک کسی پر ظلم اور تعدی نہ کریں، جب تک ان کو حرام کھانے کے لیے نہ ملے اِن کی طبیعتوں کو سکون نہیں آتا، یہ حرام خور ہوگئے، بدکردار ہوگئے، اور ایسے طور پر کہ ان کی طبیعت دوڑ دوڑ کر اُدھر کو جاتی ہے۔ یہ قلوب کے فساد کی طرف اشارہ ہے، ورنہ اگر قلوب کی حالت اچھی ہو تو پھر کبھی انسان گناہ میں مبتلا بھی ہوجائے تو فوراً سنبھل جاتا ہے، لیکن جب دلوں کے اندر ہی گناہ کی رغبت پیدا ہوجائے، کسی گناہ کی عادت ہی بن جائے، تو پھر انسان نیکی کی

(۱) پارہ ۴ سورۂ آل عمران آیت ۱۱۴۔ پارہ ۱۷ سورۂ انبیاء آیت ۹۰۔ پارہ ۱۸ سورۂ مؤمنون آیت ۶۱۔

بجائے اُدھر دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، تو ان کا مزاج اس طرح سے فاسد ہو گیا، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: بُرا کام ہے جو یہ کرتے ہیں۔ یہ تو ان کے عوام کی حالت ہے۔

یہود کے علماء اور مشائخ کا بگاڑ اور اس کا سبب

اور اب لے لیں ان کے مشائخ اور علماء، ان پر یہ انکار کیا جا رہا ہے کہ ان کے مشائخ اور علماء کیوں نہیں روکتے ان کو گناہ کی بات کہنے سے؟ (اس سے جھوٹ بولنا مراد ہے) اور حرام کھانے سے یہ کیوں نہیں روکتے؟ بہت بُرا کردار ہے جو ان مشائخ اور علماء نے اختیار کر رکھا ہے۔ گویا کہ عوام کا عمل بھی بگڑا اور مشائخ کا بھی بگڑا، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں روایت ہے، کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ بنو اسرائیل گناہوں کے اندر مبتلا ہوئے، انہوں نے بدکرداریاں اختیار کیں، تو علماء نے پہلے پہلے روکا، لیکن جب ان کے روکنے کے باوجود وہ باز نہیں آئے، تو علماء اور مشائخ کا فرض تو یہ تھا کہ انکار کرتے رہتے، زبان سے نفرت کا اظہار کرتے، اور عملاً بھی ان سے اجتناب رکھتے، عمل سے بھی ایسے معلوم ہوتا کہ وہ دیکھنے والے سمجھتے کہ یہ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے، بُرائیوں کے اندر مبتلا ہونے والے تأثر یہ لیتے کہ یہ ہمارے پیر اور ہمارے علماء ہمیں اچھا نہیں سمجھتے، اس لیے زبان سے انکار کرتے ہیں اور ان کے عمل سے بھی نفرت ٹپکتی ہے، تو ایسے وقت میں توقع ہوتی ہے کہ دوسرے شخص کو اپنے گناہ کا اور بُرائی کا احساس ہو جائے، پھر بھی وہ سیدھے راستے پر آ سکتا ہے، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ نہ رُکے تو یہ علماء انہی کے ساتھ مل کر کھاتے رہے پیتے رہے، انہی کی مجلسوں کے اندر ہنسی اور دل لگی میں شامل رہے، ہم پیالہ ہم نوالہ رہے، ہم مجلس رہے، ان کی دوستیاں ان کے ساتھ بحال رہیں، تو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے بدکرداری کے اندر وہ عوام مبتلا ہوئے تھے اُن کے دلوں کی نحوست اِن پر بھی پڑی، اور گناہ کی نفرت اور گناہ سے دوری اِن کے قلوب میں بھی نہ رہی، چاہے ظاہری طور پر انہوں نے علماء کا لباس پہن رکھا تھا، چاہے ظاہری طور پر انہوں نے مشائخ کا لباس اختیار کر رکھا تھا، صوفیوں جیسی شکل تھی عالموں جیسی شکل تھی، لیکن قلوب ایک جیسے ہو گئے، ایک دوسرے پر قلوب کا اثر پڑا، قلوب میں گناہ سے نفرت نہ رہی، تو پھر اللہ تعالیٰ نے سب پر لعنت کی، اہلِ علم پر بھی اور جاہلوں پر بھی، ساری کی ساری جماعت پھٹکاری گئی۔ وہ روایت گویا کہ انہی لفظوں کی تشریح ہے جو قرآنِ کریم میں یہ آئے ہیں، ''کیوں نہیں منع کرتے اِن کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے'' لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ: بُرا کردار ہے جو کہ انہوں اختیار کر رکھا ہے۔

اللہ کی شان میں یہود کی گستاخی اور اس کی سزا

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ: اب یہ یہود کی گستاخی ہے اللہ کی جناب میں، یہ ویسے ہی بات ہے جیسے پہلے آپ کے سامنے ایک مضمون آیا تھا کہ یہود کہتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (سورۂ آل عمران: ۱۸۱)، یاد ہو گا جہاں صدقات کی ترغیب آئی تھی، وہاں ان کا یہ لفظ آیا تھا کہ اللہ فقیر ہو گیا، محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتا ہے، یہ بھی ان کی بدباطنی تھی کہ اس قسم کی باتوں کو صحیح محمل کرنے کی بجائے مذاق اڑاتے تھے، اب یہاں بھی ایسے ہی ہوا کہ یہود اپنی بدکرداریوں کی

بناء پر جب رزق کی تنگی میں مبتلا ہوئے اور ان کے معاشی حالات خراب ہوئے، تو چاہیے تو تھا کہ وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیتے کہ اللہ ہم پر ناراض ہوگیا اور اُس کی لعنت ہم پر برس رہی ہے، جس کی وجہ سے ہمیں اُس نے سہولتوں سے اور زندگی کی آسائشوں سے محروم کردیا، تو اپنے کردار کو تو دیکھتے نہ، اُلٹا زبان درازی اللہ پر کرتے، کہ آج کل اللہ کا ہاتھ بند ہوگیا، اللہ بخیل ہوگیا، آج کل یہ کسی کو کچھ نہیں دیتا، ہمارے لیے اب اللہ کے پاس کچھ نہیں ہے، وہ بخیل ہوگیا ہے، اس قسم کے لفظ بطور گستاخی کے بولتے، یعنی اپنی بدکرداری کا جائزہ لینے کی بجائے اُن کو اعتراض اللہ پر ہی تھا، یہ بھی ان کے باطن کے مسخ ہونے کی دلیل ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے ہاتھ بند ہوگئے، بخل تو ان کے اُوپر چسپاں ہے، ان کے ہاتھوں میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اللہ کے نام پر یا اللہ کے دین کے لیے کوئی قربانی دیں اور کسی چیز کو صرف کریں۔

باقی! ان کی یہ بات اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچ نہیں سکتی، یعنی اس قسم کے طعن وتشنیع کا یہ نتیجہ نہیں نکلے گی کہ اللہ تعالیٰ ان کی زبان درازی کی وجہ سے ان کے طعن وتشنیع کی وجہ سے ان کو دینا شروع کردے، بلکہ ان کے اس قول کی وجہ سے ان پر مزید لعنت ہوئی، وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا: جو بات انہوں نے کہی اُس کے سبب سے یہ ملعون ٹھہرے، ''اللہ کے ہاتھ تو دونوں کھلے ہوئے ہیں'' اللہ تعالیٰ کی طرف بخل کی نسبت کس طرح سے ہوسکتی ہے، ساری کائنات پر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں بکھیر رہا ہے، ''خرچ کرتا ہے جس طرح سے چاہتا ہے''، وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا: مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: جو کچھ آپ کی طرف اتارا جارہا ہے آپ کے رَبّ کی طرف سے وہ ان میں سے بہتوں کے طغیان وکُفر میں اضافہ کرتا ہے، یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ ان باتوں کو سُن کر وہ سمجھنے کی کوشش کرتے، لیکن جیسے جیسے دِین آپ پر اتر رہا ہے اِن کا طغیان اور کُفر بڑھ رہا ہے، ''طغیان اور کُفر بڑھ رہا ہے'' یہ اُن کے غلط فکر کا نتیجہ تھا، جب وہ اس حسد کے اندر مبتلا ہوگئے کہ ہم سے علمی سیادت جارہی ہے، اور جو سرداری ہمیں حاصل تھی، قیادت ہمیں حاصل تھی ہم سے چھن رہی ہے، تو جیسے جیسے اِدھر دِین ترقی پاتا اتنا تنا ان کے حسد کے اندر اضافہ ہوتا تھا، طغیان اور سرکشی بڑھتی چلی جارہی تھی، قبول کرنے کی بجائے وہ دوسری طرف کو زیادہ نکل گئے۔ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ: ان کی بدکرداری کے نتیجے میں جو لعنت ہوئی تھی اُس کا اثر یہ بھی ہوا کہ ان کے مختلف گروہ بن گئے، مختلف پارٹیاں بن گئیں، جن کی آپس میں قیامت تک عداوت اور بغض باقی رہے گا۔

''اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ'' کا مفہوم

قیامت تک کا مطلب ہمیشہ کے لیے، یہ محاورہ ہے، ''قیامت تک'' کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد ہوتا ہے ہمیشہ کے لیے، جب تک یہ موجود رہیں گے ان کے مختلف گروہ ہوں گے اور ان کی آپس میں عداوت ہوگی، یہود کی نصاریٰ کی آپس میں مختلف گروہوں کی شکل میں بٹ جانے کی وجہ سے عداوتیں قائم ہوگئیں۔ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ کو محاورہ پر محمول کرتے ہوئے ہم جو کہہ رہے ہیں

کہ اس سے مراد ہے ہمیشہ کے لیے جب تک یہود ونصاریٰ موجود ہوں گے، یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کے اندر یہ بات آتی ہے کہ آخر زمانے میں جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت نصرانیت بھی ختم ہو جائے گی، یہودیت بھی ختم ہو جائے گی، یہودی جو ایمان نہیں لائیں گے، عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل ہو جائیں گے، اور اسی طرح سے عیسائی جو ایمان نہیں لائیں گے وہ بھی برباد ہو جائیں گے، تو نصرانیت بھی ختم، یہودیت بھی ختم، اور وہ وقت ایسا ہوگا کہ سوائے اسلام کے کوئی دوسرا دین باقی نہیں رہے گا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے متصل قیامت نہیں آنی، اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کتنی مدت گزرے گی، تو وہ آنے والا دور جتنا بھی ہوگا جو اللہ کے علم میں ہے کہ کتنی صدیوں پر مشتمل ہے یا کتنے برسوں پر مشتمل ہے، اس وقت یہود ونصاریٰ کا نام ونشان نہیں ہوگا، تو گویا کہ یہود ونصاریٰ جماعتی شکل میں قیامت تک باقی رہنے والے نہیں ہیں، بلکہ ان کا مسلک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا، اور آگے صرف اسلام رہ جائے گا، پھر اسلامی دور پر بھی آہستہ آہستہ زوال آئے گا، دوبارہ پھر کفر وشرک پھیلے گا، اور قیامت کے قریب جا کر پھر مسلمان بھی بالکل ختم ہو جائیں گے، اور حقیقتاً قیامت نے اس وقت قائم ہونا ہے جب کوئی اللہ کا نام لینے والا موجود نہیں ہوگا، شرار خلق اللہ کے اوپر قیامت آئے گی، جب بدترین قسم کے لوگ باقی رہ جائیں گے، جن کے پاس نہ اخلاق ہوگا نہ دین، کوئی چیز نہیں ہوگی، گدھوں کی طرح فساد کریں گے، زناکاری عام ہو جائے گی، بت پرستی عام ہو جائے گی، اس وقت پھر قیامت آئے گی۔ تو اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ یہود ونصاریٰ قیامت تک باقی رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ قیامت تک ہم نے ان کے درمیان میں عداوت اور بغض ڈال دیا، بلکہ روایاتِ صحیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو اس طرح سے محاورے پر محمول کریں گے، کہ جب تک ان کا وجود باقی ہے اس وقت تک یہ آپس میں اختلاف کریں گے، اور بغض اور عداوت کے اندر مبتلا رہیں گے، ورنہ قیامت سے بہت پہلے ان کا وجود ختم ہو جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے بعد یہ دونوں مسلک ختم ہو جائیں گے، نہ یہودیت رہے گی نہ نصرانیت۔

یہود کی طرف سے سازشوں کی ناکام کوششیں

كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ: جب یہ لڑائی کے لیے آگ بھڑکاتے ہیں، اَطْفَاَهَا اللّٰهُ: اللہ مٹا دیتا ہے۔ یہ واقعہ تھا اُس وقت کہ یہودی آئے دن سازشیں چلتی تھیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف، کبھی کسی قبیلے کو بھڑکایا، کبھی کسی قبیلے کو بھڑکایا، لیکن ان کی سازشیں کامیاب نہیں ہوئیں، اگر کسی جگہ کوئی تھوڑی بہت لڑائی کی نوبت آئی بھی، تو یہ بھی اور ان کے حمایتی بھی سارے شکست کھا گئے، اور اکثر ان کی سازشیں ناکام ہوئیں اور لڑائی تک نوبت ہی نہیں آئی۔ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا: جن کو دنیا کے اندر ایک اصلاحی نظام دیا گیا تھا، آج وہی فساد کی کوشش میں مبتلا ہیں، ان کو چاہیے تو یہ تھا کہ عدل وانصاف کو قائم کرتے، شہادت للہ کے یہ عادی ہوتے، اور قائم بالقسط کا یہ مصداق ہوتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا علم ان کو اس لیے دیا تھا، اپنا قانون اس لیے دیا تھا، لیکن سب کچھ بھلا کر آج زمین کے اندر فساد کا باعث بن گئے، عدل وانصاف کے خلاف جو بھی کوشش کی جائے وہ زمین کے

اندر فساد پھیلانے والی بات ہے، اور یہ حق کی مخالفت کرتے تھے، عدل و انصاف کو مٹانے کی کوشش کرتے تھے، جس کے نتیجے کے اندر اللہ کی کائنات کے اندر فساد برپا ہوتا ہے،'' اور اللہ تعالیٰ مفسدین سے محبت نہیں رکھتے۔''

اہلِ کتاب اگر ایمان لاتے تو ان پر کیا کیا انعامات ہوتے؟

آگے پھر اُن کو ایمان کی ترغیب ہے، کہ یہ اہلِ کتاب اگر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم اِن سے اِن کے گناہوں کو دُور کرتے اور انہیں خوشحالی کے باغات میں داخل کرتے، اور اگر یہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور اُس چیز کو جو ان کی طرف ان کے ربّ کی طرف سے اتاری گئی ہے، اِس کا مصداق قرآن ہے، قائم کرنے کا معنی کہ اس کا تعلق اپنی زندگی کے ساتھ قائم کریں، اور اس کو عملی جامہ پہنائیں، زندگی اس قانون کے مطابق گزاریں، تورات انجیل اور قرآن تینوں کو قائم کریں، تینوں کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تینوں کتابوں کو سامنے رکھ کر اب جو چیز سامنے آتی ہے اس کو مان لیا جائے، جو اَحکام منسوخ ہوگئے وہ تو گویا کہ تینوں کی طرف منسوب نہ ہوئے، جو باقی ہیں اور اب اللہ کی طرف سے عمل کرنے کے لیے دیے جارہے ہیں، یہی تورات کا تقاضا، یہی اِنجیل کا تقاضا، یہی قرآن کا تقاضا ہے، تو موسیٰ علیہ السلام کو مانا، عیسیٰ علیہ السلام کو مانا، تینوں کتابوں کا تقاضا یہ ہے کہ آنے والے پیغمبر کو بھی مانا جائے، جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے بعض اَحکام حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے منسوخ کردیے، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں صراحتاً آیا ہوا ہے، اسی طرح سے تورات و اِنجیل کے بعض اَحکام اس آنے والے پیغمبر نے منسوخ کردیے، اب ان پر عمل کرنا تینوں کتابوں کا تقاضا نہیں ہیں، تینوں کتابوں تقاضا اُنہی اَحکام پر عمل کرنا ہے جو اس وقت باقی ہیں۔ اگر یہ ان کو قائم کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو نعمتوں سے نوازتا، دنیوی خوشحالی دیتا، اُوپر کی طرف سے بھی ان کے لیے رزق کا انتظام ہوتا، اور قدموں کے نیچے سے بھی، اُوپر کی طرف سے رزق کے انتظام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کی طرف سے حالات سازگار ہوتے، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمیں رزق جو مہیا ہوتا ہے اس کے اندر زمین کا دخل بھی ہے اور آسمان کی طرف سے بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں، سورج کی گرمی چاند کی چاندنی یہ بھی اثرانداز ہوتی ہے ہمارے لیے رزق مہیا کرنے پر، یہ پھلوں کی رنگت اور پھلوں کے اندر مزا اور اسی طرح سے فصل کا پکنا بڑھنا یہ سورج کی گرمی اس قسم کی چیزیں اس پر اثرانداز ہوتی ہیں، اور آسمان کی طرف سے موقع پر بارش آنا، زیادہ بارش نہ آنا، آندھیوں سے بچاؤ، یہ اسباب اگر سازگار ہوں تو پھر رزق مہیا ہوتا ہے، اور اسی طرح سے زمین کی طرف سے کوئی سیلاب نہ آئے، اور زمین میں زلزلے وغیرہ نہ آئیں، اور اس کے اندر شور اور کلر نہ پھیلے، یہ حالات سازگار رہیں تو تب جا کے خوشحالی کے ساتھ ہمارے لیے پھل پھول اور رزق کا انتظام ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر یہ اللہ کے قانون کو عملاً قائم کرلیتے اور اپنی زندگی اس کے مطابق گزارتے تو اُوپر نیچے ہر قسم کے حالات ان کے لیے سازگار ہوتے، اور خوشحالی کے ساتھ اپنا وقت گزارتے، تو ''لَوْ'' کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ انہوں نے یہ کام نہیں کیا اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آئے دِن لعنت اور غضب کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، اور دنیا کے اندر بھی ان کو رُسوائی ملتی رہتی ہے، پریشانیوں سے یہ گھرے ہوئے ہیں۔

قرآنِ کریم کا انصاف

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ: یہ قرآنِ کریم کا انصاف ہے کہ جب دوسری جماعت کا ذکر کرتا ہے تو سب کا رگڑا اکٹھے نہیں نکال دیتا، بلکہ جو ان میں سے اچھے افراد ہوتے ہیں ان کو ہمیشہ مستثنیٰ کرلیا جاتا ہے، تو جب برائی بیان کی تو كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ کے ساتھ بیان کی، اور ایک جماعت کو علیحدہ کر کے ذکر کردیا کہ ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اعتدال پر چلنے والے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں افراد و تفریط سے بچنے والے جو قرآنِ کریم کے نازل ہونے سے پہلے توراۃ اِنجیل کے جو اَحکام ان کے پاس تھے ان کے مطابق عمل کرتے تھے، اور قرآنِ کریم کے آجانے کے بعد انہوں نے اس کو تسلیم کرلیا، یہود میں سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت اور نصاریٰ کے اندر نجاشی اور اُس کے ساتھ ملنے والے، ان کی تعریف قرآنِ کریم میں مختلف جگہ کی گئی ہے، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ: چھوٹی سی جماعت ہے جو ان میں سے مُّقْتَصِدَةٌ ہے، سیدھی راہ پر چلنے والی، افراط تفریط سے بچنے والی، اور ان میں سے بہت سارے لوگ بُرا ہے کام جو وہ کرتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ

اے رسول! پہنچادو وہ چیز جو اُتاری گئی آپ کی طرف آپ کے رَبّ کی جانب سے، اور اگر آپ نے نہ کیا تو آپ نے نہیں پہنچایا

رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾ قُلْ

اللہ کا پیغام، اللہ بچائے گا آپ کو لوگوں سے، بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافر لوگوں کو ﴿٦٧﴾ آپ کہہ دیجئے

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

کہ اے کتاب والو! تم کسی شئے پر نہیں ہو جب تک کہ تم قائم نہ کرو توراۃ کو اور انجیل کو

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

اور اُس چیز کو جو تمہاری طرف اُتاری گئی تمہارے رَبّ کی جانب سے، جو چیز آپ کی طرف اُتاری گئی آپ کے رَبّ کی جانب

مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ اِنَّ

سے وہ البتہ ان میں سے بہتوں کو زیادہ کرتی ہے از روئے سرکشی کے اور کُفر کے، نہ افسوس کر کافر لوگوں پر ﴿٦٨﴾ بے شک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ

وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جو یہودی ہوئے اور صابی بھی اور نصاریٰ، جو کوئی

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

ایمان لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور نیک عمل کرے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ

نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۶۹﴾ البتہ تحقیق لیا ہم نے بنی اسرائیل کا پختہ عہد اور ان کی طرف

اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا

بہت سارے رسول بھیجے، جب کبھی آیا ان کے پاس رسول ایسی چیز لے کر جس کو ان کے دل نہیں چاہتے، انہوں نے ایک فریق

كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا

کو جھوٹا بتلایا اور ایک فریق کو یہ قتل کرتے تھے ﴿۷۰﴾ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ کوئی سزا نہیں ہوگی، پس وہ اندھے ہوگئے

وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ

اور بہرے ہوگئے پھر اللہ نے ان پر توجہ کی، پھر اندھے ہوگئے اور بہرے ہوگئے ان میں سے بہت سارے،

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧١﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ

اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اُس چیز کو جو وہ کرتے ہیں ﴿۷۱﴾ پکی بات ہے کہ کافر ہوگئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ

الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا

مسیح ابن مریم ہی ہے، حالانکہ کہا مسیح نے اے اسرائیل کی اولاد! عبادت کرو

اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ

اللہ کی جو میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، بیشک بات یہ ہے کہ جو کوئی شریک ٹھہرائے اللہ کے ساتھ پس تحقیق اللہ نے

عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾

اس پر جنت کو حرام کر دیا، اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ﴿۷۲﴾

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ

بلا شک وشبہ کافر ہوگئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے، اور نہیں ہے کوئی معبود

اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ

مگر ایک ہی معبود، اگر نہیں رُکیں گے اس بات سے جو یہ کہتے ہیں تو البتہ جو لوگ ان میں سے کفر پر رہیں

كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞٧٣ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ

گے ان کو عذابِ الیم چھوئے گا ۞٧٣ کیا یہ توبہ نہیں کرتے اللہ کی طرف اور اس سے اِستغفار نہیں کرتے؟

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞٧٤ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ

اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۞٧٤ نہیں ہے مسیح ابنِ مریم مگر رسول، اس سے قبل بھی

مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ

بہت سارے رسول گزر گئے، اور اُس کی ماں صدیقہ ہے، یہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے، دیکھ تو،

كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۞٧٥ قُلْ

کیسے واضح کرتے ہیں ہم ان کے لیے نشانیاں، پھر دیکھ، یہ کدھر کو پلٹے جارہے ہیں ۞٧٥ آپ انہیں کہہ دیجئے!

اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ

کہ کیا تم پُوجا کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کو جو نہ تمہارے لیے نقصان کا اختیار رکھتی ہے نہ نفع کا، اور اللہ تعالیٰ

هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۞٧٦ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ

سننے والا جاننے والا ہے ۞٧٦ آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو نہ کرو

غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ

ناحق، اور نہ پیروی کرو تم ان لوگوں کی خواہشات کی جو بھٹک گئے اس سے قبل

وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۞٧٧

اور بہتوں کو انہوں نے گمراہ کیا، اور خود سیدھے راستے سے گمراہ ہوگئے ۞٧٧

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: اے رسول! پہنچا دے وہ چیز جو اُتاری گئی آپ کی طرف آپ کے رَبّ کی جانب سے، وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ: اور اگر آپ نے نہ کیا، یعنی یہ کام جو آپ کے سپرد کیا گیا ہے، تبلیغ ما انزل، اگر آپ نے نہ کیا، فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ: تو آپ نے نہیں پہنچایا اللہ کا پیغام، وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: اللہ بچائے گا آپ کو لوگوں سے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافر لوگوں کو۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ: آپ کہہ دیجئے کہ اے کتاب والو! لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ: تم کسی شئ پر نہیں ہو، حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ: جب تک تم قائم نہ کرو تورات کو اور انجیل کو اور اس چیز کو جو تمہاری طرف اُتاری گئی تمہارے رَبّ کی جانب سے، جس کا مصداق قرآنِ کریم ہے، وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ یہ لَيَزِيْدَنَّ کا فاعل ہے، جو چیز آپ کی طرف اتاری گئی آپ کے رب کی جانب سے البتہ ان میں سے بہتوں کو زیادہ کرتی ہے، طُغْيَانًا وَّكُفْرًا: از روئے سرکشی کے اور کُفر کے۔ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا تمیز ہے اور یہ تمیز محول عن المفعول ہے، یعنی مَآ اُنْزِلَ ان کے طغیان اور کُفر کو بڑھاتا ہے، تو تمیز میں مفعول والا معنی ہے، فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: کافر لوگوں پر افسوس نہ کر، غم نہ کھا، نہ افسوس کر کافر لوگوں پر۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: بیشک وہ لوگ جو ایمان لے آئے، وَالَّذِيْنَ هَادُوْا: اور جو یہودی ہوئے، وَالصّٰبِئُوْنَ: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا محل نصب کا ہے کیونکہ اِنَّ کا اسم بن رہا ہے، اور وَالَّذِيْنَ هَادُوْا کا عطف بھی اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر ہے، یہ بھی اِنَّ کا اسم ہونے کی بنا پر نصب کی جگہ ہے، اور وَالنَّصٰرٰى کا عطف بھی انہی پر ہے اس لیے وہ بھی منصوب ہے، اور وَالصّٰبِئُوْنَ یہ درمیان میں مرفوع آ گیا، اس لیے اس کی ترکیب تھوڑی سی بدلنی پڑے گی، وَالصّٰبِئُوْنَ كَذٰلِكَ، یہ مبتدا خبر اکٹھا یہیں کر دیا جائے گا، ''اور صابی بھی ایسے ہی''، وَالنَّصٰرٰى: اور نصاریٰ، مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ، جو کوئی ایمان لائے اللہ پر، وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: اور پچھلے دن پر، وَعَمِلَ صَالِحًا: اور نیک عمل کرے، فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ ان پر کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: البتہ تحقیق لیا ہم نے بنی اسرائیل کا پختہ عہد، وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا: اور ان کی طرف بہت سارے رسول بھیجے، كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ: جب کبھی آیا ان کے پاس رسول ایسی چیز لے کر جس کو ان کے دل نہیں چاہتے، ''آیا ایسی چیز لے کر'' یوں بھی ترجمہ کر سکتے ہیں، اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''جب کبھی رسول لایا ایسی چیز جس کو ان کے دل نہیں چاہتے'' بِمَا لَا تَهْوٰٓى میں باء تعدیہ کی ہے جس سے جَآءَ کے اندر متعدی والا معنی پیدا ہو گیا، آنے کی بجائے لانا ترجمہ کر دیا گیا۔ ''جب کبھی لایا ان کے پاس کوئی رسول ایسی چیز جس کو ان کے دل نہیں چاہتے'' فَرِيْقًا كَذَّبُوْا: انہوں نے ایک فریق کو جھوٹا بتلایا، وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ: اور ایک فریق کو یہ قتل کرتے تھے۔ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: اور انہوں نے سمجھ لیا کہ کوئی سزا نہیں ہوگی۔ فتنہ سے یہاں عذاب مراد ہے۔ اور انہوں نے گمان کیا، خیال کیا کہ کوئی سزا نہیں ہوگی، فَعَمُوْا: پس وہ اندھے ہو گئے، وَصَمُّوْا: اور بہرے ہو گئے۔ یعنی اندھے بہرے ہو کر وہ اپنی گمراہی کے اندر پڑے رہے، سرکشی کے اندر مبتلا رہے، فَعَمُوْا: پھر وہ اندھے ہو گئے، وَصَمُّوْا: اور بہرے ہو گئے، ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: پھر اللہ نے ان پر توجہ کی، ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا: پھر اندھے ہو گئے اور بہرے ہو گئے كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ: یہ

عَمُوْا اور صَمُّوْا کی ضمیر سے بدل ہے، کیونکہ فاعل جس وقت ظاہر ہو تو فعل مفرد آیا کرتا ہے، اور یہاں عَمُوْا وَ صَمُّوْا یہ فعل جمع کی صورت میں آئے ہوئے ہیں، ضمیر ان کے اندر جمع کی ہے، تو کَثِیْرٌ مِّنْهُمْ اس سے بدل ہے، نحو کے اندر آپ اس مسئلے کا عنوان پڑھا کرتے ہیں اَكَلُوْنِي الْبَرَاغِيْثُ، نحو کے اندر اس مسئلے کا عنوان یہی آتا ہے، وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے اس چیز کو جو وہ کرتے ہیں۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا: پکی بات ہے کہ کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا، اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ: کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، یعنی دونوں ایک ہی چیز ہیں، مسیح ابن مریم ہی حقیقت میں اللہ ہے، وَقَالَ الْمَسِیْحُ: حالانکہ کہا مسیح نے، یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: اے اسرائیل کی اولاد! اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ: عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ: ہٗ ضمیر ضمیر شان ہے۔ بیشک بات یہ ہے کہ جو کوئی شریک ٹھہرائے اللہ کے ساتھ، فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ: پس تحقیق نے اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا، وَمَاْوٰىهُ النَّارُ: اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ: اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ: پکی بات ہے، بلا شک وشبہ کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے، وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: اور نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود، وَاِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ: اگر نہیں رکیں گے اس بات سے جو یہ کہتے ہیں، لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: البتہ ضرور پہنچے گا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ہے ان میں سے عذاب الیم، ضرور چھوئے گا انہیں عذابِ الیم۔ مِنْهُمْ کی ضمیر پیچھے ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ کہنے والوں کی طرف لوٹ گئی، مِنْهُمْ کا مطلب یہ ہے ان لوگوں میں سے جو اپنے کفر پر پکے رہیں گے انہیں عذابِ الیم پہنچے گا، اور اگر ان میں سے بعض لوگ اپنے کفر کو چھوڑ دیں اور توبہ کر لیں اور ایمان قبول کر لیں تو توبہ کا دروازہ ان کے لئے بند نہیں ہے، مِنْهُمْ کا یہاں یہ معنی ہے۔ ''جو لوگ ان میں سے اپنے کفر پر رہیں گے ان کو عذابِ الیم چھوئے گا''۔ اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ: کیا یہ توبہ نہیں کرتے اللہ کی طرف؟ وَیَسْتَغْفِرُوْنَهٗ: اور اس سے استغفار نہیں کرتے؟ اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں؟ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ: مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ رسول ہے، نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر رسول۔ یہ حصر کیا جا رہا ہے اُلوہیت کے مقابلے میں، یعنی اِلٰہ نہیں، صرف رسول ہے، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ: اس سے قبل بھی بہت سارے رسول گزر گئے، وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ: اور اس کی ماں ولیہ ہے، صدیقہ ہے، كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ: یہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے، اُنْظُرْ كَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ: دیکھ تو، کیسے واضح کرتے ہیں ہم ان کے لئے نشانیاں، ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ: پھر دیکھ، یہ کدھر کو پلٹے جا رہے ہیں۔ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ کیا تم پُوجا کرتے ہو، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کو چھوڑ کر، اللہ کے علاوہ تم پُوجا کرتے ہو ایسی چیز کی، مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا: جو نہ تمہارے لیے نقصان کا اختیار رکھتی ہے نہ نفع کا۔ نقصان کے اختیار رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سے کسی تکلیف کو دُور نہیں ہٹا سکتے، لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ دَفْعَ ضُرٍّ، ضُر اور ضَر ایک ہی چیز ہے۔ نقصان دُور ہٹانے کا اختیار نہیں رکھتے، وَلَا جَلْبَ نَفْعٍ، وَلَا حُصُوْلَ نَفْعٍ، اور نفع کے حاصل کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ قُلْ: آپ اعلان کر دیجیے، کہہ دیجیے، یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے کتاب والو! لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ: اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ غلو: حد سے تجاوز کرنا۔ اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو ناحق، ناحق حق سے تجاوز نہ کرو، وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ: اور نہ پیروی کرو تم ان

لوگوں کی خواہشات کی، قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ: جو بھٹک گئے اس سے قبل، وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا: اور بہتوں کو انہوں نے گمراہ کیا، وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ: اور خود سیدھے راستے سے گمراہ ہو گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

تفسیر

رُکوع میں بیان کردہ مضامین

اہلِ کتاب کا ذکر چلا آرہا ہے، اور یہ سارے کا سارا رکوع بھی انہی کے حالات پر مشتمل ہے، اس رُکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ سے ان دونوں گروہوں کے متعلق جو اہلِ کتاب کا مصداق تھے، یہود بھی اور نصاریٰ بھی، واشگاف الفاظ میں اعلان کروایا ہے، کہ تمہارا طریقہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، بے بنیاد ہے، اور تم غلط کار ہو، اللہ تعالیٰ کے مقبول تم نہیں بن سکتے، چہیتے نہیں بن سکتے، جب تک کہ تم توراۃ انجیل اور اس قرآن کی پابندی نہ کرو، اور جس گمراہی کے اندر یہود ونصاریٰ مبتلا ہوئے اُس کو ذکر کے ان کے کُفر کی صراحت کرائی جارہی ہے، گویا کہ اس رکوع میں صاف صاف اعلان کر دیا گیا کہ اہلِ کتاب کا حق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اور اسی طرح سے نصاریٰ کے عقیدے کی بھی تخلیط کر کے یہ بتا دیا گیا کہ نصاریٰ بھی گمراہ ہیں، اور ان کی گمراہی کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس قسم کے عقیدے تراشے، اس اعلان کروانے سے قبل حضور ﷺ کو تاکید کی جارہی ہے، کہ آپ یہ اعلان کیجئے اور بالکل کھل کر کیجئے! اگر اس کے اندر کسی قسم کی کوئی کمی کمزوری آئی اور اس میں کسی قسم کا کوئی اخفاء کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنا فرضِ منصبی ادا نہیں کیا۔

اللہ کی طرف سے تبلیغ دِین کی تاکیداور سَرورِ کائنات ﷺ کا اس پر عمل

پہلے یہ تاکید ہے واشگاف الفاظ میں اعلان کرنے کے لیے کہ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ، ایک تو خطاب لفظ ''رسول'' کے ساتھ کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھیجے گئے ہیں پیغام رسانی کے لیے، پیغام پہنچانے کے لیے ہی آپ کو بھیجا گیا ہے، منصب یاد دلایا کہ آپ رسول ہیں۔ اے رسول! بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ: آپ کے ربّ کی طرف سے جو کچھ آپ کی طرف اتارا گیا اُسے پہنچا دو۔ ''مَا'' عام ہے۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ: اگر آپ نے ایسا نہ کیا، یعنی جو کچھ اتارا گیا اگر آپ نے نہ پہنچایا، اس میں سے ایک آدھی بات کا بھی اگر آپ نے اخفاء کر لیا، کیونکہ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ کا مفعول بھی وہی ہے مَآ اُنْزِلَ کے اندر جو چیز ذکر کی گئی، ''اگر آپ نے ایسا کام نہ کیا'' یعنی مَآ اُنْزِلَ کی تبلیغ نہ کی اور اسے نہ پہنچایا، فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ: تو آپ نے اپنا فرضِ منصبی ادا نہیں کیا، اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا، یعنی اگر چہ ننانوے باتیں پہنچا دیں اور ایک کا بھی اخفاء اگر ہو گیا اور اس کو لوگوں تک نہیں پہنچایا، تو یوں سمجھیے کہ فرضِ منصبی ادا نہیں ہوا،

اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں(۱) کہ جو کوئی شخص یہ کہے کہ ''اللہ کے رسول نے بعض باتیں چھپالی ہیں اور لوگوں تک نہیں پہنچائیں'' وہ بہت بڑا بہتان باندھتا ہے اللہ کے رسول پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی اُتارا گیا پہنچادے، اور اگر اس میں سے کسی بات کا اخفاء کیا گیا تو سرے سے یہ ایسا ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا منصب رسالت جو تھا اُس کو پورا ہی نہیں کیا، جو پیغام اللہ نے دیا تھا آپ نے پہنچایا ہی نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کی تبلیغ ضروری تھی، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتری تھیں قوم کی ہدایت کے لیے، ان میں سے کوئی بات اللہ کے رسول نے نہیں چھپائی، سب صاف صاف بتادیں، اس لیے کسی بات کو رازداری کے درجے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں رکھا، برملا پہنچایا، اور اس فرض کو اتنے اچھے انداز کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبھایا ہے کہ حجۃ الوداع میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا، عرفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کی تھی، بہت بنیادی چیز اس کے اندر میں واضح کی تھی، تو اس خطبے کے آخر میں لوگوں سے پوچھا تھا: ''اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟'' کیا میں نے اللہ کا دین تمہیں پہنچادیا؟ تو سب نے کہا کہ ہاں جی! آپ نے پہنچادیا۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے انگلی سے اشارہ کرکے فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!'' اے اللہ! گواہ ہوجا، دیکھ! یہ تیری ساری مخلوق کہتی ہے کہ میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچادیا۔ اور ایک روایت میں یوں بھی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا تھا، کہ میرے متعلق اللہ تعالیٰ تم سے پوچھیں گے تو تم کیا کہو گے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یارسول اللہ! اگر اللہ نے ہم سے سوال کیا تو ہم تو یہی کہیں گے کہ آپ نے پورا پورا دین پہنچادیا، اور اللہ کی کتاب ہم تک پہنچادی، کوئی بات اس میں سے چھپائی نہیں۔(۲) تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اتنی اہمیت تھی اس تبلیغ مَآ اُنْزِلَ کی، کہ ساری قوم کے سامنے برملا اس کا اعلان کیا، اور شہادت لی، اور ان کے شہادت دینے کے بعد پھر اللہ کو گواہ ٹھہرایا کہ یااللہ! تو گواہ ہوجا، دیکھ یہ سارے گواہی دیتے ہیں کہ میں نے تیرا دین ان تک پہنچادیا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اللہ نے اپنے ذِمّے لے لی

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کو پہنچانے میں اگر کسی قسم کی کوئی کمی آسکتی ہے، یا کوئی کوتاہی متصور ہے تو اس میں دو باتیں ہوا کرتی ہیں، یا تو جن کے خلاف اعلان کرنا ہے ان کی طرف سے دشمنی کی بناء پر کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، جس کے متعلق کچھ کہنا ہے ڈر ہے کہ اگر ہم نے کھل کر ان کے متعلق بات کردی، اور ان کی حیثیت ہم نے واضح کردی، تو ان کی طرف سے ہمیں کوئی نقصان پہنچے گا، وہ درپئے آزار ہوجائیں گے، ہمیں ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے، اور اس وقت علمی ریاست کے مالک یہی تھے یہود و نصاریٰ، ان کے خلاف یہ اعلان اگر کیا جائے گا تو پھر یہ دشمنی کریں گے، اور دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ کبھی کسی کے سامنے بات کہنے سے اس لیے بھی انسان کتراجاتا ہے، کہ فائدہ کوئی نہیں، ان کو کہنے کی کیا ضرورت ہے جب یہ مانتے ہی نہیں، ان دونوں باتوں کی بناء پر انسان پوری طرح سے اظہار کرنے سے کچھ نہ کچھ رک سکتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اگلے الفاظ میں ان کی تردید

---

(۱) بخاری ۲/ ۶۶۳، کتاب التفسیر تفسیر سورۃ مائدہ/ مسلم ۱/ ۹۸، باب معنی قول الله ولقد راٰه نزلة اخرى.

(۲) پہلی حدیث: بخاری ۲/ ۶۳۲، باب حجۃ الوداع۔ اور دوسری حدیث: مسلم ۱/ ۳۹۷، باب حجۃ النبی/ مشکوٰۃ ۱/ ۲۲۵، باب قصۃ حجۃ الوداع

کردی کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: آپ یہ اندیشہ نہ کیجئے کہ جب کھل کر آپ اعلان کریں گے، اور یہ دین واشگاف الفاظ میں پہنچائیں گے، چاہے لوگوں کے جذبات کے وہ کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو، وہ لوگ آپ کو قتل نہیں کرسکیں گے، ہلاک نہیں کرسکیں گے، ہم آپ کی حفاظت کریں گے، وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: اللہ تعالیٰ آپ کو بچائے گا لوگوں سے، بچانے سے یہاں مراد یہی ہے کہ آپ کو ہلاک نہیں کرسکیں گے، آپ کو قتل نہیں کرسکیں گے، چاہے یہ لوگ اس ضد میں آکر آپ کے خلاف کتنی ہی سازشیں کیوں نہ کریں آپ کو نقصان نہیں پہنچاسکیں گے، اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے قبل رات کو سرورِ کائنات ﷺ پر پہرہ دیا جاتا تھا، تاکہ کوئی خفیہ طور پر حملہ کرکے آپ کو نقصان نہ پہنچادے، مدینہ منورہ میں جانے کے بعد، جہاں آپ آرام فرماتے تھے اپنے حجرے میں، تو آپ ﷺ کے حجروں پر پہرہ دیا جاتا تھا، کہ کوئی دشمن خفیہ طور پر کوئی نقصان نہ پہنچادے، جس وقت یہ آیت اتری تو آپ ﷺ نے اسی وقت لوگوں کو خطاب کرکے کہہ دیا کہ جاؤ، جاکے آرام کرو، کوئی ضرورت نہیں ہے، میری حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لے لی ہے۔[1] چنانچہ اس سلسلے میں پہرہ موقوف کرادیا، حدیث شریف میں یہ بات آتی ہے، کہ اس سے قبل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ پر پہرہ دیتے تھے، اس آیت کے اترنے کے بعد پھر اس کو ترک کردیا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے۔''

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ'' کے دو مفہوم

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: اس کا مطلب دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، یا تو یہ کہ کافروں کی ہدایت آپ کے ذِمّے نہیں، آپ کھل کر کہہ دیجئے جو کچھ کہنا ہے، بات ان تک پہنچا دیجئے، باقی جن کے حق میں کُفر ثابت ہوچکا ہے اللہ تعالیٰ ان کو راہِ راست پر نہیں لائے گا، ان کا راہِ راست پر آنا نہ آنا یہ آپ کے اختیار کی بات نہیں ہے، اس لیے اگر وہ راہِ راست پر آگئے تو فائدہ اُن کا، نہ آئے تو نقصان اُن کا، ذمہ داری آپ ﷺ پر نہیں، آپ ﷺ کا فرض ہے تبلیغ، آپ ﷺ یہ کردیجئے۔ تو یہ خیال کہ ہم کھل کھل کر باتیں کریں، فائدہ کیا؟ کہ آگے سے کوئی متاثر تو ہوتا نہیں، یہ خیال بھی بسا اوقات تبلیغ کے اندر سستی کا باعث ہوجایا کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں کہا کہ یہ آپ ﷺ کے ذِمّے نہیں ہے، ہدایت اور عدمِ ہدایت کا قصہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جن کی قسمت میں کُفر پکا ہوچکا، جن کی قسمت پھوٹ گئی اُن کی ضد کی بنا پر، انہوں نے اپنی صلاحیت ضائع کرلی، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دے گا، آپ اپنا کام کیجئے۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جس طرح سے اس آیت کی تقریر بیان القرآن میں فرمائی اس کے مطابق صرف وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کے ساتھ ہی اس کا مضمون مل گیا، کہ لَا يَهْدِي سے ہدایت دینی مراد نہیں بلکہ دُنیوی مقصد کے لیے راہنمائی کرنا، اور مقصد تک پہنچا دینا، یہ بھی ہدایت کہلاتا ہے، تو کافر لوگوں کو آپ ﷺ کے قتل و ہلاک کی طرف اللہ راہ نہیں دے گا، تو لَا يَهْدِي سے ہدایت حسی مراد لے لی، دُنیا کے اندر کسی مقصد کو ٹھہرا کر انسان جب اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک ہدایت ہے، تو لَا يَهْدِي کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ کافر ہیں وہ آپ کی

---

(۱) سنن الترمذی ۲/ ۱۳۵، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ المائدۃ۔

طرف سے اس قسم کا اعلان سُن کر اور ان کے عقائد کی تردید سُن کر، ہوسکتا ہے کہ کوشش کریں آپ کو ہلاک کرنے کی، لیکن اللہ تعالیٰ اُنہیں اس مقصد میں کامیاب نہیں کرے گا،" اللہ آپ کو بچائے گا اور کافر لوگوں کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں کرے گا اگر آپ کو وہ ہلاک کرنے کی کوشش کریں"، تو پھر ان الفاظ کا مضمون وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کے ساتھ ہی لگ گیا،" بیان القرآن" میں حضرت تھانوی ﷫ نے ان الفاظ کا مطلب اس طرح سے ذکر کیا ہے۔

اہلِ کتاب کے بارے میں قرآن کا واشگاف اعلان

اب آگے آگیا وہ اعلان جو اِن یہود و نصاریٰ کے متعلق کروایا جارہا ہے،" کہہ دیجئے، اعلان کردو، اے کتاب والو!" کتاب والوں سے مراد یہود بھی ہیں اور نصرانی بھی، کیونکہ دونوں طبقے اس وقت اہل کتاب کہلاتے تھے، لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ: تم کسی بنیاد پہ نہیں ہو، تمہارا دِین بے بنیاد، جب تک کہ تم توراۃ، انجیل اور مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ کو قائم نہ کرو۔ توراۃ، اِنجیل اور قرآن پر عمل کرو تو تمہارا دِین صحیح ہے اور تم کسی صحیح بنیاد پر قائم ہو، اور پھر تمہارا عمل تمہارا نظریہ قابلِ اعتماد ہے، اور اگر تم توراۃ سے، اِنجیل سے اور قرآن سے روگردانی کرجاؤ، اور پھر تم دعوے رکھو کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں، اللہ کے لاڈلے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کا خاندان ہیں اور اُس کے محبوبوں کی اولاد ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم بھی مقبول ہیں، آخرت میں نجات ہمارے حصے میں ہے، یہ جتنے نظریے تم نے قائم کررکھے ہیں سب بے بنیاد ہیں، کوئی تعلق نہیں تمہارا اللہ کے ساتھ، اور کوئی تعلق نہیں اللہ کو تمہارے ساتھ، اور تم اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کے محبوب بنتے ہو، محبوبوں سے نسبت قائم کیے ہوئے ہو سب بے بنیاد باتیں ہیں جس وقت تک کہ تم اللہ کی طرف سے ان اُتاری ہوئی کتابوں کی پابندی نہیں کرو گے۔ اور اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی کتابوں کی پابندی کا کیا مطلب؟ توراۃ کو اگر تم نے زبانی طور پر قبول کیا ہے تو اس کو قائم کرو، اس کا اپنی زندگی کے ساتھ ربط لگاؤ، توراۃ جن چیزوں کے لیے کہتی ہے ان پر عمل کرو، اور اُس کی طرف سے یہ پیش گوئیاں ہیں آنے والے رسولوں کے متعلق، تو جس وقت تک تم ان کو نہیں مانو گے، یہودی جس وقت تک عیسیٰ علیہ السلام پر اِیمان نہیں لائیں گے، سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گے، تو گویا کہ توراۃ انہوں نے قائم نہیں کی، عیسائی جس وقت تک سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان نہیں لائیں گے تو گویا کہ انہوں نے اِنجیل پر عمل نہیں کیا، توراۃ اور اِنجیل پر عمل تبھی ہوگا کہ اُس کی پیش گوئیوں کے مطابق آنے والے پیغمبروں کو مانو اور آنے والی کتاب کو تسلیم کرو، تب سمجھا جائے گا کہ تم نے توراۃ کو بھی مانا، انجیل کو بھی مانا، اور قرآن کو بھی مانا، جس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتابیں اتریں ہم نے ان سب کو تسلیم کیا، ہمارا ان پر اِیمان ہے، اور ان سب کو ہم نے مانا اور ہم اس کی پابندی کرتے ہیں، جو کچھ توراۃ نے کہا، جو کچھ اِنجیل نے کہا، جو کچھ قرآن کہتا ہے تینوں کے مجموعے کو سامنے رکھ کر جو مطالبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم سے ہے ہم اس کو پورا کرتے ہیں، توراۃ کے جن اَحکام کو انجیل نے منسوخ کردیا اب اُن پر عمل کرنا توراۃ اور اِنجیل کی اِقامت نہیں ہے، اور قرآن نے توراۃ وانجیل کے جن اَحکام کو منسوخ کردیا تو اب تینوں کتابوں پر عمل کرنے کا مطلب یہی ہے کہ ان کو چھوڑ دو، اور حاصل جو ٹھہرا، تینوں کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطالبہ، اُس کو پورا کرنا یہی ان کتابوں کو قائم کرنا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ جب تک تم

ایمان نہیں لاتے اِس آخری پیغمبر پر، اور جس وقت تک تم تسلیم نہیں کرتے اِس آخری کتاب کو، اُس وقت تک تمہارے یہ دعوے ہی دعوے ہیں جو تم نے اپنے لیے کر لیے ہیں، یہ تم خواب دیکھ رہے ہو، یہ تمہاری جھوٹی خواہشات ہیں، اور جس وقت تمہاری آنکھ کھلے گی تو اُس وقت پتا چلے گا کہ تمہارے دعوے جتنے بھی تھے یہ سب پادر ہوا تھے، اور تم ہوا کے اندر اڑتے تھے، بنیاد تمہاری کچھ نہیں۔ یہ ہے وہ واشگاف اعلان جو یہود و نصاریٰ کے متعلق کروایا جا رہا ہے، کیونکہ ان کے دعوے تو بہت بڑے بڑے تھے، وہ کہتے تھے کہ اللہ کے مقبول ہیں ہی ہم، جنت آخرت میں ہے ہی ہمارے لیے، لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (البقرۃ:۱۱۱) جنت میں جائیں گے ہی یہود و نصاریٰ۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدۃ:۱۸)، لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرۃ:۸۰)، یہ سارے ان کے دعوے نقل کیے گئے ہیں، تو یہاں کہہ دیا کہ سب بے بنیاد ہیں، ان میں کچھ حقیقت نہیں، جب تک تم تورات انجیل اور قرآن پر عمل نہ کرو۔

قرآن اُترنے سے یہود و نصاریٰ کے کفر میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا: یہی ان کی بدبختی ذکر کی جا رہی ہے، کہ چاہیے تو یہ تھا کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ جس وقت یہ سامنے آیا، وہ سمجھتے کہ تورات کا تقاضا یہی ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے، انجیل کا تقاضا یہی ہے کہ اِسے تسلیم کیا جائے، ان کے تسلیم کرنے کے ساتھ ہی تورات اور اِنجیل کی صداقت ثابت ہوتی ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ اس کتاب کو اپنے گھر کی چیز سمجھتے، کیونکہ ان کی کتاب میں اِس کی پیش گوئی موجود ہے، اس آنے والے پیغمبر کو ماننا اپنا ایک فرض سمجھتے، اور یوں سمجھتے کہ اس کتاب کو ماننا اور اس پیغمبر کو تسلیم کرنا یہ ہمارے ہی دِین کا تقاضا ہے، چاہیے تو یہ تھا، لیکن ہوا یہ کہ اس قرآن کے آنے کے ساتھ ان کا حسد جو اُٹھا تو طغیان اور سرکشی اور کُفر کے علاوہ ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا، ''جو کچھ آپ کی طرف اُتارا جا رہا ہے آپ کے رَبّ کی طرف سے اِن میں سے بہتوں کے طغیان اور کُفر میں اضافہ کرتا ہے'' ان کی سرکشی اور کُفر آئے دن بڑھتا جا رہا ہے اس قرآنِ کریم کے اُترنے کی وجہ سے، اصل بات یہ ہے کہ ان کے دل کے اندر حسد اور کُفر جو آیا تو جیسے جیسے قرآنِ کریم کا نزول زیادہ ہوگا اتنا اتنا ان کے حسد کے اندر اضافہ ہوتا چلا جائے گا، جیسے اگر کسی زمین کے اندر خاردار جھاڑیوں کے بیج بو دیے جائیں، تو جیسے جیسے موسم سازگار ہوگا، جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارش آئے گی، ویسے ویسے یہی خاردار جھاڑیاں زیادہ اُگیں گی۔ اگر دل کے اندر صلاحیت اچھی ہوتی، نظریات اچھے ہوتے، حق کو قبول کرنے کا جذبہ ہوتا، تو جیسے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب اُترتی اتنی ہی ان کی حق پرستی حق کا قبول کرنا زیادہ نمایاں ہوتا، تو دِلوں کے اندر جو فساد ہے تو اللہ کی رحمت جتنی برستی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی کتاب نازل ہوتی ہے تو ان کا وہی کُفر اور طغیان جو قلوب کے اندر بھرا ہوا ہے حُبِّ دُنیا کی بنا پر، وہی بڑھتا جا رہا ہے۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: ان کافروں پر آپ کسی قسم کا غم نہ کیجئے، یعنی اگر یہ سرکشی میں مبتلا ہیں اور کتاب اللہ کو سننے کے بعد متاثر نہیں ہوتے، بلکہ ان کے طغیان اور کُفر میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو آپ اس کے اوپر کسی قسم کا کوئی غم نہ کیجئے۔

اللہ کے ہاں مقبولیت کا معیار عنوان نہیں بلکہ حقیقت ہے

اگلے الفاظ کا تعلق بھی اسی اعلان کے ساتھ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ صرف اپنا نام رکھ لینے سے مقبولیت نہیں آیا کرتی، یہ بات صاف صاف سُن لو، چاہے کوئی اپنے آپ کو "مؤمن" کہتا ہو، چاہے اپنے آپ کو "یہودی" کہلاتا ہو، اور چاہے وہ "صابی" مشہور ہوں ("صابی" ستارہ پرست تھے اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور کی طرف منسوب ایک فرقہ ہے)، چاہے وہ لوگ اپنے آپ کو "نصاریٰ" کا عنوان دیتے ہیں، ان ناموں کے رکھنے کے ساتھ ہمارے ہاں کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوتی، کوئی درجہ نہیں، یہاں تو حقیقت کی قدر ہے کہ جس کا اللہ پر صحیح ایمان ہوگا اور یوم آخر پر صحیح ایمان ہوگا، اور اس کا عمل ٹھیک ہوگا، وہ آخرت میں کامیاب ہے، نہ ان پر کوئی خوف نہ کوئی حزن، صرف اِن ناموں کے ساتھ کسی کو قبولیت حاصل نہیں، کہ ایک شخص اپنے آپ کو "یہودی" کہلالے تو چلو، اللہ کے ہاں مقبول ہوگیا، "نصرانی" کہلالے تو اللہ کے ہاں قبول ہوگیا، اپنے آپ کو "صابی" کہلالے تو اللہ کے ہاں قبول ہوگیا، اسی طرح سے "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کا مصداق اپنے آپ کو سمجھتا ہو تو اللہ کے ہاں قبول ہوگیا، ایسی کوئی بات نہیں، یہاں تو فیصلہ حقیقت پر ہوگا، "مؤمنین" کا نام سرِفہرست رکھ دیا کہ یہاں "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کا بھی یہی حال ہے، کہ جو اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لے آئے!" اگر اُن کا حقیقت کے اعتبار سے ایمان صحیح نہیں ہے تو صرف یہ کہنے کے ساتھ ان کی بھی کوئی بات نہیں ہے، جیسے کہ آج آپ کے سامنے حقیقت ہے کہ بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ جو فہرست کے اندر "مؤمنوں" میں شمار ہوتے ہیں، جن کا شمار "مسلمانوں" میں ہی ہے، "اہلِ ایمان" میں ہے، لیکن وہ سرے سے خدا کے وجود کے قائل نہیں، یومِ آخرت کے قائل نہیں، نماز کا اِستہزا کرتے ہیں، قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب سمجھ کر اس کو ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والی نہیں سمجھتے، فرشتوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، جنات کے وجود کے قائل نہیں ہیں، یہ جتنے لوگ بھی سوشلسٹوں سے متاثر ہیں، کمیونسٹوں سے متاثر ہیں، سب کا حال اسی طرح سے ہے، اور اسی طرح سے یورپ تہذیب سے جو زیادہ متاثر ہوئے تو دہریت ان کے اندر آگئی، دہریت دونوں جانب سے آئی ہے، یورپ کی طرف سے بھی آئی اور ادھر سوشلسٹ ممالک کی طرف سے بھی آئی، اور سوشلسٹ ممالک کی طرف سے زیادہ آئی، اور یورپ والے چونکہ اُصولاً اپنے آپ کو "عیسائی" کہتے ہیں، اور اپنی نسبت ان کتابوں کی طرف کرتے ہیں، تو کسی نہ کسی درجے میں پھر بھی ان کے اندر خدا اور اُس کے رسولوں کا یا آخرت کا کسی نہ کسی درجے میں تصور باقی ہے، اگرچہ ادھر سے بھی دہریت بہت پھیلی ہے، لیکن اُن کی تو بنیاد ہی دہریت پر ہے جو دوسرے نظریے اٹھے، اب کوئی شخص اپنا نام کچھ رکھ لے اور اپنے آپ کو وہ "اہلِ ایمان" میں شمار کرلے، فہرست جس وقت بنے، ووٹیں جس وقت بنیں تو وہ "مؤمنوں" کے اندر ہی شمار کیے جائیں، "غیر مسلموں" میں ان کا شمار نہ آئے، لیکن صرف "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کی فہرست میں شامل ہوجانا، یا "مسلمان" کہلالینا کافی نہیں ہے، اگر ایمان صحیح نہیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر، اور عمل صحیح نہیں، تو ان عنوانات کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ تو یہ اعلان کردیا گیا کہ "یہود" کہلانے سے، "نصرانی" کہلانے سے، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا ثبوت نہیں ملتا جب تک کہ عقائد صحیح نہ ہوں۔ تو یہاں فرقہ پرستی کے اُوپر ہی گویا کہ ضرب لگانی مقصود ہے، باقی ایمان کے اجزا کی

تفصیل کرنی مقصود نہیں کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ دوسری آیات میں بتادیا گیا، یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کے الفاظ کی طرف دیکھ کر آپ یہ نہ سوچ لیجئے کہ شاید رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں، کہ صرف ایمان باللہ اور یوم آخر کا اس میں ذکر آیا ہوا ہے، قرآنِ کریم کی دوسری آیات روایاتِ صحیحہ اور آیاتِ قطعیہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ایمان اور چیزوں پر بھی ضروری ہے، فرشتوں کے وجود کو ماننا ضروری، رسولوں کو ماننا ضروری، کتابوں کا ماننا ضروری، اور اسی طرح سے بہت ساری دوسری باتیں ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کا بھی انکار کردیا جائے تو کفر ہے، تو ایک ہی آیت پر سارے اَحکام کا مدار نہیں رکھا کرتے، کہ ہم یہ کہیں کہ چونکہ اس میں رسالت کا ذکر نہیں آیا، اس لیے رسالت پر ایمان لانا ضروری نہیں، یہ بات نہیں ہے، یہاں تو صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ فرقوں کے عنوان کوئی حقیقت نہیں رکھتے جب تک ان کے اندر ایمان صحیح طور پر موجود نہ ہو، اور جب تک ان کے کردار کے اندر عملِ صالح کی جھلک نہ ہو، اُس وقت تک یہ فرقوں کے عنوان کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اور یہ آیت اسی طرح سے پہلے آپ کے سامنے سورۂ بقرۃ میں بھی گزر چکی۔ یہ تو اِجمالاً اِعلان ہوگیا۔

گمراہی دو طرح سے آتی ہے: اِفراط اور تفریط

اب آگے کچھ تھوڑا سا ان کے کردار کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا، یہ آپ کے سامنے پہلے بھی بات آچکی ''اور اس میثاق کی یاددہانی کے لیے ہم نے ان کی طرف بہت سارے رسول بھیجے'' جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے، کہ رسولوں کے ذریعے سے اپنے احکام اپنے بندوں تک پہنچاتے ہیں، وہ رسول آئے اور آکر انہوں نے یاددہانی کی، لیکن یہود نے کیا طریقہ اختیار کیا؟ ہدایت کی راہ تو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی بات کو مانا جاتا اور اللہ کے بندوں کی وساطت سے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کتاب اُتارتا ہے، کتاب اللہ بھی بندوں کی ہدایت کے لیے آتی ہے، لیکن کتاب اللہ کی تشریح کے لیے رجال اللہ آتے ہیں، اللہ کچھ انسانوں کو کچھ آدمیوں کو منتخب کرکے اپنی اس کتاب کی وضاحت کے لیے بھیجتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کا پتا چلتا ہے یا اُس کی نازل کردہ کتابوں سے یا اُس کے بھیجے ہوئے رسولوں کے اقوال سے افعال سے اور ان کی تشریحات سے، اور گمراہی جب آتی ہے تو دو راستوں سے آتی ہے، کوئی شخص اگر اللہ کی کتاب کو قبول بھی کرلیتا ہے، تو پھر رجال اللہ کے متعلق گمراہی دو طرح سے آئی، یا افراط یا تفریط۔ ''تفریط'' کا مطلب یہ ہے کہ رجال اللہ جس منصب پر ہیں اس منصب سے بھی ان کو گرادیا، ان کو صحیح منصب نہ دیا، یہ کوتاہی یعنی رجال اللہ کے ساتھ ان کے منصب کے مطابق برتاؤ نہ کرنا بلکہ ان کی توہین کرنا، ان کو مرتبے سے گرانا، یہ ''تفریط'' ہے، اور یہ کفر یہود میں آیا، کہ اللہ کی طرف سے وہ بندے جو اس کتاب کی تشریح کے لیے آئے یا اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو واضح کرنے کے لیے آئے، یہود نے ان کو اپنی خواہشات کے پیمانے سے ناپا، اگر تو ان کی مرضی پر چلنے والے تھے تو ان کو کسی درجے میں قبول کیا، اور اگر ان کی مرضی کے خلاف چلنے والے تھے تو ان کو قتل کرنے سے بھی یہ باز نہیں آئے، تکذیب کی، جھٹلایا، اور قتل کردیا۔ مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی خواہشات کو پیمانہ بنالیا رجال اللہ کو پہچاننے کا، اصل انہوں نے ٹھہرالیا اپنی خواہشات کو، اگر تو وہ بات ان کی خواہشات کے مطابق کہتے تھے تو قابلِ قبول، اور اگر

وہ ان کی خواہشات کے مطابق نہیں بولتے تھے تو یا ان کو جھٹلاتے، اور اگر زیادہ ہی شدت کے ساتھ کہیں مزاحمت ہوتی تو ان کو قتل بھی کر دیتے تھے، یہ ہے ''تفریط'' کہ انہوں نے اُن کو صحیح مرتبے پر نہیں رکھا، کہ اللہ کی طرف ان کی نسبت کا لحاظ کرتے اور ان کی تشریحات کو مانتے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام ان کی زبان سے آتا اُس پر اعتماد کرتے ہوئے وہ ان کی اتباع کرتے، یہود نے ایسا نہیں کیا۔

اور دوسری طرف آ گئے ان کے چھوٹے بھائی ''نصرانی''، وہ ''اِفراط'' میں مبتلا ہو گئے، کہ جن کو انہوں نے رجال اللہ مانا اُلٹا ان کو خدا کا درجہ دے کر انہی کی پُوجا شروع کر دی، کسی کو خدا بنا دیا، کسی کو خدا کا بیٹا بنا دیا، یہ گویا کہ مرتبے سے اُوپر چڑھا دیا، یہ ''اِفراط'' کا درجہ ہے، رجال اللہ کے متعلق گمراہیاں دونوں قسم کی آئیں، عیسائیوں نے مرتبہ بڑھایا، اس لیے وہ اَحبار رُہبان کو بھی رَبّ قرار دینے لگ گئے، اور اسی طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہا، یا خدا کا بیٹا کہا، جس منصب پر وہ تھے اُس منصب سے اُونچا کر دیا، اور یہود نے ''تفریط'' اختیار کی، اور جہالت انسان کو اِن دو طریقوں میں مبتلا کرتی ہے، جیسا کہ عربی میں کہا کرتے ہیں کہ: ''اَلجاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ'' کہ جاہل ٹھکانے پر نہیں رہا کرتا، یا یہ اُوپر کو چڑھتا ہے یا نیچے کو گرتا ہے، نقطۂ اعتدال پر یہ کبھی نہیں رہتا، اگر کسی کے متعلق اس کا عقیدہ ہو گا تو بڑھاتے بڑھاتے اُس کو ویسے آسمان پر چڑھا دے گا، اور اس کو عبدیت سے نکال کر اللہ کی مخلوق سے نکال کر ''اللہ'' کے منصب پر بٹھانے کی کوشش کرے گا، اور اگر اپنی خواہشات کے خلاف ہونے کی بنا پر یہ کسی کے خلاف ہو جائے تو پھر اس کو صحیح مقام بھی دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا، پھر اس قسم کی کوتاہی کرتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی بیماریاں اُمتِ محمدیہ میں

تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ساری روایات کے اندر اس مضمون کو بیان فرمایا، حدیث کی کتاب میں موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے اندر بھی وہی حالات آئیں گے جس قسم کے حالات بنی اسرائیل پہ آئے، جیسے جیسے جذبات بنی اسرائیل کے تھے ویسے ویسے جذبات میری اُمت میں بھی پھیلیں گے، ایک جگہ لفظ ہے: ''حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ''[1] کہ بالکل اس طرح سے جس طرح سے ایک جُوتا دوسرے جُوتے کے مساوی ہوتا ہے، میری اُمت بنی اسرائیل کے یوں مساوی چلے گی، اور فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی گوہ کی کھڈ میں گھسے ہوں گے تو میری اُمت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو وہیں گھسیں گے،[2] اور اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا شخص ہوا جو علی الاعلان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرتا تھا تو میری اُمت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اپنی ماں کے پاس علی الاعلان آئیں گے (ترمذی کا حوالہ مذکورہ)، یعنی یہاں تک اُمت کے اندر حالات بنی اسرائیل کے ساتھ مطابقت رکھیں گے، اور لوگ انہی طریقوں پر چلیں گے جن طریقوں پر بنی اسرائیل چلے، لیکن فرق اتنا ہے کہ بنی اسرائیل کے بہتر۷۲ فرقے بنے، بہتر۷۲ کے بہتر۷۲ گمراہ، ان میں سے اہلِ حق کوئی نہیں تھا، اور میری اُمت کے تہتر۷۳ فرقے ہوں گے، بہتر۷۲ تو ہو بہو

---

(۱) ترمذی ۲/ ۹۳ باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ/ مشکوٰۃ ۱/ ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی۔ عن عبد اللہ بن عمرو۔

(۲) بخاری ۱/ ۴۹۱ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل/ مسلم ۲/ ۳۳۹ باب اتباع سنن الیہود والنصاریٰ/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۵۸ باب تغیر الناس۔

بنی اسرائیل کی طرح گمراہ ہوجائیں گے، اور ایک فرقہ اہلِ حق کا ہوگا جو کہ جنّتی ہوگا، اور یہ فرقہ وہی ہے: ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' (ترمذی کا حوالہ مذکورہ) جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلنے والے ہوں گے، یعنی اسی اِعتدال کو اِختیار کرنے والے ہوں گے۔ بہتر ''۷۲'' تو مساوی مساوی طریقے سے گمراہ ہوجائیں گے جس طرح سے اسرائیلی گمراہ ہوئے، اور ایک فرقہ اہلِ حق کا باقی رہے گا، اس اعتبار سے تہتر ''۷۳'' ہوگئے۔

سیّدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اِفراط اور تفریط کرنے والے دونوں گمراہ ہیں

اب اگر آپ غور کریں گے اس اُمت کے اندر تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے بارے میں دو قسم کے فریق گمراہ ہوں گے، جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی دو قسم کے فریق گمراہ ہوئے، کہ یہود نے تو ان کو شریف انسان ہی نہ سمجھا، ان کی ماں پر بہتان لگایا، اور ان کے قتل کے درپے ہوگئے، یہ تو تھے ''مُفَرِّط'' کوتاہی کرنے والے، یہ بھی گمراہ، اور عیسائیوں نے ان کی محبت میں مبتلا ہوکر ان کو ان کے درجے سے اُوپر چڑھا دیا، خدائی درجے میں لے گئے، یہ تھے ''مُفْرِط'' حد سے زیادہ تجاوز کرنے والے۔ مجھے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بنی اسرائیل کے دو طبقے گمراہ ہوگئے تھے تیرے بارے میں بھی دو ہی طبقے گمراہ ہوں گے۔ تو یہ ایک طبقہ ہوگیا خارجیوں کا جو سرے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مؤمن ہی نہیں مانتا، جو ان کے کُفر کا قائل ہے، تکفیر کرتا ہے، یہ خارجیوں کا گروہ ہے، اور دُوسرا طبقہ ہوگیا رافضیوں کا جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرکے ان کو اتنا چڑھایا کہ ان کی حد سے تجاوز کرکے ان کے اندر وہ صفات مان لیں جس قسم کی صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں، اور شرک کے اندر مبتلا ہوگئے۔ تو ''مُفْرِط'' اور ''مُفَرِّط'' دونوں قسم کے لوگ گمراہ ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت سامنے رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں باتیں کہیں۔

رِجال اللہ کے متعلق اِفراط وتفریط یہود ونصاریٰ سے مشابہت ہے

اور اگر عام حالات میں آپ دیکھیں گے تو بھی آپ کو دونوں قسم کے لوگ مل جائیں گے، رجال اللہ کو ماننے والے ایسے بھی لوگ آپ کو ملیں گے جو ان کے اندر صفاتِ خداوندی ثابت کرکے شرک کے اندر مبتلا ہوگئے، اللہ کے نیک بندوں کو جو کہ دِین کی تشریح کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف بُلانے والے تھے، اللہ کی توحید کی دعوت دینے والے تھے، ان کو ایسا منصب دیا کہ ان کے لیے وہی علمِ غیب، وہی کارسازی، وہی مشکل کشائی، اور وہی نفع نقصان کے مالک، رزق دینے والے، اولاد دینے والے، جس قسم کی صفات اللہ تعالیٰ کی تھیں، اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہوتے ہوئے اُن رجال کے متعلق وہی صفات قائم کرنے لگ گئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف انسان کی توجہ ہونی چاہیے تھی، ان کی توجہ ساری کی ساری اُن رجال اللہ کی طرف، بلکہ ان کی قبور کی طرف، انہی کا طواف کرنا، وہیں جاکر سجدے کرنا، وہیں جھکنا، انہی کے نام پر نذر ونیاز دینا، یہ ساری کی ساری عادتیں ایسی ہیں جو کُفر کی ہیں، شرک کی ہیں، اور یہ مشابہت رکھتی ہیں عیسائیوں کی عادات کے ساتھ جنہوں نے رجال اللہ کا مرتبہ بڑھا کر گمراہی

اختیار کرلی۔ اور بعض لوگ آپ کو ایسے بھی ملیں گے جو کہتے ہیں کہ پیغمبر بھی کوئی چیز نہیں، وہ تو صرف ایک ''چٹھی رساں'' کی طرح اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے آیا تھا، باقی! اس کے اقوال افعال کوئی حجت نہیں ہیں، جو کچھ کتاب اللہ میں ہے بس اُسی پر ہی عمل کرنا چاہیے، باقی! رسول اللہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور اسی طرح سے رسول اللہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد ائمہ عظام، اور اس اُمت کے اولیاء اللہ اور دوسرے حضرات جنہوں نے دین کی تشریح کی، اللہ کے دین کی ہمیشہ دعوت دی، وہ ان سے اس طرح سے استغناء برتتے ہوئے ہیں کہ ان کی کوئی اہمیت ہی اُن کے دل میں نہیں ہے، یہ بات بھی کُفر کی طرف لے گئی، گمراہی کی طرف لے گئی، اور یہ جذبات یہود سے ملتے جلتے ہیں۔

نقطۂ اِعتدال کیا ہے؟

اور نقطۂ اعتدال کیا ہے؟ کہ نہ تو اللہ کے بندوں سے اِستغناء اور ان کی خلاف ورزی، اور جو بات وہ اپنی خواہش کے خلاف کہیں اُس کو جھٹلانا، یہ بات بھی غلط، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری ہوئی کتاب کی تشریح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے لیجیے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی روشنی میں سمجھیے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کو آنے والے ائمہ اور دیگر اُمت میں جو اکابر علماء گزرے ہیں ان کی آراکو سامنے رکھتے ہوئے دِین کو اگر سمجھو گے اور ان کے واسطے سے اگر دِین کو لو گے تو وہ دِین صحیح ہے، اور اگر ان سے استغناء برتو گے اور یہ کہو گے کہ براہِ راست اللہ کی کتاب ہی کافی ہے، رجال اللہ کی کوئی ضرورت نہیں، تو ایسی صورت میں یہ بھی یہودیانہ کُفر آئے گا، اور اس میں بھی انسان کبھی صحیح طریقے سے ہدایت حاصل نہیں کرسکتا۔ تو یہ دو طبقے جن کا ذکر کیا جارہا ہے اپنی اُمت کے اندر اگر غور کرو گے تو آپ کو یہ دونوں طبقے یہاں ممتاز نظر آئیں گے، ایسے بھی ہیں جو رجال اللہ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے، اور اپنی خواہشات پر ان کو پرکھتے ہیں کہ ہماری مرضی کے مطابق ان کی بات ہے یا نہیں، اگر اپنی مرضی کے مطابق ہوئی تو قبول کرلی ورنہ اس کو رَدّ کردیا، اور ایسے بھی ہوں گے جو رجال اللہ کو ہی اصل قرار دے کر اللہ سے بھی مستغنی ہو گئے، تو ایک کُفر یہودیوں والا کُفر ہے، اور ایک کُفر عیسائیوں والا کُفر ہے، یہاں دونوں طبقوں کو سامنے جو ذکر کیا جارہا ہے تو ان سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے، کہ اِفراط بھی کُفر کی طرف لے جاتا ہے اور تفریط بھی کُفر کی طرف لے جاتی ہے، ایک خصلت یہودیوں کی ہے اور دوسری خصلت عیسائیوں کی ہے۔

یہود کی تفریط اور اس پر بے خوفی

''ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے، جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول آیا ایسی چیز لے کر جس کو ان کا دل نہیں چاہتا تھا، ایک فریق کو انہوں نے جھٹلایا اور ایک فریق کو قتل کیا'' اور پھر یہ حرکتیں کر کے یہ سمجھے کہ کوئی عذاب نہیں ہوگا، نڈر اتنے، بے خوف اتنے، کہ وہ سمجھے کہ اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی، کیونکہ فوری طور پر اللہ کی طرف سے گرفت نہ ہوئی تو وہ دلیر ہو گئے، وہ اندھے بہرے ہو کے اپنے کُفر پر لگے رہے، اپنی خواہشات کے پیچھے اندھے بہرے ہو کر لگے رہے، ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ پھر اللہ نے انہیں سزا دی، سزا دینے پر وہ متنبہ ہوئے، اور انہوں نے توبہ کی اور اللہ نے توبہ قبول

کرلی۔لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ پھر خواہشات کے پیچھے لگ کر اندھے بہرے ہو گئے، ”پھر اندھے بہرے ہو گئے ان میں سے بہت سارے، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے“ اگر دُنیا کے اندر سزا نہیں ہوئی تو آخرت کے اندر یہ چھوٹیں گے نہیں، یہ تو یہود کا ذکر تھا کہ یہ تو ”مُفرِط“ ہیں، کوتاہی کرنے والے، کہ انہوں نے اللہ کے رسول کے ساتھ ایسا معاملہ کیا، اور اللہ تعالیٰ کے دین کو رسولوں کے ذریعے سے حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنی خواہشات کو اصل ٹھہرایا، جس کی بات ان کو خواہش کے مطابق ہوئی اُسے قبول کیا، اور جس کی بات ان کی خواہش کے مطابق نہیں تھی اُسے قبول ہی نہیں کیا۔

عیسائیوں کا اِفراط اور اُمّتِ محمدیہ میں اس کے نمونے

اب آگئے دوسرے جنہوں نے اِفراط اختیار کیا، ”تحقیق کافر ہو گئے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے“ یہ تھا ایک طبقہ عیسائیوں میں جو کہ حلول کا قائل تھا، حلول کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہتے تھے، کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں اللہ آ گیا، اللہ اور عیسیٰ یہ ایک ہی چیز ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے، اور آپ نے سُنا دیکھا ہوگا کہ اس نظریے کے لوگ بھی اُمّتِ محمدیہ کے اندر موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ جو عرش پر ”اَحد“ کہلاتا ہے وہ صرف ”میم“ کا برقع اوڑھ کر آیا، اور دُنیا کے اندر ”اَحمد“ کہلاتا ہے، ”میم“ کو درمیان سے ہٹا دو جو پردہ ہے تو ”اَحد“ اور ”اَحمد“ ایک ہی چیز ہے، ”اَحمد“ اور ”اَحد“ کے اندر پردہ اگر ہے تو صرف ”میم“ کا ہے، جو عرش پر ”اَحد“ کہلاتا ہے وہی دُنیا میں ”اَحمد“ ہے، لیکن کہتے ہیں کہ لوگوں سے پردہ اختیار کرنے کے لئے ایک ”میم“ کا اضافہ ہو گیا، اس لیے ”میم“ کا پردہ اوڑھ کر آ گیا یہ لفظاً اگر کہیں آپ سُنیں گے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ”اَحد“ اور ”اَحمد“ کے درمیان فرق چونکہ ایک ”میم“ کا ہے، تو کہتے ہیں کہ یہ ایک ”میم“ پردہ ہے ورنہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے، وہی جو عرش پر تھا وہی زمین پر اُتر آیا، اور صرف ایک عنوان کا فرق پڑ گیا، ورنہ دونوں کے درمیان میں کوئی فرق نہیں، یہ بالکل اس قسم کا عقیدہ ہے جس طرح سے وہ کہتے تھے: اِنَّ اللّٰہَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ، وہ حلول کے قائل تھے کہ مسیح ابن مریم اور اللہ ایک ہی چیز ہے، یہ بھی کافر ہیں، لَقَدْ كَفَرَ: کتنا پختہ طریقے کے ساتھ اس بات کو کہہ دیا گیا، کہ یہ طبقہ بھی کھلم کھلا کافر ہے، بلاشک وشبہ کُفر ہے، اور اس کے اندر کسی قسم کی ہدایت کی بات نہیں ہے۔ ”حالانکہ مسیح نے تو یہ اعلان کیا“ اور اس اعلان کو سامنے رکھیے، اور اس فرقے کے عقیدے کے کو دیکھئے تو وہی بات صادق آئے گی کہ مدّعی سست گواہ چست۔ جیسے کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کی زندگی میں ہی لوگوں نے یہ عقیدہ تجویز کر لیا تھا کہ علی خدا ہے، عبداللہ ابنِ سبا کی پارٹی نے اس قسم کی نشر واشاعت شروع کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ علی کے پردے میں آ گیا، علی اور اللہ ایک ہی چیز ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو انہوں نے پکڑ والیا، اور ان کو ”زندیق“ قرار دیا یعنی ”بے دین لوگ“، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ یہ تو صحیح حدیث میں موجود ہے کہ آپ نے ان کو زندہ جلا دیا، آگ بھڑکائی اور زندہ اس میں ڈال دیا، اور اس طرح سے ان کو جلا دیا جو کہ اس قسم کا زندقہ اور بے دینی اختیار کئے ہوئے تھے۔[1] تو

(۱) بخاری ۱۰۲۳/۲ باب اثم من اشرک باللہ. ولفظہ: اُتِیَ عَلِیٌّ بِزَنَادِقَةٍ فَاَحْرَقَهُمْ۔ زنادقہ کے مصداق کے متعلق ایک قول یہی ہے (حاشیہ مشکوۃ)۔

''تاریخِ شیعہ'' کے اندر ایک روایت لکھی ہے کہ اس پارٹی کے دوسرے لوگوں کو جب پتا چلا کہ ہمارے نظریات کے لوگوں کو علی رضی اللہ عنہ نے پکڑ کر آگ میں جلا دیا، وہ کہنے لگے کہ یہ تو دلیل ہے اس بات کی کہ علی رَبّ ہے، علی کے رَبّ ہونے کی یہ تو دلیل ہے، وہ کیسے؟ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ''(۱) کہ آگ کے ساتھ عذاب دینا آگ کے مالک کا کام ہے، تو جب علی رضی اللہ عنہ نے آگ کے ساتھ عذاب دیا تو معلوم ہو گیا کہ ربُّ النار یہی ہے، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ تو اس دعوے کی بنا پر ان کو ''زِندیق'' قرار دیں، اور اس عقیدے کی بنا پر ان کو زِندہ جلائیں، اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ اس نے آگ میں جلا دیا اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آگ کے اندر جلانا یہ رَبّ النار کا ہی کام ہے، تو معلوم ہو گیا کہ علی رَبّ النار ہے،(۲) یہ تو اُس کے رَبّ ہونے کی دُوسری دلیل مل گئی۔ تو جب اس قسم کی بد دماغی کے اندر انسان مبتلا ہو جائے اور وہی بات صادق آجائے کہ مدّعی سست گواہ چست، کہ مدّعی کا دعویٰ کچھ اور ہے، گواہ گواہی کچھ اور دیے پھر رہے ہیں، تو پھر حال ایسے ہی ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو اعلان کیا کہ ''اے اسرائیلیو! اے اسرائیل کی اولاد! عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رَبّ ہے تمہارا بھی رَبّ ہے، اور یہ واقعہ ہے جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے گا وہ جنت میں نہیں جا سکتا، اللہ نے اُس پر جنت کو حرام کر دیا، اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔'' یہ جو اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ سے لے کر وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ تک الفاظ ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وعظ کا حصہ ہوں، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے توحید کا اعلان نقل کرنے کے بعد شرک کی مذمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست اُتاری گئی، تفسیر کے اندر اس کے متعلق دونوں قول ہیں۔ اب یہ دوسرا طبقہ! لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ عیسائیوں کا یہ طبقہ جو کہتے تھے کہ اللہ تین ہیں اور ان میں سے ایک اللہ ہے، آلہہ تین ہیں، ایک وہ عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیتے تھے، دوسرا عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو، یا جبریل علیہ السلام کو، اور تیسرا اللہ خود ہو گیا، تو ثلاثہ کا ثالث یعنی تین میں سے تیسرا اللہ ہے، یہ بھی اسی طرح سے کافر ہیں، یعنی جنہوں نے تعدّد کا قول کر لیا وہ بھی کافر، اور جو حلول کے قائل ہو گئے وہ بھی کافر۔ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: یہ تثلیث تو ایسے ہی ہے، ورنہ اِلٰہِ واحد ہی حقیقت میں اِلٰہ ہے، ''کوئی معبود نہیں سوائے اِلٰہِ واحد کے، اگر یہ باز نہیں آئیں گے ان باتوں سے جو کہتے ہیں تو البتہ ضرور چھوئے گا ان میں سے ان لوگوں کو جو کافر رہیں گے عذابِ الیم'' مِنْهُمْ کا نکتہ میں نے پہلے آپ کی خدمت میں ذکر کر دیا، کہ اتنی گنجائش باقی ہے کہ اگر یہ لوگ توبہ کر لیں تو ان کی توبہ کو قبول کیا جا سکتا ہے اور ان کا ایمان معتبر ہوگا، زندگی کے اندر اندر، چاہے یہ کتنے سخت کُفر کو اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ ایمان لے آئیں گے تو ان کا ایمان معتبر ہے، اور جو اس کُفر پر برقرار رہیں گے تو پھر ان کو عذابِ الیم چھوئے گا، جیسے توبہ کی ترغیب آگے دی گئی اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ: یہ کیوں توبہ نہیں کرتے اللہ کی طرف اور کیوں اِستغفار نہیں کرتے، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے، اللہ غفور رحیم ہے، اگر یہ اللہ کے سامنے توبہ کریں گے اور اِستغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے اس کُفر اور شرک کے گناہ کو بھی معاف کر دے گا۔

(۱) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۷ باب فی کراھیۃ حرق العدو بالنار۔ واللفظ لہ/ مشکوۃ ۲/ ۳۰۷ باب قتل اھل الردۃ الخ۔
(۲) دیکھئے: التبصیر فی الدین و تمییز الفرقۃ الناجیۃ عن الفرق الھالکین ص ۱۱۹ مطبوعہ لبنان۔ مؤلف: طاہر بن محمد اسفرائینی م ۴۷۱ھ۔

سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کی وضاحت

دونوں عقیدوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اُلوہیت کو ثابت کیا گیا ہے، ایک میں کُل اُلوہیت اور ایک میں اُلوہیت کا ثلث، گویا کہ مجموعۂ اُلوہیت کا تیسرا حصّہ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے قرار دیا گیا۔ تو اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو واضح کیا ہے۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُوْلٌ: اِلَّا رَسُوْلٌ کے اندر جو حصر کیا جا رہا ہے یہ اِلٰہ کے مقابلے میں ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اِلٰہ نہیں، نہ کُل اِلٰہ، نہ اِلٰہ کا ثلث، وہ تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ رسول ہے، یعنی انسان تو ہے ہی اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں، اس کی نفی کرنی یا اثبات کرنا مقصود نہیں، اُلوہیت کے مقابلے میں یہ حصر ہے، کہ اُلوہیت کا معنی اس میں نہیں پایا جاتا، یہ رسول کے علاوہ کچھ نہیں، اور جیسا یہ اللہ کا رسول ہے ایسے پہلے بہت سارے رسول گزر گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ آئے، معجزات ان کو ملے، ان کے ہاتھوں سے عجیب عجیب کارنامے سرانجام پائے، اگر اس قسم کے معجزات آنے کی وجہ سے کسی کو اِلٰہ قرار دیا جائے تو اُن رسولوں کو بھی اِلٰہ قرار دینا چاہیے تھا، ''ان سے پہلے بہت سارے رسول گزر گئے۔'' اور باقی رہی ان کی والدہ، وہ بھی اِلٰہ نہیں ہے، نہ اِلٰہ کا حصّہ ہے، اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ: وہ ایک مقبول عورت ہے، ولیہ ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مقام وہ ہے جو صدیقین کا ہوتا ہے، لہٰذا ان کی ماں میں بھی اُلوہیت کا معنی نہیں اور ان میں بھی نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِلٰہ نہ ہونے کی حسی دلیل

كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ: یہ ایک حسی دلیل دے دی کہ ان کے اندر اُلوہیت موجود نہیں ہے، بہت حسی اور واضح دلیل، جس کے اندر کوئی عیسائی بھی اختلاف نہیں کر سکتا، یہ تو ان کو بھی مُسلَّم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غذا لیتے تھے، کھانا کھاتے تھے، اور ان کی ماں بھی کھانا کھاتی تھی، تو جس کا مطلب یہ ہو گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے کھانے پینے کے محتاج تھے، اور جس کے اندر احتیاج آجائے اس میں اُلوہیت کہاں سے؟ جو خود محتاج ہو وہ اِلٰہ کیسے ہو گیا؟ ان کا کھانا کھانا ان کی بشریت کی دلیل ہے، ان کی انسانیت کی دلیل ہے، ان کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے، ان کے محتاج ہونے کی دلیل ہے، اور پھر احتیاج بھی معمولی نہیں، ''کھانا کھاتے تھے'' آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک معمولی سی بات ہے، معمولی بات نہیں ہے، ہمارا جو کھانے کی طرف احتیاج ہے اس نے ہمیں ساری کائنات کا محتاج بنا رکھا ہے، روٹی مہیا کرنے کے لیے ہمیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے، زمین کے ہم محتاج، آسمان کے ہم محتاج، سورج چاند کے ہم محتاج، پانی کے ہم محتاج، زمین کے بونے کے لیے جوتنے کے لیے ہم پتا نہیں کیا کیا جتن کرتے ہیں، لوہے کے لکڑی کے اور حیوانات کے ہم محتاج، اور پھر کتنی محنت اور مشقت کے ساتھ اس کو مہیا کرنے کے بعد ایک لقمہ ہمیں نصیب ہوتا ہے، اور پھر اس لقمے کے کھانے کے بعد جس وقت وہ پیٹ میں چلا جاتا ہے، تو اس کو ہضم کرنے کے لیے ہمیں کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں، ناموافق ہونے کی صورت میں کیا کیا کھیل ہمیں کھیلنے پڑتے ہیں، اگر وہ کھانا کھایا ہوا ناموافق ہو جائے تو کیسی کیسی بطن کی بیماریوں میں انسان مبتلا ہوتا ہے، بیماریوں میں مبتلا نہ بھی ہو یہ تو آپ سمجھتے ہیں کہ کھانے اور پینے کے بعد بیت الخلا کی احتیاج بھی تو پیش آتی ہے، اور اس وقت انسان جس کیفیت میں بیٹھا ہوتا ہے، جو انسان کی اس وقت کیفیت ہوتی ہے،

ان کیفیات کو سامنے رکھ کر سوچ، کیا کوئی اُلوہیت کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ کہ یہ شخص جو ایک وقت کھاتا ہے، تو دوسرے وقت ہگتا ہے، اور اُس کو کہیں کہ یہ خدا کے مقام پہ پہنچ گیا اور اس کو اُلوہیت حاصل ہے، یہ بات کتنی بداہت کے خلاف ہے، کتنی عقل کے خلاف ہے، تو کھانا پینا، ہگنا موتنا یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ وہ مخلوق ہیں، انسان ہیں، کائنات کے محتاج ہیں، اور اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے دوسرے انسانوں کی طرح ان چیزوں کی طرف ان کا احتیاج ہے، تو جو خود محتاج ہے اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے بھی، تو اس کے لیے تم اُلوہیت کا قول کس طرح سے کر سکتے ہو؟ تو یہ اتنی واضح دلیل ہے، اس لیے آپ سمجھ لیجئے، جو شخص کھانا نہ کھائے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اِلٰہ ہے، وہ یہاں زیر بحث نہیں ہے، مثلاً فرشتے نہیں کھاتے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اِلٰہ ہیں، وہ صورت یہاں زیر بحث نہیں، اتنی بات ثابت ہوگئی کہ جو کھانے کا محتاج ہے وہ اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ زیر بحث مسئلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور ان کی والدہ کا ہے اس لیے یہاں یہ بات دکھا دی گئی کہ کھانے کی طرف احتیاج یہ واضح دلیل ہے کہ ان کے اندر اُلوہیت نہیں پائی جاتی، فرشتے یہاں زیر بحث نہیں ہیں، ورنہ ان کی اُلوہیت کو باطل کرنے کے لیے دوسری جگہ اور دلائل ہیں، یعنی اس سے یہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا کہ جو کھانا نہ کھائے اُس میں اُلوہیت ہے، ایسی بات نہیں، مثلاً فرشتے ہیں وہ کھانا نہیں کھاتے، ان کی اُلوہیت کو باطل کرنے کے لیے دوسری جگہ اور دلائل دیئے گئے ہیں، لیکن جن کی اُلوہیت یہاں زیر بحث ہے ان کے لیے یہ واضح دلیل دے دی گئی کہ تمہارے سامنے وہ کھاتے تھے پیتے تھے، اور اس کے نتیجے کے طور پر ساری کی ساری چیزیں ان کے سامنے آتی تھیں، حالات سامنے آتے تھے، تو جو کھاتا ہے اُس کے متعلق تو یقین کر لو کہ وہ مخلوق ہے، محتاج ہے، اِلٰہ نہیں، ان کے متعلق یہاں واضح دلیل بیان کر دی، اس لیے فرمایا کہ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: دیکھ! ہم کس طرح ان کے سامنے واضح واضح نشانیاں پیش کرتے ہیں، پھر دیکھ لو! یہ بھی کیسے پلٹے جا رہے ہیں، ایسے واضح دلائل سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔

غیر اللہ کے اِلٰہ نہ ہونے کی ایک اور واضح دلیل

پھر آپ کہہ دیجئے کہ تم پُوجا کرتے ہو اللہ کے علاوہ ایسی چیز کی جو تمہارے لیے نفع نقصان کا اختیار ہی نہیں رکھتی، یہ بھی ایک بہت بڑی نفسیاتی بات کہی گئی ہے، انسان اگر کسی کے سامنے عبدیت اختیار کرتا ہے، کسی کے سامنے جھکتا ہے، تو اس میں جذبے دو ہی ہوتے ہیں، یا کسی نقصان سے بچنے کا جذبہ یا کسی نفع کو حاصل کرنے کا جذبہ، قبروں پر لوگ جاتے ہیں، آج بھی دیکھ لینا، ایک ایک سے پوچھ لینا کہ کیوں جاتے ہو؟ کوئی تو اولاد لینے کے لیے جاتا ہے، کوئی بیماریاں دفع کرانے کے لیے جاتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ میری بھینس ٹھیک نہیں ہوتی، اس لیے وہاں جا کے سر جھکاتا ہے، اور کوئی جاتا ہے کوئی اور چیز حاصل کرنے کے لیے، رزق کی وسعت حاصل کرنے کے لیے، اولاد حاصل کرنے کے لیے، کوئی صحت حاصل کرنے کے لیے، کوئی بیماریوں کے دفع کرنے کے لیے، کوئی دشمنوں کو مغلوب کرنے کے لیے، بہر حال یہ دو ہی جذبے ہیں انسان کے اندر جو انسان کی گردن جھکاتے ہیں، ایک نقصان سے بچنے کا جذبہ اور ایک نفع کے حاصل کرنے کا جذبہ، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر بار بار یہ بات واشگاف کی ہے کہ یہ دونوں ہی اختیار میرے ہیں، کہ نہ کوئی تم سے تکلیف دُور ہٹا سکتا ہے، اور نہ تمہیں کوئی کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے،

تکلیف بھی وہی پہنچے گی جو میری طرف سے آئے گی، ہٹاؤں گا بھی میں ہی، اور نفع بھی تمہیں وہی حاصل ہوگا جو میری طرف سے آئے گا، پہنچاؤں گا بھی میں ہی، اگر میں رحمت روک لوں کوئی پہنچا نہیں سکتا، اور اگر میں کوئی برائی دُور ہٹانا چاہوں تو کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، قرآنِ کریم کی بیسیوں آیات کے اندر اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے، تاکہ شرک کے اس جذبے کو اور اس رگ کو کاٹ دیا جائے، جس سے متأثر ہو کر انسان کسی دوسرے کے سامنے جھکتا ہے، کہ اللہ کے علاوہ نفع نقصان کا اختیار کوئی نہیں رکھتا، جیسے ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ۔

موحد چہ در پائے ریزی زرش چہ شمشیرِ ہندی نہی برسرش
اُمید و ہراسش نہ باشد زِکس بریں اَست بنیادِ توحید و بس

کہتے ہیں کہ موحد کا مقام یہ ہے کہ اُس کے سامنے سونے کا ڈھیر لگا دو تو بھی متأثر نہیں ہوتا، اُس کے سَر کے اُوپر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاؤ تو بھی نہیں ڈرتا، اُس کے پاؤں میں اگر سونے کے ڈھیر لگا دو، یا اس کے سر کے اُوپر ہندی تلوار لے کر کھڑے ہو جاؤ، دونوں باتیں برابر ہیں، نہ وہ نفع سے متأثر ہو، یعنی حصولِ نفع سے، اور نہ وہ اس قسم کے ڈَر سے متأثر ہو، اسے نہ کسی کی طرف سے نفع کی اُمید ہوتی ہے، نہ کسی کی طرف سے خوف ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اسی نظریے پر ہے، کہ اُمید و ہراس اللہ کے علاوہ کسی دوسرے سے نہ ہو، نہ کسی سے اُمید رکھی جائے نہ کسی سے ڈرا جائے، ایسی صورت میں انسان کی توحید کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے، [گلستاں، باب ۸ کا آخر]۔

تو لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہی بات بتائی ہے کہ کوئی شخص تمہارے لیے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، نقصان دُور ہٹانے کا نفع پہنچانے کا، پھر تم ایسی چیزوں کے سامنے عبدیت کیوں اختیار کرتے ہو؟ اُن کے سامنے جا کے کیوں جھکتے ہو؟ یہ چیز صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ''اللہ تعالیٰ سننے والا ہے اور علم رکھنے والا ہے۔''

مذکورہ دلیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کا اِبطال

اور یہی بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق خصوصیت کے ساتھ اگر دیکھی جائے تو اُدھر عیسیٰ علیہ السلام کو وہ لوگ اِلٰہ بھی کہتے ہیں، اور اِدھر دشمنوں کے ہاتھ میں پکڑے جانے کے بعد ان کی مظلومیت پر ماتم بھی کرتے ہیں، اور ان کے پھانسی چڑھنے کے قصے بھی تراش رکھے ہیں، اور یہ دو باتیں جوڑ کس طرح سے کھاتی ہیں؟ جو اپنے آپ کو دشمنوں سے بچا نہ سکا، دشمنوں کے ہاتھوں پکڑا گیا، پکڑے جانے کے بعد وہ سُولی دے دیا گیا، اُس کے متعلق یہ کہیں کہ یہ کارساز ہے، ہمیں اس مصیبت سے بچا لے گا، یہ کیسی حماقت ہے، یہی بات ہے جو کہ ''متنبّی'' نے اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ کہی، کہ اُس کے مقابلے میں دو عیسائی بادشاہ لڑنے کے لیے آئے تھے، اور وہ جب لڑنے کے لئے آیا کرتے تھے تو صلیبیں انہوں نے تبرکاً رکھی ساتھ ہوئی ہوتی تھیں، تو متنبّی کے وہ دو شعر آپ نے پڑھے ہوں گے، جس میں وہ کہتا ہے کہ:

وَیَسْتَنْصِرَانِ الَّذِیْ یَعْبُدَانِ وَعِنْدَهُمَا اَنَّہٗ قَدْ صُلِبَ

یعنی ان دونوں مدمقابلوں کے بارے میں کہتا ہے کہ دونوں کے دونوں مدد مانگ رہے تھے اس سے جس کی وہ پوجا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اُسے سُولی دے دی گئی، اور جس کو سُولی دی گئی اُسی سے مدد مانگ رہے تھے اور اُسی کو پُوج رہے تھے، مدد کیسے مانگ رہے تھے؟

لِیَدْفَعَ مَا نَالَہٗ عَنْهُمَا فَیَا لَلرِّجَالِ لِهٰذَا الْعَجَبْ

کہتے ہیں پکار یہ رہے تھے کہ جو مصیبت تجھے پہنچ گئی کہ دشمن کے ہاتھوں تُو مر گیا، ہمیں اس مصیبت سے بچالے، لِیَدْفَعَ مَا نَالَہٗ: جو مصیبت اُسے پہنچ چکی ہے یعنی دشمنوں کے ہاتھوں مغلوب ہوجانا، پکڑے جانا، سُولی چڑھ جانا، جو مصیبت اُسے پہنچ چکی ہے یہ کہتے ہیں ہمیں بچالے۔ فَیَا لَلرِّجَالِ لِهٰذَا الْعَجَبْ: لوگو! اس بات پر تعجب کرو کہ جس مصیبت سے وہ خود نہیں بچ سکا وہ ان کو کیسے بچالے گا؟ اگر دشمنوں کے ہاتھوں وہ پکڑا گیا اور سُولی پہ چڑھ گیا تو یہ اس کو پکار پکار کے خود کیسے بچ جائیں گے؟ تو بات وہی ہے کہ جو اپنے نفع نقصان کا مالک نہیں وہ تمہارے نفع نقصان کا مالک کیسے ہوگا؟ اور جو تمہارے نفع نقصان کا مالک نہیں اس کے سامنے یہ پستی اختیار کرنے کی اور عبادت کرنے کی کیا تُک ہے، یہ بے جوڑ بات ہے، پکارو اُسی کو اور عبادت اسی کی کرو جو تمہارے نفع نقصان کا اختیار رکھتا ہے، ''اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔''

آخری آیت بطور خلاصے کے آ گئی کہ ''اے اہلِ کتاب! اپنے دِین میں ناحق غلو اختیار نہ کرو'' یعنی ہر بات کو اُس کے ٹھکانے پر رکھا کرو، اعتدال کے نقطے پر رہو، حد سے نہ بڑھو بڑھاؤ، جس طرح سے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھادیا، ''اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے ہیں'' یعنی تمہارے وہ پیشوا جنہوں نے تمہیں ایسے سبق پڑھائے ان کے پیچھے نہ چلو، وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا: اور بہتوں کو انہوں نے گمراہ کیا، وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ: اور خود سیدھے راستے سے گمراہ ہو گئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ [1]

لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَى
لعنت کیے گئے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا بنی اسرائیل میں سے داؤد علیہ السلام کی اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام
ابْنِ مَرْیَمَ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝۷۸ كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ
کی زبان پر، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ۷۸ اور وہ رُکتے نہیں تھے

(۱) آخری آیت کی مزید تفسیر اگلے درس میں دیکھیں۔ ناقل

عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ

اس بری بات سے جس کو وہ کرتے تھے، البتہ بری ہے وہ چیز جو کرتے تھے ﴿۷۹﴾ تو دیکھتا ہے ان میں سے بہتوں کو، دوستی لگاتے ہیں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي

ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کفر کیا، البتہ بری ہے وہ چیز جو آگے بھیجی ان کے لئے ان کے نفسوں نے، کہ ناراض ہوا اللہ ان پر، اور

الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَاۤ

عذاب کے اندر یہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۸۰﴾ اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اللہ پر اور نبی پر اور اُس چیز پر جو

اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

اس نبی کی طرف اُتاری گئی تو پھر یہ ان کافروں کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ طاعت سے نکلنے والے ہیں ﴿۸۱﴾

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

البتہ ضرور پائے گا تو سب لوگوں میں سے زیادہ سخت ازروئے عداوت کے مؤمنوں کے لئے یہود کو اور اُن لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا،

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ

اور البتہ ضرور پائے گا تو زیادہ قریب سب لوگوں میں سے ازروئے محبت کے مؤمنوں کے لیے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں،

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

یہ اس سبب سے ہے کہ بیشک اُن میں سے علم والے ہیں اور درویش ہیں، اور اس سبب سے ہے کہ بیشک وہ لوگ تکبر نہیں کرتے ﴿۸۲﴾

وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ

اور جب وہ سنتے ہیں اس بات کو جو رسول کی طرف اُتاری گئی، دیکھتا ہے تو اُن کی آنکھوں کو کہ بہتی ہیں

مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا

آنسوؤں سے بہ سبب اس حق کے جس کو انہوں نے پہچان لیا، کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، ہمیں لکھ

مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ

گواہی دینے والوں کے ساتھ ﴿۸۳﴾ اور ہمیں کیا ہوگیا کہ ہم اللہ پر ایمان نہ لائیں اور اس حق پر ایمان نہ لائیں جو ہمارے پاس آیا ہے

الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾	
اور اُمید رکھیں ہم کہ داخل کرے گا ہمیں ہمارا رب نیک لوگوں کے ساتھ ﴿۸۴﴾	
فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	
پس بدلہ دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے بہ سبب اس بات کے جو انہوں نے کہی باغات، جاری ہیں اُن کے نیچے سے نہریں	
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا	
ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں گے، اور یہ نیکوکاروں کی جزا ہے ﴿۸۵﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	
وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع	
اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ بھڑکتی ہوئی آگ والے ہیں ﴿۸۶﴾	

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ: آپ کہہ دیجیے کہ اے کتاب والو! لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ: اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ: اور نہ پیروی کرو تم ان لوگوں کی خواہشات کی، قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ: جو اس سے قبل بھٹک گئے، وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا: اور بہت سارے لوگوں کو انہوں نے غلطی میں ڈال دیا، بھٹکا دیا، وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ: اور بھٹک گئے وہ سیدھے راستے سے۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: لعنت کیے گئے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: بنی اسرائیل میں سے، بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ لعنت کیے گئے عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ: داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی زبان پر، یعنی اُن کے اوپر لعنت کا اظہار اِن کی زبان پہ ہوا، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے، كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ: اور وہ رُکتے نہیں تھے اس بری بات سے جس کو وہ کرتے تھے۔ مُنْكَر: بُری چیز، جس کے اوپر انکار کیا گیا ہو عقلاً و شرعاً۔ ''جس منکر کا وہ ارتکاب کرتے تھے، جس منکر کو وہ کرتے تھے اس سے رُکتے نہیں تھے'' لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: البتہ بُری ہے وہ چیز جو کرتے تھے۔ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: تو دیکھتا ہے ان میں سے بہتوں کو، دوستی لگاتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کفر کیا، لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ: البتہ بُری ہے وہ چیز جو آگے بھیجی ان کے لئے اِن کے نفسوں نے، اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: اَن مصدر یہ ہے اور اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ یہ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ کا ایک قسم کا بیان ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ مخصوص بالذم ہے، مُوْجِبُ سَخَطِ اللّٰهِ یعنی وہ کیا چیز ہے جو انہوں نے آگے بھیجی ہے؟ وہ اللہ کی ناراضگی کو ثابت کرنے والی چیز ہے، وہی ان کے عمل جو اللہ کی ناراضگی کو ثابت کرنے والے ہیں وہ بہت بُرے ہیں، ''بُری ہے وہ چیز جو آگے بھیجی ان کے لیے ان کے نفسوں نے، جو ثابت کرنے والی ہے اللہ کی ناراضگی کو اِن پر'' وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ: اور عذاب کے اندر

یہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ ''بیان القرآن'' میں مضاف محذوف نکال کے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے، اور ویسے یوں بھی لفظوں میں ادا کر سکتے ہیں ''بُری ہے وہ چیز جو ان کے لیے ان کے نفسوں نے آگے بھیجی کہ ناراض ہوا اللہ ان پر'' یعنی وہ اللہ کی ناراضگی ہے جو آگے انہوں نے بھیجی اپنے نفسوں کے لئے، اور وہ ان کے حق میں بہت بری ہے، اللہ کی ناراضگی آگے کس طرح سے بھیجی؟ یعنی ایسے اعمال آگے بھیجے جو اللہ کی ناراضگی کا موجب ہیں، جن کے ذریعے سے اللہ کی ناراضگی ثابت ہوئی۔ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اللہ کے ساتھ، وَالنَّبِيِّ: اور نبی کے ساتھ، وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ: اور اس چیز کے ساتھ جو اس نبی کی طرف اتاری گئی، مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ: تو پھر یہ کافروں کو دوست نہ بناتے، هُمْ ضمیر الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر پیچھے آیا تھا، يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کہ یہ دوستی لگاتے ہیں الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے ساتھ۔ اگر ان کا ایمان صحیح طور پر اللہ پہ ہوتا نبی پہ ہوتا اور مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ پہ ہوتا یعنی جو کچھ اس نبی کی طرف اُتارا گیا (اس پہ ایمان ہوتا) تو پھر یہ لوگ ان کافروں سے دوستی نہ لگاتے، وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ: لیکن ان میں سے بہت سے لوگ طاعت سے نکلنے والے ہیں، فسق اختیار کرنے والے ہیں، نافرمان ہیں۔ فسق کی حقیقت ہوتی ہے طاعت سے نکل جانا، خروج عن الطاعة، اور یہ کُفر پر بھی صادق آتا ہے شرک پر بھی صادق آتا ہے عام معاصی پر بھی صادق آتا ہے۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا: البتہ ضرور پائے گا تو لوگوں میں سے زیادہ سخت اَزرُوئے عداوت کے مؤمنوں کے لئے، یعنی مؤمنوں کے ساتھ عداوت رکھنے کے اعتبار سے تو سب لوگوں میں سے زیادہ سخت پائے گا یہود کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا۔ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا کا مصداق مشرکینِ مکہ ہیں۔ مشرکینِ مکہ اور یہود تمام لوگوں میں سے زیادہ سخت ہیں مؤمنوں کے لئے اَزرُوئے عداوت کے، ''البتہ ضرور پائے گا تو سب لوگوں میں سے زیادہ سخت اَزرُوئے عداوت کے مؤمنوں کے لئے یہود کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا'' وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا: اور البتہ ضرور پائے گا تو زیادہ قریب سب لوگوں میں سے ازروئے محبت کے مؤمنوں کے لئے، پائے گا تو الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى: ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں وہ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہیں ازروئے محبت کے مؤمنوں کے لئے، ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ: یہ اس سبب سے ہے کہ بیشک ان میں سے قسیسین ہیں، قِسِّيْسِيْنَ، قِسِّیس کی جمع ہے، یہ عالم کو کہتے ہیں سریانی زبان میں، علم والے ہیں، علم دوست، علم والے، وَرُهْبَانًا: اور ان میں سے رُہبان ہیں۔ رُہبان راہب کی جمع، تارک الدنیا، درویش۔ وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ: اور اس سبب سے ہے کہ بیشک وہ لوگ تکبر نہیں کرتے۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ: اور جب وہ سنتے ہیں اس بات کو جو رسول کی طرف اُتاری گئی۔ الرَّسُوْلِ سے سرورِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ: دیکھتا ہے تو ان کی آنکھوں کو کہ بہتی ہیں آنسوؤں سے، مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ: حق کو پہچان لینے کی وجہ سے۔ ''ما'' مصدریہ ہے۔ ان کے حق کو پہچان لینے کی وجہ سے۔ یا بسبب اس چیز کے جس کو انہوں نے پہچانا یعنی حق، تو ''ما'' موصولہ ہو جائے گا اور مِنَ الْحَقِّ اس کا بیان ہو جائے گا۔ بسبب اس چیز کے جس کو انہوں نے پہچانا یعنی حق، جس حق کو انہوں نے پہچانا اس کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، ''دیکھتا ہے تو ان کی آنکھوں کو، بہتی ہیں آنسوؤں سے بسبب اس حق کے جس کو انہوں نے پہچان لیا'' يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا: کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ: ہمیں لکھ گواہی دینے والوں کے

ساتھ، وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: اور ہمیں کیا ہوگیا کہ ہم اللہ پر ایمان نہ لائیں، وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ: اور اس حق پہ ایمان نہ لائیں جو ہمارے پاس آیا ہے، وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا: اور اُمید رکھیں ہم کہ داخل کرے گا ہمیں ہمارا رب، مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ: نیک لوگوں کے ساتھ۔ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا: پس بدلہ دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا جو انہوں نے کہی، بسبب اس بات کے جو انہوں نے کہی، جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: باغات، جاری ہیں ان کے نیچے سے نہریں، خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ: اور یہ نیکوکاروں کی جزاء ہے۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ: اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ: یہ جہنم والے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلے رکوع میں یہود اور نصاریٰ دونوں کے کردار کے اوپر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ یہود رسولوں کے حق میں تفریط میں مبتلا ہوئے، کہ جو رسول ایسی بات لے کر آتا جو اُن کی خواہشات کے خلاف ہوتی تو اُس کو جھٹلاتے بھی تھے اور اُسے قتل بھی کرتے تھے، انہوں نے رسولوں کو اُن کے صحیح مقام پر نہ رکھا، بلکہ اُس سے نیچے گرادیا، کہ اللہ کا رسول تو اللہ کی مشیت کو واضح کرنے کے لیے آیا کرتا ہے، اور اُس کی بات ماننا ہی اللہ کی بات ماننا ہے، اور انسانوں پر فرض ہوتا ہے کہ اُس پر ایمان لائیں اور اُس کے فرمودات کے سامنے اپنی خواہشات کو چھوڑ دیں، لیکن انہوں نے اپنی خواہشات کو اصل قرار دیا اور یہ اللہ کے بندے، رجال اللہ کا جو مصداق تھے، جو اللہ کی طرف سے آئے اللہ کی مشیت کو واضح کرنے کے لیے، مرضیات کو واضح کرنے کے لیے، اُن کو انہوں نے اپنی خواہشات پر پرکھا، جو اُن کی خواہش کے مطابق تھا اُسے تو انہوں نے مانا اور جو بات ان کی خواہشات کے خلاف کہتے اُس کی تکذیب کرتے اور اُسے جھٹلاتے، یہ تو "تفریط" ہے۔ اور دُوسرے نمبر پر ذکر عیسائیوں کا تھا، نصاریٰ کا، کہ انہوں نے اِفراط کیا، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول تھے اُن کو اتنا بڑھایا کہ یا تو اللہ ہی قرار دے دیا، یا اللہ کا ثلث، اور ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ کا عقیدہ اختیار کرلیا، ان دونوں باتوں کی وضاحت کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ خطاب کیا کہ "اے کتاب والو! اپنے دِین میں ناحق غلو اختیار نہ کرو" یعنی اِفراط وتفریط دونوں ہی بُری باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس بات کی وضاحت ہوگئی، جو اِعتدال کا راستہ ہے، جو سَوَآءِ السَّبِیْلِ کا مصداق ہے، اُس کی اتباع کرنی چاہیے، ناحق اُس کے اندر غلو اختیار نہ کرو، وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ: اَهْوَآءَ قَوْمٍ: قوم کی خواہشات، اس سے اشارہ اُن بدعات کی طرف ہے جو خصوصیات کے ساتھ نصاریٰ میں رائج ہوئیں، کہ بعض لوگوں نے اپنی خواہشات کے تحت دِین کے اندر کچھ ایسی باتیں جاری کردیں جو دلیل سے ثابت نہیں، اور اُن کو دِین بنا کر جاری کردیا، جس کے لیے ہماری اِصطلاح میں "بدعات" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہ محض اُن کے خیالات ہیں، اُن کی خواہشات ہیں، دلائل کے ساتھ وہ باتیں مدلل نہیں ہیں، تو جس طرح سے وہ خواہشات پر چلے اب تم بھی اُن کی

خواہشات پر چلو گے، اور اُن کی ایجاد کردہ چیزوں کو اگر اپناؤ گے تو جس طرح سے وہ خود بھٹکے تمہیں بھی بھٹکا دیں گے، تو ان بدعات کی اتباع نہ کرو، بلکہ یہ دیکھو کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے کس طرح سے دین کی بات سمجھائی ہے، جتنی سمجھائی ہے اتنی رہنے دو، اپنے طور پر اس میں زیادتی نہ کرو۔

''بدعت'' بظاہر نیک کام ہونے کے باوجود مذموم کیوں؟

اور یہ غلو فی الدین گمراہی کی ایک بہت بڑی بنیاد ہے، کہ جب انسان اس حد پر نہیں رہتا جو حد اللہ کے رسول نے متعین کردی، اور دین کے جذبے کے تحت ہی، نیکی کے جذبے کے تحت ہی اُس کو عبور کرنا شروع کر دیتا ہے، اس سے آگے تجاوز کرنا شروع کر دیتا ہے، تو پھر یہ بدعات کی ایجاد شروع ہو جاتی ہے، بدعت جب بھی شروع ہوتی ہے (یہ آپ کے سامنے پہلے بھی غالباً وضاحت ہو چکی) اکثر و بیشتر اس کے پیچھے جذبات اچھے ہی ہوتے ہیں، نیکی کے جذبے کے ساتھ ہی انسان چلتا ہے، اور اُس نیکی میں اضافہ کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ اضافہ چونکہ حد سے زائد ہو جاتا ہے، تو اِعتدال سے کسی چیز کو آگے بڑھا دیا جائے تو یہ عیب ہے، چاہے اُس کو خوبی کے انداز کے ساتھ ہی کیوں نہ بڑھایا جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی ہمیں یہ بتایا کہ فجر کی نماز کی دو رکعتیں ہیں، اب دو رکعتیں ہی پڑھنا یہی نماز کو اصلی حالت پر اور اُس کے حُسن پر رکھنا ہے، اب اگر کوئی شخص نیکی کے جذبے کے ساتھ ہی، اس جذبے کے تحت کہ وقت فارغ ہے، اگر دو کی بجائے چار پڑھ لیں تو کیا حرج ہے؟ آخر نیکی ہی ہے، رکوع سجدہ ہی ہے، قرآنِ کریم ہی اس میں پڑھنا ہے، ذکر و اذکار تسبیحات کا اضافہ ہی ہے، تو اس میں کیا حرج ہے؟ تو یہ دو رکعت کا اضافہ اگرچہ وہ عبادت کے جذبے کے تحت کرتا ہے، لیکن یہ ہے محض اُس کی خواہش نفس اور ہوائے نفس، اور اس اضافے کے ساتھ نیکی میں اضافہ نہیں ہوا، اس اضافے کے ساتھ اُس نے عبادت اور بھلائی میں اضافہ نہیں کیا، بلکہ دین کی اصل شکل بگاڑ دی، اب وہ جو پہلی دو رکعتیں تھیں اِس اضافے کے ساتھ وہ بھی ختم ہو جائیں گی، اور اُن کی حیثیت بھی ختم ہو جائے گی۔ تو دین میں جب بھی حد سے تجاوز کیا جائے چاہے وہ کتنے ہی اچھے جذبے کے تحت کیوں نہ ہو، وہ اصل دین کی شکل کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ظاہری شکل دی ہے، جس میں ناک بھی ہے کان بھی ہیں آنکھیں بھی ہیں جو اعتدال کے ساتھ اللہ نے بنا دیئے، یہی حُسن کا باعث ہے، اب ناک اپنی جگہ ضروری ہے، لیکن اسی کو اگر آپ کھینچ کھینچ کر ایک فٹ لمبا کرنے کی کوشش کرو، یا یہ آنکھیں جو ہیں اُن کے سوراخوں کو زیادہ وسیع کر کے زیادہ چوڑا کرنے کی کوشش کر دو تو اپنے طور پر اگرچہ تم اپنے بدن کے اندر اضافہ کرو گے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے شکل بگاڑ لی، تو بدعت اسی طرح سے ہوا کرتی ہے کہ آتی تو ہے یہ نیک جذبے کے تحت، انسان نیکی میں اضافہ کرنا چاہتا ہے، لیکن اس حد پر نہیں ٹھہرتا جو حد شریعت نے واضح کی، جو کہ اس عمل کے لیے ایک حسین ترین صورت ہے، بلکہ اپنی طرف سے اس میں اضافے کر کے دین کی اصل شکل کو بگاڑ لیتا ہے، عیسائیوں میں بھی اسی طرح سے بدعات جاری ہوئیں۔ بظاہر دیکھنے میں اگرچہ وہ چیز سادی ہوتی ہے جو اللہ کے رسول نے سمجھائی، جیسے یہ اذان ہے مثال کے طور پر، آپ کہتے ہیں، سرورِ کائنات ﷺ نے کہلوائی اور اپنے سامنے کہلوائی، زندگی بھر آپ کے سامنے ہوتی رہی، بلال رضی اللہ عنہ کہتے رہے، ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کہتے رہے، عبداللہ بن

اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کہتے رہے، تمام صحاح کے اندر مذکور ہے، اب "اللہ اکبر" سے شروع ہو کر "لا الٰہ اِلّا اللہ" کے اُوپر اس کا خاتمہ یہی اِس اذان کا حُسن ہے، اگر اِس کو اسی انداز کے ساتھ ادا کیا جائے گا تو یہ خوبصورت ہے، اور اس کی اصل شکل باقی ہے، اب ایک آدمی کو جوش چڑھے کہ یہ آخر کوئی بُری بات تو ہے نہیں، جب شروع کے اندر "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ" کے بعد "اشھد ان محمدا رسول اللہ" ہے تو آخر میں بھی صرف "لا الٰہ اِلّا اللہ" پہ خاتمہ کیوں ہو؟ پورا کلمہ کیوں نہ پڑھ دیا کریں؟ آدھا کلمہ کیوں پڑھیں؟ تو "لا الٰہ اِلّا اللہ" کے بعد "محمد رسول اللہ" بھی پڑھ لیا کریں، اب اگرچہ "محمد رسول اللہ" کتنی ہی واقعہ کے مطابق بات ہے لیکن اگر اَذان کے آخر کلمے میں "لا الٰہ اِلّا اللہ محمد رسول اللہ" پورا کلمہ پڑھ دو گے تو یہ نیکی کے اندر اضافہ نہیں، بلکہ اَذان کی اصل شکل کو بگاڑ کے رکھ دیا، اسی طرح سے اَذان کے لب و لہجے کے ساتھ اِبتدا کے اندر کسی چیز کو اگر بڑھا دو گے، اپنے طور پر تم نیکی کے جذبے کے تحت بڑھا رہے ہو، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اَذان کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک دفعہ مجلس میں بیٹھے تھے، اور اُس مجلس میں بیٹھے بیٹھے ایک شخص کو چھینک آ گئی، "مشکوۃ شریف" میں روایت موجود ہے، جب اُس کو چھینک آئی تو وہ کہنے لگا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" تو اس کی زبان سے یہ بھی نکل گیا، کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کے ساتھ "وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" کا اضافہ کر دیا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فوراً اُس کو ٹوکا اور کہنے لگے کہ "وَاَنَا اَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ": میں بھی "اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" کہتا ہوں، یہ نہ سمجھ لینا کہ میں کوئی "اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" کا منکر ہوں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم اس طرح سے نہیں دی،[1] کہ چھینکنے کے بعد تم یہ کہو "وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ"، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم یہ دی ہے کہ جس وقت چھینک آئے تو جیسے کلمات آتے ہیں: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کا کلمہ آتا ہے، "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ" کا کلمہ آتا ہے، صرف "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" آتا ہے،[2] یہ کلمہ کہو، ایسے موقع پر اگر "اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" کا اضافہ کر دو گے تو یہ دِین کا حلیہ بگاڑنے والی بات ہے، یہ نیکی کے اندر اضافہ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت ایک ایسی بنائی ہے، اس کے اندر اِفراط و تفریط بہت جلدی آتا ہے، حد سے بڑھنے کا جذبہ اس میں بہت ہے، تو خاص طور پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ دِین کے معاملات میں تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جو نقشہ بنا دیا جائے، جتنی اُس کی پابندی کرو گے اتنا ہی اس دِین کے اندر حُسن ہو گا، اتنا ہی وہ عمل قبول ہے، اور اپنے طور پر جب تم اضافہ کرنے لگو گے تو دِین کے ریشمی ٹکڑے کے اُوپر تم ٹاٹ کا پیوند لگا دو گے، جس کے ساتھ اصل کپڑا بھی بدنما ہو جائے گا۔

عیسائیوں کے اندر اصل بیماری یہی آئی تھی کہ پہلے لوگوں نے اِن کے مقتداؤں نے اس قسم کے عقیدے اور اس قسم کی باتیں تجویز کر لیں، کہ جو کتاب اللہ کے دلائل سے مدلل نہیں تھیں، نبی کے فرمان سے ماخوذ نہیں تھیں، بلکہ محض اُن کے خیالات تھے، چاہے انہوں نے اچھے جذبات کے ساتھ یہ باتیں ایجاد کی ہوں، لیکن وہ بدعات کا مصداق بن گئیں، وہ دِین کی باتیں نہیں تھیں،

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۰۳ باب ما یقول العاطس اذا عطس/ مشکوۃ ۲/ ۴۰۶ باب العطاس، فصل ثانی۔

(۲) مذکورہ حوالے میں "الحمد للہ علی کل حال" کا لفظ ہے۔ بخاری ۲/ ۹۱۹ پر صرف "الحمد للہ" ہے۔ ترمذی ۲/ ۱۰۳ پر "الحمد للہ رب العالمین" ہے۔

اس لیے پچھلوں کو نصیحت کی جارہی ہے، کہ ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو جو اس سے قبل بھٹک گئے، اور انہوں نے اور بھی بہت سارے لوگوں کو بھٹکایا، اور سیدھے راستے کو انہوں نے چھوڑ دیا، غلطی کے اندر پڑ گئے، ان لوگوں کے خیالات پر نہ چلو۔ اور ہمیں یہ باتیں جو سنائی جارہی ہیں تو ہمیں بھی یہی سمجھانا مقصود ہے، کہ اگر پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے کوئی طریقے ایسے ایجاد کر لیے جو کسی دلیل کے ساتھ مدلل نہیں ہیں، بلکہ محض اُن کے خیالات ہیں، محض اُن کی خواہشات ہیں، اور پیچھے آنے والوں نے اُن کو دین سمجھ کر اپنا لیا تو یہ بات اچھی نہیں ہے، خواہشات کو چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ کے اصل دین کی اتباع کرو، تو اس غلو کو اگر اختیار کرو گے تو دین سے خارج ہو جاؤ گے، یہ غلو کی باتیں جو ہیں یہ دین نہیں ہیں، اَہواء ہیں، یہ اِتباعِ ہویٰ کہلائے گا، یہ اِتباعِ ھدیٰ نہیں ہے، یہ اِتباعِ دین نہیں ہے۔

یہود کے ملعون ہونے کی وجوہات

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے، جس طرح سے موجودہ یہود و نصاریٰ آنے والے پیغمبر کا انکار کر کے کافر ہو رہے ہیں، اسی طرح سے پچھلے زمانے میں بھی ہر دور میں بنی اسرائیل کی طرف جو پیغمبر آیا، اُس پیغمبر کی باتوں کو بعضوں نے مانا اور بعضوں نے انکار کیا، تو جو انکار کرنے والے تھے کافر ٹھہرے، تو ان کافروں کے اُوپر لعنت کی گئی، یعنی اس قوم کا کفر کی بنا پر ملعون ہونا یہ آج کی ہی بات نہیں، خاندانی طور پر پہلے بھی ان کے اُوپر بہت واقعات اس قسم کے پیش آئے، اور اِن کی پچھلی تاریخ کو دوہرا کر ان کو جو متنبہ کیا جارہا ہے تو یہی ہوشیار کرنا مقصود ہے کہ جیسے پہلے واقعات پیش آئے، انبیاء علیہم السلام کی اتباع نہ کرنے کی بناء پر تمہارے اُوپر لعنت ہوئی، اب بھی محتاط ہو جاؤ، اگر اس موجودہ پیغمبر کو نہیں مانو گے تو ویسے پھر ملعون ٹھہرو گے، ''بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کُفر کیا وہ ملعون ہوئے، اُن پر لعنت کی گئی، اس لعنت کا اظہار ہوا داؤد علیہ السلام کی زبان پر اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان پر'' داؤد علیہ السلام پر کتاب زبور اُتری، اُس کے اندر اِن پر لعنت ہوئی، تو چونکہ اس کا ظہور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان سے ہوا تو نسبت اُن کی طرف کر دی گئی، اور اِنجیل میں بنی اسرائیل میں سے کافروں پر لعنت کی گئی، تو اس کا ظہور چونکہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی زبان سے ہوا تو نسبت اُن کی طرف کر دی گئی، تو حضرت داؤد علیہ السلام ایسے پیغمبر ہیں کہ جن سے بنی اسرائیل میں سیاسی اقتدار کی اِبتدا ہوئی ہے، ان کی بادشاہت قائم ہوئی اور اس سے اُن کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا، ان کا شان و شوکت کا دور حضرت داؤد علیہ السلام سے شروع ہوا، اور ان کے پیغمبروں کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام یہ آخری پیغمبر ہیں، حضرت عیسیٰ بن مریم بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے آخری نبی ہیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ ان کے اول دور سے لے کر آخر دور تک جو بھی ان میں سے کُفر کرنے والے تھے ہر نبی نے ان کے اوپر لعنت کی، جس لعنت کی ابتداء حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوئی، اور عیسیٰ علیہ السلام پر ان کے پیغمبروں کے سلسلے میں آ کر انتہاء ہوئی، تو گویا کہ ہر دور میں ان میں سے جو کُفر کرنے والے تھے اور اللہ اور اللہ کے رسول کی باتوں کو ماننے والے نہیں تھے اُن پر پھٹکار اور لعنت ہوئی ہے، اور اب یہ نبی آخر الزمان آ گئے، اب بھی بہتر ہے کہ یہ سُدھر جائیں تو لعنت سے بچ سکتے ہیں، ورنہ وہی کردار اگر انہوں نے اپنایا تو اس کتاب کے اندر بھی ان پر لعنت کی جائے گی۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا

یَعْتَدُوْنَ: اور یہ ان کا پھٹکارا جانا اور ان پر لعنت کا ہونا اس وجہ سے تھا کہ انہوں عصیان اختیار کیا، نافرمانی اختیار کی، اس کا تعلق ہو جائے گا اللہ کے اَحکام کے ساتھ، حقوق اللہ کے ساتھ، وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ: اور یہ ظلم اور تعدی کے عادی ہو گئے تھے، اس کا تعلق ہو سکتا ہے حقوق العباد کے ساتھ، یہ حد سے بڑھتے تھے اور عصیان اختیار کرتے تھے اس بنا پر انہیں ملعون ٹھہرایا گیا، پھر یہ نہیں کہ عصیان اگر اختیار کیا تو جب ان کو متنبہ کر دیا گیا تو یہ باز آجائیں، نہیں، پھر اصرار کرتے تھے، جو عادت ایک دفعہ اختیار کر لیتے کتنی بُری عادت کیوں نہ ہوتی، اور پھر اس سے اِن کو کتنا ہی منع کیوں نہ کیا جاتا، لیکن یہ اَڑ جاتے تھے، پھر اس عادت کو چھوڑتے نہیں تھے۔ یہ وجوہ ہیں اِن کے ملعون ہونے کی۔ سعادت مندوہ ہوا کرتا ہے کہ اول تو اللہ کی نافرمانی کرے ہی نہیں، اور اگر کسی وجہ سے اُس سے غلطی ہوگئی، نفس کے تقاضے سے ماحول کے تقاضے سے، بےعلمی سے اگر وہ کسی غلطی کے اندر پڑ گیا پھر جب اللہ کی طرف سے، اللہ کے رسول کی طرف سے، علماء کی طرف سے، نائبینِ انبیاء کی طرف سے جب اُس کو متنبہ کیا جائے تو سمجھ جائے، اپنی عادت کو چھوڑ دے، لیکن یہ بدبخت ایسے تھے کہ کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ: جس بُرے کام کا یہ ارتکاب کر لیتے پھر یہ رُکتے نہیں تھے، ''رُکتے نہیں تھے'' یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، یا ''ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے''، اگر کوئی بُرا کام کر لیتا تو دوسرا آدمی اُس سے مانع نہیں ہوتا تھا، رُکاوٹ نہیں ڈالتے تھے، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ادا کیا گیا ہے۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: جو کچھ یہ کرتے تھے بہت ہی بُری چیز ہے۔

اہلِ کتاب کی مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہمدردی کیوں تھی؟

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہ بھی ان کی اسی قسم کی ایک بدکرداری کا اظہار ہے، اہلِ کتاب خصوصیت کے ساتھ یہود، ان کو مشرکینِ مکہ کے ساتھ ہمدردی تھی اہلِ ایمان کے مقابلے میں، اور پہلے سورۂ نساء کے اندر آپ کے سامنے یہ مضمون تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، جس میں آیا تھا کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (آیت: ۵۱) اُس آیت کے اندر یہ مضمون آیا تھا کہ مشرکین کو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلے میں تمہارا طریقہ زیادہ اچھا ہے، اور ان کے ساتھ ساز باز کر کے اہلِ ایمان کو وہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، اور یہ بھی اِن کے ملعون ہونے کی ایک وجہ ہے، کہ چاہیے تو یہ تھا کہ اِن کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ زیادہ ہوتا، کہ جس طرح سے یہ مدّعیٔ توحید ہیں، مسلمان بھی مدّعیٔ توحید ہیں، جس طرح سے اُصولاً یہ رسالت کے قائل ہیں، یہ بھی رسالت کے قائل، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتابیں اُترنے کے وہ قائل ہیں یہ بھی قائل ہیں، جس طرح سے آخرت کے یہ قائل ہیں یہ بھی قائل، کتنی باتوں کے اندر آپس میں مناسبت ہے، اور کتنی باتوں میں آپس میں قرب ہے، فرق اگر آ کے پڑا ہے تو اسی سے ہی پڑا کہ حضور ﷺ کو انہوں نے قبول نہیں کیا، اور مسلمانوں نے حضور ﷺ کو قبول کر لیا، ورنہ موسیٰ علیہ السلام جیسے اُن کے پیغمبر ہیں ہم بھی انہیں پیغمبر مانتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام جس طرح سے عیسائیوں کے پیغمبر ہیں ہم بھی پیغمبر مانتے ہیں، ہمیں تو اُن کی کسی بات کے ساتھ اختلاف ہے ہی نہیں، اختلاف اگر کیا تو انہوں نے کیا، ہم تو اُن کی تورات کے بھی مُصَدِّق ہیں، اور اُن کے پیغمبر کو بھی اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں، اور اُن کا عظمت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، تو پھر ہمارے مقابلے میں ان کا مشرکین کی جا کر تائید کرنا جو کہ سرے سے

توحید کے مدعی نہیں، آخرت کے قائل نہیں، رسالت کے قائل نہیں، اللہ کی طرف سے کتابیں اُترنے کے قائل نہیں، تو یہ بات سمجھ میں آنے کی نہیں ہے، اِس میں سوائے خباثتِ نفس کے اور کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، ''دیکھتا ہے تو ان میں سے بہتوں کو کہ دوستی لگاتے ہیں کافروں سے'' کافروں سے وہی مشرکینِ مکہ مراد ہیں، لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ: بُری ہے وہ چیز جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجی، وہ کیا آگے بھیجی؟ ''کہ اللہ ناراض ہوا ان پر'' یعنی انہوں نے ایسی چیز آگے بھیجی جس نے اللہ کی ناراضگی کو ثابت کردیا، ''اور عذاب کے اندر یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔ تو اس طرح سے کافروں کی طرف ان کا رُجحان اہلِ ایمان کے مقابلے میں، یہ ان کے باطن کے خراب ہونے کی دلیل ہے۔ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ: اگر ان کا اللہ پہ ایمان ہوتا اور نبی پہ ایمان ہوتا (یہاں نبی سے موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں) اگر اِن کا اللہ پر صحیح ایمان ہوتا، اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہوتا، اور توراۃ پر ایمان ہوتا جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف اُتاری گئی تھی، اگر صحیح طور پر یہ اُن باتوں پر ایمان رکھتے تو کبھی مشرکین کو دوست نہ بناتے، ان کافروں کو دوست نہ بناتے، کیونکہ ایک ایک بات میں ان کافروں کے ساتھ اختلاف ہے، تو پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اللہ کو ماننے والے مشرکوں سے دوستی لگائیں، نبیوں کو ماننے والے منکرینِ نبوّت سے دوستی لگائیں، اور اسی طرح سے اللہ کی کتاب کو ماننے والے اُن لوگوں سے دوستی لگائیں جو سرے سے اللہ کی طرف سے کتاب آنے کے قائل ہی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا صحیح طور پر اللہ پر بھی ایمان نہیں، موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان نہیں اور توراۃ پر بھی ایمان نہیں، اگر ان چیزوں پر ان کا صحیح ایمان ہوتا تو یہ کافروں کو مشرکین کو کبھی دوست نہ بناتے، وَلٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ: لیکن ان کا مزاج ہی فسق و فجور ہے، اس لیے ان کا رُجحان جب ہوتا ہے غلط بات کی طرف ہوتا ہے، ''ان میں بہت سارے لوگ حدِ طاعت سے نکلنے والے ہیں، فاسق ہیں۔''

''أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً'' کا مصداق اور اس کی وضاحت

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ: صرف یہ نہیں کہ مؤمنوں کے مخالف ہی ہیں، بلکہ سب دُنیا کے مقابلے میں عداوت زیادہ سخت رکھنے والے ہیں، ''اے مخاطب! پائے گا تو سب لوگوں میں سے زیادہ سخت ازروئے عداوت کے مؤمنوں کے لیے یہود کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا'' یہ مشرکین اور یہود سب لوگوں سے زیادہ عداوت رکھتے ہیں مؤمنوں کے ساتھ۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی بات ہے، ہمیشہ کے لیے یہ کلیہ نہیں، تو اس آیت کے اندر جو ظاہر کیا گیا کہ یہود سب سے زیادہ عداوت رکھتے ہیں اور مشرک سب سے زیادہ عداوت رکھتے ہیں، تو اس مشرک سے مراد مشرکینِ مکہ ہیں آنے والے دور میں ایسا وقت آسکتا ہے، کہ کوئی مشرک قوم مؤمنوں کے ساتھ بمقابلہ یہود کے ہمدرد ہو، یا جیسے اگلی آیت میں کہا جارہا ہے کہ جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں وہ مؤمنوں کے لیے محبت کے اعتبار سے زیادہ قریب ہیں، یہ بھی اُس دور کی بات ہے، اور ہوسکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آجائے جیسے کہ تاریخ میں آیا کہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی یہی قوم ہوئی جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتی ہے، عیسائیوں کے ہاتھوں ہی سب سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا، لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حالات ایسے تھے کہ یہود اور مشرکین یہ مسلمانوں کے اوّل درجے کے دشمن تھے، اور اس وقت کے نصاریٰ جو تھے ان کا دل مسلمانوں کے حق میں بمقابلہ ان کے نرم تھا، یہ ہمیشہ کے لیے

بات نہیں کہی جارہی کہ ہمیشہ نصاریٰ اقرب ہوں گے مودّت کے اعتبار سے، اور ہمیشہ مشرکین اَبعد ہوں گے، یعنی دشمنی کے اعتبار سے زیادہ سخت ہوں گے، یہ ہمیشہ کے لیے قاعدہ نہیں ہے، اس لیے دُنیا کی ساری قوموں پر یہ بات صادق نہیں آتی۔

انگریز کے خلاف ''ہندو مسلم اتحاد'' اور قرآنی آیات کی وضاحت

یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک بات کا پس منظر نہیں ہے، اس لیے اس حقیقت کو آپ سمجھ نہیں رہے، ہندوستان میں جس وقت انگریز کی حکومت آئی، اور یہ انگریز اپنے آپ کو مذہباً عیسائی قرار دیتے ہیں، ''اِنَّا نَصٰرٰی'' کے یہ مصداق ہیں، اور یہاں جس وقت یہ غاصبانہ آئے اور آ کر انہوں نے پھوٹ ڈال کر اور ہندوستانیوں کو آپس میں لڑا کر حکومت قائم کر لی، غلبہ انہوں نے پالیا، جس طرح سے ڈاکو آتے ہیں اور کسی علاقے کے اوپر قابض ہو جاتے ہیں، تاجر بن کر آئے تھے، اور آ کر مسلمانوں کے اور ہندوؤں کے اور دوسرے لوگوں کے آپس میں اختلافات سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اس ملک کو قبضا لیا، ہتھیالیا، تو اس کے بعد ان کے ساتھ ہندستانیوں کی طرف سے ملک کو آزاد کروانے کے لیے جس وقت مزاحمت شروع ہوئی تو اُس وقت اس جابر اور ظالم قوم سے جان چھڑانے کے لیے نہ تو اکیلے مسلمان ہی کوشش کر کے کامیاب ہو سکتے تھے، اور نہ ہی کوئی دوسری قوم انفرادی کوشش کے اندر کامیاب ہو سکتی تھی، اس لیے یہاں ہندوستان کے اندر ''ہندو مسلم اتحاد'' کا نعرہ لگا، کہ ہندو اور مسلمان آپس میں متحد ہو کر انگریز کو نکالیں، تب یہ نکل سکتا ہے، اور اس کے مقابلے میں ہمیں آپس میں متحد ہو جانا چاہیے، تو ''کانگریس'' کے اسٹیج سے اور اسی طرح سے ''جمعیت علماء ہند'' جو ہمارے اکابر تھے ان کا ذہن بھی اتحاد کا تھا، ''ہندو مسلم اتحاد'' انگریز کو نکالنے کے لیے، اتنی بات تو آپ جانتے ہی ہیں، یہ جس وقت نعرہ لگایا گیا تو کچھ لوگ ایسے تھے جو دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز کے حامی تھے یا انگریز نے انہیں خریدا ہوا تھا، اور اپنے مقاصد کے لیے انہیں آلۂ کار بنایا گیا تھا، اُن کی طرف سے اس جماعت کے ساتھ مزاحمت ہوئی، اُن کا نعرہ یہ تھا کہ ہندو ''مشرک'' ہیں اور انگریز ''اِنَّا نَصٰرٰی'' کا مصداق ہیں، اور قرآن کہتا ہے کہ مسلمان کے لیے سب سے زیادہ سخت عداوت یا یہودی کی ہے یا مشرک کی، اس لیے قرآنِ کریم کی روشنی میں ہندو تو کبھی مسلمان کا خیر خواہ ہو ہی نہیں سکتا، چونکہ یہ اَلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا کا مصداق ہے، اور قرآن کہتا ہے کہ سب سے زیادہ عداوت مسلمانوں کے ساتھ مشرکین کو ہوتی ہے، اور یہ جو قوم ہمارے اُوپر مسلط ہے یہ ''اِنَّا نَصٰرٰی'' کا مصداق ہے، یہ ہمارے لیے محبت کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے، اس لیے جہاں مقابلہ آجائے کہ ایک طرف ہندو ہوں اور ایک طرف یہ عیسائی ہوں ''اِنَّا نَصٰرٰی'' کہنے والے، تو ہمیں چاہیے کہ ہم عیسائیوں کا ساتھ دیں اور مشرکین کا ساتھ نہ دیں، اس لیے ہندو کے مقابلے میں ہمارے لیے انگریز بہتر ہے، تو انگریز کی محبت کا انہوں نے نعرہ لگایا اور قوم کو اِن کے قریب کرنے کی کوشش کی، یہ کہہ کر کہ مشرکوں کے مقابلے میں نصاریٰ مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ہیں، قرآن کہتا ہے کہ یہ ''اقربُ مودۃً'' ہیں، اور مشرکوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ''اشدُّ عداوۃً'' ہیں، اس لیے اگر ایک طرف ہندو ہو، دوسری طرف انگریز ہو تو قرآنِ کریم کی روشنی کے مطابق انگریز کو ہندو کے مقابلے میں ترجیح دینی چاہیے۔ تو بعض لوگ اس طرح سے استدلال کرتے تھے، اور ہندو کے ساتھ اتحاد کر کے انگریز کے خلاف کوشش کرنے کے وہ قائل نہیں تھے، وہ یا انگریز کے

خریدے ہوئے تھے، یا وہ علمی طور پر گمراہی کے اندر مبتلا تھے اور اُن کا دل انگریز کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اور جو صاحب بصیرت لوگ تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ اِس دور میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے یہی عیسائی ہیں، کہاں برطانیہ انگلستان! وہاں سے لے کر ہندوستان تک درمیان کے اندر سارے کا سارا مشرق وسطیٰ، اس پر یہ لوگ مسلط ہو گئے تھے، اور اسلام کو اور مسلمانوں کو دینی، دُنیوی دونوں طور پر ہی برباد کر رہے تھے، اور ہمارے حضرات کا رُجحان یہ تھا کہ جب تک ان کا اَڈّا یہاں ہندوستان سے نہیں اُکھڑے گا (کیونکہ ان کی حکومت جو ہندوستان میں ہے بہت بڑی قوت کی باعث ہے، اسی کے ساتھ ہی وہ سارے راستے پر قابض ہیں) جب تک ان کے قدم ہندوستان سے نہیں اکھیڑے جائیں گے، اُس وقت تک عالم اسلام کی جان بھی ان ظالموں سے نہیں چھوٹ سکتی، اس لیے ان کو ہندوستان سے اکھیڑنا ضروری ہے، تو ساری تگ ودو اُن کی یہ تھی کہ یہاں سے ان کے قدم اکھیڑے جائیں، اور ان لوگوں کی بصیرت کتنی صحیح ثابت ہوئی کہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ ہندوستان سے ان کے قدم اکھڑنے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے سلسلہ وار سارے کے سارے ملک آزاد ہوتے چلے گئے، اور یہ بدبخت اپنے ملک کے اندر محصور ہو کے رہ گئے، سارا عالمِ اسلام آزاد ہو گیا، ورنہ ہندوستان کی قوت کے ساتھ ہی یہ سارے عالمِ اسلام کے اوپر قبضہ جمائے بیٹھے تھے، یہیں کی فوجیں تھی جو ہر محاذ کے اُوپر لڑتی تھیں، اور یہیں کا سرمایہ تھا جو ہر جگہ ان کے لیے مددگار ثابت ہوتا تھا، تو ہندوستان سے ان کے قدم کا اکھڑنا تھا کہ سارا عالمِ اسلام ان کے چنگل سے آزاد ہو گیا، اور یہاں جو ان کے قدم جمے ہوئے تھے، تو یہ بہت بڑی ان کی چھاؤنی تھی، بہت بڑی قوت تھی، اور اس کے ذریعے سے یہ سارے راستے پر قابض تھے، تو ہمارے حضرات کا رُجحان یہ تھا کہ اِس وقت عالمِ اسلام کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ یہی ہیں جو اپنے آپ کو ''عیسائی'' کہتے ہیں یعنی انگریز، ان کے ساتھ مزاحمت ضروری ہے، اور ان کو ملک سے نکالنے کے لیے اپنے ملک کے رہنے والے ہندو چاہے وہ مشرک ہیں ان کے ساتھ اتحادِ عمل ضروری ہے۔ اور جو ان بزرگوں کی مزاحمت کرنے والے لوگ تھے، وہ ان آیتوں کو پڑھ پڑھ کے انگریز دوستی کا سبق دیا کرتے تھے۔ اس لیے میں عرض کر رہا ہوں کہ مفسرین نے یہاں یہ صراحت کی ہے، یہ کوئی کلیہ نہیں کہ ہمیشہ سخت عداوت رکھنے والے یہود اور مشرک ہی ہوں گے، اور ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ محبت کے اعتبار سے اَقرب جو ہیں وہ نصاریٰ ہی ہوں گے، یہ کلیہ نہیں، حضور ﷺ کے زمانے میں حالات ایسے ہی تھے کہ جتنی سخت مزاحمت آپ کو یہود کی کرنی پڑی اور مشرکینِ مکہ کی کرنی پڑی اتنا ٹکراؤ آپ کا عیسائیوں کے ساتھ نہیں ہوا، عیسائیوں کی معتد بہ حکومت اُس وقت حبشہ میں تھی، شاہِ حبشہ نجاشی، جس کا نام اَصْحَمَہ ہے، ''نجاشی'' اس کا لقب تھا، بہت نیک دل بادشاہ تھا، مکہ معظمہ میں جس وقت مسلمانوں کے اوپر مشرکین کے مظالم کی انتہا ہو گئی، تو آپ نے مشورہ دیا تھا کہ تم یہاں سے حبشہ چلے جاؤ، میں نے سُنا ہے کہ وہاں کا بادشاہ بڑا نیک دل ہے، نہ کسی پر ظلم کرتا ہے نہ ظلم کرنے دیتا ہے۔ چنانچہ پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا اور اس طرح سے کوئی دس گیارہ افراد جو تھے وہ مکہ معظمہ سے سب سے پہلے ہجرت کر کے یہ گئے ہیں حبشہ میں، اور پھر اُس کے بعد اَسّی بیاسی آدمیوں کا قافلہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گیا ہے، مشرکین نے اُن کو واپس لانے کے لیے شاہِ حبشہ پر ہر طرح سے اثر ڈالنا چاہا، لیکن جس وقت شاہِ حبشہ نے حالات اُن سے سنے تو اُس نے تائید کی کہ یہ ایک ہی حق ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اور جو یہ پیغمبر پیش کر رہا ہے، تو اُس

نے تائید کی اور مشرکین کو جواب دے دیا تھا، اور مسلمانوں کو واپس نہیں کیا، ہر طرح سے ان کی دلداری کی، اور جب سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے پھر یہ مسلمان مدینہ منورہ میں آئے، تو پھر شاہ نجاشی نے اہلِ علم کا ایک وفد بھیجا تھا جو حضور ﷺ کے پاس حالات کی تحقیق کے لیے آیا، ستر آدمیوں پر مشتمل تھا، جب حضور ﷺ نے انہیں قرآنِ کریم سنایا ہے تو پھر وہ سنتے بھی تھے اور روتے بھی تھے، اور اقرار کرتے تھے کہ واقعی یہ وہی حق ہے جس کی نشاندہی ہمیں ہماری کتابوں میں کی گئی ہے، اور وہ پھر ایمان قبول کر گئے انہوں نے محبت کا اظہار کیا، مسلمانوں کے لیے نرم گوشے کا اظہار کیا، اس لیے اُس وقت کے عیسائیوں کو بمقابلہ یہود اور مشرکوں کے ''اَقْرَبُ مَوَدَّۃً'' قرار دیا جارہا ہے، اس وقت کے حالات یہ تھے، ماضی کے صیغے کے ساتھ ان کو تعبیر کیا گیا، پھر نصاریٰ سے مراد یہاں وہ نصاریٰ ہیں جن کے اندر علم دوست، عالم، تارک الدنیا اور متواضع لوگ موجود تھے، جیسے آگے کہا گیا کہ ان کے اندر کچھ علم کا چرچا ہے، علم دوست لوگ ہیں، تارک الدنیا ہیں، دُنیا کی محبت میں زیادہ مبتلا نہیں، اور یہ لوگ متکبر نہیں ہیں، علم کی وجہ سے اور اس رَہبانیت کی وجہ سے کہ دُنیا کی محبت میں مبتلا نہیں، اور تواضع کی وجہ سے جو ان کے دلوں کے اندر ہے، حق قبول کرنے کی طرف زیادہ قریب ہیں۔ اور موجودہ عیسائی اوّل تو نام کے ''عیسائی'' ہیں، پوری طرح سے نہ اللہ کے قائل، نہ توراۃ کے، نہ کسی دُوسری چیز کے، پھر ان کے اندر نہ وہ علم دوستی نہ وہ ترکِ دُنیا والی بات اور نہ وہ تواضع، بلکہ سب سے زیادہ متکبر یہی لوگ ہیں، سرکش یہی لوگ ہیں، تو نصاریٰ کی جو صفتیں یہاں ذکر کی گئی ہیں یہ بھی موجودہ عیسائیوں پر صادق نہیں آتیں، جس کی بنا پر ان عیسائیوں کو مسلمانوں کے لیے ''اَقْرَبُ مَوَدَّۃً'' قرار نہیں دیا جاسکتا، اور ہر مشرک قوم کو مسلمانوں کے لیے ''اَشَدُّ عَدَاوَۃً'' نہیں قرار دیا جاسکتا۔ تو یہ آیت اُن لوگوں کی مستدل تھی جو کہ انگریز دوستی کا دعویٰ کرتے تھے، اس لیے میں ان لفظوں کی آپ کے سامنے وضاحت کر رہا ہوں۔

دورِ نبوّت کے نصاریٰ کی صفات

اب اِن نصاریٰ کی یہ شان ذکر کی ہے جو کہ علم دوست تھے، تارک الدنیا تھے، متکبر نہیں تھے، کہ ''جب سنا اُنہوں نے اُس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی'' رسول سے سرورِ کائنات ﷺ مراد ہیں، اور اِس سے اُسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو شاہِ حبشہ کا وفد حضور ﷺ کی خدمت میں آیا تھا، اور آپ ﷺ نے اُن کے سامنے قرآنِ کریم پڑھا تھا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ یٰسٓ سنائی تھی، ''جب سنا انہوں نے اُس چیز کو جو اتاری گئی رسول کی طرف، دیکھتا ہے تو اُن کی آنکھوں کو کہ آنسو بہاتی ہیں اُس حق کی وجہ سے جو انہوں نے پہچان لیا'' حق کو پہچان لینے کی وجہ سے اُن کے اُوپر خوشی طاری ہوئی اور اِس خوشی کی وجہ سے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ اب موجودہ عیسائی کون ہیں ایسے کہ جو حق بات کو پہچاننے کے بعد رونے لگ جائیں، اور قرآنِ کریم کو سننے کے بعد اُن کے اُوپر یہ رقت طاری ہوجائے۔ ''اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے'' **فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ**: ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے، کیا مطلب؟ کہ تُو نے ہمیں جو شہداء اللہ بنایا ہے، اور ہمیں تُو نے اپنی کتاب کے اندر مکلف کیا ہے کہ ہم ہمیشہ حق کے اُوپر گواہی دیں، آج ہم اس حق کو پہچان کر گواہی دیتے ہیں کہ یہ جو تیری طرف سے

آیا ہے ٹھیک ہے، ہمیں ان گواہوں کے اندر لکھ لے، ہم شہداءاللہ کا منصب ادا کر رہے ہیں، ہمارے اُوپر حق کی شہادت دینے کی جو ذمہ داری آتی ہے ہم اس شہادت کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں، ''لکھ لے ہمیں شاہدین کے ساتھ''۔ اور پھر اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ ''کیا وجہ ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اُس چیز پر جو حق ہمارے پاس آ گیا، اور اُمید یہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ داخل کرے ہمیں قومِ صالحین میں'' اللہ تعالیٰ قومِ صالحین کے ساتھ شامل کر لے، اُمید تو ہمیں یہ ہو، اور ایمان ہم لائیں نہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر صالحین لوگوں کے ساتھ داخل ہونا چاہتے ہیں، تو پھر ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور اس حق پر ایمان لائیں جو ہمارے پاس آ گیا۔ تو جب انہوں نے زبان سے اقرار کیا، دل سے عقیدہ اِس کے مطابق رکھ لیا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا، بِمَا قَالُوْا: بِمَا اعْتَقَدُوْا جو انہوں نے عقیدہ بنایا، کیونکہ صرف قول کافی نہیں جب تک کہ قلب سے عقیدہ نہ ہو، اور انہوں نے جو کچھ ایمان کے اظہار کے طور پر کہا یہ صرف قول ہی نہیں تھا، بلکہ دل میں عقیدہ بھی تھا ''جو بات انہوں نے کہی'' یعنی یہی کہ اے اللہ! ہم ایمان لے آئے، ''جو بات انہوں نے کہی'' یعنی جس عقیدے کا اظہار انہوں نے اپنے لفظوں میں کیا، ''اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بدلہ دیا باغات کا، جاری ہیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں'' وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ: اور جو بھی احسان کا کردار ادا کرتا ہے، احسان کی کیفیت پیدا کر لیتا ہے، نیکو کاروں میں سے ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کو بدلہ ایسے ہی دیتے ہیں، ''یہی جزا ہے نیکو کاروں کی۔'' وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ: اور جن لوگوں نے کُفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، یا: جو لوگ کُفر کرتے ہیں اور ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں یہی جہنم والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

سوال:- مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو ''ہندو مسلم اتحاد'' کے قائل نہیں تھے۔

جواب:- وہ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے تو واقعی قائل نہیں تھے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ بھی اتحاد کے قائل نہیں تھے، اُن کا خیال یہ تھا کہ ہندو قابلِ اعتماد نہیں، یہ وقت پر دھوکا دے جائے گا، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ سارے کے سارے اکٹھے ہو کر اپنی انفرادی کوشش کریں۔ ورنہ یہ جو مضمون میں نے آپ کے سامنے ادا کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی اس آیت سے لوگوں نے اِستدلال کیا کہ نصاریٰ ''اقربُ مودۃً'' ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نظریے کی ''بیان القرآن'' کے اندر پوری تردید کی ہے، اور یہ ساری کی ساری تقریر جو میں آپ کے سامنے کر رہا ہوں، یہ ساری ''بیان القرآن'' سے ماخوذ ہے، کہ حضرت نے فرمایا کہ اس آیت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، کہ ہر دور کے اپنے آپ کو ''نصاریٰ'' کہلانے والے ایسے ہی ہوں گے، اوّل تو یہ جو اپنے آپ کو ''نصاریٰ'' کہلاتے ہیں ان کے وہ عقائد و نظریات نہیں ہیں، دُوسرے ان کے اندر یہ صفتیں نہیں پائی جاتیں، قِسِّيْسِيْنَ والی، رُہبان والی اور عدمِ اِستکبار والی، یہ صفتیں نہیں پائی جاتیں، لہٰذا جن لوگوں نے استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں کیا، تو اس بات کی تردید انہوں نے کی ہے، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ ان کو آپس میں متحد ہو کر انفرادا کوشش کرنی چاہیے، اور اگر ہندوؤں کے ساتھ مل کر کوشش کریں گے تو ہندوؤں کو چونکہ اکثریت حاصل ہے، اور

یہ مسلمانوں کے حق میں مخلص نہیں ہیں، تو انگریز کو نکالنے کے بعد مسلمانوں پر یہ قبضہ جما کر مسلمانوں کو اسی طرح سے ذلیل کریں گے جس طرح سے کہ انگریز کر رہا ہے، اس خیال سے وہ مسلمانوں کے انفراداً کوشش کرنے کے قائل تھے، اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کے قائل نہیں تھے، ورنہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ انگریزوں کے ساتھ اتحاد کے قائل تھے، اور ہندوؤں کے مقابلے میں وہ انگریزوں کی حکومت کو پسند کرتے تھے، اس قسم کی بات بھی نہیں ہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو چونکہ عملی سیاست کا تجربہ نہیں تھا، عملی سیاست میں انہوں نے کام کیا نہیں، اور سیاست ایک میدان ہی ایسا ہے کہ جس وقت تک انسان اس میں نہ اُترے اس کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف نہیں ہوسکتا، اس لیے علمائے دیوبند اکثریت قریب الکل حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ان نظریات سے اتفاق نہیں رکھتی تھی، اُن کے سامنے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا جو نظریہ تھا وہ راجح تھا، کہ نہیں! یہ وقت ایسا ہے کہ مسلمان اکیلے کوشش کر کے اس ظالم، جابر حکومت سے جان نہیں چھڑا سکتے، ان کو نکالنے کے لئے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اس کوشش کے اندر اتحاد ضروری ہے، تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ جو نظریہ تھا علمائے دیوبند نے اسی کو قبول کیا، اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ساتھ اِس نظریے میں علمائے دیوبند نے نہیں دیا۔ آپؒ کے مُرید اور آپؒ سے تعلق رکھنے والے وہ تو حامی تھے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے، لیکن حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ہم پایہ علماء یا آپ سے بڑے جتنے بھی تھے دیوبند سے تعلق رکھنے والے، وہ سارے کے سارے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے خیال کے حامی تھے، اور نتیجتاً صورت یہی مفید رہی کہ جس درجے میں اتحاد ہوا اتنے درجے میں ہی گویا کہ کامیابی ہوئی، اور واقعہ ایسے ہی ہے کہ اگر ہندو مسلم دونوں مل کر آزادی کے لئے کوشش نہ کرتے تو شاید انگریز سے جان نہ چھوٹتی۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ پر یہ بات صادق نہیں آتی کہ وہ انگریز کے حامی تھے، انگریز کے حامی نہیں تھے، البتہ ہندوؤں پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے انفراداً کوشش کرنے کے حامی تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ
اے ایمان والو! جو چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اُن میں سے پاکیزہ ستھری چیزوں کو حرام نہ ٹھہرایا کرو، اور حد تجاوز نہ کرو،
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۸۷ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا
بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ۸۷ اور کھایا کرو اُس چیز میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہے حلال
طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۸۸ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ
پاکیزہ، اور اللہ سے ڈرتے رہو ایسا اللہ کہ جس پر تم ایمان لاتے ہو ۸۸ نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے

بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ

ایسے لغو کے سبب سے جو تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، لیکن مؤاخذہ کرے گا تم سے تمہارے قسموں کو پختہ کرنے کے سبب سے،

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ

پھر کفارہ اس قسم کا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، جو کچھ تم اپنے اہل کو کھلاتے ہو اس کے درمیانے

اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

درجے سے، یا ان دس مسکینوں کا لباس ہے یا غلام کا آزاد کرنا ہے، پھر جو شخص نہ پائے پھر اُس کے ذمے ہے تین دن کا

ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا

روزہ رکھنا، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جس وقت کہ تم قسمیں اُٹھاؤ، اور اپنی قسموں کی

اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

حفاظت کیا کرو، ایسے ہی واضح کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی نشانیاں تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ﴿۸۹﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ

اے ایمان والو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ خمر اور جُوا اور بُت اور جوئے کے تیر

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا

یہ ناپاک ہیں شیطان کے عمل سے ہیں، پس ان میں سے ہر کام سے بچو تاکہ تم فلاح پا جاؤ﴿۹۰﴾ اس کے سوا کچھ نہیں

يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ

کہ شیطان یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے شراب

وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور جوئے کے سبب سے، اور روک دے تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے، پھر کیا تم رکنے والے ہو؟﴿۹۱﴾

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا

اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، اور بچتے رہو، پھر اگر تم نے پیٹھ پھیری تو یقین کرلو

اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

کہ ہمارے رسول کے ذِمّے تو صرف کھول کھول کر پہنچادینا ہی ہے ﴿۹۲﴾ نہیں ہے اُن لوگوں پر جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل

الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

کیے کوئی گناہ اس چیز میں جو انہوں نے کھائی جس وقت کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے

ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع

پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور نیکی کی، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں ﴿۹۳﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ: اے ایمان والو! حرام نہ ٹھہرایا کرو، لَا تُحَرِّمُوْا، حرام نہ ٹھہراؤ، مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ: جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا، طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ: جو چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان میں سے پاکیزہ ستھری چیزوں کو حرام نہ ٹھہرایا کرو، وَلَا تَعْتَدُوْا: اور حد سے تجاوز نہ کرو، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا: اور کھایا کرو اس چیز میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہے حلال پاکیزہ، وَّاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ سے ڈرتے رہو، الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ: ایسا اللہ کہ جس پر تم ایمان لاتے ہو، لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ: نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے بسبب لغو کے جو تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، بِاللَّغْوِ كَائِنًا فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ، نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے ایسے لغو کے سبب سے جو تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ: لیکن مؤاخذہ کرے گا تم سے، بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ: ''مَا'' مصدریہ ہے، اور عَقَّدْتُّمْ یہ تَعْقِيْدُكُمْ کے معنی میں ہوجائے گا، تَعْقِيْدُكُمُ الْاَيْمَانَ، تمہارا قسموں کو پختہ کرنا۔ ''تمہارے قسموں کو پختہ کرنے کے سبب سے اللہ تعالیٰ تم سے مؤاخذہ کرے گا'' فَكَفَّارَتُهٗٓ: پھر کفارہ اُس قسم کا، اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ: دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ: جو کچھ تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو اس کے درمیانے درجے سے، ''جو کچھ تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو اس کے درمیانے درجے سے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے'' اَوْ كِسْوَتُهُمْ: یا ان دس مسکینوں کا لباس ہے، اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ: یا غلام کا آزاد کرنا ہے، فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ: پھر جو شخص ان تینوں چیزوں میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، نہ کھانا کھلانے کی ہمت ہے، نہ لباس دینے کی، نہ تحریر رقبہ کی، فَعَلَيْهِ صِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ، علیہ یہ خبر محذوف نکالیں گے، اور صِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ یہ مبتدأ ہے۔ ''پھر اس کے ذمے ہے تین دن کا روزہ رکھنا'' اور یہ تین دن مسلسل مراد ہیں، درمیان میں ناغہ نہ ہو، ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ: یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جس وقت کہ تم قسمیں اٹھاؤ، وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ: اور اپنی قسموں کی نگرانی کرو، اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ: ایسے

ہی واضح کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی نشانیاں، اپنے اَحکام، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تاکہ تم شکرگزار ہوجاؤ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا: اے ایمان والو! اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ خمر یعنی شراب اور جوا اور بُت۔ اَنصاب یہ نُصُب کی جمع ہے گاڑی ہوئی چیز، یعنی جس کو عبادت کرنے کے لئے پُوجنے کے لئے گاڑلیا جائے، چاہے وہ بُت ہو کسی شکل پہ تراشا ہوا، چاہے کوئی درخت ہو، چاہے کوئی لکڑی ہو، کچھ بھی ہو۔ وَالْاَزْلَامُ: ازلام یہ زَلَمْ کی جمع ہے، جوئے کے تیر۔ یہ لفظ پہلے آچکا ہے پیچھے استقسام بالازلام کے تحت، رِجْسٌ: یہ ناپاک ہیں نجس ہیں، مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ: شیطان کے عمل سے ہیں، فَاجْتَنِبُوْهُ: پس ان میں سے ہر کام سے بچو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ شیطان یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان عداوت اور بُغض ڈال دے، فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ: خمر اور میسر کے سبب سے۔ ''فی'' سببیہ ہے۔ میسر: جوا۔ شراب اور جوئے کے سبب سے۔ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ: اور روک دے تمہیں اللہ کی یاد سے وَعَنِ الصَّلٰوةِ: اور نماز سے، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ: پھر کیا تم رُکنے والے ہو؟ باز آنے والے ہو؟ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی، وَاحْذَرُوْا: اور ڈرتے رہو، بچتے رہو۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ: پھر اگر تم نے پیٹھ پھیری، فَاعْلَمُوْۤا: تو یقین کرلو، اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ: کہ ہمارے رسول کے ذِمّے صرف کھول کھول کر پہنچا دینا ہی ہے۔ اَنَّمَا حصر کا فائدہ دیتا ہے تو حصر کو اِن الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے کہ ''ہمارے رسول کے ذِمّے تو صرف کھول کھول کر پہنچا دینا ہی ہے۔'' لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: نہیں ہے ان لوگوں پر جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے، جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا: نہیں ہے ان پر کوئی گناہ اس چیز میں جو انہوں نے کھائی، اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: جس وقت کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، اور پھر تقویٰ اختیار کیا اور صفتِ احسان کو اپنایا، اَحْسَنُوْا: انہوں نے نیکی کی، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: اللہ تعالیٰ اِحسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ: شروع سورت میں آپ کے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حلال وحرام کے متعلق کچھ اَحکام دیئے تھے، اور تاکید کی تھی کہ حرام سے بچو اور حلال کھاؤ۔ اب ان آیات کے اندر پھر کچھ انہی اَحکام کی وضاحت کی طرف عود ہے۔ ماقبل کے ساتھ قریبی مناسبت یوں ہوسکتی ہے کہ پچھلے پارے کی آخری آیت میں رُہبان کا ذکر آیا تھا، اور یہ تقریباً مقامِ مدح میں ہے، اہلِ علم رُہبان وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ، یہ ذکر جو آیا تھا یہ مدح کے مقام میں ہے، اور رَہبانیت کی تعریف بایں معنیٰ تو ہے کہ اس میں دُنیا سے محبت نہیں ہوتی اور ترکِ دُنیا ان لوگوں نے اپنایا تھا، دُنیا کو چھوڑ دیا، دُنیا کی محبت میں مبتلا نہ ہوئے،

اس پہلو کے ساتھ وہ قابلِ تعریف ہیں کہ حبِّ دنیا کے اندر مبتلا نہیں، اور انہوں نے دُنیا کو اپنے سے دُور کر دیا، اور مجاہدہ اور ریاضت کر کے اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اپنا لیا، جیسا کہ آپ کے سامنے ستائیسویں پارے کے آخری رکوع میں آئے گا: ''وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا'': کہ رہبانیت ہم نے ان کے اُوپر فرض نہیں کی تھی، انہوں نے خود گھڑی، ابْتَدَعُوهَا: یہ نیا طریقہ انہوں نے خود نکالا، لیکن نکالا کس جذبے سے تھا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ: اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے، فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا: پھر وہ اس کی رعایت نہیں رکھ سکے جس طرح سے کہ رعایت رکھنی چاہیے تھی، جذبہ بہرحال اچھا تھا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ، اس لیے انہوں نے یہ طریقہ گھڑا تھا کہ دُنیا کو چھوڑ کر ایک طرف ہو گئے، اور رہبانیت کے اندر یہ بات بھی خاص طور پر موجود تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ بہت ساری نعمتیں بہت سارے لذائذ سے وہ لوگ فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے، اُن کو اپنے اُوپر حرام کر لیتے، مثلاً شادی نہیں کرتے تھے، اچھا کھانا نہیں کھاتے تھے، اچھا لباس نہیں پہنتے تھے، اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، یہ پہلو اس میں قابلِ اعتراض ہے، تو اب یہ چونکہ رہبانیت کا ذکر آیا تھا تو کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ شاید وہ بجمیع جوانبہ عنوان قابلِ تعریف ہے، رہبانیت کا طریقہ اور راہب بننا کوئی اچھی بات ہے، اس لیے یہاں مسلمانوں کو اَحکام دے دیئے گئے کہ راہبوں کی طرح حلال چیزوں کو اپنے اُوپر حرام نہ ٹھہرایا کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے لیے حلال کی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھاتے رہو۔ اس طرح سے مناسبت ہو جائے گی ماقبل کے ساتھ قریبی آیات سے، ورنہ شروع سورت میں جو ایفائے عہد کی تاکید آئی تھی، اور اس کے تحت حلال اور حرام کا تذکرہ ہوا تھا، تو یہ آیات اسی کی وضاحت پر مشتمل ہیں۔

تحریم کی تین صورتیں اور ان کے اَحکام

''حرام نہ ٹھہرایا کرو'' حرام ٹھہرانے کی تین صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ کسی حلال چیز کو عقیدۃً ہی حرام سمجھنے لگ جائیں۔ اور ایک یہ ہے کہ قسم کھا کر اُس کو اپنے اوپر حرام کر لیں، عقیدۃً تو ہم سمجھتے ہیں کہ حلال ہے لیکن قسم کے ذریعے ہم اُس کو اپنے اُوپر حرام کر لیں۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ قسم کے ذریعے سے بھی حرام نہ کریں عقیدۃً بھی حرام نہ جانیں لیکن اُس کے ساتھ معاملہ حرام جیسا کریں کہ اُس کو استعمال بالکل نہ کریں، یہ تین درجے ہیں اور ان تینوں کا حکم یہ ہے کہ:

۱۔ پہلا درجہ کہ کسی حلال چیز کو عقیدۃً حرام قرار دینا، اس میں دیکھنا یہ ہے کہ وہ حلال چیز قطعی طور پر حلال ہے، یا اس کی حلت ظنی اور اجتہادی طور پر ثابت ہے؟ اگر وہ چیز ایسی ہے کہ اُس کی حلت قطعیت کے درجے کی ہے، دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہے، قرآنِ کریم میں صاف آ گیا کہ یہ چیز حلال ہے، جیسے بکری حلال ہے، بھیڑ حلال ہے، گائے حلال ہے، بشرطیکہ اللہ کے نام پر ذبح کی گئی ہو، اور غیر اللہ کے لیے اُس کی نذر و نیاز نہ مانی گئی ہو (جس قسم کی قیود آپ کے سامنے آئی ہیں) تو جو چیزیں قطعی طور پر حلال ہیں، تو ایسی کسی چیز کو اگر کوئی شخص عقیدۃً حرام قرار دے لے تو وہ شخص کافر ہو جاتا ہے، کیونکہ اس میں قطعیات کا انکار ہے، یہ تحریم تو کفر ہے۔ اگر وہ چیز قطعی طور پر حلال ہے، اس کا حلال ہونا دلائل قطعیہ کے ساتھ ثابت ہے، تو اُس کو عقیدۃً حرام قرار دینا کفر ہے،

کیونکہ تحریم حلال یا تحلیلِ حرام یہ دونوں منصب اللہ تعالیٰ کے ہیں، کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ کسی حلال چیز کو حرام ٹھہرادے یا کسی حرام چیز کو حلال ٹھہرادے، تو یہ شخص تو کافر ہے اگر ایسی چیز کو وہ حرام سمجھتا ہے جس کا حلال ہونا قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔

۲- دُوسرے نمبر پر کہ عقیدۃً تو حلال جانتا ہے لیکن اپنے اُوپر پابندی لگالیتا ہے اور اپنے اُوپر اُس کو حرام کرلیتا ہے، ''قسم'' کا لفظ بولے یا نہ بولے، کیونکہ کسی حلال چیز کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرالینا یہ خود قسم ہے، مثلاً دُودھ کے متعلق کوئی کہتا ہے کہ ''میں اس کو اپنے اُوپر حرام قرار دیتا ہوں، میں دُودھ نہیں پیوں گا!'' یا قسم کھالیتا ہے کہ ''میں گوشت نہیں کھاؤں گا!'' یہ دونوں چیزیں قسم کے حکم میں ہیں، چاہے صراحتاً اس میں ''قسم'' کا لفظ آیا ہے، چاہے صراحتاً ''قسم'' کا لفظ نہیں آیا، قول کے ذریعے سے تحریمِ حلال، چاہے عقیدۃً وہ اس کو حلال سمجھتا ہے، یہ قسم ہے، تو پھر ایسی قسم کا توڑنا ضروری ہے، اور قسم کے توڑنے کی صورت میں پھر اس کو کفارہ دینا پڑے گا، جس کی تفصیل اگلی آیات میں آرہی ہے (اور قسم کے کفّارے کی آیت کی مناسبت ماقبل کے ساتھ یہی ہے کہ چونکہ تحریم کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو قسم کے ذریعے سے انسان اپنے اُوپر عائد کرتا ہے تو اس قسم کے ازالے کی تدبیر بتادی) تو اس کا کفارہ دیا جائے گا کفّارے کی تفصیل آپ کے سامنے آرہی ہے۔

۳- اور تیسری صورت یہ ہے کہ عقیدۃً بھی اس کو حلال جانتا ہے، اور قول کے ساتھ بھی اپنے اُوپر اُس کو حرام نہیں ٹھہرایا، لیکن معاملہ اُس کے ساتھ ایسے کرتا ہے کہ جس طرح سے حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس سے پرہیز کرتا ہے، احتیاط کرتا ہے، اُس کو زندگی بھر استعمال نہیں کرتا، یہ اگر کسی مصلحتِ شرعی یا طبّی کی وجہ سے ہے تو جائز ہے، ورنہ پھر یہ بُری بات ہے، مصلحت شرعی کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں یہ چیز کھاؤں گا تو شرعی طور پر میں کسی قباحت میں مبتلا ہوجاؤں گا، اس کا ترک کرنا ہی میری رُوحانیت کے لیے مفید ہے۔ جیسے ایک آدمی غیرشادی شدہ ہے، اور شادی کے اسباب اُسے مہیا نہیں ہیں، اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر انڈے، گوشت اور اس قسم کے مقویات میں استعمال کروں گا تو کسی فتنے میں واقع ہونے کا ڈر ہے، طبیعت میں قوت آجانے کی وجہ سے وسوسے آئیں گے، اور آگے تدبیر میرے بس کی بات نہیں، تو اگر وہ اس لیے ان گرم اشیاء کو یا مقوی اشیاء کو یا محرّک اشیاء کو چھوڑتا ہے تاکہ میں پریشانی کے اندر مبتلا نہ ہوجاؤں اور فتنوں کا شکار نہ ہوجاؤں، اس طرح سے اس کا ترک کرنا جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں باعثِ ثواب ہے۔ اور اسی طرح سے طبّی مصلحت کے طور پر! کہ تجربے کے ساتھ ثابت ہوگیا کہ دُودھ آپ کے لیے نقصان دہ ہے، جس وقت آپ دُودھ استعمال کرتے ہیں بیمار ہوجاتے ہیں، یا کوئی دال آپ استعمال کرتے ہیں تو دال کے ساتھ آپ کو تکلیف ہوجاتی ہے، کوئی سبزی آپ استعمال کرتے ہیں تو موافق نہیں آتی، پیچش لگ جاتے ہیں یا اِسہال ہوجاتے ہیں، یا پیٹ میں درد ہوجاتا ہے، تو یہ تجربہ ہوجانے کے بعد زندگی بھر اُس کو ترک کردیا جائے اور استعمال نہ کیا جائے، جبکہ زبان سے اس کو حلال بھی کہا جائے، عقیدۃً اُس کو حلال بھی جانا جائے، تو طبّی مصلحت کے طور پر بھی کسی چیز کو اگر عملاً چھوڑ دیا جائے تو یہ ٹھیک ہے، ہاں! البتہ اُس کے ترک کو ثواب سمجھنا کہ اس کا نہ کھانا باعثِ ثواب ہے، اس کے اندر پھر بدعت والا معنی پیدا ہوجائے گا، یہ ٹھیک نہیں، یعنی ایک دُنیوی تدبیر کے طور پر چاہے وہ رُوحانی ہے، چاہے وہ جسمانی ہے، آپ اُس کو ترک کردیں، لیکن اس ترک کرنے

کو ثواب نہ قرار دیں کہ یہ شریعت کا مسئلہ ہے کہ اس کو استعمال نہیں کرنا، ایسی صورت میں وہ جائز ہے، اور اگر اس کو ثواب سمجھنے لگ جائیں گے تو پھر اس کے اندر کچھ بدعت والا معنی پیدا ہو جائے گا۔

یہ تحریم کی تینوں صورتوں کے اَحکام آپ کے سامنے ذکر کر دیئے گئے، اور یہاں یہ تینوں ہی شامل ہو سکتی ہیں، حاصل اس کا یہ ہے کہ اللہ نے جو چیزیں تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں وہ پیدا ہی تمہارے لیے کی ہیں، تمہارے نفع کے لیے کی ہیں، تم ان سے فائدہ اُٹھاؤ، فائدہ اُٹھانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگو، ان میں سے جو عمدہ پاکیزہ چیزیں ہیں، تمہاری مرغوب فیہ ہیں، ان کو تم حرام نہ ٹھہرایا کرو، نہ تو عقیدۃً اُن کو حرام جانو اور نہ قسم کے ذریعے سے اُن کو اپنے اُوپر حرام کرو، اور نہ زندگی بھر ان کے ساتھ نیکی سمجھ کر اور ثواب سمجھ کر حرام والا معاملہ کرو، تینوں صورتوں کو یہ لفظ شامل ہو سکتا ہے۔ طیبات کا ذِکر ترغیب کے طور پر کر دیا کہ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ میں سے جو مرغوب فیہ چیزیں ہیں، پاکیزہ چیزیں ہیں، لذیذ چیزیں ہیں، اُن کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرا کر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے خواہ مخواہ محروم کیوں ہوتے ہو۔

''لَا تَعْتَدُوْا'' کے دو مفہوم

وَلَا تَعْتَدُوْا: حد سے تجاوز نہ کرو، اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام ٹھہرا لینا یہ عبدیت کی حد سے تجاوز کرنا ہے، بندے کا کام نہیں ہے کہ اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیز کو حرام ٹھہرائے، یہ حد سے تجاوز ہے، تو حد سے تجاوز نہ کیا کرو، اِن حدوں کو نہ پھلانگو، یہ حدیں پھلانگنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے، لَا تَعْتَدُوْا: حد سے تجاوز نہ کرو، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر لَا تَعْتَدُوْا سے دوسرا پہلو مراد لے لیا جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے، اگرچہ تبادر اِس لَا تَعْتَدُوْا کا مفہوم یہی ہے کہ حلال کو حرام ٹھہرا کر حد سے نہ گزرو۔ دوسرے پہلو کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے حلال کو حرام ٹھہرانے کی ممانعت آ گئی، اسی طرح سے ایسا بھی نہ ہو کہ تم کسی حرام کے ساتھ حلال جیسا معاملہ کرنے لگ جاؤ، یہ بھی حد سے تجاوز ہے، حلال چیز کو حرام بھی نہ کیا کرو، اور اسی طرح سے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز ہے اس کے ساتھ حلال والا برتاؤ نہ کیا کرو، لَا تَعْتَدُوْا کے مفہوم میں اس کو بھی داخل کیا جا سکتا ہے۔

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ: جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے حلال اور طیب کھایا کرو، حلال اور طیب: پاکیزہ، ستھرا، لذیذ، جس کی طرف تمہاری طبیعت راغب ہے، کھایا کرو، اس سے فائدہ اٹھایا کرو، وَّاتَّقُوا اللّٰهَ: اور اللہ تعالیٰ سے تم ڈرتے رہا کرو جس کے ساتھ تم ایمان لانے والے ہو، جس اللہ پر تمہارا ایمان ہے اُس سے ڈرتے رہو، ڈرنے کا بھی یہاں یہ معنی ہے کہ اُس کے اس منصب کے اندر دخل نہ دو، تحریم حلال یہ اللہ کا کام ہے، کسی چیز کو حرام ٹھہرانا یہ اللہ کا منصب ہے، ڈرتے رہو، اس کے اندر کسی قسم کی گڑبڑ نہ کرو، تصرف نہ کرو، یہ تاکید اس لیے کی جا رہی ہے کہ مشرکین بہت ساری چیزوں کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرا لیتے تھے، اپنے بتوں کی خوشی کے لیے، اور اس طرح سے نذر و نیاز کے ذریعے سے، جس طرح سے آگے آئے گا مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ یہ الفاظ آگے آ رہے ہیں، تو وہ ایسے جانور رکھتے تھے جن کو بتوں کی طرف منسوب کر کے اپنے اُوپر حرام ٹھہرا لیتے، اور

سورۂ انعام کے اندر بھی کچھ تفصیل آئے گی، اور اسی طرح سے بعض موقعوں پر لباس پہننے کو بھی وہ حرام قرار دے دیتے تھے، بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے جاتے تو لباس نہیں پہنتے تھے، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں آئے گی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں جو پیدا کی ہیں، جن سے نفع اٹھانا تمہارے لیے حلال کر دیا ہے، چاہے وہ برتنے کی چیزیں ہیں، چاہے کھانے کی ہیں، چاہے پینے کی ہیں، ان کو استعمال کرو اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔

''قسم'' کی اَقسام اور ان کے اَحکام

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ: اب تحریم کی ایک صورت چونکہ ''قسم'' سے بھی تعلق رکھتی ہے تو اسی مناسبت سے آگے قسم کا مسئلہ واضح کیا جا رہا ہے، اور پہلے اس کے متعلق سورۂ بقرہ میں کچھ اَحکام آ چکے ہیں۔ ''قسم'' تین قِسم پر ہوتی ہے، فقہی نقطۂ نظر سے قسم کی تین قسمیں ہیں، ایک یمینِ لغو، اور ایک یمینِ غموس، اور ایک یمینِ منعقدہ۔

''یمینِ لغو'' بے ہودہ قسم، اس کا مطلب دو طرح سے ادا کیا جاتا ہے، یا تو یہ ہے کہ قسم اُٹھانے کا ارادہ نہیں ہے، قلب متوجہ نہیں ہے، ایسے ہی عادت کے طور پر زبان کے اُوپر قسم جاری ہو گئی، انسان بات کرتا ہے اور بلا قصد زبان پر قسم کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں، وہاں قسم اُٹھانی مقصود نہیں ہوتی، یہ بھی لغو ہے، ''لغو'' کا مطلب ہے کہ اس پر گرفت نہ دُنیا میں نہ آخرت میں، اگرچہ عادت اچھی نہیں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت کو ٹھیس پہنچتی ہے، کیونکہ قسم ایک بہت بڑی بنیاد ہے آپس میں معاہدے کو پختہ کرنے کے لیے اور دوسرے معاملات کو طے کرنے کے لیے، اس کو زیادہ استعمال کرنا اس کو بے وقعت کرنا ہے، اس لیے زیادہ قسمیں اُٹھانا اچھی بات نہیں ہے، لیکن اگر کسی کی زبان پہ اس طرح سے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں اور قسم اُٹھانے کا ارادہ نہیں ہے تو شریعت اس کو کسی اعتبار میں نہیں لاتی، نہ دُنیا میں اس پر کوئی گرفت ہے نہ آخرت میں اس پر کوئی گرفت ہو گی۔ ایک صورت تو یہ ہے ''یمینِ لغو'' کی۔

اور دوسری صورت ''یمینِ لغو'' کی یہ ہے کہ آپ ماضی کے کسی واقعے پر قسم کھاتے ہیں، اور اپنے خیال کے مطابق ٹھیک قسم کھاتے ہیں، لیکن تحقیق سے وہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے، یہ یمین بھی لغو ہے، اس کے اُوپر بھی کوئی گرفت نہیں، جیسے ایک آدمی کو آپ نے آتے ہوئے جاتے ہوئے دیکھا، اور آپ نے اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھ لیا کہ یہ زید ہے، اور یہ گھر گیا ہوا تھا آ گیا، آپ اپنے طور پر صحیح سمجھ بیٹھے، کہ وہ آ گیا ہے، اور یہ زید جا رہا ہے، کسی نے آپ سے پوچھ لیا کہ زید آ گیا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں آ گیا، اور اپنی بات کو پختہ کرنے کے لیے آپ نے قسم بھی کھالی، اور یہ کہہ دیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ آ گیا، اب آپ اپنے خیال کے مطابق بات ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن بعد میں تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ کو اِشتباہ ہوا، وہ تو کوئی دُوسرا آدمی تھا جس کو آپ نے زید سمجھ لیا، تو چونکہ آپ نے اپنے خیال کے مطابق قسم ٹھیک کھائی ہے اس لیے شریعت اس کو عذر قرار دیتی ہے، اور دنیا اور آخرت میں اس قسم کے اوپر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ یمینِ لغو کی تو یہ دو صورتیں ہیں، ان پر مؤاخذہ بالکل نہیں، نہ دُنیا میں نہ آخرت میں۔

اور ایک ہے ''یمینِ غموس''، غَمَسَ کا معنی ہوتا ہے ڈبو دینا۔ ''إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ'' فقہ میں جو عبارت آیا کرتی ہے، اور حدیث شریف میں جو الفاظ آتے ہیں، کہ سوئے ہوئے اُٹھو تو بغیر ہاتھ دھوئے ہوئے برتن میں ہاتھ نہ ڈال دیا کرو۔[1] غَمَسَ ڈبو دینے کو کہتے ہیں، غَمُوس صَبُور کی طرح مبالغے کا صیغہ ہے، ''یمینِ غموس'' کا معنی ہوگا ڈبو دینے والی، اللہ کے غضب میں غوطہ دے دینے والی، جہنم کے عذاب میں غوطہ دے دینے والی قسم، یہ ہے جس کو انسان قصداً ماضی کے واقعے پر جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے، قصداً جھوٹ بولتا ہے، ایک کام آپ نے کیا ہے، آپ کو پتا ہے کہ کیا ہے، آپ کو یاد ہے کہ کیا ہے، اور کوئی پوچھتا ہے کہ آپ نے یہ کام کیا ہے؟ آپ قسم کھا کر کہہ دیتے ہیں کہ میں نے نہیں کیا! یا ایک کام آپ نے نہیں کیا، آپ کے ذمے لگایا گیا تھا، اور پھر آپ سے پوچھا گیا کہ آپ نے کرلیا؟ آپ کہتے ہیں: ہاں جی کرلیا! اور قسم اُٹھا دیتے ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ آپ غلط بیانی کر رہے ہیں اس کو ''یمینِ غموس'' کہتے ہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کبائر گناہوں کے اندر شمار کیا ہے،[2] یہ کبیرہ گناہ ہے، اور اس کی سزا آخرت میں ہوگی، اور اس پہ مطالبہ توبہ کا اور اِستغفار کا ہے، جس طرح سے باقی کبیرہ گناہوں کے متعلق ہوتا ہے، تو اگر کوئی شخص توبہ و اِستغفار کرے تو آگے اللہ کی مشیت ہے کہ قبول کرلے نہ کرے، وہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے، تو توبہ اور اِستغفار کا آپ سے مطالبہ ہے، توبہ اور اِستغفار کے علاوہ اس کا کوئی علاج نہیں، باقی اگر صحیح معنی میں آپ نے ندامت اختیار کرلی، آئندہ کے لیے عہد کرلیا کہ ہم جھوٹی قسم نہیں کھائیں گے تو اللہ کی رحمت سے توقع ہے کہ گناہ معاف ہوجائے گا، لیکن ضابطہ کوئی نہیں، اس لیے یہ قسم انتہائی خطرناک ہوتی ہے جو جھوٹی اُٹھائی جائے، اس کو اسلامی معاشرے میں برداشت نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قسم بنیاد ہے بہت سارے عقد اور معاہدوں کی، اور جس میں آپس میں ایک دوسرے کی بات پر یا معاملے پر اعتماد کیا جاتا ہے تو اگر اسی کو لوگ غلط استعمال کرنے لگ گئے تو پھر معاملات کے صحیح ہونے کی بنیاد کیا رہ جائے گی، کسی کے قول اور اقرار کا فائدہ کیا ہوگا؟ اور کسی کے قول اور اقرار کے اوپر اعتماد کیسے کیا جائے گا؟ اس لیے جھوٹی قسم قابلِ برداشت نہیں ہے۔ یہ یمینِ غموس ہے۔

اور تیسری قسم آپ کے سامنے ذکر کی ''یمینِ منعقدہ''، یہ ہوتی ہے مستقبل کے متعلق، میں ایسا کروں گا، یا، میں ایسا نہیں کروں گا، آئندہ کے لیے آپ نے قسم اُٹھائی اور قصد کے ساتھ اُٹھائی، پھر آپ پابند ہوگئے اس طرح سے کرنے کے اور نہ کرنے کے، اگر تو آپ اس کے مطابق چلیں گے جس طرح سے آپ نے قسم اُٹھائی ہے تو پھر تو کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر کسی معصیت پر قسم اُٹھائی ہے تو اُس قسم کا توڑنا ضروری ہے، کسی گناہ کے کام پر قسم اُٹھائی ہے تو اس کا توڑنا ضروری ہے، اور اگر کسی جائز کام پر قسم اُٹھائی ہے تو اس کے مطابق اگر چلو گے تو کوئی کفارہ نہیں، اور اگر اس کے خلاف کرلیا اور قسم توڑ دی تو قسم توڑنے کے ساتھ پھر کفارہ دینا پڑے گا، دُنیوی سزا اس کی یہی ہے۔

کفارۂ قسم کے متعلق اَحکام

اور کفارے کی تفصیل یہ ہے کہ یا دس مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، کھانا کھلانا ہو تو صبح شام دو وقت کھانا کھلانا پڑے گا درمیانے

(۱) صحیح ابن خزیمہ ۱/ ۷۲، باب الامر بغسل الیدین/ نیز دیکھیں مسلم ۱/ ۱۳۶، باب کراھۃ غمس الخ/ مشکوٰۃ ۱/ ۴۵، باب سنن الوضوء کی پہلی حدیث۔
(۲) بخاری ۲/ ۹۸۷، باب الیمین الغموس/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۷، باب الکبائر کی دوسری حدیث۔

درجے کا، جس قسم کا آپ گھر کے اندر اہل وعیال کے لیے استعمال کرتے ہیں، یا پھر اُن کو لباس دے دو، اتنا جس کے ساتھ اُن کے بدن کا اکثر حصہ چھپ جائے، اور یا پھر غلام آزاد کردو، ان تینوں میں برابر سرابر کا اختیار ہے، جو چیز بھی مل جائے آپ اُس کو ادا کر سکتے ہیں، اور اگر ان تینوں چیزوں میں سے کسی چیز پر اختیار نہ ہو قدرت نہ ہو، مثلاً آپ فقیر ہیں، آپ کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے کہ آپ دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنا دیں یا کوئی غلام آزاد کر دیں تو ایسی صورت میں پھر تین روزے مسلسل رکھے جائیں گے، درمیان کے اندر ناغہ نہیں کیا جائے گا۔ تو یہ یمینِ منعقدہ کا کفارہ ہے۔ لیکن یہ آیا کرتا ہے قسم کو توڑنے کے بعد، اِس کا وجوب حِنث سے متعلق ہے، صرف قسم کھانے کے ساتھ اِس کا وجوب نہیں آتا، کیونکہ قسم کھانا تو تقاضا کرتا ہے ایفاء کا، کہ اس مطابق چلو، جب مطابق چلو گے تو کفارے کا کیا سوال، اور جب اس کے خلاف حِنث آجائے گا تو حِنث کے ساتھ وجوب آئے گا، اس لیے اَحناف کے نقطۂ نظر کے مطابق جس وقت تک قسم کو توڑا نہ جائے اور اس کے خلاف نہ کیا جائے اس کا کفارہ دینا جائز نہیں ہے، اگر کوئی کفارہ دے گا تو اَدا نہیں ہوگا، کیونکہ سببِ وجوب کے پائے جانے سے قبل کوئی چیز ادا نہیں ہوا کرتی، اور سببِ وجوب یہاں حِنث ہے، تو جب تک حِنث نہیں پایا جائے گا کفارہ واجب ہی نہیں ہوا، جب واجب ہی نہیں ہوا تو ادا کیسے ہوگا؟ جیسے نماز کا وقت آنے سے قبل نماز نہیں پڑھی جاسکتی، اسی طرح سے قسم کے توڑنے سے قبل قسم کا کفارہ نہیں دیا جاسکتا، جس وقت قسم ٹوٹ جائے گی تب وہ کفارہ واجب ہوگا اور پھر اُس کی ادائیگی ہوگی، چاہے وہ کفارہ مالی ہو چاہے وہ کفارہ بدنی ہو۔

اور آگے اللہ تعالیٰ نے تاکید کردی کہ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو، حفاظت کا یہ معنی ہے کہ اوّل تو کھاؤ نہیں، اور اگر اُٹھالی ہے تو اُس کے مطابق ایفاء کرو، اور اگر توڑ دی ہے تو کفارہ دو، یہ ساری کی ساری صورتیں حفاظتِ قسم کی ہیں۔

آیاتِ قسم پر ایک نظر اور

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ: نہیں مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے لغو کے سبب سے جو تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے، اس کی تشریح آپ کے سامنے آگئی۔ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ: لیکن مؤاخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے قسموں کو پختہ کرنے کے سبب سے، یعنی قصد کے ساتھ تم جو مستقبل کے لیے قسموں کو پختہ کر لیتے ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرے گا، یہاں چونکہ آگے مؤاخذۂ دُنیوی مذکور ہے، تو یہ دُنیوی مؤاخذہ یمینِ منعقدہ پر ہوتا ہے، تو معلوم ہوگیا کہ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ سے وہی مستقبل کے متعلق قسم اٹھانا مقصود ہے، اور لغو پر مؤاخذہ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں مؤاخذہ نہیں، تو اس لغو میں یمینِ غموس بھی آسکتی ہے اور اِصطلاحی یمینِ لغو بھی آسکتی ہے، کیونکہ یمینِ غموس پر بھی دُنیا کے اندر کوئی کسی قسم کا مؤاخذہ نہیں ہے، اس معنی پر وہ لغو میں شامل ہے۔ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ: یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا، اِذَا حَلَفْتُمْ: جس وقت کہ تم قسم کھاؤ اور پھر اس کے خلاف کرلو، جیسے میں نے عرض کیا کہ صرف قسم کھانے کے ساتھ ہی کفارہ نہیں آیا، قسم کا کھانا تو تقاضا کرتا ہے ایفاء کا، اور کفارہ تب آئے گا جس وقت کہ آپ نے اپنی غلطی کی تلافی کرنی ہے، اور وہ غلطی یہ ہے کہ قسم توڑ دی، اس لیے تقدیرِ عبارت ہوگی اِذَا حَلَفْتُمْ وَحَنِثْتُمْ جب تم قسم اُٹھالو اور پھر حانث ہوجاؤ تو ایسی صورت میں پھر تمہارے ذمے یہ کفارہ ہے۔ اس میں چونکہ دس مسکینوں کی صراحت آگئی

اس لیے یہاں ایک دن میں ایک ہی مسکین کو اگر کفارے کی پوری مقدار ادا کر دی جائے تو کفارہ ادا نہیں ہوگا، یا تو حکماً دس بن جانے چاہئیں یا حقیقتاً، حکماً دس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی متعین کر لو جو دس دن تک آپ کے ہاں صبح شام کھانا کھاتا رہے، تو یہ حکماً دس ہو گئے، تب بھی کفارہ ادا ہو گیا، یا گنتی کے دس آدمی لے کر اُن کو صبح شام کھانا کھلا دو، اور اگر کھانا کھلانا نہیں چاہتے، گھر بیٹھا کے دینا ہے، تو ''صدقۃ الفطر'' کی مقدار ایک ایک مسکین کو دے دو، دس مسکینوں کو علیحدہ علیحدہ دو، اور اگر ایک ہی مسکین کو دینا ہے تو یومیہ ایک دن کے کفارے کی مقدار دو، بیک وقت اگر ایک مسکین کو سارے کے سارے کفارے کے پیسے یا کفارے کا غلہ ادا کر دو گے تو ایسی صورت میں چونکہ عشرہ کا لفظ نہیں پایا گیا، دس مسکین نہیں پائے گئے، تو یہ کفارہ ایک مسکین کے حصے کا سمجھا جائے گا، یہ دس کا ادا نہیں ہوا، جیسے کہ روزوں کے کفارے میں فقہ کے اندر آپ نے مسئلہ یہی پڑھا ہے کہ اگر کسی نے روزہ توڑ دیا تو وہاں چونکہ صراحت ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا دینا ہے، وہاں بیک وقت اگر ایک ہی دن میں ایک مسکین کو ساٹھ مسکینوں کا حصہ دے دیا جائے تو کفارہ ادا نہیں ہوگا، یا تو ساٹھ دن تک ایک مسکین کو کھانا کھلاؤ صبح شام، یا ساٹھ مسکین لے کر ان کے درمیان اس مقدار کو تقسیم کر دو۔ فدیہ میں البتہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر روزوں کا فدیہ دینا ہے وہاں چونکہ صراحت نہیں ہے کہ اتنے مسکینوں کو دو، اس لیے وہاں چند روزوں کا فدیہ ایک مسکین کو بیک وقت دیا جا سکتا ہے، فقہ کے اندر یہ اَحکام مذکور ہیں۔ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۚ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ: اپنی قسموں کی نگرانی کرو، اپنی قسموں کی حفاظت کرو، حفاظتِ یمین کا مطلب میں نے عرض کر دیا کہ اوّل تو قسمیں کھاؤ نہ، اور اگر کھالی ہیں تو پھر اس کے مطابق ان کا ایفاء کرو، اور اگر اس کو توڑ ہی چکے ہو تو پھر ایسی صورت میں کفارہ دو، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ: اسی طرح سے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح کرتا ہے، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: تا کہ تم شکر گزار ہو جاؤ، تا کہ تم قدر کرو، اللہ کا احسان مانو۔

''خمر'' کا مصداق اور حرمت کی تاریخ

''اے ایمان والو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ خمر، میسر، اَنصاب، اَزلام یہ سب گندی چیزیں اور شیطان کی کارروائیاں ہیں۔'' ''خمر'' جس کو ہم اپنی اِصطلاح میں ''شراب'' کہتے ہیں، عربی میں تو ''شراب'' ہر مشروب کو کہا جاتا ہے، چاہے وہ حلال ہو چاہے وہ حرام ہو۔ ہماری اِصطلاح میں ''شراب'' یہی نشے والی چیز کو کہتے ہیں، فقہِ حنفی کے اندر یہ لکھا ہے کہ ''خمر'' خاص ہے انگوری شراب کے ساتھ، اور باقی فقہاء کے نزدیک اور اَحناف میں سے بھی امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک ''خمر'' کا اطلاق عام ہے ہر مسکر کے لیے، جو بھی نشہ دینے والا مشروب ہے اُس کو ''خمر'' کہہ دیں گے، اور یہاں عام ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ روایات کی طرف دیکھ کر بھی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''خمر'' کو حرام کیا تھا صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اُس وقت انگور کی بنی ہوئی شراب ہمارے ہاں بہت کم تھی، زیادہ تر شراب وہی تھی جو کہ کھجوروں وغیرہ سے ہم تیار کرتے تھے، اور وہی شراب جو تھی اسی کو بہایا گیا، اس کے مٹکے توڑے گئے، اُس کو ضائع کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''خمر'' کا لفظ اُن کو بھی شامل ہے جس کے اندر سکر والی کیفیت ہو، راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے، اس لیے فقہِ حنفی میں بھی فتویٰ امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر ہے کہ ہر مسکر کے متعلق یہی حکم ہے، اس لیے ہر مسکر کا قلیل وکثیر حرام ہے، اگرچہ باقی مسکرات میں حد اُس وقت تک نہیں لگے گی جس وقت تک کہ نشے کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے،

اورانگوری شراب اگرتھوڑی سی بھی پی لی جائے چاہے نشہ نہ بھی آئے تو بھی اُس کے اُوپر حدلگ جائے گی، اور یہ انگوری شراب یہ ہوتی ہے کہ انگوروں کا نچوڑ لے کر اُس کو آگ پر پکایا نہ جائے، ویسے ہی اُس کو رکھ کر کسی طرح سے گرمی کے ساتھ جوش دِلایا جائے۔ یہ آیت آخری آیت ہے ''خمر'' کے بارے میں، جیسے کہ سورۂ بقرۃ میں آپ کے سامنے تفصیل آئی تھی، کہ پہلے لوگ شراب پیا کرتے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جوئے اور شراب کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اس میں نفع کم ہے نقصان زیادہ ہے، جس سے ہوا کا رُخ بعض لوگوں نے پہچان لیا کہ عنقریب اس کی ممانعت آئے گی، اور بہت سارے لوگوں نے اُس آیت کو سُن کر ہی شراب کا استعمال چھوڑ دیا اور جوئے کی عادت چھوڑ دی، اور بعض اس خیال سے کہ جب حرام نہیں ٹھہرایا گیا اور اس میں کچھ نفع کے پہلو بھی ہیں، تو اس نفع کو مدِنظر رکھتے ہوئے کرتے رہے، اور نقصان سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر کرلی، جیسے بھی تھا بہرحال اُس آیت میں اِس کو حرام نہیں ٹھہرایا گیا اگرچہ اس کے ترک کی اَولویت کی طرف اشارہ نکلتا ہے، پھر دوسرے وقت میں پابندی لگادی کہ ایسے وقت میں اس کو استعمال نہ کرو کہ اس کا نشہ نماز کے وقت تک باقی رہ جائے، اس میں اوقات کی تحدید ہوگئی، کہ ظہر کے بعد عصر کا وقت قریب آجاتا ہے تو ایسے وقت میں بھی شراب نہیں پئیں گے، عصر کے بعد مغرب کا وقت قریب ہے، مغرب کے بعد عشاء کا وقت قریب ہے، تو پھر اگر اجازت رہی تو صرف ان دو وقتوں میں رہے گی، کہ عشاء کے بعد پی لو کیونکہ فجر کا وقت دیر سے آتا ہے، یا فجر کے بعد استعمال کرلو کہ ظہر کا وقت دیر سے آتا ہے، تو ایسے وقت میں شراب استعمال کرنا کہ جس کے بعد نماز کے وقت تک نشہ باقی رہ جائے منع کردیا گیا، لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (سورۂ نساء: ۴۳) کے تحت یہ بات آپ کے سامنے ذکر کی گئی تھی، نماز وقت پر پڑھنی ہے، اور نشے کی حالت میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں شراب نہ پیو کہ نماز کے وقت تک نشہ باقی رہ جائے، تو اُس میں بھی قطعاً اس کو حرام نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اوقات کی تحدید کردی گئی، اور یہ آیت ہے جس کے اندر اِس کو پھر قطعاً حرام ٹھہرادیا گیا، تو اب یہ شراب حرام قطعی ہے، جو شخص اس کو حلال کہے گا وہ کافر ہے، اور حرام سمجھتے ہوئے اگر اس کو استعمال کرے گا تو فاسق ہے۔

''میسر'' (جُوا) کی تعریف، صورتیں اور ان کے اَحکام

''میسر'' جُوا ہوگیا، جُوئے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپس میں ایسا معاملہ کرنا کہ جس میں نفع نقصان متردّد ہوتا ہے، پتا نہیں نفع آپ کو حاصل ہوجائے، پتا نہیں مجھے حاصل ہوجائے، ایسا جو بھی معاملہ ہو جس میں فریقین کے لئے نفع نقصان متردّد ہو تو اُس کو ''جُوا'' کہہ دیتے ہیں، اس کی مختلف صورتیں ہیں جو لوگ اختیار کرتے ہیں، جیسے گھوڑ دوڑ، تاش پر بازی لگانا، شطرنج پر بازی لگانا، اور یہ لاٹری وغیرہ ہوگئی، یہ جو کچھ بھی ہے، اور اسی طرح سے یہ بانڈ کا سلسلہ ہوگیا یہ سب اسی ''قمار'' اور ''میسر'' میں شامل ہے، کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ دس روپے خرچ کرکے دس ہزار کمالیں، اور ایسا ہوسکتا ہے کہ ان دس روپے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اور جس وقت تاش پر بازی لگاتے ہیں، ہوسکتا ہے پانچ پانچ روپے کی بازی جو لگائی ہے تو دس آپ کو حاصل ہوجائیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کے پانچ بھی اُدھر چلے جائیں، تو جس معاملے میں نفع نقصان یوں متردّد ہوتا ہے وہ سب اس ''میسر'' میں داخل ہے اور قطعاً حرام

ہے،اس لیے گھوڑ دوڑ کے اُوپر بازی لگانا،تاش پر بازی لگانا،لاٹری اور بانڈ وغیرہ سب کو جوئے کی قسمیں ہیں اور یہ جائز نہیں ہیں۔

اَنصاب: بُت پرستی، بتوں کو بھی نجس اور ناپاک قرار دیا گیا۔ اَزلام: یہ بھی تیر ہوتے تھے ان کے ہاں، جن کے ذریعے سے وہ حصے طلب کیا کرتے تھے،جس کا ذکر آپ کے سامنے پہلے استقسام بالأزلام کے تحت آ چکا، اور یہ بھی ایک جوئے کی صورت تھی، اُونٹ مشترکہ خریدتے برابر پیسے دے کر، اور جب اُس کو ذبح کر لیتے تو پھر اُس کو تقسیم کرتے قرعہ اندازی کے ساتھ، اور وہ تیر جو دس ہوتے تھے اُن میں کسی کے اُوپر تھوڑی مقدار گوشت لکھا ہوا ہوتا تھا جیسے بیسواں حصہ مثال کے طور پر، کسی کے اُوپر زیادہ مقدار لکھی ہوئی ہوتی، اور کوئی خالی ہوتے تھے، اور جس کے نام پر جو تیر آتا ویسا معاملہ کیا جاتا تھا، اگر خالی تیر آ گیا اُس کو کچھ نہیں ملے گا حالانکہ اُس نے پیسے دیئے ہیں، اور ایک کے حصے میں وہ تیر نکل آیا کہ جس میں حصہ مقدار سے زیادہ ہے، وہ نفع میں رہ گیا، اور کسی کو تھوڑا املا وہ نقصان میں رہ گیا، کوئی بالکل خالی رہ گیا، یہ بھی ''میسر'' اور جوئے کی قسم ہے، تو استقسام بالأزلام کو بھی حرام ٹھہرایا گیا، یہ رِجس ہے، ناپاک ہے، گندی چیز ہے، سلیم الفطرت انسان کو اِس سے نفرت ہونی چاہیے جس طرح سے کہ پیشاب پاخانے سے نفرت ہوتی ہے، ناپاک چیز ہے، گندی چیز ہے، مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ: یہ شیطان کا کردار ہے، تو مؤمنوں کو دُور رہنا چاہیے۔

''خمر'' اور ''میسر'' کو حرام کیوں کیا گیا؟

فَاجْتَنِبُوْهُ: اس سے بچ کر رہو، یعنی اِن میں سے ہر کام سے بچ کر رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ، اور اس فلاح میں دینی فلاح بھی ہے اور دُنیوی فلاح بھی، کیونکہ یہ چیزیں ایسی ہیں جو دِین کو بھی برباد کرتی ہیں دُنیا کو بھی برباد کرتی ہیں، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے کہ جو لوگ شراب نوشی میں لگ جاتے ہیں، جُوئے بازی میں لگ جاتے ہیں، اکثر و بیشتر آپ اُن کو برباد ہی دیکھو گے، اِن کو خوشحال، بہت کم دیکھو گے، جس کو دیکھو! کہتے ہیں جُوئے میں ہار گیا، جیتا ہوا آدمی شاید ہی آپ کو کبھی کوئی نظر آیا ہوگا، بدحال اس قسم کے آپ کے سامنے آئیں گے جس کے متعلق لوگ کہیں گے کہ یہ ہارا ہوا ہے، تو دُنیا بھی برباد ہوتی ہے۔ اور ''خمر'' بھی برباد کرنے والی چیز ہے کہ عقل اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کے ساتھ انسان اپنا نفع نقصان سوچتا ہے، اور ''خمر'' عقل کی دُشمن ہے کہ اس کو پی لینے کے بعد انسان کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ باقی شرک، بُت پرستی وہ تو ہے ہی۔ فَاجْتَنِبُوْهُ: ان میں سے ہر کام سے بچ کر رہو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔

''خمر'' اور ''میسر'' کے نقصاتِ کثیرہ

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: شیطان نے تمہیں جو اِن کاموں میں لگا رکھا ہے تو اس کا تو مقصد یہی ہے کہ تمہارے اندر بغض اور عداوت قائم کر دے ''خمر'' اور ''میسر'' کے سبب سے، بغض وعداوت آپس میں قائم کس طرح سے ہوتی ہے؟ یہ بہت واضح بات ہے کہ ''خمر'' جس وقت استعمال ہوگی تو عقل ٹھکانے نہ رہنے کی وجہ سے گالی، گلوچ، بکواس، ایک دوسرے کی عزّت کے اوپر ہاتھ ڈالنا، یہ عام ہوتا ہے، اب اس کے دو اثر ہیں یا تو معاشرہ اتنا بے حس ہو جائے، بے غیرت ہو جائے، دیوث ہو جائے کہ کوئی کسی کی بہن کو، بیٹی کو، بیوی کو ہاتھ ڈالتا رہے تو پرواہ ہی نہ کی جائے، یہ رُوحانی موت ہے جو طاری ہو جاتی ہے، جس

طرح سے کہ یورپین سوسائٹیوں میں یہ بات پائی جاتی ہے، جو لوگ اُن کی تہذیب سے متاثر ہیں، کلب گھروں میں جاتے ہیں، وہاں جا کر شراب نوشی کرتے ہیں، اور پھر اس شراب نوشی کے نتیجے میں کسی کی بیوی کسی کے ہاتھ میں آگئی، کسی کی کسی کے ہاتھ میں آگئی، اُن کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی، اور ان کی بہو بیٹیاں لوگوں کے ساتھ اپنی محبت کی پینگیں چڑھاتی رہیں اُن کو کوئی پروا نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے پر رُوحانی موت طاری ہوگئی، ان کے اندر غیرت رہی نہیں، حسِ انسانی ختم ہوگئی، حیوانی زندگی اختیار کرلی، کہ جس طرح سے حیوان میں حلال اور حرام کا کوئی امتیاز نہیں، نر مادہ جو آپس میں خلط ملط ہوتے رہیں، چاہے کوئی ایک ہی ماں کی اولاد ہوں، چاہے کیسے بھی ہوں، تو یہ کیفیت اگر پیدا ہو جائے یہ تو رُوحانی موت ہے، یہ تو انسانیت کے درجے سے گری ہوئی بات ہے، اِس کا تو کہنا ہی کیا، لیکن اگر انسانیت باقی ہے تو یقیناً عزّت کا احساس ہے، کوئی گالی دے گا تو بھی دوسرا آدمی مشتعل ہوتا ہے، کسی کی عزّت کو کوئی آدمی ہاتھ ڈالے گا تو بھی آدمی مشتعل ہوگا، پھر اُس کے نتیجے میں قتل وقتال بھی ہوگا، لڑائیاں بھی ہوں گی، تو جس معاشرے کے اندر یہ ایمانی حس موجود ہو کہ وہ عزّت اور ناموس کی کوئی قیمت سمجھتے ہیں، تو وہاں شراب کے نتیجے میں فساد ہونا لڑائیاں ہونا ایک عام سی بات ہے، یا وہ معاشرہ ہی اس قسم کا ہو جائے کہ رُوحانی طور پر مر گیا، کہ وہ دیوث ہوگئے، بے غیرت ہوگئے، اُن کے ہاں عزت وناموس کوئی چیز ہی نہیں، تو پھر بظاہر آپ کو معلوم ہوگا کہ دیکھو! یہ لوگ شراب نوشی بھی کرتے ہیں، لیکن ان میں لڑائی بھی نہیں ہوتی۔ ان میں لڑائی ہو کیسے؟ کوئی انسانیت ان میں باقی ہو، کوئی ایمانی غیرت ان کے اندر باقی ہو تو ہی تو انسان دفاع کی کوشش کرتا ہے، اور جب ان میں ایمانی غیرت ہے ہی نہیں، کوئی ان کے سامنے ان کی بیٹی کو لیے پھرے، بیوی کو لیے پھرے، یہ محسوس ہی نہیں کرتے، تو پھر لڑنا کیا ہے؟ تو یہ نہ لڑنا خوبی نہیں بلکہ یہ تو انسانیت کے دائرے سے باہر نکل جانے کی نشانی ہے، یہ تو بربادی کی آخری حد ہے کہ غیرت کا نام ونشان مٹ گیا، اور اگر غیرت ہو اور عزت کا احساس باقی ہو تو لازماً اس گالی گلوچ کے نتیجے میں اور ایک دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کے نتیجے میں لڑائیاں ہوں گی۔ اور ایسے ہی جوے والے، ہارنے والا جیتنے والے کے متعلق اپنے دل میں کبھی بھی محبت کے جذبات نہیں رکھ سکتا، ان کے درمیان میں اس قسم کا بغض پیدا ہوگا، تو اس طرح سے معاشرہ جس کی بنیاد محبت پر ہونی چاہیے، آپس میں خیر خواہی اور ہمدردی پر ہونی چاہیے، ''خمر'' اور ''میسر'' اس بنیاد کو ڈھادیتے ہیں، اور معاشرے کی خوبی ختم ہو جاتی ہے، کہ آپس میں محبت اور ہمدردی کی بجائے خود غرضی اور لڑائی بھڑائی عام ہو جاتی ہے۔ ''یہ شیطان تمہارے درمیان خمر اور میسر کی وجہ سے بغض وعداوت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور تمہیں اللہ کے ذکر سے روکنا چاہتا ہے'' اس کا ارادہ یہی ہے کہ تم اللہ کے ذکر سے دُور ہو جاؤ، اور اللہ کا ذکر یہ رُوحانی صحت ہے، رُوحانی حیات ہے، اور اللہ کے ذکر سے رُکنا رُوحانی موت ہے، یہ آپ مشاہدہ کرلیں، یعنی اگر آپ کے سامنے کوئی شرابی نہیں ہے، جوا باز نہیں ہے، تو ان تاش کھیلنے والوں کو دیکھ لیا کرو، جس وقت یہ اس قسم کے کھیلوں میں لگے ہوئے ہوتے ہیں ان کو کوئی دھیان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف؟ کوئی نماز کے وقت کا ان کو خیال ہوتا ہے؟ یا کسی دوسری نیکی کی طرف ان کی توجہ رہتی ہے؟ اس طرح سے مست ہو کے اس میں لگے ہوئے ہیں، کہ وقت پہ وقت گزرتا جارہا ہے اور ان کو ذرہ برابر احساس نہیں، اور شراب میں تو جب عقل ہی ٹھکانے نہیں، تو کیا اللہ یاد

رہے گا اور کیا نماز یاد رہے گی؟ اور اس قسم کے دوسرے عبث کام یہ بھی اللہ کے ذکر سے غفلت اور نماز سے غفلت کا باعث بنتے ہیں۔ نماز کو خصوصیت سے ذکر کر دیا، کیونکہ اللہ کے ذکر کی بہترین اور سب سے زیادہ پاکیزہ صورت نماز ہے۔ تو جو چیز اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، تمہیں اللہ بھلا دے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں بھی اپنے آپ کو بھلا دے گی، لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ (سورۂ حشر:۱۹) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ بھلا دیا اور اللہ نے اُن کو اپنا آپ ہی بھلا دیا، اللہ کو بھول جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کو اپنا آپ بھی یاد نہیں رہا، اپنے نفع نقصان کی بھی فکر نہیں رہی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل لوگ ہیں، حقیقت ہے کہ ہر وقت وہ پریشان، اور اُن کو اپنا نفع نقصان کی قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ ہم اپنی آخرت برباد کر رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں، کیا نہیں کر رہے، جس وقت آپ ان کو دیکھیں گے تو یوں معلوم ہوگا جیسے روحانی طور پر ان لوگوں کو کچھ بھی سکون نہیں، اور اُن کو پتا ہی نہیں کہ ہمارا مقصد حیات کیا ہے، ہم نے کدھر کو جانا ہے اور کدھر جا رہے ہیں، اس طرح سے غفلت طاری ہو کر رُوحانی موت طاری ہو جاتی ہے، اور خمر، میسر اس قسم کی چیزیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روکنے کا باعث بن جاتی ہیں۔ تو جب ان کے اندر اتنی قباحتیں ہیں کہ معاشرہ ان سے برباد ہوتا ہے، کہ محبت ایثار اور ہمدردی کی بجائے بغض وعداوت آ گیا، اور عاقبت اس سے برباد ہوتی ہے، اور اپنی شخصی زندگی اس سے برباد ہوتی ہے، کہ اللہ کے ذکر سے غفلت ہو گئی، نماز سے غفلت ہو گئی، اتنے نقصانات سامنے آنے کے بعد پھر بھی تم باز آنے والے ہو یا نہیں؟ ان چیزوں سے رُکو گے یا نہیں رُکو گے؟ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ کے اندر یہی تنبیہ ہے، کیا تم باز آنے والے ہو؟ یعنی ان باتوں کے سمجھ میں آ جانے کے بعد تمہیں باز آ جانا چاہیے، یہ اِستفہام اپنے اندر امر کا معنی لیے ہوئے ہے، جب اتنے نقصانات اس میں ہیں تو تمہیں چاہیے کہ اس سے باز آ جاؤ۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کی تاکید

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ: اور اللہ کا کہنا مانو، وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اور رسول کی اطاعت کرو، وَاحْذَرُوْا: اور ان کی مخالفت سے ہر وقت بچتے رہو، فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ: اگر تم نے پیٹھ پھیر لی، اللہ اور رسول کی اطاعت سے رُخ پھیر لیا تو یقین کر لو کہ اس میں نقصان تمہارا ہے، ہمارا یا ہمارے رسول کا کوئی نقصان نہیں ہے، یہ جو کچھ باتیں تمہیں کہہ رہے ہیں تمہاری ہمدردی اور تمہاری خیر خواہی کے لیے کہہ رہے ہیں، ان کے ذمّے تو ہم نے صرف یہ دین پہنچا دینا لگایا ہے، اور وہ اس ذمہ داری کو ادا کر بیٹھے، جب انہوں نے اس ذمہ داری کو ادا کر دیا، کھول کھول کر اللہ کے احکام پہنچا دیے، اب اگر عمل کرو گے تو تمہارا فائدہ ہے اور نہیں کرو گے تو تمہارا نقصان ہے، اس میں ہمارے رسول کا ہمارے دین کا اور ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے، ''یقین کر لو کہ ہمارے رسول کے ذمّے تو کھول کھول کر پہنچا دینا ہی ہے۔''

حرمتِ شراب سے قبل شراب نوشی میں وفات پانے والوں کا حکم

اگلی آیت کے متعلق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب اس شراب کا نجس ہونا مذکور ہوا اور عملِ شیطانی ہونا مذکور ہوا تو بعض صحابہ ﷺ جو شراب کے حرام ہونے سے قبل شراب استعمال کرتے رہے، اور اس کے حرام ہونے سے قبل وہ وفات پا گئے، گویا کہ شراب نوشی

کے زمانے میں ہی اُن کا انتقال ہو گیا، یا جہاد میں گئے اور شراب استعمال کی اور اسی حالت میں شہادت ہو گئی، اب معلوم ہو گیا کہ یہ تو بڑی گندی چیز ہے، یہ تو شیطانی کارروائی ہے، اب بعض لوگوں کے دل میں خیال آیا کہ پھر اُن کا کیا ہو گا؟ وہ اُن کا جو کردار تھا وہ ان کے لیے کوئی نقص کا باعث ہو گا؟ اس آیت کے اندر اس کی وضاحت کر دی گئی کہ نہیں! اللہ تعالیٰ کی طرف سے عادت یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان لے آئے، ایمان لے آنے کے بعد جو احکام اُس کو دیے جائیں وہ اُس کے مطابق چلتا ہے، جو چیز حرام ٹھہرائی گئی اُس کو وہ حرام سمجھتا ہے، تو پھر وہ جو کچھ کھاتا پیتا رہے اُس کے اُوپر کوئی گناہ نہیں، چاہے وہی چیزیں ہوں جو بعد کے زمانے میں جا کر حرام ہو گئیں، لیکن جب وہ حلال تھیں اُس نے استعمال کی ہیں اور حرام ہونے کے بعد ترک کر دیں، ایسی صورت میں اُس کے اُوپر کوئی گناہ نہیں، لہٰذا جن لوگوں نے شراب حلال ہونے کے زمانے میں استعمال کی ہے، چاہے وہ بعد میں حرام ہی ہو گئی، لیکن وہ چونکہ زمانہ ایسا تھا کہ جس میں حرام نہیں ٹھہرائی گئی تھی، جو احکام اُس وقت تھے جو عملِ صالح کا مصداق تھے وہ لوگ اس کے پابند تھے، اللہ سے ڈرتے تھے، ایمان لاتے تھے، اُن کے اُوپر ان کھائے پیے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

بار بار تقویٰ کے ذِکر کرنے کی وجہ

یہاں بار بار تقویٰ کا ذکر کیا، مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے احکام آتے جائیں، اللہ کے تقوے کے تحت وہ ان احکام کو قبول کرتے جائیں، حتیٰ کہ ان کو صفت احسان حاصل ہو جائے، ان کے ہر کام میں حسن پیدا ہو گیا، اور اُن کی روح اس درجے پر چلی گئی جس کو کہتے ہیں کہ ”اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ“[1] کہ ایسے اللہ کی عبادت کرو گویا کہ اللہ سامنے ہے، یہ درجہ حاصل ہو گیا، ہر معاملے میں انہوں نے حُسن ہی حُسن پیدا کر لیا، احسان کی صفت پیدا کر لی، تو اُس کھائے پیئے کا اُن کے اُوپر کوئی گناہ نہیں ہے، تو یہ جو بار بار تقوے کا اور ایمان کا اعادہ کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جیسے جیسے احکام آتے گئے وہ قبول کرتے چلے گئے، ”نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے“ یعنی جو احکام اُن کو دیے گئے اس کے مطابق چلے، ”نہیں کوئی گناہ نہیں اس چیز میں جو انہوں نے کھائی جبکہ وہ کُفر و شرک سے بچے اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور پھر انہوں نے تقویٰ اختیار کیا“ کہ اللہ کی طرف سے جو احکام آتے گئے اُس کی مخالفت سے وہ ڈرتے رہے، اور جس چیز کا اُن کو مکلّف کیا گیا اُس پر وہ ایمان لاتے رہے، اور اسی طرح سے تقوے کے درجات میں ترقّی کرتے رہے، اور انہوں نے نیکی کی، اور صفت احسان کو حاصل کر لیا، ان لوگوں پر کھائے پیئے میں کوئی گناہ نہیں جو پہلے کھا گئے۔ ”تفسیر مظہری“ کے اندر پہلے تقوے کا مصداق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ شرک سے بچے، دوسرے کا مصداق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ محرمات سے بچے، تیسرے کا مصداق ذکر کیا گیا ہے کہ مشتبہات سے بچے، اور اس کے نتیجے میں پھر اُن کو صفت احسان حاصل ہو گئی، تو ایسے لوگ اللہ کے محبوب ہیں وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ، اس لیے اگر ایک وقت انہوں نے ایک چیز استعمال کی جو دوسرے وقت میں حرام ٹھہرا دی گئی وہ اُن کے لیے کوئی کسی قسم کے نقص کا باعث نہیں ہے۔

(کسی سوال پر فرمایا) گھوڑ دوڑ پر اگر بازی نہ لگائی جائے یعنی پیسے متعین نہ کیے جائیں اور اس طرح سے مقابلہ کیا جائے،

---

(۱) صحیح البخاری ص ۱۲ باب سوال جبریل النبی ﷺ / صحیح مسلم ۱/۲۷، کتاب الایمان کی پہلی حدیث / مشکوٰۃ ص ۱۱ عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

یہ شوقِ جہاد کے ساتھ ہو تو عبادت ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھوڑوں کو مقابلے میں دوڑایا کرتے تھے، حدیث شریف میں قصے آتے ہیں "باب إعداد آلة الجهاد" مشکوۃ شریف کے اندر یہ روایتیں موجود ہیں کہ گھوڑے ہوتے تھے، مقابلہ کرواتے تھے۔ اور اگر وہ جہاد کی تیاری نہ ہو، ویسے ہی دل لگی اور کھیل کود کے طور پر ہو تو جس قسم کی باقی کھیلیں ہیں ویسی ہی یہ کھیل ہے، پھر وہ حرام نہیں ہے، چاہے بعض صورتوں میں اس کو عبث کے اندر داخل کرلیا جائے، عبث ہونے کے اعتبار سے چاہے روکیں گے کہ کیا فضول حرکت ہے؟ نہ دینی فائدہ نہ دُنیوی فائدہ، ویسے دل بہلانے کے لیے جس طرح سے باقی کھیلیں ہیں اسی قسم کی یہ ایک کھیل ہے، پھر اس کو حرام نہیں ٹھہرائیں گے، اور اگر بازی رکھ لی کہ جو جیت جائے دوسرے سے اتنا لے لے، یہ صورت صراحتاً حرام ہے، اور اگر انعام کسی تیسرے آدمی کی طرف سے ہو، تیسرا آدمی کھڑا ہے، زید کو کہتا ہے اپنا گھوڑا لاؤ، بکر کو کہتا ہے اپنا گھوڑا لاؤ، انہوں نے آپس میں کچھ نہیں لینا دینا، اور جس کا گھوڑا آگے نکل جاتا ہے تو اُس کو تیسرا آدمی انعام دیتا ہے اپنی طرف سے، یہ صورت جائز ہے، جیسے والی بال فٹ بال کھیلیں، وہاں بھی یہی صورت ہے، اگر کامیاب ہونے والوں کو انعام کسی تیسری طرف سے دیا جائے تو جائز، اور اگر آپس میں متعین کرلیں کہ جو جیت جائے گا دوسرے سے اتنے پیسے لے گا، پھر یہ بھی وہی قمار کی صورت پیدا ہو جائے گی اور یہ بھی حرام ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

اے ایمان والو! البتہ ضرور آزمائش کرے گا تمہاری اللہ تعالیٰ کچھ شکار کے ذریعے سے

تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ

پہنچیں گے اس شکار کو تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے، تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر معلوم کرلے اُس شخص کو جو اُس سے بن دیکھے ڈرتا ہے،

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

پھر جو کوئی شخص حد سے تجاوز کرے گا اِس کے بعد، اس کے لیے درد ناک عذاب ہے ﴿۹۴﴾ اے ایمان والو!

لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا

شکار کو قتل نہ کیا کرو اس حال میں کہ تم مُحرِم ہو، اور جو شخص تم میں سے اس شکار کو قتل کرے گا جان بوجھ کر

فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ

اُس کے ذمے جزا ہے جو مثل ہوگی اُس چیز کے جس کو اُس نے قتل کیا ہے، فیصلہ کریں گے اس جزاء کا تم میں سے دو عادل آدمی،

هَدۡيًاۢ بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ اَوۡ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيۡنَ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِكَ صِيَامًا

اس حال میں کہ وہ (مثل) ہدی ہو پہنچنے والی ہو کعبہ کو، یا وہ کفارہ ہو مساکین کا کھانا، یا اس کے برابر ہو از روئے روزے کے،

لِّيَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَيَنۡتَقِمُ

تا کہ چکھ لے وہ شخص اپنے اَمر کی سزا، اللہ تعالیٰ نے درگزر کیا اُس چیز سے جو گزر گئی، جو کوئی عود کرے گا اللہ اس سے انتقام

اللّٰهُ مِنۡهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ۝۹۵ اُحِلَّ لَكُمۡ صَيۡدُ الۡبَحۡرِ وَطَعَامُهٗ

لے گا، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام لینے والا ہے ۝۹۵ حلال کر دیا گیا تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اُس کا کھانا،

مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيۡكُمۡ صَيۡدُ الۡبَرِّ مَا دُمۡتُمۡ

تمہارے نفع کے لئے اور مسافروں کے نفع کے لئے، حرام کر دیا گیا تم پر خشکی کا شکار جس وقت تک کہ تم

حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ۝۹۶ جَعَلَ اللّٰهُ الۡكَعۡبَةَ

محرِم ہو، ڈرو اُس اللہ سے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے ۝۹۶ بنایا اللہ نے کعبہ کو

الۡبَيۡتَ الۡحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهۡرَ الۡحَرَامَ وَالۡهَدۡىَ وَالۡقَلَاۤئِدَ ؕ

جو بیت حرام ہے لوگوں کے لیے قائم ہونے کا ذریعہ، اور شہر حرام کو اور ہدی کو اور قلادہ ڈالے ہوئے جانوروں کو،

ذٰلِكَ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَاَنَّ

یہ اس لیے تا کہ تم معلوم کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُن سب چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور بے شک

اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝۹۷ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَاَنَّ

اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۝۹۷ یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے اور بے شک

اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ؕ ۝۹۸ مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ

اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ۝۹۸ نہیں ہے رسول کے ذِمّے مگر پہنچا دینا، اللہ جانتا ہے اُس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو

وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ ۝۹۹ قُلْ لَّا يَسۡتَوِى الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوۡ اَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ

اور جس کو تم چھپاتے ہو ۝۹۹ آپ کہہ دیجئے! کہ ردّی چیز اور اچھی چیز برابر نہیں، اگرچہ تجھے تعجب میں ڈال دے خبیث کی

الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
کثرت، پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اے عقل والو! تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۱۰۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ: اے ایمان والو! البتہ ضرور آزمائش کرے گا تمہاری اللہ تعالیٰ شکار میں سے کسی شئ کے ساتھ، یا کچھ شکار کے ذریعے سے، تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ: پہنچیں گے اس شکار کو تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے، لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ: تاکہ اللہ ظاہری طور پر معلوم کرلے اُس شخص کو جو اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے، فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ: پھر جو کوئی شخص حد سے تجاوز کرے گا اس کے بعد، فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو!، لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ: شکار کو قتل نہ کیا کرو اس حال میں کہ تم محرم ہو، وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا: اور جو شخص تم میں سے اُس شکار کو قتل کرے گا جان بوجھ کر، فَجَزَآءٌ: فَعَلَيْهِ جَزَآءٌ، خبر محذوف نکال لی جائے گی۔ اس کے ذمے جزاء ہے، مِّثْلُ مَا قَتَلَ: جو جزاء مثل ہوگی اس چیز کی جس کو اس نے قتل کیا ہے، مِّثْلُ مَا قَتَلَ یہ جزاء کی صفت ہے، اور اسی طرح سے يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ یہ بھی صفت ہے جزاء کی۔ ’’فیصلہ کریں گے اس مثل کا، فیصلہ کریں گے اس جزاء کا تم میں سے دو عادل آدمی‘‘ تو دو عادل آدمی فیصلہ کرنے کے بعد پھر آگے تین صورتیں ہیں، مِّنَ النَّعَمِ: یا تو وہ مثل نعم میں سے ہو، هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ: اس حال میں کہ وہ ہدی ہو پہنچنے والی کعبے کو، اَوْ كَفَّارَةٌ: یا وہ مثل کفارہ ہو، طَعَامُ مَسٰكِيْنَ: مساکین کا کھانا، اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا: یا وہ اس کے برابر از روئے روزے کے، لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ: تاکہ چکھ لے وہ شخص اپنے امر کی سزا، عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ: اللہ تعالیٰ نے درگزر کیا اس چیز سے جو گزر گئی، وَمَنْ عَادَ: جو کوئی عود کرے گا، جو کوئی دوبارہ اس قسم کی حرکت کرے، فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ: اللہ اس سے انتقام لے گا، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ: اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام لینے والا ہے۔ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ: حلال کر دیا گیا تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا، ’’ہٗ‘‘ ضمیر صید کی طرف لوٹ رہی ہے، اس صید کا کھانا، مَتَاعًا لَّكُمْ: تمہارے نفع کے لئے، وَلِلسَّيَّارَةِ: اور قافلہ کے نفع کے لئے، مسافروں کے نفع کے لئے۔ سَارَ يَسِيْرُ: چلنا۔ سیارہ: چلنے والے لوگ، جماعت کے اعتبار سے۔ ’’مسافروں کے لئے‘‘ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ: حرام کر دیا گیا تم پر خشکی کا شکار، مَا دُمْتُمْ حُرُمًا: جس وقت تک کہ تم محرم ہو، وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: ڈرو اس اللہ سے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ: الْبَيْتَ الْحَرَامَ یہ بیان ہے کعبہ کا۔ بنایا اللہ نے کعبہ کو جو بیت حرام ہے، قِيٰمًا لِّلنَّاسِ: لوگوں کے لئے قائم ہونے کا ذریعہ، وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ: اور شہر حرام کو، وَالْهَدْيَ: اور ہدی کو، یعنی اس جانور کو جو بیت اللہ کی طرف بطور نیاز کے بھیجا جاتا ہے، وَالْقَلَآئِدَ: یہ قِلَادَة کی جمع ہے، یہاں ذَوَاتُ الْقَلَائِدِ مراد ہیں۔ اور وہ جانور جن کے گلے میں قلادے ڈالے ہوئے ہوتے ہیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے قیام کا ذریعہ بنایا، ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا: یہ اس لیے تاکہ تم معلوم کرلو، اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان سب چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اور بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا

ہے، اِعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا والا ہے، وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اور اس بات کا بھی یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ: نہیں ہے رسول کے ذِمّے مگر پہنچا دینا، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ: اللہ جانتا ہے اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے ہو۔ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ: خبیث: ناپاک چیز، گندی چیز، اور اسی طرح سے ناپاک لوگ، یعنی اشیاء اور الناس سب کے اوپر یہ خبیث کا لفظ صادق آتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ ردّی چیز اور اچھی چیز برابر نہیں، وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ: اگرچہ تجھے تعجب میں ڈال دے خبیث کی کثرت، فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ: پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اے عقل والو! لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

شروع سورت میں غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کا لفظ آیا تھا کہ شکار کو حلال نہ قرار دیا کرو احرام کی حالت میں، جس کا مفہوم یہ تھا، اب اسی حکم کی ان آیات میں کچھ وضاحت ہو رہی ہے۔

اہلِ عرب کے لئے شکار کی ممانعت بڑا امتحان کیوں تھا؟

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِحرام کی حالت میں شکار کرنے کی ممانعت کردی، اور اسی طرح سے حرم کے اندر بھی شکار کرنے کی ممانعت ہے، چاہے انسان محرِم نہ ہی ہو، یہ ممانعت خصوصیت کے ساتھ اہلِ عرب کے لیے ایک بہت بڑی امتحان کی چیز ہے، اس وجہ سے کہ اُس معاشرے میں شکار کرنا ایک معاشی ضرورت بھی تھی اور ان لوگوں کا ایک دل لگی کا مشغلہ بھی تھا، اپنا وقت گزارنے کے لیے وہ جنگل میں جاتے، شکار کرتے، گھوڑے پر سوار ہوکر، تیر کے ذریعے سے بھی، نیزوں کے ذریعے سے بھی، یہ اُن کا ایک مشغلہ تھا، اور اسی طرح سے ان لوگوں کا ایک معاشی ذریعہ بھی تھا، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُس کے اُوپر پابندی لگ گئی، پابندی بھی مدّتِ اِحرام میں، اور آپ جانتے ہیں کہ مدّتِ اِحرام یہ مہینوں پر مشتمل ہے، کہ اگر کوئی شخص شوال کے بعد حج کا اِحرام باندھ لے یہ بلا کراہت دُرست ہے، تو دس ذی الحج تک دو مہینے دس دِن ہوتے ہیں، اور اگر یہ پوری مدّت نہ ہو تو جتنی بھی ہو بہرحال یہ پابندی مسلسل کئی ہفتوں پر کئی مہینوں پر مشتمل ہوسکتی ہے، اور حرم کے اندر رہتے ہوئے ہمیشہ کے لیے، اور یہ پابندی اُس قسم کی پابندی ہے جیسے کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے دن مچھلیوں کے شکار پر پابندی لگادی، جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں آئے گا، اور اشارۃً اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں آچکا ہے وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ (آیت:۶۵) تم نے ان لوگوں کا حال معلوم کرلیا جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن کے بارے میں تجاوز کیا تھا، تو یہ اعتداء فی السبت کی طرف

اِشارہ سورۂ بقرہ میں گزرا ہے، اور واقعہ کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں آئے گی، کہ صرف سات روز میں سے ایک دن کے لیے پابندی اللہ تعالیٰ نے ان اسرائیلیوں پر لگائی تھی، کہ شکار نہ کیا کریں اور خصوصیت کے ساتھ مچھلی کا، اور وہ لوگ چونکہ سمندر کے کنارے رہنے والے تھے، یا کسی دریا کے کنارے رہنے والے تھے، اُن کا بھی یہ معاشی مسئلہ تھا، تو مچھلی کا شکار کر کے اپنا وقت گزارتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر یہ پابندی لگ گئی، اور پھر اُن کو بھی اللہ تعالیٰ نے آزمایا کہ جب ہفتے کا دن ہوتا تھا تو مچھلیاں کثرت کے ساتھ آتیں، اور منہ پانی کے اُوپر اٹھا اٹھا کر تیرتیں، جس سے سب کو نظر آتیں، اور ہفتے کے علاوہ دوسرے دنوں کے اندر اتنی کثرت سے نہیں آتی تھیں، اور وہ لوگ ویسے ہی حیلہ جو تھے، تو وہ اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکے کہ باقی ایام میں تو مچھلی نہ ملے یا کم ملے، اور ہفتے کے دن یہ اس طرح سے اچھل اچھل کر سامنے آتی ہوں، اور پھر یہ بچ کر چلی جائیں، یہ انہوں نے گوارا نہ کیا، حیلہ تراش لیا، کوئی صورت پیدا کر لی، کہ دِین بھی ہاتھ سے نہ جائے اور مچھلیاں بھی بچنے نہ پائیں، تو جیسے کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی صورت یوں کر لی کہ دریا کے کنارے پر تالاب بنا لیئے، گڑھے کھود لیے، اور ہفتے کے روز اس میں پانی چھوڑ دیتے، جب مچھلیاں اس پانی کے ساتھ ان گڑھوں میں آجاتیں تو اُن کے دروازے بند کر لیتے، جب اُن کے ناکے بند کر دیتے تو جو مچھلیاں اُدھر آ گئی ہوتیں وہ مقید ہو جاتیں، ہفتے کا دن گزرنے کے بعد اُنہیں پکڑ لیتے، اب اس طرح سے ان مچھلیوں کو قابو میں بھی لے آتے اور بظاہر یہ بھی سمجھتے کہ ہماری دِین داری میں فرق نہیں آیا، اور ہم اس قانون کو بھی پورا کر رہے ہیں کہ ہفتے کے دن شکار نہیں کرنا۔ تو اس پر تنبیہ کی گئی کہ نہیں! مچھلی کو اس طرح سے پانی کے اندر روک لینا کہ جس کے بعد پکڑنے پر انسان قادر ہو جائے یہ بھی شکار ہے، اور اس سے باز آ جانا چاہیے، لیکن جب وہ باز نہ آئے فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (سورۂ بقرہ:۶۵) تو ہم نے پھر اُن کے متعلق کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ، یہ کہنا چونکہ تکوینی تھا، تو تکوین کے تحت وہ قوم بندر کی شکلوں میں مسخ ہو گئی، اور پھر تین دِن کے بعد وہ سارے کے سارے ہلاک ہو گئے۔ یہ آزمائش پہلے اسرائیلیوں کے اوپر آ چکی، اُس کے مقابلے میں یہ آزمائش جو اہلِ اسلام کے لیے اِس پابندی پر آنے والی تھی، یہ زیادہ سخت تھی، یہ ایک دن کی بات نہیں، یہ پابندی ہفتوں پر مہینوں پر مشتمل ہے، اور جن پر یہ پابندی لگائی گئی ہے اُن کا بھی یہ معاشی مسئلہ ہے اور دل لگی بھی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے متنبہ کر دیا کہ ہم تمہاری آزمائش کریں گے کچھ شکار کے ذریعے سے، اور آزمائش کی صورت وہی ہو گی کہ جس وقت تم پر پابندی لگی ہوئی ہو گی اور تم اِحرام کی حالت میں ہو گے تو کثرت کے ساتھ شکار تمہارے سامنے آئے گا، ڈاروں کی ڈاریں پھریں گی ہرنوں کی، نیل گاؤں کی، گورخروں کی، ایسے طور پر کہ اگر تم چاہو تو ان کو ہاتھ کے ساتھ پکڑ لو، اور اگر چاہو تو تم ان کو نیزوں سے مار لو، اس طرح سے تمہارے آس پاس اردگرد کثرت کے ساتھ شکار آئے گا، لیکن یاد رکھنا اگر کسی نے کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے اوپر گرفت ہو گی، تو یہ پابندی لگا دی گئی، اور تاریخ شاہد ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رُفقاء اس امتحان کے اندر پوری طرح سے کامیاب ہوئے، کہ ایسے ہی واقعہ ہوا کہ احرام کی حالت میں جب وہ لوگ جاتے، شکار اُن کے سامنے پھرتا، آگے پیچھے آتا، پکڑنا چاہتے تو ہاتھ کے ساتھ پکڑ لیتے، مارنا چاہتے تو نیزے کے ساتھ مار لیتے، لیکن انہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی، تو یہ

آیات اس آئین کی دفعہ پر مشتمل ہیں کہ شروع کے اندر جو کہا گیا تھا کہ اِحرام کی حالت میں شکار کو حلال نہیں سمجھنا، اس کی وضاحت کی جارہی ہے کہ اگر کسی سے یہ غلطی ہوجائے تو پھر اس کا تدارک کس طرح سے کیا جائے گا؟ جماعتی طور پر تو غلطی نہیں ہوئی، کہ جماعت کی جماعت ہی اس آئین کو مسخ کر کے رکھ دے جس طرح سے اسرائیلیوں نے کیا تھا، لیکن ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی فرد لغزش کھاجائے، عمداً بھی ہوسکتا ہے اور خطأً بھی ہوسکتا ہے، تو پھر آگے اس کی تلافی کی تدبیر بتادی گئی جو ایک سزا کی صورت میں ہے، تا کہ اُس کے ذریعے سے اپنی اس غلطی کو معاف کروالیا جائے اور اُس کی تلافی ہوجائے۔ ''اے ایمان والو! البتہ ضرور آزمائے گا اللہ تعالیٰ تمہیں کچھ شکار کے ذریعے سے'' تَنَالُهٗ اَیْدِیْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ: نَالَ یَنَالُ: پہنچنا، حاصل کرنا۔ پہنچیں گے اس شکار کو تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے، یعنی اتنا کثرت کے ساتھ آجائے گا، اتنا قریب آئے گا کہ ہاتھوں سے بھی پکڑ سکو گے، نیزوں سے بھی مار سکو گے۔

اللہ تعالیٰ آزمائش میں کیوں ڈالتے ہیں؟

اور یہ آزمائش اللہ کیوں کرے گا؟ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ: جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق ایسے موقع پر علم کی نسبت آتی ہے کہ تا کہ اللہ جان لے، اس کی توجیہ آپ کے سامنے کئی دفعہ کی جاچکی، کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ معلوم کرلے، جس کو آپ ان الفاظ میں ادا کرسکتے ہیں ''تا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ظاہر ہوجائے''، ویسے تو اللہ کو معلوم ہے کہ کس کے دل میں فرمانبرواری کا جذبہ ہے، کس کے دل میں فرمانبرداری کا جذبہ نہیں ہے، لیکن اس کا یہ علم ظاہر نہیں، تو جب یہ واقعہ پیش آجائے گا تو اللہ کا علم ظاہر ہوجائے گا، ہمیں بھی پتا چل جائے گا کہ اللہ کے علم میں یہ تھا کہ اِس نے غلطی کرنی ہے اور اِس نے نہیں کرنی، اللہ تعالیٰ کا علم اس طرح سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ یا اس میں امتیاز والا معنی ہوتا ہے، ''مِنْ'' اس کا صلہ بنالیا جائے تو اس میں امتیاز والا معنی ہوجاتا ہے ''تا کہ اللہ تعالیٰ ممتاز کرلے اپنے سے ڈرنے والوں کو اُن لوگوں سے جو کہ ڈرتے نہیں ہیں''، تو جب ''عَلِمَ'' کا صلہ ''مِنْ'' آجائے تو اس میں امتیاز اور تمیز والا معنی پیدا ہوجائے گا، پھر اس کے اندر کوئی کسی قسم کا ظاہری طور پر بھی اِشکال نہیں رہتا، یعنی یہ واقعات اللہ تعالیٰ اب بھیجیں گے اور یہ صورت حال پیش آئے گی تا کہ دونوں فریق ممتاز ہوجائیں کہ کون بن دیکھے ڈرتا ہے اور کون بن دیکھے نہیں ڈرتا، نہ ڈرنے والوں سے اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو ممتاز کرلے، ظاہری طور پر ان کے اندر امتیاز ہوجائے، یہ صورت ہے یہاں اللہ تعالیٰ کے جاننے کی، تو ''علم'' کا معنی ممتاز کرنا ہوجائے گا جبکہ اس کا صلہ ''مِنْ'' آئے، یہاں ایک فریق کا ذکر ہے، دوسرا فریق ''مِنْ'' کے بعد ہوجائے گا۔ تا کہ اللہ تعالیٰ ممتاز کرلے اُن لوگوں کو جو اس سے ڈرتے ہیں بن دیکھے، اُن لوگوں سے جو کہ اُس سے نہیں ڈرتے اور نہ ڈرنے کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ اِن دونوں فریقوں کو ظاہری طور پر ممتاز کردے، یہ مقصد ہے اللہ تعالیٰ کے امتحان کا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ: اس حکم کی وضاحت کے بعد جو کوئی شخص حد سے تجاوز کرے گا، یعنی شکار پر ہاتھ اٹھائے گا، اُس کو کوئی نقصان پہنچائے گا، فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اُس کے لیے دردناک عذاب ہے، اگر اس نے دُنیا کے اندر توبہ نہ کی، اُس کی تلافی نہ کی تو آخرت میں اُسے سزا ہوگی، اور اگر دُنیا کے اندر

توبہ کر لیتا ہے، اُس کی تلافی کر لیتا ہے تو جس طرح سے باقی گناہ جو اپنے اصل کے اعتبار سے عذاب کا باعث ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ معاف بھی ہو جاتے ہیں، اسی طرح سے یہاں بھی ہے۔

اِحرام کی حالت میں شکار کی سزا اور مُحرِم کے ذبیحہ کا حکم

اے ایمان والو! لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ: شکار کو قتل نہ کیا کرو اس حال میں کہ تم مُحرِم ہو، مُحرِم ہونے کی حالت میں شکار کو قتل نہ کیا کرو۔ مسئلہ فقہ کے اندر آپ نے پڑھا ہے، کہ مُحرِم کے لیے شکار کرنا حرام ہے، اور اسی طرح سے جو شکاری جانور ہے جس کو ہم وحشی جانور کہتے ہیں اگر وہ زندہ مُحرِم کے ہاتھ میں آ جائے تو مُحرِم کے لیے اُس کا ذبح کرنا حرام ہے، کیونکہ اس کو ذبح کرنا یہ بھی قتل کی صورت ہے، اسی لیے ہماری فقہ کے اندر یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ مُحرِم کا ذبیحہ میتہ ہے، اگر مُحرِم کسی شکاری جانور کو ذبح کر لے تو وہ میتہ کے حکم میں ہے، مردار ہے، نہ اس مُحرِم کے لیے کھانا جائز، نہ غیر مُحرِم کے لیے کھانا جائز، لیکن یہ مسئلہ صید سے تعلق رکھتا ہے اور جو جانور صید نہیں ہیں بلکہ وہ اہلی ہیں جو گھروں کے اندر پالے جاتے ہیں، مانوس جانور ہیں اُن کو مُحرِم ذبح بھی کر سکتا ہے اور کھا بھی سکتا ہے، یہ ممانعت وحشی جانوروں کے متعلق ہے، گھریلو جانوروں کے متعلق نہیں ہے، مرغی کو ذبح کر سکتا ہے، بکری بھیڑ کو ذبح کر سکتا ہے، پھر اُس کا ذبیحہ حلال ہے، خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسرے لوگ بھی کھا سکتے ہیں۔ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا: اور جو کوئی قتل کرے اُس شکار کو تم میں سے جان بوجھ کر، جان بوجھ کر کی قید لگا دی اس میں شناعت پیدا کرنے کے لیے، ورنہ اگر کوئی نسیاناً قتل کر دے بھول چوک کے ساتھ ہو جائے، بدلہ تو بھی دینا پڑے گا لیکن آخرت کا گناہ نہیں ہوگا، اور جان بوجھ کر قتل کرنے کی صورت میں آخرت کا گناہ بھی ہے، اسی طرح نسیاناً اگر قتل کر دے تو جزاء ساقط نہیں ہے، جزاء پھر بھی دی جائے گی، لیکن زیادہ شناعت اور زیادہ گرفت اس بات پر ہے کہ جان بوجھ کر تم ایسا کرو، یعنی تمہیں یاد ہے کہ تم مُحرِم ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ مُحرِم کے لیے شکار کرنا ٹھیک نہیں، پھر بھی تم نے یہ اقدام کر لیا، فَجَزَآءٌ: فَعَلَيْهِ جَزَآءٌ اس قتل کرنے والے کے ذمے بدلہ ہے، کتنا بدلہ؟ مِّثْلُ مَا قَتَلَ: جو مَا قَتَلَ کا مثل ہو (اس آیت کا ترجمہ و ترکیب اچھی طرح سے سمجھ لیجئے!) مَا قَتَلَ کا مثل ہو، مثلیت مالیت کے اعتبار سے ہو، یعنی اس کی مالیت اتنی ہونی چاہیے جو اس مقتول کے برابر ہو، اور یہ صفت لازمہ ہے جزاء کی، ہر صورت میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ قتل کیے ہوئے جانور کی مالیت کے برابر جزا دی جائے گی، اور دوسری صفت لازمہ ہے يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ، اُس مثلیت کا فیصلہ کریں گے تم میں سے دو آدمی عادل، ''عادل'' کا مطلب یہ ہے کہ نیک بھی ہوں، پھر خاص طور پر چونکہ یہاں قیمت کا اندازہ لگانا ہے تو وہ اشیاء کی قیمت کے اندر بصیرت رکھنے والے بھی ہوں، کیونکہ معاملات کے اندر جس جگہ شہادت کی ضرورت ہو فیصلے کی ضرورت ہو تو اُس قسم کے معاملے سے واقفیت ضروری ہے، جیسے آپ فقہ کے اندر پڑھا کرتے ہیں کہ کنواں پاک کرنے کی ضرورت ہو، سارا پانی نکالنے کی ضرورت ہو، تو صاحب بصیرت لوگوں سے پوچھ لیا جائے کہ یہ کتنے ڈول ہوں گے، تو اتنے ڈول نکال دیئے جائیں، جو مہارت رکھتے ہیں اندازہ لگانے کی، اس طرح سے جن کو اشیاء کی قیمت کا اندازہ ہے کہ ہرن کتنے کا بک سکتا ہے، اور فلاں چیز کتنے کی بک سکتی ہے، جو اس قسم کی چیزوں سے واقفیت رکھنے والے ہیں اُن میں سے دو آدمی فیصلہ کریں، دو کا ہونا افضل ہے ورنہ ایک آدمی کی تحقیق پر بھی مدار رکھا

جا سکتا ہے، وہ قیمت کا اندازہ لگالے تو اس کا اعتماد کیا جاسکتا ہے، تفسیروں میں یہ قول موجود ہے، یہ دو آدمی فیصلہ کریں۔

سوال:- محرم ہونے کی حالت میں شکار عمداً اور خطأً دونوں کا حکم ایک ہے تو قرآن پاک میں عمداً کی قید کیوں لگائی گئی ہے؟

جواب:- یہ بات تو میں نے آپ کے سامنے ذکر کردی، کہ مزید شناعت ظاہر کرنے کے لئے کہ عمداً غلطی کرنا زیادہ قابلِ گرفت ہے، آخرت کے گناہ کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، ورنہ دُنیا کے اندر جزاء کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال:- جب دُنیا میں حکم برابر ہے تو پھر خطأً کو ذکر کیوں نہیں کیا؟

جواب:- خطأً کو ذکر تو نہیں کیا، لیکن مسئلہ روایات سے خطأً کے متعلق بھی ایسے ہی ثابت ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور عمداً کا ذکر یہاں مزید شناعت ظاہر کرنے کے لئے ہے، گویا کہ آپ اپنی اصطلاح میں یوں کہہ لیجئے کہ مُتَعَمِّدًا کی قید احترازی نہیں، بلکہ یہ مزید وضاحت کے لئے ہے۔ جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰) سُود دُگنا چوگنا نہ کھایا کرو، اب اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اگر دُگنا چوگنا نہ ہو تو کھانا جائز ہے، بلکہ دُگنا چوگنا کھانا زیادہ بُرا ہے، اس لیے یہ عنوان اختیار کر دیا گیا۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے مُتَعَمِّدًا یہ زیادہ شناعت ظاہر کرنے کے لئے اور بُرائی ظاہر کرنے کے لئے اس کا اضافہ کیا گیا ہے کہ جان بوجھ کر قتل کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ناراضگی کی بات ہے، اس کا بدلہ بھی دیا جائے، توبہ استغفار بھی ہوگی، اور اگر خطأً قتل ہو جائے تو بدلہ دیا جائے گا اگرچہ آخرت کے اعتبار سے وہ گناہ نہیں ہے، معافی کی توقع ہے۔

يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں سے دو آدمی اُس مثلیت کا فیصلہ کریں گے کہ اِس شکار کئے ہوئے جانور کی مثل کتنی رقم ہے؟ اس کی مالیت کتنی ہے، یہ بھی صفت لازمہ ہے، اب یہ بات ہوگئی، کہ دو آدمیوں کے فیصلہ کرنے کے تحت طے پایا گیا کہ یہ جانور اتنی مالیت کا ہے، اور اتنی مالیت اس کی مثل ہے، اس کی رعایت تو ہر حال میں رکھی گئی، اب آگے تین اختیار دے دیئے گئے، کہ چاہے اب اس مالیت کو آپ ایک چوپائے کی شکل میں بدل لیں، اور اس کو کعبۃ اللہ میں ہدی بنا کر بھیج دیں، وہاں جا کر اس کو ذبح کیا جائے، ذبح کر کے اس کا گوشت فقراء کے اندر تقسیم کر دیا جائے، اور یا یہ ہے کہ اس مالیت کا غلّہ خرید کر ایک مسکین کو ایک صدقۃ الفطر کی مقدار دے دیں، اور یا اندازہ لگا کر کہ اس مالیت کا کتنا غلّہ آئے گا، اور اگر ہم اس کو مساکین پر تقسیم کریں تو کتنے مسکینوں پر تقسیم ہوگا، ایک مسکین کے حصے کا ایک روزہ رکھ لیا جائے، تو اس طرح سے بھی وہ کفارہ ادا کیا جاسکتا ہے، اس کا بدل ادا کیا جاسکتا ہے۔ تو طعامِ مسکین ہو یا روزے ہوں، اِن کے اندر بھی عادل کے فیصلے کا دخل بایں معنیٰ ہوا، کہ وہ مالیت کا فیصلہ کریں گے، اور پھر اس مالیت کو مساکین پر تقسیم کیا جائے گا، اور تقسیم کر کے اگر چاہیں تو اتنا غلّہ لے کے دے دیں، اور اگر چاہیں تو جتنے مسکینوں پر وہ غلّہ تقسیم ہوسکتا ہے اُن میں سے ہر مسکین کے حصے کا ایک ایک روزہ رکھے، تو جتنا صدقۃ الفطر کی مقدار بنے گی اتنے روزے رکھ لیے جائیں گے تاکہ وہ کفارہ ادا ہو جائے۔

اب یہ تین صورتیں ہوگئیں:

۱- ان میں سے پہلی صورت یہ ہے مِنَ النَّعَمِ، یہاں مبتدأ محذوف ہے هُوَ مِنَ النَّعَمِ: وہ مثل نَعَم میں سے ہو، نَعَم کہتے

ہیں اُن چوپایوں کو جو کہ گھر میں رکھے جاتے ہیں، پہلے بھی آپ کے سامنے اس کا ذکر آ چکا، بھیڑ بکری اونٹ گائے یہ نعم کا مصداق ہیں، تو اُس کی مثل نعم میں سے ہو جائے، جس وقت وہ نعم میں سے ہوگی تو پھر اُس کی صورت ہے هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ: یہ اُس سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اس حال میں کہ وہ ہدی ہو کعبہ کو پہنچنے والی۔ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ کے اندر چونکہ اضافت لفظی ہے اس لیے اضافت کے باوجود یہ معرفہ نہیں ہوگا اور هَدْيًا کی صفت بن جائے گی، هَدْيًا موصوف اور بٰلِغَ الْكَعْبَةِ صفت، صفت موصوف مل کر یہ حال ہے النَّعَمِ سے، ''اس حال میں کہ وہ چوپایہ ہدی ہو کعبے کو پہنچنے والی'' چونکہ مسئلہ یہی ہے کہ پھر اگر بکری وغیرہ آپ نے لی ہے اس مالیت کی، تو پھر اُس کو حرم کے اندر لے جا کر ذبح کرنا ضروری ہے، ذبح کرنے کے بعد پھر اُس کا گوشت وہیں فقراء کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے، اور اس کو جو مقدم کر کے ذکر کیا ہے دونوں صفاتِ لازمہ کے درمیان میں، حالانکہ ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ دونوں صفتیں جو کہ لازم ہیں جزاء کے لیے ان کو اکٹھا ذکر کیا جاتا، اور بعد میں مِنَ النَّعَمِ کو ذکر کرتے، لیکن یہاں مِنَ النَّعَمِ کو مقدم کر دیا، اس کے افضل ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے، کہ اس کا نعم میں سے ہونا افضل ہے، کہ اس کا بدلہ جو دیا جائے تو اس کو چوپائے کی شکل میں تبدیل کر کے کعبۃ اللہ کے اندر بھیج دیا جائے، وہاں جا کر اراقۃ الدم ہو جائے، اور وہاں کے فقراء پر یہ تقسیم ہو جائے، تو اس لحاظ سے یہ افضل ہے، افضل ہونے کی وجہ سے اس کو مقدم کر کے ذکر کر دیا، تو اگر جانور لیں گے تو اس کو کعبہ کی طرف ہدی بنا کر بھیجنا ضروری ہے، وہاں جا کر اس کو ذبح کیا جائے، ذبح کرنے کے بعد پھر فقراء کے اندر اس کا گوشت تقسیم کر دیں۔

۲- اور دوسری صورت یہ ہے کہ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ: وہ مثلیت کفّارے کے طور پر اداء کر دی جائے طعامِ مساکین، طعامِ مساکین یہ کفّارہ کا بیان ہے، اب یہ طعامِ مساکین کتنا ہونا چاہیے، اس کا اندازہ بھی وہی عادلوں کے فیصلے کے تحت ہوگا کہ وہ کتنی مالیت تجویز کرتے ہیں، اور اس مالیت کو پھر ایک فقیر پر بقدر صدقۃ الفطر تقسیم کریں تو کتنے مسکینوں کو آ سکتا ہے، اتنے مسکینوں کو دے دیا جائے، اور اگر آخر میں تھوڑی سی مقدار رہ جائے، تو تھوڑی سی مقدار دے دی جائے گی، اس میں صدقۃ الفطر کی مقدار کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے، مثال کے طور پر صدقۃ الفطر پونے دو سیر گندم بنتی ہے، تو پونے دو سیر پونے دو سیر دیتے گئے، اور آخر میں جا کر ایک سیر بچ گئی، تو ایک سیر ہی کسی مسکین کو دے دو، پھر اُس کو پونے دو سیر کرنا ضروری نہیں۔ تو عادلوں نے فیصلہ مثلیت کا کیا، مثلیت کا غلہ خرید کر پھر اس طرح سے مساکین کے اوپر تقسیم کر دو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَوْ كَفَّارَةٌ کو اَوْ هُوَ كَفَّارَةٌ کہہ دیں گے، ''هُوَ'' ضمیر مثل کی طرف لوٹ جائے گی ''یا وہ مثل کفّارہ ہو مساکین کا کھانا''۔ مرجع کی رعایت کرتے ہوئے مذکر کا لفظ بول سکتے ہیں، اور خبر کی رعایت رکھتے ہوئے هِيَ كَفَّارَةٌ بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ جو ضمیر دائر ہو جائے مرجع کے درمیان اور خبر کے درمیان، تو اس میں دونوں کی رعایت رکھنی جائز ہے، اگرچہ اَولیت میں فرق ہے کہ مرجع کی رعایت رکھنا اَولیٰ ہے یا خبر کی رعایت رکھنا اَولیٰ ہے، تو مرجع کی رعایت رکھیں گے تو هُوَ كَفَّارَةٌ کہہ دیں گے، اور خبر کی رعایت رکھیں گے تو هِيَ كَفَّارَةٌ کہہ دیں گے۔ ''مساکین کا کھانا''۔

۳- اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا: ذٰلِكَ کا اشارہ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ کی طرف ہے، کیونکہ روزوں کا اندازہ جو کرنا ہے تو اُس کا مدار ہے طَعَامُ مَسٰكِيْنَ پر، کہ کتنے مساکین کو وہ کھانا دیا جا سکتا ہے اس کے برابر روزے رکھ لیے جائیں، اس طعام کے برابر۔ عَدْلُ ذٰلِكَ کی اضافت کے اندر چونکہ ابہام آ گیا، تو صِيَامًا بطور تمیز کے منصوب ہے، مطلب یہ ہو گیا کہ ''اس کے برابر از روئے روزہ رکھنے کے''،

اور روزوں کے ساتھ برابری یوں ہی ہوگی کہ ایک مسکین کے حصے میں ایک روزہ رکھ لیا جائے۔ تو یہ تین صورتیں ہوگئیں، ان تینوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرلی جائے اُس کی جزاء ادا ہو جاتی ہے۔

لِيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ: یہ اللہ تعالیٰ نے جزاء مشروع کی اور یہ حکم دیا کہ بدلہ دیا جائے، تا کہ قاتل آدمی جانور کو قتل کرنے والا اپنے اَمر کی سزا چکھ لے، یہ ایک سزا ہے جو اُس کو دی گئی ہے، عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ: جو کچھ پہلے ہو چکا اس سے اللہ تعالیٰ درگزر کر گیا، آئندہ کے لیے محتاط رہیو، اس قانون کی وضاحت کے بعد آئندہ یہ غلطی نہ ہونے پائے، ''اللہ تعالیٰ زبردست ہے انتقام والا ہے'' یہ ہمیشہ آپ کے سامنے عرض کرتا رہتا ہوں کہ اَحکام کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو جو ذکر کیا کرتے ہیں تو اس میں وہی ترغیب وترہیب والا پہلو ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ جو تمہارا خالق ہے مالک ہے، تمہارے اُوپر حاکم ہے، جو تمہیں یہ اَحکام دے رہا ہے اُس کو سمجھ لیجئے کہ وہ عزیز بھی ہے اور انتقام والا بھی ہے، تو اس سے بچ نہیں سکو گے اگر اس کے اَحکام کی مخالفت کرو گے۔

حالتِ اِحرام میں بَرّی اور بحری شکار کا حکم

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ: اب یہاں خشکی کے شکار کا حکم آیا تو ساتھ ہی بحری شکار کا ذکر بھی آ گیا، ''صید'' یہ مصدر ہے۔ ''سمندر میں شکار کرنا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا اور اس کا کھانا بھی حلال کر دیا گیا'' دو باتیں ذکر کر دیں، خشکی میں تو شکار کرنا ہی جائز نہیں تھا، اور اگر کوئی شخص محرِم نہ ہو اور وہ محرِم کے کہنے کے بغیر شکار کر لے تو اُس خشکی کے شکار کا کھانا جائز تھا، اور اگر محرِم کی طرف سے اشارہ ہے، دلالت ہے، حکم ہے، تو ایسی صورت میں محرِم کے لیے وہ خشکی کا شکار کھانا بھی حرام ہے چاہے کسی دوسرے کا کیا ہوا ہے۔ یہ مسئلہ فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں، اگر محرِم نے حکم نہیں دیا، نہ اس نے کوئی اشارہ کیا، نہ کوئی دلالت کی، نہ کوئی اعانت کی، اپنے طور پر کسی غیر محرِم نے شکار کیا، اور پھر خود ذبح کیا، ذبح کرنے کے بعد اگر وہ ہدیہ محرِم کو دے دے تو محرِم کھا سکتا ہے، اور اگر اس کی طرف سے اَمر ہو جائے یا اشارہ ودلالت ہو، یا کسی قسم کی اس شکار کے اندر اعانت ہو، تو پھر غیر محرِم کا کیا ہوا شکار بھی اِس محرِم کے لیے حلال نہیں ہے۔ لیکن سمندری شکار خود بھی پکڑ سکتا ہے، اور پکڑنے کے ساتھ ساتھ اُس کو کھا بھی سکتا ہے، باقی اس ''شکار'' کا مصداق ہمارے ہاں صرف مچھلی ہے، اور یہ اجازت کیوں دے دی؟ ''تمہارے نفع کے لیے بھی اور مسافرین کے نفع کے لیے'' کہ جب کوئی مسافر خشکی کے اندر سفر کرتا ہے اور اس سے زادِ راہ ختم ہو جائے، اُس کے پاس زادِ راہ نہ رہے، تو انسان اپنے گزران کے لیے ہزار حیلے کر سکتا ہے، لیکن جب دریا میں سفر ہو رہا ہو، سمندر میں سفر ہو رہا ہو، اور کسی قسم کی ایسی ضرورت پیش آ جائے، تو وہاں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ سمندر کے شکار پر ہی گزارہ کیا جائے، اس لیے عام مسافرین کی سہولت کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے چھٹی دے دی، کہ سمندر میں شکار کر بھی لیا کرو اور اُس کو کھا بھی لیا کرو، تمہارے نفع کے لیے بھی ہے، خصوصیت کے ساتھ جو اِحرام باندھ کر آئے ہوئے ہیں، اور عام مسافرین کے نفع کے لیے، کہ جو سمندر میں سفر کرنے والے ہیں اُن کے لیے سمندر کے شکار کی اور اُس کے کھانے کی اہمیت زیادہ ہے، تو ''صید'' سے دریائی جانور مراد لے لیں تو پھر مضاف محذوف نکالیں گے، ''بیان القرآن'' میں یہی توجیہ اختیار کی گئی، کہ ''صید'' سے مصید مراد ہے، شکار کیا ہوا، اور پھر مضاف محذوف نکالیں گے

اُحِلَّ لَكُمْ اَلصَّیْدُ الْبَحْرِ کہ بحر کے صید کا پکڑنا تمہارے لیے ٹھیک، اور''صید'' کا مصداق مچھلیاں ہیں، اُن کو پکڑ سکتے ہو اور پھر اُن کا کھانا بھی ٹھیک ہے، پکڑنے کی بھی اجازت ہے اور کھانے کی بھی اجازت ہے۔ اور اگر مصدر کے معنی میں لیں تو ترجمہ اُس طرح سے ہوگیا کہ''سمندر میں شکار کرنا بھی حلال کر دیا گیا اور اس کا کھانا بھی حلال کر دیا گیا'' مَتَاعًا لَّكُمْ: تمہیں نفع پہنچانے کے لئے، تمہارے نفع کے لیے اور مسافرین کے نفع کے لیئے، وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ: اور حرام کر دیا گیا تم پر خشکی میں شکار کرنا، مَا دُمْتُمْ حُرُمًا: جس وقت تک کہ تم محرِم ہو، ہاں البتہ باقی رہ گیا اس کا کھانا! تو خود شکار کر کے تو کھانا بھی حرام، اور اگر کوئی دوسرا شکار کر لے بغیر آپ کے شمولیت کے، کہ نہ آپ کا اُمر ہے، نہ اشارہ ہے، نہ دلالت ہے، تو ایسی صورت میں کسی دوسرے کا شکار کیا ہوا محرِم کھا سکتا ہے، اس لیے یہاں حرمت کی نسبت صرف صید کی طرف کی گئی ہے، تو یہاں مصدری معنی کے طور پر بات ہوگی''خشکی میں شکار کرنا تم پر حرام کر دیا گیا جب تک کہ تم محرِم ہو'' وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: اور ڈرتے رہو اس اللہ سے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے۔

ماقبل سے ربط

اب یہ احرام کی حالت میں شکار کا ذکر آیا، تو احرام کو بیت اللہ کے ساتھ چونکہ مناسبت ہے، تو یہاں بیت اللہ اور اُس کے متعلقات کا ذکر بھی آ گیا، جیسے بعینہٖ اسی سورت میں غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے بعد بھی بیت اللہ اور اُس کے متعلقات کا ذکر تھا۔

بقائے عالم بقائے بیت اللہ سے وابستہ ہے

''اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو بیت حرام ہے حرمت والا گھر ہے لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا، لوگوں کی مصلحتوں کے قائم ہونے کا ذریعہ بنایا۔''''لوگوں'' سے کیا مراد ہے؟ اگر تو ساری دُنیا کے انسان مراد ہوں پھر تو ایک معنوی چیز کی طرف یہاں اشارہ ہے جس کو ہم حسی طور پر معلوم کرنے سے عاجز ہیں، پھر یہ وہ مضمون ہے جو احادیث سے ثابت ہے کہ جس وقت تک یہ بیت اللہ قائم ہے اور اس بیت اللہ کی نسبت کے ساتھ لوگ اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں، اُس وقت تک یہ دُنیا قائم ہے اور انسان باقی ہیں، اور جس وقت یہ بیت اللہ ختم ہو جائے گا، لوگ اس کی نسبت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنا چھوڑ دیں گے، ایسی صورت میں پھر ساری کی ساری کائنات برباد ہو جائے گی، تباہ ہو جائے گی، اور قیامت آ جائے گی، تو گویا کہ بیت اللہ کا اس دُنیا سے اُٹھ جانا، اس کا گر جانا، ڈھے جانا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اب جہان ختم ہونے والا ہے، چنانچہ احادیث میں یہ مضمون وضاحت کے ساتھ آتا ہے، آخر وقت میں ایک حبشی آئے گا، اُس وقت کا بادشاہ ہوگا، وہ آ کے جس طرح سے حدیث شریف میں لفظ آتا ہے:''يَقْلَعُهَا حَجَرًا حَجَرًا'' اس کے ایک ایک پتھر کر کے اکھیڑ دے گا،[1] اور یہ بیت اللہ ختم ہو جائے گا، جب بیت اللہ ختم ہو جائے گا تو اس کے بعد متصل ہی اس دُنیا کو برباد کر دیا جائے گا، پھر یہ دُنیا باقی نہیں رہ سکتی، گویا کہ اس عالم کا بقا اگر ہے تو بیت اللہ کی بقا کے ساتھ ہے، اس اعتبار سے تو بیت اللہ گویا کہ عمود ہے اس دُنیا کا، جس طرح سے عمارت کا درمیانی ستون ہوتا ہے، کہ جب وہ گر جائے تو پھر عمارت گر جاتی ہے،

(۱) صحیح البخاری، باب ہدم الکعبۃ ج۱ ص۲۱۷ عن ابی ہریرۃ ؓ۔ / مشکوٰۃ ۲۳۸/۱ باب حرم مکۃ، فصل اول۔

اسی طرح سے کائنات کا درمیانی ستون یہ بیت اللہ ہے، کیونکہ یہ عمود ہے عالم کا اور اس کے اٹھ جانے کے بعد یا اس کے برباد ہوجانے کے بعد عالم باقی نہیں رہ سکتا، یہ حساً معلوم کرنے کی چیز نہیں، بلکہ شارع علیہ السلام کے اطلاع دینے کے ساتھ ہی ہمیں اس کا پتا چلا، باقی اس کی صداقت اُس وقت معلوم ہوگی جب یہ واقعہ پیش آئے گا، اس سے پہلے ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے ذریعے سے ہم یہ مشاہدہ کروادیں، کہ اس کی حیثیت کائنات کے لیے ایک عمود کی ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے بیان کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے، اور ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ بیت اللہ کی حیثیت یہی ہے، جس طرح سے شارع علیہ السلام کے بیان کے ساتھ اور حقائق غیبیہ کو ہم قبول کرتے ہیں جن کو ہمارے عقل اور ادراک پا نہیں سکتا، اسی طرح سے ہم اُن کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی قبول کرتے ہیں۔

اور اگر الناس سے مراد خاص طور پر عرب لے لیا جائے تو پھر یہ بات بالکل ہی واضح ہے، کہ عرب جو کہ اُس وقت خانہ جنگی میں مبتلا تھے، اور ہر لحاظ سے افراتفری تھی، تو بیت اللہ ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعے سے اُس ملک کے اندر کچھ امن تھا، کہ بیت اللہ کی نسبت سے حرم کا علاقہ بھی مامون تھا، اور جو لوگ بھی بیت اللہ کا حج کرنے کے لیے یا عمرہ کرنے کے لیے آتے اور اپنے اوپر وہ حاجی اور معتمر ہونے کی علامت لگالیتے، اُن کو کوئی شخص چھیڑا نہیں کرتا تھا، کوئی لوٹتا نہیں تھا، کوئی مارتا نہیں تھا، جن جانوروں کو بیت اللہ کی طرف ہدی بنا کر بھیجا جاتا تھا وہ بھی محفوظ ہوجاتے تھے، اور بیت اللہ کے ساتھ نسبت کی وجہ سے ان سب کی جان کو اور مال کو تحفظ حاصل ہوجاتا تھا اُس دور میں، یعنی باوجود اس بات کے کہ وہ دور جاہلیت کا تھا لیکن بیت اللہ کی محبت اور بیت اللہ کی عظمت اللہ تعالیٰ نے اُن کے قلوب کے اندر پیوست کر رکھی تھی، اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے میں وہ لوگ بہت ہی اُوچھے انداز کے ساتھ کوشش کرتے تھے، لیکن اگر باپ کا قاتل بھی حرم کے اندر مل جاتا تو بیٹا آنکھ نیچی کرکے پاس سے گزر جاتا تھا، اُس کے ساتھ بھی تعرض نہیں کرتا تھا، اور اسی طرح سے اَشْهُرِ حُرُم۔ تو اللہ تعالیٰ نے جو اُن کی فطرت کے اندر یہ بات ڈال دی تھی، اُن کے قلوب میں پیوست کردی، تو گویا کہ اس علاقے کے لیے تمام مصلحتوں کے قائم ہونے کا ذریعہ بیت اللہ تھا۔ تو اِس میں بھی بیت اللہ کی عظمت بیان کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے یعنی اہلِ عرب کے لیے خصوصاً اور پھر جو بیت اللہ کے ساتھ مجاورت رکھتے تھے قریش، جو کہ اوّلین مخاطب ہیں قرآن کے، وہ تو علی الخصوص فائدہ اٹھاتے تھے بیت اللہ کی برکات کا، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش کے اندر خصوصیت سے ذکر کیا ہے، کہ اُس ربِ بیت کی عبادت کرو جس نے تمہیں بھوک کے وقت میں کھانا کھلایا اور خوف کے وقت میں امن دیا، اور یہ بھوک کے وقت میں کھانا یہ بیت اللہ کی برکت سے اُن کو ملتا تھا، کہ بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے یہ لوگ تجارتی سفروں میں جاتے تو کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا تھا، اور اِن کو بیت اللہ کا مجاور سمجھ کر اِن کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس طرح سے ان کے معاش کا مسئلہ بھی حل ہوتا تھا اور اِن کے جان اور مال کو بھی تحفظ حاصل تھا۔ پھر یہ لوگ جو بیت اللہ کی برکات حاصل کرتے تھے خصوصیت کے ساتھ اُن کے لیے یہ انعام ذکر کیا جارہا ہے، ''اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو بیت حرام ہے حرمت والا گھر ہے لوگوں کی مصلحتوں کے قائم ہونے کا ذریعہ بنایا، اور شہرِ حرام کو اور ہدی کو اور قلائد کو'' اس میں بھی ایسے ہی ہے، کہ ہدی اور قلائد یہ بھی اُس وقت ایک امن کا باعث تھے، کہ جب کسی جانور کے اُوپر یہ علامت لگادی جائے جس سے معلوم

ہو جائے کہ یہ ہدی ہے اور یہ جانور بیت اللہ کی طرف جا رہا ہے، تو ایسی صورت میں لوگ اُسے سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ قلائد: ذوات القلائد جن کے گلے کے اندر قلادہ ڈال دیا جائے، یہ بھی علامت ہوتی تھی اُس کے ہدی ہونے کی، ھدی عام ہے اور ذوات القلائد اُس میں سے خاص ہے، چھوٹے جانوروں کے گلے میں عموماً قلادے نہیں ڈالے جاتے تھے، بڑے جانوروں کو قلادے ڈال کر روانہ کیا جاتا تھا۔

اَحکامِ خداوندی میں مصلحتیں کیا ہیں؟

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا: یہ اَحکام جو تمہیں دیئے جا رہے ہیں تو اس لیے دیئے جا رہے ہیں کہ تاکہ تم ان کی مصلحتوں میں غور کر کے یہ یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ذرّے ذرّے پر حاوی ہے، اس لیے وہ اپنی کائنات کی مصالح کی رعایت رکھتا ہوا کیسی کیسی ہدایات دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے علم کا یقین ہی ایک ایسا ہے جو انسان کو عمل پر بھی برانگیختہ کرتا ہے، کہ جب یہ بات ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ ذرّے ذرّے کو جانتا ہے اور ہمارا کوئی حال اس سے مخفی نہیں، تو پھر جو شخص اللہ تعالیٰ کی عظمت کا معتقد ہے وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، اَحکام کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، چاہے اُس کو کوئی دیکھنے والا ہو چاہے دیکھنے والا نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کے علم کا مراقبہ اور اللہ تعالیٰ کے علم کا یقین یہ انسان کو نیکی پر برانگیختہ کرتا ہے اور بُرائی سے روکتا ہے، اور اگر یہ یقین نہ ہو یا عقیدے کے اندر یہ پختگی نہ ہو تو پھر خلوت میں، رات کی تاریکی میں، اندھیرے میں، کسی ایسی جگہ کہ جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو انسان اپنے اُوپر کوئی کسی قسم کی پابندی نہیں لگا سکتا، اور اللہ کے علم کے متعلق عقیدہ اگر پختہ ہو جائے تو پھر انسان کسی جگہ بھی کسی وقت بھی کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا، اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، ''تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان سب چیزوں کو جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں'' وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اور اس بات کا یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، گویا کہ يَعْلَمُ یہ فعل کی صورت میں ذکر کر دیا، اور عَلِيْمٌ یہ صفت کی صورت میں ذکر کر دیا، تاکید در تاکید ہے کہ اللہ کا علم تمام زمانوں پر اور تمام مکانوں پر حاوی ہے، اس میں ماضی مستقبل حال کی کوئی تقسیم نہیں، ہر وقت ہر چیز کا علم اللہ تعالیٰ کو ہر طرح سے حاصل ہے۔

ایمان کے اندر کمال کب پیدا ہوتا ہے؟

''اور یہ بھی یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ہے اور یہ بھی یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے'' یعنی اس میں دونوں صفتیں ہیں، اگر گڑبڑ کرنے کی کوشش کرو گے تو ادھر شَدِيْدُ الْعِقَابِ بھی ہے، اس سے خوف پیدا ہوتا ہے، اور غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بھی ہے، اس سے رجاء پیدا ہوتی ہے، اور ''الإيمانُ بينَ الخوفِ والرَّجاءِ'' جس طرح سے آپ کہا کرتے ہیں، ایمان کا کمال یہی ہے کہ اللہ سے ڈرو بھی اور اللہ کی رحمت سے امید بھی رکھو، صرف ڈرنا کہ بالکل مایوسی طاری ہو جائے یہ بھی شرعاً محمود نہیں ہے، کہ خوف ہی خوف کی کیفیت ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید بالکل نہیں، اور بالکل امید ہی لگا لینا یہ بھی انسان کو جری کر دیتا ہے اور بےعملی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے ''الإيمانُ بينَ الخوفِ والرَّجاءِ'' ایمان خوف اور رجاء کے درمیان درمیان

ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو بھی اور اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید بھی رکھو، خوف کی شدت انسان کو مایوس کر دیتی ہے، اور مایوسی کے نتیجے میں بھی بے عملی آجاتی ہے، اگر انسان کے دل میں یہ آجائے جیسے کسی پر کوئی استاذ ناراض ہو گیا، اور وہ اس طالب علم پر ناراض ہونے کے بعد کسی صورت میں راضی ہی نہیں ہوتا، طالب علم کے دل میں یہ بات آگئی کہ یہ تو ہزار کوشش کر و وہ مانے گا ہی نہیں، جب مانے گا ہی نہیں تو اس کے نتیجے میں لا پروائی آجاتی ہے، کہ اچھا نہیں مانتے تو پھر ہمیں منانے کی ضرورت بھی کیا ہے، تو یہ لا پروائی بھی انسان کو دُور کر دیتی ہے، اسی طرح سے اگر اللہ سے انسان یوں ڈرنے لگ جائے کہ ہم ہزار کوشش کریں اللہ کے عذاب سے بچ ہی نہیں سکتے، ہمارا تو رگڑا نکلا ہی نکلا، اس قسم کی کیفیت اگر ہو جائے تو پھر اس کے بعد انسان کہتا ہے کہ چلو، جہنم میں تو جانا ہی ہے، دُنیا میں تو عیش کر لو، اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام سے لا پروائی شروع ہو جاتی ہے، اور اسی طرح سے جو رجاء کا غلبہ ہے کہ انسان اپنے دل میں یہ بٹھالے کہ بس اللہ تو غفور رحیم ہے اُس نے تو معاف کرنا ہی کرنا ہے، تو پھر یہودیوں کی طرح بے باکی آجائے گی، اور اس بے باکی کے نتیجے میں پھر اللہ کے احکام کی پروا نہیں رہے گی، تو ایمان کے کمال کے لیے یہ دونوں حدیں ہیں کہ ڈرو بھی اور اللہ کی رحمت سے امید بھی رکھو، تب جا کے ایمان کا کمال پیدا ہوتا ہے، نہ تو مایوسی آنی چاہیے اور نہ انسان کے اندر کسی قسم کی جرأت اور دلیری پیدا ہونی چاہیے۔

رسول کی ذمہ داری

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلٰغُ: رسول کے ذِمّے پہنچا دینا ہے، اُس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی، اب تم ذمہ دار ہو کہ ان اَحکام پر عمل کرتے ہو یا نہیں کرتے؟ عمل کرو گے تو فائدہ اٹھا لو گے، نہیں کرو گے تو پکڑے جاؤ گے، اب اس سے زائد ہمارے رسول پر ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔ ''اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو'' دیکھو! اس صفت کا اظہار کتنا کیا جا رہا ہے کہ یہ انسان کے باطن پر گرفت کرنے والی بات ہے، کہ جب یہ بات باطن کے اندر بیٹھ جائے گی کہ ہمارا کوئی حال اللہ سے مخفی نہیں، اور یہ عقیدہ صحیح ہو جائے گا، تو ایسے وقت میں پھر اَحکام پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ماحول کے ساتھ موافقت کا فتنہ

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ: یہاں بھی ایک فتنے کا سدباب کرنا مقصود ہے، کہ بسا اوقات انسان اپنی عقل کے ساتھ یا اپنی فطرتِ صحیحہ کے ساتھ یا علمی دلیل کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ فلاں کام غلط ہے اور یہ خبیث ہے، انسان کسی کام کے بُرے ہونے کی تعیین کر لیتا ہے، اور اسی طرح سے عقل کے ساتھ، علم کے ساتھ، فطرت کے ذریعے سے کسی کام کو اچھا بھی قرار دے لیتا ہے، اب چاہیے تو یہ کہ اچھائی کو اختیار کیا جائے بُرائی سے بچا جائے، اچھوں میں شامل ہونے کی کوشش کی جائے بُروں سے دُور رہا جائے، لیکن کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بُرائی کثرت پکڑ جاتی ہے اور وہ عام ہو جاتی ہے، اتنی عام ہو جاتی ہے کہ یوں سمجھو کہ انسان جدھر دیکھے بُرائی ہی بُرائی ہے، اور اس بُرائی کے حامل بُرے لوگ اتنی کثرت کے ساتھ ہو جاتے ہیں کہ انسان کو دُنیا

بھری ہوئی نظر آتی ہے، تو پھر بسا اوقات انسان کی کمزوری اس ماحول کے مقابلے میں انسان کو جھکا دیتی ہے، اور انسان کہتا ہے کہ جب زمانے کا چلن ہی یہی ہو گیا، اب طرز یہی ہے، اب کیا کریں، اگر ہم اِن کے ساتھ نہیں چلیں گے تو قدم قدم پر مزاحمت ہوتی ہے، قدم قدم پر ہمارے لیے مصیبت آتی ہے، تو پھر انسان اس ماحول کے مطابق چل پڑتا ہے، خُبث اس کی نظر میں خبث نہیں رہتا، خبیث اس کی نظر میں خبیث نہیں رہتا، بلکہ زمانے کی ہوا کے ساتھ ساتھ اسی گندے راستے پر چل کر وہ بھی ان خبیثوں میں شامل ہو جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ حمام میں سب کو ننگے دیکھ کر انسان کا بھی جی چاہنے لگ جاتا ہے کہ میں بھی کپڑے اتار ہی دُوں، اور جب ننگے ہی رہنے کا رواج عام ہو جائے تو پھر ننگوں سے نفرت نہیں ہوگی، اور اگر کوئی کپڑے پہن کے آجائے گا تو لوگ اس کی طرف انگلیاں اٹھائیں گے، ایسا ماحول بھی بن جاتا ہے، تو کثرتِ خبیث، بُرائی کی کثرت اور خبیثوں کی کثرت کبھی کبھی انسان کو تعجب میں ڈال دیتی ہے، اور اس وقت وہ اپنے باطن سے مزاحمت کو ختم کر کے اسی ڈار اور قطار میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے، جیسے کہ عام طور پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ''چلو اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو'' کہ جدھر کی ہوا رُخ اختیار کیے ہوئے ہے تم بھی ادھر کو چلو گے تو آسانی سے چلتے چلے جاؤ گے، اور اگر ہوا کے رُخ کے خلاف چلنے کی کوشش کرو گے تو پھر تمہیں مزاحمت اختیار کرنی پڑے گی، تو کیا ضرورت ہے کہ ہر وقت اِس اُدھیڑ پن میں مبتلا رہو، جو زمانے کی روش ہے اُسی کو اختیار کرو تا کہ زندگی آسانی کے ساتھ گزرتی چلی جائے، یہ گمراہی کا ایک بہت بڑا اُصول ہے، زمانہ سازی جس کو کہتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ موافقت کرو، جس قسم کے حالات ہوں انسان کو انہی حالات میں شامل ہو جانا چاہیے، تا کہ انسان کی زندگی آسانی کے ساتھ گزرے، یہ اُصول بے دینی کے ساتھ تو موافقت رکھ سکتا ہے، دِین داری کے ساتھ یہ اُصول موافقت نہیں رکھتا۔

مذکورہ فتنے کا سدِّ باب

انبیاء علیہم السلام جب آیا کرتے ہیں مخالف ماحول میں آتے ہیں، اور ہر ماحول کے ساتھ اُن کا ٹکراؤ ہوتا ہے، تو شرافت کا تقاضا یہ ہے، علم کا تقاضا یہ ہے، عقل کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح اُصول کو اختیار کر کے اُس کے مطابق اپنا ماحول بنایا جائے، نہ کہ غلط ماحول کے اندر جا کر انسان اُس کے مطابق بدل جائے، جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا تَکُوْنُوْا اِمَّعَةً: اِمَّعَةً نہ بنو، اِمَّعَةً کا معنی ہے کہ یہ نعرہ اختیار نہ کرو اِنَّا مَعَ النَّاسِ کہ ہم تو لوگوں کے ساتھ ہیں، اِنْ اَحْسَنُوْا اَحْسَنَّا: اگر لوگ اچھائی اختیار کریں گے تو ہم بھی اچھائی اختیار کریں گے، اِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا: اور اگر لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ساتھ ظلم کرنے لگ جائیں گے، یہ نظریہ ٹھیک نہیں ہے، لَا تَکُوْنُوْا اِمَّعَةً: اِنَّا مَعَ النَّاسِ یہ نظریہ نہ اختیار کرو، بلکہ فرمایا کہ وَطِّنُوْا اَنْفُسَکُمْ اپنے نفسوں کو اس بات کا عادی بناؤ، اس موقف پر ٹھہراؤ کہ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ فَاَحْسِنُوْا مَعَهُمْ کہ اگر لوگ اچھے کام کرتے ہیں تو اُن کے ساتھ مل کر تم اچھے کام کرو، اور اگر وہ لوگ ظلم کرتے ہیں تو پھر اُن کا ساتھ نہ دو، اُن کے ساتھ مل کر ظلم کی کیفیت اختیار نہ کرو، اچھائی میں تو لوگوں کے

ساتھ رہو، برائی میں لوگوں کے ساتھ نہ رہو، اپنے نفسوں کو اس بات کا عادی بناؤ، اپنے نفسوں کو اس موقف پر ٹھہراؤ، اب اگر کثرتِ خبیث بھی ہو جائے اور یہ تمہیں تعجب میں بھی ڈالتی ہے، لیکن یہ خبیث چیز خبیث ہی ہے، اور خبیث چیز جہنم میں لے جانے والی ہے، اور اگر تم اُس کے ساتھ شامل ہو جاؤ گے تو جہنم میں جاؤ گے، کسی چیز کا کثرت اختیار کر جانا اُس کے اچھے ہونے کی دلیل نہیں، اچھائی ثابت ہوتی ہے اُس کی ذاتی کیفیات کے ساتھ، کسی چیز میں اچھائی ثابت ہوگی علمی دلیل کے ساتھ، عقلی دلیل کے ساتھ جس میں اچھائی ثابت ہو جائے اُس کو اختیار کرو، باقی کسی چیز کا بہتات اختیار کر جانا، کسی فیشن کا عام ہو جانا، اور کسی رسم کا گھر گھر میں داخل ہو جانا، یہ اُس کے اچھے ہونے کی علامت نہیں ہے، جب وہ چیز بُری ہے آخر کار جہنم میں جانے والی ہے اگر ساری دُنیا بھی اُس کو اختیار کر لے گی تو اُس کی اچھائی کا ثبوت نہیں، بلکہ وہ ساری دُنیا کو لپیٹ کر جہنم کے اندر لے جائے گی، تو یہ گمراہی کا ایک بہت بڑا اُصول ہے کہ انسان ماحول سے متاثر ہو کر کثرت کو دیکھ کر اس قسم کا کردار اپنانے کی کوشش کرے جس قسم کا عام لوگوں نے اپنایا ہوا ہے، اور علامہ اقبال اسی بات کے متعلق کہتے ہیں کہ

"حدیث بے خبراں ہے کہ تو با زمانہ بساز"

یہ تو بے خبروں والی بات ہے کہ تم زمانے کے ساتھ موافقت کرو۔

"زمانہ با تو نہ سازد، تو بہ زمانہ ستیز"

(بالِ جبریل، غزل: ۱۲)

اگر زمانہ تیرے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تو زمانے کے ساتھ لڑتا رہ، اور لڑتا ہوا اس دُنیا سے چلا جا، یہ ہے اہلِ حق کا کام، یہ نہیں کہ زمانے کی رَوِش کو دیکھ کر اپنا موقف چھوڑ کر انسان اُن کے ساتھ شامل ہو جائے۔ تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ متنبہ کرتے ہیں کہ خبیث اور طیب برابر نہیں، اس سے چیز بھی مراد ہو سکتی ہے اور انسان بھی مراد ہو سکتے ہیں، "یہ دونوں برابر نہیں ہیں اگرچہ کثرتِ خبیث تجھے تعجب میں ہی ڈالے" یعنی کتنی کثرت کیوں نہ پیدا ہو جائے، جس کو دیکھ کر تیرے اُوپر یہ اثر پڑے کہ یہ تو سارے کے سارے ایسے ہو گئے، تو بھی آپ خبیث کو اختیار نہ کیجئے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ: یہاں "اولی الالباب" کا عنوان اختیار کیا کہ "اے عقل والو! اللہ سے ڈرتے رہو" اور اللہ سے ڈرنے کا تقاضا یہ ہے کہ خبیث کو اِختیار نہ کرو، طیب کو اختیار کرو، تو معلوم ہو گیا کہ عقلی اُصول یہی ہے، عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اچھی چیز کو اختیار کرو، چاہے اُس کے اختیار کرنے والے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، اور بُری چیز سے بچو، چاہے اُس کی کثرت کتنی ہی پیدا کیوں نہ ہو جائے، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پا جاؤ، فلاح اسی میں ہے کہ طیب کو اِختیار کیا جائے، طیبین کے گروہوں کے اندر شامل ہوا جائے، خبیث کا اختیار کرنا فلاح کے خلاف ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَاۤ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ

اے ایمان والو! سوال نہ کیا کرو ایسی اشیاء کے متعلق کہ اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں گی، اور اگر

تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ

تم سوال کرو گے اُن کے متعلق جبکہ قرآن اُتارا جا رہا ہے تو وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی، اللہ تعالیٰ نے اُن سے درگزر کیا، اللہ تعالیٰ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا

بخشنے والا ہے بردبار ہے ﴿۱۰۱﴾ تحقیق سوال کیا تھا ایسی ہی اشیاء کے متعلق کچھ لوگوں نے تم سے قبل، پھر ہو گئے وہ ان اشیاء کے متعلق

كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ

کُفر کرنے والے ﴿۱۰۲﴾ نہیں متعین کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ نہ سائبہ نہ وصیلہ

وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ

نہ حام، لیکن وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، اور اُن میں سے اکثر

لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ

عقل سے کام نہیں لیتے ﴿۱۰۳﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے آجاؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے اُتاری اور آجاؤ رسول کی طرف،

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

کہتے ہیں کہ کافی ہے ہمارے لیے وہی طریقہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو، کیا اگرچہ ان کے آباء نہ علم رکھتے ہوں

شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ

کسی شئ کا اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں؟ ﴿۱۰۴﴾ اے ایمان والو! اپنے آپ کو لازم پکڑو، تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا

مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ

وہ شخص جو بھٹک جائے جس وقت تم ہدایت یافتہ ہو، اللہ کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ خبر دے گا تمہیں

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ

اُس چیز کی جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۰۵﴾ اے ایمان والو! تمہارے درمیان شہادت جس وقت کہ حاضر ہو جائے

أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ أَوْ اٰخَرٰنِ

تم میں سے کسی کو موت وصیت کے وقت، (شہادت والے) دو آدمی ہیں عدل والے تم میں سے یا اور دو آدمی جو

مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ

تمہارے غیر سے ہوں، اگر تم زمین میں سفر کرو پھر تمہیں موت کی مصیبت

الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ إِنِ

پہنچ جائے، روکتے ہو تم اُن دونوں کو نماز کے بعد، پھر وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے نام کی اگر تمہیں شبہ

ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ

پیش آجائے (وہ کہیں گے) کہ ہم نہیں خریدتے اس قسم کے بدلے میں ثمن اگرچہ وہ ہمارا رشتہ دار ہی ہو، اور نہیں چھپاتے ہم اللہ کی

اللّٰهِ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ فَإِنْ عُثِرَ عَلٰٓى أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ إِثْمًا

گواہی کو، بیشک ہم تب البتہ گناہگاروں میں سے ہوں گے (۱۰۶) پھر اگر اطلاع پائی جائے اس بات پر کہ وہ دونوں گواہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلَيٰنِ

پھر دو اور کھڑے ہوئے جائیں ان دونوں کی جگہ اُن لوگوں میں سے جن کے خلاف استحقاق واقع ہوا ہے، وہ (دوسرے دو) قریبی رشتہ دار ہوں،

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ

پھر یہ دونوں قسم کھائیں گے اللہ کی، (کہیں گے) البتہ ہماری گواہی حق کے زیادہ قریب ہے بمقابلہ اُن دونوں کی گواہی کے، اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا،

إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ أَدْنٰٓى أَنْ يَّأْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى

بے شک ہم تب ظالموں میں سے ہوں گے (۱۰۷) یہ طریقہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ وہ گواہ گواہی لائیں گے

وَجْهِهَآ أَوْ يَخَافُوْٓا أَنْ تُرَدَّ أَيْمَانٌۢ بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

اس گواہی کے طریقے پر، یا وہ اندیشہ کریں گے کہ لوٹا دی جائیں گی قسمیں ان کے قسموں کے بعد، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو

وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

اور توجہ سے سُنا کرو، نافرمان لوگوں کو اللہ ان کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا (۱۰۸)

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ: سوال نہ کیا کرو اشیاء کے متعلق۔ اَشْيَآءَ یہ غیر منصرف ہے، اس لیے عَنْ کے بعد اس کے اُوپر کسرہ نہیں پڑھا گیا، جر کو فتحہ کی صورت میں پڑھا گیا ہے، یہ شَیْءٌ سے حمراء کے وزن پر اصل کے اعتبار سے شَيْئَاءُ ہے، حمراء کا وزن ہونے کی وجہ سے ہمزہ چونکہ آخر میں تانیث کا ہے، تو یہ ایک سبب ہی دو اسباب کے قائم مقام ہوتا ہے، اور پھر بعد میں دو ہمزوں کا اجتماع ثقیل ہونے کی وجہ سے لام کلمہ کو ابتدا میں لے آئے تو اب یہ وزن لَفْعَاءُ کی طرح ہے، لام فاء کی جگہ آ گیا تو اَشیاء اس طرح سے بن گیا، اصل کے اعتبار سے یہ مفرد ہے لیکن معنی جمع کا ادا کرتا ہے، "بیان القرآن" کے حاشیے میں اس لفظ کی یہی تحقیق نقل کی گئی۔ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ: سوال نہ کیا کرو ایسی اشیاء کے متعلق کہ اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں غم میں ڈال دیں گی، تمہیں ناگوار گزریں گی، تمہیں بُری لگیں گی، وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا: اور اگر تم سوال کرو گے ان کے متعلق، حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ: جب کہ قرآن اتارا جا رہا ہے، تُبْدَ لَكُمْ: تو وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی، عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا: اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر کیا، یہاں "عنہا" کی ضمیر ان سوالات کی طرف راجع ہے جو غیر ضروری کیے گئے تھے، یعنی اس سے قبل جو تم غیر ضروری سوالات کر چکے اس سے اللہ نے درگزر کیا، اس پہ کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی، آئندہ کے لئے احتیاط رکھو، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے معاف کرنے والا ہے بردبار ہے، بخشنے والا ہے تحمل والا ہے، قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ: تحقیق سوال کیا تھا ایسی ہی اشیاء کے متعلق کچھ لوگوں نے تم سے قبل، ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ: پھر ہو گئے وہ ان اشیاء کے متعلق کُفر کرنے والے۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ: نہیں متعین کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام، وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: لیکن وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ: وہ اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑتے ہیں، وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: اور ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں، عقل نہیں رکھتے، لَا يَعْقِلُوْنَ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عقل سے کام نہیں لیتے، سوچتے نہیں۔ بحیرہ اس دُودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں کہ جس کا دُودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیا گیا ہو اور کوئی دوسرا استعمال نہ کرتا ہو۔ اور سائبہ: جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیا گیا ہو، جس طرح سے سانڈ چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اور وصیلہ: ایسی اونٹنی، بکری، گائے، مادہ جانور جو پہلے بطن سے بھی مادہ جنے اور پھر دُوسرے بطن سے مادہ ہی جنے، درمیان کے اندر نر نہ ہو، تو ایسے جانور کو بھی بسا اوقات بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ اور حام: یہ نر اُونٹ جو متعینہ اُونٹنیوں کے ساتھ جفتی کر لے، اور آگے اس کی نسل چل جائے، تو ان کے ذہن میں تھا کہ اتنی اُونٹنیوں سے جس وقت وہ جفتی کر لے گا تو اس کے بعد اس کو بتوں کے نام پہ چھوڑ دیتے تھے۔ یہ مختلف قسم کے جانور ہیں جو مشرک بتوں کے لئے چھوڑ دیا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے متعین کیے ہوئے ہیں، اور ان کے متعلق جو طریقہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے وہ سارے کا سارا اللہ کا بیان کردہ ہے، تو مَا جَعَلَ اللّٰهُ کا مطلب یہ ہوا کہ نہیں متعین کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ، مَا جَعَلَ اللّٰهُ: مشروع نہیں کیا، متعین نہیں کیا، یہ طریقہ اللہ نے قرار نہیں دیا۔ "نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام، لیکن وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑتے ہیں اور ان میں

ے اکثر سوچتے نہیں، عقل سے کام نہیں لیتے" وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے آ جاؤ، متوجہ ہو جاؤ، آ جاؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اُتاری، اور آ جاؤ رسول کی طرف، قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا: کہتے ہیں کہ کافی ہے ہمارے لیے وہی طریقہ جس کے اُوپر ہم نے اپنے آباء کو پایا۔ آباء سے ان کے بڑے مراد ہیں، ان کے اسلاف مراد ہیں، یعنی بڑے۔ "کافی ہے ہمارے لیے وہی طریقہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو، یا اپنے بڑوں کو" اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ: کیا اگرچہ ان کے آباء نہ علم رکھتے ہوں کسی شی کا اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں؟ اِستفہام کا مطلب یہ ہے کہ کیا پھر بھی ان کا طریقہ ان کے لئے کافی ہے؟ یہ ان آباء کے پیچھے ہی لگے رہیں گے؟ اگرچہ ان کے آباء نہ کسی چیز کا علم رکھتے ہوں اور نہ وہ ہدایت پاتے ہوں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ: اے ایمان والو! اپنے آپ کو لازم پکڑو، اپنی فکر کرو، لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ: تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا وہ شخص جو بھٹک جائے، اِذَا اهْتَدَيْتُمْ: جس وقت تم ہدایت یافتہ ہو، اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا: اللہ کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: پھر اللہ تعالیٰ خبر دے گا تمہیں اس چیز کی جو تم کیا کرتے تھے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ: یہ مبتدأ ہے اور اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ یہ خبر ہے، تو اثْنٰنِ کا حمل بظاہر لفظوں میں شَهَادَةُ کے اوپر ہو رہا ہے، تو جس کا معنی یوں کرنا چاہیے بحذفِ مضاف، ذُوْ شَهَادَةِ بَيْنِكُمْ، تمہارے درمیان گواہی والے دو آدمی ہیں، اس طرح سے بات صاف ہو جائے گی، تمہارے درمیان گواہی والے گواہ بننے والے دو آدمی ہیں، اس لیے شَهَادَةُ کے اوپر مضاف محذوف نکال لیا جائے گا۔

"اے ایمان والو! تمہارے درمیان شہادۃ" اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ: جس وقت کہ حاضر ہو جائے تم میں سے کسی کو موت، جب تم میں سے کسی کو موت حاضر ہو جائے، یعنی موت آ جائے، موت آنے لگے، موت کے آثار طاری ہو جائیں، حِيْنَ الْوَصِيَّةِ: وصیت کے وقت، یعنی موت آنے لگے اور تم اس کو وصیت کرنے لگو، اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ: ایسے وقت میں تمہارے درمیان شہادت دو آدمی ہیں، یعنی شہادت والے دو آدمی ہیں، اس طرح سے اس کا مفہوم ادا کیا جائے گا، "دو آدمی عدل والے تم میں سے" یعنی مسلمانوں میں سے، اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ: یا اور دو آدمی جو تمہارے غیر سے ہوں، یہاں سے غیر مسلم مراد ہیں، یعنی اگر مسلمان نہ ملیں تو غیر مسلم ہی سہی، "اور دو آدمی تمہارے غیر سے" اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ: اگر تم زمین میں سفر کرو۔ ضرب فی الارض یہ سفر کرنے سے کنایہ ہے، زمین میں چلنا۔ اگر تم سفر کرو زمین میں فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ: پھر تمہیں موت کی مصیبت پہنچ جائے، یعنی موت کا حادثہ تمہیں پہنچ جائے، ایسے وقت میں جب وصیت کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو دو آدمیوں کو گواہ بنا لیا کرو جو تم میں سے ہوں عدل والے ہوں، اور اگر تم میں سے نہ ہوں یعنی مسلمانوں میں سے نہ ہوں تو بوقت ضرورت غیر مسلموں میں سے ہی دو لے کر ان کو گواہ بنا لینا چاہیے، تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ: یہ صورۃً خبر ہے اور معنیً اِنشاء ہے۔ صورۃً خبر ہے تو ترجمہ یہ ہوگا "روکتے ہو تم ان دونوں کو" یعنی جن کو گواہ بنایا گیا ہے، یہ جو اوصیاء ہیں، وصیت قبول کرنے والے، وصی، "روکتے ہو تم ان دونوں کو نماز کے بعد" یہ صورۃً خبر ہے معنیً انشاء ہے، یعنی ان کو روک لیا کرو نماز کے بعد، عام نماز بھی مراد ہو سکتی ہے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کی نماز مراد ہے، عصر کی نماز کے بعد انہیں روک لیا کرو، فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ: پھر وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے ساتھ، اللہ کے نام کی وہ قسم کھائیں گے، اِنِ ارْتَبْتُمْ: اگر تمہیں شبہ پیش آ جائے، یعنی نماز کے بعد روکنا، مسجد کے اندر ٹھہرا کے لوگوں کے سامنے قسم کھانا یہ تب ہے کہ اگر تمہیں

ان کے بیان میں کوئی شک شبہ پیش آجائے، لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا: یہ مقولہ ہے ان دو شاہدوں کا، اس لیے یہاں لفظ محذوف نکالا جائے گا يَقُوْلَانِ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا، اور یہ يقولان سمجھ میں آرہا ہے فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ سے۔ ''وہ دونوں اللہ کی قسمیں کھائیں گے، اور قسمیں کھاتے ہوئے یہ بات کہیں گے کہ ہم نہیں خریدتے اس قسم کے بدلے میں ثمن'' یعنی ہم اس قسم کے بدلے میں کوئی دُنیوی مفاد حاصل نہیں کرتے، وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى: كَانَ کی ضمیر لوٹ رہی ہے مقسم لہ کی طرف۔ ''جس کے لئے ہم قسم کھارہے ہیں اگرچہ وہ ہمارا رشتے دار ہی ہو'' یعنی نہ تو ہم کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، اور نہ ہم اس قسم کے ذریعے سے اپنے کسی رشتے دار کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں، ''اگرچہ وہ شخص جس کے لئے قسم کھائی جارہی ہے وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو'' قُرْبٰى یہ مصدر ہے قرابت کے معنی میں، وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ: اور وہ یہ بات بھی کہیں گے کہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپاتے نہیں، نہیں چھپاتے ہم اللہ کی گواہی کو، ''اللہ کی گواہی'' اضافت سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ شہادت کا اظہار اللہ کی طرف سے حکم دیا ہوا ہے، ''جس شہادت کا ظاہر کرنا اللہ کی طرف سے حکم دیا ہوا ہے ہم اس شہادت کو چھپائیں گے نہیں'' تو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کردی ایجاب کی وجہ سے، کہ اللہ کی طرف سے اس کا اظہار واجب ہے۔ ''ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے نہیں'' اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ: اگر ہم چھپائیں گے تب ہم گناہگاروں میں سے ہوجائیں گے، بیشک ہم تب البتہ گناہگاروں میں سے ہوں گے، اِذًا کا معنی ہے تب ہماری زبان میں، یعنی جب ہم چھپائیں، اِذًا کا یہ معنی ہے، اِذًا كَتَمْنَا کے معنی میں، کہ جس وقت ہم چھپائیں گے اس وقت ہم البتہ گناہگاروں میں سے ہوجائیں گے، اور اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہماری زبان میں تب کا لفظ آتا ہے، ''بیشک ہم تب البتہ گناہگاروں میں سے ہوجائیں گے'' فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا: پھر اگر اطلاع پالی جائے اس بات پر کہ وہ دونوں گواہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، یعنی انہوں نے گواہی کے اندر کوئی گڑبڑ کی ہے، غلط بیانی کی ہے، اس بات کا اگر پتا چل جائے کہ مرتکب ہوئے ہیں وہ گناہ کے، فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ: پھر دو اور کھڑے ہوجائیں ان دونوں کی جگہ ان لوگوں میں سے، اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمْ: اسْتَحَقَّ کی ضمیر یا تو اِثم کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اِثم: گناہ۔ اصل کے اعتبار سے تو یہ مفعول ہے جیسے کہ پیچھے اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا کے اندر اس کو مفعول واقع کیا گیا ہے، کہ وہ دونوں مستحق ہوئے ہیں گناہ کے، اسی طرح سے یہاں بھی اس میں مفعول والا معنی ہے، لیکن یہاں فعل کی نسبت واقع کردی اِثم کی طرف مبالغۃً، معنی وہی ہے کہ جن کے خلاف گناہ کا ارتکاب ہوا ان لوگوں میں سے دو آدمی کھڑے ہوجائیں۔ ''جن کے خلاف گناہ کا ارتکاب ہوا ہے'' یعنی جن کے حق میں گواہی دیتے ہوئے گڑبڑ کی گئی ہے اور گناہ کا ارتکاب ہوا ان میں سے دو کھڑے ہوجائیں تو اسْتَحَقَّ کی ضمیر اِثم کی طرف لوٹ گئی اور ترجمہ ہم اپنی زبان میں انہی الفاظ کے ساتھ ادا کریں گے ''جن کے خلاف گناہ واقع ہوا، گناہ کا ارتکاب ہوا۔'' اور یا اسْتَحَقَّ کی نسبت مصدر کی طرف ہی کردی گئی اِسْتَحَقَّ الْاِسْتِحْقَاقُ یعنی جن کے خلاف استحقاق کا ارتکاب ہوا، جن کے خلاف استحقاق واقع ہوا، جن کے ضرر میں حق طلب کرلیا گیا، استحقاق واقع ہوا، ان میں سے دو آدمی کھڑے ہوجائیں۔ الْاَوْلَيٰنِ: یہ تثنیہ ہے اَولیٰ کا، اَولیٰ ہوتا ہے اَقرب کے معنی میں، تو الْاَوْلَيٰنِ کا معنی الْاَقْرَبَانِ یہ اٰخَرٰنِ سے بدل ہے۔ پہلے دو گواہوں کے بدلے میں وہ اس وصیت کرنے والے کے قریبی رشتے دار ہونے چاہئیں، الْاَوْلَيٰنِ کا یہ معنی ہے، کہ جو اقربان ہیں جو اس کے ساتھ قریبی تعلق رکھنے والے ہیں جو اس کی وراثت کے مستحق ہیں،

باقی! اس میں لفظوں میں نحو کے اعتبار سے آپ کے سامنے ایک اشکال پیش آئے گا کہ آخران تو نکرہ ہے، اس میں تو معرفہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں پائی گئی، الْاَوْلَیٰنِ کے اوپر الف لام آیا ہوا ہے جس سے یہ معرفہ معلوم ہوتا ہے، اور نحو کے اندر یہ لکھا ہوا ہے کہ نکرہ سے بدل معرفہ نہیں ہوا کرتا، تو ''بیان القرآن'' کے حاشیے میں اس کی وجہ ذکر کی گئی کہ الاولیان چونکہ یہ جنس کے معنی میں ہے اور اس کا مصداق متعین نہیں، اس لیے بظاہر معرف باللام ہونے کے باوجود یہ نکرہ کا مفہوم لیے ہوئے ہے، چونکہ ان کا مصداق متعین نہیں کہ ان کا مصداق کون ہیں، جو بھی دو اقرب ہوں ان کو لے لیا جائے، تو یہ جنس والا مفہوم لیے ہوئے ہیں جس کی بناء پر ان کے اندر بھی وہی نکارت ہے، تو ان کو بدل بنانا ٹھیک ہے، تو الْاَوْلَیٰنِ کا معنی ہوگا کہ وہ دوسرے دو جوان کے مقابلے میں کھڑے کرنے ہیں وہ اقرب ہونے چاہئیں اس وصیت کرنے والے کے جو مرا ہے، فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ: پھر یہ اولیان، یہ دونوں قریبی رشتے دار، یہ قسم کھائیں گے اللہ کی، اور قسم کھاتے ہوئے کہیں گے لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا: البتہ ہماری گواہی زیادہ احق بالقبول ہے بمقابلہ اُن دونوں کی گواہی کے، ہماری گواہی حق کے زیادہ قریب ہے، وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ: اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا، اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ: بیشک ہم تب ظالموں میں سے ہوں گے، یہاں بھی اِذًا کا وہی ترجمہ، کہ اگر ہم حد سے تجاوز کریں گے اور جان بوجھ کر کوئی غلط بیانی کریں گے تب ہم ظالموں میں سے ہوجائیں گے، ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ: یہ طریقہ جو ہم نے بتادیا یہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ وہ گواہ گواہی لائیں گے اس گواہی کے طریقے پر، یعنی اس میں گڑبڑ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، اَوْ يَخَافُوْۤا: یا وہ اندیشہ کریں گے، اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌ: کہ لوٹادی جائیں گی قسمیں، بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ: اُن کی قسموں کے بعد، یعنی اگر انہوں نے قسمیں کھائیں اور ان کے اندر کوئی گڑبڑ ہوئی شبہ پڑجانے کی صورت میں ان کی قسموں کے بعد قسمیں کسی دوسرے پر لوٹائی جائیں گی، اس اندیشے کے ساتھ ہر فریق گواہی ٹھیک دینے کی کوشش کرے گا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَاسْمَعُوْا: اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام توجہ سے سُنا کرو، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ: فاسق لوگوں کو، نافرمان لوگوں کو اللہ اُن کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا۔

تفسیر

ماقبل سے ربط

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ: اس آیت میں ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے غیر ضروری سوالات کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، ماقبل کے ساتھ اس کا تعلق حضرت تھانوی ؒ نے ''بیان القرآن'' میں اس طرح سے بیان کیا کہ پہلے مختلف آیات میں اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی پابندی کی تاکید آرہی ہے کہ ان میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، جو کچھ اللہ تعالیٰ بیان فرمادیں اُن کو توجہ سے سنو، سننے کے بعد اُن کے اوپر عمل کرو۔ تو اس سورت کے اندر کثرت کے ساتھ اَحکام آئے ہیں، اور ان اَحکام کو بیان کرنے کے بعد اسی قسم کے الفاظ بولے گئے ہیں جن سے اُن پر عمل کرنے کے تاکید ہوتی ہے۔ بسا اوقات انسان اطاعت اور فرمانبرداری میں غلو کرتا ہوا مختلف قسم کے توہمات کے تحت سوال اٹھانا شروع کردیتا ہے، غیر ضروری سوالات جو مناسب نہیں ہوتے یہ کبھی کبھی غلبۂ طاعت کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ انسان مختلف قسم کے سوال اٹھاتا ہے، کہ یہ کام کیسے کروں، وہ کیسے کروں؟ اس میں یہ

کیسے ہوگیا، وہ کیسے ہوگیا؟ احتمال نکال نکال کر پوچھنا شروع کردیتا ہے، یہ غلو فی الطاعت ہے، اس سے منع کرنا مقصود ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ بیان کردیا جائے اُس کو تو توجہ کے ساتھ سُنا کرو اور اُس کے مطابق عمل کیا کرو، اور جن باتوں کو اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے واضح طور پر بیان نہ کریں، یا سرورِ کائنات ﷺ واضح طور پر بیان نہ کریں، اور اس میں کوئی معتد بہ شبہ کی بات بھی نہ ہو تو ایسے وقت میں لایعنی سوالات اُٹھا کر، غیر ضروری سوالات اُٹھا کر، اپنے اُوپر خواہ مخواہ کی پابندیاں نہ لگوالیا کرو، اس میدان کو پھر کھلا رہنے دو، پھر اس قسم کے سوال نہ اُٹھایا کرو، تو اِفراط و تفریط سے بچا کر سیدھے طریقے سے طاعت کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

آیتِ بالا کے شانِ نزول کے متعلق مختلف واقعات

اس آیت کے شانِ نزول میں مفسرین نے مختلف قسم کے واقعات نقل کئے ہیں، ایک تو یہ واقعہ نقل کیا کہ جس وقت حج فرض ہوا تھا، سرورِ کائنات ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے مسئلہ بیان فرمایا کہ اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کردیا ہے، تم بیت اللہ کا حج کرو۔ تو ایک صحابی ہیں اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے تھے، انہوں نے فوراً سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہر سال؟ آپ ﷺ اس کے سوال کی طرف متوجہ نہیں ہوئے، پھر آپ ﷺ نے اسی طرح سے تاکید کی کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کردیا ہے، حج کیا کرو۔ اُس نے پھر آگے سے کہا کہ ہر سال؟ تین دفعہ اسی طرح سے بات ہوئی اور اُس نے تین دفعہ سوال دُہرایا، تب سرورِ کائنات ﷺ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسی باتیں نہ کیا کرو، اب یہ تم نے سوال اُٹھایا اور اگر میں آگے سے کہہ دوں کہ ''ہاں ہر سال!'' تو اس کا وجوب ہر سال ہوجائے گا، اور پھر تمہیں تکلیف ہوگی تم اُس کو نبھا نہیں سکو گے، جس بات کو میں وضاحت کے ساتھ کہنا نہیں چاہتا تو تم بار بار اِصرار کر کے مجھ سے کیوں کہلواتے ہو؟ اب مصلحت اسی میں ہے کہ اس کو سکوت کے درجے میں رکھا جائے، اس کے سکوت کے درجے میں رکھنے سے یہ وسعت پیدا ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گنجائش دے تم ہر سال کرلو، نہ گنجائش دے تو زندگی میں ایک دفعہ فرض ہے، باقی فرض نہیں ہے، اب اگر یہ پابندی لگادی جائے کہ ایک ہی دفعہ کرنا ہے، تو پھر اگر کسی کا کرنے کو جی چاہے تب بھی وہ تکلیف محسوس کرے گا، اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ہر سال کرنا ہے تو جس کے پاس ہر سال حج کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی وہ تنگی میں پڑجائے گا، تو شارع علیہ السلام کا مقصد یہی ہے کہ یہ میدان کھلا رہے، اگر کسی کے پاس گنجائش ہے تو ہر سال کرلے، اور اگر کسی کے پاس گنجائش نہیں ہے تو فرض زندگی میں صرف ایک دفعہ ہے۔ تو اس موقع پر تنبیہ فرمائی کہ جہاں میں سکوت اختیار کروں، کسی بات کو واضح طور پر نہ کہنا چاہوں، تو تم اصرار کر کے مجھ سے کہلوانے کی کوشش نہ کیا کرو، جب شارع علیہ السلام کی طرف سے کسی بات کی صراحت ہوجائے تو پھر اس کے بعد عمل میں تنگی پیش آجاتی ہے پھر اُس کے خلاف کوئی صورت اختیار نہیں کی جاسکتی، اور جب شارع علیہ السلام سکوت اختیار کرلیں تو میدان وسیع ہے، مجتہدین اپنے اجتہاد کے ساتھ مختلف شقیں نکال سکتے ہیں، عمل کے اندر وسعت ہوجائے گی، پھر اگر اجتہاد کے ساتھ کوئی شق متعین ہوگئی اور اُس کی خلاف ورزی کی نوبت بھی آگئی تو اُس میں وہ شدت نہیں ہوگی جو شارع علیہ السلام کی صراحت کے بعد ہوتی ہے۔

یہ تو اَحکام کے سلسلے کی بات ہوئی، اور بعض لوگ واقعات اس قسم کے پوچھتے تھے، کہ ایک دفعہ سرورِ کائنات ﷺ نے کسی

خاص موقع پر فرمایا کہ "سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ"(۱) مجھ سے جو چاہو پوچھو۔ تو ایک آدمی تھا وہ نسب کے اعتبار سے متہم تھا، جب کوئی اُس کے ساتھ لڑ پڑتا تو اُس کو گالی دیتا تھا کہ تُو اپنے باپ کا نہیں ہے، لوگ اُس کو گالی دیتے تھے، اُس کے نسب کے اندر اِشتباہ پیدا کرتے تھے، اُس نے پوچھ لیا کہ میرا باپ کون ہے؟ تو سرورِ کائنات ﷺ نے صراحت فرمادی کہ تیرا باپ فلاں ہے، اور وہ وہی تھا جس کی طرف اُس کی نسبت واقع میں تھی، یعنی جو اُس کا باپ عالمِ ظاہر میں تھا، جس سے معلوم ہوگیا کہ لوگ جو اُس کو طعنہ دیتے تھے وہ طعنہ دینا صحیح نہیں تھا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے سوال میں کبھی جواب خلافِ توقع بھی آسکتا ہے، اور پھر اس جواب کے ساتھ رُسوائی ہوگی، پہلے تو ایک پردہ ہے اس پردے کو رہنے دو، اور ایسے سوال کر کے تم جواب لوگے تو جواب میں ہوسکتا ہے کوئی ایسی پردہ دری ہوجائے جو تمہیں پسند نہیں ہے۔

تو اس قسم کے سوالات جس میں سرورِ کائنات ﷺ کے لیے کوئی ایذا کا پہلو نکلتا یا جس میں حضور ﷺ کے سامنے سوال اٹھانے کی صورت میں اُدھر سے کوئی جھڑک واقع ہوجانے کی نوبت آجاتی، یا اَحکام کے اندر اس قسم کی قیود لگ جاتیں کہ جن کے بعد اُن کو نبھانا مشکل ہوجاتا، اس قسم کے سوالات کرنے کی ممانعت ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ "أَعْظَمُ الْمُسْلِمِيْنَ فِي الْمُسْلِمِيْنَ جُرْمًا": مسلمانوں کی جماعت میں جرم کے اعتبار سے سب سے بڑا آدمی وہ ہے کہ ایک شئ حرام نہیں کی گئی تھی اور اُس نے بار بار سوال کر کے وہ چیز حرام کروالی،(۲) شارع علیہ السلام کا مقصد تھا اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا، تاکہ اس میں کسی درجے میں وسعت رہے، کہ بعد میں اِجتہاد کے ساتھ لوگ اگر اس کو ممنوع بھی قرار دیں تو اُس کا وہ درجہ نہیں جو شارع علیہ السلام کی طرف سے صراحت کا ہے، لیکن اُس نے بار بار پوچھ کر پابندی لگوالی، جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے مسلمان اس قید میں واقع ہوگئے، اس پابندی میں آگئے، وسعت جو تھی وہ ختم ہوگئی، تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔

یہود کی غیر ضروری سوالات کی عادت اور اُس کا بھیانک انجام

تو غیر ضروری سوالات جو ہوا کرتے ہیں اُس کے ساتھ بسا اوقات ایسی نوبت آجایا کرتی ہے، اور اس کی ایک مثال سامنے دے دی، کہ یہود کو عادت تھی کہ مختلف قسم کے سوالات اپنے انبیاء علیہم السلام پر اٹھاتے رہتے تھے، اور جب انبیاء علیہم السلام کی طرف سے وضاحت ہوتی تو پھر اُس کی پابندی نہیں کرتے تھے، اَحکام کے سلسلے میں ہوتے تو اس کے مطابق عمل نہ کرتے، واقعات کے سلسلے کی کوئی بات ہوتی تو اس سے متاثر نہ ہوتے، جیسے کہ ذبحِ بقرہ کے بارے میں آپ کے سامنے وہ قصہ گزر چکا ہے، کہ کس طرح سے سوال اُٹھا اُٹھا کر اپنے اُوپر خواہ مخواہ کی پابندیاں لگوالیں، اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا مشکل ہوگیا، تو اس قوم کا حوالہ دے دیا کہ جیسے اُن کو عادت تھی کہ خواہ مخواہ سوال اٹھا کر ایسی چیزیں لے لیتے تھے کہ جس کو بعد میں نبھا نہیں سکتے تھے، تو تم اُن لوگوں کی طرح نہ کرنا۔ اور اس سے قبل اگر کچھ اس قسم کی باتیں ہوچکیں جن میں چاہے حضور ﷺ کے لیے کچھ ناگواری کا پہلو ہوا، یا تمہارے

---

(۱) صحیح البخاری ص ۱۹ باب الغضب فی الموعظۃ والتعلیم۔ عن ابی موسیٰ / صحیح مسلم ۲/ ۲۶۳ باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ۔

(۲) صحیح مسلم ۲/ ۲۶۲ باب توقیرہ ﷺ / مشکوٰۃ ۱/ ۲۸ باب الاعتصام۔ عن سعدؓ / نیز صحیح البخاری ۲/ ۱۰۸۲ باب مایکرہ من کثرۃ السؤال

ان سوالات کی نوعیت ایسی تھی کہ جس پر تمہیں تنبیہ ہونی چاہیے تھی، لیکن اللہ نے اُن کو معاف کر دیا، اب صراحتاً تمہاری راہنمائی کر دی کہ بلاضرورت سوالات نہ اُٹھایا کرو، ہاں جو اللہ تعالیٰ بیان کر دیں اور اللہ کے رسول بیان کر دیں اُس کو سمجھنے کے لیے کوئی اہم شبہ کی بات آ جائے تو صحابہ ﷺ سوال اُٹھاتے بھی تھے اور اُس سوال کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی اور جواب بھی دیا جاتا تھا، جہاں شبہ کی کوئی بات نہ ہو اور بلاوجہ سوالات اُٹھا کر مختلف قسم کے جواب لیے جائیں، جیسے مجلس بازی کی صورت ہوتی ہے، کہ بیٹھے ہیں، ضرورت ہے نہیں، اور خواہ مخواہ سوال اٹھا رہے ہیں، جس میں دوسرے کو تنگ کرنا مقصود ہے، تو یہ عبث ہونے کی بناء پر ممنوع ہے۔

تو پہلی آیت کا تعلق تو اس مضمون سے ہے ''اے ایمان والو! نہ سوال کیا کرو ایسی اشیاء کے متعلق کہ اگر وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔'' اَحکام کے متعلق بھی کہ کوئی ایسا سخت حکم آ جائے، اور واقعات کے متعلق بھی کہ تمہاری مرضی کے خلاف کوئی واقعہ ظاہر کر دیا جائے، اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو فضول ہونے کی بنا پر تمہیں جھڑکی پڑ جائے، یہ بھی تو آخر ناگواری کی بات ہے۔ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا: اگر تم ان اشیاء کے متعلق سوال کرو گے جبکہ قرآن اتارا جا رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائیں گی، یعنی نزولِ قرآن کا موقع ہے، تم سوال اٹھاؤ گے تو اُس میں امکان ہے کہ وضاحت کر دی جائے، اور وضاحت کرنے کی صورت میں پھر وہ تمہیں ناگوار گزرے گی۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا: ایسے سوالات سے جو فضول کیے جاتے ہیں اللہ نے درگزر کیا، یعنی پہلے جو کچھ تم سے ہو گیا اللہ نے درگزر کیا، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والے بردبار ہیں، اس لیے پہلی کوتاہیوں کے اوپر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں کریں گے، وہ تو اللہ نے معاف کر دیا، آئندہ کے لیے محتاط رہنا۔ اس طرز کے خطرناک ہونے کو سمجھانے کے لیے آگے اُس قوم کا حوالہ دیا، اور اس قوم کا مصداق یہاں یہودی ہیں، ''سوال کیے تھے ایسے ہی، یا ایسی اشیاء کے متعلق سوال کیے تھے کچھ لوگوں نے تم سے قبل'' ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ: پھر وہ اُن کے ساتھ کافر ہو گئے، یعنی جو جوابات آئے اُن کی قدر نہ کر سکے، اور یہ کُفر دونوں قسم کا ہے، کہ اگر تو اَحکام کے متعلق سوال تھا پھر جب وضاحت ہو گئی تو اُس وضاحت کے بعد اس کے مطابق انہوں نے عمل نہ کیا بلکہ انکار کر بیٹھے، اور اگر وہ واقعات کے ساتھ تھا تو جس قسم کا واقعہ ظاہر کیا گیا اس سے اثر لینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے اس سے اثر نہ لیا، اس لیے پھر وہ گرفت میں آ گئے، ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ: پھر ہو گئے وہ اُن اشیاء کے متعلق انکار کرنے والے، ''اُن باتوں کے متعلق انکار کرنے والے'' یوں بھی اِس کا مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔

شرک کی حقیقت اور موجودہ دور میں اس کے کچھ نمونے

دوسری بات جو یہاں کہی جا رہی ہے، یہ ایک شرکیہ رسم کی تردید ہے، توحید اور شرک یہ دونوں آپس میں متقابل چیزیں ہیں، توحید میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اُس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہیں کیا جاتا، بدنی طور پر بھی عبادت اُسی کی ہوتی ہے، مالی طور پر بھی عبادت اُس کی ہوتی ہے، اور اس عبادت کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جو آپ کے سامنے ھدی اور قلائد کے ذکر میں آیا، کہ جانور اللہ کے نام کے ساتھ موسوم کر دیئے جاتے ہیں، اور پھر اُن کو اللہ کے گھر کی طرف بھیجا جاتا ہے، اور وہاں جا کر اُن کو ذبح کر کے وہاں کے مساکین مجاور جو بھی ہوں اُن کو کھلایا جاتا ہے اور اُن پر تقسیم کیا جاتا ہے، ھدی اور قلائد

یہ وہی جانور ہیں جن کی نسبت اللہ کی طرف کردی گئی یا اللہ کے گھر کی طرف کردی گئی، پھر اُن کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں تاکید آئی کہ ان کے احترام کے خلاف کوئی حرکت نہ کرو، ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا کرو، اور پھر وہ اللہ کے نام پر ذبح کیے جاتے ہیں، اللہ کے نام پر ذبح کرنے کے بعد اللہ کے حکم کے تحت مساکین کو کھلا دیئے جاتے ہیں، تقسیم کردیئے جاتے ہیں، جن جانوروں کے متعلق یہ حکم ہے کہ مالک بھی کھا سکتا ہے تو وہاں سے مالک بھی کھا سکتا ہے، اور بعض ایسے جانور ہیں جو کفارے کے طور پر یا کسی جنایت کے دم کے طور پر دیئے جاتے ہیں تو اس میں مالک نہیں کھا سکتا تو وہاں مالک نہیں کھاتا، اللہ کے احکام کے تحت اس کا گوشت تقسیم کردیا جاتا ہے، اور کچھ ابتدا سے ہی سلسلہ ایسا چلا ہے کہ توحید کے مقابلے میں جب شرک کا طریقہ شیطان نے جاری کیا، تو اللہ تعالیٰ کے لیے مسلمان موحد جو کچھ کرتے ہیں اسی قسم کے کام اُس نے بتوں کے لیے اور غیر اللہ کے لیے بھی کروانے شروع کردیئے۔ اب بھی آپ جا کر مزاروں پر دیکھ لیں، کہ جس طرح سے موحدین اللہ کے گھر کا احترام کرتے ہیں، مشرکوں کے بالکل اسی قسم کے جذبات ان مزاروں کے متعلق بھی ہیں، اگر بت خانے آپ نے نہیں دیکھے، بتوں کے ساتھ ان بت پرستوں کا برتاؤ اگر آپ نے نہیں دیکھا، تو اس کا نمونہ آپ کو مزاروں پر نظر آجائے گا، بیت اللہ کے پاس لوگ جاتے ہیں، غلاف پکڑتے ہیں لپٹتے ہیں، اُس کو ہاتھ لگاتے ہیں، اور اِس کو اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے ہیں، تو قبروں کے ساتھ بھی یہ لوگ ایسے ہی کرتے ہیں، جاتے ہیں، اُن کے غلافوں کو چومتے ہیں، ہاتھ لگاتے ہیں، اور مس کرنے کو اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے ہیں، بوسے دیتے ہیں، چومتے ہیں، سب کچھ ہوتا ہے۔ جس طرح سے بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے اور اُس کے گھر کے اردگرد لوگ گھومتے ہیں اور یہ عبادت ہے، تو آپ کو قبروں کے اُوپر اسی طرح سے طواف ہوتا ہوا بھی نظر آجائے گا، کہ بزرگوں کی قبروں کے اردگرد لوگ اسی طرح سے طواف کرتے ہیں، خاص طور پر اگر اِس کا نمونہ آپ نے دیکھنا ہو تو اس کے متعلق سب سے زیادہ سلسلہ اوچ (بہاولپور کا مضافاتی علاقہ۔ ناقل) میں ہے، وہاں مزاروں پر باقاعدگی کے ساتھ لوگ جاتے ہیں اور جا کر چکر لگاتے ہیں، جس طرح سے اللہ کے گھر کا طواف کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح سے بیت اللہ کے پاس زمزم ہے اور اس پانی کو مسلمان متبرک سمجھتے ہیں، اور اُس کی ایک صحیح نسبت ہے، اس کا پینا باعثِ برکت ہے، اپنے چہرے کے اُوپر ڈالنا باعثِ برکت ہے، اسی طرح سے آپ کو مزاروں کے پاس بھی اس قسم کے پانیوں کا سلسلہ مل جائے گا، اس کا نمونہ اگر آپ نے دیکھنا ہو تو لاہور میں حضرت گنج بخش رحمہ اللہ کے مزار پر دیکھ لیجئے، اور بھی مختلف جگہوں میں ہے، کہ پاس کوئی ٹونٹی لگی ہوئی ہے، وہی ٹینکی کا پانی آتا ہے، لیکن لوگ اس کو اس طرح سے متبرک سمجھ کر پیتے ہیں جس طرح سے زمزم کو پیا جاتا ہے، اپنے چہروں پر ملتے ہیں، تبرک کے طور پر اُس کو استعمال کرتے ہیں، کئی مزاروں پر یہ سلسلہ ہے، تو زمزم کی طرح اُس کو بھی متبرک سمجھ لیا، جیسے اللہ کے گھر کا پانی تھا اور اُس کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا، تو یہاں بھی اسی قسم کا معاملہ ہوگیا۔

جانوروں کے متعلق مختلف شرکیہ رسمیں

ایسے ہی یہ جانوروں کا سلسلہ ہے، کہ جیسے اللہ کی طرف نسبت کرکے جانوروں کو محترم قرار دیا جاتا ہے، تو یہ مشرک اپنے

بتوں کی طرف نسبت کر کے بھی بعض جانوروں کو محترم قرار دیتے ہیں، ایک جانور تو وہ ہوتا ہے جس کو اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے وہ ذبح کرتے ہیں، اِس کا ذکر تو مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ میں ہوگیا، اور بعض جانوروں کو وہ زندہ چھوڑتے ہیں اُن کا تقرب حاصل کرنے کے لیے، اور اُن کو اسی طرح سے محترم سمجھتے ہیں جس طرح سے ہدی اور قلائد کے جانوروں کو اہلِ توحید محترم سمجھتے ہیں، تو یہ مختلف قسم کے جانور ہوتے، بعضوں کو تو اس طرح سے کر دیتے کہ اِن کا دُودھ بتوں کے لیے ہے، اپنے غیر اللہ معبودوں کے لیے اُس کو قرار دے دیتے، اس کا دُودھ کوئی دوسرا استعمال نہ کرتا، پھر اِن کا دُودھ نکالا جاتا، بتوں کے اُوپر چڑھاوا چڑھا دیا جاتا، باقی! بتوں نے تو کیا کھانا پینا تھا وہاں کے مجاروں کے کام آجاتا، کیونکہ اس قسم کے لوگ جو کہ ایسے نذرانے وصول کرنے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں، وہ اُن کے معبود کے لیے جس کی طرف وہ نسبت کرتے ہیں، میری اِصطلاح میں یہ اس معبود کے ''لیٹر بکس'' ہوتے ہیں، کہ جو کچھ اس کو دینا ہے اُس کے مجاوروں کے پیٹ میں جا کر ڈال دو، وہاں تک پہنچ جائے گا، اوران کا پڑھنا ایسا ہے جس طرح سے ڈاک کی ٹکٹ لگادی، اوران کے پیٹ میں ڈالنا ایسا ہے جیسے ''لیٹر بکس'' میں ڈال دیا، اب اگر ڈاک بھیجنا چاہیں تو طریقہ یہی ہے، اب وہ بتوں کے نام پر جو دُودھ ہوتا ہے وہ مجاور پیتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کو پہنچ گیا، دُودھ نکالتے، نکال کر جا کر بتوں کے نام پر چڑھا آتے، اسی طرح سے یہ شیرینی وغیرہ جو کچھ بھی کسی بزرگ کو دیتے ہیں تو اُس بزرگ کے نام پر جو کچھ لوگ ملنگ بنے بیٹھے ہوتے ہیں، اور وہاں مجاور بنے بیٹھے ہوتے ہیں، اُن کا کھالینا اِن لوگوں کی نظر میں ایسے ہے جیسے کہ اس بزرگ کو دے دیا، اور اگر وہاں مزار پر نہ لے جاؤ کسی دوسری جگہ صرف کر دو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ڈاک غلط ہوگئی، وہاں نہیں پہنچے گی، اس لیے وہاں لے جاتے ہیں، لے جانے کے بعد اہتمام سے وہاں کے مجاوروں کو وہ کھلاتے پلاتے ہیں، تب اُن کا دل مطمئن ہوتا ہے کہ ہماری یہ چیز اُس بزرگ تک پہنچ گئی، اس کو تو ''بحیرہ'' کہتے ہیں۔ اور ''سائبہ'' اسی طرح سے ہے جیسے کوئی سانڈ چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ بھی کسی بت کی طرف نسبت کر کے کسی جانور کو چھوڑ دیتے، اس پر سواری نہ کرتے، کوئی اور کسی قسم کا کام نہ لیتے۔ اور ''وصیلہ'' یہ بھی کوئی اونٹنی یا مادہ گائے بکری ہوتی جو متعدد بچے مادہ ہی جنتی اور درمیان کے اندر کوئی نر پیدا نہ ہوتا، تو ایسے کو بھی بتوں کی طرف نسبت کر کے چھوڑ دیتے تھے۔ اور ''حام'' یہ اونٹ ہے جو متعین اونٹنیوں کے ساتھ متعین تعداد سے وہ جفتی کر لیتا تو اُس کو بھی چھوڑ دیتے تھے۔ اور وہ کہتے تھے کہ یہ اللہ کا متعین کیا ہوا طریقہ ہے، ہم اس طرح سے جو کرتے ہیں تو اللہ کے اَحکام کے مطابق کرتے ہیں، تو گویا کہ شیطان نے اِن جانوروں کو وہی درجہ دلا دیا تھا جو اہلِ توحید کی نظر میں ہدی اور قلائد کا تھا، کہ اللہ کی طرف نسبت کی وجہ سے ہم اُس کا احترام کرتے ہیں، تو بتوں کی طرف نسبت کی وجہ سے ان کا احترام شروع کروا دیا۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے اس رسم بد کی تردید کی ہے کہ یہ ''بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام'' یہ اللہ کے متعین کئے ہوئے نہیں ہیں، اللہ نے ان کو مشروع نہیں کیا، یہ کافر لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، اور اکثر ان میں سے بے عقل ہیں، جن کے پاس نہ کوئی علمی دلیل ہے، نہ کوئی عقلی دلیل ہے، نہ کوئی ثبوت ہے، بلا وجہ ایک غلط رسم کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ ہمیں سمجھایا ہے یا اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ ہمیں بتایا ہے۔ یہ تو نفی ہوگئی کہ ان کو مشروع اللہ نے نہیں کیا۔

غیر اللہ کے نام پر مزارات پر چھوڑے ہوئے جانور کا حکم

باقی رہا کہ اب اگر اس قسم کے جانور کسی مزار کے لیے کوئی چھوڑ دے تو پھر اُن کا حکم کیا ہے؟ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی ؒ نے سورۂ بقرۃ میں ان چاروں جانوروں کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں داخل کر کے حرام قرار دیا ہے، کہ یہ بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں شامل ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تحریم کا طریقہ تو نہیں بنایا کہ تم اس طرح سے حرام ٹھہرالیا کرو، لیکن اگر کوئی حرام ٹھہرائے گا تو یہ حرام ہو جائیں گے، مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ کے اندر داخل ہو گئے اور جس وقت تک ان کا چھوڑنے والا اپنی نیت سے توبہ نہیں کرے گا، بعد میں اُن کو اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک یہ جانور حلال نہیں ہیں، تو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ کے اندر حضرت ؒ نے اس کو شامل کیا ہے۔ لیکن ''بیان القرآن'' کے اندر جو تحریر موجود ہے، اس سے حضرت تھانوی ؒ نے رُجوع کر لیا، اگرچہ اُس رُجوع کا ذکر ''بیان القرآن'' کے حاشیے میں نہیں کیا گیا، ''امداد الفتاویٰ'' کے اندر مذکور ہے، اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ؒ نے بھی اس بارے میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ چاروں جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح سے مزاروں پر یا بتوں کے نام پر جو جانور چھوڑ دیے جاتے ہیں جن کا ذبح کروانا مقصود نہیں ہوتا، کہ ان کی روح نکال کر ان کا تقرب حاصل کیا جائے، یہ جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں شامل نہیں، ان کی یہ نسبت باطل ہے، مرنے والے کی یا بُت کی ملکیت میں جاتے نہیں، اصل مالک کی ملکیت ان کے اُوپر باقی ہوتی ہے، تو اُن کی وہی نوعیت ہے جو آپ کے جانوروں کی دوسرے کے حق میں ہے، کہ غیر آدمی مالک کی اجازت کے بغیر اگر ان کو پکڑ کر کھا جائے گا تو ایسی صورت میں تو یہ فعل حرام ہے، غصب ہے چوری ہے جیسے بھی ہے، یہ غیر کے مال میں تصرف ہے، ہاں البتہ مالک سے اجازت لے لی جائے کہ یہ جو تُو نے بکرا چھوڑا ہے اس کو ہم کھا جائیں؟ ہمیں اجازت دے دو، وہ کہہ دے کہ ہاں تم کھا سکتے ہو، تو پھر لے کر اُس کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر لیا جائے تو پھر وہ بکرا حلال ہے، مالک خود کھانا چاہے تو اُس کے لیے بھی حلال، اور مالک کسی دوسرے کو اجازت دے دے تو اُس کے لیے بھی حلال، جو زندہ جانور چھوڑے جاتے ہیں جن کی روح نکالنا اُس کے تقرّب حاصل کرنے کے لیے مقصود نہیں ہوتا، اس قسم کے جانوروں میں حرمت نہیں آتی، یوں قرار دے دینا، اس طرح سے بتوں کے نام پر یا مزاروں کی طرف نسبت کر کے جانوروں کو چھوڑ دینا یہ حرام ہے اور افعالِ شرک میں سے ہے، لیکن جانور کی حیثیت نہیں بدلتی، وہ حلال کا حلال ہے، مالک کی ملکیت پہ باقی ہے، کسی مُردے کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوا، اس لیے مالک سے اجازت لے کر اگر اُس کو کوئی پکڑ کر استعمال کر لیتا ہے تو اُس کے لیے یہ حلال ہے، تو یہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللهِ میں داخل نہیں، ''امداد الفتاویٰ'' کے اندر اس مسئلے کو اسی طرح سے واضح کیا گیا ہے، اب کوئی مرغا چھوڑ کر آتا ہے کسی مزار پر، اور وہ وہاں پھر رہا ہے، تو اصل مالک کی ملکیت باقی ہے، مرنے والے کی ملکیت میں نہیں گیا، تو مالک اگر کسی کو اجازت دے دے اور وہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر کے کھالے تو اس میں کوئی کسی قسم کا حرج نہیں ہے۔

سوال:- مزارات پر جو جانور پھر رہے ہوتے ہیں، تو جو بھی پکڑ کر کھالے اس کو اجازت ہے؟

جواب:- نہیں! اس طرح اجازت نہیں ہوتی، اگر مالک کو پتا چل جائے کہ پکڑنے والا دیو بندی ہے تو پھر وہ کھانے کی

اجازت نہیں دیتے، اگر مالکوں کی طرف سے اجازت ہوگی تو انہی کے لئے ہوتی ہے جو وہاں قبر کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں، مجاور ہیں، جو وہاں اس بزرگ کے پڑوس میں بیٹھے ہوئے ہیں، اگر اجازت ہوگی تو دلالۃً اُن کے لئے ہوگی، تو اگر دلالۃً اذن سے فائدہ اُٹھانا تو یہ انہی کے لئے ہوسکتی ہے جو وہاں اس کے مزار کے آس پاس بیٹھے ہیں۔ اور یہ دوسرا آدمی اگر پکڑے تو ہوسکتا ہے کہ مالک کی طرف سے اجازت نہ ہو۔ اور اگر آپ کو اطمینان ہو کہ نہیں امالک کی طرف سے اجازت ہے کہ اگر ہم اس کے سامنے بھی پکڑ لیں گے، پکڑ کر بسم اللہ پڑھ کے ذبح کر کے کھالیں گے تو اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اُس جانور کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

شرک فی التشریع

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ: یہ اُن کی دلیل کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کی طرف متوجہ ہوجاؤ، آجاؤ، اس کو قبول کرلو، اللہ کے رسول کی طرف آجاؤ تاکہ وہ تمہیں کوئی صحیح طریقہ بتادے، تو اُن کی دلیل آگے سے یہی ہوتی ہے کہ نہ بھائی! ہمارے لیے تو وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا۔ تو چاہے وہ آباء کا طریقہ کتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی صراحت کے خلاف ہو، اللہ کے رسول کی ہدایات کے خلاف ہو، وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے آباء کے طریقے پر چلیں گے، اللہ کی اُتاری ہوئی بات یا اللہ کے رسول کی بیان کی ہوئی بات ہم قبول نہیں کریں گے، تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلے میں اس طرح سے اپنے آباء کو اہمیت دے دینا یہ بھی شرک ہے، یہ گویا کہ تشریع کے اندر شرک ہے، کہ اُحکام دینا اللہ کا کام ہے لیکن انہوں نے اپنے آباء کو یہ مقام دے دیا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، چاہے اللہ کے احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وہی مانیں گے، تو اُن کی دلیل یہی ہے کہ ہم نے تو اپنے بڑوں سے جو طریقہ دیکھا ہے ہم نے تو اُسی کی اتباع کرنی ہے، تو اس انداز کے ساتھ بڑوں کے پیچھے لگ جانا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے صراحتاً حکم آجانے کے باوجود بھی، انسان سمجھتا بھی ہے کہ جو کچھ میرے بڑے نے کہا ہے یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے، اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف ہے، ایسے طور پر اگر کسی دوسرے کی اتباع کی جائے گی تو یہ بھی شرک ہے، اس کو شرک فی التشریع کہہ سکتے ہیں، کہ اُحکام دینا اللہ کا کام ہے، اس نے دوسرے کو یہ مقام دے دیا۔ جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جس وقت مسلمان ہوئے ہیں، یہ پہلے عیسائی تھے، انہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سوال کیا تھا، کہ یارسول اللہ! قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۱) کہ ان عیسائیوں نے اَحبار ورُہبان کو اللہ کے علاوہ رَبّ بنالیا، وہ تو ان کو رَبّ نہیں کہتے، چونکہ وہ خود پہلے عیسائی تھا اس لیے اُس نے کہا کہ قرآن الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے اُن کو رَبّ قرار دیا حالانکہ وہ انہیں رَبّ نہیں سمجھتے، رَبّ قرار نہیں دیتے۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب یہی دیا کہ بتاؤ کہ وہ ان اَحبار ورُہبان کے اَحکام کو اس طرح سے نہیں مانتے جس طرح سے اللہ کے اَحکام مانے جاتے ہیں؟ اُن کا کوئی حکم ایسا آجائے جو اُن کی کتاب کے خلاف ہے، اللہ کے بتائے ہوئے حکم کے خلاف ہے، تو کیا وہ اَحبار ورُہبان کی بات کو تسلیم نہیں کرتے؟ اور اللہ کے حکم کو چھوڑ نہیں دیتے؟ جانتے ہوئے بھی کہ یہ حکم اللہ کے حکم

کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے ہاں جی! یوں تو کرتے ہیں۔ فرمایا یہی اِتخاذِ رَبّ ہے، یعنی کسی کے حکم کو یہ حیثیت دے دینا کہ صراحتاً اللہ کے حکم کے مقابلے میں وہ حکم دے دے تو مان لیا جائے، یہ اِتخاذِ رَبّ ہے، اور یہ بھی شرک ہے، اُنہوں نے ایسے ہی اختیار کر رکھا تھا۔

آیتِ بالا سے غیر مقلدین کا غلط اِستدلال اور اس کا جواب

یہ بات آپ کی خدمت میں ذرا وضاحت کے ساتھ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں، کہ بسا اوقات بعض بے دِین قسم کے لوگ مقلدین کے لیے بھی اس آیت کو پڑھا کرتے ہیں، کہ ''ان کو تو ان کے آباء کا طریقہ چاہیے، ان کو نہیں معلوم کہ اللہ نے کیا کہا اور اللہ کے رسول نے کیا کہا۔'' اس قسم کی آیتیں وہ مقلدین کے اُوپر فٹ کرتے ہیں، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ ''تقلید'' کا یہ مفہوم نہیں، کہ ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ جو کہہ دیں ہم تو وہی مانیں گے اگرچہ قرآن اور حدیث کے صراحتاً خلاف ہی کیوں نہ ہو، ایسی نوعیت بالکل نہیں ہے، ''تقلید'' کا مفہوم تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسے شخص پر اعتماد کر لیا گیا کہ جس کو ہم قرآن وحدیث کا ماہر سمجھتے ہیں، اُس کے علم اور اُس کی دیانت اور تقویٰ کی بناء پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو وہ بات کہتا ہے قرآن وحدیث سے سمجھ کر کہتا ہے، اور ہمیں نہ اُتنا وسیع علم ہے، نہ اُتنا وسیع تجربہ ہے، نہ ہمارا اتنا تقویٰ نہ اِحتیاط، اس لیے اُن کے بیان کردہ اَحکام پر اِعتماد کر لیا جائے، کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول کے ہی اَحکام ہیں، وہ اَحکام اُس اِمام کے نہیں سمجھے جاتے، بلکہ وہ اَحکام اللہ اور اللہ کے رسول کے سمجھے جاتے ہیں، اور اس اِمام کو بیان کرنے والا سمجھا جاتا ہے، اور وہ اَحکام ایسے ہوتے ہیں جو قرآن اور حدیث میں صراحتاً آئے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ اِجتہاد اور اِستنباط کے ساتھ نکالے جاتے ہیں، تو اس اِجتہاد اور اِستنباط کے ساتھ نکالنے کی وجہ سے اُن کی نسبت اِمام کی طرف ہوتی ہے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے وہ سارے کے سارے ''اَحکامِ شرع'' کہلاتے ہیں، تو یہ بات اُن پر صادق نہیں آتی۔ یہاں تو ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللہُ اور ما قالَ الرسولُ صراحتاً موجود ہے، اور اس کے مقابلے میں اُن کے بڑے اَحکام دیتے ہیں تو جاننے کے باوجود وہ کہیں کہ ہم مَآ اَنْزَلَ اللہُ کو قبول نہیں کرتے، ماقالَ الرسولُ کو قبول نہیں کرتے، بلکہ جس طریقے کے اُوپر ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے ہمیں تو وہی طریقہ کافی ہے۔ تو ''تقلید'' پر یہ بات صادق نہیں آتی۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ: اس میں اُن کی اس دلیل کو رَدّ کیا گیا ہے، کہ کیا یہ اپنے آباء کے طریقے کو کافی سمجھتے رہیں گے اگرچہ ان کے آباء ایسے ہوں کہ نہ وہ کسی شئ کا علم رکھتے ہیں، نہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اھتداء: ہدایت یافتہ ہونا، یہ عمل کی صورت ہے، کہ کسی چیز کے متعلق علم بھی ہو پھر انسان اُس کے مطابق چلتا بھی ہو تو کہیں گے کہ یہ علم بھی رکھتا ہے، یہ عالم بھی ہے اور مہتدی بھی ہے، تو اُن کے آباء نہ تو عالم تھے نہ مہتدی، علم وعمل دونوں سے خالی، نہ اُن کو اللہ کے اَحکام معلوم، نہ اُن کے مطابق اُن کا عمل، تو جن کے آباء ایسے گمراہ ہوں، جاہل ہوں، بے علم ہیں، اور راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں، اُن کے طریقے کو اصل قرار دے کر اُسی کے اُوپر جم جانا یہ کون سی عقل مندی ہے؟ تو یہ اُن کی دلیل کے اُوپر انکار کیا گیا، جس سے معلوم ہو گیا کہ اگر کسی کے بڑے علم وہدایت کے حامل ہوں، اُن کے پیچھے چلنا اصل کے اعتبار سے اتباعِ علم وہدایت ہی ہے، اس لیے ہم اگر کسی بزرگ کی بات کو مانتے

ہیں تو اس لیے نہیں مانتے کہ اُس کی شخصی حیثیت ہمارے سامنے ہے، بلکہ ہم اس لیے مانتے ہیں کہ علم وہدایت کا سرمایہ اُن کے پاس ہے، وہ ایک بات کو جانتے ہیں، اُس کے مطابق عمل کرتے ہیں، علم صحیح اُن کے پاس موجود ہے، اب اگر اُن کی اتباع کی جائے گی تو گویا کہ اصل کے اعتبار سے وہ علم وہدایت کی اتباع ہی ہے، اللہ کے مقابلے میں اُس بزرگ کی اتباع نہیں ہے۔

اِتباع میں قابلِ اعتماد اُصول

بہر حال اس میں یہ اصول بتا دیا گیا کہ اتباع کے قابل علم اور ہدایت ہے، کسی کا اَب ہونا، جد ہونا، کسی کا عمر کے لحاظ سے بڑا ہونا، یہ کوئی اتباع کا اُصول نہیں ہے، جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں صراحت کے ساتھ آیا، آپ کے سامنے سورۂ مریم میں آئے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ (سورۂ مریم: ۴۳) اے میرے اَبا! میرے پاس علم آگیا جو تیرے پاس نہیں ہے، فَاتَّبِعْنِیْۤ: تو میری اتباع کر۔ یہ بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ عمر میں بڑا ہونا اور باپ ہونا یہ کوئی قابلِ اتباع چیز نہیں ہے، یہ کوئی اُصول نہیں کہ جو عمر میں بڑا ہو، یا جو نسب کے اندر پہلے آگیا، ہمارا باپ یا دادا ہو گیا، اس کی اِتباع کی جائے گی، ایسے نہیں، بلکہ متبوع علم ہے، جس کے پاس علم ہو گا اُس کی بات مانیں گے، جس کے پاس علم نہیں ہے اُس کو بات ماننی پڑے گی، تو اِتباع اصل کے اعتبار سے علم وہدایت کی ہے نہ کہ عمر کے لحاظ سے کسی انسان کی، یا نسب کے لحاظ سے کسی انسان کی، تو یہاں بھی وہی بات آگئی کہ جب اُن کو علم نہیں، ہدایت نہیں، پھر اُن کے طریقے کو کافی سمجھنا یہ کیسی عقل مندی ہے؟ تو یہ اُصول اس میں سے سمجھ میں آگیا کہ جو بات علمی دلیل کے ساتھ ثابت ہو اُس کو تسلیم کیا جاتا ہے، اور جس کے پاس علم وہدایت ہو اُس کی اتباع کی جاتی ہے، باقی عمر کے لحاظ سے بڑا ہونا یا باپ دادا ہونا یہ کوئی متبوع ہونے کی دلیل نہیں ہے، لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ: اگرچہ ان کے بڑے علم وہدایت نہ رکھتے ہوں پھر بھی یہ اُن کے طریقے کو کافی سمجھتے رہیں گے؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مضمونِ تسلی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ: پیچھے مشرکین کی جہالت کا ذکر تھا، کہ وہ اپنے طور پر ایک طریقہ تجویز کرتے ہیں جو صراحتاً شرک ہے، اور اُس کو منسوب اللہ کی طرف کر دیتے ہیں، جب اُن سے کوئی گفتگو ہوتی ہے تو اپنے باپ دادے کے طریقے کو حجت میں لاتے ہیں، یہ اُن کا طرزِ عمل اہلِ ایمان کے لئے افسوس کا باعث ہوتا تھا، تو جب اُن کو بار بار سمجھایا جاتا تب بھی نہ سمجھتے تو اس پر غم اور حزن بھی ہوتا ہے، تو جیسے بہت ساری آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کا کام سمجھانا ہے، اگر آپ کے سمجھانے کے بعد یہ لوگ نہیں سمجھتے تو اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، آپ زیادہ غم میں نہ پڑا کیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ مضمون بہت ساری آیات میں ذکر کیا گیا، اور اس آیت میں اہلِ ایمان کے متعلق بھی یہی بات ہی

کہی جارہی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اپنی فکر کرو، خود غلطی نہ کرو، اللہ کے اَحکام پر عمل کرو، اور جب تم ہدایت یافتہ ہوگے تو کوئی شخص گمراہ ہو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں، مفہوم اس آیت کا یہی ہے۔

مذکورہ آیت پر ایک اِشکال اور اس کا جواب

اس آیت کے ظاہری مفہوم کی طرف دیکھتے ہوئے شبہ پڑتا ہے کہ شاید امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری نہیں، کیونکہ اس میں لفظ یہ آئیں گے کہ اگر تم ہدایت یافتہ ہو تو کوئی شخص گمراہ رہے تمہیں وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس میں تمہارا کوئی ضرر نہیں ہے، تو سطحی نظر ڈالنے سے ذہن ادھر جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص خود عمل کرتا رہے اور دوسرے لوگ غلط کار ہوں تو اس کا کوئی نقصان نہیں، اور اس کے ذِمّے یہ کوئی ضروری نہیں کہ اُن کو نیکی سکھائے یا بُرائی سے روکے، یہ مفہوم جو ظاہری سطحی طور پر سمجھ میں آتا ہے یہ صحیح نہیں یہ غلط ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی بعض لوگوں کو یہ اِشکال پیش آیا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اور دوسرے حضرات نے اس غلطی کو دُور کیا، بایں طور کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جب گرفت ہوگی تو پھر یہی نہیں کہ صرف بدکاروں پر ہی گرفت ہوگی، جو اُس بُرائی کو آسانی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں، روک سکنے کے باوجود نہیں روکتے، وہ بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے، حاصل اُن روایات کا یہ ہے، جو اِس آیت کی تفسیر کے اندر ذکر کی گئی ہیں، اور خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا، مثال دے کر واضح فرمایا کہ اللہ کی حدود میں واقع ہونے والے لوگ (یعنی اللہ کے اَحکام کی خلاف ورزی کرنے والے) اور اللہ کی حدود کے بارے میں سست کار لوگ جو اللہ کی حدود کی مخالفت کو رَدّ نہیں کرتے، بلکہ آسانی کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں، اُن کی مثال اس طرح سے دی کہ جیسے کشتی ہے دو منزلی، اس کی دو منزل ہیں، اور اُس میں کچھ لوگ سوار ہوئے، بعض نچلے درجے میں چلے گئے، بعض اُوپر والے درجے میں چلے گئے، اب جو نچلے درجے میں ہیں وہ پانی لینے کے لیے اُوپر آتے، کیونکہ وہ اُوپر آکر ہی سمندر سے پانی کھینچ سکتے ہیں، لیکن اُوپر والے تکلیف محسوس کرتے اُن کے آنے جانے سے، تو نچلی منزل والوں میں سے ایک شخص نے کلہاڑی لے کر نیچے سے سوراخ کرنا شروع کر دیا کشتی میں، اوپر والوں نے اس سے پوچھا کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے پانی کی ضرورت ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں، اور جب میں اُوپر پانی لینے کے لیے آتا ہوں تو تم تکلیف محسوس کرتے ہو، تو اس لیے میں یہاں سے سوراخ کر کے یہاں سے پانی لے لوں گا۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ اُوپر والے اگر نچلے والے کا ہاتھ پکڑ لیں گے اور اُسے سوراخ نہیں کرنے دیں گے، تو خود بھی بچ جائیں گے اور اُسے بھی بچا لیں گے، اور اگر انہوں نے یوں سوچنا شروع کر دیا کہ ہمیں کیا، وہ اپنے درجے میں سوراخ کر رہا ہے، تو کرتا رہے، تو صرف اکیلا وہی نہیں ڈُوبے گا، نچلے والے بھی ڈُوبیں گے اور ساتھ ہی اُوپر والے ڈُوبیں گے۔[1] تو یہ مثال دی، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اگر تم اپنے طور پر نیکی کرتے رہو اور دوسرے لوگ آپ کے محلے میں آپ کے پڑوس میں اردگرد بُرائی کرتے ہیں، اور آپ یہ سوچ لیں کہ ہمیں کیا، اُن کا کیا اُن کے

(۱) صحیح البخاری ۱/۳۶۹ باب القرعۃ فی المشکلات/مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۳۶ باب الامر بالمعروف، فصل اول، عن النعمان بن بشیر۔

ساتھ، ہمارا کیا ہمارے ساتھ، یا وہ اپنے گھر میں کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں، ہمیں اس کی کیا تکلیف ہے، اس طرح سے کر کے اگر تم چھوڑ دو گے تو پھر ان کی بدکرداری کی بنا پر جو عذاب آئے گا وہ صرف انہی پر نہیں آئے گا، بلکہ سارے کا سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجائے گا، یہ نیکوکار لوگ بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے، اس لیے ایک اور حدیث میں ہے جہاں تک ممکن ہو اَمر بالمعروف نہی عن المنکر کرتے رہو، اَمر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو، ورنہ اللہ کی طرف سے جب عذاب آئے گا پھر تم دُعائیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ دُعا بھی قبول نہیں کرے گا۔[1] اور ایسے ہی ایک واقعہ ''مشکوٰۃ شریف'' میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو فلاں بستی کو جا کر پلٹ دو، برباد کر دو۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ جی! اس میں تو آپ کا فلاں بندہ ایسا ہے کہ جس نے کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، کیا اس کے سمیت ہی اُس کو پلٹ دیا جائے؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ ہاں اس کے سمیت ہی پلٹ دیا جائے، اُس نے اگر میری نافرمانی نہیں کی، تو نافرمانوں کو دیکھ کر کبھی اُس کی پیشانی پر بَل بھی نہیں پڑا، منکرات کو دیکھ کر اُس کا چہرہ کبھی متغیر نہیں ہوا۔[2] اس سے بھی معلوم ہوا کہ عذاب کی لپیٹ میں ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو اپنے کردار میں اگرچہ اچھے ہوں، لیکن بُرائی سے وہ نفرت نہیں کرتے یا بُرائی سے روکتے نہیں یا نیکی کی اشاعت کا جذبہ اُن کے اندر نہیں ہے۔ تو ان روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنا کردار ٹھیک کر لینا کافی نہیں، بلکہ نیکی کی اشاعت اور بُرائی سے روکنا یہ بھی ضروری ہے، اور اس کے بغیر انسان عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ تو پھر اس آیت کے اندر جو آیا کہ جب تم مہتدی ہو گے، ہدایت یافتہ رہو گے، تو گمراہ ہونے والا شخص تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، پھر ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

تو اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں اور ان روایات میں کوئی کسی قسم کا تعارض نہیں، بلکہ تطبیق ہو جاتی ہے اِذَا اهْتَدَيْتُمْ کے لفظ کی طرف دیکھتے ہوئے، اِهْتَدٰی کا معنی ہوتا ہے، ہدایت قبول کرنا، ہدایت کے مطابق چلنا۔ هَدٰی يَهْدِيْ: راہنمائی کرنا۔ اِهْتَدٰی: راہنمائی کو قبول کر لینا، سیدھا راستہ پالینا۔ اور مہتدی وہ شخص سمجھا جایا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ اَحکام کو ادا کرتا ہے، فرضوں کو ادا کرتا ہے اور محرّمات سے بچتا ہے، جو شخص فرض ادا نہیں کرتا اور محرّمات سے بچتا نہیں وہ مہتدی نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جو فرض عائد ہوتے ہیں ان میں جس طرح نماز پڑھنا فرض ہے، روزہ رکھنا فرض ہے، اسی طرح سے اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض ہے، تو صحیح معنی میں مہتدی وہی سمجھا جائے گا جو اپنے اعمال کو درست رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے اعمال کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ہے مہتدی، تو اب آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ جب تم اپنے فرض ادا کر چکے، جس طرح سے تم اپنے ذاتی فرائض ادا کرتے ہو جو تم پر فرضِ عین کے طور پر عائد ہیں، جب تم یہ ادا کر چکے، اسی طرح سے اَمر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض تم نے ادا کر دیا، اب اگر کوئی شخص تمہارے ہدایت کرنے سے سیدھے راستے پہ نہیں آتا تو تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ تو مہتدی وہی شخص ہے جو سب فرائض کو ادا کرتا ہے، تو اَمر بالمعروف نہی عن المنکر بھی فرض ہے، تو مہتدی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس فرض کو بھی ادا کرے۔ ہاں! البتہ اتنا فرق ہے کہ ایک دفعہ حق دوسرے کے کان تک پہنچا دینے

---

(۱) ترمذی ۲/ ۴۰ باب ما جاء فی الامر بالمعروف الخ/مشکوٰۃ ۲/ ۴۳۶ باب الامر بالمعروف عن حذیفة

(۲) مشکوٰۃ ۲/ ۴۳۹ باب الامر بالمعروف کا آخر عن جابر/شعب الایمان ۱۰/ ۷۳ ولفظه: اقلبها علیه وعلیهم فان وجهه لم یتمعر فی ساعة قط۔

کے بعد یہ فرض ساقط ہوجاتا ہے، اگرچہ اَولیٰ اور اَفضل یہی ہے کہ انسان دوسرے کو متاثر کرنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرے، بار بار اس سے اصرار کرے، بار بار اُس کو سمجھانے کی کوشش کرے جس طرح سے کہ انبیاء علیہم السلام کرتے ہیں، لیکن حق کے اظہار کے بعد سب تک آواز پہنچ جانے کے بعد اِس میں وہ شدت نہیں رہتی۔ ایک بات! دُوسری بات یہ ہے کہ مخاطب کی طرف سے جب مایوسی ہوجائے کہ یہ مانے گا نہیں، ایسے وقت میں بھی یہ فرض ساقط ہوجاتا ہے، چنانچہ اسی آیت کی تفسیر کے اندر جو روایات آئی ہیں اُن کے اندر یہ لفظ بھی آئے ہیں: ''حَتّٰی إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكَ بِنَفْسِكَ'' او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام، کہ جب تم یہ دیکھو کہ لوگ حرص کے پیچھے لگ گئے ہیں، شُح حرص کو بھی کہتے ہیں، بخل کو بھی کہتے ہیں، حرص اور بخل کی اطاعت شروع ہوگئی، حرص کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں، بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتے، بلکہ مال سمیٹنے اور جمع کرنے میں لگ گئے، شُح کی اطاعت شروع ہوگئی، اور جس وقت تم یہ دیکھو ھوی متبع ہوگئی یعنی خواہشاتِ نفس کی اتباع ہونے لگ گئی کہ لوگ کرتے وہی ہیں جو اُن کے جی کے اندر آتا ہے، اُن کو یہ بحث نہیں کہ یہ کام کہاں تک ٹھیک ہے، کہاں تک ٹھیک نہیں، جو دل میں آگیا وہی کرنا ہے، تو ہویٰ کی اتباع شروع ہوجائے، اور جب تم دیکھو کہ دُنیا کو ترجیح دی جارہی ہے، اور جس وقت تم یہ دیکھو کہ ہر شخص اپنی رائے پر خوش ہے، کسی دوسرے کی ماننے کے لیے تیار نہیں، یہ تین باتیں ذکر فرمائیں، شُح کی اطاعت شروع ہوجائے، ہویٰ کی اتباع شروع ہوجائے، اور ہر شخص اپنی رائے کے اُوپر مطمئن ہو اور اپنی رائے پہ خوش ہو کہ میری رائے ٹھیک ہے، کسی دوسرے کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو، ایسے وقت میں پھر تم اپنی فکر کرو اور ''دَعْ أَمْرَ الْعَوَامِ'' عوام کا معاملہ چھوڑ دو۔[1] کیونکہ یہ وقت پھر مایوسی کا ہوتا ہے کہ جس میں انسان سمجھتا ہے کہ جب ہر کسی نے اپنی خواہش پر چلنا ہے، اور اپنے حرص اور بخل کے تقاضے پورے کرنے ہیں، اور اپنی رائے کے اوپر ہر کوئی مطمئن ہے، تو پھر پیچھے پڑنے کا کیا فائدہ؟ تو ایسی صورت میں بھی یہ فرض ساقط ہوجاتا ہے۔ اور ایسے ہی ایک تیسری صورت بھی ہے کہ اظہارِ حق کی صورت میں، اَمر بالمعروف نہی عن المنکر کی صورت میں ایسی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے جو انسان برداشت نہ کرسکے، مثلاً جس کو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ کوئی ایسا ذی اقتدار ظالم ہے کہ اگر اُس کے اُوپر کسی قسم کا انکار کیا گیا تو اپنی پوری قوت کے ساتھ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، اور اُس کے دفاع پر آپ قادر نہیں ہیں، تو ایسی صورت میں بھی سکوت اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ان صورتوں میں اَمر بالمعروف نہی عن المنکر ساقط ہوجائے گا، عام حالات میں یہ فرض ہے، اور مہتدی وہی شخص سمجھا جائے گا جو کہ اس فرض کو بھی ادا کرتا ہے۔ لہٰذا وہ روایات اِس آیت کے مطابق ہیں، اور یہ مضمون سارے کا سارا إِذَا اهْتَدَيْتُمْ سے نکل آیا، کہ جب تم ہدایت یافتہ ہو پھر جو شخص گمراہ رہے تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں، اور تم ہدایت یافتہ کب کہلاؤ گے؟ جب تم اپنے سارے فرض ادا کرتے ہو جو تم پر عائد ہوتے ہیں، جن میں سے ایک فرض یہ بھی ہے کہ اَمر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو۔ تو اپنی طرف سے تبلیغ کرنے کے بعد حق کا اظہار کرنے کے بعد پھر اس فکر میں نہ پڑو کہ فلاں نہیں مانا، فلاں نہیں مانا، اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو لازم پکڑو'' اپنی فکر کرو، اپنے نفع نقصان کو سامنے رکھو، لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ: نہیں نقصان پہنچائے گا

(۱) مشکوٰۃ ۴۳۷/۲ باب الامر بالمعروف. عن ابی ثعلبۃ/ترمذی ۱۳۰/۲ تفسیر سورۃ مائدہ/ابوداؤد ۲۴۱/۲ باب الامر والنھی. واللفظ لہ

تمہیں وہ شخص جو بھٹک گیا جبکہ تم ہدایت یافتہ ہو۔ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا: اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے تم سب نے، تم سب کا لوٹنا (مرجع: لوٹنے کی جگہ، یا مصدر میمی ہے، لوٹنا) تمہارے لوٹنے کی جگہ سب کی اللہ کی طرف ہے، فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: پھر وہ خبر دے گا تمہیں اُن کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔ مرجع مصدر میمی کی طور پر بھی آتا ہے اور ظرف کے طور پر آتا ہے۔

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ'' کا شانِ نزول

آگے شہادت کا ایک ضابطہ واضح کیا ہے، اس کے شانِ نزول میں تفاسیر میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، تو اس واقعے کو سامنے رکھنے کے بعد اِن آیات کا مطلب اچھی طرح سے حل ہوجاتا ہے، ایک شخص تھا ''بُدَیل'' نامی، بدیل اس کا نام تھا، یہ مسلمان ہے، صحابی ہے، سامانِ تجارت لے کر یہ کہیں باہر علاقے میں گئے، اور اِن کے ساتھ دو رفیق اور تھے ایک تمیم اور ایک عدی، اور یہ دونوں نصرانی تھے، دوسرے علاقے میں پہنچنے کے بعد بدیل بیمار ہوگیا، کچھ آثار ایسے ہوئے کہ اس کو مایوسی ہوئی کہ میں صحت یاب نہیں ہوسکوں گا، اُس نے یہ عقل مندی کی کہ اپنے سامان کی فہرست بنائی کہ میرے پاس فلاں فلاں چیز ہے، اور وہ فہرست بنا کر اپنے سامان میں چھپادی، اور پھر اپنے اُن دو ساتھیوں کو جو نصرانی تھے، چونکہ اس موقع پر جاننے والا کوئی مسلمان موجود نہیں تھا، تو یہ دونوں نصرانی تھے، ان دونوں کو اُس نے وصیت کی، ان کو وصی بنادیا، کہ جس وقت تم واپس جاؤ تو میرے ورثاء کو میرا یہ سامان پہنچا دینا، انہوں نے اس وصیت کو قبول کرلیا، ان دونوں کو علم میں یہ بات نہیں تھی کہ اس سامان کے اندر فہرست بھی رکھی ہوئی ہے، وہ سامان انہوں نے سنبھال لیا، تو اس سامان میں ایک قیمتی چیز تھی چاندی کا پیالہ جس کے اُوپر سونے کا ملمع تھا یا سونے کی پتیاں بعض جگہ لگی ہوئی تھیں، قیمتی چیز یہی تھی، یہ پیالہ ان دونوں نے چھپالیا، اور جس وقت واپس آئے تو اس کا باقی سامان ورثاء کے سپرد کردیا، جب ورثاء نے سامان کی تفتیش کی تو اندر سے فہرست نکل آئی، اور اس میں ایک پیالہ کا ذکر تھا جو اُس سامان میں سے نکلا نہیں، انہوں نے ان دونوں سے پوچھا کہ ہمارے صاحب نے آپ کو وصیت کرنے کے بعد پھر کوئی چیز فروخت تو نہیں کی؟ وہ کہنے لگے کہ نہیں، کوئی علاج معالجے میں خرچ کی ہو، اور کچھ سامان اس میں سے کچھ خرچ کردیا ہو؟ وہ کہنے لگے کہ نہیں، ان سب چیزوں کا انہوں نے انکار کردیا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ اس میں سے ایک فہرست نکلی ہے جس میں ایک چاندی کے پیالے کا ذکر ہے، وہ کہنے لگے ہمیں اس کا کوئی پتا نہیں، وہ انکار کرگئے، اور وہ جو پیالہ تھا اُس کو لے جا کر مکہ معظمہ میں ایک سنار کے پاس بیچ دیا، اور پھر یہ بُدَیل کے ورثاء وہاں کہیں گئے، انہوں نے وہ پیالہ پہچان لیا کہ یہ تو ہمارا ہے، اُس سنار سے پوچھا کہ تُو نے کہاں سے لیا؟ وہ کہنے لگا کہ تمیم اور عدی یہ دونوں میرے پاس بیچ کر گئے ہیں، سراغ لگ گیا کہ یہ پیالہ ان کے پاس تھا، اُن سے پوچھا گیا کہ وہ پیالہ تو ہمارا ہے، فہرست میں لکھا ہوا تھا، اور تم کہتے ہو کہ اور کوئی چیز نہیں تھی، تو وہ دونوں کہنے لگے کہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے یہ پیالہ اس سے خرید لیا تھا، لیکن چونکہ ہمارے پاس خریدنے کے گواہ نہیں تھے اس لیے ہم نے اس خریدنے کا اظہار نہیں کیا، کہ اگر آپ لوگ انکار کردو گے کہ نہیں خریدا تو ہم ثابت کس طرح کریں گے؟ اس لیے ہم نے انکار ہی کردیا کہ اور کوئی سامان ہے ہی نہیں۔ اب

یہاں ذرا مقدمے کی نوعیت دیکھ لیجئے، پہلے جس وقت وہ آئے تو ورثاء ایک قسم کے مدّعی تھے کہ تمہارے پاس کوئی اور سامان ہے، اور وہ (تمیم اور عدی) منکر تھے کہ ہمارے پاس نہیں ہے، اب صورت حال بدل گئی کہ وہ اشتراء کے مدّعی ہیں کہ ہم نے خریدا ہے، اور ورثاء اپنے علم کے طور پر منکر ہیں کہ تم نے نہیں خریدا۔ سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے مقدمہ چلا گیا تو اب قسم آیا کرتی ہے منکر پر، تو پہلے تو قسم اُٹھائی تھی ان وصیوں نے کہ ہمارے پاس کوئی اور سامان نہیں ہے، وہ قسم اُٹھا گئے، اور اب دوبارہ آگیا واقعہ کہ وہ مدّعی تھے کہ ہم نے خریدا ہے، اور ورثاء اپنے علم کے طور پر منکر ہیں، اب قسم آگئی ورثاء پر، لیکن ورثاء قسم اُٹھائیں گے اپنے علم پر، کہ ہمارے علم میں نہیں کہ انہوں نے خریدا ہے، اپنے علم پر قسم اُٹھائیں گے کیونکہ جب کسی دوسرے کے فعل کے اُوپر قسم اُٹھائی جاتی ہے تو وہاں اپنے علم کی حد تک اُٹھائی جایا کرتی ہے، تو جس وقت وہ تمیم اور عدی خریدنے پر شاہد نہ پیش کر سکے، اور اَولیائے میت کے اُوپر حلف آگئی، تو انہوں نے حلف اُٹھالی اپنے علم کے مطابق، چونکہ فہرست کے اندر اس کا ذکر تھا، اور اِن کی کلام مشکوک ہوگئی کہ پہلے کہتے تھے کہ کچھ بیچا نہیں اور کچھ خرچ نہیں کیا، اور اب وہ خریدنے کے مدّعی تھے، تو ایسی صورت میں فیصلہ اولیاء کے حق میں ہوگیا، اور وہ پیالہ بُدیل کے ورثاء کو دِلا دیا گیا۔ تو اس واقعے کے اوپر اُوپر یہ آیات بالکل لفظ بلفظ منطبق ہوتی ہیں، جب اس واقعے کو آپ سامنے رکھیں گے تو اس کے بعد اِن کا حل کرنا آسان ہوجائے گا۔

خلاصۂ آیات

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ: لفظی تحقیق کل آپ کے سامنے ذکر کردی گئی تھی کہ شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ مبتدأ ہے اور اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ خبر ہے، تو مبتدأ اور خبر کا آپس میں حمل ٹھیک کرنے کے لیے یہاں ذُو کا لفظ محذوف نکال لیجئے، ''شہادت والے، گواہی والے تمہارے درمیان دو آدمی ہیں عادل تم میں سے، جس وقت تم میں سے کسی کو موت آجائے وصیت کے وقت'' یعنی یہ دونوں ظرفیں ہیں، کہ جب تم میں سے کسی پر موت کے آثار طاری ہوجائیں اور وصیت کرنے کا ارادہ ہو، ایسے وقت میں گواہی والے تمہارے درمیان دو عادل آدمی ہیں تم میں سے، یعنی مسلمانوں میں سے۔ یا اگر مسلمان نہ ہوں تو اپنے غیر میں سے دو آدمی لے لو اگر تم چلو زمین میں یعنی سفر کرو، فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ: پھر تمہیں موت کی مصیبت پہنچ جائے، موت کا حادثہ پہنچ جائے تب یہ نوبت آئے گی، اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ اس لیے ذکر کردیا کہ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ کی نوبت عموماً سفر میں ہی آتی ہے، ورنہ انسان اگر اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہو تو وہاں اپنی مرضی کے مطابق مسلمانوں میں سے بھی شاہد مل سکتے ہیں۔ گواہ بن گئے، تو تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ یہ صورۃً خبر معنیً انشاء ہے، اور اس کا تعلق ہے اِنِ ارْتَبْتُمْ کے ساتھ، کہ اگر تمہیں شبہ پڑ جائے۔ ارتیاب: شک میں واقع ہونا۔ اگر تمہیں شبہ ہوجائے کہ ان کا بیان صحیح نہیں ہے تو تم روک لیا کرو ان دونوں کو نماز کے بعد، ''روک لیا کرو'' یہ حاصل مفہوم ہے، ورنہ ''روکتے ہو، روکو گے'' مضارع کا ترجمہ جس طرح سے ہوا کرتا ہے، لیکن صورۃً خبر اور معنیً انشاء کے طور پر ترجمہ یوں کیا جائے گا ''روک لیا کرو اُن دونوں کو نماز کے بعد''، کوئی نماز ہو اُس کے بعد روک لیا، خاص طور پر روایات میں عصر کا ذکر آتا ہے

کہ عصر کے بعد کا وقت متبرک ہے، پھر مسجد، پھر لوگوں کا مجمع، پھر متبرک وقت، یہ تغلیظ کے لیے ہوتا ہے کہ اگر قسم میں سختی پیدا کی جائے تو یہ بات ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ لوگ قسم عبادت خانوں کے سامنے یا عبادت خانوں میں لیتے ہیں، کہ اس کا نفسیاتی طور پر اثر زیادہ پڑتا ہے، ورنہ اللہ کے نام کی قسم میں کوئی فرق نہیں جہاں بھی اٹھالو، لیکن اگر متبرک جگہ میں اُٹھائی جائے اور متبرک وقت میں اُٹھائی جائے تو اس میں زیادہ شدت پیدا ہوجاتی ہے، جیسے مسجد میں لے جاکر قسم لے لی، تو یہ تغلیظ ہے قسم کے اندر، ''روک لیا کرو ان دونوں کو نماز کے بعد، پھر وہ دونوں اللہ کی قسم اُٹھائیں'' اور قسم اُٹھاتے ہوئے یہ بات کہیں کہ لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا: ہم اپنی اس قسم کے بدلے میں کوئی قیمت نہیں لے رہے، کوئی ثمن ہم اختیار نہیں کر رہے، یعنی کوئی مفاد نہیں حاصل کر رہے، وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى: اگرچہ وہ شخص جس کو ہماری قسم سے فائدہ پہنچے ہمارا رشتہ دار ہی ہو، یعنی نہ اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے نہ اپنے کسی رشتے دار کی ذات کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے، اس لیے ہم جو بات کہہ رہے ہیں وہ صحیح صحیح کہہ رہے ہیں جس کے اندر ہم کوئی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کریں گے، یہ قولی تغلیظ ہے، جس طرح سے نماز کے بعد مسجد میں عبادت خانے میں کھڑا کر کے قسم لینا یہ فعلی تغلیظ ہے تو یہ قولی تغلیظ ہے، ''اور نہیں چھپائیں گے ہم اللہ کی گواہی کو'' اللہ کی طرف گواہی کی نسبت اس اعتبار سے آگئی کہ اللہ نے جس کے اظہار کا حکم دیا ہوا ہے، ہم اس گواہی کو چھپائیں گے نہیں، اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ: بے شک ہم تب گنہگاروں میں سے ہوں گے، یعنی اگر ہم اس شہادت کو چھپائیں گے، اور چھپانے کے حکم میں ہی ہے اس میں گڑبڑ کرنا، اس وقت ہم گناہ گاروں میں سے ہوجائیں گے، یہ سارے کا سارا قولی تغلیظ ہے، اس کے بعد وہ اصل مضمون ادا کریں گے کہ ہمارے پاس یہی سامان ہے اور سامان نہیں ہے۔ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا: اگر اطلاع پالی گئی اس بات پر کہ وہ دونوں کے دونوں مستحق ہوگئے ہیں گناہ کے، مرتکب ہوگئے ہیں گناہ کے، یعنی اپنے بیان میں وہ گڑبڑ کر گئے ہیں اور انہوں نے گواہی صحیح نہیں دی، اگر کوئی اطلاع مل گئی، کچھ قرائن ایسے آگئے، ''اگر اطلاع پالی گئی اس بات پر کہ دونوں مرتکب ہوئے ہیں گناہ کے'' فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا: پھر اور دو آدمی کھڑے ہوں گے ان کی جگہ، یعنی شاہد بننے کی جگہ، ''اُن لوگوں میں سے جن کے خلاف گناہ کا ارتکاب ہوا ہے'' یعنی ان کے بیان سے جن کی حق تلفی ہوئی ہے، جن کے خلاف گناہ کا ارتکاب ہوا ہے، وہ ان کی جگہ کھڑے ہوجائیں گے۔ وہ آخران ہوں گے کون؟ ان کا بیان ہے الْاَوْلَیٰنِ، جو اس مرنے والے کے قریبی رشتے دار ہیں، اَولی بالمیت، جو قریبی رشتے دار ہیں۔ یہ بدل ہے اٰخَرٰنِ سے۔ فَیُقْسِمٰنِ: پھر یہ دونوں قسم اُٹھائیں گے، کیونکہ اب یہ منکر ہیں، جیسے اُنہوں نے دعویٰ کیا تھا خریداری کا اور یہ منکر تھے اپنے علم کے اعتبار سے۔ ''یہ قسم اٹھائیں گے اللہ کی'' اور قسم اُٹھاتے ہوئے کہیں گے: لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا: ہماری گواہی ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ اَحق بالقبول ہے، یہ زیادہ درست ہے، قبول کرنے کے زیادہ لائق ہے، وَمَا اعْتَدَیْنَاۤ: اور ہم نے اس شہادت کے اندر کوئی حد سے تجاوز نہیں کیا، جو بات ہم جانتے ہیں وہی کہہ رہے ہیں، اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ: بے شک ہم تب ظالموں میں سے ہوں گے، یعنی اگر ہم اس گواہی کے اندر اعتداء کریں گے، حد سے تجاوز کریں گے تو ہم ظالموں میں شمار ہوجائیں گے۔ اور اس کے بعد پھر وہ اپنے شہادت کے مضمون کو ادا کریں، قسم اُٹھانے کے بعد اور یہ عہد کرنے کے بعد کہ ہم اعتداء نہیں کریں گے، اگر کریں گے تو ظالموں

میں ہوں گے، پھر وہ اصل مضمون کو ادا کریں۔ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ: اللہ تعالیٰ اب اس کی اہمیت بیان فرماتے ہیں کہ یہ جو طریقہ ہم نے تمہیں بتادیا یہ زیادہ قریب ہے کہ لوگ گواہی کو اس کے طریقے پہ لے آئیں گے، یعنی اس طرح سے تغلیظ کی جائے گی، یوں شدت کے ساتھ قسم دی جائے گی، تو اُمید ہے کہ وہ لوگ گواہی صحیح دیں گے یا ان کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو جائے گا کہ اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ: کہ اگر انہوں نے قسمیں اُٹھالیں اور ان قسموں کے اوپر دوسرا مطمئن نہ ہوا، بلکہ خیانت کے قرائن مل گئے، تو ان کی قسموں کے بعد قسمیں کسی دوسرے پر لوٹائی جائیں گی، اس اندیشے کے ساتھ ہر فریق گواہی ٹھیک دینے کی کوشش کرے گا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، وَاسْمَعُوْا: اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام توجہ سے سُنا کرو، وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ: فاسق لوگوں کو، نافرمان لوگوں کو اللہ اُن کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا، اور آخری مقصد ہے جنت کا حاصل کرنا، نجات کا حاصل کرنا، اللہ کی رضا کا حاصل کرنا، تو فاسق لوگوں کو اُن کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا جو اللہ کے نافرمان ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ
جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ رسولوں کو، پھر کہے گا تم کیا جواب دیئے گئے؟ رسول کہیں گے ہمیں کوئی علم نہیں،
اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْ
بے شک آپ غیبوں کے جاننے والے ہیں ﴿۱۰۹﴾ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب اللہ تعالیٰ کہیں گے اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! یاد کر
نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ
میرے احسان کو جو تیرے پر ہے اور تیری والدہ پر، جبکہ میں نے تجھے قوت پہنچائی پاکیزہ روح کے ذریعے سے، کلام کرتا تھا تو
النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ
لوگوں سے گود میں اور کہولت کے زمانے میں، اور جب کہ سکھائی میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور تورات
وَالْاِنْجِیْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْــٴَـةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ
اور انجیل، اور جب کہ بناتا تھا تو مٹی سے پرندے کی شکل جیسی چیز میری اجازت سے، پھر تو پھونک مارتا تھا
فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ
اُس میں پھر وہ میری اجازت سے پرندہ بن جاتی تھی، تو ٹھیک کرتا تھا مادر زاد اندھے کو اور ابرص کو میری اجازت سے،

وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ

اور جب تو نکال کھڑا کرتا تھا مُردوں کو میری اجازت سے، اور جب کہ روکا میں نے اسرائیلیوں کو تجھ سے جس وقت کہ

جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا

تُو اُن کے پاس لایا تھا واضح دلائل پھر کہا اُن لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا اُن میں سے، نہیں ہے یہ مگر

سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ

صریح جادو﴿۱۱۰﴾ اور جب کہ میں نے حکم بھیجا حواریین کی طرف کہ ایمان لاؤ مجھ پر

وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ

اور میرے رسول پر، اُن (حواریون) نے کہا ہم ایمان لے آئے اور تُو گواہ ہوجا کہ ہم فرمانبردار ہیں﴿۱۱۱﴾ جب کہ کہا

الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ

حواریوں نے اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تیرا ربّ طاقت رکھتا ہے کہ اُتار دے

عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

ہمارے اُوپر مائدہ آسمان سے، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان لانے والے ہو﴿۱۱۲﴾

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ

وہ کہنے لگے ہم چاہتے ہیں کہ ہم کھائیں اس مائدہ میں سے اور یہ کہ ہمارے قلوب مطمئن ہوجائیں اور یہ کہ ہم جان لیں کہ بے شک

صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

آپ نے ہم سے سچ کہا ہے اور یہ کہ ہم اس مائدہ پر گواہوں میں سے ہوجائیں﴿۱۱۳﴾ مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا

اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا

اے اللہ! اے ہمارے ربّ! اُتار دے ہم پر مائدہ آسمان سے، ہوجائے وہ مائدہ ہمارے لئے خوشی کی چیز

لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

یعنی ہمارے پہلوں کے لئے بھی اور پچھلوں کے لئے بھی، اور تیری طرف سے نشانی ہوجائے، اور عطا فرما ہمیں، تُو بہترین عطا فرمانے والا ہے﴿۱۱۴﴾

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک میں اُتارنے والا ہوں اُس مائدہ کو تم پر، جو ناشکری کرے گا اس کے بعد تم میں سے پھر میں اُسے عذاب دوں گا

عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ

ایسا عذاب کہ میں جہانوں میں سے ویسا عذاب کسی کو نہیں دوں گا ﴿۱۱۵﴾ اور جب کہے گا اللہ اے مریم کے بیٹے

مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ

عیسیٰ! کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا کہ بنالو مجھے بھی اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ دو

اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۚ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ

معبود، عیسیٰ کہیں گے تُو پاک ہے، میری شان کے یہ بات لائق نہیں تھی کہ میں کہوں ایسی بات جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے، اگر میں نے

قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ

یہ بات کہی ہوتی تو تُو بھی تو جانتا ہوتا، تُو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے علم میں ہے،

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ

بے شک تُو غیبوں کا جاننے والا ہے ﴿۱۱۶﴾ نہیں کہی میں نے انہیں مگر وہی بات جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا، کہ

اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ

عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، اور میں اُن کے اُوپر نگران تھا جب تک میں اُن میں موجود تھا،

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ

پھر جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو پھر تُو ہی اُن کے اُوپر نگہبان تھا، اور تُو ہر

شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ

چیز کے اُوپر خبردار ہے ﴿۱۱۷﴾ اگر تُو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تُو ان کو بخش دے

فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ

پس بے شک تُو زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۱۱۸﴾ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ دِن ہے جس دِن سچوں کو ان کی سچائی نفع

صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ

دے گی، اُن کے لئے باغات ہیں، جاری ہوں گی اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ ہمیشہ اُس میں رہنے والے

اَبَدًا ۚ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ

ہوں گے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱۹﴾ اللہ ہی کے لئے ہے

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾

ملکیت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان سب چیزوں کی جو ان میں ہیں، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۲۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ: جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ رسولوں کو، فَیَقُوْلُ: پھر کہے گا، مَاذَآ اُجِبْتُمْ: تم کیا جواب دیے گئے، قَالُوْا: رسول کہیں گے، لَا عِلْمَ لَنَا: ہمیں کچھ پتا نہیں، ہمیں کوئی علم نہیں، اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ: بیشک آپ غیبوں کے جاننے والے ہیں۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب اللہ تعالیٰ کہیں گے اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! اذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰی وَالِدَتِكَ: یاد کر میرے احسان کو جو تیرے پہ ہے اور تیری والدہ پر، اِذْ اَیَّدْتُّكَ: جبکہ میں نے تجھے قوت پہنچائی، بِرُوْحِ الْقُدُسِ: رُوحِ قدس کے ذریعے سے، پاکیزہ رُوح کے ذریعے سے، جس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، تُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا: کلام کرتا تھا تو لوگوں سے گود میں۔ مھد: گود۔ حال کونِكَ فِی الْمَهْدِ، کلام کرتا تھا تو لوگوں سے اس حال میں کہ تو گود میں تھا یعنی بچہ تھا، وَكَهْلًا: اور کلام کرتا تھا تو لوگوں سے کہل ہونے کی حالت میں۔ کہولت کا زمانہ جوانی کے بعد بڑھاپے سے قبل یہ جو برزخی دور ہوتا ہے اس کو کہولت کہتے ہیں، کہ نہ تو پوری طرح سے بڑھاپا نمایاں ہوا ہو اور جوانی زائل ہونی شروع ہوگئی ہو، ادھیڑ عمر کا آدمی جسے کہتے ہیں۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ: اور جبکہ سکھائی میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل، وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ: اور جبکہ بناتا تھا تو مٹی سے پرندے کی شکل جیسی چیز، اور جبکہ تو بناتا تھا گارے سے، كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ: هَیْئَةً كهیئۃِ الطیر، صُورۃً کهیئۃِ الطیر، تَخْلُقُ کا مفعول نکل آئے گا، ویسے کاف مثل کے معنی میں لے لیا جائے تو بھی تَخْلُقُ کا مفعول بن سکتا ہے، ''پرندے کی شکل جیسی چیز تو بناتا تھا'' بِاِذْنِیْ: میری اجازت سے، فَتَنْفُخُ فِیْهَا: پھر تو پھونک مارتا تھا اس میں، فَتَكُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ: پھر وہ میری اجازت سے، میرے حکم سے وہ پرندہ بن جاتی تھی، وہ ہیئت اصل پرندہ بن جاتی، وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ: اکمہ: مادرزاد اندھا۔ تو ٹھیک کرتا تھا تندرست کرتا تھا مادرزاد اندھے کو اور اَبرص کو میری اجازت سے، وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی: اور جب تو نکال کھڑا کرتا تھا مُردوں کو۔ موتی میت کی جمع ہے۔ بِاِذْنِیْ: میری اجازت سے، وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ: اور جبکہ روکا میں نے اسرائیلیوں کو تجھ سے، اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ: جس وقت کہ تو ان کے پاس لایا تھا واضح دلائل، فَقَالَ الَّذِیْنَ

كَفَرُوْا مِنْهُمْ: پھر کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا ان میں سے، اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ: اور جبکہ میں نے حکم بھیجا حواریین کی طرف، اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ: کہ میرے ساتھ ایمان لاؤ، وَبِرَسُوْلِيْ: اور میرے رسول کے ساتھ ایمان لاؤ، قَالُوْٓا: ان حواریون نے کہا، اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ: ہم ایمان لے آئے، اور تو گواہ ہو جا کہ ہم مسلم ہیں، اسلام قبول کرنے والے ہیں، فرمانبردار ہیں، اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ: اور جبکہ کہا حواریون نے، يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ: کیا تیرا رَبّ طاقت رکھتا ہے؟ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ: کہ اُتار دے ہمارے اُوپر مائدہ آسمان سے۔ مائدة: دستر خوان، خوان جس کے اُوپر کھانا چنا ہوا ہو، اور نفسِ طعام کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ: کیا تیرا رَبّ ایسا کرسکتا ہے؟ یہ قدرت کے متعلق اِشتباہ نہیں کہ طاقت ہے یا نہیں، بلکہ اس کا مطلب یوں ہوتا ہے کہ اس وقت ایسا کام کرنے میں کوئی رُکاوٹ تو نہیں ہے، اس کی حکمت کا تقاضا ہے؟ اس کی حکمت کے خلاف تو نہیں؟ جیسے میں آپ سے کہوں کہ آپ اس وقت بازار جاسکتے ہیں؟ تو وہاں آپ کی قدرت سے سوال نہیں، کہ آپ کی ٹانگوں میں چلنے کی طاقت ہے یا نہیں؟ راستہ آپ کو معلوم ہے یا نہیں؟ آپ بازار جاسکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس وقت فارغ ہیں؟ کوئی رُکاوٹ تو نہیں؟ اس وقت بازار میں جانا آپ کی کسی مصلحت کے خلاف تو نہیں؟ تو ہمارا سوال یوں ہوتا ہے کہ آپ اس وقت فلاں کام کرسکتے ہیں؟ تو یہاں نفسِ قدرت سے سوال نہیں ہوتا، ایسے ہی یہاں بھی جب کہتے ہیں ''کیا آپ کا رَبّ ایسا کرسکتا ہے؟ آپ کا رَبّ ایسا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے؟'' تو یہاں قدرت سے سوال نہیں، کیونکہ اوپر ان کے ایمان کا ذکر ہے، اور جو مؤمن ہوتا ہے وہ اللہ کی قدرت میں شک نہیں کرسکتا، ''کیا آپ کا رَبّ ایسا کرسکتا ہے؟'' یعنی اس وقت اس کی کوئی حکمت اس سے مانع تو نہیں ہے، ایسا کرنا اس کی حکمت کے موافق ہے؟ ''کیا کرسکتا ہے تیرا رَبّ کہ اُتارے ہم پر مائدہ؟'' یعنی خوان جس کے اوپر کھانا چنا ہوا ہو، دستر خوان مع کھانے کے، اور نفسِ کھانے پر بھی یہ ''مائدہ'' کا لفظ بولا جاتا ہے، ''کہ اُتار دے وہ ہمارے اُوپر مائدہ آسمان سے'' قَالَ: عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، اتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ قَالُوْا: وہ کہنے لگے: نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا: ہم چاہتے ہیں کہ اس مائدہ میں سے خود کھائیں، ہم کھائیں اس مائدہ میں سے، اس اُترے ہوئے کھانے میں سے ہم کھائیں، وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا: اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے قلوب مطمئن ہوجائیں، وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا: اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم جان لیں کہ بیشک آپ نے ہم سے سچ کہا ہے، قَدْ صَدَقْتَنَا فِي دَعْوَى الرِّسَالَةِ یعنی کھانے کا ہمارے سامنے اُترنا یہ آپ کی نبوّت کی صداقت کی ایک اور دلیل بن جائے گی، جتنے معجزات سامنے آئیں اتنی ہی صداقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، ''جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے اس میں آپ نے سچ کہا ہے''، وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ: یہ سب نُرِيْدُ اَنْ والے ''اَن'' کے نیچے داخل ہیں۔ اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس مائدہ پر گواہوں میں سے ہوجائیں، کہ لوگوں کے سامنے جاکے ہم شہادت دیں گے کہ ایسا معجزہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور اس طرح سے ہم آپ کی نبوّت کو اور رسالت کو ثابت کریں گے۔ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ: مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا، اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ: اے اللہ! اے ہمارے رَبّ! اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ: اُتار دے ہم پر کھانا آسمان سے، تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا: عید کہتے ہیں بار بار لوٹ

کے آنے والی خوشی کو، یہ سُرور کے معنی میں ہے۔ ہو جائے وہ مائدہ ہمارے لیے خوشی کی چیز، ہمارے لیے یعنی لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا: ہمارے پہلوں کے لئے بھی اور پچھلوں کے لئے بھی۔ اَوَّلِنَا کا مصداق ہوں گے جو لوگ اس وقت موجود ہیں نزولِ مائدہ کے وقت، اور آخِرِنَا کا مصداق ہوں گے جو پیچھے آنے والے ہیں، ''ہمارے اگلے پچھلوں کے لئے یہ خوشی کی بات ہو جائے'' وَاٰيَةً مِّنْكَ: اور تیری طرف سے نشانی ہو جائے، وَارْزُقْنَا: ہمیں رزق نصیب فرما، وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: تُو بہترین دینے والا ہے۔ تُو دے ہمیں، وَارْزُقْنَا کا مفعول وہی ہے مائدہ۔ تُو ہمیں رزق دے تو یہ ''رزق'' ہم مفعول نکال لیتے ہیں، ورنہ ''رَزَقَ'' کا معنی دینا ہی ہوتا ہے، وَارْزُقْنَا: عطا فرما ہمیں، وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: اور تُو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک میں اُتارنے والا ہوں اس مائدہ کو تم پر، فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ: اور اس کے اُتارے جانے کے بعد جو کوئی ناشکری کرے گا۔ بَعْدُ کا مضاف الیہ محذوف منوی ہے، ''اس مائدہ کے اُتارے جانے کے بعد جو کوئی نافرمانی کرے گا تم میں سے'' فَاِنِّيْ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا: پھر میں اسے عذاب دُوں گا ایسا عذاب، لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: کہ میں جہانوں میں سے ویسا عذاب کسی کو نہیں دُوں گا، عذاب دُوں گا میں اس کو ایسا عذاب کہ نہیں عذاب دُوں گا میں وہ کسی کو بھی جہانوں میں سے۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ: اور جب کہے گا اللہ، یہ قَالَ مستقبل کے معنی میں ہے۔ جب کہے گا اللہ: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ: کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا، ءَاَنْتَ اور قُلْتَ، قُلْتَ میں بھی خطاب اور اَنْتَ کے ساتھ پہلے بھی صراحت کر دی، یہ گفتگو کے وقت کلام کے اندر ایک قسم کا زور پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ ''کیا تُو نے یہ بات کہی تھی لوگوں سے؟'' اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: کہ بنالو مجھے بھی اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ دو معبود۔ کیا یہ بات تُو نے کہی تھی لوگوں سے؟ قَالَ: عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے، سُبْحٰنَكَ: تُو پاک ہے کہ تیرا کوئی شریک ہو، مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ: میری شان کے یہ بات لائق نہیں تھی کہ میں کہوں ایسی بات جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے، اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ: اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی، فَقَدْ عَلِمْتَهٗ: تو بھی تُو جانتا ہوتا، اس کا ترجمہ یوں ہوگا، اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تُو بھی تو جانتا ہوتا، تیرے علم میں بھی تو یہ بات آجاتی کہ میں نے کہی ہے، تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ: تُو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے، میرے دل میں ہے، وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ: مَا فِيْ نَفْسِكَ کے اندر جو اللہ تعالیٰ کی طرف نفس کی نسبت کی گئی ہے یہ مشاکلۃ ہے، فِيْ نَفْسِيْ کے مقابلے میں فِيْ نَفْسِكَ کہہ دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف دل کی نسبت، سینے کی نسبت، نفس کی نسبت، کما یلیق بشانہ، اس میں تشبیہ کا معنی نہیں کہ جیسے ہمارا دل ہے اسی طرح سے ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی بیان کریں ایسی بات نہیں، یہ لفظ مشاکلۃ استعمال کیا گیا ہے اس لیے حاصل ترجمہ اس کا یہی ہے کہ ''میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے علم میں ہے'' جو کچھ تیرے علم میں ہے وہ میں تو نہیں جانتا، لیکن جو کچھ میرے دل میں ہے وہ تُو تو جانتا ہے، اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: بیشک تُو غیبوں کا جاننے والا ہے، لفظی ترجمہ اگر ویسے ہی کریں تو ''تُو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے جی میں ہے'' لفظی ترجمہ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو عرض کر رہا ہوں کہ یہاں ''جی'' کا لفظ اور ''نفس'' کا لفظ مشاکلۃ بولا گیا ہے، ورنہ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تیرے علم میں ہے اُسے میں نہیں جانتا اور جو میرے دل میں ہے وہ تُو جانتا ہے، جب دل کی بات کو بھی تُو جانتا ہے تو جو ظاہر کہی

ہوگی وہ تو بدرجۂ اَولیٰ تُو جانتا ہوگا، مَاقُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ: نہیں کہا میں نے انہیں مگر وہی جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا، نہیں کہی میں نے انہیں مگر وہی بات جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا، وہ بات یہ ہے کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ: عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رَبّ ہے اور تمہارا بھی رَبّ ہے، وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا: اور میں ان کے اوپر نگران تھا، نگہبان تھا، خبردار تھا، مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ: جب تک میں ان میں موجود تھا، فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ: پھر جب تُو نے مجھے وفات دے دی، كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ: پھر تُو ہی ان کے اُوپر نگہبان تھا۔ تَوَفّٰی کا لفظ دونوں صورتوں میں بولا جاتا ہے، ''جب تُو نے مجھے وصول کرلیا'' چاہے رَفع کے ساتھ، چاہے موت کے ساتھ، دونوں وقتوں پر یہ بات صادق آتی ہے، پہلے اُٹھالیے گئے پھر پیچھے مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیا کرتے رہے، دوبارہ اُترے پھر موت کے ذریعے سے چلے گئے، پھر پتا نہیں پیچھے کیا کرتے رہے، تو ''وفات'' کا لفظ دونوں صورتوں میں بولا جاتا ہے، جیسے کہ پہلے حیاتِ عیسیٰ کے بارے میں ذکر کیا جاچکا، فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ: جب تُو نے مجھے اُٹھالیا، وصول کرلیا، كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ: پھر تُو ان کے اُوپر نگہبان تھا، وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ: اور تُو ہر چیز کے اُوپر شہید ہے، خبردار ہے۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ: اگر تُو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، تجھے عذاب دینے کا ہر طرح سے اختیار ہے، اگر تُو انہیں سزا دے، اگر تُو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ: اور اگر تُو ان کو بخش دے، فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: پس بیشک تُو زبردست ہے حکمت والا ہے، تو یہ بخشنا تیری قدرت اور تیری حکمت کے مطابق ہوگا اگر تُو بخش دے گا، یعنی بخشنے پر تُو کوئی مجبور نہیں۔ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ: اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ دِن ہے جس دِن سچوں کو ان کی سچائی نفع دے گی، صادقین کو ان کا صدق نفع دے گا، لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: ان کے لئے باغات ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا: ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہوں گے، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ: اللہ ان سے راضی ہوگیا، وَرَضُوْا عَنْهُ: اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، وَمَا فِيْهِنَّ: اور ان چیزوں کی جو ان میں ہیں، آسمانوں کی ملکیت زمین کی ملکیت اور جو کچھ بھی ان کے اندر موجود ہے ہر چیز کی ملکیت اللہ کے لئے ہے، لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: آسمانوں کا مُلک، زمین کا مُلک اور مَا فِيْهِنَّ کا مُلک، یعنی ان سب چیزوں کی ملکیت اللہ کے لئے ہے، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

سورۂ مائدہ کے یہ آخری دو رُکوع اس وقت جو آپ کے سامنے پڑھے گئے ہیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یومِ قیامت کے کچھ اَحوال بیان فرمائے ہیں، اور سورت کے اختتام پر یہ اَحوالِ قیامت بیان کرکے اصل کے اعتبار سے اُن اَحکام

پرعمل کرنے کی ترغیب وترہیب ہے جو کثرت کے ساتھ اس سورت میں ذکر کیے گئے ہیں، خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل سے معاہدوں کا ذکر بھی آیا تھا، اوران معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے کی بناء پر دنیا اور آخرت میں ان کے سامنے سزا کا ذکر بھی کیا گیا تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کی امت کو بھی تاکید کی گئی تھی کہ شھداء للہ اور قوام بالقسط ہو جائیں، قائم بالقسط ہو جائیں، انصاف قائم کرنے والے ہو جائیں، شاہد للہ ہو جائیں، اللہ کے لئے گواہی دینے والے، یہ مضمون آپ کے سامنے گزر چکا، تو یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس آخری اُمت سے ایک عہد ہے کہ تم نے ہر وقت اللہ کے لیے گواہی دینی ہے، اظہارِ حق کرنا ہے، کسی کا لحاظ نہیں کرنا، کسی سے ڈرنا نہیں، اور اللہ کے احکام کی پابندی کرنی ہے۔ اب آخرت کے اَحوال ذکر کر کے یہی تاکید کرنا مقصود ہے کہ ایک دن آئے گا جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ یوں پوچھ گچھ کریں گے، اوراس دن کا خیال کرتے ہوئے انسان کو اپنی تیاری رکھنی چاہیے، تو قیامت کے اَحوال یہاں ذکر کئے گئے ہیں۔

قیامت کے دِن انبیاء اوران کی اُمتوں سے سوال

پہلے تو اجمالی طور پر سب رسولوں کا ذکر ہے، نقشہ یوں کھینچا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب انسانوں کو جمع کریں گے، جن میں مرسلین بھی ہوں گے، اور مرسل الیہم بھی ہوں گے، جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا ہے یعنی اُن کی اُمتیں بھی موجود ہوں گی، اور رسول بھی موجود ہوں گے، پھر قرآنِ کریم میں ایک جگہ آپ کے سامنے آئے گا فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (سورۂ اَعراف: ٦) ہم اُن سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا، یعنی اُمتوں سے بھی سوال ہوگا، اُمتوں سے سوال کیا ہوگا؟ وہ دوسری جگہ الفاظ آئیں گے: مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (سورۂ قصص: ٦٥) کہ تم نے مُرسلین کو کیا جواب دیا تھا؟ جب یہ رسول تمہارے پاس آئے تھے تم نے اُن کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا؟ یہ اُن مُرسَل الیہم سے سوال کیا جائے گا، اوراسی طرح سے رسولوں سے بھی پوچھا جائے گا کہ جب تم ان اُمتوں کے پاس گئے تھے اور جاکر میرا دِین پہنچایا تھا تو ان کی طرف سے تمہیں کیا جواب ملا؟ ان دونوں پر ہی سوال قرآنِ کریم میں مذکور ہے، انبیاء ﷩ کو شہداء کا مرتبہ دیا گیا ہے جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ (سورۂ نساء: ۴۱) ہر اُمت سے ہم ایک گواہ کھڑا کریں گے، اور یہ گواہ اُسی اُمت کا نبی ہوگا جو کہ اللہ کے سامنے اس اُمت کے متعلق بیان کرے گا کہ انہوں نے مانا یا نہیں مانا، اور پھر وہ اُمتی جو کافر تھے وہ انکار کریں گے کہ ہمیں یہ دِین پہنچایا ہی نہیں گیا، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ انبیاء ﷩ سے پوچھیں گے، انبیاء ﷩ گواہی کے اندر سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت کو پیش کریں گے اوراس اُمت کی گواہی انبیاء ﷩ کے حق میں ہوگی، بہرحال قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں یہ مقدمے کی شکل اس طرح سے بنی ہوئی ہے۔ اور یہاں صرف یہ مذکور ہے کہ رسولوں سے پوچھا جائے گا: مَاذَآ اُجِبْتُمْ: کہ تم کیا جواب دیئے گئے، اور یہ سوال جو رسولوں سے ہوگا اصل کے اعتبار سے یہاں سرزنش ان کے اُمتیوں کی کرنی مقصود ہوگی، کہ رسول کی حیثیت ایک گواہ کی ہے، جب وہ بیان کریں گے کہ ہم ان کے سامنے گئے تھے، تیرا دِین پہنچایا تھا اور انہوں نے قبول نہیں کیا، تو فردِ جرم اُن کے اُوپر عائد ہوسکتی ہے، تو یہ سوال رسولوں کے اُوپر کرنا اصل کے اعتبار سے اس کی اُمت کے لئے ہی ایک تنبیہ اور سرزنش کی صورت ہے۔

''لَا عِلْمَ لَنَا'' کی چار توجیہات

جب رسولوں یہ بات پوچھی جائے گی قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا: رسول آگے سے کہہ دیں گے لَا عِلْمَ لَنَا ہمیں کچھ علم نہیں۔ یہ رسولوں کا کہنا کیسے ہوا؟ جبکہ رسول تو گواہ ہیں اور روایات سے معلوم ہوتا ہے، اور قرآنِ کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہی دیں گے بھی، اور بیان کریں گے کہ ہم ان کے سامنے گئے تھے، ہم نے تیرا دین پیش کیا تھا، لیکن انہوں نے نہیں مانا، تبھی تو وہ آگے انکار کریں گے، اور انکار کرنے کی صورت میں انبیاء علیہم السلام گواہ پیش کریں گے، سرورِ کائنات ﷺ بھی بطور گواہی کے پیش ہوں گے، جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا (سورۂ نساء: ۴۱) اور شہید وہی ہوا کرتا ہے جو آگے آ کر گواہی دیتا ہے، انبیاء علیہم السلام اُمت کے احوال بیان کریں گے، تو جب یہ بیان کرنے کا ذکر بھی آیا ہوا ہے تو پھر یہاں لَا عِلْمَ لَنَا کا کیا مطلب، کہ اے اللہ! ہمیں کچھ پتا نہیں، اس کی توجیہ مفسرین نے مختلف انداز سے کی ہے۔ بعض حضرات نے تو یوں کہا کہ وہ وقت ایسا ہولناک ہوگا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا جلال اتنا نمایاں ہوگا اور غصے کے آثار اتنے کھلے ہوئے ہوں گے کہ اتنے غصے کے آثار پہلے کھل کے کسی کے سامنے نہیں آئے، جیسے کہ حدیثِ شفاعت، لمبی چوڑی روایت جو حدیث کی کتابوں میں آتی ہے، اُس کے اندر ان باتوں کا اظہار کیا گیا ہے، اور جب وہ جلال کی کیفیت ہوگی تو انسان بڑے چھوٹے جتنے بھی ہیں حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام بھی گھبرائے ہوئے ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے جلال کے سامنے ایسے ہوں گے جیسے کہ ہوش بجا نہیں ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ جتنا کوئی مقرب زیادہ ہوا کرتا ہے غصے کی حالت میں اس کا تأثر سب سے زیادہ شدید ہوتا ہے، ایک اُستاذ ناراض ہو جائے تو جن لڑکوں کا تعلق اس اُستاذ ساتھ نہیں وہ نہیں گھبرائیں گے، اُن کے اُوپر ہیبت طاری نہیں ہوگی، جن کا محبت کا عقیدت کا جتنا زیادہ تعلق ہوگا اتنا ہی وہ اُس غصے سے زیادہ متأثر ہوں گے، تو اسی طرح سے جب اللہ تعالیٰ کا جلال نمایاں ہوگا تو انبیاء علیہم السلام متأثر ہوں گے، تو ایسے تأثر کی صورت میں جبکہ ہوش بجا نہیں، گھبرائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس غضب کے منکشف ہونے کے ساتھ، تو اس گھبراہٹ کی حالت میں کہیں گے لَا عِلْمَ لَنَا: کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اور جب پھر سرورِ کائنات ﷺ کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا جلال کچھ جمال کی صورت میں بدلے گا، تو اُس وقت پھر انبیاء علیہم السلام جو کچھ جانتے ہیں اپنی اُمتوں کے متعلق وہ بیان فرمائیں گے، بیان بہرحال انبیاء علیہم السلام کرنا ہے، یہ نہیں کہ بیان بالکل کچھ نہیں کریں گے، دوسری آیات میں جس طرح سے آتا ہے بیان کریں گے، تو جس وقت طبیعت میں کچھ سکون آئے گا تو سکون آنے کے بعد پھر اپنے علم کو ظاہر کریں گے، ورنہ اللہ کے جلال کے سامنے اُن کا علم بالکل دب جائے گا، اور ایسا ہوگا جیسے حافظے میں کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔ یا تو اس طرح سے توجیہ کی گئی ہے۔

یا اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ یہ لفظ تادب مع اللہ کے طور پر ہے، کہ جس طرح سے کوئی استاذ شاگرد سے مسئلہ پوچھتا ہے کہ فلاں مسئلہ کس طرح سے ہے؟ تو شاگرد کہتا ہے جی! آپ ہی بہتر جانتے ہیں، میں آپ کے سامنے اس مسئلے کو کیا بیان کروں، یہ ادب ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ بتاؤ، تمہیں تمہاری اُمتوں نے کیا جواب دیا تھا؟ تو انبیاء علیہم السلام یہ تأثر ظاہر کریں گے کہ جی!

آپ کے علم کے مقابلے میں ہمارا کیا علم ہے، آپ کے علم کے مقابلے میں ہمارا علم کچھ نہیں، آپ زیادہ اچھا جاننے والے ہیں، اور پھر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطالبہ ہوگا کہ نہیں! آپ اپنے علم کے مطابق بیان کیجئے جو کچھ تم جانتے ہو، تو پھر انبیاء ﷩ اظہار بھی کردیں گے۔ صحابہ کرام ﷡ سرورِ کائنات ﷺ کی مجلس میں ایسے ہی تھے کہ جب حضور ﷺ کی طرف سے سوال اُٹھایا جاتا تو وہ یوں ہی کہا کرتے تھے کہ ''اللہ ورسولہ اعلم!'' اللہ اور اللہ کا رسول ہی بہتر جانتا ہے، چاہے وہ بات معلوم بھی ہو تو بھی وہ جلدی سے جواب کا اظہار نہیں کرتے تھے، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول کے علم کی طرف اُس بات کو محول کردیا کرتے تھے، اور بعد میں جس وقت پوچھا جاتا اور وہ سمجھتے کہ ہم سے ہی جو کچھ ہماری معلومات ہیں دریافت کی جارہی ہیں، تو پھر جو کچھ اُن کے علم میں ہوتا بتادیتے۔ تو یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تأدب کے طور پر ہے۔

اور یا جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال ہوگا تو انبیاء ﷩ یہ سمجھیں گے کہ تمام اُمت کے احوال پوچھنے مقصود ہیں کہ جن کی طرف تم بھیجے گئے تھے، چاہے وہ تمہارے زمانے میں موجود تھے یا تم سے بعد میں پیدا ہوئے، اُن کی طرف سے تمہیں کیا جواب ملا؟ اب یہ واقعہ ہے کہ انبیاء ﷩ اپنے مخاطبین جو اس زمانے کے اندر موجود تھے اُن کے احوال کو تو کچھ جانتے ہیں، باقی بعد میں پیدا ہونے والوں کے تفصیلی احوال کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا، اور اور کیسے وہ رہے کیسے نہیں رہے، یہ تفصیلی احوال انبیاء ﷩ نہیں جانتے، تو اس لئے لَا عِلْمَ لَنَا کا مطلب یوں ہوگا جیسے کہ ''بیان القرآن'' میں واضح کیا گیا، کہ یا اللہ! جو ہمارے سامنے موجود تھے اُن کا تو ہم کچھ تھوڑا بہت حال جانتے ہیں، وہ تو بتا ہی دیں گے، باقی مجموعی طور پر کیا حال رہا یہ ہم نہیں جانتے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا حاصل ہے جو آگے قرآنِ کریم میں آرہا ہے، کہ جب تک میں ان میں موجود تھا تو میں اُن کے احوال کو جاننے والا تھا، اور جس وقت تو نے مجھے اُٹھالیا تو اُس کے بعد تو ہی جانتا ہے کہ انہوں نے کیا کیا، کیا نہیں کیا۔ تو لَا عِلْمَ لَنَا کا تعلق ہوگا اپنی وفات کے بعد والے زمانے کے ساتھ۔

یا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا ظاہری حال کچھ نہ کچھ ہمیں معلوم ہے، باقی حقیقی احوال ان کے کیا تھے؟ ان کے دل میں کیا جذبات تھے؟ کلمہ پڑھنے والوں کے دل میں کیا نفاق تھا یا نفاق نہیں تھا؟، اور جنہوں نے نہیں پڑھا اُن کے کس قسم کے دلائل تھے، کس قسم کی بات اُن کے دل میں تھی، اس اعتبار سے لَا عِلْمَ لَنَا کہہ دیا، کہ یہ تفصیل ہمارے علم میں نہیں ہے۔ اور ایسے احوال مختلف طور پر قیامت میں پیش آئیں گے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کھڑے ہوں گے، اور آپ کی طرف کچھ لوگ آئیں گے جن کو آپ پہچانتے ہوں گے کہ یہ میرے صحابی ہیں، میری موجودگی میں انہوں نے اسلام قبول کیا تھا، جب وہ آئیں گے حضور ﷺ کی طرف کوثر کی طرف پانی پینے کے لئے تو رکاوٹ ڈال دی جائے گی، فرشتے آگے آجائیں گے کہ تم آگے نہیں جاسکتے، اُن کو پیچھے روک دیا جائے گا، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ میں کہوں گا: ''اُصَیْحَابِیْ اُصَیْحَابِیْ'' یہ تو میری چھوٹی سی جماعت ہے، یہ تو میرے صحابہ ہیں، ان کو آنے دو۔ فرشتے جواب دیں گے: ''اِنَّكَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ'' آپ کو کیا پتا، انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا کرتوتیں کی ہیں؟ اور کیسی کیسی نئی نئی باتیں پیدا کرلیں، اور کس طرح سے دِین کو بدل کر رکھ دیا، اور کیسے ایڑیوں

کے بل لوٹ گئے، اور یہ مرتد ہو گئے، آپ کو کیا پتا؟''اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ ''انہوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا آپ نہیں جانتے۔ تو جس وقت یہ بات ظاہر کی جائے گی تو پھر سرورِ کائنات ﷺ فرمائیں گے:''سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ''(۱) جس نے میرے بعد میرے دِین کو بدل کر رکھ دیا وہ دفع ہو جائیں، دفع ہو جائیں، مجھے ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، دُور ہو جائیں۔ تو ایسے ہوتا ہے کہ اپنی موجودگی میں لوگوں کے اَحوال کچھ معلوم ہیں، اور بعد میں جس قسم کے حالات پیدا ہوئے تفصیلی طور پر انبیاء ﷩ نہیں جانتے، جس کی بنا پر لَا عِلْمَ لَنَا کا اظہار کر دیا گیا، اور بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جس وقت سوال ہوگا تو جو کچھ اَحوال آپ کے سامنے تھے تو وہ انبیاء ﷩ بتائیں گے۔

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: بے شک غیبوں کا جاننے والا تُو ہی ہے، اس لئے ہر قسم کی معلومات تجھے حاصل ہیں، تیرے علم کے مقابلے میں ہمارا علم کچھ نہیں، یا ہمارے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد بھی سب چھپی چھپائی چیزیں جو بھی ہیں سب تیرے علم میں ہیں، ہم اُن کے متعلق کچھ نہیں جانتے، ان لوگوں کی دِلوں کی کیفیات کیا تھیں وہ تُو ہی جانتا ہے، دِلوں کی کیفیات کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے، یعنی پچھلی تقریر کے مطابق اس جملے کا مفہوم یوں ہو جائے گا۔

روزِ قیامت ہر شخص سے اِنفرادًا پانچ سوال

یہ تو عام انبیاء ﷩ سے سوال کا ذکر ہے، اور میں نے عرض کیا کہ اُمتوں سے بھی سوال ہوگا، اسی طرح سے انفرادی طور پر ہر شخص سے بھی علیحدہ علیحدہ سوال ہوگا، زندگی کا محاسبہ ہوگا، حدیث شریف میں جیسے آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا جب تک کہ پانچ سوالوں کا جواب نہ دے دے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے محشر میں میدانِ قیامت میں پانچ سوال ہوں گے، اور جب تک اُس کا جواب نہ دیا جائے اُس وقت تک کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا، پہلا سوال یہ ہوگا کہ عمر کس چیز میں خرچ کی؟ دوسرا سوال ہوگا خصوصیت کے ساتھ جوانی کے متعلق کہ جوانی کو کس چیز میں صرف کیا؟ تیسرا سوال ہوگا کہ مال کمایا کیسے تھا، کہاں سے کمایا تھا؟ چوتھا سوال ہوگا کہ خرچ کہاں کیا تھا؟ اور پانچواں سوال ہوگا کہ جو کچھ سیکھا تھا اُس کے مطابق عمل کتنا کیا تھا؟ یہ پانچ سوال ہر کسی پر ہوں گے، جب تک اس کا جواب نہ دے دے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔(۲) بہرحال اللہ کی طرف سے محاسبے کے یہ مختلف پہلو ہیں، انبیاء ﷩ سے، اُمتوں سے، اور تمام اَشخاص سے اِنفرادًا یہ سوال ہوں گے۔ یہ تو ایک اِجمالی سا اِشارہ کر دیا جس کی تفصیل دوسری آیات وروایات میں موجود ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور اس کا مقصد

آگے کلام منتقل ہوگئی خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف، تو حضرت عیسیٰ چونکہ بنی اسرائیل کے انبیاء ﷩ میں سے آخری رسول ہیں، اس لئے ان کے متعلق جو کچھ بیان کیا جارہا ہے یہ یہود ونصاریٰ دونوں کے لئے ہی ہدایت کا باعث ہے، یہود

(۱) مسلم ۲۵۲/۲ باب اثبات حوض نبینا/ بخاری ۹۷۴/۲ باب فی الحوض/ مشکوٰۃ ۴۸۸/۲ باب الحوض۔ نوٹ: یہ دو حدیثوں کا مجموعی مضمون ہے۔
(۲) ترمذی ۶۷/۲ باب ما جاء فی شان الحساب/ مشکوٰۃ ۴۴۳/۲، کتاب الرقاق، فصل ثانی، عن ابن مسعود

ان کی حیثیت کو پہچانتے نہیں تھے تو اِن میں اُن کی حیثیت بھی مذکور ہے، اور عیسائیوں نے اُن کو اُن کے درجے سے بڑھا کر اللہ کا شریک بنالیا، تو اس میں اُن کی رُسوائی کے حالات بھی سارے کے سارے دِکھائے جارہے ہیں، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جب اللہ تعالیٰ اپنے انعامات ذکر کر کے یہ پوچھے گا تو اِنعامات کے اندر تو اُن کی شان نمایاں ہوگئی، اور جب اِنعامات ذکر کئے جائیں گے تو یہود رُسوا ہوں گے کہ یہ اللہ کے ایسے مقبول بندے تھے، اور اللہ نے ان کو یہ یہ دے رکھا تھا، اس میں تو رُسوائی یہود کی ہے، اور پھر جب اُن سے پوچھا جائے گا کہ آپ کی اُمت نے جو آپ کو اِلٰہ قرار دیا، یا آپ کی ماں کو اِلٰہ قرار دیا، یہ تعلیم آپ نے دی تھی؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جب اس کی وضاحت ہوجائے گی، تو اس وضاحت کے بعد عیسائیوں کی رُسوائی بھی اپنی جگہ نمایاں ہوجائے گی۔ باقی اِنعامات کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ہر معجزہ آپ کے سامنے پہلے آچکا ہے، اس لئے اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ: ''یاد کرنے کے قابل ہے وہ دِن، دھیان میں رکھنے کے قابل ہے وہ دِن جس دِن کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو اکٹھا کرے گا، پھر پوچھے گا تم کیا جواب دیے گئے؟ رسول کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، بے شک تو غیبوں کو جاننے والا ہے۔'' ''جب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے عیسیٰ علیہ السلام کو، اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میرے احسان کو یاد کرو جو تجھ پر ہے اور تیری والدہ پر بھی'' آگے اس کی کچھ تفصیل! ''جبکہ میں نے تجھے قوت پہنچائی رُوح القدس کے ذریعے سے'' کہ یہود تیری مخالفت کر رہے تھے، قتل کرنے کے درپے تھے، سُولی تجھے چڑھانا چاہتے تھے، مختلف قسم کی تکلیفیں دیتے تھے تو میں نے تجھے قوت پہنچائی جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے۔ ایک اِنعام۔ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا: اس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئے گی، ویسے ان الفاظ کا تذکرہ پہلے سورۂ نساء میں ہوچکا، ''تو کلام کرتا تھا لوگوں سے بچپن میں بھی اور بڑی عمر میں بھی'' بچپن میں کلام کی تھی جب ابھی حضرت مریم علیہا السلام نے ان کو جنا ہی تھا بالکل گود میں تھے اور یہود آگئے تھے گفتگو کرنے کے لئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کے سامنے تقریر کی تھی۔ اور كَهْلًا: بڑی عمر میں بھی تو لوگوں سے باتیں کرتا تھا، بڑی عمر میں تو سارے لوگ ہی باتیں کیا کرتے ہیں، تو پھر یہاں اس کو خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا جارہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بات بڑی عمر میں اور بچپن میں ایک ہی جیسی تھی، بچپن کے اندر بولے تو ایسے نہیں جیسے بچے کچھ مہمل سی باتیں کیا کرتا ہے جن کا کچھ موقع نہیں ہوتا محل نہیں ہوتا، بے جوڑ سے قصے، بے معنی سی گفتگو، مہمل گفتگو جیسے بچوں کی ہوا کرتی ہے ایسی نہیں، بلکہ آپ کی کلام فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا دونوں ایک ہی طرح کی تھی، جیسے بڑی عمر میں تقریر کرتے تھے تو حکمت سے بھری ہوئی تقریر تھی، اسی طرح سے بچپن کے اندر جو گفتگو کی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت سے اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے بھرپور تھی۔

عیسیٰ علیہ السلام کی بوقتِ رفع اور کل عمر کے متعلق مختلف اقوال

اور ایسے ہی كَهْلًا کے لفظ سے نزولِ عیسیٰ پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعض روایات کے مطابق کہولت کی عمر سے پہلے اُٹھالئے گئے، اور کہولت کی عمر دوبارہ آنے کے بعد اُن کے اُوپر ہوگی، بعض تفسیری روایات کے اندر یہ چیز ذکر کی گئی ہے، كَهْلًا کے لفظ سے ان کے نزول کی طرف اشارہ لیا گیا ہے، جیسے ''معارف القرآن'' میں یہ بات مذکور ہے۔ لیکن یہ بات

حضرت شیخنا الانور سیدانور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے خلاف ہے، اُن کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کل عمر ایک سو بیس سال ہے، اور اُن کو نبوت عام طریقے کے مطابق چالیس سال کی عمر میں ملی، اور نبوّت ملنے کے چالیس سال تک وہ اس دُنیا کے اندر رہے، اَسی (۸۰) سال کی عمر میں اُٹھائے گئے، اور جس وقت دوبارہ نازل ہوں گے تو چالیس سال پھر رہیں گے، مجموعی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال ہوگی، اس لئے کہولت کے لفظ سے جس قسم استدلال کیا جاتا ہے یہ بات اُن کی تحقیق کے مطابق نہیں ہے، اور آپ نے ''جلالین'' کے اندر پڑھا ہوگا کہ یہ بتیس یا تینتیس سال تھے جب اُٹھا لیے گئے، اور بتیس تینتیس سال کی عمر یہ کہولت کی عمر نہیں ہے، یہ جوانی کا منتہا ہے، اس کے بعد کہولت کی عمر شروع ہوتی ہے، اور پھر جس وقت اُتریں گے تو سات سال اُن کا قیام ہوگا اور چالیس سال کی عمر میں وفات پا جائیں گے، تفسیروں کے اندر اس قسم کی روایتیں بھی موجود ہیں۔ بہرحال ان کی عمر کتنی ہے، کتنی عمر کے اندر یہ اُٹھائے گئے، اس کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی، علماء کی تحقیقات اس سلسلے میں مختلف ہیں۔ تو حضرت سیدنا الانور رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات ظاہر کی ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ سات سال کا زمانہ اُن کا مہدی کے ساتھ ہے، تینتیس سال کا زمانہ اُن کا علیحدہ ہے، تو یہ تینتیس اور سات کی تقسیم جو روایات موجود ہے وہ آسمان سے اُترنے کے بعد کی عمر کا حساب ہے، سات سال وہ حضرت مہدی کے ساتھ موجود رہیں گے، اور حضرت مہدی کے انتقال کے بعد پھر امامت کلیۃً وہ سنبھال لیں گے، اور پھر وہ تینتیس سال موجود رہیں گے، تو یہ چالیس سال کا حساب اُن کے آسمان سے زمین پر اُترنے کے بعد کا ہے، سات اور تینتیس کی تقسیم یوں ہو جاتی ہے ورنہ اُن کی کل عمر انہوں (شاہ صاحبؒ) نے ایک سو بیس سال قرار دی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے قرآن وسنّت کا علم بھی دیا ہے

وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ: میں نے تجھے آسمانی کتابوں کی تعلیم دی، حکمت اور دانش مندی کی باتیں سکھائیں، خصوصیت کے ساتھ توراۃ وانجیل سکھائی، اور بعض حضرات کے نزدیک الْكِتٰبَ سے یہ آخری کتاب قرآنِ کریم مراد ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کو اس کتاب کا بھی تفصیلی علم ہے، اور حکمت سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت مراد ہے، تو کتاب وحکمت سے مراد ہوگئی کتاب وسنّت، یعنی قرآن وحدیث کا علم یہ خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تفصیلاً دیا گیا ہے، کہ جب انہوں نے آخری عمر میں اُترنا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے آخری حصے میں جب انہوں نے نازل ہونا ہے، تو یہاں آکر لوگوں کو ہدایت قرآن وسنّت کے مطابق کرنی ہے، تو اُن کو تفصیلی علم ہوگا تو وہ اُس وقت راہنمائی کر سکیں گے، اور اگر اُن کو اس چیز کا تفصیلی علم نہ ہو تو اس اُمت کو قرآن وسنّت کے مطابق وہ کیسے چلائیں گے؟ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چونکہ کتاب وسنّت پر عمل کرنا ہے اور اس اُمت کو کروانا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے توراۃ وانجیل کے ساتھ ساتھ قرآن اور سُنّت کا علم بھی اُن کو پورا پورا دیا، جب وہ آئیں گے اور اس اُمت کی قیادت جو کریں گے تو کتاب وسنّت کے مطابق کریں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مزید اِنعامات

وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ: یہ حسی معجزات ہیں، جس طرح سے وہ معنوی معجزات تھے یہ حسی معجزات ہیں، کہ تو مٹی

کی ایک صورت بناتا تھا پرندے جیسی، اور پھر تو اُس میں پھونک مارتا تھا، تو میری اجازت کے ساتھ وہ پرندہ بن جاتا تھا، یہ معجزہ اُمت کے سامنے پیش کیا گیا، اب یہ کَهَيْئَةِ الطَّيْرِ مٹی کی شکل بنانا، یہ ہے تصویر بنانا، اور ان کے لیے یہ جائز تھی، ہمارے ہاں مٹی کی اس قسم کی شکل بنانا جیسے کہ پرندے کی شکل ہوتی ہے، یہ جائز نہیں ہے، ہماری شریعت میں یہ حرام ہے، اور اُن کی شریعت میں جائز تھی، اس لئے وہ ایک پرندے کا فوٹو بناتے، مٹی کی اُس کی صورت بناتے جس طرح سے بُت بنایا جاتا ہے، بعد میں اُس میں پھونک مارتے وہ زندہ ہو جاتا، لیکن یہ سارے کا سارا ''بِإِذْنِي'' تھا، جس سے معلوم ہو گیا کہ اصل قوت اور طاقت اس میں اللہ کی تھی۔ ''اور تُو تندرست کرتا تھا مادرزاد اندھوں کو'' یہ معجزات پہلے گزر چکے ہیں اس لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، ''مادرزاد اندھوں کو، اور کوڑھیوں کو، میری اجازت کے ساتھ، اور جبکہ تُو نکال کھڑا کرتا تھا مُردوں کو میری اجازت کے ساتھ، اور جبکہ میں نے روکا بنی اسرائیل کو تجھ سے'' بنی اسرائیل سے یہاں یہودی مراد ہیں جو آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتے تھے، ''جب تو اُن کے پاس واضح دلائل لے کر آیا تو اُن میں سے کافروں نے کہا کہ یہ تو صریح جادو ہے'' ان معجزات کو جادو کا اثر قرار دیا اور تجھے جادوگر قرار دیا اور اس طرح سے وہ تیرے مخالف ہو گئے، تجھے نقصان پہنچانا چاہتے تھے، لیکن میں نے انہیں تیرے اُوپر قدرت نہیں دی۔ اور پھر حوارین جن کا ذکر پہلے ہو چکا یہ ایک گروہ تھا اُس وقت موجود دھوبیوں کا، کپڑے صاف کیا کرتے تھے، ''اُن کی طرف میں نے تیری وساطت سے حکم بھیجا کہ میرے پر ایمان لاؤ اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ، وہ ایمان لے آئے اور انہوں نے کہا کہ تو گواہ ہو جا کہ ہم فرمانبردار ہیں، ہم اسلام قبول کرنے والے ہیں۔''

حواریوں کی طرف سے مائدہ کا مطالبہ کرنے کا واقعہ

پھر آگے حوارین نے ایک معجزے کا مطالبہ کیا جو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اس میں ''مائدہ'' کا ذکر آیا ہوا ہے، تو سورۂ مائدۃ اِسی وجہ سے اس سورت کو کہتے ہیں کہ اس میں ''مائدہ'' کا ذکر ہے، اِسی لفظ سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔ ''جبکہ حواریوں نے کہا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تیرا ربّ یوں کر سکتا ہے'' یعنی اس وقت کوئی حکمت مانع تو نہیں؟ ''کہ ہمارے اُوپر پکا پکایا کھانا اُتار دے آسمان سے۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ ''اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان لانے والے ہو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ رزق ہمیشہ اُس کے اسباب سے طلب کرو، اللہ تعالیٰ سے معجزات کا مطالبہ کرنا اور اُس کی قدرت کا امتحان کرنا بندوں کی شان کے لائق نہیں ہے، اس لئے اس قسم کا مطالبہ نہ کرو، رزق تمہیں چاہیے تو جو اللہ تعالیٰ نے رزق کے ذرائع متعین کیے ہوئے ہیں اُسی طریقے کے ساتھ رزق طلب کرو، اس طرح سے خلافِ اسباب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا امتحان کرنے کے لئے تم جس قسم کا مطالبہ کر رہے ہو یہ مناسب نہیں ہے، یہ تمہاری ایمانی شان نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں جی! ہماری اس میں کچھ مصلحتیں ہیں، وہ مصلحتیں یہ ہیں کہ ایک تو ہم اس سے ہم کھائیں گے، برکت والا کھانا ہو گا، برکت حاصل کریں گے، دوسرے یہ ہے کہ اس معجزے کو دیکھ کر ہمارے دلوں کو زیادہ اطمینان آئے گا، اور آپ کی صداقت زیادہ نمایاں ہو گی، اور آنے والے لوگوں کے سامنے ہم ایک چشم دید گواہ کی حیثیت میں پیش ہوں گے، ہم تو اس قسم کے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمارے اُوپر کوئی کھانا اُتروا دیجئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے

آ جائے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی نیت اچھی ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کر دی کہ "اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر پکا پکایا کھانا اُتار دے آسمان سے، جو ہمارے لئے خوشی کا باعث ہو جائے اگلوں کے لیے بھی اور پچھلوں کے لئے بھی"، اگلوں سے مراد جو اس وقت موجود ہیں، پچھلے جو بعد میں آئیں گے، "اور تیری قدرت کی اور میری صداقت کی ایک نشانی بھی ہو جائے گی"، "ہمیں عطا فرما" یعنی یہ مائدہ، وَارْزُقْنَا کا مفعول وہ مائدہ ہوگا، "اور تُو بہترین عطا کرنے والا ہے، رزق دینے والوں میں سے تُو بہترین رزق دینے والا ہے۔" جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دُعا کر دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ میں اس مائدہ کو تم پر اُتارنے والا ہوں، میں اُتار دُوں گا، لیکن جتنی بڑی نعمت ہوا کرتی ہے، اس کا شکر بھی اتنا بڑا ہوتا ہے، اب اتنا صریح معجزہ اور اتنا واضح اِنعام کہ پکا پکایا کھانا اُترے، یہ اُتر گیا تو پھر اگر اس کی ناشکری ہوئی اور اس کا شکر اَدا نہ ہوا تو پھر عذاب بھی ایسا دُوں گا جو کسی کو نہیں دیا۔

پکا پکایا کھانا اُترا یا نہیں؟

آگے پھر تفاسیر کے اندر دونوں قسم کی روایتیں موجود ہیں، بعض روایات میں تو آتا ہے کہ پھر یہ مائدہ اُترا تھا، اور ان لوگوں نے اُس میں سے کھایا لیکن پیٹ بھر کر کھا کے پھر یہ غرائے اور اللہ کی نافرمانی کی، یا اس مائدہ کے اندر خیانت کی کہ حکم یہ تھا کہ جتنی ضرورت ہو اتنا کھا لیا کرو، باقی اُٹھا کر اگلے دن کے لئے نہ رکھا کرو۔ انہوں نے یہ خیانت بھی شروع کر دی، تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کر دیا۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات آئی کہ اگر اس کی ناشکری ہوئی اور اُس کی قدر نہ کی گئی تو میں عذاب ایسا دُوں گا کہ جہانوں میں سے ایسا عذاب میں نے کسی کو نہیں دیا، تو پھر وہ ڈر گئے اور اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہو گئے۔ بہرحال آگے قطعیت کے ساتھ یہ مذکور نہیں ہے کہ مائدہ اُترا تھا یا نہیں اُترا تھا؟ جو روایات آخری درجے کی ہوا کرتی ہیں یعنی تفسیری روایات، ان میں دونوں قسم کی باتیں مذکور ہیں، ان میں سے کسی ایک کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔

عیسیٰ علیہ السلام کا روزِ قیامت عیسائیوں سے اِعلانِ لاتعلقی

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ: انعامات کا یاد دلانا یہ تو تمہید ہے، اب آگے اُس میدان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا اُس کو ذکر کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو اِلٰہ بنا لو اللہ کے علاوہ؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ "یا اللہ! تو شرک سے پاک ہے، میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں"، یعنی تبری کر دیں گے، تو جس وقت عیسیٰ علیہ السلام سب لوگوں کے سامنے خود یہ تبری کریں گے کہ میں نے ایسا نہیں کہا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو کہ اس دلیل کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کو اِلٰہ کہتے رہے کہ یہ تعلیم انہی کی ہے، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں انہی کے کہنے کے مطابق کرتے ہیں، وہ سارے کے سارے وہاں ذلیل ہو جائیں گے اور رُسوا ہو جائیں گے۔ تو پہلے تو تبری کریں گے کہ میں

ایسی بات نہیں کہہ سکتا جس کا مجھ حق نہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے علم کا حوالہ دیں گے کہ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے پتا نہ ہوتا؟ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ: عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ تُو پاک ہے یعنی شرک سے، تیرا کوئی شریک نہیں، میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں، میری یہ شان کے لائق ہی نہیں کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں ہے، اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ: اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی فَقَدْ عَلِمْتَهٗ: تو تجھے پتا ہوتا، یعنی جب تیرے علم میں بھی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس بات کا وجود ہی نہیں، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں نے کہی ہو اور تجھے پتا نہ ہو، تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ: تُو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے، میرے دل میں ہے، تُو علیم بذات الصدور ہے، تُو دِل کے جذبات اور دِل کے خیالات کو بھی جانتا ہے، تو جو بات زبان سے کہی ہوگی اور علی الاعلان کہی ہوگی وہ کیسے تجھے معلوم نہیں ہے؟ "اور جو کچھ تیرے علم میں ہے وہ میں نہیں جانتا" تو مَا فِيْ نَفْسِكَ کا ذکر یہاں مشاکلۃً ہے، اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: بے شک تُو غیبوں کو جاننے والا ہے۔ یہ تو نفی ہوگئی اِس بات کی کہ شرک کی تعلیم میں نے ان کو نہیں دی، اب دوسرا پہلو کہ میں نے تو ان کو توحید سکھائی ہے جس کے سکھانے کے لئے تُو نے مجھے بھیجا تھا، مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ: نہیں کہا میں نے انہیں مگر وہی جس کے کہنے کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا، جس کے لئے تُو نے مجھے مامور کیا تھا وہی بات میں نے ان کے سامنے کہی ہے، اور وہ بات یہ ہے کہ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ: کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رَبّ ہے تمہارا بھی رَبّ ہے، اُسی اللہ کی عبادت کرو، "رَبّ" کا مفہوم آپ کے سامنے آہی چکا، یعنی وہ اللہ میرا بھی پالنے والا ہے میری ضروریات کو پورا کرنے والا ہے، اور تمہارا پالنے والا تمہاری ضروریات کو پورا کرنے والا ہے، وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا: اور میں اُن کے اُوپر خبر رکھنے والا تھا، مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ: جس وقت تک میں اُن میں موجود تھا، جب تک میں موجود تھا مجھے اُن کے حالات کی خبر تھی، کہ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے، فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ: جس وقت تُو نے مجھے وصول کرلیا، اُٹھالیا، چاہے موت کے ذریعے سے، چاہے رَفع کے ذریعے سے، دونوں باتوں پر یہ صادق آئے گی، "پھر تُو ہی اُن کے اُوپر رقیب تھا، نگہبان تھا" پھر مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے بعد میں کیا کیا، کیا نہیں کیا، وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ: اور تُو ہر چیز کے اُوپر نگہبان ہے۔

اہلِ بدعت سے سرورِ کائنات ﷺ کا اِعلانِ لاتعلقی

ابتدا میں ذکر کرتے ہوئے سرورِ کائنات ﷺ کا وہ واقعہ قیامت کا میں نے ذکر کیا، کہ کچھ لوگ آپ کی طرف آئیں گے اور فرشتے اُن کے سامنے رُکاوٹ ڈال دیں گے، آپ تک پہنچنے نہیں پائیں گے، اور حضور ﷺ کہیں گے: "اُصَيْحَابِيْ اُصَيْحَابِيْ" اور جواب دیا جائے گا کہ "اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ" پھر حضور ﷺ اُن سے تبری کردیں گے "سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ"(۱) تو ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر میں ویسے ہی کہوں گا کہ جیسے اللہ کے ایک نیک بندے نے کہا تھا: كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ جس طرح سے اللہ کے نیک بندے نے کہا تھا

(۱) مسلم ۲ / ۲۵۲ باب اثبات حوض نبینا / بخاری ۲ / ۹۷۴ باب فی الحوض / مشکوۃ ۲ / ۴۸۸ باب الحوض۔ نوٹ: یہ دو حدیثوں کا مجموعی مضمون ہے۔

میں بھی پھر ایسے ہی کہہ دُوں گا، کہ یااللہ! مجھے ان کا کیا پتا، جب تک میں موجود تھا ان کے حالات کی مجھے خبر تھی، اور جب تُو نے مجھے وفات دے دی تو اس کے بعد تُو ہی جانتا ہے کہ یہ کیا کرتے رہے کیا نہیں کرتے رہے؟(۱) تو اس لئے پہلے جو حضور ﷺ کہیں گے ''اُصَیْحَابِیْ اُصَیْحَابِیْ'' تو اپنے اس علم کے مطابق کہیں گے جو کہ یہاں دُنیا کے اندر اُن کو تھا، کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے، بعد میں انکارِ زکوٰۃ کی وجہ سے، یا مسیلمہ کذّاب کے حامی بننے کی وجہ سے، یا اَسود عنسی کے ساتھ شامل ہونے کی وجہ سے جو اِرتداد پھیلا تھا، تو کچھ لوگ اس میں پھر گئے تھے، اس سے پھر آپ تبری کر دیں گے کہ مجھے ان کے حالات کی کوئی خبر نہیں ہے، اور فرمایا کہ ویسے ہی جواب دُوں گا جس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا تھا، کہ جب تک میں موجود تھا مجھے ان کی حالات کی خبر تھی، اور جب تُو نے مجھے اُٹھا لیا تو پھر مجھے کچھ پتا نہیں انہوں نے کیا کیا، کیا نہیں کیا۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ: یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اُمت کے اُن لوگوں کے متعلق جنہوں نے کُفر و شرک کیا ایک قسم کا لاتعلقی کا اظہار ہے، کہ میرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے تیری مرضی ان کو سزا دے دے یہ تیرے بندے ہیں، سزا دے گا تو سزا دینے کا بھی حق ہے، یہ تیرے بندے ہیں، جس طرح سے چاہے ان کو عذاب دے، اگر تُو اُن کو بخش دے تو بخشنا بھی تیری قدرت اور حکمت کے ساتھ ہے، مطلب یہ ہے کہ بخشنے پر بھی تُو مجبور کوئی نہیں، اگر چاہے تو بخش دے، اور اگر چاہے تو نہ بخشے، کوئی مجبوری نہیں کسی قسم کی، تُو قدرت والا بھی ہے، حکمت والا بھی ہے، ہر بات پر تجھے قدرت حاصل ہے، تُو معاف کرنا چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے، سزا دینا چاہے تو سزا بھی دے سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، اس طرح سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دے دیں گے، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے تو پھر عیسائی نصرانی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، یا اُن کی ماں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا تھا اُن کی رُسوائی سب لوگوں کے سامنے واضح ہو جائے گی۔

جنتیوں کے لئے سب سے بڑی نعمت

آگے پھر اللہ تعالیٰ نے عمومی حال ذکر کر دیا کہ یہ وہ دِن ہے کہ جس میں سچوں کو اُن کی سچائی نفع دے گی، صدق قول میں بھی ہوتا ہے فعل میں بھی ہوتا ہے، قول سچا وہ ہوتا ہے جو واقع کے مطابق ہو، اور فعل سچا وہ ہوتا ہے جو حکم کے مطابق ہو، اس لئے جنہوں نے اچھے اقوال اور اچھے افعال اختیار کئے یہ صدق اُن کو نفع دے گا، ''اور ان کے لئے باغات ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ ہمیشہ اُس میں رہنے والے ہوں گے، اللہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے'' اللہ ان سے راضی، اس لئے ان کو بخش دیا اور اپنی رضا کا اعلان کر دیا، اور وہ بھی اللہ سے راضی کہ اُن کے دل میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اللہ کو ہمارے ساتھ یوں کرنا چاہیے تھا، یوں ہمیں انعام دینا چاہیے تھا نہیں دیا، اس قسم کا شکوہ شکایت اُن کو بھی کوئی نہیں ہوگا، بندوں کی طرف سے رضا کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ دُنیا میں تو ہوتا ہے بھائی! کہ حاکم ایک آدمی پر خوش ہو گیا، اور خوش ہو کر اس نے انعام دے دیا، لیکن وہ رعایا کا آدمی، وہ ماتحت جس کو اِنعام دیا گیا ہے، وہ دل میں کڑھتا ہے کہ میری خدمات تو زیادہ تھیں، اِنعام تھوڑا دیا گیا

(۱) بخاری ۲/ ۶۶۵، کتاب التفسیر، سورۂ مائدہ کا آخر/ مسلم ۲/ ۳۸۳ باب فناء الدنیا/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۳ باب الحشر فصل اول۔

ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم تو راضی ہے لیکن ماتحت راضی نہیں ہے، حاکم نے تو راضی ہو کر انعام دے دیا اپنے خیال کے مطابق، لیکن ماتحت یہ سمجھتا ہے کہ جتنے انعام کا میں مستحق تھا اتنا نہیں دیا گیا، اور میرا اکرام اس سے زیادہ ہونا چاہیے تھا جتنا کہ انہوں نے کیا ہے، تو پھر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بڑا تو خوش ہے لیکن چھوٹا خوش نہیں ہے، لیکن یہاں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان صادقین کے ساتھ معاملہ ہوگا وہ دوطرفی رضا ہوگی، کہ جو اللہ تعالیٰ کا برتاؤ ہوگا اُس پر بندے بھی خوش ہوں گے، اور بندوں کے حالات پر اللہ بھی خوش ہوں گے۔ اور اللہ کی طرف سے رضا کا حاصل ہو جانا یہ جنت کی اعلیٰ نعمتوں میں سے نعمت شمار ہوتی ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں جائیں گے، ہر قسم کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں گے، تو پھر اللہ تعالیٰ بندوں سے پوچھے گا کہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ، اور جنتی کہیں گے کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، سب کچھ تُو نے ہمیں دے دیا، تو پھر اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ میں تم پر اپنی رضا اُتارتا ہوں، اور اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا،[1] تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا کا اعلان سن کر جنتی اتنا خوش ہوں گے کہ جنت کی کسی نعمت سے اتنا خوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ تو اللہ ان سے خوش ہو گیا، یہ اللہ سے خوش ہو گئے، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: یہ بہت بڑی کامیابی ہے، لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ: یہ وہی توحید کا اعلان، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مالکیت، اور ساری کی ساری کائنات کا مخلوق ہونا مملوک ہونا، اس کے استحضار کے ساتھ بھی اطاعت کا جذبہ اُبھرتا ہے، تو آخر میں یہ لفظ ذکر کر دیئے گئے'' زمین آسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطنت اللہ کے لئے ہے'' وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

***

(۱) بخاری ۲/۱۱۲۱ باب کلام الرب مع اهل الجنة/ مسلم ۲/ ۳۷۸ باب احلال الرضوان الخ/ مشکوۃ ۲/ ۴۹۷ باب صفة الجنة، فصل اول عن ابی سعید

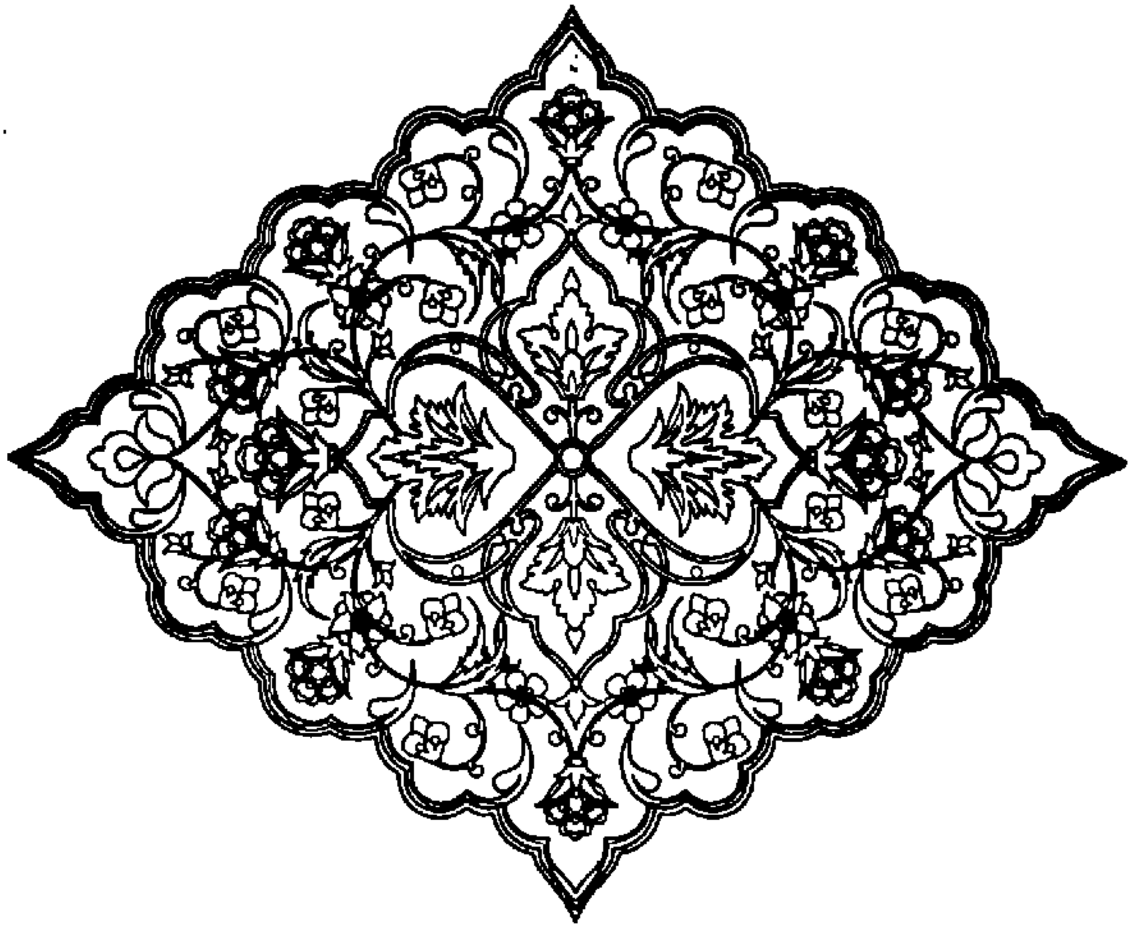

سُورَةُ الأَنعَامِ

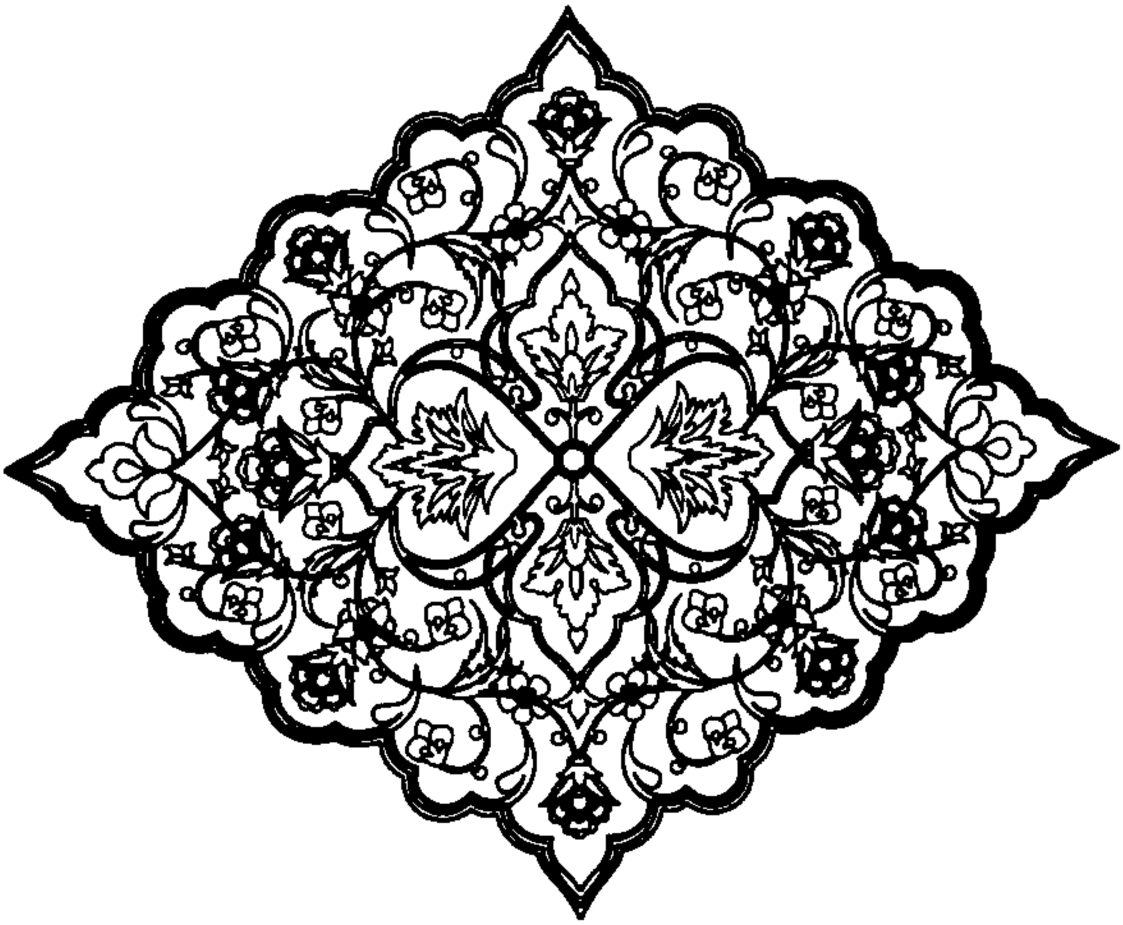

اٰیاتھا ۱۶۵ ۶ سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَکِّیَّۃٌ ۵۵ رکوعاتھا ۲۰

سورۂ اَنعام مکی ہے، اس کی ۱۶۵ آیات ہیں اور ۲۰ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، اور جس نے تاریکیوں کو

وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ① هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ

اور نُور کو بنایا، پھر بھی یہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اپنے رَبّ کے برابر ٹھہراتے ہیں ① اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا

مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ

مٹی سے پھر اُس نے ایک وقت متعین کیا، اور ایک اور متعین وقت اُس کے پاس ہے، پھر بھی تم

تَمْتَرُوْنَ ② وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ

شک کرتے ہو ② وہی اللہ معبود حقیقی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، جانتا ہے وہ تمہارے سِرّ کو

وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ

اور تمہارے جہر کو، اور جانتا ہے وہ اُن کاموں کو جن کو تم کرتے ہو ③ اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رَبّ کی

رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ④ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ

نشانیوں میں سے مگر وہ اُس سے اِعراض کرنے والے ہوتے ہیں ④ پس تحقیق جھٹلایا انہوں نے حق کو جب وہ حق اُن کے پاس آ گیا

فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ⑤ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ

پس عنقریب آ جائیں گی ان کے پاس خبریں اُس چیز کی جس کا یہ اِستہزا کرتے ہیں ⑤ کیا انہوں نے دیکھا نہیں

اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ

کہ ہم نے کتنی ہی جماعتوں کو ان سے قبل ہلاک کر دیا، قدرت دی تھی ہم نے اُن کو زمین میں اتنی جتنی کہ ہم نے تمہیں قدرت نہیں دی،

وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۖ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ

اور بھیجا ہم نے اُن کے اُوپر بادل بہت برسنے والا، اور بنائی ہم نے نہریں جو بہتی تھیں اُن کے نیچے سے

مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا

پھر ہم نے اُنہیں ہلاک کردیا اُن کے گناہوں کے سبب سے اور پیدا کردیئے ہم نے اُن کے بعد اور

اٰخَرِيْنَ ۝٦ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ

لوگ⑥ اگر ہم آپ پر کاغذ میں لکھا ہوا مضمون اُتار دیں پھر یہ اُس کاغذ کو چھولیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ

لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٧ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

البتہ کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، نہیں ہے یہ مگر صریح جادو⑦ اور یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اُتارا جاتا

عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝٨

اِس پر کوئی فرشتہ، اور اگر ہم فرشتہ اُتاردیں تو معاملہ طے ہو جائے پھر یہ مہلت نہ دیئے جائیں⑧

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝٩

اگر ہم اُس بھیجے ہوئے رسول کو فرشتہ بناتے تو بناتے ہم اُس کو آدمی اور البتہ خلط ملط کردیتے ہم ان پر جس کو یہ اپنے اُوپر خلط کیے ہوئے ہیں⑨

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ

البتہ تحقیق اِستہزا کیا گیا آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ پھر گھیر لیا اُن لوگوں کو جنہوں نے رسولوں سے تمسخر کیا اس چیز نے

مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝١٠ ع قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا

جس کے ساتھ وہ اِستہزا کرتے تھے⑩ آپ کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو تم

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝١١

کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا⑪

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ اَنعام مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینسٹھ آیتیں اور بیس رُکوع ہیں،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: جس نے کہ آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ: اور جس نے تاریکیوں کو اور نُور کو بنایا، ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ: ثُمَّ استبعاد کے لئے ہے۔ پھر بھی یہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اپنے رَبّ کے برابر ٹھہراتے ہیں، یعنی باوجود اس بات کے کہ ''خالقُ السماوات والارض'' وہی ہے، ''جاعلُ الظلمات والنور'' وہی ہے پھر بھی یہ کافر لوگ اپنے رَبّ کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ يَعْدِلُوْنَ عدل سے ہے، برابری کرنا۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، مِّنْ طِيْنٍ: مٹی سے، ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا: پھر اس نے ایک وقت متعین کیا۔ اجل: مدت۔ اس نے مدت متعین کی، یعنی تمہاری زندگی کے ختم ہونے کی وَاَجَلٌ مُّسَمًّى: اور ایک اور متعین وقت عِنْدَهٗ: اس کے پاس ہے، یعنی اس کے علم میں ہے، ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ: پھر بھی تم شک کرتے ہو۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ: اللہ سے معبود بالحق مراد ہے۔ وہی اللہ معبود حقیقی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ: جانتا ہے وہ تمہارے سِر کو اور تمہارے جہر کو، خفیہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہر کو بھی جانتا ہے، وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ: اور جانتا ہے وہ ان کاموں کو جن کو تم کرتے ہو۔ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ: اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ: ان کے رَبّ کی نشانیوں سے اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ: مگر وہ اس سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں، فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ: پس تحقیق جھٹلایا انہوں نے حق کو، لَمَّا جَآءَهُمْ: جب وہ حق ان کے پاس آ گیا، فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: پس عنقریب آ جائیں گی اِن کے پاس خبریں اس چیز کی جس کا یہ اِستہزا کرتے ہیں۔ خبر کے آ جانے کا مطلب ہوتا ہے اس کا مصداق مہیّا ہو جانا، کہ جس عذاب کے ساتھ یہ اِستہزا کرتے ہیں اس کی خبریں واقع ہو جائیں گی، خبریں واقعہ بن کر سامنے آ جائیں گی، حاصل یہ ہوگا کہ اس خبر کی حقیقت سامنے آ جائے گی، اس کا مصداق مہیّا ہو جائے گا۔ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ: کیا اِنہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کتنی ہی جماعتوں کو ان سے قبل ہلاک کر دیا۔ قَرْنٍ: ایک زمانے میں موجود لوگ ''قرن'' کہلاتے ہیں، ''قرن'' زمانے کو بھی کہتے ہیں جو سو سال تک محیط ہو سکتا ہے، اور اس زمانے کے اندر موجود لوگ، ہم زمانہ لوگ، وہ بھی ''قرن'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ مِّنْ قَرْنٍ یہ كَمْ کی تمیز ہے، یعنی کتنی ہی جماعتوں کو ہلاک کر دیا ان سے قبل، مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ: ہم نے ان کو ٹھکانا دیا تھا، قدرت دی تھی زمین میں مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ: قدرت دی تھی ہم نے ان کو زمین میں اتنی جتنی کہ ہم نے تمہیں قدرت نہیں دی، وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ: سماء آسمان کو بھی کہتے ہیں، بادل پر بھی یہ لفظ صادق آتا ہے، جیسے کہ آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ جو چیز بھی سر سے اُونچی ہو اور انسان پہ سایہ افگن ہے اس کو سماء سے تعبیر کر دیا جاتا ہے ''كُلُّ مَا عَلَاكَ وَاَظَلَّكَ فَهُوَ سَمَآءٌ''، یہاں بادل مراد ہے۔ ''بھیجا ہم نے ان کے اُوپر بادل'' مِّدْرَارًا: بہت برسنے والا، وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ: اور بنائیں ہم نے نہریں جو بہتی تھیں ان کے نیچے سے فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ: پھر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ان کے گناہوں کے سبب سے، وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ: اور پیدا کر دیے ہم نے اُن کے بعد اور لوگ، اور لوگ پیدا کر دیے، وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ: اگر اُتار دیں ہم آپ پر کتاب، مکتوب، لکھا ہوا مضمون کسی کاغذ میں۔ قرطاس کاغذ کو کہتے ہیں۔ کتاب مکتوب کے معنی میں۔ ''اگر ہم آپ پر کاغذ میں لکھا ہوا مضمون اُتار دیں'' فَلَمَسُوْهُ: پھر یہ اس کاغذ کو چھو لیں بِاَيْدِيْهِمْ: اپنے ہاتھوں کے ساتھ، لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: البتہ کہیں وہ لوگ جنہوں نے کُفر

کیا، اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ: نہیں ہے مگر یہ صریح جادو۔ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ: اور یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اُتارا جاتا اس پر کوئی فرشتہ، وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا: اور اگر ہم فرشتہ اُتار دیں لَّقُضِیَ الْاَمْرُ: تو اَمر کا فیصلہ ہو جائے، بات طے ہو جائے، پورا کر دیا جائے اَمر، یعنی معاملہ طے ہو جائے، ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ: پھر یہ مہلت نہ دیے جائیں، وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا: اگر ہم اس بھیجے ہوئے رسول کو فرشتہ بناتے، لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا: تو بناتے ہم اس کو آدمی، وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ: اور البتہ خلط ملط کر دیتے ہم ان پر، مَّا یَلْبِسُوْنَ: جس کو یہ اپنے اوپر غلط کیے ہوئے ہیں، یعنی جس شبہ میں یہ اپنے آپ کو ڈال رہے ہیں ہم اسی شبہ میں ان کو پھر واقع کر دیتے اگر فرشتے کو رجل کی شکل میں بھیجے، وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ: البتہ تحقیق ہنسی کی گئی، مذاق اُڑایا گیا، اِستہزا کیا گیا آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ، فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ: پھر گھیر لیا ان لوگوں کو جنہوں نے رسولوں سے تمسخر کیا، تمسخر کیا، مذاق کیا، مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ: اس چیز نے جس کے ساتھ وہ اِستہزا کرتے تھے۔ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ سے وہ عذاب مراد ہے، کیونکہ رسول جب عذاب کی خبر دیتے تھے تو وہ مذاق اُڑاتے تھے، تو جس بات کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے اس بات نے ان کو گھیر لیا، یعنی وہ عذاب آ گیا۔ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ: آپ کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو تم، کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

سورۂ اَنعام کا ماقبل سے ربط

سورۂ اَنعام سے قبل جو سورتیں آپ کے سامنے گزری ہیں وہ ساری کی ساری مدنیہ تھیں، جو ہجرت کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں، اس لیے اُن میں اَحکام کا تذکرہ زیادہ تھا، اور پھر گفتگو کا رُجحان بھی زیادہ تر اہلِ کتاب کی طرف تھا، کیونکہ مدینہ منورہ میں جانے کے بعد واسطہ اہلِ کتاب سے ہی پڑا تھا، مشرکین کے ساتھ بھی گفتگو تھی اور اُن کے متعلق بھی باتیں آئی تھیں لیکن کم، زیادہ ذِکر اہلِ کتاب کا تھا، اور اُن میں اُصولِ دِین کا ذِکر آیا تھا لیکن فروع کے مقابلے میں کم، اور اَحکامِ فرعیہ زیادہ تھے۔ اور اَب یہاں سے جو سورتیں شروع ہو رہی ہیں یہ سورتیں مکی ہیں، مکی سورتوں میں گفتگو کا رُجحان مشرکینِ مکہ کی طرف ہے، اور ان میں اُصولِ دِین کو ذِکر کیا گیا ہے، فروع کا تذکرہ ان سورتوں میں کم ہے۔

مکی سورتوں کے مضامین کا رُخ

اُصولِ دِین کیا ہیں؟ سب سے پہلے توحید اور پھر رسالت اور پھر آخرت یہ تین عقیدے بنیادی عقیدے کہلاتے ہیں، یہ امہاتِ عقائد میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننا اور رسالت پر ایمان لانا اور آخرت کے اُوپر ایمان لانا، تو جس وقت توحید کا اِثبات ہوگا تو اُس کے ساتھ ساتھ پھر رَدِّ شرک بھی ہو جائے گا، اور جس وقت رسالت کا ذِکر ہوگا تو رسالت کے بارے میں جس قسم کے شبہات مشرکین پیش کرتے تھے ان شبہات کا ذِکر بھی ہو جائے گا اور ان کے جوابات بھی آ جائیں گے، اور جب آخرت کا ذِکر

ہوگا تو آخرت کے بارے میں جس قسم کے شبہات وہ پیدا کرتے تھے اُن شبہات کا ازالہ بھی ساتھ ساتھ کردیا جائے گا، یہ تو ہیں بنیادی چیزیں، پھر انہی چیزوں کو مؤکد کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اُمم سابقہ کے واقعات بھی بیان فرماتے ہیں، جن کے ساتھ انہی اُصولوں کی تاکید کرنی مقصود ہوتی ہے، انہی اُصولوں کی تائید ہوتی ہے، واقعات کے طور پر یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ اللہ کی طرف سے رسول آئے، جس کے ضمن میں رسالت کا مسئلہ آ گیا، انہوں نے آکر توحید کو بیان کیا، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو لوگوں کے سامنے ثابت کیا، اس میں اِثباتِ توحید ہوگیا، اور شرک کی تردید کی، تو رَدِّ شرک والا مضمون بھی اس ضمن میں آ گیا، آخرت کی یاددہانی کی، کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں جاکے محاسبہ کرنا ہے، اس میں تذکیرِ آخرت بھی ہوگئی، اور پھر اُن کو عذاب سے ڈرایا کہ اگر نہیں مانو گے، یہ ترہیب ہے دُنیوی عذاب کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف وعدے کیے کہ اگر تم اللہ کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں رزق کے اندر اور اولاد کے اندر وسعت دے گا، یہ ترغیب ہے اِنعامِ دُنیوی کے ساتھ، پھر مخالفت کرنے کی صورت میں اُن کے اُوپر عذاب کا ذکر ہے، اور اسی طرح سے ماننے کی صورت میں اُن کے لیے نجات کا ذکر ہے، ان واقعات کے ساتھ بھی ان اُصول کی تاکید کی جاتی ہے، اور ان واقعات کے ساتھ ان حقائق کی تائید ہوتی ہے جو اُصولی رنگ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ تو مکی سورتوں کے اندر زیادہ تر یہی مضامین آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہونا، اِس کے متعلق زیادہ دلائل دینے کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی کہ قرآنِ کریم کے مخاطبین جتنے بھی تھے وہ سب کے سب اللہ کے وجود کو مانتے تھے، اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر اُس وقت قرآنِ کریم کے مخاطبین میں نہیں تھے، منکرینِ خدا نہیں تھے، کیونکہ اُن کو کہا جاتا ہے ''مشرک''، اور ''مشرک'' وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ماننے کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی مانے، اور جو سرے سے اللہ کے وجود کا منکر ہو اُس کو ''مشرک'' نہیں کہہ سکتے، اور ایسے منکرین اُس دور میں کوئی شاذ ونادر ہوں گے، قرآنِ کریم نے اکثر وبیشتر اُن سے خطاب نہیں کیا۔ اہلِ کتاب تو سارے کے سارے اللہ کو بھی مانتے تھے، باقی سب چیزوں کو مانتے تھے، اُن کے ساتھ اگر مسئلہ مختلف فیہ ہوا ہے زیادہ تر تو وہ سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت کا ہے، ورنہ فی نفسہٖ وہ رِسالت کو مانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے رسول بھی آئے، آخرت کے بھی وہ قائل تھے، کتابوں کو بھی وہ مانتے تھے جو پہلے نازل ہوچکی تھیں، اُن کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ جو مسئلہ ہے وہ سرورِ کائنات ﷺ کی ذات تک مختلف فیہ ہے، کہ آپ کی نبوت کو وہ تسلیم نہیں کرتے تھے، آپ کی نبوت کو اگر تسلیم کرلیتے تو باقی اُصولِ دین جتنے ہیں اُن کے وہ قائل تھے، اس لیے جب اہلِ کتاب کے متعلق تذکرہ آتا ہے تو زیادہ تر سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا بیان ہوتا ہے، اور جب مشرکین کے متعلق تذکرہ آتا ہے تو مشرکین توحید کے بھی منکر تھے، اور آخرت کے بھی منکر تھے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول کے آنے کے بھی منکر تھے، البتہ فرشتوں کے وجود کے قائل تھے، اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے، اس لیے ان کے ساتھ جو گفتگو آتی ہے وہ مختلف اجزاء کے اُوپر مشتمل ہوتی ہے، توحید کا ذکر بھی آتا ہے، اور اسی طرح سے اُن کے سامنے اثباتِ رسالت بھی کی جاتی ہے، تذکیرِ آخرت بھی ہوتی ہے۔ تو یہ سورت انہی مضامین پر مشتمل ہے جیسے کہ مکی سورتوں کے متعلق میں نے عرض کیا۔

تین بنیادی عقیدوں کا مختصر تعارف

سب سے پہلے ذکر ہے توحید کا، توحید کا حاصل یہ ہے کہ ساری کائنات کا خالق اللہ کو مانا جائے، ساری کائنات کا مالک اللہ کو قرار دیا جائے، ساری کائنات کے اندر متصرف اُسی کو قرار دیا جائے، اور ساری کائنات کے اندر احکام اُسی کے مانے جائیں کہ حاکم وہی ہے، اس لیے اُسی کے اَحکام ماننا ضروری ہے۔ اور جس وقت خالق وہ، مالک وہ، صاحبِ سلطنت وہ، متصرف وہ، اور اَحکام بھی اسی کے ماننے ضروری، تو پھر ان اَحکام کے پہنچنے کے لیے ایک ذریعہ ماننا پڑتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے ہی بعض کو منتخب کر کے اپنے اَحکام دیتے ہیں، اور وہ بندے جن کو منتخب کیا جاتا ہے جن کے اُوپر اللہ تعالیٰ اپنے اَحکام اُتارتے ہیں وہ اللہ کے رسول کہلاتے ہیں۔ اور اُن اللہ کے رسولوں میں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں ظاہری اسباب کے طور پر ربط فرشتوں کے ذریعے سے ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اَحکام فرشتوں کے وساطت سے اُتارتے ہیں، جس طرح سے باقی تصرف کائنات میں اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کی وساطت سے ہے، بلا احتیاج اپنی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ذریعہ بنایا ہوا ہے، اسی طرح سے انبیاء ﷺ تک اللہ تعالیٰ کے اَحکام فرشتے لے کر آتے ہیں، اس ضمن میں فرشتوں کا ذکر بھی ہو جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے اَحکام بندوں تک پہنچا دیے گئے، اب سیدھی بات ہے کہ اگر اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں کہ ماننے والوں کا کیا انجام ہوگا، نہ ماننے والوں کا کیا انجام ہوگا؟ اگر کوئی نتیجہ سامنے آنے والا نہیں تو یہ سارے کا سارا کھیل بے سود ہے پھر یہ پیدا کیوں کیے گئے؟ یہ اَحکام کیوں دیے گئے؟ جب فرمانبرداروں کا اور نافرمانوں کا کوئی انجام سامنے آنے والا نہیں ہے، کہ فرمانبرداروں کو اِنعام دیا جائے اور نافرمانوں کو سزا دی جائے، تو پھر یہ اَحکام بھیجنے اور اس طرح سے دُنیا بسانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ایک عبث سا کھیل ہو جاتا ہے، اس لیے آخرت کا عقیدہ ضروری ہے، ورنہ یہ سارے کا سارا کھیل عبث ہو جاتا ہے، جیسے قرآنِ کریم میں آتا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (سورۂ مؤمنون:۱۱۵) اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے؟ وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ: اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ یعنی اگر تمہارے لوٹنے کا عقیدہ نہ ہو اور تم نے واپس ہماری طرف لوٹ کر نہ آنا ہو، فرمانبرداروں کے لیے جزا اور نافرمانوں کے لیے سزا کی صورت نہ ہو، تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں پیدا کرنا فضول ٹھہرا۔ جیسے بچے کھیل کھیلتے ہیں، تھوڑی دیر کے لیے دل بہلاتے ہیں، ہاتھوں کے ساتھ مٹی کے گھر بناتے ہیں، پاؤں کے ساتھ ڈھا کر گھروں کو چلے جاتے ہیں، جس طرح سے اُن کا کھیل بے سُود سا ہوتا ہے، جس کا نتیجہ کوئی نہیں، تو کیا اللہ تعالیٰ نے یہ سارے کا سارا کھیل اسی طرح سے بنایا ہے؟ تو توحید اور رسالت اور اللہ کے اَحکام کے ماننے کے ساتھ ساتھ لازم ہے کہ عقیدۂ آخرت رکھا جائے، ورنہ یہ سارے کا سارا کھیل عبث معلوم ہوتا ہے۔ تو پھر جب آخرت کا عقیدہ آپ رکھیں گے تو وہاں اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کا بھی عقیدہ رکھنا پڑے گا، اگر جھوٹی شفاعتیں اور جھوٹے سہاروں کے ساتھ وہاں چھوٹنے کا نظریہ ساتھ آ جائے تو بھی آخرت کا عقیدہ بے سُود ہو جاتا ہے، جیسے مشرکین عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمارے معبود بہرصورت ہمیں چھڑا لیں گے، چاہے ہم نیک ہوں چاہے بد ہوں، اگر آخرت ہوئی تو ہمیں یہ بچا لیں گے یہ ہمارے شفیع ہیں، یا اہلِ کتاب نے جس طرح سے عقیدہ اختیار کر لیا تھا کہ بزرگوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے

ہم بہرحال بخشے جائیں گے، اگر یہ شفاعت کا عقیدہ اس طرح کا ہو جس کو شفاعت جبری کہتے ہیں، کہ شفاعت کرنے والا مجرم کو بہرصورت چھڑالے گا، تو پھر بھی آخرت کا عقیدہ بے سُود ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ آخرت کے عقیدے کی تو ضرورت اس لیے ہے کہ وہاں جا کر فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے، اور اگر مجرموں نے چھوٹ جانا ہے اور اُن کی کوئی کسی قسم کی پکڑ نہیں ہوگی، اور جیسے بھی جرم کرتے رہو دوسرا کوئی چھڑا کر لے جائے گا، تو پھر عدل وانصاف کا تصورِ آخرت کے متعلق نہیں رہتا، اس لیے شفاعت جبری کا عقیدہ، نسب ونسبت کی بنا پر چھوٹنے کا عقیدہ یہ سب اعتقادِ آخرت کے خلاف ہیں اور اُس مصلحت کے خلاف ہیں جس مصلحت کے تحت عقیدۂ آخرت بتایا گیا ہے، تو ساتھ ساتھ ان کی تردید بھی آجائے گی۔

مشرکینِ مکہ کے ساتھ مسئلۂ توحید میں اختلاف کی نوعیت اور شرک کی حقیقت

مشرکین کے ساتھ توحید کا مسئلہ جو مختلف فیہ تھا، اب اِس کو ذرا عنوان کے طور پر سمجھ لیجئے، اللہ کے وجود میں اختلاف نہیں تھا، اللہ تعالیٰ کے خالقِ کائنات ہونے میں اختلاف نہیں تھا، مالک کائنات ہونے میں اختلاف نہیں تھا، ان سب چیزوں کو وہ مشرک تسلیم کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اگر تھا تو وجود میں نہیں، خالقیت میں نہیں، بلکہ اللہ کے ساتھ شرک تھا اُس کی صفتِ تصرف میں اور اُس کی صفتِ اطاعت میں، کہ اللہ تعالیٰ کو جو مطاع قرار دیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی مطاع قرار دیتے تھے، اور اس کائنات کے اندر جس طرح سے اللہ تعالیٰ کو متصرف قرار دیا جاتا ہے وہ دوسروں کو بھی متصرف قرار دیتے تھے، اور وہ متصرف قرار دیتے تھے اللہ تعالیٰ کے تابع کر کے، جس کا حاصل یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پیدا کرنے کے بعد اِس کی حکومت سنبھالی، جس طرح سے دنیوی بادشاہ دُور دُور کے علاقوں کے نظم دوسرے حاکموں کے سپرد کر دیتے ہیں، اور اُن کی شان کے لائق نہیں کہ چھوٹے موٹے کام خود کریں، اپنے نائب بنا دیتے ہیں اور وہ نائب اُس سلطنت کو سنبھالتے ہیں، اور لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں، تو لوگوں کا تعلق براہِ راست ان نائبوں کے ساتھ ہوتا ہے، اگر یہ نائب خوش رہیں تو بادشاہ بھی خوش رہے گا، اگر یہ نائب ناراض ہو جائیں تو کسی صورت میں بادشاہ خوش نہیں رہ سکتا، تو وہ اللہ تعالیٰ کو اسی طرح سے حاکمِ اعلیٰ مانتے تھے، اور اُس کے نائبین کا عقیدہ رکھتے تھے، کہ ان کو اختیار اللہ دیتا ہے، اور مخلوق کے ساتھ اب تعلق ان نائبین کا ہے، اور مخلوق کا ربط براہِ راست ان کے ساتھ ہے، لہٰذا ان کو خوش رکھو تو اللہ تعالیٰ خوش رہے گا، اور اگر یہ ناراض ہو گئے تو اللہ بھی ناراض ہو جائے گا، اس طرح سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حکومت کے ساتھ دوسرے حاکمین کو شریک کر لیا، اطاعت بھی اُن کی کرتے اور پھر عبادت بھی اُن کی کرتے، انہی کے سامنے جھکتے، انہی کے نام پہ نذر ونیاز دیتے، انہی کی جگہوں کا طواف کرتے، ساری کی ساری چیزیں جو اللہ کو خوش کرنے کے لیے اللہ کے بندے کرتے ہیں، وہ ساری کی ساری چیزیں انہوں نے ان نائبین کے ساتھ لگائی تھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ جب اپنی کتاب کے اندر توحید کو بیان فرماتے ہیں تو یہی بات کہتے ہیں کہ اللہ کو دوسرے حاکموں پر قیاس نہ کرو، دوسرے حاکم ہر چیز کے جاننے والے نہیں ہوتے، اُن کو جاننے کے لیے ذرائع کی ضرورت ہے، اس لیے وہ دوسرے ذرائع کے محتاج ہیں، وہ حاکم بیک وقت قادر نہیں ہوتے کہ ہر جگہ اپنا تصرف جاری کر لیں اور ہر جگہ ضرورتیں پوری کریں، اللہ تعالیٰ اس طرح

سے نہیں، اللہ قدیر بھی ہے علیم بھی ہے، ہر ایک کی ضرورت کو جانتا ہے اور ہر چیز کے اُوپر قدرت رکھنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کا احتیاج کسی دوسرے کی طرف نہیں ہے، اس لیے حکومت ساری کائنات میں اللہ کی، تصرف اُسی کا، کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں کہ جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طرح سے اختیار دے دیا ہو جس طرح سے دنیا کے حاکم اپنے گورنروں کو اور گورنر اپنے ماتحت کمشنروں کو اور کمشنر اپنے ماتحت ڈی سی کو اور ڈی سی اپنے ماتحت تحصیل داروں کو اور تحصیل دار اپنے ماتحت پٹواریوں کو جس طرح سے اختیارات دے کر علاقے تقسیم کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے اپنے علاقے تقسیم نہیں کیے، یہ حاصل ہے رَدِّ شرک کا، اور اسی کے اردگرد ساری کی ساری کلام گھوم رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو واسطہ بنایا ہے اس دُنیا کے اندر تصرف کا، لیکن ان میں اس تصرف کا اختیار نہیں جس کی بنا پر نسبت اُن کی طرف نہیں کی جاتی، ہم بھی مانتے ہیں کہ بارش میکائیل علیہ السلام کی وساطت سے ہوتی ہے، اور ہم مانتے ہیں کہ وحی جبریل علیہ السلام کی وساطت سے اُترتی ہے، اور ہم مانتے ہیں کہ وفات عزرائیل علیہ السلام کی وساطت سے آتی ہے، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے روحیں ڈالنے کے لیے بھی فرشتے متعین کر رکھے ہیں، رزق اور بارش کی تقسیم کے اُوپر بھی فرشتے متعین ہیں، لیکن ان کی حیثیت اُس طرح کی نہیں جس طرح سے مشرکین کے شرکاء کی تھی، مشرکین اِن کو حاکم مانتے تھے کہ اِن کو اختیار ملا ہوا ہے اور یہ تصرف اپنے اختیار سے کرتے ہیں۔ (۱)

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْأَرْضِ: اللہ سے مراد ہے، معبود برحق، ''وہی معبود برحق ہے آسمانوں میں اور زمین میں''، اور انہوں نے یہ بھی تقسیم کر رکھی تھی کہ آسمان میں تو وہ اللہ ہی کو مانتے تھے، اور کہتے تھے کہ زمین چونکہ اُس کی کائنات کا ایک بہت دُور کا علاقہ ہے، تو جس طرح سے حاکمِ وقت دُور کے علاقوں میں اپنے نائبین متعین کر دیا کرتے ہیں، تو زمین میں بھی اُس نے سارے نظام کو سنبھالنے کے لیے اپنے نائب بنا رکھے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہیں! آسمانوں میں بھی وہی اور زمین میں بھی وہی۔ اور اس کا علم اتنا تام ہے کہ قریب اور بعید کا کوئی فرق نہیں، ظاہر اور باطن کا کوئی فرق نہیں، علم اُس کا سب کو محیط ہے يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ: وہ تمہارے سِر کو بھی جانتا ہے جہر کو بھی جانتا ہے، جس چیز کو تم چھپاتے ہو اُس کو بھی جانتا ہے اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو اُس کو بھی جانتا ہے وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ: خاص طور پر تمہارے عملوں کو بھی جانتا ہے، جو تم کماتے ہو، جو تم کرتے ہو، کیونکہ جزا وسزا کا تعلق کسبِ انسانی کے ساتھ ہے اس لیے اس کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا۔

اِنسان کے اِعراض کی شکایت

آگے شکایت ہے انسان کے اِعراض کی کہ ''اِن کے پاس کوئی نشانی نہیں آتی رَبّ کی نشانیوں میں سے مگر اُس سے منہ موڑ جاتے ہیں'' یہ نشانیوں کو دیکھ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، یہ ان کی بے توجہی کی عدمِ مبالات کی شکایت ہے۔ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ: اسی اِعراض کا نتیجہ ہے کہ اب بھی اِن کے پاس حق آیا تو انہوں نے اس حق کو جھٹلایا جبکہ اُن کے پاس آ گیا، ''جھٹلایا انہوں نے حق کو جب ان کے پاس آیا'' فَسَوْفَ يَأْتِيْهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: جس چیز کا یہ

(۱) ریکارڈنگ مس ہونے کی وجہ سے بات نامکمل رہ گئی۔ البتہ یہی مضمون سورۂ یونس کے شروع میں اور سورۂ انبیاء آیت ۵۱ تا ۵۷ کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

مذاق اُڑاتے ہیں، جس چیز کے ساتھ یہ استہزا کرتے ہیں اُس کی خبریں ان کے پاس آجائیں گی، حقیقت ان کے سامنے واضح ہوجائے گی، یعنی ایک وقت آنے والا ہے، آج یہ عذاب کی خبروں کا مذاق اُڑاتے ہیں، آخرت کے قصوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ یہی باتیں ساری کی ساری حقیقت بن کر سامنے آجائیں گی۔

کیا اُممِ گزشتہ پر تباہی کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ تھی؟

آگے تاریخ سے استشہاد ہے، تاریخ کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے، کہ اگر تم اپنے گزشتہ لوگوں کے واقعات کو دیکھو، تو بھی ہمارے ان اُصولوں کی صداقت آپ کو اس صفحۂ ہستی کے اُوپر نظر آجائے گی، زمین کے اُوپر یہ واقعات بکھرے ہوئے ہیں، اور یہ واقعات اس طرح سے بخت واتفاق قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ہر جگہ ایک رسول آیا، اُس نے آکر متعین بات کہی، نہ ماننے کی صورت میں اُس نے عذاب کی دھمکی دی، اور جب قوم نے نہیں مانا تو اُس کی پیش گوئی کے مطابق عذاب آگیا، ایک جگہ آیا اسی انداز کے ساتھ، دوسری جگہ آیا اسی انداز کے ساتھ، تیسری جگہ آیا اسی انداز کے ساتھ، تو یقین ہوگیا کہ یہ تباہی کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ باقاعدہ پروگرام کے تحت ہے، جس طرح سے اللہ کے نبی نے بتائی تھی، تو اس سے اُس نبی کی شخصیت بھی حق پر ثابت ہوئی، اور اُس کی باتیں بھی حق پر ثابت ہوئیں، اور تاریخ کا یہ تسلسل انسان کو بتاتا ہے کہ یہ اُصول اسی طرح سے ہے، اُسی کے مطابق اب یہ رسول آگئے، وہ بھی دین کی باتیں بتارہے ہیں، وہی بات کہہ رہے ہیں جو پہلے پیغمبروں نے کہی تھی، اور وہی بات کہی جارہی ہے کہ اگر نہیں مانو گے تو اللہ کا عذاب آئے گا، تو ماقبل کے واقعات سے عبرت حاصل کرو اور اس رسول کی بات پر یقین لاؤ، ورنہ جیسا حال اُن کا ہوا تھا ویسا ہی تمہارا ہوگا۔ اَلَمْ یَرَوْا: کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کتنی جماعتیں اِن سے پہلے ہلاک کردیں، اور وہ جماعتیں بھی معمولی نہیں تھیں، یہ نہیں کہ یہ تو بڑے بڑے وجود والے انسان ہیں اور وہ کوئی چیونٹیاں یا ٹڈیاں تھیں جن کو پاؤں کے نیچے مسل دیا گیا، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اُن کو اتنی قدرت دی گئی تھی جتنی قدرت اِن کو بھی نہیں ہے، عاد وثمود کو جس طرح سے جاہ وجلال حاصل تھا اس قسم کا جاہ وجلال اہلِ مکہ کو حاصل نہیں تھا، اور اسی طرح سے مادّی اسباب جو اُن کو حاصل تھے وہ مادّی اسباب اِن کو حاصل نہیں ہیں، بدنی قوت اور طاقت میں جس طرح سے وہ تھے ویسے یہ نہیں ہیں، ''ہم نے ان کو زمین میں ٹھکانا دیا تھا، قدرت دی تھی، جما دیا تھا اتنا کہ جتنا تمہیں نہیں جمایا، جتنا تمہیں قدرت نہیں دی'' وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا: اور ہم نے اُن کے اُوپر بادل بھیجے تھے بہت برسنے والے، ''اور ہم نے نہریں جاری کی تھیں اُن کے نیچے سے'' یعنی اُن کے باغات اور مکانوں کے نیچے سے نہریں بہتی تھیں جو خوشحالی کی علامت ہے، فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ: لیکن جب انہوں نے ذُنوب کو اختیار کیا، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی نافرمانی کی، تو وہ اُن کی مالی خوشحالی اور اُن کی وہ بدنی قوت اُن کو اللہ کے عذاب سے نجات نہ دلاسکی، ہم نے اُن سب کو ہلاک کردیا، وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ: اور اُن کے جانے کے بعد ہماری زمین کوئی ویران بھی نہیں ہوگئی، وہ گئے، ہم نے اور لوگ آباد کردیئے، اور یہ بات بھی آنکھوں کے سامنے ہے، کتنے لوگ مرتے ہیں، لیکن زمین میں بے رونقی کہاں آتی ہے؟

ویرانی کہاں آتی ہے؟ تو جیسے مرتے جاتے ہیں ویسے اور پیدا ہوتے جاتے ہیں، اللہ کے خزانے میں کیا کمی ہے؟ اور اللہ کی زمین کے اندر ویرانی نہیں آتی، اگر ایک قوم گئی تو دوسری آ گئی، ''پیدا کر دیا ہم نے اُن کے بعد دوسرے لوگوں کو۔''

سوال کا جواب دینے کے متعلق بلاغت کا اُصول

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ: یہ اصل میں اُن کے بعض شبہات کا یا بعض مطالبات کا جواب ہے۔ جس وقت ایک مقرر سٹیج پر کھڑا ہوا تقریر کرتا ہے، تو اُس کی تقریر کے اندر بات دونوں طرح سے آیا کرتی ہے، کبھی مخالفین کا اعتراض پہلے نقل کر دیا جاتا ہے پھر اُس کا جواب دیا جاتا ہے، ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ پہلے سوال کرتے ہیں کہ دیکھو فلاں شخص کی طرف سے یہ سوال ہے، مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض ہے، اور ہماری طرف سے اُس کا یہ جواب ہے، کبھی تو اس کی اس طرح سے وضاحت کی جاتی ہے، اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ اس معاشرے کے اندر سوال چل رہا ہے، اعتراض کی ایک بات مشہور ہے، تو اُس سوال کو نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اعتراض کو دوہرانے کی ضرورت ہی نہیں، جس وقت مقرر اپنی طرف سے کسی بات کی وضاحت کرتا ہے تو لوگ سمجھتے جاتے ہیں کہ یہ فلاں سوال کا جواب دے دیا گیا، اس میں فلاں اعتراض کو اٹھا دیا گیا، تو ایک یہ انداز بھی ہوتا ہے، تو فصاحت بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ کبھی تو سوال کو دوہراتے ہیں اور سوال دوہرا کر پھر اُس کا جواب دیا جاتا ہے، اور کبھی اُس کی شہرت پر مدار رکھتے ہوئے جواب کی تقریر کر دیتے ہیں، اور سوال اس معاشرے کے اندر خود معلوم ہوتا ہے، اس لیے جواب کی تقریر سے ہم سوال کو سمجھیں گے۔

مشرکین کے سوالات کا رَدّ

اس زمانے میں جو قرآنِ کریم کے مخاطب تھے اُن کو سوال کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو جانتے تھے کہ لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، تو جس قسم کی باتیں کرتے ہیں ویسے قرآنِ کریم کے اندر اُس کی وضاحت آ گئی، مثلاً وہ یہ مطالبہ کرتے تھے، بعض مشرکوں نے یہ کہا کہ جی! ہم تو تب مانیں گے، کہ ہمارے سامنے آسمان پر جاؤ اور ہمارے نام کا رقعہ لے کر آؤ، جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ اللہ کی طرف سے فلاں کے نام، اور یہ میرا رسول ہے، اس کو مانو، اس پر ایمان لاؤ، اس قسم کی تحریر ہمارے سامنے لاؤ گے تب ہم مانیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ کہنے کو کہہ رہے ہیں، ورنہ اگر آپ کے اُوپر کاغذ میں لکھا ہوا مضمون بھی اُتار دیا جائے، پھر یہ نہیں کہ اِن کو دُور سے دکھایا جائے، بلکہ ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے، اور یہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کو چھو کر دیکھ بھی لیں کہ یہ حقیقت ہے، لیکن پھر بھی نہیں مانیں گے، اور کہیں گے یہ جادو ہے اور ہماری نظر بندی کر دی گئی، جب نہ ماننا ہو تو کہتے ہیں کہ ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' اسی طرح سے یہ لوگ بھی ہر بات پر اَڑ جاتے ہیں، یہ نہیں کہ صدق دل سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر ہماری یہ فرمائش پوری ہو جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے، ایسی بات نہیں ہے۔ اب ان کے اس سوال کو ان الفاظ کے تحت گویا کہ رَدّ کیا جا رہا ہے، ''اگر اتار دیں ہم آپ پر کوئی لکھا ہوا مضمون کاغذ میں'' فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ: پھر وہ چھو لیں اس کو اپنے ہاتھوں کے ساتھ تو بھی کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔

''اور وہ یوں بھی کہتے ہیں کہ اِس کے اُوپر فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے طور پر فرشتہ اس کے ساتھ ہوتا جو ہم بھی دیکھتے کہ دیکھو! یہ اللہ کا فرشتہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے، اور لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ یہ اللہ کا رسول ہے اس کو مان لو۔ اور یہ اس لیے کہتے تھے کہ جب اپنے آپ کو اللہ کا رسول قرار دیا جا رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنا سفیر کسی طرف بھیجے، اللہ اپنا رسول کسی طرف بھیجے تو اول تو اس کے ساتھ فوجوں کی فوجیں ہونی چاہئیں اُس کے اعزاز کے طور پر، اور یہ کیا بات ہے کہ دُنیا کا کوئی حاکم سفیر بھیجتا ہے کسی طرف، تو اُس کے اعزاز کے لیے اُس کے ساتھ خادم بھی بھیجے جاتے ہیں، اُس کی شان وشوکت بھی نمایاں کی جاتی ہے، اور اللہ جو مالک کائنات ہے اُس کا سفیر اور اُس کا رسول آیا اور گلیوں کوچوں کے اندر پتھر کھاتا پھر رہا ہے اور کوئی اُس کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ نہیں، اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ان کے ساتھ فرشتوں کی صفوں کی صفیں آنی چاہئیں تھیں، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں جمع کے صیغے کے ساتھ بھی آئے گا، کہ ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے صفیں باندھ کر کیوں نہیں آئے؟ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (سورۂ زخرف: ۵۳) کا لفظ کسی جگہ آئے گا، تو اس کا مفہوم اِسی قسم کا ہی ہے۔ تو وہ کہتے تھے کہ کوئی فرشتہ آتا جس کو ہم دیکھتے اور وہ ہمارے سامنے آکر اس قسم کی شہادت دیتا، '' کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتارا گیا اس پر فرشتہ'' لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا: اگر ہم فرشتہ اُتار دیتے جس طرح سے یہ مطالبہ کرتے ہیں، اور اگر کسی کو دِکھایا جائے پھر وہ نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِتمامِ حجت ہوجانے کے بعد پھر عمومی عذاب آجایا کرتا ہے، ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ: پھر یہ مہلت نہیں دیے جائیں گے۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا: اور اگر ہم اِس رسول کو فرشتہ بناتے، جیسے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ رسول فرشتہ ہونا چاہیے تھا، رسول بشر کیوں آیا، یہ بھی بہت ساری آیات کے اندر ذکر کیا گیا ہے، جیسے اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا (سورۂ تغابن: ۶) کیا ہماری ہدایت کے لیے کوئی بشر اتارا گیا ہے؟ تو بشر کو رسول بنا کر جو بھیجا گیا تو اِس پر بھی ان کو اعتراض تھا کہ اللہ نے اگر رسول بھیجنا ہی تھا تو کسی فرشتے کو بھیج دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ہم فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے تو پھر بھی دو حال سے خالی نہیں، اگر تو فرشتہ اصلی ہیئت میں آتا تو انسان اس کو دیکھ نہ سکتے، برداشت نہ کر سکتے، اس سے استفادہ نہ کر سکتے، پھر بھیجنے کا فائدہ کیا؟ اور اگر ہم اس کو اِنسانی شکل میں بھیجتے تاکہ انسانوں کے ساتھ وہ مانوس ہو اور ان کو تعلیم دے سکے تو پھر جو شبہ اب کر رہے ہیں وہی شبہ پھر پیدا ہوجاتا، اس لیے ماننے کو تو بشر رسول بھی ٹھیک ہے، اور اگر نہیں ماننا تو اگر فرشتہ بھی آجائے تو اس ماننے کے لیے بھی یہ لوگ ایسے ہی شبہات پیدا کرتے، ''اگر ہم اس رسول کو مَلَک بنادیتے تو بھی ہم اس کو رجل ہی بناتے'' یعنی یہ فرشتہ ہوتا تو بھی یہ انسانی شکل میں آتا، وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ: تو ہم خلط کردیتے ان کے اُوپر جس چیز کو یہ اپنے اُوپر خلط کر رہے ہیں، یعنی پھر بھی یہ اسی طرح سے شبہات میں پڑ جاتے جس طرح سے اب شبہات میں پڑے ہوئے ہیں۔

حضور ﷺ کو تسلی

آگے سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی ہے، یہ کہہ کر کہ یہ لوگ آج آپ کا مذاق اڑاتے ہیں، آخرت کی بات آپ کرتے ہیں تو یہ آگے سے ہنستے ہیں، عذاب کے آنے کی دھمکی دیتے ہیں تو اِستہزا کرتے ہیں، اس سے آپ گھبرائیے نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے

جو رسول بھی آئے ہیں اِن نادانوں نے ہر کسی کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہے وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ: آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا ہے، جب پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا ہے تو آپ بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جب اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو جیسا آپ کے ساتھیوں کے ساتھ ہوا وہی آپ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

انبیاء کی وراثت میں تکالیف کا سہنا بھی شامل ہے

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم آپ حضرات سے کہا کرتے ہیں کہ ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ''[1] یہ بات آپ اپنی فضیلت کے طور پر نقل کرتے ہیں کہ ہم انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، جہاں تو فضائل کی بات آتی ہے وہاں تو آپ جھٹ تیار ہو جاتے ہیں کہ واقعی ہم انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، فضائل اپنے اُوپر چسپاں کرنے کے لیے آپ بڑے دلیر ہوتے ہیں، لیکن آپ کو یہ نہیں معلوم کہ وراثت میں جس طرح سے مال ملا کرتا ہے، قرضہ اور ذمہ داریاں بھی ساتھ ہی آیا کرتی ہیں، یہ تو نہیں ہے کہ وارثت سنبھالنے کے لیے تو سارے تیار ہو جاؤ اور قرضے کی اور ذمہ داریوں کی بات آئے تو کہو کہ کوئی اور بولو نہیں! جو جائیداد سنبھالے گا قرضہ بھی وہی ادا کرے گا، ذمہ داریاں بھی اُسی پر آئیں گی، تو اگر آپ لوگوں کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، تو انبیاء علیہم السلام والے حال کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہو، قوم انبیاء علیہم السلام کا استقبال نہیں کیا کرتی، مخالفین گالیاں بھی دیتے ہیں، مذاق بھی اُڑاتے ہیں، اِستہزا بھی کرتے ہیں، پتھر بھی مارتے ہیں، مخالفین کی طرف سے اس قسم کے برتاؤ کو دیکھ کر اِنسان یہ سمجھے کہ ہماری معاشرے میں عزت نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے منصب کو پہچانتا نہیں، جو لوگوں کی طرف سے اس قسم کے معاملات کو دیکھ کر کہے کہ ہماری معاشرے میں عزت نہیں، یوں سمجھو کہ وہ اپنے منصب سے غافل ہے، جو تمہارا منصب ہے وہ ان عوام کی نظر میں عزت دیکھنے کا نہیں ہے، عوام جن کی خواہشات کے ساتھ آپ ٹکرائیں گے، جن کے خیالات کی آپ تردید کریں گے وہ تو آپ کو بُرا بھلا ہی کہیں گے، وہ تو آپ کو گالیاں ہی دیں گے، اِستہزا ہی کریں گے، مذاق ہی اُڑائیں گے، آپ اُن کے سامنے کوئی باقدر یا باعزت بننے کے لیے نہیں آئے، آپ کا منصب ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نمائندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کی قدر و قیمت ہے، جو شخص ایمانِ صحیح کا حامل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی تعلیمات سے واقف ہوگا وہ یقیناً آپ کی عزت کرے گا، ورنہ جو بھی اللہ کے نافرمان ہیں اُن کے ساتھ آپ کا ٹکراؤ ہوگا تو ٹکراؤ ہونے کے ساتھ پتھر بھی کھانے پڑیں گے، گالیاں بھی سُنی پڑیں گی اور اِستہزا بھی سننا پڑے گا، اور اگر لوگوں کے اِستہزا سے ڈرنا ہو اور اُن کی گالیوں سے گھبرانا ہو تو پھر اس جماعت سے تعلق نہیں رکھا جا سکتا، یہ تو جماعت ہی ایسی ہے کہ اس کا ٹکراؤ چونکہ جاہلوں کے ساتھ، بددینوں کے ساتھ، بددماغوں کے ساتھ ہوتا ہے، تو اُن کی طرف سے کسی خیر کی توقع نہیں ہوتی، گالیاں اور مذاق ہی سننے پڑتے ہیں، جیسے کہ ہمارے شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں ۔

یا مکن با پیل باناں دوستی یا بنا کن خانۂ درخورِ پیل

(۱) سنن الترمذی ۹۷/۲، باب ماجاء فی فضل الفقه /مشکوٰۃ ۳۴/۱، کتاب العلم، فصل ثانی، عن کثیر بن قیس/ولفظ الحدیث: إنّ العلماء ورثة الانبیاء۔

کہ یا تو ہاتھی والوں سے یاری نہ لگایا کرو، اور اگر ہاتھیوں والوں سے یاری لگائی ہے تو گھروں کے دروازے اُونچے اُونچے بنایا کرو کیونکہ جب وہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر آئیں گے تو کم از کم اندر گزرنے کی گنجائش تو ہو، (گلستان باب ۸ کا تقریباً آخر)۔

پنجابی میں محاورہ ہے کہ ''اٹھاں والیاں نال یاری لا کے دروازے چھوٹے نہیں رکھی دے'' اُس کا بھی یہی معنی ہے کہ جس جماعت کے ساتھ انسان تعلق قائم کرتا ہے، تو پھر اُس کے تقاضے بھی پورے کیے جاتے ہیں، تو جب قرآنِ کریم نص قطعی کے طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ جاہلوں کی طرف سے، کافروں کی طرف سے، مشرکوں کی طرف سے، بدعتیوں کی طرف سے، بددینوں کی طرف سے ہمیشہ رسولوں کا مذاق اُڑایا گیا، اور اپنے رسول کو تسلی یہی دیتا ہے کہ جس جماعت سے تم تعلق رکھتے ہو اس کے ساتھ تو ایسے ہی ہوتا ہے، تو پھر آپ اگر اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کے وارث سمجھتے ہیں تو پھر ان جاہلوں کے مذاق اُڑانے سے، استہزا کرنے سے، یا اُن کی طرف سے بُرا بھلا کہنے سے آپ کیوں گھبراتے ہیں؟ یہ تو آپ کو وراثت میں ملی ہوئی چیز ہے، اور یہ علامت ہے کہ آپ کا نسب صحیح ہے اور آپ کا تعلق اس جماعت کے ساتھ صحیح ہے، ان بددینوں کی خواہش کے مطابق چلنے لگ جاؤ تو پھر کون تمہارا مذاق اُڑائے گا، ان کے ساتھ مل کے اسی قسم کی رُسوم کے اندر مبتلا ہو جاؤ، اُسی قسم کی بددینی اختیار کر لو تو پھر کون تمہارا مذاق اُڑائے گا؟ یہ جاہلوں کے ساتھ ذہنی طور پر ٹکراؤ ہے، بددینوں کے ساتھ آپ کا ٹکراؤ ہے، تبھی تو وہ گالیاں دیتے ہیں اور مذاق اُڑاتے ہیں، یہ تو آپ کے نسب نامے کے صحیح ہونے کی علامت ہے۔ تو یہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ اسی طرح سے تسلی دیتے ہیں کہ آپ سے پہلے جو رسول آئے اُن کے ساتھ بھی اسی طرح سے ہنسی کی گئی۔

مستہزئین کے لئے وعید

لیکن اس ہنسی کا نتیجہ رسولوں کے حق میں اچھا نکلا، ہنسی کرنے والوں کے حق میں بُرا نکلا، تو یہ جو ہنستے ہیں یہ عنقریب اسی طرح سے عذاب کا نشانہ بنیں گے جس طرح سے کہ پہلے لوگ بنے۔ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ: گھیر لیا ان لوگوں کو جنہوں نے رسولوں سے تمسخر کیا تھا، کس چیز نے گھیر لیا؟ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ جس چیز کا وہ استہزا کیا کرتے تھے اس نے گھیر لیا، استہزا تو ہوتا تھا رسولوں کا لیکن عذاب کی خبروں کی بنا پر، تو اصل کے اعتبار سے استہزا عذاب کا تھا، اللہ کی طرف سے عذاب آنے کی اطلاع کا استہزا تھا، یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نبیوں کا مذاق اُڑایا گیا اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں نبیوں کی اس بات کا مذاق اُڑایا گیا جو وہ کہتے تھے کہ اللہ کی طرف سے عذاب آ جائے گا، یوں ہو جائے گا، ووں ہو جائے گا، اس لیے یہاں مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ سے عذاب مراد ہے، جس چیز کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے اُس چیز نے گھیر لیا اُن لوگوں کو جو کہ انبیاء علیہم السلام سے تمسخر کرتے تھے، جو تمسخر کرتے تھے۔ اس بات کا یقین اگر تمہیں نہیں آتا تو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ: انہیں کہہ دیجئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو، پھر غور کر لو، دیکھ لو، کہ کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا، یہ کھنڈرات آپ کے سامنے جو پڑے ہیں، یہ بستیاں جو برباد ہوئی ہوئی ہیں، ان کی تاریخ کو کریدو اور ان کے حالات کو معلوم کرو، تو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کا مذاق اُڑانے کی بنا پر،

دین کے ساتھ استہزا کرنے کی بنا پر یہ لوگ تباہ ہوئے ہیں، تو یہ واقعات ہماری اس بات کی تصدیق آپ کو مبینہ طور پر مہیا کر دیں گے جو ہم کہتے ہیں کہ استہزا کرنے والوں پر بربادی آتی ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ

آپ کہہ دیجئے! کس کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، آپ کہہ دیں اللہ ہی کے لئے ہے، لکھ لیا اُس اللہ نے اپنے نفس پر رحمت کو،

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

البتہ ضرور اکٹھا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

پس وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲﴾ اُسی کے لئے ہیں رات اور دن میں سکونت اختیار کرنے والی چیزیں، اور وہ سننے والا ہے علم رکھنے والا ہے ﴿۱۳﴾

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ

آپ کہہ دیجئے! کہ کیا اللہ کے غیر کو میں کارساز بناؤں؟ ایسا اللہ جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو، اور وہ کھلاتا ہے

وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ

اور کھلایا نہیں جاتا، آپ کہہ دیجئے! کہ بیشک میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں ہو جاؤں اسلام لانے والوں میں سے اوّل، اور ہرگز تو نہ ہو

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ

مشرکین میں سے ﴿۱۴﴾ آپ کہہ دیجئے! کہ میں اندیشہ کرتا ہوں اگر میں نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی بڑے دن کے

عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ

عذاب کا ﴿۱۵﴾ جس شخص سے وہ عذاب دُور پھیر دیا گیا اس دن پس تحقیق اللہ نے اس کے اُوپر رحم کیا، اور یہ واضح

الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ

کامیابی ہے ﴿۱۶﴾ اگر اللہ تعالیٰ پہنچادے تجھے کوئی تکلیف پس کوئی شخص اُس تکلیف کو دُور کرنے والا نہیں سوائے اس کے،

وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ

اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچادے تو بھی وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (۱۷) وہ اپنے بندوں پر

فَوْقَ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿١٨﴾ قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ

غالب ہے، اور وہ حکمت والا ہے اور خبر رکھنے والا ہے (۱۸) آپ کہہ دیجیے! کہ کون سی شی زیادہ بڑی ہے از روئے گواہ بننے کے؟

قُلِ اللَّهُ ۖ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ

آپ خود ہی کہہ دیجیے کہ اللہ گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان، اور میری طرف وحی کیا گیا ہے یہ قرآن تاکہ میں تمہیں ڈراؤں

بِهِ وَمَنْ بَلَغَ ۚ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ ۚ قُلْ

اس قرآن کے ذریعے سے اور (ڈراؤں) ان سب کو جن کو یہ قرآن پہنچے، کیا بیشک تم البتہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہیں؟ آپ کہہ دیجیے

لَا أَشْهَدُ ۚ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿١٩﴾

کہ میں تو گواہی نہیں دوں گا، آپ کہہ دیں کہ سوائے اس کے نہیں کہ وہ ایک ہی معبود ہے، اور بیشک میں لاتعلق ہوں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو (۱۹)

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ ۘ الَّذِينَ

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی پہچانتے ہیں وہ اس کو جس طرح سے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، وہ لوگ جنہوں

خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ

نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا پس وہ ایمان نہیں لائیں گے (۲۰) کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ پر

عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢١﴾ وَيَوْمَ

جھوٹ گھڑا یا اُس کی آیات کو جھٹلایا، بیشک بات یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے (۲۱) اور جس دن کہ

نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ

ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر کہیں گے ہم ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے شرک کیا، کہاں چلے گئے تمہارے وہ شرکاء جن کو تم

كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا

شرکاء سمجھا کرتے تھے (۲۲) پھر نہیں ہوگا اُن کی گمراہی کا انجام مگر یہی کہ وہ کہیں گے کہ قسم ہے اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے

مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝۲۳ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ

ہم شرک کرنے والے نہیں تھے ۝۲۳ دیکھو تو، کیسے جھوٹ بولتے ہیں اپنے آپ پر، اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ باتیں

مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۲۴ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى

جو گھڑا کرتے تھے ۝۲۴ ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، ہم نے ان کے دلوں کے

قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ

اُوپر پردے ڈال دیے تاکہ یہ اس قرآن کو نہ سمجھیں، اور ان کے کانوں کے اندر بھی بوجھ ہے، اگر یہ لوگ دیکھ لیں ہر قسم کی

اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ

نشانی تو نہیں ایمان لائیں گے اس نشانی کے ساتھ، حتّٰی کہ جس وقت آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں،

كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۲۵ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ

کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں ۝۲۵ اور یہ لوگ قرآنِ کریم سے روکتے ہیں

وَيَنْــَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۶ وَلَوْ

اور اس سے دُور ہٹتے ہیں، نہیں ہلاکت میں ڈالتے وہ مگر اپنے آپ کو اور وہ نہیں سمجھتے ۝۲۶ اگر

تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ

دیکھے تو جبکہ وہ ٹھہرائے جائیں گے آگ پر، پھر یہ کہیں گے ہائے کاش! ہم لوٹا دیئے جائیں اور ہم اپنے ربّ کی

رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۷ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ

آیات کو نہ جھٹلائیں اور ہو جائیں ہم ایمان لانے والوں میں سے ۝۲۷ بلکہ ظاہر ہوگئیں ان کے لئے وہ باتیں جن کو چھپایا کرتے تھے اس سے

مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۲۸

قبل، اور اگر یہ واپس لوٹا دیئے جائیں البتہ لوٹیں گے اسی بات کی طرف جس سے ان کو روکا گیا، اور بیشک یہ البتہ جھوٹ بولنے والے ہیں ۝۲۸

وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝۲۹ وَلَوْ

اور یہ کہتے ہیں نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، اور نہیں ہیں ہم اُٹھائے ہوئے ۝۲۹ اگر تُو

تَرٰىٓ اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى
دیکھے جبکہ وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے رَبّ کے سامنے، اللہ تعالیٰ کہے گا کیا یہ حق نہیں؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں!
وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ
ہمارے رَبّ کی قسم، اللہ کہے گا چکھو تم عذاب بسبب تمہارے کُفر کرنے کے ﴿۳۰﴾ تحقیق خسارے میں پڑ گئے
كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا
وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، حتّٰی کہ جب اُن کے پاس قیامت اچانک آ جائے گی، کہیں گے کہ ہائے ہمارا افسوس!
عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا
ہمارے کوتاہی کرنے پر اس قیامت کے بارے میں، اور وہ اُٹھائیں گے اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر، خبردار!
سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ
بُری ہے وہ چیز جس کو یہ اُٹھاتے ہیں ﴿۳۱﴾ نہیں ہے دُنیوی زندگی مگر کھیل کود، البتہ پچھلا گھر
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾
بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو کہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿۳۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ: آپ کہہ دیجئے، جس میں یہ مفہوم بھی ہوتا ہے کہ آپ سوال کر لیجئے پوچھ لیجئے لِمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کس کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ لام ملکیت کا ہے، یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے یہ کس کی ملکیت ہے؟ آپ پوچھ لیں، قُلْ لِّلّٰهِ: یہ قُلْ بطور جواب کے ہے، کہ آپ خود ہی کہہ دیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے، کیونکہ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب متعین ہے، اس لیے مخاطبین کی طرف سے جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں، جو بات قائل اور اس کے مخاطب کے درمیان متفق علیہ ہوتی ہے تو اس کو ادا کرنے کا یہی دستور ہوتا ہے، کہ انسان خود سوال اُٹھاتا ہے اور پھر خود ہی جواب بھی ذکر کر دیتا ہے کہ یہی بات ہے نا؟ مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ بات ایسی ہے کہ جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں، تو جواب کے طور پر آپ ہی کہہ دیجئے، لِلّٰهِ: یہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے، كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: لکھ لیا اس اللہ نے اپنے نفس پر رحمت کو، اپنے نفس پر رحمت کرنے کو لازم کر لیا، رحمت مصدر ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اپنی مخلوق پر، اپنی مخلوق پر رحم کرنے کو اللہ نے اپنی ذات پر لازم کر لیا، لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِلٰى فی کے معنی میں ہے۔ البتہ ضرور اکٹھا کرے گا اللہ تعالیٰ

تمہیں قیامت کے دِن، لَا رَیْبَ فِیْہِ: جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، کوئی تر دّد نہیں، اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَہُمْ: وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا، فَہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ: پس وہ ایمان نہیں لاتے، وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَ النَّہَارِ: سَکَنَ کا لفظ اگر سکون سے لیا جائے تو پھر لیل ونہار کی مناسبت سے ایک لفظ اس کے بالمقابل محذوف نکالنا پڑے گا، معنی یوں بن جائے گا وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَمَا تَحَرَّکَ فِی النَّہَارِ: اسی کے لئے ہے جو چیز رات کو سکون پکڑتی ہے اور جو چیز دِن کو ہلتی جلتی ہے، متحرک ہوتی ہے، دِن کو ہلنے جلنے والی چیزیں اور رات کو ساکن ہونے والی چیزیں سب اسی کے لئے ہی ہیں، یہ تو تب ہے کہ جب سَکَنَ کو سکون سے لیں، اور اگر سَکَنَ کو سُکنٰی سے لے لیں، رہنے والی چیز، ساکن رہنے والی چیز کو بھی کہتے ہیں، ساکن متحرک کے مقابلے میں بھی آتا ہے، اور ساکن سُکنٰی سے لیا جائے تو سکونت اختیار کرنے والا، رہنے والا۔ تو پھر کوئی لفظ نکالنے کی ضرورت نہیں، پھر معنی یوں ہو جائے گا کہ ''رات اور دِن میں ٹھہرنے والی چیزیں، سکونت اختیار کرنے والی چیزیں اسی کے لئے ہی ہیں'' وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: اور وہ سننے والا ہے علم رکھنے والا ہے۔ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا: ولی: وَلِیَ یَلِیْ قریب ہونے کو کہتے ہیں، اور ولی دوست کو بھی کہتے ہیں، ولی مددگار اور متولّی اُمور کو بھی کہتے ہیں، اور یہاں متولّی اُمور والا ہی معنی ہے، مددگار اور متولّی اُمور۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے غیر کو میں کارساز بناؤں؟ اپنا متولّی اُمور بناؤں؟ اپنا مددگار اختیار کروں؟ ایسا اللہ جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو، وَھُوَ یُطْعِمُ: اور وہ کھلاتا ہے وَلَا یُطْعَمُ: اور کھلایا نہیں جاتا، اللہ دُوسروں کو طعام دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو طعام نہیں دیا جاتا، قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ: آپ کہہ دیجئے کہ بے شک میں حکم دیا گیا ہوں، مَنْ اَسْلَمَ: جو لوگ فرمانبردار ہیں ان میں سے میں پہلا ہو جاؤں، سب سے پہلے فرمانبردار ہو جاؤں، میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں ہو جاؤں اسلام لانے والوں میں سے اوّل، وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ: اور ہرگز نہ ہو تُو مشرکین میں سے۔ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ: آپ کہہ دیجئے کہ میں اندیشہ کرتا ہوں اگر میں نے اپنے رَبّ کی نافرمانی کی عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ: یہ اَخَافُ کا مفعول ہے۔ بڑے دِن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں، کہ بڑے دِن کا عذاب مجھے پالے گا، مَنْ یُّصْرَفْ عَنْہُ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَہٗ: وہ شخص کہ پھیر دیا وہ عذاب اس شخص سے، جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس شخص سے وہ عذاب دُور ہٹا دیا گیا، وہ شخص کہ پھیر دیا گیا وہ عذاب اس شخص سے یَوْمَئِذٍ: اس دن، فَقَدْ رَحِمَہٗ: پس تحقیق اللہ نے اس کے اوپر رحم کیا، وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ: اور یہ عذاب کا ہٹایا جانا اور اللہ تعالیٰ کا رحم فرمانا یہی فوزِ مبین ہے، واضح کامیابی ہے، جس پر اللہ رحم کردے اس کو واضح کامیابی حاصل ہوگئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس سے اُس دن کا عذاب ہٹا دیا گیا اس کو واضح کامیابی حاصل ہوگئی۔ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ: اگر اللہ تعالیٰ پہنچادے تجھے کوئی تکلیف۔ ضُرّ: نقصان، تکلیف۔ مَسّ یَمَسُّ: چھونا۔ آگے باءِ تعدیہ کی آگئی جس نے آکے اس میں متعدی والا معنی پیدا کردیا، پہنچانا۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی تکلیف پہنچادے فَلَا کَاشِفَ لَہٗ: پس کوئی شخص اس تکلیف کو کھولنے والا، دُور کرنے والا نہیں، اِلَّا ھُوَ: سوائے اس کے، اس کے سوا اس تکلیف کو کوئی ہٹانے والا نہیں، وَاِنْ یَّمْسَسْکَ بِخَیْرٍ: اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچادے فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: تو بھی وہ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے، تو جس کا مطلب ماقبل کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہوا کہ اگر وہ تجھے بھلائی پہنچادے تو اس کی بھلائی کو بھی کوئی روکنے والا نہیں، جیسے کہ سورۂ یونس کے آخر میں لفظ آئے گا فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِہٖ: اس کے فضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں، کہ اگر وہ تمہیں خیر پہنچائے تو اس کے فضل کو ردّ کرنے والا کوئی نہیں، وہ ہر چیز پہ

قدرت رکھنے والا ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ: قاہر کا لفظ قہر سے لیا گیا ہے، قہر کا معنی ہوتا ہے کسی دوسرے پہ غلبہ حاصل کر لینا، جس کے لیے آج کی اِصطلاح میں کنٹرول کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اور ''قہار'' اس کو کہتے ہیں جو ہر چیز کے اوپر غلبہ حاصل کر کے اس کو سنبھال لے، اس کے قبضے سے کوئی چیز باہر نکل نہ سکے، پوری طرح سے کنٹرول کر لے، یہی مفہوم ہے قاہر کا اور قہار کا، وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ: وہ اپنے بندوں پر قاہر ہے، غالب ہے، برتر ہے، اپنے تمام کے تمام بندوں کو پوری طرح سے کنٹرول میں کرنے والا ہے، سنبھالنے والا ہے، اس کے قبضۂ قدرت سے کوئی باہر نہیں، تمام بندوں کے اُوپر قبضہ اس کا ہے، قاہر کا یہ مفہوم ہے، جس طرح سے کسی چیز کو آپ مٹھی میں لے لیں اور دبا لیں تو گویا کہ اس کے اوپر آپ نے مکمل کنٹرول حاصل کر لیا، کہتے ہیں کہ فلاں چیز میری مٹھی میں ہے، تو فَوْقَ عِبَادِهٖ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اوپر اس طرح سے غالب ہے کہ پوری طرح سے ان کا کنٹرول سنبھال رکھا ہے، اس کے قبضے سے کوئی باہر نہیں، وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ: اور وہ حکمت والا ہے اور خبر رکھنے والا ہے۔ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً: آپ کہہ دیجئے کہ کون سی شئی زیادہ بڑی ہے از روئے گواہ بننے کے، گواہی کے اعتبار سے کون سی چیز بڑی ہے، یعنی کس چیز کی گواہی سب سے بڑی ہے کہ جس کی گواہی کے بعد اختلاف ختم ہو جانا چاہیے، آپ خود ہی کہہ دیجئے کہ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ: جس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑی شئ اَز رُوئے گواہی کے اللہ ہے، کہ اللہ کی شہادت ہو جانے کے بعد پھر کسی کی شہادت کی ضرورت نہیں، اور اللہ گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان، وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ: اور میری طرف وحی کیا گیا ہے یہ قرآن، لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ: تا کہ میں تمہیں ڈراؤں اس قرآن کے ذریعے سے، وَمَنْۢ بَلَغَ: اس کا عطف اُنْذِرَكُمْ کی كُمْ ضمیر پر ہے، ''تا کہ میں تمہیں ڈراؤں'' یہ اوّلین مخاطبین ہیں، ''اور تا کہ میں ڈراؤں ان سب کو جن تک یہ قرآن پہنچے'' اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ: کیا بے شک تم البتہ گواہی دیتے ہو کہ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى: کہ اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہیں؟ قُلْ: آپ کہہ دیجئے کہ لَّاۤ اَشْهَدُ: میں تو گواہی نہیں دُوں گا۔ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: آپ کہہ دیں کہ سوائے اس کے نہیں کہ وہ ایک ہی معبود ہے، وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ: اور بے شک میں لاتعلق ہوں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، جن چیزوں کو تم شریک ٹھہراتے ہو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، میں ان سے بَری ہوں لاتعلق ہوں، اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: وہ لوگ کہ جن کو ہم نے کتاب دی، يَعْرِفُوْنَهٗ: ہٗ ضمیر قرآنِ کریم کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے جس کا ذکر پیچھے آیا اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ، اور ''ہٗ'' ضمیر حامل قرآن کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، یعنی پیغمبر کی طرف، سرورِ کائنات ﷺ کی طرف، کیونکہ جس نے قرآنِ کریم کو پہچان لیا اس نے سرورِ کائنات ﷺ کی شخصیت کو پہچان لیا، اور جس نے حضور ﷺ کو شخصیت کو پہچان لیا اس نے قرآنِ کریم کو پہچان لیا، تو قرآنِ کریم کی معرفت اور اللہ کے رسول کی معرفت آپس میں لازم ملزوم ہیں، ایک کی معرفت دوسرے کی معرفت کو لازم ہے، اس لیے یہ ضمیر دونوں کی طرف لوٹ سکتی ہے۔ ''وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی پہچانتے ہیں وہ اس قرآن کو، یا پہچانتے ہیں وہ اِس نبی کو'' كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ: جس طرح سے اپنے بچّوں کو پہچانتے ہیں، اور معرفت یہ ظاہری آثار دیکھ کے کسی چیز کا علم حاصل کرنے کو کہتے ہیں، تو گویا کہ پہلی کتابوں میں حضور ﷺ کی جو علامات ذکر کی گئیں، یا آنے والی کتاب کے جو حالات ذکر کیے گئے اس کتاب کے سامنے آتے ہی یا اس پیغمبر کے سامنے آتے ہی وہ اہلِ کتاب ان کو اس طرح سے پہچانتے ہیں جس طرح سے مختلف بچّوں کے اندر اپنا بچّہ کھیل رہا ہو تو پہلی نظر میں انسان پہچان

لیتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، اس کو کوئی کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح سے یہ قرآن کو اور حاملِ قرآن کو پہچانتے ہیں، اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لیا، فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: پس وہ ایمان نہیں لائیں گے، وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا، اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ: یا اس کی آیات کو جھٹلایا، اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ: ''ہٗ'' ضمیر شان ہے۔ بیشک بات یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا: اور جس دن کہ ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، جمع کریں گے ہم ان سب کو اکٹھا کر کے، ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا: پھر کہیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا، اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ: کہاں چلے گئے تمہارے وہ شرکاء جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے، جن کے متعلق تمہارا زعم تھا، جن کے متعلق تمہارا خیال تھا کہ یہ اللہ کے شرکاء ہیں وہ کہاں چلے گئے؟ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ: فتنہ یہاں ضلالت گمراہی کے معنی میں ہے، اور مضاف یہاں محذوف ہے ثُمَّ لَمْ تَكُنْ عاقبةُ فِتْنَتِهِمْ۔ پھر نہیں ہوگا ان کی گمراہی کا انجام مگر یہی کہ وہ کہیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ: قسم ہے اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے، ہم شرک کرنے والے نہیں تھے، اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ: دیکھ تو، کیسے جھوٹ بولتے ہیں اپنے آپ پر، وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: اور گم ہو جائیں گی ان سے وہ باتیں جو گھڑا کرتے تھے، جس قسم کی باتیں گھڑا کرتے تھے وہ سب گم ہو جائیں گی، کوئی سامنے نہیں رہے گی۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ: ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف توجہ کرتے ہیں، متوجہ ہو کے کان لگاتے ہیں۔ استماع: کان لگا کر کسی کی بات سننا۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً: اَكِنَّةً کِنَان کی جمع ہے۔ ہم نے ان کے دلوں کے اوپر پردے ڈال دیے، اَنْ يَّفْقَهُوْهُ: لِئَلَّا يفقهوه، تا کہ یہ اس قرآن کو نہ سمجھیں، یا مطلب ہے کہ اُس قرآن کو سمجھنے سے ان کے قلوب کے اُوپر پردے ڈال دیے، وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا: وقر بوجھ کو کہتے ہیں، کانوں کے اندر جو ثقل پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے سماعت زائل ہو جاتی ہے۔ ''اور ان کے کانوں کے اندر بھی ثقل ہے، بوجھ ہے'' جس کا مفہوم ماقبل کے الفاظ کی طرف دیکھتے ہوئے یوں ہوگا کہ ہم نے ان کے کانوں کے اندر بھی بوجھ ڈال دیا تا کہ اِس کو سن نہ سکیں، یعنی جس طرح سے سننے کا حق ہے، سننا وہی معتبر ہے کہ جس کے بعد اس میں تدبر، تفکر کیا جائے، اور قابلِ قبول بات کو قبول کیا جائے، اور اگر کسی بات کو سن لیا جائے اور قبول نہ کیا جائے تو سننا نہ سننا برابر ہے، جیسے آپ کہتے ہیں ''سنی اَن سنی کر دی'' اس کا یہی معنی ہوتا ہے، کہ سن کر کسی بات سے متاثر نہ ہوئے تو ایسے ہو گئے جیسے سنا ہی نہیں۔ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ: اگر یہ لوگ دیکھ لیں ہر قسم کی نشانی لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا: نہیں ایمان لائیں گے اس نشانی کے ساتھ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ: حتیٰ کہ جس وقت آپ کے پاس آتے ہیں، يُجَادِلُوْنَكَ: آپ کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں، يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کی قصے کہانیاں۔ اساطیر اُسطورۃ کی جمع ہے، اُسطورہ کہا جاتا ہے ان باتوں کو جو لکھی لکھائی، سنی سنائی چلی آتی ہیں، جن کے اندر کوئی واقعیت نہیں ہوتی، جس کے لیے آج کل آپ سمجھ سکتے ہیں جیسے افسانے ہوتے ہیں، ناول ہوتے ہیں، کہ ایک آدمی اپنی ذہنی ساخت کے طور پر ایک واقعہ گھڑ لیتا ہے، گھڑ کے لکھ لیتا ہے، اور آگے اس کو نقل کرنے والے نقل کرتے رہتے ہیں، جیسے کہ واقعی کوئی یہ واقعہ پیش آیا ہے، تو یہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں یہ بھی پہلے لوگوں کی ایسے ہی قصے کہانیاں ہیں جو منقول چلے آرہے ہیں، جن میں

واقعیت کوئی نہیں، وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ: اور یہ لوگ قرآنِ کریم سے روکتے ہیں، وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ: اور اس سے دُور ہٹتے ہیں۔ نَئی يَنْئی۔ نَاٰ بِجَانِبِهٖ سورۂ اسراء میں آئے گا (آیت: ۸۳) اپنے پہلو کے ساتھ وہ دُور ہٹ جاتا ہے، اپنے پہلو کو پھیر لیتا ہے۔ تو يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ: دُور ہٹتے ہیں وہ اس قرآن سے، وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ: یہ ''اِن'' نافیہ ہے۔ نہیں ہلاک کرتے وہ مگر اپنی ہی جانوں کو، وَمَا يَشْعُرُوْنَ: اور وہ سمجھتے نہیں ہیں، ان کو معلوم نہیں، انہیں شعور نہیں ہے، جانتے نہیں، ''نہیں ہلاکت میں ڈالتے وہ مگر اپنے آپ کو اور وہ نہیں سمجھتے'' وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ: اگر دیکھے تو جبکہ وہ کھڑے کیے جائیں گے آگ پر، ٹھہرائے جائیں گے جہنّم کے کنارے پر فَقَالُوْا: پھر یہ کہیں گے: يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ: یہ تمنّا ہے۔ ہائے کاش! ہم لوٹا دیے جائیں، وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا: اور ہم اپنے رَبّ کی آیات کو نہ جھٹلائیں، وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور ہو جائیں ہم ایمان لانے والوں میں سے، بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ: بل کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو خواہش ظاہر کر رہے ہیں یہ بھی صدقِ دل سے نہیں، حالات کی مجبوری سے ہے، ''بلکہ ظاہر ہو گئیں ان کے لئے وہ باتیں جن کو چھپایا کرتے تھے اس سے قبل'' چھپاتے تھے یعنی انکار کے ساتھ تکذیب کے ساتھ اس کے اُوپر پردے ڈالتے تھے، ''جن باتوں کو یہ چھپاتے تھے، جن کے اُوپر پردے ڈالتے تھے، انکار اور اِستہزا کے تحت ان کو دبانے کی کوشش کرتے تھے، وہ باتیں ان کے لیے ظاہر ہو گئیں، بَدَا لَهُمْ: ظاہر ہو گئی ان کے لئے وہ باتیں جن کو اس سے قبل چھپایا کرتے تھے، وَلَوْ رُدُّوْا: اور اگر یہ واپس لوٹا دیے جائیں، لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ: البتہ لوٹیں گے اسی بات کی طرف جس سے اِن کو روکا گیا، وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اور بے شک یہ البتہ جھوٹ بولنے والے ہیں، اِس وقت بھی یہ جھوٹ بول رہے ہیں کہ کہتے ہیں وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: ہم اپنے رَبّ کی آیات کو جھٹلائیں گے نہیں، اور اس کی تصدیق کریں گے، مؤمنین میں سے ہو جائیں گے، یہ بھی اب غلط کہتے ہیں۔ وَقَالُوْٓا: اور یہ کہتے ہیں اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا: نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ: اور نہیں ہیں ہم اُٹھائے ہوئے۔ قَالُوْٓا کا عطف لَعَادُوْا پر بھی ہو سکتا ہے، پھر معنی یہ ہو جائے گا کہ اگر یہ دُنیا کی طرف لوٹا دیے جائیں تو جن باتوں سے ان کو روکا گیا ہے پھر یہ ادھر ہی لوٹیں گے اور کہیں گے کہ نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، یعنی سب کچھ دیکھنے جاننے کے باوجود پھر کہیں گے کہ بس یہ دُنیوی زندگی ہی حقیقت میں زندگی ہے، وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ: ہم اُٹھائے ہوئے نہیں ہیں، یعنی ہم مبعوث نہیں کیے جائیں گے۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ: اگر تو دیکھے جبکہ وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے رَبّ کے سامنے، قَالَ: اللہ تعالیٰ کہے گا، اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ: کیا یہ یوم القیامۃ، یہ مبعوث ہونا جس کا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ کے اندر انکار کرتے تھے، کیا یہ بعث حق نہیں؟ واقع کے مطابق نہیں؟ قَالُوْا بَلٰى: وہ کہیں گے کیوں نہیں، وَرَبِّنَا: ہمارے رَبّ کی قسم قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: اللہ تعالیٰ فرمائیں گے چکھو تم عذاب بسبب تمہارے کُفر کرنے کے، قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ: تحقیق خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً: حتیٰ کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آ جائے گی قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا: فَرَّطَ تفریط: کوتاہی کرنا۔ کہیں گے کہ ہائے ہمارا افسوس! ہائے حسرت! ہمارے کوتاہی کرنے پر اس قیامت کے بارے میں، اس قیامت کے بارے میں جو ہم نے کوتاہی کی اس پر ہائے افسوس!، وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ: اوزار وزر کی جمع ہے، وزر گناہ کے بوجھ کو کہتے ہیں۔ اور وہ اُٹھائیں گے اپنے بوجھ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ: اپنی پشتوں پر، یعنی نیک اعمال تو عاملین کے لیے سواری کا کام دیں گے، ان کے تو عمل ان کو

اُٹھائیں گے اور چلائیں گے، اور بدکرداروں کے عمل ان کے اُوپر بوجھ بن کے پڑ جائیں گے،'' اُٹھائیں گے یہ اپنے بوجھوں کو اپنی پشتوں پر'' اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ: خبردار! بُری ہے وہ چیز جس کو یہ اُٹھاتے ہیں۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ: نہیں ہے دُنیوی زندگی مگر کھیل کود، لَعِبَ کھیل کو کہتے ہیں۔ لَعِبَ يَلْعَبُ: کھیلنا۔ اور لہو غفلت میں پڑنے کو کہتے ہیں، تو لعب ولھو دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، جس طرح سے ہم ''کھیل کُود'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ''کھیل تماشا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ویسے لغوی حیثیت سے ان کا مفہوم یوں ہوا کرتا ہے کہ غیر مفید چیز کی طرف متوجہ ہونا جس کا انجام اچھا نکلنے والا نہیں یہ ''لعب'' ہے، اور غیر مفید چیز کی طرف متوجہ ہونے کی بنا پر جو ضروری چیزوں سے غفلت ہوجاتی ہے اس اعتبار سے ''لہو'' ہے، کیونکہ جب بھی انسان کسی بے کار کام میں لگے گا مثلاً تاش کھیلنے کے لئے بیٹھ گیا تو ایک غیر مفید چیز کی طرف متوجہ ہوگیا، تو یہ تو ''لعب'' ہوگیا، اس معنی کے اعتبار سے ان کا یہ کام ''لعب'' کا مصداق ہے، پھر جب اُدھر متوجہ ہو گئے تو اللہ کے ذِکر سے غفلت ہوگئی، نماز سے غفلت ہوگئی، دوسرے کاموں سے غفلت ہوگئی، تو اس اعتبار سے ان کا یہ فعل ''لہو'' ہے، تو حاصل دونوں کا ایک ہی ہے ''کھیل کُود''، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کا کوئی دیرپا نتیجہ نکلنے والا نہیں جو ان کے حق میں مفید ہو۔ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ: البتہ آخرت کا گھر، پچھلا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

مکی اور مدنی سورتوں کے اُسلوب میں فرق

سورت کی تمہید میں جس طرح سے آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا تھا، کہ یہ سورت مکی ہے اور مکی سورتوں کے اندر اَحکامِ عملیہ بہت کم بیان ہوئے ہیں، زیادہ تر ان کے اندر اُصول کی بحث ہے، اس لیے یہ سورتیں جو کہ مکہ معظمہ کے اندر اُتریں جن میں عقائد کی تلقین کی گئی ہے، اُصولِ دین کو مختلف انداز کے ساتھ سمجھایا گیا ہے، یہ ترجمہ اور تفسیر کے لحاظ سے انتہائی آسان سورتیں ہیں، مدنی سورتیں جن کے اندر اَحکام مذکور ہیں وہ ترجمے کے لحاظ سے آسان ہیں، لیکن تفسیر کے لحاظ سے مشکل ہیں، جیسے کہ سورۂ مائدہ کے اختتام تک آپ نے دیکھ لیا، اور آگے حصّہ آجائے گا مفصلات کا، وہ ترجمے کے لحاظ سے مشکل ہیں اور تفسیر کے لحاظ سے آسان ہیں، اور یہ درمیان والی سورتیں ترجمے کے لحاظ سے بھی آسان اور تفسیر کے لحاظ سے بھی آسان ہیں، ان میں توحید، رسالت، معاد اور اس کے متعلقات کو مختلف انداز کے ساتھ ذِکر کیا گیا ہے، اور بنیادی عقیدے یہی ہیں، مثلاً یہ جو رُکوع آپ کے سامنے پڑھے گئے ہیں، ان کے اندر زیادہ تر ذِکر اِثباتِ معاد کا ہے، اور اِثباتِ توحید بھی ہے، اور ردِّ شرک بھی ہے، مفہوم ان کا بالکل صاف صاف ہے۔

رَدِّ شرک کے لئے اللہ کی مالکیت کا ذِکر

پہلی آیت قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس میں ذِکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مالک المُلک ہے اور زمین آسمان کے اندر جو

کچھ ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کا ہے، اور اللہ کی مِلک ہے، اللہ اُس کا مالک ہے، سوال اگرچہ اُٹھایا گیا کہ پوچھ لیجئے کہ اس کا مالک کون ہے؟ لیکن جواب متعین ہے جس کی وجہ سے سوال کرنے والا خود ہی اس جواب کو ذکر کرسکتا ہے، اور آپ حضرات کی گفتگو میں اور محاورات میں ایسا انداز اختیار کیا جاتا ہے، کہ جب آپ کسی کے ساتھ کسی اختلافی مسئلے پر بات کرتے ہیں، اور ان میں کوئی بات اس قسم کی ہوتی ہے جو بالیقین مسلّم ہے آپ کے نزدیک بھی، تو انسان پہلے سوال اُٹھاتا ہے کہ یہ بات کس طرح سے ہے یہ بات کیسے بنتی ہے؟ پھر خود ہی اس کا جواب ذکر کردیا جاتا ہے، جب کہ اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، تو یہاں بھی اسی طرح سے اُن کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی جواب مذکور ہے، کہ یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ اس میں تو یہ بات آگئی کہ اللہ مالک ہے اور باقی جتنے بھی ہیں سارے کے سارے مملوک، جب اللہ مالک ہے اور سارے کے سارے مملوک ہیں تو زمین آسمان میں بسنے والوں میں سے تو کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس کو اللہ کے برابر ٹھہرایا جاسکے، یا اس کا شریک ٹھہرایا جاسکے، مملوک بھی کبھی کسی کی مِلک میں شریک ہوتا ہے؟

قیامت کا قائم ہونا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر رحم کرنے کو اپنے پر لازم کرلیا۔ بنیادی طور پر جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات کو بنانے کا ارادہ کیا تھا، حدیث شریف میں آتا ہے، تو ایک تحریر لکھ کر عرشِ معلیٰ پر رکھ لی تھی، اور اس میں یہی لکھا تھا: ''رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي''[1] میری رحمت میرے غضب پر سابق رہے گی، تو مخلوق کے ساتھ اس کا جتنا بھی معاملہ ہے اس میں رحمت سابق ہے، غضب کا ظہور بہت کم ہے اور رحمت کا ظہور صبح وشام ہے، اس لیے اب اس کی رحمت سے فائدہ اُٹھانا بندوں کا کام ہے، جو لوگ شرک سے توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کو ہی ساری کائنات کا مالک سمجھیں اور اس میں تصرف اسی کا ہی قرار دیں اُن کے اُوپر اللہ کی رحمت بارش کی طرح برستی ہے، اور دُنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کے ساتھ نوازتے ہیں، اور اس رحمت کا ہی تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کے بعد انسانوں کو بے کار نہیں چھوڑے گا، لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یہ اسی رحمت کا ہی تقاضا ہے، اس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے انسان مختلف قسم کے اعمال اختیار کرتے ہیں، جن میں باتفاقِ انسان، تمام کے تمام انسان اس بات پر متفق ہیں، کہ اِن اعمال کے اندر اچھے اور بُرے کی تقسیم ہے، چاہے کوئی مشرک ہے، چاہے کوئی کافر ہے، چاہے کسی مسلک سے تعلق رکھنے والا ہے، وہ اس اصل کے اُوپر متفق ہے کہ دُنیا کے اندر انسان جو کچھ کرتا ہے اس کی اچھے اور بُرے دو باتوں کی طرف تقسیم ہے، ہر کسی کے نزدیک بعض کام اچھے ہیں اور بعضے کام بُرے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء ﷺ کے ذریعے سے حقیقتاً اچھے کام اور حقیقتاً بُرے کام بھی بتلادیے، اب بعض ان کو اختیار کرتے ہیں بعض اختیار نہیں کرتے، اور اپنے عمل کے اندر بعض ظالم ہیں بعض مظلوم ہیں، اور بعض اللہ کے دین کی خاطر جہاد کرتے والے، کوشش کرنے والے ہیں، بعض عیاشی کے اندر اپنا وقت گزارنے والے ہیں، اب اگر لوگ اسی طرح سے مرتے جائیں، اور مرنے کے بعد ان کو کسی جگہ اکٹھا کرکے اچھے بُرے کی سزا اور جزا نہ دی

---

(1) بخاری ٢/١١٢٧ باب قول الله بل هو قرآن مجيد/مشكوٰة ٢/٥٠٦ باب بدء الخلق عن ابی هريرة. ان الله تعالیٰ كتب كتابا قبل أن يخلق الخلق الخ

جائے، اچھا کام کرنے والے کو جزا نہ دی جائے اور بُرا کام کرنے والے کو سزا نہ دی جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے اللہ کا نام لیا اور اللہ کے دین کے لیے محنت کی، اللہ کے اَحکام کی پابندی کی، اللہ کے راستے میں ماریں کھائیں، اُن کی ساری کی ساری کوشش بیکار چلی جائے گی؟ کیونکہ ظالم بھی مرگیا، مظلوم بھی مرگیا، اگر اس کے بعد کوئی دِن آنے والا نہیں کہ جب ظالم سے انتقام لیا جائے اور مظلوم کو بدلہ دلایا جائے، اگر ایسا کوئی دِن آنے والا نہیں تو مظلوم کے ساتھ اللہ نے کیا رحم کیا؟ پھر تو وہی شخص کامیاب ہے جس کی یہاں دُنیا کے اندر لاٹھی بھاری ہے، جس کا ڈنڈا کامیاب ہے پھر تو دُنیا میں وہی شخص کامیاب ہے، کہ جتنے دِن ہیں مار دھاڑ کرو، لوگوں کو لوٹو، کھاؤ پیو، عیاشی کرو، تو وہ شخص کامیاب زندگی گزار گیا، اور جو لٹ گئے، پٹ گئے، اور اللہ کے نام کی خاطر محنتیں برداشت کرتے رہے، فاقے برداشت کیے، بدنی تکلیفیں اُٹھائیں، یہ تو پھر ناکام رہ گئے، آخرت میں بھی کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا اور دُنیا کے اندر بھی ساری زندگی مار کھاتے ہوئے اور اسی طرح سے مجاہدے اور تکلیفیں اٹھاتے ہوئے گزار دی۔ اس لیے اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دن سب کو اکٹھا کرے گا، ظالموں کو سزا دینا یہ بھی اُس کی رحمت ہے، مظلوم کی حمایت کرنا یہ بھی اُس کی رحمت ہے، اور جن لوگوں نے اُس کی خاطر محنت کی ہے اور مشقتیں اُٹھائی ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ اچھا بدلہ دیں گے، یہ اُس کی رحمت کا تقاضا ہے۔ اور اگر اکٹھا نہ کیا جائے اور آخرت نہ لائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مخلوق میں سے ایک کثیر حصے کو پٹتا ہوا اور مظلوم چھوڑ دیا اور اُس کی کوئی کسی قسم کی مدد نہیں کی، تو یہ رحمت کا تقاضا ہے کہ قیامت آئے اور اس میں مظلوموں کو ظلم کا بدلہ دلایا جائے، اور ظالم کو سزا دی جائے، اور جنہوں نے اللہ کے اَحکام کو نہیں مانا انہیں سزا دی جائے، اور جنہوں نے اللہ کے نام پر محنت کی ہے اور اللہ کے اَحکام کو مانا ہے اُنہیں اچھا انجام دکھایا جائے، ''ضرور اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دِن میں'' لَا رَیْبَ فِیْهِ: جس کے آنے میں کوئی تردّد اور کوئی شک کی بات نہیں۔ دیکھو! توحید سے کلام منتقل ہوگئی معاد کی طرف، اور اس کلام کی یہی خاصیت ہے کہ اس میں علیحدہ علیحدہ موضوع بنا کر بات نہیں کی گئی کہ اب یہ توحید ذکر ہوگئی تو اس کے سارے متعلقات کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے، پھر آخرت آگئی تو اس کے سارے متعلقات کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے، اس طرح سے نہیں، بلکہ یہ ایسے انداز میں وعظ اور نصیحت اور تذکیر ہے کہ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے، کبھی توحید سے معاد کی طرف، کبھی معاد سے توحید کی طرف اور رَدِّ شرک کی طرف، اسی طرح سے یہاں توحید کا ذکر کرتے ہوئے جب قیامت کے دِن جمع کرنے کا ذکر آیا تو اس میں معاد کا ذِکر بھی آگیا، کہ اللہ تعالیٰ اٹھائے گا۔

اِیمان نہ لانے والے خسارے میں کیسے ہیں؟

''جن لوگوں نے اپنے آپ کو برباد کر دیا وہ نہیں مانتے'' فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ، گویا کہ ایمان نہ لانے والے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنے والے ہیں، خسارے میں کیوں ڈالنے والے ہیں؟ بات بالکل واضح ہے آیات کی روش کے ساتھ، ایمان نہیں لاتے، اُن کا یہ اعتقاد نہیں کہ مرنے کے بعد اُٹھنا ہے، اور اٹھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب وکتاب پیش کرنا ہے، جب اُن کا اعتقاد نہیں تو اُس کی تیاری کیا کریں گے؟ جب تیاری نہیں کریں گے تو اُن کو پھر آخرت میں کامیابی کہاں سے ملے گی؟ اپنے آپ کو

برباد کر بیٹھے، اپنے آپ کو سنوارنا اور بنانا انہی لوگوں کا کام ہے جن کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب پیش کرنا ہے، اپنے آپ کو برباد کرنے والے وہ ایمان نہیں لاتے، جو ایمان نہیں لاتے وہی اپنے آپ کو برباد کرنے والے ہیں، ''جن لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اللہ کی صفات کا ذِکر اور ردِّ شرک

آگے پھر وہی بات! اللہ تعالیٰ کی مالکیت کو نمایاں کرنے کے لیے، ''جو چیز رات میں ساکن ہے اور دن میں متحرک ہے وہ سب اسی کی ہے'' جیسے پیچھے تعمیم مکان کے اعتبار سے تھی کہ زمین و آسمان کی سب چیزیں اسی کے لیے ہیں، یہ تعمیم زمان کے اعتبار سے آگئی کہ رات دِن میں جو کچھ موجود ہے، جو ساکن متحرک ہے، سب پر ملکیت اللہ کی ہے، اور اللہ سمیع ہے علیم ہے، سمع کی صفت آگئی اور علم کی صفت آگئی کہ ہر ایک کی بات کو سنتا ہے اور ہر ایک کے احوال کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس طرح سے نمایاں کیا جائے، اِس میں بھی رَدِّ شرک کا پہلو ہے۔ قُلْ: آپ کہہ دیجئے کہ مالک تو ہو گیا وہ، اور ہر چیز اس کی مملوک ہے چاہے کسی جگہ ہو اور کسی وقت میں موجود ہو، تو کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کوئی اور کارساز بنالوں؟ اللہ کے علاوہ کوئی اور ولی اختیار کرلوں؟ حالانکہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ پیدا کرنے والا ہے آسمان کو اور زمین کو، اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ کھانے کو دیتا ہے اور خود کچھ نہیں کھاتا، اُسے نہیں کھلایا جاتا، وہ کھانے کا محتاج نہیں ہے، وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ: وہ خود محتاج نہیں ہے اور جو خود کھاتے ہیں اور کھانے کے لیے اپنے مُریدوں سے اور اپنے پیروں سے مانگتے ہیں، وہ بھلا دوسرے کی کارسازی کیا کریں گے؟ اللہ تعالیٰ دیتا ہے، اور کھلایا نہیں جاتا، کھلاتا ہے۔

حقیقی کامیابی کیا ہے؟

آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں ماننے والوں میں سے اوّل، جتنے بھی مسلم ہیں، فرمانبردار ہیں، اسلام اختیار کرنے والے ہیں ان میں سے اوّل ہو جاؤں، ہر لحاظ سے، مرتبے کے لحاظ سے بھی اوّل درجے کا مسلمان بن جاؤں، اور ترتیب کے لحاظ سے بھی سب سے پہلے مانوں، کیونکہ نبی کا کردار یہی ہوا کرتا ہے کہ جو کسی دوسرے کو کہے سب سے پہلے اس کے اُوپر خود عمل کرے، اگر لوگوں کو کہا جائے کہ تم مان جاؤ تو سب سے پہلے خود مانے، لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے فرمانبردار ہو جاؤ تو اوّل درجے کا فرمانبردار خود ہو، مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اے مخاطب! ہرگز نہ ہو تو شرک کرنے والوں میں سے، کیونکہ شرک کرنا یہ اسلام کے منافی ہے، اللہ کی توحید کے منافی ہے۔ آگے اپنے اُوپر بات رکھ کر دوسروں کو سنائی جارہی ہے کہ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ: اگر میں نے اپنے رَبّ کی نافرمانی کی اِنِّيْٓ اَخَافُ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: میں اندیشہ کرتا ہوں بڑے دِن کے عذاب کا، ''آپ کہہ دیجئے کہ میں اندیشہ کرتا ہوں بڑے دِن کے عذاب کا اگر میں اپنے رَبّ کی نافرمانی کروں'' تو نافرمانی ایک ایسی چیز ہے کہ مجھ سے بھی اگر صادر ہو جائے باوجود اس بات کے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تو میرے اُوپر بھی عذابِ عظیم اس دن میں آجائے گا، تو جو دوسرے لوگ ہیں جو نافرمانی کریں اُن کو بھی اسی طرح سے ڈرنا چاہیے۔ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ کے اندر پھر دیکھو! معاد کی طرف

اشارہ ہے۔ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ: جس شخص سے وہ عذاب اس دن اُٹھا دیا گیا، دور ہٹا دیا گیا، فَقَدْ رَحِمَهٗ پس تحقیق اللہ نے اُس کے اُوپر رحم کیا، اللہ کی رحمت ہے اس پر جس سے وہ عذاب ہٹادیا گیا' 'اور یہی بڑی کامیابی ہے'' ۔ تم نے دُنیا کے اندر گھوڑوں کا پالنا، جائیداد کا اکٹھا کرنا، اولاد اور بیوی کا حاصل کرنا، اِس کو کامیابی قرار دے رکھا ہے، یہ تو ایسے ہے جیسے انسان خواب دیکھتا ہے، حقیقت میں کامیابی یہ ہے کہ اُس دِن عذاب دُور ہٹا دیا جائے، اور اللہ کی رحمت انسان کو حاصل ہو جائے، بڑی کامیابی یہ ہے۔

عقیدۂ توحید کی وضاحت اور رَدِّ شرک

آگے پھر توحید کا ذِکر ہے، اور یہاں توحید کی بنیاد کو واضح کیا گیا ہے، اور شرک کی بنیاد کے اُوپر تیشہ چلا گیا ہے، اگر آپ مشرکین کے جذبات میں غور کریں گے، کہ یہ کسی کے دروازے پر جانے کی کیوں ضرورت محسوس کرتے ہیں، اور کسی کے سامنے جا کر کیوں ناک رگڑتے ہیں؟ تو آپ کو اس ضمن میں دو ہی باتیں ملیں گی، کہ یا یہ کسی نفع کی اُمید پر جایا کرتے ہیں، یا کسی تکلیف کو دُور ہٹانے کے لیے جاتے ہیں، کوئی بیمار ہے تو جا کر درخواستیں کرتا ہے کہ میری بیماری دُور کر دی جائے، اور اگر کسی کے پاس اولاد نہیں ہے تو اولاد حاصل کرنے کے لیے جا کر ماتھا ٹیکتا ہے اور درخواستیں کرتا ہے، اور اگر کسی شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ نفع نقصان کا مالک اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنا چاہے تو ساری کائنات اکٹھی ہو جائے، جن و اِنس جتنے ہیں سب کے سب اکٹھے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اگر کسی مصیبت مبتلا کر دے تو وہ مصیبت سے چھڑا نہیں سکتے، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کے اُوپر فضل کرنا چاہے تو اگر ساری مخلوق اکٹھی ہو کر اُس کو نقصان میں ڈالنا چاہے تو نقصان میں نہیں ڈال سکتی، اللہ کے فضل کو کوئی رَدّ نہیں کر سکتا، تو اگر نفع نقصان کا خزانہ سارے کا سارا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے نفع پہنچائے جس کو چاہے نقصان پہنچائے، کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی کو نفع پہنچا سکے یا کسی کو نقصان سے بچا سکے، تو پھر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے عاجزی ظاہر کرنے اور جھکنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

بظاہر آپ کو دُوسروں کی طرف سے نقصان اور نفع پہنچتا ہوا معلوم ہوتا ہے، لیکن اُس کی حقیقت بھی یہیں نمایاں کر دی گئی، کہ یونہی سمجھیے کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے، اگر اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں آپ کے متعلق اچھا خیال نہ ڈالتا تو وہ آپ کے لیے نفع کا ذریعہ نہ بنتا، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کے دل کے اندر آپ کے متعلق عداوت کے جذبات پیدا نہ کرتا تو وہ آپ کے لیے نقصان کا ذریعہ نہ بنتا، انسان کے اپنے دل کے اُوپر انسان کا اپنا اختیار نہیں چلتا، انسان کے دل کے اُوپر تصرف اللہ کا چلتا ہے، وہ چاہے جس کی محبت میں مبتلا کر دے، چاہے جس کی عداوت دل کے اندر ڈال دے، جس کی محبت میں مبتلا کر دے گا اُس کو آپ فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں گے، جس کی عداوت دل میں ڈال دے گا اُس کو آپ نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، تو حقیقت کے اعتبار سے یہ نفع نقصان بھی اللہ کی جانب سے ہے، اور اس مضمون کو بہت اچھے انداز کے ساتھ ہمارے شیخ حضرتِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ادا کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

گر گزندت رسد زِ خلق مرنج | کہ نہ راحت رسد زِ خلق نہ رنج

اگر مخلوق کی طرف سے تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو رنجیدہ نہ ہوا کر، کیونکہ مخلوق کی طرف سے نہ راحت پہنچا کرتی ہے نہ رنج پہنچا کرتا ہے۔

از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جان دشمن اور دوست کے خلاف کو، یعنی بظاہر تجھے تکلیف یا گزند دشمن سے پہنچی ہے، تو بھی یہی سمجھ کہ اللہ کی طرف سے آئی، اور بظاہر تجھے راحت دوست کی طرف سے ملی ہے تو بھی سمجھ کہ اللہ کی طرف سے آئی، کیونکہ دونوں کے دل اللہ کے قبضے میں ہیں، دشمن کا دِل تجھے نقصان پہنچانے کی طرف پھیر دیا تو وہ نقصان کا ذریعہ بن گیا، اور دوست کا دِل تجھے راحت پہنچانے کی طرف پھیر دیا تو وہ راحت کا ذریعہ بن گیا۔ آگے اُس کی ایک مثال دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ:

گرچہ تیر از کمان ہمی گزرد — از کماں دار بیند اہل خرد

کہ ظاہری طور پر اگرچہ تیر کمان سے نکل کر آیا ہے جو تمہیں لگا ہے، لیکن عقل منداُن ہاتھوں کو دیکھا کرتا ہے جو کمان کو چلانے والے ہیں، اگر ظاہری طور پر وہ تیر کمان سے نکل کر آیا ہے تو اِس زخم کی نسبت کمان کی طرف نہیں، تیر کی طرف نہیں ہے، بلکہ اُن ہاتھوں کی طرف ہے جنہوں نے اس کمان کو اور تیر کو سنبھال رکھا ہے، اسی طرح سے دوست، دشمن کی طرف سے اگر کوئی تکلیف راحت پہنچتی ہے تو اُس کو بھی یونہی سمجھو کہ اللہ کی جانب سے ہے، کیونکہ ان کے دِلوں کے اُوپر قبضہ اللہ کا ہے، (گلستاں، باب ۱، حکایت ۲۵)۔

یہ بہت بڑی بات ہے جو ان الفاظ کے ساتھ سمجھائی جارہی ہے، اگر کسی شخص کے قلب کے اندر یہ بات پیوست ہوجائے اور یہ عقیدہ راسخ ہوجائے تو پھر انسان اللہ کا محتاج ہوتا ہے باقی ساری کائنات سے مستغنی ہوتا ہے، پھر کسی کے سامنے اس کا دِل ڈرتا نہیں ہے، دبتا نہیں ہے، اگر دِل میں یہ بات مضبوطی سے آجائے کہ نفع نقصان کا مالک اللہ ہے، اور دُوسری جگہ حضرتِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو بیان فرماتے ہیں کہ:

موحد چہ در پائے ریزی زرش — چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

موحد کا حال یہ ہے کہ اس کے سامنے سونے کا ڈھیر لگا دو تو بھی اُس کو تم خیالات کے ساتھ بدل نہیں سکتے، خرید نہیں سکتے، اُس کے سَر کے اُوپر ہندی لوہے کی بنی ہوئی تلوار لے کر کھڑے ہوجاؤ، یہ دونوں باتیں اس کے لیے برابر ہیں۔

اُمید و ہراسش نہ باشد زِکس — بریں است بنیادِ توحید وبس

اُس کو نہ کسی سے اُمید ہوتی ہے، نہ خوف ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اسی بات پر ہے۔ تو جس شخص نے یہ سمجھ لیا کہ اُمید اور ہراس کسی کی طرف سے نہیں، توحید کی بنیاد یہی ہے، (گلستاں، باب ۸ کا آخر)۔

تو یہی میں نے جو عرض کیا کہ اس میں عقیدے کی بنیاد واضح کی جارہی ہے، جس سے انسان موحد بنتا ہے اور شرک سے بچتا ہے، وہ لفظ یہی ہیں کہ "اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی تکلیف پہنچادے تو اس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں سوائے اُس کے، اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی خیر پہنچادے تو اس کو روکنے والا کوئی نہیں" اللہ اس بات کے اُوپر بھی قادر ہے، بھلائی بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور نقصان

بھی اسی کے ہاتھ میں، ''اور وہی تمام بندوں کو سنبھالنے والا ہے'' سارے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، سب پر اُسی نے کنٹرول کررکھا ہے، وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ: اور وہ حکمت والا ہے اور خبر رکھنے والا ہے۔

حضور ﷺ کی رِسالت پر سب سے بڑی شہادت

اب یہ مسئلہ مختلف فیہ ہوگیا توحید و شرک کا، یا سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت و نبوّت کا کہ آپ رسول ہیں یا نہیں؟ یہ تینوں باتیں آپس میں ملتی جلتی سی ہیں، جو شخص سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا قائل ہوجائے گا وہ توحید کا قائل بھی ہوگیا اور آخرت کا قائل بھی ہوگیا، کیونکہ یہ باتیں جو کہ عالم غیب سے تعلق رکھتی ہیں وہ رسول کی زبان سے ہی واضح ہوتی ہیں، تو میں اللہ کا رسول ہوں یا نہیں، یہ تمہارے اور میرے درمیان مسئلہ مختلف فیہ ہے، تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ سب سے بڑی چیز از روئے گواہی کے کون سی ہے؟ کہ اگر وہ شہادت دے دے تو پھر اس کے بعد کسی کی شہادت کی ضرورت نہ رہے، اب یہ بات بالکل بیّن ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے عظمت والے ہیں، اور اگر وہ گواہی دے دیں تو اُس کی گواہی کے بعد کسی دوسرے کی گواہی کی ضرورت نہیں رہتی۔ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۚ قُلِ اللّٰهُ ۚ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ: یعنی اس مسئلے میں جو میرے اور تمہارے درمیان مختلف فیہ ہوگیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا نہیں، اس کا فیصلہ یوں کرلیجئے کہ تم یہ بتاؤ کہ گواہی کے اعتبار سے، شہادت کے اعتبار سے سب سے بڑا کون ہے؟ اب یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اللہ کی شہادت سب پر بھاری ہے، اللہ کی گواہی کے بعد کسی کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں، اور اللہ نے گواہی دے دی میری نبوت کی، وہ گواہی کس طرح سے دے دی؟ یہ قرآن کریم اتار کر، اور یہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے اس کی کیا دلیل؟ اس کی دلیل وہی کہ اس کلام کی مثل جب تم نہیں لاسکتے تو یہ دلیل ہے کہ یہ کتاب اللہ کی ہے اور یہ کلام اللہ کی ہے، اور اس کلام کو میرے اُوپر اُتار کر اللہ تعالیٰ نے ثابت کردیا کہ میں اُس کا فرستادہ ہوں، اس کے بعد مسئلہ ختم ہوجانا چاہیے، تو سرورِ کائنات ﷺ کی نبوّت پر اِتفاق ہوجانے کے بعد پھر توحید اور معاد کے اندر اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی لیے آگے جا کے اہلِ کتاب کی معرفت کو بھی بطورِ حوالے کے ذکر کیا گیا ہے، کہ اہلِ کتاب میں سے جو منصف ہیں وہی بھی تمہیں بتادیں گے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور جو نہیں بتاتے اُن کے متعلق دوسری جگہ آئے گا کہ یہ ظالم ہیں کتمانِ حق کرتے ہیں، چنانچہ ان میں جو منصف مزاج تھے، نیک تھے، صالح تھے، جو دُنیا کی محبت کے اندر مبتلا نہیں تھے، چاہے وہ انجیل والوں میں سے ہیں، چاہے وہ توراۃ والوں میں سے ہیں، جن میں سے بھی ہوں، اہلِ کتابین، نصاریٰ ہوں یا یہودی ہوں، دونوں میں سے جو بھی انصاف والے تھے، جب اُن کے سامنے اس کتاب کا تذکرہ آیا تو انہوں نے اس کتاب کو بھی تسلیم کیا، اور جب اُن کے سامنے سرورِ کائنات ﷺ کا ذکر آیا تو انہوں نے آپ کی نبوّت کی گواہی بھی دی، نجاشی انجیل والوں میں سے ہے، عیسائیوں میں سے، اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور اُن کے رُفقاء یہود میں سے ہیں۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اللہ گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان'' اور اللہ تعالیٰ کی گواہی اس طرح سے نمایاں ہوئی کہ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ: وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن تاکہ میں تمہیں ڈراؤں اس کے ذریعے سے اور ہر اس شخص کو ڈراؤں جس کو یہ قرآن پہنچے، جہاں تک بھی یہ آواز جائے سب میرے مخاطب ہیں۔

مشرکین کا دعویٰ بلا دلیل ہے

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى: کیا تم اس بات پر گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہیں؟ اب شہادت تو مبنی ہوا کرتی ہے علم یقینی پر یا مشاہدے پر، اپنی آنکھوں سے دیکھا حال انسان بیان کیا کرتا ہے، اور اگر آنکھوں سے دیکھا نہیں تو کوئی قطعی دلیل، عقلی دلیل، نقلی دلیل جس کے ساتھ انسان کے قلب میں یقین آجائے تو اس کی بنا پر گواہی دی جاسکتی ہے، اور اگر کسی نے کوئی مشاہدہ بھی نہیں کیا، اور اُس کے پاس عقلی نقلی دلیل کوئی ایسی قطعی بھی موجود نہیں جس کے اوپر یقین آجائے تو پھر شہادت اگر کوئی دیتا بھی ہے تو جھوٹ بولتا ہے، ہم کہتے ہیں ''أشهد أن لا إله إلا الله'' اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، ہم نے اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا کوئی دوسرا شریک نہیں، یہ بات ہمارے مشاہدے میں آنکھوں کے ساتھ دیکھنے میں نہیں آئی، ہم اس کو دلائل قطعیہ کے ساتھ جانتے ہیں، اللہ کے وجود کو بھی ہم جانتے ہیں یقین کے درجے میں، اور دلائل کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں، اس لیے ہم اس کو ''اَشْهَدُ'' کے لفظ کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور ایسے ہی ''أشهد أن محمدًا رسول الله'' ہم جو کہتے ہیں تو اس کو بھی ہم نے دلائل قطعیہ کے ساتھ جان لیا، یقین کے درجے میں بات آگئی، اب مشرکین اگر کسی کے متعلق قول کرتے ہیں کہ فلاں اللہ کا شریک ہے، نہ تو یہ مشاہدے کی بات ہے، اور نہ ان کے پاس عقلاً نقلاً اس کی کوئی واضح دلیل ہے، پھر وہ گواہی کس طرح سے دیں گے؟ اگر وہ کہیں کہ ہاں ہم گواہی دیتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تو گواہی دیتا نہیں، کیونکہ گواہی کی کوئی بنیاد ہی موجود نہیں ہے، یہی مطلب ہے اس کا، کہ ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود بھی ہیں؟ آپ کہہ دیجئے کہ میں تو گواہی نہیں دُوں گا'' یعنی اگر تم ڈھٹائی کے ساتھ آمادہ ہو ہی جاؤ کہ ہاں ہم شہادت دیتے ہیں تو میری طرف سے فیصلہ ہے میں تو گواہی نہیں دیتا، میں تو یہی اعلان کردوں گا کہ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ: کہ وہ معبود صرف ایک ہی ہے، معبودِ برحق اِلٰہِ واحد ہے، اور بے شک میں لاتعلق ہوں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔

رِسالتِ مصطفیٰ ﷺ پر اہلِ کتاب کی شہادت

آگے اہلِ کتاب کی شہادت کا ذِکر ہے، ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ پہچانتے ہیں اس قرآن کو جس طرح سے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو'' بیٹوں کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے چہرے کو دیکھ کر، مکھڑے کو دیکھ کر، ظاہری نقش ونگار اُن کی شکل کو دیکھ کر کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ ہمارا بچہ ہے، پرائے بچے پر اشتباہ نہیں ہوتا اپنا بچہ ہونے کا، جیسے بچوں کے اندر اگر اپنا لڑکا بھی کھیل رہا ہو تو دیکھتے ہی انسان پہچان جاتا ہے کہ یہ میرا ہے، اسی معرفت کو یہاں ذکر کیا گیا ہے، باقی! وہ حقیقت میں تمہارا ہے یا نہیں؟ وہ چیز زیر بحث نہیں ہے، ظاہری علامات کو دیکھ کر پہچاننا مقصود ہے، وہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی طرف جو ایک بات منسوب کی گئی ہے اس میں ایک قسم کا مبالغہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ تم اللہ کے رسول کو اس طرح سے پہچانتے ہو جیسے اپنے بچوں کو، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ وہ کہنے لگے کہ صحیح کیا بلکہ صحیح سے بھی زیادہ، ہم اس سے بھی زائد

یقین رکھتے ہیں، کہ اپنے بیٹے کے بارے میں تو مغالطہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارا ہے یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ ہم سمجھ رہے ہوں کہ ہمارا ہے لیکن حقیقت میں اس کی ماں نے خیانت کی ہو اور وہ ہمارا نہ ہو، لیکن اللہ کے اس رسول کے بارے میں ہمیں کسی قسم کا اشتباہ نہیں۔(۱) یہ زیادہ مبالغے کی بات ہے، ورنہ حقیقت پر بحث نہیں کہ حقیقت میں تمہارا بیٹا ہے یا نہیں؟ جن کو تم اپنا بیٹا سمجھتے ہو اگر وہ دوسرے بچوں کے اندر خلط ملط ہو جائے تو جیسے پہلی نظر میں تم پہچان لیتے ہو کہ یہ ہمارا بچہ ہے، اسی طرح سے اللہ کے رسول پر اتنی علامات نمایاں ہیں کہ کوئی اشتباہ کی بات ہی نہیں ہے، فوراً پہچانے جاتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ: جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا وہ ایمان نہیں لاتے، بار بار یہ بات ظاہر کی جاتی ہے کہ اللہ کی توحید پر ایمان نہ لانا، معاد کا اقرار نہ کرنا، اللہ کے رسول کی رسالت کو نہ ماننا یہ خسارے کا سودا ہے، یہ اپنے آپ کو برباد کرنے والی بات ہے، کیونکہ یہی عقیدے ہیں جو اِنسان کی زندگی کا رُخ سیدھا کرتے ہیں اور ان عقائد کی بنیاد پر ایسے اعمال کی توفیق ہوتی ہے جو آخرت میں جا کر انسان کے لیے مفید رہیں گے، دائمی زندگی میں باعثِ راحت ہوں گے، اور جب تک یہ عقائد اختیار نہ کیے جائیں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انسان آخرت کے لیے کوئی ایسا کام کرے جو اُس کے لیے مفید ہو، اس لیے خسارہ ہی خسارہ ہے۔ ''کون بڑا ظالم ہے اس سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟'' تم بے دلیل باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو تو تم مفتری، اور اگر میں بات کو اللہ کی طرف غلط منسوب کروں تو میں ظالم ''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ بیشک بات یہ ہے کہ ایسے ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔'' یہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے نہ دُنیا میں نہ آخرت میں۔

روزِ قیامت مشرکین کا حال

آگے پھر وہی معاد کا ذکر ہے کہ ''جس دِن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم کہیں گے اُن لوگوں کو جنہوں نے شریک ٹھہرائے تھے، اور اُن کو شفیع قرار دیا تھا کہ اللہ کے دربار میں اگر بالفرض جانا ہو گیا تو یہ چھڑا لیں گے، ہم پوچھیں گے کہاں چلے گئے وہ شرکاء جن کو تم شرکاء سمجھا کرتے تھے، میرے ساجھی بنا رکھے تھے وہ کہاں چلے گئے؟ یہ ''شرکاء'' کا لفظ اُن کے خیال کے مطابق استعمال کیا جا رہا ہے۔ پھر اُن کی گمراہی کا انجام سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا، کہ قسمیں کھا کھا کر اپنے عقیدے کا انکار کریں گے، کہیں گے قسم ہے اللہ کی، ہمارے پروردگار کی، ہم مشرک نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''دیکھو! کیسے جھوٹ بولیں گے اپنے آپ پر اور گم ہو جائیں گی اِن سے وہ سب باتیں جو بنایا کرتے تھے۔'' دُنیا کے اندر تو بڑے دلائل گھڑتے تھے، بڑے دعوے کرتے تھے، سب باتیں گم ہو جائیں گی، کوئی سامنے موجود نہیں رہے گی، سب ذہن سے نکل جائیں گی۔

کُفّار کی ضد اور اس کا اَنجام

وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ: ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، بظاہر بات سنتے ہیں لیکن چونکہ اُن

(۱) مظہری، آلوسی وغیرہ سورۂ بقرۃ آیت ۱۴۶ کے تحت۔

کی نیت ماننے کی نہیں ہے، بلکہ اس لیے کان لگاتے ہیں تاکہ آپ کی گفتگو میں کوئی اعتراض کی بات ہاتھ آجائے، اور اُس کے اُوپر پھر شور اُٹھایا جاسکے، اور جب کوئی شخص کسی کی تقریر میں اس نیت سے جا کر بیٹھے کہ میں نے اعتراض کی بات پکڑنی ہے، تو جو اچھی باتیں ہوں گی پھر وہ ایسے ہے جیسے کان میں آتی ہی نہیں، اُدھر توجہ ہی نہیں ہوتی، اُن کو انسان ٹالتا چلا جاتا ہے، اور اعتراض کی بات کو تلاش کرتا ہے، تو یہ بھی آپ کی مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں، آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، تو ان کا مقصد بھی کوئی اچھی باتیں سننا نہیں ہے، بلکہ اعتراض کی بات پکڑنا ہے، للہٰذا نہ یہ حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ کوئی اچھی بات ان کے کان میں آتی ہے۔ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ: اس قرآن کے سمجھنے سے ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، اور ان کے کانوں میں بوجھ ہے جس کی بنا پر یہ اچھی بات سن نہیں سکتے، وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ: اگر ہر قسم کی نشانی بھی دیکھ لیں تو بھی اُس پر ایمان نہیں لائیں گے، تو مطلب یہ ہوا کہ نہ آنکھوں سے متاثر، نہ کانوں سے متاثر، نہ دل سے سوچ سمجھ کے متاثر، ''حتیٰ کہ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑا کرتے ہیں، کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہیں یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں جو منقول چلی آرہی ہیں۔'' یعنی ان واقعات سے وہ متاثر نہیں ہوتے، بلکہ ان واقعات کو اتفاقی قرار دیتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ایسے ہی جوڑی ہوئی باتیں ہیں، ورنہ یہ کوئی بات نہیں کہ عقائد انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوں، کہ قوم برباد اس لیے ہوجائے کہ اُن کے عقیدے صحیح نہیں تھے یا اُن کا کردار صحیح نہیں تھا، اور کوئی قوم سرسبز و شاداب ان عقائد کی بنا پر ہوجائے، کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا، یہ بات سمجھ میں آنے کی نہیں ہے، اس لیے جو کچھ یہ کہا جارہا ہے کہ فلاں قوم کفر کی بنا پر ہلاک ہوگئی تھی، فلاں قوم بدکرداری کی بنا پر برباد ہوگئی تھی، کہتے ہیں کہ سب ایسے ہی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ: یہ لوگ اس قرآن سے روکتے ہیں وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ: اور اس سے دُور ہٹتے ہیں، اور نہیں ہلاکت میں ڈالتے یہ مگر اپنی ہی جانوں کو اور یہ سمجھتے نہیں۔'' یہ ویسی ہی بات ہے جیسے پیچھے ذکر کیا تھا کہ جو ایمان نہیں لاتے وہ اپنے آپ کو برباد کرنے والے ہیں، جو اپنے آپ کو برباد کرنے والے ہیں وہی ایمان نہیں لاتے، یہاں بھی یہی بات ہے کہ اس قسم کا انکار کر کے حقیقتاً اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں، اور ان کو شعور نہیں۔

جہنم کے کنارے پر کافروں کی جھوٹی آرزو

''اور اگر تو دیکھے جب یہ کھڑے کیے جائیں گے جہنم پر'' یہ پھر معاد کا ذکر آگیا کہ ''جب ان کو جہنم کے کنارے پر کھڑا کیا جائے گا، پھر کہیں گے کہ ہائے کاش! ہم واپس لوٹا دیے جائیں، اور اپنے رَبّ کی آیات کو نہ جھٹلائیں، اور ایمان لانے والوں میں سے ہو جائیں۔'' یعنی تصدیق کریں تکذیب نہ کریں، اُس وقت یہ آرزو کریں گے، اور ان کی یہ آرزو بھی کوئی حقیقت پر مبنی نہیں ہوگی، بلکہ مصیبت میں پھنس گئے ہیں اس لیے بول رہے ہیں۔ ''ظاہر ہوگئیں ان کے لئے وہ باتیں جن کو اس سے قبل وہ چھپایا کرتے تھے۔'' یعنی انکار کے پردے میں دبایا کرتے تھے، انکار کرتے تھے، استہزا کرتے تھے، وہ باتیں سب سامنے آگئیں۔ ''اور اگر یہ واپس لوٹا دیے جائیں'' تو جیسے ان کی فطرت ہے، جس قسم کے ان کے جذبات ہیں، جیسے یہ ضدی ہیں ''پھر بھی لوٹیں گے اسی بات کی طرف جس سے اُن کو روکا جائے، اور بے شک یہ البتہ اپنے قول میں جھوٹے ہیں۔'' اور یہ بات بھی کوئی بعید نہیں کہ آپ

کہیں کہ جب وہ جہنم دیکھ آئیں گے، اور ہر چیز اُن کے سامنے آجائے گی، پھر دُنیا کے اندر آ کے دوبارہ وہ حرکتیں کیسے کریں گے جس طرح سے پہلے کرتے ہیں؟ یہ بات کوئی بعید نہیں ہے، آپ کے سامنے روزمرہ کے واقعات ہیں، آپ اگر دیکھیں گے تو معلوم ہوجائے گا، ایک آدمی بیمار ہوجاتا ہے یا کسی مصیبت کے اندر مبتلا ہوجاتا ہے، پریشانی میں مبتلا ہوجاتا ہے، تو اُس کی کبھی باتیں سنا کرو، کہتا ہے: ''یااللہ! اب جان چھوڑ دے، آئندہ کے لیے میں بالکل پابندی سے نماز پڑھا کروں گا! اس مصیبت سے میں چھوٹ جاؤں تو پھر آئندہ کے لیے میں یوں کیا کروں گا!'' بڑے وعدے کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے، یہ بالکل اپنے کانوں کی سنی ہوئی باتیں ہیں، آپ بھی جس وقت دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ پریشانی میں پھنسا ہوا آدمی اس قسم بڑے وعدے کرتا ہے، کہ اب اگر نجات ہوگئی تو میں یوں کروں گا، ووں کروں گا، لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ چھوڑ دیتے ہیں تو اس کے بعد پھر جو پہلی فطرت ہے وہی پھر سامنے آجاتی ہے، کیے کرائے وعدے سب بھول جاتے ہیں، تو اسی طرح سے جنہوں نے بُری عادت ڈال لی وہ آنکھوں سے جہنم کو بھی دیکھ آئیں تو بھی گر انہوں نے نہیں ماننا تو نہیں ماننا، ''اگر لوٹا دیئے جائیں تو البتہ لوٹیں گے اسی بات کی طرف جس سے وہ روکے گئے، اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔'' اور پھر یہی بات ہی کہیں گے (جیسے میں نے عرض کردیا کہ قَالُوْٓا کا عطف لَعَادُوْا پر بھی ہوسکتا ہے) کہ جیسے اب ان کا دعویٰ ہے کہ بس دُنیا کی زندگی ہے، یہیں کھا پی لو، ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کہ دوبارہ دُنیا میں نہیں آنا، جتنی عیش کرنی ہے کرلو! جس طرح سے اب اِن کا دعویٰ ہے، اگر یہ لوٹ کر آجائیں تو بھی اسی طرح سے کہیں گے کہ نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، بس یہیں کھا پی لو جو کچھ کھانا ہے، وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ: ہم اُٹھائے نہیں جائیں گے، بعث نہیں ہوگا۔

قیامت کے دِن کُفّار کی بدحالی کا ذِکر اور اس کا مقصد

''اور اگر دیکھے تو جب کھڑے کیے جائیں گے اپنے رَبّ کے سامنے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ یہ بعث بعد الموت حق ہے یا نہیں؟'' دیکھو! تینوں عقیدے آپس میں کس طرح سے خلط ملط ہو کر آرہے ہیں توحید، رِسالت، معاد اور ردّ شرک، ''کیا یہ بعث بعد الموت حق ہے یا نہیں؟'' قَالُوْا بَلٰی: اُس وقت کہیں گے کیوں نہیں، وَرَبِّنَا: ہمارے رَبّ کی قسم! یہ تو بالکل واقعی بات ہے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: چکھو تم عذاب بسبب اس کے کہ تم کُفر کیا کرتے تھے، آنے والے واقعات کو اس طرح سے یقین کے انداز میں ذکر کیا جارہا ہے گویا کہ آنکھوں کے سامنے بات ہورہی ہے، تو کہا یہ جارہا ہے کہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے آج ہی قائل ہوجاؤ بعث بعد الموت کے، ورنہ جب یہ ڈنڈے لگیں گے اور چوتڑ کوٹے جائیں گے اس وقت پھر اقرار کرو گے بھی تو کیا فائدہ ہوگا؟ پھر اللہ کہے گا کہ دُنیا میں انکار کرتے رہے، اب جاؤ جہنم میں، چکھو عذاب۔ پھر وہی خسارے کا ذکر آگیا کہ جو ماننے والے نہیں وہی خسارے میں ہیں، کس طرح سے یہ بار بار تصور دلایا جارہا ہے کہ نفع اور کامیاب زندگی یہی ہے کہ ان عقائدِ حقہ کو اختیار کیا جائے، اور جو لوگ ان عقائدِ حقہ کو اختیار نہیں کرتے وہ حقیقت میں اپنے آپ کو بربادی میں ڈالے ہوئے ہیں، بار بار، بار بار یہی بات دُہرائی جارہی ہے ''تحقیق خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی

ملاقات کو جھٹلایا'' جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ سے ملاقات نہیں ہوگی وہ خسارے میں پڑ گئے۔ اور یہ اُن کا انکار یہ تکذیب دائم نہیں: ''حتیٰ کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آ جائے گی تو پھر کہیں گے کہ ہائے ہمارا افسوس! ہمارے کوتاہی کرنے پر اس قیامت کے بارے میں'' ہم نے جو اس کے بارے میں کوتاہی کی، کہ اس کے متعلق عقیدہ نہیں رکھا، اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو نہیں ڈھالا، اس پر بڑا افسوس۔ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ: جیسے میں نے ترجمے میں ذکر کیا کہ نیک آدمیوں کے لیے تو اُن کے نیک اعمال سواری کا کام دیں گے، اُن کے لیے سہارا بنیں گے، اور بدکردار جو ہیں وہ اپنے بُرے اعمال کو اپنی پشتوں کے اُوپر اُٹھائے ہوئے ہوں گے، حسی طور پر وہ عمل نمایاں ہوں گے، اور انسان کی گردن کے اُوپر چڑھے ہوئے ہوں گے، جیسے کہ حدیث شریف میں واضح واضح مثالیں ہیں، کہ اگر کسی نے مالِ غنیمت میں خیانت کرتے ہوئے اُونٹ چرالیا، تو قیامت کے میدان میں آئے گا تو اُونٹ اُس کی گردن پر چڑھا ہوا ہوگا، گھوڑا ہوگا تو گھوڑا اس کی گردن پر چڑھا ہوا ہوگا، اسی طرح سے جو چوری کی اور خیانت کی وہ ساری چیزیں نمایاں ہوں گی اور اُوپر سوار ہوں گی۔ زکوٰۃ نہ دینے والوں کے متعلق جس طرح سے آیا تھا، کہ اُن کو میدان میں لٹا کر اُن کے سارے جانوروں کو اُن کے اُوپر چڑھایا جائے گا، جو اس کے سینگ ماریں گے اور اس کو پاؤں کے نیچے روندیں گے، تو یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ کس طرح سے انہوں نے اپنے بوجھ اپنی پشتوں پہ اُٹھا رکھے ہیں، ''اُٹھائیں گے یہ اپنے گناہوں کے بوجھ اپنی پشتوں پر، خبردار! بُری ہے وہ چیز جس کو یہ اُٹھائیں گے۔''

یہ تو کہتے ہیں کہ دُنیوی زندگی ہی بس زندگی ہے، اس میں عیش کرلو جو بھی کرلو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے عقل ہیں ''دُنیوی زندگی تو کھیل تماشا ہے'' دُنیوی زندگی سے یہاں مراد ہے دُنیوی زندگی کے اعمال جو کہ دُنیا ہی کے لیے کیے جائیں، کیونکہ دُنیوی زندگی کے متعلق جو کام ہوں گے اسی نیت کے ساتھ کہ ہم نے اس سے دُنیا کا فائدہ اُٹھانا ہے وہی اعمال حیاتِ دُنیا ہے، اور اس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے آخرت کا تصور کر کے جو آخرت کے لیے نیکی کے کام کیے جاتے ہیں وہ اعمالِ دُنیا نہیں ہیں، اس لیے وہ کھیل تماشے کا مصداق بھی نہیں، دُنیوی زندگی یعنی دُنیوی زندگی کے کام جن کو انسان اسی دُنیوی زندگی کے لیے کرتا ہے، وہ تو ایسے ہے جیسے کھیل تماشا، وقتی طور پر دِل بہلایا اور تھوڑی دیر کے بعد کھیل ختم، جیسے بچے جب اکٹھے ہو جاتے ہیں تو مٹی کے گھر بناتے ہیں، بیٹھکیں بناتے ہیں، حویلیاں بناتے ہیں، قلعے بناتے ہیں، پتا نہیں کیا کچھ کیا کرتے ہیں، اور جس وقت جی بھر جاتا ہے اور کھیل کا وقت ختم ہو گیا تو پھر پاؤں کے ساتھ سب کو گراتے ہیں، اور پھر ساتھ زبان سے یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ''ہتھاں نال بنایا سی پیراں نال ڈھایا سی'' تھوڑی دیر کے بعد کھیل ختم، اسی طرح سے دُنیوی اعمال ایسے ہی ہیں، کہ سوائے کھیل تماشے کے ان کی کوئی حقیقت نہیں، ہاں البتہ اس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے آخرت کے لیے جو کام کیے جائیں وہ دُنیوی اعمال نہیں ہیں، وہ باقی رہنے والی چیزیں ہیں، وہ کھیل تماشا نہیں، وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ: پیچھے آنے والا گھر بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ

ہم ضرور جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو غم میں ڈالتی ہے وہ بات جو یہ لوگ کہتے ہیں، پس بے شک یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے

الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ

لیکن ظالم لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں﴿۳۳﴾ البتہ تحقیق تکذیب کی گئی رسولوں کی آپ سے قبل

فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ

پھر انہوں نے صبر کیا تکذیب کیے جانے پر اور ایذا پہنچائے جانے پر یہاں تک کہ اُن کے پاس ہماری مدد آگئی، اور اللہ تعالیٰ کے

لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ

کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، البتہ تحقیق آپ کے پاس رسولوں کی خبر آچکی﴿۳۴﴾ اور اگر گراں گزرتا ہے آپ پر

اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا

اِن کا اِعراض کرنا پھر اگر آپ طاقت رکھتے ہیں کہ آپ تلاش کرلیں کوئی سُرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی

فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى

آسمان میں پھر آپ لے آئیں ان کے پاس کوئی نشانی (تو لے آؤ)، اگر اللہ چاہتا تو ان کو جمع کر دیتا ہدایت پر،

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ

پس آپ نادانوں میں سے نہ ہوجایئے﴿۳۵﴾ سوائے اس کے نہیں کہ قبول کرتے ہیں وہ لوگ جو توجہ سے سنتے ہیں

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ

اور مُردے، اللہ انہیں اُٹھائے گا، پھر اُسی کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے﴿۳۶﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں اس پر کوئی نشانی اس کے

عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً

رَبّ کی طرف سے کیوں نہیں اُتاری گئی؟ آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ تعالیٰ قدرت رکھنے والا ہے اس بات پر کہ نشانی اُتار دے،

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ

لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں﴿۳۷﴾ نہیں ہے کوئی چلنے والا جانور زمین میں اور نہ کوئی پرندہ

يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ

جو اُڑتا ہو اپنے دونوں پروں کے ساتھ مگر وہ جماعتیں ہیں تم جیسی ہی، نہیں چھوڑی ہم نے کتاب میں کوئی شی،

ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (۳۸) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ

پھر یہ سارے کے سارے لوگ اپنے رب کی طرف جمع کیے جائیں گے (۳۸) اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے ہیں گونگے ہیں

فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ

تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں، جس کو اللہ چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے، اور جس کے متعلق چاہتا ہے اُس کو صراطِ مستقیم

مُّسْتَقِيْمٍ (۳۹) قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ

پر ٹھہرا دیتا ہے (۳۹) آپ کہہ دیجیے کہ تم بتلاؤ! اگر اللہ کا عذاب تمہارے پاس آجائے یا تمہارے پاس قیامت

اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۰) بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ

آجائے، کیا تم اللہ کے غیر کو پکاروگے؟ اگر تم سچے ہو (۴۰) بلکہ تم اسی کو ہی پکاروگے، پھر دُور ہٹا دے گا وہ

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (۴۱) ع وَلَقَدْ

اس تکلیف کو جس کے دُور کرنے کی طرف تم اسے بلاؤ گے اگر چاہے گا، اور بھول جاؤ گے تم ان چیزوں کو جن کو شریک ٹھہراتے ہو (۴۱) البتہ

اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ

تحقیق بھیجا ہم نے آپ سے قبل مختلف جماعتوں کی طرف، پھر پکڑ لیا ہم نے انہیں مالی تنگی میں اور بدنی تکلیف میں تاکہ

يَتَضَرَّعُوْنَ (۴۲) فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ

وہ عاجز ہو جائیں (۴۲) جس وقت اُن کے پاس ہمارا عذاب آگیا تو وہ کیوں عاجز نہ ہوئے، لیکن اُن کے دل سخت ہوگئے

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۴۳) فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ

اور شیطان نے اُن کے لیے سجا دیا انہی کاموں کو جو وہ کرتے تھے (۴۳) جس چیز کے ساتھ اُن کو نصیحت کی گئی تھی جب انہوں نے

فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا

اُس کو بھلا دیا تو کھول دیے ہم نے اُن کے اُوپر ہر شی کے دروازے، حتّٰی کہ جب وہ اکڑنے لگ گئے اُس چیز کے سبب سے جو وہ

اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ

دیئے گئے تھے تو ہم نے انہیں پکڑلیا اچانک، پس اچانک وہ مایوس ہونے والے تھے﴿۴۴﴾ پھر کاٹ دی گئی جڑ اُن لوگوں کی

ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ

جنہوں نے ظلم کیا، اور شکر ہے اس اللہ کا جو رَبّ العالمین ہے﴿۴۵﴾ آپ کہیے کہ بتلاؤ تم، اگر اللہ تعالیٰ تمہارے

سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ

کان لے لے اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دِلوں پر مُہر کردے، کون ہے اللہ کے علاوہ معبود جو اس

یَاْتِیْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ هُمْ یَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

چیز کو تمہارے پاس لے آئے گا؟ دیکھو تو، کیسے ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات، پھر یہ کنارہ کشی کرتے ہیں﴿۴۶﴾

قُلْ اَرَءَیْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ

آپ کہہ دیجئے بتلاؤ تم، اگر تمہارے پاس اللہ کا عذاب اچانک آجائے یا کھلم کھلا آجائے، نہیں

یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا

ہلاک کیے جائیں گے مگر ظالم لوگ﴿۴۷﴾ نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے

مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

ہوتے ہیں اور ڈرانے والے ہوتے ہیں، پھر جو کوئی ایمان لے آئے اور اپنے احوال کو دُرست کرلے پس نہ ان کے اُوپر کوئی خوف ہے

وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ

نہ وہ غمزدہ ہوں گے﴿۴۸﴾ اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں اُن کو عذاب لگے گا اُن کی

بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ

نافرمانی کے سبب سے﴿۴۹﴾ آپ کہہ دیجئے! کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں

وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى

اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، نہیں اتباع کرتا میں مگر اُس چیز کی جو

اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

میری طرف وحی کی جاتی ہے، آپ کہہ دیجئے! کیا اندھا اور سوانکھا برابر ہوتے ہیں؟ کیا تم سوچتے نہیں؟ ﴿۵۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَدْ نَعْلَمُ: ہم ضرور جانتے ہیں، یہ قَدْ بطور تاکید کے ہے۔ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ: کہ بیشک آپ کو غم میں ڈالتی ہے وہ بات جو یہ لوگ کہتے ہیں، فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ: پس بیشک یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، آپ کی تکذیب نہیں کرتے، وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ: لیکن ظالم لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ: البتہ تحقیق تکذیب کی گئی رسولوں کی آپ سے قبل، فَصَبَرُوْا: پھر انہوں نے برداشت کیا، عَلٰی مَا كُذِّبُوْا: پھر انہوں نے صبر کیا تکذیب کیے جانے پر، ''مَا'' مصدریہ ہے، تکذیب کیے جانے پر، جھٹلائے جانے پر انہوں نے صبر کیا، یعنی کافروں کی طرف سے تکذیب کو برداشت کیا، وَاُوْذُوْا: اس کا عطف بھی كُذِّبُوْا کے اوپر ہے، تو یہ بھی ''مَا'' کے نیچے داخل ہے۔ تکذیب کئے جانے کو اور تکلیف پہنچائے جانے کو انہوں نے برداشت کیا، صبر کیا انہوں نے تکذیب کئے جانے پر اور ایذا پہنچائے جانے پر، حَتّٰی اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا: یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی، وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ کلمات سے یہاں اللہ تعالیٰ کے وعدے مراد ہیں جو اس نے اپنے رسولوں کے ساتھ کر رکھے ہیں۔ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ: البتہ تحقیق آپ کے پاس رسولوں کا واقعہ آ گیا۔ نَبَاٌ: خبر کو کہتے ہیں، یعنی رسولوں کی خبر آپ کے پاس آ چکی، یعنی یہ بات جو ہم نے کہی کہ رسولوں کی تکذیب کی گئی تھی اور انہوں نے اس تکذیب پر اور ایذا پر صبر کیا، یہ خبر آپ کے پاس پہلے آ چکی ہے، آپ کو یہ قصے سنائے جا چکے ہیں، وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ: اور اگر گراں گزرتا ہے آپ پر ان کا اعراض، ان کا منہ موڑنا اگر آپ کو گراں گزرتا ہے، فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ: پھر اگر تو طاقت رکھتا ہے کہ تلاش کرلے کوئی سرنگ زمین میں، اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ: یا کوئی سیڑھی آسمان میں، فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ: پھر تو لے آئے ان کے پاس کوئی نشانی۔ ''اِنْ'' کی جزاء یہاں محذوف نکالی جائے گی فَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ اگر آپ میں طاقت ہے کہ آپ زمین میں سرنگ لگا کر، یا آسمان پہ سیڑھی لگا کر کوئی نشانی لا سکتے ہو ان کو دکھانے کے لئے تو لے آؤ، یہ جواب ہوگا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی: اگر اللہ چاہتا تو ان کو جمع کر دیتا ہدایت پر فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ: جاھلین کا لفظ جھل سے لیا گیا ہے، جھل کا لفظ ہمارے محاورے میں تو بہت شدت کا اور مذمت کا پہلو لئے ہوئے ہے، جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص جاہل ہے، تو ایک قسم کی اس کی بے عزتی بھی ہوتی ہے اور اس کے لئے ایک بہت مذمت کا عنوان ہے، عربی میں ''جھل'' کا لفظ ''علم'' کے مقابلے میں بھی آتا ہے اور ''حلم'' کے مقابلے میں بھی آتا ہے، عَلِمَ: جاننا، اور جَهِلَ: نہ جاننا، اور اسی طرح سے حَلُمَ: برداشت کرنا، اور جَهِلَ کا معنی جذباتی ہو جانا، برداشت نہ کرنا، تو دونوں مفہوم کے اندر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، تو یہاں ترجمہ ہم یوں بھی کر سکتے ہیں کہ آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیے، اور یوں بھی کر سکتے ہیں کہ آپ ان لوگوں میں سے نہ ہو جائیے جو جذبات سے مغلوب ہو جایا کرتے ہیں، آپ صبر کیجئے، ان لوگوں میں سے نہ ہو جائیے جو جذبات سے مغلوب ہو جایا کرتے ہیں، دونوں

انداز کے ساتھ یہ ترجمہ کرنا قابلِ برداشت ہے، اور اگر اس کا ترجمہ آپ اس طرح سے کریں گے کہ جاھلین کو جاھل کے عنوان کے ساتھ ہی ادا کریں کہ آپ جاہلوں میں سے نہ ہوجائیں، تو مقامِ نبوّت کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے پنجابی اور اُردو کے محاورے کے اعتبار سے یہ لفظ کچھ ثقیل سا ہے، اس لئے اس ترجمے کے اندر یوں احتیاط کی جائے گی تاکہ معلوم ہو کہ جاھل سے یہاں عربی والا جاہل مراد ہے، جس طرح سے ہم پنجابی اور اُردو میں کسی کو ''جاہل'' کہہ کے گالی دیتے ہیں، اس قسم کا ''جاہل'' یہاں مراد نہیں، اپنے اپنے محاورے کا فرق ہوتا ہے، تو آپ نادانوں میں سے نہ ہوجایئے، یا آپ ان لوگوں میں سے نہ ہوجایئے جو بُردبار نہیں ہوتے، جو جذبات سے مغلوب ہوجاتے ہیں، اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ: سوائے اس کے نہیں کہ قبول کرتے ہیں وہ لوگ جو توجہ سے سنتے ہیں، وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ: اور مُردے، اللہ انہیں اُٹھائے گا، ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ: پھر اسی کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ اَلْمَوْتٰی کے اوپر الف لام اگر عہد کا ہو اور اس کا مصداق ہوں وہ مشرکین جو حضور ﷺ کے مخاطب ہیں، تو مطلب ہوگا کہ جو توجہ سے سنتے ہیں وہ تو مان جایا کرتے ہیں، اور یہ مُردہ قلوب لوگ! تو اَلْمَوْتٰی سے پھر حقیقتاً مُردے مراد نہیں، بلکہ اَلَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ کے مقابلے میں اَلْمَوْتٰی کا لفظ لایا گیا ہے، کہ جو توجہ سے سنتے ہیں وہ تو مان لیتے ہیں، باقی یہ! جن کے اندر جان ہی نہیں ہے، کوئی سکت ہی نہیں، ان کے کان دل دماغ ہر چیز جواب دے چکی ہے، یہ قیامت کے دن ہی حقائق کو دیکھ کر سمجھیں گے، ان کو اللہ اُٹھائے گا پھر اسی کی طرف یہ لوٹائے جائیں گے، تو یہاں اَلْمَوْتٰی سے مُراد ہوجائے گا اَلَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ کے بالمقابل، یعنی وہ لوگ جو اپنی استعداد کھو چکے ہیں، یہ نہیں سمجھیں گے جب تک کہ قیامت نہ آجائے، اور جب قیامت آئے گی، اللہ انہیں اُٹھائے گا، اللہ کی طرف جمع کیے جائیں گے تو پھر سارے حقائق اِن کے سامنے آجائیں گے، یہ اس وقت مانیں گے اور اس وقت ماننا کوئی نفع نہیں دے گا۔ تو جب موتیٰ سے موتی القلوب مُراد لے لئے جائیں گے تو کلام کی رَوِش ایک جیسی رہ جائے گی، کہ منکرین کا ذِکر آیا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے، تو اسی سے یہ الفاظ تعلق رکھتے ہیں، اور اگر موتیٰ سے حقیقی مُردے مراد لیے جائیں کہ اللہ ان کو اُٹھائے گا قیامت کے دِن اور اس کی طرف لوٹائے جائیں گے، پھر یہ درمیان میں معاد کا مسئلہ آگیا، پھر ماقبل مابعد کے ساتھ کلام کی روش یکساں نہیں رہتی، کیونکہ آگے بھی کلام وہی چل رہی ہے منکرین کے متعلق ہی۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی اِس کے رَبّ کی طرف سے کیوں نہیں اُتاری گئی؟ قُلْ: آپ کہہ دیجئے اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً: بے شک اللہ تعالیٰ قدرت رکھنے والا ہے اس بات پر کہ نشانی اُتار دے، یعنی ان کی مطلوبہ، جس قسم کی یہ چاہتے ہیں، وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں، کس بات کو نہیں جانتے؟ کہ مطلوبہ نشانی اُتارنے کا پھر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اور یہ سمجھتے نہیں کہ اس طرح سے مطلوبہ نشانی ان کے سامنے پیش کرنے میں ان کی بدبختی آجائے گی اور یہ برباد ہوجائیں گے، یہ بے علم ہیں، جانتے نہیں ہیں۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ: دَبَّ یَدِبُّ: زمین پہ چلنا۔ نہیں ہے کوئی چلنے والا جانور زمین میں، وَلَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ: اور نہ کوئی پرندہ جو اُڑتا ہوا اپنے دونوں پروں کے ساتھ۔ طائر اُڑنے والے کو کہتے ہیں، اور یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ: جو اپنے دونوں پروں کے ساتھ اُڑتا ہے، یہ لفظ اس لئے بڑھا دیے کہ معلوم ہوجائے کہ طائر سے یہاں حقیقی پرندہ مُراد ہے، تو یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ کی صفت اس لئے بڑھادی، ورنہ طائر تیز رفتار کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے، یعنی چاہے وہ زمین پر اپنے قدموں کے ساتھ چل رہا ہے، لیکن تیز تیز چل رہا ہے تو

اس کو بھی کہتے ہیں کہ اُڑا جا رہا ہے، اور عربی کے اندر بھی طائر کا لفظ تیز چلنے کے معنی میں آتا ہے۔" اور نہ کوئی پرندہ جو اُڑتا ہو اپنے دونوں پروں کے ساتھ" اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ: مگر وہ جماعتیں ہیں تم جیسی ہی، مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ: فَرْط تفریط: چھوڑنا۔ نہیں چھوڑی ہم نے کتاب میں کوئی شئ۔ کتاب سے یہاں لوحِ محفوظ مراد ہے۔ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ: پھر یہ سارے کے سارے لوگ اپنے رَبّ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، یا، جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ موصول کے بعد جس وقت ماضی آجایا کرتی ہے تو اس کا ترجمہ مضارع کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے۔" جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں" صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ: صُمٌّ اَصَمّ کی جمع ہے، وہ بہرے ہیں، ان کے کانوں میں صلاحیت نہیں، بُكْمٌ اَبْكَم کی جمع، گونگے ہیں، ان کی زبان حق گو نہیں، فِي الظُّلُمٰتِ: تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں، ان کے سامنے کوئی کسی قسم کی ہدایت کی روشنی نہیں، حاصل اس کا یہی ہے کہ ان کی سب اِستعداد خراب ہو چکی ہے۔" جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اور تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔" بہرے، گونگے ان کو تشبیہاً کہا جا رہا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ بہرے گونگے نہیں تھے، وہ تو بہت بڑے فصیح بلیغ، بڑے شاعر اور قصیدہ گو، بڑے خطیب اور لیکچرار تھے، لیکن جس وقت زبان سے اور کانوں سے وہ کام نہیں لیتے کہ اپنے نفع نقصان میں امتیاز کریں، تو یوں سمجھو کہ نہ کان کام دے رہے ہیں، نہ زبان کام دے رہی ہے، مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ: جس کو اللہ چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے یعنی جس کو بھٹکانا چاہتا ہے اسے بھٹکا دیتا ہے، وَمَنْ يَّشَاْ: اور جس کے متعلق چاہتا ہے، يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اس کو صراطِ مستقیم پہ ٹھہرا دیتا ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ: آپ کہہ دیجیے کہ تم بتلاؤ، اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ: اگر اللہ کا عذاب تمہارے پاس آجائے اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ: یا تمہارے پاس قیامت آجائے، اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ: کیا تم اللہ کے غیر کو پکارو گے؟ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ: بلکہ تم اسی کو ہی پکارو گے، فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ: پھر دُور ہٹا دے گا وہ اس تکلیف کو جس کے دُور کرنے کی طرف تم اسے بلاؤ گے، مَا تَدْعُوْنَ اِلَى كَشْفِهٖ، پھر دُور ہٹا دے گا وہ اس تکلیف کو کہ تم اس تکلیف کے دُور کرنے کی طرف اس کو پکارو گے، دُور ہٹا دے گا اگر چاہے گا، اِنْ شَآءَ کی قید ساتھ آگئی، وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ: اور بھول جاؤ گے تم ان چیزوں کو جن کو شریک ٹھہراتے ہو۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے آپ سے قبل مختلف جماعتوں کی طرف، بھیجا ہم نے رسولوں کو، بھیجا ہم نے اپنا پیغام، اَرْسَلْنَا کا مفعول محذوف نکال لیں گے،" بھیجا ہم نے آپ سے قبل مختلف جماعتوں کی طرف" فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ: بَاْسَاء: تنگی۔ ضَرَّاء: تکلیف۔ دونوں کے درمیان فرق یوں کر دیا جاتا ہے کہ بأساء سے مالی تنگی مراد ہے اور ضراء سے بدنی تکلیف مراد ہے۔" پھر پکڑ لیا ہم نے انہیں مالی تنگی میں اور بدنی تکلیف میں" لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ: يَتَضَرَّعُوْنَ یہ لفظ تضرّع سے لیا گیا ہے، جس کا معنی ہوتا ہے عاجز ہو جانا، عاجزی کا اظہار کرنا، کسی کے سامنے جھک جانا، دب جانا، اس کی قوت اور غلبے کو اپنے اوپر تسلیم کر لینا، یہ ہوتا ہے 'تضرّع'' کا مفہوم۔" ہم نے ان کو پکڑا سختی میں تکلیف میں تاکہ وہ عاجز ہو جائیں، اللہ کے سامنے جھک جائیں، بندگی کا اظہار کر دیں، اپنی پستی کو مان لیں" فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا: لَوْلَا کا تعلق تَضَرَّعُوْا کے ساتھ ہے۔ جس وقت ان کے پاس ہمارا عذاب آگیا تو وہ کیوں عاجز نہ ہوئے، انہوں نے عاجزی کا اظہار کیوں نہ کیا، بأس سے وہی دُنیوی تکلیف مراد ہے۔ لَوْلَا: کیوں نہ، جب ان کے پاس ہمارا عذاب آیا، تَضَرَّعُوْا: وہ عاجز ہوئے،

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ: لیکن ان کے دل سخت ہو گئے وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور شیطان نے ان کے لیے سجا دیا انہی کاموں کو جو وہ کرتے تھے، یہ قَسَتْ کا لفظ تضرُّع کے مقابلے میں آیا ہے، تو تضرُّع کا مفہوم ہوا کہ تنبیہ سے متنبہ ہو کر اپنے دل کے اندر عاجزی پیدا کر لینا، اور اپنے حاکم کے سامنے مالک کے سامنے اپنے عجز کو ظاہر کرنا، یہ ہے تضرُّع کا مفہوم، اور قساوت اس کے مقابلے میں آ گئی کہ دل سخت ہو گئے کہ چاہے کسی قسم کی تنبیہ ہوتی رہے، مصیبت آتی رہے، تکلیف آتی رہے، دل متاثر ہی نہیں ہوتا، اُسی طرح سے اکڑے ہوئے ہیں، اسی طرح سے گردن اُٹھائے ہوئے ہیں، ''ان کے دل سخت ہو گئے'' وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ: اور شیطان نے ان کے لیے آراستہ کر دیا، سجا دیا انہی کاموں کو جو وہ کرتے تھے، یعنی جن کارروائیوں میں وہ لگے ہوئے تھے شیطان نے ان کو یہی سمجھایا کہ یہی کام اچھے ہیں۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ: جس چیز کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی تھی جب انہوں نے اس کو بھلا دیا، مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کو جب انہوں نے بھلا دیا، فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ: پھر کھول دیے ہم نے ان کے اوپر ہر شئ کے دروازے، پھر نعمتوں کے دروازے ہم نے ان پر کھول دیے، خوب انہیں خوشحال کر دیا، حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا: حتیٰ کہ جب وہ اترانے لگ گئے، اکڑنے لگ گئے بسبب اس چیز کے جو وہ دیئے گئے تھے، یہ ''فرحِ بطر'' ہے، ایک ''فرحِ شکر'' ہوتا ہے کہ اللہ کے شکر کے طور پر انسان کی طبیعت میں سرور آئے اور خوشی آئے، اور ایک ''فرحِ بطر'' ہے کہ اترانے اور اکڑنے کے طور پر اس کے اُوپر سرور آئے، یہاں اترانا مُراد ہے۔ ''جب وہ خوش ہو گئے اس چیز کے ساتھ جو وہ دیئے گئے'' یعنی خوشی اترانے والی، ''اکڑنے لگ گئے وہ اس چیز کے سبب سے جو وہ دیئے گئے'' اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً: پھر ہم نے انہیں پکڑ لیا اچانک، اچانک کا مطلب ہوتا ہے بغیر نوٹس دینے کے، یعنی ایک عذاب آیا کرتا ہے کہ اس میں پہلے تنبیہ کر دی جاتی ہے، کچھ آثار نمایاں ہوتے ہیں، اور ایک عذاب ایسے طور پر آتا ہے کہ آثار کچھ نمایاں نہیں، رات کو اچھے بھلے سوئے تھے، کوئی کسی قسم کے خوف خطرے کی بات نہیں تھی، زلزلہ آیا اور مکان گرے اور سارے نیچے دَب کے مر گئے، اس قسم کا عذاب جو ہوتا ہے وہ دفعی عذاب ہوتا ہے جس کو بَغْتَةً کہتے ہیں، اور ایک یہ ہے کہ جس طرح سے انسان بیمار ہوتا ہے، تکلیف بڑھتی جاتی ہے، آہستہ آہستہ جا کے بچے مر جاتے ہیں، یا خود مر جاتا ہے، یا کوئی ایسا نقصان ہو جاتا ہے، علامات کے ساتھ جس طرح سے تکلیف آیا کرتی ہے، تو بَغْتَةً وہ ہوتا ہے جس کی پہلے کوئی علامت نمایاں نہیں تھی کہ ایسا ہونے والا ہے اور یکدم اللہ کا عذاب آ گیا، ''پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک'' فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ: پس اچانک وہ مایوس ہونے والے تھے، فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: پھر کاٹ دی گئی جڑ۔ دابر جڑ کو کہتے ہیں، پچھلے حصے کو۔ پھر کاٹ دی گئی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اور شکر ہے اس اللہ کا جو رَبّ العالمین ہے، رَبّ العالمین کا شکر ہے، یعنی ظالموں کی جڑ کاٹنے پہ، گویا کہ ظالموں کی جڑ کاٹ دینا یہ بھی رَبّ العالمین کی رُبوبیت کا تقاضا ہے، اور یہ بھی اس کی رَحمت کا تقاضا ہے، اس لیے اس پہ شکر ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ: آپ کہیے کہ بتلاؤ تم، اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ: اگر اللہ تعالیٰ تمہارے کان لے لے وَاَبْصَارَكُمْ: اور تمہاری آنکھیں لے لے، وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ: اور تمہارے دِلوں پہ مُہر کر دے، مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ: کون ہے اللہ کے علاوہ معبود جو اس چیز کو تمہارے پاس لے آئے گا؟ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ: دیکھ تو، کیسے ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات، ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ: پھر یہ اعراض کرتے ہیں، کنارہ کشی کرتے ہیں۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ: اَرَاَيْتُمْ اور اَرَاَيْتَكُمْ ایک ہی چیز ہے، یہ لفظ اَخْبِرُوْنِيْ کے معنی میں ہوتا ہے،

بتلاؤتم، اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً: اگر تمہارے پاس اللہ کا عذاب اچانک آجائے، اَوْ جَهْرَةً: یا کھلم کھلا آجائے۔ کھلم کھلا یہ بَغْتَةً کے مقابلے میں آگیا، یعنی بَغْتَةً وہ عذاب ہوگا جو بلانوٹس آتا ہے، اور جَهْرَةً وہ ہوگا جس کے متعلق پہلے آثار نمایاں کردیے جائیں، هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ: نہیں ہلاک کیے جائیں گے مگر ظالم لوگ۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ: نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے ہوتے ہیں اور ڈرانے والے ہوتے ہیں، فَمَنْ اٰمَنَ: پھر جو کوئی ایمان لے آئے، وَاَصْلَحَ: اور اپنے اَحوال کو دُرست کرلے، سنوار لے، فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: پس نہ ان کے اوپر کوئی خوف ہے نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں، يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ: ان کو عذاب لگے گا، بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: ان کی نافرمانی کے سبب سے۔ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ: آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: یہ لَا بھی پہلے لَا کی تاکید ہے، یعنی عبارت یوں بنے گی قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ، اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں غیب جانتا ہوں، تو یہ لَا جو ہے یہ اسی پہلے لَا کی تاکید ہوجائے گی، جس طرح سے کلام کی روش ہے، "اور نہ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں"، "نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب جانتا ہوں، اور نہ میں یہ بات کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔" اور اگر لَا کو اَعْلَمُ کے ساتھ ہی لگالیا جائے تو بھی بات ٹھیک ہے لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ: میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب ہی جانتا ہوں، تو پھر اس کو لَاۤ اَقُوْلُ کے نیچے داخل نہیں کرنا (ترکیب کو ذرا سمجھ لیجئے!) اگر لَا کو اَعْلَمُ کے ساتھ لگائیں گے تو پھر وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ کا عطف لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ کے اوپر ہے، آپ کہہ دیجئے کہ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ میں غیب نہیں جانتا، اور اگر اس کو لَاۤ اَقُوْلُ کے نیچے داخل کرنا ہے تو پھر یہ لَا پہلے لَا کی تاکید ہے، تو پھر معنی یوں ہوجائے گا کہ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میں غیب جانتا ہوں، پھر یہ بھی مقولہ بن جائے گا، اور لَا کو اَعْلَمُ کے ساتھ لگاؤ پھر اس کو لَاۤ اَقُوْلُ کے نیچے بھی داخل کرو پھر مفہوم محرف ہوجائے گا، مطلب غلط ہوجائے گا، کیونکہ مقصد تو یہاں ہے خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ کی نفی کرنا، کہ میرے پاس اللہ کے خزانے نہیں ہیں کہ تم جو کہو میں تمہیں دے دوں، تم کہتے ہو پہاڑ سونے کا بنا کے دے دو، یہ کردو، تو میں کوئی اللہ کے خزانوں کا مالک تو نہیں ہوں، اس کی قدرت کے خزانے میرے پاس تو نہیں ہیں کہ جو تم کہو میں کر کے دکھادوں، اور تم پوچھتے ہو کہ عذاب کب آئے گا؟ قیامت کب آئے گی؟ میں نہیں بتاسکتا تو تم جھٹلاتے ہو، تو میں نے کب کہا ہے کہ میں غیب جانتا ہوں، یہ ہے اس کا مفہوم، اگر میرا یہ دعویٰ ہو کہ میں غیب جانتا ہوں پھر تم کوئی بات پوچھو اور میں نہ بتاسکوں تو پھر تو تم میری تکذیب کرو، جب میرا یہ دعویٰ ہی نہیں ہے کہ میں غیب جانتا ہوں، تو پھر اگر تم کوئی بات پوچھتے ہو اور میں اس کا جواب نہیں دے سکتا تو اس میں کون سی تکذیب کی بات ہے، یہ ہے اس کا صحیح مفہوم۔ اور اگر لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ کو اکٹھا کرلوگے کہ لَا یہ اَعْلَمُ پہ داخل ہے، پھر اس کو لَاۤ اَقُوْلُ کے نیچے لے آؤگے تو مُراد بدل جائے گی، پھر اس کا مفہوم یوں ہوجائے گا کہ میں یہ بات نہیں کہتا کہ میں غیب نہیں جانتا، یعنی لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ کا قول میں نہیں کرتا، میں نہیں کہتا کہ میں غیب نہیں جانتا، تو پھر یہ ماقبل اور مابعد کی طرف دیکھتے ہوئے کلام کی مراد بالکل محرف ہوجائے گی، کیونکہ مقصد تو یہی کہنا ہے کہ تم باتیں پوچھتے ہو اور میں تمہیں جواب نہیں دے سکتا، اور تم کہتے ہو یہ جھوٹا ہے، یہ بات تو تب کہو کہ میں کہوں کہ میں سب کچھ جانتا

ہوں، پھر تم ایک بات پوچھو اور میں نہ بتاؤں تو تمہارے لیے تکذیب کا بہانہ ہے، تو میں نے کب کہا ہے کہ میں غیب جانتا ہوں، اس لیے مجھے تو اللہ کی طرف سے جو اطلاع آتی ہے وہ بتا سکتا ہوں، جو اللہ کی طرف سے نہیں آتی وہ نہیں بتاتا، یہ ہے اس کا صحیح مفہوم۔ تو اگر تو اس کو مقولہ بنانا ہو اور لَآ اَقُوْلُ کے تحت داخل کرنا ہو تو پھر یہ لَآ پہلے لَآ کی تاکید ہے، پھر ترجمہ یوں کریں گے ''میں یہ بات نہیں کہتا کہ میں غیب جانتا ہوں'' یا لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ کو اکٹھا کر کے اس کا عطف لَآ اَقُوْلُ کے اوپر کر لیجئے، جیسے کہ آگے آنے والے وَلَآ اَقُوْلُ کا عطف اسی لَآ اَقُوْلُ کے اُوپر ہے، تو یہ جملہ بھی پورا ہو کے اس کا عطف لَآ اَقُوْلُ کے اُوپر ہو جائے گا، اور وَلَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ کا عطف بھی اس جملے کے اُوپر ہے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں کہتا تمہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں، اور نہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں'' اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ: نہیں اتباع کرتا میں مگر اس چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، آپ کہہ دیجئے کہ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ: کیا اندھا اور سوانکھا برابر ہوتے ہیں؟ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں؟

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

توحید، رسالت اور معاد، ان اُصولِ ثلاثہ کا ذکر کرتے ہوئے مشرکین اور کافرین کی طرف سے اُن کی تکذیب کا بیان تھا کہ یہ توحید کو بھی تسلیم نہیں کرتے، اسی طرح سے رسالت کو بھی تسلیم نہیں کرتے، اور آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ اسی بات کو مختلف انداز کے ساتھ دُہرایا گیا ہے، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ اُن کے ایمان نہ لانے کی بنا پر بڑا دُکھ ہوتا تھا، یہ دُکھ ہوتا تھا محبت اور شفقت کی وجہ سے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی بھلائی چاہتے تھے، اور وہ تسلیم نہیں کرتے تھے، اور آپ کی ہمدردی اور خیرخواہی کو اُلٹا دہ عداوت پر محمول کرتے، آپ کے اس بار بار سمجھانے کو اُلٹا وہ آپ کے لیے باعثِ ایذا بنالیتے، یہ چیزیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت باعثِ تکلیف تھیں۔

کُفّار کی تکذیب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی اور اللہ کی طرف سے تسلی

اور ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی بنا پر، اور تکذیب کرنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی تکلیف تھی، اس کا اگر آپ اندازہ کرنا چاہیں تو اس لفظ کے تحت کر سکتے ہیں جو سورۂ کہف کے پہلے رُکوع میں آئے گا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا، اس کا مفہوم ہم اپنے الفاظ میں یوں ادا کریں گے، کہ ''ایسے لگتا ہے جیسے آپ تو ان کے پیچھے گھل گھل کر مر ہی جائیں گے اگر یہ ایمان نہ لائے''، اپنے الفاظ میں اس مفہوم کو یوں ادا کریں گے، یعنی آپ کا جو حال ہے اس وقت، جس طرح سے آپ تڑپتے ہیں ان کے ایمان نہ لانے کی بنا پر، تو ایسے لگتا ہے کہ اگر یہ نہیں مانیں گے تو آپ تو ان کے پیچھے گھل گھل کر مر ہی جائیں گے۔ اس سے

آپ اندازہ کر لیجئے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے قلب میں کتنی بے چینی تھی، اور آپ کتنے غمزدہ تھے قوم کے تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار حضور ﷺ کو تسلی دی ہے، اور یہ آیات جو اس وقت آپ کے سامنے پڑھی جارہی ہیں یہ اسی تسلی سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ: ہمیں پتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ جو باتیں یہ کرتے ہیں یہ آپ کے لیے باعثِ غم ہیں، الَّذِي يَقُولُونَ جو بات یہ لوگ کرتے ہیں یہ آپ کو حزن میں ڈالتی ہے، یہ آپ کے لیے باعثِ غم ہے، ہم اس بات کو جانتے ہیں۔ لیکن آپ اتنا تو دیکھیں کہ ان لوگوں کو آپ سے تو کوئی ضد نہیں ہے، جس وقت تک آپ نے میری بات کہنی نہیں شروع کی تھی اُس وقت تک تو یہ سارے آپ کو صادق اور امین کہتے تھے، اُس وقت تو سارے کے سارے آپ کی دیانت اور امانت پر اعتماد کرتے تھے، تو آپ سے تو ان کو ضد نہیں، یہ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے، یہ تو میری باتوں کا انکار کرتے ہیں، تو واسطہ تو اِن کا براہِ راست میرے ساتھ ہے، تو میں جانوں اور یہ جانیں، آپ کو اس پر غم کرنے کی کیا ضرورت؟ یعنی اللہ تعالیٰ کی بات حضور ﷺ نے کہی تو اُن لوگوں نے کہا کہ تُو جھوٹا ہے، اور تکذیب کی، ورنہ جس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے آپ نے باتیں کہنی نہیں شروع کی تھیں اُس وقت تک کافر آپ کو صادق اور امین کہتے تھے، تو ان کی تکذیب تو میری باتوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، آپ سے تو ان کو کوئی ضد نہیں، چاہے مطلب اس کا وہی ہے کہ جب اللہ کی بات کو انہوں نے جھٹلایا تو اللہ کے رسول کو جھٹلا دیا، حضور ﷺ کو جھٹلا دیا، لیکن آپ کا جھٹلایا جانا ضمناً ہوا، اصل کے اعتبار سے تکذیب کا تعلق اللہ کی باتوں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ جب تک آپ نے اللہ کی طرف نسبت کر کے یہ باتیں کہنی شروع نہیں کیں اُس وقت تک آپ کے ساتھ تکذیب کا معاملہ بھی نہیں ہوا، یہ ظالم لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے، فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ: آپ کو جھوٹا نہیں بتلاتے، یعنی حقیقت کے اعتبار سے، وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ: یہ تو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، تو جب یہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرو، اللہ جانیں اور یہ جانیں، اب اللہ کی آیات کا انکار کرنا یہ آپ کی ہی تکذیب ہے، لیکن آپ کو جھوٹا بتلانا ضمناً ہوا، اصل کے اعتبار سے ان کو اِنکار اللہ کی باتوں سے ہے، ورنہ جس وقت تک آپ نے یہ تبلیغ شروع نہیں کی تھی اور اللہ تعالیٰ کے آیات سنانی شروع نہیں کی تھیں، اس وقت تک آپ کے ساتھ ان کا تکذیب کا معاملہ نہیں ہوا۔

ایک اور پہلو سے تسلی

اور یہ بات صرف آپ کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ آپ سے قبل بھی رسول آئے تھے، اور اُن کو بھی اسی طرح سے جھٹلایا گیا، ان کو بھی اسی طرح سے جھوٹا بتلایا گیا، جس طرح سے آپ بات کرتے ہیں تو لوگ آپ کو کہتے ہیں کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں، انہوں نے بھی صبر کیا، برداشت کیا، آپ بھی صبر کریں، برداشت کریں، جو ان کی تکذیب کی گئی، جو اُن کو تکلیف پہنچائی گئی، اُس کے اُوپر انہوں نے صبر کیا، کتنا صبر کیا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا: وہ صبر کرتے رہے، برداشت کرتے رہے، ایذائیں سہتے رہے، تکذیب سن سن کے برداشت کرتے رہے، حتیٰ کہ اُن کے پاس ہماری مدد آ گئی، تو جب ہماری مدد آ گئی تو اُن کی صداقت نمایاں ہو گئی اور تکذیب کرنے

والے برباد ہو گئے، توجس میں اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ آپ کی تکذیب بھی اسی اُصول کے تحت ہی ہے، اور آپ کو بھی اسی طرح سے برداشت کرنا چاہیے، اِن کی ایذاؤں کو سہنا چاہیے، ایک وقت آئے گا کہ ہماری مدد آپ کے ساتھ بھی آ جائے گی، وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، اس لیے اللہ کی طرف سے جو نصرت کا وعدہ ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ ''اور آپ کے سامنے رسولوں کا واقعہ آ چکا، رسولوں کی خبر آپ کے پاس آ چکی'' یعنی قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے یہ واقعات بیان کر دیئے گئے کہ کیسے کیسے رسول آئے تھے، اور قوم نے کیسے کیسے اُن کی تکذیب کی تھی، اور پھر انجام کار کس طرح سے رسول کامیاب ہوئے، اور تکذیب کرنے والے کیسے برباد ہو گئے، یہ آپ سُن چکے ہیں، انہی واقعات کی طرف دیکھ کر آپ تسلی پکڑیے۔

مطالباتی معجزات نہ دِکھانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں

اگلی بات! وہ ذرا تیز لب ولہجہ کے ساتھ کہی جارہی ہے، لیکن اس تیزی کے اندر بھی شفقت نمایاں ہے، محبت نمایاں ہے، حاصل اُس کا یہ ہے کہ اگر آپ کو بہت ہی تکلیف ہے کہ یہ کیوں نہیں مانتے، اور آپ کا دِل یہ چاہتا ہے کہ جس قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں معجزہ دِکھادو، تو ہم مان جائیں گے، فلاں معجزہ دِکھادو، تو ہم مان جائیں گے، اور آپ کا دِل چاہتا ہے کہ یہ معجزات اِن کو دکھا دیئے جائیں، جس کی بنا پر آپ کو بے چینی ہے کہ شاید اِن کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو یہ مان جائیں گے، اس لیے آپ دِن رات تڑپتے ہیں، اور آپ کے دِل کی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی قسم کے معجزات دِکھادے، تو پہلے تو سیدھی بات سُن لو، ہم تو دِکھانے کے نہیں، ہماری حکمت کے تو یہ مطابق نہیں ہے، کہ جو کوئی کہے ویسے کر کے دِکھادیں، یہ کوئی طریقہ ہے؟ یعنی اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے کہ جو کوئی کہے کہ ''فلاں بات دِکھاؤ تو میں ایمان لاتا ہوں!'' اگر اس طرح سے لوگوں کے مطالبے پورے کرنے شروع کر دیئے جائیں تو پھر تو سارا نظام بگڑ جائے گا، ایک کہے گا کہ مشرق کی طرف سے سورج چڑھاؤ، دوسرا کہے گا کہ مغرب کی طرف سے چڑھا کے دِکھاؤ تو میں مانتا ہوں، ایک کہے گا کہ بارش کر کے دِکھاؤ، دوسرا کہے گا دُھوپ نکال کر دِکھاؤ، ان کے ایسے ایسے متضاد مطالبے ہوں گے، تو اس کے ساتھ تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا اگر ان کی بات ماننی شروع کر دو، یہ پہاڑ سونے کا ہو جائے، یہ پہاڑ چاندی کا ہو جائے، پہاڑوں کی جگہ نہریں بہہ پڑیں، یہاں چشمے پھوٹ جائیں، یہاں باغات ہو جائیں، جیسے جیسے ان کے مطالبے تھے، اُوٹ پٹانگ جیسی مارتے تھے، تو ہم تو اُن کے مطلوبہ معجزات دِکھانے کے نہیں، کیونکہ ہماری حکمت کا تقاضا نہیں ہے، ہم انہیں برباد کرنا نہیں چاہتے، اگر ان کی منہ مانگی نشانی ان کے سامنے ظاہر کر دی گئی تو یہ مانیں گے نہیں، اور پھر میرا طریقہ یہ ہے کہ جو مانگے اور اس کے مطابق اگر معجزہ ظاہر کر دیا جائے پھر وہ تسلیم نہ کرے تو پھر عذاب بھیج کر اس قوم کو تباہ کر دیا جاتا ہے، برباد کر دیا جاتا ہے، اور اِن کا کلیۃً برباد کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے، اس لیے اِن کے مطالبات میں تو پورا کرنے کا نہیں، تو آپ میری اس حکمت پر مطمئن رہیں، آپ اس فکر میں کیوں پڑیں؟

اب اگلی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں کہ تیز لب لہجے سے کہی جارہی ہے، لیکن اس میں بھی محبت نمایاں ہے، سمجھایا تو یوں جارہا ہے کہ جب میں نہیں دِکھاتا، میری حکمت کے مطابق نہیں ہے، تو آپ کو میری حکمت کا جاننے والا بن کر اس کے اُوپر صبر کرنا

چاہیے، کہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت ہے، صحیح ہے، آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں، کہ جو اس قسم کی باتوں کی حکمتیں نہیں سمجھتے، آپ ان میں سے نہ ہو جایئے، کہ ضرور ایسا ہو گا یا ضرور ایسا ہو جائے، یہ بات وہ لوگ تو کر سکتے ہیں کہ جو اللہ کی حکمت کو سمجھتے نہیں ہیں، اور آپ کے سامنے تو ہم ساری حکمت واضح کر رہے ہیں، تو پھر آپ ان لوگوں میں سے نہ ہو جایئے، اس لیے یہ آپ کے دِل میں جو تڑپ ہے کہ یہ معجزات ظاہر ہو جائیں، یہ ختم کر دو، یہ بے چینی جانے دو، ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اس قسم کی باتوں کی حکمت نہیں جانتے۔ اور اگر آپ کے دِل میں ایسی تڑپ ہے ہی کہ ان کو معجزہ دِکھانا چاہیے، تو بہت اچھا! ہم تو دِکھائیں گے نہیں، سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ، وہاں سے ان کی مرضی کے مطابق معجزہ لے آؤ، یا زمین میں گھس جاؤ، سُرنگ لگا کر، وہاں سے نکال کر لا سکتے ہو تو لے آؤ، ہم تو دِکھانے کے نہیں۔ اب یہ لفظ جو بولا جا رہا ہے آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں تھوڑی سی تیزی نمایاں ہے، کہ جاؤ لے آؤ پھر، اگر آپ کا دِل ایسے چاہتا ہے تو جاؤ، سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ سکتے ہو تو آسمان سے اُتار لاؤ اِن کا مطلوبہ معجزہ، اور اگر زمین میں سُرنگ لگا کے زمین میں گھس سکتے ہو تو وہاں سے لے آؤ، فَتَأْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ: لے آؤ ان کے پاس کوئی نشانی۔ حقیقت کے اعتبار سے اس کے ساتھ بھی حضور ﷺ کو تسلی دینی مقصود ہے، کہ اس بات کو ختم کر دیجئے، آپ کے دِل میں یہ تڑپ نہیں رہنی چاہیے کہ ایسے معجزات ان کو دِکھائے جائیں، کیونکہ یہ بدبخت معجزہ آجانے کے بعد بھی مانیں گے نہیں، پھر اِن کی بربادی ہے، اب ان کے لیے بھی شفقت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے ہر مطالبے کو پورا نہ کیا جائے۔ یہ ساری آیات اس طرح سے حضور ﷺ کے لیے تسلی کا باعث ہیں۔ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ: اگر اِن کا منہ موڑنا، اعراض کرنا، بے رخی کرنا، آپ کو گراں گزرتا ہے، پھر اگر آپ طاقت رکھتے ہیں تلاش کرنے کی (اَنْ تَبْتَغِيَ میں اَن مصدریہ ہے) اگر آپ اس بات کی طاقت رکھتے ہیں کہ آپ تلاش کریں کوئی سُرنگ زمین میں یا آپ تلاش کر لیں کوئی سیڑھی آسمان میں، پھر آپ لے آئیں اِن کے پاس کوئی نشانی، تو لے آؤ۔

زبردستی ہدایت پر لانا اللہ کی حکمت نہیں ہے

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى: اگر اللہ چاہتا ان کو ہدایت پہ جمع کرنا تو سب کو ہدایت پر اکٹھا کر دیتا، یہ اللہ تعالیٰ کے لیے مشکل نہیں، تکویناً زبردستی زور کے ساتھ ان کو سیدھے راستے پر چلا دے، اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، لیکن اللہ کی یہ حکمت نہیں، بلکہ اللہ کی حکمت یہ ہے کہ انسان کو اِبتلا میں ڈال دیا، اختیارات دے کر، اب اپنی عقل کے ساتھ، فہم کے ساتھ، گوشِ ہوش کے ساتھ اگر کوئی شخص ہدایت کو قبول کرے گا تو ہم اُس کو ہدایت کے راستے پر چلائیں گے، اور نہیں قبول کرتا تو نہ سہی، ہم نے ان کو اس طرح سے بنایا، ورنہ اگر ہمارا مقصد یہی ہوتا کہ زبردستی سب کو ایک راستے پر چلانا ہے تو ہمارے لیے کیا مشکل تھا، ہم چلا دیتے، لیکن یہ حکمتِ اِبتلا کے خلاف ہے، لہٰذا اِن کے مطلوبہ معجزات اُتار اُتار کر ان کو گردنوں سے پکڑ پکڑ کر سیدھے راستے پر چلا دینا یہ حکمت کے منافی ہے، "اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو اکٹھا کر دیتا ہدایت پر" یعنی زبردستی، تکویناً۔

"لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" کے مختلف مفہوم

"پس نہ ہو جایئے آپ اُن لوگوں میں سے جو حکمت کو سمجھتے نہیں ہیں" یعنی اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد آپ

مطمئن ہوجائیے، اور پھر اس قسم کی بے چینی قلب میں رکھنا اُن لوگوں کا کام ہوگا جن کے سامنے یہ حکمت نمایاں نہیں ہے، دیکھو! جاہلین کے ترجمے کا مفہوم جس طرح سے میں ادا کر رہا ہوں تو کتنا سہل اور کتنا الفاظ کے مطابق ہوگیا۔ اور یا پھر مطلب یوں ادا کرلیں کہ آپ کے دِل میں جذبہ ہے کہ یہ راہِ راست پر آجائیں، لیکن اس جذبے سے اتنا مغلوب نہ ہوجاؤ کہ اِن کا ہر مطالبہ پورا کرنے کے لیے جوش اُٹھ رہا ہے، اس جذبے میں کہ اِن کو ہدایت پہ لانے کا جذبہ آپ کے دل میں ہے، کہ یہ کسی طرح سے مان جائیں لیکن اس جذبے سے ایسے مغلوب نہ ہوجاؤ کہ جو کچھ یہ کہیں اُسی کے کرنے پر تیار ہوجاؤ کہ ایسے ہوجانا چاہیے جس کی بنا پر ہم یہ کہہ رہے کہ ہم تو کرتے نہیں، اگر آپ کو زیادہ ہی جذبہ اُٹھ رہا ہے اس بات کا کہ اِن کو ضروری ہی منوانا ہے تو جاؤ پھر، کرلو پورے ان کے مطالبے، ہم تو کریں گے نہیں، تو پھر لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کا مفہوم یہ نکل آئے گا کہ آپ ان لوگوں میں سے نہ ہوجائیے جو جذبات میں مغلوب ہوجایا کرتے ہیں، ٹھیک ہے کہ ان کو ہدایت پر لانے کا جذبہ ہے، لیکن وہ جذبہ ایک حد پہ رہنا چاہیے، ان کو دلائل کے ساتھ سمجھاؤ، تدبر، تفکر کی انہیں دعوت دو، آیاتِ تنزیل اور آیاتِ آفاق کی طرف ان کو متوجہ کرو، تاکہ یہ سوچیں اور سوچ کر سیدھے راستے پر آئیں، اتنی ہمدردی ان کے ساتھ رکھیے، باقی جو کچھ یہ الٹ پلٹ کہتے چلے جائیں تو آپ کا جذبہ ہو کہ سب کچھ پورا کردیا جائے، ایسی بات نہیں ہے، تو آپ اُن لوگوں میں سے نہ ہوجائیں جو جذبات سے مغلوب ہوجایا کرتے ہیں، تو پھر جہل کا ترجمہ حلم کے مقابلے میں آجائے گا، کہ آپ مغلوب ہونے والوں میں سے نہ ہوجائیں، اس کا مفہوم یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔

''سوائے اس کے نہیں، قبول وہی لوگ کرتے ہیں جو کہ سنتے ہیں'' اور سننا یہاں توجہ سے مقصود ہے، حق معلوم کرنے کے لیے جو کان لگاتے ہیں سنتے ہیں، یہ لوگ تو مُردہ ہوچکے، یہ تو موتی القلوب ہیں، دِلوں کے مُردہ ہیں، اِن کے تو نہ کان کام دے رہے ہیں، نہ اِن آنکھیں کام دے رہی ہیں، ''ان کو قیامت کے دِن اللہ اُٹھائے گا پھر اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے'' پھر یہ سارے کے سارے حقائق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، تب اِن کے ہوش ٹھکانے آئیں گے، یہ مُردے سمجھنے کے نہیں، یہ قیامت کو ہی سیدھے ہوں گے، تو پھر اس تفسیر کے مطابق موتی کا مصداق وہی کافر ہیں اور موتی القلوب مُراد ہیں۔ اور اگر موتی سے حقیقی مُردے مُراد ہوں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ درمیان میں یہ بعث کی طرف اشارہ کردیا، کہ یہ سننے والے نہیں ہیں، ماننے والے نہیں، آخر ایک وقت آئے گا کہ اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا، قیامت میں اپنی طرف ان کو جمع کرکے لائے گا، پھر ان کے نہ ماننے پر اِن کو سزا دے دیگا، پھر اس کا تعلق مسئلہ معاد کے ساتھ ہوجائے گا۔

رَدِّ شرک کے لئے آفاقی دلائل

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ: یہ کہتے ہیں کہ آپ پر کوئی نشانی آپ کے رَبّ کی طرف سے کیوں نہیں اُتاری جاتی؟ یعنی جیسا ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اللہ قدرت رکھتا ہے اس بات پر کہ کوئی نشانی اُتار دے، لیکن اِن میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں'' کہ ان کے مطالبے کا پورا کرنا ان کے حق میں مفید نہیں ہے۔ باقی! آیاتِ آفاقی کی طرف توجہ کرو، کہ زمین کے اندر کتنی چلنے پھرنے والی چیزیں ہیں، اور فضا کے اندر کتنے اُڑنے والے پرندے ہیں، وہ بھی تمہاری طرح مختلف جماعتیں ہیں، اللہ تعالیٰ

نے اُن کو بھی خاص خاص استعداد دے کر پیدا کیا ہے، اپنی استعداد کے دائرے کے اندر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح سے تم بھی ایک جماعت ہو انسانوں کی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی ایک استعداد دی ہے، تمہارا بھی ایک دائرہ متعین کیا ہے، تو جس طرح سے وہ پرندے اور حیوانات اللہ کی تقدیر کے تحت اپنے اپنے کام کر رہے ہیں، تو انسانوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو استعداد ان کے لئے مقدر کی ہے اُس سے فائدہ اُٹھائیں، اور اس کو کام میں لائیں، اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی حکمت کو پورا کریں۔ اور یوں بھی اس کا مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ یہ چیز بھی معاد سے تعلق رکھتی ہے، کہ جو دابہ زمین میں ہے، جو پرندہ فضا میں اُڑنے والا ہے، یہ بھی تمہاری طرح مختلف جماعتیں ہیں، جماعتوں کی شکل میں یہ پیدا ہوئے، جماعتوں کی شکل میں یہ مریں گے اور آخرت میں جماعتوں کی شکل میں اُٹھیں گے، ہر ہر جانور کو، ہر دابہ کو اللہ تعالیٰ اُٹھائے گا، اور اُٹھانے کے بعد پھر اپنی شانِ عدالت کو ظاہر کرے گا، کہ ایک جانور نے، ایک پرندے نے بھی دوسرے پرندے کے اُوپر کوئی ناجائز تجاوز کیا ہے، زیادتی کی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کا بدلہ دلائیں گے، اور بدلہ دلانے کے بعد پھر ان سب کو مٹی کر دیا جائے گا، پھر ان کو دوزخ یا جنت میں نہیں بھیجا جائے گا، اور ان سے بدلہ دلانا یہ سارے کا سارا شانِ عدل کو نمایاں کرنا ہے۔ ورنہ اس کے بعد پھر ان کو مٹی کر دیا جائے گا، اور یہی وقت ہوگا جب کافر تمنا کریں گے: یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (پ ۳۰۔ سورۂ نبا) کافر بھی کہے گا کہ ہائے کاش! میں بھی مٹی ہو جاتا، جس طرح سے ان کو مٹی کر دیا گیا۔ اور اگر اس کو معاد کے ساتھ نہ لگایا جائے تو پھر اس کا مفہوم یونہی ہے جیسے میں ادا کر رہا ہوں، ''فوائد عثمانی'' میں اس کا مفہوم اسی طرح سے ادا کیا گیا ہے، گویا کہ یہ آیاتِ آفاقی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، کہ پرندے اللہ کے پیدا کیے ہوئے اپنے خاص دائرے کے اندر کس طرح سے اپنی استعداد سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اللہ کی حکمت کو پورا کرتے ہیں، تو انسانوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بھی جس استعداد کو مقدر کیا ہے، جیسی صلاحیتیں ان کے لیے رکھی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھائیں، اور اپنے اپنے دائرۂ اختیار کے اندر اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائیں۔

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ: ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، ہر چیز کا احاطہ کر لیا، لوحِ محفوظ میں ہر چیز مقدر ہے، لکھی ہوئی ہے، ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ: پھر یہ اپنے ربّ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، یعنی بہروں گونگوں کی طرح ہیں، ظلمات میں پڑے ہوئے ہیں، اُن کے سامنے کوئی ہدایت کی روشنی نہیں، ''اللہ جسے چاہتا ہے اُسے بھٹکا دیتا ہے۔'' ''جسے چاہتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ جو اُس کی قانون کی زد میں آ جائے، ایک آدمی اُلٹ راستے پر چلتا ہے تو اللہ کو کوئی مجبوری نہیں کہ اُس کو زبردستی سیدھے راستے پر چلائے، اُلٹا چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اُلٹا چلا دیتا ہے، ''اور جس کے متعلق چاہتا ہے اسے صراطِ مستقیم پر ثابت کر دیتا ہے'' صراطِ مستقیم پر ثابت کرنا چاہتا کس کے متعلق ہے؟ کہ جو اپنے ارادے اور قصد کے ساتھ سیدھا چلنا چاہتا ہے۔

رَدِّ شرک پر دلیلِ نفسی

''آپ اُن سے کہیے'' یہ دلیل نفسی ہے جس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، اور یہ بات مشرکین میں تھی کہ چھوٹی موٹی تکلیفوں

میں تو بتوں کے سامنے ناک رگڑتے تھے، اور جب کوئی بڑی آفت آجاتی تھی تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان بتوں کے بس کے بات نہیں ہے، پھر سیدھا خدا کو پکارتے تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم نے آخر کار اسی دروازے کو کھٹکھٹانا ہے، تم سمجھتے ہو کہ یہ عاجز ہیں پھر تم اللہ تعالیٰ کی توحید کے قائل ہی کیوں نہیں ہو جاتے؟ کئی جگہ سمندر کے سفر کا ذکر کر کے، یا دوسرے واقعات ذکر کر کے یہی بتایا گیا ہے کہ شرک فطرت کی آواز نہیں ہے، فطرت کی آواز وہ ہے کہ جب انسان حالات سے مجبور ہو جاتا ہے تو جو دل سے آواز نکلتی ہے، اور حالات کی مجبوری کے تحت تم بھی پھر آخر کار اللہ کو ہی پکارتے ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہ مصیبت ایسی ہے کہ جس کو کوئی دوسرا دُور نہیں کر سکتا۔ "آپ کہہ دیجئے! تم بتلاؤ، اگر تمہارے پاس اللہ کا عذاب آ گیا یا تمہارے پاس قیامت آ گئی، کیا اللہ کے غیر کو تم پکارو گے؟ اگر تم اپنے اس دعویٰ شرک میں سچے ہو" کہ کوئی دوسرا کارساز بھی ہے، نہیں نہیں، دوسروں کو نہیں پکارو گے، اس وقت سب ہوا ہو جائیں گے جتنے بھی تم نے بنا رکھے ہیں، "بلکہ اُسی کو پکارو گے، پھر دُور ہٹا دے گا وہ تکلیف جس کے دُور کرنے کی طرف تم پکارو گے اگر چاہے گا" اور بھول جاؤ گے تم یا بھول جاتے ہو، دونوں طرح سے ہو سکتا ہے، "بلکہ تم اسی کو پکارتے ہو، پھر وہ دُور ہٹا دیتا ہے اس چیز کو جس کے دُور کرنے کی طرف تم اسے پکارتے ہو اگر وہ چاہتا ہے، اور بھول جاتے ہو تم ان کو جن کو شریک ٹھہراتے ہو۔" اور اگر اسی عذاب کے ساتھ اس کا تعلق لگانا ہو کہ "اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو تم اُسی کو پکارو گے، پھر اگر اللہ چاہے گا تو اس کو دُور ہٹا دے گا جس کے دُور کرنے کے لئے تم آوازیں دے رہے ہو، اور بھول جاؤ گے تم اُن چیزوں کو جن کو شریک ٹھہراتے ہو۔"

خوش حالی اور بدحالی حق و باطل کی علامت نہیں

"البتہ تحقیق بھیجا ہم نے آپ سے قبل مختلف جماعتوں کی طرف" یعنی رسولوں کو، اب آگے اللہ تعالیٰ اس حکمت کو نمایاں کرتے ہیں، جس میں انسان کی ایک ذہنی غلطی کا ازالہ مقصود ہے، وہ ذہنی غلطی کیا ہے؟ کہ جب انبیاء علیہم السلام لوگوں کو آ کر کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کو تسلیم کرو، قبول کرلو، تو تم دُنیا اور آخرت کے اندر کامیابی پاؤ گے، اور اگر تم اس کو تسلیم نہیں کرتے تو دُنیا اور آخرت میں برباد ہو جاؤ گے۔ تو یہ انکار کرنے والے لوگ، تکذیب کرنے والے لوگ دیکھتے ہیں کہ بھائی! مال کے اندر ہم زیادہ، دولت کے اندر ہم زیادہ، قوت میں ہم زیادہ، تو پھر یہ کیسے کہتے ہیں کہ اگر ہماری باتیں تسلیم نہیں کی جائیں گی تو تم یوں ہو جاؤ گے، دوں ہو جاؤ گے، اُلٹا ہم دیکھتے ہیں کہ ماننے والے رگڑے میں ہیں، اور جو انکار کرنے والے ہیں وہ عیاشی کر رہے ہیں اور خوب اچھی طرح سے اپنا وقت گزار رہے ہیں۔ تو یہ ذہنوں کے اندر ایک بات آتی ہے اور ہر دور میں انسانوں کے دماغ میں یہ بات آتی ہے، اور آج بھی منکر لوگ اور کافر قسم کے لوگ اپنی خوش حالی کو اپنے حق پہ ہونے کی دلیل بناتے ہیں، اور کسی کی بدحالی کو اس کے باطل پہ ہونے کی دلیل بناتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ یہاں یہی حکمت واضح کرتے ہیں کہ ہمارے طریقے مختلف ہیں، ہم قوموں کی طرف رسول بھیجا کرتے ہیں، پھر کبھی تو اُن کو مخالفت کی بنا پر مالی تنگی میں بدنی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں، یہ ہوتی ہے تنبیہ، اور اس تنبیہ کے اندر نیک بد سارے ہی شامل ہو سکتے ہیں، جس سے وہ متنبہ ہو جائیں، اللہ کی طرف اُن کی لجاجت اور اُن کی زاری بڑھ جائے، اور وہ عاجز ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کی قوت اور اُس کی قہاریت کو تسلیم کر کے اُس کے سامنے اپنی بندگی اور عجز کا اظہار کرنا شروع کر دیں۔

لیکن اگر واقعہ ایسا ہو کہ اس قسم کی چھوٹی موٹی تکلیفوں کو وہ محسوس نہیں کرتے، اور اس کو بھی بخت و اتفاق پر محمول کر کے سمجھتے ہیں کہ جیسے دُنیا میں ہوتا رہتا ہے، کبھی کیسے ہو گیا کبھی کیسے ہو گیا، یہ بھی ایسے ہی ہے، دلوں کے اندر کوئی رقّت پیدا نہیں ہوئی، تو پھر ہماری طرف سے ایک دوسرا ابتلاء بھی آتا ہے، کہ ہم پھر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں، اُس قوم کو خوش حال کر دیتے ہیں، خوب اُن کو رزق دیتے ہیں، دُنیا کے اندر وہ قوم بڑھتی اور پھولتی ہے، جس وقت وہ خوب اچھی طرح سے غافل ہو جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کی بجائے اُس کے اُوپر طاقت کے بل بوتے پر اکڑنے لگ جاتے ہیں، اور وہ اس قسم کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں کوئی آ نہیں سکتا، سب سے زیادہ زور آور ہم ہیں، پھر اللہ کے عذاب کا ایک ہی تھپڑ لگتا ہے اور ان سب کے ہوش ٹھکانے آ جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو گرفت ہوتی ہے اُس گرفت سے پھر چھوٹنے کی کوئی سبیل نہیں ہوتی، اس لیے اگر منکرین خوش حالی میں ہوں تو بھی اُن کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر تنبیہ کے طور پر کوئی تکلیف آتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا چاہیے، یہ دونوں قسم کے فتنے ہی آزمائش کے طور پر آتے ہیں، کبھی تکلیف کا کبھی خوش حالی کا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت حالات بدلتے رہتے ہیں، خوش حالی سے کبھی استدلال نہ کرو کہ ہم حق پر ہیں، اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو یہ خوش حالی کیوں ہوتی، بسا اوقات یہ کھلایا پلایا اس لیے جاتا ہے تاکہ ان کو موٹا تازہ کر کے پھر قربانی چڑھایا جائے۔ ''البتہ تحقیق بھیجا ہم نے مختلف جماعتوں کی طرف آپ سے قبل پھر پکڑا اُن کو ہم نے سختی میں اور تکلیف میں تاکہ وہ عاجزی کرنے لگ جائیں، پس کیوں نہ عاجزی کی انہوں نے جب اُن کے پاس ہمارا عذاب آیا، لیکن اُن کے دل سخت ہو گئے، اور شیطان نے مزین کر دیا اُن کے لیے انہی کاموں کو جو وہ کرتے تھے۔'' شیطان نے یہی سمجھایا کہ تمہارا طرزِ عمل ٹھیک ہے، فلاں تکلیف جو آئی تھی وہ اہلِ باطل ہونے کی وجہ سے نہیں آئی تھی، ایسے ہوتی رہتی ہیں، ورنہ اب بھی تو ہم اہلِ باطل ہی ہیں، اب ہم خوش حال کیوں ہو گئے؟ معلوم ہو گیا کہ تمہارا طرزِ عمل ٹھیک ہے، پہلے جو تم تکلیف میں مبتلا ہوئے تھے، تو طرزِ عمل کی غلطی کی بنا پر نہیں ہوئے تھے، تمہاری وہ کارروائی ٹھیک تھی، اگر وہ تمہارا طرزِ عمل غلط ہوتا تو اب تم خوش حال کیوں ہو گئے؟ اس طرح سے اُن کے وہ اعمال جن کے اندر وہ لگے ہوئے تھے شیطان اُن کو اچھے کر کے دکھاتا ہے، ''پس جب وہ بھول گئے اُس چیز کو جس کے ساتھ نصیحت کیے گئے تو کھول دیے ہم نے اُن کے اُوپر دروازے ہر شَے کے'' یعنی دُنیا کی ہر نعمت کے دروازے کھول دیے، سب سے زیادہ اُن کو خوش حال کر دیا، ''حتّٰی کہ جب وہ اکڑنے لگ گئے اُس چیز کے ساتھ جو وہ دیے گئے'' اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً: پھر ہم نے انہیں پکڑ لیا اچانک، فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ: پس اچانک وہ مایوس ہو گئے، پھر اُن کو کوئی اُمید نہ رہی کہ اب ہم چھوٹ جائیں گے، فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا: پھر کاٹ دی گئی جڑ اُن لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا، اور پھر ظالموں کی جڑ کا کٹ جانا یہی عالمین کے لیے اللہ کی رحمت ہے، رَبّ العالمین ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ اس عالمین کے اندر ظالموں کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے۔

خوش حالی پر اِترانے والوں کے لئے وعید

''آپ کہہ دیجئے کہ تم بتلاؤ اگر اللہ تمہارے کان چھین لے، آنکھیں چھین لے، تمہارے دلوں پر مُہر لگا دے، کوئی اللہ کا

غیر معبود ہے جو تمہارے پاس یہ چیزیں لے آئے گا؟'' اگرچہ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ کو'' اِن'' شرطیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت کہ کان چھین لے، آنکھ چھین لے، دِلوں کی استعداد ختم کردے، یہ صرف ایک مفروضہ ہی نہیں، دُنیا کے اندر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اللہ کی حکمت کے تحت، اِبتداءً ہی اللہ کسی کو آنکھ نہ دے، ایسا بھی ہوتا ہے، دُنیا زور لگا لے، دوبارہ آنکھ آتی ہے؟ دے کر چھین لے، اِبتدا سے ہی کانوں کے اندر سننے کی صلاحیت نہ رکھے، ایسا بھی ہوتا رہتا ہے، اور کانوں کے اندر سننے کی صلاحیت تھی اور پھر بعد میں چھین لی، تو سونے کے ڈھیر خرچ کرلو، جو چاہو کرلو، ساری دُنیا کے ڈاکٹر اکٹھے کرلو، یہ گئی ہوئی نعمتیں پھر کوئی طاقت واپس نہیں لاسکتی، اِس کے اُوپر قدم قدم پر لوگوں کا عجز روزمرہ نمایاں ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو چھین لیتا ہے تو پھر واپس لانے کی کسی میں طاقت نہیں، آج تک دُنیا عاجز ہے اور اِن شاء اللہ العزیز! عاجز ہی رہے گی، یہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی بڑی نعمتیں ہیں کہ جس وقت وہ دیتا ہے اُس وقت اُن کی قدر نہیں ہوتی، جب چھنتی ہیں تب پتا چلتا ہے، تو اس میں ان کا عجز ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ'' اگر اللہ تمہارے کان لے لے اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دِلوں پر مُہر لگا دے'' جس طرح سے پاگل کردیتا ہے، بے وقوف بنا دیتا ہے، دِلوں کی اِستعداد ختم ہوجاتی ہے،'' کوئی اللہ کا غیر معبود ہے جو تمہارے پاس اس کو لے آئے گا؟ دیکھ! ہم کیسے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ لوگ اعراض کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، اگر تمہارے پاس اللہ کا عذاب اچانک آجائے'' اچانک کا معنی آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا کہ علامات نمایاں نہیں، اچھے بھلے خوش حال ہنستے کھیلتے بوٹر سوٹر بس میں جا کر بیٹھے اچانک ٹھاہ ہوگئی، کوئی دیر لگتی ہے؟ یہ اچانک عذاب ہوتا ہے، یا آج کل اچانک عذاب اور اچانک گرفت یوں بھی ہے کہ بیٹھے ہیں اور بیٹھے بیٹھے ہی ہارٹ اٹیک ہوگیا، یہ واقعات اچھوں کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں، بُروں کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں، لیکن اچھوں کے لیے یہ اللہ کی رحمت ہوتے ہیں، یہ حکمت آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کی، اور بُروں کے لیے یہ عذاب ہوتے ہیں، بایں معنیٰ کہ سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا، اور جس شخص کی تیاری ہے آخرت کی طرف جانے کے لیے اور وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سنبھالے بیٹھا ہے، اُس کے لیے تو رحمت ہے کہ ایک ہی قدم اُٹھایا اور آخرت میں گئے، نہ چارپائی پہ ہڈیاں رگڑیں، نہ کسی کے لیے مصیبت بنے، نہ اپنے لیے تکلیف اُٹھائی، ایک ہی اشارے میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اس لیے اُن کے لیے یہ رحمت ہے،[1] اور بُروں کے لیے بایں معنیٰ عذاب ہوتا ہے کہ اگر یہ اس طرح سے نہ مرتے، اچانک نہ پکڑے جاتے تو شاید ان کے سنبھلنے کی کوئی گنجائش نکل آتی، توبہ تائب ہوجاتے، تو اللہ تعالیٰ موقع ہی نہیں دیتا، اس لیے مَوْتُ الْفُجَاءَةِ اَخْذَةُ الْاَسِفِ: اچانک موت جو ہے یہ غضب ناک کی گرفت ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ غضب ناک ہو کر گرفت فرمالیتے ہیں۔ جَهْرَةً کا معنی کھلم کھلا علی الاعلان، علامات کے نمایاں ہونے کے ساتھ۔'' نہیں ہلاک کیے جائیں گے مگر ظالم لوگ۔''

منصبِ رِسالت کی وضاحت

'' نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والے ہوتے ہیں، اور ڈرانے والے ہوتے ہیں'' یہ ہے

---

(۱) حضرت حکیم العصر رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ انتقال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ قدس اللہ سرہ العزیز طیب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ

منصبِ رسالت، منصبِ رسالت یہ ہے کہ رسول مبشر ہوتا ہے اور منذِر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَحکام پہنچاتا ہے، اور ماننے والوں کے اچھے انجام کی ان کو خبر دیتا ہے، نہ ماننے والوں کے بُرے انجام کی ان کو خبر دیتا ہے، یہ ہے اصل منصب، پھر آگے قوم کا کام ہے کہ ان کی باتوں کو سُن کر مان لے، اپنے حالات دُرست کرلے تو بے خوف وخطر وہ دُنیا اور آخرت میں زندگی گزاریں گے، نہ اُن پہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن ہوگا، اور جو اُن کی باتوں کو تسلیم نہیں کرتے اُن کو پھر عذاب پکڑ لیتا ہے اُن کی نافرمانی کی بنا پر، یہ ہے اصل میں منصبِ رسالت، باقی! رسول کا یہ منصب نہیں ہوتا کہ تم جو کہو وہ کر کے دِکھادے، جو پوچھو وہ بتادے، یا تمہارا یہ اعتراض کہ تُو تو انسان ہے، تُو تو کھاتا ہے، تُو تو پیتا ہے، تیری تو بیویاں ہیں، تیرے تو بچے ہیں، تُو تو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، مختلف آیات کے اندر یہ اعتراض کافروں کی طرف سے نقل کیے گئے ہیں، یہ اعتراضات جو تم کرتے ہو اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسالت کے منصب کو پہچانا نہیں، کہ رسول واقعی ایک بشر ہوتا ہے، اُس کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ میں فرشتہ ہوں، تو جب وہ ہوتا ہی بشر ہے تو بشر والے اَحوال اُس کے اُوپر طاری ہوں گے، تو تمہیں اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ یہ اعتراض کہ تُو تو کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا ہے، یہ اعتراض تم تب کرو کہ اس نے دعویٰ کیا ہو کہ میں فرشتہ ہوں یا انسان سے اُوپر کوئی اور جنس ہوں، تو جب اس کا یہ دعویٰ ہی نہیں تو پھر تمہارے یہ اعتراض کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور پھر کہتے ہو کہ بتاؤ فلاں کام کب ہوگا؟ عذاب کب آئے گا؟ یہ کب ہوگا؟ وہ کب ہوگا؟ جب وہ نہیں بتاسکتے تو کہتے ہو کہ تم کیسے رسول ہو؟ یہ بات تو تم تب کہو کہ رسول نے دعویٰ کیا ہو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں، جو پوچھو بتاؤں گا، میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، تو جب اُن کا یہ دعویٰ ہی نہیں تو پھر تمہارے اس قسم کے سوالات کرنے کا کیا مقصد؟ اور نہ رسول کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت کے سارے خزانے میرے قبضے میں آگئے، اس لیے جو تم کہو وہ کر کے دکھادیں، اس طرح سے تم رسول کی آزمائش کرنا چاہو، یہ ساری کی ساری تمہاری باتیں ایسی ہیں کہ تم رسول کا منصب ہی نہیں سمجھتے کہ رسول ہوتا کیا ہے؟ رسول ایک بشر ہوتا ہے، اس لیے بشر کے احوال اُس کے اُوپر طاری ہوں گے، یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے، اور رسول عالم الغیب نہیں ہوتا، اللہ کی طرف سے وحی آئے تو اُس کو کسی چیز کی اطلاع ہوگی، وحی نہ آئے تو اُس کو کچھ پتا نہیں، اس لیے اللہ کی طرف سے اطلاع ملے گی تو تمہیں جواب دے گا، اللہ کی طرف سے اطلاع نہیں ملتی تو جواب نہیں ملتا، اور وہ بھی اُسی طرح سے اللہ کی قدرت کے تحت ہوتا ہے جس طرح سے دوسرے ہیں، اللہ کی قدرت کے خزانے اس کے پاس نہیں ہوتے، لہٰذا تمہاری ہر فرمائش کا پورا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے، یہ تمہارے سوالات غلط ہیں، تم اللہ کے رسول کو اس معیار پر نہ پرکھو، اللہ کا رسول ایک انسان ہوتا ہے اور اس کو مبشر اور منذِر بنا کر بھیجا جاتا ہے، اُس کی بات ماننے میں فلاح ہے، اور اُس کی بات نہ ماننے کے اندر اپنی بربادی ہے، یہ ہے اصل کے اعتبار سے رسول کا منصب۔ تو آپ بھی انہیں کہہ دیجئے، اپنا منصب واضح کردیجئے کہ ''میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب جانتا ہوں (یا یہ معنی ہے کہ ''اور نہ میں غیب جانتا ہوں'') اور نہ میں تمہیں یہ بات کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، نہیں اتباع کرتا میں مگر اسی بات کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اندھے اور سوانکھے برابر نہیں ہوتے۔'' اس لیے تم آنکھیں کھولو، اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں

اس کو دیکھو، سمجھو، اور اندھے بن کر تم اپنی زندگی نہ گزارو، کہ دائیں بائیں تم جھانکتے ہی نہیں، دیکھتے ہی نہیں کہ تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ نے کیا دلائل بکھیر دیئے، تمہارے آگے پیچھے کس قسم کی اللہ تعالیٰ نے آیات قائم کی ہیں، اندھے نہ بنو، ''اندھا اور سوانکھا برابر نہیں ہوتے'' اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ

اور ڈرائیں آپ اس قرآن کے ذریعے سے اُن لوگوں کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ جمع کیے جائیں گے اپنے رَبّ کی

مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ

طرف ایسے حال میں کہ اُن کے لئے اللہ کے علاوہ نہ کوئی ولی ہوگا نہ شفاعت کرنے والا، تاکہ وہ ڈر جائیں ﴿۵۱﴾ دُور نہ ہٹا اُن لوگوں کو

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ

جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح وشام، چاہتے ہیں وہ اس کی رضا، نہیں ہے آپ کے ذِمّے

مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ

اُن کے حساب سے کوئی شَے، اور نہ آپ کے حساب سے اُن کے ذِمّے کوئی شَے،

فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ

کہ آپ اُن کو دُور ہٹائیں، پس ہو جائیں گے آپ ظالموں میں سے ﴿۵۲﴾ اور ایسے ہی ہم نے آزمائش میں ڈالا ان کے بعض کو بعض

لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ

کے ساتھ، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا یہی ہیں جن کے اُوپر اللہ نے احسان کیا ہمارے درمیان سے؟ کیا اللہ تعالیٰ

بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ

شاکرین کو خوب نہیں جانتا؟ ﴿۵۳﴾ اور جس وقت آپ کے پاس آئیں وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر، تو

عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ

آپ اُنہیں کہیے کہ تم پر سلام ہو، تمہارے رَبّ نے اپنے اُوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے، کہ بیشک بات یہ ہے کہ جو کوئی تم میں سے کوئی

سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾

بُرا کام کر بیٹھے نادانی کے ساتھ پھر اُس کے بعد وہ توبہ کرلے اور اپنے حالات کی اصلاح کرلے پس بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ﴿۵۴﴾

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلِتَسۡتَبِيۡنَ سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۵۵﴾

اور ایسے ہی ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں آیات کو، اور تاکہ ظاہر ہوجائے مجرمین کا راستہ ﴿۵۵﴾

قُلۡ اِنِّىۡ نُهِيۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ قُلْ

آپ کہہ دیجئے کہ بیشک میں روک دیا گیا ہوں اس بات سے کہ میں عبادت کروں اُن کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے!

لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهۡوَآءَكُمۡ‌ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾

کہ میں اتباع نہیں کرتا تمہاری خواہشات کی، تب میں گمراہ ہوجاؤں گا اور میں راہ پانے والوں میں سے نہیں ہوں گا ﴿۵۶﴾

قُلۡ اِنِّىۡ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَكَذَّبۡتُمۡ بِهٖ‌ؕ مَا عِنۡدِىۡ مَا

اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ بیشک میں واضح دلیل پر ہوں اپنے پروردگار کی طرف سے اور تم نے اس کی تکذیب کی، نہیں ہے میرے پاس

تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِهٖ‌ؕ اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ‌ؕ يَقُصُّ الۡحَـقَّ وَهُوَ خَيۡرُ

وہ چیز جس کو تم جلدی طلب کرتے ہو، نہیں ہے حکم مگر اللہ ہی کے لیے، اللہ بیان کرتا ہے حق کو، اور وہ سب سے بہتر

الۡفٰصِلِيۡنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوۡ اَنَّ عِنۡدِىۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِهٖ لَقُضِىَ الۡاَمۡرُ

فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۵۷﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کو تم جلدی طلب کرتے ہو تو البتہ فیصلہ کردیا جاتا اُمر کا

بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ

میرے اور تمہارے درمیان، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو ﴿۵۸﴾ اُسی کے پاس ہیں غیب کے خزانے،

لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ‌ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ‌ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ

نہیں جانتا ان خزانوں کو مگر وہی، اور جانتا ہے اُس چیز کو جو خشکی میں ہے اور سمندر میں ہے، نہیں گرتا کوئی پتہ

اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ

مگر اللہ اُس کو جانتا ہے، اور نہیں ہے کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں اور نہ کوئی تر چیز نہ کوئی خشک چیز مگر وہ

كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ
کتاب مبین میں ہے ﴿۵۹﴾ اللہ وہ ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے رات کو اور جانتا ہے اُس چیز کو جو تم کرتے ہو
بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ
دن کو، پھر دن میں تمہیں اللہ تعالیٰ اُٹھاتا ہے تاکہ وقتِ معین پورا کر دیا جائے، پھر اُسی کی طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے،
ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾
پھر وہ تمہیں خبر دے گا اُن کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے ﴿۶۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاَنْذِرْ بِهٖ: بِہٖ کی ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ رہی ہے جس کے اوپر پچھلے الفاظ دلالت کر رہے ہیں اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ، ''اور ڈرائیں آپ'' بِهٖ: اس قرآنِ کریم کے ذریعہ سے، الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ: ان لوگوں کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ جمع کیے جائیں گے اپنے رَبّ کی طرف، لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ: ایسے حال میں کہ ان کے لیے اللہ کے علاوہ نہ کوئی ولی ہوگا نہ شفاعت کرنے والا، لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: تاکہ وہ ڈر جائیں، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں، اللہ کی معصیت سے اور نافرمانی سے بچیں۔ وَلَا تَطْرُدِ: طَرَدَ کا معنی ہوتا ہے کسی کو دھتکار دینا، دور دفع کر دینا، وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ: دُور نہ ہٹا ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح و شام، چاہتے ہیں وہ اس کی رضا، ارادہ کرتے وہ اللہ کے وجہ کا، اس کی رضا چاہتے ہیں، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ: نہیں ہے آپ کے ذِمّے ان کے حساب سے کچھ بھی۔ حِسَابِهِمْ کی ضمیر الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور ان کو دُور ہٹانے کا مطالبہ کرنے والے جو کفار تھے ان کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، تفسیر میں یہ مطلب واضح ہو جائے گا، ''نہیں ہے آپ کے ذِمّے اُن کے حساب سے کوئی شئ'' وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ: اور نہ آپ کے حساب سے اُن کے ذِمّے کوئی شئ، فَتَطْرُدَهُمْ: کہ آپ ان کو دُور ہٹائیں فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: پس ہو جائیں گے آپ ظالموں میں سے۔ ''نہیں ہے آپ کے ذِمّے ان کے حساب سے کچھ بھی کہ آپ انہیں دُور ہٹائیں پھر ہو جائیں آپ بے انصافوں میں سے'' وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ: اور ایسے ہی ہم نے آزمائش میں ڈالا ان کے بعض کو بعض کے ساتھ، لِيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: یہ لام لامِ عاقبت ہے۔ ''جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا یہی ہیں جن کے اوپر اللہ نے احسان کیا ہمارے درمیان سے؟'' اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ شاکرین کو خوب نہیں جانتا؟ اچھی طرح سے نہیں جانتا؟ یعنی جانتا ہے، وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ: اور جس وقت آپ کے پاس آئیں وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر، فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ: تو آپ انہیں کہیے کہ تم پر سلام ہو، كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

تمہارے رَبّ نے اپنے آپ پر رحمت کولازم کرلیا ہے، اپنی ذات پر لازم کرلیا ہے رحم کرنا، اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ: اللہ نے جو اپنے اوپر رحمت لازم کی ہے اس کا یہ بیان ہے، وہ رحمت اس انداز سے ظاہر ہوگی ''کہ بے شک بات یہ ہے کہ جو کوئی تم میں سے کوئی برا کام کر بیٹھے نادانی کے ساتھ'' ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ: پھر اس برا کام کرنے کے بعد وہ توبہ کرلے، وَاَصْلَحَ: اور اپنے حالات کی اصلاح کرلے، فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: پس بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، فَالامرُ اَنَّهٗ غفورٌ رَحِيمٌ۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ: ''اور ایسے ہی ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیات کو''، وَلِتَسْتَبِيْنَ: اس کا معطوف علیہ ظاہر کرلیجئے بات صاف ہوجائے گی، لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ المؤمنين وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ: ہم ہم کھول کھول کے آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ مجرمین کا راستہ بھی واضح ہوجائے اور مؤمنین کا راستہ بھی واضح ہوجائے۔ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: آپ کہہ دیجئے کہ مجھے روک دیا گیا ہے، بے شک میں روک دیا گیا ہوں اس بات سے کہ عبادت کروں اُن کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ: اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ میں اتباع نہیں کرتا تمہاری خواہشات کی۔ اھواء ھویٰ کی جمع ہے، دل کی خواہش۔ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا: تب میں گمراہ ہوجاؤں گا، تب کا معنی ہے کہ اگر میں نے تمہاری اہواء کی اتباع کی تب میں بھٹک جاؤں گا، وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ: اور میں راہ پانے والوں میں سے نہیں ہوں گا، ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوں گا۔ قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ: اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ بیشک میں بینہ پر ہوں، واضح دلیل پہ ہوں، مِّنْ رَّبِّيْ: اپنے پروردگار کی طرف سے، وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ: اور تم نے اس کی تکذیب کی، تم نے اس کو جھٹلایا، اب بِهٖ کی ضمیر بَيِّنَةٍ کی طرف لوٹ رہی ہے، لیکن لفظ کے اعتبار سے نہیں، اس کے مصداق کے اعتبار سے، اس کا مصداق قرآنِ کریم ہے، یا بینہ کا معنی دلیل و برہان ہے اس لیے مذکر کی ضمیر ادھر لوٹ گئی، ''تم اس دلیل کو، برہان کو جھٹلاتے ہو، یا تم اس قرآنِ کریم کی تکذیب کرتے ہو'' مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ: نہیں ہے میرے پاس وہ چیز جس کو تم جلدی طلب کرتے ہو، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: نہیں ہے حکم مگر اللہ ہی کے لئے، یعنی اللہ کے علاوہ حکم کسی کا نہیں چلتا، يَقُصُّ الْحَقَّ: اللہ بیان کرتا ہے حق کو، وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ: اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، فیصلہ کرنے والوں میں سے بہترین ہے، سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کو تم جلدی طلب کرتے ہو لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ: البتہ فیصلہ کردیا جاتا امر میرے اور تمہارے درمیان، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ: مفاتح مَفْتَح کی جمع بھی ہوسکتی ہے مِفْتَح کی جمع بھی ہوسکتی ہے، مِفتَح میم کے کسرے کے ساتھ پڑھیں گے تو یہ کنجی اور چابی کے معنی میں ہے، کھولنے کا آلہ، اور مَفتَح میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھیں گے تو یہ خزانے کے معنی میں ہے، مفہوم دونوں طرح سے ایک ہی نکلے گا، ''اُسی کے پاس ہیں غیب کے خزانے، یا اسی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں'' یعنی غیب کے خزانوں کی کنجیاں۔ غیب مغیبات کے معنی میں ہوتا ہے، اور مغیبات کا مصداق وہ چیزیں ہوتی ہیں جو ابھی تک عالمِ وجود میں نہیں آئیں، یا عالمِ وجود میں تو آئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کے سامنے ان کو ظاہر نہیں کیا، ''غیب کے خزانے سارے کے سارے اللہ ہی کے پاس ہیں'' لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ: نہیں جانتا ان خزانوں کو مگر وہی، وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: اور جانتا ہے اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور سمندر میں ہے، وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا: نہیں گرتا کوئی پتا مگر اللہ اس کو جانتا ہے، وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ: اور نہیں ہے کوئی دانہ

زمین کی تاریکیوں میں، اور نہ کوئی تر چیز، نہ کوئی خشک چیز، اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ: مگر وہ کتاب مبین میں ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ: اللہ وہ ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے رات کو، وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ: اور جانتا ہے اس چیز کو جو تم کرتے ہو۔ جرح کسب کے معنی میں۔ جو تم کرتے ہو دن کو، ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ: پھر دن میں اللہ تعالیٰ تمہیں اُٹھاتا ہے، یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ، یَبْعَثُكُمْ فِی النَّهَارِ: فِیْهِ کی ضمیر نہار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پھر دن میں اللہ تعالیٰ تمہیں اُٹھاتا ہے، لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى: تاکہ وقت معین پورا کر دیا جائے، مدت معینہ پوری کر دی جائے، مدتِ معینہ سے مراد آپ کی زندگی ہے، یعنی اسی طرح سے دن رات کے ذریعے سے زندگی کی مدت پوری ہو جائے، ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ: پھر اسی کی طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے، ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ: پھر وہ تمہیں خبر دے گا، بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ

تفسیر

قرآنِ کریم کے ذریعے کن لوگوں کو ڈرانے کا حکم ہے اور کیوں؟

وَاَنْذِرْ بِهِ کا خطاب ہے سرورِ کائنات ﷺ کو، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ جو من مانی آیات کا مطالبہ کرتے ہیں، اور اپنے ایمان لانے کو اُن آیات کے ظہور کے اُوپر موقوف کرتے ہیں، انہیں تو چھوڑ دیجئے آپ نے اپنا منصب اِن کے سامنے ظاہر کر دیا کہ میں کوئی اللہ کے خزانوں کا مالک نہیں ہوں، اور نہ میں عالم الغیب ہوں، اور نہ میں کوئی فرشتہ ہوں، اس لیے اس قسم کے تمہارے ٹیڑھے ترچھے سوال پورے کرنے میرے بس کی بات نہیں ہے، جنہوں نے اپنے ایمان لانے کو اس قسم کی آیات کے مطالبے پر موقوف کیا ہوا ہے، نڈر قسم کے اور ڈھیٹ قسم کے لوگ ہیں، ان سے تو آپ صرفِ نظر کر لیجئے اور اس قرآنِ کریم کے ذریعے سے اُن لوگوں کو ڈرائیں جن کے دل میں کچھ نہ کچھ اندیشہ ہے اس بات کا کہ وہ اپنے رَبّ کی طرف جمع کیے جائیں گے، جن کو کچھ نہ کچھ فکرِ آخرت ہے کہ ہم نے اپنے مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، اور پیش ہونا بھی ایسے طور پر ہے کہ وہاں اگر پکڑے گئے تو چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا، کیونکہ اگر کسی کو آخرت کا خیال ہی نہیں، تو وہ بھی بے باک ہو کر کام کرے گا، اس کو کوئی فکر نہیں ہوگی کہ میں نے کسی کے سامنے حساب و کتاب بھی دینا ہے، تو اُس کی زندگی کبھی سیدھے رخ پر نہیں آسکتی، اور اگر کوئی آخرت کا خیال تو ہے لیکن باطل قسم کے سہارے بنا رکھے ہیں، جس طرح سے یہود و نصاریٰ نے بنا لیے تھے، کہ ہمیں فلاں چھڑا لے گا، ہم بزرگوں کی اولاد ہیں، ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا، یا ہمارا فلاں بڑا ہے اور اللہ کا مقبول بندہ ہے وہ ضرور ہمیں چھڑا لے گا، اس قسم کے نظریات اگر قائم کر لیے جائیں تو پھر آپ جانتے ہیں کہ آخرت کا عقیدہ ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے، آخرت کا عقیدہ مؤثر تبھی ہوگا کہ جب انسان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور اگر اللہ کی گرفت میں آگئے تو چھڑانے والا کوئی نہیں، تب جا کر یہ عقیدہ مؤثر ہو سکتا ہے، تو جن کے دل میں یہ اندیشہ ہے آپ انہیں ڈرائیے وہی آپ کے ڈرانے سے فائدہ اٹھائیں گے، اور دوسرے

لوگ جن کو کوئی کسی قسم کا فکر نہیں ہے وہ آپ کی باتوں سے متاثر نہیں ہو سکتے، اُن کا دھیان چھوڑ دیجئے۔'' ڈرائیے اس قرآنِ کریم کے ذریعے سے اُن لوگوں کو جو اندیشہ کرتے ہیں اس بات کا کہ وہ جمع کیے جائیں گے اپنے رَبّ کی طرف ایسے حال میں کہ اُن کے لیے اللہ کے علاوہ نہ کوئی یار ہوگا نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا'' کوئی اُن کا مددگار نہیں ہوگا، کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا، ان کو ڈرائیں'' تاکہ یہ تقویٰ اختیار کریں اور اللہ تعالیٰ کی معصیت سے بچیں'' گویا کہ اس میں یہ واضح کردیا گیا کہ تاثر بھی آئے گا جس وقت کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا اندیشہ دل میں آجائے، اور پیش ہونا بھی ایسے طور پر ہو کہ کوئی باطل سہارا انسان کے ذہن میں نہ ہو، ورنہ یہ شفاعت وغیرہ کے عقیدے جو ان لوگوں نے اختیار کررکھے تھے، کہ بالفرض آخرت ہوئی تو یہ ہمارے شفعاء ہیں عند اللہ، جو ہمیں چھڑالیں گے اور کسی قسم کی سزا نہیں ہونے دیں گے، اس قسم کے لوگ آپ کی وعظ ونصیحت سے متاثر نہیں ہوں گے۔

''جاہل'' اور'' عالم'' کے مقصدِ زندگی میں فرق

اگلی بات جو کہی جارہی ہے اُس کا پس منظر یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے ایک دفعہ یہ مطالبہ پیش کیا تھا، اور اس مطالبے کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ہم لوگ معزز ہیں، مال دار ہیں، صاحبِ جائیداد ہیں اور معاشرے کے اندر ہمیں ایک عزت کا مقام حاصل ہے، چونکہ جہالت کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ آخرت کے عقیدے میں تو ضعف ہوتا ہے یا سرے سے عقیدہ ہوتا نہیں، اور اُن کے نزدیک دُنیا کے اندر کمال یہی ہے کہ انسان کو کھانے کے لیے اچھا مل رہا ہو، پہننے کے لیے اچھا مل رہا ہو، رہنے کے لیے مکان اچھا ہو، جب بھی جہالت آئے گی وہ ان چیزوں کی اہمیت کو واضح کرے گی، کہ انسان کے سامنے اس کی حیوانی زندگی ہر وقت مستحضر ہوتی ہے، اور رُوحانی کمالات مستور ہوجاتے ہیں، رُوحانیت کی طرف متوجہ ہونا یہ علم کی وجہ سے ہوتا ہے، اور جہاں علم نہیں ہوگا جہالت ہوگی تو اُس کے سامنے یہی مقاصد ہیں کھانا پینا پہننا رہنا سہنا بیوی بچے، یہی چیزیں ہیں جو اِنسان کو جلدی سے اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں، اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ شاید زندگی کے مقاصد یہی ہیں، تو جب زندگی کے مقاصد ان کو قرار دے لیا جاتا ہے تو پھر معاشرے میں کامیاب اُنہیں سمجھا جاتا ہے جن کو یہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں، اور معاشرے کے اندر معزز اور بالادست انہی کو سمجھا جاتا ہے کہ جن کے پاس ان چیزوں کی فراوانی ہوتی ہے، جس کے پاس رزق فراواں ہے، جس کو پہننے کے لیے اچھے کپڑے مل رہے ہیں، جس کے رہنے کے لیے اچھا مکان ہے، وہ یوں سمجھا جاتا ہے گویا کہ زندگی کے اندر کامیاب ترین شخص یہی ہے، اور معاشرے کے اندر بالادستی بھی اُسی کو حاصل ہوتی ہے، بمقابلہ اُن لوگوں کے کہ جو غریب ہیں، فقیر ہیں، اور اُن کے پاس کوئی اندوختہ نہیں ہے، ذخیرہ نہیں ہے، اُن کا لباس اچھا نہیں، اُن کی رہائش اچھی نہیں، محنت اور مزدوری کرتے ہیں تھوڑا بہت کما کر لاتے ہیں، خود کھاتے ہیں، اپنے بچوں کو پالتے ہیں، اُن کو سمجھا جاتا ہے ذلیل اور کم درجے کے لوگ، ''کمی'' جنہیں کہتے ہیں، اور ان کو معاشرے کے اندر کوئی عزت اور مقام حاصل نہیں ہوتا، اور مال دار لوگوں کو، اچھا کھانے والوں کو، اچھا پہننے والوں کو، صاحبِ جائیداد لوگوں کو معاشرے کے اندر عزت حاصل ہوتی ہے، جب بھی جہالت آئے گی یہ نظریہ یقیناً سامنے آجائے گا، اور یہ نظریہ جہالت کا پیداوار ہے بایں معنی کہ انسان کی زندگی سے مقصد کیا ہے؟ اس میں انسان ٹھوکر کھا جاتا ہے، تو وہ

سمجھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا مقصد کمانا کھانا پہننا رہنا سہنا ہی ہے، اور جو شخص اس چیز کو زیادہ حاصل کرلے گا وہ اپنی زندگی میں کامیاب ہے، اس لیے وہ اس معاشرے کے اندر باعزت ہے۔ اور علم جب آتا ہے تو علم آکر یہ چیز نمایاں کرتا ہے کہ یہ چیزیں مقاصد میں نہیں، یہ تو انسان کی حیوانی زندگی کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ حیوان جاندار جتنے بھی ہیں وہ سارے کھانے کی فکر بھی کرتے ہیں، پینے کی فکر بھی کرتے ہیں، اور اسی طرح سے وہ اپنے رہنے سہنے کے لیے بھی اپنی اپنی شان کے مطابق انتظام کرتے ہیں، آپ کی کتنی ہی اچھی کوٹھی کیوں نہ ہو، بہترین قسم کی آپ کی بلڈنگ ہو، لیکن اگر کوئی چڑیا اس میں ٹھکانہ لگانا چاہے گی تو آپ کے صوفے سیٹوں کو وہ پسند نہیں کرے گی، وہ اپنی پسند کا گھر بنائے گی تنکوں کا، تبھی اُس میں رہے گی، اور آپ کے اچھے سے اچھے بنگلے جو ہیں اگر اُن میں چوہے آجائیں تو وہ آپ کے اچھے سے اچھے بنگلے اور ان کی کرسیوں پر گزارہ نہیں کریں گے، وہ اپنی حالت کے مطابق اپنی ایک کھڈ بنائیں گے، بل کھودیں گے، اس میں گزراہ کریں گے، اور اسی طرح سے کیڑے مکوڑے جو بھی آتے ہیں وہ اپنی حالت کے مطابق ایک مکان بناتے ہیں اور اُس میں گزارہ کرتے ہیں، آپ اُن کے گھونسلے کو، آپ اُن کی کھڈ کو اور ان کی کھوہ کو بُرائی کی نظر سے بے شک دیکھیں، لیکن جیسے آپ کو وہ پسند نہیں ہے آپ کی کوٹھیاں بنگلے اُن کو بھی پسند نہیں ہیں، جو انہوں نے اپنے ذہن کے اندر نقشہ اپنی رہائش کے لیے رکھا ہوا ہے وہ اس طریقے سے مکان بناتے ہیں، اور رہتے ہیں، اور بچے بھی جنتے ہیں اور بچوں کو پالتے بھی ہیں، اُن کے ساتھ محبت بھی کرتے ہیں، گرمی سردی سے بچاؤ کا ذریعہ بھی اختیار کرتے ہیں پھر اگر مقاصد یہی ہوں تو پھر انسان میں اور حیوان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، انسان میں اور حیوان میں اگر فرق ہے تو رُوحانی کمالات کے اعتبار سے ہے، کہ اللہ نے اس کو علم کا حامل بنایا ہے، رُوحانی کمالات کا حامل بنایا ہے، لہٰذا کامیاب ترین شخص وہ ہوگا جو کہ رُوحانی کمالات کا حامل ہے، لیکن اس بات کو نمایاں کرنے کے لیے آپ جانتے ہیں کہ علم چاہیے، اور جب علم نہیں ہوتا جہالت ہی جہالت ہوتی ہے، تو اُس وقت اِسی دولت کی، اسی سونے کی، چاندی کی، ریشم کی اور اس قسم کی چیزوں کی بالادستی ہوتی ہے، جس کے پاس یہ زیادہ حاصل ہوتے ہیں انسان سمجھتا ہے کہ کامیاب یہی ہے، پھر دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

انبیاء کی دعوت پر لبیک کہنے والے زیادہ تر غرباء کیوں ہوتے ہیں؟

انبیاء علیہم السلام کے واقعات آپ کے سامنے جو قرآنِ کریم میں آئیں گے اُن کے اندر یہ چیز بہت نمایاں طریقے سے ذکر کی جائے گی، کہ اکثر و بیشتر انبیاء علیہم السلام کو قبول کرنے والے، اُن کی ہدایت کو قبول کرنے والے، اُن کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس دُنیوی مال دولت سے اور اسباب سے کچھ محروم ہوتے ہیں، وہ اُن کو اس لیے قبول کرتے ہیں کہ دُنیوی مال و دولت یہ ایک تکبر کا ذریعہ ہوتا ہے، نخوت کا ذریعہ ہوتا ہے، دماغ کے اندر بڑائی اور بالادستی آجاتی ہے، وہ کسی کی اطاعت کر نہیں سکتے، اپنی خواہشات کو چھوڑ نہیں سکتے، اور دین قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی خواہشات قربان کرنی پڑتی ہیں، مساکین کی ایسی خواہش ہوتی ہی کوئی نہیں، ان کی اگر ہوتی بھی ہے تو ان کو قربان کرنے کی پہلے ہی عادت پڑی ہوئی ہوتی ہے، کہ اُن خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اُن کے پاس کوئی اسباب ہی نہیں ہوتے، اس لیے جب دین کی آواز بلند ہوتی ہے تو سرمایہ دار

طبقہ تو اس کو اپنی خواہشات کے ساتھ ٹکراتا ہوا محسوس کرتا ہے، اس لیے وہ تو کرتے ہیں انکار، اور مساکین کے طبقے کے ساتھ کوئی کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہوتا، اُن کی فطرت کسی درجے میں صاف ہوتی ہے، اس لیے وہ حق کی آواز کو جلدی قبول کر لیتے ہیں۔

سرمایہ دار کفار کی طرف سے غرباء کو دُور رکھنے کا مطالبہ کیوں ہوتا ہے؟

اور پھر سرمایہ دار اس کو ایک بہانہ بناتے ہیں کہ ہم آپ کی مجلس میں آ کر کیسے بیٹھیں، آپ کی مجلس کے اندر تو یہ کمینے قسم کے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، جیسے قومِ نوح نے یہ لفظ استعمال کیا تھا کہ آپ کی اتباع کرنے والے جو بھی لوگ ہیں هُمْ اَرَاذِلُنَا (سورۂ ہود:۲۷) وہ ہم میں سے ارذل ہیں، کمینے ہیں، رذی قسم کے لوگ ہیں، وہ آپ کو قبول کرنے والے ہیں، تو ہم آپ کی مجلس میں آئیں اور وہ ہمارے برابر بیٹھے ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہمارے گھروں کے یہ نوکر ہمارے سامنے کام کرتے ہیں تو ہم ان کو اپنی چارپائی کے قریب نہیں آنے دیتے، ان میں یہ جرأت نہیں ہے کہ ہمارے برابر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں، بلکہ یہ ہمارے ہاتھ کے ساتھ ہاتھ نہیں ملا سکتے، مصافحہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، تو آپ کی مجلس میں آ کر یہ جو مساوات دیکھنے میں آتی ہے کہ سب کے برابر بیٹھنا پڑے گا یہ ہم گوارا نہیں کر سکتے، اس لیے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی بات سنیں تو ان لوگوں کو اپنی مجلس سے دفع کر دیجئے، دُور ہٹا دیجئے، اس قسم کا لفظ انہوں نے استعمال کیا ہوگا جس کی نقل قرآنِ کریم نے کی ہے لَا تَطْرُدِ کے لفظ کے ساتھ، کہ ان کو دھتکار دو اپنی مجلس سے، یہ آپ کی مجلس میں نہ بیٹھیں، پھر ہم آئیں گے آپ کے پاس، اور آپ کے پاس آ کر بیٹھیں گے، اور آپ کی باتوں کو سنیں گے، ورنہ جب تک یہ مساکین لوگ بیٹھے ہیں، ہمارے نوکر چاکر، ہمارے غلام، یا ہمارے آزاد کردہ، ہمارے خادم قسم کے لوگ، اُس وقت ہم آپ کی مجلس میں آ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ تو یہ انہوں نے اپنے اُسی تکبر اور غرور کا اظہار کیا جو کہ عام طور پر مال دار طبقے میں اور سرمایہ دار طبقے میں مساکین کے مقابلے میں ہوا کرتا ہے، اور اِسی کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ دِین اگر کوئی اللہ کی نعمت ہے تو یہ بھی ہمیں ملنی چاہیے، جس طرح سے دوسری نعمتیں اللہ نے ہمیں دی ہیں اسی طرح سے یہ نعمت بھی ہمیں ملنی چاہیے، جیسے ان کا لفظ نقل کیا گیا: لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ (سورۂ احقاف:۱۱) کہ اگر یہ کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے سبقت نہ لے جا سکتے، جیسے دوسری بھلائیاں ہمیں حاصل ہیں یہ بھلائی بھی ہمیں حاصل ہوتی۔ بلکہ اسی زعم کے ساتھ وہ چاہتے تھے کہ نبی بھی ہم میں سے ہونا چاہیے تھا: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف:۳۱) مکہ اور طائف دونوں شہروں میں سے کسی سرمایہ دار کے اُوپر یہ قرآن کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اگر یہ کوئی اللہ کی نعمت تھی تو جن کو دوسری نعمتیں حاصل ہیں اُن کو یہ نعمت حاصل ہونی چاہیے تھی۔

مؤمنینِ مخلصین مساکین کے متعلق ہدایاتِ خداوندی

تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن مساکین کے متعلق جو کچھ بیان فرمایا یہ انتہائی درجے کی حوصلہ افزائی ہے اِن مساکین کی، پہلے تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو منع کر دیا: لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ: یہ نہیں کہا کہ اِن مساکین کو دُور نہ ہٹاؤ، کیونکہ ''مساکین'' کے لفظ کے اندر ان کا شرف نمایاں نہیں، اور یہاں بتانا یہ ہے کہ یہ لوگ اشرف ہیں، افضل ہیں، یہ قابلِ ترجیح ہیں، اور یہ قابلِ ترجیح مساکین ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ رُوحانی کمالات کی بنا پر ہیں، اور اگر کوئی مسکین ہے، اُس کے پاس مال نہیں، لیکن

یہ رُوحانی کمال بھی اُس کو حاصل نہیں ہے، وہ اسی طرح سے اپنے درجے کے مطابق دُنیادار ہے، دُنیا کے پیچھے لگا ہوا ہے، وہ کوئی قابلِ ترجیح نہیں، بلکہ اگر کوئی سرمایہ دار ایسا ہو کہ جس کے اندر اس قسم کی خصلتیں پیدا ہو جائیں وہ پھر قابلِ ترجیح ہے، ترجیح جو دینی ہے تو رُوحانی کمالات کی بنا پر دینی ہے، مسکین ہونے کی بنا پر نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ مساکین رُوحانی کمالات کے حامل تھے، جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ایسے لوگ جو آپ کے پاس ہیں ان کو اپنی مجلس سے نکالیے نہیں، ''دُور نہ ہٹاؤ ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رَبّ کو صبح وشام'' صبح وشام اللہ کو یاد کرتے ہیں، صبح وشام کا لفظ بول کر دوام مراد ہوتا ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ: اور اللہ تعالیٰ کو پکارنے سے ان کا مقصد ریاءکاری یا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں، جس میں یہ بات واضح کردی کہ چاہے وہ مساکین ہیں، انہوں نے اپنا منتہائے مقصود مال دولت کو نہیں بنایا، وہ ایمان اس لیے نہیں لائے کہ آپ پر ایمان لانے کی وجہ سے اُن کو دُنیا کے اندر سونے چاندی کے ڈھیر مل جائیں گے، یا اُن کو ریشم اور قیمتی کپڑے مل جائیں گے، ایسی بات نہیں، یعنی وہ ایمان لائے ہیں تو مقصد ان کا صرف اللہ کی رضا کو حاصل کرنا ہے، اور یہی ہے کمال کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے اور محض اُس کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے، ''ایسے لوگوں کو آپ اپنے پاس سے نہ اٹھایئے''۔ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ اگر تو ''حِسَابِهِمْ'' کی ضمیر الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ کی طرف لوٹائی جائے تو معنیٰ ہوگا کہ ان لوگوں کا کوئی حساب آپ کے ذمے نہیں، کہ ان کے اندر کے جذبات کیسے ہیں؟ یہ کیا کام کرتے ہیں؟ کیا نہیں کرتے؟ اگر ان کا محاسبہ آپ کے ذمے ہوتا تو پھر تو گنجائش تھی کہ آپ ان کو اپنی مجلس سے اٹھا دیتے، لیکن جب ان کا باطن کیسا ہے، کیسا نہیں ہے، آپ کو اس سے بحث ہی کوئی نہیں، جب وہ رغبت کر کے آتے ہیں، آپ سے سیکھنے کے لیے آتے ہیں، آپ سے محبت کرتے ہیں، اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں، پھر آپ کو کیا ضرورت ہے کہ آپ ان کو اپنی مجلس سے اُٹھائیں، اور خواہ مخواہ بے انصافوں میں سے ہو جائیں، یہ ایک بے انصافی ہے کہ ایک آدمی آپ سے آکر دِین قبول کرتا ہے، اور دِین کی تعلیم حاصل کرتا ہے، اور ایک سرکش ہے، تو سرکش کی خاطر ان کا ٹھکرادیا جائے یہ کون سا انصاف ہے؟ آپ ایسی بات نہ کیجئے، اِن کا حساب آپ کے ذِمّے ایسے ہی نہیں ہے جس طرح سے کہ آپ کا حساب اِن کے ذِمّے نہیں ہے، تو ظاہری حالت کو دیکھو، جو آپ کی طرف متوجہ ہے اُس کی رعایت رکھو، اور باطن کے محاسبے سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، کہ آپ ان کو دُور ہٹائیں۔ یا یہ ہے کہ مِنْ حِسَابِهِمْ کی ضمیر ان مشرکین کی طرف لوٹا دیجئے جو اس قسم کا مطالبہ کرنے والے ہیں، ان کا کوئی حساب آپ کے ذِمّے نہیں کہ آپ سے پوچھا جائے گا کہ یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے، مانتے کیوں نہیں، ایمان کیوں نہیں لائے؟ کہ آپ ان کی خاطر اس قسم کی تدبیریں کریں کہ اپنے جاں نثاروں کو بھی دُور ہٹانے کی کوشش کریں، ان کا کوئی حساب آپ کے ذِمّے نہیں ہے، نہ آپ کا حساب ان کے ذِمّے ہے کہ یہ کوئی کسی قسم کا محاسبہ کریں، یا ان سے پوچھا جائے کہ رسول نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس بارے میں کوئی ایک دوسرے سے تعلق نہیں، اس لیے ان کی خاطر یا ان کے مطالبے کی بنا پر اگر ان مخلصین کو اپنی مجلس سے اٹھا دو گے، تو آپ بے انصافوں میں سے ہو جائیں گے، یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے، اس لیے آپ ان کا یہ مطالبہ پورا نہ کیجئے۔

غربت و مال داری عند اللہ مقبولیت کی علامت نہیں ہے

باقی رہا کہ بعض لوگوں کو ہم نے سرمایہ وافر دے دیا، دُنیا کی خوشحالی دے دی، اور بعض کو مسکین بنا دیا، یہ ہماری حکمت کی بنا پر ہے، مال و دولت کا ملنا یہ ہمارے نزدیک مقبول ہونے کی علامت نہیں، اور کسی کا مسکنت کے اندر مبتلا ہو جانا یہ ہمارے نزدیک کسی کے مردود ہونے کی علامت نہیں، اس لیے مشرکوں کا یہ ذہن غلط ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جب مال دولت ہمارے پاس ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقبول بھی ہم ہیں، اور اِن کے پاس مال و دولت نہیں ہے تو یہ اللہ کے مقبول نہیں، یہ ان کا ذہن غلط ہے، سونا چاندی ریشم قیمتی کپڑے یہ ایسی چیز نہیں ہیں[1] کہ جن کے پاس یہ ہوں وہ اللہ کے محبوب بھی ہوں، اور جن کے پاس دُنیوی مال و اسباب نہیں ہیں وہ اللہ کے محبوب بھی نہیں ہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں یہ حدیث کے اندر بھی ہے، سرورِ کائنات ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر اخلاق ایسے تقسیم کیے ہیں جیسے رزق تقسیم کیا ہے، اور دُنیا کا ساز و سامان اللہ اپنے محبوبوں کو بھی دیتا ہے اور غیر محبوبوں کو بھی دیتا ہے، یعنی دُنیا کا ساز و سامان ملنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہونے کی علامت نہیں ہے، کتنے ہی خزانے مل جائیں اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ یہ اللہ کا محبوب ہے، اور فرمایا کہ اللہ دِین اسے دیتا ہے کہ جس کے ساتھ اللہ کو محبت ہوتی ہے،[2] تو جس شخص کو اللہ نے دِین سے دے دیا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ کو اس شخص کے ساتھ محبت ہے، تو اس لیے اگر کسی کے پاس مال نہیں بھی ہے، تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اصل چیز دِین ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اصل دولت دولتِ اِیمان ہے جو مؤمنین کو حاصل ہے

مؤمنین کی دل داری کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب آپ ان ایمان والے لوگوں کے پاس آئیں، تو کہا کرو کہ تم پر سلامتی ہو، اور ان کو یہ خوشخبری بھی دے دو کہ تمہارے رَبّ نے اپنے اُوپر رحمت کو لازم قرار دے لیا ہے، وہ رحیم و کریم ہے، اُس کی رحمت بہت عام ہے، ان مؤمنین کو دُنیا میں دُنیوی ساز و سامان کا نہ ملنا یہ بھی اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے، کیونکہ اگر ان کو بھی کافروں کی طرح مال دار بنا دیا جاتا تو شاید یہ بھی مال کی محبت میں مبتلا ہو کر ایمان کی طرف متوجہ نہ ہوتے، اس لیے بظاہر اگرچہ غربت ہے، لیکن اصل دولت ایمان کی ہے جو ان کو حاصل ہے، اس لیے دُنیا کا سامان نہ ملنا یہ بھی اللہ کی رحمت ہے، اور اسی طرح اللہ کی رحمت اس صورت میں بھی ظاہر ہوگی، کہ دُنیا کے اندر ان لوگوں نے جتنے اعمال کیے ہیں، جو تنگیاں برداشت کی ہیں، ان پر اجر و ثواب ملے گا، اور اس کے بدلے میں آخرت کی نعمتیں بھی ملیں گی۔

توبہ اور اِصلاح پر مغفرت کا وعدہ

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ: اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو آدمی جہالت کے ساتھ غلط کام کر بیٹھے اور اُس کے بعد توبہ کر کے اپنے حالات کو درست کر لے تو اللہ تعالیٰ اُس کوتاہی کو معاف کر دیتے

(۱) اس کے بعد ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے چند آیات تک کی تفسیر "معارف القرآن" وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) مشکوٰۃ ۲/۴۲۵ باب الصدقۃ، فصل ثالث عن ابن مسعود/ مستدرک حاکم ۲/۴۸۵/ الادب المفرد للبخاری ۱/۱۰۴/ مسند احمد ج ۳ ص ۵۳۹

ہیں، غلطی ہو جانے کے بعد پھر اُس کی معافی کی صورت نہ ہونا یہ اُس کی رحمت کے خلاف ہے، اور پھر صرف معافی پر ہی اکتفا نہیں ہوتا بلکہ توبہ کے بعد انعامات سے بھی نوزا جائے گا، اس آیت میں جو لفظ ''جہالۃ'' آیا ہے اس سے بظاہر ذہن اس بات کی طرف جاتا ہے کہ توبہ سے صرف وہی گناہ معاف ہوتا ہے جو ناواقفیت کی بنا پر کیا ہو، اور اگر کسی نے کوئی گناہ جانتے بوجھتے ہوئے کیا ہے تو اُس پر توبہ کے ساتھ معافی کا اعلان نہیں، ایسی بات نہیں ہے، یہ جہل علم کے مقابلے میں نہیں، بلکہ جہالت سے عملی جہالت مراد ہے، ناواقفیت اور بے علم ہونا ضروری نہیں ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ جاہل ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کی آیات اور بہت سی احادیث صحیحہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ سے ہر قسم کا گناہ معاف ہو جاتا ہے، چاہے ناواقفیت کی بنا پر کیا ہو چاہے جان بوجھ کر کیا ہو، جب سچے دِل سے توبہ کر لی جائے تو ہر قسم کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ اس آیت میں جو مغفرت اور رحمت کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ دو چیزوں پر ہے ایک توبہ اور دوسری اصلاحِ احوال، یعنی دونوں ہوں گی تو مغفرت ورحمت حاصل ہوگی، توبہ تو یہ ہے کہ جو گناہ ہوا ہے اس پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کیا جائے، جب غلطی کا احساس ہو گیا تو یہ توبہ ہے، اور دُوسری چیز اصلاحِ احوال ہے، اِس کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ یہ غلطی نہیں کروں گا، جب یہ صورت ہوگی تو پھر توبہ تام ہوگی، اور اصلاحِ احوال کے اندر یہ بات بھی شامل ہے، کہ جو حقوق کسی کے ضائع کیے ہیں جہاں تک اختیار ہے اُن کو ادا بھی کرے، چھوٹی ہوئی نمازوں کو قضا کرے، روزے جو رہ گئے ہیں ان کو قضا کرے، زکوٰۃ اگر فرض تھی تو جتنے سالوں کی رہ گئی ہے وہ ادا کرے، حج فرض تھا اور وہ نہیں کیا تو اُس کو ادا کرے، اسی طرح حقوق العباد میں لوگوں کے جو حقوق تلف کیے ہیں مثلاً کسی کا مال غصب کیا ہے، زمین غصب کی ہے، کسی کو زبان سے یا ہاتھ وغیرہ سے تکلیف پہنچائی ہے، جو بھی صورت ہے ان حقوق العباد کو یا ادا کرے یا ان سے معاف کرائے، غرض یہ ہے کہ اصلاحِ احوال کے لیے صرف آئندہ کے عمل کو درست کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ پچھلے فرائض وواجبات ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ آگے فرمایا ''اسی طرح سے ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیات کو تا کہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے'' ظاہری طور پر پتا چل جائے کہ کون احکامِ خداوندی پر عمل کر کے مغفرت ورحمت کا مستحق بنتا ہے، اور کون شخص ایسا ہے جو نافرمانی کر کے مجرموں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے، اس طرح جب راستہ جدا جدا ہوگا تو انجام بھی خود بخود جُدا ہوتا چلا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ سے چند باتوں کا اِعلان

اگلی آیات میں نبی کریم ﷺ سے چند باتوں کا اعلان کروایا گیا، باتیں بالکل واضح ہیں، آیات کی طرف دیکھنے سے مفہوم بالکل واضح ہو جائے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں اللہ کے حکم کا پابند ہوں، اور مجھے اس بات سے روکا گیا ہے کہ میں معبودانِ باطلہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، میں اُن کی عبادت نہیں کروں گا، اور اسی طرح تم جو باتیں کہتے ہو یہ ساری تمہاری خواہشاتِ نفس ہیں، اور میں تمہاری خواہشات کی اتباع نہیں کروں گا، اگر میں نے تمہاری خواہشات کی اتباع کی تو میں اس وقت گمراہ ہو جاؤں گا، اور ہدایت کو چھوڑنے والا ہوں گا، اس لیے میں تمہاری خواہشات کی اتباع نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اعلان فرما دیں کہ میں

اپنے ربّ کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں، میں اللہ کا رسول ہوں، میرے پاس وحی آئی ہے، میرے اس دعوے کی میرے پاس واضح اور صریح دلیل موجود ہے، اور میں اس بارے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہوں، مجھے اس پر یقین حاصل ہے، اور تم مجھے جھٹلاتے ہو، میری تکذیب کرتے ہو، بلکہ صرف تکذیب ہی نہیں ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہو کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لا کر دکھاؤ، ہماری تکذیب کی وجہ سے ہم پر اللہ کا عذاب کیوں نہیں آتا؟ تو آپ اُن کو کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اللہ کا رسول اور اُس کا نمائندہ ہوں، تم پر عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: حکم تو صرف اللہ کا چلتا ہے، وہ تمہارا پابند نہیں ہے کہ جو تم کہو وہی کرے، وہ جب چاہے گا جب اُس کی حکمت کا تقاضا ہوگا وہ تم پر عذاب لے آئے گا، يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ: وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔ تیسرا اعلان یہ کروا دیا گیا کہ جس عذاب کو تم جلدی طلب کرتے ہو یہ میرے پاس نہیں ہے، اگر یہ میرے پاس ہوتا تو میرے اور تمہارے درمیان کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، یہ جس کے اختیار میں ہے وہ ظالموں کو خوب جانتا ہے، یہ نہ سمجھ لینا کہ تم پر جو دُنیا میں عذاب نہیں آتا تو اللہ کو اس کا پتا نہیں ہے، وہ ظالموں کو خوب جانتا ہے، صرف اُس نے تمہیں ڈھیل دی ہوئی ہے، جب اُس کی حکمت کا تقاضا ہوگا تمہیں پکڑے گا، اس طرح رسول پاک ﷺ کے منصب کو ان آیات کے اندر واضح کیا گیا ہے۔

غیب کے خزانوں کا مالک صرف اللہ ہے

حضور ﷺ کے منصب کو واضح کرنے کے بعد اب بیان دوبارہ عقیدہ توحید کی طرف لوٹ رہا ہے، اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک اہم ترین صفت ''علم'' کو بیان کیا گیا ہے، حاصل اُس کا یہ ہے کہ اُس کا علم ہر چیز جو موجود ہے یا غیر موجود ہے، ظاہر ہے یا نہیں، بڑی ہے یا چھوٹی ہر چیز پر حاوی ہے اور ہر چیز کو محیط ہے، اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایسی صفت ہے جس میں کوئی دُوسرا اُس کا شریک نہیں ہے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ: مفاتح جمع ہے اس کا مفرد مَفتح (بفتح الميم) بھی ہوسکتا ہے جس کا معنی ہے خزانہ، اور اس کا مفرد مِفتح (بکسر الميم) بھی ہوسکتا ہے، جس کا معنی چابی ہے، اس میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے، اس لیے تفسیروں میں اس کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا گیا ہے، حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ کنجیوں کے مالک ہونے سے بھی خزانوں کا مالک ہونا ہی مراد ہے، اور غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا وجود میں تو آ چکی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا، پہلی قسم میں تو وہ حالات واقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں، یا وہ کائنات میں آئندہ پیش آنے والے واقعات ہیں، کہ مثلاً کون، کب اور کہاں پیدا ہوگا؟ کیا کام کرے گا؟ کتنی عمر ہوگی؟ کتنے سانس لے گا؟ کتنے قدم اُٹھائے گا؟ کہاں مرے گا؟ کہاں دفن ہوگا؟ رزق کس کو کتنا اور کس وقت ملے گا؟ یا بارش کس وقت، کہاں اور کتنی ہوگی؟ اور دوسری قسم کی مثال یہ ہے کہ حمل عورت کے رحم میں ظاہر تو ہو چکا ہے، لیکن یہ علم کہ مذکر ہے یا مؤنث، خوبصورت ہے یا بدصورت، نیک طبیعت ہے یا بدخصلت، اسی طرح اور دوسری بہت ساری چیزیں جو وجود میں تو آ چکی ہیں لیکن اُن کے متعلق علم کسی کو نہیں ہے، ان تمام چیزوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ: اللہ کے پاس ہیں خزانے غیب کے، یعنی اُس کے ملک اور قبضے میں

ہیں، یعنی غیب کے خزانوں کا علم بھی اُس کے پاس ہے، اور اُن کو وجود میں لانا بھی اُس کی قدرت میں ہے، لفظ عِنْدَہٗ جو شروع میں آیا ہوا ہے، اُس نے آ کر اس کلام کے اندر حصر والا معنی پیدا کر دیا ہے، لَا یَعْلَمُھَآ اِلَّا ھُوَ: کہ ان غیب کے خزانوں کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے، ''غیب'' کی جو تعریف آپ کے سامنے کی گئی ہے کہ ''غیب'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں، یا وجود میں تو آ چکی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا، اگر یہ تعریف ذہن میں ہو تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا جو اعتراض بھی ہوگا اس تعریف کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

''علمِ غیب'' کی صحیح تعریف

اور اگر ''غیب'' کا لغوی معنی مراد لیتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ''غیب'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جو ہمارے علم ونظر سے غائب ہو، اگرچہ دوسرے لوگوں کو ذرائع واسباب کے ساتھ اُس کا علم بھی ہو، لیکن چونکہ ہماری نظروں سے غیب ہے اس لیے وہ بھی ''غیب'' ہے، اگر یہ مفہوم مراد لیں تو قدم قدم پر دھوکا کھائیں گے، اور دوسروں کو بھی ''عالم الغیب'' کہنے لگ جائیں گے، جیسے نجوم، جفر، رمل اور ہاتھ کی لکیروں سے آئندہ کے واقعات وحالات کا علم ہو جاتا ہے، کشف والہام کے ذریعے کسی کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں، محکمۂ موسمیات والے ہوا کی رفتار دیکھ کر آندھی اور بارش کی پیش گوئی کر دیتے ہیں، اگر اس دُوسری تعریف کو لے لیا جائے تو ان میں سے ہر شخص کو ''عالم الغیب'' کہنا پڑے گا، حالانکہ قرآنِ کریم کا واشگاف الفاظ میں اعلان ہے کہ ''غیب'' کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، کوئی دُوسرا اس میں اس کا شریک نہیں ہے، یہ تبھی ہوگا جب ہم ''غیب'' کی وہ تعریف کریں جو میں نے پہلے کی ہے، اگر وہ تعریف کریں گے تو ان تمام مثالوں کا جواب بالکل واضح ہے، پھر اگر اللہ تعالیٰ نے وحی اور کشف والہام کے ساتھ کسی بندے کو ''غیب'' کے واقعے کی خبر دی ہے تو وہ قرآنی اصطلاح کے مطابق ''غیب'' نہیں ہے، اسی طرح آلات واسباب کے ساتھ جو علم حاصل کیا جاتا ہے وہ قرآنی اصطلاح کے مطابق ''علمِ غیب'' نہیں ہے، جیسے محکمۂ موسمیات کی خبریں یا حکیم وڈاکٹر کا نبض دیکھ کر مریض کے مخفی حالات بتا دینا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کو ایسی خبر دینے کا موقع تب ملتا ہے جب اُن کا مادّہ پیدا ہو کر ظاہر ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ اُس کا ظہور ابھی اتنا عام نہیں ہوتا اس لیے عوام کو پتا نہیں چلتا اور یہ لوگوں کو بتا دیتے ہیں، اور جب مادّہ ظاہر ہو جاتا ہے تو پھر ہر کسی کو پتا چلتا ہے، اور جب تک مادّہ ظاہر نہ ہو اس وقت تک اُن کو بھی پتا نہیں چلتا، یہی وجہ ہے کہ محکمۂ موسمیات دو ماہ بعد ہونے والی بارش کی خبر آج نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی اس بارش کا مادّہ سامنے نہیں آیا، اسی طرح ڈاکٹر یا حکیم دو سال پہلے کھائی ہوئی غذا یا دوا کے متعلق نبض دیکھ کر نہیں بتا سکتا کیونکہ اس کا کوئی اثر عادۃً نبض میں نہیں ہوتا، یا دو سال بعد شروع ہونے والی بیماری کے متعلق آج نہیں بتا سکتا، اس کے علاوہ ان سب چیزوں کے متعلق جو خبر ہوتی ہے وہ آلات واسباب کے استعمال کے بعد بھی ایک اندازہ ہوتا ہے کوئی یقینی بات نہیں ہوتی، اور ''علم'' جو یقین کا نام ہے وہ اُن کو حاصل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان خبروں کے غلط ہونے کے بے شمار واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، باقی! علمِ نجوم میں جو چیزیں حساب سے تعلق رکھتی ہیں، مثلاً کوئی شخص حساب کر کے کہتا ہے کہ آج سورج اتنے بجے طلوع ہوگا اور اتنے بجے غروب ہوگا، یا فلاں مہینہ میں سورج گرہن ہوگا یا فلاں وقت چاند گرہن ہوگا

ان چیزوں کا تعلق چونکہ حساب سے ہے، یہ ایسے ہے جیسے ریلوے اسٹیشنوں یا ہوائی اَڈوں پر ٹرینوں اور جہازوں کے اوقات بتادیے جاتے ہیں، کہ فلاں ٹرین فلاں وقت آئے گی یا فلاں فلائٹ فلاں وقت آئے گی، تو جن چیزوں کا تعلق حساب سے ہے اُن کا حساب کرکے اُن کا وقت متعین کیا جاتا ہے، وہ بھی ''علمِ غیب'' میں شامل نہیں، اور اس کے علاوہ نجوم وغیرہ سے جو خبریں معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں، سو جھوٹ میں ایک سچ نکل آنا کوئی ''علم'' نہیں ہے، اور اسی طرح ایکسرے مشینوں کے ساتھ جو حمل دیکھا جاتا ہے کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی یہ بھی محض تخمینہ اور اندازہ ہی ہوتا ہے، قطعی علم صرف اللہ کے پاس ہے، الغرض قرآنِ کریم کی اصطلاح کے مطابق جو چیز غیب ہے اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ''اِحاطۂ علمی'' کا ذِکر

آگے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس طرح ارشاد فرمایا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہر اُس چیز کو جو خشکی میں ہے اور جو دریا میں ہے، جیسے صبح وشام بول کر پورا زمانہ اور مشرق ومغرب بول کر پوری زمین مراد لی جاتی ہے، اسی طرح برو بحر بول کو بھی ساری کائنات مراد لی جاتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا علم تمام کائنات پر محیط ہے، اور پھر صرف یہی نہیں کہ وہ صرف بڑی بڑی چیزوں کو جانتا ہے، بلکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اُس کے علم میں ہے، فرمایا وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا: سارے جہاں میں کسی درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا جو اس کے علم میں نہ ہو، ہر درخت کا ہر پتا گرنے سے پہلے اور گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے، وہ جانتا ہے کہ ہر پتا درخت پر لگا ہوا کتنی مرتبہ اُلٹ پلٹ ہوگا، کب اور کہاں گرے گا؟ اور پھر وہ کس حال سے گزرے گا؟ وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ: ہر وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیرے میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے، پہلے درخت کے پتے کا ذکر کیا جو سب کے سامنے گرتا ہے، پھر دانے کا ذکر کیا جو زمین کی گہرائی میں چھپا ہوا ہوتا ہے، پھر ہر خشک وتر کا ذکر کیا کہ وہ بھی اس کے علم میں ہے، کوئی اس کے علم سے باہر نہیں۔ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے پاس کتابِ مبین میں لکھی ہوئی ہیں۔ ''کتابِ مبین'' سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک ''لوحِ محفوظ'' ہے، اور بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ''علمِ الٰہی'' ہے، اور اس کو ''کتابِ مبین'' سے تعبیر اس لیے کیا ہے کہ جیسے لکھی ہوئی چیز محفوظ ہوتی ہے اور اس میں سہو ونسیان کا احتمال نہیں ہوتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا علم جو کائنات کے ذرّے ذرّے کو محیط ہے، یہ تخمینی نہیں بلکہ یقینی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ''اِحاطۂ قدرت'' کا ذِکر

''صفتِ علم'' کی خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی ''صفتِ قدرت'' کو بیان کیا گیا ہے، کہ جیسے اس کا علم کائنات کے ذرّے ذرّے کو محیط ہے، اسی طرح اس کی قدرت بھی کائنات کے ذرّے ذرّے کو محیط ہے، اور کوئی بھی چیز اُس کی قدرتِ کاملہ سے باہر نہیں ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ اس آیتِ کریمہ میں دِکھایا گیا ہے، اور اسی سے پھر اِستدلال کرکے عقیدۂ معاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وہی ذات ہے کہ قبضے میں لے لیتا ہے تم کو رات میں، اور جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، اور پھر صبح کو جگا کر اُٹھا دیتا ہے تاکہ تمہاری مقررہ عمر پوری کردے، یہ اللہ تعالیٰ کی ہی قدرتِ کاملہ ہے کہ

انسان کے جینے مرنے اور پھر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ایک نمونہ دکھا دیا، کہ جیسے وہ ذات تمہیں رات کو نیند دے کر تمہاری رُوح قبض کر کے پھر دوبارہ زندہ کر سکتی ہے، جو ذات اس پر قادر ہے اُس ذات سے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا بھی بعید نہیں ہے، وہ تمہیں دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے، اس لیے آخر میں فرمایا کہ ''پھر تمہیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں خبر دے گا ان کاموں کی جو تم کرتے ہو'' اس سے مراد یہ ہے کہ حساب کتاب ہوگا اور پھر اس کے مطابق جزا و سزا ہوگی۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ

اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان، یہاں تک کہ جب آ پہنچے

اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝٦١ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ

تم میں سے کسی ایک کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اُس کو ہمارے بھیجے ہوئے اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ۝٦١ پھر وہ لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف

مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ۝٦٢ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ

جو اُن کا مالک ہے سچا، خبردار حکم اُسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۝٦٢ آپ کہہ دیجئے! کون تمہیں بچاتا ہے

مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ

جنگل اور دریا کے اندھیروں سے اس وقت میں کہ پکارتے ہو تم اس کو گڑگڑا کر اور چپکے سے، اگر ہمیں نجات دے دی اس

هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝٦٣ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ

مصیبت سے تو ہم ضرور شکرگزاری کریں گے ۝٦٣ آپ کہہ دیجئے اللہ تمہیں نجات دیتا ہے اس سے اور

كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝٦٤ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ

ہر بے چینی سے، پھر تم شرک کرتے ہو ۝٦٤ آپ کہہ دیجئے! وہ قادر ہے اس بات پر کہ بھیجے

عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ

تم پر عذاب تمہارے اُوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا لڑا دے تمہیں

شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ

مختلف جماعتیں کر کے اور چکھا دے ایک کو دوسرے کی سختی، آپ دیکھئے کیسے ہم پھیرتے ہیں

الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝٦٥ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ

آیات کو تاکہ وہ سمجھ جائیں۞۶۵ اور آپ کی قوم نے اس کو جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے، آپ کہہ دیجئے!

لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝٦٦ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٦٧

کہ میں تم پر داروغہ بناکر مقرر نہیں گیا۞۶۶ ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور عنقریب تم جان لوگے۞۶۷

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى

اور جب تُو دیکھے اُن لوگوں کو جو ہماری آیات کے بارے میں عیب جوئی کرتے ہیں تو اُن سے اِعراض کرجا، حتّٰی کہ

يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ

وہ اُس کے علاوہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو مت بیٹھ

بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٦٨ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ

یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ۞۶۸ اور جو لوگ احتیاط کرتے ہیں اُن پر

مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝٦٩ وَذَرِ

ظالموں کے حساب میں سے کچھ بھی نہیں، لیکن نصیحت ہے تاکہ وہ ڈرنے لگیں۞۶۹ اور چھوڑ دے

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

اُن لوگوں کو جنہوں نے اپنے دِین کو کھیل اور تماشا بنالیا ہے، اور دھوکے میں ڈالا ہے اُن کو دُنیوی زندگی نے

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور قرآن کے ذریعے اُن کو نصیحت کرتا کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے نہ پھنس جائے جس کے لیے اللہ کے علاوہ

وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ

کوئی حامی اور سفارش کرنے والا نہ ہوگا، اور اگر نفس ہر طرح سے جان کا بدلہ دے تو اُس سے نہ لیا جائے گا، یہ وہ لوگ ہیں

اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝٧٠ ع

جو اپنے اعمال کی وجہ سے پھنس گئے، اُن کے لیے پینا ہے گرم پانی سے اور دردناک عذاب ہے کفر کرنے کی وجہ سے۞۷۰

تفسیر

ماقبل سے ربط

جیسا کہ بار بار عرض کیا جاچکا ہے کہ مکی سورتوں کا مضمون زیادہ تر توحید رسالت اور معاد ہوتا ہے، گزشتہ آیات میں عقیدۂ توحید کو بیان کیا گیا ہے، اور رَدِّ شرک کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، یہ مضمون بالترتیب ایسے آتے چلے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے غلبے کا ذِکر اور اس کا مقصد

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ: وہ اپنے بندوں پر غالب ہے، وہ اپنے بندوں کے بارے میں جو اِرادہ کرتا ہے کوئی اُسے روک نہیں سکتا، اور جب تک اپنے بندے کو زِندہ رکھنا مقصود ہوتا ہے تو فرشتے بھیج کر اُن کی حفاظت کرتا ہے، جو اُس کے آگے سے اور اُس کے پیچھے سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں، اور اس سے اعمال کی حفاظت کرنے والے فرشتے ''کراماً کاتبین'' بھی مراد ہوسکتے ہیں، بہرحال فرشتوں کے ساتھ اُس کی حفاظت کرتا ہے، کسی کو مجال نہیں جو اُس کو نقصان پہنچا سکے، اور جب کسی بندے کا مقررہ وقت پورا ہوجاتا ہے تو اللہ کے حکم سے یہی حفاظت کرنے والے فرشتے اُس کی موت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، یعنی جب تک اللہ زندہ رکھنا چاہتا ہے یہ محافظوں کی طرح نگہبانی کرتے ہیں، اور جب وقت آجاتا ہے تو یہی فرشتے موت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور پھر جس طرح زندگی میں حفاظت میں کوئی کمی نہیں کرتے اسی طرح جب موت کا وقت آتا ہے تو اُس میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کرتے، جس وقت اللہ کا جو حکم آجائے اُس کو پورا کرتے ہیں، اور پھر مَر گئے، بات اسی پر ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ مَرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرکے اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے، اور وہ مالک بھی ایسا ہے جو صرف احکم الحاکمین ہی نہیں بلکہ اُن کا مولیٰ اور مددگار ہے، ہر وقت اُن کی مدد کرتا رہتا ہے، اور حکم بھی ساری کائنات پر صرف اُسی کا چلتا ہے، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے، یہ سوچ لینا کہ اربوں کھربوں لوگ ہیں اور وہ ایک ہے تو ایک ذات سب کا حساب کیسے لے گی؟ فرمایا ایسی بات نہیں، اس کو اپنے اُوپر قیاس نہ کرو، وہ جب حساب لینا شروع کرے گا تو بہت جلد حساب لے لے گا اور صحیح صحیح حساب لے گا۔

مصیبت کے وقت مشرکین کی حالت کا ذِکر اور اس کا مقصد

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو تنبیہ کرنے کے لئے سرورِ کائنات ﷺ کو فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے سوال کریں کہ جب تم برّی اور بحری سفر کرتے ہو اور دورانِ سفر تمہیں کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے، تو اُس وقت تم اپنے سارے بتوں کو بھول کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو، کبھی علانیہ طور پر عاجزی کا اظہار کرتے ہو، اور کبھی دل ہی میں اس بات کا اقرار کرتے ہو کہ اس مصیبت سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں چھڑا سکتا، اور دل ہی دل میں یہ خیال بھی لاتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم شکرگزاری کریں گے، ناشکری ختم کردیں گے، اُس کے ساتھ کسی کو اُس کا شریک نہیں بنائیں گے، کیونکہ جب مصیبت میں کوئی ہمارے کام نہ آیا، تو ہم اُن کی پوجا پاٹ کیوں کریں؟ تو اب آپ ان سے پوچھئے کہ جب یہ حالات ہوتے ہیں تو

ان مصائب و آلام سے تمہیں نجات کون دیتا ہے؟ اور چونکہ اس کا جواب متعین تھا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ان مصائب و آلام سے نجات دینے میں کوئی بت اُن کے کام نہیں آیا، اس لیے دوسری آیت میں خود ہی فرما دیا کہ آپ ان کو کہہ دیجئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی تمہیں اس مصیبت سے نجات دیتا ہے، صرف ایک مصیبت کی بات نہیں، بلکہ ہر تکلیف پریشانی اور بے چینی کو وہی دُور کرتا ہے، اس سب کے باوجود یہ کیسی جہالت غداری اور بے وفائی ہے کہ ان سب نشانیوں کو دیکھ لینے کے باوجود جب تم کو نجات مل جاتی ہے تو پھر تم شرک کے اندر مبتلا ہو جاتے ہو، اور بتوں کی پوجا پاٹ میں لگ جاتے ہو، چاہیے تو یہ تھا کہ شرک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توبہ کر لیتے، اور ایک اللہ کے عبادت گزار بن جاتے، عبادت گزاری کی بجائے تم شرک میں مبتلا ہو جاتے ہو یہ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تین قسمیں

پہلے یہ بیان کیا کہ ہر انسان کی ہر مصیبت کو صرف اللہ ہی دور کر سکتا ہے، اُس کے علاوہ کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا، اب اس کا دوسرا رُخ بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس بات پر بھی قدرت حاصل ہے کہ جب کسی جماعت یا شخص کو اُس کے جرم کی وجہ سے سزا میں مبتلا کرنا چاہے تو ہر قسم کا عذاب اُس کے لیے آسان ہے، دُنیا کے حکام کی طرح اُس کو پولیس یا فوج یا خدمت گاروں کی ضرورت نہیں ہوتی، جب چاہے جیسا عذاب چاہے وہ مسلط کر سکتا ہے، کوئی اُس کے سامنے رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب کی تین قسمیں بیان کی ہیں، پہلی یہ ہے کہ اُوپر سے عذاب آئے، اس کی بہت سی مثالیں پچھلی اُمتوں میں گزر چکی ہیں، جیسے قومِ ثمود پر بارش کا عذاب آیا تھا، قومِ عاد پر ہوا کا عذاب آیا تھا، قومِ لُوط پر اُوپر سے پتھر برسائے گئے تھے، اصحاب فیل پر پرندوں کے ذریعے کنکریاں برسائی گئی تھیں۔ دوسرا ہے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجنا، اس کی بھی مختلف صورتیں گزشتہ اُمتوں میں پیش آ چکی ہیں، جیسے قومِ نوح پر بارش کے عذاب کے ساتھ نیچے کا پانی بھی اُبلنا شروع ہو گیا تھا، قارون اپنے خزانوں کے ساتھ زمین کے اندر دھنس گیا، اور بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اُوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلط ہو جائیں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا، غدار، کام چور اور خائن جمع ہو جائیں۔ اور تیسری قسم جو عذاب کی یہاں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تمہاری مختلف پارٹیاں بن جائیں، اور تم ایک دوسرے کے لیے عذاب بن جاؤ اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے لگ جاؤ، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی ایک صورت ہے، اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''لَا تَرْجِعُوْنَ بَعْدِیْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ '' یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے، ہمارا گزر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے، اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت نماز پڑھی، اُس کے بعد آپ دُعا میں مشغول ہو گئے، اور بہت دیر تک دُعا کرتے رہے، اُس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رَبّ سے تین چیزوں کا سوال کیا ہے، ایک تو یہ کہ میری اُمت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا قبول فرمائی، دوسری یہ کہ میری اُمت کو قحط اور بھوک کے ذریعے سے

ہلاک نہ کیا جائے، یہ بھی قبول ہوئی، تیسری دُعا یہ کی کہ میری اُمت آپس کے جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دُعا سے روک دیا گیا ہے، یعنی اُمتِ محمد یہ پر گزشتہ قوموں والے عذاب تو نہ آئیں گے، لیکن ایک عذاب اس اُمت پر بھی آتا رہے گا وہ آپس کے لڑائی جھگڑوں سے محفوظ نہ رہیں گے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

کون سا اِختلاف باعثِ محرومی اور کون سا باعثِ رحمت ہے؟

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس کا اختلاف رحمتِ خداوندی سے محرومی کا ذریعہ ہے، اور اس کو عذاب قرار دیا گیا، جب کہ ایک روایت میں ہے: "اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ" میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے تو دونوں باتوں کا آپس میں جوڑ کیسے لگے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں اختلافوں میں فرق ہے، جس اختلاف کو قرآنِ کریم میں رحمتِ خداوندی سے محرومی کا باعث قرار دیا گیا ہے، یہ وہ اختلاف ہے جو اُصول اور عقائد میں ہو، یا نفسانی اَغراض اور خواہشات کی وجہ سے ہو، اس میں وہ اختلاف داخل نہیں جو قرآن وسنّت کے بتلائے ہوئے اُصول کے تحت فروعی مسائل میں کیا جاتا ہے، جن میں فریقین کی حجت قرآن وسنّت اور اِجماع سے ہے، اور ہر ایک کی نیت قرآن وسنّت کے اَحکام پر عمل کرنے کی ہوتی ہے، اور اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہیں ہوتی، اس اختلاف کو حدیثِ مبارکہ میں رحمت فرمادیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مجتہدین اور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں، اور جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں ان کو دُوسروں کے نزدیک گناہ گار کہنا جائز نہیں ہے، ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل احترام کرتے ہیں، وہاں جنگ وجدل اور خصومت وعداوت کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، یہ اختلاف ہے جو رحمت ہے اور لوگوں کے لیے وسعت اور سہولت کا ذریعہ ہے اور بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ اور جو اختلاف جنگ وجدل کا ذریعہ ہو، نفسانی اَغراض کے تابع ہو اور اصولیات میں ہو، وہ رحمتِ خداوندی سے محرومی کا باعث ہے، اس سے منع کیا گیا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ: آپ دیکھ لیجیے ہم کیسے آیات کو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں تو سمجھنے والے غور وفکر کرکے سمجھ جائیں، اور آپ کی قوم نے اس عذاب کی تکذیب کی حالانکہ وہ حق ہے، اور جب آپ کی قوم یہ کہے کہ عذاب کب آئے گا؟ تو آپ اُن کو کہہ دیں کہ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا، اللہ جب چاہے گا لے آئے گا، ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم جان لوگے، تمہیں جو خبریں دی گئیں اُن کے واقع ہونے کا ایک وقت مقرر ہے جو اللہ کے علم میں ہے، جب اُن کا وقتِ مقرر آجائے گا، تو اُن کا ظہور بھی ہوجائے گا، اور تمہیں عنقریب تکذیب کی سزا معلوم ہوجائے گی۔

اہلِ باطل کی مجلسوں سے اِعراض کا حکم اور اِعراض کی مختلف صورتیں

اگلی آیات میں ایک اہم اُصول بتادیا گیا ہے کہ جس کام کا خود کرنا گناہ ہے، اُس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک رہنا بھی گناہ ہے، اُس سے بھی اجتناب ضروری ہے، آیت مذکورہ میں خطاب عام ہے، ہر شخص اُس کا مخاطب ہے، اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا: جب تو دیکھے اُن لوگوں کو جو جھگڑا کرتے ہیں ہماری آیات میں، فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: تو اُن سے کنارہ کر، یعنی اُن کی مجلس سے اُٹھ جاؤ۔ اب اہلِ باطل کی مجلس سے اعراض کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس مجلس سے اُٹھ جائیں، دوسری یہ

کہ وہاں رہتے ہوئے کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجائیں، تو بتایا یہ گیا ہے کہ سرے سے اُن کی مجلس میں بیٹھیں ہی نہ، بلکہ فوراً وہاں سے اُٹھ جائیں، اس لیے فرمایا اگر تم کو شیطان بھلا دے یعنی بھول کر اُن کی مجلس میں شریک ہوگئے، تو جس وقت بھی یاد آئے فوراً اُن کی مجلس سے اُٹھ جائیں، یاد آجانے کے بعد وہاں بیٹھا رہنا گناہ ہے۔ اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعراض کی بہتر صورت تو یہ ہے کہ اُس مجلس سے ہی اُٹھ جائیں اور اگر وہاں سے اُٹھنے میں اپنی جان مال یا آبرو کا خطرہ ہے، تو وہاں بیٹھے بیٹھے کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجائیں، اور اُن لوگوں کی طرف اِلتفات نہ کریں، جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر اُن کی مجلس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجدِ حرام میں نماز اور طواف سے بھی محروم ہوجائیں گے، کیونکہ یہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر بعد والی آیت نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ احتیاط رکھنے والے ہیں وہ اگر اپنے کام سے مسجدِ حرام میں جائیں تو ان شریر لوگوں کے اعمال بد کی اُن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ حق بات اُن تک پہنچا دیں، کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستے پر آجائیں۔ اگلی آیت کا مضمون تقریباً اسی جیسا ہے وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا: آپ اُن لوگوں کو چھوڑ دیجئے جن لوگوں نے اپنے دِین کو لہو ولعب یعنی کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ جو دِینِ حق ان کے پاس بھیجا گیا تھا، اُس کو لہو ولعب بنا لیا، یعنی اُس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اصلی دِین کو چھوڑ کر لہو ولعب کو ہی اپنا دِین و مذہب بنا لیا ہے، وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: اور ان کو دُنیا کی چند روزہ زندگی نے غرور اور دھوکے میں ڈال رکھا ہے اُن سے اِعراض کریں۔ اور آگے فرمایا: صرف اِعراض کرنا ہی کافی نہیں ہے وَذَكِّرْ بِهٖ: بلکہ قرآنِ کریم کے ذریعے اُن کو نصیحت بھی کرتے رہیں، اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے بھی رہیں، کہ کہیں اُس کے عذاب میں گرفتار نہ ہوجائیں، اگر اُس کے عذاب میں گرفتار ہوگئے تو اُس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی حمایت کرنے والا بھی نہیں ہوگا، اور سفارش کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا، اور اگر بدلہ دے کر چھوٹنا چاہو گے تو بھی نہیں چھوٹ سکو گے، چونکہ دُنیا کے اندر تو یہ چیزیں سزا سے بچا سکتی ہیں، آخرت کے اندر یہ چیزیں فائدہ مند نہیں ہوں گی، اس لیے سب کی نفی کر دی، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا: یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے بُرے اعمال کی سزا میں پکڑ لیے گئے، ان کو پینے کے لیے جہنم کا کھولتا ہوا پانی ملے گا، اور دُوسرے بھی دردناک قسم کے عذاب ہوں گے اُن کے کُفر کی سزا کے طور پر۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ

آپ کہہ دیجئے! کیا ہم پکاریں اللہ کے علاوہ اُس کو جو ہمیں نفع نہیں دیتا اور جو ہمیں تکلیف نہیں دیتا، اور ہم لوٹا دیے جائیں اپنی ایڑیوں پر بعد اس کے

اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ

کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی کیا ہم اُس شخص کی طرح ہوجائیں جسے شیاطین نے جنگل میں بے راہ کر دیا ہو اس حال میں کہ حیران ہو کر بھٹکتا پھر رہا ہو اس کے ساتھی ہیں

يَدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ

جواُسے بلاتے ہیں ہدایت کی طرف کہ آجا ہمارے پاس، آپ کہہ دیجئے! بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم فرمانبردار ہو جائیں

لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۱ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۭ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ

ربّ العالمین کے ۝۷۱ اور یہ کہ نماز کو قائم کرو اور اُسی سے ڈرو، وہی ہے جس کی طرف

تُحْشَرُوْنَ ۝۷۲ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ وَيَوْمَ

تم جمع کیے جاؤ گے ۝۷۲ اور وہی ہے جس نے حق کے ساتھ آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا اور جس دن

يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ڛ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۭ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ

وہ فرمائے گا کہ ہو جا پس وہ ہو جائے گا، اور اُس کا فرمان حق ہے، اور اُسی کے لیے ساری حکومت ہے جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۷۳

وہ جاننے والا ہے غیب کی چیزوں کو اور ظاہر چیزوں کو، اور وہ حکمت والا ہے خبر رکھنے والا ہے ۝۷۳

تفسیر

شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول میں مفسرین نے ایک واقعہ لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کو کہا کہ تم ہمارے راستے کا اتباع کرلو اور محمد ﷺ کا راستہ چھوڑ دو۔ اس پر آیت کریمہ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ نازل ہوئی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مثال کے طور پر ایک شخص کی حالت بیان کی ہے، کہ جو راستہ بھٹک گیا اور جو لوگ اُس کے ساتھ تھے، اور اُسے صحیح راستے کی طرف بلا رہے تھے، اور جنگل میں جس جگہ وہ گم ہوا تھا وہاں شیاطین موجود ہیں، انہوں نے اُسے پریشان کر رکھا ہے، وہ اُسے اپنی طرف بلا کر پریشان کرتے ہیں، اس حالت میں وہ حیران کھڑا ہے، اگر وہ شیاطین کی طرف جاتا ہے تو ہلاکت میں پڑتا ہے، اور اگر اپنے ساتھیوں کی طرف جاتا ہے تو ہدایت پا جاتا ہے اور شیاطین سے محفوظ ہو جاتا ہے، اسی طرح یہاں اہلِ ایمان کو کافروں نے واپس گمراہی کی طرف لوٹ جانے کی دعوت دی، اور بت پرستی کی ترغیب دی، مسلمانوں کو اللہ نے حکم فرمایا کہ تم اُن کو جواب دے دو کہ کیا اللہ کو چھوڑ کر جو پوری طرح نفع وضرر کا مالک ہے، ہم اُن کو پکاریں جو کچھ بھی نفع وضرر نہیں دے سکتے؟ اور کیا اللہ کی طرف ہدایت مل جانے کے بعد الٹے پاؤں واپس ہو جائیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا، خدانخواستہ اگر ہم ایسا کرلیں تو ہماری مثال وہی ہو جائے گی جیسے کوئی شخص جنگل میں راستہ گم کر کے کھڑا ہے، اور شیاطین نے اُسے حیران کر رکھا

ہے، وہ اُسے اپنی گمراہی میں ڈالنا چاہتے ہیں، اور اُس کے ساتھی اُس کو ہدایت کی طرف بلا رہے ہیں، پھر ہماری مثال بھی اسی طرح ہوگی۔" آپ کہہ دیجئے اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے" جب اللہ نے ہمیں ہدایت وحی کی نعمت سے نواز دیا اب ہم کفر وشرک کی طرف کیوں جائیں؟ "اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم رب العالمین کی فرمانبردار رہیں، اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور رب العالمین سے ڈرو، وہی ذات ہے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے، ہمارا ربّ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ" یعنی بالکل ٹھیک طریقے کے ساتھ پیدا فرمایا، "اور جس دن اللہ تعالیٰ فرما دے گا کہ ہو جا، پس ہو جائے گا، اُس کا فرما دینا حق ہے، اور جس دن صور پھونکا جائے گا اُس دن ساری حکومت اُس کی ہوگی، وہ پوشیدہ اور ظاہر سب چیزوں کو جانتا ہے، وہ حکمت والا ہے خبر رکھنے والا ہے" اُس کو کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، وہ اپنی حکمت کے مطابق جزا وسزا دے گا، اور یہ جو قیامت قائم نہیں ہو رہی اور ابھی کافروں پر عذاب نہیں آرہا ہے، یہ بھی حکمت کے مطابق ہے، جب اُس کی حکمت کا تقاضا ہوگا قیامت قائم ہو جائے گی اور کافروں پر بھی عذاب آجائے گا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ إِنِّيٓ أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تُو اُصنام کو آلہہ قرار دیتا ہے؟ بے شک میں تجھے بھی اور تیری قوم کو بھی صریح گمراہی

فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝٧٤ وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

میں دیکھتا ہوں ۝ ہم ایسے ہی کامل طریقے سے ابراہیم کو زمین اور آسمان کی مخلوقات دکھاتے تھے

وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ۝٧٥ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّي ۚ

اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں ۝ جب طاری ہو گئی ان پر رات تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، کہا کہ یہ میرا ربّ ہے،

فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْاٰفِلِينَ ۝٧٦ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا

جس وقت وہ غروب ہو گیا تو کہنے لگے غروب ہونے والوں سے تو میں محبت نہیں رکھتا ۝ جس وقت دیکھا چاند کو چمکتا ہوا تو کہا کہ یہ

رَبِّي ۚ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ

میرا ربّ ہے، جس وقت وہ غائب ہو گیا تو کہا کہ اگر میرا ربّ میری راہنمائی نہ کرتا تو میں تو بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے

الضَّآلِّينَ ۝٧٧ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّي هٰذَآ أَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ

ہو جاتا ۝ پھر جب سورج کو دیکھا چمکتا ہوا تو کہنے لگے کہ یہ میرا ربّ ہے، یہ باقی سب کے مقابلے میں بڑا ہے، جب وہ

اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ

غروب ہو گیا تو کہا اے میری قوم! میں اُن چیزوں سے لاتعلق ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ﴿۷۸﴾ میں نے تو اپنی ذات کو متوجہ کر دیا

لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

اُس ذات کی طرف جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، اس حال میں کہ میں ہر طرف سے ہٹ کر ایک طرف ہونے والا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں ﴿۷۹﴾

وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ

جھگڑا کیا ابراہیم کے ساتھ اس کی قوم نے، ابراہیم کہنے لگے کہ کیا تم میرے ساتھ اللہ کے معاملے میں جھگڑا کرتے ہو، حالانکہ اُس نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا، اور نہیں ڈرتا میں

مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ

ان چیزوں سے جن کو تم اُس کا شریک ٹھہراتے ہو، ہاں میرے رب کا چاہا ہو کر رہتا ہے، میرا رب وسیع ہے ہر چیز سے از روئے علم کے،

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ

کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿۸۰﴾ میں کیسے ڈروں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اور تم نہیں خوف کرتے اس بات سے کہ

اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ

تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ایسی چیزوں کو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اُتاری، دونوں فریقوں میں سے

اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا

کون سا فریق امن کا زیادہ حق دار ہے؟ اگر تم جانتے ہو ﴿۸۱﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اپنے ایمان کے اندر

اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

ظلم کی آمیزش نہیں کرتے، ان لوگوں کے لیے امن ہے اور یہ ہدایت یافتہ ہیں ﴿۸۲﴾

تفسیر

ابراہیم علیہ السلام کے واقعے سے مشرکین پر اِتمامِ حجّت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ:[1] یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ شروع ہو رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصرؒ کی تقریر ہے لیکن خلاصۂ آیات ریکارڈنگ نہ ملنے کی وجہ سے درج نہیں ہو سکا۔

سے مشرکین کے اُوپر اِتمامِ حجت مقصود ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مرکزی شخصیت ہیں، پہلے آپ کے سامنے سورۂ بقرۃ میں اور آل عمران میں آچکا کہ یہود ہوں یا نصاریٰ، یہ بھی اپنا انتساب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے، یہود کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقے پر تھے، اور نصاریٰ کہتے تھے کہ ہمارے طریقے پر تھے، اللہ تعالیٰ نے مختلف واقعات اور آیات کے ذریعے نمایاں کیا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام مسلم حنیف تھے۔ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (سورۂ آل عمران: ۶۷) کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے وہ تو حنیف مسلم تھے، مسلم حنیف تھے، فرمانبردار تھے، اور سب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر اللہ کی طرف لگانے والے تھے، جیسے وہاں یہود و نصاریٰ کے نظریے کے اُوپر یہ چوٹ لگائی گئی تھی، جو اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے اُوپر قرار دیتے تھے کہ تمہارا ابراہیم علیہ السلام سے کیا تعلق؟ تم اُن کے طریقے کو چھوڑ بیٹھے، اب تمہارا انتساب ابراہیم علیہ السلام کی طرف غلط ہے، تم اُن کی ملت پر نہیں ہو، اُن کا تو کام تھا کہ اللہ کی طرف سے جو حکم ہو جائے مان جائیں، اور تم اپنے خیالات پر اڑے ہوئے ہو، تو تم ملتِ ابراہیمی پر کیسے ہوئے؟ اسی طرح سے مشرکینِ مکہ یہ بھی فخر کرتے تھے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہونے پر، تو یہاں اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ کیا تھا؟ کہ اپنی نسبت تو تم کرتے ہو ابراہیم علیہ السلام کی طرف، لیکن حال تمہارا وہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے اعداء اور مخالفین کا تھا، جن کے مقابلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساری بحث وجدال کی، اور سارے کے سارے مباحثے کیے، تمہارا حال اُس قوم جیسا ہے، ابراہیم علیہ السلام جیسا نہیں، اس لیے اگر تم آبائی تقلید کے قائل ہو تو تم اپنے جدِ اعلیٰ کی تقلید کیوں نہیں کرتے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کیوں نہیں مانتے؟

اور اس کے ضمن میں یہ بات بھی آجائے گی، سنتِ ابراہیمی کے تحت یہ بات بھی آجائے گی، کہ قابلِ اتباع وہ بات ہے جو علمی دلیل کے ساتھ ثابت ہو، آبائی طریقہ یہ کوئی قابلِ اتباع نہیں، دیکھو! تم جو کہتے ہو کہ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا کہ ہم تو اسی طریقے کو اپنائیں گے، اُسی کو اختیار کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ کو پایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تو یہ اُصول نہیں تھا، کہ جس طریقے پر اپنے باپ کو پایا اسی طریقے پر چل پڑیں، بلکہ انہوں نے تو جس وقت دیکھا کہ باپ کا طریقہ علم کے خلاف ہے ہدایت کے خلاف ہے تو انہوں نے اُس سے بھی مخالفت کی، تو یہی طریقہ تمہیں اپنانا چاہیے۔ اس نظریے کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے کو اس ضمن میں بیان کیا جا رہا ہے۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعارف

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس علاقے میں پیدا ہوئے جو آج کل ''عراق'' کا علاقہ کہلاتا ہے، اور قرآنِ کریم میں جو کچھ اُن کی قوم کے اور خاندان کے حالات ذکر کیے گئے ہیں وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری کی ساری قوم، اس علاقے کے باشندے بمع حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کے یہ مشرک تھے، اور مشرک وہ ہوتا ہے جو اللہ کے وجود کا بھی قائل ہے، لیکن دوسروں کو ساتھ شریک کرتا ہے، وہ اللہ کے وجود کے منکر نہیں تھے، اور شرک اُن کا دو قسم کا تھا، ایک تو وہ اپنی تراشیدہ مورتیوں کو پوجتے تھے زمین کے اندر، حاکمِ وقت بھی اُن کے لیے ربّ کے درجے میں مانا جاتا تھا، اور اُسی کی تصویریں بنا بنا کر رکھتے تھے اُس کو بھی پوجتے تھے،

اور ایک اُن کا شرک یہ تھا کہ ستاروں کو وہ عالم کے اندر متصرف سمجھتے تھے اور اُن کی رُبوبیت کے قائل تھے، اور ستاروں کی رُبوبیت کے قائل ہونے کی بناء پر اُن کو بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہوئے تھے، حاکمِ وقت کو بھی رَبّ سمجھتے تھے، اُس کے ساتھ بھی اُن کا معاملہ ایسے تھا جیسے رَبّ کے ساتھ ہوتا ہے، اور اُسی کی تصویریں بنابنا کر مختلف جگہوں میں رکھتے تھے اور اُن کو پُوجتے تھے، اور اپنے تراشیدہ بُت جو تھے اُن کے ساتھ اُن کا معاملہ عبادت کا تھا، اور ستاروں کے متعلق بھی اُن کے نظریات ایسے ہی تھے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس ماحول کے اندر پیدا ہوئے، اور جس طرح سے نبی صحیح فطرت کے اوپر ہوا کرتا ہے آپ بھی صحیح فطرت پر تھے، ایسا ممکن نہیں کہ نبی کسی دور میں بھی، بچپن میں، جوانی میں، وحی کے نازل ہونے سے قبل وہ کوئی کُفر اور شرک کی حرکت کرے، ایسی بات نہیں، وہ پہلے سے ہی فطرتِ سلیم پر ہوتا ہے، لیکن اُس کی دعوت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے اُوپر وحی نازل ہوجاتی ہے، پھر وہ دعوت شروع کرتا ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح سے اس ماحول میں رہے، جب اس ماحول میں رہے تو جب اللہ کی طرف سے تبلیغ کا حکم ہوا تو جیسے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں اور لوگوں کو کہتے ہیں تو سب سے پہلے ابتدا انہی لوگوں سے کرتے ہیں جو اُن کے قریبی ہوتے ہیں اور اُن کے اعزہ ہوتے ہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آغاز بھی ایسے ہی ہوا تھا، قرآنِ کریم میں حکم دیا گیا: وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (سورۂ شعراء:۲۱۴) اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈراؤ۔ تو جس بات کو حق سمجھا تو اُس کی اَذان سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کے کانوں میں پہنچائی جاتی ہے، اپنے عزیزوں کے کانوں میں وہ اَذان دی جاتی ہے، اس کے بعد دُوسروں تک وہ آواز پہنچتی ہے۔ تو سب سے پہلے اپنے باپ کو خطاب کر کے انہوں نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔

''آزر'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد تھا یا چچا؟

یہاں ''لِاَبِیْهِ اٰزَرَ'': ''آزر'' کو ''اَب'' کے لفظ کے ساتھ ذِکر کیا گیا ہے، تو بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ''آزر'' ابراہیم کے چچا ہیں، باپ نہیں، اور چچا بھی چونکہ باپ کی طرح ہوتا ہے، تو قرآنِ کریم نے اُس کو ''اَب'' کے لفظ سے تعبیر کیا، خاص طور پر جب کہ چچا باپ کی جگہ مربی بھی ہو۔ مثال کے طور پر باپ فوت ہوگیا، بچہ یتیم ہوگیا اور چچے نے پالا تو پھر تو بالکل ہی وہ باپ کے درجے میں آجاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کے الفاظ کا تبادُر اِس کے خلاف ہے، اگرچہ بہت بڑے بڑے حضرات ہیں یہ قول کرنے والے، اور یہ قول کرنے کی وجہ اصل میں یہ ہے (اس کا پس منظر آپ کے سامنے ظاہر کردوں) کہ بہت سارے علماء کا یہ خیال ہے کہ سرورِکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد میں کوئی شخص جہنمی نہیں ہے، وہ سب مغفور ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء واجداد یعنی آپ کے والدین بھی مغفور، اور اسی طرح سے آدم علیہ السلام تک جتنا بھی سلسلہ چلا ہے آپ کے آباؤ اجداد میں کوئی مشرک نہیں، کافر نہیں، سارے کے سارے مغفور ہیں، یہ بعض لوگوں نے ایک نظریہ پیش کیا، اور اس نظریے کو پیش کرنے کے بعد ثابت کرنے لگے کہ بعض تو دِینِ حق پر تھے، اور بعض فترت کے زمانے میں تھے اور وہ اس طرح سے صریحاً مشرک نہیں تھے، جس کی بناء پر وہ آخرت میں بخشے جاسکتے ہیں، لیکن سب سے بڑی رُکاوٹ اس نظریے میں جو پیش آتی ہے وہ ''آزر'' کا وجود ہے، کہ ابراہیم علیہ السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

آباء میں داخل ہیں، تو ابراہیم علیہ السلام کا باپ بھی آپ کے آباء میں داخل ہوا، اور اُس کا مشرک ہونا قطعی ہے قرآنِ کریم میں آ گیا، اور اُس کا شرک کے اُوپر مرنا بھی قطعی ہے، اِس کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں ہے، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ: جب ابراہیم علیہ السلام کو پتا چلا کہ وہ تو عدوّ اللہ ہونے کی حالت میں گیا ہے تو تَبَرَّاَ مِنْهُ۔ قرآنِ کریم میں آتا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (سورۂ توبہ: ۱۱۴) قرآنِ کریم میں صراحتاً آیا ہوا ہے، اور حدیث شریف میں صراحتاً مذکور ہے کہ قیامت کے میدان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات اپنے باپ ''آزر'' سے ہو جائے گی، اور ''آزر'' بہت بُرے حال میں ہوگا، ''عَلٰی وَجْهِ آزَرَ قَتَرَةٌ وَغَبَرَةٌ'': اُس کے چہرے پر گرد وغبار اور تاریکی طاری ہوگی، جس طرح سے کافروں مشرکوں کے چہرے پر ہوگی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اُسے کہیں گے کہ میں تجھے کہتا نہیں تھا کہ تو میری اطاعت کرلے؟ وہ کہے گا کہ جی! میں آج وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ سے دُعا کریں گے کہ یا اللہ! تُو نے میرے سے وعدہ کیا تھا کہ تجھے قیامت کے دِن رُسوا نہیں کروں گا، اور میرے لیے اس سے بڑی رُسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا یہ باپ ایسا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا کہ جنت کافروں کو نہیں مل سکتی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توجہ ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ اُس کو ایک ''بجو'' کی شکل میں مسخ کر کے اور نجاست اور گندگیوں میں آلودہ کر کے اُٹھا کے اُس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ حدیث شریف کے اندر صحیح روایات موجود ہیں، گویا کہ اُس کی عاقبت میں بھی مذکور ہے کہ وہ جہنم میں جائے گا۔ اب یہ نظریہ جو ہے، یہاں آ کے اپنے سامنے رُکاوٹ محسوس کرتا ہے کہ اب یہاں کیا کریں؟ جبکہ قطعی طور پر اس کا کُفر بھی ثابت اور اس کا جہنمی ہونا بھی ثابت! اس لیے پھر یہاں ان لوگوں نے زور لگایا کہ یہ ''آزر'' باپ نہیں ہے بلکہ چچا ہے، اور جو اُن کا باپ ہے اس کا نام ''تارخ''(۱) لکھا ہے، اور اُس کے اَحوال مذکور نہیں ہیں، اور ''چچے'' کے لیے ''باپ'' کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کو پیش کرنے والے بھی بڑے بڑے علماء ہیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں، صاحبِ ''روح المعانی'' اسی نظریے کا ہے، اُس نے پورا زور لگایا ہے اس پر، اور اسی طرح سے بعض دوسرے حضرات بھی ہیں جنہوں نے اس کو لیا ہے، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور ''تفسیر مظہری'' والے جو ہیں قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے بھی اسی نظریے کی تائید کی ہے، اور وہ سب لوگ اس چیز کے قائل ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء اجداد میں کوئی جہنمی نہیں ہے، والدین کے بارے میں بھی صراحت اسی طرح سے کی ہے، لیکن بظاہر لفظوں کی طرف دیکھتے ہوئے قرآنِ کریم کے تبادُر کے خلاف ہے، کہ ہر جگہ اُس کو ''اَبٌ، اَبٌ'' کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، کہیں بھی اس کے لیے ''چچا'' کا لفظ نہیں آیا۔

سیّدنا اِبراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کو خطاب اور اِبراہیمی اُصول

بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ ''آزر'' کو خطاب کر کے کہا اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً، یہ اپنے باپ کو خطاب کر کے جو باتیں کہی گئی ہیں اس کی زیادہ تفصیل آپ کے سامنے سورۂ مریم میں آئے گی، یہاں اجمالاً مذکور ہے۔ ''کیا تو اَصنام کو آلِہہ بناتا

---

(۱) بعض کتب میں ''تارح'' لکھا ہے، بعض میں ''تارخ'' لکھا ہے۔

ہے؟ آلہہ قرار دیتا ہے؟" اٰلِھَۃً اِلٰہ کی جمع ہے، اور اِلٰہ: معبود، جو بھی مفہوم اِلٰہ کا ہے جو آپ "لا اِلٰہ اِلّا اللہ" میں اللہ کے اُوپر اِلٰہ کا اطلاق کرتے ہیں تو وہ اسی مفہوم کے طور پر اِن چیزوں پر بھی "آلہہ" کا لفظ بولتے تھے، جس کی بنا پر اس میں انہوں نے وہ چیزیں مان لیں جو معبود میں ہوا کرتی ہیں، تو صراحتاً یہ شرک ہوگیا، اور اَصنام صنم کی جمع، تراشیدہ تصویریں، پتھروں وغیرہ کی جو تم نے تراش لیں، "کیا تم ان کو اِلٰہ قرار دیتے ہو؟" یہ استفہامِ انکاری ہے، یعنی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: بے شک میں تجھے بھی اور تیری قوم کو بھی صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں، اس میں تو ہدایت کا نشان نہیں، تم تو سارے کے سارے مل کر بھٹک گئے، یہ صاف طور پر علی الاعلان اپنے باپ کے سامنے اُن کے طریقے سے تبری کردی، تو مشرکین کا یہ اُصول کہاں چلا گیا؟ جو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ کچھ ہوجائے ہم تو اپنے آباء کے طریقے پر چلنے والے ہوں گے، کیا ابراہیم علیہ السلام کا یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنے باپ کے طریقے پر چلے تھے؟ انہوں نے تو جب دیکھا کہ باپ کا طریقہ غلط ہے گمراہی ہے اور دلیل کے خلاف ہے تو صاف طور پر اعلان کردیا، اور اسی واقعہ کو قرآنِ کریم نے آنے والے لوگوں کے لیے نمونہ قرار دیا، قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ (سورۂ ممتحنہ: ۴) تو صاف اعلان کردیا، اور قرآنِ کریم نے اس کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے، کہ ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں کے اندر اچھا نمونہ موجود ہے، کہ انہوں نے صاف طور پر اعلان کردیا کہ ہم تم سے بھی لاتعلق اور اُن چیزوں سے بھی لاتعلق جن کو تم شریک کرتے ہو، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ابراہیمی اُصول یہ ہے کہ جو بات دلیل صحیح کے ساتھ ثابت ہو اُس کو مانا جائے اگرچہ باپ کے طریقے کے خلاف ہو، اور جو بات غلط ہو اُس کو غلط کہا جائے چاہے وہ اپنے باپ کا طریقہ ہی کیوں نہ ہو۔ تو یہاں اپنے باپ سے خطاب کرکے کہا کہ "بے شک میں تجھے بھی اور تیری قوم کو بھی صریح گمراہی میں دیکھتا ہوں۔"

اِبراہیم علیہ السلام کو عجائبات دِکھانے سے مقصود کیا تھا؟

وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ: ہم ایسے ہی کامل طریقے سے ابراہیم علیہ السلام کو زمین اور آسمان کے عجائبات، مخلوقات دکھاتے تھے، کامل طریقے سے اُن کو تعارف کرایا زمین وآسمان کی مخلوقات کا، تاکہ اُن کا عرفان بڑھے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں، یا تاکہ اس کائنات کو پہچاننے کے بعد اچھی طرح سے اپنی قوم کے خلاف حجت قائم کرنے والے ہوجائیں، اور اس کائنات کے حالات سے استدلال کرکے لوگوں کے سامنے ثابت کرسکیں کہ اس کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے اور اس میں متصرف ایک ہی ہے، اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اور تاکہ اُن کے اپنے یقین کے اندر بھی اضافہ ہو، اس کائنات کے حالات سے انہوں نے اثباتِ توحید کے لیے جس طرح سے دلیل پکڑی اور جس طرح سے شرک کو رَدّ کیا اگلے الفاظ کے اندر اُس کا ذکر ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

زمین وآسمان میں غور کر کے حق کو کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

کل کے سبق کی آخری آیت میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بت پرستی کا بطلان سمجھادیا، سمجھا دیا، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو زمین وآسمان کی مخلوقات بھی کامل طریقے سے دکھائیں، مشاہدہ کروایا، اور اس مشاہدے کے نتیجے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یقین بھی کامل ہوا، اور قوم کے خلاف وہ حجت بھی قائم کرسکے، یقین کامل ہونا تو اس طرح سے ہے کہ جب انسان زمین وآسمان کے اندر غور کرتا ہے، اور اُس کی مخلوقات کو بنظرِ تفکر وتدبر دیکھتا ہے تو انسان کا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ کیا یہ ساری کی ساری دُنیا، یہ ساری کی ساری کائنات خود ہی پیدا ہوگئی اور اپنے آپ بن گئی، یا اس کا کوئی خالق مالک بھی ہے؟ یہاں سے انسان کا تفکر شروع ہوتا ہے، پھر اگر اس کا کوئی خالق اور مالک ہے، تو اُس کی کیا صفات ہیں؟ اور یہ سارے کا سارا نظم جو کائنات کے اندر چل رہا ہے، اِس کے اندر کسی ایک کا علم وحکمت اور قدرت کارفرما ہے یا اُس کے ساتھ کوئی اور شریک سہیم بھی ہیں؟ باقی مخلوقات میں سے انسان جو ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے، یہ بھی کسی کے سامنے مسئول ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی حساب بھی لیا جائے گا یا اس کو شتر بے مہار کی طرح آزاد ہی چھوڑ دیا گیا؟ اور اس کائنات کے اندر جو ظلم وستم ہے اِس کے انصاف کا دِن بھی کوئی آئے گا یا نہیں؟ اور جو لوگ انصاف اور شرافت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں ان کی دادودہش کا بھی کوئی وقت آئے گا کہ نہیں آئے گا؟ اُن کو بھی کوئی انعام ملے گا کہ نہیں ملے گا؟ ان نکات پر جس وقت انسان غور کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے سامنے حقیقت منکشف ہونی شروع ہوجاتی ہے، قرآنِ کریم میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں اسی طرزِ فکر کی نشاندہی کی گئی ہے: یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا: کہ زمین وآسمان کے اندر تفکر کر کے وہ لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اے اللہ! تُو نے اس کو باطل اور بیکار پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کا کوئی مہتم بالشان نتیجہ نکلنے والا ہے، تو کائنات کا یہی مشاہدہ ہے جس سے یہ دلیل اخذ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو قوم کے سامنے پیش کی، آگے اس دلیل کا تذکرہ آرہا ہے۔

انبیاء ہمیشہ فطرتِ صحیحہ پر ہوتے ہیں

اس بات سے پہلے کہ آپ کے سامنے اس دلیل کی تفصیل ذِکر کی جائے، اِس بات کو آپ جان لیجئے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ فطرتِ صحیحہ پر ہوتے ہیں اور کامل طریقے سے، پیدائشی طور پر وہ معصوم ہوتے ہیں، نہ اُن سے کوئی کبیرہ گناہ صادر ہوسکتا ہے، اور نہ کسی دور میں وہ کُفر اور شرک کے اندر مبتلا ہوسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی اِس درجے کی معرفت کہ ایمانِ صحیح اُن کے قلب میں ہو یہ بدءِ فطرت سے ہی حاصل ہوتی ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اپنی زبان سے وہ اس کی تفصیل ذکر نہ کرسکیں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان فرمایا کہ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (سورۂ شوریٰ: ۵۲) آپ کو پتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے؟ ایمان کیا ہوتا ہے؟ یعنی اِس کی تفصیل آپ کے سامنے نہیں تھی، اللہ تعالیٰ راہنمائی کرتا ہے، پھر ایمان کی تفصیل، اللہ تعالیٰ کے اَحکام، اُس کی مرضیات، یہ سب کے سب تفصیل کے طور پر واضح کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کسی وقت بھی ایمان سے خالی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اِتنی معرفت اُن کو فطری طور پر حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہیں اور وحدہ لاشریک ہیں، ساری

مخلوق کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ چیز ڈالی ہے یعنی عقیدۂ توحید اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى کے تحت (سورۂ اعراف: ۱۷۲)، یہی وجہ ہے کہ عقیدۂ توحید کا انسان مکلف ہے، چاہے کوئی ڈرانے والا آیا ہو چاہے نہ آیا ہو، پیغمبر اور رسول کی آواز کہیں پہنچے یا نہ پہنچے عقیدۂ توحید کے اُوپر انسان کی گرفت ہوگی، جس نے اِس عقیدے کو نقصان پہنچایا اُس کی آخرت میں مغفرت نہیں، تو انبیاء ﷩ فطری طور پر موحد ہوتے ہیں، اُن کو اس بارے میں کبھی شک اور شبہ پیش نہیں آتا۔

ستارے وغیرہ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو فکری اِرتقا نہیں تھا

تو اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو آگے یہ تقریر آرہی ہے قوم کے سامنے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فکری اِرتقا نہیں، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچے اور اس طرح سے انہوں نے توحید کا سبق حاصل کیا، کہ اپنے اردگرد ماحول میں جب انہوں نے دیکھا کہ ستارہ پرستی ہے تو... نعوذ باللہ!... اُن کو قوم کی طرف دیکھ کر یہ شبہ ہوا کہ شاید یہ ستارہ میرا رَبّ ہے، پھر اس کو باطل کیا، پھر چاند کو دیکھ کر شبہ ہوا کہ شاید یہ میرا رَبّ ہے، تو پھر اس کو باطل کیا، پھر سورج کو دیکھ کر سمجھے کہ شاید یہ میرا رَبّ ہے، پھر اُس کو باطل کیا، یہ فکری اِرتقا نہیں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے ساتھ جو ہو رہی ہے نبی بننے کے بعد ہو رہی ہے جبکہ وہ پہلے بُت پرستی کے اُوپر انکار کر چکے ہیں، جس طرح سے اُوپر کی آیت میں مذکور ہے، بُت پرستی پر اتنی وضاحت کے ساتھ انکار قبل اَز نبوّت نہیں، نبوّت مل چکی، اُس کے بعد انہوں نے تبلیغ شروع کی، اپنے باپ کے سامنے اور قوم کے سامنے پہلے بُت پرستی کی تردید کی، اب آگے وہ ستارہ پرستی کی تردید کرتے ہیں۔

اِبراہیم علیہ السلام کی گفتگو ''اِرخائے عنان'' کے طور پر تھی

اور یہ تردید کرنے کا ایک انداز ہے جس کو مناظرے کی اصطلاح میں ''اِرخائے عنان'' یا ''اِستدراج'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، کہ دوسرے کی بات کو ایسے طور پر ذکر کرو گویا کہ وہ مسلَّم ہے، لیکن پھر اُس کا نتیجہ اس طرح سے نکالو کہ اُس کا بطلان خود سب کے اُوپر واضح ہو گیا، یعنی بات ابتدا سے ہی انکار کی صورت میں نہ ہو، کیونکہ انکار کی صورت میں بات کی جائے تو مخاطب بسا اوقات پہلے ہی ضد میں آجاتا ہے، اور پہلے ہی آگے سے اکڑ جاتا ہے، اُس کے ساتھ ساتھ چلو جس طرح سے وہ چلتا ہے، پھر چلتے ہوئے اُس کے نظریات کی غلطی نکالو کہ دیکھو! یہ نظریہ تو غلط ہے جس طرح سے ہم پہلے کہتے تھے وہ بات تو غلط نکلی، یہ مناظرے کا ایک اُصول ہے، اور مخاطب کو گھیر اڈالنے اور اس کو اُس کے نظریات کا بطلان سمجھانے کی ایک تدبیر ہے، ''اِرخائے عنان'' کے ساتھ اس کو تعبیر کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی قوم کے ساتھ گفتگو اسی انداز کے ساتھ کی، کہ پہلے براہِ راست انکار نہیں کیا، بلکہ اس انداز کے ساتھ گفتگو کی گویا کہ یہ بات ایسی ہے جو مانی ہوئی ہے، لیکن یہ قول کرنا ماننے کے لیے نہیں، تردید کے لیے ہے، یہ مناظرے کے مختلف انداز ہوتے ہیں، کبھی انسان کسی دوسرے کی بات کو مسلَّم قرار دے کر پھر اس کو باطل قرار دیتا ہے، کہ ''جیسے تو کہتا ہے کہ چلو ایسے ہی سہی، لیکن پھر اس کا کیا جواب؟'' اس طرح سے اُس بات کی تردید کی جاتی ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی قوم کے نظریات کی تردید اسی انداز سے کی ہے، یہ نہیں کہ... نعوذ باللہ!... آپ کو کوئی شک تھا کہ شاید یہ ستارہ رَبّ ہے، یا چاند

رَبّ ہے، یا سورج رَبّ ہے، اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خود سمجھنے کے لیے اِستدلال کرنا ہوتا تو یہ ترتیب یوں ہونی چاہیے تھی، کہ سب سے پہلے وہ سورج کی طرف دیکھ کر اِس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے، پہلے موٹی باتیں سامنے آیا کرتی ہیں پھر باریک باتیں سامنے آیا کرتی ہیں، ستارے کے اندر رُبوبیت اتنی نمایاں نہ ہوتی، سورج میں زیادہ نمایاں ہوتی اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو اپنے طور پر سمجھنا ہوتا، تو سب سے پہلے ان کی توجہ سورج کی طرف ہوتی، پھر آہستہ آہستہ وہ چاند کی طرف جاتے، ستاروں کی طرف جاتے، موٹی بات سے باریک بات کی طرف جایا کرتے ہیں، یہ کیا؟ کہ سورج کو دیکھ کر تو اُن کو توجہ نہ ہوئی اور سب سے پہلے اُن کی توجہ ستارے کو دیکھ کر ہوئی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، تو یہ دلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے خلاف پیش کی ہے، جیسے اگلے رکوع کے اندر صراحتاً آ رہا ہے کہ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ: یہ حجت ہے جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کے خلاف دی تھی، اس لیے یہ زمانۂ نبوّت کی بات ہے، اور قوم کے ساتھ بحث مناظرہ کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو ذکر کیا۔

مودودی صاحب کی زبردست لغزش

اس موقع پر مودودی صاحب سے تفسیر میں بہت زبردست لغزش ہوئی ہے، اور انہوں نے اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ''فکری اِرتقا'' سے تعبیر کیا ہے، کہ مشرکانہ ماحول کے اندر چونکہ آنکھیں کھولی تھیں، تو اس طرح سے انہوں نے آہستہ آہستہ منزلیں طے کیں اور اپنے نظریات کی اصلاح کی اور آخرکار وہ توحید تک پہنچے، گویا کہ پہلے اسی طرح سے جیسے سمجھنے کے لیے تحقیق کرنے کے لیے انسان کہتا ہے، کہ یہی رَبّ ہے پھر اُس کی تردید ہوگئی، پھر سوچتے سوچتے آگے بڑھے کہ یہی رَبّ ہے پھر اُس کی تردید ہوگئی، پھر سوچتے سوچتے آگے بڑھے کہ یہی رَبّ ہے پھر اُس کی تردید ہوگئی، اس طرح سے اس کو ''فکری اِرتقا'' کے ساتھ تعبیر کرکے گویا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ چیزیں جو تھیں یہ ہدایت کا ذریعہ بن رہی ہیں، اور آخرکار حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید تک پہنچے، یہ بات غلط ہے، انبیاء علیہم السلام اِبتدا سے ہی موحد ہوتے ہیں، اُن کو توحید کا عقیدہ سمجھنے کے لیے کسی قسم کے غور فکر کی ضرورت نہیں ہوتی، ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ جب تک نبوّت کا اظہار نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہ آجائے، اُس وقت تک وہ تفصیلات نہیں ذکر کرسکتے۔ تفصیلات معلوم ہوا کرتی ہیں اور لوگوں کے ساتھ بحث وجدال کا دور شروع ہوتا ہے وحی کے اُترآنے کے بعد، ورنہ انبیاء علیہم السلام اپنی فطرت کے اعتبار سے موحد ہوتے ہیں، اُن کے لیے اِس میدان میں کوئی شک اور شُبہ کی بات نہیں ہے۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور ستارہ پرستی کی تردید

قوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا: جس وقت آپ پر رات طاری ہوگئی تو آپ نے ایک ستارہ دیکھا، یہ بحث کی اِبتدا ہے، چھوٹی بات سے بڑی بات کی طرف اُن کو منتقل کیا جائے گا، اور یہ بات کہ یہ بحث کی اِبتدا ہے اس کی دلیل یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے، کہ کیا اس سے قبل زندگی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی ستارہ نہیں دیکھا تھا؟ کہ آج جو نظر پڑی تو اُس کے اُوپر بحث شروع کردی، ستارے دیکھے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام سب کچھ سمجھے ہوئے تھے، لیکن قوم کے سامنے جس وقت گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اِبتدا رات کو ستارے سے کی تھی، کیونکہ وہ ستاروں کو

پُوجتے تھے اور اس ''کوکب'' کا مصداق بھی کوئی ایسا ہی نمایاں ستارہ ہوگا جس کی پُوجا وہ خصوصیت کے ساتھ کیا کرتے تھے، جیسے کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم کے اندر ''زہرہ'' ستارے کی حیثیت نمایاں تھی، تو ہوسکتا ہے کہ اس ''کوکب'' سے وہی ''زہرہ'' ستارہ مراد ہو، ''جب طاری ہوگئی اُس کے اُوپر رات تو انہوں نے ستارہ دیکھا، اور کہا'' یعنی قوم کو خطاب کر کے نہیں کہا، بلکہ جس طرح سے انسان اپنے متعلق خود ہی گفتگو کرتا ہے، لیکن ایسے انداز سے کہ دوسرے بھی سُن لیں، دوسرے بھی ملنے جلنے والے آس پاس بیٹھے ہوئے ہوں گے، اپنے طور پر جس طرح سے انسان گفتگو کرتا ہے اپنے پہ رکھ کر، ستارے کی طرف دیکھا اور دیکھ کر کہنے لگے: هٰذَا رَبِّیْ، یہ گویا کہ لوگوں کی بات جو تھی اُس کو ذِکر کرلیا، کہ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ هٰذَا رَبِّیْ کا مصداق ہے، جیسے میں نے عرض کیا کہ یہ بحث ومناظرے کا ایک طرز ہوتا ہے، تو انہوں نے یہ طرز اَپنایا کہ جس میں ابتدا میں ٹکراؤ نہیں ہے، اور ابتدا میں اپنی قوم کو سامنے رکھ کر اُس کے اُوپر انکار کی صورت اختیار نہیں کی، اُن کے نظریے کو یوں ذکر کیا کہ هٰذَا رَبِّیْ: یہ میرا رَبّ ہے، فَلَمَّآ اَفَلَ: سلسلہ چلتا رہا، جس وقت وہ غروب ہوگیا، غروب ہونے کے بعد کہنے لگے کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ: یہ غروب ہونے والوں سے تو میں محبت نہیں رکھتا، اور جو رَبّ ہو اُس کے ساتھ محبت لازمًا ہونی چاہیے، غروب ہونے کا ذکر کیا، اس لیے کہ یہ ستارہ جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی چمک دمک کو دیکھ کر وہ لوگ اِس کی شان وشوکت کے گویا کہ قائل ہوتے تھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے طلوع ہونے اگر دیکھتے ہو، اس کے چمکنے کو اگر دیکھتے ہو تو اِس کے غروب ہونے کو اور اُس کے بےنُور ہونے کو بھی تو دیکھو، تمہیں پتا چلے کہ اِس کے اُوپر بھی زوال آتا ہے، یا اِس کے طلوع سے لے کر غروب تک تم اِس کی رفتار کو دیکھو کہ کس طرح سے بندھا بندھایا متعین رفتار کے ساتھ چلتا ہے، اِس کے طلوع کا وقت متعین ہے، اِس کے غروب کا وقت متعین ہے، اور آپ نہیں دیکھ سکتے کہ کسی دِن بھی یہ اپنے اختیار کے ساتھ جس طرح سے یہ طلوع ہوتا ہے وہاں سے نہ ہو کسی دوسری جگہ سے ہوجائے، اپنے راستے کو چھوڑ کر کسی اور طرف چلا جائے، غروب کے لیے جو اُس کی جگہ متعین ہے اُس جگہ غروب نہ ہو، بلکہ کسی اور طرف یہ نکل جائے، آپ اس کو کبھی نہیں دیکھیں گے، تو طلوع سے لے کر غروب تک کی ساری اس کی رفتار اور سارے اس کے حالات یہ بتاتے ہیں کہ یہ خودمختار نہیں بلکہ یہ تو کسی کا چلایا ہوا چل رہا ہے، جب چڑھایا چڑھ گیا، جس وقت چھپایا چھپ گیا، اور جب چاہا اس کو نُورانی کردیا، جب چاہا اِس کو بےنُور کردیا، تو ایسی چیز جو کہ کسی دوسرے کے سامنے مجبور اور مقہور نظر آتی ہے میں تو اس کے ساتھ ایسی محبت نہیں رکھتا جیسے رَبّ کے ساتھ رکھی جایا کرتی ہے، یہ اپنے اُوپر رکھ کر گفتگو کررہے ہیں، تاکہ دوسرے سنیں، اور ان کے ذہن میں بھی یہ بات پڑے کہ واقعی یہ غور کرنے کا پہلو ہے، ہم جو اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں، ہم نے کبھی اس کا یہ پہلو سوچا ہی نہیں، دوسروں کے ذہن کے اندر اس طرح سے بات ڈال دی جاتی ہے، یعنی اگر کوئی شخص کسی کی شان وشوکت کو دیکھ کر اُس کے کروفر کو دیکھ کر اگر اس کی عظمت کا قائل ہوجائے، تو اُس کا ناقص پہلو ظاہر کرنے کے لیے سب سے مناسب وقت وہ ہوا کرتا ہے، کہ جب اُس کی لاش سامنے پڑی ہوئی ہو، جب اُس کو مرا ہوا دیکھیں، لاش اُس کی گلی سڑی دیکھیں، اور اُس کے اندر کسی قسم کی شان وشوکت باقی نہ ہو تو ایسے وقت ہی اُس کی تردید کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے، تو یہاں بھی غروب کا جو وقت ہوتا ہے وہ ستارے کی

گویا کہ ایک قسم کی بے بسی کا وقت ہے، جب نظروں سے یہ غائب ہو رہا ہے، تو اُس وقت متوجہ کیا کہ ایسی چیز جو کہ وقت پہ آ کر چھپ جاتی ہے میں اس کے ساتھ محبت نہیں رکھتا، اپنے اُوپر رکھ کر اس بات کو ذکر کر رہے ہیں، سننے والے سن رہے ہیں، تاکہ اُن کا ذہن بھی اس ہل چل میں آ جائے کہ واقعی یہ چیز اِس پہلو کے ساتھ بھی قابل غور ہے، ہمیں اس کو بھی دیکھنا چاہیے، پہلی رات تو ستارے کے متعلق گفتگو ہوگئی، گویا کہ لوگوں کے دماغ میں ایک شوشہ چھوڑ دیا۔

چاند پرستی کی تردید

پھر کسی دوسری رات میں اُس سے آگے قدم بڑھا دیا، فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا: ضروری نہیں ہے کہ یہ اسی رات کو پیش آیا ہو، ایک رات میں اتنی سی گفتگو کر کے گویا کہ قوم کے ذہن میں ایک شوشہ چھوڑ دیا، کہ ستارے جو ہیں یہ پُوجنے کے قابل نہیں ہیں، ان کے اُوپر جو طلوع غروب کا نظام ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ کسی کے ہاتھ میں یہ مجبور ہیں، جس طرح سے کوئی ان کو چلانا چاہتا ہے یہ اس طرح سے چلتے ہیں، دوسری رات آگئی تو چاند کو نشانہ بنالیا اپنی گفتگو کا، وہ بھی اسی طرح سے فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا: یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو رہی ہے، جس وقت دیکھا چاند کو چمکتا ہوا، قَالَ هٰذَا رَبِّيْ: اسی طرح سے گفتگو کی کہ یہ میرا رَبّ ہے فَلَمَّاۤ اَفَلَ: جس وقت وہ غائب ہوگیا، قَالَ لَىٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ: یہ پہلے سے قدم آگے بڑھا دیا، لوگوں کو سنا کر کہتے ہیں، ایسے طور پر گفتگو کرتے ہیں اپنے متعلق ہی، کہ یہ تو اللہ نے میری راہنمائی کر دی کہ میں سمجھ گیا کہ یہ رَبّ بنانے کے قابل نہیں، اگر اللہ میری راہنمائی نہ کرتا میں تو بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہو جاتا، جس میں یہ اشارہ ہوگیا کہ جو لوگ اس کو رَبّ سمجھے ہوئے ہیں وہ سارے بھٹکے ہوئے ہیں، سارے گمراہ ہیں، اور سارے بے ہدایتے ہیں، ہدایت سے محروم ہیں، ضمناً یہ بات نکل آئی، دیکھو! پہلے کے مقابلے میں بات آگے بڑھ گئی۔

سورج پرستی کی تردید

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً: پھر جب سورج کو دیکھا چمکتا ہوا، اُسی رات کو صبح کو یا کسی دوسرے موقع پر، وقفے وقفے کے ساتھ یہ فقرے چھوڑے جا رہے ہیں، یہ باتیں چھوڑی جا رہی ہیں تاکہ قوم کا ذہن اِدھر متوجہ ہو، اور وہ ان باتوں کو سوچیں، جب سورج کو دیکھا چمکتا ہوا تو کہنے لگے کہ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ: یہ رَبّ ہے یہ تو باقی سب کے مقابلے میں بڑا ہے، لیکن جب اپنا سفر طے کرتا ہوا وہ بھی آخر غروب کے قریب پہنچ گیا، فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ: جب وہ غروب ہوگیا، قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ: یہ پہلے سے اور آگے قدم بڑھا لیا اور اپنی قوم کو خطاب کر کے کہہ دیا کہ بھائی! تم ہو مشرک، میں تو ان چیزوں سے لاتعلق ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، ایسی چیزیں جو نوکروں چاکروں کی طرح اپنے متعین وقت پر آتی ہیں، متعین وقت پر چلی جاتی ہیں، میں ان کو شریک ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں، تو دیکھو! پہلے سے بات زیادہ کھل کر سامنے آگئی، یٰقَوْمِ: قوم کو خطاب کر کے کہہ دیا: ''اے قوم! بے شک میں لاتعلق ہوں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو'' میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، جیسے پہلے کہہ دیا تھا میری ان سے کوئی محبت نہیں جو اس طرح سے غائب ہو جاتے ہیں اور بے بس معلوم ہوتے ہیں، پھر دوسرے نمبر پر کہہ دیا کہ اس کو رَبّ ماننا تو گمراہی ہے، اگر میرا رَبّ مجھے

سیدھا راستہ نہ دکھاتا تو میں بھی بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہو جاتا، جس میں ضمناً اُن کو بھٹکے ہوئے کہہ دیا، اب آگے سورج کا قصہ آیا
تو براہِ راست کہہ دیا یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ: میرا کوئی تعلق نہیں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔

شرک سے براءت اور توحید کا اِعلان

اور پھر میرا مسلک کیا ہوا، میرا مسلک یہ ہے، گویا کہ یہ ابراہیمی ملت کا کلمہ ہے جو آگے ذکر کیا جا رہا ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ: اب اتنی واضح اور صاف توحید کا عقیدہ اور شرک کی تردید یہ قبل از نبوت کے زمانے میں نہیں، بلکہ یہ نبوت کے زمانے کے بعد کی بات ہے، اپنے مسلک کو ان الفاظ میں ادا کر دیا، ''میں نے تو اپنی ذات کو متوجہ کر دیا اُس ذات کی طرف جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، اس حال میں کہ میں ہر طرف سے ہٹ کر ایک طرف ہونے والا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں'' گویا کہ اپنا کلمۂ توحید جو تھا اِس کو اِن الفاظ کے ساتھ ادا کر دیا، ''اپنے چہرے کو میں نے متوجہ کر دیا اللہ کی طرف'' اپنے آپ کو میں نے سپرد کر دیا، اس میں اسلام والا معنی بھی ہے، ''اپنی ذات کو میں نے سپرد کر دیا اُس کے لیے جو زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا ہے، اس حال میں کہ میں سب سے توجہ ہٹانے والا ہوں'' نہ میری چاند کی طرف توجہ، نہ سورج کی طرف توجہ، نہ ستارے کی طرف، نہ پتھر کے بتوں کی طرف، میں نے ہر طرف سے توجہ ہٹالی اور اُس کی طرف اپنے آپ کو متوجہ کر لیا، اور اُس کی طرف متوجہ ایسے طور پر کر لیا کہ میں کسی دوسرے کو اُس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں، یہ کلمۂ توحید ہے ملتِ ابراہیمی کا۔

قوم کی دھمکی اور اِبراہیم علیہ السلام کا دوٹوک جواب

تو جب یہاں تک بات مکمل کر آ گئی، تو اب دو فریق بن گئے، ایک طرف قوم آ گئی جو کہ مشرک تھی، دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو گئے جنہوں نے شرک سے براءت کا اعلان کر دیا، اب جیسے مشرکین کی عادت ہوتی ہے کہ پھر وہ موحدین کے ساتھ جھگڑتے ہیں، اور جھگڑنے کے اندر وہ ڈراتے بھی ہیں کہ دیکھو! تم اِن کی مخالفت نہ کرو، ورنہ ہم تمہاری ٹانگ توڑ دیں گے، ایسا نہ کرو ورنہ یوں ہو جائے گا، یہ بہت ڈرایا کرتے ہیں اسی طرح سے، اولاد مر جائے گی، گھر اجڑ جائیں گے، فصلیں برباد ہو جائیں گی، اس قسم کی چیزیں ہیں جو توہمات کے درجے میں لوگوں کے ذہنوں میں ڈالی جایا کرتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اِسی قسم کا جھگڑا قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ شروع کر دیا، وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ: ان سارے الفاظ کی روش یہ بتاتی ہے کہ یہ زمانہ تبلیغ کی باتیں ہیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام تبلیغ کے اوپر فائز کر دیا گیا تھا، یہ کوئی بچپن کے قصے نہیں کہ جب ابھی وہ خود بھی توحید کی منزلیں طے کر رہے تھے، یہ اُس وقت کی بات نہیں، جیسے کہ مودودی صاحب نے اس کو بچپن کے زمانے پر محمول کیا ہے، یہ بات قرآن کریم کی رَوِش کے خلاف ہے، اور ان کی یہ تحریر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے منصب سے جوڑ نہیں کھاتی۔ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ: جھگڑا کیا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اس کی قوم نے قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ کیا تم میرے ساتھ اللہ کے معاملے میں جھگڑا کرتے ہو؟ حالانکہ اُس نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا، کیا مطلب؟ کہ میرے سامنے ہدایت آ گئی، دلیل کے ساتھ ہر چیز

میرے سامنے واضح ہے، تم اُس کے بارے میں میرے سے جھگڑا کرتے ہو؟ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ: ان لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پھر اپنے شرکاء سے اُن کو ڈرایا تھا کہ اِن کی مخالفت نہ کر، اِن سے لاتعلقی کا اعلان نہ کرو، ورنہ تیرا کوئی نقصان کردیں گے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ نہیں ڈرتا میں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، اُن سے میں نہیں ڈرتا، اُن سے مجھے کوئی خطرہ نہیں، خوف نہیں کہ میرا کچھ بگاڑ لیں گے نقصان پہنچائیں گے، ایسا میرے دل میں کوئی خوف نہیں ہے،"ہاں! جو میرا اللہ چاہے گا وہ ہو کے رہے گا" یہ لفظ اس لیے کہہ دیئے کہ آخر اِنسان ہے، انسان کو دُنیا کے اندر تکلیفیں بھی ہوتی رہتی ہیں، کبھی بخار چڑھ گیا، کبھی کوئی اور تکلیف پہنچ گئی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس قسم کی تکلیف پہنچے تو کہیں وہ فوراً یہ نہ کہہ دیں دیکھا! ہم نہ کہتے تھے کہ بتوں کی مخالفت نہ کر، ورنہ تجھے تکلیف پہنچے گی دیکھو! تمہیں تکلیف پہنچ گئی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کی اس بات کا جواب پہلے ہی مہیا کردیا، کہ جو کچھ ہوگا میرے رَبّ کے چاہنے سے ہوگا، اس لیے میری زندگی کے اندر جو بھی انقلاب آئے، جو بھی تغیر آئے، جو بھی حادثہ پیش آئے، میں تو اُس کو اپنے رَبّ کی طرف منسوب کروں گا کہ اُس کی طرف سے ہے، میں کسی واقعے کے پیش آجانے کے بعد تمہارے شرکاء کی طرف اس کی نسبت کرنے کے لیے تیار نہیں، یہ گویا کہ گنجائش پہلے رکھ دی کہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مجھے کبھی تکلیف نہیں پہنچے گی، پہنچے گی لیکن وہ میرے رَبّ کی طرف سے ہوگی؛"میرے رَبّ کا چاہنا ہو کر رہتا ہے" وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: میرا رَبّ وسیع ہے ہر چیز سے از روئے علم کے، کوئی چیز اُس کے علمی احاطے سے باہر نہیں ہے اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ یہ باتیں تمہارے لیے کوئی سوچ پیدا نہیں کرتیں، تذکر نہیں ہوتا؟ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ: میں کیسے ڈروں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو، اور تم نہیں خوف کرتے اس بات سے کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا: ایسی چیزوں کو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری، کیا مطلب؟ کہ دیکھو! جہاں تک تو اللہ کی ذات کو ماننے کا تعلق ہے، تم بھی مانتے ہو میں بھی مانتا ہوں، یہاں تک تو ہو گیا اتفاق کہ اللہ ہے، باقی! ہم میں اختلاف کہاں سے ہوا؟ کہ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ہیں یا نہیں؟ تم کہتے ہو کہ اور بھی ہیں، تو اس کا ثبوت تمہارے ذمے ہے کہ تم دلیل سے ثابت کرو کہ اور بھی ہیں، میرا تو اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جب دلیل سے کوئی اور ثابت نہیں لہٰذا میں کسی اور کو مانتا نہیں، میرا مسلک تو صاف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود پر تو تمہارا بھی اتفاق اور ہمارا بھی اتفاق۔

دلیل مشرک کے ذِمّے ہے (علّامہ شمس الحق افغانی کا واقعہ)

جیسے مولانا شمس الحق صاحب افغانی[1] کہہ رہے تھے، کہ ایک دفعہ میری عیسائی سے بحث ہوگئی، وہ تثلیث کا دعویٰ کرتا تھا کہ اللہ تین ہیں، اور میں کہتا تھا کہ اللہ ایک ہے، تو بحث کرتے ہوئے مجھے کہتا ہے کہ اچھا! آپ اللہ کے ایک ہونے کی دلیل دیجئے تو میں نے کہا کہ پادری صاحب! بات سُن لو! جب تم کہتے ہو کہ خدا تین ہیں تو تین کے ضمن میں ایک تو آ گیا، اب ایک کے اُوپر دو کا اضافہ تم کرتے ہو، تو دو کے زائد ہونے کی دلیل تم دو! باقی جب تم نے تین کو مان لیا تو مجھے ایک کی دلیل دینے کی کیا ضرورت ہے؟

(۱) آپ فاضل دارالعلوم دیوبند تھے، ۵۴ ۱۳ھ تا ۵۷ ۱۳ھ دارالعلوم میں ہی شیخ التفسیر رہے، ذی الحجہ ۰۳ ۱۴ھ میں وفات پائی۔

میں کہتا ہوں کہ میری جیب میں ایک روپیہ ہے، اور تم کہتے ہو کہ تین، تو مجھے یہ ثبوت دینے کی کیا ضرورت ہے کہ میری جیب میں ایک روپیہ ہے، وہ تو تین کے ضمن میں ایک آ گیا، میری بات تو تم نے مان لی کہ ایک ہے، باقی یہ ہے کہ ایک کے علاوہ دو اور بھی ہیں یا نہیں؟ یہ تمہارا دعویٰ ہے، تو اِثبات تمہارے ذِمے ہے کہ دلیل بیان کرو کہ دو اور بھی ہیں، دلیل کسی کی سمجھ میں آئے گی تو وہ مان لے گا نہیں آئے گی تو اپنے مؤقف پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اسی طرح سے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کو ماننے کا تعلق ہے، اُس کے وجود کی بات ہے وہ تو تم بھی جانتے ہو میں بھی جانتا ہوں کہ اللہ ہے، باقی جھگڑا تو اگلی بات میں ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ شریک ہیں یا نہیں، تمہارا دعویٰ ہے کہ ہیں، تو ثبوت تمہارے ذِمے ہے، اور جب تم بلا ثبوت اس بات کا قول کیے ہوئے ہو تو مجرم تم ہو یا میں ہوں؟ ڈرنا اس اللہ سے تمہیں چاہیے کہ مجھے ڈرنا چاہیے؟ جرم تو تم کر رہے ہو کہ بلا دلیل اس کی خدائی میں کسی دوسرے کو شریک کیے بیٹھے ہو، اور ڈراتے مجھے ہو، تو عقل کے ساتھ سوچو، تمہیں پتا چلے، تو تم ڈرتے نہیں اُلٹا مجھے ڈراتے ہو، یہ تو وہی مثال ہے کہ ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے!'' کہ مسلک تو میرا صاف ہے کہ میں بلا دلیل کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتا، لہٰذا میں تو امن میں ہوں، اور تم بلا دلیل اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیے بیٹھے ہو، تو ڈرنا تمہیں چاہیے، یہ ہے ان الفاظ کا مطلب۔ كَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ: کیسے ڈروں میں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو؟ مجھے اُن سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے، ان کے لیے کوئی قدرت ثابت نہیں، اُن کے لیے کوئی علم ثابت نہیں، اُن کے لیے کوئی اختیار ثابت نہیں، وہ نفع نقصان کے مختار نہیں، تو میں کیوں ڈروں؟'' اور تم نہیں ڈرتے اس بات سے کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو ایسی چیزوں کو جن کے متعلق اللہ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری' بے دلیل باتیں تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت میں، خدا کی خدائی میں بے دلیل تم نے چیزوں کو شریک کر رکھا ہے، تو ڈرنا تمہیں چاہیے۔

امن میں موحد ہے یا مشرک؟

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ: دونوں گروہوں میں سے کون سا فریق امن کا زیادہ حق دار ہے، یعنی میں امن کا زیادہ حق دار ہوں جو بے دلیل بات نہیں کرتا، اور تم بے دلیل اللہ کے ساتھ جو شرکاء ٹھہرائے ہوئے ہو تمہیں ڈرنا چاہیے، اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: اگر تم علم رکھتے ہو، اگر کچھ جانتے ہو تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ احق بالامن دونوں فریقوں میں سے وہی فریق ہے جو بے دلیل کوئی عقیدہ اختیار نہیں کرتا، اور جو بے دلیل شرکاء قائم کیے ہوئے ہیں اُن کو ڈرنا چاہیے، وہ امن کے حق دار نہیں ہیں۔ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ کے اندر اِستفہام ہے اور اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ کے اندر اِس کا جواب ہے، کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور ایمان لانے کے بعد اپنے ایمانوں کے اندر ظلم کو خلط ملط نہیں کرتے، ظلم کی آمیزش نہیں کرتے اُن کے لیے امن ہے، ظلم سے کیا مراد ہے؟ قرآن وحدیث کی اِصطلاح میں ظلم ہر قسم کی معصیت پر بولا جاتا ہے: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (سورۂ اعراف: ۲۳) اے اللہ! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوگی اور اُس کے اَحکام کے خلاف کوئی بات آجائے گی یہ کرنے والے کا

اپنے نفس کے اُوپر ظلم ہے، اس لیے چھوٹی معصیت ہو یا بڑی معصیت ہو یہ ظلم کا مصداق ہے، تو جس وقت یہ آیت اُتری ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذہن ادھر ہی گیا، کہ ظلم کا معنی یہ ہے کہ کوئی نافرمانی کی جائے، کوئی گناہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان کام بھی دے گا، امن تبھی حاصل ہوگا جبکہ ایمان لے آنے کے بعد کسی قسم کے گناہ کا ارتکاب نہ ہو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذہن ان الفاظ کے ساتھ ادھر منتقل ہوا، جس کے بعد وہ ڈر گئے کہ یہ تو بڑی مشکل بات ہے، گناہ تو ہم سے ہو جاتا ہے، ایمان کے ساتھ ظلم کی آمیزش تو ہو جاتی ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں امن حاصل نہیں ہوگا؟ تو یہ اشکال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بات اس طرح سے نہیں جیسے تم سمجھے، یہاں ظلم سے عام ظلم مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں ظلم کا مصداق وہی ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان: ۱۳) کہ شرک ظلم عظیم ہے، تو یہاں ظلم سے ظلم عظیم مراد ہے جس کا مصداق ''شرک'' ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد اپنے ایمان کے اندر شرک کی آمیزش نہ کریں، تب جا کر اُن کو اَمن حاصل ہوگا، اور اگر ایمان لے آنے کے بعد اُس میں شرک کی آمیزش کر دی تو پھر امن نہیں ہے، عام معاصی اور گناہ اس سے مراد نہیں، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اس اِشکال کی وضاحت کر دی، کہ اس سے عام معاصی مراد نہیں ہیں بلکہ ظلم سے ظلم عظیم مراد ہے جس کا مصداق ''شرک'' ہے، جیسے کہ حضرت لقمان علیہ السلام کی تقریر کے اندر یہ بات آئی یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ: ان لوگوں کے لئے امن ہے، وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: اور یہ ہدایت یافتہ ہیں۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ
یہ ہماری دلیل ہے، دی ہم نے یہ دلیل ابراہیم کو اُس کی قوم کے خلاف، ہم اُونچا کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں درجات میں،
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ
بیشک تیرا رب حکمت والا ہے اور علم والا ہے ﴿٨٣﴾ ہم نے عطا کیا ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب، اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے سیدھے راستے پر چلایا،
وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ
اور نوح کو ہم نے سیدھے راستے پر چلایا ابراہیم سے قبل، اور ابراہیم کی اولاد میں سے داؤد کو اور سلیمان کو اور اَیوب کو
وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَزَكَرِيَّا
اور یوسف کو اور موسیٰ کو اور ہارون کو (ہم نے سیدھے راستے پر چلایا) اور ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم نیکوکاروں کو ﴿٨٤﴾ اور زکریا

وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ

اور یحییٰ کو اور عیسیٰ اور الیاس کو (ہم نے ہدایت دی) یہ سارے شائستہ لوگوں میں سے تھے ﴿۸۵﴾ اسماعیل اور یسع کو

وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ

یونس کو اور لوط کو (ہم نے ہدایت دی)، اور ان سب کو ہم نے عالمین کے مقابلے میں فضیلت دی ﴿۸۶﴾ ان کے آباء سے

وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

اور ان کی اولاد سے اور ان کی بھائیوں سے بھی ہم نے بعض کو ہدایت دی، ہم نے انہیں چن لیا، اور اُن کو سیدھے راستے کی طرف چلایا ﴿۸۷﴾

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا

یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کو چاہتا ہے وہ دیتا ہے اپنے بندوں میں سے، اگر ان سے بھی شرک کا صدور ہوجاتا

لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

تو ان کے اعمال بھی برباد ہوجاتے ﴿۸۸﴾ یہی لوگ ہیں کہ جن کو ہم نے کتاب دی

وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا

اور حکم دیا اور نبوّت دی، اگر اس نبوّت کا انکار یہ لوگ کرتے ہیں تو ہم نے کفیل بنادیا ہے اس کے ساتھ اور لوگوں کو

لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ

جو کہ اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں ﴿۸۹﴾ یہی جماعت ہے جن کی اللہ نے راہنمائی کی، آپ بھی انہی کے طریقے پر چلئے،

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع

آپ کہہ دیجئے کہ میں اس پر تم سے کوئی اُجر نہیں مانگتا نہیں ہے یہ قرآن مگر تمام جہانوں کے لئے نصیحت ﴿۹۰﴾

تفسیر

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی رفعتِ شان اور گروہِ انبیاء کا تذکرہ

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ: یہ ہماری دی ہوئی دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دی اُس کی قوم کے خلاف، یہ

حجت ہم نے سمجھائی، یہ استدلال کر کے قوم کے سامنے ستاروں کی اُلوہیت کو باطل کرنا اور اُن کی رُبوبیت کو باطل کرنا یہ ہم نے سمجھایا ابراہیم علیہ السلام کو، "یہ ہماری دلیل ہے، دی ہم نے یہ دلیل ابراہیم علیہ السلام کو قوم کے خلاف" نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ: نَرْفَعُ مَنْ نَّشَآءُ: ہم اُونچا کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں درجات میں، ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بڑھا دیتے ہیں، اُونچا کرتے ہیں ہم جس کو چاہتے ہیں درجات میں، مفہوم اس کا یہی ہے کہ جس کے چاہتے ہیں درجات بُلند کرتے ہیں، علم میں، معرفت میں، یقین میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم نے درجات اُونچے کیے، کہ ایسا صحیح علم اُن کو نصیب فرمایا، اور صحیح علم کی وجہ سے انہوں نے کیسی واضح حجت کے ساتھ شرک کی تردید کر دی، اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ: بے شک تیرا رَبّ حکمت والا ہے اور علم والا ہے۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ: اب یہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جو نوازا، دُنیا کے اندر بھی عزّت دی اور آخرت میں بھی اُن کے درجات اُونچے کیے، اُس کی کچھ وضاحت ہے، "ہم نے عطا کیا ابراہیم کو اِسحاق (یہ بیٹا ہے) اور یعقوب (یہ پوتا ہے)" كُلًّا هَدَيْنَا: ان میں سے ہر ایک کو ہم نے سیدھے راستے پر چلایا۔ وَنُوْحًا: اور نوح علیہ السلام کو ہم نے سیدھے راستہ پر چلایا ابراہیم علیہ السلام سے قبل، یہ ابراہیم علیہ السلام کے آباء کا ذکر آ گیا، نوح علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے آباء میں شامل ہیں، "اور نوح علیہ السلام کو ہم نے سیدھے راستے پر چلایا ابراہیم علیہ السلام سے قبل" وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ: ذُرِّيَّتِهٖ کی "ہ" ضمیر بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، "حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے داؤد علیہ السلام کو اور سلیمان علیہ السلام کو، اور ایوب علیہ السلام کو، اور یوسف علیہ السلام کو، موسیٰ علیہ السلام کو، اور ہارون علیہ السلام کو ہم نے سیدھے راستے پر چلایا، اور ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم نیکوکاروں کو" جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو جو ہدایت نصیب ہوئی تھی یہ ان کی اس صفت احسان کی وجہ سے تھی کہ اچھے لوگ تھے، اچھی فکر والے تھے، نیکوکار تھے، جس کی بنا پر آئے دن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت میں ترقی دی، وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى: اور زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام کو، اور عیسیٰ علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام کو ہم نے ہدایت دی، كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ: یہ سارے شائستہ لوگوں میں سے تھے، عمدہ لوگوں میں سے تھے، "اسماعیل علیہ السلام اور یسع علیہ السلام کو، یونس علیہ السلام کو اور لوط علیہ السلام کو" وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: یعنی ان سب کو ہم نے ہدایت دی اور ان سب کو ہم نے عالمین کے مقابلے میں فضیلت دی، چُن لیا اُن کو، فضیلت دی عالمین کے مقابلے میں، وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ: یہ چند تو نام ذکر کر دیئے، باقی ان کے علاوہ ان کے آباء کے سلسلے میں، ان کی اولاد کے سلسلے میں، ان کے بھائی بندوں کے سلسلے میں بھی ہدایت یافتہ لوگ ہوئے۔ اِخْوَانِهِمْ: بھائی۔ ذریات: اولاد۔ آباء: آباء اجداد۔ "ان کے آباء سے اور ان کی اولاد سے اور ان کے بھائیوں سے بھی ہم نے بعض کو ہدایت دی" وَاجْتَبَيْنٰهُمْ: ہم نے انہیں چُن لیا وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اور اُن کو سیدھے راستے کی طرف چلایا، ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: یہی ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو دی تھی یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کو چاہتا ہے وہ دیتا ہے اپنے بندوں میں سے۔ یہ تو تھا برگزیدہ گروہ جس کا ذکر آپ کے سامنے آ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان سے پہلے نوح علیہ السلام پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں یہ سارے پیغمبر جن کا ذکر آ گیا، مجموعی طور پر اس رکوع میں یہ سترہ ہیں جن کا ذکر یہاں صراحتاً کیا گیا ہے، اور یہی پیغمبر ہیں جو مشہور ہیں، جن کو سب جانتے پہچانتے تھے، اہلِ کتاب بھی ان کو اچھی طرح سے جانتے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف انتساب مشرکین بھی کرتے تھے۔

گروہِ انبیاء کے ذِکر کے بعد شرک کی مذمت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اتنے برگزیدہ لوگ! اگر اِن سے بھی شرک کا صدور ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ اِن کے بھی اعمال برباد کر دیتا، یعنی جن لوگوں کی طرف انتساب کی بناء پر تم فخر کرتے ہو اور اپنے لئے نجات کو تجویز کیے بیٹھے ہو، شرک تو ایک ایسی بیماری ہے کہ اگر اِن میں سے بھی کسی سے صادر ہو جاتی تو وہ بھی راستے پر بھٹک جاتا اور ہم اُس کے اعمال برباد کر دیتے، اور تم جو اُن کی طرف انتساب رکھنے والے ہو تو تمہارا شرک تمہارے لئے بربادی کا باعث کیسے نہیں بنے گا؟ تو ان ہدایت یافتہ لوگوں کے ذکر کرنے کے بعد گویا کہ شرک کی مذمت کو نمایاں کر دیا، کہ اگر ان سے بھی یہ صادر ہو جاتا تو ان کے بھی اعمال برباد ہو جاتے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ: یہی لوگ ہیں کہ جن کو ہم نے کتاب دی اور حکم دیا، حکم اور حکمت ایک ہی چیز ہے، حکم کا معنی ہوتا ہے فہمِ صحیح پھر اُس کے مطابق فیصلہ کرنا، اور کتاب اسی حکم اور حکمت کے تحت ہی عملی صورت اختیار کیا کرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کتاب جو اُتارا کرتا ہے تو صرف اُس کے الفاظ ہی مقصود نہیں ہوا کرتے، یا اُس کو تبرک بنا کر رکھنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اُس کتاب سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کو صحیح طور پر سمجھا جائے، اور پھر اُس کے مطابق فیصلہ جات صحیح کیے جائیں، جب وہ عملی صورت اختیار کرتی ہے تو گویا کہ حکم اور حکمت سامنے آجاتی ہے، ''ہم نے اُن کو کتاب دی اور حکم دیا اور نبوّت دی۔''

حضور ﷺ کو تسلی، مخالفین کے لئے وعید، اور صحابہ کی عظمت

فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ: ''هٰٓؤُلَآءِ'' سے حضور ﷺ کے مخاطبین مراد ہیں، اگر اس نبوّت کا انکار یہ لوگ کرتے ہیں فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ: ہم نے کفیل بنا دیا ہے اس کے ساتھ اور لوگوں کو جو کہ اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں، وکیل بنا دیا، متعین کر دیے، یعنی آپ کی نبوّت کے اگر یہ انکاری ہیں تو آپ کی نبوّت کے ماننے کے لئے ہم نے اور قوم متعین کر دی ہے، اس سے مراد وہ صحابہ ﷺ بھی ہو سکتے ہیں جو اُس وقت تک ایمان لے آئے تھے، اور بعد میں آنے والے بھی سارے کے سارے مراد ہوں گے، کہ یہ نہیں مانتے تو ان کے نہ ماننے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، ہم دوسرے لوگوں کو کھڑا کر لیں گے جو اس نبوّت کو مانیں گے، اور اس کے حقوق ادا کریں گے، لَيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ: وہ اس کا انکار کرنے والے نہیں ہوں گے۔

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ہدایات، اور عظمتِ قرآن

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ: یہی جماعت ہے جن کا ذکر پیچھے آیا، اللہ نے ان کی راہنمائی کی، فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ: آپ بھی انہی کے طریقے پر چلئے، چونکہ یہ اللہ کی ہدایت کے حامل ہیں تو ان کا طریقہ وہی اللہ کی ہدایت کا مصداق ہے، آپ اسی طریقے کی اقتدا کیجئے۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا: اور انہیں کہہ دیجئے کہ تم اگر نہیں مانتے تو اس میں میرا نقصان کوئی نہیں، یعنی میں تمہارے ساتھ جو اس قسم کا معاملہ رکھتا ہوں یہ کوئی میری تجارت نہیں ہے، کوئی دُکان داری نہیں، کہ اگر تم خریدار نہیں بنو گے تو میری دُکان بیٹھ

جائے گی، کاروبار مندا ہوجائے گا، ایسی بات نہیں، یہ تو اللہ کی ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے مجھے مفت ملی، مفت بانٹ رہا ہوں، قبول کرنے میں تمہارا فائدہ ہے اگر قبول نہیں کرو گے تو تم اپنا نقصان کرو گے۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا آپ کہہ دیجئے کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، کہ تمہارے نہ ماننے کی صورت میں میرا اس میں کوئی نقصان ہو جائے، اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ: نہیں ہے یہ قرآن مگر ذکریٰ جہانوں کے لیے، ذکریٰ کا معنی یاددہانی، یعنی یہ قرآن یاددہانی کا ذریعہ ہے، یاددہانی کس چیز کی کرواتا ہے؟ فطری تقاضوں کی یاددہانی کراتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا جو کیا تو تمہاری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا چیز ڈالی؟ فطرت کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ قرآن اس کی یاددہانی بھی کراتا ہے، انبیاء ﷺ کی تعلیم کی یاددہانی بھی کراتا ہے، اور دُنیا کی تاریخ کے اندر جس قسم کے واقعات گزرے جو انسان کے لئے عبرت کا باعث ہیں اُن کی یاددہانی بھی کراتا ہے، تو جو شخص اس یاددہانی سے فائدہ اُٹھائے گا کامیاب ہوگا، اور جو اس یاددہانی کی طرف توجہ نہیں کرے گا نقصان اٹھائے گا، میرا اس میں کوئی کسی قسم کا نقصان نہیں، میں کوئی اُجرت نہیں مانگتا جو تمہارے نہ ماننے کی صورت میں مجھے کوئی نقصان ہو۔'' آپ کہہ دیجئے کہ نہیں سوال کرتا میں تم سے اس قرآن پر یا اس تبلیغ پر کسی قسم کے اجر کا، نہیں ہے یہ قرآن مگر تمام جہانوں کے لئے نصیحت۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ

اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی اُن لوگوں نے اُس کی قدر کرنے کا حق، جبکہ کہا انہوں نے نہیں اُتاری اللہ نے کسی انسان پر

شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا

کوئی شیٔ، آپ کہہ دیجئے! کہ کس نے اُتاری وہ کتاب جس کو موسیٰ لائے تھے اس حال میں کہ وہ نُور تھی

وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ

اور لوگوں کے لئے راہنمائی ہے، بناتے ہو تم اس کتاب کو مختلف اوراق، ظاہر کرتے ہو ان اوراق کو، اور بہت سے اوراق چھپاتے ہو،

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ

اور تعلیم دیے گئے تم جو تم نہیں جانتے تھے نہ تمہارے آباء، آپ خود ہی جواب دیجئے کہ اللہ نے، پھر انہیں چھوڑ دیجئے

خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ۝٩١ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ

وہ اپنے مشغلے میں کھیلتے رہیں ۝٩١ اور یہ ایسی کتاب ہے جس کو ہم نے اُتارا، برکت دی ہوئی ہے، مصداق بننے والی ہے اُس

بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

کتاب کا جو اس سے پہلے ہے، اور تا کہ تُو ڈرائے اُمّ القریٰ کو اور اُن لوگوں کو جو کہ اُمّ القریٰ کے اِرد گرد ہیں، اور جو لوگ آخرت پر ایمان

بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ

لاتے ہیں وہ اس قرآن پر بھی ایمان لائیں گے، اور وہ اپنی نمازوں کے اُوپر محافظت کرنے والے ہیں ﴿۹۲﴾ کون

اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ

بڑا ظالم ہے اُس شخص سے جو اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑے، یا کہے میری طرف وحی کی جاتی ہے حالانکہ اس کی طرف کوئی وحی

اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ

نہیں کی جاتی، اور جو کہے عنقریب میں بھی اُتاروں گا مثل اُس چیز کے جو اللہ نے اُتاری، اور اگر تُو دیکھے جب

الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا

ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلانے والے ہوں گے (اور کہتے ہوں گے) نکالو

اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى

اپنی جانیں، آج تم بدلہ دیے جاؤ گے ذِلّت کا عذاب بسبب اس کے کہ تم اللہ کے اُوپر

اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا

ناحق بولتے تھے اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے تکبر کرتے تھے ﴿۹۳﴾ البتہ تحقیق آ گئے ہو تم ہمارے پاس

فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ

تنہا تنہا جیسے کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اور چھوڑ آئے تم وہ چیزیں جو ہم نے تمہیں دی تھی (چھوڑ آئے) اپنی پشتوں کے پیچھے

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ

اور نہیں دیکھتے ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشی جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہارے اندر شرکاء ہیں

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع

ٹوٹ گیا وہ تعلق جو تمہارے اپنے درمیان تھا، اور گم ہو گئیں تم سے وہ چیزیں جن کو تم سمجھا کرتے تھے (کہ وقت پر کام آنے والی ہیں) ﴿۹۴﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ: اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی ان لوگوں نے اُس کی قدر کرنے کا حق، یعنی جس طرح سے قدر کرنی چاہیے تھی اس طرح سے اِن لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، اِذۡ قَالُوۡا: جبکہ کہا انہوں نے، مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ: عَلٰى بَشَرٍ میں بشر نکرہ ہے، مِّنۡ شَىۡءٍ میں شیٔ نکرہ ہے، اور مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ میں مَا نافیہ ہے، اور کلام منفی میں نکرہ آجائے تو یہ عموم کو چاہتا ہے، تو معنی یہ ہوگا ''نہیں اُتاری اللہ نے کسی انسان پر کوئی شیٔ''۔ ''جبکہ کہا انہوں نے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شیٔ نہیں اُتاری، اس کہنے کے وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی جس طرح سے قدر کرنی چاہیے تھی'' یہ قدر شناسی نہیں ہے۔ قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى: آپ کہہ دیجئے کہ کس نے اُتاری وہ کتاب جس کو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے؟ نُوۡرًا: اس حال میں کہ وہ نُور تھی، یعنی واضح کتاب ہے، جس طرح سے نُور واضح ہوتا ہے، وَّهُدًى: اور لوگوں کے لئے راہنمائی تھی، تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ: قراطیس قِرطاس کی جمع ہے، قرطاس: کاغذ۔ بناتے ہوتم اُس کتاب کو مختلف اوراق۔ تَجۡعَلُوۡنَهٗ کی ''ہٗ'' ضمیر اس کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ قرار دیتے ہوتم اس کتاب کو، بناتے ہوتم اس کتاب کو مختلف اوراق، تُبۡدُوۡنَهَا: ظاہر کرتے ہو اُن اوراق کو، وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا: اور بہت سے اوراق چھپاتے ہو، وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا: اور تعلیم دیے گئے تم جو تم نہیں جانتے تھے نہ تمہارے آباء، نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے آباء، تمہیں اس کتاب کے ذریعے سے ایسی چیزیں سکھائی گئیں۔ قُلِ اللّٰهُ: یہ جواب ہے مَنۡ اَنۡزَلَ کا، اس کتاب کو کس نے اُتارا؟ تو آپ خود ہی جواب دے دیجئے کہ اللہ نے، کیونکہ جواب متعین ہے، ''اللہ کہہ دیجئے'' یعنی جواب میں اللہ کہہ دیجئے، ثُمَّ ذَرۡهُمۡ: پھر انہیں چھوڑ دیجئے، فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ: وہ اپنے مشغلے میں کھیلتے رہیں۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ: اور یہ ایسی کتاب ہے جس کو ہم نے اُتارا، مُبٰرَكٌ: برکت دی ہوئی ہے، یعنی بہت کثیر النفع ہے، دینی و دُنیوی نفع اللہ نے اس میں رکھا ہے، برکت کا معنی یہی ہوتا ہے، ''فلاں چیز بابرکت ہے'' یعنی دُنیا و آخرت کے لیے مفید ہے، اس میں نفع کا پہلو غالب ہے، ''برکت دی ہوئی ہے'' مُّصَدِّقُ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ: مصداق بننے والی ہے اس کتاب کا جو اس سے پہلے ہے، تصدیق کرنے والی ہے، تصدیق کا یہاں یہی معنی ہے کہ اس کی پیش گوئیوں کا مصداق ہے، جیسے کہ یہ مفہوم پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا جاچکا ہے، ''سچا قرار دینے والی ہے اس کتاب کو جو اس سے پہلے ہے'' وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى: وَلِتُنۡذِرَ کے اوپر جو واؤ عاطفہ ہے اس کا معطوف علیہ ماقبل کے الفاظ سے یہ اخذ کرلیا جائے گا اَنۡزَلۡنٰهُ لِلۡبَرَكَةِ وَلِلتَّصۡدِيۡقِ وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى: ہم نے اس کتاب کو برکت کے لیے اُتارا، اور پہلی کتابوں کی تصدیق کے لئے اُتارا، اور اس لیے اُتارا تاکہ آپ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا کو ڈرائیں۔ اُمَّ الۡقُرٰى کا لفظی معنی ہے بستیوں کی اصل، اُم اصل کو کہتے ہیں، بستیوں کی اصل، قُرٰی قریۃ کی جمع ہے اور اس کا مصداق مکہ معظمہ ہے، اور وہ بستیوں کی اصل بایں معنی ہے کہ ظاہری طور پر اُس وقت اس کو تمام دُنیا کے لئے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی، اور ویسے بھی ''قدیم دُنیا'' میں وہ بالکل وسط میں واقع ہے، اور ''نئی دُنیا'' سے مراد امریکا ہے وہ بالکل اس کے بالمقابل نیچے ہے، جتنی دُنیا اُس وقت دریافت تھی یہ (مکہ) اس کے وسط میں ہے، امریکا کو ''نئی دنیا'' کہتے ہیں کیونکہ یہ باقی دُنیا سے بالکل کٹا ہوا تھا، کسی کو اس کی خبر نہیں تھی، یہ تقریباً آج سے کوئی ساڑھے

پانچ سوسال پہلے دریافت ہوا ہے اور باقی دُنیا کے اِس کے ساتھ تعلقات ہوئے ہیں، اور ساڑھے پانچ سو، پونے چھ سوسال قبل یہ دُنیا جو ''مشرقِ وسطیٰ'' کہلاتی ہے، اور اس کے آس پاس والے ممالک، افریقہ اور متصل دوسرے ممالک جو بھی ہیں جن کی حدود آپس میں متصل ہیں، ان کا امریکا کے ساتھ کسی لحاظ سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ بہت بڑے بڑے سمندر درمیان میں حائل ہیں، اور اس کی خشکی کی سرحد کسی کے ساتھ نہیں لگتی، بالکل وسط سمندر میں ہے، نقشے میں اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا۔ تو اس کو دریافت ہوئے ہوئے زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ سو، پونے چھ سوسال ہوگئے ہیں، اس سے قبل اس دُنیا کو اس کا کوئی پتا نہیں تھا کہ کوئی اور دُنیا بھی ہے، اس لیے امریکا کو ''نئی دُنیا'' کہا جاتا ہے، تو ''پُرانی دُنیا'' جو اُس وقت آپس میں تعلقات رکھتی تھی مکہ معظمہ اس کے وسط میں ہے۔ اور روایاتِ حدیث کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین کو بنایا تھا تو یہیں سے زمین متشکل ہونی شروع ہوئی تھی، اس اعتبار سے بھی اس کو ''اُمّ القریٰ'' کہہ دیا جاتا ہے، اور رُوحانی مرکز تو اَب وہ ہے ہی، قرآنِ کریم کے اُترنے کے بعد اس کی رُوحانی مرکزیت کی اور توثیق ہوگئی، اس اعتبار سے اس کو ''اُمّ القریٰ'' کہتے ہیں، بستیوں کی اصل، بستیوں کی ماں، ماں سے یہاں اصل مراد ہے، مصداق اس کا مکہ معظمہ ہے، ''تاکہ ڈرائے تُو اُمّ القریٰ کو'' وَمَنْ حَوْلَهَا: اور ان لوگوں کو جو کہ ''اُمّ القریٰ'' کے اردگرد ہیں، یا تو اس اردگرد سے وہی عرب کا علاقہ مراد ہے، کیونکہ اوّلین مخاطب حضور ﷺ کے وہی تھے، یا اردگرد سے ساری دُنیا مراد ہے، جب وہ مرکزی نقطہ ہوا تو اس کے اردگرد ساری دُنیا ہوگئی، جیسے کہ دوسری جگہ الفاظ میں واضح کردیا گیا: لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (سورۂ فرقان:۱) تاکہ آپ ﷺ سارے جہانوں کے لیے ڈرانے والے بن جائیں۔ اور اگر مَنْ حَوْلَهَا سے مراد عرب کا علاقہ ہوگا تو اوّلین مخاطب ہونے کے اعتبار سے اس کو ذکر کیا جارہا ہے، ''تاکہ ڈرائے تُو مکہ معظمہ کو اور اس کے ارگرد کے لوگوں کو'' یعنی مکہ معظمہ کے رہنے والوں کو، اَهْلَ اُمِّ الْقُرٰى، اور وَمَنْ حَوْلَهَا: جو لوگ اس اُمّ القریٰ کے اردگرد ہیں۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: اور جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: وہ اِس قرآن پر بھی ایمان لائیں گے، وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ: اور وہ اپنی نمازوں کے اوپر محافظت کرنے والے ہیں، نمازوں کا خیال رکھتے ہیں۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ کے اوپر جھوٹ گھڑے، اَوْ قَالَ: یا کہے: اُوْحِيَ اِلَيَّ: میری طرف وحی کی جاتی ہے، وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ: حالانکہ اس کی طرف کوئی وحی نہیں کی جاتی، وَّمَنْ قَالَ: اور جو کہے سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ: عنقریب میں بھی اُتاروں گا مثل اس چیز کے جو اللہ نے اُتاری۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ: اور اگر تُو دیکھے جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے، غَمَرٰتِ غَمْرَة کی جمع، غمرہ سختی کو کہتے ہیں۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ: اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلانے والے ہوں گے، اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: يقولون اخرجوا انفسكم: اور وہ فرشتے کہتے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں، اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ: آج تم بدلہ دیئے جاؤ گے ذِلّت کا عذاب، بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ: بسبب اس کے کہ تم اللہ کے اوپر ناحق بولتے تھے، ایسی باتیں بولتے تھے جس قسم کی بات بولنے کا تمہیں حق نہیں تھا، وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ: اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى: یہ قیامت کے دن انہیں کہا جائے گا۔ البتہ تحقیق آگئے ہو تم ہمارے پاس تنہا تنہا۔ فُرَادٰى: فرداً فرداً، علیحدہ علیحدہ، اکیلے اکیلے۔ جتھے اور گروہ اور جماعتیں جو دُنیا میں بنارکھی تھیں وہ گروہ بندی نہیں رہی، ہر کوئی اپنی انفرادی حیثیت میں آیا ہے،

''آ گئے ہوتم ہمارے پاس اکیلے اکیلے'' کَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ جیسے کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اسی کیفیت سے واپس آ گئے ہو، اوراس کیفیت میں یہ بھی داخل ہے کہ ننگ دھڑنگ، نہ سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا، اور جیسے حدیث شریف میں آتا ہے حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا، بچہ پیدا ہونے کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔ حُفَاةً: ننگے پاؤں، عُرَاةً: ننگے بدن، غُرْلًا: بے ختنہ، ایسی کیفیت کے ساتھ۔ ''جیسے کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا'' وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ: اور چھوڑ آئے تم وہ چیزیں جو ہم نے تمہیں دی تھیں۔ مَا خَوَّلْنٰكُمْ: جو چیزیں ہم نے تمہیں دی تھی تم وہ چیزیں چھوڑ آئے، کہاں چھوڑ آئے؟ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ: اپنی پشتوں کے پیچھے، یعنی دُنیا میں۔ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمْ: اور نہیں دیکھتے ہم تمہارے ساتھ تمہارے سفارشی، الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا: جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہارے اندر شرکاء ہیں۔ شرکاء شریک کی جمع ہے۔ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ: تَقَطَّعَ: ٹوٹ گیا۔ تَقَطَّعَ کا فاعل یہاں محذوف ہے تَقَطَّعَ الْحَبْلُ بَيْنَكُمْ، تَقَطَّعَ الْوُصْلَةُ بَيْنَكُمْ، تمہارا جو آپس میں تعلق تھا وہ ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا وہ تعلق جو تمہارے اپنے درمیان تھا، جیسے دوسری جگہ لفظ آتا ہے وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (سورۂ بقرہ: ۱۶۶) کہ ان کے جو اسباب تھے (اسباب سے وہی تعلقات مراد ہیں) ان کے جو آپس میں تعلقات تھے سب منقطع ہو گئے۔ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ: اور گم ہو گئیں تم سے وہ چیزیں جن کو تم سمجھا کرتے تھے کہ وقت پہ کام آنے والی ہیں، وہ ساری کی ساری چیزیں تم سے گم ہو گئیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

تفسیر

ماقبل سے ربط اور پچھلے رُکوع پر اِجمالی نظر

پچھلے بیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہوا تھا، جس میں انہوں نے اپنی قوم کے مقابلے میں اللہ کی وحدانیت کو ثابت کیا تھا، ستاروں کی رُبوبیت کی تردید کی تھی، اور اَصنام کی اُلوہیت کو رَدّ کیا تھا، یہ دو مضمون بنیادی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے میں آپ کے سامنے آئے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اثباتِ توحید اور رَدِّ شرک میں محنت کی، اور اس راستے کے اندر مشکلات برداشت کیں، قربانیاں دیں، وطن چھوڑا، خاندان چھوڑا، برادری کو ترک کیا، اور دیگر اِبتلاءات جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے وہ سارے کی سارے برداشت کیے، تو اللہ تعالیٰ نے دُنیا اور آخرت میں عزّت سے نوازا، اور اُن کے نام کو اس قدر روشن کیا کہ بعد میں نبوت کا سلسلہ سارے کا سارا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تعلق پکڑ گیا، چنانچہ پچھلے رُکوع میں جو سترہ پیغمبروں کا ذکر آیا تھا اُن میں حضرت نوح علیہ السلام کو چھوڑ کر باقی جو مذکور ہوئے وہ سارے کے سارے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہی تھے، تو یہ نیک نام کا باقی رہ جانا اور آنے والے وقت میں لوگ اُن کو اپنا مقتدیٰ قرار دیں یہ دُنیوی عزّت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی، اور آخرت کی عزّت کا تو کیا ہی کہنا، کیونکہ یہ کارِ خیر جو اُن کے سلسلے میں باقی رہا اس سب میں وہ برابر کے شریک ہیں، اور ابو الانبیاء ہیں، آخرت کے مراتب بھی اُن کے ہوں گے، تو ان انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گویا کہ ایک دُنیوی

عزت کا ذکر بھی تھا، اُن کی کامیابی کا ذکر بھی تھا، اور ساتھ ہی رسالت کا ذکر بھی ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح بعد میں بھی جاری رہا، اور وہ سارے کے سارے موحد تھے، اور اگر اُن میں سے کسی سے شرک صادر ہو جاتا تو اُن کی بھی زندگی بھر کی کمائیاں ختم ہو جاتیں، اور اُن کے اعمال برباد ہو جاتے، یعنی تم ان کی طرف محض انتساب کر کے بے فکر ہوئے بیٹھے ہو، اور ہر قسم کا شرک کرتے ہو اور اللہ سے نہیں ڈرتے، تو جن کی طرف تم انتساب پر فخر کرتے ہو اُن کا بھی مقام ایسا ہے کہ اگر شرک وہ بھی کرتے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بھی ٹھکرا دیئے جاتے، تو اُن کی طرف نسبت رکھنے والوں کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اور ان کا ذکر کرنے کے بعد پھر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ اِنہی کے ساتھ جوڑا تھا کہ آپ بھی اُسی طریقے پر ہیں جس طریقے پر یہ لوگ آئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کو سیدھے راستے پر چلایا تھا تو آپ بھی اِنہی کی اقتدا کیجئے، یعنی اُنہی والا طریقہ اختیار کیجئے اور اس طریقے سے مراد ہے اُصولِ دین کا اختیار کرنا، اور فروع جو منسوخ نہ ہوئے ہوں اُن کو اختیار کرنا، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے حکم کے خلاف کوئی حکم آجائے، پھر تو اسلام اور فرمانبرداری جو کہ انبیاء علیہم السلام کا مسلک ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ نئے حکم کو مانا جائے، اور اگر کوئی نیا حکم نہ آئے تو پھر جو حکم انبیاء علیہم السلام کو پہلے آیا ہوا تھا شرائع سابقہ میں اسی کے اُوپر ہی عمل کیا جائے گا۔ اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرنے کے بعد پھر آپ سے ایک ایسا اعلان کروایا گیا تھا جو انبیاء علیہم السلام کے درمیان میں مشترکہ اعلان ہے، جہاں انبیاء علیہم السلام کے واقعات مفصل آئیں گے وہاں یہ بات تقریباً ہر نبی کے واقعہ میں آئے گی کہ نبی اپنی قوم کے مقابلے میں اعلان کرتا ہوا یہ ضرور کہتا ہے کہ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا: کہ میں تمہارے لئے اِس دِین کے بارے میں جو محنت کر رہا ہوں، تبلیغ کر رہا ہوں، اللہ کا دِین پہنچا رہا ہوں، یہ میرا ایک فرض ہے جو میں ادا کر رہا ہوں، میرا کاروبار نہیں کہ جس کے بارے میں مجھے یہ اندیشہ ہو کہ اگر تم نے اِس کو قبول نہ کیا تو میرا کوئی نقصان ہو جائے گا، میری دُکان بیٹھ جائے گی، میری تجارت فیل ہو جائے گی، کساد بازاری ہو جائے گی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اگر قبول کرو گے تو اس میں تمہارا نفع ہے، نہیں قبول کرو گے تو میرا کوئی نقصان نہیں، میرا تو اَجر جو بھی ہے سب اللہ کے ذِمّے ہے، یہ انبیاء علیہم السلام اعلان کرتے ہیں، اور اس اعلان کا اثر یہ پڑتا ہے کہ دوسرا شخص متوجہ ہوتا ہے کہ یہ بے غرض ہے، بے مطلب ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی مقصد نہیں، کوئی دُنیوی مفاد حاصل نہیں کرنا چاہتا، تو یہ خلوص اثرانداز ہوتا ہے دوسرے پر، یہ اعلان ہوا تھا۔

رُکوعِ ہٰذا کا خلاصہ اور آیات کا شانِ نزول

اور آگے جو آپ کے سامنے رُکوع پڑھا گیا اس میں مسئلۂ رِسالت کی تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ سورۂ اَنعام اگرچہ مکی ہے، اور مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ جو پڑا تھا وہ اہلِ مکہ سے تھا جو کہ مشرک تھے اور نبوّت کے سرے سے منکر تھے، اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کے اُوپر اپنی کتاب یا اپنا پیغام کس طرح سے اُتارتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنا کر بھیجنا ہے تو کسی فرشتے کو بھیج دے اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (سورۂ اسراء: ۹۴)، اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا (سورۂ تغابن: ٦)، اس قسم کے الفاظ جو قرآنِ کریم میں آئے ہیں اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بشر کے رسول ہونے کے منکر تھے کہ بشر رسول نہیں ہوسکتا، تو مشرکینِ مکہ کے ساتھ آپ کا براہِ راست واسطہ تھا اور اُس زمانے میں اہلِ کتاب یہود یہ مدینہ کے اردگرد

موجود تھے، اگر چہ ان کے ساتھ آپ کی براہِ راست اُس وقت ٹکر نہیں تھی، لیکن یہود نے آخر حالات پکھ تو رکھے، تو انہوں نے بھی اس اُٹھنے والے مذہب کو اس اُٹھنے والے دین کو اپنے لئے خطرہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا ابتدا سے ہی، اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان اُمیوں کے اندر پیغمبر آ گیا تو ہماری علمی ریاست بنی اسحاق سے اور بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسماعیل کی طرف چلی جائے گی، یہ ہماری خاندانی وجاہت کے خلاف ہے۔ تو جب اِس قسم کی کوئی صداقت نمایاں ہوتی ہے جس سے کسی کے کاروبار کو نقصان پہنچتا ہے، کسی کی حیثیت مجروح ہوتی ہے، تو پھر وہ مختلف سازشوں کے ذریعے سے اُس کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، تو اہلِ مکہ میں جب یہ آواز اٹھی کہ اللہ کی طرف سے کوئی رسول آیا ہے، اُس کے اُوپر کتاب اُتری ہے، تو گاہے گاہے وہ یہود سے ملتے تھے اور اُن کے سامنے حالات کا تذکرہ کرتے، اور اِس کو دبانے کے لئے وہ اُن سے مشورہ لیتے تھے، اور وہ یہود آئے دن اُن کو کچھ نہ کچھ پٹی پڑھاتے رہتے، اب اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہود ''اہلِ کتاب'' ہیں، اور اُن کا ایمان تھا موسیٰ علیہ السلام پر، اور وہ موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے تھے، اور موسیٰ علیہ السلام بشر تھے، اور اُن پر جو تورات اُتری تھی اُس کو بھی وہ لئے ہوئے تھے، اور اسی تورات کی وجہ سے وہ دُنیا کے اندر اپنے علم کا سکہ چلائے ہوئے تھے، تو وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بشروں کو رسول بناتا ہے، اور اُن کے اُوپر کتابیں بھی اُتارتا ہے، یہود کا یہ عقیدہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ بُرا کرے اِس ضد کا کہ جب یہ آجاتی ہے تو اُس وقت پھر واضح سے واضح حقائق سے بھی انسان چشم پوشی کر جاتا ہے، اُن کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اب اُن کا مقصد تو یہ تھا کہ بنی اسماعیل، بنی اسرائیل کے مقابلے میں اُبھر نہ آئیں، اور اِن کے اندر کوئی قسم کی خیر باقی نہیں رہنی چاہیے، لیکن یہ بات اگر وہ اپنی زبان سے کہتے تو ایسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ اہلِ عرب کا تعصب بھڑک اُٹھے، اور وہ یہود کے مقابلے میں تعصب میں آکر حضور ﷺ کا ساتھ دینا شروع کر دیں، یہ بھی تو اندیشہ ہوتا ہے، تو وہ تعصب بھی بھڑکنے نہیں دیتے تھے، تو اِس سیاسی چال کے طور پر وہ آئے دن شبہات پیدا کرتے رہتے تھے تاکہ یہ عرب اِس کو قبول نہ کریں، جب اِس کو قبول نہیں کریں گے اور اِن کے اندر یہ اسلام پھیلے گا نہیں، تو بنی اسرائیل کی علمی ریاست اِن کی طرف منتقل نہیں ہوگی، تو مشرکینِ مکہ کی اُن کے ساتھ کہیں کوئی ملاقات ہوئی ہوگی، تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بات ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز کسی بندے پر اُترتی ہے، کسی انسان پر اللہ نے کبھی کوئی چیز نہیں اُتاری، اب اِس فقرے سے وہ بددِل کرنا چاہتے ہیں اور دُور ہٹانا چاہتے ہیں اہلِ مکہ کو سرورِ کائنات ﷺ پر ایمان لانے سے، کہ یہ بات ہی غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی انسان پر کچھ اُتارا ہی نہیں، اب اِس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اہلِ عرب اُلٹ کر یہ کہہ دیں کہ پھر تم کیوں موسیٰ علیہ السلام کو مانے بیٹھے ہو؟ تم اِس کتاب کے اُوپر ایمان کس طرح سے لائے ہو؟ لیکن ضد بازی میں یہ چیزیں نہیں سوجھا کرتیں، اس میں تو دوسرے کی مخالفت کے اُوپر اُکسانا مقصود ہے چاہے نتیجۃً اپنا بھی نقصان ہو ہی جائے، جب حسد آجایا کرتا ہے اور ضد آجایا کرتی ہے تو پھر انسان یہ نہیں دیکھا کرتا کہ یہ بات میرے لئے بھی نقصان دہ ہے، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ وقتی طور پر یہ بات کر کے دوسرے کو نقصان پہنچاؤ، جب یہ بات اُلٹ کر اپنے پر آئے گی تو پھر دیکھی جائے گی، پہلے کون سے اہلِ عرب ہمیں مانے بیٹھے ہیں جو بعد میں ہمارے منکر ہو جائیں گے، مشرکینِ مکہ تو پہلے اُن کے ساتھ نہیں تھے، تو اگر اس بات کے نتیجہ میں اور بددِل ہو جائیں یا بداعتقاد ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا

ہے، مقصد تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ اِن کی عقیدت نہ ہو، یہ آنے والی کتاب کو نہ تسلیم کریں، جیسے کسی فارسی شاعر کا شعر ہے، وہ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہے کہ ۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد کردہ باشی

کہ ہمارے لئے تو یہی خوشی کی بات ہے کہ تُو نے ہمارے رقیبوں سے دامن چھڑا لیا، ہم بھی چاہے برباد ہو جائیں اس کی پروا نہیں، اپنی بربادی کی فکر نہیں، خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے ہمارے رقیبوں سے دامن چھڑا لیا۔ تو یہاں بھی وہی بات ہے، وہ چاہتے تھے کہ محمد ﷺ کو یہ نہ مانیں، باقی! ہم سے بد اعتقاد رہیں، ہم سے دُور رہیں، اس کی کوئی بات نہیں، وہ پہلے کون سے ہمارے معتقد ہیں۔ تو یہ پٹی پڑھا دی، تو جب یہ پٹی پڑھا دی تو سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے جب اس قسم کا کوئی اعتراض آیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِن آیات کے اندر پہلے تو اُن یہود کی خبر لی ہے، اُن کے اس اعتراض کو اٹھایا جو انہوں نے کیا تھا، وضاحت کے ساتھ اس کا رَدّ کر دیا، وہ مانیں یا نہ مانیں، منصف قسم کے اہلِ عرب کے سامنے بات آگئی کہ یہ بات یہود کے تعصب کی ہے، اور یہ بات انہوں نے غلط پڑھائی ہے جس کو بھی پڑھائی ہے۔ اور پھر مشرکین مکہ کے جو رُؤساء تھے وہ اپنے تکبّر کی بنا پر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ کو اِس لئے ٹھکرا رہے تھے کہ ذی وجاہت تو ہم ہیں، مال دار تو ہم ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب اُترنی تھی، اللہ نے اپنا کوئی نمائندہ بندوں کو طرف بنانا تھا تو نمائندہ ہمیں بننا چاہیے تھا، وہ اِس حسد کے اندر مبتلا تھے، اور اپنی نخوت اور اپنے غرور کی بنا پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، تو رُکوع کی آخری آیات میں براہِ راست اُن کے اُوپر انکار ہے۔ تو پہلی آیات کا تعلق یہود کے ساتھ ہے، اور رُکوع کی جو آخری آیات ہیں اُن کا تعلق مشرکین کے رُؤساء کے ساتھ ہے۔

یہود کی ناشکری اور ناقدر شناسی

پہلی بات جو کہی گئی وہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اُتاری تو انہوں نے اللہ کی شان نہیں پہچانی، اللہ کی قدر نہیں کی، یہ قدر شناسی نہیں ہے کہ جس اللہ پر اِن کا ایمان ہے، جس کے رسولوں پر اِن کا ایمان ہے، جس کی کتاب کی برکت سے یہ پیر بنے بیٹھے ہیں، مولوی بنے بیٹھے ہیں، اور کھا رہے ہیں پیٹ پال رہے ہیں، اور ایک وقت میں آ کر اُسی کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس اللہ نے کچھ بھی نہیں اُتارا؟ یہ کتنی زیادہ ناشکری ہے، جس کے اُتارنے کی برکت سے عالم بنے بیٹھے ہیں، جس کے کتاب دینے کی برکت سے علمی سرداری اِن کے لئے ہوگئی، پیر بن گئے، رُہبان بن گئے، اَحبار بن گئے اور خواہ مخواہ گل چھرے اُڑا رہے ہیں، عیش پرستی کر رہے ہیں، اب اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ اللہ نے کچھ نہیں اُتارا؟ اور پھر اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کو انہوں نے کیا پہچانا کہ اللہ تعالیٰ انسان کی اس پیاس کے بجھانے کے لئے پانی کو زمین سے بھی اچھالے اور آسمان سے بھی برسائے اور اس کے پیٹ کو بھرنے کے لئے تو اللہ تعالیٰ جگہ بہ جگہ نعمتوں کے انبار لگا دے، تو جو رُوح اس کے اندر ڈالی ہے اُس رُوح کی پیاس کو بجھانے کے لئے اللہ نے کوئی انتظام نہیں کیا؟ اور انسان کی فطرت کے اندر اللہ نے جو طلبِ حق کا جذبہ رکھا ہے، اس طلب کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے کوئی سامان نہیں کیا؟ تو تم نے کیا پہچانا اللہ کو، کہ اپنی مخلوق کی کس طرح ضرورتیں پوری کرتا

ہے، تم نے اس کو نہیں پہچانا، تو وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ کے اندر یہ سارے پہلو آجائیں گے، "ان لوگوں نے جب یہ کہا تو اللہ کی قدر نہیں کی جس طرح قدر کرنی چاہیے تھی" یہ اللہ کی قدر شناسی نہیں ہے، "جبکہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اُتاری۔"

یہود کے اِعتراض کا علمی جواب

مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ یہ منطقی اِصطلاح کے اعتبار سے سالبہ کلیہ ہے، کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نہیں اُتارا، اور آپ کیا پڑھتے ہیں کہ سالبہ کلیہ کی نقیض کیا آیا کرتی ہے؟ موجبہ جزئیہ، دیکھو! قرآنِ کریم نے اُسی انداز کے ساتھ اس کا جواب دیا، کہ سالبہ کلیہ کو جھوٹا ثابت کیا ایجابِ جزئی کے ساتھ، "کسی انسان پر اللہ نے کچھ نہیں اُتارا"۔ "تو آپ ان سے پوچھئے کہ موسیٰ علیہ السلام جو کتاب لائے تھے وہ کس نے اُتاری تھی؟" اب دیکھو! موسیٰ علیہ السلام بھی ایک جزئی ہے، اور موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب اُتری تورات وہ بھی ایک جزئی ہے، انہوں نے کہا کہ کسی انسان پر کچھ نہیں اُترا، اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام پر جو تورات اُتری تھی وہ کس نے اُتاری؟ اب ایک جزئیہ بھی اگر ثابت ہوجائے تو کلیہ ٹوٹ گیا، سالبہ کلیہ کو جھوٹا کرنے کے لئے دوسری جانب موجبہ کلیہ ضروری نہیں ہوتا، ایجابِ جزئی کے ساتھ بھی سالبہ کلیہ کی تردید ہوجاتی ہے، تو یہ اُسی انداز کے ساتھ تردید ہے کہ "آپ اِن سے پوچھئے کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام لائے تھے" یہ بشر کی تردید ہوگئی، کہ تم کہتے ہو کسی بشر پر نہیں اُتری، جبکہ موسیٰ علیہ السلام پر اُتری، تم کہتے ہو کچھ نہیں اُترا، ہم کہتے ہیں تورات اُتری، تو تورات کا موسیٰ علیہ السلام پر اُترنا یہ پچھلے جملے کی تردید ہے کہ کسی انسان پر کچھ نہیں اُترا، ایک انسان پر ایک کتاب کے اُترنے کا ذکر کر کے اس سالبہ کلیہ کو توڑ دیا گیا۔ اور وہ کتاب اِس حیثیت کی تھی کہ نُور ہے اور ہدایت ہے، واضح ہے، یعنی ایسی مبہم نہیں کہ جس کا مطلب سمجھنا مشکل ہو، نُور کی طرح واضح ہے، اور لوگوں کے لئے راہنمائی کا باعث ہے، یہ اُس کی ذاتی حیثیت ہوگئی۔

یہود کا تورات سے غیر منصفانہ رویہ

پھر تم نے اس کتاب کو کاروبار بنالیا کہ اس طرح سے نہیں جس طرح سے ہمارے ہاں کتاب اللہ یہ ایک کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، وہ اس طرح سے نہیں کرتے تھے، مختلف کاغذوں کے اُوپر لکھ کر اس کو رکھتے تھے، بقدرِ ضرورت ظاہر کرتے، جس ورق کو چھپانے کی ضرورت ہوتی اُس کو چھپالیتے، یعنی علماء اپنی اِغراض کے تحت جس کو چھپانا چاہتے آسانی سے چھپالیتے، "اُس کو تم مختلف قرطاسوں پر لکھے ہوئے ہو، اس کتاب کے تم مختلف ورقے بنائے ہوئے ہو، ظاہر کرتے ہو اُن اوراق کو، اور بہتوں کو چھپا بھی لیتے ہو" یہاں کثیر کا لفظ ہے، اکثر کا نہیں، کثیر کا معنی ہوتا ہے کہ جو تم نے چھپایا وہ فی حد ذاتہ بہت ہے، اگرچہ کل کتاب کے مقابلے میں زیادہ نہ ہو، کہ زیادہ حصّہ چھپایا ہو اور کم حصّہ ظاہر کیا ہو، یہ بات نہیں، فی حد ذاتہ وہ باتیں کافی ہیں جو تم نے چھپالیں، چاہے وہ کتاب کا چوتھا حصّہ ہو، چاہے نصف ہو، چاہے نصف سے کم ہو، اس سے بحث نہیں ہے، فی حد ذاتہ اُن میں کثرت ہے، وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمْ: اس کتاب کے ذریعے سے تم سکھائے گئے تھے ایسی چیز جو نہیں جانتے تھے تم اور نہ تمہارے آباء۔ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمْ یہ مَا لَمْ تَعْلَمُوْۤا نفی کی تاکید ہے۔ "آپ ان سے پوچھئے کہ وہ کتاب کس نے اُتاری تھی موسیٰ پر؟" تو جواب بالکل واضح ہے کہ "آپ کہہ دیں کہ اللہ نے اُتاری تھی" جب اللہ نے اُتاری تھی تو پھر اِن کے یہ شوشہ چھوڑنا کہ اللہ تعالیٰ نے

کسی انسان پر کچھ نہیں اتارا، یہ کہاں تک صحیح ہوا؟" آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے اُتاری تھی" یہ جواب دے کر ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ: پھر ان کو ان کے مشغلے کے اندر لگا رہنے دیجئے، یہ اپنے مشغلے میں کھیلتے رہیں، پھر انہیں چھوڑ دیجئے، پھر ان کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں، صحیح جواب ان کے سامنے ذکر کر دیا، ذکر کرنے کے بعد پھر وہ مانیں یا نہ مانیں، پھر اس بحث میں آپ نہ اُلجھیں۔
یہ تو موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ذکر تھا۔

قرآنِ کریم حقانیت کی دلیل

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ: یہ کتاب، اس کو بھی ہم نے اُتارا، یہ مبارک ہے، یہ جس طرح سے کہتے ہیں " آفتاب آمد دلیل آفتاب" کہ آفتاب کو آفتاب ثابت کرنے کے لئے، یا " آفتاب چڑھا ہوا ہے" اِس کو ثابت کرنے کے لئے یہ آفتاب خود ہی دلیل ہے، کسی نئی چیز کی ضرورت نہیں۔ تو یہ کتاب خود دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اُوپر کچھ اُتارتا ہے، وہ کیسے؟ کہ اِس نے بار بار آپ کو چیلنج جو کر کے دکھا دیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اگر اللہ کی کتاب نہیں تو تم اس کا مقابلہ کر کے دکھا دو، تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ کی کتاب ہے اور کسی انسان کے اُوپر یہ اُتر رہی ہے تو بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے اُوپر اُتارتا ہے هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ: یہ کتاب، ہم نے اس کو اُتارا یہ برکت دی ہوئی ہے، اور الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ کا مصداق ہے، اس کی تصدیق کرنے والی ہے، تصدیق کا مطلب یہی کہ جو اس میں پیش گوئیاں ہیں ان کا یہ مصداق ہیں، کیونکہ پیش گوئی کا مصداق مہیا نہ ہو تو پیش گوئی جھوٹی ہوتی ہے، اور پہلی کتابوں کے اندر جو ذکر آیا کہ بعد میں ایسی کتاب اُترے گی تو اس کے مطابق کتاب کا ظاہر ہو جانا یہ اُس کی تصدیق ہے، اور اُتاری اِس لئے ہے تاکہ لوگوں کے لئے برکت بھی ہو، " اور تاکہ تو اُمّ القریٰ کے رہنے والوں کو اور ان کے اردگرد رہنے والوں کو ڈرائے بھی" اگر تو مَنْ حَوْلَهَا سے عرب مراد ہے تو پھر یہ ابتدائی خطاب کے اعتبار سے ہے، کہ اہلِ مکہ کو اور اہلِ مکہ کے اِردگرد رہنے والوں کو ڈرائے، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام ہے، اور سب لوگ آپ کے مخاطب ہیں، جیسے لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (سورۂ فرقان: ۱) کے اندر اس بات کو واضح کیا ہے۔

اہلِ کتاب کے معتدل لوگ

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: یہ وہی اہلِ کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر صحیح ایمان رکھتے ہیں وہ اس قرآن پر بھی یقیناً ایمان لے آئیں گے، جن کو اپنے پچھلے انجام کی فکر ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، ہمیں کوئی نیکی کرنی چاہیے، اللہ کو راضی کرنا چاہیے، جن کا عقیدہ اس قسم کا ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے، " جو آخرت پہ ایمان لاتے ہیں وہ اس قرآن پہ بھی ایمان لائیں گے اور وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں" نمازوں کی محافظت کا مطلب ہوتا ہے نمازوں کا خیال رکھنا، دھیان رکھنا، وقت پہ پڑھنا، آداب اور شروط کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھنا، اس کو محافظۃ علی الصلوۃ کہتے ہیں، حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (سورۂ بقرہ: ۲۳۸) ایسے یہ لفظ دوسری جگہ پر قرآنِ کریم میں آئے کہ ساری نمازوں کا خیال رکھو خاص طور صلوۃِ وسطیٰ کا، وہاں

بھی 'حٰفِظُوْا'' کا صیغہ آیا ہوا ہے، تو یُحَافِظُوْنَ کا ہم اپنی زبان میں یہی مفہوم ادا کر سکتے ہیں کہ نمازوں کا خیال رکھتے ہیں، اور خیال رکھنے کے اندر سب کچھ آ گیا، وقت پر پڑھتے ہیں، قضا نہیں کرتے، اور اُس طریقے کے مطابق پڑھتے ہیں جو طریقہ ان کو بتایا گیا ہے۔

وحیٔ اِلٰہی کے مقابلے میں مشرکین سرداروں کی ڈینگیں

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: اِس کے اندر اب انکار ہے اُن رُؤسائے مشرکین پر جو اپنے ماتحتوں کو مطمئن رکھنے کے لئے اِس قسم کی ڈینگیں مارا کرتے تھے، جب اُن کی مجلس میں قرآنِ کریم کا ذکر آتا تو اپنے معتقدین کو اور اپنے ماتحتوں کو مطمئن رکھنے کے لئے وہ کہتے کہ یہ کون سی بات ہے، یہ قرآن اُترا ہے تو کیا ہو گیا، اگر ہم چاہیں تو ایسی کلام تو ہم بھی لا سکتے ہیں، جیسے دوسری جگہ ہے: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (سورۂ انفال: ۳۱) جب اِن کے اُوپر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیں، کون سی اس میں نئی بات آ گئی، لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ: اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی باتیں کر سکتے ہیں، اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ: اس میں کیا ہے؟ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، تو جیسے پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں اس میں بیان کیے جا رہے ہیں، تو ایسی باتیں ہم نہیں بیان کر سکتے؟ لیکن ہم اِن کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے جس کی وجہ سے ہم ایسی کلام بناتے ہی نہیں، یہ اپنے ماتحتوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس قسم کی باتیں وہ کیا کرتے تھے۔ یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے، کہ جب کوئی ایسی حقیقت نمایاں ہو جس کو لوگوں نے اپنی اغراض کے تحت پوشیدہ کر رکھا ہو، اور اُس حقیقت کے نمایاں ہونے کے ساتھ کسی کی بڑائی پر زد پڑتی ہو، اور اُس کی اپنی حیثیت خراب ہوتی ہو تو پھر یہ نفسیاتی قاعدہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو بچانے کے لئے لوگوں کے سامنے پھر ڈینگیں مارا کرتا ہے، اور اس طرح سے وہ نمائشی قسم کی شاہ زوری دکھاتا ہے، کہ میں بھی ایسا کر سکتا ہوں، میں یوں کر دوں گا، میں یہ کر دوں گا، اس قسم کی باتیں کر کے اپنے معتقدین کے ذہن کو وہ محفوظ رکھنا چاہتا ہے کہ یہ دوسری طرف متوجہ نہ ہوں، لیکن ایسی نمائشی شاہ زوری کتنی دیر تک چلتی ہے، جب قرآنِ کریم نے بار بار چیلنج دیا، بار بار چیلنج دیا، پھر وہ آگے سے کوئی جواب نہ لا سکے، تو منصف مزاج کہتا ہے کہ یہ محض اِن کی ڈینگیں ہی ڈینگیں ہیں، باقی! اِس میں حقیقت کچھ نہیں۔ تو ایسے تھے مشرکوں کے سردار جو کہتے تھے کہ ایسی وحی تو ہم پر بھی آتی ہے جیسے یہ کہتا ہے کہ وحی آتی ہے، اور اس قسم کی باتیں تو ہم بھی کر سکتے ہیں جیسے یہ کر رہا ہے، یہ کیا قصے کہانیاں ہیں، ہم بھی تو سنا سکتے ہیں، اس قسم کی باتیں وہ کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اُن کے اُوپر انکار کیا ہے کہ ''کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑنے'' اور اللہ پر جھوٹ گھڑنا اُس کے متعلق شریک کا قول کرنا بھی ہے، اللہ پر جھوٹ گھڑنا یہ بھی ہے کہ وہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شرک کرنے کی اجازت دی، یا وہ اللہ پر جھوٹ یہ گھڑے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر بھی ایسی باتیں اُتارتا ہے جس طرح سے تم پر اُتاری جا رہی ہیں، یہ جتنے بھی بُرے عقیدے اللہ تعالیٰ کی تعلیم کی طرف منسوب کر دیے جاتے ہیں اور اللہ کی تعلیم نہیں ہے، وہ سب اِفترا علی اللہ ہے، ''یا وہ کہتا ہے کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے حالانکہ اُس کی طرف کوئی وحی نہیں کی جاتی، یا وہ کہتا ہے کہ میں بھی عنقریب اُتاروں گا مثل اِس کے جو اللہ نے اُتاری'' یہ اپنے معتقدین کے ذہن کو مطمئن رکھنے کے لئے اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، یہ سب بڑے ظالم ہیں، اور ان ظالموں کا انجام خراب ہوگا۔

موت اور حشر کے وقت کُفار کی نمائشی عزّت رفتہ ہو جائے گی

''اگر دیکھے تو اے مخاطب! تو عجیب حال دیکھے گا'' جزاء محذوف نکال لی جائے گی لو تریٰ لَرَاَیْتَ امرًا عجیبًا، اگر تو دیکھے تو وہ حال دیکھنے کے قابل ہے، یا عجیب حال دیکھے گا، ''جس وقت کہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے، اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں گے'' اس طرح سے جیسے کسی سے کوئی چیز چھیننے کے لئے اور نکالنے کے لئے ہاتھ پھیلایا جاتا ہے، ''اور کہتے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں'' یہ تعبیر ہے، جس طرح سے کوئی کسی کو پیٹا کرتا ہے، اور پھر زبان سے بھی اس قسم کی دھمکیاں دیتا ہے اور باتیں کیا کرتا ہے، یہ بات ویسے ہی ہے، ''نکالو اپنی جانیں، آج تم جزا دیئے جاؤ گے بدلہ دیئے جاؤ گے ذِلّت کا عذاب'' دُنیا کے اندر جو تم نے نمائشی عزّت اپنے لیے بنا رکھی تھی اب وہ عزّت کا مقام چلا گیا، اب تم ذِلّت کا عذاب دیئے جاؤ گے، ''بسبب اِس کے کہ اللہ کے اُوپر تم ناحق باتیں بولتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلے میں تم اکڑتے تھے'' عن صلہ آگیا، تو اِس کا معنی ہے اعراض، ''اللہ کی آیات سے اعراض کرتے ہوئے تم بڑے بنتے تھے، تکبّر کرتے تھے'' بڑائی تم نے اپنے لئے اختیار کر رکھی تھی، تو اُس کے مقابلے میں آج تمہیں اللہ تعالیٰ ذِلّت کا عذاب دے گا۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی: دُنیا میں تمہیں اپنے گروہوں پر اپنی جماعتوں پر اپنے جتھوں پر بڑا ناز تھا، اور آج ہمارے پاس سب اِنفرادًا اِنفرادًا آتے ہو، وہ جماعتی حیثیت تمہاری باقی نہیں رہی، جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہارے جتھے، تمہاری جماعتیں، تمہاری گروہ بندیاں سب ختم ہو گئیں، یہاں جو آرہے ہو تو سارے انفرادی حیثیت میں آرہے ہو، ''آگئے ہو ہمارے پاس اکیلے اکیلے، جیسے کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا'' ویسے ہی آگئے ہو ننگ دھڑنگ، ٹوپی جوتے سے خالی، حُفاۃً عُراۃً غُرْلًا جس طرح سے پہلے ترجمے میں مفہوم ادا کیا، بچہ جس طرح سے پیدا ہوتا ہے، قبروں سے نکل کر ایسے ہی سارے کے سارے حشر کی طرف چلے جائیں گے، ''جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا'' وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ: اور چھوڑ آئے تم وہ چیزیں جو ہم نے تمہیں دی تھی، جس مال دولت کے اوپر تمہیں ناز تھا وہ بھی تم چھوڑ آئے، کہاں چھوڑ آئے؟ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ: اپنے پیچھے یعنی دُنیا میں۔ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمْ: اور ہمیں تمہارے وہ سہارے بھی نظر نہیں آتے جو تم نے اختیار کر رکھے تھے، وہ سفارشی تمہارے نظر نہیں آرہے جن کو تم سمجھا کرتے تھے کہ وہ تمہارے بارے میں شریک ہیں اللہ کے، فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا: یعنی تمہارے بارے میں اللہ کے شریک ہیں، تمہاری عبادت میں شریک ہیں، تمہارے مال میں شریک ہیں، جس طرح سے تم عبادت بھی اُن کی ایسی کرتے تھے جیسے اللہ کی کی جاتی ہے، نذر و نیاز بھی تم اُن کی ایسے دیتے تھے جیسے اللہ کی دی جاتی ہے، جن کو تم یہ سمجھا کرتے تھے کہ تمہارے بارے میں اللہ کے شریک ہیں وہ بھی کہیں نظر نہیں آرہے، ''کہیں نظر نہیں آرہے'' یعنی تمہارے سامنے نہیں، اِس وقت شفعاء کی حیثیت سے موجود نہیں ہیں، ''نہیں دیکھتے ہم'' یعنی تمہارے ساتھ ان کی وہ شفعاء والی حیثیت ہم نہیں دیکھتے، کیونکہ جب اُن کی حیثیت شفعاء والی ہے ہی نہیں، تو دیکھا کیسے جائے، لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ: دُنیا کے اندر رہتے ہوئے تم نے آپس میں جو یاریاں لگا رکھی تھیں، آپس میں تعلق قائم کر رکھا تھا وہ سب ٹوٹ گیا، جس طرح سے دوسری جگہ

آیا ہوا ہے تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (سورۂ بقرہ:۱۶۶)۔ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ: اور جس قسم کے خیال تم پکاتے تھے، جو چیزیں تم سمجھتے تھے وہ سب تم سے گم ہوگئیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ

بے شک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانے کو اور گٹھلی کو، نکالتا ہے وہ زندہ کو میت سے اور نکالنے والا ہے میت کو

مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ

زندہ سے، یہی ہے اللہ، پھر تم کدھر پھرے جارہے ہو؟﴿۹۵﴾ پھاڑ نکالنے والا ہے صبح کو، اور بنایا اُس نے رات کو

سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ

سکون کی چیز، اور بنایا اُس نے سورج کو اور چاند کو حساب کے لئے، یہ اندازہ کرنا ہے زبردست کا علم والے کا﴿۹۶﴾ اور اللہ وہ ہے جس

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ

نے تمہارے نفع کے لئے ستاروں کو بنایا تاکہ تم راہنمائی حاصل کرو ان ستاروں کے ساتھ خشکی کی تاریکیوں میں اور سمندر کی تاریکیوں میں،

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ

تحقیق کھول کھول کر بیان کیا ہم نے آیات کو علم والے لوگوں کے لئے﴿۹۷﴾ اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں

نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا

نفس واحدہ سے پھر تمہارے لئے قرار پکڑنے کی جگہ ہے اور ودیعت رکھے جانے کی جگہ ہے، تحقیق کھول کھول کر بیان کیا ہم نے

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ

آیات کو سمجھ دار لوگوں کے لئے﴿۹۸﴾ اور اللہ وہ ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر نکالا ہم نے اُس پانی کے ذریعے سے

نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ

ہر شئ کی انگوری کو، پھر اس انگوری سے ہم نے نکالی سبز شاخ، پھر اس سبز شاخ سے ہم نکالتے ہیں تہ بہ تہ غلہ،

وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ
اور کھجوروں کے درخت سے یعنی اُن کے گابھے سے قریب ہونے والے خوشے نکلتے ہیں، اور (نکالا ہم نے) انگوروں کے باغات کو

وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ
اور زیتون کو اور انار کو، ان میں سے ہر ایک ملتا جلتا ہے اور ملتا جلتا نہیں ہے، دیکھو تم اُس کے پھل کی طرف

اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۹۹ وَجَعَلُوْا
جب یہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کی طرف، بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں ۹۹ اور ان لوگوں نے

لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ
اللہ کے لئے شرکاء بنالیے جن، حالانکہ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے، اور تراشے انہوں نے اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بغیر کسی علمی تحقیق کے،

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى
اللہ پاک ہے اور بلند ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں ۱۰۰ اللہ تعالیٰ ابتداءً بغیر نمونے کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کو،

يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ
کیونکر ہوگی اُس کے لئے اولاد، اُس کی تو بیوی ہی نہیں، اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا، اور وہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ
ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے ۱۰۱ یہی اللہ تمہارا رَبّ ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے

شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲ لَا تُدْرِكُهُ
پس تم اسی کی عبادت کرو، اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے ۱۰۲ آنکھیں اُس کا ادراک نہیں

الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۰۳ قَدْ
کرسکتیں .اور وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے اور وہ باریک بین ہے اور خبر رکھنے والا ہے ۱۰۳

جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ
آگئیں تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے بصیرت کی چیزیں، جو بصیرت حاصل کرلے گا تو اُس نے بصیرت اپنے نفع کے لئے حاصل کی، اور جو اندھا رہ گیا

فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۱۰۴ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ

تو اُس کے اندھے پن کا وبال اُسی پر پڑے گا، میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں ۝۱۰۴ اور اسی طرح ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات کو

وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۰۵ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ

اور تاکہ لوگ یہ کہیں کہ تُونے کہیں سے پڑھ لیا ہے اور تاکہ ہم واضح کریں اس کو علم والے لوگوں کے لئے ۝۱۰۵ آپ اس طریقے پر چلیں

اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۶

جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے وحی کر دیا گیا، اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور مشرکین سے منہ موڑ لے ۝۱۰۶

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ

اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے، اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان، اور نہیں ہیں آپ

عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۷ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ

اُن پر متعین کئے ہوئے داروغہ ۝۱۰۷ نہ گالی دیا کرو اُن کو جن کو پکارتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ

اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠

پس یہ گالی دینے لگ جائیں گے اللہ کو حد سے تجاوز کرتے ہوئے بغیر علم کے، اسی طرح سے ہم نے مزین کر دیا ہے ہر جماعت کے لئے اُن کے عمل کو،

ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۸

پھر اُن کے رَبّ کی طرف سے اُن کا لوٹنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ خبر دے گا انہیں ان کاموں کی جو یہ کرتے تھے ۝۱۰۸

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ

اور یہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی اپنی قسموں کو پختہ کرتے ہوئے، کہ اگر ان کے پاس نشانی آ جائے تو البتہ ضرور ایمان لے آئیں گے

بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ

یہ اس نشانی پر، آپ کہہ دیجئے سوائے اس کے نہیں کہ نشانیاں اللہ کے پاس ہیں، اور کون سی چیز تمہیں اطلاع دیتی ہے کہ یہ نشانی جب آ جائے گی

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۹ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ

تو یہ ایمان نہیں لائیں گے ۝۱۰۹ اور ہم پلٹا دے دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو، جس طرح سے

يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾
یہ ایمان نہیں لائے اس قرآن پر پہلی مرتبہ، اور ہم انہیں چھوڑ دیں گے ان کی سرکشی کے اندر، اس حال میں کہ یہ بھٹکتے ہوں گے ﴿۱۱۰﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى: حَبّ: دانہ، جو غلہ جات کا ہوا کرتا ہے، اور نویٰ یہ نواۃ کی جمع ہے، نواۃ گٹھلی کو کہتے ہیں، جیسے آم کی گٹھلی ہوگئی، کھجور کی گٹھلی ہوگئی، اور حبّ یہ دانہ ہوگیا، اس کا واحد حبّۃ آئے گا، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ آیا ہوا ہے مِائَةُ حَبَّةٍ (سورۂ بقرہ:۲۶۱)۔ فَالِقُ فلق سے ہے، پھاڑنا۔ ''بیشک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانے کو اور گٹھلی کو'' یعنی زمین میں اس کے دب جانے کے بعد اس کو پھاڑ کے اس میں سے پودا نکالنا اور تنا نکالنا یہ اسی کا کام ہے، یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ: نکالتا ہے وہ زندہ کو میت سے، وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ: اور نکالنے والا ہے میت کو حی سے۔ میت: بے جان۔ حی: حیات والا۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ: یہی ہے اللہ، فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ: پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ: اِصباح باب افعال کا مصدر ہے، لیکن یہاں اس میں اسم والا معنی ہے مصدر والا نہیں، صبح کا نور اور صبح کی روشنی اِصباح کا مصداق ہے، فَالِقُ الْاِصْبَاحِ: پھاڑ نکالنے والا ہے صبح کو، یعنی رات کے اندھیرے کو چیر کے اس میں سے صبح کی روشنی کو نکالنے والا ہے، وَجَعَلَ الَّیْلَ سَكَنًا: اور بنایا اس نے رات کو سکون کی چیز، سکن اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کے حاصل ہو جانے سے انسان کو سکون حاصل ہو، جیسے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا (سورۂ نحل:۸۰) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تمہارے گھر باعثِ سکون بنائے۔ ''رات کو تمہارے لیے آرام کی چیز بنایا، سکون کی چیز بنایا'' جس کے ذریعے سے تمہیں سکون حاصل ہوتا ہے، وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا: حُسبان مصدر ہے حساب کے معنی میں۔ ''اور بنایا اس اللہ نے سورج کو اور چاند کو حساب کے لیے، یا حساب کے ساتھ'' دونوں طرح سے مفہوم ادا کر سکتے ہیں، حساب کے لیے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے سورج اور چاند بنا دیے تاکہ اس کے ذریعے سے تمہارا حساب قائم ہو، جیسے دوسری جگہ ہے لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (سورۂ یونس:۵) تاکہ تم ان کے ذریعے سے سالوں کی گنتی اور دوسرا چھوٹا موٹا حساب معلوم کرتے رہو۔ اور حساب کے ساتھ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی چال کو اور ان کے طلوع غروب کو حساب سے مقدر کیا، جس کی وجہ سے مناسب طریقے کے ساتھ فصلوں کا ظہور ہوتا ہے، کبھی سردی کا کبھی گرمی کا، جس طرح سے دن رات کا ظہور ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اِن کا یہ حساب رکھا ہے، حساب کے ساتھ اِن کو بنایا ہے، حساب کے ساتھ چلایا ہے، جس طرح سے دوسری جگہ قرآنِ کریم میں آیا ہے قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ (سورۂ یونس:۵) کہ چاند کو اللہ نے بنایا اور اس کے لئے یہ منزلیں مقدر کیں۔ ''بنایا اس نے سورج اور چاند کو حساب کے لئے، یا حساب کے ساتھ'' ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ: یہ اندازہ کرنا ہے زبردست کا علم والے کا، یعنی ایسے نے اندازہ کر کے ان کو بنایا ہے جس کو قدرت بھی زبردست حاصل ہے اور علم بھی حاصل ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ: اور اللہ وہ ہے جس نے تمہارے نفع کے لئے ستاروں کو بنایا۔ نجوم نجم کی جمع ہے۔ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: تاکہ تم راہنمائی حاصل کرو ان ستاروں کے ساتھ خشکی کی تاریکیوں میں اور سمندر کی تاریکیوں میں، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ: تحقیق کھول کھول

کر بیان کیا ہم نے آیات کو علم والے لوگوں کے لئے، جاننے والوں کے لئے۔ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اور اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں نفسِ واحدہ سے، ایک جان سے، جس کا مصداق حضرت آدمؑ ہیں، فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ: مستقر: قرار پکڑنے کی جگہ۔ اور مستودَع: ودیعت رکھے جانے کی جگہ۔ ''پھر تمہارے لیے مستقر ہے اور مستودَع ہے'' یعنی ایسی جگہ جس میں تم چند روز ودیعت رکھے جاتے ہو، اور ایسی جگہ جہاں تم قرار پکڑتے ہو، اس کا مصداق یوں بھی ہوسکتا ہے کہ مستودَع باپ کی پشت ہے اور مستقر ماں کا رحم ہے، یا مستودَع دُنیوی زندگی ہے اور مستقر آخرت ہے، یا مستودَع برزخ کی زندگی ہے اور مستقر کا مصداق آخرت، یا آخرت کے مقابلے میں دُنیا مستودَع ہے، کیونکہ یہاں بھی انسان کا رہنا عارضی ہے، تھوڑے وقت کے لیے ہے، اور آخرت میں جو جنت اور دوزخ ٹھکانہ ملے گا وہ مستقر ہے، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ: تحقیق کھول کھول کر بیان کیا ہم نے آیات کو سمجھ دار لوگوں کے لئے۔ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اللہ وہ ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا، فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ: پھر نکالا ہم نے اس پانی کے ذریعے سے (یہ غائب سے انتقال ہو گیا متکلم کی طرف) پھر ہم نے نکالا اس پانی کے ذریعے سے ہر شی کی نباتات کو، ہر شی کی انگوری کو، فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا: پھر اس انگوری سے یعنی ابتداءً جو سوئی نکلتی ہے وہ نبات کا مصداق ہے۔ ''پھر اس نبات سے، اس ابتدائی انگوری سے، ابتدائی سوئی سے ہم نے نکالی سبز شاخ'' خَضِرًا یہ سبز شاخ کے معنی میں ہو گیا۔ مِنْهُ کی ضمیر نبات کی طرف چلی گئی۔ ''ہر چیز کی ابتدائی نبات سے، ابتدائی سوئی سے پھر ہم نے سبز شاخ نکالی''، نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا: پھر اس سبز شاخ سے ہم نکالتے ہیں تہہ بہ تہہ غلہ، دانے جو کہ ایک دوسرے کے اُوپر تہہ کر کے رکھے ہوئے ہوں، مُّتَرَاكِبًا کا یہ معنی ہے، جس طرح سے سٹے آپ نے دیکھے ہوں گے کس طرح سے اس میں دانے چنے ہوئے ہوتے ہیں، وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ: اور کھجوروں کے درخت سے یعنی ان کے گابھوں سے۔ طلع کہتے ہیں جو پہلے پہلے گابھا نکلتا ہے اس طرح سے لفافے کی شکل میں، اور اس کے اندر خوشہ ہوتا ہے۔ ''کھجوروں کے درخت سے یعنی ان کے گابھے سے'' قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ: قِنوانٌ جمع ہے قِنوٌ کی، قنو کہتے ہیں خوشے کو، تو اس کی جمع قِنوانٌ آئے گی، تثنیہ قِنوانِ آئے گا، یعنی نون کی حرکت سے فرق پڑے گا، نون کے اُوپر تنوین آجائے تو یہ جمع ہے قِنوٌ کی، اور تثنیہ ہو تو جس طرح سے نون تثنیہ مکسور ہوا کرتا ہے قِنوانِ پڑھیں گے، ایسے ہی ہے صِنوٌ، اس کی جمع صِنوانٌ آئے گی، اور تثنیہ صِنوانِ آئے گا، جس کا ذکر سورۂ رعد میں آپ کے سامنے آئے گا۔ دَانِیَةٌ: دَنَا یَدْنُوْ: قریب ہونا۔ قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ: قریب ہونے والے خوشے، جس سے مراد ہے جھکنے والے خوشے، جو پھل کے وزن کے ساتھ اُوپر سے نیچے کو جھک کر قریب آجاتے ہیں، وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ: اور نکالا ہم نے اسی پانی کے ذریعے سے باغات کو، باغات انگور کے، اَعناب عِنَب کی جمع، وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ: یہ چونکہ منصوب آگئے اس لئے یہ براہِ راست اَخْرَجْنَا کا مفعول ہیں۔ اور ہم نے نکالا اس پانی کے ذریعے سے زیتون کو اور رُمان کو، رُمان اَنار کو کہتے ہیں، زیتون بھی ایک پھل کا نام ہے۔ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ: ان میں سے ہر ایک ملتا جلتا ہے اور ملتا جلتا نہیں ہے، یعنی بعض زیتون، زیتون کے مشابہ ہیں، بعض انار، انار کے مشابہ ہیں، اور بعضوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، انار کا ایک دانہ آپ لیں گے وہ خالص سُرخ رنگ کا ہوگا، دوسرا لیں گے وہ دُوسرے رنگ کا ہوگا، ان کی آپس میں کوئی مشابہت ہی نہیں نظر آئے گی، ذائقے کے اعتبار سے رنگ کے اِعتبار سے چھوٹے بڑے ہونے کے اعتبار سے، اور بعض ایسے ہوں گے کہ اِس درخت کا

پھل اور اُس کا پھل دونوں ایک ہی جیسے ہیں، رنگ رُوپ کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں، ذائقے کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں، حجم کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں، تو ایک ہی نوع کا پھل، اس کے بعض افراد بعضوں کے ساتھ ملتے ہیں، بعض افراد بعض کے ساتھ نہیں ملتے، تو مُشْتَبِهًا: ملتے جلتے، غَيْرَ مُتَشَابِهٍ: جو ملتے جلتے نہیں ہیں۔ غَيْرَ نے نفی کا معنی پیدا کر دیا۔ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ: دیکھو تم اس کے پھل کی طرف، اِذَآ اَثْمَرَ: جب یہ درخت پھلتا ہے، جب ان میں سے ہر ایک کا درخت پھلتا ہے تو اس کے پھل کی طرف دیکھو، وَيَنْعِهٖ: اور اس کے پکنے کی طرف دیکھو، يَنْع پکنے کو کہتے ہیں، یعنی جب درخت پھلتا ہے تو اس وقت دیکھا کرو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے، پھل کی شکل دیکھو اور ذائقہ دیکھو، کسیلا، بدمزہ، اور شکل بھی ابتداء، ابتدا میں بھدی سی اور چھوٹی سی، آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے پھر پکتا ہے، تو پکنے کے بعد کیسے کیسے رنگ لاتا ہے، کیسے کیسے اس میں مزے پیدا ہوتے ہیں، ابتدا منزل سے لے کر آخر تک تم دیکھو، تمہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کس طرح سے نظر آتی ہے، کہ ایک بے مزہ چیز میں کیسے مٹھاس پیدا کر دی، ایک بے رنگ چیز میں کس قسم کے رنگ پیدا کر دیئے، یہ ابتدا سے لے کر آخر تک تم مطالعہ کرو۔ ''دیکھو اس کے پھل کی طرف جب یہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کی طرف'' اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: بیشک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: اور بنایا ان لوگوں نے اللہ کے لئے شرکاء کو، اللہ کے لئے شرکاء ٹھہرا دیئے۔ شرکاء شریک کی جمع۔ ان شرکاء کا بیان ہے الْجِنَّ، ان لوگوں نے اللہ کے لئے شرکاء بنالیے جن، یعنی جنوں کو شرکاء بنا دیا، وَخَلَقَهُمْ: حالانکہ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے، حالانکہ ان جنوں کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ: خرق: تراش لیے۔ اور تراشے انہوں نے اللہ کے لئے بیٹے وَبَنٰتٍ: اور بیٹیاں، بِغَيْرِ عِلْمٍ: بغیر کسی علمی تحقیق کے، سُبْحٰنَهٗ: اللہ پاک ہے اولاد سے، وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ: اور بلند ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ تعالیٰ ایجاد کرنے والا ہے سماوات اور ارض کو۔ بدع کا معنی ہوتا ہے کسی نمونے کے بغیر بنا دینا، جس کا پہلے کوئی نمونہ موجود نہ ہو، ''بدعت'' کا لفظ جو آپ استعمال کیا کرتے ہیں تو ''بدعت'' کا بھی یہی معنی ہوتا ہے کہ نیا کام ایجاد کر لیا جس کی مثال پہلے خیر القرون میں موجود نہیں، سرورِ کائنات ﷺ کے دور میں، صحابہ کے دور میں اس کی مثال موجود نہیں ہے، ایسے کام کو ایجاد کر لیا تو اس کو ''بدعت'' کہتے ہیں، ابتداع کا معنی نئی چیز گھڑ لینا۔ تو ''بدیع'' اسی طرح سے ہے کہ زمین و آسمان اللہ نے بنائے ہیں تو یہ نہیں کہ ان کا پہلے نمونہ موجود تھا، بلکہ ابتداءً اللہ نے بنائے ہیں، اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ: کیونکر ہو گی اس کے لئے اولاد۔ وَلد اولاد کے معنی میں ہے۔ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ: اس کی تو بیوی ہے نہیں، نہیں ہے اس کے لئے بیوی، وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ: اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اور وہ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ: یہی اللہ تمہارا رب ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی، خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ: وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، فَاعْبُدُوْهُ: پس تم اسی کی عبادت کرو، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ: اور وہ ہر چیز کے اُوپر وکیل ہے، ذمہ دار ہے، کارساز ہے۔ وکیل اصل کے اعتبار سے کہتے ہیں مَوْكُوْلٌ اِلَيْهِ الْاَمْرُ، وہ شخص جس کے سپرد اپنا معاملہ کر دیا جائے، تو ہر چیز پر وکیل وہی ہے، کارساز وہی ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ: آنکھیں اس کا اِدراک نہیں کر سکتیں، اِدراک سے احاطہ مراد ہے، آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ: اور وہ آنکھوں کا اِدراک کرتا ہے، آنکھوں کا احاطہ کرتا ہے، وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ: لطیف لُطف سے بھی ہوتا ہے، لطافت سے بھی ہوتا ہے، لطف سے ہو تو مہربانی کرنے والا، لطافت

سے ہوتو اس کا مطلب ہے کہ کثیف نہیں ہے، لطیف ہے، اس میں لطافت ہے۔'' اور وہ لطیف ہے اور خبر رکھنے والا ہے، باریک بین ہے اور خبر رکھنے والا ہے، یا مہربان ہے اور خبر رکھنے والا ہے۔'' قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ: بصائر بصیرۃ کی جمع، بصیرۃ اصل کے اعتبار سے دِل کی روشنی کو کہتے ہیں، جیسے ''بصارت'' آنکھوں کی روشنی کو کہتے ہیں، اسی طرح سے ''بصیرت'' دِل کی روشنی کو کہتے ہیں، اور یہاں سے مراد ایسے دلائل ہیں جو کہ دِل کی روشنی کا باعث بن جائیں،'' آ گئیں تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے بصیرت کی چیزیں'' جن سے تم بصیرت حاصل کر سکتے ہو،'' بصیرت کے اسباب، روشنی پیدا کرنے والی چیزیں تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی طرف سے آ گئیں'' فَمَنْ اَبْصَرَ: جو کوئی مبصر ہو جائے گا، جو کوئی دیکھنے والا بن جائے گا، جو بصیرت حاصل کرے گا، فَلِنَفْسِهٖ: وہ اپنے نفع کے لئے ہے، اس نے بصیرت اپنے نفع کے لئے حاصل کی، وَمَنْ عَمِيَ: اور جو اندھا رہ گیا اور ان آیات سے اس نے کوئی روشنی حاصل نہ کی فَعَلَيْهَا: تو اس کے اندھے پن کا وَبال اسی پر پڑے گا۔'' علیٰ '' ضرر کے لئے ہے اور لام نفع کے لئے ہے۔ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ: میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ: اور اسی طرح سے ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات کو وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ: اس کا معطوف علیہ محذوف نکال لیجئے، ہم اسی طرح سے پھیر پھیر کر آیات بیان کرتے ہیں تاکہ آپ تبلیغ کریں اور تبلیغ کا اَجر پائیں، اور تاکہ یہ لوگ کہیں کہ دَرَسْتَ: تُو نے کہیں سے پڑھ لیا ہے وَلِنُبَيِّنَهٗ: اور تاکہ ہم واضح کریں اس کو لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: علم والے لوگوں کے لئے۔ لِنُبَيِّنَهٗ کی ''ہٗ'' ضمیر آیات کی طرف لوٹ جائے گی بتاویل قرآن، یا المذکور کی تاویل سے۔ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: آپ کے رَبّ کی طرف سے جو چیز آپ کی طرف وحی کی جارہی ہے آپ اس کی اتباع کریں، اس طریقے پر ہی چلیں جو آپ کی طرف آپ کے رَبّ کی طرف سے وحی کردیا گیا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ: اور مشرکین سے منہ موڑ لیں، اِعراض کرلیں۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا: اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ اِن کا عدمِ اشراک چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے، وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا: اور ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان، وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ: اور نہیں ہیں آپ ان پر کوئی متعین کیے ہوئے داروغہ۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: سَبَّ يَسُبُّ: گالی دینا۔ ''سب وشتم'' اُردو کے اندر بھی یہ لفظ آیا کرتا ہے، گالی کا مفہوم ہوتا ہے بُرا بھلا کہنا۔ '' نہ گالی دیا کرو ان کو جن کو پکارتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ'' یعنی ان کے معبودانِ باطلہ کو گالی گلوچ نہ کیا کرو،'' نہ گالی دیا کرو ان کو جن کو پکارتے ہیں یہ اللہ کے علاوہ'' فَيَسُبُّوا اللّٰهَ: پس یہ گالی دینے لگ جائیں گے اللہ کو، عَدْوًا: حد سے تجاوز کرتے ہوئے، بِغَيْرِ عِلْمٍ: جہالت کے ساتھ۔ علم کے بغیر جہالت کی وجہ سے سرکشی کرتے ہوئے حد سے تجاوز کرتے ہوئے یہ اللہ کو گالی دینے لگ جائیں گے۔ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ: اسی طرح سے ہم نے مزین کردیا ہے ہر جماعت کے لئے ان کے عمل کو، ہر جماعت کو اپنا عمل، اپنا طرز وطریق، اپنا شعار، اپنے نظریات پسند ہیں،'' ہم نے مزین کردیا ہے ہر جماعت کے لئے ان کے عمل کو'' ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ: پھر ان کے رَبّ کی طرف ان کا لوٹنا ہے، فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: پھر اللہ تعالیٰ خبر دے گا انہیں اُن کاموں کی جو یہ کرتے تھے۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ: اور یہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی، جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ: اپنی قسموں کو پختہ کرتے ہوئے، یہ مفہوم ہے، ویسے اس کا معنی ہوا کرتا ہے مُجْتَهِدِيْنَ فِي تو كيد أيمانهم، جَهْدَ مصدر ہے اور اَقْسَمُوْا کی ضمیر سے اس کو حال واقع کریں گے، مُجْتَهِدِيْنَ فِي

تو کیدِ ایمانِھِم، ''ان لوگوں نے قسمیں کھائیں، یہ قسمیں کھاتے ہیں اس حال میں کہ اپنی قسموں کو پختہ کرنے میں پوری کوشش کرنے والے ہیں، زور لگا کر قسموں کو پختہ کر رہے ہیں، اس حال میں کہ کوشش کرنے والے ہیں اپنی قسموں کے پکا کرنے میں'' لَئِنْ جَآءَتْھُمْ اٰیَۃٌ: قسم کھا کر یوں کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس نشانی آجائے لَیُؤْمِنُنَّ بِھَا: تو البتہ ضرور ایمان لے آئیں گے یہ اس نشانی پر، قُلْ: آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ: سوائے اس کے نہیں کہ نشانیاں اللہ کے پاس ہیں، اللہ کے قبضے میں ہیں، وَمَا یُشْعِرُکُمْ: اے اہلِ ایمان! کون سی چیز تمہیں اطلاع دیتی ہے اَنَّھَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ: کہ یہ نشانی جب آجائے گی تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، تمہیں کیا پتا کہ جب یہ نشانی آجائے گی تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، ایسے ہی کہہ رہے ہیں، جس وقت وہ نشانی ظاہر ہو جائے گی تو مانیں گے نہیں، وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ: اور ہم ان کے دلوں کو پلٹا دے دیں گے، وَاَبْصَارَھُمْ: اور ان کی آنکھوں کو پلٹا دے دیں گے، کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ: جس طرح سے یہ ایمان نہیں لائے اِس قرآن کے ساتھ پہلی مرتبہ، جب قرآن ان کے سامنے پیش کیا گیا تو جس طرح یہ اُس وقت کُفر کر بیٹھے اور اِیمان نہیں لائے تو آئندہ بھی ان کی آنکھ اور دِل ایسے ہی بدل جائیں گے، ورنہ قرآنِ کریم کا آنا اتنا واضح معجزہ ہے اور اتنی واضح نشانی ہے کہ جس کے بعد کسی اور نشانی کی ضرورت ہی نہیں، وَنَذَرُھُمْ: اور ہم انہیں چھوڑ دیں گے ان کی سرکشی کے اندر بھٹکتے ہوئے، یَعْمَھُوْنَ: اس حال میں کہ یہ بھٹکتے ہوں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ. اَسْتَغْفِرُ اللّٰه

تفسیر

مذکورہ دو رُکوع میں بیان کردہ مضامین

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی توحید کے اثبات کے لئے، توحید کو ثابت کرنے کے لئے اپنی آیاتِ قدرت کو واضح فرماتے ہیں، تو یہ آیات جو پیش کی جارہی ہیں اِن میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت، اُس کی قدرت، اُس کا علم، اُس کا محسن ہونا یہ بہت زیادہ نمایاں ہے، اور اِن چیزوں کے اندر غور کرنے کے بعد پھر انسان کی عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ جو قادر ہے، جو علیم ہے، جو محسن ہے، جو خالق ہے، اور جس کا اِن کاموں کے اندر کوئی شریک نہیں، تو عبادت کے اندر بھی کسی کو شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے، کارساز بھی صرف اُس کو سمجھنا چاہیے۔ تو یہ تصرفات جو اللہ تبارک وتعالیٰ ذکر فرمائیں گے اپنے خلق کے اعتبار سے جس کے ساتھ علم کی صفت لازم ہے، کہ جب تک علم نہ ہو اُس وقت تک کس طرح سے تصرف کیا جاسکتا ہے، تو علم وقدرت کے ثابت ہو جانے کے ساتھ معاد کا مسئلہ خود بخود ثابت ہوتا چلا جائے گا، کیونکہ آخرت میں جی اٹھنے پر اُن کا جو اشکال تھا وہ یہی تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کون کرے گا؟ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو دوبارہ اِن میں جان کون ڈالے گا؟ تو جب اللہ تعالیٰ کی قدرت ان سب کاموں کے اُوپر ثابت ہو جائے گی، تو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا یہ بھی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے، تو ان آیات کے اندر اثباتِ توحید بھی ہے، ردِ شرک بھی ہے، اور اثباتِ معاد بھی ہے، بات واضح سی ہے اس میں کوئی اِشکال نہیں، جلدی جلدی دیکھتے چلیے!

قدرتِ باری کے ارضی دلائل

پہلے ذکر کیا اللہ تعالیٰ نے اُن آیات کو جو کہ زمین کی طرف سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى: یہ نظارہ ہر روز نظر آتا ہے، آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، کہ دانہ بویا جاتا ہے، کاشت کار کا کام صرف اتنا ہے کہ زمین کو سازگار کر کے، ہل جوت کے، نرم کر کے اُس کے اندر غلے کو بکھیر دے، یا کسی چیز کی گٹھلی کو دبا دے، اس کے بعد اس کا کوئی کام نہیں ہے، اب اُس دانے کو پھاڑنا چیرنا اور اُس میں سے نباتات کا نکالنا، یا اُس گٹھلی میں سے سوئی کا نکالنا یہ محض اللہ کا کام ہے، جس میں انسان کی قدرت کا کوئی دخل نہیں، جیسے کہ سورۂ واقعہ میں آئے گا اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۞ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ: حرث کی نسبت تو انسان کی طرف کی ہے (یحرث: بیج ڈالنا) کہ تم بتلاؤ جو تم بیج ڈالتے ہو، اُس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟ اُگانا کام اللہ کا ہے، ظاہری طور پر اگر آپ نے کیا ہے تو یہی کیا ہے کہ مٹی میں بیج کو دبا دیا، اب اس کے بعد انسان کا کوئی زور نہیں چلتا،"بے شک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانے کو اور گٹھلی کو۔"

زِندہ سے مُردہ اور مُردہ سے زِندہ کو نکالنے کے متعدّد مفہوم

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ: یہ تصرف بھی روز آپ کے سامنے ہے، کہ"بے جان چیز سے جاندار چیز کو نکالتا رہتا ہے" بے جان حقیقی جیسے انڈا ہے، اس میں کوئی حیات نہیں، بے جان ہے، اور اس میں سے جاندار کو نکال دیا کہ اسی انڈے میں سے بولتا ہوا چہچہاتا ہوا بچہ نکل آتا ہے، تو بے جان میں جان ڈالنا آپ کے سامنے آ گیا، کہ بے جان میں اللہ تعالیٰ کس طرح سے جان ڈال کر اس کو زندہ کر دیتا ہے۔ اور بے جان میں سے زندہ کو نکالنا، اِس کی قریبی مثال یہی نباتات بھی بن جاتی ہے، کہ ایک خشک دانہ ہے، خشک گٹھلی ہے، اور خشکی کو بے جان کے ساتھ ہی تعبیر کیا جاتا ہے، ارضِ میتہ آپ کے سامنے کئی دفعہ آیا، مردہ زمین، بنجر زمین، وہی زمین جو خشک پڑی ہوئی ہے، اور اُس کے اندر نباتات کا اُگ آنا یہ ایک قسم کی حیات ہے، يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یہ کتنی بار قرآنِ کریم کے اندر ذکر کیا گیا، کہ اللہ تعالیٰ زمین کی موت کے بعد زمین کو زندہ کر دیتا ہے، زمین کی موت ہے اس کا بنجر ہونا اور خشک ہونا، اور اُس کی حیات ہے اُس کا سبز ہو جانا، تو گویا کہ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى یہ بھی مثال ہے يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کی، کہ خشک چیز میں سے اُس نے سرسبز چیز کو اٹھا دیا، اور پھر ایک وقت آئے گا کہ اسی سرسبز کو دوبارہ خشک کر کے پھر اس میں سے اسی طرح سے ایک بے جان سا دانہ نکال لے گا۔ تو زمین کا اس طرح سے بنجر ہونا، بار بار آباد ہونا یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا رہتا ہے اور زندوں کو مردہ کرتا رہتا ہے، تو حیات و موت کی مثال یہ خشکی اور نباتات بھی بن سکتے ہیں، یہ بات قرآنِ کریم کے محاورے کے عین مطابق ہے، اس کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں رکھتی، يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اس قسم کے الفاظ قرآنِ کریم میں کئی جگہ ذکر کیے گئے ہیں،(1) اور اِس اِحیاء اَرض کو موت کے بعد زِندہ کرنے کی مثال بنایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی مردوں کو اُٹھا کھڑا

---

(1) دیکھیں سورۂ روم: ۱۹۔ سورۂ حدید: ۱۷۔ سورۂ بقرہ: ۱۶۴۔ سورۂ نحل: ۶۵۔ سورۂ عنکبوت: ۶۳۔ سورۂ فاطر: ۹۔ سورۂ روم: ۵۰۔ وغیرہ۔

کرے گا جیسے روز تمہارے سامنے اس بے جان چیز میں جان ڈالی جاتی ہے۔[1] تو یہ نباتات بھی اس کی مثال بن سکتا ہے، اور انڈے سے بچے کا نکل آنا یہ بھی مفسرین نے مثال دی، اور اسی طرح سے نطفے سے انسان کا نکل آنا بچے کا بن آنا۔ اور مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ: زندہ چیز سے بے جان کو نکالنے والا ہے، اس کی مثال ہے مرغی سے انڈا نکل آیا، مرد سے نطفہ نکل آیا، اور یہ سبز نباتات جو ایک حیات کی علامت ہے، اسی سے وہی خشک غلہ نکل آیا، ماقبل کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوئے یہ مفہوم بھی بیان کیا جاتا ہے۔

قوموں کے عُروج وزوال کی چند مثالیں

اور اس سے کچھ اور وسعت بھی کر دی گئی، کہ رُوحانی موت اور رُوحانی حیات بھی اس سے مراد لی جاسکتی ہے، کہ ایک قوم رُوحانی طور پر مردہ ہوگئی، اللہ تعالیٰ اُس میں حیات کے آثار پیدا کر دیتا ہے، اُس کو اُبھار دیتا ہے، اُٹھا دیتا ہے وہ سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے، اور ایک قوم سرسبز وشاداب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اسی کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں، یعنی ہر لحاظ سے اُس کو پست کر دیتے ہیں، اُس کی صلاحیتیں ضائع ہوجاتی ہیں، تو جس طرح سے تم روز غلے سے نباتات کا پیدا ہونا، پھر نباتات سے غلے کا پیدا ہونا یہ دیکھتے ہو، اسی طرح سے قوموں کے عروج اور زوال کا فلسفہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت کبھی کسی کو اُبھارتے ہیں کبھی کسی کو گراتے ہیں، یعنی آج آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ امریکا اور رُوس یہ چڑھے ہوئے ہیں، ان کو عروج حاصل ہے اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، اگر ماقبل کی طرف آپ دیکھیں گے تو آپ کو قوموں کے عروج اور زوال کی بے شمار مثالیں معلوم ہوں گی، اِن کو نمایاں ہوئے ہوئے تو ابھی کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا، یہ دونوں جنگِ عظیم کے بعد اُبھرے ہیں، پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں ہوئی، اور دُوسری ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی، یہ دو جنگیں ہیں جس کے نتیجے میں یہ دونوں قومیں رُوس اور امریکا دُنیا کے اِس نقشے کے اُوپر اس طرح سے نمایاں ہوئے ہیں، اور اس سے قبل اس دُنیا کے اُوپر برطانیہ کا طوطی بول رہا تھا، برطانیہ کی حکومت تھی، انگریز کی حکومت تھی، اور اتنی طویل وعریض حکومت کہ جس میں سورج ہی غروب نہیں ہوتا تھا، اور اُس کے مدِمقابل کوئی ایسی حکومت نہیں تھی کہ جس کا ذِکر کیا جاسکے، اب وہ سکڑتے سکڑتے اپنے مُلک میں اکٹھے ہوگئے، اور ان جنگوں کے نتیجے میں ان قوموں کو یعنی رُوسیوں اور امریکیوں کو برتری حاصل ہوگئی، اور برطانیہ کے دور سے قبل ترکوں کا دور تھا، ہندوستان کے اندر برطانیہ کے دور سے قبل مغلوں کا دور تھا، اور اتنی عظمت اور اتنی شان والا دور تھا کہ انسان سمجھتا تھا کہ اب انہوں نے کھونٹے گاڑ لیے ہیں، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اِن کو زوال آجائے، چڑھتے چلے جاتے تھے، ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ساری دُنیا کے اُوپر حاوی ہوجائیں گے، مغلوں کا دور بڑی شان وشوکت کا دور گزرا، ترکوں کا دور بڑی شان وشوکت کا دور گزرا، اور آپ اس سے پیچھے ہٹیں گے تو خلفائے بنوعباس کا ڈنکا بجتا تھا، اس سے پیچھے بنواُمیہ تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ سے قبل اسی نقشے کے اُوپر آپ کو رُوم اور فارس نظر آتے ہیں، کسی طرف رُوم کی شان وشوکت ہے، کسی طرف فارس کی شان وشوکت ہے، کوئی بڑھ رہا ہے، کوئی چڑھ رہا ہے، کوئی گر رہا ہے، اور پیچھے ہٹتے چلے جاؤ، تاریخ میں جاؤ گے تو سکندر ودارا کی مثالیں، فرعون ونمرود کی مثالیں تاریخ کے اُوراق کے اُوپر بکھری ہوئی ہیں، اس لئے کسی کو

(۱) دیکھیں سورۂ اعراف: ۵۷۔ سورۂ فاطر: ۹۔ سورۂ زخرف: ۱۱۔ سورۂ ق: ۱۱۔

چڑھتا ہوا دیکھ کر سمجھ لینا کہ حق یہی ہے، اور کسی کو گرتا ہوا دیکھ کر سمجھ لینا کہ باطل یہی ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہوا کرتی، جیسے ایک آدمی اپنی زندگی کے اندر کمال حاصل کرتا ہے تو اُس کو موت بھی آجائے تو موت کے بعد بھی اُس کے کمالات کمالات ہی رہتے ہیں، اسی طرح سے حق حق ہی رہتا ہے چاہے کسی میدان میں غالب ہوجائے چاہے کسی میدان میں مغلوب ہوجائے، تو کسی قوم کا عروج کی طرف چلے جانا اُس کے حق ہونے کی علامت نہیں ہوتی، کسی کا زوال کی طرف چلے جانا اُس کے باطل ہونے کی علامت نہیں ہوتی، تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (سورۂ آل عمران: ۱۴۰) اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ہوتی رہتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں بھی یہ نقشہ آپ کے سامنے موجود ہے، کہ حق و باطل کا ٹکراؤ ہوا تو بدر میں سرورِ کائنات ﷺ اور آپ کی جماعت کو بے نظیر فتح حاصل ہوئی، اس وقت بھی حق آپ کے ساتھ تھا، اور اگر بعض وجوہ کی بنا پر اُحد کے اندر شکست کھالی، زخمی ہوگئے، دانت تڑوالیے تو اُس کا یہ مطلب نہیں کہ اب حق دوسروں کے ساتھ چلا گیا تھا، اور حق آپ کے پاس نہیں تھا، جو حق بدر میں تھا وہی حق اُحد میں تھا، لیکن اللہ کی حکمت کے تحت کبھی حق جیتتا ہے کبھی حق ہارتا ہے، اور کبھی غالب آتا ہے کبھی مغلوب ہوتا ہے، لیکن نتیجہ ہمیشہ اہلِ حق کے ساتھ ہوتا ہے، انجام انہی کا اچھا ہوگا۔ تو اس طرح سے حی اور میت کا یہ فرق قوموں کے عروج و زوال کے اعتبار سے بھی ہوتا رہتا ہے۔ جاہل لوگوں میں سے، اُمیوں میں سے، اَن پڑھ لوگوں میں سے، بدویوں میں سے ایک ایسی قوم اُٹھادی جو ساری دُنیا کے اُوپر حاوی ہوگئی، اور یہ اہلِ کتاب اور دُوسرے لوگ جو علم وفضل کے مالک ہونے کی وجہ سے ایک زندہ قوم کہلاتے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اُوپر مُردنی طاری کردی، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تصرفات ہیں جن کی یہاں نشاندہی کی جارہی ہے، جس سے اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہوتی ہے، علمی احاطہ بھی نمایاں ہوتا ہے، حکمت بھی نمایاں ہوتی ہے، اُس کی خالقیت مالکیت ہر چیز کا ثبوت ملتا ہے، اسی تدبر کے لئے اور غور وفکر کے لئے ان چیزوں کی نشاندہی کی جارہی ہے، ''یہی اللہ ہے'' فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ: تم کدھر کو پھیرے جارہے ہو؟

شمس وقمر میں آیاتِ قدرت اور قمری تاریخ کی اہمیت

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ: یہ اب وہ باتیں آگئیں جن کا تعلق عالمِ جوّ کے ساتھ ہے، زمین وآسمان کے درمیان کے ساتھ، ''تاریکی کو چیر کر اللہ تعالیٰ صبح کی نکال لاتا ہے، صبح کی روشنی نکالنے والا ہے، رات کو اُس نے تمہارے لئے سکون کی چیز بنایا'' ایک ایک چیز میں غور کروگے تو پتا چلے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے کتنا بڑا اِحسان اور کتنی بڑی نعمت ہے، کہ کیسا سکون ہوتا ہے، اطمینان حاصل ہوتا ہے، سارا عالم رات کو ایک سکون کی نیند سوجاتا ہے۔ ''اور سورج چاند کو اللہ نے حساب کے لئے بنایا'' جس سے معلوم ہوگیا کہ حساب کا تعلق سورج سے بھی رکھا جاسکتا ہے، چاند سے بھی، اس لئے شمسی مہینے بھی اپنی جگہ ایک حق ہیں، قمری مہینے بھی حق ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت شریعت کے اَحکام کا تعلق قمری مہینوں کے ساتھ لگادیا، اس لئے قمری مہینوں کا یاد رکھنا اور اِن کی تاریخوں کو یاد رکھنا فرضِ کفایہ ہے، اگر سارے کے سارے لوگ بھول جائیں کہ یہ کون سا مہینہ ہے، کون سی تاریخ ہے، تو ساری اُمت گناہ گار ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کا حساب، رمضان کا حساب، حج کا حساب یہ سارے کا سارا قمری مہینوں سے تعلق رکھتا ہے، ہاں! ویسے حساب کتاب کے لئے اگر شمسی مہینے استعمال کیے جائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن فرضِ کفایہ کو اَدا کرنے والا ثواب یقیناً پاتا

ہے، سورۂ بقرۃ کے اندر یہ مسئلہ ذکر کیا تھا، جیسے جنازہ پڑھنا ہر کسی کے ذِمّے فرض نہیں ہے، لیکن جو پڑھے گا اُس کو ثواب ایسے ہی ملے گا جیسے فرض ادا کرنے والے کو ملا کرتا ہے، اسی طرح سے جو عربی تاریخیں یاد رکھتے ہیں، اور یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن کو اپنے خط وکتابت میں اور اپنے معاملات میں استعمال کیا جائے، تاریخ جب درج کی جائے تو اِسلامی تاریخ درج کی جائے، تو یہ یقیناً کارِثواب ہے، کیونکہ اس میں فرضِ کفایہ کی ادائیگی ہے، اور اگر ساری قوم اِس کے استعمال کو چھوڑ دے گی، مہینے خلط ملط ہوجائیں گے، تاریخ کا پتا نہیں چلے گا، جب تاریخ کا پتا نہیں چلے گا تو رمضان بھی مشتبہ ہوجائے گا، اور اِسی طرح سے ذی الحج بھی مشتبہ ہوجائے گا، اور یہ سارے کا سارا نظامِ عبادت گڑبڑ ہوجائے گا۔ باقی! حساب کا تعلق شمس کے ساتھ بھی ہے، جیسے ہماری نمازوں کو شمسی حساب کے ساتھ متعلق کردیا گیا، روزے اور حج قمری مہینوں سے متعلق ہیں اور نمازیں شمسی حساب سے متعلق ہیں، سورج اتنا چڑھ آئے تو یہ نماز پڑھو، اتنا چڑھ آئے تو یہ نماز پڑھو، چھپے ہوئے اتنی دیر ہوجائے تو یہ پڑھو، نکلنے میں اتنا وقت باقی ہو تو یہ پڑھو، ہمارا نماز کا سارے کا سارا نظام سورج کے حساب سے ہے، وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا۔ اور پھر اِن کو بھی ایسے حساب کے ساتھ رکھا ہے، اِن کی حرکات کو ایسا منظم کیا کہ کروڑہا سال بھی گزرتے چلے جائیں گے تو ان کا نظم ایسے ہی چلے گا اور ایسے ہی چلتا آیا ہے، جب تک اللہ کی مشیت اس نظام کے بگاڑنے کی نہ ہو، اور جب اِن کا نظام بگاڑنا ہی اللہ کی مشیت ہوجائے گی تو پھر یہ اپنی چال چھوڑ دیں گے، سورج مشرق کی بجائے مغرب کی طرف سے طلوع کرآئے گا، اور نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے گا، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اِن کی چال کے اندر فرق نہیں آسکتا، اور یہ اسی طرح سے اپنے حساب کو ادا کرتے رہیں گے۔ ''یہ اندازہ ہے'' یعنی اِن کو اس طرح سے حساب کے ساتھ چلانا، حساب کے ساتھ بنانا، حساب کے لیے قرار دینا، ''یہ اندازہ ہے ایک زبردست کا اور علم والے کا''، اس سے اُس کی قدرت بھی نمایاں ہے اور علم بھی نمایاں ہے۔

ستاروں میں قدرت کے دلائل

''اور اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا تاکہ تم اِن کے ذریعے سے راہنمائی حاصل کرو'' ستاروں کے ذریعے سے راہنمائی حاصل ہوتی ہے ''جنگل کی تاریکیوں میں اور سمندر کی تاریکیوں میں۔'' بَر: ریگستان، جس میں کوئی ایسی علامت نہیں ہوتی جس کو دیکھ کر انسان راہ معلوم کرلے کہ کون سا شہر کدھر ہے؟ وہاں بھی یہ ستارے کام دیتے ہیں، اور آج بھی خشکی کا سفر، ہوائی سفر، سمندری سفر انہی ستاروں کی مدد سے ہوتا ہے، یہ علیحدہ بات ہے اب منہ اُٹھا کر ستارے دیکھنے کی چنداں نوبت نہیں آتی، کیونکہ آلات کے ذریعے سے ستاروں کا رُخ معلوم کرلیا جاتا ہے، یہ سمندری جہاز جتنے چلتے ہیں اور ہوائی جہاز جتنے اُڑتے ہیں سب قطب نما کی مدد سے اُڑتے ہیں، کہ اس زاویے پر چلیں گے تو قطب ستارہ یہاں ہوگا، اس زاویہ پر ہوگا تو ہم فلاں شہر میں پہنچ جائیں گے، اس زاویے پہ ہوگا تو فلاں شہر میں پہنچ جائیں گے، اور وہ ستارے کا رُخ قطب نما کے ذریعے سے معلوم کرتے رہتے ہیں، تو یہ بھی لاھتداء بالنجوم ہی ہے، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ یہ ایک ایک چیز کو ذکر کرکے متوجہ کیا جارہا ہے۔

اِنسانی تخلیق کے متعلق تمام آسمانی مذاہب کا نظریہ اور موجودہ دَہریت

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ایک ہی نفس سے۔ یہ دلیل اَنفسی آ گئی۔ ''ایک ہی نفس سے پیدا کیا'' ایک نفس کا مصداق آدم علیہ السلام ہیں، تمام آسمانی مذاہب اس بات پر متفق ہیں، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، کہ انسان کی اِبتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، آدم علیہ السلام اوّل انسان ہے جو اللہ نے پیدا کیا تھا، اسی سے پھر آگے نسل چلی ہے، آسمانی مذاہب سب کے سب اس بات کے اُوپر متفق ہیں، جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور موجودہ دَہریت اِس چیز کا انکار کرتی ہے، وہ کسی ایک انسان کو اَصل نہیں مانتی، وہ کہتے ہیں جس طرح سے کیڑے مکوڑے پیدا ہوئے، پھر اُس سے ترقی کر کے اگلی چیز بن گئی، پھر اُس سے ترقی کر کے اگلی چیز بن گئی، اور اس سے ترقی یافتہ آخر میں حیوان، پھر اُس میں ترقی یافتہ بندر آ گیا، بندر سے ترقی کر کے ایک ہی چھلانگ میں انسان بن گیا، تو کوئی ایک آدھ پہلے اللہ نے پیدا کیا ہو، اُس کی نسل سے چلے ہوں، ایسا نہیں، بلکہ انسان بندر سے اُوپر کا درجہ ہے، یعنی حیوانات میں ترقی یافتہ بندر ہے، اور بندر سے تھوڑی سی ترقی کر کے آگے انسان بن گیا، بس اتنی سی بات ہوئی کہ اس کی دُم کٹ گئی اور یہ بولنے لگ گیا تو یہ انسان بن گیا، تو یہ انسانیت کی ابتدائی منزل یعنی پچھلی منزل انسانیت کی اِن کے ہاں بندر ہے، جس سے ترقی کر کے انسان وجود میں آ گیا، موجودہ دَہریت کا یہی نظریہ ہے، یہ ڈاروِن کا فلسفہ جو ذِکر کرتے ہیں، ڈاروِن کی تھیوری، اس کے اندر یہی چیز ذِکر کی گئی ہے، لیکن یہ آسمانی مذہب کے خلاف ہے، چاہے آسمانی مذہب قدیم ہے، جدید ہے، جو بھی ہے، جس مسلک کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس میں بنیادی اسی چیز کو تسلیم کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آدم علیہ السلام کی نسل سے پھیلایا ہے، ''اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک ہی جان سے'' فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ: اس کی تفصیل آپ کے سامنے ذِکر کر دی گئی، کہ اس کے لئے مستقر بھی بنایا، مستودع بھی بنایا، عارضی طور پر ٹھہرنے کی جگہ بھی بنائی اور مستقل ٹھہرنے کی جگہ بھی بنائی، قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ: تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہم نے آیات کو سمجھدار لوگوں کے لئے۔

بارش ونباتات میں آیاتِ قدرت

''اور اللہ وہ ہے جس نے اُتارا آسمان سے پانی کو'' یہ نشانی جو ذِکر کی جا رہی ہے پانی کے اُتارنے کی، یہ اپنی ابتدا کے اعتبار سے علویات سے تعلق رکھتی ہے یعنی عالمِ بالا کے ساتھ، اِنتہا کے اعتبار سے سفلیات سے تعلق رکھتی ہے یعنی زمین کے ساتھ، اور درمیانہ درجہ اِس کا جَوّ سے تعلق رکھتا ہے، گویا کہ اوّل اور اِنتہا کے اعتبار سے اُوپر سے لے کر نیچے تک یہ نشانی پھیلی ہوئی ہے، ''ہم نے آسمان سے پانی اُتارا'' اس کا اُتارنا مستقل نعمت بھی، اور جو اُتارنے کا انداز ہے وہ مستقل قدرت بھی، اتنا پانی اگر یک دَم اُوپر سے گرا دیا جاتا جس طرح سے آبشار گرتی ہے تو کسی مکان پر گرتا تو مکان زمین بوس ہو جاتا، اور سڑکوں پر گرتا تو سڑکوں میں گڑھے پڑ جاتے، کس طرح سے قطرہ قطرہ کر کے اللہ تعالیٰ اُتارتے ہیں، کتنی حکمت کے ساتھ اُتارتے ہیں، جس کو مکان بھی برداشت کر لیتے ہیں، خیمے بھی برداشت کر لیتے ہیں، فصلیں بھی برداشت کر لیتی ہیں، تو یہ اُتارنا مستقل اللہ کی قدرت اور نعمت ہے، ''پھر ہم نے اسی پانی کے ذریعے سے ہر چیز کی نباتات کو نکالا، اور پھر اس نباتات میں سے سبز شاخ کو نکالا، پھر اس سبز شاخ سے غلہ

نکلا جو تہہ بہ تہہ رکھا ہوا ہے'' یہ مکئی کا بھٹا دیکھو جس کو ہم چھلی کہتے ہیں، اور یہ گندم کا سِٹہ دیکھو، کس طرح سے تہہ بہ تہہ ان کے اندر غلے رکھے ہوئے ہوتے ہیں، دانے رکھے ہوئے ہوتے ہیں، اور یہ پھلی دار جو غلہ ہے اس میں دیکھو ایک پھلی کے اندر دانے کو کس طرح سے ٹکایا ہوا ہوتا ہے، یہ سب اللہ کی قدرت ہے۔ ''اور کھجوروں سے یعنی اُن کے گابھوں سے'' قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ: خوشے حاصل ہوتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں، ایسے خوشے جو اپنے وزن کے اعتبار سے نیچے کو جھکے ہوئے ہیں، زمین کی طرف قریب آنے والے ہیں، ''اور پیدا کیے اسی پانی کے ذریعے سے اُس نے باغات انگوروں کے، اور پیدا کیا زیتون کو اور رمان کو، بعض آپس میں ملتے جلتے ہیں، بعض آپس میں ملتے جلتے نہیں ہیں'' اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ: ان میں سے ہر ایک کے پھل کی طرف دیکھو جب یہ پھلتا ہے، یعنی جب پھل پیدا ہوتا ہے تو اُس کی ابتدائی منزل کیسی ہوتی ہے، کیسی شکل، کیسا مزا، کیسی رنگت، ''اور دیکھو اس کے پکنے کی طرف جب یہ پکتا ہے'' اِذَآ اَثْمَرَ کے مقابلے میں یہ لفظ نکلے گا وَيَنْعِهٖ اِذَآ اَيْنَعَ، اور دیکھو اس کے پکنے کی طرف جب یہ پکتا ہے، تو پھر اس میں کیا کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کہ ابتدا اور انتہا میں کوئی مناسبت ہی نہیں رہتی، کیسا خوش رنگ، کیسا خوش ذائقہ، کیسی اس میں خوشبو ہوگئی، تو اوّل سے لے کر آخر تک مطالعہ کرو تو تمہیں پتا چلے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنی قدرت اس میں نمایاں ہے، ''بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں۔''

رَدِّ شرک اور مزید دلائلِ قدرت

آگے وہی رَدِّ شرک ہے، وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: ''انہوں نے جنوں کو شرکاء بنالیا، بنائے انہوں نے اللہ کے لئے شرکاء جن، حالانکہ ان جنوں کو بھی اللہ نے ہی پیدا کیا، اور تراش لیے انہوں نے اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں'' یعنی بے ڈھنگے پن سے قرار دے دیئے، تراش لیے، ''تراش لیے انہوں نے بیٹے اور بیٹیاں اللہ کے لئے بغیر کسی علمی دلیل کے جہالت کے ساتھ'' یعنی یہ سارے کے سارے کام اللہ کے ہیں، اور آگے انہوں نے اور شرکاء قرار دے لئے، اور بغیر دلیل کے بیٹے بیٹیاں قرار دے دیئے، ''پاک ہے اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں سے اور بلند ہے اُن سے جو یہ بیان کرتے ہیں''۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: زمین و آسمان کو نئی طرح سے بنانے والا ہے بغیر نمونے کے۔ ''کیسے ہو سکتی ہے اس کے لئے اولاد؟ اس کی تو کوئی بیوی ہی نہیں ہے'' کیونکہ عرفاً اولاد ہوتی ہے بیوی اور خاوند کے تعلق سے، تو یہ اللہ کے لئے بیٹیاں بیٹے قرار دے رہے ہیں، تو پہلے اُس کی بیوی تجویز کرو،... نعوذ باللہ!... پھر بیوی خاوند والے تعلقات ثابت کرو، تب جا کر آگے اولاد ہوگی، تو اُس کے لیے اولاد کا لفظ استعمال کرو، ''اُس کے لئے اولاد کیسے ہو سکتی ہے، اس کی تو بیوی ہی نہیں ہے'' وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ: ہر چیز کا خالق وہی ہے، پیدا کیا اُس نے ہر چیز کو، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، یہی اللہ تمہارا رَبّ ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: رُبوبیت کو پیش کر کے آگے اُلوہیت کو ذکر کیا جا رہا ہے، قرآنِ کریم میں خاص طور پر اس انداز کو اپنایا گیا ہے، رَبّ کا معنی ہوتا ہے پیدا کرنے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا، یہی تمہارا رَبّ ہے، یہی تمہیں وجود دیتا ہے، یہی تمہارے وجود کو آگے نشوونما دیتا ہے، اور یہی معبود ہے اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں، ''ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو، اور وہ ہر چیز کے اوپر وکیل ہے، ذمہ دار ہے، کارساز ہے۔''

دُنیا و آخرت میں رُؤیتِ باری تعالیٰ کے متعلق تفصیل

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ: آنکھیں اُس کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھا بھی نہیں جاسکتا، اِس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اِن آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت نہیں ہوسکتی، آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں آئے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب طُور پر موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی تھی، تو اس گفتگو کے نتیجے میں موسیٰ علیہ السلام کے دل میں دیدار کا شوق بھی بھڑک اُٹھا، پردے سے جو گفتگو سنی تو پردے سے گفتگو سُن کے دیدار کا شوق ہوگیا، جیسے کہتے ہیں کہ:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　　　بسا کیں دولت از گفتار خیزد[1]

عشق کی اِبتدا صرف دیدار سے نہیں ہوا کرتی کہ دیکھیں تو محبت ہوتی ہے، بلکہ کبھی گفتار سے بھی ہوجاتی ہے کہ پس پردہ بات ہوئی اور دل میں عشق کی آگ بھڑک اُٹھی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پس پردہ تذکرہ سنا تو عشق نے جوش مارا، تو مطالبہ کیا کہ اب شکل بھی دکھادیں اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (سورۂ اَعراف: ۱۴۳)، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ، اور لَنْ یہ دُنیا میں نفیٔ دوام کے لئے ہوتا ہے، کہ تو ہرگز نہیں دیکھ سکے گا، تو اس سے معلوم ہوگیا کہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اِن آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہیں جاسکتا، یہ اہلِ سُنّت والجماعت کا متفق علیہ مسلک ہے۔ اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، اہلِ ایمان کو ہوگا کافروں کو نہیں ہوگا، ''کافروں کو نہیں ہوگا'' اس کا ذِکر سورۂ مطففین میں ہے: كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ: بے شک یہ لوگ اپنے رَبّ سے پردے میں رکھے جائیں گے، اہلِ ایمان کو محشر میں بھی دیدار ہوگا اور جنّت میں جانے کے بعد بھی دیدار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا دیدار اور اللہ تعالیٰ کی زیارت جنّت کی نعمتوں میں سے اعلیٰ ترین نعمت ہوگی، کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوتی رہے گی جنّت کی کسی نعمت کی طرف اہلِ جنّت متوجہ نہیں ہوں گے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ المعراج میں زیارت ہوئی یا نہیں، یہ مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف فیہ ہے، لیکن اگر یہ قول کیا جائے کہ رُؤیت ہوئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، تو پھر اس میں یہ اِشکال نہیں ہوگا کہ دُنیا میں کیسے دیکھ لیا؟ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو دُنیوی زندگی میں تھے۔ تو اس کا حل اکابر نے یہی لکھا ہے کہ ایک ہے عالمِ آخرت، اور ایک ہے زمانِ آخرت، زمانِ آخرت تو ہوگا قیامت کے بعد، اور عالمِ آخرت اِس وقت بھی موجود ہے، اور اب بھی اگر کوئی شخص اُس عالمِ آخرت میں منتقل ہوجائے تو اُس کے اُوپر وہی آثار طاری ہوجائیں گے جو کہ زمانِ آخرت کے بعد طاری ہوں گے، مثلاً عیسیٰ علیہ السلام اِس وقت عالمِ آخرت میں موجود ہیں، اب یہ ہزارہا سال بھی بیٹھے رہیں تو اُن پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، جیسے گئے تھے ویسے واپس آجائیں گے، اور اسی طرح سے عالمِ آخرت میں پہنچ جانے کے بعد کھانے پینے کی اور پیشاب پاخانے کی احتیاج بالکل نہیں رہتی، جیسے اللہ کے ذِکر کے اُوپر گزارہ ہوگا اور تسبیح کے اُوپر وقت گزرے گا، اسی طرح سے ان کا گزرے گا، اس لئے نہ پیشاب کی ضرورت، نہ پاخانے کی، نہ بیماری، نہ صحت، کوئی چیز زیرِ بحث ہی نہیں ہے، جیسے گئے اسی طرح سے محفوظ رہیں گے، جب اللہ اُتارے گا اس کے بعد ہی پھر یہ

---

(۱) ملا جامی، یوسف وزلیخا، بعنوان داستان دختر بازرضا ئے، عنوان نمبر ۳۹

قصہ چلے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جتنا عرصہ رکھا گیا وہ اُن کی عمر میں شمار نہیں ہے، اُن کی عمر جو شروع ہوئی تو زمین پر آنے کے بعد شروع ہوئی، تو جس طرح سے آخرت میں منتقل ہوجانے کے بعد زمانِ آخرت کے آثار طاری ہوتے ہیں، تو اسی طرح سے اگر عالمِ آخرت میں منتقل ہوجائیں تو بھی وہی آثار طاری ہوجاتے ہیں، تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اگر زیارت کا قول کیا جاتا ہے یا رُؤیت کا قول کیا جاتا ہے، تو عالمِ آخرت میں پہنچنے کے بعد، نہ کہ عالمِ دُنیا میں، تو وہاں زیارت اور رُؤیت جیسے قیامت کے بعد ہوسکتی ہے اسی طرح سے آج بھی ہوسکتی ہے، بہرحال یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، بعض صحابہ رُؤیت کا قول کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے، لیکن یہ مسئلہ متفق علیہ ہوا کہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اِن آنکھوں کے ساتھ کسی کو اللہ تعالیٰ کی رُؤیت نہیں ہوسکتی۔ ''اور وہ ادراک کرتا ہے آنکھوں کا'' سب آنکھوں کا اِحاطہ کیے ہوئے ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ: تمہارے پاس ایسی نشانیاں آگئیں جن کے ساتھ تم بصیرت حاصل کرسکتے ہو، اسبابِ بصیرت آگئے، بصائر بصیرۃ کی جمع ہے، ''جو کوئی بصیرت حاصل کرلے گا اپنے نفع کے لئے کرے گا، اور جو کوئی اندھا بنا رہے گا تو اُس کا وبال اُسی پر پڑے گا، میں تم پر کوئی نگہبان نہیں ہوں'' کہ تمہیں زبردستی سوانکھا بنانے کی کوشش کروں، اور تم نہ کرو تو میرے اُوپر کوئی ذمہ داری عائد ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ: ہم یہ آیات پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، تاکہ آپ تبلیغ کا اجر حاصل ہو، آپ تبلیغ کریں، ''اور تاکہ یہ لوگ کہیں کہ تُو نے پڑھ لیا ہے کہیں سے'' پڑھ پڑھ کر لا کے سُناتا ہے، یعنی ان کے اُوپر اِتمامِ حجت زیادہ ہوجائے گی، جیسے جیسے وضاحت ہوتی جائے گی اور یہ انکار کرتے جائیں گے تو زیادہ مجرم بنتے چلے جائیں گے، ''اور تاکہ ہم واضح کردیں'' ہٗ ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ رہی ہے، جس کے اُوپر بَصَآىِٕرُ دلالت کرتا ہے یا آیات کا لفظ دلالت کرتا ہے ''ان لوگوں کے لئے جو کہ علم رکھتے ہیں۔''

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات اور تسلی

''آپ کی طرف آپ کے رَبّ کی طرف سے جو طریقہ وحی کردیا گیا آپ اُسی کی اتباع کرتے رہیے'' اور اس طریقے کی بنیاد یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ: اور مشرکوں سے منہ موڑ لیجئے، ان کے پیچھے زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ کی حکمت ہے کہ دنیا کے اندر کوئی صحیح ہوگا کوئی غلط ہوگا، اگر اللہ یہ چاہتا کہ دنیا میں سارے موحد ہی ہوں کوئی مشرک نہ ہو تو کسی کی مجال تھی کہ شرک کرتا؟ لیکن جب اللہ نے صلاحیت پیدا کر کے آزاد چھوڑ دیا، تو کوئی موحد ہے کوئی مشرک ہے، کوئی اچھا ہے کوئی بُرا ہے، سمجھو کہ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے، ورنہ اللہ کی مشیت کے خلاف کوئی کام نہیں ہوسکتا، اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ کوئی شرک نہ کرے تو سارے ہی موحد ہوتے، زبردستی تو کوئی مشرک نہیں بن سکتا، تو یہ اللہ کی حکمت ہے کہ آزاد چھوڑ دیے ہیں، لہٰذا کچھ اچھے بھی ہوں گے کچھ بُرے بھی ہوں گے، دُنیا خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ ''ہم نے آپ کو اِن کے اُوپر نہ نگہبان بنا کر بھیجا ہے، نہ آپ ان کے اُوپر کوئی داروغہ متعین ہیں'' کہ آپ کی یہ ذمہ داری ہو کہ آپ نے ان کو ضرور ٹھیک کرنا ہے۔

تبلیغ کا ایک بہترین ادب اور اُصول

اور آگے تبلیغ کا ایک ادب سکھایا ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرے کو تبلیغ ایسے طور پر کرو کہ دوسرے کے نظریات پر اس طرح سے تنقید نہ ہو کہ اُس میں اِشتعال پیدا ہو جائے، کیونکہ اِشتعال پیدا ہونے کے بعد پھر سمجھنا ممکن نہیں رہتا، اب یہ مشرکین جن کو اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں، چاہے وہ بُت ہوں، چاہے درخت ہیں، چاہے رُوحیں ہیں، چاہے فرشتے ہیں، چاہے جن ہیں، جو بھی ہیں اُن کے ساتھ اُن کی عقیدت ہے، اور اُن کی عبادت کے جو طریقے انہوں نے تجویز کر لیے ہیں وہ قومی سطح پر ان کے دیرینہ طریقے چلے آرہے ہیں جن کے ساتھ اِن کو اُنس ہے، اپنے طرز وطریق کے ساتھ اُنس ہے، ہر قوم کو اپنے طرز وطریق کے ساتھ پیار ہوتا ہے، اپنے شعار اُن کو پیارے ہوتے ہیں، اور اِنسان اپنی عادات وغیرہ کو چھوڑنے کے لئے جلدی تیار نہیں ہوتا، تو اگر اُس کو سمجھاتے وقت کوئی بدزبانی اختیار کر لی جائے، اُس کا اِستہزا اُڑایا جائے، مذاق اُڑایا جائے، تحقیر کی جائے یا اُس کی معتقد فیہ شخصیات کو گالی دی جائے، بُرا بھلا کہا جائے تو وہ یقیناً اِشتعال میں آجائے گا، اور اپنے دفاع کے لئے تیار ہو جائے گا، جس سے پھر سمجھنے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، تو جن کو آپ بات سمجھانا چاہتے ہیں اگر آپ انداز ایسا اختیار کریں گے، کہ وہ دِل کی کھڑکیاں پہلے ہی بند کر کے وہ زور کے ساتھ مدافعت پر ہی آمادہ ہو جائیں تو پھر آپ کی کوشش فضول ہے، وہ سمجھ نہیں سکتے، اس لئے فرمایا کہ ''جن کو یہ مشرکین اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں اُن کو بُرا بھلا نہ کہو، ورنہ ضد میں آکر وہ اللہ کو برا بھلا کہنے لگ جائیں گے، اور ان کا اللہ کو بُرا بھلا کہنا جہالت کی وجہ سے ہوگا، ضد کی وجہ سے ہوگا'' لیکن چونکہ تم سبب بنے کہلوانے کا، اس لئے مجرم تم بھی بن جاؤ گے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اپنے باپ کو گالی نہ دیا کرو، اور اپنی ماں کو گالی نہ دیا کرو۔ صحابہ نے کہا کہ یارسول اللہ! بھلا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیا کرتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ ماں باپ کو گالی نہ دیا کرو، تو ماں باپ کو تو گالی کوئی دیتا ہی نہیں، ایسا بھی کوئی شخص ہے جو اپنے باپ کو گالی دے، یا اپنی ماں کو بُرا بھلا کہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! جب تم کسی کے باپ کو گالی دو گے تو جواب میں وہ تمہارے باپ کو گالی دے گا، تو اپنے باپ کو گالی تم نے دِلوائی، اور جب تم کسی کی ماں کو گالی دو گے اور وہ جواب میں آ کے تمہاری ماں کو گالی دے گا تو اپنی ماں کو گالی تم نے دِلوائی[1] تو تم سبب بن گئے اپنے ماں اور باپ کو گالی دلوانے کا، تو اپنے باپ کو گالی نہ دو کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے باپ کو گالی نہ دو، تاکہ جواباً وہ تمہارے باپ کو گالی دے دے، تو جس سے معلوم ہو گیا کہ جیسے بُرا کام کرنا خود جائز نہیں اسی طرح سے کسی بُرے کام کا سبب بننا بھی جائز نہیں، ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو کہ جس کے نتیجے کے اندر کوئی بُرائی جنم لے لے۔

---

(۱) مسلم ۱/۶۴، باب بیان الکبائر/ مشکوۃ ۲/۴۱۹، باب البر والصلہ، فصل اول۔ ولفظ الحدیث: مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوا يَارَسُولَ اللهِ الخ

میدانِ تبلیغ میں ایک دُوسرے پر اِستہزا کا نقصان - ایک عبرت آموز واقعہ

یہ صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے بھائی! ذرا توجہ کیجئے! میں آپ کو ایک واقعہ سُناؤں جس وقت میں کمالیہ میں مدرّس تھا،(۱) اُس وقت فیصل آباد سے ایک رسالہ نکلا کرتا تھا ''پاکستانی''، فیصل آباد اُس وقت ''لائل پور'' تھا، تو وہاں سے ''پاکستانی'' رسالہ نکلتا تھا، اور وہ ''پاکستانی'' بریلویوں کے خلاف کچھ ضرورت سے زیادہ متشدّد تھا۔ اور کوٹلی لوہاراں، ضلع سیالکوٹ سے ایک رسالہ نکلا کرتا تھا ''ماہِ طیبہ''، میں یہ دونوں رسالے منگواتا تھا، چونکہ میں اُس وقت ایک مسجد میں خطیب بھی تھا، تقریر بھی کرنی ہوتی تھی، تو اس قسم کے حالات کو جمع کر کے رکھا جاتا ہے، فاروقیہ مسجد میں جمعہ پڑھاتا تھا، تو میں ''ماہِ طیبہ'' کا مطالعہ بھی کرتا تھا اور ''پاکستانی'' کا مطالعہ بھی کرتا تھا۔ اِبتدا ''پاکستانی'' نے کی، ایک عنوان اختیار کیا ''اُلٹے بانس بریلی کو''، اور اِس کے تحت اُس نے مضامین کا سلسلہ شروع کیا کہ احمد رضا خان بریلوی کی عبارات لے کر اُس کا مذاق اُڑانا شروع کیا، کہ اُس نے یہ لکھا ہے، پھر اس کے اُوپر تبصرہ کرتا، تبصرہ کر کے مذاق اُڑاتا، ایک یا دو قسطیں ''پاکستانی'' کے اندر اِس عنوان کے ساتھ آئی ہوں گی کہ ''ماہِ طیبہ'' میں ایک عنوان شروع ہوگیا ''مجرم دیکھا تھانے میں''، اور یہ عنوان قائم کرنے کے بعد اُس نے عنوان کے نیچے لکھا کہ چونکہ ''پاکستانی'' نے یہ عنوان شروع کیا ہے ''اُلٹے بانس بریلی کو''، اور اس میں اعلیٰ حضرت کی عبارات جو کہ صحیح ہوتی ہیں، اچھے مطلب پر محمول ہوتی ہیں، اُن کو لے کر اُن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، تو جب تک وہ عنوان اُس پرچے کے اندر آتا رہے گا، ہمارے اس پرچے کے اندر عنوان آئے گا ''مجرم دیکھا تھانے میں''، اور ہم اس میں اِن کے ''حکیم الاُمت'' کی وہ باتیں آپ لوگوں کو سُنائیں گے جو واقعی قابلِ اِستہزا ہیں۔ تو انہوں نے اس کے مقابلے میں مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کو لے لیا، اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ''تھانہ بھون'' کے رہنے والے تھے تو اس لئے وہیں سے یہ عنوان اُخذ کرلیا ''مجرم دیکھا تھانے میں''، اور مجرم اور تھانے کی مناسبت آپ جانتے ہی ہیں۔ تو اُس وقت میرے دِل میں یہ آیا، میں نے کہا: دیکھو! بسا اوقات دوسرے کو چڑا کر، چھیڑ کر اپنوں کو یوں گالیاں دِلوائی جاتی ہیں، اب میں تو یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ اب ''مجرم دیکھا تھانے میں'' اس عنوان کے تحت جو وہ مذاق اُڑائیں گے، باتیں وہ اپنی جگہ صحیح ہوں گی، لیکن بات کو بگاڑنا اور بگاڑ کر بات بنالینا یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، انسان کو بڑے کرتب آتے ہیں، وہ واقعہ لکھتا، لکھنے کے بعد اُس پہ مذاق اُڑاتا، آخر میں پھر وہ ایک شعر لکھا کرتا تھا، ہر دفعہ واقعہ بیان کرتا، بات لکھتا، لکھنے کے بعد مذاق اُڑاتا، آخر میں لکھتا کہ۔

گر ہمی حکمت و ہمی جدت کارِ اُمت تمام خواہد شد

کیونکہ ہم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ''حکیم الاُمت'' اور ''مجدّد الاُمت'' کہتے ہیں، تو بات نقل کرنے کے بعد یہ الفاظ کہتا، تو انہوں نے اِدھر سے یہ سلسلہ شروع کیا تو جواباً اُنہوں نے شروع کر دیا، اب اس پر جتنا وبال آئے گا اُسی پر ہی آئے گا جس نے اِبتدا کی، اَلْبَادِیْ اَظْلَمُ، اِبتدا کرنے والا بڑا ظالم ہوتا ہے، اگر اُدھر سے اِبتدا پہلے ہوتی اور جواباً یہ کارروائی ہوتی تو پھر بات وہ آتی کہ دیکھو! انہوں نے اپنوں کو بُرا کہلوایا، ہمارے بزرگوں کو بُرا کہہ کر، اور یہاں اِس جزوی واقعے کے تحت، یعنی کلیت پر بحث نہیں،

(۱) جامعہ نعمانیہ کمالیہ، ضلع فیصل آباد میں حضرت حکیم العصرؒ نے ایک سال (۱۳۷۵ھ تا ۱۳۷۶ھ) تدریس فرمائی ہے، اور یہ آپؒ کی تدریس کا پہلا سال تھا۔

اس جزوی واقعے کے تحت گویا کہ ہمارا ''پاکستانی'' سبب بن گیا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا اِستہزا کروانے کا اور مذاق کروانے کا، تو یہ صورت نادانی ہے، یہ عقل مندی نہیں ہے، اگر کوئی تمہیں چھیڑتا نہیں ہے تو تم خواہ مخواہ دوسرے کا چھیڑ کر اپنوں کو برا کہلواؤ، اس طرح سے بات بنواؤ، یہ کوئی حوصلہ افزائی کی بات نہیں، یہ حوصلہ شکنی کی بات ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ہاں! البتہ اگر کوئی برا بھلا کہتا ہے اور جواباً اگر کارروائی کی جائے گی، تو چونکہ اِبتدا اُن کی طرف سے ہے تو اَظلم وہ ہوں گے، اگر چھیڑ ہم چھیڑیں گے، ایسے انداز کے ساتھ کہ جس میں اِشتعال انگیزی ہو، کہ وہ بھی گالی گلوچ پر آمادہ ہو جائیں، تو بادی ہم ہوں گے اور اَظلم ہم ہوں گے۔ تو یہ تمیز سکھائی گئی ہے تبلیغ کے میدان میں کہ کبھی کسی دوسرے کا ایسا اِستہزا نہ اُڑاؤ کہ جس کے نتیجے میں آ کر وہ تمہاری صحیح باتوں کا اِستہزا اُڑانے لگ جائے۔ ''برا بھلا نہ کہو اُن چیزوں کو جن کو پکارتے ہیں یہ مشرک اللہ کے علاوہ، کہ پھر وہ برا بھلا کہنے لگ جائیں گے اللہ کو نادانی کے ساتھ اور جہالت کی وجہ سے حد سے تجاوز کرتے ہوئے'' کیونکہ جب دوسرا آدمی ضد میں آتا ہے، تو ضد میں آنے کے بعد پھر وہ صحیح غلط کی تمیز کیے بغیر ایسی باتیں کرے گا جس سے تمہارے اندر اِشتعال پھیلے۔

کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمْ: ہم نے اسی طرح سے ہر جماعت کے نزدیک اس کے عمل کو مزین کر رکھا ہے، ہر شخص کو اپنے نظریات پسند ہیں، ہر شخص کو اپنا طرز و طریق پسند ہے، اپنی بود و باش پسند ہے، اور ہر کسی کو نظریات پر تعصب ہوتا ہے، تو تم اس طرح سے بات کرو کہ دلیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرو، اُن کا طرزِ فکر بدلنے کی کوشش کرو، جیسے قرآنِ کریم نے بتوں کی تردید کی ہے، دلائل کے ساتھ کی ہے، سنجیدگی کے ساتھ کی ہے، لیکن اِشتعال انگیزی اور گالی گلوچ! یہ برا طریقہ ہے، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے طرز و طریق سے ہر کسی کو محبت ہے، جب تم اس کا مذاق اُڑاؤ گے تو وہ دِفاع کے لئے تیار ہو جائیں گے، وہ تمہارا مذاق اُڑانے لگ جائیں گے، ''ایسے ہی مزین کیا ہم نے ہر جماعت کے لیے ان کے عمل کو، پھر اُن کے رَبّ کی طرف اُن کا لوٹنا ہے، پھر خبر دیں گے ہم انہیں اُس کام کی جو وہ کیا کرتے تھے۔''

منہ مانگا معجزہ نہ دینے کی حکمت

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَہْدَ اَیْمَانِہِمْ: ''اور یہ مشرکینِ مکہ قسمیں کھاتے ہیں پکی قسمیں، کہ اگر آ جائے ان کے پاس نشانی'' یعنی ان کی منہ مانگی، جس قسم کی نشانی یہ مانگتے ہیں ''تو ضرور اُس پر ایمان لے آئیں گے، آپ انہیں کہہ دیجئے کہ آیات کا لانا تو اللہ کے قبضے میں ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو تسلی دی جا رہی ہے، کہ تمہارے دل میں اگر یہ باتیں آتی ہیں کہ نشانی آ ہی جائے، شاید یہ مان جائیں، یہ بات غلط ہے، ''تمہیں کیا پتا جب نشانی آ جائے گی تو یہ ایمان نہیں لائیں گے'' اور منہ مانگا معجزہ ظاہر کر دیا جائے تو پھر وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے جو اس قسم کا معجزہ ظاہر ہونے کے بعد بھی مانتی نہیں، اس لیے ہم اِن کو اس بربادی کی طرف جلدی سے نہیں لے جانا چاہتے، ''ہم پلٹا دیں گے اِن کے دِلوں کو اور ان کی آنکھوں کو، جیسے یہ ایمان نہیں لائے قرآن کے ساتھ پہلی مرتبہ'' سنا اور تکذیب کر دی، یہی کیفیت اِن کی بعد میں پیدا ہو جائے گی، ''اور ہم چھوڑ دیں گے اِن کو اِن کی سرکشی کے اندر بھٹکتے ہوئے۔''

سُبْحَانَکَ اللّٰہُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا

اور اگر بے شک ہم اُتار دیں اُن کی طرف فرشتے، اور باتیں کرنے لگ جائیں اِن لوگوں کے ساتھ مُردے، اور جمع

عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

کردیں ہم ان پر ہر چیز کو آمنے سامنے، نہیں ہیں یہ لوگ کہ ایمان لے آئیں مگر یہ کہ اللہ ہی چاہے

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا

لیکن ان میں سے اکثر جہالت کی حرکتیں کرتے ہیں﴿۱۱۱﴾ اور ایسے ہی ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن بنائے

شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ

انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین، وحی کرتا ہے اُن کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات کو

الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا

دھوکے میں ڈالنے کے لئے، اگر آپ کا ربّ چاہتا تو یہ کام نہ کرتے، آپ انہیں چھوڑ دیجئے اور اس بات کو چھوڑ دیجئے جو یہ

يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

گھڑتے ہیں﴿۱۱۲﴾ اور تاکہ مائل ہو جائیں اس بات کی طرف دل اُن لوگوں کے جو آخرت پر ایمان

بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ

نہیں لاتے، اور تاکہ وہ اس کو پسند کرلیں، اور تاکہ کرتے رہیں وہ وہی کام جس کام کو وہ کرنے والے ہیں﴿۱۱۳﴾ کیا پھر میں اللہ

اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ

کے غیر کو حَکم طلب کروں؟ حالانکہ اللہ وہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اُتار دی اس حال میں کہ وہ کتاب مفصل ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ

اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب اُتاری ہوئی ہے آپ کے ربّ کی طرف سے

بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا

حق کے ساتھ، پس آپ نہ ہوں شک کرنے والوں میں سے﴿۱۱۴﴾ اور پوری ہوگئی آپ کے ربّ کی کلام از روئے صدق کے

وَعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ

اور عدل کے، اللہ تعالیٰ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور وہ سننے والا جاننے والا ہے﴿۱۱۵﴾ اور اگر

تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ

آپ اطاعت کریں گے زمین میں بسنے والوں میں سے اکثر کی تو یہ آپ کو بھٹکا دیں گے اللہ کے راستے سے،

يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ

(زمین میں بسنے والوں میں سے اکثر) نہیں اتباع کرتے مگر ظن کی، اور نہیں ہیں وہ مگر اٹکل چلاتے﴿۱۱۶﴾ بے شک آپ کا رَبّ

اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوْا

خوب جانتا ہے اُس کو جو بھٹکتا ہے اُس کے راستے سے، اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو﴿۱۱۷﴾ پس کھایا کرو تم

مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا

اُس چیز میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام ذکر کردیا گیا اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے ہو﴿۱۱۸﴾ اور تمہیں کیا ہوگیا

لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ

ہے کہ تم نہ کھاؤ اُس چیز میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام لیا گیا ہے، حالانکہ کھول کے بیان کرچکا اللہ تعالیٰ تمہارے لئے

مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ

اُس چیز کو جو اس نے تم پہ حرام ٹھہرائی ہے، سوائے اس چیز کے جس کی طرف تم مضطر ہوجاؤ، اور بے شک بہت سارے لوگ البتہ گمراہ

بِاَهْوَاۗىِٕهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

کرتے ہیں اپنی خواہشات کے سبب سے بغیر علم کے، بیشک آپ کا رَبّ خوب جاننے والا ہے حد سے تجاوز کرنے والوں کو﴿۱۱۹﴾

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ

چھوڑ دو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اُس کے باطن کو بھی، بے شک جو لوگ گناہ کماتے ہیں

سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ

عنقریب بدلہ دیئے جائیں گے اُس کام کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے﴿۱۲۰﴾ اور نہ کھایا کرو اُس جانور میں سے جس کے اُوپر اللہ کا

اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى

نام نہ لیا گیا ہو، ایسے جانور کو کھانا فسق ہے، اور بے شک شیاطین البتہ وحی کرتے ہیں اپنے دوستوں کی

اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

طرف تاکہ وہ (ان کے دوست) تمہارے ساتھ جھگڑا کریں، اگر تم نے اُن کی اطاعت کرلی تو بیشک تم بھی البتہ مشرک ہو جاؤ گے ﴿۱۲۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ: اور اگر بیشک ہم اُتاریں ان کی طرف فرشتے، وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى: اور باتیں کرنے لگ جائیں اِن لوگوں کے ساتھ مُردے۔موتی میت کی جمع ہے۔وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ: اور جمع کردیں ہم ان پر ہر چیز کو، قُبُلًا: یہ مصدر بھی ہوسکتا ہے مُقابلۃً کے معنی میں، پھر اس کا مفہوم ہوگا آمنے سامنے، ''ان کے سامنے ہم سب چیزوں کو جمع کردیں۔'' اور قُبُلًا قبیل کی جمع بھی ہوسکتی ہے، قبیل بمعنی جماعت، گروہ در گروہ کے معنی میں ہو جائے گا، ''جمع کردیں ہم ان پر ہر شئی کو جماعت در جماعت، گروہ در گروہ'' دونوں طرح سے اس لفظ کا مفہوم ذکر کیا جاسکتا ہے، مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا: یہ لَوْ کا جواب ہے۔ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں، نہیں ہیں یہ لوگ کہ ایمان لے آئیں، اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: اِلَّا وقتَ مشیئۃِ اللہ۔اَنْ یہ يَّشَآءَ اللّٰهُ کو مصدر کی تاویل میں کردے گا۔ ''مگر یہ کہ اللہ ہی چاہے، مگر اللہ کے چاہنے کے وقت''، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ: لیکن اِن میں سے اکثر جہالت کی حرکتیں کرتے ہیں، اِن میں سے اکثر جاہل ہیں۔وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ: اور ایسے ہی بنایا ہم نے ہر نبی کے لیے عَدُوًّا: دشمن۔عدوّ لفظوں میں مفرد ہے جس کی جمع اعداء آتی ہے، لیکن یہاں جنس مراد ہے، اس لیے ترجمہ جمع کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے، چونکہ آگے شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یہ اسی عدوّ کا بیان ہے، اور وہ بطور عنوان جمع کے آیا ہے، تو معنیٰ اس کو جمع قرار دے سکتے ہیں۔ ''ایسے ہی ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن بنائے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین'' انسانوں میں سے شیاطین کو اور جنوں میں سے شیاطین کو ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن بنایا۔شیاطین شیطان کی جمع ہے، جس سے مراد شریر، ''جنوں میں سے شریر اور اسی طرح انسانوں میں سے شریروں کو ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن بنایا'' يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ: وحی کرتا ہے ان کا بعض بعض کی طرف، یعنی ان شیاطین کا بعض بعض کی طرف وحی کرتا ہے، زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا: زُخرف سونے کو کہتے ہیں سورۂ زخرف آئے گی، اس کے اندر بھی یہ لفظ آئے گا، اور یہاں زُخرف سے ''قولِ مزخرف'' مراد ہے، مزین کیا ہوا، ملمع کیا ہوا قول۔حقیقت کچھ اور ہو اور اس کے اوپر باہر لیبل کچھ اور لگا دیا جائے اس کو ملمع سازی کہتے ہیں، تو قولِ مزخرف: مزین کی ہوئی بات، سنہری ملمع کی ہوئی بات، زُخرف کو مزخرف کے معنی میں کر لیا جائے گا تو یہ صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے، تو زُخْرُفَ الْقَوْلِ کا معنی ہو جائے گا الْقَوْلِ الْمُزَخْرَفِ مزین بات، ملمع کی ہوئی بات۔ ''وحی کرتا ہے ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات کو دھوکے میں ڈالنے

کے لئے"۔ غُرُوْرًا یہ یُوْحِیْ کا مفعول لہ ہے۔ غَرَّ یَغُرُّ کا معنی ہوتا ہے: دھوکے میں ڈالنا۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ: اگر آپ کا رَبّ چاہتا مَا فَعَلُوْهُ: تو یہ کام نہ کرتے، فَذَرْهُمْ: آپ انہیں چھوڑ دیجئے، وَمَا یَفْتَرُوْنَ: اور اُس بات کو چھوڑ دیجئے جو یہ گھڑتے ہیں، ان کو اور ان کے جھوٹ کو رہنے دیجئے، یعنی اِن کو ان کے جھوٹ کے ساتھ رہنے دیجئے، افتراء: جھوٹی بات گھڑنا۔ وَلِتَصْغٰۤى اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: وَلِتَصْغٰۤى کا عطف غُرُوْرًا کے اوپر ہے، کیونکہ لام کے بعد اَنْ مقدر ہے تو یہ بھی مصدر کی تاویل میں ہو جائے گا، یا غُرُوْرًا کے اندر مفعول لہ کا معنی ظاہر کرنے کے لئے اس کو فعل کی تاویل میں کر سکتے ہیں لِیَغُرُّوْا وَلِتَصْغٰۤى اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ: دھوکا دینے کے لیے اور اس مقصد کے لیے تاکہ مائل ہو جائیں اُس بات کی طرف دل ان لوگوں کے جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ تصغی مائل ہو جائیں، اَفْـِٕدَةُ فُؤَاد کی جمع ہے، فُؤَاد دل کو کہتے ہیں۔ "مائل ہو جائیں اس بات کی طرف، اس مزین بات کی طرف، قلوب ان لوگوں کے، دل ان لوگوں کے جو کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے" وَلِیَرْضَوْهُ: تاکہ وہ اس کو پسند کر لیں وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ: تاکہ کرتے رہیں وہ وہی کام جس کام کو وہ کرنے والے ہیں، اپنی کارروائیاں جاری رکھیں، اقتراف اکتساب کے معنی میں ہوتا ہے، تاکہ کرتے رہیں وہ وہی کام جو وہ کرنے والے ہیں، اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا: کیا پھر میں اللہ کے غیر کو حکم طلب کروں؟ حکم: فیصلہ کرنے والا، وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا: حالانکہ اللہ وہ ہے جس نے کہ تمہاری طرف کتاب اُتاردی اس حال میں کہ وہ کتاب مفصل ہے، ضروری باتیں اس میں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں، وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ: اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن، یہ کتاب اتاری ہوئی ہے آپ کے رَبّ کی طرف سے حق کے ساتھ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ: پس آپ نہ ہوں شک کرنے والوں میں سے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا: اور پوری ہوگئی آپ کے رَبّ کی کلام۔ کلمہ سے یہاں کلام مراد ہے۔ تام ہوگئی، کامل ہوگئی آپ کے رَبّ کی کلام از روئے صدق کے اور عدل کے۔ صدق کا معنی ہوتا ہے کسی بات کا واقع کے مطابق ہونا، یعنی اِس کلام کے اندر جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ سچائی کے ساتھ موصوف ہیں، وہ سارے کے سارے موافق للواقع ہیں، اس کے اندر کوئی بات خلاف واقع نہیں ہے، اور عدل برابری کرنے کو کہتے ہیں، تو جس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ کتاب للہ کے اندر جو اَحکام بیان کیے گئے ہیں ان میں کسی کی حق تلفی نہیں کی گئی، وہ عدل ہی عدل ہے، انصاف ہی انصاف ہے، اس میں سب کے حقوق کی برابر رعایت رکھی گئی ہے، اس میں کسی کی حق تلفی نہیں، تو عدل کے اعتبار سے بھی یہ کلام تام ہے۔ اور عدل اعتدال کے معنی میں بھی ہوتا ہے، کہ اس میں افراط وتفریط نہیں، کہ بالکل انسانی خواہشات کی تبع ہو، یا بالکل انسانی خواہشات کے خلاف ہو ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اس میں اعتدال ہے، فطرت کی اس میں رعایت رکھی گئی ہے، اور ناجائز قسم کی خواہشات کی رعایت نہیں کی گئی، ناجائز قسم کی خواہشات سے یہ ٹکراتی ہے اور فطری خواہشات کی تائید کرتی ہے اور اس کے یہ موافق ہے، اس اعتبار سے یہ معتدل ہے، اس میں افراط وتفریط نہیں ہے، تو رَبّ کی کلام کا تام ہونا واقعات کے اندر صدق کے اعتبار سے ہے اور اَحکام کے اندر عدل کے اعتبار سے ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ: اللہ تعالیٰ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ: اور اگر آپ اطاعت کریں گے مَنْ فِی

الْاَرْضِ میں سے اکثر کی، جو لوگ زمین میں موجود ہیں ان میں سے اگر آپ اکثر کی اطاعت کریں گے یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: تو یہ آپ کو بھٹکا دیں گے اللہ کے راستے سے، اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: یَتَّبِعُوْنَ کی ضمیر اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ زمین میں بسنے والوں میں سے اکثر نہیں اتباع کرتے مگر ظن کی۔ ظن سے مراد محض خیال، جس کی دلیل کوئی نہ ہو۔ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ: اور نہیں ہیں وہ مگر اٹکل چلاتے۔ خرص کا معنی ہوتا ہے اٹکل کے طور پر بات کرنا جس کی بنیاد کوئی نہ ہو۔ تو زمین میں بسنے والوں میں سے اکثر عقائد کے درجے میں محض توہمات اور خیالات کے متبع ہیں، اور اقوال کے درجے میں اٹکل چلاتے ہیں، عقیدے بھی ان کے ظن وتخمین پہ مبنی ہیں، باتیں بھی ان کی خرص اور اٹکل پہ مبنی ہیں، نہ عقیدہ کسی دلیل پر مبنی، نہ یہ جو باتیں کرتے ہیں ان باتوں کی کوئی دلیل، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ: بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اس کو جو بھٹکتا ہے اس کے راستے سے، وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ: اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو۔ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ: پس کھایا کرو تم اس چیز میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام ذِکر کر دیا گیا۔ مَا سے یہاں ذبیحہ مراد ہے۔ اس ذبیحے میں سے کھالیا کرو جس کے اُوپر اللہ کا نام ذِکر کر دیا گیا، اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ: اگر تم اللہ کی آیات کے ساتھ ایمان لانے والے ہو، وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ: اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نہ کھاؤ اس چیز میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام لیا گیا ہے، وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ: حالانکہ کھول کے بیان کر چکا اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اس چیز کو جو اس نے تم پہ حرام ٹھہرائی ہے اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ: سوائے اس چیز کے جس کی طرف تم مضطر ہو جاؤ، یعنی محرمات میں سے بھی وہ چیز جس کی طرف تم مضطر ہو جاؤ وہ بھی محرمات میں سے خارج ہو جاتی ہے اور وہ بھی حلال ہو جاتی ہے، اس کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے، ''مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ'' وَاِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ: اور بیشک بہت سارے لوگ البتہ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشات کی وجہ سے۔ اھواء ھویٰ کی جمع ہے، خواہش، یعنی دل کی خواہشات جس کے اُوپر کوئی دلیل موجود نہیں۔ ''البتہ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشات کے سبب سے'' بِغَیْرِ عِلْمٍ: بغیر علم کے، بغیر تحقیق کے، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ: بے شک آپ کا رب وہ زیادہ جاننے والا ہے حد سے تجاوز کرنے والوں کو، حد سے تجاوز کرنے والوں کو وہ خوب اچھی طرح سے جاننے والا ہے۔ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ: ذَرُوْا یہ اَمر کا صیغہ ہے، ذَرْ ذَرُوْا۔ چھوڑ دو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی، یعنی جو اس کا حصہ چھپا ہوا ہے دل میں، دل کے اندر کوئی بُرا عقیدہ ہے یہ باطنِ اِثم ہے، اور اس کے مطابق عمل کرنا ظاہرِ اِثم ہے۔ دل کے خیالات بھی ٹھیک کر لو، دل میں بھی معصیت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے حکم خلاف کوئی عقیدہ اختیار نہ کیا جائے، اور جو ظاہر ہے، ظاہری عمل ہے اس کو بھی ترک کر دو، ''چھوڑ دو ظاہرِ گناہ کو اور باطنِ گناہ کو'' اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ: بے شک جو لوگ گناہ کماتے ہیں، کسبِ اِثم کرتے ہیں، گناہ کا اِرتکاب کرتے ہیں، سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ: عنقریب بدلہ دیے جائیں گے اس کام کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اقتراف کا لفظ پہلے بھی گزرا ہے، اکتساب کے معنی میں ہے، وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ: اور نہ کھایا کرو اس جانور میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اللہ کا نام نہ ذِکر کیا گیا ہو، وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ: ایسے جانور کو کھانا فسق ہے، نافرمانی ہے، ایسے جانور کو کھانا جس کے اُوپر اللہ کا نام نہیں لیا گیا یہ فسق ہے، نافرمانی ہے، وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـئِهِمْ: اور

بیشک شیاطین البتہ وحی کرتے ہیں اپنے دوستوں کی طرف لِيُجَادِلُوْكُمْ: تا کہ ان کے دوست تمہارے ساتھ جدال کریں، جھگڑا کریں، وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ: اگرتم نے ان کی اطاعت کرلی اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ: بے شک تم بھی البتہ مشرک ہو جاؤ گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللهَ. اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

تفسیر

ماقبل سے ربط... مشرکین کا منہ مانگی نشانی سے مقصد

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ: اس کا تعلق پچھلے مضمون کے ساتھ ہے جو اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ سے شروع ہوا تھا، کل کے سبق کے آخر میں یہ بات آئی تھی، کہ وہ مشرک لوگ قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے، کہ اگر ہماری مرضی کے مطابق آیت واضح کر دی جائے، نشانی دکھادی جائے، تو پھر ہم ایمان لے آئیں گے، اور یہ کہہ کر اصل کے اعتبار سے وہ ایک سیاسی فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے، ایک تو اپنے معتقدین کے ذہنوں پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ دیکھو! ہم منصف ہیں، کہ اگر ہماری مرضی کے مطابق ہمیں اس بات کی تحقیق کروادی جائے تو اس کو ہم ماننے کے لئے تیار ہیں، گویا کہ ہم نے ایک شرط بدلی (باندھ لی) ہے، اگر کوئی اس شرط کو پورا کردے کہ ہماری مرضی کے مطابق نشانی دکھادے تو ہمارے دل میں کوئی تعصب نہیں ہے ہم مان جائیں گے، اور دوسرے جو ایمان لانے والے لوگ تھے مؤمنین، ان میں سے جو کمزور لوگ تھے اُن کے دل دماغ پر بھی اثر ڈالنا مقصود ہے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اُن کے دِل میں بھی یہ بات آئے گی کہ جب اِن کا ایمان لانا مطلوب ہے، اور صبح شام کوشش کی جارہی ہے کہ کسی طرح سے مان جائیں، تو پھر ان کی مرضی کے مطابق اِن کو تحقیق کیوں نہیں کروادی جاتی، وہ دوطرفہ یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے، اپنے معتقدین پر بھی اور دوسروں پر بھی۔

مشرکین کو منہ مانگی نشانیاں کیوں نہیں دِکھائی گئیں؟

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت یہ نہیں تھی کہ اُن کو منہ مانگا معجزہ دکھادیا جائے، حکمت کیوں نہیں تھی؟ اس لئے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ محض ایک وقتی بات ہے جو یہ کررہے ہیں، ورنہ ان کے دل میں جس طرح سے ضد اور عناد بھرا ہوا ہے، اگر اِن کی مرضی کے مطابق بھی معجزہ دکھادیا گیا تو اس میں بھی کوئی نہ کوئی بات نکالیں گے، اور نکال کر اُس کا انکار کریں گے، ایمان تو انہوں نے لانا نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے طور پر یہ عادت رکھی ہے کہ جب کسی قوم کو اُس کی مرضی کے مطابق معجزہ دکھادیا جائے پھر وہ نہ مانے تو پھر اُس کو کلیۃً نیست ونابود کردیا جاتا ہے، اور اِن کو نیست ونابود کرنا ابھی اللہ کی حکمت کا تقاضا نہیں تھا۔ دوسرے یہ ایک فطری اصول ہے کہ ایک شخص ایک دعویٰ کرتا ہے، مدّعی ہے، مثلاً آج کل عدالت کے اندر ایک شخص جا کر کسی پر کوئی دعویٰ کردے، اُس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے گواہ تو پیش کرنے ضروری ہیں، دلیل تو دینی ضروری ہے اپنے مدّعا کو ثابت کرنے کے لئے، لیکن مدعاعلیہ کی مرضی کے مطابق دلیل قائم کرنا یہ دُنیا کی کسی عدالت کا اُصول نہیں ہے، مثلاً مدعاعلیہ کا یہ فرض تو ہے، یہ حق

ہے کہ مدعی نے جو اپنے دعوے کے اثبات کے لئے دلیل پیش کی ہے وہ اُس پر جرح کرے، جو گواہ پیش کئے ہیں اُن گواہوں کا ناقابلِ اعتماد ہونا ثابت کرے، تو پھر مدعی کا دعویٰ ثابت نہیں ہوگا، لیکن مدعا علیہ کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ یوں کہے کہ یہ گواہ تو میں مانتا نہیں، فلاں فلاں شخص گواہی دے دے تو میں ماننے کے لئے تیار ہوں، دُنیا کی کوئی عدالت مدعا علیہ کو یہ حق نہیں دیتی کہ گواہوں کی تعیین وہ اپنی مرضی سے کرے، اسی طرح سے سرورِ کائنات ﷺ نے جب دعویٰ رسالت کیا، دعویٰ نبوت کیا اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا اعلان کیا تو اس کے اُوپر دلیل دینا یہ تو ایک منصب کا تقاضا ہے، باقی اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق دلیل کا مطالبہ کرے اور اُس کی دلیل پوری کردی جائے، اُس کے مطابق چلا جائے تو پھر تو سارے کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا، ہر شخص آزمانے کی کوشش کرے گا کہ دیکھئے ہماری مرضی کے مطابق معجزہ ظاہر ہوتا ہے یا نہیں؟ تو اُلٹ پلٹ قسم کے مطالبے ہوں گے، اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں ہوں گی، کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ کہے گا، پھر لوگوں کے پیچھے پیچھے حق کو کہاں کہاں لئے پھریں گے؟ جیسے کہ دوسری جگہ قرآنِ کریم میں آتا ہے، کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (سورۂ مؤمنون:۷۱) اگر حق کو ان کی خواہشات کے پیچھے لگا دیا جائے تو پھر تو زمین وآسمان کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا، اب دوپہر کے وقت ایک آدمی مطالبہ کر بیٹھے کہ میں تب مانوں گا کہ ابھی رات موجود کر کے دِکھاؤ، اور آدھی رات کو کوئی شخص مطالبہ کیے بیٹھا ہو کہ میں تب مانوں گا کہ ابھی سورج چڑھا کر دِکھاؤ، اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے کہ جو شخص کہے کہ ایسا معجزہ دِکھاؤ تو مانوں گا، تو اس معجزے کو اُس کے سامنے ظاہر کیا جائے، تو ہر شخص کی اپنی اپنی مرضی ہوگی، جتنے منہ اتنی باتیں، تو کہاں ان باتوں کو اِن کے پیچھے پیچھے لئے پھریں گے؟ اس لئے ایک اُصولی جواب دے دیا گیا سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے، کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کرتے ہو، صاف صاف بات ہے، یہ میرے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ قادر ہے ہر قسم کا معجزہ دکھا سکتا ہے، ہر قسم کی نشانی واضح کرسکتا ہے، لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، میں تو منذر بن کر آیا ہوں، مبشر بن کر آیا ہوں، میں تو اللہ کی طرف سے جو باتیں اُترتی ہیں اُنہی کو تمہارے سامنے واضح کرتا ہوں، باقی! اللہ کی حکمت ہوگی تو معجزہ ظاہر کردے گا، نہیں ہوگی تو نہیں کرے گا، میں تمہارا یہ چیلنج قبول نہیں کرسکتا، جو شرط تم لگا رہے ہو میں اس شرط کے اُوپر اُترنے کے لئے تیار نہیں ہوں، کیونکہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

مؤمنین کو تسلی

اور پھر وہ مسلمان جن کے دل میں یہ خیال آتا تھا، کہ اِن کی یہ شرط پوری کردینی چاہیے، شاید یہ مان جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو کہا تھا وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (سورۂ انعام:۱۰۹) تمہیں کیا پتا؟ تم ان کی ظاہری باتوں میں نہ آؤ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم مخلص ہیں، جب یہ بات پوری ہو جائے گی ہم تسلیم کرلیں گے، تمہیں کیا پتا کہ جب یہ نشانی آجائے گی تو بھی یہ نہیں مانیں گے، اور ان کا نہ ماننا ایسے ہی ہوگا کہ جب پہلے ان کے سامنے حق پیش ہوا تو انہوں نے ضد وعناد کے طور پر اس سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنے دلوں کو ادھر متوجہ نہیں ہونے دیا، اسی طرح سے بعد میں بھی اللہ تعالیٰ اِن کی آنکھیں پھیر دے گا اور اِن کے دلوں کو پلٹا دے دے گا، جیسے کہ اللہ کی عادت ہے کہ جب کوئی شخص کسی اُلٹے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے سامنے وہی راستہ واضح

کر دیتے ہیں، چونکہ ہر کیفیت کا خالق اللہ ہے، اس لئے اس گمراہی کی اور اس قسم کی چیزوں کی نسبت بسا اوقات اللہ کی طرف بھی کر دی جاتی ہے کہ اللہ نے بھٹکا دیا، کیونکہ جب ایک آدمی اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہوا کوئی ٹیڑھی چال چلنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے اختیار دے دیتے ہیں تو خلق کے اعتبار سے نسبت اللہ کی طرف کر دی جاتی ہے، کہ جیسے پہلے حق پیش ہو جانے کے بعد انہوں نے حق کو قبول نہیں کیا بلکہ آنکھیں پھیر لیں اور اپنے دلوں کو دوسری طرف کر لیا، ایسے ہی ان کی پھر بھی آنکھیں پھر جائیں گی اور ان کے دل پلٹا کھا جائیں گے، اور یہ سرکشی میں طغیانی میں جس طرح سے پہلے ہیں ویسے بھٹکتے پھریں گے، اگلی آیت اسی مضمون سے تعلق رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیں، فرشتے آ جائیں، جیسے کہ ان کا مطالبہ ہے جیسے اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیْلًا (سورۂ اسراء: ۹۲) کچھ اس قسم کے الفاظ بھی قرآنِ کریم میں آتے ہیں، وَکَلَّمَہُمُ الْمَوْتٰی: یا ان کے ساتھ مردے باتیں کرنے لگ جائیں، جس طرح سے یہ کہتے ہیں فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ (سورۂ دخان: ۳۶) ہمارے آباؤ اجداد کو لے آؤ ہمارے سامنے، یعنی جو مر گئے اُن کو زندہ کر کے دکھا دو، وہ مردے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگ جائیں، ''لَوْ'' بالفرض کے لئے ہوتا ہے، اگر بالفرض ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے کہ فرشتے اُتار دیئے جائیں، مردے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگ جائیں وَحَشَرْنَا عَلَیْہِمْ کُلَّ شَیْءٍ: کُلَّ شَیْءٍ سے مراد ہیں مغیبات جو ان کی آنکھوں سے غائب ہیں، جنت، دوزخ اور جتنی مخلوق غائب ہے، ہر چیز ہم ان کے سامنے گروہ در گروہ لے آئیں، جماعت در جماعت لے آئیں، یا قُبُلًا کا معنی ہے مقابلۃً، آمنے سامنے ہم پیش کر دیں مَا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْٓا: یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں، اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ: اِلَّا وَقْتَ مَشِیْئَۃِ اللّٰہِ ہاں! اللہ کے چاہنے کے وقت، اور اللہ چاہتا ہے تو اپنی کسی حکمت کے تحت ہی چاہتا ہے، اور اللہ چاہے تو پھر کون نافرمانی کر سکتا ہے؟ پھر تو اللہ تعالیٰ زبردستی چلا دے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جب اختیار دیا ہے تو اس کا اختیار کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف بھی ہوگا، کوئی مانے گا کوئی نہیں مانے گا، ''مگر یہ کہ اللہ چاہے'' وَلٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ یَجْہَلُوْنَ: ان میں سے اکثر لوگ جاہل ہیں، جہالت کی حرکتیں کرتے ہیں، ماننا ان کا مقصود نہیں ہے، ماننے کا ان کا ارادہ نہیں ہے، اور خواہ مخواہ اس قسم کے مطالبے کر کے بات کو بگاڑتے ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا: اس آیت کا تعلق سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے ساتھ ہے، کہ یہ لوگ جو آپ کی مخالفت کرتے ہیں یہ نئی بات نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی جب بھی کوئی نبی آیا تو انسانوں میں سے شریر اور جنوں میں سے شریر ہمیشہ اُس نبی کے دشمن ہوئے، اور اُسی اصول کے مطابق یہ آپ سے دشمنی کرتے ہیں، تو بالکل پروا کرنے کی بات نہیں ہے، ''ایسے ہی'' یعنی جیسے آپ کے ساتھ یہ لوگ عداوت سے پیش آ رہے ہیں، شرارتیں کر رہے ہیں، ''اسی طرح سے ہم نے انسانوں میں سے شیاطین کو اور جنوں میں سے شیاطین کو، شریر طبقے کو ہر نبی کے لئے دشمن بنایا'' پھر وہ دشمنی ظاہر کس طرح سے کرتے ہیں؟ دشمنی ظاہر اس طرح سے کرتے ہیں کہ بعض بعض کے دل میں بات ڈالتا ہے، شریر انسان شریر انسان کے دل میں بات ڈالتا ہے کان کے

راستے، شریر جن دوسرے جنوں کو بھڑکاتا ہے، یا جن جو ہے وہ انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے، ساری صورتیں پائی جاتی ہیں، انسانوں میں جو شیطان ہیں وہ دوسرے انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں، کان کے راستے بات ان کے دل میں ڈال دی، جو ایک وسوسے کی صورت اختیار کرگئی جو برائی کی طرف داعی ہوتی ہے،''اِن کا بعض بعض کی طرف وحی کرتا ہے'' یعنی چپکے چپکے باتیں سکھلاتے ہیں ایک دوسرے کو،''وحی کرتا ہے'' کس چیز کی وحی کرتا ہے؟ زُخْرُفَ الْقَوْلِ: مزین باتوں کی، بظاہر دیکھنے میں وہ باتیں اچھی لگتی ہیں، سجی سجائی باتیں ہیں، ملمع شدہ، جن میں حقیقت کچھ نہیں ہوتی لیکن اُس کے اوپر الفاظ اچھے استعمال کیے جاتے ہیں، لیبل ان کے اُوپر اچھا لگا لیا جاتا ہے،''وحی کرتے ہیں دھوکا دینے کے لئے'' یہ اِن کی عادت ہے ایک دوسرے کو بہکانا اور ایک دوسرے کو اکسانا حق کے خلاف، اور سجی سجائی باتیں ایک دوسرے کے کان میں ڈالتے ہیں۔ وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ: اگر آپ کے رَبّ کی مشیت ہوتی تو یہ ایسا نہ کرتے، اللہ تعالیٰ زبردستی اِن کو ہر نبی کا متبع بنا دیتا، لیکن یہ اللہ کی مشیت نہیں ہے، تو جب اللہ کی مشیت کے تحت یہ اختلافات پیش آرہے ہیں، زبردستی سب کو ایک راستے پر چلانا مقصود نہیں، تو اِن کی عداوت سے آپ گھبرائیے نہیں، فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ: ان کو اِن کے جھوٹ کے ساتھ ہی چھوڑ دیجئے، جو یہ جھوٹ بولتے ہیں، بُری بُری باتیں کرتے ہیں، خلافِ دلیل اپنے عقائد بنائے ہوئے ہیں، اور زبان سے باتیں کرتے ہیں اِن کی پروانہ کیجئے، اِن کو اِن کے جھوٹ کے ساتھ ہی رہنے دیجئے، یہ حضور ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ اور یہ وحی جو کرتے ہیں دھوکا دینے کے لئے، تاکہ دین سے پھیریں، اس طرح سے اِن کا مقصد یہ ہے کہ''مائل ہوجائیں اُس بات کی طرف دل ان لوگوں کے جوکہ آخرت پر یقین نہیں لاتے'' کیونکہ زیادہ تر شیطان کا وسوسہ وہی لوگ قبول کرتے ہیں جن کا آخرت کے متعلق عقیدہ صحیح نہیں ہوتا، آخرت کی فکر نہیں ہوتی،''مائل ہوجائیں اُس کی طرف دل اُن لوگوں کے جوکہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے''، وَلِيَرْضَوْهُ: تاکہ عقیدے کے درجے میں وہ اس بات کو پسند کرلیں، وَلِيَقْتَرِفُوْا مَاهُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ: اور تاکہ عملی زندگی کے اندر بھی اسی کے مطابق ہی عمل کریں، تاکہ لگے رہیں وہ ان کاموں میں جو وہ کرتے ہیں، یعنی بعض کا بعض کے دل میں وسوسے ڈالنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن کو دھوکا دے دیں اور اُن کے قلوب اُدھر مائل ہوجائیں خیالات کے درجے میں، عقیدے کے درجے میں اس بات کو پسند کرلیں، اور عمل کے درجے میں بھی اس کو اپنالیں، یہی ان کا مقصد ہے جو غلط باتیں ایک دوسرے کی طرف ڈالتے رہتے ہیں۔ ان آیات کا تعلق تو سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی سے تھا۔

حضور ﷺ کی رِسالت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی اور اس کی صورتیں

آگے یہ کہا جارہا ہے کہ اِس وقت مختلف فیہ مسئلہ حضور ﷺ کے درمیان اور مشرکین کے درمیان توحید ہے اور سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت ہے، اب اس مختلف فیہ مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے کیا طرز اختیار کیا جائے؟ جب دو آدمیوں کے درمیان میں ایک جھگڑا ہوجاتا ہے تو کسی تیسرے سمجھدار آدمی کے سامنے اس واقعہ کو پیش کردیا جائے تو وہ فیصلہ کردے، جیسے شروع

سورت میں یہی چیز پیش کی گئی تھی۔ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً: کون سی چیز بڑی ہے از روئے شہادت کے؟ اور پھر آگے خود ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب تلقین کیا گیا کہ قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اللہ کی گواہی سب سے بڑی ہے، تو جو بات اللہ تعالیٰ کی گواہی کے ساتھ ثابت ہو جائے گی اس کے بعد اختلاف ختم ہو جانا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ نے گواہی دے دی آیاتِ تنزیلیہ کے ساتھ بھی اور آیاتِ آفاقیہ کے ساتھ بھی، وحدانیت پر بھی واضح دلائل بیان کر دیئے، جس طرح سے پیچھے رکوع سارے کے سارے گزرے، کائنات جوّ اور آسمان کی طرف کی کائنات، زمین کی طرف کی، اور دلیل انفسی اور دلیل آفاقی ہر قسم کی واضح کر دی گئی، جس کے ساتھ سرورِ کائنات ﷺ کی زبان سے توحید کا اظہار بھی ہو گیا، اثبات بھی ہو گیا، اور یہی آپ کی نبوّت اور رِسالت کی دلیل بھی بن سکتی ہے، جس طرح سے تفصیل آپ کے سامنے ذِکر کر دی گئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی شہادت کے اُوپر مطمئن نہ ہو تو اُس کے ساتھ اور اِس سے بڑی شہادت کیا لائی جائے؟ تو اور کون سا غیر ہے کہ جس کے پاس ہم اس مسئلے کو لے جائیں اور وہ ہمارا فیصلہ کر دے؟ یہی بات اب آگے کہتے ہیں، اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا: کیا میں اللہ کے غیر کو حَکَم تلاش کروں؟ (حَکَم: فیصلہ کرنے والا) کہ اللہ کے فیصلے پر تو ہم مطمئن نہ ہوں، اور اللہ کے غیر کو ہم فیصل بنائیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ سنا چکا اس کتاب کو نازل کر کے۔

قرآن کی خصوصیات اور اس کی حقّانیت پر منصف اہلِ کتاب کی شہادت

اور یہ کتاب اللہ کی کلام ہے، اس لئے اس کتاب کی خصوصیات واضح کی جا رہی ہیں، جن سے معلوم ہو گا کہ واقعی یہ اللہ کی اُتاری ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جو بات اس کتاب کے اندر واضح کر دی وہ اللہ کی شہادت کے ساتھ ثابت ہو گئی۔ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا: اللہ وہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری، جس کی پہلی شان تو یہ ہے کہ وہ مفصل ہے، ضروری ضروری باتیں، عقائد ضروریہ، بنیادی باتیں جو اصول کے درجے میں ہیں وہ کھول کھول کر بیان کر دی گئیں، جس میں کوئی خفاء نہیں ہے، یہ کتاب اپنے مدّعا کو خوب اچھی طرح سے واضح کرتی ہے، اور عقائد کے درجے کی چیزیں اصول کے درجے کی چیزیں نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کر دی گئی ہیں۔ ایک بات! دوسری بات یہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ: اہلِ کتاب میں سے جو منصف لوگ ہیں وہ بھی شہادت دیتے ہیں، کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے اُتری ہوئی ہے، جب اُن کی طرف سے بھی شہادت ہو گئی تو یہ بھی اس کی حقّانیت کی ایک دلیل ہے، اور اہلِ کتاب میں سے جو منصف تھے وہ اس کتاب کو سننے کے بعد ایمان لے آئے، جیسے اس کا ذِکر آپ کے سامنے کئی دفعہ ہوا، "اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی وہ جانتے ہیں کہ یہ آپ کے رَبّ کی طرف سے اُتاری ہوئی ہے ٹھیک ٹھیک" فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ: پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں، اس میں بظاہر اگرچہ خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے، لیکن آپ کو سامنے رکھ کر سنانا دوسروں کو مقصود ہے، کہ اس کتاب کے اُتر آنے کے بعد اب کسی شک کی گنجائش نہیں، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب نازل ہو گئی، یہ اس کا لکھا لکھایا فیصلہ ہے، جو بات اس کتاب کے اندر کہہ دی گئی

بس وہی صحیح ہے، اب اللہ کے فیصلے کو نہ مانا جائے اور کسی دوسری طرف ہم بھاگیں یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے، یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی جو اپنے مفہوم کو خوب اچھی طرح سے بیان کرتی ہے، اور اس کے حق ہونے کے اُوپر اہلِ کتاب کے منصف علماء بھی شہادت دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی شانِ تمامیت

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا: یہ بھی اس کتاب کی شان ہے، کہ آپ کے ربّ کی کلام جو کہ اس کتاب کی شکل میں نازل ہوئی ہے یہ تمامیت کو پہنچی ہوئی ہے، یہ تام ہے، کامل ہے از روئے صدق کے اور عدل کے، یعنی اس کتاب میں بعض تو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ واقع کے مطابق ہیں، اُن میں کوئی کسی قسم کا کذب نہیں ہے، وہ صدق ہی صدق ہے، تاریخی حقائق جتنے بیان کئے گئے ہیں اُن کے اندر کوئی کسی قسم کا کذب کا شائبہ نہیں ہے، اور جو آیات اس میں احکام کی ہیں وہ عدل پر مشتمل ہیں، عدل کا مفہوم دونوں طرح سے آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا، کہ نہ تو اس میں کسی کی حق تلفی ہوتی ہے، اور نہ اُس کے اندر کوئی افراط وتفریط ہے، حقوق کی حفاظت کی گئی ہے، ہر کسی کا حق ادا کر دیا گیا، کسی کے حق کو تلف نہیں کیا گیا، اس لئے اس میں ظلم کا شائبہ نہیں، اور پھر اس میں کوئی افراط وتفریط نہیں، بالکل فطری امور کے ساتھ یہ کتاب ٹکراتی اور اس کے اَحکام فطرت کے خلاف ہوتے یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں تھی، اور بالکل انسانی خواہشات کے مطابق ہو جائے ایسا بھی نہیں ہے، بلکہ یہ معتدل ہے، فطری خواہشات کی اس میں رعایت رکھی گئی ہے، اور غیر فطری خواہشات کو اس میں ختم کیا گیا ہے، عدل اور اعتدال کو لئے ہوئے ہے۔

قرآنِ کریم کی شانِ محفوظیت

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ: یہ بھی اس کتاب کی ایک شان ہے، کہ اللہ کے کلمات جو کہ اس کتاب کی شکل میں آئے ہیں کوئی شخص ان کو بدل نہیں سکتا، ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، اس کے لئے تبدیلی نہیں ہے۔ اب ایک تبدیلی تو ہے انسانوں کی طرف سے کہ اس میں تحریف کر دیں، اور تحریف کر کے اس کی حقیقت کو بدل کر رکھ دیں، ایسا بھی نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (سورۂ حجر: ۹) یہ حفاظت اللہ تعالیٰ نے کر لی، اور آنے والے دور نے ثابت کر دیا کہ واقعی یہ حقیقت ہے کہ اللہ اس کا محافظ ہے، چودہ سو سال کے اندر ہر قسم کے دشمن اس کتاب کے پیدا ہوئے، ہر قسم کے اسباب کے ساتھ وہ لیس تھے، اور مخالفت کرنے کے ہر قسم کے ہتھیار ان کو حاصل تھے، لیکن اس کتاب کی حقیقت کو وہ تبدیل نہیں کر سکے، کسی ایک شوشے کو بدل نہیں سکے، زیر اور زبر کا فرق نہیں ڈال سکے، چودہ سو سال کی تاریخ اس بات کے اُوپر شاہد ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ چونکہ آخری نبی ہیں، اور آپ ﷺ کے بعد دوسرا کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، تو اللہ کی طرف سے بھی اس کلام کو منسوخ نہیں کیا جائے گا، اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے، انسانوں کی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر کوئی نسخ نہیں آئے گا۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ تو یہ تو ہے اس کتاب کی حقیقت، اپنی دلیل کے ساتھ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی کتاب ثابت ہوتی ہے، اور جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔

حق پہچاننے کے لئے اکثریت کا اُصول غلط ہے

اکثریت اگر اس اُصول کا انکار کرے اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو اکثریت سے آپ مرعوب نہ ہوں، افرادی اکثریت کوئی مرعوب ہونے کی چیز نہیں، اگر آپ دُنیا کے اُوپر نظر ڈالیں گے تو آپ کو ایسے ہی نظر آئے گا کہ ہر دور میں انسانوں کی اکثریت راستے سے بھٹکی ہوئی ہوتی ہے، اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں، جب بھی کوئی حقیقت نمایاں کی جاتی ہے تو اس سوسائٹی کے جتنے لیڈر ہوتے ہیں، اُس وقت کے موجود لوگوں میں سے جو شریر طبقہ ہوتا ہے، اور جن کو معاشرے کے اندر کسی قسم کی برتری حاصل ہوتی ہے، وہ اس حق کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے کہ اس حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد اُن کی سیادت اور قیادت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، کہ ایک نظریہ قائم کر کے وہ اس کی قیادت کر رہے ہیں، اور ایک معاشرہ قائم کر کے اس کے اندر وہ ریاست قائم کئے ہوئے ہیں، اور اس کے خلاف ایک حقیقت ظاہر ہوگئی، اب اس حقیقت کے ساتھ یہ معاشرہ ٹوٹے گا، اس نظریے کی تردید ہوگی، تو اُن کی قیادت اور سیادت بھی ختم ہو جائے گی، لیڈر طبقہ اور جو بالا دست لوگ ہوتے ہیں وہ تو اس لئے اس حقیقت کے ساتھ ٹکراتے ہیں، کہ اُن کی شخصیت کو نقصان پہنچتا ہے، اُن کی قیادت زائل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور عوام اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی طریقے سے مانوس ہوتے ہیں، جب اُن کے دل میں اپنے آباء کی عظمت ہوتی ہے، تو اُن کے طریقے کی بھی عظمت ہوتی ہے، اُن کے سامنے سب سے پہلے یہ بات آتی ہے کہ اگر ہم نے اس اُٹھنے والی حقیقت کو قبول کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے آباء غلط تھے؟ ہم اپنے آباء کو گمراہ کس طرح سے مان لیں اور اُن کو غلط کس طرح سے کہہ دیں، تو آباء کی عظمت جو قلب کے اندر بیٹھی ہوئی ہوتی ہے وہ اُن کے طریقے کو چھوڑنے نہیں دیتی، اس لئے اکثریت جو ہے وہ حقیقت سے ٹکرا جاتی ہے، تو کسی حقیقت کو پہچاننے کا یہ اُصول نہیں کہ اس کے ساتھ افرادی اکثریت ہے یا نہیں، بلکہ دیکھنا چاہئے کہ فی حد ذاتہٖ اس بات کی کیا حیثیت ہے؟ اور اگر خارجی طور پر اس کی تائید چاہیئے تو اس فن کے جاننے والے سمجھدار طبقے کی رائے اس کے موافق ہونی چاہیے، اور جو اس فن کے نہیں ہیں اور اس حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اُن کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہاں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی کتاب ٹھیک اور خارجی طور پر اہلِ علم بھی اس کے حق ہونے پر شہادت دیتے ہیں، وہ بات اپنی جگہ حق ثابت ہوگئی، اب اگر اکثریت اس کے خلاف کرتے ہیں تو اکثریت کا کوئی اعتبار نہیں، یہ اُصول شریعت نے تسلیم نہیں کیا، کہ جدھر ہاتھ زیادہ اُٹھیں اور جدھر زبانیں زیادہ کھلیں، جدھر بھیڑ زیادہ ہو جائے اور جدھر لوگ زیادہ جمع ہو جائیں، شور و غوغا زیادہ ہو اُسی کو حق تسلیم کر لیا جائے، یہ کوئی شرعی اُصول نہیں ہے، حق ثابت ہوتا ہے دلیل کے ساتھ، اور خارجی شہادت اس کے اُوپر ہوا کرتی ہے سمجھدار لوگوں کی، تو سمجھدار لوگ جس بات کی شہادت دے دیں اور دلیل کے ساتھ اُس بات کا حق ہونا ثابت ہو جائے وہ حق ہے، چاہے اس کا ماننے والا ایک ہی فرد ہو اور ساری دُنیا اُس کے ساتھ اختلاف کرنے والی ہو، یہاں بھی یہی بات ہے کہ آپ اکثریت سے مرعوب نہ ہوں، تو اکثریت ہمیشہ بھٹکی ہوئی ہوتی ہے، اگر آپ ان کا خیال کریں گے اور اکثریت کی بات لینا چاہیں گے تو جیسے وہ بھٹکے ہوئے ہیں اسی طرح سے آپ کو بھی بھٹکا دیں گے۔ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ: اگر اطاعت کریں

گے آپ زمین میں آباد لوگوں میں سے اکثریت کی، یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: تو یہ اللہ کے راستے سے آپ کو بھٹکا دیں گے، اکثریت جو ہوتی ہے وہ حق سے ہٹے ہوئے لوگوں کی ہوتی ہے ہر دور میں، جس کی وجہ میں نے آپ کے سامنے عرض کر دی، کہ باپ دادے کا طریقہ لوگوں کے نزدیک مالوف ہوتا ہے، مانوس ہوتا ہے، لوگ اُس کی پابندی کرتے ہیں، اور ایک غلط معاشرے کے اندر جب غلط قسم کے لیڈر پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ حقیقت کو ثابت نہیں ہونے دیا کرتے۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: اور ان کے اپنے نظریات اور عقائد یہ محض توہمات اور خیالات پر مبنی ہیں، وہ ظن وتخمین کی اتباع کرتے ہیں، اور باتیں ان کی ساری کی ساری اٹکل ہیں جن کی بنیاد کوئی نہیں ہے، اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ، تو ایسے لوگوں کا کیا اعتبار؟ اور ان کی اکثریت سے کیا حقیقت ثابت ہو سکتی ہے؟ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ: آپ کا رَبّ خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جو کہ اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں، اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو، تو ہدایت یافتہ لوگوں کی نشاندہی بھی اللہ نے کر دی، بھٹکے ہوؤں کی نشاندہی بھی کر دی، اس لئے بھٹکے ہوؤں سے بچ کر رہو، اور ہدایت یافتہ لوگوں کے ساتھ مل کے چلنے کی کوشش کرو، اکثریت کا کوئی اصول نہیں، جو مہتدی ہے، اللہ تعالیٰ کے بیان کرنے کے ساتھ جس کا مہتدی ہونا ثابت ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کا ساتھ دیا جائے، اور اللہ تعالیٰ کے واضح کرنے کے ساتھ جس کے متعلق معلوم ہو گیا کہ یہ شخص بھٹکا ہوا ہے اُس کا ساتھ نہ دو چاہے وہ کتنی ہی اکثریت میں کیوں نہ ہو۔

جانوروں کی حلت وحرمت کے متعلّق مشرکین کے پروپیگنڈوں کا جواب اور اہلِ ایمان کو ہدایات

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: اب یہاں سے ایسی باتیں ذکر کی جا رہی ہیں جو مشرکین اہلِ اسلام کے خلاف بطور پروپیگنڈا کرتے تھے، اور عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات تھی کہ جب قرآنِ کریم یہ میں حکم آیا کہ اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کیا کرو، غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا کرو، اور جو چیز غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دی جائے اور اس کی طرف منسوب کر دی جائے، جیسے مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے اندر ذکر آیا تھا تو وہ چیز حرام ہو جاتی ہے اس کا کھانا جائز نہیں ہے، اس پر مشرکین نے بڑا شور مچایا، بعض تو یوں کہتے تھے کہ دیکھو جی! یہ کیا نیا دِین آ گیا کہ جس کو یہ خود مارتے ہیں اس کو تو حلال سمجھتے ہیں، اُس کو تو کھاتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو مار دیتا ہے تو اللہ کی ماری ہوئی کو یہ حرام کہتے ہیں، حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ کا جس وقت ذکر آیا تو وہ کہتے کہ دیکھو! اللہ کی ماری ہوئی کو تو حرام قرار دیتے ہیں، اور جس چیز کو یہ خود مار دیتے ہیں اس کو یہ حلال قرار دیتے ہیں۔ پھر اسی طرح سے وہی آبائی طریقہ جو ان کا چلا آ رہا تھا، کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے، غیر اللہ کی طرف نسبت کر کے جانوروں کو ذبح کرنے کے بعد اُس کو کھاتے تھے، بلکہ تبرک سمجھ کر کھاتے تھے، تو قرآنِ کریم نے جو اس کی تردید کر دی تو اس پر انہوں نے بہت زیادہ شور مچایا، کھانے پینے کا مسئلہ جو تھا وہ اسی طرح سے زیرِ بحث آ گیا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کے اندر خصوصیت سے تاکید کی ہے کہ ان کے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہونا، ان کے شور پر کوئی کان نہ دھرو، تمہارے سامنے یہ بات ذکر کر دی گئی کہ اللہ کی اطاعت تم نے کرنی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا ہے کہ جس حلال جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے اُس کو تو کھایا

کرو، اور جس کو اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا جائے، غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے یا جان بوجھ کر اللہ کا نام اُس پر لینا چھوڑ دیا گیا، تو اُس کو نہ کھایا کرو، تو جو غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوا ہے، جس کو اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیا گیا، ایسے جانور کا کھانا یہ فسق ہے، اس لئے ہم یہ تمہیں تاکید کرتے ہیں کہ اِن کو کھاؤ اور اِن کو نہ کھاؤ، اور مشرکین کی باتوں پر کان نہ دھرو، اگر ان مشرکین کی باتوں کے پیچھے تم لگ جاؤ گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے، یہاں مشرک ہونے کا معنی یہی ہے کہ کسی چیز کو حلال قرار دینا یا کسی چیز کو حرام قرار دینا یہ منصب اللہ تعالیٰ کا ہے، اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حلال قرار دے تو اس کو حلال جاننا ضروری، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حرام قرار دے تو اس کو حرام جاننا ضروری، اور اگر کسی کے پیچھے لگ کر حلال کو حرام ٹھہرا دیا جائے یا حرام کو حلال ٹھہرا دیا جائے تو یہ تحریم اور تحلیل کا اختیار کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اللہ تعالیٰ کی تصریح کے خلاف، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کا شرک ہے، جیسا کہ آپ کے سامنے پہلے ذکر کیا گیا تھا کہ قرآنِ کریم میں جب یہ آیت آئی تھی اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۳۱) کہ اہلِ کتاب نے اپنے علماء کو اور درویشوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنا لیا، جس کی بنا پر یہ مشرک ہو گئے، تو بعض اہلِ کتاب کی طرف سے یہ اشکال کیا گیا تھا کہ یہ تو اپنے اَحبار و رُہبان کو رَبّ نہیں کہتے، قرآنِ کریم نے یہ الزام کس طرح سے لگا دیا کہ انہوں نے علماء کو اور درویشوں کو رَبّ بنا لیا؟ تو سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے وضاحت یہی کی گئی تھی کہ تم یہ بتاؤ کہ کیا اللہ کے اَحکام کے خلاف اِن کو تم نے تحریم اور تحلیل کا اختیار نہیں دے دیا؟ کہ جس کو یہ حرام کہہ دیں وہ حرام ہے چاہے وہ اللہ کی کتاب میں حلال ہی ہو، اور جس کو یہ حلال کہہ دیں وہ حلال ہے چاہے اللہ کی کتاب میں وہ حرام ہی ہو۔ وہ کہنے لگے ہاں! یہ بات تو ہے۔ فرمایا کہ بس یہ تحلیل اور تحریم کا اختیار تم نے جو اپنے علماء اور درویشوں کو دے دیا، یہی علامت ہے کہ تم نے اللہ کے علاوہ اِن کو رَبّ بنا لیا ہے۔[1] تو یہاں یہ آئے گا کہ ان مشرکوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اگر تم نے بھی کسی حرام کو حلال سمجھ لیا یا کسی حلال کو حرام قرار دے دیا، تو تم بھی اسی طرح سے مشرک ہو جاؤ گے، تحلیل تحریم کا اختیار اللہ کو ہے، جس کو وہ حلال قرار دے اسے حلال سمجھو اور کھاؤ، اور جس کو وہ حرام قرار دیتا ہے اس کو حرام سمجھو اور اس سے بچو، یہ ہے ایمان کا تقاضا، اس کے خلاف اگر چلو گے تو یہ بھی مشرکوں والا فعل ہے۔ ''کھایا کرو اُس چیز میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام لے لیا گیا'' اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ: اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے ہو، یعنی حلال جانور جن کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا جائے اُسے کھایا کرو۔ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا: تمہیں کیا ہو گیا یعنی تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم نہ کھاؤ اُس جانور میں سے جس کے اُوپر اللہ کا نام لیا گیا، یعنی وہ جانور حلال اور اُس کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا گیا، اس میں سے تم نہ کھاؤ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہو گیا تمہیں؟ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ: اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کر چکا تم پر وہ چیزیں جو اُس نے تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، یہ اس سے پہلے آیات اتری تھی، جیسے سورۂ نحل کے اندر بھی آیا اور بعض دوسری سورتوں میں بھی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ[2] یہ مدنی

(۱) روح المعانی، سورۂ توبہ آیت ۳۱ کے تحت۔ نیز دیکھیں سنن کبریٰ بیہقی ۱۰/۱۱۶۔ ترمذی ۲/۱۴۰ تفسیر سورۂ توبہ۔
(۲) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ (سورۂ نحل: ۱۱۵، سورۂ بقرۃ: ۱۷۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (سورۂ مائدہ: ۳)

سورتوں میں بھی ہے، مکی سورتوں میں بھی ہے، اور ان آیات میں بھی ہے جو سورۂ اَنعام سے پہلے اُتری ہیں، انہی کا حوالہ ہے، ''اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کر چکا تمہارے لئے اُس چیز کو جو اس نے تم پر حرام ٹھہرائی ہے، ہاں! جس کی طرف تم مضطر کر دیے جاؤ'' وہ باوجود اس بات کے کہ اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہے، لیکن وقتی طور پر اِضطرار کی وجہ سے وہ بھی تمہارے لیے حلال کر دی گئی، یہ تفصیل اُن آیات کے اندر آ گئی۔ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ: اور بہت سارے لوگ البتہ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشات کے مطابق، یعنی جو خیالات انہوں نے اپنے پکا رکھے ہیں انہی کے مطابق دوسروں کو چلانا چاہتے ہیں، اور وہ ہوتے ہیں بغیر علم کے، علمی تحقیق کے خلاف انہوں نے اپنی خواہشات اور بدعات جو اختیار کر رکھی ہیں اُس کے مطابق لوگوں کو چلا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں، یعنی حرام کو حلال ثابت کرتے ہیں وہ اپنی خواہشات کے مطابق۔

عقیدۃً اور عملاً ترکِ معصیت کا حکم

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ: ظاہرِ اثم سے مراد تو ظاہری عمل ہو گیا جو انسان اختیار کرتا ہے، جیسے کہ حرام کے ساتھ حرام والا اور حلال کے ساتھ حلال والا برتاؤ کرنا یہ ظاہر ہے، اور دل کا عقیدہ یہ باطن ہے، اس لئے جس کو گناہ قرار دے دیا گیا تو اُس کے متعلق دل کا عقیدہ بھی ٹھیک کرو، اور ظاہری عمل کو بھی درست کرو۔ ایک جانور جو اللہ کے غیر کے نام پر ذبح کر دیا گیا، اُس کو باطن کے اندر حرام جاننا ضروری، اگر کوئی شخص اُسے حلال سمجھے گا تو یہ باطنِ اثم ہے، اور اگر اس کے ساتھ ظاہری طور پر حلال والا برتاؤ کرے گا اور اسے کھائے گا تو یہ ظاہرِ اثم ہے، دل سے بھی گناہ کے اثرات مٹادو اور ظاہری عمل کے ساتھ بھی گناہ کو ترک کر دو، بُرائی کے یہ دونوں پہلو ہوتے ہیں، یہ قلب سے اُٹھتی ہے اور عمل کے درجے میں آ کر ظاہر ہوتی ہے، اور ان دونوں باتوں کا آپس میں تعلق ہوتا ہے، دل میں بات ہو گئی تو عمل میں بھی کجی آ جائے گی، اور عمل کے اندر کجی ہو گی تو دل میں بھی بات بیٹھ جائے گی، تو اگر گناہ سے کامل طریقے سے بچنا چاہتے ہو تو دل کو بھی صاف کرو کہ اس کے متعلق عقیدہ اور رجحان نہ ہو، اور اسی طرح سے ظاہر کے اندر اُس گناہ کی جو شکل اختیار کی جاتی ہے اُس کو بھی ترک کرو، تب جا کے کامل طریقے سے تم گناہ سے بچ سکو گے۔ ''چھوڑ دو گناہ کے ظاہری حصے کو بھی اور باطنی حصے کو بھی'' یعنی دل کے عقیدے کے اندر بھی معصیت کو ترک کر دو اور عمل کے اندر بھی معصیت کو ترک کر دو، اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ: بے شک وہ لوگ جو کہ گناہ کا کسب کرتے ہیں، گناہ کی کمائی کرتے ہیں، عنقریب بدلہ دیے جائیں گے وہ اُس چیز کے ساتھ جو وہ کیا کرتے تھے، مایقترفون کا وہ بدلہ دیے جائیں گے۔

متروک التسمیہ جانور کے متعلق اَئمہ کا اِختلاف

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: کھایا نہ کرو اس جانور میں سے جس کے اوپر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، چاہے غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، چاہے غیر اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، جس طرح سے کہ ہمارے ہاں یہ مسلک مشہور ہے، آپ کو معلوم ہو گا، کہ نسیان تو معافی کے درجے میں ہے، کہ ذبح کرتے وقت نسیان ہو گیا اور اللہ کا نام نہیں لیا وہ جانور تو حلال ہے، اور اگر جانتے

بوجھتے ہوئے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام چھوڑ دیا گیا تو ایسی صورت میں ہم اُس جانور کو حرام کہتے ہیں، اور آپ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور وہ بات بھی صحیح ہے، کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک متروک التسمیہ عامداً بھی حلال ہے، یہ بات آپ نے ''اُصول الشاشی'' اور دوسری کتابوں میں پڑھی بھی ہے، کہ متروک التسمیہ عامداً حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بھی حلال ہے، تو بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ کتنے صاف لفظوں کے اندر اللہ نے حکم دیا ہے کہ جس کے اُوپر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُس میں سے نہ کھایا کرو، پھر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ متروک التسمیہ عامداً کو کیسے حلال قرار دیتے ہیں؟ تو اصل بات یہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر اس جگہ واقعے کے مطابق ہے، کہ واقعہ اُس وقت یہ تھا کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اُس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جاتا تھا، اور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے وہ بالکل حرام ہے سب کے نزدیک، اور جس کے اُوپر غیر اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا اور اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، چونکہ یہ جزئیہ اُس وقت موجود نہیں تھا، تو یہ مجتہد فیہ ہے، اس لئے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مؤمن جس کے دل پر، دماغ پر اللہ کا تصور رہتا ہے اگر وہ جان بوجھ کر بھی چھوڑ دے تو یہ اس میں داخل نہیں جو مشرکوں کا مَالَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ہوتا تھا، کیونکہ اس کا مصداق تھا کہ لات عزیٰ کے نام پر اور غیر اللہ کے نام پر وہ جانور ذبح کیا جاتا تھا، یہ ہے اِجتہاد حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا، کہ لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ سے مراد ہے جو اللہ کے غیر کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اگرچہ یہ اجتہاد مرجوح ہے اور ہمارے نزدیک یہ راجح نہیں، راجح وہی حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ والی بات ہے، کہ اللہ کا نام جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے تو جانور حرام ہے، لیکن ایک مجتہد کا نظریہ اس طرح سے بالکل صاف ستھری آیت کے خلاف ہو ایسی بات بھی نہیں، اُن کے نزدیک اس آیت کی توجیہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جو اللہ کے غیر کے نام پر ذبح کیا گیا، چونکہ اُس وقت واقعہ ایسے ہی تھا کہ جب اللہ کا نام نہیں لیتے تھے تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ: ایسے جانور کا کھانا فسق ہے، نافرمانی ہے، وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ: بے شک شیاطین البتہ وحی کرتے ہیں اپنے دوستوں کی طرف لِيُجَادِلُوْكُمْ: تا کہ وہ تم سے جدال کریں، تم سے جھگڑیں، وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ: اگر تم نے ان کا کہنا مان لیا، جو مختلف قسم کے جھگڑے آ کر ڈالتے ہیں، اور حرام کو تمہارے ہاں حلال کروانا چاہتے ہیں، اگر تم نے اِن کا کہنا مان لیا، اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ: بے شک تم بھی مشرک ہو جاؤ گے، کیونکہ اللہ کے احکام کے خلاف کسی حرام کو حلال قرار دینا یا حلال کو حرام قرار دینا یہ بھی شرک ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي
کیا وہ شخص جو کہ مُردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندگی دی، اور ہم نے اُس کے لئے روشنی بنائی، چلتا پھرتا ہے وہ اُس روشنی کے

النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ

ساتھ لوگوں میں، وہ اُس شخص کی طرح ہوسکتا ہے؟ جس کا حال یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، ان سے وہ نکلنے والا نہیں ہے، ایسے ہی

زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ

مزین کر دیا ہم نے کافروں کے لئے اُس عمل کو جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۲۲﴾ اور ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں بڑے لوگوں

قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ

کو اسی بستی کے مجرم بنا دیا تا کہ وہ لوگ اُس بستی میں شرارتیں کرتے رہیں، نہیں مکروفریب کرتے وہ مگر اپنی جانوں کے ساتھ

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى

اور وہ سمجھتے نہیں ہیں ﴿۱۲۳﴾ اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو یہ کہتے ہیں ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ہم جب

نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ

تک کہ نہ دیئے جائیں ہم مثل اُس چیز کے جو دیئے گئے اللہ کے رسول، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس مقام کو جہاں وہ اپنی رسالت

رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ

رکھے، عنقریب پہنچے گی اُن لوگوں کو جنہوں نے جرم کیا ذلّت اللہ کے نزدیک اور سخت عذاب ہوگا

شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ

بسبب اُس کے کہ یہ شرارتیں کیا کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾ پھر اللہ تعالیٰ جس کے متعلق ارادہ کرتا ہے کہ اُسے ہدایت دے

صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا

اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے، اور جس کے بھٹکانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو کر دیتا ہے اُس کے سینے کو

حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ

بہت تنگ، گویا کہ وہ شخص چڑھتا ہے بُلندی میں، ایسے ہی کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ رجس

عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ

اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲۵﴾ یہی آپ کے رَبّ کا راستہ ہے سیدھا، ہم نے کھول کھول کر

فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ

بیان کر دیا آیات کو اُن لوگوں کے لئے جو کہ نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ انہی لوگوں کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے رَبّ کے پاس

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ

اللہ اُن کا دوست ہے اُن کے عملوں کی وجہ سے جو یہ کرتے تھے ﴿۱۲۷﴾ جس دِن اللہ تعالیٰ ان سب کو اکٹھا کرے گا، کہے گا

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ

اے جنوں کے گروہ! تم نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کرلیا، کہیں گے اُن شیاطین کے دوست

مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ

انسانوں میں سے، اے ہمارے پروردگار! ہم میں سے بعض نے بعض سے فائدہ اٹھایا اور ہم پہنچ گئے اپنی اس معیاد کو جو تُو نے ہمارے

اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ

لیے متعین کی تھی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جہنم تمہارا ٹھکانا ہے، ہمیشہ رہنے والے ہوگے اُس جہنم میں، مگر جو چاہے اللہ وہی ہوگا،

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ

بے شک آپ کا رَبّ حکمت والا ہے علم والا ہے ﴿۱۲۸﴾ ایسے ہی قریب کردیں گے ہم بعض ظالموں کو بعض کے

بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع

بسبب اُن کاموں کے جو یہ کیا کرتے تھے ﴿۱۲۹﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط۔ مؤمن اور کافر کی حالت ایک مثال کی روشنی میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ: کیا وہ شخص جو کہ مردہ تھا پھر ہم نے اُس کی زندگی دی، وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا: اور ہم نے اُس کے لئے روشنی بنائی، يَّمْشِيْ بِهٖ: چلتا پھرتا ہے وہ اُس روشنی کے ساتھ، فِي النَّاسِ: لوگوں میں، كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ: وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے؟ کہ جس کی مثال یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، جس کا حال یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا: ان تاریکیوں سے، ان اندھیروں سے وہ نکلنے والا نہیں ہے، كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ:

ایسے ہی مزین کر دیا ہم نے کافروں کے لئے اُس چیز کو جو وہ کرتے ہیں، جو عمل وہ کرتے ہیں وہ ہم نے کافروں کے لئے مزین کر دیا...... پچھلے رکوع کی آخری آیت میں یہ ذکر کیا گیا تھا، کہ شیاطین میں سے بعض بعض کی طرف وحی کرتے ہیں، اپنے اولیاء کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں، اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر تم نے ان کی اتباع کی اور اطاعت کی تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمن اور کافر کا حال ایک مثال کے ساتھ واضح کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن شیاطین کے وسوسوں کو قبول نہیں کرتا، اور اس کا اِغوا اس کے اوپر اثر انداز نہیں ہوتا، کیونکہ پہلے یہ مردہ تھا رُوحانی موت کے ساتھ، کُفر ایک رُوحانی موت ہے، پھر ہم نے اس کو زندگی دی ایمان کی توفیق دے کر، ایمان کے ساتھ زندگی ملتی ہے۔ کُفر رُوحانی موت اس طرح سے ہے کہ جس طرح سے مردہ اپنے نفع نقصان میں فرق نہیں کرتا، اور اپنی صلاحیتیں ضائع کر بیٹھتا ہے، اسی طرح جب انسان کُفر میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا، اور اپنے دائمی نفع نقصان سے غافل ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ زندگی دے دیتے ہیں، دل اور دماغ بیدار ہو جاتا ہے، دائمی نفع نقصان کی فکر لگ جاتی ہے، تو یہ ایک روشنی ہے جو انسان کے دل دماغ میں آ گئی، اور یہ حیات ہے جس میں انسان اپنے حقیقی مقصد کو پہچانتا ہے، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندگی دے دی، پھر اُس کے دل دماغ میں ایک روشنی ڈال دی (اس روشنی سے وہی ایمان والی روشنی مراد ہے جس کے ساتھ انسان غلط اور صحیح میں فرق کرتا ہے) وہ شخص اس طرح نہیں ہو سکتا جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، کُفر کی، ضلالت کی، فسق کی، فجور کی تاریکیوں میں مبتلا ہے، اور اس سے نکلنے والا نہیں ہے، ایسے لوگ ہیں جو اندھیرے کے اندر ہیں، اور یہی لوگ ہیں جن کو شیاطین اپنے قبضے میں لیتے ہیں، اور اکسا کر بہکا کر غلط راستوں کے اُوپر ڈالتے رہتے ہیں۔ ورنہ جس کے سامنے روشنی ہے، وہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتا ہے، تو کوئی شخص اُس کو بہکا نہیں سکتا۔ باقی رہا کہ یہ کافر سمجھانے کے باوجود سمجھتے کیوں نہیں؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کافروں کے لئے ان کی کارروائی مزین کر دی گئی، یہ اپنی ان کارروائیوں پہ خوش ہیں، سمجھتے ہیں جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی ٹھیک ہے۔

ہر دور میں بستی کے رُوساء ہی مجرم کیوں رہے؟

اگلی آیات میں سرورِ کائنات ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے اور انجام ذکر کر کے دونوں فریقوں کا حال بتانا بھی مقصود ہے، اور پھر اس سے اگلے رکوع میں مشرکانہ رسوم کی کچھ تردید ہے، مضمون چونکہ واضح سا ہے، اس میں کوئی زیادہ پیچیدگی نہیں، اس لیے ترجمے کے ساتھ ساتھ تھوڑی تھوڑی وضاحت کرتا جاؤں گا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا: اور ایسے ہی (یعنی جیسے آپ کے ساتھ ہو رہا ہے کہ جس بستی میں آ کے آپ نے اعلانِ حق کیا، اس بستی کے رُوساء آپ کے مخالف ہیں) اور ایسے ہی بنایا ہم نے ہر بستی میں۔ جَعَلْنَا دو مفعول چاہتا ہے، اَكٰبِرَ مفعول اوّل ہے، اور مُجْرِمِيْ یہ مفعول ثانی ہے، بظاہر جس طرح سے اَكٰبِرَ مضاف اور مُجْرِمِيْ مضاف الیہ معلوم ہوتا ہے اس طرح سے بھی بعض مترجمین نے ترجمہ کیا ہے ''مجرمین میں سے بڑے، مجرمین کے سرغنے، اُن

کے سردار اور اُن کے لیڈرز" ایسے بھی ترجمہ کیا گیا ہے، لیکن یہ ترکیب کے لحاظ سے زیادہ احسن ہے کہ اَکٰبِرَ کو مفعول اوّل بنایا جائے اور مُجْرِمِیْ کو مفعول ثانی بنایا جائے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ "ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں بڑے لوگوں کو اُس بستی کے مجرم بنادیا" یعنی اس بستی میں جو اکابر کا مصداق ہیں، جو بڑے بنے بیٹھے ہیں، جن کے لئے لیڈری اور قیادت ہے، وہی اسی بستی کے بڑے مجرم بنے، وہی مجرمین ہیں اس بستی کے جو حق کو قبول نہیں کرتے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے حق کا ساتھ دیا تو ہماری سیادت اور قیادت کو نقصان پہنچے گا، تو جیسے آپ کے مقابلے میں یہ لوگ جو کسی وجہ سے اپنی قوم کے اندر ممتاز ہیں اور اُن کو بڑائی حاصل ہے، آپ کے مقابلے میں آئے ہوئے ہیں، آپ کو پریشان کرتے ہیں تو یہ گھبرانے کی بات نہیں، ایسے ہی ہر نبی کے ساتھ ہوا، "اور ہم نے ہر بستی کے اندر وہاں کے بڑے لوگوں کو ہی اُس بستی کا مجرم بنایا" اس بستی کے اندر جرم کرنے والے وہی ہوتے ہیں، تو ترجمہ پھر یوں ہو جائے گا "ایسے ہی بنایا ہم نے ہر بستی میں بڑے لوگوں کو اس بستی کے مجرم" لِیَمْکُرُوْا فِیْهَا: تاکہ وہ لوگ اس بستی میں شرارتیں کرتے رہیں، مکر کرتے رہیں۔ مکر: حق کے خلاف جو خفیہ تدبیریں وہ کرتے تھے۔ اس لئے ترجمے میں اس طرح سے کہہ دیا جائے "تاکہ وہ اس میں شرارتیں کرتے رہیں، فتنے اٹھاتے رہیں" تو یہ ترجمہ بالکل صحیح ہے۔ "اور نہیں شرارتیں کرتے وہ مگر اپنے نفسوں کے ساتھ، نہیں مکر وفریب کرتے وہ مگر اپنی جانوں کے ساتھ" کیا مطلب؟ کہ جس قسم کے مکر وفریب بھی وہ کرتے ہیں اُن کا نقصان اُلٹ کر انہی کو ہونے والا ہے، حق کو کوئی نقصان نہیں، اہل حق کو کوئی نقصان نہیں، کیونکہ دنیا کے اندر ظاہری طور پر اگر وہ لوگ کچھ کامیاب ہو بھی جائیں جس کے نتیجے وہ حق کو دبا لیں، یا جس کے نتیجے میں اہل حق کو وہ زخمی کردیں، قتل کردیں، گھروں سے نکال دیں، مالی نقصان پہنچا دیں، تو یہ تو اہلِ حق کی ایک تجارت ہوتی ہے، کہ اگر اُن کی دولت کو نقصان پہنچتا ہے، یا اُن کے بدن کو نقصان پہنچتا ہے، یا کوئی چیز اُن سے چھنتی ہے یا وہ کسی چیز کی قربانی دیتے ہیں، تو اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اُن کو بہت زیادہ اجر دیتے ہیں، تو اہلِ حق کبھی نقصان میں نہیں رہتے، وہ اس تجارت میں ہمیشہ نفع پاتے ہیں، اور یہ جو ظاہری طور پر نقصان پہنچانے والے ہیں، غلبہ پانے والے ہیں، یہ اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں، دُنیا میں اللہ کے عذاب کی گرفت میں آسکتے ہیں، اور آخرت میں آئیں گے ہی، اس لئے اِن کا یہ مکر وفریب ان کی یہ شرارتیں انہی کے لئے وبال بننے والی ہیں، "نہیں شرارتیں کرتے وہ مگر اپنے ہی نفسوں کے ساتھ، نہیں مکر کرتے وہ مگر اپنے ہی نفسوں کے ساتھ" وَمَا يَشْعُرُوْنَ: اور وہ سمجھتے نہیں ہیں، اُن کو شعور نہیں۔

رُؤسائے مشرکین کی طرف سے ایک مطالبہ اور اس کا جواب

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ: اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو یہ کہتے ہیں ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ہم جب تک کہ نہ دیئے جائیں (حتّٰی کے بعد محاورۃً ہمیشہ نفی کا ترجمہ کیا جاتا ہے) جب تک کہ نہ دیئے جائیں ہم مثل اُس چیز کے جو دیئے گئے اللہ کے رسول۔ یہ بھی اُن کی بڑائی کی ایک ڈینگ ہے، چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال یہ ہے کہ جس طرح سے دُنیا کی دولت ہمیں ملی تو اسی طرح سے نبوت اور رسالت اور اس قسم کی چیزیں بھی ہمیں ملنی

چاہئیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نشانی اُن کے سامنے واضح ہو، کوئی معجزہ آئے، لیکن وہ نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں وہ چیز ملے، یعنی نبوّت، رسالت، وحی، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ مکالمہ، فرشتوں کا نزول جب تک ہمیں یہ چیزیں نہیں دی جائیں گی اُس وقت تک ہم ماننے والے نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہیں کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس مقام کو جہاں وہ اپنی رسالت رکھے، مقامِ رسالت کو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں، اور کس نے اپنے آپ کو پاک اور صاف رکھا ہے جو اللہ کا رسول بننے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ کا رسول ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی ایک دَین ہے، اُس کی عطا ہے، یہ محنت کے ساتھ یا مشقت کے ساتھ یا دُنیوی جاہ وجلال کے ساتھ حاصل نہیں کی جاسکتی، یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون رسالت کے قابل ہے کون نہیں؟ کس کو پیغام براہِ راست دیا جائے کس کو نہ دیا جائے؟ یہ ان لوگوں کی اپنے آپ میں ایک بڑائی اور ایک تکبر کی بات ہے جو کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ رسول کیوں نہیں بناتا؟ اور یہ رسالت ہمارے اُوپر کیوں نہیں آتی؟ اللہ کا پیغام ہمارے اُوپر کیوں نہیں اُترتا؟ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ: صغار ذِلّت کو کہتے ہیں، عنقریب پہنچے گی اُن لوگوں کو جنہوں نے جرم کیا ذِلّت اللہ کے نزدیک، یعنی یہ تو اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ مستحقِ رسالت بنے بیٹھے ہیں، تو یہ اِن کی بڑائی کا احساس آخرت میں یہی ذِلّت کی صورت میں نمایاں ہوگا، اللہ کے ہاں جائیں گے تو ذِلّت ان کو پہنچے گی، وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ: اور سخت عذاب ہوگا بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ: بسبب اس کے کہ یہ شرارتیں کیا کرتے تھے، یہ مکاریاں اور فریب جو حق کے خلاف کرتے تھے اس کے سبب سے ان کو عذابِ شدید پہنچے گا، اور ان کے اسی احساسِ بڑائی کے نتیجے میں ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذِلّت نصیب ہوگی۔

اِسلام کے لئے ''شرحِ صدر'' اور ''ضیقِ صدر'' کا مفہوم

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ: پھر اللہ تعالیٰ جس کے متعلق ارادہ کرتا ہے کہ اُسے ہدایت دے، جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے، شرحِ صدر کردیتا ہے اسلام کے لئے، ''شرحِ صدر'' کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کے قلب میں یہ صلاحیتیں نمایاں ہوجاتی ہیں کہ اسلام کی بات جب اُس کے سامنے آتی ہے تو فوراً اُس کو قبول کرلیتا ہے، وہ ایسے ہوتا ہے جیسے اِس کی من بھاتی غذا ہے اور اِس کے اپنے ہی دل کی ایک پکار ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اِس کو مل رہی ہے، اس طرح سے دل کے اندر کشادگی پیدا ہوجاتی ہے، اور اسلام کی ہر بات کو وہ خوشی کے ساتھ قبول کرنے لگ جاتا ہے، وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ: اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکانا چاہتا ہے، جس کے بھٹکانے کا ارادہ کرلیتا ہے، يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا: کردیتا ہے اُس کے سینے کو تنگ، حَرَجًا: بہت تنگ، ''بہت تنگ کردیتا ہے''، كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ: گویا کہ وہ شخص چڑھتا ہے بلندی میں، سماء سے یہاں بلندی مراد ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کسی کے لئے ہدایت مقدر ہوجائے، اور وہ شخص اپنے ارادے کے ساتھ اُس ہدایت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، تو اُس کی نیکی کی صلاحیتیں دِن بدن بڑھتی جاتی ہیں، نیکی اُس کے لئے مرغوبِ طبع ہوجاتی ہے، اور ہدایت کی باتیں اُس کے لئے اپنی من بھاتی غذا کی طرح ہوجاتی ہیں، کہ جب وہ بات سامنے

آتی ہے تو انسان اس میں اپنی راحت اور سکون محسوس کرتا ہے، قبول کرتا جاتا ہے، دن بدن اس میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور جس کا رُخ گمراہی کی طرف ہو گیا اور اللہ نے اس کو گمراہی کے اندر ڈال دیا، اس میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی، اگر اُس کو کسی نیک کام کے لئے کہا جائے تو اُس کی مثال ایسے ہی بن جاتی ہے جیسے کہ کوئی بہت دُشوار گزار گھاٹی ہے جس کے اُوپر اُسے چڑھنے کے لئے کہا جا رہا ہے، اور وہ زور لگا کر چڑھتا ہے لیکن چڑھا نہیں جاتا، تو دل کے اندر تنگی سی پیدا ہوتی ہے، تو حق کا قبول کرنا اُس کے نزدیک ایک بہت دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کی طرح ہوتا ہے، اور جس کے لئے شرحِ صدر ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اور سینے کو اِسلام کے لیے کھول دے اس کے لئے مرغوب فیہ چیز ہوتی ہے۔

جس طرف باطنی نسبت ہوگی ترقی اسی طرف ہوگی

دُنیا کے اندر آپ کے سامنے بھی اس کی مثالیں ہیں، کُفر اور اسلام سے اتر کر نیچے آجائیے، مسلمانوں میں خاص طور پر آپ اپنے طبقے میں دیکھیں گے اپنی سطح کے لوگوں میں، کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا رُجحان نیکی کی طرف ہے، اُن کے لئے نیکی کے کام بہت آسان ہوتے چلے جاتے ہیں، مسجد میں ان کو گھنٹوں بیٹھنا آسان، درسگاہ میں گھنٹوں بیٹھنا اُن کے لئے باعثِ راحت، دینی کتاب کا مطالعہ کریں گے تو دل دماغ خوش ہوتا چلا جائے گا، اللہ تعالیٰ کا نام لیں گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی مسرور ہو جائے گی، اور اگر کبھی وہ کسی غلط ماحول میں پھنس جائیں اور ماحول کی مجبوری کے تحت اُن کو ایسا کام کرنا پڑ جائے جو کہ شریعت کے خلاف ہے تو اُن کے لئے ایسے ہوتا ہے جیسے کہ زہر کا پیالہ پینے کے لئے کہہ دیا، انہیں انتہائی کڑوی اور تلخ بات معلوم ہوتی ہے جو فسق کی ہوتی ہے، فجور کی ہوتی ہے، جو شریعت کے خلاف بات ہو اُس کا اختیار کرنا اُن کے لئے انتہائی ناگوار ہوتا ہے، وہ غلط ماحول میں اس طرح سے تڑپتے ہیں جیسے کہ مچھلی کو پانی سے باہر نکال دیا جائے تو تڑپتی ہے، اور صحیح ماحول میں اُن کو سکون ملتا ہے۔ اور جن کا رُجحان عیاشی اور بدمعاشی کی طرف ہو جاتا ہے، اُن کے لئے سینماؤں میں تین تین گھنٹے تک بیٹھنا تو بہت خوشگوار ہے، لیکن اگر اُن کو گھیر گھار کر کبھی مسجد میں لے آئیں تو پانچ منٹ بھی بیٹھیں گے تو اس طرح سے تڑپیں گے جس طرح سے کسی بہت بڑی مصیبت کے اندر آگئے، آنکھ بچا کے بھاگنے کی کوشش کریں گے، بے قرار ہوں گے کہ کسی طرح سے اس ماحول سے نکل جائیں، اچھے ماحول میں وہ اپنا وقت نہیں گزار سکتے، یہ باطنی مناسبت جس کے ساتھ انسان کو ہو جاتی ہے، اچھائی کے ساتھ ہو جائے تو آئے دِن اس کے لئے اچھائی آسان ہوتی چلی جاتی ہے، اور اگر یہ باطنی مناسبت اُس کو بُرائی کے ساتھ ہو جائے تو آئے دِن اس میں بُرائی کی طرف ترقی ہوتی چلی جاتی ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اِنعام ہوتا ہے کہ کسی شخص کی طبعی مناسبت اچھائی کے ساتھ ہو جائے، اچھائی کے ساتھ مناسبت ہوگی تو اچھے لوگوں کی مجلس میں بیٹھے گا، اچھے لوگ اُس کو اچھے لگیں گے، اچھی باتیں اُس کو پسند ہوں گی، اچھے کام کرنے کے اندر وہ سُرور محسوس کرے گا، دن بدن اُس کی اِس گروہ کے اندر شمولیت ہوتی چلی جائے گی، کیونکہ باطنی جذبات ظاہر میں اسی طرح سے نمایاں ہوا کرتے ہیں، اگر دل کے اندر نیکی کا جذبہ ہو گا تو انسان اپنے رُفقاء نیک تجویز کرے گا، دل کے اندر نیکی کا جذبہ ہوگا تو نیک ماحول کے اندر انسان اپنا وقت گزارنے کی کوشش کرے گا، اور اگر دل کے اندر فسق و فجور ہے تو اسی

قسم کے دوست تلاش کرے گا جو اُس کے لئے فسق وفجور میں معاون بنیں، اور اسی قسم کا ماحول تلاش کرے گا جس میں اُس کو فسق وفجور کے مواقع ملیں۔

ظاہری عادات باطنی جذبات کی عکّاس ہوتی ہیں

تو یہ ظاہری عادات جو ہوا کرتی ہیں، انسان کا ظاہری ماحول، یہ باطنی جذبات کی عکاسی کرتا ہے، اس لئے ظاہر کے حالات کو دیکھ کر انسان اندازہ کر لیتا ہے کہ اس کے قلب کی کیفیت کیسی ہے؟ اس کے قلب کے اندر نیکی کی طرف رُجحان ہے یا بُرائی کی طرف رُجحان ہے، اور اِس کا اندازہ ہو جایا کرتا ہے اُس کے ہم نشینوں سے، اُس کے پسندیدہ ماحول سے، اور اُس کے طرزِ عمل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اِس کے قلب کے اندر کتنی صلاحیت ہے کتنی نہیں ہے؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ یہی بیان فرماتے ہیں کہ جس کے لئے اللہ کی طرف سے ہدایت کا ارادہ ہو جائے اسلام کے لئے اُس کا سینہ کھل جاتا ہے، اور اسلام کو بہت آسانی کے ساتھ قبول کرنے لگ جاتا ہے، بلکہ خوشی کے ساتھ اُس کی باتوں کو سننے کے بعد اُس کے اُوپر عمل کرتا ہے، اور جس کا رُجحان ضلالت کی طرف کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ اُس کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لے، اُس کا دل انتہائی تنگ ہو جاتا ہے، جب اُس کو کوئی اسلام کی بات قبول کرنے کے لئے کہا جائے تو ایسے ہوتا ہے کہ گویا کہ وہ بلندی کے اندر بڑے زور سے چڑھنا چاہتا ہے، آسمان کی طرف چڑھنا چاہتا ہے اور چڑھ سکتا نہیں، تو اس مزاحمت کی بنا پر پھر اُس کا دل تنگ ہوتا ہے۔

''ایسے ہی کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ رِجس اُن لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے'' رِجس پلیدی کو کہتے ہیں، یہاں شرک، کُفر اور فسق کی پلیدی مراد ہے، ایمان نہ لانے کی وجہ سے دن بدن اُن کے اُوپر کُفر کی، فسق کی تہیں بیٹھتی جاتی ہیں، حتیٰ کہ انسان پوری طرح سے اس فسق وفجور میں غرق ہو جاتا ہے، پھر اُس کی زندگی کے کسی حصے کے اندر بھی نیکی کا نام ونشان نہیں رہتا۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا: هٰذَا کا اشارہ اسی ''اسلام'' کی طرف ہے جو پیچھے ذکر ہوا، اور ''اسلام'' کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا جا چکا ہے، کہ اللہ کی اطاعت میں اپنی گردن رکھ دینا یہ اصل میں ''اسلام'' ہے، جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا جائے اُسی کو قبول کرتے چلے جاؤ، ''یہی آپ کے رَبّ کا راستہ ہے سیدھا'' مُسْتَقِيْمًا یہ صِرَاطُ رَبِّكَ سے حال واقع ہے، اور هٰذَا اسم اشارہ میں فعل والا معنی ہے، هٰذَا رَجُلٌ قَآئِمًا جس طرح سے آپ مثال پڑھا کرتے ہیں، هٰذَا کے اندر جو ''اُشِيْرُ'' والا معنی ہے اشارے والا معنی ہے، اُس نے آ کر اس کے اندر عمل کیا ہے، ''یہ آپ کے رَبّ کا راستہ ہے اس حال میں کہ سیدھا ہے۔'' قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ: ہم نے کھول کھول کر بیان کر دیا آیات کو اُن لوگوں کے لئے جو کہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

مکمل سلامتی صرف جنّت میں ہوگی

انہی لوگوں کے لئے جو دُنیا میں اس صراطِ رَبّ کو اختیار کرتے ہیں، یعنی اسلام کو اختیار کرتے ہیں، دنیا میں اسلام والا راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ''انہی لوگوں کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے رَبّ کے پاس''، یعنی جب آخرت میں جائیں گے، اللہ کے سامنے پیش ہوں گے تو ان کو سلامتی کا گھر نصیب ہوگا، ''سلامتی کے گھر'' کا مصداق ہے جنت، جنت میں سلامتی ہی سلامتی

ہے، ہر قسم کی آفات سے حفاظت، ہر قسم کی تکلیف سے حفاظت جنّت کے اندر ہوگی، اس میں کوئی کسی قسم کی آفت اور پریشانی کی بات نہیں ہوگی، اور یہ ایک ایسی نعمت ہے جو کہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے نصیب نہیں ہوسکتی، ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کسی کا دل اپنے ساتھ جوڑ لے، اُس کو ذِکر اللہ کے ساتھ مناسبت ہوجائے، سکونِ قلبی حاصل ہوجائے، تو اس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی اُس کے دل میں ایک خنکی ہوتی ہے، ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، جس کی بناپر دُنیا کی تکلیفیں آسان ہوجاتی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کہے کہ کلّیۃً دُنیا کے اندر عافیت نصیب ہوجائے، ظاہری باطنی کسی قسم کی تکلیف کا انسان شکار نہ ہو، تو یہ دُنیا کے اندر رہتے ہوئے بہت کم ہوتا ہے، بلکہ تقریباً ناممکن ہے، چاہے کسی حکمت کے تحت ہو، تکلیفیں پہنچتی ہیں، پریشانیاں پیش آتی ہیں، انسان کی مرضی کے خلاف حالات زیادہ پیش آتے ہیں، مرضی کے موافق کم ہوتے ہیں، جس کی بناپر طبیعت کو ناگواری بھی ہوتی ہے، لیکن جنّت میں چلے جانے کے بعد سلامتی ہی سلامتی ہے، وہاں کوئی بات اس قسم کی نہیں ہوگی جو آپ کی طبیعت کو ناگوار گزرے، تو یہ نتیجہ اسی کا ہی ہے کہ دُنیا کے اندر بھی آپ اسلام کو اختیار کیجئے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بنئے، تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرت میں سلامتی کا گھر مل جائے گا۔ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ: اللہ ان کا دوست ہے بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: ان کے عملوں کی وجہ سے جو یہ کرتے تھے، ان کے عمل کی وجہ سے اللہ ان کا دوست ہے، یعنی اسلام اختیار کرنے کے نتیجے میں اللہ کی دوستی نصیب ہوگی۔

روزِ محشر کفّار اوران کے معبودانِ باطلہ کا حال

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا: جس دن اللہ تعالیٰ اِن سب کو اکٹھا کرے گا، اِن سب کو یعنی اِن کافروں کو اور ان کے معبودوں کو اور اُن کے شیاطین دوستوں کو سب کو جمع کرے گا، اور کہے گا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ: اے جنوں کے گروہ! ''جنوں کے گروہ'' سے یہاں وہی گروہ مراد ہے جو ابلیس اور ابلیس کا پیروکار انسانوں کو گمراہ کرنے کے اندر حصہ لیتا تھا، اِستکثار کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کی کثرت حاصل کرلینا، ''انسانوں میں سے تم نے کثرت حاصل کرلی'' لفظی معنی یوں بنتا ہے ''اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں میں سے کثرت حاصل کرلی'' یعنی انسانوں میں سے بہت سے انسانوں کو تم نے گمراہ کرلیا، جو ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعویٰ کیا تھا: لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (سورۂ اعراف:۱۷) کہ اِن میں سے اکثر کو تو شکر گزار نہیں پائے گا، تو اللہ تعالیٰ کہیں گے تم نے اپنا زور لگا کر بہت سارے انسانوں کو گمراہ کرلیا، یہ بطور تنبیہ کے ہوگا کہ تمہاری یہ گمراہی کا عمل جو تھا وہ اس طرح سے نتیجہ خیز ہوا کہ بہت سارے انسانوں کو تم نے بہکالیا۔ یہ تنبیہ ہورہی ہوگی اُن جنوں کو جو گمراہ کرنے والے ہیں، تو ساتھ ہی اُن کے دوست انسان بول پڑیں گے، وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ: ان شیاطین کے دوست جو ہیں انسانوں میں سے وہ کہیں گے رَبَّنَا: اے ہمارے پروردگار! اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ: ہم میں سے بعض نے بعض سے فائدہ اُٹھایا، یعنی دُنیا کے اندر ہم ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھاتے تھے، گمراہ کرنے والے گمراہ کرنے میں لذّت محسوس کرتے تھے، جب کسی کو گمراہ کرلیتے تو وہ کہتے تھے کہ دیکھو! ہم کامیاب ہوگئے اور اس سے نذرانے چڑھاوے وصول کرتے تھے، اور گمراہ ہونے والوں کی چونکہ خواہش پوری ہوتی تھی اُن کے اتباع کرنے کے ساتھ، تو وہ سمجھتے تھے کہ ہم بھی ان سے فائدہ اُٹھارہے ہیں، جس کی کسی کے ذریعے سے خواہش پوری ہوتی ہے وہ

سمجھتا ہے کہ میں اِس سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں، تو" ہمارے بعض نے بعض کے ساتھ فائدہ اُٹھایا" وَبَلَغْنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِيْۤ اَجَّلْتَ لَنَا: اور ہم پہنچ گئے اپنی اس معیاد کو جو تو نے ہمارے لئے متعین کی تھی، یعنی دُنیا کے اندر تو ہم ایک دوسرے سے استمتاع کرتے رہے، لیکن وہ بڑا عارضی تعلق ثابت ہوا، اور اب ہم اس وقت معین پر آ گئے جو تو نے ہمارے لئے متعین کیا تھا، مطلب یہ ہے کہ معذرت کرنے کے لئے اپنے جرم کا اعتراف کریں گے، کہنا یہ چاہیں گے کہ دُنیا کے اندر کچھ کارروائی ہم نے آپس میں کی، ایک دوسرے سے نفع اُٹھایا، اور آخرت سے ہم غافل تھے، اب ہم اس میعاد پر پہنچ گئے ہیں جو تو نے متعین کی تھی۔ آگے وہ کرنا چاہیں گے عذر، اقرار اور اعتراف کرنے کے بعد آگے معافی کی درخواست کریں گے، لیکن ان کو کہنے کی نوبت ہی نہیں دی جائے گی، کہ اُن کا نتیجہ پہلے یہ اُن کے سامنے ذکر کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ: جہنم تمہارا ٹھکانا ہے خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ: ہمیشہ رہنے والے ہو گے اس جہنم میں، اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: مگر جو چاہے اللہ وہی ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اِن کا جہنم کے اندر رہنا ٹھہرنا وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، کوئی شخص اب اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکے گا، یہ نہیں کہ اللہ تو چاہے کہ جہنم میں رہیں، اور کوئی دوسرا زبردستی آ کر چھڑا لے، یا اللہ کی مشیت تو ہو کہ یہ جہنم میں رہیں، لیکن کوئی اور طریقہ اختیار کر لیا جائے اس عذاب سے بچنے کا، ایسا بالکل نہیں ہو سکتا، اب جو کچھ ہوگا سب اللہ کی مشیت کے تحت ہوگا، کوئی شخص بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں کر سکے گا، اور اللہ کی مشیت کے خلاف اِن کو عذاب سے بچا نہیں سکے گا، جس طرح سے لوگ کہتے ہیں کہ زبردستی فلاں فلاں کو چھڑا لے گا، یہ جیسے شفاعتِ جبری کے عقیدے مشرکوں کے تھے ان سب کی نفی ہو گی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے تحت، ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہوگا، اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ: بے شک آپ کا ربّ حکمت والا ہے علم والا ہے، وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا: جس طرح سے آج یہ ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے ہیں، ایسے ہی ہم بعض ظالموں کو بعض کے قریب کر دیں گے، یعنی جہنم کے اندر بھی ان کے نظریاتی طور پر جوڑ لگا دیں گے، عمل کے اندر اور کارروائیوں میں جو ایک دوسرے کے شریک ہوئے تھے، وہاں بھی ہم اِن کو آپس میں قریب قریب کر دیں گے، جیسے دُنیا کے اندر انسان اپنے ہم مسلکوں کو پسند کرتا ہے، وہاں بھی اسی طرح سے ظالموں کو ظالموں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا، صالحین کو صالحین کے ساتھ ملا دیا جائے گا،" ایسے ہی قریب کر دیں گے ہم بعض ظالموں کو بعض کے" بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: بسبب اُن کاموں کے جو یہ کیا کرتے تھے۔

يٰمَعْشَرَ	الْجِنِّ	وَالْاِنْسِ	اَلَمْ	يَاْتِكُمْ	رُسُلٌ	مِّنْكُمْ	يَقُصُّوْنَ

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے؟ جو پڑھتے تھے

عَلَيْكُمْ	اٰيٰتِيْ	وَيُنْذِرُوْنَكُمْ	لِقَآءَ	يَوْمِكُمْ	هٰذَا ۭ	قَالُوْا	شَهِدْنَا

تم پر میری آیات اور ڈراتے تھے اِس دن کی ملاقات سے، وہ کہیں گے ہم گواہی دیتے ہیں

عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ
اپنے آپ پر، اور ان کو دُنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا، اور انہوں نے اپنے آپ پر گواہی دے دی کہ
كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ
یہ لوگ کافر تھے ﴿۱۳۰﴾ یہ اس سبب سے ہے کہ تیرا رَبّ ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم کے سبب سے
وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
اس حال میں کہ وہ غافل ہوں ﴿۱۳۱﴾ ہر کسی کے لیے درجات ہیں اُن کے عمل کے سبب سے، تیرا رَبّ بے خبر نہیں اُن کاموں سے
عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ
جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۳۲﴾ اور تیرا رَبّ بے نیاز ہے رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے
وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ؕ
اور تمہارے پیچھے خلیفہ بنا دے جس کو چاہے، جیسے کہ پیدا کیا تمہیں دوسرے لوگوں کی اولاد سے ﴿۱۳۳﴾
اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ
جس چیز کا تم وعدہ کیے جاتے ہو البتہ آنے والی ہے، اور تم ہرانے والے نہیں ہو ﴿۱۳۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اے میری قوم!
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ
عمل کرو تم اپنی حالت پر، میں بھی عمل کرنے والا ہوں، عنقریب جان لو گے تم، کون ہے وہ شخص جس کے لئے
عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ
آخرت کا اچھا انجام ہے، بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے ﴿۱۳۵﴾ مقرر کیا انہوں نے اللہ کے لیے ایک
مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ
حصہ اُس چیز میں سے جو اللہ نے پیدا کیا، چاہے وہ کھیتی ہے چاہے وہ چوپائے ہیں، پھر وہ کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کے لئے ہے اُن کے خیال کے مطابق،
وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ
اور یہ ہمارے شرکاء کے لیے ہے، جو اُن کے شرکاء کے لیے ہوتا ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتا،

وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور جو کچھ اللہ کے لیے ہے وہ شرکاء کی طرف پہنچ جاتا ہے، بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں ﴿۱۳۶﴾

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ

ایسے ہی مزین کردیا بہت سارے مشرکوں کے لیے اولاد کا قتل کرنا اُن کے شرکاء نے

لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ

تاکہ وہ شرکاء ان لوگوں کو بربادی میں ڈال دیں، اور تاکہ ان کے اُوپر ان کے دِینی طریقے کو خلط ملط کردیں، اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے

فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ

چھوڑ دو انہیں اور ان باتوں کو جو یہ گھڑتے ہیں ﴿۱۳۷﴾ کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور یہ کھیتی ممنوع ہے، اس کو نہیں کھاسکے گا

لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ

مگر وہی جس کو ہم چاہیں گے اُن کے اپنے گمان کے مطابق، اور کچھ چوپائے ہیں کہ ان کی پشتیں حرام کردی گئی ہیں، اور بعض چوپائے ہیں کہ

لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا

جن کے اُوپر اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر اِفترا کرتے ہوئے، جو یہ باتیں گھڑتے ہیں ان کا اللہ تعالیٰ ان کو

كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ

بدلہ دے گا ﴿۱۳۸﴾ اور یہ کہتے ہیں کہ ان چوپاؤں کے پیٹ میں جو کچھ ہے یہ ہمارے

لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ

مذکروں کے لیے ہے خالص، ہماری بیویوں پر یہ حرام ہے، لیکن اگر وہ پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ مُردہ ہوتو پھر مرد وعورت

شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ

اُس میں شریک ہوتے ہیں، ان کو بدلہ دے گا اللہ تعالیٰ ان کے بیان کا، بیشک وہ حکمت والا ہے علم والا ہے ﴿۱۳۹﴾ تحقیق خسارے

الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ

میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنے بچوں کو قتل کیا نادانی سے بغیر علم کے، اور حرام ٹھہرایا اُس چیز کو جو اللہ نے انہیں دی

اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اللہ کے اُوپر بہتان باندھتے ہوئے، تحقیق یہ لوگ گمراہ ہوگئے، اور یہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں ﴿۱۴۰﴾

تفسیر

جہنمی جن واِنس کو تنبیہ

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: اے جنوں اور انسانوں کے گروہ!، اس سے مراد وہی ہیں جو جہنم میں پڑ گئے جن کا ذکر پیچھے آیا، ان جہنمیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے یہ بات پوچھی جائے گی، ''اے جنوں اور انسانوں کے گروہ!'' اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے؟ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ: جو تم پر میری آیات پڑھتے، وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا: اور تمہیں تمہارے اِس دن کی ملاقات سے ڈراتے، کیا ایسے رسول تمہارے پاس نہیں آئے تھے؟ جن اور اِنس کو مشترکہ خطاب ہوگا،'' کیا تم میں سے تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے؟''

سرورِ کائنات ﷺ جنّ واِنس کے نبی ورسول ہیں

اس آیت کے تحت مفسرین نے ذکر کیا کہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے رسول دونوں قسم کے بھیجے ہیں، کہ جنوں کی طرف بھی رسول آئے اور انسانوں کی طرف بھی آئے، باقی یہ ہے کہ وہ حقیقتاً ایسے تھے کہ اللہ کی وحی اُن کے اُوپر اُترتی ہو جو جنوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، یا رسولوں سے تربیت پا کر وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر گئے ہوں اس میں دونوں احتمال ہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اصل تو رسول انسانی ہیں اور انسانی رسولوں سے تربیت پا کر بعض جن اپنی قوم کی طرف جاتے ہیں اور جا کر ڈراتے ہیں، اس کا ذکر قرآنِ کریم میں صراحتاً ہے سورۂ جن کے اندر آئے گا، اور اسی طرح چھبیسویں پارے کی پہلی سورت سورۂ اَحقاف کے آخری رُکوع میں بھی ذکر ہے، کہ وہ جن ایمان لائے اور ایمان لانے کے بعد پھر اپنی قوم کی طرف چلے گئے، اور جا کر قوم کو ڈراتے ہوئے کہنے لگے يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ: اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات مان لو، تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے متاثر ہو کر وہ ایمان لائے، اور ایمان لانے کے بعد پھر جا کر اپنی قوم کو ڈرایا، اس کا ذکر وہاں ہے۔ تو ایسے ہی یہ جو جنات لوگوں کو لگتے ہیں تو عاملین یہ بتاتے ہیں کہ جب ان کو حاضر کیا جائے، تو اُن میں سے کوئی یہودی ہوتا ہے، کوئی نصرانی ہوتا ہے، کوئی فلاں ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے ان کا ایمان بھی اسی طرح سے کسی کا موسیٰ علیہ السلام پر ہے، کسی کا عیسیٰ علیہ السلام پر ہے، کوئی داؤد علیہ السلام کا کلمہ پڑھتا ہے، تو یہ گروہ اُن کے اندر پائے جاتے ہیں، بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ مستقل رسول تو آئے انسانوں میں، اور جن انسانوں سے متاثر ہو کر اور ان سے تعلیم حاصل کر کے آگے تبلیغ کرتے تھے، اور ایسا بھی ممکن ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ سے پہلے مستقل طور پر بھی جنوں میں رسول بھیجے جاتے ہوں، لیکن یہ حقیقت اب بالکل واضح ہے اور مسلمہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ

جن وانس دونوں کے طرف بھیجے گئے تھے (دیکھئے مظہری آلوسی وغیرہ)، آپ ﷺ کی خدمت میں جنوں کا آنا، ایمان لانا اور آپ ﷺ کا اُن کو وعظ کرنا اور تبلیغ کرنا یہ واقعات روایاتِ حدیث کے اندر موجود ہیں۔

''رُسل'' سے کیا مُراد ہے؟

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: رُسُل سے عام مراد لے لیا جائے تو خطاب دونوں کو ہے، کہ جنوں میں بھی رسول آئے چاہے مستقل رسول یا رسولوں کے نمائندہ، اور اسی طرح سے انسان و جن دونوں کے اندر بھی پائے جاسکتے ہیں، یا پھر یہ ہوگا کہ مجموعے کو خطاب کیا جارہا ہے، تو جب یہ جن اور انسان مجموعہ مراد لیا جائے تو جو انسانوں میں رسول آئے ہیں گویا کہ وہ جنوں کی طرف بھی ہیں، چاہے جنوں کے اندر رسول کوئی نہ ہو، مطلب یہ ہوا کہ ''رُسل'' سے اگر مستقل رسول مراد لئے جائیں، صاحبِ رسالت، صاحبِ وحی، تو پھر اس مجموعے کی طرف نسبت ہوگی، کہ ''اے جن وانسان کے گروہ! کیا ہم نے تمہاری طرف رسول نہیں بھیجے؟'' جب دونوں گروہ اکٹھے کر لیے گئے تو ایک گروہ کے اندر جو رسول ہوں گے وہ ایسے ہی ہیں جیسے دونوں کی طرف ہیں، اور اگر اس کو عام رکھا جائے کہ صاحبِ رسالت ہو یا نہ ہو، وحی اُس کے اُوپر آتی ہو یا نہ آتی ہو، بلکہ صاحبِ رسالت کی طرف سے کوئی نمائندہ بن کر چلا جائے وہ بھی رسول کا مصداق ہے، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت نہیں، بالیقین جنوں میں بھی تھے اور انسانوں میں بھی تھے، تو صاحبِ رسالت صاحبِ وحی مستقل ہوئے انسانوں میں، اور ان کی نمائندگی کے طور پر کچھ لوگ اُن کو سمجھانے والے جنوں میں بھی ہوئے۔

جنّ وإنس کا دربارِ خداوندی میں اِعتراف جرم اور وجۂ جرم

''پڑھتے تھے تم پر میری آیات اور ڈراتے تھے تمہیں اس دن کی ملاقات سے'' کیا ایسے رسول نہیں آئے؟ مطلب یہ ہے کہ تم جو گمراہ رہے اور غلط کار رہے تو تمہیں کوئی سمجھانے والا نہیں ملا؟ وہ کہیں گے کہ شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا: شہادت علی النفس یہ اقرار کے معنی میں ہوتا ہے، ہم اقرار کرتے ہیں اپنے آپ پر، ہم گواہی دیتے ہیں اپنے آپ پر، اپنے آپ پر جو گواہی ہوتی ہے ہماری اِصطلاح میں وہ ''اقرار'' کہلاتی ہے، ہم اپنے آپ پر اقرار کرتے ہیں کہ رسول آئے تھے اور انہوں نے ہمیں سمجھایا تھا لیکن ہم نہیں سمجھے۔ نہ سمجھنے کی وجہ کیا تھی؟ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: ان کو یعنی جنوں کو اور اِنسانوں کو دُنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا، وہ سمجھے کہ یہی زندگی ہے، بس جو کچھ کھانا پینا کرنا ہے یہیں کرلو، وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ: اور انہوں نے اپنے آپ پر گواہی دے دی، اور اپنے آپ پر اقرار کرلیا، اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: کہ یہ لوگ کافر تھے، اپنے کُفر کا انہوں نے اقرار کرلیا، کہ رسول تو ہمارے پاس آئے تھے سمجھانے کے لئے، لیکن ہم نہیں سمجھے، اور نہ سمجھنے کی درمیان میں وجہ ذکر کردی گئی دُنیوی زندگی کا دھوکے میں ڈال دینا، جس میں نشاندہی کردی گئی کہ اگر تم حقیقت پانا چاہتے ہو تو دُنیا کی محبت سے بچ کر رہو، جو شخص بھی دُنیا کی محبت میں مبتلا ہو جائے گا دُنیا اُس کو بہت دھوکے میں ڈال دیتی ہے، پھر بہت سارے حقائق اس سے مخفی رہ جاتے ہیں۔

بغیر تنبیہ کے اللہ تعالیٰ نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى: یہ اس سبب سے ہے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ظلم کے سبب سے اس حال میں کہ وہ غافل ہوں، یعنی رسولوں کا بھیجنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کی حالت میں لوگوں کو بستیوں والوں کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا، غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لئے، بیدار کرنے کے لئے پہلے رسول بھیجتے ہیں، اور وہ رسول اللہ تعالیٰ کے پیغامات آ کر پہنچاتے ہیں، متنبہ کرتے ہیں، اور پھر بھی اگر کوئی نہیں سمجھتا تب اللہ تعالیٰ پھر ان بستیوں کو ہلاک اور برباد کرتے ہیں، یہ اللہ کی عادت نہیں کہ بغیر تنبیہ کرنے کے بغیر متنبہ کرنے کے کسی کو ہلاک کر دے، ''یہ اس سبب سے ہے کہ نہیں ہے تیرا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو ظلم کے سبب سے'' یعنی ان بستیوں کے ظلم کے سبب سے کہ وہ بستیاں ظلم کا ارتکاب کر رہی ہوں، کفر و شرک کا ارتکاب کر رہی ہوں، اور اللہ تعالیٰ اُن کو غفلت سے تنبیہ کئے بغیر ان کو ہلاک کر دے ایسا کرنے والا نہیں ہے، تو یہ ظلم جو ہے یہ انہی اہل القریٰ کا ہے، یعنی اُن کے ظلم کے سبب سے جو ان کی طرف سے ہو رہا ہے، اور ظلم کا سب سے بڑا مصداق کفر و شرک ہے، وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ: اور وہ بستیوں والے غافل ہوں، بے خبر ہوں، ایسے حال میں اللہ ہلاک کرنے والا نہیں۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا: ہر کسی کے لئے درجات ہیں ان کے عمل کے سبب سے وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ: تیرا ربّ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

اللہ بے نیاز بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ رحمت والا بھی ہے

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ: اور تیرا ربّ بے نیاز ہے۔ غنی: جو کسی کا محتاج نہیں، اس کے مقابلے میں لفظ فقیر آیا کرتا ہے، دوسری جگہ لفظ آئے گا يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ: اے لوگو! تم سب کے سب اللہ کی طرف محتاج ہو، وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (سورۂ فاطر: ۱۵) اللہ تعالیٰ ہی غنی ہے بے نیاز ہے، ہر قسم کی اچھی صفت کے ساتھ موصوف ہے، اور تم سب کے سب محتاج ہو۔ اللہ کے غنی ہونے کا ذکر جو یہاں کیا جا رہا ہے تو یہ انسان کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ تمہارے کفر سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں، اور تمہاری نیکی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں، اگر تم سارے کے سارے باغی ہو جاؤ، جن اور انسان مل کر انتہائی درجے کے باغی ہو جاؤ، تو اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں ایک مچھر کے پَر برابر تم نقصان نہیں پیدا کر سکتے، اور اگر سارے کے سارے فرمانبردار ہو جاؤ تو اللہ کے ملک میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

پھر بے نیازی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کسی کے حال پر انسان متوجہ بھی نہیں ہوتا، انسان اگر بے نیاز ہو جائے کسی سے تو پھر کسی کے حال پر وہ متوجہ نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ ذُو رحمت بھی ہے، اس لئے انسانوں کو سمجھانے کے لئے رسول بھیجتا ہے، کتابیں اتارتا ہے، اُن کو نفع نقصان سمجھاتا ہے، کہ یہ مخلوق کسی خسارے میں نہ پڑ جائے، ہلاکت میں نہ پڑ جائے، ورنہ بے نیازی کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ دوسرے جس حال میں رہیں ہمیں کیا۔ قرآنِ کریم میں انسان کا مزاج یہ نقل کیا گیا ہے كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (پ ۳۰، سورۂ علق) کہ جب انسان اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے تو پھر یہ سرکش ہو جاتا ہے، باغی ہو جاتا ہے، پھر ہر کسی کے مقابلے میں دندناتا ہے، کسی کا کام کرنے کے لئے، کسی کی خدمت کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ یہ ہم

جوایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں یا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے ہیں یہ سب احتیاج کی وجہ سے ہے، سرمایہ دار مزدور کا محتاج ہے، مزدور سرمایہ دار کا محتاج ہے، زمین دار کاشتکار کا محتاج ہے، کاشتکار زمین دار کا محتاج ہے، غریب امیر کا محتاج ہے، اور اسی طرح سے امیر بعض خدمات کے لئے غریب کا محتاج ہے، تو چھوٹے بڑے کا اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ احتیاج ہے جس کی بنا پر ہم ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو احتیاج کسی کا نہیں لیکن اس کی صفت چونکہ یہ بھی ہے کہ وہ رحمت والا ہے، اس لئے بغیر کسی قسم کی ضرورت کے مخلوق پر وہ مہربانی کرتا ہے مخلوق کے نفع کے لئے، تو اللہ کی تعلیمات سے فائدہ اٹھاؤ گے تو اس میں نفع تمہارا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی تعلیمات سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو اللہ کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو غنی ہے۔

قدرتِ الٰہی کے اِظہار کا انداز

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ: اگر وہ اللہ چاہے تو تمہیں لے جائے، اور تمہارے پیچھے خلیفہ بنادے جس کو چاہے، جیسے کہ پیدا کیا تمہیں پچھلے لوگوں کی اولاد سے، مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ: دوسرے لوگوں کی اولاد سے جس طرح سے تمہیں پیدا کیا، اسی طرح سے اگر چاہے تو تمہیں بھی لے جائے اور تمہارے پیچھے اور نسل لے آئے، تدریجاً ترتیب کے ساتھ تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ بڑے مرتے جاتے ہیں چھوٹے پیچھے آتے چلے جاتے ہیں، ایک وقت میں آپ کے گھروں کے اندر آپ کا دادا تھا، پھر باپ تھا، پھر اُس کے بعد آپ آگئے، اسی طرح سے سلسلہ آگے چلتا چلا جائے گا، بالترتیب تو ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا اظہار یوں بھی کیا، کہ یکدم کسی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا اور اُس کی جگہ دوسری قوم کو آباد کردیا، اس کی مثالیں بھی بے شمار ہیں، کہ ایک ہی آن کے اندر قوم کی قوم ختم ہوگئی، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اور پیدا کردیئے، اللہ تعالیٰ کی زمین ویران نہیں ہوئی، اُس کی رونق بحال رہی، مٹنے والے مٹ گئے، یہ اللہ کی قدرت ہے کہ ''اگر چاہے تو تم سب کو لے جائے، اور خلیفہ بنادے تمہارے پیچھے جس کو چاہے، جیسے کہ پیدا کیا تمہیں پہلے لوگوں کی اولاد سے'' قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ: جو پہلے گزر گئے۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ: جس چیز کا تم وعدہ کیے جاتے ہو البتہ آنے والی ہے، وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ: اور تم ہرانے والے نہیں ہو، عاجز کرنے والے نہیں ہو، اللہ تعالیٰ جب تمہیں فنا کرنا چاہے گا، فنا کرنے کے بعد دوبارہ اٹھانا چاہے گا، قیامت وغیرہ جنت دوزخ جتنی وعدے کی چیزیں ہیں سب آئیں گی، اور اللہ تعالیٰ جو واقع کرنا چاہے گا واقع کرلے گا، اور تم اُسے عاجز کرنے والے نہیں ہو۔

منکرین سے جھگڑا ختم کرنے کے لئے آخری بات

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: آپ یہ کہہ دیجئے کہ اے میری قوم! عمل کرو تم اپنی حالت پر، جیسے حال میں تم ہو اپنی جگہ پر تم عمل کرتے رہو، اِنِّىْ عَامِلٌ: میں بھی عمل کرنے والا ہوں، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ: عنقریب جان لوگے تم، کون ہے وہ شخص جس کے لئے عاقبۃ الدار ہے، دار سے دارِ آخرت مراد ہے، عاقبت سے اچھا انجام مراد ہے، انجام کار اچھی حالت کس کو ملتی ہے تمہیں خود پتا چل جائے گا۔ یہ بات کو ختم کرنے کے لئے، جھگڑا چکانے کے لئے آخری آخری بات ہوتی ہے کہ اگر ہمارے سمجھائے ہوئے تم نہیں سمجھتے تو بہت اچھا! اپنے حال پر چلتے رہو، اپنی جگہ پہ تم بھی کام کرتے رہو، عنقریب پتا چل جائے گا کہ اچھا

انجام کس کا ہے؟ دار سے دارِ آخرت اور عاقبت سے اچھا انجام مراد ہے، '' آخرت کا اچھا انجام کس شخص کے لئے ہے تم عنقریب جان لو گے۔'' اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ: یہ بات تو واضح ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پا سکتے، اور ظالم کا اصل مصداق اور اعلیٰ مصداق تو مشرک ہے، اور ہر بدعملی ظلم کا مصداق ہے، چاہے وہ غیر پر ہو چاہے وہ اپنے آپ پر ہو، '' بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے۔''

مشرکانہ رُسومات کی تردید

آگے اُن کی بعض مشرکانہ رُسوم کی تردید ہے، وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا: مقرر کیا انہوں نے اللہ کے لئے ایک حصّہ اُس چیز میں سے جو اللہ نے پیدا کیا، چاہے وہ کھیتی ہے چاہے چوپائے، مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ یہ مَا ذَرَاَ کا بیان ہے، '' جو اللہ نے کھیتی پیدا کی اور جو چوپائے پیدا کئے اس میں سے انہوں نے اللہ کے لئے ایک حصّہ لگایا'' یعنی کچھ اس میں سے اللہ کے نام کا نکال دیا، جس کو فقراء پر خرچ کرتے ہیں، مساکین پر خرچ کرتے ہیں، دوسرے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں، فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ: پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ حصّہ تو اللہ کے لئے ہے اُن کے خیال کے مطابق، اور ایک دوسرا حصّہ لگالیا، وہ کہتے ہیں هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا: یہ ہمارے شرکاء کے لئے ہے، یعنی مالی عبادت جس طرح سے نذر و نیاز وغیرہ ہے، اللہ کے لئے بھی وہ مانتے ہیں، غیر اللہ کے لئے بھی مانتے ہیں، یہی اُن کا شرک ہے کہ پیدا اللہ نے کی کھیتی بھی اور چوپائے بھی......! نذر و نیاز اور دوسرے کے نام پر جو کچھ وہ دیتے تھے دو ہی قسمیں تھی، یا نباتات میں سے تھیں یا حیوانات میں سے تھیں، جو چیز بھی نذر و نیاز کے طور پر دی جاتی ہے وہ یا حیوانات میں سے ہوتی ہے یا نباتات میں سے ہوتی ہے، تو مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ کے اندر دونوں قسمیں ذکر کردیں، کہ چاہے وہ حیوانات ہیں چاہے وہ نباتات ہے، پھل ہے، غلّہ ہے، سبزیاں ہیں، فروٹ ہیں، سب کچھ پیدا کیا ہوا اللہ کا ہے، تو جب اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے چاہیے تو یہ تھا کہ جتنا خرچ کرنا چاہتے ہیں اللہ کے نام پر خرچ کریں، لیکن انہوں نے اپنے خیال کے مطابق کچھ حصّہ تو اللہ کے لئے متعین کرلیا اور کچھ شرکاء کے لئے۔ پھر ساتھ بے انصافی یہ کہ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ: جو ان کے شرکاء کے لئے ہوتا ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتا، یعنی اگر کسی وجہ سے اللہ کے لئے رکھے ہوئے حصے میں کوئی کمی آگئی مثلاً کوئی جانور مرگیا، یا کچھ ایسا ہوگیا، تو ایسا تو نہیں کریں گے کہ اپنے شرکاء کے رکھے ہوئے حصے میں سے نکال کر اُس کو پورا کردیں، اور ایسا ہوجائے گا کہ اگر شرکاء کے حصے میں کسی قسم کی کمی ہوگئی تو اللہ والے حصے سے نکال کر شرکاء کا حصّہ پورا کریں گے، اُن کو نہیں ناراض کرنا چاہتے، اور اُن کے حصے میں کمی نہیں ڈالنا چاہتے، '' پھر جو کچھ اُن کے شرکاء کے لئے ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتا'' وَمَا كَانَ لِلّٰهِ: اور جو کچھ اللہ کے لئے ہے فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ: وہ شرکاء کی طرف پہنچ جاتا ہے، یعنی یہاں آکر بھی ترازو کے دو پلڑوں میں سے پلڑا جب جھکتا ہے تو شرکاء کا ہی جھکتا ہے، ان کا قلبی رُجحان جتنا ہے وہ سارے کا سارا ادھر ہے، کہ اللہ کی تو پروا نہیں، کم چلا گیا تو بھی کوئی بات نہیں ہے، اللہ کے لئے قرار دیئے ہوئے میں سے نکال کر دوبارہ شرکاء کی طرف کردیا جائے اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے لیکن جو شرکاء کے لئے متعین کیا جاچکا ہے وہ کبھی بھی اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے، سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ: بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔

مشرکین بچوں کو کیوں قتل کرتے تھے؟

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ: شُرَكَآؤُهُمْ یہ زَيَّنَ کا فاعل ہے۔''ایسے ہی''یعنی جس طرح سے ان مالیات کے اندر شیاطین نے ان کو غلط راستے پر ڈال دیا،''ایسے ہی مزین کردیا بہت سارے مشرکوں کے لئے اولاد کا قتل کرنا ان کے شرکاء نے'' جو کہ جنات ہیں، یا جنات سے متاثر انسان ہیں انہوں نے ان کے سامنے مزین کردیا اپنی اولاد کا قتل کرنا، اولاد کو قتل کرتے تھے یا تو انہی غلط نظریات کی بنا پر، غیرت کی بنا پر کہ ہماری لڑکی کسی اور کے گھر چلی جائے گی، اور یہ اپنی نخوت کے خلاف سمجھتے تھے کہ ہماری بیٹی کسی کے نکاح میں ہو، اور یا اسی نظریے کے تحت کہ یہ رزق میں حصہ دار ہوجائیں گے، رزق ہمارے پاس کم ہے، ہم کیسے ان کو کھلائیں گے، خود ہمیں کھانے کے لئے نہیں ملتا، یا جتنا ملتا ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے، یہ اور آجائیں گے تو ہمارے لئے ناکافی ہوجائے گا، دونوں نظریے تھے، کوئی تنگدستی میں مبتلا تھا اس لئے بچوں کو برداشت نہیں کرتا تھا، اور کوئی تھا تو خوش حال لیکن یہ اُس کو اندیشہ تھا کہ اگر یہ آبادی زیادہ ہوگئی، گھر کے اندر افراد زیادہ پیدا ہوگئے تو پھر ہمارا رزق تنگ ہوجائے گا، دونوں صورتوں میں ہی قتل کرتے تھے، اور ایک صورت یہ بھی تھی کہ بتوں کے نام پر بچوں کی بھینٹ بھی چڑھاتے تھے، اگر ہمارا فلاں کام ہوگیا تو ہم اپنے پیارے بیٹے کو فلاں بت کے پاس جاکر اس کے نام پر ذبح کردیں گے، ایسے واقعات بھی تھے، تو ان کے شرکاء نے اُن کے لئے اُن کی اولاد کا قتل کرنا مزین کر رکھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے لِيُرْدُوْهُمْ: تاکہ وہ شرکاء اِن لوگوں کو، ان انسانوں کو بربادی میں ڈال دیں، کہ اولاد کے قتل کرنے سے دُنیا کی بربادی بھی ہے اور آخرت کی بھی وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ: تاکہ اِن کے اُوپر ان کے دینی طریقے کو خلط ملط کردیں، یہ شرکاء اس لئے اِن کو یہی وسوسے ڈالتے ہیں اور باتیں سکھاتے ہیں کہ اِن کے دینی طریقے کو بھی خلط ملط کرنا چاہتے ہیں، اور ایسے ہی اِن کو دین و دُنیا کے اعتبار سے برباد بھی کرنا چاہتے ہیں۔

آگے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ: یہ اللہ نے اپنی حکمت کے تحت اِن کی ڈوری ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے، اور اِن کو مہلت دے دی ہے، جنوں اور شیاطین کو گمراہ کرنے کی اور انسانوں کو اپنے مفاد کے تحت غلط راستے اختیار کرنے کی، ورنہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، زبردستی ان کو سیدھے راستے پر چلا دیتا، گمراہی اختیار کرنے کی اِن میں صلاحیت ہی نہ رکھتا، لیکن یہ اللہ کی حکمت ہے، فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ: رہنے دیجئے انہیں، چھوڑ دو انہیں اور ان باتوں کو جو یہ گھڑتے ہیں، جو جھوٹی باتیں بناتے ہیں ان کو ان کے ساتھ ہی رہنے دیجئے، ذَرْهُمْ: یعنی ان کی طرف سے توجہ ہٹالو، اعراض کرلو، ان کی باتوں پر زیادہ فکر مند نہ ہوا کرو۔

جانوروں کی حلت وحرمت کے متعلق مشرکانہ قواعد اور دورِ حاضر میں اس کے نمونے

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ: حجر ممنوع کے معنی میں ہے، کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور یہ کھیتی ممنوع ہے، ممنوع ہے کا کیا مطلب؟ کہ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ: اس کو نہیں کھا سکے گا کوئی مگر وہی جس کو ہم چاہیں گے بِزَعْمِهِمْ: اُن کے اپنے گمان کے مطابق۔ گویا کہ وہ مشرک لوگوں کے جو قائدین تھے وہی ان کو فتوے دیتے کہ فلاں چیز فلاں کے لئے کھانی جائز ہے، فلاں چیز فلاں

کے لئے کھانی جائز نہیں، جس کا نمونہ اگر آپ نے دیکھنا ہو تو یہ جعفر رحمہ اللہ کے کونڈوں کا فلسفہ بھی ان جاہلوں سے سُن کر دیکھو، یہ جو امام جعفر رحمہ اللہ کے کونڈے بنتے ہیں، اسی مہینے میں بناتے ہیں،[1] ہم نے تو یہیں (کہروڑ پکا میں) آ کر سُنا ہے، اس سے پہلے تو سُنا ہی نہیں کہ حلوہ پکاتے ہیں، کوئی خاص ترتیب کے ساتھ پکاتے ہیں، خاص وزن کے ساتھ پکاتے ہیں، خاص اوقات میں پکاتے ہیں، پھر کھانے کا ایک طریقہ متعین کر رکھا ہے، کہ فلاں قسم کا آدمی کھا سکتا ہے، فلاں قسم کا نہیں کھا سکتا، ایسے وقت میں کھایا جائے گا، پھر جو کھائے وہ اگلے سال اتنا کر کے دے، اس طرح سے اندر اندر ہی یہ رسم چلتی ہے، یہ کھانے پینے کے بارے میں اس قسم کے قواعد جیسے مشرکوں کے قائد بتاتے تھے، آج کل یہی قصہ یہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کے اُوپر اپنی طرف سے پابندیاں، کہ فلاں کھا سکتا ہے، فلاں نہیں کھا سکتا، فلاں وقت میں کھا سکتا ہے، فلاں وقت میں نہیں کھا سکتا، یہ بالکل وہی جاہلانہ اور مشرکانہ رسم ہے، جو کہ اس زمانے کے اندر بھی اُن کے بتوں کے جو مجاور ہوتے تھے جو مہند ہوتے تھے، وہ اس قسم کی شریعت اُن کے لئے بنائے بیٹھے تھے اور ایسے اَحکام دیتے تھے، اُسی کے نمونے آج بھی موجود ہیں، شیاطین اس قسم کی باتیں سکھاتے ہیں، ''کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہے'' ''ممنوع ہونے کا معنی یہ ہے کہ ''نہیں کھا سکے گا اس کو مگر وہی جس کو ہم چاہیں گے'' یعنی یہ بات اُن کے اپنے خیال کے مطابق تھی، وَاَنْعَامٌ: اور کچھ چوپائے ہیں حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا: کہ اُن کی پشتیں حرام کر دی گئی ہیں، کہ اُن کے اُوپر سواری جائز قرار نہیں دیتے، وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا: اور بعض چوپائے ہیں کہ جن کے اُوپر اللہ کا نام نہیں لیتے، یعنی بتوں کی طرف منسوب کر دینے کی وجہ سے سواری نہیں کرتے، بتوں کی طرف منسوب ہو جانے کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فلاں بُت کا ہو گیا یعنی ہمارے شریک کا، اب اگر اِس کا دُودھ دوہتے وقت اللہ کا نام لے لیا، یا اِس کے اُوپر سواری کرتے وقت اللہ کا نام لے لیا، یا اِس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے لیا تو ہمارے شرکاء ناراض ہو جائیں گے، اس لئے وہ ممنوع کر دیتے ہیں کہ اِن پر کسی وقت بھی اللہ کا نام نہیں لینا تا کہ ان شرکاء کو تکلیف نہ پہنچے، یہ اُن کے اپنے بنائے ہوئے مسئلے تھے، اور اپنی بنائی ہوئی شریعت تھی، اِفْتِرَآءً عَلَيْهِ: اللہ پر اِفترا کرتے ہوئے، یعنی کہتے وہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم اسی طرح سے ہے، یہ سارے کا سارا ان کا اللہ پر اِفترا ہے، سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: جو یہ باتیں گھڑتے ہیں، اپنی طرف سے باتیں بناتے ہیں ان کا اللہ تعالیٰ ان کو بدلہ دے گا۔ وَقَالُوْا: اور یہ کہتے ہیں مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا: کہ اِن چوپاؤں کے پیٹ میں جو کچھ ہے، ان جانوروں کے پیٹ میں جو کچھ ہے یہ ہمارے مذکروں کے لئے ہے خالص، اس کو عورت نہیں کھا سکے گی، یعنی بعض جانور جو کسی خاص مقصد کے لئے وہ نذر و نیاز کے طور پر چھوڑتے تھے اُن کے پیٹ سے نکلا ہوا دُودھ، اُن کے پیٹ سے نکلا ہوا بچہ، وہ کہتے تھے کہ مرد کھا سکتے ہیں عورتیں نہیں کھا سکتیں، وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا: ہماری بیویوں پر یہ حرام ہیں، وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً: لیکن اگر پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ مُردہ پیدا ہو جاتا، فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ: تو پھر مرد و عورت اکٹھے ہو کر اُس کو کھا لیتے ہیں، زندہ پیدا ہو تو صرف مردوں کا حصہ ہے، مُردہ پیدا ہو جائے تو عورتیں بھی حصہ دار ہیں اور مرد بھی حصہ دار ہیں، یہ اُن کے بنائے ہوئے مسئلے جن کو انہوں نے ایک

---

(۱) یہ درس رجب ۱۴۰۰ھ کا ہے۔

شریعت کے طور پر اپنے لئے بنالیا تھا، اور اپنا طرزِ زندگی متعین کرلیا تھا، یہ بیہودہ قسم کے اُن کے فتوے تھے، اُن کے مجاوروں کے، اور بت پرستی کے جو لیڈر تھے اُن کے، یہ اُنہی کا نمونہ دکھایا جارہا ہے، یہ ساری کی ساری مشرکانہ رسمیں ہیں، اور ان کو اگر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں تو یہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، اور اِس جھوٹ کی اللہ انہیں سزا دے گا، تو ایسے ہوتا ہوگا کہ بعض جانور جو کسی بت کی طرف منسوب کردیئے جاتے ہوں گے ان پر وہ اس قسم کی پابندیاں لگاتے تھے، کہ اُن کے اندر سے جو چیز بھی نکلے گی بچہ پیدا ہوگا وہ مرد کھاسکیں گے عورتیں نہیں، ہاں! البتہ اگر وہ مرا ہوا ہو تو پھر وہ عورتیں بھی کھاسکتی ہیں، سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ: اِن کو بدلہ دے گا اللہ تعالیٰ اِن کے بیان کا، اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ: بے شک وہ حکمت والا ہے علم والا ہے۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ: تحقیق خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنے بچوں کو قتل کیا نادانی سے بغیر علم کے، یہ جاہلانہ انداز کے ساتھ نادانی سے اپنے اولاد کو قتل کرتے ہیں، چاہے وہ کسی وجہ سے قتل کرتے ہوں، نخوت اور غرور کی بنا پر قتل کرتے تھے، یا رزق کی تنگی کی وجہ سے یا رزق کی تنگی کے اندیشے سے قتل کرتے تھے، یا بتوں کے نام بھینٹ چڑھا کر اُن کو ذبح کرتے تھے، وہ سب اس میں آگئے، ''خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنے بچوں کو قتل کیا نادانی سے بغیر علم کے، اور حرام ٹھہرایا اُس چیز کو جو اللہ نے انہیں دی'' اللہ نے دی تھی کھانے کے لئے، لیکن انہوں نے اُس کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرالیا، افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ: اللہ کے اُوپر بہتان باندھتے ہوئے، یعنی نسبت اِن سب کاموں کی وہ اللہ کی طرف کرتے ہیں، قَدْ ضَلُّوْا: تحقیق یہ لوگ بھٹک گئے، گمراہ ہوگئے، وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ: اور یہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ
وہی ہے جس نے پیدا کیا ایسے باغات کو جو سہارے دے کر اُونچے کیے جاتے ہیں اور جو سہارے دے کر اُونچے نہیں کیے جاتے،
وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا
اور (پیدا کیا) کھجور کے درختوں کو اور کھیتی کو اس حال میں کہ مختلف ہیں اُس سے حاصل شدہ کھانے کی چیزیں، اور زیتون کو اور انار کو، جو آپس میں
وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ
ملتے جلتے ہیں اور جو آپس میں ملتے جلتے نہیں ہیں، کھاؤ ان میں سے ہر ایک کے پھل کو جس وقت کہ وہ پھل دے، اور دیا کرو اُس کا حق
حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الْاَنْعَامِ
اُس کو کاٹنے کے دن، اسراف نہ کیا کرو، بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ﴿۱۴۱﴾ گھریلو جانوروں

حَمُولَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

میں سے اس نے بڑے قد کے پیدا کیے اور چھوٹے قد کے پیدا کیے، کھاؤ اُس چیز میں سے جو اللہ نے تمہیں دی، اور شیطان کے نقش

الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ

قدم کی اتباع نہ کرو، بیشک وہ تمہارے لئے صریح دشمن ہے ﴿۱۴۲﴾ (پیدا کیں اللہ نے انہی انعام میں سے) آٹھ قسمیں، ضان میں سے

اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ

بھی دو قسمیں اور معز میں سے بھی دو قسمیں، آپ پوچھیے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان میں سے مذکروں کو حرام کیا ہے یا مؤنثوں کو؟

اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ

یا اس چیز کو جس کے اُوپر انثیین کے ارحام مشتمل ہوں؟ خبر دو مجھے کسی علمی دلیل کے ساتھ

صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ

اگر تم سچے ہو ﴿۱۴۳﴾ اور (پیدا کیں) اونٹوں میں سے بھی دو قسمیں اور گائے میں سے بھی دو قسمیں، آپ (ان سے) پوچھیے

ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ

کہ کیا ان دو مذکروں کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے یا دو مؤنثوں کو یا اُس چیز کو جس کے اُوپر مشتمل ہیں

الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ

انثیین کے ارحام؟ کیا تم اُس وقت موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کی وصیت کی تھی؟ پھر کون بڑا ظالم ہے

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اس شخص سے جو اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑے تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرے، بے شک اللہ تعالیٰ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ

ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا ﴿۱۴۴﴾ آپ کہہ دیجئے کہ نہیں پاتا میں اُس چیز میں جو میری طرف وحی

مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا

کی گئی، حرام ٹھہرائی ہوئی کوئی چیز کھانے والے پر جو اُس کو کھاتا ہے، مگر یہ کہ وہ چیز میتہ ہو، یا بہنے والا خون ہو،

أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۚ فَمَنِ

یا خنزیر کا گوشت ہو، پس بیشک یہ خنزیر نجس ہے، یا وہ جانور سبب فسق ہو جس کے اُوپر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کر دی گئی، پھر جو شخص

اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَى

مضطر کر دیا جائے اس حال میں کہ وہ طالبِ لذّت نہ ہو اور نہ وہ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو پس بیشک تیرا رَبّ غفور رحیم ہے ﴿۱۴۵﴾ اور

الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ

لوگوں پر جو کہ یہودی ہو گئے ہم نے حرام ٹھہرایا ہر ناخن والا جانور، اور گائے اور بکریوں میں سے

حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا

حرام کر دیا ہم نے اُن یہودیوں پر اِن کی چربیوں کو مگر وہ چربی جس کو اُٹھاتی ہیں ان دونوں کی پشتیں، یا وہ چربی جس کو ان کی آنتڑیاں اُٹھاتی ہیں

أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۱۴۶﴾

یا وہ چربی جو ہڈّی کے ساتھ خلط ملط ہے، یہ ہم نے اُن کو سزا دی تھی اُن کی سرکشی کے سبب سے، بے شک ہم البتہ سچے ہیں ﴿۱۴۶﴾

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ

پھر اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو پھر آپ کہہ دیجئے! کہ تمہارا رَبّ وسیع رحمت والا ہے، نہیں رَدّ کیا جاتا اُس کا عذاب

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۴۷﴾ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ

مجرم لوگوں سے ﴿۱۴۷﴾ عنقریب کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا کہ اگر اللہ چاہتا

مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ

تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، اسی طرح سے تکذیب کی

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ

اُن لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا، آپ ان سے پوچھئے کہ کیا تمہارے پاس

عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا

کوئی علم ہے؟ پھر تم اُس علم کو ظاہر کرو ہمارے لئے، نہیں پیروی کرتے تم مگر توہمات کی، اور نہیں ہو تم مگر

تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اٹکل چلاتے ﴿۱۴۸﴾ آپ کہہ دیجئے! پوری پوری حجت اللہ ہی کے لئے ہے، پھر اگر وہ چاہتا تو ہدایت دے دیتا تم سب کو ﴿۱۴۹﴾

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ

آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اپنے گواہوں کو جو گواہی دیں کہ بے شک اللہ نے اس چیز کو حرام ٹھہرایا ہے،

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

پھر اگر وہ شہادت دے ہی دیں تو آپ اُن کے ساتھ شہادت نہ دیں، اور پیروی نہ کریں آپ اُن لوگوں کی خواہشات کی جو ہماری

بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

آیات کو جھٹلاتے ہیں، اور جو آخرت کے ساتھ ایمان نہیں لاتے، اور وہ اپنے ربّ کے برابر دوسروں کو ٹھہراتے ہیں ﴿۱۵۰﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ: وہی ہے جس نے پیدا کیا باغات کو، باغات دو قسم کے مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ۔ مَّعْرُوْشٰتٍ یہ لفظ عرش سے لیا گیا ہے، عرش سے یہاں مراد ہے بیلوں کے نیچے جو سہارا دے کے بیلوں کو اونچا کیا جاتا ہے، اُردو میں اس کو ٹٹی کہتے ہیں۔ ٹٹیوں پہ اُونچے کیے ہوئے، سہاروں کے اُوپر بلند کیے ہوئے، وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ: اور جو سہاروں کے اُوپر اُونچے کیے ہوئے نہیں ہیں۔ ''سہاروں کے اُوپر اُونچے کیے ہوئے'' اس کی واضح مثال ہے جیسے انگور کی بیل، یہ زمین پر نہیں پھیلائی جاتی، بلکہ سہارا دے کے اس کو اونچا پھیلاتے ہیں، تب جا کے یہ اچھی پھلتی ہے، اور اگر زمین پر پڑی رہے تو یا پھلے گی نہیں، اگر پھلے گی تو کم پھلے گی اور اس کا پھل اچھا نہیں ہوگا، وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ: جو سہاروں کے اُوپر اُونچے نہیں کیے جاتے، اس سے مراد درخت بھی ہو سکتے ہیں جو تنے پہ کھڑے ہیں، اور ان کو سہارا دے کے اُونچا نہیں کیا جاتا، اور اس کی مثال وہ بیلیں بھی ہو سکتی ہیں جو عادۃً زمین پر پھیلائی جاتی ہیں اور سہارے دے کے اُونچی نہیں کی جاتیں، جیسے کہ خربوزے کی بیل ہوگئی، تربوز کی ہوگئی، ککڑی کی ہوگئی، یہ بیلیں زمین پر پھیلتی ہیں، ان کو اگر اونچا کر دیا جائے تو پھر یہ پھلتی نہیں، یا پھلیں گی تو پھل اچھا نہیں ہوگا۔ ''ایسے باغات جو سہارے دے کر اونچے کیے جاتے ہیں اور ایسے باغات جو سہارے دے کر اونچے نہیں کیے جاتے'' وَّالنَّخْلَ: اور وہی ہے جس نے پیدا کیا کھجور کے درختوں کو، وَالزَّرْعَ: اور کھیتی کو، مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ: اُكل: ماکول، کھانے کی چیز۔ ''ہٗ'' ضمیر کل واحد کے اعتبار سے ہر کسی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس حال میں کہ مختلف ہیں اس سے حاصل شدہ کھانے کی چیزیں۔ اُکل ماکول کو کہتے ہیں، یہ پھل پر بھی بولا جاتا ہے، اور کھیتی سے جو غلہ جات حاصل ہوتے ہیں اس پر بھی بولا جاتا ہے، ہر وہ چیز جو کھانے کے لیے حاصل ہو جائے اس کو اُکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو ان میں سے ہر ایک سے کھانے کی چیز جو حاصل ہوتی ہے،

مُخْتَلِفًا: وہ مختلف ہے، ذائقے کے اعتبار سے مختلف ہیں، رنگ کے اعتبار سے مختلف ہیں، حجم کے اعتبار سے مختلف ہیں، فوائد منافع کے اعتبار سے مختلف ہیں، وَالزَّيْتُونَ: اور پیدا کیا اس نے زیتون کو، وَالرُّمَّانَ: اور اَنار کو۔ ''زیتون'' زیتون کے درخت کو بھی کہتے ہیں اور پھل کو بھی، اسی طرح سے ''رُمان'' اَنار کے درخت کو بھی کہتے ہیں اور پھل کو بھی، مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ: زیتون اور رُمان میں سے ہر ایک آپس میں ملتا جلتا، اور آپس میں جدا جدا، جو آپس میں ملتے جلتے نہیں ہیں، ایک زیتون دوسرے زیتون کے ساتھ حجم میں ذائقے میں رنگت میں مشابہ ہے، اور بعض زیتون بعض زیتون کے ساتھ مزے میں ذائقے میں رنگت میں مشابہ نہیں ہے، اسی طرح سے انار انار کے مشابہ بھی ہے اور فرق بھی ہے، ''آپس میں ملتے جلتے اور آپس میں جدا جدا''۔ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ: جو آپس میں ملتے جلتے نہیں ہیں بلکہ جدا جدا ہیں۔ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ: کھاؤ ان میں سے ہر ایک کے پھل کو جس وقت کہ وہ پھلے، جس وقت کہ وہ پھل والا ہو جائے، پھل دے، وَاٰتُوْا حَقَّهٗ: اور دیا کرو اس کا حق، يَوْمَ حَصَادِهٖ: اس کو کاٹنے کے دِن۔ حصاد: کاٹنا۔ یہ اُردو میں زرع کے ساتھ صادق آتا ہے، اور توڑنا پھل کے ساتھ صادق آتا ہے۔ حصاد کا لفظ دونوں پر بولا جاتا ہے، اس لیے ہم اپنے محاورے کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یوں ہی کریں گے کہ ''اس کے کاٹنے توڑنے کے دن اس کا حق ادا کیا جائے''، حَقَّهٗ کی ضمیر ان میں سے ہر ایک کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، یعنی جو حق ان میں متعین ہے، زرع کے اندر جو حق متعین ہے اور پھل کے اندر جو حق متعین ہے وہ دیا کرو اس کے کاٹنے توڑنے کے دن۔ اور حَقَّهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق جو ان چیزوں کے اندر متعین ہے وہ اس کے کاٹنے توڑنے کے دن دیا کرو، مفہوم دونوں اعتبار سے ایک ہی ہے۔ وَلَا تُسْرِفُوْا: اِسراف نہ کیا کرو، حد سے زیادہ خرچ نہ کیا کرو، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ: بیشک وہ اِسراف کرنے والوں کے پسند نہیں کرتا۔ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا: اَنعام نَعَمٌ کی جمع، چوپائے، خاص طور پر جو گھروں میں رکھے جاتے ہیں۔ حَمُوْلَةً: بوجھ اٹھانے والے، قدآور، بڑے قد کے جن کے اوپر بوجھ لادا جاتا ہے، جیسے اونٹ۔ اور فرش: مفروش، زمین پہ بچھے ہوئے، یعنی چھوٹے قد کے جن کے اوپر بوجھ نہیں اُٹھایا جاتا۔ اور یہ بھی ''اَنْشَاَ'' کا مفعول ہے اَنْشَاَ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا مِنَ الْاَنْعَامِ، چوپایوں میں سے، گھریلو جانوروں میں سے، چوپایوں میں سے جو عام طور پر گھروں میں پالے جاتے ہیں، اس نے بڑے قد کے پیدا کیے، یعنی جو بوجھ اٹھانے والے ہیں، اور چھوٹے قد کے پیدا کیے جو بوجھ اُٹھانے والے نہیں ہیں، ان سے گوشت، چمڑے، اُون اور دُودھ کا فائدہ لیا جاتا ہے، بوجھ نہیں لادا جاتا۔ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ: کھاؤ اس چیز میں سے جو اللہ نے تمہیں دی، وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ: اور ان کو اپنی طرف سے حرام ٹھہرا کر شیطان کے نقشِ قدم کی اتباع نہ کرو۔ خطوات خُطوۃ کی جمع ہے اور چلتے وقت دو قدموں کے درمیان میں جو فاصلہ ہوتا ہے وہ خطوۃ کہلاتا ہے، اور جس وقت آپ کسی کے خطوات کی اتباع کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی چال بالکل اس کی چال کے مشابہ ہو جائے گی، ایک آدمی آگے آگے جا رہا ہو اور آپ اس کے پیچھے پیچھے چلیں، اس کے پاؤں پہ پاؤں رکھتے جائیں، تو آپ کے قدموں میں اتنا ہی فاصلہ ہوتا جائے گا جتنا اگلے چلنے والے کے قدموں کے درمیان میں فاصلہ تھا، تو آپ چال چلن میں مکمل طور پر اس کے تبع ہو جائیں گے، تو یہ کامل اتباع سے کنایہ ہوتا ہے۔ ''شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو، اس کی کامل اتباع مت کرو'' یعنی اِن میں سے بلا دلیل بعض کو حرام ٹھہرا کر شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ: بیشک وہ

تمہارے لیے صریح دشمن ہے۔ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: پیدا کیں اللہ تعالیٰ نے انہی اَنعام میں سے آٹھ قسمیں۔ اَزواج زَوج کی جمع ہے، دو چیزیں جو آپس میں جوڑا ہوتا ہے تو جوڑے کو بھی ''زوج'' کہہ دیا جاتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے لیے بھی ''زوج'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جس طرح سے ''زوجین'' خاوند بیوی کے لیے بولتے ہیں، اور اکیلے خاوند کو بھی ''زوج'' کہتے ہیں، اکیلی بیوی کو ''زوجہ'' کہتے ہیں، اور دونوں کے مجموعے کو ''زوجین'' کہہ دیتے ہیں، تو جو جوڑا ہوا کرتا ہے تو جوڑے پر بھی ''زوج'' کا لفظ بولا جاتا ہے، اور اس جوڑے میں سے ہر فرد پر بھی ''زوج'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: آٹھ زوج، یعنی آٹھ قسمیں، مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ: دو قسمیں تو ہو گئی ضان میں سے، ضان تو ہو گیا بھیڑ یا دُنبہ، یعنی جن کے بدن کے اُوپر اُون ہوتی ہے بال نہیں ہوتے، تو بھیڑ، چھترا، دُنبہ اس کا مصداق ہیں، اس میں سے دو قسمیں، وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ: اور معز کہتے ہیں بکرے کو جس کے اُوپر بال ہوتے ہیں اُون نہیں ہوتی، ''اور معز میں سے بھی دو قسمیں'' دو قسموں سے مراد ہیں نَر اور مادَہ، ''معز میں سے بھی دو قسمیں پیدا کیں'' یعنی نَر اور مادَہ، اور ضان، معز دونوں میں سے دو دو قسمیں ہو گئیں نَر اور مادَہ، چار تو یہ ہو گئیں، قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ: آپ ان سے پوچھئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اِن دونوں قسموں میں سے مذکروں کو حرام کیا ہے یا مؤنثوں کو حرام کیا ہے؟ ان میں سے نَر حرام ہیں یا مادَہ حرام ہیں؟ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ: یا وہ چیز حرام ہے جس کے اُوپر اُنثیین کے اَرحام مشتمل ہوں، جو ان کے پیٹوں میں موجود ہے وہ حرام ہے؟ کون سی چیز ان میں سے حرام ہے؟ یہ اِستفہام انکار کے لئے ہے، یعنی کوئی چیز حرام نہیں ہے، نَر بھی حلال ہے، مادَہ بھی حلال ہے، مادَہ کے بطن میں جو بچّہ ہے وہ بھی حلال ہے، نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: خبر دو مجھے کسی علمی دلیل کے ساتھ اگر تم سچے ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ فلاں قسم کا نَر اللہ نے حرام کیا ہے ضان میں سے، فلاں قسم کی مادَہ اللہ نے حرام کی ہے معز میں سے، یا ان کے پیٹوں کے اندر جو بچّہ ہے وہ مذکروں کے لئے حلال ہے، مؤنثوں کے لئے حرام ہے، یا اس کے برعکس، اس قسم کی باتیں جو تم نے کر لی ہیں ان باتوں پر تمہارے پاس اگر کوئی علمی دلیل موجود ہو تو مجھے اس کی خبر دو، ''خبر دو مجھے علم کی'' اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ: اور اُونٹوں میں سے بھی دو قسمیں اللہ نے پیدا کیں، وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ: اور گائے میں سے بھی دو قسمیں پیدا کیں، یہاں بھی دو قسموں سے نَر اور مادَہ مراد ہیں، اُونٹ بھی نَر اور مادَہ، بقر بھی نَر اور مادَہ، ''بقر'' گائے کو کہتے ہیں، ہمارے ہاں جو بھینس ہے یہ بھی ''بقر'' میں ہی شامل ہے، لیکن چونکہ اس کا وجود اُس وقت نہیں تھا عرب میں، اس لیے عام طور پر ''بقر'' کا مصداق یہ نہیں لکھا جاتا، لیکن یہ ہر لحاظ سے اُسی کے حکم میں ہے، حلت میں، قربانی میں، زکوٰۃ میں جو بھی حساب اس کا چلتا ہے اِس کا ساتھ ہی چلتا ہے، آج کل بھی وہاں بھینس کا وجود نہیں ہے، قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ: آپ ان سے پوچھئے کہ کیا ان دو مذکروں کو، یعنی اُونٹ اور گائے میں سے مذکروں کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے یا مؤنثوں کو؟ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ: یا اس چیز کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے جس کے اُوپر مشتمل ہیں اُنثیین کے اَرحام؟ اَرحام رِحم کی جمع ہے ان کی بچہ دانیاں، یعنی اُونٹنی اور گائے کی بچہ دانیاں جس پر مشتمل ہیں یا اس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے؟ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ: کیا تم اس وقت موجود تھے؟ حاضر تھے؟ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا: جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کی وصیت کی تھی، فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑے، لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ: تا کہ بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا، ان کو جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا، کامیابی کا راستہ نہیں دکھائے گا، یہ ظالم ہمیشہ خائب وخاسر ہی رہیں گے۔ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ: آپ کہہ دیجئے کہ نہیں پاتا میں اس چیز میں جو میری طرف وحی کی گئی، مُحَرَّمًا: شَيْئًا مُحَرَّمًا: حرام ٹھہرائی ہوئی کوئی چیز، عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ کھانے والے پر جو اس کو کھاتا ہے، اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً: مگر یہ کہ وہ چیز میتہ ہو، اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا: یا بہنے والا خون ہو، بہایا ہوا خون، اِس سے رگوں کا خون مراد ہوتا ہے جو رگیں کاٹتے وقت بہتا ہے، یا بدن کے کسی دُوسرے حصے پر زخم لگایا جائے تو اس میں سے جو خون ٹپکتا ہے وہ دَمِ مسفوح ہے، اور یہ دَم نجس ہے، حرام ہے، اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ: یا خنزیر کا گوشت ہو، فَاِنَّهٗ رِجْسٌ: پس بے شک یہ خنزیر رجس ہے ناپاک ہے نجس ہے، اسی لفظ سے فقہاء نے استدلال کیا اس کو نجس العین قرار دینے کے لیے، اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: فسق اصل کے اعتبار سے تو نافرمانی کو کہتے ہیں، لیکن یہاں سے مراد ہے سببِ فسق۔ ''یا وہ جانور سببِ فسق ہو جس کے اُوپر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کردی گئی'' وہ شرک کا ذریعہ ہے، فسق کا ذریعہ ہے، اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: یا وہ فسق کا سبب ہو جس کے اوپر اللہ کے غیر کے لیے آواز بلند کردی گئی ہو، فَمَنِ اضْطُرَّ: پھر جو شخص مضطر کردیا جائے، غَيْرَ بَاغٍ: اس حال میں کہ وہ طالبِ لذّت نہ ہو، وَّلَا عَادٍ: اور نہ وہ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: پس بے شک تیرا ربّ غفور رحیم ہے۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا: اور ان لوگوں پر جو کہ یہودی ہوگئے، حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ: ہم نے حرام ٹھہرایا ہر ناخن والا جانور۔ ظُفُر کہتے ہیں ناخن کو، ناخن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا پاؤں پھٹا ہوا نہیں، اور اس کے کنارے کے اُوپر اس طرح سے ناخن کی شکل ہے، اس کا مصداق اُونٹ بھی لکھتے ہیں، اور اسی طرح سے اس کا مصداق شترمرغ بھی لکھتے ہیں، اور ایک کتاب کے اندر اس کا مصداق خرگوش کو بھی لکھا ہے، خرگوش کی اُنگلیاں نہیں ہوتیں میرے خیال میں، خرگوش کا پاؤں اس طرح سے پھٹا ہوا نہیں ہوتا جس طرح سے گائے بھینس کا ہوتا ہے، تو خرگوش کو بھی اس میں شامل کیا ہے، شترمرغ کو بھی شامل کیا ہے، اُونٹ کو بھی شامل کیا ہے، اور گھوڑا، گدھا، خچر وہ بھی اس میں آجاتے ہیں جن کا پاؤں پھٹا ہوا نہ ہو، وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ: اور گائے اور بکریوں میں سے، غنم میں سے، غنم کا لفظ بھیڑ، بکری دونوں کو شامل ہے، حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا: حرام کردیا ہم نے اُن یہودیوں پر ان کی چربیوں کو۔ شُحوم شحم کی جمع ہے، شحم چربی کو کہتے ہیں۔ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا: مگر وہ چربی جس کو اُٹھاتی ہیں ان دونوں کی پشتیں، پشت کے ساتھ لگی ہوئی ہو، اَوِ الْحَوَايَاۤ: یا وہ چربی جس کو ان کی آنتڑیاں اُٹھاتی ہیں، آنتڑیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہو، اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ: یا وہ چربی جو کہ ہڈی کے ساتھ خلط ملط ہے، یہ مستثنیٰ ہیں، باقی ان کے علاوہ چربیاں حرام ہیں، ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ: یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی ان کی شرارت کے سبب سے۔ بَغی: ظلم، بغاوت۔ ان کی سرکشی کے سبب سے یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی، وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ: بے شک البتہ ہم سچے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا خلاف کہنے والے جھوٹے ہیں۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ: پھر اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ: پھر آپ کہہ دیجئے کہ تمہارا ربّ وسیع رحمت والا ہے، وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ: نہیں رَدّ کیا جاتا اس کا عذاب مجرم لوگوں سے۔ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا: عنقریب کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا کہ اگر اللہ چاہتا ہم شریک نہ ٹھہراتے، ہم شرک نہ کرتے، جس طرح سے چاہو کہہ لو، مفہوم ایک ہی ہے، ہم شریک نہ ٹھہراتے، یا ہم شرک نہ کرتے، وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا: اور نہ ہمارے آباؤ اَجداد شرک

کرتے، وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ: اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: اسی طرح سے تکذیب کی اُن لوگوں نے جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا: یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا، قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا: آپ ان سے پوچھئے کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے؟ پھر تم اس علم کو ظاہر کرو ہمارے لیے۔ اِخراج سے ظاہر کرنا مراد ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے پھر تم ظاہر کرو اُس علم کو ہمارے لیے، اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: نہیں پیروی کرتے تم مگر تو ہمات کی، وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ: اور نہیں ہو تم مگر اٹکل چلاتے۔ خرص کہتے ہیں اٹکل کے ساتھ بات کرنا، یعنی عقائد کے درجے میں ظن کے متبع ہیں، اور ان کی باتیں جو ہیں یہ محض رجم بالغیب ہیں، اٹکل کے تیر ہیں، بے سوچے سمجھے چلاتے رہتے ہیں۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ: آپ کہہ دیجئے پس اللہ ہی کے لئے ہے دلیل۔ بالغہ: کامل، دل دماغ تک پہنچنے والی، کمال کو پہنچنے والی، ''پوری پوری حجت اللہ ہی کے لئے ہے''، فَلَوْ شَآءَ: پھر اگر وہ اللہ چاہتا، لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ: تو ہدایت دے دیتا تم سب کو، قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ: آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اپنے گواہوں کو جو گواہی دیں اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا: کہ بیشک اللہ نے اس چیز کو حرام ٹھہرایا ہے، فَاِنْ شَهِدُوْا: پھر اگر وہ شہادت دے ہی دیں، فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ: آپ ان کے ساتھ شہادت نہ دیں، وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور پیروی نہ کریں آپ ان لوگوں کے خیالات کی، خواہشات کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: اور جو آخرت کے ساتھ ایمان نہیں لاتے، وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ: اور وہ اپنے ربّ کے برابر دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور آیات کا مضمون

ماقبل میں مشرکین کی رسوم شرکیہ کا ذکر تھا، جس میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات واضح کی گئی تھی کہ یہ نباتات میں سے بھی، اور حیوانات میں سے بھی، اللہ کے غیر کی نیاز چڑھاتے ہیں، اور اُس کی حلت وحرمت کے لئے انہوں نے اپنی طرف سے قواعد بنا رکھے ہیں، پیچھے یہ لفظ آئے تھے وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا: دو کا ذکر آ گیا نباتات کا اور حیوانات کا، اس میں سے وہ اللہ کا بھی حصہ متعین کرتے ہیں، اور غیر اللہ کا بھی حصہ متعین کرتے ہیں، اور پھر پلڑا ہمیشہ غیر اللہ کا جھکتا ہے، اس لئے اگر غیر اللہ کے حصے میں کسی قسم کی کمی آ جائے تو اللہ کا حصہ کاٹ کر اُس کو پورا کرتے ہیں، لیکن اگر اللہ کے حصے میں کسی قسم کی کمی واقع ہو جائے تو غیر اللہ کا حصہ کاٹ کر اللہ کو نہیں دیتے، کون سا جانور کس کے لئے حرام ہے؟ اس بارے میں اپنی طرف سے قواعد بنا لیے، فلاں جانور پر سواری حرام، فلاں جانور پر اللہ کا نام نہیں لینا، فلاں جانور کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ مذکر کھا سکتے ہیں مؤنث نہیں کھا سکتے، مرا ہوا نکلے تو دونوں کھا سکتے ہیں، یہ ایک ایسا قانونی ضابطہ تھا جو انہوں نے اپنے لئے تجویز کر لیا تھا، اور نسبت کرتے تھے اُس کی اللہ تعالیٰ کی طرف، اس کے اُوپر انکار تھا، آگے آنے والے دونوں رکوع اسی مسئلے سے متعلق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اِن ماکولات میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تمہاری یہ تحریمات بلا دلیل ہیں، اور اس طرح سے تم نے جو کارروائی کر رکھی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی

ناشکری بھی ہے اور شرک بھی، اس لئے دونوں قسموں کا ذکر آ رہا ہے، نباتات کا بھی جو زمین سے اُگتی ہیں اور حیوانات کا بھی۔

اِحسانات باری تعالیٰ کا ذکر

پہلے تو نباتات کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا، جس میں اُس کی قدرت بھی نمایاں ہے اور احسان بھی نمایاں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد اِس کو جو کھانے کا محتاج بنایا اور اِس کی زبان کے اندر جو ذوق رکھا تو اس کے ذوق کو پورا کرنے کے لئے، اس کی کھانے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نباتات میں سے بھی کیسی کیسی چیزیں پیدا کیں، اور اِس کے دسترخوان کو کس طرح سے سجایا، یہ نہیں کہ جانوروں کی طرح اگر یہ کھانے کا محتاج تھا تو زمین میں گھاس اُگا دی، اب ہر روز اٹھو، صبح صبح گھاس کھا کر اپنے پیٹ کو بھر لو، انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے تو اِس کو صرف گھاس سے پیٹ بھرنے پر ہی مجبور نہیں کیا، بلکہ اس کی زبان کے تلذذ تک کی رعایت رکھی ہے، اِس کی آنکھوں کے لئے بہار اور نشاط پیدا کرنے والی چیزوں کی رعایت بھی رکھی ہے، پیٹ بھرنے کے لئے مختلف قسم کی چیزیں جو لذّت میں بھی مختلف ہیں فوائد میں بھی مختلف ہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں، اس میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احسان بھی انسانوں کے اُوپر بہت نمایاں ہیں، پہلے تو وہی مختلف قسم کی چیزیں ذکر کی ہیں نباتات کی جو اللہ نے انسان کے کام و دہن کی لذت کے لئے اور اس پیٹ کو بھرنے کے لئے پیدا فرمائیں، ''اللہ وہ ہے جس نے باغات پیدا کیے، بعض باغات ایسے ہیں جو سہارے دے کر اونچے کیے جاتے ہیں، ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو سہارے دے کر اونچے نہیں کیے جاتے'' ان کی مراد آپ کے سامنے واضح کر دی گئی، ''کھجور کے درخت پیدا کیے، کھیتیاں پیدا کیں'' کھیتیوں کے اندر سب غلہ جات اور سبزیاں آ گئیں، مختلف قسم کی جو گنی نہیں جا سکتیں، اتنی کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مختلف علاقوں کے اندر سبزیاں پھل اور غلہ جات پیدا کیے ہیں، ''اور اُن کا اُکل مختلف ہے'' یعنی اُن سے جو کھانے کی چیز حاصل ہوتی ہے وہ مختلف ہے، ایک ہی جیسی نہیں، رنگ رُوپ کے اعتبار سے مختلف ہے، حجم کے اعتبار سے مختلف ہے، لذت کے اعتبار سے مختلف ہے، فوائد و منافع کے اعتبار سے مختلف ہے، اور یہی جو اختلاف ہے اور تلوّن و تنوّع یہی انسان کے لئے لذت بخش ہے، ہر روز یہ منہ کے ذائقے تبدیل کرتا رہتا ہے، ایک وقت میں اپنے دسترخوان کے اُوپر مختلف چیزیں سجا کر اپنا پیٹ بھی بھرتا ہے اور ہر قسم کے مزے بھی لیتا ہے۔ ''اور زیتون اور رمان کو پیدا کیا، آپس میں ملتے جلتے ہیں، بعض جدا جدا ہیں آپس میں ملتے جلتے نہیں ہیں'' یہ تو اللہ نے نعمتیں دیں۔

''اٰتُوْا حَقَّهٗ'' میں ''حق'' کا مصداق کیا ہے؟ مختلف اقوال

نعمتیں دینے کے بعد حکم یہ دیا کہ جس وقت یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کو کھاؤ بھی، لیکن کھانے کے ساتھ ساتھ اس دینے والے کے حق کو بھی یاد رکھو، وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ: جس دن اس فصل کو کاٹو یا پھلوں کو توڑو اس وقت اس میں متعین حق جو اللہ تعالیٰ کا ہے وہ بھی ادا کیا کرو، اب اس ''حق'' سے کیا مراد ہے؟ جن حضرات کے نزدیک یہ آیت مکی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہاں ''حق'' سے ''حق اِستحبابی'' مراد ہے، کیونکہ اس وقت تک مکہ معظمہ کے اندر عُشر، زکوٰۃ کے اَحکام نازل نہیں ہوئے تھے، اس لئے

شرفاء کے اندر اور احسان شناس لوگوں میں عام طریقہ چلا آتا تھا کہ جس وقت وہ اپنے پھل کاٹتے اور فصل کاٹتے تو فقراء اور مساکین کو کچھ نہ کچھ حصہ اس میں سے دیا کرتے تھے، تو یہاں حق سے وہی حق مراد ہے، اور مدینہ منورہ میں آنے کے بعد اس حق کو پھر وجوبی رنگ دے دیا گیا عشر اور زکوٰۃ کی صورت میں، کہ زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں چاہے باغات ہوں، چاہے وہ فصلیں ہوں، اُن کا عشر دیا کرو، اور دوسری چیزیں جو ہیں اُن کی زکوٰۃ دیا کرو، تو وہ اس کو حقِ اِستحبابی پر محمول کرتے ہیں، جو فقراء اور مساکین کو دینے کا عام طور پر شریف سوسائٹی کے اندر رواج تھا۔ لیکن دوسرے حضرات اس حق سے وہی حقِ عشری مراد لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرضیت اس کی مکہ معظمہ میں اُتر گئی تھی، لیکن اس کے مقادیر اور اس کا طریقِ کار یہ مدینہ منور میں واضح کیا گیا، جس طرح سے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (سورۂ مزمل) زکوٰۃ کا حکم بھی اِقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ہی آ گیا تھا، اور مکہ میں بالاتفاق نماز فرض ہوگئی تھی، اور یہ آیات اُتری ہیں تو ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ'' کے ساتھ ''اٰتُوا الزَّكٰوةَ'' کا ذِکر بھی ہے، تو زکوٰۃ کی فرضیت نازل ہوگئی تھی مکہ معظمہ میں، لیکن اس کے مقادیر اس کے اندازے کہ کس مال میں سے کتنا دینا ہے؟ اور کس مال میں سے کتنی زکوٰۃ ادا کرنی ہے؟ یہ تشریح سرورِ کائنات ﷺ نے مدینہ منورہ میں آنے کے بعد کی ہے، اسی طرح سے عشر کے بارے میں ہے کہ وجوب تو آ گیا تھا مکہ معظمہ میں ہی، اور اس کی تشریح مدینہ منورہ میں ہوئی ہے۔ اور بعض حضرات کے نزدیک یہ آیات ہیں ہی مدنی، اور وہ اس میں اسی طرح سے متعین کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں آیات اُتری تھیں، مکی سورتوں کے اندر کوئی کوئی آیت مدنی اور مدنی سورتوں کے اندر کوئی کوئی آیت مکی آتی رہتی ہے، جس وقت آپ اس کی تفصیل دیکھیں گے اُصول کی کتابوں میں تو یہ بات آپ کے سامنے واضح ہو جائے گی۔ بہرحال حق کا مصداق اب یہاں عشر ہی ہے۔

''عشر'' کی مقدار

اور ''عشر'' کا دستور آپ فقہ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، کہ پھلوں کی شکل میں یا غلہ جات کی صورت میں جو چیز زمین سے پیدا ہوتی ہے حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس میں قلیل کثیر کی کوئی قید نہیں، باقی رہنے نہ رہنے کی کوئی قید نہیں، کہ وہ باقی رہنے والی چیز ہے، یا فوراً کھا کر ختم کر دینے کی چیز ہے، جیسے سبزیاں ہوگئیں، تازے تازے پھل ہوگئے جن کو دیر تک رکھا نہیں جا سکتا، کیسے ہی ہو، جو چیز بھی پیدا ہوا اس میں سے عشر دیا جاتا ہے، جس کی مقدار بارانی علاقوں میں جہاں پانی وغیرہ کا خرچ نہیں ہے، اس میں دسواں حصہ ہے، اور جہاں نہری پانی خرید کر دیا جاتا ہے، یا کنویں استعمال ہوتے ہیں، ٹیوب ویل وغیرہ، جس میں پانی دینے کے اُوپر مشقت آتی ہے تو وہاں بیسواں حصہ ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کے تذکرے میں اِسراف کی ممانعت کی وجہ

وَلَا تُسْرِفُوْا: اِسراف نہ کیا کرو، اسراف کا معنی ہوتا ہے فضول خرچی، ضرورت سے زائد خرچ کرنا، بے موقع خرچ کرنا، اب یہاں یہ بات کیوں کہہ دی گئی؟ کہ اللہ تعالیٰ جس وقت اپنے راستے میں خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے، مساکین کو دینے کے لئے

کہتا ہے تو ساتھ ہی تاکید کرتا ہے کہ تم فضول خرچی نہ کیا کرو، اس فضول خرچی کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اوپر اپنی ضروریات میں ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرو، بے موقع خرچ نہ کرو، اور یہ ایک بہت بڑی اہم بات ہے جو یہاں ظاہر کی جارہی ہے، اس لفظ کے ساتھ ایک بند باندھا جارہا ہے آپ کی خواہشات پر، جس شخص کو اپنے اُوپر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کی عادت ہے، بے موقع خرچ کرنے کی عادت ہے، محض تلذذات میں تعیشات میں ضرورت سے زائد خرچ کرتا ہے، اور بلاضرورت صرف کرتا ہے، وہ شخص کبھی بھی اللہ کے نام پر دے نہیں سکتا، مساکین کی امداد اور فقراء کی حمایت نہیں کرسکتا، کیونکہ اس کی اپنی ضروریات اتنی ہوجاتی ہیں، اور اپنی خواہشات اُس کی اتنی پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ اُس کے اپنے اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے وہ کسی اور کو کیا دے، اور جو شخص اپنے اُوپر پابندی لگا کر رکھتا ہے کہ بے موقع خرچ نہیں کرتا، ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتا، سرمایہ اُس کے پاس بچتا ہے، تو اللہ کے نام پر دینا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے، اور آج اللہ کے نام پر دینے میں جو کمی آئی ہوئی ہے تو اُس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے اپنے تلذذ میں اور اپنے تعیش کے اندر بہت وسعت پیدا کرلی، موقع بے موقع خرچ کرتے رہتے ہیں، اپنی عیاشی کے اُوپر خرچ کرتے رہتے ہیں، تو اخراجات ہوگئے زیادہ، آمدنی ہوگئی کم، اب اگر ان سے کسی مسجد کے لئے کہو، مدرسے کے لئے کہو، کسی غریب کی حمایت کرنے کے لئے کہو، تو اپنی جیب کا جائزہ لیتے ہیں، کہ ہمارے پاس اپنی ضرورت سے زائد ہے ہی نہیں، ہم مسجد کو اور مدرسے کو کیسے دیں؟ ہم کسی بھوکے کو کھانا کیسے کھلا دیں؟ کسی ننگے کو کپڑا کیسے دے دیں؟ ہمارے پاس گنجائش ہی نہیں ہے، کیونکہ اُن کو پتا ہے کہ ہم نے شام کو سینما میں جانا ہے، فلاں جگہ جانا ہے، فلاں جگہ جانا ہے، تو اتنے ہماری جیب میں پیسے کہاں ہیں؟ کل آپ نے اخبار میں دیکھا ہوگا، یہ ''امروز'' میں انہوں نے لکھا تھا کہ صرف لاہور، لاہور میں ایک رات کا سینما کا خرچ پچیس لاکھ ہے، یعنی پچیس لاکھ روپیہ لاہوری ہر روز سینما دیکھنے پر خرچ کرتے ہیں، یعنی جتنے ٹکٹ بکتے ہیں جتنی قیمت پر بکتے ہیں تو اُس کا حساب لگا کر انہوں نے مرتب کیا، کہ پچیس لاکھ روپیہ یومیہ عوام سینما بینی پر صَرف کرتے ہیں، اب اگر کہیں اپیل کی جائے کسی قومی خدمت کے لئے، کسی دینی کام کے لئے تو چیخ چیخ کر مَر جاؤ گے اگر چھ مہینہ کے اندر بھی لاکھ روپیہ اکٹھا ہوجائے تو غنیمت ہے، تو جب اس قسم کی لذتوں کے اُوپر خرچ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے، فضول عیاشی پر جب پیسے جاتے ہیں، تو پھر اللہ کے نام پر دینے کی توفیق نہیں ہوا کرتی، پھر وہ اپنے بازوں کو، اپنے شکروں کو، اپنے کتوں کو تو اچھے سے اچھا کھلا سکتے ہیں، اور اُن کو تو آرام پہنچا سکتے ہیں، چونکہ وہ اُن کے لئے ایک دماغی عیاشی کا ذریعہ بنتے ہیں، لیکن کسی غریب کی حمایت، کسی ننگے کو کپڑا دے دینا یا کسی بھوکے کو روٹی دے دینا اُن کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اُن کے کتے سیر ہو کر سوتے ہیں، پڑوسی بھوکے بلکتے رہیں تو اُن کو کسی قسم کی پروا نہیں ہوتی، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں جو اپنے لئے ایک حق ادا کرنے کے لئے کہا ہے، تو ساتھ یہ پابندی لگادی کہ تم اسراف نہ کیا کرو، فضول خرچی نہ کیا کرو، اگر فضول خرچی کے اندر مبتلا ہوگئے، موقع بے موقع تمہیں خرچ کرنے کی عادت پڑ گئی، ضرورت سے زائد خرچ کرنے کی عادت پڑ گئی، پھر تم کسی دوسرے کا حق ادا نہیں کرسکتے، اللہ کا حق بھی ادا نہیں کرو گے اور اللہ کا حق حقیقت میں وہی ہے جو مساکین کو دیا جاتا ہے تو مساکین کا حق بھی ادا نہیں کرو گے، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ حد سے زیادہ خرچ کرنے

والوں کو پسند نہیں فرماتے، ان سے محبت نہیں کرتے۔ اور قرآنِ کریم میں دوسری جگہ سورۂ اسراء میں یہی بات آئے گی وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ: اُس کا بھی یہی معنی ہے کہ بے موقع اُڑایا نہ کرو، بے موقع اُڑانے والے تو شیطانوں کے بھائی ہیں، تو جب بے موقع اُڑانے کی عادت پڑ جاتی ہے تو پوری طرح سے انسان شیطنت کی طرف جاتا ہے، شرارتیں کرے گا، شہوت پرستی کرے گا، اور دُوسری قسم کی عیاشیاں بدمعاشیاں کرے گا، لیکن پھر اللہ کے راستے کی طرف انسان کی توجہ نہیں رہتی جس وقت کہ بے موقع مال اُڑانے کی عادت پڑ جائے، اس لئے یہاں حق کے ادا کرنے کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگادی لَا تُسْرِفُوْا: حد سے تجاوز نہ کیا کرو اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ: بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، تو موقع بے موقع خرچ کرنا، فضول خرچی کے طور پر، اور زائد از ضروریات خرچ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی ہے، اور اسی طرح سے دوسرے لوگوں کی حق تلفی بھی ہے۔ یہ تو نباتات کی بات ہوئی کہ اللہ نے پیدا کیں، کھاؤ، خوب مزے اُڑاؤ، اور اس میں سے اللہ کے حق کو یاد رکھو۔

چوپائے اللہ تعالیٰ کا مستقل اِنعام ہیں

وَمِنَ الْاَنْعَامِ: اب اسی طرح سے آگے چوپایوں کا ذکر آ گیا، دوسری قسم کا، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض تو بڑے قد کے پیدا کیے جو بوجھ اُٹھاتے ہیں، جن کے اُوپر سواری ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل اِنعام ہے، اور بعض چھوٹے قد کے پیدا کیے، جو زمین کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، زیادہ اُونچے نہیں ہوتے، جن کے اُوپر سواری نہیں ہوتی، جن کے اُوپر بوجھ نہیں لادا جاتا، ان کے گوشت، دُودھ، چمڑا، بالوں اور اُون سے فائدہ اُٹھاتے ہو، اور اُن (بڑے قد والوں) پر بار برداری بھی کرتے ہو، بوجھ بھی لادتے ہو، سوار بھی ہوتے ہو، اور اُن کا گوشت بھی کھاتے ہو، دُودھ چمڑا ہر چیز سے فائدہ اُٹھاتے ہو۔ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ: جو اللہ نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے کھاتے پیتے رہو، کھاؤ پیو برتو، كُلُوْا ان سب کو شامل ہے، جیسے اُن کے چمڑے کو استعمال کرو، اُن کی اُون اور بالوں کو استعمال کرو، تو کھانا، پینا، استعمال کرنا، كُلُوْا کے مفہوم میں سب کچھ ہے۔

شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے کے نقصانات

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ: اِن کو اپنی طرف سے حرام ٹھہرا ٹھہرا کر شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، یہ شیطانی طریقہ ہے کہ اللہ کی تحریم کے بغیر کسی کو حرام ٹھہرالیا جائے، اور اللہ تعالیٰ نے منع نہ کیا ہو کسی چیز سے فائدہ اُٹھانے کو اور اُس کو منع کر دیا جائے یہ شیطانی طریقہ ہے، تم شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، وہ تو صریح دُشمن ہے، جب تم اس کے مشورے مانو گے، اس کے نقشِ قدم پر چلو گے، وہ تو تمہیں دُنیا کے اندر بھی اللہ کی نعمتوں سے محروم کرے گا، اور آخرت میں بھی تمہیں عذاب کی طرف لے جائے گا، اب شیطان کی لگائی ہوئی پابندیاں قبول کرلو یا شیطانی پابندیاں تم لگالو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے تم یہاں بھی محروم ہوگئے، اور اللہ کی نافرمانی کرنے کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی معذب ہو جاؤ گے۔

مشرکین کے پاس جانوروں کی حلت وحرمت کے متعلق کوئی دلیل نہیں

''آٹھ قسمیں اللہ نے پیدا کیں، ضأن میں سے دو قسمیں'' ضأن کا مصداق بھیڑ، دُنبہ، چھترا، دو قسموں سے مراد ہو گئے نر اور مادہ، ''بکرے کی بھی دو قسمیں''۔ ''آپ ان سے پوچھئے کہ ان دونوں میں سے اللہ نے مذکروں کو حرام کیا ہے یا مؤنثوں کو حرام کیا ہے یا اُس چیز کو حرام کیا ہے جو کہ ان مؤنثوں کے رحم کے اندر ہے، بچہ دانی میں ہے؟ کچھ بھی نہیں، کسی چیز کو بھی حرام نہیں کیا، جب حرام نہیں کیا تو تم میں سے کسی کو کیا حق ہے کہ تم کسی مذکر کو حرام ٹھہراؤ، کسی مؤنث کو حرام ٹھہراؤ، کسی پیٹ کے بچے کو حرام ٹھہراؤ، اگر کوئی حرمت کی دلیل علمی طور پر تمہارے پاس ہے تو لے آؤ، نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ: آپ انہیں کہہ دیجئے کہ علمی دلیل اگر تمہارے پاس موجود ہے جس کے ساتھ تم یہ ثابت کر سکو کہ فلاں مذکر حرام ہے، یا فلاں مؤنث حرام ہے، یا پیٹ کا بچہ حرام ہے، تو لے آؤ، ملتِ ابراہیمی کے اندر کوئی حرمت کی دلیل ہو، کوئی عقل وفطرت کی دلیل تمہارے پاس موجود ہے تو لے آؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ جب تمہارے پاس دلیل ہے ہی نہیں، تو پھر تم جھوٹے ہو، اور خواہ مخواہ ان چیزوں کو حرام ٹھہرا کر اللہ کی نعمتوں سے اپنے آپ کو کیوں محروم کرتے ہو؟ ایسے ہی اُونٹ اور گائے کے متعلق فرمایا، وہاں بھی یہی سوال ہے کہ اس کے مذکر اللہ نے حرام ٹھہرائے یا مؤنث حرام ٹھہرائے یا وہ بچے حرام ٹھہرائے جو ان کے رحم میں ہیں؟ ان میں سے کسی چیز پر اگر دلیل ہے تو لے آؤ، اگر علمی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے، جس کو آپ عقلی دلیل کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں، جو فطرت سے ماخوذ ہو، یا اس طرح سے علمی دلائل جس طرح سے ہوا کرتے ہیں، وہ اگر نہیں تو تم یہ بتا دو کہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست تم نے سنا ہے، تم اُس کے اُوپر کوئی گواہ ہو، تو ایسی بات ہی کوئی لے آؤ، یا کوئی مشاہدہ ہے تمہارا، ''یا تم اُس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمہیں یہ حکم دیا تھا؟'' تو ایسی بات بھی کوئی نہیں ہے، تم یہ بھی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہاں! براہِ راست اللہ نے ہمیں کہا ہے، جب اِن کی تحریم کی تھی تو ہم اُس وقت موجود تھے۔ جب کوئی دلیل ہی نہیں کسی قسم کی تو پھر تم اللہ کے اُوپر جھوٹی باتیں کیوں گھڑتے ہو؟ اور جھوٹ لگا لگا کہ اللہ کے ذِمے اپنے آپ کو مشرک کیوں بناتے ہو؟ ''کون زیادہ بڑا ظالم ہے اُس سے جو اللہ کے اُوپر جھوٹ گھڑے تا کہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا، ان کو مقصد تک نہیں پہنچائے گا'' چونکہ انسان کا اعلیٰ مقصد جنت ہے تو ایسے ظالم جنت کی راہ نہیں پائیں گے۔ یہ تو انکار فرمایا اُن کی تحریم پر، جو بلا وجہ وہ بعض چیزوں کو بتوں کی طرف منسوب کر کے اور اس طرح سے حرام کرتے تھے، کہ یہ کوئی طریقہ نہیں۔

چار چیزوں میں حرمت کا حصر کیوں؟

اب آگے حضور ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ جن چیزوں کے بارے میں اِس وقت بحث چل رہی ہے، میرے پاس جو وحی آئی ہے اُس میں تو ان چار چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے، اور یہ چیزیں وہ ہیں کہ جن کو تم حلال کیے بیٹھے ہو، مثلاً میتہ وہ کھاتے تھے، مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کھاتے تھے، اسی طرح سے ممکن ہے کہ دَمِ مسفوح بھی استعمال کرتے ہوں، اور بعض مشرک قومیں خنزیر بھی کھاتی ہیں، تو ماکولات کے بارے میں جو جھگڑا ہے یہ اُن کا بیان ہے، کلیۃً یہاں یہ واضح نہیں کیا جا رہا کہ ساری دُنیا کے اندر جتنی چیزیں موجود ہیں ان میں سے صرف یہی چار حرام ہیں، بلکہ جن کے متعلق گفتگو چل رہی تھی، جو اُس وقت زیر

بحث تھیں اُن کے متعلق یہ بات کہی جا رہی ہے، ورنہ ان کے علاوہ بیسوں چیزیں حرام ہیں، جیسے درندے ہو گئے اور پرندوں میں بھی اسی طرح سے جو پنجے کے ساتھ شکار کرنے والے ہیں، اُن کے لئے اُصول علیحدہ بیان کیے گئے ہیں، یعنی جن چیزوں پر اس وقت بحث کی جا رہی ہے، جو زیر بحث ہیں اُن میں سے میرے پاس جو وحی آئی ہے، تو ان چار چیزوں کے متعلق وحی آئی ہے کہ ان کو کوئی نہیں کھا سکتا، اور جو تم نے نسبتیں کر کر کے سائبہ، بحیرہ، وصیلۃ، حام وغیرہ بنا لیے، ان کی حرمت کے متعلق میرے پاس کوئی وحی نہیں آئی، یہ حرام نہیں ہیں، جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے مسئلے کی تفصیل ہو چکی۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ نہیں پاتا میں'' فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ: ''اُس وحی میں جو میری طرف بھیجی گئی ہے، کوئی چیز حرام ٹھہرائی ہوئی کسی کھانے والے پر جو اُس کو کھاتا ہے مگر یہ کہ وہ میتہ ہو'' میتہ کی تفصیل آپ کے سامنے دو دفعہ آ چکی، سورۂ بقرۃ میں بھی اور سورۂ مائدہ میں بھی یہ آیت گزر چکی ہے، ''بہنے والا خون ہو، لحم خنزیر ہو، پس بے شک یہ خنزیر رِجس ہے، یا ایسا جانور ہو جس کو فسق شرک کا ذریعہ بنا لیا گیا'' کہ غیر اللہ کا نام ہے اُس کے اُوپر پکارا جا رہا ہے، ''آواز بلند کی گئی اللہ کے غیر کے لئے اس پر'' (اس کا ذکر مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے تحت ہوا تھا) یہ چیزیں حرام ہیں۔ لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اتنی وسعت دے دی کہ ''اگر کوئی مضطر ہو گیا'' ایسا بھوک میں مبتلا ہو گیا کہ اُسے اندیشہ ہے کہ اگر میں نہیں کھاؤں گا تو میں مر جاؤں گا، اضطراری حالت ہے، ''اور وہ طالبِ لذّت نہیں ہے'' یہ اضطرار کا ہی بیان ہے، کیونکہ جو طالبِ لذّت ہوتا ہے وہ مضطر نہیں ہوتا، عادی نہیں ہے یعنی ضرورت سے زیادہ کھانے والا نہیں ہے، صرف اپنی ضرورت کو پورا کرتا ہے، باغی نہ ہو یعنی طالبِ لذّت نہ ہو، ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا نہ ہو، تو ایسے مضطر کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ حرمت اُٹھا دی، فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اب یہ اگر کھائے گا تو گناہ گار نہیں ہے۔ یہ تو چار چیزیں مطلقاً حرام ہیں اور ملتِ ابراہیمی میں بھی حرام تھیں۔

عارض کی وجہ سے یہود پر حرام ہونے والی چیزیں

اور آگے بعض چیزیں حرام ایسی ہیں جو یہود پر عارضی طور پر حرام ٹھہرائی گئی تھیں، اور ملتِ ابراہیمی کی طرف اُن کی نسبت نہیں، جیسے کہ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ کے تحت چوتھے پارے کی ابتدا میں اس کی تفصیل عرض کی گئی تھی، کہ حضرت اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام نے اپنے نفس پر اُونٹ کو حرام ٹھہرا لیا تھا، اُونٹ کے دُودھ کو حرام ٹھہرا لیا تھا، پھر یہودیوں کے اندر وہی حرمت دائم ہو گئی، اس کی نسبت حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف ہے اور ملتِ ابراہیمی کی طرف نہیں۔ اور بعض چیزیں یہود کے اوپر اُن کی سرکشی کے نتیجے میں حرام کر دی گئی تھیں، وہ شرارت کی بناء پر تھیں، تو اُن کے اندر بھی کوئی کسی قسم کا خبث نہیں، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد چونکہ طیبات حلال کر دی گئیں، اور خبائث کو حرام ٹھہرایا گیا، وہ چیزیں فی حد ذاتہ طیبات کا مصداق تھیں، عارضی طور پر یہود پر اُن کی شرارت کی بنا پر اُن کو ممنوع ٹھہرا دیا گیا تھا، وہ بھی ساری کی ساری حلال ہیں۔ ''اُن لوگوں پر جو یہودی ہوئے ہم نے حرام ٹھہرا دیا ہر ذی ظُفُر کو'' ایسا جانور کہ جس کا ناخن ہے پھٹا ہوا نہیں ہے، وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ: اور گائے اور بکریوں میں سے بھی ہم نے اُن کے اوپر ان کی چربیاں حرام ٹھہرا دیں، البتہ وہ چربی مستثنیٰ ہے جو اُن کی کمروں نے اُٹھائی ہے، کمر کے ساتھ لگی ہوئی ہے، یا انتڑیوں کے ساتھ، یا اُن کی ہڈی کے ساتھ خلط ملط ہے، یہ جانور جو ہم نے ان کے اُوپر حرام کیے تھے یہ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ: یہ ہم

نے اُن کو ان کی شرارت کی بنا پر سزا دی تھی، جس سے معلوم ہو گیا کہ فی حد ذاتہٖ ان کے اندر حرمت نہیں ہے، وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ: اور ہم اپنے اس بیان میں سچے ہیں، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ جو اس کے خلاف کہتا ہے وہ جھوٹا ہے، یہ چیزیں ملت ابراہیمی میں حرام نہیں، عقل وفطرت کے تحت حرام نہیں ہیں، بلکہ ان کو سزا کے طور پر یہود پر ممنوع ٹھہرا دیا گیا تھا، جب سزا کے طور پر ممنوع ٹھہرادیا گیا تھا تو باقیوں کے لئے وہ حلال ہی رہیں، جیسے ہماری شریعت میں یہ چیزیں حلال کردی گئیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ: پھر بھی اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہی رہیں اس تحریم وتحلیل کے باب میں، اور یوں کہتے رہیں کہ اگر یہ حلال ہیں حرام نہیں ہیں، اور ہم ان کو حرام قرار دیتے ہیں، تو ایسی صورت میں پھر ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا، اس قسم کی باتیں وہ کرتے تھے، تو آپ کہہ دیجئے کہ تمہارا ربّ رحمت واسعہ والا ہے، اس لئے تمہیں بار بار سمجھاتا ہے، تمہیں ڈھیل دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ڈھیل تو دیا کرتا ہے، لیکن یہ نہیں کہ مجرم بالکل ہی چھوٹ جائے اور اُس کی گرفت سے باہر ہو جائے ایسی بات نہیں ہے، یہ اُس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ تمہیں بار بار سمجھاتا ہے اور ڈھیل دے رکھی ہے، ویسے مجرم قوموں سے اس کے عذاب کو ردّ نہیں کیا جاتا، تو جو بھی اس کے اَحکام کے خلاف سوچنے والے، کرنے والے، عقیدہ رکھنے والے ہیں وہ سب مجرم ہیں، اور جس وقت اس کا عذاب آئے گا تو عذاب مجرموں سے ہٹایا نہیں جائے گا۔

دُنیا کا نظام جزا وسزا کے اُصول پر نہیں بلکہ اِبتلا کے اُصول پر ہے

دلیل تو ان کے پاس کوئی نہیں تھی، جیسے پچھلے رکوع کے اندر بار بار مطالبہ کرلیا گیا، اب ایک مشرکانہ رویہ جو اُن کا تھا جس کو وہ بطور دلیل کے پیش کیا کرتے تھے، وہ اِن الفاظ میں نقل کیا جارہا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ ہمارا شرک اللہ کو پسند نہ ہو تو پھر ہم شرک کیوں کرتے؟ تو جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس پر معذب نہیں کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ طریقہ اللہ کو پسند ہے، ''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک کرتے نہ ہمارے آباء اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے'' یہ انتہائی بودی دلیل وہ لوگ پیش کیا کرتے تھے جس کو یہاں ذکر کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو جو ردّ کرتے ہیں تو اُس کے ردّ کرنے کی صورت یہ ہے کہ یہ تو انتہائی بوگس دلیل ہے جس کو کسی علمی محفل کے اندر پیش بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ کسی شخص کو کسی کام کے کرنے پر قادر کردینا یا اُس کے کرنے پر فوراً اس کے اوپر گرفت نہ کرنا، یہ اس فعل کے جواز یا پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، ردّ کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کسی کام کے کرنے پر قدرت دے دیں، یا کسی کام کے کرنے والے کے اوپر فوراً گرفت نہ کریں اور عذاب نہ دیں، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جواز کی یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، پسندیدہ ہونے کا اور جواز کا پتا چلے گا اُس کے شائع کردہ قانون سے، قانون کے اندر جس چیز کو جائز قرار دیا گیا ہے وہ جائز ہے، جس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے وہ ناجائز ہے، باقی! اس کے احکام کے مطابق وہ عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا، اور کرنے والوں کو فوراً بدلہ نہیں دیتا، اور نہ کرنے والوں کو وہ سزا نہیں دیتا، تو اُس کی حکمت کی بنا پر یہ ڈھیل ہے، کیونکہ دُنیا کا نظام اُس نے جو چلا رکھا ہے تو یہ جزا سزا کے اُصول پر نہیں بلکہ یہ اِبتلا کے اُصول پر ہے، اگر تمہاری یہ دلیل مان لی جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی اشاعت کرنے والے پیغمبر اور رسل جھوٹے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک فلاں چیز

اچھی نہیں ہے، فلاں چیز اچھی نہیں، تو تمہارے اس قول سے اُن کی تکذیب لازم آتی ہے، اور پھر! تمہارے اس قول سے دُنیا کے اندر جو فسق وفجور برائی اچھائی جو کچھ بھی ہے سب کا جواز نکلتا ہے، کیونکہ اگر اپنے فعل کے لئے تم اس چیز کو بطور دلیل کے پیش کرتے ہو، تو کل کو کوئی زانی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو میں ایسا کیوں کرتا؟ چور ایسا کہہ سکتا ہے کہ اگر اللہ نہ چاہتا تو میں ایسا کیوں کرتا؟ تو پھر اچھائی برائی کی تقسیم دنیا میں کیا رہ گئی؟ کہ جو جرم کرنے والا جرم کرتا ہے اور فوراً اللہ کی گرفت میں نہیں آتا، اس کے لئے یہ دلیل ہے، وہ کہے گا کہ جب اللہ چاہتا ہے تو میں ایسا کرتا ہوں، اگر اللہ نہ چاہتا تو میں ایسا نہ کرتا، حالانکہ اچھائی برائی کی تقسیم تمہارے نزدیک بھی ہے، اگر یہی بات ہے کہ جو کرے اور اُس کے اُوپر سزا نہ ہو وہ جائز ہے اور اللہ کو پسند ہے تو پھر تمہیں موحدین سے چڑ کیوں ہے؟ آخر وہ جو توحید کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں، توحید کی اشاعت کرتے ہیں تو وہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، معلوم ہو گیا کہ یہ دلیل کوئی اچھی دلیل نہیں ہے، کوئی علمی دلیل نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے، اور یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اہلِ حق کو بسا اوقات دُنیا کے اندر وہ پٹواتا ہے، یہ چیزیں حق اور باطل کی دلیل نہیں ہیں، کوئی چیز پسندیدہ ہے یا پسندیدہ نہیں ہے اس کا پتا چلتا ہے شائع کردہ قانون سے۔

جیسے آج ایک حکومت ہمارے سر پر مسلط ہے، اُن کا ایک آئین ہے کہ فلاں چیز ہماری مملکت کے اندر جائز ہے، فلاں جائز نہیں ہے، اور ایک آدمی اُس کے خلاف جرم کا ارتکاب کرتا ہے، اور حکومت کو اطلاع بھی ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص بغاوت پھیلاتا پھر رہا ہے، اور فلاں اس قسم کی باتیں کرتا ہے، لیکن حاکم وقت اُس کے اُوپر فوراً ہاتھ نہیں ڈالتا، اس لئے ہاتھ نہیں ڈالتا کہ ابھی تک رپورٹیں تھوڑی آئی ہیں، اور اگر اس کو پکڑ لیا گیا تو ممکن ہے کہ کسی وجہ سے یہ چھوٹ جائے، اور کوئی شق ایسی بھی موجود ہو کہ اس کو چھوڑنا پڑے، اس لیے اِس کو ڈھیل دو تاکہ یہ دو چار تقریریں اور کرلے، اور اس سے بھی زیادہ کھل کر بات سامنے آجائے، جب پکڑ نہیں ہوگی تو دِن بدن یہ دلیر ہوتا چلا جائے گا، آخر وہ انتہا کو پہنچ جائے گا، جب بغاوت اِنتہا کو پہنچے گی تو پھر عدالت میں جا کر چھوٹنے کی کوئی گنجائش نہ رہے حکومت تب پکڑے گی، اب جتنے دِن تک اس مجرم کو نہ پکڑا جائے، چور کر نہ پکڑا جائے، ڈاکو کو نہ پکڑا جائے، باغی کو نہ پکڑا جائے تو وہ یہی سوچنے لگ جائیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ ساری کارروائیاں حکومت کے نزدیک پسندیدہ ہیں، اگر حکومت کے نزدیک یہ پسندیدہ نہ ہوتیں تو حکومت ہمیں روک دیتی، اس قسم کی دلیل اگر وہ دیتا ہے تو انتہائی جاہل ہے، کیونکہ وہ حکومت کے نزدیک پسندیدہ ہیں یا نہیں، وہ تو اس کا آئین موجود ہے جو بتاتا ہے کہ یہ جائز ہے اور یہ جائز نہیں ہے، باقی پکڑنا نہ پکڑنا بسا اوقات اس میں حاکم کی مصلحت ہوتی ہے، کچھ دِن گزر جائیں گے جب تمہارے جرم کا پیمانہ خوب اچھی طرح سے لبریز ہو جائے گا، پھر وہ ہاتھ ڈالیں گے اور چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے آئین کو سمجھ لیجئے کہ اس نے اپنے پسندیدہ اور ناپسندیدہ کی تفصیل تو اپنے رسولوں کی زبان سے بتادی، اگر تمہاری اس دلیل کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول غلط کہتے ہیں کہ فلاں چیز اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے، یہ تمہارا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ رسول اور اُس کی نازل کردہ کتابوں کی تکذیب کرتا ہے، اور پھر اگر اس کو مان لیا جائے تو پھر دُنیا کے اندر کوئی جرم جرم ہی نہیں رہتا، اور اللہ تعالیٰ کی

ڈھیل کو اگر جواز کی دلیل بنالیا جائے تو پھر سارے کے سارے مجرم اپنے جرم کے جواز کی دلیل کے طور پر اس چیز کو پیش کردیں گے، اس لئے یہ بات غلط ہے۔

دُنیا میں کسی طریقے کا وجود اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں

فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ کا یہی معنی ہے کہ کامل حجت جس کے ساتھ مدعا ثابت ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی ہے، اور اس کو ان الفاظ میں ادا کردیا گیا کہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے راستے پر چلادیتا، لیکن جب سیدھے راستے پر سب کو نہیں چلایا، بلکہ اختلاف تمہارے سامنے نمایاں ہے، تو معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی ہے کہ یہاں زبردستی سب کو ایک راستے پر نہیں لگایا جاتا، اختلاف خود اس بات کی دلیل ہے کہ دُنیا کے اندر کسی چیز کا پایا جانا یہ اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، ورنہ تو متضاد کا جواز لازم آئے گا، تضادات ہی تضادات ہیں، متضاد چیزیں دُنیا کے اندر پائی جاتی ہیں، ایک دوسرے کی نقیض بھی پائی جاتی ہے، اگر دُنیا کے اندر کسی چیز کا موجود ہونا اُس کے حق ہونے کی دلیل ہوتی پھر تو ساری چیزیں جائز ہوجائیں گی، اللہ تعالیٰ نے جب سب کو ایک راستے پر نہیں چلایا، اختلاف کرنے کی گنجائش دی ہے، تو اس اختلاف کی گنجائش سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ کسی چیز کا دُنیا کے اندر پایا جانا اُس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اگر حق پر سب کو چلانا چاہتا تو ایک ہی راستے پر سب کو چلادیتا۔ ''عنقریب کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا، کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شریک نہ ٹھہراتے، نہ ہمارے آباء شریک ٹھہراتے، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ایسے ہی جھٹلایا تھا اُن لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں'' یعنی ان سے پہلے جو مشرک گزرے تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی باتوں کی تکذیب اسی اصول کے تحت ہی کرتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ ہمیں زبردستی کیوں نہیں روک دیتا؟ جب اللہ تعالیٰ ہمیں نہیں روکتا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ طریقہ ٹھیک ہے، اور ان کی یہ بات رسولوں کی تکذیب کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کی تکذیب کا باعث ہے، ''ایسے ہی جھٹلایا تھا اُن لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا'' تب اُن کو پتا چلا کہ ہماری یہ کرتوتیں ہمارے یہ افعال اعمال جو بھی تھے وہ اللہ کو پسند نہیں تھے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اُس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو'' علم کس چیز کے متعلق؟ علم اسی چیز کے متعلق کہ کسی چیز کا دُنیا کے اندر موجود ہونا اُس کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے، اس اصول پر اگر تمہارے پاس کوئی علمی دلیل ہے تو لاؤ، ''کیا ہے تمہارے پاس کوئی علم؟ تو ظاہر کرو اُس کو ہمارے لئے، نہیں اتباع کرتے تم مگر توہمات کی'' تمہارے اپنے خیالات ہیں جن کے پیچھے تم لگے ہوئے ہو، ''اور نہیں ہو تم مگر اٹکل چلاتے'' باتیں بلادلیل کرتے ہو، رجم بالغیب، بن دیکھے تیر چلاتے ہو، اٹکل چلاتے ہو، اور سارے توہمات کے پیچھے لگے ہوئے ہو، یہ تمہارے اپنے دل کے خیالات ہیں جو کسی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں ہیں۔ ''آپ کہہ دیجئے اللہ ہی کے لئے ہے حجتِ کاملہ'' جو کہ مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ''اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی راستے پر چلا دیتا'' جب ایک راستے پر نہیں چلایا تم نے متضاد راہیں اختیار کررکھی ہیں، یہ خود دلیل ہے اس بات کی کہ کسی فعل کا وجود اُس کے جواز کی دلیل نہیں، ورنہ یہ متضاد اور متناقض چیزیں اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ٹھہریں گی۔

''شہادت'' کے صحیح ہونے کا معیار

''آپ کہہ دیجئے کہ لے آؤ تم اپنے گواہ جو گواہی دے دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس چیز کو حرام ٹھہرایا ہے'' اب گواہی کا مدار کس چیز پر ہوتا ہے؟ شہادتِ صحیحہ کون سی ہوتی ہے؟ یا تو وہ مشاہدے پر مبنی ہوتی ہے کہ آنکھوں سے دیکھا واقعہ کوئی بیان کرے، اور یا دلیل قطعی کے اُوپر مبنی ہوتی ہے، قطعیات پر بھی شہادت دی جاتی ہے، مثلاً اللہ کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں لیکن ہم کہتے ہیں ''اَشھد اَن لا اِلٰہ اِلا اللہ''، اللہ کے موجود ہونے کی شہادت دیتے ہیں، اُس کی وحدانیت کی شہادت دیتے ہیں، حالانکہ ہم نے اِس کا اپنی آنکھوں کے ساتھ، جس کے ساتھ مشاہدہ نہیں کیا، لیکن چونکہ ہم نے قطعیات کے ساتھ اِس کو پہچان لیا، عقلی دلائل کے ساتھ، نقلی دلائل کے ساتھ، تو ہم اِس پہ گواہی دے سکتے ہیں۔ تو یا تو آنکھوں دیکھی چیز ہو، مشاہدہ کیا ہوا ہو، تو انسان شہادت دے سکتا ہے اور یہ قابلِ اعتماد ہے، یا کسی قطعی دلیل کے ساتھ ثابت ہو، اور جب ان دونوں میں سے کسی چیز کا وجود نہ ہو تو بِلاوجہ ہی ایک آدمی کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں، تو یہ اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی تو کہلائے گی، یہ شہادت کے اُصول پر نہیں ہے۔

سَرورِ کائنات ﷺ کو اللہ کی طرف سے مشرکین کے متعلق ہدایات

اس لئے اگر یہ بے شرم بن کر، ڈھیٹ بن کر آمادہ ہی ہو جائیں کہ ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں، اور فلاں فلاں شخص گواہ ہے کہ اس چیز کو اللہ نے حرام ٹھہرایا، تو چونکہ یہ شہادت کے اُصول کے خلاف ہے، تو آپ اِن کی اس حرکت سے متاثر نہ ہوں، آپ اِن کے ساتھ مل کر شہادت نہ دیں، یہ اپنی خواہشات کے متبع ہیں، اگر اِن کی باتوں میں آپ آ جائیں تو آپ بھی اسی طرح سے بھٹک جائیں گے جس طرح سے یہ بھٹکے ہوئے ہیں، ''اگر یہ گواہی دینے لگ جائیں'' یعنی گواہی دینے پر آمادہ ہو جائیں فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ: تو آپ اِن کے ساتھ گواہ نہ بنیں، گواہی نہ دیں، یعنی اِن کی شہادت کا اعتبار نہ کریں، کیونکہ اِن کی بات شہادت کے اُصول کے خلاف ہے، نہ تو اِن کے پاس کوئی مشاہدہ، اور نہ اِن کے پاس کوئی قطعی دلیل، وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اُن کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے، وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے۔ اس کا عطف اُسی (پچھلے الَّذِیْنَ) پر ہے۔ ''نہ اتباع کیجئے اُن لوگوں کی خواہشات کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے'' وَهُمْ بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ: اور وہ اپنے رَبّ کے برابر دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

قُلْ	تَعَالَوْا	اَتْلُ	مَا	حَرَّمَ	رَبُّكُمْ	عَلَیْكُمْ	اَلَّا	تُشْرِكُوْا	بِهٖ شَیْئًا

آپ کہہ دیجئے کہ آؤ تم، میں پڑھوں وہ چیز جو حرام ٹھہرائی تمہارے رَبّ نے تم پر، کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ

اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اور نہ قتل کرو تم اپنے بچوں کو تنگدستی کی وجہ سے، ہم

نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا

تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں رزق دیتے ہیں، اور بے حیائی کے کاموں کے قریب مت جاؤ جو اُن میں سے ظاہر ہیں اور جو

بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ

اُن میں سے چھپے ہوئے ہیں، اور نہ قتل کرو تم ایسے نفسوں کو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا مگر حق کے ساتھ، یہ بات ہے

وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا

وصیت کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی تاکہ تم سوچو ﴿۱۵۱﴾ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر

بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ

ایسے طریقے کے ساتھ جو کہ اچھا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے، اور ماپ اور تول کو پورا کرو

بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا

انصاف کے ساتھ، نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو مگر اُس کی گنجائش کے موافق، اور جب تم بات کہو تو انصاف کیا کرو

وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ

اگرچہ وہ شخص رشتے دار ہی ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، یہ بات ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے تاکہ

تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا

تم یاد کرو ﴿۱۵۲﴾ اور آپ خبر دے دیجئے کہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے، اس کی اتباع کرو، اور مختلف راستوں کی

السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ

اتباع نہ کرو، وہ راستے تمہیں متفرق کردیں گے اللہ کے راستے سے، یہ بات ہے جس کے ذریعے سے اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے تاکہ

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ

تم تقویٰ اختیار کرو ﴿۱۵۳﴾ پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اُس شخص پر اپنی نعمت کو پورا کرنے کے لیے جو نیکوکار ہے

وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
اور ہر چیز کی تفصیل کے لئے اور ہدایت اور رحمت کے لئے تاکہ وہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر
يُؤْمِنُوْنَ ۝١٥٤ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ
ایمان لائیں ۝۱۵۴ اور یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے اُتارا، جو برکت دی ہوئی ہے، پس اس کی اتباع کرو، اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ
تُرْحَمُوْنَ ۝١٥٥ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ
تم پر رحم کیا جائے ۝۱۵۵ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ سوائے اس کے نہیں کہ اُتاری گئی تھی کتاب اُن دو گروہوں پر جو
قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝١٥٦ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ
ہم سے پہلے ہیں، اور بے شک ہم البتہ ان کے پڑھنے پڑھانے سے البتہ بے خبر تھے ۝۱۵۶ یا تم یوں نہ کہنے لگ جاؤ
اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ
اگر ہم پر کتاب اُتاری جاتی تو ہم ان سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، پس تحقیق واضح دلیل آگئی
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ
تمہارے رَبّ کی طرف سے، اور ہدایت اور رحمت آگئی، پھر کون بڑا ظالم ہے اُس شخص سے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے
اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا
اور اُن سے اِعراض کرے، عنقریب بدلہ دیں گے ہم اُن لوگوں کو جو ہماری آیات سے اعراض کرتے ہیں
سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝١٥٧
بُرا عذاب بسبب اِس کے کہ وہ اِعراض کرتے تھے ۝۱۵۷

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قُلْ تَعَالَوْا: آپ کہہ دیجئے کہ آؤ تم۔ دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اصل میں تَعَالٰی یَتَعَالٰی نیچے سے اُوپر چڑھنے کے معنی میں ہے، اور جب کوئی شخص بلندی پہ ہو اور نیچے والے کو اپنی طرف بُلائے تو اس کو کہتا ہے تَعَالَ تَعَالَ اُوپر چڑھ آؤ، اُوپر چڑھ آؤ۔ اور بعد میں صرف متوجہ کرنے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور آلِ عمران میں

بھی یہ لفظ آیا تھا فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ آؤ تم'' اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ: اَتْلُ یہ تَعَالَوْا کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، اَتْلُوْ تھا اصل میں، تَلَا يَتْلُوْ سے۔ ''میں پڑھوں وہ چیز جو حرام ٹھہرائی تمہارے رَبّ نے تم پر'' اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـئًا: آگے ان محرمات کا ذکر ہے، لیکن محرمات کے ذکر میں انداز دو طرح کا اختیار کیا گیا ہے، ایک اثبات کا، ایک نفی کا، اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـئًا: تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ تو اس سے شرک کا حرام ہونا نکل آئے گا، وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: وَاَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اس میں عدمِ احسان کا حرام ہونا نکل آئے گا، وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ: اور نہ قتل کرو تم اپنے بچوں کو، مِّنْ اِمْلَاقٍ: تنگ دستی کی وجہ سے، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ: ہم تمہیں رزق دیتے ہیں وَاِيَّاهُمْ: اور انہیں رزق دیتے ہیں، وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ: اور بے حیائی کے کاموں کے قریب مت جاؤ، مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ: یہ الْفَوَاحِشَ سے بدل ہے۔ جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو ان میں سے چھپے ہوئے ہیں، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ: اور نہ قتل کرو تم ایسے نفس کو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا مگر حق کے ساتھ۔ ذٰلِكُمْ: یہ بات ہے، وَصّٰىكُمْ بِهٖ: وصیت کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سوچو۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ: اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: مگر ایسے طریقے کے ساتھ جو کہ اچھا ہے، حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ: یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے، وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ: اور ماپ اور تول کو ٹھیک کرو انصاف کے ساتھ، پورا کرو۔ ایفاء: پورا اَدا کرنا۔ ماپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ، لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا: اور جب تم بات کہو تو انصاف کیا کرو، وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى: اگرچہ وہ شخص جس کے متعلق تم بول رہے ہو، وہ رشتے داری ہو۔ قربی قرابت کے معنی میں۔ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا: اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ: یہ بات ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: تاکہ تم یاد کرو۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ: وَاَخْبِرْ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا: اور آپ خبر دے دیجئے کہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے فَاتَّبِعُوْهُ: اس کی اتباع کرو، وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ: اور مختلف راستوں کی اتباع نہ کرو، فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ: وہ راستے تمہیں متفرق کر دیں گے اللہ کے راستے سے ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ: یہ بات ہے جس کے ذریعے سے اللہ تمہیں تاکید کرتا ہے، تاکیدی حکم دیتا ہے، وصیت کرتا ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: یہ ثُمَّ محض تاخیر ذکری کے لیے ہے۔ پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ: اس شخص پر اپنی نعمت کو پورا کرنے کے لیے جو نیکوکار ہے، الَّذِيْٓ اَحْسَنَ: جو شخص محسن ہے، جو نیکوکار ہے اس پر اپنی نعمت کو پورا کرنے کے لیے، وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ: اور ہر چیز کی تفصیل کے لیے، وَّهُدًى وَّرَحْمَةً: اور ہدایت اور رحمت کے لیے، لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ: تاکہ وہ لوگ اپنے رَبّ کی ملاقات کے ساتھ ایمان لائیں۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ: اور یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے اُتارا، برکت دی ہوئی ہے، فَاتَّبِعُوْهُ: پس اس کی اتباع کرو، وَاتَّقُوْا: اور اللہ سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو، لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: تاکہ تم پہ رحم کیا جائے۔ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ: لِئَلَّا تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اُنْزِلَ الْكِتٰبُ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ سوائے اس کے نہیں کہ اُتاری گئی تھی کتاب ان دو گروہوں پر جو ہم سے پہلے ہیں، وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ: اور بے شک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے

سے البتہ بے خبر تھے، اَوْ تَقُوْلُوْا: یا تم یوں نہ کہنے لگ جاؤ، لَوْ اَنَّا اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْكِتٰبُ: اگر ہم پر کتاب اُتاری جاتی، لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ: تو ہم ان سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ: پس تحقیق واضح دلیل آ گئی تمہارے رَبّ کی طرف سے، اور ہدایت اور رحمت آ گئی۔ هُدًى: راہنمائی۔ کتاب چونکہ احکام کی طرف راہنمائی کا ذریعہ بنتی ہے اس لیے هُدًى ہے، اور جب انسان اس راہنمائی کو قبول کر کے اس کے مطابق چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ثمرات نصیب ہوتے ہیں اس اعتبار سے رحمت ہے، یعنی اللہ کی رحمت کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور اَحکام کی طرف راہنمائی ہے، تو راہنمائی یہ سبب بنتی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت تک پہنچنے کا۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ: پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے، وَصَدَفَ عَنْهَا: اور اُن سے اِعراض کرے، سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ: عنقریب بدلہ دیں گے ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے اِعراض کرتے ہیں بُرا عذاب، سَنَجْزِیْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ: عنقریب بدلہ دیں گے ہم انہیں بُرا عذاب، بِمَا كَانُوْا یَصْدِفُوْنَ: بسبب اس کے کہ وہ اِعراض کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضمون

پچھلی آیات میں خصوصیت کے ساتھ تحریم اور تحلیل میں مشرکین نے جو اپنی طرف سے راہ اختیار کر رکھی تھی اُس کے اُوپر تفصیلاً انکار آیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو کسی چیز کے حرام ٹھہرانے کا حق نہیں، کسی چیز کو حلال ٹھہرانے کا حق نہیں، اور جنہوں نے اپنے تقلیدِ آباء کے طور پر بعض چیزوں کو اَز خود حرام ٹھہرا لیا، یا بعض چیزوں کو حلال ٹھہرا لیا، یہ اللہ کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں، یہ تفصیل آپ کے سامنے آئی ہے، خاص طور ماکولات کے بارے میں شرکیہ رُسوم کی تردید کی گئی، اب یہاں اللہ تعالیٰ ملتِ ابراہیمی کو واضح کرتا ہے، کہ اپنی طرف سے تم راستے تجویز نہ کرو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح راستہ جو اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت جو دُنیا اور آخرت میں اُس کی رحمت کے حاصل کرنے کا سبب ہے، وہ راستہ یہ ہے جو ان آیات کے اندر پیش کیا جا رہا ہے۔

تحلیل وتحریم کے غلط اُصول

اس لئے فرمایا: قُلْ تَعَالَوْا: آ جاؤ، متوجہ ہو جاؤ، میں تمہیں پڑھ کے سناؤں کہ کون سی چیزیں ہیں جو تمہارے رَبّ نے تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، تمہیں تو تحریم کا حق نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں یہ چیزیں ملتِ ابراہیمی میں حرام تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرام تھیں، عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرام تھیں، یوں سمجھئے کہ انسان کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ

چیزیں حرام ہوں، ان کی تم پروا نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے خلاف، انبیاء ﷤ کی تعلیم کے خلاف اپنے طور پر جو تم نے تحلیل اور تحریم کے اُصول بنا لیے وہ غلط ہیں، وہ دُنیا اور آخرت میں خسارے میں ڈالنے والے ہیں، اور وہ اتباعِ شیطان ہے۔ نمبر ایک اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا: یہ کلام کا اُسلوب ہے کہ جو باتیں کہی جارہی ہیں، بعض نہی کے انداز سے بعض امر کے انداز سے، اور اس میں سے محرمات خود بخود ثابت ہوتی چلی جائیں گی، پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، جس سے معلوم ہو گیا کہ شرک کرنا حرام ہے، شرک کو اللہ نے حرام کیا، ''کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ'' یہ نکرہ تحت النفی ہے جس میں بے جان چیزیں، جان دار چیزیں، مقبولین، غیر مقبولین، شیاطین، جن، انس سب آ گئے، اور اسی طرح سے ظاہری، باطنی، شرکِ جلی، شرکِ خفی سب کچھ آ گیا، جیسے کہ ریا ہے کہ انسان بظاہر عبادت اللہ کی کرتا ہے لیکن اُس میں رضا کسی دوسرے کی مطلوب ہو جاتی ہے، تو یہ جو درجہ ہے شرکِ خفی کا اس سے بھی بچو، نکرہ تحت النفی ان سب صورتوں کو شامل ہو گا، کہ مالی صدقہ دو تو شہرت مطلوب نہ ہو، اور نماز پڑھتے ہو تو اس میں دِکھلاوا مقصود نہ ہو، جو نیکی بھی کرو اُس میں اللہ کی رضا مطلوب ہو، اگر اللہ کی رضا کے ساتھ کسی دوسرے کی رضا کو شامل کر لیا تو اس کو بھی شرکِ خفی کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، تو شرک حرام ہے، باقی! شرک کا مفہوم، اور اس کی نقیض توحید جو مامور ثابت ہو گی کہ شرک نہ کرو بلکہ توحید اختیار کرو، یہ توحید اور شرک، اس کی تفصیل اور اس کی وضاحت آپ کے سامنے پہلے مختلف آیات میں ہو چکی ہے۔

والدین کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: وَاَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اور اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، تو جب اچھا برتاؤ کرنا فرض ہوا تو عدمِ احسان یعنی بُرا برتاؤ کرنا حرام ہوا، جیسے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں آئے گا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ (آیت: ۲۳) اپنے والدین کو اُف بھی نہ کہو، ''اُف'' سے مراد ایسا کلمہ ہے جو ان کے لئے باعثِ تکلیف بنے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا حق ذکر کرنے کے بعد والدین کا حق ذکر کر دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو سب کا محسن ہے ہمارا بھی اور ہمارے والدین کا بھی، سب کا خالق ہے ہمارا بھی اور ہمارے والدین کا بھی، لیکن اس دُنیا کے اندر ہمارے اُوپر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ احسانات اگر ہوتے ہیں تو والدین کے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے بعد کئی مقام پر والدین کا ذکر کیا ہے، وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (حوالہ مذکورہ) والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، تو معلوم ہو گیا کہ والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا یہ حرام ہے۔

مشرکین میں قتلِ اولاد کے مختلف مروّج طریقے

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ: یہ تیسری بات آ گئی۔ اَمْلَقَ، اِمْلَاقًا: رزق کی تنگی میں مبتلا ہونا، قحط زدہ ہونا۔ ''اپنے بچوں کو تنگ دستی کی وجہ سے، افلاس کی وجہ سے قتل نہ کیا کرو'' مشرکین میں قتلِ اولاد مختلف طریقوں سے مروّج تھا، بسا اوقات تو بتوں کے اُوپر بھینٹ چڑھا دیتے تھے، اپنی اولاد کی نذر مانتے تھے کہ اگر ہمارا فلاں کام ہو گیا تو فلاں بُت کے سامنے اپنا بچہ ذبح کر دیں

گے، جس کا ذکر ابھی پچھلی آیات میں آپ کے سامنے گزرا ہے کہ شرکاء نے مشرکین کے لئے قتلِ اولاد کو مزین کر رکھا ہے، تاکہ انہیں دین اور دُنیا کے اعتبار سے برباد کردیں، یہ بھی ان کے ہاں قتلِ اولاد تھا، بتوں کے نام پر یہ قربانی دے دیتے تھے اپنے بچوں کی۔ اور ایک اُن میں قتلِ اولاد تھا لڑکیوں کا، ایک اپنی وہمی فرضی غیرت کی بنا پر، نخوت اور غرور اُن میں کچھ ایسا تھا کہ جب اُن کے گھر لڑکی پیدا ہوتی تو یہ سوچتے کہ اب یہ ہماری لڑکی کسی کے پاس جائے گی، کوئی ہمارا داماد بنے گا، ان کی جو وہمی عزت اور غیرت تھی وہ اس کو برداشت نہ کرتی، تو بچی کو پیدا ہونے کے بعد وہ قتل کردیتے تھے، اس کا ذکر بھی قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات میں آیا ہوا ہے، یہ اُس فرضی اور وہمی غیرت کی بنا پر تھا، یہ غیرت میں غلو ہے، یہ سوچتے کہ ہماری لڑکی کسی کے ہاں جائے گی اور وہ ہمارا داماد بنے گا، اس وجہ سے وہ لڑکی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ تیسرا نظریہ اُن کا قتلِ اولاد کا اِس بنا پر تھا جو یہاں مذکور ہے کہ تنگ دست ہوتے، اپنے گزارے کے لئے اُن کے پاس کھانے کو نہ ہوتا، اب وہ چونکہ ترقی یافتہ دور تو نہیں تھا کہ پیدا ہونے سے قبل کوئی تدبیر اختیار کرلیں کہ پیدا نہ ہو، کوئی برتھ کنٹرول کرلیں، پیدائش کے اُوپر کنٹرول کرلیں، کوئی گولیاں دے دیں، تو ان کے ہاں طریقہ وہی اجڈ قسم کا بڑا ظالمانہ طریقہ تھا کہ بچے پیدا ہوجاتے، پیدا ہوجانے کے بعد اُن کا گلا گھونٹ دیتے، صرف اس وجہ سے کہ جب ہمیں اپنی روٹی کا فکر ہے، ہم اپنی روٹی نہیں کما سکتے، تو ان بچوں کو کہاں سے کھلائیں گے؟ اور اس نظریے کی بنیاد اس پر ہے کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ بچے جو پیدا ہوگئے تو ان کی روزی ہمارے ذِمّے ہے، قرآنِ کریم نے اسی نظریے کی تردید کی ہے کہ پیدا ہونے والوں کا رزق اللہ کے ذِمّے ہے، تم پر اتنی ذمہ داری ہے کہ ان کو نگہداشت کرو، اللہ کی اس امانت کو سنبھالو، اپنی صلاحیت کے مطابق ان کی خدمت کرو، باقی! آگے یہ بھوکے مرتے ہیں، زندہ رہتے ہیں، جیسے کیسے بھی ہیں، پھر اس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، تم اپنے طور پر کوتاہی نہ کرو، رزق اللہ کے ذِمّے ہے، اس لئے یہاں یہ بات کہہ دی گئی کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ: ہم تمہیں بھی دیں گے وَاِيَّاهُمْ: اور انہیں بھی دیں گے، یہ رزق رسانی ہمارے ذِمّے ہے، تمہارے ذِمّے نہیں ہے، تم تو ہماری طرف سے اس بات کے مکلّف ہو کہ جو تم سے ہوسکتا ہے وہ بچوں کی خدمت کرو، یہ تمہارے پاس اللہ کی امانت ہیں، باقی! اگر آپ کی کوشش کے باوجود ان کو کچھ نہیں ملتا اور وہ بھوکے مرجاتے ہیں تو وہ اللہ کی مخلوق ہے اللہ جانے، یہ ذمہ داری اللہ پر ہے تم پر نہیں۔

''مِنْ اِمْلَاقٍ'' اور ''خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ'' کا فرق

یہاں مِنْ اِمْلَاقٍ کا لفظ آیا ہے، تو جس کا معنی یہ ہے کہ والدین تنگ دستی میں مبتلا ہیں اور بچے پیدا ہوگئے، پہلے اُن کو اپنے رزق کا فکر ہوتا ہے، بعد میں بچوں کا، تو اس لئے اللہ تعالیٰ نے نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ میں كُمْ کو پہلے ذِکر کردیا۔ اور ایک آیت میں آئے گا: خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (سورۂ بنی اسرائیل: ۳۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت اگرچہ وہ تنگ دستی میں نہیں ہیں، اُن کے اپنے گزارے کی خوراک اُن کے پاس موجود ہے، لیکن یہ اندیشہ ہے کہ اگر خاندان بڑھ گیا تو پھر ہم تنگ دست ہوجائیں گے، تو گویا کہ وہ اپنی روزی

سے تو بے فکر ہوتے ہیں، کہ اگر بچے نہ ہوں تو ہمارے پاس اتنا ذریعۂ معاش ہے کہ ہم اُس پر گزارہ کر سکتے ہیں، لیکن بچے پیدا ہونے کی صورت میں ہم اِن کو نہیں کھلا سکیں گے، تو وہاں اندیشہ ہوتا ہے مفلس ہونے کا، تو وہاں اللہ تعالیٰ ذکر فرماتے ہوئے یوں کہا نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ، وہاں بچوں کی روزی کا ذکر پہلے کیا ہے، اور والدین کی روزی کا ذکر بعد میں کیا ہے، ہم انہیں بھی دیں گے اور تمہیں بھی دیں گے۔

''خاندانی منصوبہ بندی'' مشرکانہ نظریہ ہے

تو یہ تو انفرادی جرم تھا کہ خاندان کا سربراہ یہ سوچتا تھا کہ میں روٹی کا انتظام نہیں کر سکتا، اس لئے پیدا ہونے والے بچوں کو ختم کر دیا جاتا تھا، مار دیا جاتا تھا، اب یہ ترقی یافتہ دور آ گیا، اب یہ انفرادی نظریے سے قومی اور ملکی سطح پر لوگ سوچنے لگ گئے، کہ وقت کی حکومت سوچتی ہے، کہ ہمارے پاس پیداوار اتنی ہے کہ جتنی اس وقت آبادی ہے بڑی مشکل کے ساتھ اس کا گزارہ ہو رہا ہے، اور اگر یہ آبادی بڑھ گئی تو ایسی صورت میں پھر ملک کے اندر قحط پڑ جائے گا، روزی کی تنگی ہو جائے گی، تو انہوں نے پھر ترقی یافتہ طریقے ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے اور اولاد کو روکنے کے شروع کر دیے، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر عدمِ اعتماد، اللہ تعالیٰ کی رَزّاقیت کے اُوپر عدمِ اِعتماد اور اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری کو اپنے اُوپر ڈال لینے والی بات ہے، کہ رزق رسانی کا ذمہ تو اللہ نے لیا ہوا ہے، لیکن حکومت خواہ مخواہ اس کو اپنے سر پہ تھوپتی ہے، اور قدرت کے ساتھ مزاحمت کرتی ہوئی اس قسم کے منصوبے بناتی ہے، کہ اس سال گندم اتنی پیدا ہوگی، بچے اتنے پیدا ہونے چاہئیں، اگر اس سے زیادہ بچے پیدا ہو گئے تو پھر یہ توازن بگڑ جائے گا، وہ اپنے طور پر یوں حساب لگانے بیٹھ جاتے ہیں، اور یہ دونوں باتیں ہی اُن کے بس سے باہر ہیں، گندم اتنی پیدا ہوگی یہ قبل از وقت اُن کی منصوبہ بندی بھی خواہ مخواہ اللہ کی قدرت کے ساتھ ٹکراؤ ہے، ہوسکتا ہے کہ اتنی گندم پیدا نہ ہو، تم نے اپنے طور پر اتنے کھیتوں کے اندر دانہ بکھیر دیا، لیکن تمہیں پتا ہے کہ موسم سازگار رہے گا؟ تمہیں پتا ہے کہ ژالہ باری نہیں ہوگی؟ تمہیں پتا ہے کہ کسی اور قسم کے طوفان نہیں آئیں گے جن کے ساتھ فصلوں کا نقصان ہو جاتا ہے؟ اس لئے اُن کی یہ منصوبہ بندی بھی محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ٹکراؤ ہے، اصل بات یوں ہے کہ اپنی طرف سے کوشش کرو، باقی! کہو کہ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ رزق کے اندر تنگی نہیں دے گا، کوشش میں کمی نہ کرو، زمین کا سینہ چیر کر اپنے رزق کو تلاش کرو، پہاڑوں میں تلاش کرو، اپنی کوشش پوری صرف کرو، تم اس بات کے مکلف ہو، باقی! آگے اللہ پر اعتماد کرو، اتنی گندم پیدا ہوگی یہ بھی اپنے طور پر تجویز غلط، اور اتنے بچے پیدا ہونے چاہئیں یہ تدبیر بھی غلط، تو اگر بچے اس سے زیادہ پیدا ہو جائیں اور گندم اس سے کم پیدا ہو تو سوائے اس کے کہ انسان اپنی جگہ پریشان ہوگا اور کیا حاصل ہے؟ یہ چیزیں انسان کے بس میں نہیں ہیں، انسان کا اس انداز کے ساتھ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ کی رَزّاقیت پر اعتماد نہ رہے یہ بدبختی ہے، اور یہ وہی مشرکانہ نظریہ ہے جس نظریے کی بنا پر وہ اپنے بچوں کو قتل کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور رزّاقیت میں تناسب ہے

ایک بزرگ نے بڑی اچھی بات کہی، ایک دفعہ ہم مجلس میں بیٹھے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ لوگ جو ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے طور پر سوچتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے نظم کو بھی ایسے ہی سمجھتے ہیں کہ جیسے ان کا اپنی دفتری نظم ہوتا ہے، کہ ایک تو وزیرِ خوراک ہے مثال کے طور، یا یوں سمجھ لیجئے کہ مدرسے میں ایک تو داخلہ کرنے والا ہے، دوسرا مطبخ کا انتظام کرنے والا ہے، داخلہ کرنے والا دھڑا دھڑ داخلہ کرتا چلا جا رہا ہے، اُسے پتا ہی نہیں کہ مطبخ کا انتظام کرنے والے کے پاس کتنا آتا ہے، کتنا آتا نہیں ہے، یا مطبخ کا انتظام کرنے والے کو پتا ہی نہیں کہ کتنا داخلہ ہوگیا اور میں نے کتنوں کی روٹی پکوانی ہے، اس لئے بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے کہ آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کا یہ دُنیا کا کارخانہ بھی ایسے ہی ہے، کہ کسی کے ذِمّے تو رزق لگا رکھا ہے کہ اتنا پیدا کرنا ہے، اور کسی کے ذِمّے بچے پیدا کرنے لگا رکھے ہیں، بچے پیدا کرنے والے کو پتا نہیں کہ رزق کتنا ہے اور میں نے کتنے پیدا کرنے ہیں، اور رزق والے کو پتا نہیں کہ پیدا کتنے ہو رہے ہیں اور میں نے انتظام کتنوں کا کرنا ہے، یہ بے ڈھنگا نظریہ گویا کہ ان لوگوں کا ہے، اور انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی خالق ہے، خود ہی رازق ہے، وہ جتنے پیدا کرے گا اتنے کے رزق کا انتظام بھی کرے گا، اور جتنا اُس کی حکمت کے مطابق رزق کا انتظام ہے، اتنا پیدا کرے گا، تو اس کے خلق میں اور اس کی رَزّاقی میں تناسب ہے، یہ ہم لوگ ہیں کہ دونوں قسم کی باتیں علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہیں جس کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ توازن بگڑ گیا، توازن بگڑتا نہیں، اس کی حکمت کے تحت خلق اور اس کی صفتِ رَزّاقی ان دونوں کے درمیان میں تناسب ہے، اس لئے جن کو پیدا کرے گا اُن کے لئے وہ اسبابِ رزق بھی پیدا کرے گا، اور جتنے اسبابِ رزق پیدا کرتا چلا جائے گا اتنا اپنی مخلوق کے اندر اِضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ آج اگر دُنیا کی آبادی آپ کو بڑھی ہوئی نظر آتی ہے تو دیکھو تو سہی کہ پہلے کے مقابلے میں وسائلِ رزق کتنے حاصل ہوگئے، جیسے جیسے آبادی بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے وسائلِ رزق حاصل ہوتے جا رہے ہیں، پہلے لوگ صرف لکڑی جلاتے تھے، پھر اللہ نے پہاڑی کوئلہ دے دیا، پھر مٹی کا تیل دے دیا، پھر گیس دے دی، پھر بجلی دے دی، جیسے جیسے ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی نئی چیزیں ظاہر ہوتی چلی جا رہی ہیں، اور اسی طرح سے آپ دیکھیں گے کہ زمین پہلے جتنی آباد تھی اس کے مقابلے میں کتنی زیادہ آباد ہوگئی، اور ابھی تک کتنی زمین غیر آباد پڑی ہے کہ اگر اس کو آباد کیا جائے تو غلّہ اور بھی زیادہ فراوانی کے ساتھ حاصل ہوسکتا ہے، پہلے ایک کھیت میں جتنی پیداوار تھی اب جدید طریقوں کے ساتھ جب ترقی کی گئی تو اس کھیت میں پہلے سے چارگنی پانچ گنی پیداوار زیادہ ہوگئی، تو یہ اللہ کی حکمت ہے، اس لئے اس نظریے کے تحت ''خاندانی منصوبہ بندی'' کو اپنانا یہ باطنی طور پر گویا کہ وہی مشرکوں والا جذبہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ: مِنْ اِمْلَاقٍ اور خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ یہ دو لفظ جو آئے تو دونوں کے درمیان فرق میں نے آپ کے سامنے واضح کردیا، کہ فی الحال والدین تنگی میں ہیں تو مِنْ اِمْلَاقٍ صادق آتا ہے، اور اگر فی الحال تنگی میں نہیں ہیں لیکن خاندان بڑھ جانے کی صورت میں وہ ڈرتے ہیں کہ تنگی ہوجائے گی وہاں خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ صادق آتا ہے، مِنْ اِمْلَاقٍ میں اپنی روزی کی فکر ہے،

بچوں کو کہاں سے کھلائیں، تو نَرْزُقُكُمْ کہا یعنی کُمْ کو پہلے ذکر کر دیا، خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ میں اپنی روزی سے کسی درجے میں اطمینان ہے بچوں کی روٹی کا فکر ہے، تو وہاں نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ہے، وہاں هُمْ کو مقدم کر دیا، تو یہ اللہ تعالیٰ نے جو الفاظ بیان فرمائے ہیں اُن کے اندر یہی حکمت پوشیدہ ہے۔

چند بُنیادی منہیات کا ذِکر

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ: بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو ان میں سے چھپے ہوئے ہیں، ظاہری بے حیائی اور باطنی بے حیائی، باطنی بے حیائی سے مراد دِل کے اندر غلط سوچنا، غلط جذبات، غلط نظریے، اور ظاہری بے حیائی سے مراد اپنے ہاتھوں سے، پاؤں سے، آنکھوں سے بے حیائی کے کام کرنا، زِنا کا صدور یہ ظاہری بے حیائی ہے، اور اس کے دواعی اور اس کی طرف رغبت اور اس کے متعلق تدبیریں سوچنا یہ سب باطنی بے حیائی ہے، تو بے حیائی کے کام ظاہر ہوں باطن ہوں سب کو چھوڑ دو، ان کے قریب نہ جاؤ۔ تو فواحش کا ارتکاب حرام ہوا۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ: کسی نفس کو قتل نہ کرو ایسا نفس جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ہاں حق کے ساتھ اس کو قتل کیا جاسکتا ہے، تو بلا وجہ قتلِ نفس نہ کرو، تو قتلِ نفس حرام ہے۔ بِالْحَقِّ کے اندر آ جائے گا جیسے کسی نے زِنا کر لیا اور وہ محصن ہے تو اُس کو رَجم کر دیا جائے گا، ظلماً کسی کو قتل کر دیا تو قصاص میں اُس کو قتل کر دیا جائے گا، دِین سے مرتد ہو گیا تو ارتداداً قتل کر دیا جائے گا، یہ صورتیں بِالْحَقِّ میں آ جاتی ہیں، ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کی تاکید کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو، یعنی آباء اجداد کا طریقہ یہ عقل کے مطابق نہیں ہے، وہ فطرت کے خلاف ہے جو تم نے اختیار کر لیا، سوچو، سوچنے کے بعد تمہیں پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ طریقہ ہی ٹھیک ہے، اور جو ہم نے تقلیدِ آباء کے طور پر چیز اختیار کر رکھی ہے وہ عقل کے مطابق نہیں ہے، فطرت کے مطابق نہیں ہے، کچھ سوچو تا کہ تقلیدِ آباء کا طوق تمہارے گلے سے اُتر جائے، عقل سے کام لو۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ: یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، اس قسم کے اَحکام سارے سورۂ نساء میں گزر چکے ہیں، ''قریب نہ جاؤ'' یہ تاکید ہوتی ہے، کہ ایک تو ہے کھالینا اور ایک ہے کھانے کے قریب جانا، ممانعت اِس کی ہے کہ کھانے کے قریب بھی نہ جاؤ، اس میں کوئی قسم کا تصرف نہ کرو جو یتیم کے لئے نقصان دہ ہے، اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: مگر ایسے طریقے کے ساتھ ہی جو کہ اچھا ہے، جس میں یتیم کا بھلا ہے، یتیم کے فائدے کے طور پر یتیم کے مال میں تصرف کرو، ویسے یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، ہاں جس وقت وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے گا پھر وہ مختار ہو گیا پھر مال اُس کے سپرد کر دو، پھر قصہ ختم! یعنی یہ جو لَا تَقْرَبُوْا ہے یہ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ، کیونکہ احتمال ہی اُس وقت ہے جب تک وہ جوان نہیں ہوتا، اور جب وہ جوان ہو جائے تو اُس کے بعد اُس کا مال اُس کے سپرد کر دو، جس طرح سے سورۂ نساء کے پہلے رُکوع میں تفصیل آئی تھی۔

چند بُنیادی مَاموراتِ کا ذِکر

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ: یہ معاملات آ گئے۔ ناپ اور تول کو پورا پورا کرو، یعنی کم نہ تولو اور کم نہ ماپو، وَاَوْفُوا بِالْقِسْطِ: انصاف کے ساتھ پورا کرو، جتنا جس کا حق بنتا ہے اتنا اُس کو ادا کرو، اس میں کمی بیشی کرنے کو عمل تطفیف کہتے ہیں، سورۂ مطففین کے اندر جس

طرح سے ذکر کیا گیا: وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ۔ وہاں یہی تفصیل کی کہ جب لوگوں سے کیل کر کے لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں، اور جب اُن کو کیل کر کے یا وزن کر کے دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں، اُن کو مطففین قرار دے کر اُن کے لئے ویل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: یہ گویا کہ تسہیل ہے، کہ ان اَحکام کو مشکل نہ سمجھو، ہم نے ہر نفس کو اس کی گنجائش کے مطابق ہی تکلیف دی ہے، برداشت سے زیادہ ہم حکم ہی نہیں دیتے، یا یہاں اس کا موقع محل یہ ہے کہ اپنی طرف سے ناپ تول پورا کرو، سہو ونسیان کے ساتھ اگر کچھ کمی بیشی ہو بھی جائے تو انسان کے بس سے باہر ہے، اور انسان کی وسعت سے باہر جو بھی چیز ہو ہم اُس کا انسان کو مکلف نہیں ٹھہراتے، اپنے علم اپنے ارادے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق تم ٹھیک ٹھیک ادا کرو، باقی! بھول چوک ہوگئی، کسی قسم کی کمی بیشی ہوگئی تو ہم معاف کردیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تکلیف اتنی دیتا ہے کسی کو جتنی اس میں گنجائش ہوتی ہے۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا: قُلْتُمْ سے یہاں وہی! بات کرنا شہادت دینا مراد ہے، جب تم بات کرو تو انصاف کی رعایت رکھا کرو، انصاف سے کرو، وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى: اگرچہ وہ شخص جس کے متعلق تم بیان دے رہے ہو رشتے دار ہی کیوں نہ ہو، رشتے دار کی رعایت کرتے ہوئے خلافِ حق خلافِ عدل بات نہ کرو، یہ سب اَحکام ایسے ہیں کہ مختلف آیات کے اندر ان کی تفصیل گزر چکی ہے۔ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا: اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، اللہ کے عہد کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ نے کوئی نذر مان لی، اور اللہ کے عہد کے اندر یہ سارے کے سارے اَحکامِ شریعت بھی آ گئے، کہ جب آپ نے کلمہ پڑھ لیا تو اللہ سے عہد کرلیا کہ ہم تیرے اَحکام مانیں گے، ''اللہ کے اس عہد کو پورا کرو'' اللہ کے عہد کے اندر عہدِ میثاق بھی داخل ہے جو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے تحت لیا گیا تھا وہ میثاق بھی اس عہد کا مصداق بن سکتا ہے، کہ تم نے اقرار کیا تھا اور میرے ساتھ عہد کیا تھا کہ ہم تجھے رَبّ سمجھتے ہیں اور رَبّ سمجھیں گے، تو اَب میری رُبوبیت کا عقیدہ رکھو، اس عہد کو پورا کرو، تو گویا کہ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا کے اندر سارے ہی اَحکامِ شریعت آ گئے۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: اس بات کے ساتھ تمہیں اللہ تاکید کرتا ہے تاکہ تم یاد کرو، یہ بھولی بسری باتیں تمہیں یاد دِلائی جارہی ہیں، جو اصل کے اعتبار سے بدءِ فطرت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو سکھائی ہیں، عقل سے کام لوگے تو یہ تمہارا نسیان اور تمہاری خطا دُور ہوجائے گی، اور یہ باتیں تمہیں اچھی طرح سے یاد آجائیں گی، اور یاد ہونے کے بعد پھر اس کے اُوپر عمل کروگے تو آخرت کی سعادت حاصل کرلوگے۔

''صراطِ مستقیم'' کی اِتباع کی تاکید

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا: اور یہ بات بھی انہیں بتلادو کہ یہی راستہ جو ان آیات میں واضح کیا گیا ہے، یہی میرا راستہ ہے اس حال میں کہ سیدھا ہے۔ مُسْتَقِیْمًا یہ صراط سے حال واقع ہے، اور اس کے اندر هٰذَا عامل ہے، چونکہ هٰذَا کے اندر فعل والا معنی موجود ہے۔ ''میرا یہ راستہ ہے اس حال میں کہ سیدھا ہے'' فَاتَّبِعُوْهُ: اسی کی تم اتباع کرو، وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ: مختلف راستوں کی اتباع نہ کرو جو شیطان نے تمہیں سکھا دیئے، دائیں بائیں نکل گئے ہو، ''مختلف راستوں کی اتباع نہ کرو، وہ

تمہیں اللہ کے راستے سے متفرق کردیں گے" مختلف پگڈنڈیاں اختیار کرو گے تو کسی کا منہ کدھر کو ہوگا، کسی کا کدھر کو ہوگا، یہ مختلف راستے اللہ کے راستے پر تمہیں چلنے نہیں دیں گے، بس یہی سیدھا راستہ ہے جو ان آیات کے اندر واضح کردیا گیا ہے، اسی کو اختیار کرو، ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرلو، عقل سے کام لوگے تو عقل سے کام لینے کے نتیجے میں یہ اَحکام یاد ہوں گے، اور اَحکام کو یاد رکھنے کے بعد عمل کرو گے تو تقویٰ کی صفت تمہارے اندر پیدا ہوگی، اور یہی رُوحانی کمال ہے۔

توراۃ کا تذکرہ اور اس کا مقصد

ان اَحکام کو ذِکر کرنے کے بعد اب اِن آیات (ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ الخ) میں مسئلہ رِسالت ذِکر کیا جارہا ہے، اور اصل مقصود اِس میں بھی اُن اَحکام کی اتباع کی تاکید ہے، جس میں یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول بھی بھیجتا ہے اور اُن کو کتابیں بھی دیتا ہے، اور اس میں اسی صراطِ مستقیم کی وضاحت ہوتی ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ یہ ثُمَّ کا لفظ جو یہاں بولا گیا ہے یہ تاخیرِ ذِکری کے لئے ہے، کہ ان باتوں کے بعد پھر یہ بات بھی سنو کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی، تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً: الَّذِیْۤ اَحْسَنَ: جو لوگ نیکوکار ہیں (صیغہ اگرچہ مفرد کا ہے معنیٰ جمع ہے) ان کے اُوپر اپنی نعمت کو پورا کرنے کے لئے، اور ہر ضروری چیز تفصیل کے لئے، اور راہنمائی کے لئے اور رحمت کے لئے، یعنی اس لئے دی تھی تاکہ لوگوں کو راہنمائی حاصل ہو، اور تاکہ اس راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں تو اللہ کی رحمت کو حاصل کرلیں، اور لَعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ: تاکہ وہ لوگ اپنے رَبّ کی ملاقات کے ساتھ ایمان لے آئیں، اصل راہنمائی کتاب کی یہی ہے، کہ اللہ کی ملاقات پر یقین لاؤ کہ مرنے کے بعد تم نے دوبارہ اُٹھنا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی، وہاں جاکر جزا اور سزا کا سلسلہ ہوگا، جس شخص نے اللہ کی کتاب سے یہ راہنمائی حاصل کرلی اُس کو سارے کا سارا دِین ہی مل گیا، عقیدۂ آخرت بنیاد ہے ہر قسم کی عملی اصلاح کی۔

قرآنِ کریم کا تذکرہ اور اس کا مقصد

موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے بعد آپ ﷺ کی کتاب کا ذکر آگیا، جس میں آپ ﷺ کی رسالت بھی مذکور ہوگئی، کتاب کی اہمیت بھی آگئی۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ: اور یہ کتاب ہے، اس کو ہم نے اُتارا، مُبٰرَكٌ: برکت دی ہوئی ہے، برکت کا معنی نفع، بہت نفعِ کثیر کی حامل ہے، اللہ نے اس میں بہت منافع رکھے ہیں، فَاتَّبِعُوْهُ: پس تم اس کی اتباع کرو، وَاتَّقُوْا: اور تقویٰ اختیار کرو، لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: تاکہ تم پر رحم کیا جائے، یعنی جب تم تقویٰ اختیار کرو گے، کتاب کی اتباع کرو گے تو تم اللہ کی رحمت کو حاصل کرلو گے۔ اور اس کے اُتارنے سے ایک یہ بھی مقصد ہے کہ آخرت میں جس وقت تمہیں سزا ہونے لگے گی کُفر و شرک پر اور نافرمانی پر، تو پھر کہیں تم یوں عذر نہ کرنے لگ جاؤ کہ ہمارے پاس کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں آئی تھی، اور پہلی کتابیں تورات وانجیل جو اُتری تھیں وہ یہود و نصاریٰ کے پاس تھیں، ان کے پڑھنے پڑھانے کی ہمیں کوئی خبر نہیں تھی، اس طرح سے تم عذر نہ کرنے لگ

جاؤ، اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ عذر زائل کر دیا، اب اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا تمہارا کام ہے،'' تا کہ تم کہنے نہ لگ جاؤ'' لِئَلَّا تَقُوْلُوْا، یا مَخَافَةَ اَنْ تَقُوْلُوْا، دونوں طرح سے ترجمہ ہو جایا کرتا ہے،'' ہم نے اس کتاب کو اُتارا تا کہ تم کہنے نہ لگ جاؤ کہ سوائے اس کے نہیں کہ اُتاری گئی تھی کتاب دو گروہوں پر'' دوگروہوں سے یہاں یہود ونصاریٰ مراد ہیں، مِنْ قَبْلِنَا: ہم سے قبل، وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ: اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے البتہ بے خبر تھے، اس لئے ہم معذور ہیں،'' یا تم یوں نہ کہنے لگ جاؤ'' جس وقت باقی اُمتوں کے متبعین کو ثواب ملے گا اور تم محروم رہو گے، تو پھر تم یوں نہ کہنے لگ جاؤ کہ'اگر ہم پر کتاب اُتاری جاتی تو ہم اِن لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے'' تم یہ عذر کرو گے کہ ہمارے پاس کتاب ہی نہیں آئی، ورنہ اگر کتاب آجاتی تو ہم اِن سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ عذر زائل کر دیا، فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: تمہارے رَبّ کی طرف سے واضح دلیل آگئی، واضح دلیل کا مصداق یہی کتاب ہے، واضح اس کو اس لئے کہہ دیا کہ اپنے مقاصد میں بالکل واضح ہے، اور ہر بات کھول کھول کر بیان کر رہی ہے،'' اور آگئی تمہارے پاس ہدایت اور رحمت'' ہدایت کا مصداق بھی یہی کتاب ہے کہ یہ راہنمائی کا باعث بنتی ہے، اور رحمت کا مصداق بھی یہی کتاب، کہ اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے،'' پھر کون بڑا ظالم ہے اُس شخص سے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے اِعراض کرے'' سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ: عنقریب دیں گے ہم اُن لوگوں کو جو ہماری آیات سے اِعراض کرتے ہیں بُرا عذاب، بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ: اُن کے اِعراض کرنے کی وجہ سے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ

نہیں انتظار کرتے وہ لوگ مگر اس بات کا کہ آجائیں اُن کے پاس فرشتے یا آجائے آپ کا رَبّ یا آجائے

بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا

آپ کے رَبّ کی آیات میں سے بعض، جس دن آپ کے رَبّ کی آیات میں سے بعض آیت آجائے گی نہیں نفع دے گا کسی نفس کو

اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا

اُس کا ایمان جو اس سے قبل ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کسبِ خیر نہ کیا ہو،

خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ

آپ کہہ دیجئے کہ تم انتظار کرو، بیشک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں ﴿۱۵۸﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو فرقہ فرقہ کر لیا

وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى

اور وہ مختلف گروہ ہوگئے آپ اُن سے کسی شئ میں نہیں، بے شک ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے

اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ

پھر وہ خبر دے گا انہیں اُن کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۵۹﴾ جو شخص حسنہ لے آیا

فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا

اس کے لئے اس حسنہ کی دس مثل ہیں، اور جو کوئی سیئہ لے آیا پس وہ بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر

مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى

اُس سیئہ کے برابر، اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿۱۶۰﴾ آپ فرمادیجئے بے شک مجھے ہدایت دی میرے رب نے

صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ

سیدھے راستے کی طرف، جو مضبوط دین ہے یعنی ابراہیم کا طریقہ، ایسا ابراہیم جو حنیف تھا،

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ

اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا ﴿۱۶۱﴾ آپ کہہ دیجئے بیشک میری نماز اور میری قربانی

وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ

اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۱۶۲﴾ اُس کا کوئی شریک نہیں،

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ

اور اسی کا میں حکم دیا گیا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے پہلا مسلمان ہوں ﴿۱۶۳﴾ آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں اللہ

اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ

کے غیر کو رب طلب کروں؟ حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے، نہیں کمائے گا کوئی شخص

اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ

مگر اس کا وبال اسی پہ پڑنے والا ہے، نہیں بوجھ اُٹھائے گا کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ، پھر تمہارے رب کی طرف ہی

مَّرْجِعُكُمْ	فَيُنَبِّئُكُمْ	بِمَا	كُنْتُمْ	فِيْهِ	تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾	وَهُوَ

تمہارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں خبر دے گا اُن چیزوں کی جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۶۴﴾ اور اللہ وہ ہے

الَّذِيْ	جَعَلَكُمْ	خَلٰٓئِفَ	الْاَرْضِ	وَرَفَعَ	بَعْضَكُمْ	فَوْقَ	بَعْضٍ
جس نے	تمہیں	زمین	میں خلیفے	بنایا اور	اونچا کیا	تمہارے بعض	کو بعض پر

دَرَجٰتٍ	لِّيَبْلُوَكُمْ	فِيْ	مَآ	اٰتٰىكُمْ	اِنَّ	رَبَّكَ	سَرِيْعُ الْعِقَابِ

درجوں میں تاکہ تمہاری آزمائش کرے اُس چیز میں جو اس نے تمہیں دی ہے، بے شک آپ کا رَبّ جلدی سزا دینے والا ہے،

وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

اور بے شک وہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۶۵﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ نہیں انتظار کرتے وہ لوگ مگر اس بات کا کہ آجائیں ان کے پاس فرشتے۔ اَنْ چونکہ اپنے مابعد فعل کو مصدر کی تاویل میں کر دیا کرتا ہے، اس لیے یوں بھی ترجمہ کر سکتے ہیں ''نہیں انتظار کرتے وہ مگر اپنے پاس فرشتوں کے آنے کا''، اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ: یا آنا آپ کے رَبّ کا، اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ: یا آنا آپ کے رَبّ کی بعض آیات کا، یعنی اِن چیزوں کا وہ انتظار کرتے ہیں۔ ''نہیں انتظار کرتے وہ مگر اس بات کا کہ آجائیں ان کے پاس فرشتے یا آجائے آپ کا رَبّ، یا آجائے آپ کے رَبّ کی آیات میں سے بعض'' يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ: جس دن آپ کے رَبّ کی آیات میں سے بعض آیت آجائے گی، لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ: نہیں نفع دے گا کسی نفس کو اس کا ایمان جو اس سے قبل ایمان نہ لایا ہو۔ لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ یہ نَفْسًا کی صفت ہے۔ ایسا نفس جو اس سے قبل ایمان نہ لایا ہو، اس بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ کے آنے سے قبل ایمان نہ لایا ہو، اس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا، اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا: كَسَبَتْ کا عطف اٰمَنَتْ کے اوپر ہے۔ نہیں نفع دے گا کسی نفس کو اس کا ایمان جس نے اپنے ایمان میں کسب خیر نہ کیا ہو قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: آپ کہہ دیجیے کہ انتظار کرو، بیشک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو فرقہ فرقہ کرلیا، ٹکڑے ٹکڑے کرلیا، دین میں تفرق ڈال دیا، جنہوں نے اپنے دین کو علیحدہ علیحدہ کرلیا، وَكَانُوْا شِيَعًا: اور وہ مختلف گروہ ہو گئے۔ شِيَعًا، شِيْعَةٌ کی جمع ہے، ''شیعہ'' ایک جماعت کو کہتے ہیں جو کسی نظریے پہ متحد ہو گئی ہو۔ لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ: آپ ان کی طرف سے کسی شئ میں نہیں، یعنی آپ کو ان سے کوئی تعلق نہیں، اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ: بیشک ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ: پھر وہ خبر

دے گا انہیں، بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: ان کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ: جو شخص حسنہ لے آئے، اچھائی لے آیا، فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا: اس کے لئے اس حسنہ کی دس مثل ہیں، وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ: اور جو کوئی سیئہ لے آیا، فَلَا يُجْزٰٓى: پس وہ بدلہ نہیں دیا جائے گا، اِلَّا مِثْلَهَا: مگر اس سیئہ کے برابر، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔ قُلْ: آپ فرما دیجئے! اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ: بیشک مجھے ہدایت دی میرے رَبّ نے، اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: سیدھے راستے کی طرف، دِيْنًا قِيَمًا: قِيَمًا قَيِّمًا کے معنی میں ہے، مضبوط دِین۔ اور دِيْنًا قِيَمًا یہ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کے محل سے بدل ہے، کیونکہ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کا محل ہے هَدٰىنِيْ کا دوسرا مفعول، تو محلاً چونکہ وہ منصوب ہے، اس لیے دِيْنًا قِيَمًا میں نصب آ گئی۔ مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ: یہ بیان ہے اس دِيْنًا قِيَمًا کا۔ یعنی مِلّتِ ابراہیم، ابراہیم کا طریقہ، حَنِيْفًا: ایسا ابراہیم جو حنیف تھا، جس میں کوئی کجی نہیں، وہ تمام دِینوں سے ہٹ کر ایک دِین کی طرف متوجہ ہونے والا تھا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ قُلْ: آپ کہہ دیجیے، اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ: بیشک میری نماز اور میری قربانی۔ نُسک قربانی کے معنی میں بھی آتا ہے، مطلق عبادت کے معنی میں بھی آتا ہے، اور اَحکامِ حج میں سے ہر حکم کو بھی نُسک کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، لیکن یہاں قربانی کا معنی مناسب ہے، کہ صَلَاتِيْ کے اندر بدنی عبادت آ جائے گی، اور نُسُكِيْ کے اندر مالی عبادت آ جائے گی، وَمَحْيَايَ: اور میری زندگی، وَمَمَاتِيْ: اور میری موت، مَحْيَا یہ بھی مصدر میمی ہے، اور مَمَات یہ بھی مصدر میمی ہے۔ ”میرا جینا اور میرا مرنا“ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رَبّ ہے، لَا شَرِيْكَ لَهٗ: اس کا کوئی شریک نہیں، وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ: اور اِسی کا میں حکم دیا گیا ہوں، وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ: اور میں مسلمانوں میں سے پہلا مسلمان ہوں، یعنی اِس اُمّت کے اعتبار سے، یا حقیقت خلقت کے اعتبار سے، دونوں معنی ہو سکتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ سب سے پہلے نُورِ محمدی کو ہی پیدا کیا تھا تو سب سے پہلے ایمان کا ظہور بھی آپ سے ہی ہوا، اور اگر اس ظاہری دُنیا کو مراد لیا جائے تو پھر اپنی اُمّت کے اعتبار سے اوّل المسلمین آپ ﷺ ہیں، کیونکہ جو نبی آیا کرتا ہے سب سے پہلے ایمان اسلام اسی کا ہوتا ہے، اس کے بعد پھر اُمّت میں اس کی اشاعت ہوتی ہے۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا: آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں اللہ کے غیر کو رَبّ طلب کروں؟ وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ: حالانکہ وہ ہر چیز کا رَبّ ہے، وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا: نہیں کمائے گا کوئی شخص مگر اُس کا وبال اسی پہ پڑنے والا ہے، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى: نہیں بوجھ اُٹھائے گا کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ۔ وَازِرَةٌ: نَفْسٌ وَّازِرَةٌ۔ وَازِرَةٌ صیغہ مؤنث کا نفس کے اعتبار سے آ گیا۔ کوئی بوجھ اُٹھانے والا نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، وِزْرَ نَفْسٍ اُخْرٰى۔ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ: پھر تمہارے رَبّ کی طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے، فَيُنَبِّئُكُمْ: پھر وہ تمہیں خبر دے گا، بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: ان چیزوں کی جس میں کہ تم اختلاف کیا کرتے تھے، وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ: اور اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفے بنایا۔ خَلٰٓئِفَ خلیفہ کی جمع ہے، جانشین۔ خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی کے جانے کے بعد اس کی جگہ آیا ہو، اللہ نے تمہیں پہلی اُمتوں کے جانشین بنایا، زمین کے اندر تمہیں خلیفے بنایا، وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ: اور اُونچا کیا تمہارے بعض کو بعض پر درجوں میں، لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ: تاکہ تمہاری آزمائش کرے اس چیز میں جو اس

نے تمہیں دی ہے، اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ: بیشک آپ کا رَبّ جلدی سزا دینے والا ہے، وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اور بیشک وہ غفور رحیم ہے، بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ

تفسیر

ماقبل سے ربط

پچھلی آیات میں مشرکین پر ہر لحاظ سے ہر نہج سے حجت تام کردی گئی، شرک کے رد کرنے میں، اثبات توحید میں، خاص طور پر تحلیل و تحریم کے مسئلے میں، اتنی وضاحت اور بات کو اتنا مدلل کر دینے کے بعد بھی اگر وہ نہیں مانتے تو اس پر اُن کو یہاں تنبیہ کی گئی ہے۔

ایمان کب نافع ہوتا ہے اور کب نہیں؟

هَلْ يَنْظُرُوْنَ یہ منتظر نہیں، یہ کسی اور چیز کے منتظر نہیں مگر ان چیزوں کے منتظر ہیں کہ جب یہ چیزیں آجائیں گی تب یہ ایمان لائیں گے، لیکن ان چیزوں کے آجانے کے بعد ایمان لانا پھر ان کے کسی کام نہیں آئے گا، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ایمان لانے سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں تو آج وقت ہے ایمان لانے کا، اور جب یہ چیزیں واضح ہوجائیں گی اس کے بعد ایمان لانا، نہ لانا برابر ہے، چونکہ ایمان کے بارے میں دستور یہ ہے کہ یہ بالغیب اگر ہو تو قابلِ قبول ہے، اور جس وقت عالمِ آخرت منکشف ہوجائے یا اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ڈنڈا سر پر کھڑا ہوجائے تو اس عذاب کے ڈنڈے کو دیکھ کر، یا عالمِ آخرت کے منکشف ہوجانے کی صورت میں جو ایمان لایا جاتا ہے، یہ ایمانِ مشاہدہ ہے، اور اس دُنیا کے اندر یہ قابلِ قبول نہیں، جیسے کہ آخرت میں جس وقت لوگ جہنم کو دیکھیں گے تو یہ کافر مشرک پکاریں گے، کہ ہم ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی ہر بات کی تصدیق کرنے کے لئے تیار ہوجائیں گے، لیکن ان کی یہ تصدیق بھی کارآمد نہیں ہوگی، اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: مگر یہ ان کے پاس فرشتے آجائیں، اس سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ عذاب لے کر آجائیں، اور قیامت کا منظر بھی مراد ہوسکتا ہے کہ فرشتے آجائیں اور آپ کا رَبّ آجائے، جیسے کہ حساب و کتاب کے لئے آئیں گے، مطلب یہ ہے کہ اب یہ قیامت کے ہی منتظر ہیں کہ جب قیامت آئے گی تب یہ مانیں گے، اور اُس وقت ماننا، نہ ماننا برابر ہے، تو اس میں اُن کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کو مایوس کرنا بھی مقصود ہے اور اُن کو ایک تنبیہ کرنی بھی مقصود ہے، کہ جب تم ان دلائل سے متاثر ہو کر ایمان نہیں لاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک عذاب آنکھوں کے سامنے نہیں آئے گا اُس وقت تک نہیں مانیں گے، اور اگر تم اس بات پر تلے ہوئے ہو کہ ہمارے سامنے فرشتے آجائیں عذاب لے کر، یا اللہ تعالیٰ آجائے حساب و کتاب کے لئے تو یہ تمہاری بدبختی ہے، اور یہ تم اپنے متعلق اچھا نہیں سوچ رہے۔ تو اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ: اس کا مصداق تو

قیامت ہوجائے گی، قیامت کے دن فرشتے بھی آئیں گے، اور ربّ بھی آئے گا حساب وکتاب کے لئے۔ اَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ: یا آپ کے ربّ کی آیات میں سے بعض آیات اِن کے سامنے آجائیں یہ اس بات کے منتظر ہیں "اور جس دن آپ کے ربّ کی آیات سے بعض آیات آجائیں گی تو کسی نفس کو اُس کا ایمان لانا نفع نہیں دے گا جو اس سے قبل ایمان نہ لایا ہو" اب اس آیت کی صراحت سے یہ معلوم ہوا کہ بعض بعض آیات ایسی ہیں کہ جن کے پیش آجانے کے بعد ایمان لانا قبول نہیں ہوگا، اور یہ دروازہ بند ہوجائے گا، اسی طرح سے كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا: كَسَبَتْ کا عطف جب اٰمَنَتْ کے اوپر کریں گے تو عبارت یوں بنے گی لَمْ تَكُنْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا، جس نفس نے اپنے ایمان میں کسبِ خیر نہیں کیا تھا، نیک کام نہیں کیے تھے، یعنی ایمان تو لے آیا لیکن کسبِ خیر نہیں کیا، اب اس کے لئے بھی ایمان نافع نہیں رہے گا، لیکن اس نافع سے خاص قسم کا نفع مراد ہے، ایمان کا نفع یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص فسق وفجور سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، بُرے کام سے توبہ کرلے تو یہ ایمان کی برکت سے توبہ قبول ہوجاتی ہے، کافر کی توبہ قبول نہیں ہے، تو اگر کوئی شخص ایمان لایا تھا لیکن فسق وفجور میں مبتلا رہا اور اس نے کسبِ خیر نہیں کیا، اب بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ کے پیش آجانے کے بعد اگر وہ توبہ کرنا چاہے گا، تو ایمان کا نفع یہاں ختم ہوگیا، اب ایمان اس کے لیے نافع نہیں، کہ جس طرح سے عام حالات میں ایمان کا نفع یہ تھا کہ توبہ قبول ہوجاتی تھی اب توبہ قبول نہیں ہوگی، تو جس کا مصداق یہ نکلا کہ نہ کافر ایمان لائے تو ایمان قبول، اور نہ فاسق فاجر توبہ کرے تو توبہ قبول۔

"بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ" کا مصداق

اب سوال یہ ہے کہ اس "بعض آیاتِ ربّ" سے کیا مراد ہے؟ جس کے ظاہر ہوجانے کے بعد ایمان لانا بھی معتبر نہیں، اور اسی طرح سے توبہ کرنا بھی معتبر نہیں، قرآنِ کریم میں اس کا مصداق واضح نہیں کیا گیا، اس کو مبہم رکھا گیا ہے، لیکن روایاتِ صحیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا مطلب متعین ہے کہ اس سے مراد ہے مغرب کی طرف سے سورج کا طلوع کرآنا، کیونکہ بہت ساری روایات میں سرورِ کائنات ﷺ نے اس مضمون کو بیان فرمایا کہ جب مغرب کی طرف سے سورج طلوع کرآئے گا، اُس وقت توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا،[1] توبہ کے دروازے کے بند ہونے کی نسبت احادیث میں دو چیزوں کی طرف کی گئی ہے، اور ان دونوں کو ہی اس بعض آیاتِ ربّ کا مصداق بنایا گیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بندے کی توبہ قبول ہوتی ہے مَا لَمْ يُغَرْغِرْ[2] جس وقت تک کہ اس کے اُوپر غرغرہ کی کیفیت نہ طاری ہوجائے، غرغرہ کی کیفیت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا سانس اکھڑ گیا، اور زندگی کی طرف سے اُس کو بالکل مایوسی ہوگئی، اور عالمِ آخرت منکشف ہوگیا، موت کا فرشتہ نظر آگیا، دوسرے فرشتے جو موت کے فرشتے کے ساتھ معاون ہونے کے طور پر آیا کرتے ہیں وہ منکشف ہوگئے، ایسی صورت میں اگر وہ توبہ کرے گا تو اُس کی توبہ قبول نہیں، چاہے وہ کفر سے توبہ کرکے ایمان لائے، اور چاہے وہ کسی گناہ سے توبہ کرے اور اُس کا ازالہ کرنا چاہے، تو اب وقت گزر گیا،

---

(۱) دیکھئے مسلم ۲/ ۳۵۸ باب قبول التوبة - ۲/ ۳۴۶ باب استحباب الاستغفار/ ابوداؤد ۱/ ۳۶ باب فی الهجرة هل انقطعت/ مشکوٰة ۱/ ۲۰۳، ۲۰۵، باب الاستغفار۔

(۲) سنن الترمذی ۲/ ۱۹۳ باب فی فضل التوبة/ مشکوٰة ۱/ ۲۰۳ باب الاستغفار فصل ثانی عن ابن عمر۔

مَالَمْ یُغَرْغِرْ: جس وقت تک کہ غرغرہ کی کیفیت طاری نہ ہو تو اس موت کے طاری ہونے کے ساتھ بھی توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اُس کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اور دوسرے یہی طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنَ الْمَغْرِبِ مغرب کی طرف سے سورج کا طلوع ہونا اس کو بھی علامت قرار دیا گیا ہے کہ اب توبہ کا دروازہ بند ہو گیا، اس کے بعد اگر کوئی کافر ایمان لانا چاہے تو ایمان معتبر نہیں، کوئی فاسق فاجر توبہ کرنا چاہے تو توبہ کا اعتبار نہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں آپس میں کوئی مختلف نہیں ہیں، ایک ہی چیز ہے، ایک ہے موت انفرادی، شخص واحد کی، اور ایک ہے موت عالم کی، تو جس طرح سے انفرادی موت کے آثار جب نمایاں ہو جاتے ہیں تو انفرادی طور پر توبہ کا دروازہ بند ہو گیا، خاص طور پر اس شخص کے لئے جس کے اوپر یہ آثار طاری ہوئے ہیں، اور جس وقت عالمی سطح کے اُوپر موت کے آثار طاری ہو جائیں گے، کیونکہ مغرب کی طرف سورج طلوع کر جانے کے بعد پھر قیامت بہت جلد آ جائے گی، وہ یوں ہوگا جیسے عالمی طور پر نزع شروع ہو جائے اور علاماتِ موت بہت نمایاں ہو جائیں، تو جس وقت عالمی سطح کے اُوپر یہ موت کے آثار نمایاں ہو جائیں گی تو عالمی سطح پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، تو حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ سے یہ موت کے فرشتے مراد لئے جائیں تو یہ شخصی اور انفرادی علامت ہے، کہ اس وقت شخصی اور انفرادی طور پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، جس کو دوسری جگہ قرآنِ کریم میں وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے لَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (سورۂ نساء: ۱۸) ان لوگوں کے لئے کوئی توبہ نہیں ہے، یعنی اُن کی توبہ قبول نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں، کرتے رہتے ہیں، اور جس وقت اُن میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ: میں توبہ کرتا ہوں۔ تو قرآنِ کریم میں یہ صراحت سے ذکر آ گیا، اور طلوع الشمس من المغرب کا ذکر روایات میں صراحتاً آ گیا، تو بعض آیاتِ رَبّ کا مصداق یہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ ایمان نہیں لایا تھا تو ایمان لانا معتبر نہیں، اور اگر ایمان تو لے آیا تھا لیکن اس نے ایمان میں کسبِ خیر نہیں کیا، بلکہ محرمات کا مرتکب رہا، فرائض کا تارک رہا، تو عام حالات میں جس وقت یہ علامات نمایاں نہ ہوں تو اگر محرمات سے توبہ کی جائے معاصی سے توبہ کی جائے تو ایمان کی برکت سے توبہ قبول ہو جاتی ہے، یہ بھی ایمان کا ایک نفع ہے، اور جب یہ علامت طاری ہو جائے گی تو پھر اگر وہ توبہ کرے گا تو پھر یہ ایمان نفع نہیں دے گا، یعنی خاص طور پر اس معاملے میں اُس کی توبہ قبول نہیں ہے۔ کَسَبَتْ فِیْۤ اِیْمَانِهَا خَیْرًا: یا اُس نے اپنے ایمان کے اندر کسبِ خیر نہ کیا ہو، تو ایسے شخص کو بھی ایمان نفع نہیں دے گا، لیکن یہاں خاص نفع مراد ہے قبولیتِ توبہ والا۔ قُلِ انْتَظِرُوْۤا: اگر وہ اسی بات پر اَڑے ہوئے ہیں کہ جب تک یہ چیزیں سامنے نہیں آئیں گی ہم اس وقت تک نہیں مانتے تو آپ کہہ دیجئے اچھا! تم بھی انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں، جب یہ وقت آ جائے گا پھر دیکھ لیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔

''فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ'' کا مفہوم اور مصداق

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ: وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا، کسی نے کوئی نظریہ اختیار کر لیا، کسی نے کوئی عقیدہ اختیار کر لیا، یہاں جس تفریق کا ذکر ہے اِس تفریق سے اُصولی تفریق مراد ہے، جس میں کُفر اور ایمان کا اختلاف ہو، جس طرح سے مختلف گروہ ہو گئے، کسی نے کوئی عقیدہ بنا لیا، کسی نے کسی قسم کا عقیدہ اختیار کر لیا، اس قسم کی جو گروہ بندی ہے یہ مذموم ہے جو قطعیات کے اندر ہو، جس میں کُفر اور ایمان کا اختلاف آ جائے، تو سرورِ کائنات ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ان سے آپ کا کوئی تعلق

نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اصل مصداق تو یہی ہے، تو یہاں تفریقِ دین سے مراد قطعیات کے اندر اختلاف کر کے مختلف دین بنالینا، جس کے اندر کفر اور ایمان کا اختلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو تفریق سُنّت کے خلاف راستہ اختیار کرنے کے ساتھ ہوتی ہے، جیسے بدعتیں ایجاد کرلیں، مختلف قسم کے طریقے ایجاد کرلیے، کسی درجے میں وہ بھی اس کا مصداق بن سکتے ہیں بعد کے حالات کے اعتبار سے، سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں تو وہی فرقے مراد تھے جنہوں نے آپ کی اتباع نہیں کی، بلکہ کافر تھے، ایمان ہی نہیں لائے، اور بعد میں آنے والے حالات میں جو سُنّت کے طریقے کو چھوڑ کر بدعتیں ایجاد کر کر کے مختلف گروہ بنالیتے ہیں وہ بھی اس کا مصداق بن سکتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث کے اندر تفصیل ذکر کی گئی کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ پہلی امتیں جو تھیں بنی اسرائیل، ان کے تو بہتر فرقے بنے تھے، اور میری اُمّت کے تہتر فرقے بنیں گے، جن میں سے بہتر فرقے جہنمی ہیں اور ایک فرقہ جنّتی ہے، پوچھا گیا: یارسول اللہ! وہ کون سا فرقہ ہے جو جنّتی ہے، جو نجات پانے والا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مَاۤ اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ[1] کہ جس طریقے پر میں ہوں اور جس طریقے پر میرے صحابہ ہیں، جو لوگ اس طریقے پر چلنے والے ہوں گے یہ ہے ناجی فرقہ، اور باقی بہتر کے بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے، اب ان بہتر میں سے کوئی کافر ہو تو بھی وہ جہنم میں گیا، اور اگر کافر نہ ہوں بدعتی ہوں تو پھر اُن کا جہنم میں جانا عارضی طور پر ہوگا۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ہوتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے طریقے پر ہوگا اور صحابہ کے طریقے پر ہوگا، جس کو ہم اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں، یہ ہے نجات پانے والا، تو کیا اہلِ سنت والجماعت یہ لوگ آخرت میں عذاب نہیں پائیں گے؟ یہ جہنم میں نہیں جائیں گے؟ حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر اہلِ سُنّت والجماعت میں سے جس نے نظریہ یہی اپنایا ہے کہ حضور ﷺ کی اتباع، صحابہ کی اتباع، عقائد وہی اختیار کیے ہیں لیکن پھر اگر عملی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس عملی معصیت کے ارتکاب کرنے کی وجہ سے یہ بھی جہنم میں جاسکتے ہیں، اور دوسرے بہتر فرقے جو آپ کی اُمّت ہیں، (تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ: میری اُمّت مختلف ہوجائے گی تہتر فرقوں پر) تو یہ آپ ﷺ کی اُمّت کے فرقے ہیں، تو کیا یہ بہتر کے بہتر کافر ہیں؟ اور اگر وہ کافر نہیں تو پھر وہ جہنم میں جائیں گے تو عقیدہ یہ ہے کہ آخرکار نجات بھی پاجائیں گے، جیسے کہ تفصیل آپ کے سامنے آچکی، تو یہ جو بہتر ہیں ان کے متعلق نجات کا عقیدہ بھی ہے، اور اہلِ سُنّت والجماعت کے جہنم میں جانے کا عقیدہ بھی ہے، کہ اگر یہ کوئی بُرا عمل اختیار کریں گے تو یہ بھی جہنم میں جاسکتے ہیں، ایسا نہیں کہ جو اہلِ سُنّت والجماعۃ میں آگیا بس وہ جنّتی ہی جنّتی ہے، اور اُس کی عملی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، تو دونوں صورتوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی بہتر فرقے اگر کافر نہیں ہیں تو آخرکار نجات وہ بھی پاجائیں گے تو دونوں میں وجہ فرق کیا ہوئی؟ اس اِشکال کو اُٹھانے کے لئے علمائے اُمّت نے یہی کہا ہے کہ ایک ہے جہنم میں جانا نظریات میں غلطی کی بناپر، اور ایک ہے جہنم میں جانا عمل میں کوتاہی کی بناپر، نظریاتی غلطی کے طور پر جہنم میں جانا یہ زیادہ سخت ہے، اس لئے اگر وہ نظریہ کُفر تک نہ بھی پہنچا ہوا تو بھی عمل کے مقابلے میں نظریہ چونکہ ایک ٹھوس بنیاد ہوتی ہے، اس لئے سزا بمقابلہ دوسروں کے اس میں زیادہ ہوگی اور مدت دراز تک رہنا

(۱) ترمذی ۲ / ۹۳ باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ/ مشکوۃ ۱ / ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی، عن عبد اللہ بن عمرو۔

پڑے گا۔ تو باقی بہتر فرقے تو جہنّم میں جائیں گے نظریاتی گمراہی کی بنا پر، چاہے پھران کے نظریات کُفر تک نہ پہنچنے کی صورت میں بعد میں چھوٹ ہی جائیں، لیکن سزا سخت ہوگی اور زیادہ طویل ہوگی، اوراہلِ سُنّت والجماعۃ نظریاتی گمراہی کے طور پر جہنّم میں نہیں جائیں گے، یہ جہنّم میں جائیں گے تو عملی کوتاہی کے طور پر جائیں گے، جس سے جلد جان چھوٹ جانے کی توقع ہے، کہ سزا ہلکی ہوگی اوراسی طرح سے جلد ختم ہوجائے گی۔ تو وہ بھی مراد لئے جاسکتے ہیں، اس لئے بدعت کے طور پر جو بھی راستہ اختیار کرلیا جائے، سُنّت کو چھوڑ کر سرورِ کائنات ﷺ کے طریقے کو چھوڑ کر جو بھی راستہ اختیار کرلیا جائے وہ سارے کا سارے اس کا مصداق بن سکتے ہیں۔

''صراطِ مستقیم'' کیا ہے اور اس سے بھٹکنے کی صورت کیا ہے؟

اس لئے دِینِ واحد جس کو دِینِ قیم کے ساتھ تعبیر کیا جارہا ہے، ملّتِ ابراہیمی کے ساتھ تعبیر کیا جارہا ہے، یہ دِین وہی ہے کہ قرآن وحدیث سے جو صراحتاً ثابت ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے کہنے کے مطابق چونکہ خلفائے راشدین کی سُنّت کو بھی دِین کی تشریح کا درجہ حاصل ہے ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ''(۱) اس لئے قرآنِ کریم سے جو ثابت ہے اس کو مانو، سرورِ کائنات ﷺ کی سُنّت کے اندر جو چیز وضاحت سے آگئی اُس کو مانو اور اُس کے مطابق عمل کرو، اور خلفاء راشدین کے طریقے کے اندر جو چیز آگئی، سلف صالحین کا جس بات کے اُوپر اجماع ہوگیا، جو چیز قیاسِ صحیح سے ثابت ہو، یہ سارے کا سارا دِینِ قیم ہے، اس طریقے کو اختیار کیا جائے تو یہ ہے صراطِ مستقیم، جس میں نجات ہی نجات ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز تجویز کرلی جائے، چاہے کتنے ہی نیک جذبات کے تحت کیوں نہ ہو، کتنے ہی اچھے جذبات کے تحت کیوں نہ ہو، لیکن اگر اُس کا اصل قرآن وحدیث میں موجود نہیں، سلف صالحین کے اندر اس کا عمل موجود نہیں ہے، خلفائے راشدین کی زندگی میں اس کا کوئی نمونہ نہیں ملتا، تو ایسی صورت میں وہ گمراہی ہوگی تو اس طریقے کا اختیار کرنا ''صراطِ مستقیم'' سے بھٹکنے کی صورت ہے۔

بطورِ نمونہ ستائیسویں رجب میں مروّجہ چند بدعات کا ذِکر

جیسا کہ یہی رات جو ابھی گزری ہے ستائیسویں رجب کی رات، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ یہ لیلۃ المعراج ہے، ''عام طور پر مشہور'' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ روایاتِ صحیحہ میں اس کا کوئی ذِکر نہیں، چونکہ وہ دور ایسا تھا کہ جس میں تاریخ ضبط کرنے کی عادت ہی نہیں تھی، یہ جدید دور کی خصوصیات میں سے ہے کہ جو واقعہ آتا ہے اس کو تاریخ وار لکھ لیا جاتا ہے، بچہ پیدا ہوا تو اُس کی ولادت کی تاریخ لکھ لی، کوئی مرا تو اُس کی تاریخ وفات لکھ لی، اور کوئی واقعہ پیش آیا تو اُس کو تاریخ وار ضبط کرلیا، یہ اِس وقت ایسا ہی ہے، لیکن پرانے زمانے میں تاریخوں کے ضبط کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا، اس لئے مشہور سے مشہور واقعات کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے، کہ کس مہینے میں پیش آیا تھا؟ کس تاریخ کو پیش آیا تھا؟ تو سرورِ کائنات ﷺ کی معراج کس تاریخ میں ہوئی تھی، اس کا ذکر روایاتِ صحیحہ میں نہیں ہے، ہاں! مختلف روایات ہیں جن میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ رجب کے مہینے میں تھی، تو رجب کے مہینے میں تھی یا ستائیسویں رجب کو تھی ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں ہے، کہ ہم اس کا انکار کریں کہ اس رات میں نہیں ہوئی، اور دوسری

(۱) ترمذی ۲/۹۶، باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ/ ابوداؤد ۲/۲۷۶، باب فی لزوم السنۃ/ مشکوٰۃ ص ۳۰، باب الاعتصام، فصل ثانی، عن العرباض بن ساریہ۔

کوئی رات متعین ہے، ایسی بات نہیں، ہوسکتا ہے اسی رات میں ہی ہو، اور آثار کے اعتبار سے اگر اس کو ترجیح دے دی جائے تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اب اس رات کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ حضور ﷺ کو معراج مکہ معظمہ میں ہوا تھا، اس بات پر اتفاق ہے کہ مکہ معظمہ میں معراج ہوا تھا، جس میں پھر نماز فرض ہوئی، اور مکہ معظمہ میں معراج کے بعد حضور ﷺ مکہ میں بھی رہے سال رہے، دو سال رہے، یا تین سال رہے، اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو دس سال حضور ﷺ مدینہ منورہ میں رہے، تو دس دفعہ رجب حضور ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں آیا، اور آپ کے زندگی کے بعد دو اڑھائی سال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رہے، تو اور نہیں تو دو دفعہ رجب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت میں آیا، دس دفعہ رجب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت میں آیا، بارہ دفعہ رجب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت میں آیا، اور اسی طرح سے پانچ یا چھ دفعہ رجب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت میں آیا، بعد والے دور کو چھوڑیے کم از کم ان تیس سالوں کے اندر تو تیس دفعہ رجب آیا ہے حضور ﷺ کی وفات کے بعد، اور دس دفعہ رجب آیا حضور ﷺ کی مدنی زندگی میں، تو چالیس سالہ دور کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے کہ کسی ایک سال کے اندر بھی اِس رات کا کوئی اہتمام کیا گیا ہو، یا اس رات کی کوئی فضیلت بیان کی گئی ہو کہ اس رات میں فلاں عمل کے اختیار کرنے کی یہ فضیلت ہے، فلاں عمل کرو گے تو یہ فضیلت ہے، اس لئے سنّت کے مطابق طریقہ یہی ہوا کہ جس وقت کی فضیلت روایاتِ صحیحہ کے اندر بیان نہیں کی گئی، ہم اپنے طور پر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی یہ فضیلت ہے، اور اس میں اس عمل کی یہ فضیلت ہے، اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو معلوم کرنا انسان کی عقل کے ساتھ نہیں ہوتا، یہ سرورِ کائنات ﷺ کے بیان کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔

اب رات[1] میں بیٹھا ہوا سُن رہا تھا، تقریر کی آواز آ رہی تھی، کہ یہ رات چونکہ لیلۃ المعراج ہے، اس رات میں صلوٰۃ التسبیح پڑھی جائے گی، جو لوگ اس رات میں عبادت کریں گے نفل پڑھیں گے، خاص طور پر دو رکعتیں جس میں پہلی رکعت کے اندر اَلَمْ تَرَ كَيْفَ، دوسری کے اندر لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ پڑھیں گے تو ان کو نبیوں کے درجے والا ثواب ملے گا، رات تقریر کے اندر یہ آواز آ رہی تھی، اب یہ ہے جس کو موضوع روایات کے اندر شمار کیا جاتا ہے کہ کسی خاص عمل پر کسی خاص ثواب کا وعدہ کر لیا، یہ کذب علی النبی ہے، اِفترا علی اللہ ہے، اور اس طرح سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جب سرورِ کائنات ﷺ نے اِس رات کی کوئی اہمیت بیان نہیں کی، اور اس رات کے متعلق کوئی اعمال ذکر نہیں کیے، کہ اس رات کے اندر یہ عمل کیا کرو تو یہ ثواب ہے، خلفائے راشدین کے دور میں اس کا کوئی نمونہ نہیں ملتا، پچھلے تیرہ سو سال کے اندر اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، اب یہ چند سالوں کے اندر اس قسم کی چیزیں تلاش کر کر کے، کر کر کے ان کا جو اہتمام کیا جاتا ہے، پھر اپنے طور پر اعمال کے فضائل گھڑے جاتے ہیں کہ فلاں عمل کی یہ فضیلت ہے، فلاں عمل کی یہ فضیلت ہے، یہ ہے جس کے ساتھ تفرقِ دینی پیدا ہوتا ہے، اور سُنّت راستے سے ہٹ کر انسان بدعت کی طرف جاتا ہے۔

پھر صلوٰۃ التسبیح کی جماعت، یہ ایک اور ہی عجیب بدعت شروع ہوگئی، حالانکہ نفلوں کے اندر جماعت کا اہتمام تو دُرست ہی نہیں، اور اس قسم کی عبادات جن کی ترغیب آتی ہے تو ان کو جتنا چھپا کر پڑھا جائے اتنا اچھا ہے، پھر یہ نماز ایسی ہے کہ جس کے اندر بار بار متعدد بار تسبیح پڑھنی ہوتی ہے، جو جماعت کی شکل میں ضروری نہیں ہے کہ امام اور مقتدی ایک وقت میں ختم کر لیں۔ بہر حال یہ

(۱) یہ درس رجب ۱۴۰۰ھ کا ہے۔

چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا سُنّت میں یا سُنّت سے استدلال کے طور پر کسی قسم کا ثبوت نہیں ہے، اس قسم کے سارے کے سارے اعمال بدعت میں داخل ہیں، اور نذر و نیاز اور اس قسم کی خیر خیرات اس رات کے اندر افضل قرار دینا، (آپ کو معلوم ہوگا کہ رات ہمیں تو تلاش کرنے پر بھی دُودھ نہیں ملا، اور ان بدعتیوں کی رات پانچوں گھی میں ہوں گی، ان کے لئے یہ عیش ہو جاتی ہے، اور ہم جیسوں کے لئے مصیبت ہو جاتی ہے، قیمتاً بھی کوئی چیز نہیں ملتی) بہر حال یہ طریقے جتنے بھی ایجاد کیے گئے ہیں یہ سارے کے سارے بدعت ہیں، اور ان کے اندر کوئی فضیلت نہیں، اور اختیار کرنے کے ساتھ اُلٹا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ گرفت ہوگی، کہ اپنے طور پر تم نے کیسے تجویز کر لیے؟ جب میں نے نہیں بتایا کہ فلاں عمل کے اندر یہ فضیلت ہے، اور فلاں وقت کے اندر یہ فضیلت ہے۔ اب آنے والے حالات کے اعتبار سے جتنے بدعت کے طریق ہیں وہ سُنّت سے ہٹے ہوئے ہیں، اور وہ سب اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ کا مصداق بن سکتے ہیں۔ ''جنہوں نے اپنے دِین میں تفریق ڈال لی اور وہ مختلف گروہ بن گئے، آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں، اُن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اور اللہ تعالیٰ اُنہیں خبر دے گا جو یہ کام کیا کرتے تھے۔''

''فی سبیل اللہ'' خرچ اور نیکی کی برکات

تو آخرت میں جس ضابطے سے اللہ تبارک وتعالیٰ معاملہ فرمائیں گے آگے اُس کی نشاندہی ہے، کہ اگر تو کوئی شخص بھلا کام لے کر آیا، اس میں دیکھو! جَآءَ بِالْحَسَنَةِ: جو بھلا کام لے کر آیا، یہاں یوں نہیں کہا کہ ''مَنْ فَعَلَ الْحَسَنَةَ'' جس نے نیکی کی ہوگی، کیونکہ ایک آدمی نیکی کرتا ہے لیکن اُس نیکی کے کرنے کے بعد اُس کو برباد کر بیٹھتا ہے، کوئی ایسی حرکت کر لیتا ہے جس کے ساتھ اُس کا ثواب ضائع ہو گیا، جیسے قرآنِ کریم کے اندر یہ آیا تھا: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (سورۂ بقرہ: ۲۶۴) ایک آدمی صدقہ دیتا ہے اور صدقے کے بعد احسان جتلاتا ہے، جس کو صدقہ دیا اُسے تکلیف پہنچاتا ہے، تو ایسی صورت میں وہ صدقہ برباد ہو گیا، اب جب آخرت میں جائے گا تو یہ صدقہ اُس کے پاس ہوگا ہی نہیں کہ اس کے اوپر ثواب ملے، تو جَآءَ بِالْحَسَنَةِ کا مطلب یہ ہو گیا کہ دُنیا کے اندر اُس نے نیکی کی تھی، اور نیکی کرنے کے بعد پھر اُس کو محفوظ رکھا، کہ قیامت تک وہ محفوظ رہی، ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی بنا پر وہ حبط ہو جائے اور ضائع ہو جائے، ''جو نیکی لے کر آئے گا'' فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا: اُس کو اُس نیکی کی دس مثلیں ملیں گی، دس گنا ثواب ملے گا، یہ ہے کم از کم درجہ، ورنہ قرآنِ کریم کے اندر سات سو تک کی نشاندہی ہے، جیسے وہ غلے والی مثال دی تھی، دانے والی، کہ ایک دانہ بویا اور اُس میں سے سات بالیاں نکلیں، اور ایک ایک بالی کے اندر سو سو دانہ تو ایک کا سات سو بن گیا، لیکن اُس کے بعد بھی ہے وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے بڑھاتا رہتا ہے، حتیٰ کی حدیث شریف میں ایک مثال آئی ہوئی ہے کہ ایک کھجور اللہ کے راستے میں اگر کوئی خرچ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھاتے بڑھاتے اُحد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے،(1) اب اگر ایک کھجور کا موازنہ اُحد پہاڑ کے ساتھ اگر کیا جائے تو کروڑوں تک پہنچ جاتا ہے، تو جتنا جس عمل کے اندر اِخلاص ہوگا اتنا اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، کم از کم درجہ یہ ہے کہ ایک نیکی کو دس گنا کر کے لکھا جائے گا، گویا کہ وہ نیکی آپ نے دس دفعہ کر لی۔ ''اور اگر

(1) تفسیر ابن کثیر/بخاری ۱/۱۸۹ باب الصدقة من کسب/مسلم ۱/۳۲۶ باب قبول الصدقة/مشکوٰۃ ۱/۱۶۷۔ نوٹ: آخری تین میں جبل کا لفظ ہے نہ کہ اُحد کا۔

کوئی بُرا کام لے کر آئے تو نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر اُس کے برابر ہی۔" اور اسی طرح سے اللہ نے اپنی رحمت کے طور پر ایک اور فرق بھی رکھا، حدیث شریف میں آتا ہے، کہ اگر کوئی شخص نیکی کا ارادہ کرلے، پختہ ارادہ، لیکن پھر اسباب مہیا نہیں ہوئے جس کی بنا پر اس نیکی کو کر نہیں سکا، تو بھی اس عزم کو، اِس ھَمّ کو، ھَمّ بالحسنۃ کو بھی نیکی کے اندر شمار کرلیا جاتا ہے، اس پر بھی ثواب ہوگا، اور اگر بُرائی کا ارادہ کیا تھا، لیکن پھر بعد میں چھوڑ دی تو اُس کے اُوپر کوئی کسی قسم کا وبال اور عذاب نہیں ہے۔[1] وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ: اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا، حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

''ملّتِ اِبراہیمی'' اور ''صراطِ مستقیم'' کی نشاندہی

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ: آپ کہہ دیجئے کہ تم نے تو اپنے اپنے راستے بنالیے، لیکن میرا تو راستہ یہی ہے جو اللہ نے مجھے سمجھا دیا، مجھے راہنمائی کی میرے رَبّ نے صراطِ مستقیم کی طرف، ایسا صراطِ مستقیم جو کہ دِینِ قَیم ہے، بے شک میرے رَبّ نے مجھے ہدایت دی صراطِ مستقیم کی، یہ صراطِ مستقیم یہی دِینِ قیم ہے، مضبوط دِین، جس کے اندر کوئی کسی قسم کی شکست و ریخت کا احتمال نہیں، اور یہی دِینِ قیم ملّتِ ابراہیمی ہے، یہود اپنے طریق کو ملّتِ ابراہیمی قرار دیتے ہیں، نصرانی اپنے طریق کو ملّتِ ابراہیمی قرار دیتے ہیں، اور مشرکین اپنے طریقے کو ملّتِ ابراہیمی قرار دیتے ہیں، لیکن ان میں سے ملّتِ ابراہیمی کوئی نہیں، اور ملّتِ ابراہیمی یہی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سیدھا راستہ سمجھا دیا، وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ: اور وہ ابراہیم علیہ السلام مشرکین میں سے نہیں تھے، یہ اُن کی ملّت کی ایک خصوصیت ہے۔ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي: اب یہ گویا کہ اُس ملّتِ ابراہیمی کی ایک تعبیر ہے، ملّتِ ابراہیمی کے اندر اللہ کے لئے اخلاص ہی اخلاص ہے، کہ جو کام کرنا ہے اللہ ہی کے لئے کرنا ہے، ''آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی'' نماز کے اندر بدنی عبادت آگئی اور قربانی کے اندر مالی عبادت آگئی، یہ اختیاری عمل ہیں، وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي: یہ غیر اختیاری ہیں، تو میرے اختیاری اعمال خواہ وہ بدنی عبادت سے تعلق رکھتے ہوں خواہ مالی عبادت سے، اور غیر اختیاری حالات جو میرے اُوپر طاری ہوتے ہیں، موت ہو حیات ہو، ''سب اللہ ہی کے لئے ہے جو رَبّ العالمین ہے'' اس کے اندر کوئی دوسرا شریک نہیں، موت وحیات بھی اسی کے اختیار میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حیات ملی، اللہ کی طرف سے ہی موت آئے گی، زندگی موت سب اُس کے لئے، اور جو ہمارے اختیاری اعمال ہیں چاہے وہ بدنی عبادت سے تعلق رکھتے ہوں چاہے مالی عبادت سے تعلق رکھتے ہوں، وہ بھی اللہ کے لئے ہیں جو رَبّ العالمین ہے، لَا شَرِيكَ لَهُ: اس کا کوئی شریک نہیں، وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ: اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ: میں اول نمبر کا مسلمان ہوں، پھر تو یہ فضیلت کے اعتبار سے ہوگیا، کہ سب سے بڑھیا مسلمان میں ہوں، یا اوّل مسلمان ہوں ترتیب کے لحاظ سے، کہ اس اُمت میں سے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والا میں ہوں۔ یہاں یہ بات آگئی، اور دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے گئے تھے إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (سورۂ انعام: ۷۹)، تو حدیث شریف کے اندر ان دونوں آیتوں کو جوڑ کر نماز کی اِبتدا کے اندر سرورِ کائنات ﷺ پڑھا کرتے تھے،

---

(۱) بخاری ۲/ ۱۱۱۷ باب قول اللہ تعالیٰ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ ۔ مسلم ۱/ ۷۸ باب اذا هم العبد۔ نوٹ: مسلم میں ھَمّ کا لفظ ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ،[1] حضور ﷺ ''اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ'' پڑھیں گے اور ہم جس وقت پڑھیں گے تو ہمیں ''اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' پڑھنا چاہیے، کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں، کیونکہ ہم پر ''اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ'' صادق نہیں آتا، دُعا کے طور پر جب ہم پڑھیں گے تو ''مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' کہیں گے۔

عقیدۂ رُبوبیت توحید کی بُنیاد ہے

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا: آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں اللہ کو چھوڑ کر اللہ کے غیر کو رَبّ طلب کروں؟ یعنی اللہ کو رَبّ نہ بناؤں، کسی اور کو رَبّ بناؤں؟ اور رَبّ ہی بنیاد ہے توحید کی، جیسے آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق رُبوبیت کا عقیدہ ہی توحید کی بنیاد ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی سب سے پہلے یہی بات ہمارے ذہن میں ڈالی تھی، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے تحت جو عہد لیا گیا تھا، تو یہ رُبوبیت کا ہی مسئلہ ہے جس کو بنیادی طور پر ہمارے قلوب کے اندر ڈالا گیا ہے، تو جس شخص کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کے متعلق رُبوبیت کے طور پر صحیح ہو گیا، کہ اللہ رَبّ ہے، تو آگے ساری بنیاد اُس کی صحیح ہو جاتی ہے، کیونکہ رَبّ کا معنی پیدا کرنے والا، پالنے والا، ضروریات پورا کرنے والا، جب ایک ذات کے متعلق ہمارا یہ نظریہ ہو جائے گا، پھر اطاعت، عبادت، احتیاج، نیازمندی جو کچھ ہو گی سب اُسی کے ساتھ ہی تعلق رکھے گی، پھر ہم کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکیں گے۔ اور قبر میں جانے کے بعد بھی سب سے پہلے جو سوال ہو گا تو یہی ہو گا، کہ مَنْ رَّبُّكَ، تم نے رَبّ کس کو قرار دیا تھا تو مطلب یہ ہو گا کہ اول سے لے کر آخرت تک اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا عقیدہ یہ انسان کے عمل کی لائن کو سیدھا کرتا ہے۔ وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ: کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کوئی اور رَبّ طلب کر لوں؟ حالانکہ وہی رَبّ ہے ہر شَی کا، وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا: علیٰ چونکہ ضرر کے لئے ہوتا ہے، تو اس لئے یہاں کسب سے بُرا کام کرنا مراد ہے، اور تفسیر کے اندر لکھا ہے کہ یہ آیت اُن مشرکین کے جواب میں اُتری تھی جو مسلمانوں کو کہتے تھے کہ تم جو ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے کُفر اختیار کیا تو آخرت میں یہ وبال آجائے گا، ہم تمہارے ساتھ وعدہ کرتے ہیں کہ تم ہمارے کہنے کی بنا پر ہمارا طریقہ اختیار کر لو، اور جو کوئی سختی ہو گی جو عذاب ہو گا اُس کی ذمہ داری ہم پر ہے، جیسے سورۂ عنکبوت میں لفظ آئیں گے وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ (آیت: ۱۲) تمہارے گناہ ہم اُٹھالیں گے، تمہارا بوجھ ہم اُٹھالیں گے اور آخرت میں تمہارے اوپر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑنے دیں گے، اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے، کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، جو کرے گا وہی بھرے گا، تو اُن کے جواب میں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے، یہ دُنیا کا معاملہ یا دُنیا کی عدالت نہیں کہ ایک کا جرم کوئی دوسرا آدمی اپنے سر لے لے، یا ایک کا جرم کسی دوسرے کے سر پر ڈال دیا جائے، وہاں اللہ کے دربار میں تو جو کرے گا اسے ہی اپنی ذمہ داری اُٹھانی پڑے گی، اس دھوکے میں نہ آئیو کہ تمہیں کوئی کہہ دے کہ تو یہ گناہ کر لے، اس کا جو وبال ہو گا وہ میں برداشت کر لوں گا، اس دھوکے میں نہ آئیو، اللہ کی عدالت میں ایسا نہیں ہو گا، اگرچہ ترغیب دینے والا ترغیب کی بنا پر اُس جرم کی سزا میں شریک ہو جائے گا، لیکن جرم کرنے والا سزا سے بَری نہیں ہو گا، ایسے

(۱) مسلم ۱/ ۲۶۳ باب الدعاء فی صلوۃ اللیل/ مشکوۃ ۱/ ۷۷ باب ما یقرء بعد التکبیر۔

طور پر کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا کہ اصل گناہ کرنے والے کو بری قرار دے دیا جائے، ''نہیں کسب کرے گا کوئی نفس مگر اُس کا وبال اسی پر ہوگا'' وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی: کوئی بوجھ اٹھانے والا نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ: پھر تمہارے رَبّ کی طرف ہی تمہارا لوٹنا ہوگا، پھر وہ تمہیں خبر دے گا اُن کاموں کی جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

دُنیا کا نظام اِبتلا کے اُصول پر چل رہا ہے

اب یہ آخر میں جا کر تنبیہ کر دی گئی، جس میں گزشتہ تاریخ کی طرف متوجہ کر دیا گیا کہ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ: جس کا مطلب یہ ہو گیا کہ اس دنیا کی اسٹیج پر تم پہلے نمودار ہونے والے نہیں، تم سے پہلے بہت ساری اُمتیں بہت ساری جماعتیں آئیں، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک معیار پر پرکھا، تو جس ترازو اور باٹ کے ساتھ اللہ نے انہیں تولا تھا اسی ترازو اور باٹ کے ساتھ اللہ تمہیں تولے گا، جب اللہ کے معیار پر وہ پورے نہیں اُترے، تو کس طرح سے اُن کو پردۂ عدم میں بھیج دیا گیا؟ کیسے برباد کر دیا گیا؟ تم اُن کے جانشین ہو، پہلے بھی امتیں اور جماعتیں آئی تھیں، تم اُن کی جگہ ہو، تم اُن کے گدی نشین ہو جانشین ہو، اگر انہی جیسا عمل اختیار کرو گے تو جیسے وہ برباد ہو گئے ویسے تم برباد ہو جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ کے معیار پر تم صحیح اترو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دُنیا اور آخرت کے اندر شاداب کرے گا، نیک نامی ہوگی، آخرت میں اللہ تعالیٰ ثواب دے گا، دُنیا کے اندر نیک نام رہو گے اور عافیت نصیب ہوگی، تو خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ: تم زمین کے اندر خلیفے ہو، جانشین ہو، اللہ نے تمہیں خلیفے بنایا زمین میں، جانشین بنایا، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَعراف کے اندر ذکر کی جائے گی اُمتوں کے حالات تفصیل سے بیان کر کے، کہ پہلے کیسی کیسی اُمتیں آئیں، اور اُن کے پاس رسول آئے، اور انہوں نے کیسا کردار اپنایا، جس کے نتیجے میں اُنہیں برباد کر دیا گیا، وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ: اللہ تعالیٰ تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں ترقی دی، درجوں میں اونچا کیا، کسی کو رزق زیادہ دیا کسی کو کم، کسی کو بدنی قوت زیادہ دی کسی کو کم، کسی کو علمی استعداد زیادہ دی کسی کو کم، یہ تمام چیزوں میں ہے، کسی کو اللہ نے نیچا کیا کسی کو اُونچا کیا، یہ اس لیے کیا ہے لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ: یہ تمہارے عملوں کی جزا نہیں ہے، یعنی دُنیا کے اندر کسی کا بڑھیا ہونا گھٹیا ہونا یہ عملوں کی جزا اور سزا کے طور پر نہیں، یہ دُنیا دارالابتلا ہے، یہاں کا نظم جو چل رہا ہے وہ جزا اور سزا کے اُصول پر نہیں، بلکہ یہاں کا نظم جو چل رہا ہے یہ ابتلا کے اُصول پر ہے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک پرلے درجے کا بدمعاش اور پرلے درجے کا بدکردار دُنیا کے اندر خوشحال ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوش حال کر کے اس کی آزمائش کر رہا ہے، اور ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک بہت نیکوکار آدمی، بہت محسن صفت احسان کی صفت رکھنے والا دُنیا کے اندر بدحال ہو، اللہ تعالیٰ اُس کو مصیبت میں ڈال کر صبر کا امتحان کر رہا ہے، تو یہ جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانا چاہتا ہے، کہ جو حالت تمہارے اُوپر طاری کی گئی ہے تم اس کا حق ادا کرتے ہو یا نہیں اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ: بیشک آپ کا رَبّ جلد سزا دینے والا ہے، وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اور بے شک وہ غفور رحیم ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

سُورَةُ الأَعْرَافِ

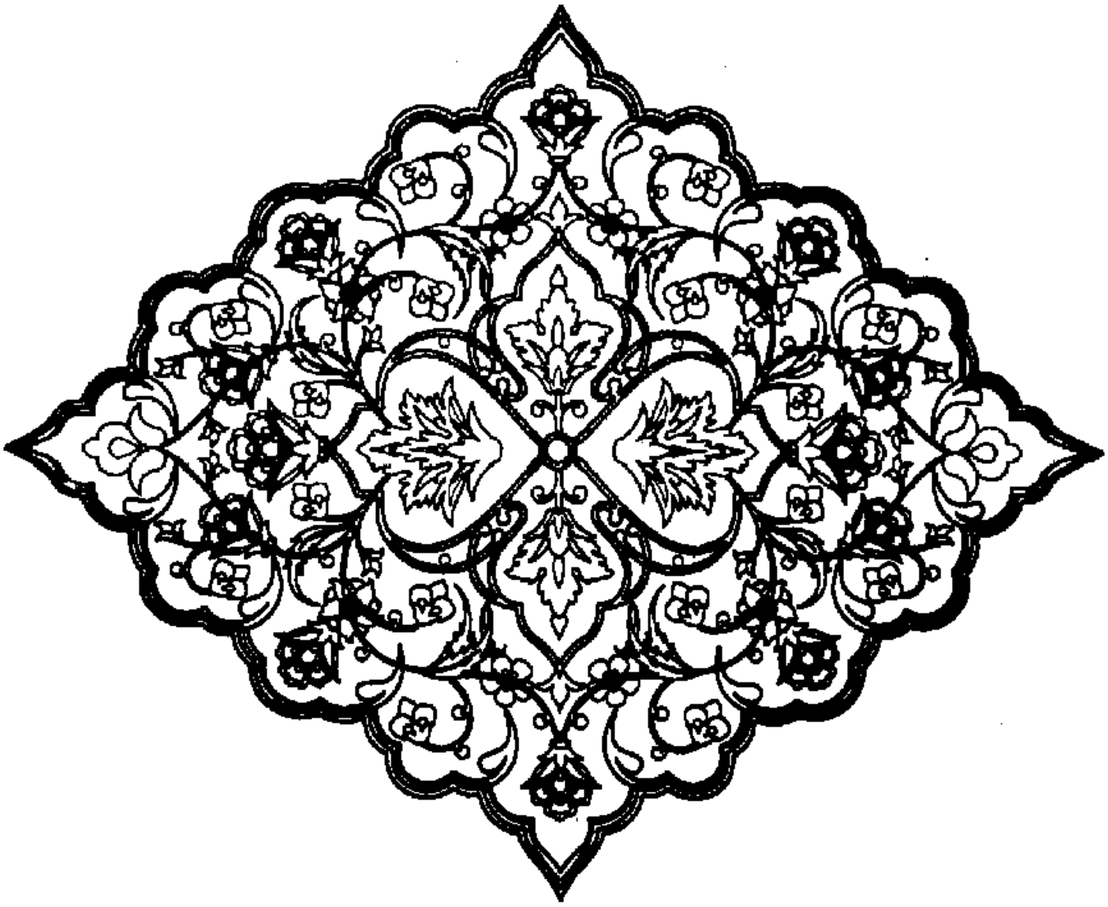

رکوعاتھا ۲۴ ۷ سُوۡرَۃُ الۡاَعۡرَافِ مَکِّیَّۃٌ ۳۹ اٰیاتھا ۲۰۶

سورۂ اعراف مکی ہے اس کی ۲۰۶ آیات اور ۲۴ رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ

الٓمّٓصٓ ① یہ کتاب ہے جو اُتاری گئی آپ کی طرف، پس نہ ہو آپ کے سینے میں تنگی

مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ

اس کتاب کی طرف سے، تاکہ آپ ڈرائیں اس کے ذریعے سے، اور یہ نصیحت ہے مؤمنین کے لئے ② پیروی کرو اس چیز کی جو اُتاری گئی

اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا

تمہاری طرف تمہارے رَبّ کی جانب سے، نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر اولیاء کی، تم لوگ بہت کم نصیحت

تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ کَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ

حاصل کرتے ہو ③ اور کتنی ہی بستیاں ہیں ہم نے اُن کو ہلاک کردیا، پس آ گیا اُن کے پاس ہمارا عذاب اس حال میں کہ وہ لوگ رات گزارنے

ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ

والے تھے، یا وہ دوپہر کو آرام کرنے والے تھے ④ پس نہیں تھی اُن کی پُکار جب اُن کے پاس ہمارا عذاب آیا مگر

قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ

یہی کہ کہا انہوں نے بے شک ہم ہی قصوروار تھے ⑤ پس البتہ ضرور پوچھیں گے ہم اُن لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے

وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیۡہِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا کُنَّا

اور البتہ ضرور سوال کریں گے ہم اُن لوگوں سے جو بھیجے گئے ⑥ پھر البتہ ضرور بیان کریں گے ہم اُن لوگوں پر اپنے علم کے ساتھ اور ہم

غَآئِبِیۡنَ ﴿۷﴾ وَ الۡوَزۡنُ یَوۡمَئِذِ ۣالۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ

چھپنے والے نہیں تھے ⑦ اور وزن اُس دن حق ہے، پس وہ شخص کہ بھاری ہوگئے اُس کے ترازو

فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ
پس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ۸ اور وہ لوگ کہ ہلکے ہوگئے ان کے ترازو پس یہی لوگ ہیں
الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ ۹ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ
جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈالا بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات پر ظلم کیا کرتے تھے ۹ البتہ تحقیق ہم نے تمہیں ٹھکانا دیا
فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۱۰
زمین میں، اور ہم نے تمہارے لیے اس زمین میں تمہاری زندگی کے لیے اسباب بنائے، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو ۱۰

سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کا مفہوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ[1] سورۂ اَعراف مکی ہے اور اس کی دو سو چھ آیتیں ہیں چوبیس رکوع ہیں، سورۂ اَعراف یہ اس سورت کا نام ہے، ''اَعراف'' کا معنی ترجمے کے دوران میں آجائے گا جہاں سورت کے اندر یہ لفظ آئے گا، مکیہ کا مطلب یہ ہے کہ سرورِکائنات ﷺ کی زندگی کے دو حصے ہیں، ایک حصہ آپ کی مکی زندگی کہلاتا ہے اور ایک حصہ آپ کی مدنی زندگی کہلاتا ہے، جس وقت آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا تھا اس وقت آپ مکہ معظمہ میں تھے، اور وحی کا نزول شروع ہونے کے بعد ۱۳ سال تک آپ مکہ معظمہ میں رہے ہیں اور اس کے بعد آپ نے ہجرت فرمائی، اور ہجرت فرمانے کے بعد مدنی زندگی کا آغاز ہوا مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد سرورِکائنات ﷺ دس سال بقیدِ حیات رہے، اس عالمِ ظاہر میں دس سال تک زندہ رہے، تو یہ ۲۳ سال کا عرصہ ہے جس میں کہ قرآنِ کریم اترا، تو پہلے ۱۳ سال ہجرت سے قبل یہ آپ کی زندگی مکی کہلاتی ہے اور ہجرت کے بعد کے ۱۰ سال یہ آپ کی زندگی مدنی کہلاتی ہے، قرآنِ کریم ۲۳ سال میں اُترا، بہت سا حصہ اس کا مکہ معظمہ میں اترا ہے اور کثیر حصہ اس کا مدینہ منورہ میں اترا ہے یعنی حضور ﷺ کے مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کے بعد، تو جو قرآنِ کریم کی آیات یا سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں خواہ وہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہوں یا مکہ معظمہ سے باہر کسی سفر میں، لیکن ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں ان کو مفسرین کی اصطلاح میں ''مکی سورتیں'' کہا جاتا ہے، تو مکی سورت کا یہ معنی نہیں کہ یہ مکہ میں اتری، بلکہ مکی سورت کا مطلب یہ ہے کہ سرورِکائنات ﷺ کی مکی زندگی میں اتری، چاہے مکہ شہر میں اُتری ہو چاہے مکہ شہر سے باہر کسی سفر میں لیکن ہجرت سے پہلے، تو سورۃ الاعراف مکیہ کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سورت سرورِکائنات ﷺ کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمانے سے قبل اتری ہے، یعنی آپ کی مکی زندگی میں یہ اتری ہے، اور جن سورتوں کے شروع میں ''مدنیہ'' لکھا ہوا ہوگا یہ وہ سورتیں ہوں گی جو سرورِکائنات ﷺ کے ہجرت فرمانے کے بعد آپ کی مدنی زندگی میں اتریں، تو سورۂ مدنیہ کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ وہ سورت ہے جو کہ ہجرت کے بعد اتری

(۱) شوال ۱۴۰۰ھ کو درسِ قرآن یہاں سے شروع ہوا۔

ہے، پھر چاہے مدینہ منورہ شہر میں اتری ہو، اور چاہے سرورِ کائنات ﷺ کے کسی سفر کے دوران میں اتری ہو، حتیٰ کہ اگر آپ حجۃ الوداع کے لئے تشریف لائے یا فتح مکہ کے لئے تشریف لائے مکہ معظمہ میں، مکہ معظمہ شہر میں بھی جو آیات اتری ہوں گی وہ بھی ''مدنی'' کہلائیں گی، کیونکہ ''مدنی'' کا یہ معنی نہیں کہ مدینہ شہر میں اتریں، بلکہ ''مدنی'' کا معنی یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی مدینہ والی زندگی میں اتریں، اس دور میں اتریں جبکہ آپ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے، تو ''مدنیہ'' اور ''مکیہ'' یہ دو قسم کے لفظ آپ کے سامنے سورتوں کے آغاز میں آئیں گے، ان کا مطلب اس طرح سمجھ لیجئے، ایک دفعہ جو بات سمجھا دی جائے تو پھر اس کے بار بار کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے، الٓمّٓصٓ: یہ الفاظ بعض سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں، اور ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا جاتا ہے، حرف علیحدہ علیحدہ کر کے، الف، لام، میم، صاد، توڑ توڑ کے پڑھے جاتے ہیں، علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھے جاتے ہیں، اکٹھا لفظ نہیں پڑھا جاتا، اس لیے ان حروف کو مفسرین کی اصطلاح میں ''حروفِ مقطعات'' کہتے ہیں، حروفِ مقطعات: جن کو قطع قطع کر کے علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا جاتا ہے، جیسے کہ سورۂ بقرۃ کی ابتدا میں بھی یہ لفظ آیا تھا تو اس کو بھی ہم نے یوں ہی پڑھا تھا، الف، لام، میم، تینوں حرفوں کا تلفظ علیحدہ علیحدہ کیا گیا، ان کو ''حروفِ مقطعات'' کہتے ہیں اور یہ مفسرین کے نزدیک ''متشابہات'' میں داخل ہیں، ''متشابہات'' قرآنِ کریم کی وہ آیات ہیں جن کا معنی سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے ہمارے سامنے واضح نہیں کیا گیا، یہ حروف بھی ایسے ہی ہیں کہ ان کا مفہوم حضور ﷺ نے بیان نہیں فرمایا، کسی صحیح روایت نہیں آتا، اس لیے جب یہ الفاظ آتے ہیں تو ترجمہ کرنے والے یوں کہہ دیں گے ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ''، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ہمارے سامنے ان کا مفہوم ذکر نہیں کیا گیا، اس لیے ان کا کوئی ترجمہ نہیں کیا جائے گا، یہ اسی طرح آئیں گے الف لام میم صاد، اس پر یہی لفظ بولتے ہیں یہ حروفِ مقطعات ہیں، ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ''، ان حروف سے اللہ کی کیا مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ہم یقینی طور پر ان کا مفہوم متعین نہیں کر سکتے، باقی جن لوگوں نے کچھ تاویلات کر کے ان کا مفہوم بتانے کی کوشش کی ہے وہ اجتہادی باتیں ہیں، تاویل ہے، اس کے اُوپر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: هٰذَا كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ، کتاب یہ خبر ہے مبتدأ محذوف کی، اور بعض حضرات نے ترکیب یوں کی کہ الٓمّٓصٓ اس کو مبتدأ بنالیا، گویا کہ یہ سورت کا ایک نام ہے اور كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ یہ اس کی خبر بن گئی، اور یوں بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے کہ ''یہ الٓمّٓصٓ ہے یہ کتاب ہے جو اتاری گئی آپ کی طرف''، فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ: حرج تنگی کو کہتے ہیں، پس نہ ہو آپ کے سینے میں تنگی اس کتاب کی طرف سے، لِتُنْذِرَ بِهٖ: یہ اُنْزِلَ کے متعلق ہے، اتاری گئی تا کہ آپ ڈرائیں اس کے ساتھ، وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ: ذِكْرٰى یہ محلِ نصب میں بھی ہوسکتا ہے اور محلِ رفع میں بھی، اگر محلِ نصب میں ہو تو پھر اس کا عامل محذوف نکالنا پڑے گا لِتُنْذِرَ بِهٖ

وَلِتُذَكِّرَ بِهٖ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، ذِكْرٰى مصدر کے مقام میں آگیا، تاکہ نصیحت کرے تو اس کے ذریعے سے نصیحت کرنا مومنین کے لئے، پھر ترجمہ یوں ہوجائے گا، اور اگر اس کو مرفوع رکھیں تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ هٰذَا كِتٰبٌ، هٰذَا ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، یہ کتاب ہے جو اتاری گئی آپ کی طرف پس نہ ہو آپ کے سینے میں کوئی تنگی اس کی جانب سے، اتارنے کا مقصد یہ ہے کہ تو ڈرائے اس کے ذریعے سے، اور یہ نصیحت ہے مومنین کے لئے، ذِكْرٰى: نصیحت، لِلْمُؤْمِنِيْنَ: مومنین کے لئے۔ اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ: پیروی کرو، اتباع کرو، تبع اس کا مادہ ہے، پیروی کرو اس چیز کی جو اُتاری گئی تمہاری طرف تمہارے رَبّ کی جانب سے، وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ: اولیاء ولی کی جمع ہے، ولی دوست کو بھی کہتے ہیں، یار، مددگار کو بھی کہتے ہیں، یہاں اولیاء سے کارساز اور یار، مددگار مراد ہیں جو لوگوں نے اپنے طور پر بنا لیے تھے، ''نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر اولیاء کی'' یعنی جو تم نے اپنے طور پر کارساز بنا لیے ہیں اپنے یار مددگار بنا لیے ہیں ان کی پیروی نہ کرو، قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ: مَا یہ قَلِيْلًا کے ساتھ بطور تاکید کے ہے، تَذَكُّر: نصیحت حاصل کرنا، ''تم لوگ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو''، اور قَلِيْلًا مَّا یہ چونکہ غایتِ قلت کو ظاہر کرتا ہے یعنی بہت کم، اور اَلْقِلَّةُ فِي غَايَةِ الْقِلَّةِ لَا تُعَدُّ کہ جب کوئی چیز بہت ہی قلیل ہوجایا کرتی ہے وہ شمار میں نہیں آتی، اس لیے اس کا ترجمہ نفی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نصیحت حاصل نہیں کرتے، مفہوم اس کا یہی ہے، وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا: اور کتنی ہی بستیاں ہیں (قریہ بستی کو کہتے ہیں) کتنی ہی بستیاں ہیں ہم نے ان کو ہلاک کردیا، فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا: بیات یہ بات یبیت سے، رات گزارنا، بیات مصدر ہے اور یہاں بَآئِتِيْنَ کے معنی میں ہوکر حال واقع ہوگا اہلِ قریہ سے، اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ: قَآئِلُوْنَ یہ قول سے نہیں ہے، قَالَ يَقُوْلُ سے جیسے قائل آیا کرتا ہے اس سے نہیں، یہ قیلولہ سے ہے، قیلولہ کا معنی ہوتا ہے دوپہر کو آرام کرنا، دوپہر کو جو لیٹا کرتے ہیں آرام کے لئے اس کو ''قیلولہ'' کہتے ہیں، یہ قَآئِلُوْنَ قیلولہ سے لیا گیا ہے، اور فَجَآءَ میں جو فاء آگئی یہ تفصیل کے لئے ہے، ان کا اہلاک کیسے ہوا اس کی تفصیل یہ ہے، یہ نہیں کہ پہلے ہلاک کردیا پھر ان کے پاس ہمارا عذاب آیا، ایسے نہیں، بلکہ ہمارا عذاب آنے کے ساتھ وہ ہلاک ہوئے، تو فَجَآءَهَا بَاْسُنَا یہ تفصیل بن جائے گی اَهْلَكْنٰهَا کی، ''ہم نے ہلاک کیا اس بستی کو'' فَجَآءَهَا: پس آگیا اس بستی کے پاس بَاْسُنَا: ہمارا عذاب، بستی بول کر اہلِ بستی مراد ہیں، قریہ بول کے اہلِ قریہ مراد ہیں، ''آگیا ان کے پاس ہمارا عذاب'' بأس عذاب کو کہتے ہیں، بَيَاتًا: اس حال میں کہ وہ لوگ رات گزارنے والے تھے، بَآئِتِيْنَ کے معنی میں ہوگیا، اور اگر مصدر کو ایسے ہی رکھنا ہو تو وقتَ بَيَاتٍ، رات گزارنے کے وقت، یوں بھی اس کا مفہوم ہوسکتا ہے، ''آگیا ان کے پاس ہمارا عذاب اس حال میں کہ وہ رات گزارنے والے تھے یا وہ دوپہر کو آرام کرنے والے تھے'' فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ: دعویٰ دَعَا يَدْعُوْ، چیخنا، پکارنا، ''پس نہیں تھی ان کی پکار'' اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ: جب ان کے پاس ہمارا عذاب آیا، اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا: مگر یہی کہ کہا انہوں نے، اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ: بیشک ہم ہی قصوروار تھے، ظٰلِمِيْنَ: ظلم کرنے والے، ''ہم ہی ظلم کرنے والے تھے'' فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ: پس البتہ ضرور پوچھیں گے ہم ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے، وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ: اور البتہ ضرور سوال کریں گے ہم ان لوگوں سے جو بھیجے گئے، یعنی رسولوں

سے بھی سوال کریں گے اور جن کی طرف رسول بھیجے گئے ان سے بھی سوال کریں گے، فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْہِمْ: پھر البتہ ضرور بیان کریں گے ہم ان لوگوں پر، بِعِلْمٍ: اپنے علم کے ساتھ، کیونکہ ہمارے علم میں ہے سب کچھ، قَصَّ یَقُصُّ: بیان کرنا، ''البتہ ضرور بیان کریں گے ہم ان پر علم کے ساتھ'' وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ: اور ہم چھپنے والے نہیں تھے، غائب نہیں تھے، وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ الْحَقُّ: یَوْمَئِذٍ: جس دن یہ واقعات پیش آئیں گے اس دن وزن حق ہے، وزن کا معنی تولنا، اس دن تولنا حق ہے، تو یہ حق جو ہے یہ وزن کی میں نے خبر بنادی، اور اگر الْحَقُّ کو وزن کی صفت بنالیا جائے تو پھر ''ثابت'' خبر نکالنی پڑے گی، ''حقیقی وزن، حق پر مبنی وزن اس دن ثابت ہے''، اس دن وزن حق ہے، فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ: موازین یہ میزان کی جمع آ گئی، میزان ترازو کو کہتے ہیں، پس وہ شخص کہ بھاری ہو گئے اس کے ترازو، فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: پس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں، فلاح پانے والے ہیں، وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ: اور وہ لوگ کہ ہلکے ہو گئے ان کے ترازو، فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَہُمْ: پس یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈالا، بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ: بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات پر ظلم کیا کرتے تھے، یعنی آیات کی حق تلفی کرتے تھے، حق ادا نہ کرنا یہ بھی ظلم ہوتا ہے، ہماری آیات پر ظلم کیا کرتے تھے یعنی ان کی حق تلفی کرتے تھے، وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ: البتہ تحقیق ہم نے تمہیں ٹھکانہ دیا زمین میں، مَكَّنَ تَمْكِیْنٌ: جمادینا، ٹھہرادینا، ''ہم نے تمہیں ٹھکانہ دیا زمین میں'' وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْہَا مَعَایِشَ: مَعَایِشُ یہ مَعِیْشَۃٌ کی جمع ہے، عَاشَ یَعِیْشُ: زندگی گزارنا، اور معایش سے مراد ہو گئے زندگی گزارنے کے اسباب، ''اور ہم نے تمہارے لیے اس زمین میں زندگی گزارنے کے اسباب بنائے'' قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ: تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

تفسیر

مکی اور مدنی سورتوں میں فرق

یہ سورۂ اَعراف ہے، اور اس کے متعلق آپ کے سامنے ذکر کیا گیا کہ یہ مکی ہے، قرآنِ کریم میں آپ تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے، کہ مکی سورتوں میں اَحکام زیادہ تر نہیں ہیں، مدنی سورتوں میں اَحکام ہیں، اور مکی سورتوں میں زیادہ تر خطاب مشرکینِ مکہ کو ہے، اور مدنی سورتوں میں زیادہ تر خطاب اہلِ کتاب کو ہے یہود و نصاریٰ کو، اور مشرکین کو بھی خطاب ہے لیکن نسبتاً کم، اور مکی سورتوں میں زیادہ تر خطاب مشرکین کو ہے اور اہلِ کتاب کا ذکر بھی آتا ہے لیکن نسبتاً کم۔

مکی سورتوں کے مضامین پر اِجمالی نظر

مکی سورتوں میں زیادہ تر اُصول ذکر کیے گئے ہیں، اُصول کا معنی بنیادی عقائد، سب سے بڑا مختلف فیہ مسئلہ جو مشرکینِ مکہ کے ساتھ تھا وہ توحید ہے، اور اسی طرح وہ لوگ آخرت کے قائل نہیں تھے، مرنے کے بعد جی اٹھنے کے قائل نہیں تھے، اور ایسے ہی وہ رسالت کے منکر تھے، کہ انسانوں کی طرف انسان اللہ تعالیٰ کا رسول بن کر آجائے، یہ بات اُن کے خیالات میں صحیح نہیں تھی، اور

یہی تین بنیادی رکن ہیں ایمان کے، توحید رسالت اور معاد، تو مکی سورتوں میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ نے انہی عقائد کو ذکر کیا ہے، توحید کو ثابت کرنے کے لیے دلائل دیے ہیں، اور توحید کے بارے میں جو اُن کے شبہات تھے جن کی بنا پر وہ شرک کرتے تھے، اُن کو رَدّ کیا ہے۔ تو اثباتِ توحید، ردِّ شرک۔ آخرت کے واقع ہونے کے متعلق دلائل دیے ہیں کہ آخرت ضروری ہے اور وہ ہوگی، اور وہ کہتے تھے کہ مرنے کے بعد مٹی ہوجانے کے بعد جب ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو دوبارہ زندہ کون کرسکتا ہے، تو گویا کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اوپر شبہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی آخرت کا ذکر کیا ہے وہاں زیادہ تر اپنی قدرت کو واضح کیا ہے، کہ میرے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ جب میں ایک دفعہ انسان کو پیدا کرچکا تو دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں ہے، مختلف انداز اختیار کرکے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو واضح کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ آخرت ہوگی، اور آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہر کسی نے پیش ہونا ہے، اور اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔

اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان دونوں واسطے قابلِ اعتماد ہیں

اور پھر مخلوق اور اللہ کے درمیان میں واسطہ انبیاء علیہم السلام اور رُسل کا جو قرار پایا ہے، کہ براہِ راست انسان اللہ تعالیٰ کے اَحکام معلوم نہیں کرسکتا، اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تقاضا ہے کہ ہر کسی کو خود بتاتا پھرے کہ میرا یہ حکم ہے میرا یہ کام ہے، کرو، یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظمت کے منافی ہے، اور نہ ہر انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست اَحکام لے لے، اور عقل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو معلوم نہیں کیا جاسکتا، کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے کیا نہیں چاہتا؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ مخلوق اور اپنے درمیان واسطہ قرار دیا ہے رسولوں کو، اور رسولوں تک اپنی کلام اکثر و بیشتر فرشتوں کی وساطت سے پہنچائی، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام مخلوق تک جو پہنچے ہیں، تو اُس کے درمیان دو واسطے ہیں ایک واسطہ فرشتوں کا ہے، اور ایک واسطہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، تو ان دونوں واسطوں کو اللہ تعالیٰ نے خوب اچھی طرح ثابت کیا، اور یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں بالکل ثقہ واسطے ہیں، قابلِ اعتماد ہیں، یہ کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں کرتے، نہ تو فرشتے کے اندر یہ طاقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جو دے کر بھیجے وہ اس میں کوئی گڑبڑ کرے، اپنی طرف سے اس میں کوئی آمیزش کرلے، اور نہ رسولوں میں یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اُس کے خلاف بیان کریں، یا اُس کے اندر اپنی طرف سے کوئی آمیزش کریں، ان دونوں باتوں کو قرآنِ کریم میں خوب اچھی طرح سے واضح کرکے ذکر کیا گیا ہے، یہ دونوں واسطے قابلِ اعتماد ہیں، اس لیے فرشتے لے کر آئے انبیاء علیہم السلام پر، انبیاء علیہم السلام نے آگے عام انسانوں کے سامنے واضح جو کیا تو وہی صحیح دِین ہے جو اس وساطت کے ساتھ اللہ کی طرف سے بندوں تک پہنچا ہے۔

مکی سورتوں میں ترغیب وترہیب کا انداز ومقصد

پھر ان اصول کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مکی سورتوں میں انسان کو متاثر کرنے کے لیے ترغیب وترہیب کا سلسلہ ہے۔ ترغیب کا معنی ہے رغبت دلانا، بسا اوقات انسان رغبت دلانے سے متاثر ہوتا ہے، کہ اگر تم مان جاؤ گے تو دنیا کے اندر تمہیں یہ راحت پہنچے گی، دنیا میں تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات ہوں گے، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح سے حور وقصور

دے گا، اور آخرت کی نعمتیں یوں ملیں گی، یہ ترغیب کا شعبہ ہے۔ اور ترہیب کا مطلب یہ ہے کہ ڈرایا کہ اگر نہیں مانو گے تو نہ ماننے کی صورت میں دُنیا میں تباہ کر دیے جاؤ گے، جس طرح پچھلی تاریخ دوہرا کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دیکھو انبیاء علیہم السلام پہلے آئے تھے، اور اُن کی باتیں جن لوگوں نے نہیں مانی، اُن کو کس طرح مختلف عذابوں کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا، اس لیے پہلی امتوں کے ہلاک کیے جانے کے واقعات مکی سورتوں میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اور سورۂ اعراف میں بھی آپ کے سامنے بہت تفصیل کے ساتھ آرہے ہیں۔ اور ایسے ہی آخرت کی ترہیب ہے دوزخ کو ذکر کر کے، کہ اگر انبیاء علیہم السلام کی بات نہیں مانو گے تو آخرت میں تمہارے ساتھ اس طرح سے ہوگا، یوں عذاب ہوگا، جہنم کے قصے جو سنائے ہیں، وہ انسان کو متاثر کرنے کے لیے ہیں، یہ ترغیب وترہیب کہلاتا ہے، تو یہ ساتھ ساتھ ہے انسان کے دماغ کو سازگار کرنے کے لیے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ باتوں کو تسلیم کرلے، اور کج روی اختیار نہ کرے، یہ قرآنِ کریم کا حصہ اس طرح سے آگیا۔ اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے ترغیب جہاں دی ہے تو اپنے دُنیوی احسانات بھی شمار کرائے ہیں، احسانات کے ساتھ بھی متاثر کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ انسان کی فطرت کچھ ایسی ہے، کہ یہ احسان سے متاثر ہوتا ہے "اَلْاِنسانُ عبدُ الاحسانِ" انسان احسان کا بندہ ہے، اگر کسی کی طبیعت میں ذرا برابر شرافت موجود ہو تو محسن کی انسان قدر کیا کرتا ہے، اور اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھایا کرتا، احسان کرنے والے کے سامنے آنکھ اٹھانا، یا اس کے سامنے اکڑ جانا یا اترانا یہ انسانیت سے بعید ایک جہالت ہے اور شیطنت ہے، ورنہ فطرت انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ محسن کے سامنے اُس کا سر جھک جاتا ہے اور وہ اپنے محسن کی قدر کرتا ہے، اور اُس کی بات کو مانتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے کثرت کے ساتھ اپنے احسانات کو بیان فرمایا، شخصی طور پر بھی جو اللہ تعالیٰ نے بدن میں احسان کیے کہ آنکھ دی، ناک دیا، کان دیے، اور زبان دی، اور اس قسم کی دوسری صلاحیتیں دی ہیں۔ اور مادی طور پر بھی کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے تمہارے لیے زمین کا دسترخوان بچھا دیا، یہ زمین اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا گودام ہے، جس میں تمہیں چھوڑ دیا ہے، تم اپنی مرضی کے ساتھ اپنی ضروریات اس میں سے نکالتے جاتے ہو، کھاتے جاتے ہو، اللہ تعالیٰ کا یہ گودام ختم ہونے میں نہیں آتا، یہ علیحدہ بات ہے کہ تم اپنی سستی کی بنا پر نکالو نہیں، یا تم جہالت کی بنا پر نکالنے کا طریقہ نہ جانو، ورنہ اس میں سے جو نکالنا چاہو نکلتا ہے، اور نکالتے جاؤ اور کھاتے جاؤ، کتنا بڑا اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، پھلوں کے نام تک شمار کروائے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ بنایا، یہ بنایا، پانی، ہوا، آگ تک کو ذکر کیا، جتنی بھی یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پر قائم کی ہیں تو یہ مادی احسانات ذکر کیے ہیں۔ روحانی احسانات ذکر کیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کس طرح سے مکرم بنایا، عزت دی، فرشتوں کو تمہارے باپ کے سامنے جھکا دیا سلام کرنے کے لیے، تم اتنے باعزت لوگ ہو، اتنے مکرم ہو، پھر شیطان تمہارے اُوپر حسد کر کے، اس طرح سے تمہارا دشمن بنا تو تم اپنی شرافت کو یاد رکھو، جو شریف ہوا کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنی شرافت کی رعایت رکھا کرتے ہیں، وہ رذیل اور کمینی حرکتیں نہیں کیا کرتے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک بھنگی اور جمعدار سڑک کے اوپر جھاڑو دیتا ہوا شرماتا نہیں ہے، کیونکہ اس کے سامنے اس کا وہی منصب ہے، لیکن اگر محلے کے ایک چوہدری کو کہہ دیا جائے کہ آج سڑک کے اوپر جھاڑو دو تو وہ شرم کے مارے پسینہ پسینہ ہو جائے گا، اور اپنے اندر وہ ہمت اور طاقت نہیں پائے گا کہ راستے سے وہ گند اُٹھاتا پھرے، نالیاں صاف کرتا پھرے اور جھاڑو دیتا پھرے، اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا منصب نہیں ہے، تو اپنے

منصب کے مطابق حرکت کرنی آسان ہوتی ہے، اور اپنے منصب کے خلاف کسی قسم کا کردار اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان کو اِس کا منصب یاد دلاتا ہے کہ تم تو اس طرح سے مکرم ہو، مشرف ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، تم تو مسجودِ ملائکہ ہو، فرشتوں کو تمہارے سامنے جھکایا، تو اگر تم اس قسم کی حرکتیں کرو کہ شیطان کو بھی دیکھ کے شرم آئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے منصب سے واقف نہیں ہو، تو اللہ تعالیٰ نے روحانی انعامات جو انسان پر کیے ہیں وہ بھی یاد دلاتا ہے، مکی سورتوں میں زیادہ تر یہی مضامین ہیں اور یہی مضامین آپ کے سامنے سورۂ اعراف میں تفصیل کے ساتھ آ رہے ہیں، جس طرح سے عام طور پر مکی سورتوں میں یہ مضامین ہیں وہی مضامین تفصیل سے آپ کے سامنے آ رہے ہیں۔

سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی

سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی عظمت کو بیان کیا ہے، کہ کتاب حضور ﷺ کی طرف اتاری گئی، اللہ کی طرف سے آئی، جب اللہ کی طرف سے آئی تو رسول اللہ ﷺ پر ذمہ داری عائد ہوگئی کہ آپ ﷺ اس کے ذریعے سے لوگوں کو سمجھائیں، اور جہالت سے، کفر سے، شرک سے نکال کر سیدھے راستے کی طرف لائیں، اور آپ ﷺ کے دل میں مخلوق کے اوپر شفقت بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی، اور رسول کو اللہ کی باتوں کا اس طرح یقین ہوتا ہے جس طرح دوپہر کے وقت ایک آنکھوں والے انسان کو سورج کا یقین ہوتا ہے کہ سورج چڑھا ہوا ہے، اس لیے اللہ نے جو یہ کہہ دیا کہ اس غلط راستے پر چلنے والے ہلاک ہوں گے، تو دوسرا آدمی کوئی شک کرے تو کرے رسول کو شک نہیں ہوتا، وہ سمجھتا ہے کہ اس راستے پر جو چلا جا رہا ہے یقیناً آگے گڑھے میں گرے گا۔ پھر جب اس چلنے والے کے ساتھ محبت بھی ہو، اس کے ساتھ تعلق بھی ہو تو اُس کو سمجھانے میں انسان کسی قسم کی کمی نہیں کرتا، صبح و شام رات دن اس کے پیچھے پڑتا ہے، کہ کسی طرح سے یہ اپنے نفع و نقصان سے واقف ہو جائے، لیکن آگے انسان جاہل ایسا تھا کہ بار بار سمجھانے کے باوجود سمجھتا نہیں تھا، تو اس سے حضور ﷺ کو بہت تکلیف ہوتی تھی، اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ آپ غم کے اندر گھٹتے تھے اور اس غم کے اندر گھلتے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار یہ تسلی دی ہے جیسا کہ سورۂ الکہف میں لفظ آئیں گے فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا (سورۂ کہف: ۵) کہ ایسے لگتا ہے کہ آپ تو اپنے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے ان کے پیچھے، اگر یہ ایمان نہ لائے۔ تو یہ جو غم کی کیفیت حضور ﷺ کے قلب پر طاری ہوتی تھی، لوگوں کے نہ ماننے کی وجہ سے، اور اس کتاب کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بار بار تسلی دی ہے، تو یہ لفظ بھی تسلی کے ہیں، کہ اس کتاب کی طرف سے آپ کے دل میں کوئی تنگی نہ ہو، آپ کا کام تو انذار ہے، اور یہ تو ایمان لانے والوں کے لیے نصیحت ہے، اور آپ انذار کر رہے ہیں، کتاب اُن کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اگر کوئی شخص اپنے انجام سے نہیں ڈرتا، یا اس کتاب سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا، تو آپ کیوں غم کرتے ہیں، آپ کی ذمہ داری پوری ہوگئی، اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے سرورِ کائنات ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انبیاء ﷺ کے دل میں اس بات کی کتنی فکر اور کتنی اہمیت ہوتی تھی، کہ انسان سیدھے راستے پر آ جائیں، اور ان کے نہ سمجھنے سے کتنا غم ہوتا ہے، ہم تو صرف اپنے نفع و نقصان کو جانتے ہیں، اور وہ ساری مخلوق کے خیر خواہ بن کر

آتے ہیں جیسے وہ اردو کا شعر آتا ہے کہ۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

(امیر مینائی)

یہ تو اس نے کوئی تکلف ہی کیا ہوگا، بناوٹ ہی کی ہے، کون کسی کے لیے تڑپتا ہے؟ خنجر کسی پر چلے اور تڑپے کوئی! یہ کچھ مبالغہ ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام پر یہ بات صحیح معنی میں صادق آتی ہے، کہ ایک آدم کا بچہ بھی اگر اپنے لیے جہنم اختیار کرتا ہے، اور جہنم کے راستے پر چلتا ہے تو انبیاء علیہم السلام اسی طرح تڑپتے ہیں جس طرح کوئی ذاتی نقصان ہو جائے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ تسلی دی گئی، کہ آپ اس تنگی میں نہ پڑیے، سورۂ طٰہٰ میں لفظ آئے گا مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (آیت:۲) ہم نے آپ پر قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں، یہ کیا رات دن صبح شام رونا دھونا، قوم کے پیچھے ہر وقت پھر رہے ہو، آپ کی زندگی ہی اجیرن ہوگئی، ہم نے قرآن آپ پر اس لیے اتارا ہے کہ آپ اتنی مشقت میں پڑ جائیں؟ یہ سب تسلی کے الفاظ ہیں۔ تو یہ بھی اسی طرح سے تسلی ہے، کہ آپ کے دل میں اس کتاب کی طرف سے کوئی تنگی نہ ہو، یہ تو اس لیے اتاری گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعے سے ڈرائیں۔ اِنذار ایسے ڈرانے کو کہا کرتے ہیں جو شفقت سے ناشی ہوتا ہے، ڈرانا دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تو پولیس والے دھمکاتے ہیں اور ایک ماں باپ دھمکایا کرتے ہیں، تو آپ کے نزدیک دونوں کے دھمکانے میں فرق ہے یا نہیں ہے؟ ماں باپ کا جو دھمکانا ہے یہ انذار ہے، یعنی وہ شفقت سے ناشی ہوتا ہے، وہ اس نقصان کا تصور کر کے جو آپ کو پہنچنے والا ہے وہ برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ کسی طرح سے بچے پر سختی کریں تو وہ سیدھا ہو جائے۔ تو جو ڈرانا شفقت کی بنا پر ہوتا ہے مستقبل کے نقصان سے، اور مستقبل میں کسی نیکی کی طرف لانا ہوتا ہے اس کو کہتے انذار، اور سرورِ کائنات ﷺ کا ڈرانا ایسا ہی تھا۔ ''اور یہ کتاب نصیحت ہے مؤمنین کے لیے۔'' نصیحت تو سارے جہان کے لیے ہے ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (سورۂ انعام:۹۰) لیکن فائدہ چونکہ مؤمنین اٹھاتے ہیں، اس لیے یہاں مؤمنین کا ذکر ہوگیا۔ ایمان لانے والے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے ذِكْرٰى کو خاص کر دیا گیا مؤمنین کے ساتھ۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ: جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا، اتاری یہی کتاب گئی جس کا ذکر آیا، یہ اللہ کی طرف سے قانون اور قاعدہ ہے، یہ اللہ کی طرف سے طرزِ عمل ہے، طرزِ زندگی ہے جو آپ نے اختیار کرنا ہے، اس کی پیروی کرو، اور من گھڑت اولیاء جو تم نے اپنی طرف سے اپنے کارساز بنالیے، دوست احباب بنالیے ہیں اُن کی بات نہ مانو اللہ کے قاعدے کے مقابلے میں، اللہ کے قانون کے مقابلے میں ان کی اتباع نہ کرو، نہ اتباع کرو اللہ کے علاوہ اور رفقاء کی اولیاء کی، کارسازوں کی، قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ: یہ ایک قسم کی شکایت ہے انسان کی کہ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو، جتنا تمہیں سمجھایا جاتا ہے اُس سے سمجھتے نہیں۔

اُممِ سابقہ کے واقعات کے ذریعے ترہیب

آگے وہ ترہیب آگئی، جیسے کہ میں نے مضامین کا اجمال ذکر کرتے ہوئے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا، یہ ترہیب ہے۔

''کتنی ہی بستیاں ہیں'' جن کی تفصیل آپ کے سامنے سورت میں آرہی ہے۔اب اگر فاء کو تاکید کے لیے بناتا ہے تو ترجمہ یوں ہوگا، ہم نے اُن کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو اُن کے پاس ہمارا عذاب آگیا۔اور اگر فاء کو تفصیل کے لیے بناتا ہو، تو ہم نے اُن ہلاک کردیا اور ہلاک کرتے وقت اُن کے پاس ہمارا عذاب آگیا، تو ہلاک کرنے کی یہ تفصیل ہے، ہم نے انہیں ہلاک کیا یا ہلاک کرنے کا ارادہ کیا دونوں مفہوم میں نے آپ کے سامنے عرض کردیے ہیں ترجمے میں۔ہم نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو اُن کے پاس ہمارا عذاب آگیا۔ یہاں دو وقت ذکر کیے گئے ہیں ایک رات کا اور ایک دوپہر کا، اور دوسری جگہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ بھی ہیں اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ یَلْعَبُوْنَ (سورۂ اعراف:۹۸) کہ اُن کے پاس ہمارا عذاب چاشت کے وقت آجائے جبکہ وہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں۔تو ان سب باتوں کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے عذاب کے آنے کا کوئی وقت متعین نہیں، کہ سوئے ہوؤں کو آدبوچتا ہے، یا جاگتوں کو پکڑتا ہے، رات کو بھی آسکتا ہے، دوپہر کو بھی آسکتا ہے، چاشت کے وقت بھی آسکتا ہے چاہے تم کھیل کود میں لگے ہوئے ہو، چاہے آرام کرنے کے لیے لیٹے ہوئے ہو، چاہے تم سوئے ہوئے ہو، جب بھی اللہ کا عذاب آجائے انسان میں طاقت نہیں کہ اُس کو دفع کرسکے۔یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ہم جاگتے ہوتے تو شاید عذاب سے بچ ہی جاتے، یا ہم سوئے ہوئے ہوتے تو شاید ہمیں عذاب کا احساس نہ ہوتا، ایسی بات نہیں، جس وقت اللہ کا عذاب آتا ہے، چاہے رات کو آجائے، چاہے دوپہر کو آجائے، چاہے صبح کے وقت آجائے، اس عذاب کے آنے کے بعد پھر کسی کا بچ نکلنا یا اُس عذاب کی مدافعت کرلینا یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔مختلف اوقات میں امتوں پر عذاب آیا، تفصیل آگے آرہی ہے۔قَآىِٕلُوْنَ کا مفہوم بھی ذکر کردیا کہ یہ قیلولہ سے ہے، تو جس وقت انبیاء علیہم السلام قوم کو سمجھاتے ہیں تو آپ کے سامنے آئے گا کہ قوم کس طرح سے آگے سخت مزاج واقع ہوئی، کیسے کیسے اکڑفوں دکھاتے ہیں، اور اپنے مال پر، اپنی اولاد پر، اپنے جاہ پر وہ کس طرح سے اعتماد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں ہمیں کون پکڑ سکتا ہے؟ ہم ایسے طاقت ور ہیں ہمارا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کو دھمکاتے ہیں کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو ہم یوں کردیں گے؟ یہ تفصیل ساری واقعات میں آرہی ہے۔یہ اس وقت تک ہی ہے جب کہ اس قوم کے سامنے ان اکڑفوں کرنے والوں کے سامنے اللہ کا عذاب منکشف نہیں ہوتا، اور جس وقت اللہ کے عذاب کے آثار نظر آجاتے ہیں، اور اللہ کے عذاب کا ایک ہی جھونکا آتا ہے تو سب شیخی کرکری ہوجاتی، پھر کوئی اکڑ نہیں رہتی اور کسی قسم کی پھوں پھاں باقی نہیں رہتی، اکڑتے اُس وقت تک ہی ہیں جب تک کہ اللہ کی طرف سے عذاب سامنے نہیں آیا، جب اللہ کی طرف سے عذاب سامنے آجاتا ہے پھر اس کے کے علاوہ کوئی چیخ وپکار نہیں ہوتی کہ واقعی قصوروار ہم ہی تھے، ورنہ انبیاء علیہم السلام نے تو ہمیں بہت سمجھایا، اللہ کی طرف سے تو ہمیں سب کچھ بتادیا گیا تھا، ہم نہیں مانے، سو قصور ہمارا ہی تھا۔لیکن وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ پھر قصور کا اعتراف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جیسے آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ بات آئے گی فرعون کے متعلق کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کس طرح سے سمجھایا، اور وہ اپنی سلطنت مصر پر ناز کرتا ہوا کس طرح سے اکڑا، اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ (سورۂ زخرف:۵۰) کیا میں ملک مصر کا بادشاہ نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں میرے نیچے سے نہیں چلتیں، اس طرح سے وہ اکڑتا تھا کہ میں بادشاہ ہوں اور اس طرح سے میرے محلات ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمندر میں ایک ہی غوطہ دیا گیا، اور ناک میں پانی پڑا، تو ساری فرعونیت کرکری ہوگئی، فوراً ہی کہنے لگا اٰمَنْتُ

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (سورۂ یونس: ۹۰) اب مان گیا بنی اسرائیل کے رب کو، لیکن جواب یہ ملا آٰلْـٰٔنَ: اب مانتے ہو؟ اب ماننے کا وقت نکل چکا۔ تو انسان میں یہی ایک خامی ہے، کہ وہ قبل از وقت سوچتا نہیں، اور جب سر پر ڈنڈا لگتا ہے اور کھوپڑی پھٹتی ہے، اُس وقت اس کا سارے کا سارا تکبر اور اس کی اکڑ اس وقت نکلتی ہے، لیکن پھر نکلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نیک بخت وہی ہوا کرتے ہیں، جو انبیاء ﷩ کے سمجھانے کے ساتھ یا انبیاء کے نائبین علماء کے سمجھانے کے ساتھ، یا والدین کے سمجھانے کے ساتھ، استاذ کے سمجھانے کے ساتھ جو قبل از وقت سمجھ جائے نیک بخت وہی ہوتا ہے، ورنہ جس وقت رگڑا لگ گیا تو رگڑا لگنے کے بعد سمجھے یا نہ سمجھے، پھر تو دونوں برابر ہیں، پھر کیا فائدہ؟

آخرت میں رسولوں اور ان کی اُمتوں سے سوال

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ: البتہ ضرور سوال کریں گے ہم اُن سے بھی۔ یہ اب آخرت کا ذکر آ گیا، جس طرح سے عذابِ دُنیوی ذِکر کر کے ترہیب کی ہے، اب یہ آخرت کا ذکر آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ہم رسولوں سے بھی پوچھیں گے کہ کیا انہوں نے دِین پہنچایا؟ اور لوگوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ اور اس طرح سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اُن سے بھی پوچھا جائے گا کہ رسول تمہارے پاس آئے تھے، تم نے کتنا مانا؟ یہ محاسبہ ہے، یہ آخرت کا ذکر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس طرح سے آخرت میں سوال کریں گے۔ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ: پھر ہم لوگوں پر اپنے علم کی بنا پر بیان کریں گے۔ اور جب یہ لوگ کام کیا کرتے تھے، اُس وقت ہم کوئی غیر حاضر نہیں ہوتے تھے کہ ہم وہاں موجود نہ ہوں، بلکہ جو بھی لوگوں نے اپنی زندگی میں طرزِ عمل اختیار کیا، ہر عمل کے وقت ہم موجود ہوتے تھے، ہم غائب نہیں تھے، اس لیے ہمارے پاس صحیح معلومات ہیں، جب یہ صحیح معلومات ہیں تو ہم اپنے علم کی بنا پر سب حالات لوگوں کے سامنے واضح کر دیں گے کہ تم نے یہ کیا، اور وہ کیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

''یَوْمَئِذٍ'' کا مفہوم

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ ۟الْحَقُّ: اِذٍ کے آخر میں جو تنوین ہے، نحو میں آپ پڑھتے رہتے ہیں، کہ یہ مضاف الیہ کا عوض ہے، مفہوم اس کا یہ ہوتا ہے یَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا: جس دِن ایسا ہوگا، یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے، جس دِن ایسا ہوگا، اس سے اشارہ ہے پچھلے واقعات کی طرف، کہ جب ہم رسولوں سے پوچھیں گے، اور جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا ان سے پوچھیں گے، اور ہم پھر اپنے علم کے مطابق باتیں بیان کر دیں گے، کیونکہ جس وقت مخلوق کوئی کام کیا کرتی تھی ہم موجود ہوتے تھے، ہم کوئی غیر حاضر نہیں ہوتے تھے جب یہ واقعات پیش آئیں گے یَوْمَئِذٍ کا یہ مفہوم ہوا، یَوْمَ اِذْ كَانَ كَذَا کا معنی ہوا جب یہ واقعات پیش آئیں گے یعنی قیامت کے دن، کیونکہ یہ سارے کے سارے واقعات قیامت کے دن پیش آنے ہیں، تو جس دن ایسا ہوگا اس دن تول برحق ہے، تولنا حق ہے، یا وزنِ حقیقی ثابت ہے، دونوں طرح سے مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا۔ اب یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ تولا کس چیز کو جائے گا، کس طرح سے تولا جائے گا؟ چونکہ عام طور پر تو ہم دیکھتے ہیں، خاص طور پر پچھلے زمانے میں یہ اشکال تھا جس کو آج کل کے

حالات نے کچھ تھوڑا سا حل کر دیا ہے، پہلے زمانے میں لوگ یہ اشکال کیا کرتے تھے کہ انسان کے جتنے اعمال ہیں، اقوال ہوں یا افعال ہوں، وہ سارے کے سارے ''اَعراض'' ہیں، اعراض عرض کی جمع ہے، منطق میں آپ یہ لفظ پڑھیں گے، ایک ہوتا ہے عرض اور ایک ہوتا ہے جوہر، جوہر ہوتا ہے قائم بالذات، اور عرض وہ ہوتا ہے جو قائم بالذات نہیں، مثلاً ایک آپ کا کپڑا ہے اور ایک کپڑے کا رنگ ہے، کپڑے کا اپنا وجود ہے، رنگ کپڑے کے ساتھ قائم ہے، کپڑا ہوگا تو رنگ ہے، کپڑا نہیں تو رنگ بھی نہیں، اس کو عرض کہتے ہیں۔ تو انسان کے اعمال خواہ وہ افعال ہوں یا اقوال ہوں یہ اَعراض ہیں، یعنی وجود میں آتے ہی مٹتے چلے جاتے ہیں، یہ باقی نہیں رہتے۔ مثلاً میں یہ بول رہا ہوں تو پہلا لفظ میری زبان سے نکل کے ختم ہو جاتا ہے تب دوسرا لفظ باہر آتا ہے، اور آپ نے جو کام کیا وہ آپ کی ذات کے ساتھ قائم تھا، کام ہو گیا اور اس کے بعد آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئے تو پہلا کام ختم ہو گیا، اس کا وجود ہی نہیں ہے، جب اس کا وجود نہیں ہے تو پھر تولا کس چیز کو جائے گا؟ یہ پرانے زمانے میں ایک اِشکال ہوتا تھا۔

چاروں طرف قدرت کے کیمرے نصب ہیں

اور آج اس اشکال کو بہت حد تک جدید ایجادات نے اٹھا دیا ہے، ختم کر دیا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں بول رہا ہوں، لیکن میرے بولے ہوئے الفاظ ضائع نہیں جا رہے، بلکہ وہ ریکارڈ میں آ رہے ہیں، اور جس وقت چاہیں گے آپ ان کو دوبارہ موجود کر لیں گے، ایک نقطے کا فرق نہیں ہوگا، جس وقت آپ چاہیں انہیں موجود کر لیں۔ اسی طرح سے آپ کے سامنے ایک کیمرہ ہے، ایک چیز اُس کے سامنے سے گزرتی جاتی ہے، اور اس کے اندر اس کا عکس آتا جاتا ہے، اور وہ محفوظ ہوتا چلا جا رہا ہے، حتیٰ کہ یہ ٹیلی ویژن کے اصول پر جو تصویریں لی جاتی ہیں، اس میں صرف تصویر ہی نہیں آتی، بلکہ پوری حرکت بھی آتی ہے، یعنی آپ نے جس طرح سے ہاتھ ہلایا تھا، دوسرے وقت میں جب اس فلم کو چلایا جائے گا تو آپ کا ہاتھ بھی اسی طرح سے ہلتا ہوا نظر آئے گا، بات کرتے ہوئے جس طرح سے آپ کے ہونٹ ہل رہے ہیں، تو جس وقت آپ کی تصویر سامنے آئے گی، تو اسی طرح سے آپ کے ہونٹ بھی ہلتے ہوئے نظر آئیں گے، تو وہ جتنی ہیئات تھیں جتنی کیفیات تھیں وہ ساری کی ساری ضبط میں آگئیں، اور ان میں سے کوئی ضائع نہیں ہوئی، چاہے آپ دس سال کے بعد چاہیں تو وہی نقشہ دیکھ سکتے ہیں، اور بالکل اسی طرح سے اس کو موجود کر دیا جائے گا۔ تو اس سے معلوم ہو گیا کہ جن کو پہلے لوگ سمجھتے ہیں، کہ یہ اَعراض ہیں جو باقی نہیں رہ سکتے، آنے والی ایجادات نے بتا دیا کہ یہ باقی رکھی جا سکتی ہیں۔ تو جب ایک انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل دی وہ اس چیز پر قادر ہے کہ انسان کے اقوال اور افعال کا ذخیرہ محفوظ کر لے، تو جو خالق کائنات ہے خالقِ انسان ہے اور انسان کو عقل دینے والا ہے کیا وہ انسان کی زندگی کے افعال اور اقوال کا ریکارڈ نہیں رکھ سکتا؟ یقیناً رکھ سکتا ہے۔ اس لیے آپ کی آنکھ میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک مشین ہے، ایک کیمرہ ہے، جب سے آپ نے ہوش سنبھالی ہے، جو کچھ آپ دیکھتے چلے جا رہے ہیں، وہ سارے کا سارا اس میں ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آپ کا کان بھی اسی طرح سے ایک مشین ہے، جو کچھ آپ سنتے چلے جا رہے ہیں، وہ سارے کا سارا آپ کے کان میں ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے، آپ کے ہاتھوں میں بھی اللہ نے اس قسم کی ایک چیز رکھی ہے، کہ جو کچھ آپ ان ہاتھوں کے

ذریعے سے کرتے ہیں وہ ساری فلم اس کے اندر تیار ہوتی چلی جارہی ہے، قدموں میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ جدھر آپ چل کر جاتے ہیں، وہ سارے کا سارا ان میں ریکارڈ ہوتا چلا جارہا ہے، آپ کے دل میں جس قسم کے جذبات ہیں وہ سارے کے سارے اس میں ریکارڈ ہوتے چلے جارہے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ ختم ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے اندران کا ذخیرہ اسی طرح سے موجود ہے۔ اسی طرح یہ زمین آپ کے لیے ایک ریکارڈ مشین ہے، اس کے اوپر بیٹھ کر جو باتیں آپ کرتے ہیں، اس کے اوپر بیٹھ کر آپ جو کام کرتے ہیں، وہ سارے کے سارے اس کے اندر محفوظ ہوتے چلے جارہے ہیں، چنانچہ یہی چیز ہے جس کی طرف شریعت نے ہمیں بار بار متوجہ کیا، کہ تم اپنی نقل وحرکت کو یوں نہ سمجھو کہ یہ ضائع جارہا ہے، بلکہ اللہ کے ہاں اس کا ریکارڈ تیار ہے، جس وقت اللہ کے سامنے پیش ہو گے تو تمہیں تمہاری زندگی کی فلم دکھادی جائے گی، تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ ہم نے کیا کیا تھا، زبان بتادے گی کی اس سے کیا کیا باتیں کی گئی تھیں، آنکھ بتادے گی کہ اس کے ذریعے سے کیا کیا دیکھا گیا تھا، ہاتھ بتادیں گے کہ ان کے ذریعے سے کیا کیا کام کیا گیا تھا، قدم بتادیں گے کہ ان کے ذریعے سے کدھر کدھر آپ چل کر گئے تھے، اور اسی طرح سے یہ زمین بولے گی یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (پ ۳۰، سورۂ عادیات) قرآنِ کریم میں جس طرح سے آتا ہے، إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا زمین کو جس دن جنبش دی جائے گی زلزلہ دیا جائے گا، اس میں آگے جاکے آئے گا یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا یہ زمین اس دن اپنی ساری خبریں سنادے گی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس کی خبریں یہی ہیں کہ یہ بتائے گی کہ میری پشت پر فلاں انسان نے یہ کام کیا تھا، فلاں نے یہ کام کیا تھا، زمین کے جن قطعات کے اوپر آپ نے نماز پڑھی ہے، وہ شہادت دیں گے کہ آپ نے اس کے اوپر نماز پڑھی ہے، اور زمین کے جس قطعے کے اوپر آپ نے کوئی گناہ کیا ہے، معصیت کی ہے تو وہ بیان کرے گی کہ میری پشت پر اس نے یہ گناہ کیا ہے۔[1] اس طرح سے یوں سمجھو کہ آپ کے چاروں طرف قدرت کے کیمرے لگے ہوئے ہیں، اور آپ کی نقل وحرکت اور آپ کے اقوال جو کچھ بھی ہیں وہ سب محفوظ ہوتے چلے جارہے ہیں، قرآنِ کریم نے اور سرورِ کائنات ﷺ کے اقوال نے ہمیں بار بار اس بات پر متنبہ کیا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگ ایمان بالغیب کے طور پر مانتے تھے، کہ ہاں یہ ساری کی ساری چیزیں محفوظ ہوں گی، اور ایک وقت پر سامنے آجائیں گی، لیکن آج ان چیزوں نے ہمارے سامنے اس حقیقت کو بہت ہی نمایاں کردیا ہے، کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان کی نقل وحرکت بھی محفوظ رکھ لی جائے، اور اس کے اقوال اور افعال کا ریکارڈ بھی بعینہ اسی طرح سے موجود رکھ لیا جائے جس طرح کوئی کام کیا گیا ہے، جب وہ سامنے آئے گا تو پھر وہی بات ہوگی جو قرآنِ کریم نے کہی وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا (سورۂ کہف: ۴۹) جو کچھ انسانوں نے کیا ہوگا سب کو اپنے سامنے حاضر موجود پائیں گے، اور اُن کے سامنے آجائے گا کہ واقعی ہم نے یہ کام کیا تھا، واقعی ہم نے یہ بات کی تھی، واقعی ہم نے یہ جرم کیا تھا، واقعی ہم نے یہ نیکی کی تھی، وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا: جو کچھ کیا ہے سب موجود ہوجائے گا۔ اور یہ عقیدہ ایک ایسا بنیادی عقیدہ ہے، کہ انسان کی زندگی کو سنوارنے میں جتنا یہ عقیدہ مؤثر ہے شاید اتنا کوئی دوسرا عقیدہ مؤثر نہ ہو، یعنی اپنی زندگی کے متعلق یہ

(۱) سنن ترمذی ۲/۶۸ - ۲/۱۷۸، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ اذا زلزلت - مشکوۃ ج ۲ ص ۴۸۳ باب الحشر، فصل ثانی - عن ابی ھریرۃ۔

استحضار کہ ہم جو کچھ کرتے جا رہے ہیں وہ سب خفیہ کیمروں کے اندر ریکارڈ ہوتا چلا جا رہا ہے، اور ایک دن ہمارے سامنے یہ ساری کی ساری تصویر آجائے گی، ہم اپنی زندگی کی فلم خود دیکھ لیں گے، اور اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے سب کچھ موجود کر دیں گے، یہ عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ اگر کسی انسان کے دل میں یہ راسخ ہو جائے تو وہ شخص کبھی بھی بے فکری کی زندگی نہیں گزار سکتا۔

گناہ کا مدار جذبۂ اِخفاء پر ہے

ایک چیز ہے جس کو آپ معصیت یا گناہ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، بعض اقوال ایسے ہیں جن کا زبان سے ادا کرنا آپ سمجھتے ہیں کہ گناہ ہے، بعض افعال ایسے ہیں جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا کرنا گناہ ہے، معصیت ہے۔ آپ اپنے ضمیر کی طرف رجحان کیجئے، آپ کے سامنے ایک حقیقت نمایاں ہوگی، کہ گناہ اور معصیت کا مدار جذبۂ اخفاء پر ہے چھپانے پر موقوف ہے، جذبۂ اِخفاء پر یہ معصیت مبنی ہے...... (بہت بڑی حقیقت ہے جو آپ کے سامنے نمایاں کر رہا ہوں، اس کو سمجھئے اور اپنے دماغ میں بٹھائیے!)...... سرورِ کائنات ﷺ سے ایک دفعہ ایک شخص نے پوچھا: ''مَا الْاِثْمُ ؟'' یا رسول اللہ! گناہ کی نشانی کیا ہے؟ ہم کس طرح سے سمجھیں کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں یہ گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مَا حَاكَ فِيْ صَدْرِكَ '' ایک جگہ تو یہ فرمایا، اور دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے ''وَ كَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ ''(۱) گناہ وہ چیز ہے کہ جس وقت تُو کرنے لگے تو تیرا دل دھڑکنے لگ جائے کہ میں یہ کیا کرنے لگا ہوں، اور آپ جب چاہیں تجربہ کر لیں کہ جب تک گناہ کرنے کی عادت پوری راسخ نہ ہو (عادت راسخ ہو جانے کے بعد تو دِل میں قساوت آجاتی ہے، سنگ دلی آجاتی ہے، پھر تو انسان کو حیوانوں کی طرح پتا نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں کیا نہیں کر رہا، پھر احساس ختم ہو جاتا ہے) جب تک قلب کے اندر ایمان باقی ہو اس وقت تک انسان کا دل دھڑکتا ہے کہ میں یہ کیا کرنے لگا ہوں۔ اور پھر آپ نے دیکھا ہوگا کہ دل بھی دھڑکتا ہے، پھر انسان ذرا یوں چاروں طرف دیکھتا بھی ہے، کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا، چور جس وقت چوری کرنے لگتا ہے تو کس طرح سے گھوم کے چاروں طرف دیکھتا ہے، اور اگر کوئی اندر گھس کر گناہ کرنے لگا ہے تو کس طرح سے دروازے اور کھڑکیوں کو جھانکتا ہے کہ کوئی روشن دان کھلا تو نہیں، کوئی کھڑکی کھلی تو نہیں، کوئی دروازہ کھلا تو نہیں۔ اور جس وقت بھی انسان کوئی معصیت کرنے لگے اُس کی عادت ہے کہ یوں کر کے چاروں طرف دیکھے گا کہ مجھے کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اور اگر اُس کو یہ شبہ پڑ جائے کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، یہ روشن دان ہے اور اس میں کوئی شخص بیٹھا اندر دیکھ رہا ہے، یا اس کھڑکی میں سوراخ ہے اور باہر سے کھڑا ہوا ایک آدمی اندر جھانک رہا ہے، تو آپ ذرا دیانت داری سے بتلائیے کہ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہو کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، یا وہ دُور سے دُوربین لگائے ہوئے ہے اور میری نقل و حرکت جتنی ہے اُس کے سامنے ہے، اور اس کے ہاتھ میں کیمرہ ہے، میں جو کچھ کروں گا وہ تصویر لے لے گا تو اگر یہ خیال دل میں آجائے تو ذرا بتائیے کہ آپ کو گناہ کرنے پر جرأت ہو سکتی ہے؟ کبھی بھی نہیں ہوگی۔ انسان گناہ کرنے کی جرأت تب کرتا ہے، جب اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا، اور میرا یہ فعل چھپا رہ جائے گا، کسی کو پتا نہیں چلے گا، تب جا کر انسان گناہ پر جرأت کرتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/ ۳۱۴ باب تفسیر البر والاثم۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۳۱ باب الرفق والحیاء، فصل اول، عن النواس بن سمعان۔

اِنسان اللہ کا خوف اور اپنی ذِمہ داری کب محسوس کرے گا؟

اور اگر اس کے دل و دماغ میں اور ہر ریشے میں یہ چیز سرایت کر جائے کہ تم پتھر کی چٹان کے اندر گھس جاؤ، جس کا کوئی دروازہ نہیں، کوئی روشن دان نہیں ہے، اندر گھس کر بھی جو کچھ تم کرو گے وہ بھی ظاہر ہو جائے گا، چھپے گا نہیں، رات کی تاریکیوں میں جو کچھ تم کرو گے، اس وقت بھی تمہارے اُوپر دیکھنے والے پہریدار بیٹھے ہیں، اور تمہارے ساتھ ہی اس قسم کی ریکارڈ مشینیں لگی ہوئی ہیں، کہ جن کے اندر تمہارا ہر قول اور فعل ریکارڈ ہوتا چلا جائے گا، اور ایک دن ساری مخلوق کے سامنے تمہاری فلم نمایاں کر دی جائے گی، اور تم خود بھی دیکھو گے، اور وہ نامہ اعمال جس وقت سامنے آئے گا تو اس کو دیکھ کر کہو گے مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً (سورۂ کہف: ۴۹) ہائے! اس کتاب کو کیا ہو گیا، اس نے نہ تو میری کوئی چھوٹی بات چھوڑی نہ بڑی بات چھوڑی، یہ تو سب کچھ ہی اکٹھا کر کے لے آئی۔ اگر یہ عقیدہ راسخ ہو جائے تو پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دن کی روشنی ہے یا رات کی تاریکی ہے، تم تنہائی میں ہو یا مجمع کے سامنے ہو، تمہارے اوپر کوئی پہریدار ہے یا نہیں ہے، تمہاری کوئی نگرانی کرنے والا ہے یا نہیں، اگر یہ حقیقت آپ کے دل میں اتر جائے تو آپ ہر وقت ایک سنجیدہ، سمجھدار، عقل مند، اللہ سے ڈرنے والے، اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے والے رہو گے، اور آپ کے قول اور فعل میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تمہیں کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں، اگر کوئی دیکھنے والا ہو گا تو بھی گناہ سے بچو گے، اور اگر نہیں دیکھنے والا ہو گا تو بھی گناہ سے بچو گے۔ اور قرآن نے ہمیں یہی سبق پڑھایا ہے اور یہی بتایا ہے کہ فرشتے تمہارے اوپر علیحدہ نگران ہیں، اگر تم کہیں بُرا کام کرنا چاہتے ہو تو کوئی تدبیر کرو کہ فرشتوں سے چھپ جاؤ، پھر تمہارے بدن کا ایک ایک حصہ تمہارے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے، تم اپنے بدن سے نکل کر کہاں چلے جاؤ گے، زمین کے ٹکڑے پر اگر تم گناہ کرو گے تو وہ زمین کا ٹکڑا تمہارا گواہ بن جائے گا، تو جب یہ ساری کی ساری اردگرد شہادتیں دینے والی چیزیں موجود ہیں، اور اللہ کا علم علیحدہ، جیسے فرمایا کہ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ: ہم بھی ہر وقت سر پہ موجود ہوتے ہیں، ہم کہیں عمل کے وقت غائب نہیں ہوتے، تو جب یہ ساری کی ساری حقیقت آپ کے سامنے ہو گی، تو آپ کو یقین ہو جانا چاہیے کہ آپ کتنا ہی چھپ کر گناہ کریں، لیکن یہ ایک دن نمایاں ہو جائے گا، چھپا نہیں رہے گا۔

اِنسانی زندگی میں انقلاب کیسے آئے گا؟

تو جس وقت اس نے نمایاں ہونا ہے تو بیٹو! کام وہی کرو جس کا نمایاں ہونا آپ کو پسند ہے، اور جس کا نمایاں ہونا آپ کو پسند نہیں ہے وہ کام چھوڑ دو۔ جس کام کے متعلق آپ یہ چاہتے ہیں کہ اگر علی الاعلان بھی کہہ دیا گیا کہ فلاں نے یہ کام کیا ہے، تو ہمیں کوئی شرم ساری نہیں ہو گی، ہم کوئی ذِلت اور رُسوائی محسوس نہیں کریں گے، جس کام کے متعلق آپ کا یہ عقیدہ ہو وہ کام دھڑلے سے کیجئے، اور جس کام کے متعلق آپ کے دل میں یہ جذبہ ہو کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے، سینما دیکھنے جانا ہے تو راستہ ایسا اختیار کرنا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، کوئی اور حرکت کرنی ہے تو ایسی جگہ تلاش کرنی ہے جہاں کسی کی نظر نہ پڑے، تو یہ حماقت اور جہالت کے علاوہ کوئی بات نہیں ہے، اس حماقت اور جہالت کا انسان کو وقتی طور پر احساس نہیں، بعد میں پتا چلے گا کہ یہ تو وہی بات ہے جو عام طور

پر مشہور ہے، کہ کبوتر پر جب بلی حملہ آور ہوتی ہے (یہ عام طور پر پنجابی میں مشہور ہے، ویسے تو کبوتر بازوں کو پتا ہوگا کہ اس کی حقیقت کیا ہے) کہ کبوتر پر جب بلی حملہ آور ہوتی ہے کبوتر کو دبوچنے کے لیے، تو کہتے ہیں کہ کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ جیسے میں اس کو نہیں دیکھ رہا وہ بھی مجھے نہیں دیکھ رہی، تو جب میں اُسے نظر ہی نہیں آرہا تو وہ مجھے پکڑے گی کیسے؟ یعنی اپنی آنکھیں بند کر کے وہ یہ سمجھ لیتا ہے، کہ میں اس کو نظر نہیں آرہا۔ اب یہ بات آپ سنیں گے تو ہنسیں گے، کہ واقعی کبوتر کی حماقت ہے، کہ اپنی آنکھیں بند کرنے سے دوسروں سے کیسے چھپ گیا؟ یہ تو ہو گیا کہ آپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو دوسرا آپ کو نظر نہیں آرہا، لیکن آپ کی اپنی آنکھیں بند کرنے سے دوسرے سے آپ کیسے چھپ جائیں گے؟ تو جس طرح سے یہ کبوتر کی حماقت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ آنکھیں بند کر لی جائیں تو بلی دیکھ نہیں سکتی، لیکن پتا اُسی وقت ہی چلتا ہے کہ جب بلی صاحبہ آکر گردن مروڑ لیتی ہے، پھر اس کو پتا چلتا ہے کہ آنکھیں بند کرنا یہ بچنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح سے یہ حماقت اور جہالت ہماری ہے کہ ہم خود چھپتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی نظروں سے چھپ گئے، ہم خود پردے تانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں سے پردے میں آگئے، لیکن یہ یقین کر لو کہ آپ دوسروں سے پردے میں نہیں ہیں۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے جو انسان کی عملی زندگی سنوارنے کے لیے بہت قیمتی عقیدہ ہے، جو شخص جتنی جلدی اپنے دل اور دماغ میں اس خیال کو جمالے گا، اتنی جلدی ہی وہ ایک صالح انسان بن جائے گا، اور جتنی دیر لگائے گا اس بات کے سمجھنے میں، اتنی دیر تک اُس کی زندگی بگڑی رہے گی۔ آج آپ تہیہ کر لیجئے کہ ہم نے خلوت میں وہی کام کرنا ہے جو ہم میدان میں بیٹھ کر کر سکتے ہیں، اور ہم نے رات کی تاریکی میں وہی کام کرنا ہے جو ہم دن کی روشنی میں کر سکتے ہیں، اور ہم نے تنہائی میں وہی کام کرنا ہے جو دس آدمیوں کی موجودگی میں کر سکتے ہیں، اگر آج آپ یہ طرزِ عمل اختیار کر لیں تو اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے کے بعد آپ سمجھیں گے کہ آج ہی آپ کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے ایک بات واضح کی ہے، کہ انسان کا کیا ہوا عمل ضائع نہیں جاتا، یہ سارے کا سارا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔

وزنِ اعمال کی کیفیت کے متعلق مختلف اقوال

تو جب یہ ساری کی ساری چیزیں موجود ہیں، اب وہ بات نہیں کہ اعراض ہیں جو ساتھ ساتھ مٹتے جاتے ہیں، بلکہ اب اعراض کا بھی وجود ہو گیا، اب انہی اعمال کو آخرت میں تولا جائے گا، پھر دو صورتیں ہوں گی، یا تو انہی اعمال کو موجود کر لیا جائے گا، جس طرح سے آپ نے سنا ہوگا کہ نیک عمل حسین شکل میں آئے گا، جو انسان کے لیے انس کا باعث بنے گا، محبت کا باعث بنے گا، نماز ہے وہ ایک شکل میں آئے گی، اور روزہ ہے وہ اپنی شکل میں آئے گا، کوئی آپ کو دودھ کی شکل میں ملے گا، کوئی آپ کو کسی شکل میں ملے گا، تو عالم مثال کے اندر ان اعمال کی کوئی نہ کوئی مثال اور کوئی نہ کوئی صورت ہے، یا تو اُن عملوں کو اللہ تعالیٰ وجود دے کر اس طرح سے حاضر کر لیں گے، اور ان کو تولا جائے گا، یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہے۔ یا یہ ہے کہ تولنے کے لیے ہمارے ذہن میں جو اِشکال آتا ہے، اس کی بنیاد اس بات پر ہے، کہ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید تولنے کے لیے یہی ترازو اور یہی بٹے ہوتے ہیں، اگرچہ میزان کا مطلب اس زمانے میں لوگ یہی سمجھتے تھے، اور سرورِ کائنات ﷺ نے بھی اسی طرح سے سمجھایا، پلڑے کا لفظ آیا، اس کے

کانٹے کا لفظ آیا، یہ ساری کی ساری چیزیں آتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تأثر یہی دیا گیا ہے، کہ جس طرح سے یہ میزان ہے اسی طرح ہوگی، لیکن آخرت کی چیزیں جتنی ہیں ان کا دنیا کی چیزوں کے ساتھ ایک نام کے اعتبار سے اشتراک ہے، باقی احقیقت ایک نہیں ہے، جنت میں آپ کو انار کھانے کے لیے ملیں گے، انار آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں بھی موجود ہیں، تو اگر آپ یہ سمجھ بیٹھے کہ آخرت میں یہی انار ملتے ہیں، تو آپ کہیں گے کہ جس دن ہم کھا لیتے ہیں نزلہ ہو جاتا ہے، تو کیا جنت میں بھی انار کھانے کے بعد نزلہ ہو جائے گا؟ اگر آپ یہ تصور کریں گے تو یہ غلط تصور ہوگا، کیونکہ یہ صرف ایک نام کا اشتراک ہے، کہ جو نعمت وہاں ملے گی وہ کسی اعتبار سے انار جیسی ہے، جس کو آپ لفظ انار کے ساتھ پہچانیں گے، باقی! دُنیا کے انار کو آخرت کے انار سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اسی طرح سے آپ کو جنت میں کھانے کے لیے بیر ملیں گے سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ: ایسی بیریاں ہوں گی جن کے کانٹے نہیں، لیکن وہ بیر اور یہ بیر بہت مختلف ہیں، وہاں آپ کو کیلا ملے گا طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ (سورۂ واقعہ) جس طرح سے یہ لفظ قرآنِ کریم میں آیا، وہ کیلا اور یہ کیلا بہت مختلف ہیں، اسی طرح سے وہاں شہد ہوگا، دودھ ہوگا، پانی ہوگا، لیکن اُن چیزوں کو دنیا کی ان چیزوں کے ساتھ کوئی نسبت نہیں، انسان چونکہ انہی لفظوں کو پہچانتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کا تعارف انہی الفاظ کے ساتھ کرایا ہے۔ اسی طرح سے میزان ہے، اور جب قرآنِ کریم میں یہ لفظ اتر رہا تھا تو اس وقت میزان یہی تھی جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں، اور یوں پکڑ کر اٹھایا جاتا ہے، اور ایک کانٹا ہوتا ہے، اور بتاتا ہے کہ کدھر جھکاؤ ہے اور کدھر نہیں ہے، بالکل وہ بھی اس کا مصداق ہے۔ لیکن آخرت کی میزان اور دنیا کی میزان آپس میں مختلف ہو سکتی ہے، اب آپ آج بھی دیکھ لیجئے، بازار میں آپ نے غور کیا ہوگا کہ میزان کتنی قسم پر ہے، ایک میزان تو وہ ہے جس کے ساتھ یہ دالیں نمک وغیرہ تولتے ہیں، ایک میزان سنارے کی ہے جس کے ساتھ وہ سونا تولتا ہے، ایک میزان ہے بڑے بڑے کانٹے جن کے ساتھ ٹرک تلتے ہیں، یہ چونگیوں کے پاس جو لگے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی تو آخر میزان ہی ہیں، اور ایک میزان ڈاکٹر کے پاس ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ آپ کا بخار تولتا ہے کہ آپ کے اندر حرارت کتنی ہے، وہ میٹر جو آپ کی حرارت اور بخار دیکھنے کے لیے ہوتا ہے وہ بھی تو ایک میزان ہے، باقی ان سائنسی مراکز میں جا کر دیکھو گے تو ہوا تولنے کی میزانیں ہیں، بارش کتنی ہوگی اُس کو تولنے کی میزانیں ہیں، دریا میں کتنا پانی گزر رہا ہے اُس کو تولنے کی میزانیں ہیں، بجلی اس تار میں سے کتنی گزر گئی اس کو تولنے کی میزان ہے، سوئی گیس اس پائپ میں سے کتنا چلا گیا اس کو تولنے کی میزان ہے، اور شہروں کے اندر یہ پانی جو گھروں میں دیا جاتا ہے پائپ لگے ہوئے ہیں تو اُس کو تولنے کی میزان ہے، میٹر لگے ہوئے ہیں، وہ دیکھ کر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ ایک مہینے کے اندر آپ نے کتنا پانی استعمال کیا ہے، وہ دیکھ کر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ اس مہینے میں آپ نے کتنی بجلی استعمال کی ہے، اور وہ اپنے میٹر کے ذریعے سے بتا دیتے ہیں کہ آج بارش کتنی ہوئی ہے، اور اپنے میٹر کے ذریعے سے بتا دیتے ہیں کہ ہوا چل رہی ہے تو اس کی کتنی رفتار ہے، اور اس ہوا کے اندر پانی کا وزن کتنا ہے، یہ ہر روز اخبار کے اندر آتا ہے نمی کا تناسب، کہ صبح کے وقت ہوا میں نمی کا تناسب اتنا تھا، اور شام کے وقت نمی کا تناسب اتنا ہے، یعنی اس ہوا کے اندر پانی کی ملاوٹ کتنی ہے، صبح کو کتنی تھی، شام کو کتنی تھی، کون سی چیز ایسی ہے جس کو انسان نے تول نہیں لیا، ہاں البتہ تولنے کے لئے میزان اور ترازو اپنی اپنی شکل کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسی طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ بھی ہمارے ایمان کو تولے گا، ہمارے اعمال کو تولے گا، ہمارے اقوال کو تولے گا،

میزان ہوگی، جو بھی اُس کی حقیقت ہے وہ اللہ بہتر جانتے ہیں، ہر چیز کے متعلق میزان اسی قسم کی ہوسکتی ہے۔ اس لیے اب کوئی اِشکال نہیں، جب بیسیوں قسم کی میزانیں آپ نے نکال لیں، اور ہر چیز کو تولنے کے لیے آپ نے اس کی شان کے مطابق میزان بنالی، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ آپ کے افعال واقوال کو تولنے کے لیے اگر اُس کے مطابق میزان بنالے تو اس میں کون سی اِشکال کی بات ہے؟

اور بعض روایات سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن اوراق پر آپ کے اعمال لکھے جائیں گے وہ اوراق تولے جائیں گے، اور اُن کا وزن اس حقیقت کے مطابق ہوگا جو اس میں لکھی ہوئی ہے، یہ بھی اللہ کی قدرت کے ساتھ ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کو ننانوے دفتر دیں گے، بڑے بڑے رجسٹر جن کے اندر اُس کے اعمال لکھے ہوئے ہوں گے، یعنی ایک کم سو، اور وہ اتنے بڑے بڑے ہوں گے کہ انسان جہاں تک نظر پھیلائے گا یوں معلوم ہوگا جیسے اس کا نامہ اعمال پھیلا ہوا ہے، اور وہ سارے ہی نامہ اعمال ایسے ہوں گے جن میں ایک نیکی نہیں ہوگی، سارے کے سارے گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے، اللہ تعالیٰ اُس کتاب کو انسان کے سامنے پھیلا دے گا، جیسے قرآنِ کریم میں آتا ہے یَلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (سورۂ اِسراء: ۱۳)، انسان اپنے نامہ اعمال کو پھیلا ہوا دیکھے گا، سامنے کھلا ہوا دیکھے گا۔ تو جس وقت وہ کھلا ہوا نامہ اعمال سامنے آئے گا، انسان نظر دوڑائے گا، تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے ٹھیک ہے؟ وہ کہے گا جی! بالکل ٹھیک ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اَظَلَمَكَ كَتَبَتِي الْحَافِظُوْنَ: میرے لکھنے والے نگہبانوں نے تیرے اوپر کوئی زیادتی تو نہیں کی؟ کہ تُو نے تھوڑا کیا ہو اور انہوں نے زیادہ لکھ دیا ہو، یا تُو نے نہ کیا ہو اور انہوں نے لکھ دیا ہو۔ وہ کہے گا نہیں جی! بالکل نہیں، جو کچھ لکھا گیا بالکل ٹھیک لکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، کہ تیری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے، تو وہاں حدیث شریف میں لفظ آتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ ایک بطاقہ یعنی کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا اُسے دیں گے، جس پر لکھا ہوگا ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ''، جو اس شخص نے کلمہ پڑھا تھا، اور وہ ٹکڑا دے کر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اُحْضُرْ وَزْنَكَ! اپنے وزن کے پاس جاؤ تول کے پاس جاؤ، اسے تلوا کر لاؤ۔ اب کہاں ننانوے دفتر اتنے بڑے بڑے پھیلے ہوئے کہ جہاں تک نظر جاتی ہے، اور وہ سارے ہی معصیت کے ساتھ بھرے ہوئے، اور کہاں وہ ایک ٹکڑا جس پر ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' لکھا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ جا کر وزن کروا کر لاؤ کہ وزن کس میں زیادہ ہے؟ وہ وہیں اپنے نتیجے سے آگاہ ہوگا اپنے خیال کے مطابق، کہے گا یا اللہ! کیا ضرورت ہے وزن کروانے کی؟ کہاں یہ ایک ٹکڑا، کہاں یہ ننانوے دفتر؟ میں ان کو تلوا کر کیا کروں گا؟ جس طرح سے انسان پر پہلے ہی مایوسی طاری ہوجاتی ہے، کہ نتیجہ تو واضح ہے، اب ایک پلڑے میں جا کر ننانوے رجسٹر رکھ دیے جائیں، اور ایک پلڑے میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا جائے۔ وہ کہے گا جی! کیا کروں، یہ ایک بطاقہ ہے یہ ان کا کیا مقابلہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ نہیں ہمارے قاعدے کے مطابق جاؤ، جا کر وزن کروا کر لاؤ۔ کہتے ہیں وہ جائے گا، اور میزان کے ایک پلڑے کے اندر اپنے وہ ننانوے دفتر رکھے گا، اور دوسرے پلڑے کے اندر کاغذ کا وہ ٹکڑا رکھے گا، کاغذ کے ٹکڑے والا پلڑا جھک جائے گا، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ لَا یَثْقُلُ مَعَ اسْمِ اللہِ شَیْءٌ: اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز وزنی نہیں ہوسکتی، جس ٹکڑے پر ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' لکھا ہوا تھا وہ ننانوے دفتر کے مقابلے میں وزنی ہوجائے گا، اور وہ جنتی قرار دے دیا

جائے گا۔[1] تو غالباً یہ وہ شخص ہوگا جس نے زندگی بھر تو گناہ کیے، کفر کیا، شرک کیا، معصیت کی، لیکن آخر وقت میں اس کو کلمہ نصیب ہوگیا۔ تو آپ جانتے ہیں کہ جس کو آخر وقت میں کلمہ نصیب ہوجائے تو زندگی کے سارے گناہ ختم ہوجاتے ہیں۔ تو مقابلہ کرتے وقت اِس ایمان کی برکت سے اس کے سارے سارے معاصی معاف کردیے جائیں گے اور وہ شخص نجات پا جائے گا۔ لیکن اس روایت سے اتنا معلوم ہوگیا کہ کاغذ کے ٹکڑے میں وزن اُس کے اندر جو حقیقت درج ہے اس کے اعتبار سے ہوگا، یہ نہیں کہ ایک ہی وزن ہے، چاہے اُس پر نیکی لکھی ہوئی ہو تو بھی اُس کا وہی وزن، بُرائی لکھی ہوئی ہو تو بھی اُس کا وہی وزن۔ جتنا نیکی میں خلوص زیادہ ہوگا اتنا اس کے اندر وزن زیادہ نمایاں ہوگا، اور جتنا اس میں خلوص کم ہوگا اتنا اس میں وزن کم نمایاں ہوگا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ یہ سارے کے سارے معاملات طے پا جائیں گے۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اشخاص کو ہی تول لیا جائے، بعض روایت سے یوں بھی معلوم ہوتا ہے، کہ نیکی بدی کے اعتبار سے اشخاص کے وزن میں بھی فرق پڑے گا۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ہے کہ جس طرح سے چاہے وہ انسانوں کے درمیان میں فیصلے کرے، اور اس فیصلے کے ساتھ حق اور باطل، مؤمن اور کافر، ناجی اور معذَّب، یہ سارے کے سارے جدا ہوجائیں گے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ الْحَقُّ اس دِن وزن حق ہے، اس دِن تول حق ہے، یا وزنِ حقیقی اس دِن ثابت ہے۔ اور یہ ترہیب ہے آخرت کے ذکر کرنے کے ساتھ، کہ جو کچھ تم کرتے ہو قیامت کے دِن سارے کا سارا تولا جائے گا، اور یہ تولنا برحق ہے، جس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں، تو اپنی زندگی گزارتے ہوئے یہ بات بھی مستحضر رکھا کرو کہ تم بھی تولے جاؤ گے، تمہارے اقوال بھی تولے جائیں گے، تمہارے افعال بھی تولے جائیں گے۔

وزنِ اَعمال کا نتیجہ

اور اس تولنے کے نتیجے میں فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ پھر جس کے تول بوجھل ہوجائیں گے یعنی نیکی کے تول، جس کے ترازو بوجھل ہوجائیں گے یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔ تو یہاں موازین سے نیکی کے موازین مراد ہیں، جس کی نیکی کے وزن زیادہ ہوگئے وہ فلاح پانے والے ہیں، کامیاب ہونے والے ہیں، وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ: اور جس کے تول ہلکے ہوگئے یعنی نیکیاں اُس کے پلڑے میں نہ ہوئیں، یا ہوئیں تو گناہوں کے مقابلے میں ہلکی ہوگئیں فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ تو پھر یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا۔ خسارے میں پڑنے والے، ٹوٹے میں پڑنے والے، نقصان میں پڑنے والے وہی لوگ ہیں کہ جن کی نیکیوں کے پلڑے قیامت میں جا کر ہلکے ہوئے، سب سے زیادہ خسارے میں یہ لوگ ہیں۔

قیامت کے دِن مسکین کون ہوگا؟

جیسے ایک حدیث میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے پوچھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے، کہ تمہارے اندر مسکین کون ہے، تم مسکین کس کو سمجھتے ہوں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یارسول اللہ! مسکین وہ ہے جس کے پاس درہم دینار نہ ہوں۔ جیسے ہم آج کل مسکین اُسے کہتے ہیں جس کے پاس سونا نہیں، چاندی نہیں، پیسے نہیں، روپے نہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ مسکین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

(۱) سنن ترمذی ۲/ ۹۲ باب ما جاء فی المیمن یموت/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۸۶ باب الحساب فصل ثانی عن ابن عمرؓ

میری اُمت میں سے حقیقی مسکین وہ ہوگا کہ جو قیامت کے دن آئے گا، جس وقت آئے گا تو اس کے پاس نیکیوں کے ڈھیر ہوں گے، نماز ہوگی، روزہ ہوگا، حج ہوگا، زکوۃ ہوگی، تلاوت ہوگی، تسبیحات ہوں گی، بہت ساری نیکیاں وہ لے کر آئے گا، لیکن جس وقت وہ نیکیاں لے کر آئے گا تو اُس کے مقابلے میں دعوے دار بھی آجائیں گے، کوئی کہے گا کہ یا اللہ! اس نے مجھے بے وجہ گالی دی تھی، کوئی کہے گا یا اللہ! اس نے مجھے بے عزت کیا تھا، میری عزت کو نقصان پہنچایا تھا، کوئی کہے گا یا اللہ! اس نے میرے پیسے دبا لیے تھے، اس طرح سے دعوے دار آتے چلے جائیں گے، کسی کو اُس نے مالی نقصان پہنچایا ہوگا، کسی کی عزت کو نقصان پہنچایا ہوگا، کسی کو بے جا گالی دی ہوگی، کسی کو بے جا مارا ہوگا، یہ دعویدار بھی آتے چلے جائیں گے، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس دن چونکہ روپیہ پیسہ تو ہوگا نہیں، تو وہاں فیصلہ جو اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے تو ظالم کی نیکیاں لے کر مظلوم کو دی جائیں گی، جو آتا جائے گا دعویٰ ثابت ہوتا چلا جائے گا تو اِس کی نیکیوں میں سے اٹھا کر اُس کو دیتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ اُس کی ساری کی ساری نیکیاں ختم ہو جائیں گی، جب نیکیاں ساری کی ساری ختم ہو جائیں گی اور ابھی دعوے دار باقی ہوں گے، تو پھر دعویداروں کے گناہ لے کر اس پر ڈالنا شروع کر دیں گے، چونکہ نیکیاں تو دینے کے لیے ہوں گی نہیں، پھر دعویداروں کے گناہ لے کر اس پر ڈالنا شروع کر دیں گے، حتیٰ کہ جس وقت فیصلہ ہوگا، سارے دعویداروں کے دعوے ختم ہوں گے تو اِس شخص کے پاس اسی طرح سے گناہوں کے ڈھیر لگ جائیں گے، جس طرح سے پہلے یہ نیکیوں کے ڈھیر لے کر گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ حقیقت میں مسکین ہے۔[1] یہ مسکین اس لیے کہ ایسے موقع پر لٹ گیا کہ اب اس کو سنبھلنے کا موقع بھی کوئی نہیں، یعنی دنیا کے اندر اگر کوئی شخص لٹ جائے، ڈاکو اسے لوٹ کر لے جائیں، کسی وجہ سے اُس کا سرمایہ ختم ہو جائے تو پھر کمانے کا موقع ہوتا ہے، لیکن یہ شخص ایسے وقت میں لٹ گیا کہ جب سنبھلنے کا موقع کوئی نہیں، زندگی بھر کی کمائی بھی دے بیٹھا اور دوسروں کے گناہ بھی اپنے سر ڈلوا لیے، سب سے بڑھ کر مسکین یہ ہے۔ تو یہ لوگ ہیں خسارے میں پڑنے والے جن کی نیکیوں کے ترازو ہلکے ہو جائیں گے، یا تو اُن کے پاس نیکیاں ہوں گی نہیں، یا نیکیاں بھی تھیں لیکن اُس کے مقابلے میں اس قسم کا کردار اختیار کیا ہوا تھا کہ نیکیاں اس وقت میں لٹ گئیں۔ تو یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا۔

قرآنِ کریم ایک انقلابی کتاب

یہ باتیں سمجھنے کی ہیں، دل اور دماغ میں حاضر رکھنے کی ہیں، اس لیے ابتداء، ابتداء میں ان باتوں کی وضاحت آپ کے سامنے کر رہا ہوں، کہ اگر کوئی سنبھلنا چاہے تو ایک ایک بات اس کی زندگی کا رُخ بدلنے کے لیے کافی ہے، یہی تاثیر ہے قرآنِ کریم کی جس وجہ سے اس کو انقلابی کتاب کہتے ہیں، کہ انسانوں کی حالت بدلنے میں جتنا مؤثر کردار اس نے ادا کیا ہے کوئی کتاب انسان کے اندر اتنا اثر پیدا نہیں کر سکی، اس کا ایک ایک جملہ ایسا ہے جو انسان کی زندگی کا رُخ بدل کر رکھ دیتا ہے، وہ یہی جملے ہیں جو آپ کے سامنے آرہے ہیں۔ ان حقیقتوں کو اگر آپ اپنے ذہن میں بٹھائیں گے تو زندگی کا رُخ بدل جائے گا، بُرائی سے نیکی کی طرف

(۱) مسلم ۲/۳۲۰، باب تحریم الظلم/ مشکوۃ ۲/۴۳۵، باب الظلم، فصل اول۔ ولفظ الحدیث: أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ قَالُوا الْمُفْلِسُ فِينَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ...الخ۔

رُجحان ہو جائے گا، ایک بُرے انسان میں لمحوں کے اندر نیکی کے جذبات ابھر سکتے ہیں، بشرطیکہ ان حقائق کو اپنے دل کے اندر بٹھانے کی کوشش کرے۔ ’’یہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا۔‘‘

خسارے میں پڑنے کی وجہ

بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ: اور خسارے میں پڑنے کی وجہ یہ تھی، کہ یہ لوگ ہماری آیات کا حق ادا نہیں کرتے تھے، ہماری آیات پر ظلم کرتے تھے، اور ظلم کا معنی ہے حق تلفی، ہماری باتیں جو اُن کے سامنے آتی تھیں اُن کا حق نہیں پہچانتے تھے، اگر اُن کو حق پہچانتے اور اُن کے مطابق عمل کرتے تو آج خسارے میں نہ ہوتے۔ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ: ظَلَمَ کا صلہ باء نہیں آیا کرتا، اور یہاں صلہ باء آ گیا، اس لیے یہاں تضمین ہو جائے گی، تضمین کا معنی ہوتا ہے کہ ایک فعل کے ضمن میں دوسرا معنی ڈال دیا جائے، تو یہاں ظلم جحود کے معنی کو متضمن ہے۔

تو یہاں تک جو مضمون آپ کے سامنے آیا، یہ ہے آخرت کے احوال ذکر کرنے کے بعد ترہیب، ڈرانا۔ تا کہ آخرت کا تصور کر کے اور ان باتوں کو سوچ کر لوگ برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کی طرف آئیں، تو یہ آخرت کا ذکر کرنے کے ساتھ ترہیب ہے۔

تمام اسبابِ معیشت اللہ نے زمین سے پیدا کیے ہیں

اگلے جملے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جو انعامات ہوئے وہ احسانات جتلائے جا رہے ہیں، کیونکہ احسان بھی ایک چیز ہے کہ جو محسن کا فرمانبردار بناتا ہے، جب آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ پر فلاں احسان کیا، فلاں احسان کیا، اگر طبیعت کے اندر شرافت موجود ہو تو پھر انسان محسن کی رعایت رکھا کرتا ہے، اور محسن کے سامنے جھکتا ہے، اُس کی اطاعت کرتا ہے۔ پہلے مادی احسان ہے وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ: البتہ تحقیق ہم نے زمین میں تمہیں ٹھکانہ دیا وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ: اور تمہارے لیے اس زمین میں اسبابِ زیست پیدا کیے۔ معایش کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ معایش یہ جمع ہے معیشت کی، یہ مصدر میمی ہے عَاشَ يَعِيْشُ سے، عَاشَ يَعِيْشُ: زندگی گزارنا۔ تو یہاں معایش سے مراد ہے اسبابِ معیشت، زندگی گزارنے کے اسباب، یعنی ہم نے زمین میں تمہیں ٹھہرا دیا، ٹھہرانے کے بعد ایسے نہیں چھوڑ دیا کہ نہ تمہیں کچھ کھانے کو ملے، نہ پہننے کو ملے، نہ رہنے کو کوئی ٹھکانا ملے، ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں تمہارے روٹی، کپڑے مکان کا پورا انتظام کیا ہے۔ جو چیز آپ کو کھانے کے لیے چاہیے تھی، اللہ تعالیٰ نے یہاں زمین میں وہ بھی پیدا کی، جو آپ کو علاج معالجے کے لیے چاہیے تھی اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر وہ بھی پیدا کی، راحت، آرام، آرائش، زیبائش کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے وہ ساری کی ساری پیدا فرمائیں۔ آپ غور فرمائیں گے تو زمین اللہ تعالیٰ کا ایک اتنا بڑا گودام ہے کہ بنی آدم اس میں سے اپنی ضرورت کی چیزیں نکال رہے ہیں اور استعمال کر رہے ہیں، کوئی چیز بتاؤ جو آپ کی زندگی کے استعمال میں آ رہی ہو اور وہ زمین سے نہ نکلتی ہو، یہ گھڑی ہے یہ بھی زمین سے نکلی، یہ عینک ہے یہ بھی زمین سے نکلی، کوئی چیز ایسی نہیں جو براہِ راست آسمان سے اتری ہو، سب کچھ یہیں سے نکلتا ہے۔ بس نکالنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہیے اور نکالنے کی ہمت ہونی چاہیے، اور اگر آپ ہی ہاتھ منہ توڑ کر بیٹھ جائیں کوئی کام ہی نہ کریں، تو اس زمین

میں سوائے گرد اور مٹی کے آپ کو کچھ نہیں ملے گا، یہاں باہر سارا دن منہ کھول کر بیٹھ جاؤ تو مٹی کے ساتھ ہی آپ کا منہ بھر جائے گا، اس سے زائد آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی، نہ مٹھائی ملے، نہ کوئی لذیذ پھل ملے، منہ کھول کر بیٹھ جائیں گے تو مٹی اڑے گی اور آپ کے منہ کو بھر دے گی، سست آدمیوں کے لیے یہاں سوائے مٹی کے کچھ نہیں ہے، کاہل آدمی، سست آدمی، بدعمل آدمی، جاہل آدمی کہ جو جانتا بھی کچھ نہیں، اور کرتا بھی کچھ نہیں اس کے پاس زمین میں سے سوائے کرکری مٹی کے اس کے پلے کچھ نہیں ہے۔ لیکن جتنا جتنا آپ علم حاصل کرتے چلے جائیں گے، جتنا جتنا عملی زندگی اختیار کرتے چلے جائیں گے، تو دنیا کی کونسی نعمت ہے جو زمین میں موجود نہیں، اپنے ہنر کے ساتھ اور اپنی ہمت کے ساتھ نکالو، سونا اسی میں، چاندی اسی میں، اور آپ کی جتنی بھی ضروریاتِ زندگی ہیں ساری کے ساری اسی میں ہیں، بس اِسی کو چھانتے جاؤ اور اس میں سے نکالتے جاؤ، اور پھر تمہیں اللہ تعالیٰ کے انعام کا احساس ہوگا، کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے ہماری ضروریات اس زمین کے اندر کس قدر مہیا کی ہیں۔

اَسبابِ معیشت کا غلط اِستعمال ہلاکت کا باعث ہے

یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ کو ایک علم کے حامل قرار دے کر، جو حقیقت کے اعتبار سے جہل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے اندر جو نعمتیں رکھی تھیں، اس لیے رکھی تھیں کہ انسان راحت اور آرام کے ساتھ زندگی گزارے، اور پھر اپنے مولیٰ اور محسن کو یاد کرے اور اُس کی اطاعت کرے، اسی کی غلط ترکیبیں دے دے کر لوگوں نے انسانوں کی ہلاکت کے اسباب بھی اسی میں سے نکال لیے۔ انسانوں کو مارنے کے لیے آج جو کچھ آپ کے سامنے عجیب وغریب قسم کے بم اور دوسری چیزیں ہیں، وہ بھی تو زمین سے نکلی ہیں، لیکن یہ انسان کی جہالت ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں علم پر چل رہا ہوں، یہ جہالت ہے کہ اسی زمین کو جس میں اللہ تعالیٰ نے اسبابِ معیشت رکھے تھے، انہی اسباب معیشت کی غلط ترکیب دے کر اپنے لیے ہلاکت کا سامان بنالیا، یہ غلط استعمال کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو زمین کو انسان کے لیے راحت کا باعث بنایا ہے، اور اس میں انسان کی راحت کے اسباب پورے کے پورے رکھے ہیں۔ یہی لوہا ہے جس کو آپ اپنی زندگی میں استعمال کرتے ہیں، آپ کے کتنے کام ہیں جو لوہے کے ذریعے سے ہوتے ہیں، اگر لوہا نہ ہوتا تو آپ کو کپڑے سینے کے لیے سوئی نہ ملتی، یعنی چھوٹے سے چھوٹے کام سے لے کر بڑے سے بڑے کام تک دیکھو! لوہا کتنا استعمال ہو رہا ہے، وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (سورۂ حدید: ۲۵) ہم نے لوہا اُتارا جس میں لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے کہ اس میں بَاْسٌ شَدِيْدٌ بھی ہے، کہ اسی سے آپ تلوار بناتے ہیں، اسی سے آپ نیزہ بناتے ہیں، اور اسی سے آپ دوسری چیزیں بناتے ہیں، لیکن وہ ہے بوقت ضرورت، اپنے دشمن کو دفع کرنے کے لیے، کوئی شیر آپ پر حملہ آور ہو گیا، کوئی دوسری چیز آپ پر حملہ آور ہوگئی، تو دفاع کے اندر بھی لوہا استعمال ہوتا ہے، اب یہ علیحدہ بات ہے کہ انسانوں نے انسان کو ہلاک کرنے کے لیے سب سے زیادہ استعمال اسی کا شروع کر دیا، بہر حال یہ اپنے اپنے فہم کی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر ہر قسم کے اسبابِ زیست اس زمین کے اندر رکھے ہیں، چاہے آپ لوگوں نے اسبابِ ہلاکت بھی اس کے اندر سے بے شمار نکال لیے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں۔

نعمتوں کی قدردانی کیسے ہوگی؟

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ: یہ ایک قسم کا شکوہ اور شکایت ہے کہ اللہ کی طرف سے تو اتنے انعامات ہیں، لیکن تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ شکر کا معنی قدردانی، تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدردانی کم کرتے ہو۔ نعمت کی قدردانی کیا ہے؟ نعمت کی قدردانی یہ ہوتی ہے کہ یہ احساس ہو کہ ہمیں ہمارے منعم نے اور ہمارے محسن نے دی ہے، اس تصور کے ساتھ ہم اس کو استعمال کریں، اور پھر ہمارے دل دماغ میں اس دینے والے کی عظمت ہو، اور اس دینے والے کی فرمانبرداری ہو، یہ ہے شکرگزاری۔ نسبت اللہ کی طرف ہو، یہ نہ ہو کہ ہم نے اپنے کمال سے پیدا کرلی، یہ خیال کہ مجھے یہ چیز میرے کمال سے مل گئی یہ شکرگزاری کے منافی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا اللہ! تیری نعمتیں تو ایسی ہیں جو شمار میں نہیں آسکتیں، اتنی زیادہ نعمتیں ہیں، خود قرآنِ کریم میں آئے گا اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (سورۂ ابراہیم: ۳۴، سورۂ نحل: ۱۸) کہ اگر تم اللہ کے احسانات کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکو گے۔ تو ان ساری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور اگر کسی نعمت پر شکر ادا کرنے کی توفیق ہوجائے تو وہ مستقل تیری نعمت ہے، اس کا آگے کس طرح سے شکر ادا کیا جائے؟ یہ موسیٰ علیہ السلام کا سوال ہے اللہ تعالیٰ سے، کہ یا اللہ! اوّل تو تیری نعمتیں بے شمار، اُن کا شکر کس طرح سے ادا کریں؟، اور اگر کسی نعمت پر شکر ادا کرنے کا موقع مل ہی جائے تو یہ مستقل تیری نعمت ہے کہ شکر ادا کرنے کا موقع مل گیا، تو کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کے ساتھ انسان اس ذمہ داری سے نکل جائے کہ واقعی میں نے اللہ کا شکر ادا کردیا؟ اول تو نعمتیں ہی شمار میں نہیں ہیں، جیسے گلستاں کی بسم اللہ یہاں سے ہوتی ہے، ابتدا سے، جہاں ہمارے شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی ہے، وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ''ہر نفسے کہ فرو میرود مُمِدِّ حیاتست، وچوں برمی آید مفرّحِ ذات، پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است۔'' شیخ کہتے ہیں کہ جب ہم سانس لیتے ہیں تو سانس کا اندر کو جانا ہماری زندگی بڑھاتا ہے، سانس کا باہر کو آنا ہمارے لیے راحت کا باعث ہے، تو ایک سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں، ودر ہر نعمت شکر واجب اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔ تو ایک سانس میں دو دفعہ الحمد للہ کہو تو صرف ایک سانس کا شکر ادا ہوتا ہے اور باقی دوسرے کام کیا ہوئے؟ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا اللہ! تیرا شکر ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ تیری اتنی نعمتوں کا شکر کیسے ادا کریں، اور اگر کسی نعمت کا شکر ادا ہوجائے تو وہ مستقل تیری نعمت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ موسیٰ! بس یہ خیال رکھنا کہ جو کچھ مل رہا ہے میری طرف سے مل رہا ہے، میرے شکر ادا کرنے کے لیے کافی ہے۔[1] یعنی یہ نہ تمہارے دل میں خیال آئے کہ ہم نے اپنے ہنر سے کمالیا، اپنی قابلیت سے حاصل کرلیا، ہر وقت تمہارے دھیان میں یہ ہو کہ جو کچھ ملتا ہے اللہ کی طرف سے ملتا ہے، ہمارا اس میں کوئی کمال نہیں، یہ اللہ کا احسان ہے، یہ جذبہ اگر انسان کے دل کے اندر رہے تو سمجھو کہ انسان شکرگزار ہے۔ لیکن یہ جذبہ بنیاد ہے اگلی نیکی کی، کہ جب ہر وقت آپ کو احساس یہ ہوگا کہ کھانے کو وہ دیتا ہے، پینے کو

(۱) مظہری وخازن، سورۂ بقرہ آیت ۵۲ کے تحت۔ نوٹ: بعض تفاسیر میں یہ بات داؤد علیہ السلام کی طرف بھی منسوب ہے، ابن کثیر، سورۂ ابراہیم آیت ۳۴، وغیرہ۔

وہ دیتا ہے، پہننے کو وہ دیتا ہے، صحت ہمیں اس نے دی، مال ہمیں اس نے دیا، دولت ہمیں اس نے دی، جائیداد اس نے دی، دُکان اس نے دی، جب یہ تصور آپ کے دل میں رہے گا تو "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ" کہ انسان احسان کا بندہ ہے، جب اس کے تصور میں یہ ہوتا ہے کہ یہ انعامات مجھے فلاں نے دیے ہیں تو پھر اطاعت اور عبادت اور محبت عظمت یہ ساری چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اور اس کے ساتھ انسان کی زندگی ایک صالح اور شکر گزار بندے کی زندگی بن جاتی ہے۔ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ: تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے تمہیں، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں کو کہا آدم کو
لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪
سجدہ کرو، پھر انہوں نے سجدہ کر دیا سوائے ابلیس کے، ابلیس سجدہ کرنے والوں سے نہ ہوا⑪
قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ
اللہ تعالیٰ نے فرمایا کس چیز نے روکا تجھے سجدہ کرنے سے جب میں نے تجھے حکم دیا تھا، ابلیس نے کہا میں اس آدم سے بہتر ہوں،
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ⑫ قَالَ فَاهْبِطْ
پیدا کیا تُو نے مجھے آگ سے اور پیدا کیا اس آدم کو مٹی سے ⑫ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نیچے اُتر جا
مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ
آسمان سے، پس نہیں ہے تیرے لیے کہ تُو تکبر کرے آسمان میں، پس تُو نکل جا، بے شک تُو
الصّٰغِرِيْنَ ⑬ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ⑭ قَالَ اِنَّكَ
ذلیلوں میں سے ہے⑬ ابلیس نے کہا مجھے مہلت دے دے اس دن تک جس دن میں لوگ اُٹھائے جائیں گے⑭ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک تُو
مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ⑮ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے⑮ ابلیس نے کہا پس تیرے مجھ کو گمراہ کر دینے کی وجہ سے البتہ ضرور بیٹھوں گا میں ان کے لئے تیرے
الْمُسْتَقِيْمَ ۙ⑯ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
سیدھے راستے پر⑯ پھر البتہ ضرور آؤں گا میں ان کے پاس اُن کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے

وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾

اور اُن کی دائیں طرف سے اور اُن کی بائیں جانب سے، اور تُو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا ﴿۱۷﴾

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تُو نکل جا آسمان سے اس حال میں کہ تُو بُرائی بیان کیا ہوا ہے اور دھتکارا ہوا ہے، جو شخص تیرے پیچھے لگے گا ان میں سے

لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

البتہ ضرور بھر دُوں گا میں جہنم کو تم سب سے ﴿۱۸﴾ اے آدم! تُو اور تیری بیوی دونوں ٹھہرو جنت میں

فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا

پھر تم دونوں کھاؤ جہاں سے تم چاہو، اس متعین درخت کے قریب نہ جانا، پھر ہو جاؤ گے تم

مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا

اپنا نقصان کرنے والوں میں سے ﴿۱۹﴾ وسوسہ ڈالا ان دونوں کے لیے شیطان نے تاکہ ظاہر کردے وہ ان دونوں کے لیے

وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ

وہ چیز جو چھپائی گئی تھی اُن دونوں سے اُن کی شرم گاہوں سے، اور اس نے کہا نہیں منع کیا تم دونوں کو تمہارے رَبّ نے اس

الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

درخت سے مگر اس بات کو ناپسند کرنے کی وجہ سے کہ تم فرشتے بن جاؤ یا ہو جاؤ تم ہمیشہ رہنے والوں میں سے ﴿۲۰﴾

وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا

ابلیس نے ان دونوں کے سامنے باربار قسم کھائی کہ بیشک میں تمہارے لیے خیرخواہوں میں سے ہوں ﴿۲۱﴾ ان دونوں کو مائل کرلیا اس نے دھوکے

ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا

کے ساتھ، جب ان دونوں نے چکھا اس درخت کو تو ظاہر ہوگئیں ان کے لئے ان کی شرمگاہیں، وہ دونوں جوڑنے لگ گئے اپنے اُوپر

مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا

جنت کے پتے، آواز دی ان دونوں کو ان کے رَبّ نے، کیا میں نے تم دونوں کو اس

الشَّجَرَةِ	وَاَقُلْ	لَّكُمَآ	اِنَّ	الشَّيْطٰنَ	لَكُمَا	عَدُوٌّ	مُّبِيْنٌ ۝۲۲	قَالَا

درخت سے روکا نہیں تھا؟ اور تم دونوں سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمہارے لیے صریح دشمن ہے؟ ⑳ وہ دونوں کہنے لگے

رَبَّنَا	ظَلَمْنَآ	اَنْفُسَنَا	وَاِنْ	لَّمْ	تَغْفِرْلَنَا	وَتَرْحَمْنَا	لَنَكُوْنَنَّ	مِنَ

اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنے آپ پر، اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور تو ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں

الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳	قَالَ	اهْبِطُوْا	بَعْضُكُمْ	لِبَعْضٍ	عَدُوٌّ	وَلَكُمْ	فِي

میں سے ہو جائیں گے ⑳ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُتر جاؤ سارے، تمہارا بعض بعض کے لیے دشمن ہوگا، اور تمہارے لیے

الْاَرْضِ	مُسْتَقَرٌّ	وَّمَتَاعٌ	اِلٰى	حِيْنٍ ۝۲۴	قَالَ	فِيْهَا	تَحْيَوْنَ

زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور فائدہ اُٹھانا ہے ایک وقت تک ⑳ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی زمین میں تم زندگی گزارو گے

وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝۲۵

اور اسی کے اندر تمہیں موت آئے گی اور اسی زمین سے تم نکال لیے جاؤ گے ⑳

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ـ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ: لام بھی تاکید کا اور قد بھی تاکید کے لئے، ہم اپنے لفظی ترجمے کے تحت یوں کہہ دیا کرتے ہیں البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے تمہیں، ''البتہ تحقیق'' یہ لفظ کلام میں تاکید کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، اور یہ ''البتہ تحقیق'' کا لفظ نہ بولا جائے جیسے کہ حضرت شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ کرتے وقت یوں ہی کہا ''اور ہم نے تم کو پیدا کیا''، تو بات تو بھی صاف ہے، ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ: صَوَّرَ یہ تصویر سے ہے، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی، ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ: پھر کہا ہم نے فرشتوں کو، ہم نے فرشتوں کو کہا (فرشتوں کے لئے کہا یوں ترجمہ نہیں کرنا) ہم نے فرشتوں کو کہا، اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: آدم کو سجدہ کرو، فَسَجَدُوْٓا: پھر انہوں نے سجدہ کر دیا، اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سوائے ابلیس کے، سوائے ابلیس کے اُن سب نے سجدہ کر دیا، لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ: لَمْ يَكُنْ کی ضمیر ابلیس کی طرف لوٹ گئی، ابلیس سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا، قَالَ مَا مَنَعَكَ: قَالَ کا فاعل اللہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ: کس چیز نے روکا تجھے، اَلَّا تَسْجُدَ میں لا زائدہ ہے، مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ، جس طرح سے کہ سورۂ ص میں لفظ آئے گا: ''اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ'' ...... مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ: اَنْ نے آگے مابعد والے فعل کو مصدر کی تاویل میں کر دیا، اور مفہوم نکل آئے گا: مَا مَنَعَكَ مِنْ سُجُوْدِكَ اِذْ اَمَرْتُكَ، اَنْ مابعد میں مضارع کو مصدر کی تاویل میں کر دیا کرتا ہے، تو معنی ہو گیا ''تجھے تیرے سجدہ کرنے سے کس نے روکا، کس چیز نے روکا تجھے سجدہ کرنے سے'' اِذْ اَمَرْتُكَ: جب میں نے تجھے حکم دیا تھا، قَالَ: ابلیس نے کہا

اَنَاخَیْرٌمِّنْہُ: میں اس آدم سے بہتر ہوں، خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ: پیدا کیا تو نے مجھے آگ سے وَخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ: اور پیدا کیا اس آدم کو مٹی سے، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فَاھْبِطْ مِنْھَا: ھَبَطَ ھُبُوْط: اوپر سے نیچے اترنا، مِنْھَا کی ضمیر آسمان کی طرف یا جنت کی طرف جا رہی ہے،'' نیچے اتر جا جنت سے، یا، نیچے اتر جا آسمان سے'' فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْھَا: پس نہیں ہے تیرے لیے کہ تو بڑا بنے اس آسمان میں، تکبر کرے تو آسمان میں، تکبر کہتے ہیں بہ تکلّف بڑا بننا، یعنی انسان بڑا ہوتا نہیں لیکن اکڑ اکڑ کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرتا ہے،'' نہیں ہے تیرے لیے کہ تو تکبر کرے آسمان میں'' فَاخْرُجْ: پس تو نکل جا، اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ: بیشک تو ذلیلوں میں سے ہے، صاغرین یہ صاغر کی جمع ہے اور یہ صَغَار سے لیا گیا ہے، صغار ذِلّت کو کہتے ہیں،'' تو ذلیلوں میں سے ہے'' قَالَ: ابلیس نے کہا اَنْظِرْنِیْ: مجھے مہلت دے دے، اِنظار: مہلت دینا، مجھے مہلت دے دے اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ: اس دِن تک جس دِن میں لوگ اٹھائے جائیں گے یعنی قیامت کا دن، قیامت کے دِن جس دِن لوگ اٹھائے جائیں گے اس دِن تک تو مجھے مہلت دے دے، قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیشک تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے، یعنی تجھے مہلت مل گئی، مُنظَرِین: مہلت دیے ہوئے،'' تو ان لوگوں میں سے ہے جو مہلت دیے گئے ہیں'' قَالَ: ابلیس نے کہا، فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ: غَوِیَ: گمراہ ہونا، اَغْوٰی: گمراہ کرنا، یہ جو لفظ آپ بولا کرتے ہیں'' اِغوا کر لی'' یہ'' اِغوا'' کا لفظ اسی سے لیا ہوا ہے،'' اغواء'' کا معنی ہوتا ہے بہکا کر کسی کو غلط راستے پہ ڈال دینا، یہ'' اغواء'' کا لفظ اسی سے ہے، یہ مَا اَغْوَیْتَنِیْ میں'' مَا'' مصدریہ ہے،'' تیرے مجھ کو گمراہ کر دینے کے سبب سے''، مَااَغْوَیْتَ، تُو نے مجھے گمراہ کیا، تیرا مجھ کو گمراہ کرنا، اس کی وجہ سے، باء سببیہ ہے،'' پس تیرے مجھ کو گمراہ کر دینے کی وجہ سے''، لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ: البتہ ضرور بیٹھوں گا میں، (لَھُمْ کی ضمیر بنی آدم کی طرف لوٹ رہی ہے آدم اور آدم کی اولاد کے لئے) البتہ ضرور بیٹھوں گا میں ان کے لئے تیرے سیدھے راستے پر، تو بِمَا اَغْوَیْتَ میں گویا کہ اس پھسلنے کی ذمہ داری اس نے اللہ تعالیٰ پہ ڈال دی، تُو نے مجھے گمراہ کر دیا، تُو نے مجھے بہکایا، تو اس کا بدلہ میں بنی آدم سے لوں گا،'' بیٹھوں گا میں اِن کے لئے تیرے سیدھے راستے پر'' اَلْمُسْتَقِیْمَ یہ صراط کی صفت ہے، ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ: پھر البتہ ضرور آؤں گا میں ان بنی آدم کے پاس، یہاں آنا بطور حملہ کرنے کے ہے، اِغواء کرنے کے لئے،'' پھر البتہ ضرور آؤں گا میں ان کے پاس'' مِّنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ: ان کے سامنے سے یعنی ہاتھوں کے سامنے سے، وَمِنْ خَلْفِھِمْ: اور ان کے پیچھے سے، وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ: اَیمان یمین کی جمع، اور ان کی دائیں طرف سے، وَعَنْ شَمَآئِلِھِمْ: اور ان کی بائیں جانب سے، یہ چاروں طرفیں آ گئیں، آگے سے پیچھے سے دائیں طرف سے بائیں طرف سے میں ان پر حملہ آور ہوں گا، میں ان کے پاس آؤں گا، وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ: اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا، قَالَ اخْرُجْ مِنْھَا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو نکل جا آسمان سے، مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا: مذءوم یہ اسم مفعول کا صیغہ آ گیا، ذَئم سے، ذَئم بھی عیب لگانے کو کہتے ہیں، مدحور اسم مفعول کا صیغہ آ گیا دَحَرَ سے، دَحَرَ کا معنی ہوتا ہے کسی کو دھتکار کر نکال دینا،'' نکل جا یہاں سے اس حال میں کہ تو برائی بیان کیا ہوا ہے اور دھتکارا ہوا ہے، پھٹکارا ہوا ہے'' لَمَنْ تَبِعَکَ: جو شخص تیرے پیچھے لگے گا، مِنْھُمْ: ان بنی آدم میں سے،'' ان بنی آدم میں سے جو شخص تیرے پیچھے لگے گا'' لَاَمْلَئَنَّ جَھَنَّمَ مِنْکُمْ اَجْمَعِیْنَ: البتہ ضرور بھر دوں گا میں جہنم کو تم سب سے، تم بھی

اور تمہارے تبعین بھی ساتھ ہی سب کو ملا کر جہنم کو بھر دوں گا، وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ: وَزَوْجُكَ کا عطف اسْكُنْ کے فاعل پر ہے، اور یہ نحو کے اندر آپ نے قاعدہ پڑھا ہوگا کہ ضمیر مرفوع متصل پر عطف جس وقت کرنا ہو تو اس کو منفصل کے ساتھ مؤکد کر کے عطف کیا جاتا ہے، ضربتُ انا وزیدٌ، زید کا عطف ضمیر متصل پر ہوتا ہے تو اس لیے اس کو منفصل کر لیا جاتا ہے، اسی طرح سے یہاں اسْكُنْ کے اندر جو ضمیر ہے انت مخاطب کی، اس کو منفصل کر کے اس پر عطف کیا جا رہا ہے وَزَوْجُكَ کا، ''اے آدم! تو اور تیری بیوی دونوں ٹھہرو جنت میں، سکونت اختیار کرو جنت میں'' فَكُلَا: كُلَا یہ تثنیہ کا صیغہ آ گیا، كُلْ كُلَا كُلُوْا، پھر تم دونوں کھاؤ، مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا: جہاں سے تم چاہو، شِئْتُمَا بھی تثنیہ کا صیغہ ہے، ''پھر کھاؤ تم دونوں جہاں سے چاہو'' وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: اس متعین درخت کے قریب نہ جانا، فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ: پھر ہو جاؤ گے تم اپنا نقصان کرنے والوں میں سے، یہاں ظالمین سے ظلم علی النفس مراد ہے، اپنے آپ کو خسارے میں ڈال لو گے، اپنے آپ پہ ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے، اپنا نقصان کر بیٹھو گے، اس درخت کے قریب نہ جائیو، فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ: وسوسہ ڈالا ان دونوں کے لئے شیطان نے، وسوسہ کا معنی ہوتا ہے دل کے اندر ہلکی سی بات ڈال دینا، خیال پیدا کر دینا، ''وسوسہ ڈالا ان دونوں کے لئے شیطان نے'' لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا: لِيُبْدِيَ میں لام لامِ عاقبت ہے، لامِ عاقبت کا معنی آپ نے پڑھا تھا کہ اس کا مدخول انجام ہوتا ہے پہلے فعل کا، یہ لام غرض وغایت کا نہیں، یعنی شیطان نے جو وسوسہ ڈالا تھا تو اس کی غرض وغایت یہ نہیں تھی کہ ان کا لباس چھن جائے، البتہ اس وسوسے کا نتیجہ یہ نکل آئے گا، انجام یہ نکل آئے گا'' ان دونوں کے لئے شیطان نے وسوسہ ڈالا تاکہ ظاہر کر دے وہ ان دونوں کے لئے'' مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا وازی یُوَارِیْ مُوَارَاۃً: چھپانا، موارا ۃ چھپانے کو کہتے ہیں، سورۂ مائدہ کے اندر یہ لفظ گزر چکا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کے قصے میں كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ (آیت: ۳۱) اپنے بھائی کی لاش کو وہ کیسے چھپائے، ''جو چھپایا گیا تھا ان دونوں سے'' ''تاکہ ظاہر کر دے ان دونوں کے لئے وہ چیز جو چھپائی گئی تھی ان دونوں سے'' وہ کیا چیز ڈھانپی گئی تھی چھپائی گئی تھی، آدم اور حوا کی کونسی چیز چھپائی گئی تھی ڈھانپی گئی تھی جس کو ننگا کرنا لِيُبْدِيَ کا مصداق ہے، مِنْ سَوْاٰتِهِمَا: سَوْاٰت سَوْءَة کی جمع ہے، سَوْءَةٌ سے یہاں اعضائے مستورہ مراد ہیں اگلا حصہ اور پچھلا حصہ، جس کو آپ شرمگاہ سے تعبیر کرتے ہیں، اس کو سوءۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا کھلنا اور اس کا ننگا ہونا باعث غم بنتا ہے، تو یہاں اعضائے مستورہ مراد ہیں، آدم اور حوا ان دونوں میں سے جو ان کے عورات، جو ان کے اعضاء چھپائے ہوئے تھے تاکہ وہ ابلیس ان دونوں کو ننگا کر دے، تاکہ ظاہر کر دے ان دونوں کے لئے وہ چیز جو ان دونوں سے چھپائی گئی تھی ان کے اعضائے مستورہ سے، ان کی شرمگاہوں سے، کنایہ کے طور پر لفظ ادا کر دیا جاتا ہے وَقَالَ: اور اس ابلیس نے کہا مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ: نہیں منع کیا تم دونوں کو تمہارے رب نے اس درخت سے، اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ: نہیں منع کیا مگر کراھۃ ان تکونا ملکین، اس بات کو ناپسند کرنے کی وجہ سے کہ تم فرشتے بن جاؤ یا ہو جاؤ تم ہمیشہ رہنے والوں میں سے، مگر اس لیے منع کیا ہے کہ تاکہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو کہ ہمیشہ رہنے والے ہیں، یعنی اللہ نے جو منع کیا ہے تو اس لیے منع کیا ہے کہ اگر تم یہ کھا لو گے تو فرشتے بن جاؤ گے اور اگر تم یہ کھا لو گے تو تمہیں دائمی زندگی حاصل ہو جائے گی، مطلب یہ ہے کہ اس درخت میں یہ

تاثیر ہے کہ اس کے کھانے سے انسان فرشتہ بن جاتا ہے، اور اسی طرح سے اس کے کھانے کے ساتھ دائمی زندگی مل جاتی ہے پھر موت نہیں آتی، یہ وسوسہ ڈالا ابلیس نے ان دونوں کے دل میں، اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ، یوں ترکیب کرلیں گے، مگر اس بات کو ناپسند کرنے کی وجہ سے کہ تم فرشتے بن جاؤ اور ہو جاؤ تم ان لوگوں میں سے جو ہمیشہ رہنے والے ہیں، یا لِئَلَّا تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ، لِئَلَّا تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ، تاکہ تم دونوں ملکین میں سے نہ ہو جاؤ، یا تاکہ تم ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ: اَقْسَمَ قسم کھانے کو کہتے ہیں اور قَاسَمَ باب مفاعلہ ہے، مفاعلہ اصل کے اعتبار سے تو مشارکت کو چاہتا ہے، جو مل کر کام کیا جاتا ہے جیسے قَاتَلَ زَيْدٌ عَمْرًا، دونوں آپس میں لڑے، فعل میں اشتراک ہو گیا، اس طرح سے اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے، اور کبھی کبھی یہ مبالغہ ظاہر کرنے کے لئے اشتراک سے خالی بھی آجاتا ہے جس طرح سے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (سورۂ بقرہ:۹) وہاں بھی باب مفاعلہ استعمال ہوا ہے کہ یہ لوگ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ دوسری طرف سے تو دھوکا دینے کی کوشش نہیں ہے، اسی طرح سے یہاں جو قَاسَمَ ہے یہ مشارکت کے لئے نہیں بلکہ اس فعل میں مبالغہ ظاہر کرنے کے لئے ہے، تو قَاسَمَهُمَآ کا معنی ہوگا ''وہ ابلیس ان دونوں کے سامنے بار بار قسم کھا گیا، ابلیس نے ان دونوں کے سامنے بار بار قسم کھائی'' کس بات پر قسم کھائی؟ کہ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ: کہ بیشک میں تمہارے لیے خیر خواہوں میں سے ہوں، تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں، اس لیے یہ جو مشورہ دے رہا ہوں اگر قبول کرلو گے تو بس ادھر کھایا اور ادھر فرشتے بنے، اور موت سے جان چھوٹی، ''قسمیں کھا گیا وہ ان دونوں کے سامنے کہ بیشک میں تمہارے لیے خیر خواہوں میں سے ہوں'' فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ: دَلّٰی تَدْلِیَۃ یہ لفظ دَلْو سے لیا گیا ہے، دلو ڈول کو کہتے ہیں، سورۂ یوسف میں لفظ آئے گا فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ: اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ تو دَلّٰی بھی لٹکانے کے معنی میں ہے، یہاں مراد ہے جیسے کوئی چیز لٹکائی جاتی ہے تو وہ اوپر سے نیچے کو چلی جاتی ہے، لٹکانا یہی ہوتا ہے۔ اور غرور مصدر ہے، دھوکا دینا۔ ''ان دونوں کو مائل کرلیا ابلیس نے دھوکے کے ساتھ'' یعنی بلندی سے پستی کی طرف مائل کرلیا، ''مائل کرلیا ان دونوں کو ابلیس نے دھوکے کے ساتھ'' فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ: جب ان دونوں نے، یعنی آدم اور حواء دونوں نے، ''جب ان دونوں نے چکھا اس درخت کو'' درخت کو چکھنے سے مراد ہے اس کا پھل کھانا، ''جس وقت اس درخت کو چکھا'' بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا: تو وہ جو عزت کا لباس اللہ تعالیٰ نے ان کو پہنایا ہوا تھا جنت میں، وہ لباس اُتر گیا۔ ''ظاہر ہو گیا ان دونوں کے لئے ان کا مستور بدن'' جو کپڑوں کے اندر چھپا ہوا بدن تھا، عزت کا لباس اتر گیا، عزت کا لباس اترنے کے ساتھ ان کا وہ حصہ ننگا ہو گیا، ''ظاہر ہو گیا ان کے لئے ان کا نتیجہ، ان کے اعضائے مستورہ، ان کی شرمگاہیں ان کے لئے ننگی ہو گئیں'' وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ: خَصَفَ يَخْصِفُ: جوڑنا، سینا، اس لئے آپ کو معلوم ہوگا کہ موچی کو عربی میں خصّاف کہتے ہیں جو چمڑے کے مختلف ٹکڑے لے کر جوڑتا ہے، سیتا ہے۔ اور طَفِقَا یہ افعال شروع میں سے ہے، افعال مقاربہ اور افعال شروع جو آپ نے نحو کے اندر پڑھے تھے۔ تو طَفِقَا يَخْصِفٰنِ دونوں کا مل کر ترجمہ ہوگا ''وہ دونوں سینے لگ گئے، وہ دونوں جوڑنے لگ گئے اپنے اوپر جنت کے پتے۔'' جنت کے درختوں کے پتے لے کر وہ اپنے اوپر جوڑنے اور سینے لگ گئے، کہ لباس تو اللہ نے اتروا لیا، اب آدم اور حواء نے بدن کو ڈھانپنے کے لئے پتے جوڑنے شروع کردیے، ''جوڑنے لگ گئے وہ اپنے اوپر جنت

کے پیچے" وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ: آواز دی ان دونوں کو ان کے رَبّ نے، یہ آواز دینا بطور جھڑک کے ہے،" آواز دی، پکارا ان دونوں کو ان کے رَبّ نے" اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈانٹ ہے۔کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہیں تھا؟ وَاَقُلْ لَّكُمَآ: اور تم دونوں سے کہا نہیں تھا؟ کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ: کہ شیطان تمہارے لئے صریح دشمن ہے، اور تم اسی دشمن پر اعتماد کر بیٹھے؟ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈانٹ پڑی،" آواز دی ان کو ان کے رَبّ نے، کیا میں نے تم دونوں کو روکا نہیں تھا اس درخت سے، اور کیا میں نے تم دونوں سے کہا نہیں تھا (یہ اَقُلْ بھی اَلَمْ کے نیچے داخل ہے اَلَمْ اَقُلْ) کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ شیطان تمہارے لیے صریح دشمن ہے" قَالَا: وہ دونوں کہنے لگے رَبَّنَا: اے ہمارے رَبّ! ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا: ہم نے اپنے آپ پہ زیادتی کی، ہم نے اپنے آپ پہ ظلم کیا۔ یہ دیکھو! ایک وہ بھی خبیث تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ وہ کہتا ہے کیوں کروں؟ میں اچھا ہوں، وہ گھٹیا ہے، کوئی اچھا بھی گھٹیا کو سجدہ کیا کرتا ہے؟ یہ شیطانوں والی اور خبیثوں والی بات ہے، جس کے نتیجے میں وہ ملعون ہوگیا۔ تو اس کو بھی پوچھا تھا کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ اِدھر ہمارے ابا جی کی بات بھی دیکھ لو، کہ جب اللہ تعالیٰ نے ڈانٹ ڈالی تو کہتے ہیں رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا: اے ہمارے پروردگار! ہم سے اپنے آپ پہ زیادتی ہوگئی، ہم نے (اپنے) آپ کو برباد کرلیا، ہم نے ظلم کیا اپنے آپ پر، وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا: اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا، وَتَرْحَمْنَا: اور تو ہم پر رحم نہیں کرے گا، لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائیں گے، ہم تو بالکل ہی برباد ہوگئے اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا، تو اس طرح سے آدم اور حواء نے اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی کے لئے دامن پھیلا دیا، قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اتر جاؤ سارے۔ اهْبِطُوْا جمع کا صیغہ ہے۔ سب چلو نیچے، اهْبِطُوْا: اتر جاؤ، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: تمہارا بعض بعض کے لئے دشمن ہوگا، یہ ہمیشہ کے لئے عداوت قائم ہوگئی، وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ: اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے، وَّمَتَاعٌ: اور فائدہ اٹھانا ہے اِلٰى حِيْنٍ: ایک وقت تک، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا فِيْهَا تَحْيَوْنَ: اسی زمین میں تم زندہ رہوگے، زندگی گزاروگے، وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ: اور اسی کے اندر تمہیں موت آئے گی، وفات پاؤگے، وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ: اور اسی زمین سے تم نکال لیے جاؤگے۔

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضمون

پچھلے رُکوع کی آخری آیت میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انسانوں پر مادّی احسان ہوا تھا اس کا ذکر آیا تھا، زمین میں قدرت دینا، اقتدار بخشا، ٹھکانہ دینا، اور کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں مہیا کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مادی احسان ہے جو انسان پر ہوا، جس کے ساتھ انسان اپنی بدنی زندگی کو باقی رکھتا ہے۔ اگلے رُکوع میں جیسا کہ آپ نے ترجمہ سن لیا، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور اولادِ آدم کی رُوحانی کرامت، جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھی اُس کا ذکر ہے، کہ کس طرح سے اللہ تعالیٰ نے عزت

بخشی، اور تمہیں اتنے اونچے مقام پر پہنچایا، مسجودِ ملائکہ بنایا، تو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے منصب کی اور مقام کی رعایت رکھو، اور اپنی اس عزت کو بچانے کی کوشش کرو جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں دی ہے، انسان کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی، آدم علیہ السلام کے بنائے جانے کے بعد جب یہ انسان کا سلسلہ شروع ہوا تو پیدا ہوتے ہی جس قسم کے حالات پیش آئے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے سامنے آپ کی وہ ابتدائی تاریخ دوہراتے ہیں، بہت اہم واقعہ ہے جس کو ذکر کیا جارہا ہے، اور بہت سوچنے کی بات ہے۔ ذکر یہ کیا جارہا ہے کہ تمہیں جس وقت پیدا کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ کرامت بخشی تھی کہ اپنی جانب سے روح پھونکی، اور روحانی وعلمی کمالات عطا کیے، فرشتوں کو جس قسم کے اشکالات تھے تمہاری افضلیت کے متعلق، وہ اشکالات اللہ تعالیٰ نے دُور فرمائے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آیا، اور پھر تمہاری عزت اور کرامت ظاہر کرنے کے لیے آدم علیہ السلام کو یعنی تمہارے باپ کو فرشتوں کے لئے مسجود بنایا، اور آدم کا وجود چونکہ تمام انسانیت کا ایک اجمالی وجود ہے تو یوں سمجھو کہ سارے انسانوں کو بنایا۔

ابلیس جن تھا، اُستاذِ ملائکہ نہیں تھا

اور یہ ابلیس جو کہ اصل کے اعتبار سے جنات میں سے ہے، یہ فرشتہ نہیں، سورۂ کہف کے اندر اس کی صراحت آئے گی آپ کے سامنے: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۗ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (آیت: ۵۰) وہ جنات میں سے تھا جو اپنے رَبّ کے حکم کے سامنے سرکش ہو گیا نافرمان ہو گیا۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ وہاں صراحت ہے۔ تو آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے پہلے جنوں کی آبادی تھی، اور یہ جو ابلیس تھا جس کا نام بعض کتابوں کے اندر ''عزازیل'' نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ ''کریما'' میں آپ نے پڑھا تھا۔

تکبّر عزازیل را خوار کرد بزندانِ لعنت گرفتار کرد

تو یہ عبادت گزار تھا، بہت زیادہ عبادت کرتا تھا، بہت بڑا صوفی پرہیزگار، اور آمد و رفت آسمان پر اس کی تھی، جیسے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے عام شیاطین اور جنات بھی آسمان کی طرف جاتے تھے، روایات میں جس طرح آتا ہے، قرآنِ کریم کی آیات میں بھی اشارہ ہے، یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان کو دھتکارا گیا اور آسمان کے پاس ان کا جانا ممنوع ٹھہرادیا گیا، ورنہ ان کی آمد و رفت اُوپر تک، بادلوں کے اوپر تک خبریں سننے کے لیے یہ آیا جایا کرتے تھے، بعض آیات کے اندر اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ تو یہ بھی جاتا تھا اور فرشتوں میں شامل رہتا تھا۔ ظاہری طور پر فرشتوں میں یہ شامل تو تھا، لیکن یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ یہ فرشتوں کا اُستاذ تھا، اُستاذِ ملائکہ تھا، یہ بظاہر واعظوں کی بنائی ہوئی بات ہے، ورنہ روایات وآیات میں اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں نکلتا، کہ یہ فرشتوں کا اُستاذ تھا۔ تو اُستاذِ ملائکہ کے طور پر جو اس کو ذکر کیا کرتے ہیں، تو یہ انہی لطیفوں میں سے ہے جس قسم کے لطیفے واعظ اپنے ذہن سے تراشتے رہتے ہیں، یہ بھی انہی باتوں میں سے کوئی بات معلوم ہوتی ہے، ورنہ اُستاذی وغیرہ اس کو کچھ حاصل نہیں تھی۔

سجدے کا حکم ابلیس کو بھی تھا

ہاں عملاً ان میں شامل رہتا تھا، جب یہ شامل رہتا تھا تو جتنے اس وقت آسمان پر موجود تھے اللہ تعالیٰ نے سب کو حکم دیا کہ میں جو اس کو خلیفہ بنا رہا ہوں، یہ خلیفۃ فی الارض ہے، میں اس کو زمین کے اندر اپنا نائب بنانے والا ہوں، تو تم اس کے سامنے سجدہ کر کے اس کی عزت نمایاں کرو۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا، اب فرشتوں کا تو کام ہے کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کہ وہ تو وہی کرتے ہیں جو اللہ کی طرف سے حکم آجاتا ہے لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَهُمْ جو بھی حکم اللہ دے دے وہ نافرمانی نہیں کرتے۔[1] جب حکم ہوا تو وہ تو سارے کے سارے سجدے میں گر گئے، یہ چونکہ وہیں ان میں شامل تھا تو سجدہ کرنے کا حکم اس کو بھی ہوا تھا، کہ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کر، اگرچہ کسی آیت کے اندر یہ صراحتاً نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کہا تھا کہ تو سجدہ کر، اور پھر اس نے انکار کیا، لیکن اِذْ اَمَرْتُکَ کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ جب سجدے کا حکم فرشتوں کو ہوا تھا اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا کے اندر یہ ابلیس بھی شامل تھا، یہ اِذْ اَمَرْتُکَ کا لفظ صراحتاً بتاتا ہے، اگرچہ اُسْجُدُوْا کا حکم بظاہر فرشتوں کو ہے اور کسی جگہ اُسْجُدُوْا کا خطاب بظاہر ابلیس کو نہیں ہے، لیکن اِذْ اَمَرْتُکَ کا لفظ بتاتا ہے کہ اس حکم کے اندر یہ بھی شامل تھا، ورنہ وہ یہ عذر کر سکتا تھا کہ جی! آپ میرے پر ناراض کیوں ہو رہے ہیں، مجھے تو آپ نے حکم ہی نہیں دیا۔ لیکن اس نے یہ عذر نہیں کیا، وہ سمجھتا تھا کہ اس حکم میں میں بھی شامل ہوں، جو آدم علیہ السلام کے سامنے جھکنے کے متعلق دیا گیا ہے، لیکن اُس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

حسد کی وجہ سے ابلیس کا انکار، پھر اس پر ڈھٹائی، اور اللہ کی طرف سے پھٹکار

کیوں انکار کر دیا؟ حسد میں مبتلا ہو گیا، وہ یہ اُمیدوار تھا کہ شاید یہ خلافت ارضی میرے حصے میں آئے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک نئی مخلوق کھڑی کر دی اس خلافت کو سنبھالنے کے لیے، اور وہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا کہ میں جو اتنا عبادت گزار ہوں، اتنا نیک ہوں، اور اتنی اللہ کی اطاعت وعبادت کرتا ہوں تو مستحق میں ہوں، بس اس کے دل میں یہ جو استحقاق آیا تو آدم علیہ السلام کی عزت کو دیکھ کر وہ جل گیا۔ یہ حسد کی بیماری، سب سے پہلے اس کا ظہور آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ابلیس سے ہوا، کہ وہ آدم علیہ السلام کی عزت کو دیکھ نہیں سکا بلکہ دیکھ کر جل گیا۔ آسمان پر پہلی معصیت اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو ہوئی ہے وہ یہی حسد کے رنگ میں نمایاں ہوئی، کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کیا اور اُن کی عزت کو برداشت نہیں کر سکا، اس لیے اُن کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کیا جیسا اللہ کو مطلوب تھا، انکار کر دیا، جب انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ڈانٹ دی، کہ میں نے جب تجھے کہا تھا تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ (اس بات کو یاد رکھیے، بعض بعض چیزیں نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں) کہ جب ایک دفعہ کوئی شخص کسی معاملے میں اَڑ جائے اور تہیہ کر لے کہ میں نے یہ کام نہیں کرنا، پھر کہنے والے کی عظمت، اُس کا جلال، اُس کی عزت کوئی چیز بھی اپیل نہیں کیا کرتی، وہ سب چیزیں پردے میں چلی جاتی ہیں، پھر انسان بے حیا ہو کر بے غیرت ہو کر جب ڈٹ جاتا ہے اور اَڑ جاتا ہے تو پھر کوئی چیز اُس کو موڑ نہیں سکتی۔ حیرت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست کلام فرما رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال جس کے سامنے فرشتوں کی اور انبیاء علیہم السلام کی بھی بات

---

(۱) لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (پارہ ۲۸، سورۃ تحریم، آیت: ۶)

نہیں بنتی، اُس عظمت اور جلال کے سامنے ان سب کی زبانیں بند ہوتی ہیں، اور اِس خوف کے سامنے ہر کوئی دبتا ہے، لیکن جب یہ آدم علیہ السلام کے مقابلے میں ضد میں آیا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی ڈٹ گیا، اور اللہ کی عظمت اور جلال سب پردے میں چلی گئی۔ پوری ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ میں سجدہ کیوں کروں، میں اس سے اچھا ہوں اور یہ مجھ سے گھٹیا ہے، جب یہ مجھ سے گھٹیا ہے تو گھٹیا کو چاہیے کہ اعلیٰ کو سجدہ کرے، اعلیٰ ادنیٰ کو سجدہ کیوں کرے؟ گویا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو اس نے خلافِ حکمت قرار دیا، اور ساتھ ہی اپنے اچھے ہونے کی دلیل بھی ٹھوک دی، کہتا ہے کہ مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اِسے مٹی سے بنایا ہے، یہاں لفظ صرف اتنے ہی ہیں، مطلب اُس کا سمجھ میں آ گیا کہ آگ مٹی کے مقابلے میں افضل ہے، مٹی ظلمانی ہے اور آگ نُورانی ہے، اور جب میں آگ میں سے بنا ہوں تو میں اچھا ہوں، اور یہ مٹی میں سے بنا ہے تو یہ گھٹیا ہے، آگ اُوپر کو جاتی ہے، مٹی نیچے کو آتی ہے، آگ کا اُبھار تو اُوپر کو ہوتا ہے اور مٹی نیچے کو جاتی ہے، تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں، یہ اُس نے آگے سے بے حیائی کے ساتھ جواب دیا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے اُس کی دلیل کا جواب نہیں دیا کہ تجھے غلط فہمی ہوگئی ہے، مٹی آگ سے گھٹیا نہیں، بلکہ مٹی افضل ہے، اور آگ اگر مٹی سے افضل بھی ہے تو جو چیز آگ سے بنائی جائے ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز جو مٹی سے بنائی جائے اُس کے مقابلے میں افضل ہو، افضل بھی ہو تو بھی جب میں نے حکم دیا تھا، تجھے چاہیے تھا کہ تو مان جاتا، اس قسم کی چیزیں جیسے دلیل کے ساتھ کسی مقدمے کو توڑا جاتا ہے، یہ انداز اللہ تعالیٰ نے اختیار نہیں فرمایا، اُس کی وجہ یہ ہے کہ آگے سے اُس کا انداز بھی متکبرانہ ہے، اور جس وقت اُس کا آگے سے انداز متکبرانہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی پھر اپنا حاکمانہ جوتا دکھایا، جواب یہی دیا کہ چل مردود! نکل یہاں سے پھٹکارا ہوا، میرے سامنے اس قسم کی حجتیں کرتا ہے، دفع ہو جا یہاں سے، نکل جا، یہ حاکمانہ انداز ہے۔

اِبلیس کا چیلنج اور اللہ کی طرف سے حاکمانہ جواب

اب چاہیے تو یہ تھا کہ کم بخت کچھ بھی غیرت کرتا کہ جب ایک بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی، پھر دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے تو پھر ہی وہ جھک جاتا، لیکن وہی جو آگ والی سرشت تھی وہ جھکنے کیسے دے، ایک دفعہ جب اکڑ آ گئی تو پھر وہ نکلے کیسے، اللہ تعالیٰ کی جھڑکیاں سُن کر بھی وہ پتلا نہیں ہوا، اس میں نرمی نہیں آئی، بلکہ حسد جو تھا وہ اُس کو دوسرے راستے پر ڈال گیا، اُس کے سامنے یہ بات آ گئی کہ یہ آدم ہے جو اللہ نے بنایا، اور اس کی عزت نہ کرنے کی بنا پر آج میں ٹھکرایا جا رہا ہوں، تو جس کا مطلب یہ ہے کہ آدم اللہ کا بڑا لاڈلا اور بڑا پیارا ہے، اور اس کی وجہ سے آج مجھے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ اچھا! ناراض تو ہو گئے ہو، مجھے ذرا مہلت دو، اس کے کمالات میں دکھاؤں گا کہ یہ کیا چیز ہے، اور جس کو سجدہ نہ کرنے کی بنا پر مجھے ٹھکرا رہے ہو، مجھے ذرا چھٹی دو، میں بتاؤں گا یہ کیا چیز ہے؟ اس کو اور اس کی اولاد کو ایسا بہکاؤں گا کہ ان میں سے اکثر تیرے نہیں رہیں گے، دیکھو مجھے ذرا چھٹی دے دو، تمہیں اس لاڈلے کے کمالات دکھاؤں۔ یہ آگے سے جس طرح سے حسد کرنے کی بنا پر بات ہوا کرتی ہے اکڑ کے ساتھ، بے غیرتی کے ساتھ، وہ یوں ہو گیا۔ گویا کہ آدم علیہ السلام کی وجہ سے چونکہ وہ مردود ہوا تھا، تو آدم علیہ السلام کو مدمقابل ٹھہرا کر اللہ کو چیلنج دے رہا ہے، اپنے اسی دماغ کے تحت کہ میں ثابت کروں گا کہ میں اچھا ہوں یہ گھٹیا ہے، مجھے چھوڑ تو سہی ذرا، مہلت تو دو۔ جیسے

آگے آپ کے سامنے آئے گا غالباً سورۂ بنی اسرائیل میں لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ (سورۂ اسراء:۶۲) مجھے ذرا چھوڑو، میں اس کی اولاد کو ڈھاٹی مارلوں گا۔اِحتناکِ دابہ: یہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بیل یا گدھے گھوڑے جو ذرا سرکش سے ہو جاتے ہیں، اور وہ کاشتکار سے زمین دار سے سنبھالے نہیں جاتے، تو اُس کے جبڑے کو یوں کر کے رسّی باندھ لیتے ہیں، منہ میں رسّی گزار کر اس کا جبڑا باندھ لیتے ہیں، جس وقت اس کا جبڑا باندھ لیا جائے پھر سرکش سے سرکش جانور ہو وہ بھی قابو آجاتا ہے، اس کو کہتے ہیں: اِحتناکِ دابہ، اردو میں اس کو کہتے ڈھاٹی مار لینا۔ کہتا ہے مجھے چھوڑ تو سہی، اگر اس کی اولاد کو ڈھاٹی نہ مار لی تو کہنا۔ یعنی ان سب کو اس طرح سے باندھ لوں گا جس طرح سے سرکش جانور کو جبڑے سے باندھا جاتا ہے، یہ اُس کے غرور کی انتہا ہے جو اُس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ظاہر کیا اور آدم علیہ السلام کے مقابلے میں، کہ میں اس کی اولاد کو اچھی طرح سے لگام دے لوں گا، اور اس طرح سے قابو کر لوں گا جس طرح گھوڑے کا جبڑا باندھ کر اس کو قابو کر لیا جاتا ہے، اپنی بڑائی پر اس کو اس طرح سے ناز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی وہی جواب دیا کہ جا، دفع ہو، تُو بھی جا اور جو تیرے پیچھے لگیں گے وہ بھی جائیں، میرا کیا بگاڑیں گے، سارے تیرے پیچھے لگیں گے سب کو اُٹھا کر جہنم میں پھینک دُوں گا، میرا کیا نقصان ہے اس میں، وہاں بھی وہی حاکمانہ انداز ہے، وہاں بھی دوسرے انداز میں بات نہیں کی، حاکمانہ انداز ہے کہ جاجا، دفع ہو، بہکا لینا جس کو بہکانا ہے، میرا کیا نقصان کرو گے۔ ان میں سے اگر کوئی تیرے پیچھے لگ جائے گا، تیرا کہنا ماننے لگ جائے گا، میرا کیا نقصان ہے، میں تجھے بھی اور ان کو بھی سب اکٹھا کر کے جہنم میں دھونک دوں گا، اگلے جواب کا حاصل یہ ہے۔

جنّت میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ کی آدم علیہ السلام کو نصیحت

اب وہ تو چڑ گیا اور چڑ کر وہ مشتعل ہو گیا آدم علیہ السلام کے خلاف، اور اللہ نے کہا کہ بہت اچھا، تُو بھی زور آزمائی کر لینا، جا، میری طرف سے چھٹی ہے، قیامت تک اُس نے مہلت مانگی تھی، قیامت تک ہی اس کو زندگی دے کر مہلت دے دی گئی، لو! ایک پہلوان تو تیار ہو گیا۔ اب دوسری طرف سے آدم علیہ السلام ہیں، آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدم! اب تُو جا ذرا جنّت میں، تُو بھی اور تیری بیوی بھی، دونوں جنّت میں رہو، لیکن دیکھنا ایک بات کا خیال کرنا وہ دشمن چیلنج دے گیا ہے تمہارے متعلق، وہ یوں کہہ گیا ہے، اس کی باتوں میں نہ آنا، اور باقی جنّت میں جہاں چاہو کھاؤ پیو، کھلا میدان ہے، لیکن یہ درخت جو ہے، اس سے ذرا بچ کر رہیو، اس کی تاثیر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی رکھی ہوئی تھی، جس کے بعد وہی اثرات نمایاں ہونے تھے، جس قسم کے ہوئے، تو فرمایا بس اس سے بچ کر رہیو، اور اس بات کا خیال رکھیو کہ تمہاری وجہ سے یہ مردود ہوا ہے اور تمہارے متعلق اس کے جذبات بہت خطرناک ہو گئے ہیں، اس سے ہوشیار رہیو، یہ کہہ کر ہمارے اَبا جان کو اور ہماری اَمّاں جان کو جنّت میں ٹھہرا دیا، عزّت کا لباس پہنایا، رہنے کے لیے اچھی جگہ دی، کھانے کے لیے نعمتیں دیں۔

ابلیس نے آدم علیہ السلام کو کس طرح پھسلایا

اب وہ کھاتے پھر رہے ہیں، اور شیطان ابلیس تو اس تاک میں پھرتا تھا کہ کوئی بات بنے تو میں اپنا انتقام لوں، کہ جس کی

وجہ سے میں دھتکارا گیا ہوں، تو ذرا اس کا کمال بھی ظاہر کردوں، تو اُس نے آدم اور حوا کی ایک خامی سے فائدہ اٹھایا، اور وہ خامی اُس نے اُسی وقت ہی تاڑلی تھی جب آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ نے تابوت بنا کر رکھا ہوا تھا، ڈھانچہ بنا کر رکھا ہوا تھا، ابھی رُوح نہیں ڈالی تھی، اس وقت ہی اس نے آدم علیہ السلام کی ایک کمزوری تاڑی تھی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا وجود بنایا (کیونکہ آدم علیہ السلام اس طرح سے تو نہیں بنے جس طرح سے ہم بنے، پیدا ہوئے چھوٹے سے تھے پھر بڑھتے گئے، ایسا تو نہیں ہوا تھا وہ تو یکدم ہی بنے تھے جیسے بنے تھے) مٹی کا بنا کر نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ[1] اس میں رُوح ڈال دی، جب ان کا مکمل وجود بنا پڑا تھا تو ابلیس آیا اور اُس نے اردگرد گھوم کر دیکھا کہ یہ اللہ نے کیا چیز بنائی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے، تو جب دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ یہ آدم اندر سے کھوکھلا ہے، (ہماری جو تہہ ہے، اُوپر اُوپر سے ہے، اندر سے تو سب خالی ہے) جب اندر سے کھوکھلا ہے تو کہتا ہے کہ ''خَلْقٌ خَلْقًا لَا یَتَمَالَكُ''[2] اللہ تعالیٰ نے یہ ایک ایسی مخلوق بنائی ہے جو اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی، یعنی اس کو بہکایا جاسکے گا، ہوادی جاسکے گی، وسوسے اس میں ڈالے جاسکیں گے، اس کا رُخ موڑا جاسکتا ہے۔ تو اس کے کھوکھلے پن کو دیکھ کر اُس نے یہ اندازہ لگایا، (ہوشیار تو کافی معلوم ہوتا ہے)، اب اسی سے اس نے کام شروع کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ قوت دی ہے کہ نظر نہیں آتا، اور اس کے خیالات مختلف طریقوں کے ساتھ انسان کے قلب تک پہنچتے ہیں، ''وسوسہ'' کا معنی یہی ہے کہ آہستہ آہستہ اُس نے بات پہنچانی شروع کی، کچھ حوا کو پہنچائی، کچھ آدم کو پہنچائی، چلتے پھرتے ہیں، سب کچھ کھاتے پیتے ہیں، آخر دِل میں خیال آنے لگ گیا کہ یہ درخت جس سے اللہ نے روکا ہے آخر کیوں روکا ہے؟ اس میں کیا وجہ ہے؟ روکنے میں کیا حکمت ہے؟ یوں انسان کا ذہن حرکت کرتا ہے، دِل میں خیال آیا کہ شاید اس میں کوئی نقصان کا پہلو ہو، پھر دِل میں خیال ڈالا کہ نہیں نہیں، نقصان کا پہلو تھا، اس لیے اللہ نے روکا ہے، لیکن اُس وقت تھا جب تم نئے نئے جنت میں آئے تھے، اور یہ درخت بڑا قوت والا ہے، اور تم اس وقت اس کو ہضم کرنے پر قادر نہیں تھے، اب جنّت کی نعمتیں کھاتے کھاتے تمہارا معدہ قوی ہوگیا ہے، اب اگر تم کھاؤ گے تو اب یہ ہضم ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ کا روکنا ٹھیک ہے، یہ نہیں کہ روکنا غلط ہے، روکنا ٹھیک ہے، لیکن یہ روکنا ایسے ہے جیسے دُودھ پیتے بچے کو منع کریں کہ بھائی! گوشت نہیں کھانا، دُودھ پیتے بچے کو گوشت نہیں دیا جاتا، کیونکہ اُس کی انتڑیاں اُس کا معدہ اُس کو ہضم نہیں کرسکتا، سنبھال نہیں سکتا، مرجائے گا وہ کھانے سے، لیکن جس وقت وہ تھوڑا سا جوان ہوجاتا ہے، دُودھ پیتا پیتا اُس میں قوت آجاتی ہے، پھر وہ سیروں گوشت کھا جاتا ہے، کیا ہوتا ہے، اس سے قوت آتی ہے۔ اسی طرح سے یہ درخت ایسا ہے کہ جو اس کو کھالے فرشتہ بن جاتا ہے، اور یہ درخت ایسا ہے کہ جو اس کو کھالے موت سے بچ جاتا ہے، ہمیشہ کی زندگی اُس کو حاصل ہوجاتی ہے، یہ شجرۃ الخلد ہے، دائمی حیات والا درخت ہے، جس طرح سے آپ نے مشہور کر رکھا ہے کہ ایک آبِ حیات بھی ہے کہ وہ پانی پی لے تو آدمی مرتا نہیں، اسی طرح سے یہ شجرۃ الخلد ہے، دائمی حیات کا درخت ہے، کہ جو اس کو کھالے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اب آدم علیہ السلام کچھ اپنے حالات

---

(۱) پارہ ۱۴، سورۃ حجر، آیت ۲۹۔ پارہ ۲۳، سورۃ ص، آیت ۷۲۔

(۲) مسلم ۳۲۷/۲، کتاب البر، باب خلق الانسان الخ۔ مشکوۃ ۵۰۶/۲ باب بدء الخلق فصل اول۔

کے طور پر سمجھتے تھے کہ فرشتے کو بھی ایک بہت بڑی کرامت حاصل ہے، اور موت سے بچنے کا اگر یہ نسخہ ہے تو پھر تو واقعی اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، لیکن وہ بات پھر یاد آ جاتی کہ اللہ نے روکا ہے، پھر کچھ تاویلیں ہوتیں، پھر وہ آتا اور بار بار آ کر قسمیں کھاتا، کہ آدم! میں جو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اب اس کو کھالو، موقع آ گیا ہے، اس کا بڑا فائدہ ہوگا، اللہ کی قسم، رَبّ کی قسم (جس طرح ہمارے ہاں بہکانے والے کہا کرتے ہیں ''قرآن کی قسم! ایمان سے کہتا ہوں!'') کہ میں تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں، اور جو کہہ رہا ہوں تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔

دُوسرے کو متاثر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

شیطان کا ہتھکنڈا جب شروع ہوگا، بیٹو! یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو وہ خیر خواہ بن کر آپ کے سامنے ظاہر کرے گا، خیر خواہ بن کر آپ سے دوستی لگائے گا، خیر خواہ بن کر آپ کو مشورے دے گا، آخر اس قسم کے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرائے گا، کہ جہاں سے اٹھنے کا پھر موقع کوئی نہیں ہوگا۔ ہمیشہ شیاطین الانس ہوں یا شیاطین الجن ہوں، دشمن بن کر سامنے سے کوئی نہیں آتا، پہلے آپ کے ساتھ دوستی لگائیں گے، اور آپ کو یقین دلائیں گے کہ میں تیرا خیر خواہ، میں تیرا ہمدرد۔ اچھا آدمی بھی متاثر کرے گا تو یہی کہہ کر متاثر کرے گا، انبیاء ﷩ جس وقت لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے تو یہی کہتے ہیں، جیسے نوح علیہ السلام کے واقعے میں ہے اَنۡصَحُ لَکُمۡ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، میں تمہارا خیر خواہ ہوں (سورۂ اعراف: ۶۲)۔ اور وہ دجال جس نے گمراہ کرنا ہوتا ہے وہ بھی خیر خواہ بن کر آتا ہے، پہلے آپ سے دوستی لگائے گا، آپ کو بہکائے گا، یقین دلائے گا کہ میں تمہارا بڑا مخلص دوست ہوں، میری دوستی میں تمہارے بڑے فائدے ہیں، میں بہت تمہارا خیر خواہ ہوں، جو تمہیں کہتا ہوں تمہارے فائدے کی بات کہتا ہوں، میرا اس میں کوئی غرض مطلب نہیں ہے۔ قسمیں کھا کر یقین دلا دیں گے، پھر اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے ہلاکت کے گڑھے میں جا گرائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ حقیقی خیر خواہ کون ہے اور کون نہیں ہے؟ آپ کا بدخواہ کون ہے اور خیر خواہ کون ہے؟ یہ فرق کرنا سب سے بڑا مشکل مسئلہ ہے، خاص طور پر اس عمر میں جس عمر میں سے آپ لوگ گزر رہے ہیں، یہاں بہت مغالطہ لگتا ہے کہ انسان بدخواہوں کو خیر خواہ سمجھ لیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری خیر خواہی کے مشورے دے رہے ہیں، اور مشورہ ہوتا ہے اپنی ہلاکت کا، جوان اسی طرح سے تباہ ہوتے ہیں، بچے اسی طرح سے غلط راستوں پر چڑھ جاتے ہیں، کہ بہکانے والے بہکاتے اُن کو اسی راستے سے ہیں۔

آدم علیہ السلام نے شیطان کی بات پر اعتبار کیوں کیا؟

اب دو قسمیں کھا گیا، بار بار قسمیں کھاتا ہے، کہ میں بڑا خیر خواہ ہوں، تمہیں مشورہ خیر خواہی کا دے رہا ہوں، اب ہمارا اَبّا سیدھا سادا، نہ جھوٹ بولنا جانے، نہ جھوٹی قسم کھانا جانے، ارے! نیک آدمی میں یہی تو بات ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہمارا دل صاف ہے دوسروں کا بھی صاف ہے، وہ نہ تو جانتا تھا کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے، اور نہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر اللہ کی قسمیں کھا کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، اس لیے اس کی باتوں میں آ گیا۔ اب فرشتہ بننے کے لیے دائمی حیات حاصل کرنے کے

لیے وہ درخت کھالیا۔ جب کھالیا، اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو منع کیا تھا، منع کرنے کے باوجود، اور پھر اُس کے دشمن ہونے کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ تمہارا دشمن ہے اس سے ہوشیار رہو، پھر یہ چکر میں کیسے آ گئے؟ تو اس کا جواب خود قرآن کریم میں: فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (سورۂ طٰہٰ:۱۱۵) آدم بھول گیا، اس کے لیے ہم نے پختگی نہیں پائی، جو بات ہم نے کہی تھی اُس کے ذہن سے ہی نکل گئی، اس کے دشمن ہونے کا تصور ہی نہ رہا، بھول گیا، اس کی فطرت میں یہ نسیان ہے، اور اس نسیان کی وجہ سے یہ چکر میں آ گیا۔ اور اس درخت کا چکھنا تھا درخت کے چکھتے ہی وہ کرامت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل تھی وہ چھن گئی، وہ لباس جو عزت کا پہنا رکھا تھا وہ اتر گیا۔

بنی آدم پر شیطان کا طریقۂ واردات آج بھی وہی ہے

یہاں درمیان میں ایک نکتہ یاد رکھیے! قرآن کریم کے واقعات جو پڑھے جاتے ہیں، یہ تاریخی انداز میں نہیں پڑھے جایا کرتے، ان میں سے انسان کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آج بھی اس دور میں آپ جو چل رہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کھانے کی، پہننے کی، پینے کی، ہر چیز کی وسعت حاصل ہے۔ آپ گن نہیں سکتے وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کھانے کے لیے دی ہیں، اور اتنے قسم کے شربت اور مشروبات، بازار میں جا کر دیکھو، آپ کے پینے کے لیے، آپ کی لذت اور تلذذ کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتنے قسم کے مشروبات بازار میں چھوڑے ہوئے ہیں، حکیموں کی دکانوں پر جا کر دیکھو کتنے قسم کے شربت پڑے ہیں، بوتلوں کی دُکانوں پر جا کر دیکھو کتنی قسم کی بوتلیں پڑی ہیں، آپ کے لیے دودھ ہے، شہد ہے، لسی ہے، چائے ہے، جو چاہو پیو، اللہ نے ہر چیز کی وسعت کر دی۔ اور اسی طرح سے کھانے کے لیے اگر آپ شمار کریں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتنی چیزیں کھانے کے لئے دی ہیں، کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں ہے، پہننے کے لئے آپ کو کتنے قسم کے کپڑے دے دیے، کوئی تنگی نہیں ہے۔ لیکن آج بھی چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے اللہ نے روکا ہے، کہ ان کے قریب نہ جاؤ، مشروبات میں سے روک دیا ہے کہ نشہ آور چیز نہیں پینی، شراب نہ پیو باقی جو چاہو پیتے رہو۔ کھانے میں سے روک دیا کہ سُوّر نہ کھانا، درندہ نہیں کھانا، سود نہیں کھانا، فلاں چیز نہیں کھانی، باقی جو چاہو کھاتے رہو۔ پہننے کے متعلق روک دیا، کہ سونا نہیں پہننا، ریشم نہیں پہننا، فلاں چیز نہیں پہننی، باقی جو چاہو پہنتے رہو۔ لیکن یہاں بھی آدم کا بچہ اسی طرح سے شیطان کے چکر میں ہے، کہ اس کو جتنی لذت اُن چیزوں میں آتی ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، اتنی ان چیزوں میں لذت نہیں آتی ہے جن کے کرنے کی اللہ نے اجازت دی ہے۔ اور آج بھی اس کے دل میں یہی ڈالا جاتا ہے کہ فائدہ اصل میں انہی چیزوں میں ہے، لسی مفید نہیں، دودھ مفید نہیں، شربت صندل مفید نہیں، فلاں چیز مفید نہیں، شراب کے ایک گھونٹ میں جو مزہ ہے، یا جو اس میں قوت ہے، دنیا کے کسی مشروب میں نہیں ہے، اس لیے صحت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تھوڑی سی ضرور پی لینی چاہیے، اس سے صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کاروبار جتنا چاہو کرتے رہو تم فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک سودی کاروبار نہیں کرو گے، تمہاری ترقی کا راز سودی کاروبار میں ہے، اس لیے قوم بھاگی جا رہی ہے، کہتے ہیں کہ واقعی سودی کاروبار کریں گے تو ہم ترقی کر سکتے ہیں، اگر سودی کاروبار نہیں کریں گے تو ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ یعنی جس

طرح سے اس نے بہکایا تھا کہ فائدہ اسی درخت کے کھانے میں ہے، ساری جنت کی نعمتیں ایک طرف رہ گئیں، اور رغبت اس درخت کی طرف کی اور سر کے بل اٹھا کے مارا، اسی طرح سے یہاں اگر آپ اپنے معاشرے میں دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کی ہمیں اجازت دے رکھی ہے، ہم اس میں تو فائدہ سمجھتے نہیں، اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ہم سمجھتے ہیں، کہ ہماری زندگی کا مزہ اسی میں ہے، مسجد جانے میں کوئی مزہ نہیں ہے، قرآنِ کریم کے پڑھنے میں کوئی مزہ نہیں ہے، جو مزہ سینما دیکھنے اور ناول پڑھنے میں ہے۔ جو مزہ سینما دیکھنے اور ناول پڑھنے میں ہے، مسجد میں بیٹھنے، مدرسے میں بیٹھنے اور قرآنِ کریم کے پڑھنے میں ہم وہ مزہ نہیں سمجھتے، اور اسی طرح سے انسانی آبادی کے اندر جتنی رغبت سونا پہننے کی طرف ہے، کہ اب جس جوان کو دیکھو ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی ہے، اور اسی طرح جو ممنوع لباس ہیں کہ ایسی شلوار نہ پہنو جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی ہو، اور ریشم نہ پہنو اور اس قسم کی ہیئت نہ اختیار کرو جیسی غنڈوں اور بدمعاشوں کی ہوتی ہے، اور ایسا کپڑا نہ پہنو جو عورتوں کے ساتھ تشبہ پیدا کرتا ہے، لیکن ہمارا نوجوان طبقہ جتنا بھی ہے وہ سب دوڑ دوڑ کر ادھر ہی جائے گا جدھر سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہوا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی عیش، دنیا کی راحت، دنیا کا آرام، دنیا کی زیب و زینت جو حاصل ہوگی اسی سے حاصل ہوگی۔ کاروبار میں سود سے منع کر دیا، سٹے سے منع کر دیا، دوسری چیزوں سے منع کر دیا، حلال کاروبار جتنے چاہو کرو، لیکن بنی آدم کا ذہن یہی ہے کہ اس وقت تک ترقی نہیں ہوگی جس وقت تک کہ ہم سودی کاروبار نہیں کریں گے اور یہ نہیں کریں گے۔ شراب سے منع کر دیا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہزار شربت صحیح، لیکن ان میں وہ فائدہ ہی نہیں جو شراب کے ایک گھونٹ میں ہے۔ شیطان کا بہکاوا بنی آدم کو آج بھی اسی طرح سے ہے، جس طرح ہمارے اَبا کو بہکایا تھا نسخہ اس کا وہی ہے، اور وہی نسخہ آج اَبا کی اولاد پر استعمال ہو رہا ہے، اور جیسے اَبا چکر کھا گیا تھا اسی طرح سے اَبا کی اولاد بھی چکر کھا رہی ہے۔ اور آخر سب کو چکر دے کر اپنے ساتھ ہی لے جائے گا، اور وہاں جا کر رونق لگائے گا۔

جہنم میں اِبلیس کا اپنے متبعین کو خطاب، اور ان سے اعلانِ لاتعلقی

یہ آئے گا آپ کے سامنے سورۂ ابراہیم میں، اس نے پھر تقریر کرنی ہے، جہنم میں ایک جلسہ ہوگا، سارے کے سارے آدم کے بچے اکٹھے ہو کر اس کے پاس جائیں گے، کہ وہاں تو تو بڑی اُمیدیں دلاتا تھا، یہ کرتا تھا وہ کرتا تھا، آج تو ہم پھنس گئے، اب کوئی تدبیر بتا، کہ ہم نکلیں، اس وقت تو بڑے بہکا دے دیتا تھا، بڑی اُمیدیں دلاتا تھا، آج تو کوئی تدبیر بتا۔ تو جب سارے اکٹھے ہو کر جائیں گے پھر وہاں شیطان نے تقریر کرنی ہے سب بنی آدم کو اکٹھا کر کے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ: شیطان کہے گا جب معاملہ صاف ہو جائے گا، سارے کے سارا معاملہ صاف ہو جائے گا تو پھر شیطان کہے گا کہ بھائی! میں نے بھی تم سے وعدے کیے تھے، لیکن وہ تو سارے کے سارے جھوٹے تھے، اللہ اور اللہ کے رسول نے وعدے کیے تھے وہ سارے کے سارے سچے تھے، میں نے تمہیں کوئی زبردستی اپنے پیچھے لگا لیا؟ میں نے تو صرف بلایا تھا، تم اپنی خوشی کے ساتھ آئے تھے، فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: ایک طرف اللہ کی بات تھی اللہ کے رسولوں کی بات تھی، ایک طرف میری بات تھی، میرے پاس کوئی قوت نہیں تھی طاقت نہیں تھی کہ میں تمہیں زبردستی لے آیا، تم ان کو چھوڑ کر میرے پیچھے لگ گئے، تو تم اپنے آپ پہ ملامت کرو، مجھے کیا ملامت کر رہے ہو،

لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اپنے آپ کو ملامت کرو، فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ: مجھے ملامت نہ کرو، مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ: میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا، کہ تمہیں زبردستی لے آیا، میرے پہ الزام کیا دھرتے ہو، تمہارے سامنے اللہ کی باتیں نہیں تھیں؟ تو اس وقت ابلیس تقریر کرے گا، وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ کے بعد اس کا وہی خطبہ نقل کیا ہے جو اس نے جہنم میں پہنچنے کے بعد اپنے متبعین کے سامنے اور آدم کے بچوں کے سامنے دینا ہے۔[1]

شیطان کے چکّر سے بچنے کا طریقہ

یہ ساری کی ساری بات آپ کے سامنے جو نقل کی جارہی ہے، اس لیے نقل کی جارہی ہے کہ آدم کے بچو! سوچو اس بات کو، تم اس میدان کے اندر جو اترے ہوئے ہو تو تم کن حالات میں اترے تھے، اور یہ دشمن تمہارے پیچھے کس طرح سے لگا ہوا ہے، اور کیسے اللہ تعالیٰ کے سامنے چیلنج دے کر لگا ہوا ہے۔ اب اگر تمہارے ہوش ٹھکانے ہیں، اگر تم عقل مند ہو تو جب تمہارے سامنے آجائے کہ اللہ کی یہ بات ہے، اور اس نے اس بات سے روکا ہے، پھر چاہے ہزار حکمتیں تمہارے دل کے اندر ڈالی جائیں، کہ یہ غلط کام کرنے میں یہ مزہ ہے، یہ غلط کام کرنے میں یہ لطف ہے، اس میں یہ فائدہ ہے، یہ صحت کے لیے مفید ہے، یہ ذہن کے لیے مفید ہے، یہ عقل کے لیے مفید ہے، ہزاروں حکمتیں لاکھوں حکمتوں کو ٹھوکر ماردو، کام وہی کرو جو اللہ کا حکم اور اللہ کے رسول کا حکم ہے، پھر تو تم بچ جاؤ گے شیطان کے چکر سے۔ اور اگر یہ مصلحتیں سوچنی شروع کردیں تو تمہاری طبیعت ہمیشہ انہی کاموں کی طرف جائے گی جن سے اللہ نے روکا ہے، اور یہ وہی نسخہ ہے جو شیطان نے ہمارے ابا پر استعمال کیا تھا۔ یہ بات بنیادی طور پر ذہن میں ڈالنے کے لیے آپ کو یہ قصہ سنایا جارہا ہے، کہ جب بھی شیطان فائدہ اٹھائے گا تمہیں یہی چکر دے کر فائدہ اٹھائے گا، کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف چلنے میں تمہیں ہزاروں حکمتیں معلوم ہوں گی، تم کہو گے کہ اس طرح سے زینت حاصل ہوتی ہے، زیبائش حاصل ہوتی ہے، دنیا میں عزت حاصل ہوتی ہے، مال حاصل ہوتا ہے، دولت حاصل ہوتی ہے، لذتیں پوری ہوتی ہیں، اس قسم کی حکمتیں تمہارے ذہن میں آئیں گی، اور ان حکمتوں کے راستے سے تم پھسلو گے، اور اللہ تعالیٰ کے محرمات میں مبتلا ہو جاؤ گے، شیطان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

ممنوعہ درخت کھانے کے نتیجے میں جنّت کی نعمتوں سے محرومی

تو جب اس طرح سے ہوا تو اُن کا لباس جو عزت کا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے اتار دیا، تو آدم علیہ السلام نے تو اپنا ننگا وجود اس طرح سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، نہ حوا نے دیکھا تھا، اب فطرتِ آدم حیا کا تقاضا کرتی ہے کہ وجود ننگا نہیں رہنا چاہیے۔ تو لباس تو چھن گیا، جلدی جلدی درختوں کے پتے توڑ کر، جوڑ جوڑ کے اپنے آپ کو چھپانا شروع کردیا، پہلی تو یہ آفت سامنے آگئی، اور ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھڑکی پڑ گئی، سورۂ طٰهٰ کے اندر تفصیل آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنّت کے اندر آدم علیہ السلام کو ٹھہرایا تھا تو یہ کہا تھا کہ یہ

---

(۱) پ ۱۳۔ سورۂ ابراہیم۔ آیت ۲۲۔ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۚ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۚ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ۔

تمہارا دشمن ہے اس سے بچ کر رہنا، دیکھو! جنت میں تمہیں یہ راحت حاصل ہوگی، اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى: نہ تو تجھے یہاں بھوک پریشان کرے گی، اور نہ تُو ننگا ہوگا کہ تجھے کپڑے کی فکر پڑے، وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (سورۂ طٰہٰ:۱۱۸) اور نہ تجھے یہاں پیاس ستائے گی، اور نہ تجھے یہاں دُھوپ لگے گی، کہ اپنے لیے سائے کا انتظام کرنا پڑے، یہ خلاصہ ہے اس چیز کا جس کو آپ روٹی کپڑا مکان سے تعبیر کرتے ہیں، کہ دیکھو! جنّت کے اندر تیری تینوں ضرورتیں پوری ہیں، تجھے بھوک نہیں ستائے گی کہ تو روٹی کے لیے پریشان ہو، تو ننگا نہیں ہوگا کہ تجھے کپڑے کی ضرورت پیش آئے، اور دھوپ وغیرہ کی تکلیف نہیں پہنچے گی کہ اپنا سایہ کرنے کے لیے اور گرمی سے بچنے کے لیے مکان بنانے کا محتاج ہو، روٹی کپڑا مکان کا مسئلہ تیرا حل ہے، اس لیے ہوشیار رہنا ورنہ شیطان نے جب چکر دیا تو یہی چکر تمہیں دے گا کہ تمہیں ان مصیبتوں میں مبتلا کردے گا، ہر وقت زندگی کا یہی چکر کہ روٹی کپڑا مکان چاہیے، اسی چکر کے اندر تمہاری زندگی گزر جائے گی۔ بنیادی ضرورتیں جو تھیں انسان کی وہ ساری کی ساری وہاں پوری کردیں، لیکن جس وقت اس نے چکما دیا تو ایسے ہوا کہ لباس بھی چھن گیا، مکان بھی گیا روٹی بھی گئی، اور ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھڑک علیحدہ پڑ گئی۔

فطرتِ آدم اور فطرتِ شیطان میں فرق

جب جھڑک پڑ گئی تو یہاں آدم علیہ السلام کی فطرت شیطان کی فطرت سے کتنی ممتاز نظر آئی، کہ انہوں نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اقرار کیا، کہ یا اللہ! ہم سے غلطی ہوگئی، ہمیں معاف کردے، اگر تو ہم پر رحم نہیں کرے گا، اور ہمیں معاف نہیں کرے گا تو ہم تو خسارے میں پڑ گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے طریقہ بتادیا آدم کے بچوں کو، اور یہ بہت بڑا قیمتی نسخہ بتایا، کہ چونکہ ایک فطری کمزوری نسیان کی آدم علیہ السلام کے بچے میں ہے، یہ بھول جاتا ہے، اس کو کتنی ہی تاکید کردو، بسا اوقات اس کے ذہن میں بات نہیں رہتی، دوسرے کے چکر میں آجاتا ہے، لیکن اگر اس کے اندر آدمیت باقی ہوگی تو جب تنبہ ہوگا فوراً معافی مانگ لے گا، اور جب معافی مانگ لے گا تو ہم اُس کی تلافی کردیں گے۔ تو آدم علیہ السلام سے یہی بات ظاہر ہوئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب تنبیہ کی تو فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلیا، جب غلطی کا اقرار کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا۔

یہ دُنیا بنی آدم اور شیطان کا میدانِ جنگ ہے

معاف کرنے کے بعد، اب ذرا دیکھو! شیطان دھتکارا گیا تھا آدم علیہ السلام کی وجہ سے، اور آدم علیہ السلام جنت سے نکالا گیا شیطان کی وجہ سے، جب دو پہلوان ایک دوسرے سے یوں مات کھالیں تو پھر غصہ انتہا پر پہنچ جاتا ہے، ایک دفعہ اس نے گرالیا ایک دفعہ اس نے گرالیا، اب ایک دوسرے کے ساتھ چڑ اور غصہ انتہا کو پہنچ گیا، جب انتہا کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چلو اب زمین میں، وہیں جاکر آباد ہو جاؤ، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وہیں اب تمہاری عداوت قائم ہوگی اور آپس میں لڑو گے، ایک دوسرے کو بہکاؤ گے، سب کچھ کرو گے، نتیجہ اسی کے ہاتھ میں آئے گا جو ہمارے احکام کی پیروی کرے گا۔ بنیاد آپ کی دنیا میں کن حالات کے اندر رکھی گئی، یہ آپ کو سمجھایا گیا کہ آپ یہاں بیٹھو! آرام کے لیے، عیش کے لیے، عشرت کے لیے پیدا نہیں کیے گئے یہ تمہارے

لیے میدانِ جنگ ہے، جس میں تم کو اتار دیا گیا، اپنے آپ کو ایسے سمجھو جس طرح سے کوئی فوجی میدان جنگ میں کھڑا ہوتا ہے، میدان جنگ میں جب کھڑا ہوتا ہے تو اس کو ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے، کہ میں دشمن کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں اور دشمن کے نقصان سے کیسے بچ سکتا ہوں، جب انسان میدانِ جنگ میں کھڑا ہوتا ہے، تو یہی جذبہ ہوتا ہے کہ میں دشمن کی گھات سے بچوں کیسے، دشمن کے حملے سے اپنا بچاؤ کیسے کروں، اور اپنا کام کس طرح سے کروں۔ یہ جو جذبہ ہے میدانِ جنگ والا، اسی کو شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کہتے ہیں، کہ انسان کے دل میں ہر وقت یہ جذبہ ابھرا رہے، ہر وقت ہوشیار رہے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا وار میرے اوپر چل جائے، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اپنے مقصد کے سامنے دشمن کوئی رکاوٹ پیدا کر دے، دشمن کے واروں سے بچتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھو تا کہ اپنی منزل تک پہنچ جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے رکھی ہے، یہی تقویٰ کی زندگی ہے۔ اور یہ سارے کا سارا واقعہ بیان دوہرا کر اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے آپ کی زندگی کی بنیاد واضح کر رہا ہے کہ تم اس دنیا کے اندر پیدا جو ہوئے ہو تو ایک میدانِ جنگ کے اندر تمہیں اتارا گیا ہے، ایک طرف شیطانی قوتیں ہیں اور ایک طرف تم ہو، اور وہ شیطانی قوتیں چاہیں گی کہ اپنا انتقام لیں آدم کی اولاد سے، تمہیں بہکانا چاہیں گی اور جہنم میں پہنچانا چاہیں گی، تم نے اپنے آپ کو ہوشیار رکھنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننا ہے، اس کے خلاف نہیں چلنا۔ اگر یہ طریقہ اپناؤ گے تو اسی جنت کو حاصل کر لو گے، جو تمہارے باپ کی میراث ہے، اور اگر تم شیطان کے پیچھے لگ جاؤ گے تو بھائی! ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، تم سارے کے سارے اکٹھے ہو جاؤ گے ہم سب کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دیں گے، اس رکوع کے اندر گویا کہ آپ کے سامنے آپ کی زندگی کی بنیاد بتادی گئی، کہ آپ کی زندگی کی بنیاد اس پر ہے، اور آپ نے ہر وقت اپنے آپ کو اس مقام میں سمجھتے ہوئے چلنا ہے کہ ہم ایک میدانِ جنگ میں کھڑے ہیں شیطان ہمیں بہکاتا ہے، اور ہم نے اس کے بہکانے سے بہکنا نہیں، اپنی عقل کو ٹھکانے رکھتے ہوئے یہ دیکھو کہ اللہ کا حکم کیا ہے؟ اللہ کے رسول کا حکم کیا ہے؟ فائدہ اسی میں ہے۔ اور جس چیز سے اللہ اور اللہ کے رسول نے روک دیا، ہزار حکمتیں شیطان تمہیں سمجھائے گا لیکن ان حکمتوں سے متاثر نہیں ہونا، اگر ان حکمتوں سے متاثر ہو کر اس راستے پر چل پڑو گے تو جیسے اس نے آدم کو چکر دے دیا تھا اسی طرح سے تمہیں چکر دے دے گا، جیسے اس واقعہ کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ کہے گا یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ، آخر میں جا کر آپ کو یوں متنبہ کریں گے، یہ جو میں تقریر کر رہا ہوں آپ کے سامنے وہ اسی کا حاصل ہے، یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اے آدم کے بچو! لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ تمہیں شیطان کہیں فتنے میں نہ ڈال دے كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ جس طرح سے اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا، بس اس بات سے ہوشیار رہو۔ تو یہ رکوع جو آپ کے سامنے پڑھا گیا، اس کے اندر آپ کی زندگی کی ابتدا اس طرح سے ذکر کی گئی، اور آپ کی حیثیت دنیا کے اندر متعین کر دی گئی، کہ آپ نے وقت کس طرح سے گزارنا ہے، یہ باتیں بنیادی طور پر ذہن میں پڑ جائیں تو انسان پھر شیطانی کام اور رحمانی کام کے درمیان فرق کرنے لگ جائے گا، شیطانی کاموں سے بچے گا چاہے اس میں ہزار فائدے معلوم ہوں، اور رحمانی کام کرے گا چاہے اس میں بظاہر اس کو کوئی فائدہ معلوم نہ ہو،

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ ہے وہی میرے لیے مفید ہے، اور دوسرا شیطان کا راستہ ہے وہ میرے لیے دشمن ہے، چاہے ہزار حکمتیں بتائے لیکن نتیجۃً وہ میرے لیے نقصان دہ ہے۔ ترجمہ بار بار کر دیا گیا تھا، اور مطلب تمام آیات کے تحت آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

مذکورہ رُکوع پر ایک نظر اور!

حضرت آدم علیہ السلام کے خلق اور تصویر کا مفہوم

شروع میں آیا تھا وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ یہ دو باتیں ذکر کی تھیں ایک خلق اور ایک تصویر، ان دونوں باتوں کا مطلب یہ ہے کہ پہلے مادہ پیدا کیا جس سے آدم علیہ السلام نے بننا تھا، اور پھر اُس کی صورت بنا دی، جیسا کہ سورۂ حشر میں تین لفظ آئیں گے الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ، ان سب لفظوں کا مفہوم قریب قریب ہی ہے، مثلاً ایک تو لوہا ہے اور ایک یہ کہ لوہے کو پرزوں کی شکل میں ڈھال لیا، اور ایک یہ کہ پھر ان پرزوں کو جوڑ کر انجن بنا دیا، تو خلق کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح سے اصل مادہ پیدا کیا، الْبَارِئُ کا مفہوم ہوگا کہ اعضاء بنائے، تصویر کا مفہوم ہوگا کہ سب کو جوڑ کر ایک مکمل صورت بنا دی، تو یہاں خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ میں اس طرح سے دو درجے نکل آئیں گے، پہلے تو وہ مواد (مادّے) پیدا کیے جن سے آدم کو بنانا تھا، جیسے مٹی، پانی، ہوا، آگ جو کچھ بھی ہے، پھر اس کو ایک خاص صورت میں ڈھال لیا۔

کیا شیطان کو مانگی ہوئی مہلت پوری ملی یا کچھ کم ملی؟

آگے آیا تھا ابلیس کی دُعا میں اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۔ تو یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ سے تو قیامت مراد ہے جس دن کہ اٹھائے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے، یہاں وہ الفاظ نہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ الفاظ آئیں گے فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (سورۃ حجر: ۳۷) تجھے مہلت دی ہوئی ہے وقت معلوم کے دن تک۔ تو یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ اور یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ان دونوں کا کیا مفہوم ہوا، بظاہر اگر دیکھا جائے تو یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ سے مراد ہوگا نفخۂ ثانیہ جس میں بعث ہوگا، لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ پھر اس سے بظاہر معلوم ہوگا کہ نفخۂ اُولیٰ کے وقت شیطان کو مرنا نہیں چاہیے، جب کہ باقی کائنات فنا ہوگی اس وقت شیطان نہیں مرے گا۔ تو پھر اگر یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ سے نفخۂ اُولیٰ کا وقت مراد لیا جائے، کہ وقت معلوم سے عالم کے فنا ہونے کا وقت مراد ہے، پھر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ابلیس نے جتنی دُعا مانگی تھی اتنی قبول نہ ہوئی، بلکہ کوئی تھوڑا سا فرق پڑ گیا، کہ اُس نے تو یوم بعث تک اپنی زندگی مانگی تھی مہلت مانگی تھی، اور اس کو مہلت ملی یوم فنا تک، کہ جس دن کائنات نے فنا ہونا ہے، تو گویا کہ جتنی اُس نے دُعا مانگی تھی اتنی نہ ملی، کچھ تھوڑا سا فرق رہ گیا۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق بات بالکل صاف ہے کہ یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ اور یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ دونوں کا مصداق ایک ہی ہے یعنی قیامت کا دن، جو نفخۂ اُولیٰ

سے شروع ہوگا۔ یہ یقینی بات ہے کہ نفخۂ اُولیٰ کے وقت جس طرح سے باقی چیزیں فنا ہوں گی شیطان بھی فنا ہو جائے گا، اس کے بعد یہ زندہ نہیں رہے گا۔ پھر جس دن دوبارہ اٹھائے جائیں گے اسی دن اس کو بھی دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ تو اس سے مراد قیامت کا دن ہے، اور قیامت کا دِن شروع ہو جائے گا نفخۂ اُولیٰ سے، اور آگے پھر وہ ممتد ہے، لمبا ہے، اسی دن کے ایک حصے میں گویا کہ فنائیت ہے، اور اسی دِن کے دوسرے حصے میں دوبارہ زندہ کرنا ہے، اس لیے اس دِن کو یوم البعث بھی کہہ سکتے ہیں، اور اس دِن کو یوم الفناء بھی کہہ سکتے ہیں، گویا کہ دِن وہ ایک ہی ہے جو نفخۂ اُولیٰ سے شروع ہوگیا، نفخۂ اُولیٰ سے قیامت شروع ہوگئی، اب اس کے ابتدائی حصے کے اندر فنائیت ہے، کہ سارے کے سارے لوگ فنا ہو جائیں گے، اور پچھلے حصے کے اندر دوبارہ پھر بعث ہو جائے گا۔ اس لیے جیسے اس نے دُعا مانگی تھی ویسے ہی قبول کی گئی کہ یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ سے مراد ہے قیامت کا دِن، اور قیامت کا دِن شروع ہو جائے گا نفخۂ اُولیٰ سے، تو جس وقت پہلا صور پھونکا جائے گا اور کائنات فنا ہوگی تو قیامت شروع ہوگئی، اب اس کے پہلے حصے میں سارے کے سارے فنا ہو جائیں گے، اسی دِن کے ایک حصے میں دوبارہ زندہ کیا جائے گا، لہٰذا ''یوم بعث'' کا مصداق بھی وہی ہے، اور ''یومِ فنا'' کا مصداق بھی وہی ہے، اور ''وقتِ معلوم'' سے بھی وہی دِن مراد ہے، اس طرح سے مفہوم صاف ہو جاتا ہے، کہ قیامت کا دِن صرف یومِ بعث ہی نہیں، یومِ فنا بھی قیامت کا دِن ہی ہے، ایک ہی دن ہے جس کے مختلف حصوں کے اندر مختلف قسم کے واقعات پیش آئیں گے۔

''صراطِ مستقیم'' کا مفہوم اور شیطان کے اس پر بیٹھنے کا مقصد

پھر آگے اس میں آیا تھا کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ: میں ان بنی آدم کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ تو ''سیدھے راستے'' سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ، صحیح عقیدہ صحیح عمل یہی سیدھا راستہ ہے، عقائد میں بنیادی حیثیت توحید کی ہے، تو توحید یہ سیدھا راستہ ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے جو دُعا کرتے ہیں سورۂ فاتحہ میں وہ یہی کرتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلانا، ہم بھی صراطِ مستقیم کی ہدایت اللہ سے مانگتے ہیں، کہ ہمیں سیدھے راستے پر چلانا۔ اور سیدھے راستے کا مصداق سورۂ یٰس کے چوتھے رُکوع میں ذکر کیا گیا وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ: میری عبادت کرو، صراطِ مستقیم یہی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت یہ ہے صراطِ مستقیم۔ اور اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (سورۂ مریم: ۳۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان میں بھی آئے گا کہ اللہ ہی میرا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے، اسی کی عبادت کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔ تو صراطِ مستقیم سے مراد ہے سیدھا راستہ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا راستہ، جس راستے پر چلنے سے اللہ تعالیٰ ملتا ہے اور اللہ کی رضا نصیب ہوتی ہے، وہ ہے سیدھا راستہ جس کی ہم صبح شام نماز کے اندر اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اپنی عبادت کے راستے پر چلا، جس پر چلنے کے ساتھ تو ملتا ہے اور تیری رضا ملتی ہے، جو سیدھا راستہ تیرے تک آتا ہے ہمیں اس راستے پر چلا۔ اور یہ جو شیطان نے کہا کہ میں تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا، تو یہ بیٹھنا ہے گھات لگا کر، ڈاکا زنی کی نیت سے، جس طرح سے لوگ راستے روک لیا کرتے ہیں، راستوں پر بیٹھ جاتے ہیں، آنے جانے والوں کو پریشان

کرتے ہیں، یا غلط مشورے دے کر غلط راستوں پر چڑھا دیتے ہیں، کہ ایک آدمی جا رہا ہے سیدھے راستے پر، اور دوسرا آدمی اُس سے دشمنی کرنا چاہتا ہے، یا اس کو کسی خطرناک جگہ کی طرف لے جا کر لوٹنا چاہتا ہے، تو اُس کو پوچھے گا کہ تو کدھر جا رہا ہے، وہ کہے گا فلاں طرف جا رہا ہوں، کہے گا کہ یہ راستہ تو دور ہے، اس راستے پر تو خطرات ہیں، یہ سیدھا راستہ ہے، ادھر سے ہو لے، اور اس کو سیدھے راستے سے کھسکا دیتا ہے، آگے چلنے نہیں دیتا، یا اس کا رخ موڑ دیتا ہے، اور پھر آگے لے جا کر اس کو برباد کر دیتا ہے، لوٹ لیتا ہے، قتل کر دیتا ہے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ تو جس طرح سے انسانی ظاہری آبادی کے اندر یہ واقعات ہیں کہ لوگ سیدھے راستے سے روکتے ہیں، غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں، تو باطنی اور روحانی طور پر بھی ایسے ہی ہے، کہ آپ ایک اخلاق کے سیدھے راستے پر ہیں، کوئی بہکا کر آپ کو غلط راستے پر ڈال دے گا، آپ ایک زندگی کی صحیح راہ پر چلے جا رہے ہیں، لوگ بہکا کر آپ کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں، تو یہ شیاطین ہی ہوتے ہیں، شیاطین کے چیلے چانٹے، جو ظاہری اور باطنی طور پر انسان کے لیے گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔ تو یہ بیٹھنا اس کا ڈاکا زنی کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ جو تیرا سیدھا راستہ ہے، جس پر چلنے کے ساتھ تو خوش ہوتا ہے، جو تیرے تک پہنچتا ہے اور تیری رضا نصیب ہوتی ہے، میں اس کے اوپر ڈیرے ڈال لوں گا، اور بنی آدم کو اس راستے پر چلنے نہیں دوں گا۔ پھر آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، ہر طرح سے اُن پر حملہ آور ہو کر، یعنی وسوسوں کے ذریعے سے، ترغیبات کے ذریعے سے، ترہیبات کے ذریعے سے، ڈرا کر، دھمکا کر، لالچ دے کر، کہ اگر ادھر جاؤ گے تو تمہارا یہ نقصان ہو جائے گا، اور اگر ادھر جاؤ گے تو تمہیں یہ نفع ہو جائے گا، اس طرح سے کر کرا کر میں انہیں اس راستے سے بہکاؤں گا، اور میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا، کہ بہت کم لوگ رہیں گے جو تیرے سیدھے راستے پر چلیں گے، اور زیادہ کو میں اغوا کر لوں گا تو صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ کا یہ مفہوم ہے۔

سوال:- اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور جنّت میں ٹھہرایا، اور شیطان نے بہکا کر درخت کھلا دیا جس سے منع کیا گیا تھا، تو جنّت سے نکلنے کا وہ باعث بن گیا، اگر حضرت آدم علیہ السلام بہکاوے میں نہ آتے شیطان کی بات نہ مانتے، اور درخت نہ کھاتے تو کیا پھر وہ جنّت میں ہی رہتے؟

جواب:- ان کا سوال معقول ہے۔ بھئی! آنا تو ہمارے اَبا نے اسی زمین پر ہی تھا، کیونکہ جب اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، بنایا گیا تھا، تو یہی کہا گیا تھا اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (سورۂ بقرہ: ۳۰) میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تو پیدا ہی کیا گیا تھا زمین میں آباد ہونے کے لیے، اور جنّت میں ٹھہرایا تھا تھوڑی دیر، تاکہ زمین کو جو آگے آباد کرنا ہے تو جنّت کے اندر کچھ آبادی کا رنگ دیکھ لے، آج انسان کا ذہن جو مختلف قسم کے باغات، باغیچے، محلات اور اس قسم کی آرائش، نہریں چلانا وغیرہ جو کچھ بن رہا ہے، یہ انسان کی فطرت میں وہی جنّت کے نقشے پڑے ہوئے ہیں، اس لیے دنیا میں جس کو بھی اسباب مہیا ہوئے اُس نے دنیا میں جنّت بسانے میں کمی نہیں کی، جیسے جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، تو یہ وہیں دیکھے ہوئے تھے، بدہ فطرت میں وہی نقشے ذہن میں پڑے ہوئے ہیں۔ تو جن کو اللہ نے توفیق دی، جن کے لیے اسباب مہیا تھے انہوں نے اپنے لیے باغات اور انہار

میں کمی نہیں کی، اور کہیں دُور جا کر نہیں دیکھ سکتے تو مغلیہ خاندان کی سیر گاہیں جا کر دیکھ لو، یہ "شالامار" وغیرہ، کہ کیسے باغ بنائے اور کیسے درمیان میں نہریں چلائیں، کس طرح سے ان کو خوشنما بنایا، اور محلات کس طرح سے لوگ بناتے ہیں اپنی راحت و آرام کے لیے، دنیا کو آباد کس طرح سے کیا، یہ وہی نقشے ہیں جو آدم علیہ السلام نے جنّت میں رہ کر دیکھے تھے، اور وہ آدم کے ذہن میں پڑے ہوئے ہیں، اور اولاد کے ذہن سے ظاہر ہے کہ جیسے جیسے اسباب مہیا ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتوں کے تحت کچھ اسی قسم کے نقشے آدم علیہ السلام کے ذہن میں ڈالنے کے لیے اُن کو جنت میں آباد کیا۔ ایک وقت آتا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین میں بھیجنا تھا، اور زمین میں آ کر خلافت اُس کے سپرد کرنی تھی، کہ اب اس زمین کی آبادی اور اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت، اور اس کے مطابق حکومت قائم کرنا اب یہ تیرے ذمے ہے، اب اس کو سنبھالو۔ آنا تو تھا، تو ابلیس نے وہ شجرہ کھلا کے بھیج دیا۔ دونوں باتوں میں فرق ہے، ایک تو ہے کہ آپ گھر سے چلتے ہیں، پتا ہے کہ دس بارہ شوال کو مدرسہ کھلنا ہے، اور آپ نے "باب العلوم" میں پہنچنا ہے، تو اس وقت تک آپ ماں باپ کے فرمانبردار، خدمت گزار، گھر کے اندر امن وراحت کے باعث۔ ماں آپ کو رخصت کرے گی، بہن بھائی آپ کو محبت کے ساتھ، پیار سے، چومتے ہوئے، عزت کے ساتھ، دُعائیں دیتے ہوئے، موٹر پر تو وہ بھی چڑھادیں گے۔ اور ایک ہے کہ آپ گھر میں برتن توڑیں، لڑیں، اور تنگ کر ڈالیں، پھر روانگی کی تاریخ آگئی، جس وقت روانگی کی تاریخ آگئی، رخصت وہ تب بھی کریں گے لیکن کہیں گے دفع ہو کہیں، جا جدھر جانا ہے، جان چھوڑ ہماری، تو رخصت تو کریں گے لیکن ناراض ہو کر۔ جو بچے گھر تنگ کرتے ہیں، اور فساد مچاتے ہیں، ان کو والدین بھیجتے تو ہیں لیکن بھیجتے ہوئے اس وقت کچھ ناراضگی کے آثار ہوتے ہیں، یہ ایک مثال دے رہا ہوں...... اگر آدم علیہ السلام کے سامنے ابلیس کا چکر نہ ہوتا، تو اُترنا ذرا عزت کے ساتھ ہوتا، اور اب اس چکر میں آگئے تو کچھ ناراضگی کے اظہار کے ساتھ رخصت کر دیا، اور اس میں بھی اللہ کی حکمتیں تھیں، اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ تو آدم علیہ السلام کو جنّت سے رخصت کیا ذرا ناراضگی کا اظہار کر کے، اور اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو پھر یہ ناراضگی کا اظہار نہ ہوتا، پھر عزت اور اکرام کے ساتھ آجاتے۔ ورنہ آنا تو آدم علیہ السلام نے زمین میں ہی تھا، وہ تو پیدا ہی زمین کے لئے کیے گئے تھے، آسمان میں، جنّت میں رہنے کے لئے پیدا نہیں کیے گئے تھے، جنّت اس کو ملنی تھی انتہاء، لیکن اس کی فطرت کے اندر جنّت کا شوق ڈالنے کے لئے اور جنّت کا کچھ نقشہ سمجھانے کے لئے، جس کے مطابق دنیا کو آباد کرنا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت چند روز کے لئے ان کو جنّت میں چھوڑ دیا، ورنہ وہیں آبادی نہیں ہونی تھی، اگر آدم علیہ السلام کی وہیں اولاد شروع ہو جاتی، اور تم اور ہم وہیں پیدا ہو جاتے تو اَبا تو ہمارا سمجھ دار تھا، وہ تو ٹھیک ٹھاک رہ جاتا، اور تم آپس میں لڑتے تو جنّت میں یہی دنگا ہوتا جو پاکستان میں ہو رہا ہے، تو پھر جنّت کیا ہوتی وہ بھی جہنّم ہی بن جاتی، خیر تو ہم نے کرنی نہیں تھی، پھر اسی طرح سے لڑتے بھڑتے، یہی فساد وہاں ہوتا، پھر جو گڑبڑ کرتا اللہ تعالیٰ کان سے پکڑ کے نیچے اتارتا، کسی کی ماں وہاں ہوتی بیٹا نیچے ہوتا، کسی کی بہن وہاں ہے بھائی نکل گیا، کسی کی بیوی وہاں ہے خاوند نکل گیا، پھر یہی قصہ ہوتا، پھر جنّت میں رونا دھونا ہی ہو جاتا، جس نے گڑبڑ کرنی تھی اللہ تعالیٰ نے نکال تو دینا ہی تھا، تو اچھا ہو گیا کہ اَبا جی آگئے اور سارا خاندان ایک ہی جگہ آ کے آباد ہو گیا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ

اے آدم کے بچو! تحقیق اُتارا ہم نے تم پر لباس جو چھپاتا ہے تمہاری شرم گاہوں کو، اور (اُتارا تم پر لباس) زینت کے لئے، اور تقوے

التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ

کا لباس یہ بہتر ہے، یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۶﴾ اے آدم کے بچو!

لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا

تمہیں شیطان فتنے میں نہ ڈال دے جیسے کہ اُس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکال دیا، اُتارتا تھا شیطان ان دونوں سے ان کا لباس

لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ

تاکہ دکھادے اُن دونوں کو اُن کی شرمگاہیں، بیشک وہ دیکھتا ہے تمہیں وہ بھی اور اُس کی جماعت بھی ایسی جگہ سے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے،

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاِذَا فَعَلُوْا

بے شک ہم نے بنادیا شیاطین کو دوست اُن لوگوں کے لیے جو کہ ایمان نہیں لاتے ﴿۲۷﴾ اور جس وقت یہ کوئی بے حیائی کا

فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ

کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پایا ہم نے اس طریقے پر اپنے آباء کو اور اسی طریقے کا حکم دیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے، آپ کہہ دیجئے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

بیشک اللہ تعالیٰ نہیں حکم دیتا بے حیائی کے کام کا، کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے ﴿۲۸﴾

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

آپ کہہ دیجئے حکم دیا میرے رَبّ نے انصاف کا، اور سیدھا رکھو تم اپنے چہروں کو ہر نماز کے وقت

وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾

اور پکارو اس اللہ کو اس حال میں کہ تم اسی کے لئے اطاعت کو خالص کرنے والے ہو، جیسے اس نے تمہیں شروع کیا تم لوٹو گے ﴿۲۹﴾

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا

ایک فریق کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک فریق، اس کے اوپر گمراہی ثابت ہوگئی، بیشک انہوں نے بنالیا

الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

شیاطین کو دوست اللہ کو چھوڑ کر، اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بیشک وہ سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں ﴿۳۰﴾

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا

اے آدم کے بچو! اختیار کیا کرو اپنی زینت مسجد کی ہر حاضری کے وقت، اور کھاؤ اور پیو

وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا حد سے تجاوز کرنے والوں کو ﴿۳۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ- يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا: بنی آدم میں بنی اصل میں بَنِيْنَ تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ بنین ابن کی جمع ہے۔ اے آدم کے بیٹو! (اور بیٹوں میں بیٹیاں بھی آگئیں، اس لئے آدم کی اولاد مراد ہے) اے اولادِ آدم! اے آدم کے بچو! تحقیق اتارا ہم نے تم پر لباس، يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ: يُوَارِيْ یہ لفظ پہلے آپ کو بتایا ہے، مُوَارَاۃ: چھپانا۔ ایسا لباس جو کہ چھپاتا ہے۔ سوءات کا لفظ پہلے کئی دفعہ گزر گیا، یعنی اعضائے مستورہ جن کا کھلنا اور ننگا ہونا انسان کے لئے باعث دکھ ہوتا ہے، باعث صدمہ ہوتا ہے، تو سوءات سے وہ اعضاء مراد ہیں۔ ''جو چھپاتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو، تمہارے اعضائے مستورہ کو'' وَرِيْشًا: اور اتارا تم پر لباس زینت کے لئے۔ گویا کہ لِلْمُوَارَاۃِ وَلِلزِّيْنَۃِ یہ دو مقصد ہو گئے، بدن کا چھپانا اور زینت، ''تحقیق اتارا تم پر لباس جو چھپاتا ہے تمہارے مخصوص اعضا کو اور زینت کے لئے'' وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ: اور تقوے کا لباس یہ بہتر ہے، ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: تا کہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ يَذَّكَّرُوْنَ اصل میں تھا يَتَذَكَّرُوْنَ، تاء کو ذال کر کے ذال کو ذال میں ادغام کیا۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ: اے آدم کی اولاد! اے آدم کے بچو! لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ: خرابی میں نہ ڈال دے تمہیں شیطان، فتنے میں نہ ڈال دے تمہیں شیطان، كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ: جس طرح سے اس نے نکال دیا تمہارے والدین کو جنت سے۔ ابوین: ماں اور باپ دونوں ہو گئے، تغلیباً باپ کا تثنیہ آ گیا، تو ابوین سے اَب اور اُم مراد ہیں، ''تمہیں شیطان فتنے میں نہ ڈال دے جیسے کہ اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکال دیا'' يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا: اتارتا تھا وہ شیطان (چونکہ شیطان سبب بنا اس لئے نسبت اس کی طرف ہو گئی) اتارتا تھا شیطان ان دونوں سے ان کا لباس، لِيُرِيَهُمَا: تا کہ دکھا دے ان دونوں کو اُن کے اعضائے مستورہ، ان کی شرمگاہیں، اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ: بیشک وہ شیطان دیکھتا ہے تمہیں وہ بھی اور اس کی جماعت بھی۔ یہ هُوَ ضمیر منفصل آ گئی یری کی، جس طرح سے پہلے بتایا تھا کہ ضمیر مرفوع متصل پر عطف جب بھی کیا جائے تو ضمیر منفصل کے ساتھ اس کی تاکید لائی جاتی ہے۔ ''بیشک وہ دیکھتا ہے تمہیں وہ بھی

اور اس کی جماعت بھی' مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ: ایسی جگہ سے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے، ایسی حیثیت سے تمہیں وہ دیکھتے ہیں کہ تم انہیں نہیں دیکھتے، اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ: بیشک ہم نے بنا دیا شیاطین کو دوست، لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ: ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان نہیں لاتے، وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً: اور یہی لوگ جو ایمان نہیں لاتے، جو شیطانوں کے دوست ہیں، اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً: جس وقت یہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں قَالُوْا: کہتے ہیں کہ وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا: پایا ہم نے اس طریقے پر اپنے آباء کو، اپنے باپ دادوں کو، وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا: اور اسی طریقے کا حکم دیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے، قُلْ: آپ کہہ دیجئے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ: بیشک اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیتا، لَا یَاْمُرُ: نہیں حکم دیتا بِالْفَحْشَآءِ: بے حیائی کے کام کا، اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی بات جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ یعنی بے علمی کے ساتھ اللہ کے اوپر باتیں تھوپ رہے ہو؟ کہ اللہ نے ہمیں یہ کرنے کے لئے کہا ہے، (حالانکہ) اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیا کرتا، اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ: کیا تم بولتے ہو اللہ پر، مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ: آپ کہہ دیجئے حکم دیا میرے رَبّ نے قِسط کا۔ قِسط کہتے ہیں انصاف کو۔ میرے رَبّ نے حکم دیا ہے انصاف کا، وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ: اور سیدھا رکھو تم اپنے چہروں کو، عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: مسجد یہ مصدر میمی ہے، سجدہ کے معنی میں، تو اس سے صرف نماز مراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے، اور مطلق عبادت مراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے، ''ہر نماز کے وقت اپنے چہروں کو سیدھا رکھو'' یا ''ہر عبادت کے وقت اپنے چہروں کو سیدھا رکھو'' یعنی اللہ کی طرف، جیسے کہ وَادْعُوْهُ کے اندر یہی بات آ گئی، ''اور پکارو اس اللہ کو اس حال میں کہ تم اسی کے لئے اطاعت کو خالص کرنے والے ہو'' دین اطاعت کو بھی کہتے ہیں عقیدے کو بھی کہتے ہیں ''اپنی اطاعت کو خالص اللہ کے لئے کرتے ہوئے اللہ کو پکارو اور اللہ کی عبادت کرو'' دُعاء پکارنے کو کہتے ہیں اور یہ عبادت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ كَمَا بَدَاَكُمْ: جیسے کہ اس نے ابتداءً تمہیں بنایا تَعُوْدُوْنَ: تم لوٹو گے۔ عود لوٹنے کو کہتے ہیں۔ كَمَا بَدَاَكُمْ: جیسے اس نے شروع میں تمہیں بنایا، جیسے تمہیں شروع کیا، تَعُوْدُوْنَ: تم لوٹو گے۔ فَرِیْقًا هَدٰی: ایک فریق کو اللہ نے سیدھے راستے پر چلایا، ہدایت دی، وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ: اور ایک فریق، اس کے اوپر گمراہی ثابت ہو گئی۔ حَقَّ: ثابت ہو گئی، عَلَیْهِمْ: ان پر، الضَّلٰلَةُ: گمراہی۔ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ: بیشک انہی لوگوں نے جن پر گمراہی ثابت ہو گئی بنا لیا شیاطین کو دوست۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ انہوں نے بنا لیا شیاطین کو دوست مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کو چھوڑ کر، وَیَحْسَبُوْنَ: اور یہ لوگ سمجھتے ہیں اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: کہ بیشک وہ سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں، یعنی گمراہ ہو گئے، شیطانوں کو دوست بنا لیا، اور سمجھے یہ بیٹھے ہیں کہ سیدھے راستے پر چلنے والے ہم ہی ہیں۔ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ: اے آدم کے بچو! اختیار کیا کرو زینت، زِیْنَتَكُمْ: اپنی زیبائش آرائش اختیار کیا کرو، عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: ہر عبادت کے وقت، یا ہر دفعہ مسجد میں آتے وقت، مسجد کی ہر حاضری کے وقت تم زیب و زینت کو اختیار کیا کرو، خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ: زینت کو اختیار کرو، عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: ہر عبادت کے وقت، یا، مسجد کی ہر حاضری کے وقت، جب مسجد میں آؤ تو زیب و زینت اختیار کر کے آؤ، وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا: اور کھاؤ اور پیو، وَلَا تُسْرِفُوْا: اور حد سے تجاوز نہ کرو، اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا حد سے تجاوز کرنے والوں کو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

گزشتہ رکوع سے ربط

پچھلے رکوع میں جو آپ کے سامنے آدم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا، اس میں یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام اور حواء کو بہکایا، اور اُن کے بہکانے کا سب سے پہلے نقصان کیا پہنچا؟ کہ عزت کا لباس اتر گیا، جو اللہ تعالیٰ نے پہنایا تھا وہ لباس چھن گیا، اور اللہ تعالیٰ نے جو بدن ڈھانپا تھا وہ کھل گیا، جو آدم علیہ السلام اور حواء کے لیے بڑا پریشانی کا باعث بنا، پھر وہ اپنے بدن کو چھپانے کے لئے جنت کے پتے جوڑنے لگ گئے، پتوں کے ساتھ اپنے بدن کو ڈھانپنے لگ گئے، یہ واقعہ آپ کے سامنے گزرا۔ اور اسی طرح سے جنت کی نعمتیں جو کھانے کے لیے ملی ہوئی تھیں، شیطان کے اس بہکاوے میں آنے کی وجہ سے وہ بھی چھن گئیں، تو گویا کہ بلا مشقت جو رزق حاصل ہوتا تھا اس سے بھی محروی ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت و کرامت کا جو لباس حاصل تھا وہ لباس بھی چھن گیا۔ اور پھر اُس کی عداوت آدم علیہ السلام کے ساتھ جو علی الاعلان نمایاں کر دی گئی اس کو بنایا گیا ہے بنیاد، بنیاد بنانے کے بعد اب بعض ان خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں بنی آدم مبتلا ہو گئے شیطان کے بہکاوے کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اسی قسم کا فتنہ ہے جس میں تمہیں شیطان نے ڈال دیا، جیسے کہ تمہارے ابوین کو ڈال دیا تھا، اس سے خصوصیت کے ساتھ بعض رسموں کی تردید کرنا مقصود ہے جو مشرکین نے اختیار کر رکھی تھیں۔

مشرکینِ مکہ کی دورانِ طواف بے حیائی

سب سے زیادہ بے حیائی کا کام جو مشرکین نے اختیار کر رکھا تھا، وہ یہ تھا کہ بیت اللہ کا طواف وہ ننگے ہو کر کرتے تھے، آگے پیچھے تو کچھ نہ کچھ بدن ڈھانکا ہوا ہوتا، لیکن جس وقت طواف کرنے کے لئے آتے تھے تو قریش کے علاوہ (قریش اپنے آپ کو اس قانون سے مستثنیٰ سمجھتے تھے) باقی دنیا کے جس حصے کے لوگ بھی آتے طواف کرنے کے لیے، وہ یا تو قریش سے لباس مانگ لیں مستعار، کوئی ان کو اپنے کپڑے دے دے پہننے کے لیے، اگر کوئی قریشی اُن کو کپڑے پہننے کے لیے نہ دے تو پھر جو پہنا ہوا لباس ہوتا تھا، وہ اتار کر رکھ دیتے اور پھر وہ ننگے ہو کر طواف کیا کرتے تھے، چاہے مرد ہوں چاہے عورتیں ہوں۔[1] اب یہ بے حیائی کا کام انہوں نے شروع کر لیا، تو پھر عرب کے پرانے شعراء کے قصائد اگر پڑھو گے تو ایسے موقع پر وہ فساق فجار عیاش قسم کے لوگ نظر بازی کرتے، اور اس میں اپنے عشق کو اپنے اس قسم کے جذبات کو آگے بڑھاتے، پھر اُن کا شعروں کے اندر ذکر کرتے اور فخر کرتے، گویا کہ اللہ کے حرم کو اور اللہ کے گھر کو انہوں نے ایک بے حیائی کا اڈا بنا لیا تھا، اور فساق فجار کے لیے نظر بازی کا ایک بہت بڑا بازار کھل گیا تھا، وہ اپنی عشق بازی کے جذبات کو یہاں آ کے تسکین دیتے تھے، اور جب انہیں کہا جاتا تھا کہ تم اس قسم کے کام نہ کرو، یہ تو بے حیائی کے کام ہیں، تو وہ کہتے، لو جی! ہمارے باپ دادا اسی طرح سے کرتے آئے ہیں، یہ تو اللہ کا حکم ہے، اُلٹا اس بے حیائی

---

(۱) بخاری ۱/۲۲۶ باب الوقوف بعرفۃ۔ ولفظ الحدیث: قَالَ عُرْوَةُ كَانَ النَّاسُ يَطُوفُونَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ عُرَاةً إِلَّا الْحُمْسَ وَالْحُمْسُ قُرَيْشٌ الخ۔

کے کام کو اللہ پر تھوپ دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا قصہ سنا کر اُن کو یہ کہا ہے کہ بدبختو! یہ تو وہی شیطانی حرکت ہے، جس طرح سے اس نے تمہارے آباء کا لباس اتروا دیا تھا، اُس نے وہاں اتروا دیا بہکا کر، اور یہاں تمہارے دلوں میں وسوسے ڈال کر، تمہیں گمراہی کی طرف لے جا کر مصلحتیں سمجھا سمجھا کر یہاں بھی تمہارا لباس اتروا دیا۔ لیکن وہ (آدم علیہ السلام) تو فطرتِ سلیم پر تھے کہ جس وقت اُن کا لباس اترا تو انہوں نے پھر پتوں کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپنے کی کوشش کی، اور تم ایسے شیطان کے چکمے میں آگئے ہو کہ تم اپنے اختیار کے ساتھ لباس اتارتے ہو، اور پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ہی ضرورت محسوس نہیں کرتے، تو پچھلی تاریخ کو دوہرا کر گویا کہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ بھی شیطان کا چکمہ ہے۔

آج کی نئی تہذیب اور عُریانی کی جدید صورتیں

لیکن اب اس کو صرف مشرکینِ مکہ تک ہی نہ بند رکھو (سمجھنے کی بات ہے) اُس زمانے میں لوگ کوئی پڑھے لکھے نہیں تھے، اس لیے بھدے طریقے کے ساتھ لباس اتروا دیا، کہ شلوار کھولی، چادر کھولی، اور رکھ دی، اور چلو طواف کرنے کے لیے، یہ ایک بھدا سا طریقہ تھا۔ اور آج اسی شیطان نے لباس فیشن کے تحت اتروا دیا، کیا آج لباس اترا ہوا نہیں ہے؟ اگر دیکھا نہیں تو یہ ننگی تصویریں نہیں دیکھتے اِدھر اُدھر اخباروں میں رسالوں میں؟ اور شہروں میں جا کر دیکھو جو لوگ اپنے آپ کو مہذب قرار دیتے ہیں ترقی یافتہ قرار دیتے ہیں، عورتیں تو بالکل عریاں ہیں۔ بالکل عریاں کا مطلب یہ ہے (اب آپ کہیں گے کہ یہ کیسی باتیں شروع کر دیں) کہ عام طور پر بڑے شہروں میں جو طبقہ اپنے آپ کو مہذب کہلاتا ہے ترقی یافتہ کہلاتا ہے، اُن کی عورتیں جب تفریح کے لیے نکلتی ہیں، تو صرف ایک سینہ بند معمولی سا، جو سینے پر باندھا ہوا ہوتا ہے، اور چڈا، کچھا (جانگھیا)، باقی سارا بدن ننگا ہوگا جس وقت وہ تفریح کے لیے نکلتی ہیں۔ یورپ کا تو کہنا ہی کیا، لاہور اور کراچی میں بھی یہ نقشے موجود ہیں، عورت کو ننگا کر دیا، اور عورت کو ننگا کرنے کے ساتھ ہی آپ جانتے ہیں کہ سارے کے سارے بے حیائی کے دروازے کھلتے ہیں۔ اور اگر لباس پہنوایا بھی تو وہ لباس بھی ایسا پہنوایا کہ جس کی وجہ سے بے حیائی میں ترقی ہوئی، کہ خوشنمائی ہوگئی، بدن اندر سے جھلک رہا ہے، اصل رنگ اگر براہِ راست نظر آئے تو اس میں اور شان ہوتی ہے، جب کپڑے میں سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے تو اس میں اور شان ہوتی ہے، اتنا باریک لباس کہ سارا بدن نظر آرہا ہے، جس کا پہننا نہ پہننا برابر ہے لیکن اُس کا پہننا ایک بڑے ہونے کی نشانی بن گئی، فیشن بن گیا، سر ننگا کر دیا، سینہ ننگا کر دیا، بازو ننگے کر دیے، ٹانگیں ننگی کر دیں، اور یہ یقین کر لیجئے کہ اس قسم کے خطے بھی ہیں، جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ بالکل مادرزاد ننگے ہو کر پھرنا ہی تہذیب ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ بدن کا ننگا ہونا یہ صحت کے لیے مفید ہے، دیکھو! جانور ننگے رہتے ہیں تو بڑے صحت مند رہتے ہیں، اور لباس فطرت کے خلاف ہے، اکٹھے ہو کر نہائیں گے تو ننگے ہو کر نہائیں گے، سیر و تفریح کریں گے تو ننگے ہو کر کریں گے۔ یہ وہی بلیاد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس طرح سے اس نے عزت کے لباس سے اور شرم کے لباس سے محروم کر دیا تھا، لیکن آدم علیہ السلام نے اپنی طبعی شرم کے تحت پھر اپنے بدن کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ لیکن آدم علیہ السلام کی اولاد کو شیطان بہکا کر کہاں لے گیا کہ ننگا ہونا فیشن بن گیا ہے، اور فیشن بنا کر آج دنیا شیطان کی اسی خواہش کو اور اُس کی اسی آرزو کو پورا کر رہی ہے۔

تنگ اور باریک لباس کا حکم

تو شرعی مقدار کے علاوہ جو بھی لباس پہنا جائے جس میں بدن کے اس حصے کو ننگا کیا جائے جس کو ننگا کرنے اجازت نہیں، عورت کے لیے، مرد کے لیے، یہ احکام آپ کے سامنے واضح ہیں کہ عورت اگر باہر نکلے تو اس کا بدن کتنا مستور ہونا چاہیے، تو پھر بالکل ننگا ہو تو بھی وہی بات ہے، اور اتنا باریک کپڑا پہنا ہوا ہو کہ اس میں سے بدن جھلکتا ہے تو بھی وہی بات ہے۔ اور ایسے ہی اتنا تنگ لباس پہنا ہوا ہو، کہ اعضا علیحدہ علیحدہ نظر آئیں تو یہ بالکل ننگے ہونے کے حکم میں ہے، جس میں اعضا کی موٹائی اور چوڑائی بالکل واضح نظر آئے، اتنا ٹائٹ لباس ہو کہ جس میں بدن کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی، بناوٹ ساری کی ساری معلوم ہو جاتی ہے تو یہ بھی ناجائز ہے۔ عورت کے لیے سارے بدن پر ناجائز، مرد کے لیے اعضائے مخصوصہ پر ناجائز، اس لیے اتنی تنگ پینٹ جس کے ساتھ وہ سب کچھ ہی نظر آئے، آگے سے بھی پیچھے سے بھی، یہ بالکل ممنوع لباس میں شامل ہے۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی ؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ ''الفصل بین چوتڑتین نمایاں ہوتا ہے!'' لیکن پچھلے دِنوں میں اتنی تنگ شروع ہو گئی تھی کہ اگلا حصہ بھی سارے کا سارا نمایاں ہوتا تھا، تو یہ ممنوع لباس ہے۔ اور عورت کا بدن چونکہ سارا ہی مستور ہے باہر نکلتے وقت! گھر میں تو آپ سمجھتے ہیں کہ محرم کے سامنے وہ سر ننگا رکھ سکتی ہے، بازو ننگے ہو سکتے ہیں، گھٹنے سے نیچے کا حصہ ننگا ہو سکتا ہے، یہ بھائیوں کے سامنے، ماں باپ کے سامنے، چونکہ گھر میں کام وام کرنے کی عادت ہوتی ہے، وہاں تو گنجائش ہے گھر میں رہتے ہوئے، لیکن جب عورت باہر نکلے تو اگر اس قسم کا لباس پہن کر نکلتی ہے جو بالکل تنگ ہے، یا بالکل باریک ہے تو یہ بالکل ننگی کے حکم میں ہے۔ تو جو بھی ہے، فیشن میں لا کر کسی طریقے سے بنی آدم کو شیطان نے ننگا کر دیا، اس کا لباس وہاں بھی اتروایا تھا اور یہاں بھی اتروا دیا۔

لباس کے مقاصد اور شرعی حدود

اور جب ان کو اس قسم کی باتوں پر متنبہ کیا جاتا ہے تو پھر وہ اس کو اپنی تہذیب بتاتے ہیں، اپنا تمدن بتاتے ہیں، اپنے بڑوں کا طریقہ بتاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم اسی طرح سے ہے کہ یوں ہی کرو، اللہ پر بہتان علیحدہ باندھنے شروع کر دیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ یہ بے حیائی کے کام ہیں، اور اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیا کرتا، اُس نے تو تمہارے لیے لباس اتارا ہے (اتارنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں پیدا کر دیں جن سے تم لباس تیار کر سکتے ہو) جس سے دو مقصد ہیں ایک بدن کا ڈھانپنا، اور دوسرے اپنے آپ کو زیب و زینت دینا۔ اس لیے لباس میں دونوں چیزیں ملحوظ ہوتی ہیں، ورنہ بدن تو آپ ٹاٹ کے ساتھ بھی ڈھانپ سکتے ہیں، لیکن یہ کوئی مطلوب نہیں ہے، اس میں خوبصورتی کی رعایت رکھو، ایسا لباس پہنو جس سے تمہاری شخصیت اجاگر ہو، ایسا لباس پہنو جس کے ساتھ تمہارے نظریات اور تمہارے مسلک کی ترجمانی ہو اس میں یہ بھی مقصود ہے، کیونکہ زینت اور زیب وہی ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق ہے، اب ایک مرد ہے وہ قیمتی سے قیمتی خوبصورت سے خوبصورت کپڑے پہنے، لیکن پہن لے زنانے، عورتوں کا لباس مردوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہوتا ہے، اب اگر کوئی مرد زنانے کپڑے پہن کر آ جائے تو آپ کیا کہیں گے کہ اس نے اچھا کیا ہے؟ تو اس زیب و زینت کا کوئی اعتبار نہیں، یہ حرام ہے، جس میں

انسان کی اپنی نوع ہی خلط ہو جائے کہ دیکھنے والے کو پتا ہی نہ چلے کہ مرد ہے یا عورت، ایسا لباس مرد کے لیے حرام ہے چاہے کتنا ہی زیب وزینت کا باعث کیوں نہ ہو، چاہے بدن ڈھکا ہوا ہے، لیکن اس میں اس کی نوعیت خراب ہو گئی، کہ اس کا مرد ہونا نمایاں نہیں بلکہ عورت ہونا نمایاں ہے۔ اور اسی طرح سے عورت لباس پہنے اور بالکل مردانہ پہن لے، چاہے اس کا بدن ڈھکا ہوا ہے اور چاہے وہ لباس خوبصورت ہے، لیکن اس کی نوع جو تھی وہ خلط ہو گئی، دیکھنے والا پہچان نہیں سکتا کہ یہ عورت ہے یا مرد، تو براہِ راست حدیث شریف کے اندر اسی عنوان کے تحت ایسی عورتوں پر لعنت کی گئی ہے جو کہ بہ تکلف مرد بننے کی کوشش کرتی ہیں، یعنی ایسا لباس اور ایسی ہیئت اختیار کرتی ہیں جو مردوں کی ہے، مُتَشَبِّهَات بِالرِّجَال پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی، اسی طرح مُتَشَبِّهِيْن بِالنِّسَاء پر بھی لعنت فرمائی۔ [1] تو بدن کی ہیئت ایسی بنانا، لباس کے ساتھ یا دوسرے پہناوے کے ساتھ، کہ مرد عورت لگنے لگ جائے، جس طرح سے آپ نے جوانوں میں دیکھا ہوگا، عام فیشن ہے، زنانے لباس مرد پہنے پھرتے ہیں، مردانے عورتیں پہنی پھرتی ہیں، سب اللہ تعالیٰ کی لعنت کا باعث ہیں، اس میں انسان کی نوعیت خلط ہوتی ہے...... اور ایسے ہی لباس کے اندر ایک یہ قید بھی ہے، کہ اگر کوئی لباس فساق فجار یا کافر قوم کا شعار ہے، اور تم ویسا پہننے لگ جاؤ گے کہ دیکھنے والے کو پتا نہ چلے کہ تم مسلمان ہو یا انگریز، تم مسلمان ہو یا عیسائی، اور دیکھنے والے کو پتا نہ چلے کہ تم کس جماعت سے تعلق رکھتے ہو، تو جس جماعت کے ساتھ ملتا جلتا لباس پہنا ہوگا اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کا شمار اسی جماعت میں ہے، ایک مسلمان ہوتا ہوا عیسائیوں جیسا لباس پہن لے تو "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" [2] جو کسی قوم کے ساتھ تشبیہ اختیار کرے گا انہی میں سے ہو جائے گا۔ اور اسی طرح سے آپ ذاتی طور پر نیک ہیں، نماز کے پابند ہیں، سب کچھ کرتے ہیں، لیکن اگر آپ فاسقوں فاجروں جیسا لباس پہنیں گے، تو اپنے لباس کے ساتھ تم اپنے آپ کو اس جماعت میں شامل کرتے ہو بازاری لوگوں میں، تو آپ کی باطنی نیکی اپنی جگہ رہی، لیکن ظاہری طور پر اللہ کے حساب میں آپ فاسق ہو جائیں گے، کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جو کسی قوم کے ساتھ تشبیہ اختیار کرتا ہے انہی میں شمار ہو جاتا ہے۔ اس لیے جس جماعت سے تعلق رکھتے ہو لباس ویسا پہنو، کہ دیکھتے ہی انسان کو نظر آجائے کہ یہ فلاں جماعت کا آدمی ہے، یہ کالج کا لڑکا ہے، یہ طالب علم مدرسہ کا ہے، یہ نیک لوگوں میں سے ہے، یہ فاسقوں بدمعاشوں میں سے ہے، آخر لباس کے ذریعے شخصیت نمایاں ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ یہ حدبندیاں ہیں جو کر دی گئیں، ان حدبندیوں کی رعایت رکھتے ہوئے آپ خوبصورت لباس پہنیں، صاف ستھرا لباس پہنیں، عین مقصود ہے، میلا کچیلا رہنا کوئی مقصود نہیں ہے، ننگے رہنا کوئی مقصود نہیں ہے، یہ سب باتیں اللہ کے احکام کے خلاف ہیں، لباس پہنو ستھرا پہنو، ایسا پہنو جو پہنا ہوا تمہارے اچھا لگے، لیکن ان چیزوں کی رعایت رکھو کہ مرد عورتوں جیسا لباس نہ پہنے، عورت مردوں جیسا نہ پہنے، اور فساق، فجار، کفار کے ساتھ تمہاری تشبیہ لازم نہ آئے، اگر دیکھنے میں تم یوں معلوم ہو کہ یہ تو کوئی بازاری لڑکا چلا جا رہا ہے تو یوں سمجھئے کہ آپ نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا ہے کہ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۸۷۴، باب المتشبھون/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۸۰، باب الترجل. لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ.

(۲) ابوداؤد ۲/ ۲۰۳، باب فی لبس الشھرۃ/ مشکوٰۃ ۲/ ۳۷۵، کتاب اللباس، فصل ثانی۔

شلوار اور چادر ٹخنوں سے نیچے رکھنے کی ممانعت

اس کا فائدہ کوئی نہیں، یہ گناہ بے لذت کہلاتے ہیں، اب بتائیے کہ ایک شخص کا ٹخنا شلوار سے ننگا رہتا ہے اللہ کے حکم کے مطابق، کہ سرورِ کائنات ﷺ نے صراحتاً فرمایا کہ "مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْإِزَارِ فَفِي النَّارِ"[1] کہ چادر جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی ہو وہ یوں سمجھئے کہ چادر والا جہنمی ہے، اس لیے بالاتفاق ٹخنوں سے نیچے پاجامے، شلوار، اور چادر کا ہونا حرام ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جس کی چادر ٹخنوں سے نیچے لٹک رہی ہو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔[2] مسبلِ ازار کو متکبر قرار دیا گیا ہے، اس کے دل میں تکبر ہے جو اس طرح سے کپڑا لٹکا کر چلتا ہے، حضور ﷺ نے عمل اور قول سے بہت شدت کے ساتھ ممانعت کی ہے۔ اب ایک آدمی کا تو ٹخنا ننگا ہے، اور ایک آدمی شلوار اتنی نیچے چھوڑ کر چلتا ہے کہ اس کی ایڑی بھی چھپی ہوئی ہے، تو یہ ایڑی چھپانے والا، یہ چادر کو نیچے لٹکانے والا اپنے دل میں سمجھ رہا ہے کہ میں بڑا باعزت نظر آ رہا ہوں، بڑا خان صاحب نظر آ رہا ہوں، بڑا ایوں معلوم ہو رہا ہوں، لیکن مجھے بتائیے کہ اس میں دین اور دُنیا کا کوئی فائدہ ہے؟ چادر نیچے لٹکانے میں کوئی دین اور دُنیا کا فائدہ ہے؟ (نہیں)، اور اس کو ذرا سا اونچا رکھنے میں کوئی نقصان ہے؟ صرف ایک دماغی جنون ہے جس میں انسان نے اپنے ذہن کے طور پر اپنا ایک فوٹو بنا لیا، کہ میں ایسا ہوں گا تو خوبصورت لگوں گا، اور ایسا ہوں گا تو خوبصورت نہیں لگوں گا، بس اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ایک فرضی معیار ہے جس کی بنا پر انسان اس طرح سے کرتا ہے۔ اب اچھے سے اچھے کپڑے مردانہ موجود ہیں، لیکن ایک آدمی خالص ریشم پہنتا ہے اور حرام کا ارتکاب کرتا ہے، یہ صرف ایک ذہنی جنون ہے جس سے اس نے اپنے آپ کو سکون دیا، ورنہ نہ دِین کا فائدہ نہ دُنیا کا۔ ایک آدمی مرد ہو کر سونا پہنتا ہے تو ایک حرام کا ارتکاب کرتا ہے، ویسے نہ کوئی دِین کا فائدہ نہ دُنیا کا، یہ ہے وہ ذہنی جنون جس کی بنا پر بنی آدم دھوکا کھاتے ہیں۔

فساق کی شکل اپنانا کس بات کی عکاسی ہے؟

ورنہ اگر آپ دیکھیں گے تو جتنا لباس شریعت نے تمہیں پہننے کے لیے دیا ہے اس میں زیب و زینت کی بھی پوری رعایت ہے، اور راحت و آرام کی بھی رعایت ہے، تو پھر کیوں خواہ مخواہ دوڑ دوڑ کر انسان دوسری طرف جائے۔ ایک طرف اپنے اساتذہ کا نمونہ ہے، سرورِ کائنات ﷺ کی سُنّت ہے، اور ایک طرف بازاری لوگوں کا طریقہ اور ان کا رسم رواج ہے، اور تم درمیان میں کھڑے ہو، اور تم سے پوچھا جائے کہ ایسا بننا چاہتے ہو یا ایسا بننا چاہتے ہو، تو تمہاری طبیعت کی اُفتاد فساق، فجار کی طرف کیوں جاتی ہے؟ بالوں کی ساخت ہو، کپڑوں کی ساخت ہو، اگر آپ بازاری لوگوں جیسی بنائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی آپ کے دل میں قدر و قیمت ہے، اور اپنے اساتذہ کی اور اپنی جماعت کی کوئی قدر و قیمت نہیں، ورنہ اگر قدر و قیمت ہے، آپ اسی کو حسن سمجھتے

---

(۱) بخاری ۲/۸۶۱، کتاب اللباس، باب ما اسفل الخ/مشکوۃ ۲/۳۷۳، کتاب اللباس، فصل اول۔

(۲) نسائی ۲/۲۵۳، باب اسبال الازار. ولفظه: إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنْظُرُ إِلَى مُسْبِلِ الْإِزَارِ/ نیز مسلم ۱/۷۱/ ترمذی ۱/۲۳۰/ مشکوۃ ۱/۲۴۳، باب المساهلة۔

ہیں، جمال سمجھتے ہیں، تو کیا بات ہے کہ آپ ایسی شکل اختیار کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ یہی بنیادیں ہیں شیطان کے چکما دینے کی، اسی طرح سے آہستہ آہستہ وہ بہکاتا ہے، کہ فلاں ماحول میں جاؤ گے تو عزت ہے، ایسی شکل بناؤ گے تو عزت ہے، ایسا کرو گے تو عزت ہے، اور دوسری طرف بتاتا ہے کہ یوں کرو گے کیا ہے، دیکھنے میں ایسے لگو گے جیسے مسکین ہوتے ہیں، اور اس قسم کی باتیں ذہن میں ڈال کر پھسلا دیتا ہے۔

واقعۂ آدم علیہ السلام کے بعد اَحکامِ لباس کے ذِکر کی وجہ

تو یہ لمبا واقعہ سنا کر آگے لباس کا مسئلہ شروع کرنے کی وجہ یہ ہوگئی کہ مشرکین نے یہ لباس اتار دیا تھا، اور ننگے ہو کر اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کرتے تھے، یہ بے حیائی کا کام اختیار کر رکھا تھا، اور پھر اس کو کہتے تھے کہ چونکہ ہمارے آباء کا طریقہ ہے اس لیے ہم تو ایسے ہی کریں گے، پھر یوں بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا ہے، جس کی بنا پر خصوصیت سے یہاں تردید کردی گئی۔ یہ وجہ ہے آدم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد لباس کے اَحکام کے ذکر کرنے کی۔

لباس کے دو مقصد

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا: ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے جس میں دو فائدے ہیں، دو مقصد ہیں، ایک ہے تمہارے بدن کو چھپانا، تو چھپانے میں حیا کی رعایت بھی ہے، اور گرمی سردی کی رعایت بھی، وَرِیْشًا: اور زینت کے لیے اتارا ہے، تاکہ تمہاری شخصیت اس سے اجاگر ہو، تمہیں زیب و زینت حاصل ہو۔ تو لباس میں دونوں باتوں کی رعایت ہوتی ہے، کہ وہ پردے کا کام بھی دے اور زینت کا باعث بھی ہو، پہنا ہوا اچھا بھی لگے۔

’’لِبَاسُ التَّقْوٰی‘‘ کے دو مفہوم

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیْرٌ: تقویٰ کا لباس یہ بہت بہتر ہے، یہ ہے باطنی لباس، جس طرح سے ظاہری لباس ہمارے ظاہری عیوب کو چھپاتا ہے، تقویٰ کا لباس ہماری باطنی خامیوں کو چھپاتا ہے، اور اگر کسی آدمی کو یہ تقویٰ کا لباس حاصل نہ ہو تو اُس کی عیاشی بدمعاشی اور باطنی کمزوریاں نمایاں ہو کر انسان کو ذلیل کر دیتی ہیں، اور اگر تقویٰ کا لباس حاصل ہو جائے تو باطنی کمزوریاں چھپی رہ جاتی ہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ظاہری لباس بھی تقویٰ کے لباس کا ہی ایک فرد ہے، تو جیسے ظاہری لباس کو پہننے کی کوشش کرتے ہو، اسی طرح سے باطنی لباس کو اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ کا خوف اور خشیت یہ باطنی لباس ہے جس کے ساتھ انسان کی باطنی کمزوریاں چھپتی ہیں۔ اور یوں بھی معنی کیا گیا ہے کہ لباس جو تقویٰ کے مطابق ہو وہی بہتر ہے، یعنی لباس تو ہم نے اتار دیا جو تمہارے لیے ستر کا باعث بھی ہے، اور زینت کا باعث بھی، لیکن لباس پہنتے وقت تقویٰ کی رعایت رکھنی ہے، جس قسم کے ہمارے اَحکام ہیں اُس کے مطابق پہننا، اُس کے خلاف نہ پہننا، بہتر تمہارے لیے یہی ہے۔ وہی جس کی تشریح میں نے آپ کے سامنے کردی کہ غیر کے ساتھ تشبہ نہ ہو، مرد ریشم نہ پہنیں، سونا نہ پہنیں، عورتیں ایسا لباس نہ پہنیں، جو مردوں سے مشابہت رکھتا ہو، ان

قاعدوں کی رعایت رکھو گے تو تمہارا لباس تقویٰ کا لباس ہے، اور اگر ان قاعدوں کی رعایت نہیں رکھو گے تو تمہارا لباس تقویٰ کا لباس نہیں ہے۔ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ اللہ کا لباس پیدا کرنا اس کے اسباب اتارنا، تمہیں بنانے کا سلیقہ سکھا دینا، یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے، لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

شیطان ہمیشہ خیر خواہی کے عنوان سے حملہ کرتا ہے

''اے آدم کی اولاد! تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے شیطان، تمہیں بہکا پھسلا نہ دے، خرابی میں نہ ڈال دے جیسے کہ تمہارے والدین کو جنت سے نکال دیا، اتارتا تھا ان دونوں سے اُن کا لباس تاکہ دکھا دے اُنہیں ان کے اعضائے مستورہ۔'' لغزش میں ڈالنے سے یہی تو اس کا مقصد تھا کہ عزت شرافت سب کچھ چھن جائے، اور پھر یہ تمہارا دشمن جس سے ہم تمہیں ہوشیار کر رہے ہیں کہ یہ تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے، اتنا خطرناک دشمن ہے کہ وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے، اور اُس کی پارٹی بھی تمہیں دیکھ رہی ہے، لیکن تم انہیں نہیں دیکھ رہے، اور ایسا خفیہ دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے، جو دشمن سامنے سے حملہ کرے اُس کی مدافعت آسان ہوتی ہے، اور جو دشمن نظر ہی نہیں آتا، بسا اوقات تو نظر اس لیے نہیں آتا کہ اُس کا وجود اتنا لطیف ہے کہ یہاں پھر رہا ہے اور ہم نہیں دیکھ رہے، اور بسا اوقات وہ اپنی عداوت کو کسی دوستی کے پردے میں چھپا لیتا ہے، اور وہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچتی کہ یہ ہمارا دشمن ہے، جب یہ مفہوم ہوگا تو اس میں شیاطینِ جن اور شیاطینِ اِنس دونوں آجائیں گے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ تجھے نظر نہیں آتا یہ تیرا دشمن ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اِس نے دوستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، اس نے چادر تو اُوپر اوڑھ لی ہے خیر خواہی اور دوستی کی، اور تمہیں پتا نہیں کہ یہ در پردہ دشمن ہے، چھپ کر حملہ کر رہا ہے، دوستی کے پردے میں حملہ کر رہا ہے، خیر خواہی کے پردے میں حملہ کر رہا ہے۔ تو شیطان ایسے بھی ہوتے ہیں، جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ شیطان جب بھی آئے گا، آئے گا خیر خواہی کے عنوان سے، اور اس خیر خواہی کے پردے میں وہ اپنے آپ کو چھپاتا ہے، اور باقی جو جنات وغیرہ ہیں وہ تو ویسے ہی نظر نہیں آتے، لیکن یہ نظر نہ آنا عام طور پر ہے، ورنہ گاہے گاہے اگر نظر آجائیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں، یہ عام ضابطہ ہے کہ عام طور پر تم انہیں دیکھتے نہیں ہو، اس لیے اگر کبھی کوئی شیطان نظر آجائے اور کسی ولی کو نظر آجائے، کسی نبی کو نظر آجائے، جس طرح سے واقعات احادیث میں آتے ہیں، تو وہ اس آیت کے خلاف نہیں، عام قاعدہ یہی ہے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے تم اُسے نہیں دیکھتے، اس لیے اس دشمن سے ہوشیار رہو۔

شیطانی حملوں سے بچنے کا طریقہ

پھر اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی پابندی کرو گے تو گویا کہ تم ایسی ذات کی پناہ میں آگئے، یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاؤ گے تو تم ایسے کی پناہ میں آگئے کہ جو شیطان کو دیکھتا ہے، شیطان اُسے نہیں دیکھتا۔ تو اللہ تعالیٰ کے تحفظ میں آجانے کے بعد پھر شیطان کے حملوں سے کلیۃً حفاظت ہو جاتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں جو شیطان کو دیکھتے ہیں شیطان انہیں نہیں دیکھتا تو اس کی مدافعت کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی رعایت رکھو۔ جب اس کے قاعدے اور ضابطوں کی پابندی

کرو گے تو شیطان کے حملوں سے محفوظ رہ جاؤ گے، یہ ہوشیار کیا گیا ہے کہ یہ خطرناک دشمن ہے جو تمہیں دیکھ رہا ہے اور تم اُسے نہیں دیکھ رہے۔ ''بیشک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اُس کی جماعت ایسی جگہ سے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے'' یعنی عام طور پر، اس لیے کا ہے گا ہے اگر نمایاں ہو بھی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

شیطان کے دوست، اور صالحین کے دوست

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ: بے شک ہم نے بنایا ہے شیطانوں کو دوست ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے، ایمان سے محروم لوگوں کو شیطان دوست ملتے ہیں، اور جتنا اپنے ایمان کے اندر کمال پیدا کرتے چلے جاؤ گے شیطان دور بھاگتے ہیں، اور دوستی تمہاری اللہ اور نیک بندوں کے ساتھ لگتی چلی جاتی ہے۔ ایمان سے محرومی کے نتیجے میں اردگرد شیطان ہی شیطان جمع ہو جاتے ہیں، یہ واقعہ ہے۔ تم نیکی کا راستہ چھوڑ کر برائی کی طرف لگ جاؤ، آج ہی تمہارے اردگرد سارے شہر کے غنڈے جمع ہو جائیں گے، اور جتنا تم نیکی کی طرف آتے چلے جاؤ گے اتنا ہی شیطان تم سے بھاگیں گے، اور صالحین کی رفاقت تمہیں نصیب ہوتی چلی جائے گی۔ تو ایمان میں کمال شیطانوں سے دُور ہٹا کر فرشتوں کا قرب نصیب کرتا ہے، اور ایمان سے محرومی انسان کو فرشتوں سے دُور ہٹا کر شیطانوں کا قرب نصیب کرتی ہے۔ تو یہ دوست اُن کے ہیں جو ایمان نہیں لاتے، اور ایمان لانے والے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والے وہ ان کے حملوں سے بچے ہوئے ہوتے ہیں۔

بے حیائی پر مشرکین کی دو دلیلیں اور ان کا رَدّ

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً: پھر ان کی یہ بات، کہ جب یہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں، خصوصیت سے یہاں بے حیائی وہی ہے جو لباس کے متعلق انہوں نے اختیار کر رکھی ہے، تو جب یہ اس قسم کا کام کرتے ہیں تو پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء کو اسی طریقے پر پایا ہے، گویا کہ باپ دادا کے طریقے کو اپنے لیے یہ حجت بنائے بیٹھے ہیں، اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اللہ کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ باقی! ان کے آباء کا طریقہ تو تھا، اُس کی تردید دوسری جگہ آئے گی کہ اگر آباء گمراہ ہوں تو ضروری نہیں کہ اولاد بھی اسی گمراہی کے راستے پر دوڑتی رہے: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۷۰) کہ تم اپنے آباء کے طریقے پر چلتے رہو گے اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت۔ بے عقلوں بے ہدایتوں کے راستے پر اگر چلو گے تو تم بھی وہی بن جاؤ گے، دیکھنا تو یہ چاہیے کہ تمہارے خاندان میں جو رسم چلی آ رہی ہے، تمہارے آباؤ اجداد کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے یہ عقل اور ہدایت کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر عقل اور ہدایت کے مطابق ہے تو ضرور اختیار کرو، اور اگر وہ عقل اور ہدایت کے مطابق نہیں تو تمہارے باپ بھی گمراہ، تم اُن کے پیچھے لگو گے تو تم بھی گمراہ، یہ وضاحت اور آیات میں آئے گی۔ یہاں صرف اس کے اوپر یہ تردید کی گئی ہے، کہ اللہ پر بہتان نہ باندھو، اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیتا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ۔ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کیا تم اللہ کے اوپر ایسی باتیں بولتے ہو کہ جن کو تم جانتے نہیں ہو، یعنی اللہ کے متعلق وہی بات کہنی چاہیے کہ اللہ کا حکم ہے،

جس کو انسان علمی دلیل کے ساتھ ثابت کر سکے کہ واقعی دیکھو! وہاں سے ثابت ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم ہے نماز پڑھو۔ تو کوئی پوچھے کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اللہ کا حکم ہے؟ ہم کہیں گے اللہ کی کتاب میں لکھا ہوا ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ تو ہماری یہ بات علم کے ساتھ ہے، اور تمہیں علم تو ہے نہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے نہیں، دیکھا نہیں، جانا نہیں، بوجھا نہیں، اور اپنی طرف سے بے علمی کے ساتھ اللہ کی طرف باتیں منسوب کرنا یہ اللہ پر بہتان باندھنا ہے۔ تو یہی تنبیہ ان کو کی گئی ہے کہ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جن کو تم جانتے نہیں ہو، یعنی جن کی علمی دلیل تمہارے پاس ہے نہیں، تم ایسی باتیں اللہ کے ذمے لگاتے ہو۔

ہر چیز میں اِعتدال کی رعایت کا حکم

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو حکم دیا ہے انصاف کا۔ انصاف سے مراد ہے ہر چیز کے اندر اعتدال کی رعایت رکھنا، افراط اور تفریط سے بچنا، جیسے حکم ہے ویسے ہی کرنا، اس میں سب حقوق العباد آجائیں گے، کسی پر ظلم نہ کرو، کسی کی حق تلفی نہ کرو، ہر کسی کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: اور ہر عبادت کے وقت اپنے رُخ سیدھے رکھو اللہ کی طرف، اللہ کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو، اور مخلص ہو کر خالص عقیدے کے ساتھ اسے ہی پکارو، اُسے ہی اپنا فریادرس اور ضرورتیں پوری کرنے والا سمجھو۔ یاد رکھو! تم نے اُس کے سامنے پیش ہونا ہے، جیسے اُس نے پہلے تمہیں پیدا کیا ویسے ہی تم لوٹو گے۔ یہ قیامت کے یاد دلانے کے ساتھ ترہیب آ گئی۔

سارے عمل کی بنیاد اِنسان کے اِرادے سے اُٹھتی ہے

فَرِیْقًا هَدٰى: ایک گروہ ایسا ہے کہ جس کو اللہ نے توفیق دی سیدھے راستے پر چلنے کی، اور ایک گروہ ایسا ہے کہ جن پر اُن کی بدکرداریوں کی وجہ سے گمراہی ثابت ہو گئی، کہ انہوں نے اپنے اختیار کے ساتھ گمراہی کا راستہ اختیار کیا، اللہ نے اسی پر اُن کو جما دیا۔ دیکھو! یہ دو دروازے ہیں، تم ارادہ کرلو ادھر سے نکلنے کا، اللہ تعالیٰ تمہیں ادھر چلنے کی توفیق دے دے گا، ارادہ کرلو ادھر سے نکلنے کا، اللہ تعالیٰ تمہیں ادھر چلنے کی توفیق دے دے گا۔ لیکن چلنا تمہارا اللہ کی توفیق کے ساتھ ہی ہے اس لیے نسبت اللہ کی طرف ہی ہے، اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے چونکہ خالق ہر چیز کا وہ ہے، اور آپ کی رفتار اور آپ کی چال بھی اللہ کی مخلوق ہے، لیکن آپ کے ارادے کے ساتھ جیسے جیسے اسباب آپ بناتے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں کھڑے ہو جاؤ مشرق کو جانا چاہو، مشرق کو چلے جاؤ، مغرب کو جانا چاہو تو اللہ تمہیں مغرب کو چلا دے گا۔ بات انسان کے ارادے سے چلتی ہے، کہ تم نے ارادہ نیکی کا کیا ہے تو تمہارے لیے نیکی کا راستہ آسان ہوتا چلا جائے گا، اور اگر تم نے ارادہ برائی کا کیا ہے تو برائی کا راستہ آسان ہو جائے گا، کمرے میں بیٹھے ہوئے ارادہ کرلو کہ آج ہم نے بارہ بجے تک مسجد میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا ہے، یقیناً آپ کے لیے اسباب مہیا ہو جائیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

آخری آیات پر ایک نظر دوبارہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ: قِسط کہتے ہیں انصاف کو، افراط اور تفریط سے بچا ہوا درمیانی راستہ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرے رَبّ نے حکم دیا ہے قسط کا، کہ ہر معاملے میں انصاف کی راہ اختیار کرو، وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ: اور سیدھا رکھو اپنے چہروں کو عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: مسجد مصدر میمی ہے سجدہ کے معنی میں، اور سجدہ بول کر نماز مُراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے "ہر نماز کے وقت اپنے چہروں کو سیدھا رکھو" یعنی سیدھے رُخ پر نماز پڑھو، اور سجدہ بول کر مطلقاً عبادت مراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے "تم ہر عبادت کے وقت اپنے چہروں کو سیدھا رکھو" وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: اور پکارو اس اللہ کو اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو، اس کے لئے اعتقاد کو۔ دِین طاعت کو بھی کہتے ہیں، اعتقاد کو بھی کہتے ہیں۔ خالص کرنے والے ہو، اس کے لئے طاعت کو۔ كَمَا بَدَاَكُمْ: جیسے اس نے تمہیں ابتداءً پیدا کیا۔ بَدَاَ يَبْدَاُ: شروع کرنا۔ جیسے اس نے تمہیں شروع کیا ہے، یعنی ابتداءً پیدا کیا ہے، تَعُوْدُوْنَ: تم لوٹو گے۔ عود حالتِ سابقہ کی طرف لوٹنے کو کہتے ہیں، پہلی حالت کی طرف لوٹنا۔ فَرِيْقًا هَدٰى فَرِيْقًا یہ هَدٰى کا مفعول ہے۔ هَدٰى کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی، سیدھے راستے پہ چلایا، وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ: اور ایک فریق، اس کے اُوپر گمراہی ثابت ہوگئی، اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ: بیشک ان لوگوں نے جن پر گمراہی ثابت ہوگئی بنالیا ہے شیاطین کو دوست مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ: اللہ کو چھوڑ کر۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ وَيَحْسَبُوْنَ: اور وہ سمجھتے ہیں اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: کہ وہ سیدھے راستے پہ چلنے والے ہیں۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ: اے آدم کے بچو! خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ: اپنی زینت کو اختیار کرو، عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: مسجد کی ہر حاضری کے وقت، یا ہر عبادت کے وقت، یا ہر نماز کے وقت، جیسے مسجد کا اُوپر معنی کیا گیا تھا، تو یہاں مسجد سے یہ (معروف) مسجد بھی مراد لی جاسکتی ہے اور مطلقاً عبادت، اور اسی طرح سے خاص طور پر نماز بھی مراد لی جاسکتی ہے، "ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو" كُلُوْا وَاشْرَبُوْا: اور کھاؤ اور پیو، وَلَا تُسْرِفُوْا: اور اِسراف نہ کرو۔ اِسراف: حد سے تجاوز کرنا۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ: بیشک اللہ تعالیٰ اِسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر

غلط رُسوم پر مشرکین کی دو دلیلیں

پچھلی آیات کا مضمون آپ کے سامنے مستحضر ہے کہ وہ لوگ ننگا طواف کرتے تھے، بے حیائی کا ارتکاب کرتے تھے، اور پھر اس رسم کے صحیح ہونے پر اپنے آباؤ اجداد کے طریقے سے استدلال کرتے تھے، کہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کا طریقہ ہے، ہم نے اسی طریقے پر اپنے آباء کو پایا، اس لیے ہم یونہی کریں گے، اور پھر وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے آباؤ اجداد جو طریقہ بھی اختیار کیے ہوئے تھے وہ اللہ کی طرف سے آیا ہوا تھا، اس لیے وہ کہتے کہ یہ طریقہ اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہے، ہمیں یہ طریقہ اس نے بتایا ہے، جس طرح سے ہم کوئی دین کا کام کرتے ہیں تو ہم اس کو اللہ کا حکم سمجھ کر ہی کرتے ہیں لیکن اس کی ہمارے پاس علمی دلیل ہوتی ہے کہ

دیکھو! فلاں جگہ سے ثابت ہے، فلاں آیت سے ثابت ہے، یا سرورِ کائنات ﷺ کے فرمان سے ثابت ہے کہ یہ کام ہمیں اس طرح سے کرنا چاہیے، ہم اس کام کو کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ یہ کام ہم اللہ کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں، اور وہ مشرکین بھی اپنے ان طریقوں کو کہتے تھے کہ ہم ان کو اللہ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں، تو آبائی تقلید جس کی وجہ سے وہ گمراہ تھے اس پر تو تنقید بہت جگہ قرآنِ کریم میں آئی ہے، یہاں اس کا ذکر نہیں۔

کس حکم کی نسبت اللہ کی طرف دُرست ہے اور کس حکم نسبت اللہ پر اِفترا ہے؟

باقی یہ نسبت جو کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا طریقہ ہے اور اللہ نے ہمیں اسی طرح سے حکم دیا ہے، اس کے اوپر یہاں انکار کر دیا گیا، کہ یہ بات غلط کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں، یہ افترا ہے، بھلا اس قسم کی بے حیائی کا حکم اللہ تعالیٰ کس طرح سے دے؟ اور ان کو تنبیہ وہی کی گئی ہے کہ بے علمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف باتیں منسوب نہ کیا کرو، اللہ تعالیٰ کے متعلق وہی بات کہو جس کو تم علمی دلیل کے ساتھ ثابت کر سکو، اگر علمی دلیل کے ساتھ ثابت نہ کر سکو تو اللہ تعالیٰ کے متعلق غلط بیانی نہ کیا کرو، اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ: کیا تم اللہ پر بولتے ہو مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: ایسی باتیں جن کو تم جانتے نہیں ہو، جانتے نہیں ہو کا مطلب یہ ہے کہ جس کی علمی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے، معلوم ہو گیا کہ جس مسئلے کی علمی دلیل ہو وہاں ہم ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا حکم یہی ہے اور ہمارا یہ کام اللہ کے حکم کے مطابق ہے، تو جب بھی آپ کسی چیز کے متعلق دعویٰ کریں کہ ہم یہ کام اللہ کی مرضی کے مطابق کر رہے ہیں، اللہ کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں، تو اس کی علمی دلیل آپ کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ اللہ کی مرضی یا معلوم ہوتی ہے اللہ کی کتاب سے، یا معلوم ہوتی ہے اللہ کے رسول سے، تو اگر کتاب اللہ سے دلیل موجود ہے یا اللہ کے رسول کے بیان کے اندر اس قسم کی دلیل موجود ہے تو واقعی آپ کا وہ کام اللہ کے حکم کے مطابق ہے، اور اگر اللہ کے رسول ﷺ نے بھی نہیں بتایا اور اللہ کی کتاب میں بھی اترا ہوا نہیں ہے تو پھر تم کس طرح سے کہتے ہو کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور یہ طریقہ اللہ کے حکم کے مطابق ہے، تو "کیا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جن کو تم جانتے نہیں ہو" جانتے نہیں ہو کا معنی ہے کہ تمہارے پاس اس کی کوئی علمی دلیل موجود نہیں، علمی دلیل ہو تو پھر اللہ کی طرف بات کو منسوب کیا جا سکتا ہے ورنہ وہ اِفترا ہے جھوٹ ہے کذب ہے، اور اس قسم کی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیے۔

تو آگے یہ ذکر کیا گیا کہ ان کا طریقہ تو مامور من اللہ نہیں ہے، اللہ کی طرف سے آیا ہوا نہیں ہے، آپ ان کے سامنے واضح کر دیں کہ اللہ تعالیٰ تو ہر معاملے میں قسط کا حکم دیتا ہے، قسط انصاف کو کہتے ہیں، یعنی کام اس طرح سے کرنا جس طرح سے کرنے کا حق ہے، لوگوں کے معاملات کے اندر کسی پر ظلم نہ کرنا، کسی پر زیادتی نہ کرنا، انصاف کا معاملہ کرنا یہ سب قسط میں شامل ہے۔

عبادت کے ظاہر اور باطن کو دُرست رکھنے کا حکم اور ریا کی مذمت

اور وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: یہ خصوصیت کے ساتھ عبادت کا ذکر آ گیا۔ عبادت کے وقت اپنے چہرے سیدھے رکھو، اور اللہ کو خالص عقیدے کے ساتھ پکارو۔ یہ دو باتیں آ گئیں، تو اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ سے ظاہر مراد ہے کہ ظاہر کو بھی ٹھیک رکھو، تمہارا رُخ اللہ کی طرف ہونا چاہیے، اور وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ کے اندر باطن مراد ہے، کہ دل کا عقیدہ بھی

خالص اللہ کے متعلق ہونا چاہیے۔ اگر تو خاص طور پر نماز مراد ہے پھر تو اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز کی جو جہت ہے اپنے چہرے ادھر سیدھے رکھا کرو، مثلاً ہم جب نماز پڑھیں تو اپنا منہ سیدھا قبلے کی طرف رکھیں اور ادھر ادھر نہ دیکھیں، ادھر ادھر نہ جھانکیں، ادھر ادھر نہ پھریں، تو یوں سمجھو کہ ہم نے اپنا چہرہ سیدھا کر لیا، یہ تو ظاہر درست ہو گیا۔ اور وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے اندر باطن کی طرف اشارہ ہو گیا کہ باطن میں بھی عقیدہ صرف اللہ کے متعلق ہو کہ عبادت اسی کے لئے ہے کسی دوسرے کے لئے نہیں، دل کے خیال کے اعتبار سے بھی کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ ایک شرک ہے جس کو شرکِ جلی کہتے ہیں، یعنی واضح طور پر شرک، یہ تو وہی ہے جس طرح سے انہوں نے شرکاء بنا رکھے تھے اور اپنی عبادت کے اندر ان کو حصہ دار قرار دے رکھا تھا، اور ایک ہے وہ شرک جس کو شرکِ خفی کہتے ہیں، بہت چھپا ہوا شرک، اس کے لئے شریعت میں عنوان ہے "ریا" کا، "ریا" کا معنی ہے دکھلاوا، عبادت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا مقصود نہ ہو بلکہ اللہ کے بندوں کو خوش کرنا مقصود ہے، اور دل کے اندر یہ جذبہ ہے کہ فلاں شخص مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھے گا تو کہے گا دیکھو! بڑا نمازی ہے، اپنی نیکی کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے کے لئے، شہرت حاصل کرنے کے لئے، اس جذبے کے تحت جو نماز پڑھی جاتی ہے یا عبادت کی جاتی ہے یہ ریاکاری کی عبادت ہے، اور ریاکاری کی عبادت یہ بھی اخلاص للہ کے خلاف ہے، اور اس کو بھی سرورِ کائنات ﷺ نے شرکِ خفی قرار دیا، کہ اس جذبے کے تحت نماز پڑھنے والا چاہے حقیقتاً مشرک نہیں ہے جس کا درجہ شریعت میں دائمی جہنمی والا ہے، لیکن یہ حرام کا ارتکاب یقیناً کرتا ہے، کیونکہ ریا بھی محرمات میں داخل ہے، دکھلاوے کے طور پر اور دوسروں کو خوش کرنے کے لئے نماز پڑھنا بھی اخلاص کے منافی ہے۔ تو ظاہری طور پر بھی ٹھیک رہو کہ ادھر ادھر نقل وحرکت نہ ہو، ادھر ادھر جھانکنا نہ ہو، آپ کا رخ قبلے سے نہ پھرے، اور باطن میں بھی صرف اللہ کی رضا مقصود ہو اور اللہ کے حکم کے طور پر اس کام کو کیا جائے تو یہ ہے مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔ اور اگر دکھلاوے کا جذبہ ہوگا تو ریاکاری آگئی، وہ بھی اخلاص کے خلاف ہے، وہ عبادت بھی قبول نہیں، جیسے کہ ہمارے شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ؎

کلید درِ دوزخ است آں نماز | کہ در چشمِ مردم گزاری دراز

جو نماز تو لوگوں کے سامنے لوگوں کو دکھانے کے لئے لمبی لمبی پڑھتا ہے یہ نماز جہنم کے دروازے کی کنجی ہے (بوستاں، باب ۵ کا تقریباً آخر)، یعنی یہ نماز تمہیں جہنم میں تو لے جا سکتی ہے جنت میں نہیں لے جا سکتی، کیونکہ جب تم لوگوں کو دکھانے کے لئے لمبی لمبی پڑھو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا مقصود لوگ ہیں اللہ نہیں ہے۔ اور جس شخص کے اندر بھی ریا کا جذبہ ہوتا ہے وہ جب یہ دیکھے کہ مجھے کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی میرے حال پر غور نہیں کر رہا، اس وقت کوئی موجود نہیں، تو پھر وہ نماز سرے سے پڑھتا ہی نہیں، اور اگر پڑھے گا بھی تو ایسے ہی ٹرخائے گا، اور جب لوگوں کے سامنے پڑھے گا تو سنوار کے پڑھے گا، کیونکہ دل میں جذبہ تو ریاکاری کا ہے، دکھانا تو لوگوں کو ہے، منافق کی نماز ایسی ہی ہوا کرتی ہے، جو شخص دکھلاوے کی پڑھتا ہے وہ جہاں دکھلاوا ہوگا وہاں پڑھے گا، جہاں دکھلاوا نہیں ہوگا وہاں نہیں پڑھے گا، اسی لیے سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص جس طرح سے خلوت میں نماز پڑھتا ہے ویسے ہی جلوت میں پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے یہ میرا سچا بندہ ہے[1] یہ میرے لیے ہی پڑھتا ہے، اب اگر خلوت میں

---

(۱) ابن ماجہ ص ۳۰۹ باب التوقی علی العمل / مشکوٰۃ ۲/۴۵۵ باب الریاء فصل ثالث، عن ابی ہریرۃؓ۔

آپ یا تو پڑھیں ہی نہیں یا ایسے ہی خالی ٹکریں ماریں، جیسے ایک حدیث شریف میں ہے: ''نَقَرَ نَقَرَاتٍ'' کہ دو ٹھونگے مار لیے، سجدہ ایسے کیا جیسے جانور دانہ اٹھانے کے لئے ٹھونگا مارتا ہے، نہ تسبیحات پڑھیں نہ اس کے اندر سکون اختیار کیا، یہ ٹھونگے سے مار لیے، خلوت میں تو ایسے پڑھیں، اور لوگوں کے سامنے پڑھیں تو ایسے معلوم ہو کہ جیسے ان کی رُوح عرشِ الٰہی کی سیر کرتی پھر رہی ہے اور ان کو دُنیا کی خبر ہی کوئی نہیں، یہ نماز قابلِ قدر نہیں ہے، ہاں! جیسے لوگوں کے سامنے پڑھتے ہو جب تم گھر میں دروازہ بند کر کے جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں اگر تم وہاں بھی ویسے ہی پڑھتے ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مخلص ہو، ریا کار آدمی خلوت کے اندر عبادت نہیں کر سکتا، وہ جب کرے گا لوگوں کے سامنے کرے گا، اور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہاں وہ عبادت کرے گا ہی نہیں۔ تو پھر یہ معنی ہو گیا کہ عبادت سے مقصود بھی اللہ کی رضا ہو، عقیدہ اسی کے متعلق ہو، اور دکھلاوا مقصود نہ ہو۔ اور اگر عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ سے عام عبادت مراد لے لی جائے تو پھر اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ یعنی اپنے رخ سیدھے رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کام شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرو، جو کام شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہے وہاں تو اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ صادق آتا ہے کہ اپنے چہروں کو سیدھا رکھ لیا، ظاہر کا سنوارنا اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ کے اندر آ گیا، اور باطن کا جذبہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے اندر آ گیا، ہر کام شریعت کے مطابق ہوگا تو اس میں اِقامتِ وجہ صادق آتا ہے، اور جہاں آپ نے اپنی تجویز کر لی، کہ شریعت نے تو کہا ہے کہ یہ کام یوں کرو لیکن آپ نے اپنی تجویز کر لی تو آپ کا ظاہر کا رُخ اللہ کی طرف نہیں ہے، آپ کا رُخ ظاہری طور پر بھی بدل گیا، تو دل کا خیال بھی بدل گیا اور ظاہری رُخ بھی بدل گیا، لہٰذا اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: ہر عبادت کے وقت اپنے چہرے سیدھے رکھو کا مطلب یہ ہوگا کہ جو بھی عبادت کرو اس طریقے کے مطابق کرو جو اللہ نے بتایا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت کرو گے تو کہا جا سکتا ہے کہ تمہارا رُخ اللہ کی طرف ہے، اور اگر تم نے عبادت میں اپنے طریقے تجویز کر لیے، کہ شریعت کچھ کہے اور تم اپنی مرضی کے مطابق کرتے جاؤ گے تو تمہارا رُخ ٹیڑھا ہو گیا، اللہ کی طرف نہیں ہے۔ اور وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے اندر تو بہر حال باطن کی اصلاح ہے کہ دل کے اندر جذبہ اللہ کی رضا کا ہونا چاہیے۔

معاد کا ذِکر اور اس کا مقصد

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ: اس میں آخرت کا ذکر کر دیا، یہ بطور ترہیب کے ہوتا ہے، کہ ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے، جب اللہ کے سامنے جانا ہے تو جو عبادت شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کی ہوئی ہوگی اور دل کے اندر جذبہ بھی اللہ کی رضا کا ہوگا، اخلاص ہوگا، اس کا تو تم اجر پاؤ گے، اور اگر تم نے اللہ کی عبادت اس طریقے سے نہ کی جیسے اللہ نے بتایا ہے یا دل کے اندر جذبات غلط رکھے تو وہاں سزا پاؤ گے، كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ کے اندر ترغیب کا پہلو بھی ہے ترہیب کا پہلو بھی ہے، جس طرح سے ابتداءً تمہیں پیدا کیا، تم لوٹ کے آؤ گے۔ دیکھو! اصل بیان کرنا ہے لوٹ کے آنا، کہ تم نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کے ہمارے سامنے آنا ہے، اور مشرکین کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہ بار بار اعتراض کرتے تھے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ: کہ ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں گے تو ان کو زندہ کون کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی جواب دیا ہے کہ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ

اَوَّلَ مَرَّةٍ (سورۂ یٰس: ۷۹) آپ کہہ دیجئے انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، گویا کہ پہلی مرتبہ پیدا کرنے کا ذکر بطور دلیل کے ہے، کہ اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ مرنے کے بعد دوبارہ کیسے لوٹ کے آئیں گے تو یہ دیکھو جس نے تمہیں پہلی دفعہ بنایا ہے وہی دوبارہ کھڑا کرلے گا، تو جس کو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قدرت ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر یا دوبارہ نکال کھڑا کرنے پر قدرت کیوں نہیں ہے؟ تو کَمَا بَدَاَکُمْ گویا کہ ایک دلیل ہے تَعُوْدُوْنَ کی، ورنہ مقصود تَعُوْدُوْنَ ہے، تم نے لوٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے، تم ہماری طرف لوٹ کے آؤ گے، جیسے کہ اس نے پہلی دفعہ تمہیں پیدا کر دیا، اگر پہلے تمہیں مٹی پانی آگ اور اس قسم کے عناصر سے ترکیب دے کر وہ بنا سکتا ہے تو مرنے کے بعد اگر یہ عناصر بکھر ہی گئے تو کیا وہ دوبارہ اکٹھے نہیں کر سکتا؟

اِنسان جدھر رُخ کرتا ہے وہی کیفیت اللہ کی طرف سے پیدا ہو جاتی ہے

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ: یہ وہ تقسیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات آنے کے بعد انسانوں میں ہو جاتی ہے، لیکن یہ یاد رکھیے! کہ ہر کیفیت کا خالق بھی اللہ ہے، اس لیے انسان جب قصد اور ارادہ کرتا ہے تو آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کیفیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے جیسے میں نے آپ کے سامنے مثال دی تھی کہ آپ کمرے کے وسط میں کھڑے ہیں، دروازہ ادھر بھی ہے اور ادھر بھی ہے، آپ ادھر سے نکلنے کا ارادہ کرلیں اور ادھر کو رُخ کرلیں تو آپ کے لئے یہی چلنا آسان ہوتا چلا جائے گا، اس چلنے کی توفیق بھی اللہ کی طرف سے ہے، اور آپ ارادہ کرلیں اِس دروازے سے نکلنے کا اور ادھر کو قدم اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ وہ بھی آپ کو توفیق دے دیں گے اور آپ کے قدم ادھر کو اٹھتے چلے جائیں گے، مشرق کو رُخ کرلیجئے تو مشرق کا راستہ آسان ہے، مغرب کو رُخ کرلیجئے تو مغرب کا راستہ آسان ہے، زبردستی اِدھر بھی نہیں اور زبردستی اُدھر بھی نہیں۔ ایک بچّہ گھر سے مدرسے میں آنے کا ارادہ کرتا ہے، کتاب اٹھاتا ہے، مدرسے کی طرف آتا ہے، تو اس کے لئے بھی راستہ کھلا ہوا ہے، اور اگر وہ گھر سے نکلے اور ماں باپ کو تو کہے کہ آج میں مدرسے جا رہا ہوں اور نکل جائے کہیں آوارہ گردی کے لئے اور تماشے دیکھنے کے لئے، تو راستہ اس کے لئے بھی کھلا ہے، جدھر چاہے چلا جائے۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے نسبت دونوں فعلوں کی اپنی طرف ہی کی ہے، گمراہ کرنے کی نسبت بھی اپنی طرف کی کیونکہ گمراہی کا پیدا کرنے والا وہ ہے، کہ انسان جدھر کا رخ کرلے ادھر کی کیفیت اللہ تعالیٰ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے لئے راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ ''ایک گروہ کو اللہ نے سیدھے راستے پر چلایا'' یعنی سیدھے راستے پہ چلنے کی توفیق دی، یہ وہی گروہ ہے جنہوں نے اپنا رخ سیدھا کیا اور نیت کرلی ارادہ کرلیا کہ ہم نے کام وہی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے تو ان کے لئے یہ راستہ آسان ہوتا چلا جائے گا، یہ گاڑی جو چلتی ہے تو انسان کے ارادے اور قصد سے چلتی ہے، ایک آدمی اگر بُرائی کا قصد کیے ہوئے ہو اور وہ اپنے ارادے کو تبدیل نہیں کرتا تو دُنیا کی کوئی قوت اس کا رُخ سیدھا نہیں کر سکتی، اور اگر ایک آدمی نیکی کا ارادہ کر لیتا ہے اور وہ اپنے ارادے کو تبدیل نہیں کرتا تو دُنیا کی کوئی قوت اس کے رُخ کو ٹیڑھا نہیں کر سکتی، تو نیکی کرنے والوں کے لیے نیکی کا راستہ آسان ہے، بُرائی کرنے والوں کے لیے بُرائی کا راستہ آسان ہے، جو بھی کام آپ کرنے لگیں اُس وقت آپ اپنے دل میں غور کرلیں، اس کی دلیل آپ کے اندر موجود ہے، وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (سورۂ ذاریات: ۲۱) دلیل اندر موجود ہے، اگر کسی

وقت آپ کوئی معصیت کا کام کرنے لگے ہیں، گناہ کا کام کرنے لگے ہیں، تو اس وقت بھی اپنے دل میں غور کرلیا کیجئے کہ کیا اس سے بچنا ہمارے اختیار میں ہے یا نہیں؟ تو آپ کا دل یہ جواب دے گا کہ اختیار میں ہے، کہ مرضی ہے کرو مرضی ہے نہ کرو، تو پھر باہر کی دلیلیں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ جو بھی قدم آپ اٹھاتے ہیں، اُس وقت آپ اپنے دل میں سوچ لیجئے کہ کیا ادھر کو اٹھانے کا یا ادھر کو اٹھانے کا، مجھے اختیار ہے یا نہیں؟ دل کہے گا کہ دونوں طرف کا اختیار ہے، تو پھر جب تم اپنے اختیار کے ساتھ اپنے ارادے کے ساتھ بُرائی کی طرف جاتے ہو، تو پھر ملزم تم ہو، باقی! اللہ تعالیٰ نے تو جدھر کا آپ نے رُخ کرلیا وہ راستہ آپ کے لیے آسان کر دینا ہے۔ اور سمجھا دیا، ہر چیز واضح کردی، برائی بھی واضح کردی اچھائی بھی واضح کردی، تمہیں درمیان میں کھڑا کر دیا، اب آپ اپنے دل کا جائزہ لیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں، اگر یہ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو یہ کھلا ہے، یہ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو تو یہ کھلا ہے، ہر قدم پر آپ اپنا جائزہ لے سکتے ہیں باطن کے اندر، کہ آپ اس وقت محسوس کریں گے، نماز پڑھنے کے لیے اگر تکبیرِ تحریمہ کہنے لگے ہیں تو اس وقت بھی سوچ لو، تو آپ کا دل کہے گا کہ اختیار ہے چاہے کہو چاہے نہ کہو، اور کوئی بُرائی کرنے لگے ہو تو عین موقع پر سوچ لو کہ اس کو چھوڑنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ آپ کا دل کہے گا کہ بالکل اختیار ہے، ارادہ کرلو، چھوٹ جائے گی، یہ تو انسان کی باطن کی کیفیت ہے کہ جب غور کرے تو یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے، تو پھر اِلزام انسان پر کیوں نہ آئے؟ جبکہ سارے عمل کی بنیاد اسی کے ارادے سے اُٹھتی ہے، باقی ہاں! آگے ہر چیز کا پیدا کرنے والا چونکہ اللہ ہے، بغیر اس کے پیدا کرنے کے کوئی چیز وجود میں نہیں آتی، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت یہ فیصلہ فرما لیا، کہ انسان جدھر کا ارادہ کرے گا ویسے ہی اللہ تعالیٰ اُس کے لیے کیفیات حالات اسباب پیدا فرماتے چلے جاتے ہیں۔

تعلق مع اللہ کی علامت، اور تعلق مع الشیطان کی علامت

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ: یہ جن کے اوپر گمراہی ثابت ہوئی ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں سے دوستی لگالی۔ دیکھو! بنیاد کہاں سے چلتی ہے؟ بنیاد یہاں سے چلتی ہے کہ تمہارا دلی تعلق کس کے ساتھ ہے؟ اگر تو تمہارا دِلی تعلق بُروں کے ساتھ ہے تو سمجھو گمراہی کا نشانہ تم ہو، گمراہی تم پر ثابت ہے۔ اور اگر تمہارا دلی تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور اللہ کے ساتھ تعلق کی علامت یہ ہے کہ اللہ والوں سے تعلق ہے، اللہ کے نبی سے تعلق ہے، اللہ کے ولیوں سے تعلق ہے، دِین کے ترجمانوں سے تعلق ہے، تو یقیناً آپ فَرِيْقًا هَدٰى کا مصداق بنتے چلے جائیں گے، اس لیے تو ایک عربی شاعر کہتا ہے:

''عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْئَلْ وَاَبْصِرْ قَرِيْنَهٗ''

کہ کسی انسان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تُو اچھا ہے یا بُرا، یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تم اچھے ہو یا بُرے ہو، کہتے ہیں اس کے دوست دیکھ لیا کرو، جس قسم کے دوست ہوا کرتے ہیں وہی کیفیت انسان کے باطن کی ہوتی ہے، یہ نکتہ اپنے ذہن میں بٹھالو، وہ جاہل عربی شاعر کہتا ہے کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ تُو اچھا ہے یا بُرا، اس کے دوستوں کو دیکھ لو، اگر اس کے اردگرد اچھے دوست ہیں تو سمجھو کہ یہ بھی باطن میں اچھا ہے، کیونکہ اچھا آدمی اچھی چیز کو پسند کرتا ہے، اور اگر اُس کے دوست خراب ہیں، بدمعاش

ہیں، عیاش ہیں، چاہے آپ کو بظاہر اس پر کوئی اعتراض نظر نہیں آ رہا، لیکن حقیقت میں یہ بھی خراب ہے، اگر یہ خراب نہ ہوتا تو اس کا خراب لوگوں کی طرف رجحان کیوں ہوتا اور مناسبت کیوں ہوتی؟ ایک واضح بات ہے، دوستی کی بنا مناسبت پر ہوتی ہے، جب تک دو آدمیوں میں مناسبت نہ ہو دوستی نہیں ہوتی، باطن کے جذبات ہمیشہ انسان کے دوستوں کے حلقے سے سمجھ میں آتے ہیں، کہ اس کے اردگرد اس کے دوست کیسے ہیں؟ اِس کا رجحان کس قسم کے لوگوں کی طرف ہے؟ جس قسم کے لوگوں کی طرف اُس کا رُجحان ہوتا ہے ویسے ہی اُس کے قلبی جذبات ہوتے ہیں۔ تو گمراہی اُن پر ثابت ہے جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین سے دوستی لگالی، شیاطین کا لفظ عام ہے، دیکھو! جمع کے صیغے کے طور پر آیا ہے، چاہے وہ شیاطین جن ہوں، چاہے وہ شیاطین اِنس ہوں۔ شیاطین الجن والانس یہ دونوں ہی ہوتے ہیں، انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں اور جنوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں، اور انسانوں میں شیطان کون سے ہیں؟ جو آپ کے لیے غلط راستے کی راہنمائی کا باعث بنتے ہیں، جو آپ کو غلط عادات کی تلقین کرتے ہیں وہ انسانوں میں سے شیاطین ہیں، ان سے دوستی لگا کر دیکھو فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ کے اندر فوراً داخل ہو جاؤ گے، اور اگر اللہ کے ساتھ دوستی لگاؤ گے اللہ والوں کے ساتھ دوستی لگاؤ گے تو فَرِیْقًا هَدٰی کے اندر شامل ہوتے چلے جاؤ گے، یہ تو آپ نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا ہے۔

توبہ کی توفیق کسے ملتی ہے، کسے نہیں ملتی؟

وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: یہ بھی ایک نفسیاتی بات ہے کہ لگے ہوئے ہیں شیطانوں کے پیچھے، دوستی شیطانوں سے ہے، گمراہی کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں، لیکن دل دماغ اُن کو یہ کہتا ہے کہ ہم ہی ٹھیک ہیں وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ وہ اپنے طور پر سمجھتے یہی ہیں کہ ٹھیک ہم ہی ہیں، سیدھے راستے پر ہم ہی چل رہے ہیں، اس لیے دوسرا شخص جو نہیں سمجھاتا ہے اُس کی بات پر کان ہی نہیں دھرتے، اُن کا دماغ یہی ہے، اور یہ گمراہی کی انتہا ہوتی ہے، کہ جب ایک انسان غلط راستے پر چلتا ہوا یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں صحیح راستے پر چل رہا ہوں، ایسے شخص کے سمجھنے کی توقع پھر بہت کم ہوتی ہے، اس کو ''جہلِ مرکب'' کہتے ہیں، ارے بھائی! ایک آدمی بُرائی کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں بُرائی کر رہا ہوں تو اُمید رکھو کہ کسی وقت وہ باز آ جائے گا، ایک آدمی کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے لیکن اُسے یہ احساس ہے کہ واقعی میں بُرا کام کر رہا ہوں یہ کام اچھا نہیں ہے، مجھے نہیں کرنا چاہیے، لیکن عادت کی مجبوری سے، کسی کے بہکانے سے، ماحول کی مجبوری سے وہ کر رہا ہے، لیکن سمجھتا ہے کہ میں غلط ہوں، تو جو اپنے آپ کو غلط سمجھ رہا ہے، وہ کسی وقت سنبھل جائے گا، اُس کو سنبھلنے کی توفیق ہو جائے گی۔ لیکن جو کر رہا ہو بُرائی اور دلیلیں دے رہا ہو کہ یہی ٹھیک ہے، ایسے شخص کے سنبھلنے کی توقع نہیں ہوتی یہ ''جہلِ مرکب'' میں مبتلا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر کہا کرتے ہیں کہ بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، زانی کو ہو سکتی ہے، چور کو ہو سکتی ہے، قاتل کو ہو سکتی ہے، ہر لچے بدمعاش کو ہو سکتی ہے، بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چور، چوری کرتا ہے تو وہ اُس کو جائز نہیں سمجھتا، وہ سمجھتا ہے کہ میں بُرا کام کر رہا ہوں، اس پر توقع ہے کہ کسی وقت چھوڑ دے گا، اور

ایک زانی زنا کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں غلط کام کر رہا ہوں تو کسی وقت بھی اس کو تنبہ ہو جائے گا وہ چھوڑ دے گا۔ لیکن بدعتی تو اس بدعت کو، اللہ کی معصیت کو عبادت سمجھ کر کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ نیکی کا کام ہے، اس سے اللہ خوش ہوگا، اللہ کے پیغمبر خوش ہوں گے، اللہ کے ولی خوش ہوں گے وہ تو ان کے نام پر جو کچھ کرتا ہے نیکی سمجھ کر کرتا ہے، جب وہ نیکی سمجھ کر کرتا ہے تو پھر وہ باز کیسے آئے؟ اس لیے بدعتی کے لیے ایک قسم کا عملاً توبہ کا دروازہ بند ہے، کہ بہت کم اللہ تعالیٰ کسی کی دستگیری فرمادے، کوئی خاص فضل ہو جائے تو سمجھ جائے، ورنہ بدعتی آخر وقت تک سنبھلتا نہیں ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خلافِ شریعت کام کرتا ہے، اور اُس کا دل دماغ یہ کہتا ہے کہ یہ ثواب کا کام ہے، نیکی کا کام ہے، جب نیکی کا کام ہے تو توبہ کیوں کرے۔ تو یہ گمراہی کا ٹھپہ ہے جب کسی پر لگ جائے کہ انسان ہو تو غلط کار، اور سمجھے یہ کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں۔

''زینت'' کا معیار

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ: اب مطلب کی بات آگئی کہ یہ لوگ عبادت کرتے وقت جو کپڑے اتار دیتے تھے، بیت اللہ کے قریب ننگے ہو کر جاتے تھے، طواف کرتے تھے تو اب حکم دیا جارہا ہے، کہ اے آدم کے بچو! اپنی زینت اختیار کرو ہر نماز کے وقت یا مسجد کی ہر حاضری کے وقت، یا ہر عبادت کے وقت، زیب و زینت کے ساتھ عبادت کیا کرو۔ جس سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کا پہننا فرض ہے، عام حالات میں بھی فرض اور نماز کے لیے خاص طور پر فرض، کہ اگر ننگا بدن ہوگا تو نماز نہیں ہوگی۔ باقی یہ ہے کہ کتنے پہننے چاہئیں وہ تفصیل فقہ میں آپ کے سامنے موجود ہے، کہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک جگہ کا چھپانا تو فرض ہے، عام حالات میں بھی اور نماز میں بھی، فرض مقدار تو اسی سے پوری ہو جاتی ہے، اگر کوئی شخص اتنے بدن کو ڈھانپ کے نماز پڑھ لیتا ہے، چاہے باقی بدن اس کا ننگا ہی ہو تو فرض ادا ہو گیا۔ لیکن آگے حکم جو ہے صرف فرض کی ادائیگی کا نہیں بلکہ زینت اختیار کرنے کا ہے، تو جیسے جیسے اسباب مہیا ہوتے جائیں اُتنی زینت اختیار کرنا ضروری ہے۔ زینت کا معیار کیا ہے؟ خوبصورت اور اچھے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے کے لیے جاؤ، اس کا معیار کیا ہے؟ تو فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کا معیار یہ ہے، کہ دنیا کے اندر معزز سے معزز مجلس میں جانے کے لیے آپ اپنے لیے کون سی ہیئت پسند کرتے ہیں، جس قسم کی ہیئت آپ دنیا کی معزز مجلسوں میں جانے کے لیے پسند کرتے ہیں، مسجد میں اس ہیئت کے ساتھ جاؤ، ورنہ مکروہ ہے۔ یعنی آپ کے کپڑے اتنے میلے ہیں کہ اگر آپ کو بلا لیا جائے کہ وہاں اجلاس ہے، یا وہاں میٹنگ ہے، یا وہاں کچھ معزز آدمی جمع ہیں، آپ بھی آئیں، آپ اس حالت میں جانے کے لیے تیار نہیں، اب اگر اس حالت میں آپ مسجد میں جائیں گے تو یہ آپ کا جانا مکروہ ہے، اور اس لباس کے ساتھ آپ کی نماز مکروہ ہے۔ بس یہ معیار ہے کہ معزز مجلس میں، کسی بڑے آدمی کی مجلس میں جانے کے لیے انسان جس قسم کی ہیئت اپنے لیے پسند کرتا ہے، اس قسم کی ہیئت اختیار کرنا خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ کا مصداق ہے۔ اگر کسی کے پاس گھٹیا کپڑے ہیں، وہی پہن کر وہ ہر جگہ جاتا ہے، حتیٰ کہ تھانے دار بلالے، تحصیل دار بلالے، کوئی معزز آدمی بلالے اسی کیفیت سے جاتا ہے، تو اس کے لیے ان کپڑوں میں نماز مکروہ نہیں

ہے، جس طرح سے عام مزدور طبقہ اور کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ تو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جو لباس آپ معزز مجلسوں کے اندر پہن کر جاتے ہیں وہی اس کا معیار ہے۔ اس لیے مسجد میں جو تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں، لوگ آتے ہیں سر پہ رکھ کے نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں، اگر انہیں کہا جائے کہ یہ ٹوپی لے کر ذرا بازار میں چکر لگا آؤ تو شاید وہ آمادہ نہ ہوں تو ایسی ٹوپیوں کے ساتھ ان کے لئے نماز مکروہ ہو جائے گی۔ اور اگر ایک آدمی کے سر پر ٹوپی ہے وہی لیے پھرتا ہے ہر جگہ، چاہے وہ میلی ہے چاہے وہ پھٹی ہوئی ہے، تو اس کے لیے اس ٹوپی کے اندر نماز مکروہ نہیں ہے۔ تو خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ کے تحت مفسرین نے فقہاء نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اچھی حالت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے، اور اچھی حالت وہ ہے کہ جو انسان اچھی سے اچھی مجلس میں جاتے وقت اختیار کرتا ہے، اور اگر اس کے خلاف اختیار کرو گے تو ایسی صورت میں مکروہ ہوگی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں کپڑے کم ہوتے تھے، صرف ایک چادر باندھ کر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، آپ کی مجلس میں بھی ویسے ہی آتے تھے، اُن کے لیے یہ کوئی مکروہ نہیں تھا۔ اب ہماری حالت ایسی ہوگئی کہ ہم کسی استاذ کے سامنے صرف اتنی سی چادر باندھ کر جانے کے لیے تیار نہیں، باہر جانے کے لیے تیار نہیں، تو اب اگر ہم صرف چادر باندھ کر نماز پڑھیں گے تو ہمارے لیے مکروہ ہے۔ گرمیوں میں لوگوں کو عادت ہوتی ہے، قمیص اتار دیتے ہیں، صرف بنیان پہنی ہے، یا ایسے ہی ایک صافہ (چادر) سا ڈال لیا اور نماز پڑھ لی، اور ابھی پیغام آ جائے کہ تمہیں تحصیل دار صاحب بلا رہے ہیں، تو دیکھو! ابھی پوشاک پہنی جائے گی، نہ گرمی کا عذر ہوگا نہ کوئی اور عذر، ان کے لئے نماز بالکل مکروہ ہے، چاہے وہ کہیں کہ ہم نے ستر ڈھانپا ہوا ہے، پھر بھی ان کی نماز مکروہ ہے، جو اس قسم کے لباس میں نماز پڑھتے ہیں جس لباس کے ساتھ وہ کسی معزز مجلس میں جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ کا مفہوم یہ ہے۔

اِسراف سے بچنے کا حکم

وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا: کھاؤ پیو، اور حد سے نہ بڑھو، اسراف نہ کرو۔ حد سے بڑھنا ایک تو یہ بھی ہوتا ہے کہ حلال سے حرام کی طرف انسان چلا جائے، حلال پر بند نہیں رہتا حرام کی طرف جاتا ہے۔ اور ضرورت سے زیادہ کھاتا پیتا ہے جو انسان کے لیے بدہضمی کا باعث بن کر ہلاکت کا باعث ہو جائے وہ بھی اسراف میں داخل ہے۔ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ: اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اس کا تعلق بھی مشرکین کے اس معاشرے کے ساتھ ہے، کہ انہوں نے اپنے طور پر بعض چیزوں کو اپنے اُوپر حرام کر رکھا تھا، کھاتے پیتے نہیں تھے کہ ان دنوں میں یہ نہیں کھانا، ان دنوں میں یہ نہیں کھانا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ انعام میں کچھ گزر چکی ہے۔ تو اس پر بھی پابندی لگانا مقصود ہے کہ حرام کرنا حلال ٹھہرانا اللہ کا کام ہے، جو چیزیں اس نے حلال ٹھہرائی ہوئی ہیں اُن کو کھاؤ پیو، اپنے طور پر ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، یہ بھی اسراف ہے، یہ بھی حد سے بڑھنا ہے، اور اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ

آپ کہہ دیجئے کس نے حرام ٹھہرایا اللہ کی اس زینت کو جو اللہ نے نکالی ہے اپنے بندوں کے لئے اور (کس نے حرام ٹھہرایا) رزق میں سے

الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً

پاکیزہ چیزوں کو، آپ فرمادیں یہ سب نعمتیں اُن لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے دُنیوی زندگی میں اس حال میں کہ خالص ہیں

يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ

قیامت کے دِن، ایسے ہی ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں آیات کو علم والے لوگوں کے لئے ﴿۳۲﴾ آپ فرما دیجئے سوائے اس کے کچھ نہیں کہ

رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ

میرے رَبّ نے حرام ٹھہرایا بے حیائی کے کاموں کو، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپے ہوئے ہیں، اور (حرام ٹھہرایا) گناہ کو اور ناحق ظلم کرنے کو

وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا

اور اس بات کو کہ تم شریک ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ ایسی چیز جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، اور اس بات کو کہ تم بولو اللہ پر ایسی باتیں

لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ

جو تم جانتے نہیں ﴿۳۳﴾ اور ہر جماعت کے لئے ایک وقت معین ہے، پس جب اُن کا وہ وقت معین آجائے گا تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ

سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے ﴿۳۴﴾ اے آدم کی اولاد! اگر آئیں تمہارے پاس رسول تمہی میں سے

يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

جو پڑھتے ہوں گے تم پر میری آیات، پس جو کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے گا اور اپنے اعمال کو دُرست کرلے گا پس نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ

اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۳۵﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کرتے ہوئے ان سے اعراض کرلیا

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

یہی لوگ جہنم والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۳۶﴾ پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو گھڑے

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ

اللہ پر جھوٹ یا اُس کی آیات کو جھٹلائے، یہی لوگ ہیں کہ پہنچے گا ان کو ان کا حصہ

الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

لکھی ہوئی تقدیر سے، جب آجائیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے جو ان کو وفات دیں گے، تو وہ کہیں گے کہاں چلے گئے وہ

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى

جن کو تم پکارا کرتے تھے اللہ کے علاوہ، وہ جواب دیں گے کہ وہ سب ہم سے گم ہوگئے، اور وہ لوگ اقرار کریں گے

اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ

اپنے نفسوں پر کہ بیشک وہ کافر تھے ﴿۳۷﴾ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے داخل ہو جاؤ جہنّم میں ان جماعتوں میں شامل ہو کر جو تم سے پہلے

مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ

گزری ہیں انسانوں کی اور جنوں کی، جب کبھی داخل ہوگی کوئی جماعت لعنت کرے گی وہ

اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ

اپنے جیسی جماعت پر، حتّٰی کہ جب سب جہنّم میں اکٹھے ہو جائیں گے، تو کہے گی پیچھے جانے والی جماعت اس جماعت کے متعلق جو پہلے چلی گئی

رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۬ؕ قَالَ لِكُلٍّ

اے ہمارے پروردگار! یہی ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس دے ان کو آگ سے دُگنا عذاب، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہر کسی کے لئے

ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ

دُگنا ہے لیکن تم جانتے نہیں ﴿۳۸﴾ اور کہے گی وہ پہلی جماعت پچھلی جماعت کو پس نہیں ہے

لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

تمہارے لیے ہم پر کسی قسم کی فضیلت پس چکھو تم عذاب اُن کاموں کی وجہ سے جو تم کرتے تھے ﴿۳۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ: آپ کہہ دیجئے مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ: یہ

استفہامِ انکاری ہے۔ کس نے حرام ٹھہرایا اللہ کی اُس زینت کو جو اللہ نے ظاہر کی ہے، نکالی ہے اپنے بندوں کے لئے۔ زینت سے یہاں اچھا لباس مراد ہے۔ کس نے حرام ٹھہرائی اللہ کی زینت، ایسی زینت جو اللہ نے ظاہر کی، پیدا کی، نکالی اپنے بندوں کے لئے، وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ: اس کا عطف زِیْنَۃَ پر ہے، اور الطَّیِّبٰتِ کے نیچے جو آپ کو کسرہ نظر آ رہا ہے یہ مُسلمات والی بات ہے، کہ نصب کسرے کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے، ورنہ زِیْنَۃَ پر عطف ہونے کی وجہ سے ہے یہ منصوب۔ ''اور کس نے حرام ٹھہرایا رزق میں سے پاکیزہ چیزوں کو'' وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ: مَنْ حَرَّمَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ، رزق میں سے پاکیزہ چیزوں کو، ستھری چیزوں کو کس نے حرام ٹھہرایا؟ قُلْ: آپ فرما دیں، هِيَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: یہ سب نعمتیں یعنی زینت اور طیبات ان لوگوں کے لئے ہیں جو ایمان لائے دنیوی زندگی میں اس حال میں کہ خالص ہیں قیامت کے دن، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ایسے ہی ہم کھول کھول کے بیان کرتے ہیں آیات کو علم والے لوگوں کے لئے۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ: فواحش فاحشہ کی جمع۔ آپ فرما دیجئے۔ اِنَّمَا یہ حصر کے لئے آیا کرتا ہے، یعنی سوائے اس کے کچھ نہیں، بات یہی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، جس کو آپ ''جز ایں نیست'' کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ ''سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میرے رَبّ نے حرام ٹھہرایا بے حیائی کے کاموں کو'' مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ: یہ فواحش سے بدل ہے۔ جو ان بے حیائی کے کاموں میں سے ظاہر ہیں نمایاں ہیں کھلم کھلے ہیں، یا جو چھپے ہوئے ہیں، مَا بَطَنَ: جو چھپے ہوئے ہیں، مَا ظَهَرَ: جو کھلم کھلا ہیں، ظاہر باہر ہیں، وَالْاِثْمَ: اور حرام ٹھہرایا میرے رَبّ نے گناہ کو، وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ: اور ناحق ظلم کرنے کو، وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا: سلطان دلیل کو کہتے ہیں۔ اور اَنْ تُشْرِكُوْا: اَنْ مضارع پر داخل ہو تو نصب بھی دیتا ہے اور اس کو مصدر کی تاویل میں کر دیتا ہے۔ ''حرام ٹھہرایا میرے رَبّ نے اس بات کو کہ تم شریک ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ ایسی چیز جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری''۔ مصدر کے طور پر ترجمہ کرو گے تو ''حرام ٹھہرایا میرے رَبّ نے شریک ٹھہرانے کو اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو جس کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری'' وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اور حرام ٹھہرایا میرے رَبّ نے اس بات کو کہ تم بولو اللہ پر ایسی باتیں جن کو تم جانتے نہیں۔ اللہ پر ایسی باتیں بولنا جن کو تم جانتے نہیں ہو، اس قسم کا بولنا، اس کو بھی میرے رَبّ نے حرام ٹھہرایا، وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ: اور ہر جماعت کے لئے ایک وقت معین ہے۔ اجل وقت معین کو کہتے ہیں۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ: پس جس وقت ان کی اَجل آ جائے گی، جب ان کا وہ وقت معین آ جائے گا لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً: نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے، وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ: نہ آگے بڑھ سکیں گے، نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹتے ہیں نہ وہ آگے بڑھتے ہیں۔ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ: اے آدم کی اولاد! اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: اِمَّا یہ اصل میں اِن ما تھا، اِن شرطیہ، ما زائدہ۔ اگر آئیں تمہارے پاس رسول تمہی میں سے، یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ: جو پڑھیں گے، جو پڑھتے ہوں گے تم پر میری آیات۔ قَصَّ یَقُصُّ: بیان کرنا۔ فَمَنِ اتَّقٰى: پھر جو کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے گا، وَاَصْلَحَ: اور اپنے اعمال کو درست کر لے گا، فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ: پس نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ خوف کا معنی آپ ڈر کے ساتھ کر دیتے ہیں اور حزن کا معنی غم، دونوں کے درمیان میں فرق کرنے کے لئے علماء یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ آنے والے حالات کا جو انسان کے دل میں اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، آنے والے حالات سے

جو انسان ڈرتا ہے اس کو خوف کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اور ایک واقعہ پیش آچکا جو اس پر صدمہ ہوتا ہے اس کو حزن کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے کسی کا بچہ بیمار ہو جائے، ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اس کو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مر نہ جائے، یہ مر جائے گا، اس کی موت کا تصور کر کے جو دل میں ایک خوف سا اور اندیشہ سا ہوتا ہے اس کے مرنے کا وہ تو خوف ہے، اور اس کے مرنے کے بعد جو صدمہ ہوتا ہے وہ حزن ہے، تو فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو ان کو ماضی میں گزرے ہوئے واقعات پر کوئی صدمہ ہوگا اور نہ آنے والے حالات کا کسی قسم کا اندیشہ ہوگا، یعنی بالکل خوش ہوں گے، کیونکہ غمی انسان پر دو اعتبار سے ہی آیا کرتی ہے، یا تو ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، اس وجہ سے انسان کی طبیعت پر افسردگی ہے، یا ایک واقعہ اس کی طبیعت کے خلاف آچکا اس کا دل میں صدمہ ہے، اور اگر ماضی کے حالات پر بھی انسان مطمئن ہو اور مستقبل کے حالات پر بھی مطمئن ہو تو پھر طبیعت میں بشاشت ہوتی ہے، خوشی ہوتی ہے، پھر انسان پر افسردگی یا غم نہیں طاری ہوا کرتا، تو یہ دو لفظ بول کر گویا کہ ماضی اور مستقبل دونوں کے متعلق مطمئن کر دیا گیا، کہ ان پر کوئی خوف بھی نہیں ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اور وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَاۤ: استکبار: بڑا بننا، تکبر کرنا۔ اور عَنْهَا میں جو عن ہے یہ اشارہ کرتا ہے اس بات کی طرف کہ اسْتَكْبَرُوْا کے اندر اعراض والا معنی مضمن ہے، مطلب یہ ہوا ''اور وہ متکبر ہو گئے، بڑے بن گئے اعراض کرتے ہوئے ہماری آیات سے'' تکبر کرتے ہوئے انہوں نے ہماری آیات سے منہ موڑ لیا، ہماری آیات سے متکبر ہونے کا معنی یہی ہے کہ تکبر کرتے ہوئے، اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے انہوں نے ہماری آیات سے منہ موڑ لیا، اعراض کر لیا۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ: یہی لوگ جہنم والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو گھڑے اللہ پر جھوٹ، اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ: یا اس کی آیات کو جھٹلائے، اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ: یہی لوگ ہیں کہ ان کو ان کا حصہ پہنچے گا لکھی ہوئی تقدیر سے۔ کتاب سے مکتوب مراد ہے۔ یعنی جتنی ان کے لئے عمر لکھی گئی وہ عمر ان کی پوری ہوگی، جتنا ان کے لئے رزق لکھا گیا وہ رزق ان کو ملے گا، ''یہی لوگ ہیں کہ پہنچے گا ان کو ان کا حصہ کتاب سے، لکھی ہوئی چیز سے ان کو ان کا حصہ پہنچے گا، جو ان کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے وہ تو بہر حال یہ فائدہ اٹھائیں گے، حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا: جب آجائیں گے ان کے پاس ہمارے رسول، بھیجے ہوئے، یعنی موت کے فرشتے، ملک الموت اور اس کے ساتھی، جب آجائیں گے ان کے پاس ہمارے رسول يَتَوَفَّوْنَهُمْ: جو ان کو وفات دیں گے، قَالُوْۤا: تو یہ رسول کہیں گے، یہ بھیجے ہوئے فرشتے کہیں گے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے، اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: کہاں چلی گئیں وہ چیزیں جن کو تم پکارا کرتے تھے اللہ کے علاوہ؟ یہ ایک قسم کا ڈانٹنا مقصود ہے کہ آج بلا لو ان کو، اب ہم لگے ہیں تمہاری جان نکالنے، جن کے تم نے سہارے لگا رکھے تھے، جن کو تم اپنا سب کچھ سمجھتے تھے، آج بلا لو انہیں، ''کہاں چلے گئے وہ جن کو تم پکارتے تھے اللہ کے علاوہ'' قَالُوْا: وہ جواب دیں گے، ضَلُّوْا عَنَّا: وہ سب ہم سے گم ہو گئے، وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ: اور وہ لوگ اقرار کریں گے اپنے نفسوں پر اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: کہ بیشک وہ کافر تھے، شہادت دیں گے اپنے نفسوں پر، شهادة على النفس کا معنی ہمارے محاورے میں ہوتا ہے ''اقرار کرنا''، دوسرے کے متعلق جو بات کہی جائے اس کو تو ہمارے

محاورے میں ''شہادت'' سے تعبیر کرتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کے خلاف شہادت دے دی، اور جو اپنے متعلق شہادت ہوتی ہے اس کو''اقرار'' کہا جاتا ہے،''وہ اقرار کریں گے، اپنے نفسوں پر خود گواہ ہوں گے کہ یہ کافر تھے'' قَالَ ادْخُلُوْا فِیْۤ اُمَمٍ: اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ماضی کے ساتھ اس کو تعبیر کیا ہے، مستقبل کی بات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا جائے تو یہ تحقق وقوع کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کہ یہ بات یقیناً ہونے والی ہے، یوں سمجھو کہ ہو ہی گئی، یہ فصاحت کے تحت ماضی کے ساتھ کسی مستقبل کے واقعہ کو نقل کرنا، آپ عام طور پر پڑھیں گے کہ یہ تحققِ وقوع کے لئے ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ اتنا یقینی واقعہ ہے کہ یوں سمجھو ہو ہی گیا، جیسے ماضی میں ہوئے ہوئے واقعہ پر یقین ہوتا ہے تو یہ مستقبل کا واقعہ ایسے ہی یقینی ہے، اس لئے ترجمہ مستقبل کے ساتھ ہوگا،''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے'' ادْخُلُوْا فِیْۤ اُمَمٍ: فی یہاں مع کے معنی میں ہے۔ داخل ہو جاؤ تم ان جماعتوں کے ساتھ جو گزر گئیں تم سے پہلے انسانوں سے اور جنوں سے، جنوں اور انسانوں سے جو جماعتیں تم سے پہلے گزر گئیں ان کے ساتھ شامل ہو کر داخل ہو جاؤ فِی النَّارِ: جہنم میں۔ اَیْ ادْخُلُوْا فِی النَّارِ، داخل ہو جاؤ جہنم میں ان جماعتوں میں شامل ہو کر جو تم سے پہلے گزری ہیں جنوں اور انسانوں کی، كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ جب کبھی داخل ہو گی کوئی جماعت، لَّعَنَتْ اُخْتَهَا: اُخت بہن کو کہتے ہیں لیکن یہاں اپنے جیسی جماعت مراد ہے۔ جب کبھی داخل ہو گی کوئی جماعت لعنت کرے گی وہ اپنے جیسی جماعت پر، یعنی جن کے ساتھ انہوں نے بھائی چارے کے طور پر وقت گزارا تھا ان پر وہ لعنت کریں گے، حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا: ادَّارَكُوْا اصل میں تھا: تَدَارَكُوْا، تَدَارُكٌ یہ تَلَاحُق کے معنی میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب سارے کے سارے کافر مشرک اس جہنم میں اکٹھے ہو جائیں گے، جب سارے ایک دوسرے کو پالیں گے، سب وہاں اکٹھے ہو جائیں گے، قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ: تو کہے گی ان میں سے آخری جماعت، یعنی جو پیچھے تھے، پچھلگ، تابعین نے بعد میں جانا ہے، متبوعین نے پہلے جانا ہے، لیڈر جیسے یہاں قیادت کرتے ہیں وہاں بھی قیادت ہی کریں گے، قرآنِ کریم میں جس طرح سے فرعون کے متعلق آتا ہے کہ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (سورۂ ہود:۹۸) قَدَمَ یَقْدُمُ: آگے آگے چلنا۔ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ: وہ اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا قیامت کے دن، اور انہیں جہنم میں جھونک دے گا، تو ان لیڈروں نے جو یہاں قیادت کرتے ہیں وہاں بھی قیادت کرنی ہے، پہلے وہ جائیں گے، اور ان کے پیچھے جائیں گے جھنڈے اٹھانے والے، جب سارے وہاں اکٹھے ہو جائیں گے تو پھر پچھلے اگلوں کے متعلق کہیں گے، قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ: کہے گی پیچھے جانے والی جماعت اُس جماعت کے متعلق جو پہلے چلی گئی۔ قلتُ لزیدٍ میں جیسے ترجمہ کیا جاتا ہے،''میں نے زید کو کہا'' بھی ترجمہ ہوتا ہے، اور''زید کے متعلق کہا'' بھی ترجمہ ہوتا ہے۔ تو یہ ان کے متعلق کہیں گے رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا: اے ہمارے پروردگار! یہی ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، یہ مریدین، تابعین، پچھلگ اپنے لیڈروں کے متعلق کہیں گے: رَبَّنَا: یَا رَبَّنَا، اے ہمارے پروردگار! یہی ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ: پس دے اِن کو آگ سے دُگنا عذاب، عَذَابًا ضِعْفًا: ان کو دُگنا عذاب دے، انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، قَالَ: اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لِكُلٍّ ضِعْفٌ: ہر کسی کے لئے دُگنا ہے، وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ: لیکن تم جانتے نہیں، وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ: اور کہے گی وہ پہلی جماعت، یعنی لیڈروں والی۔ کہے گی وہ پہلی جماعت پچھلی جماعت

کو۔ یہاں خطاب ان کو ہے، اسی لئے ترجمہ یوں ہی کرتا ہے''پہلی جماعت پچھلی جماعت کو کہے گی'' فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ: پس نہیں ہے تمہارے لئے ہم پر کوئی بڑھوتری، بڑائی، فضیلت، فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ: پس چکھوتم عذاب ان کاموں کی وجہ سے جوتم کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع ھٰذا میں بیان کردہ مضامین

جو مضمون آپ کے سامنے چلا آرہا ہے، وہ مشرکین کی اُن رسوم کی تردید ہے جو انہوں نے اپنے طور پر تجویز کر رکھی تھیں اور نسبت اُن کی اللہ کی طرف کرتے تھے، جن میں خاص طور پر یہ مسئلہ یہاں زیرِ بحث ہے کہ وہ طواف کرتے ہوئے کپڑے نہیں پہنتے تھے، اور حج کے ایام میں خواہ مخواہ بعض چیزوں کو اپنے اُوپر حرام ٹھہرا لیتے تھے، اس کی تردید پیچھے کی گئی کہ یہ شیطانی کام ہیں، اور جس طرح شیطان نے تمہارے ابوین کو بہکایا تھا اور ان کو لباس سے بھی محروم کردیا اور جنت کی نعمتوں سے بھی محروم کردیا، آج بھی شیطان تمہارے پیچھے لگ کر تمہیں بہکا کر لباس سے بھی محروم کررہا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھی محروم کررہا ہے، چوکنے ہوجاؤ یہ وہی دشمن ہے جو وہاں سے پیچھے لگا اور آج بھی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ تو پہلی آیت میں تو یہی انکار کیا گیا کہ آپ ان سے پوچھئے، قُلْ کا یہ معنی ہوتا ہے کہہ دو، اعلان کردو، یعنی اِن سے دریافت کرو، ان کے سامنے واضح طور پر کہو، کون ہے جس نے حرام ٹھہرایا اللہ کی زینت کو جو اللہ نے بندوں کے لیے ظاہر کی ہے، زینت سے مراد لباس ہے، کیونکہ آپ کے سامنے عرض کیا تھا، کہ لباس میں صرف یہی فائدہ نہیں کہ اس سے ستر پوشی ہوتی ہے، اس میں ستر پوشی کا فائدہ بھی ہے اور انسان کے لیے زینت بھی ہے، تو اللہ نے جو زینت پیدا کی ہے، لباس جو انسان کے لیے باعث زینت ہے، اس کو کس نے حرام ٹھہرایا ہے؟ یہ اِستفہامِ انکاری ہے، یعنی کسی کو حق نہیں حرام ٹھہرانے کا، اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے، حرام ٹھہرائے تو اللہ ٹھہرائے، جس چیز کو اللہ حرام نہ ٹھہرائے اس کو کون حرام ٹھہرا سکتا ہے۔ اسی طرح رزق میں سے پاکیزہ اور ستھری چیزیں، ان کو کس نے حرام ٹھہرایا، یعنی کسی کو حق نہیں حرام ٹھہرانے کا، حرام ٹھہرانا حلال ٹھہرانا یہ منصب خالق کا ہے، جس نے چیز کو پیدا کیا جو اس کا مالک ہے وہی کہہ سکتا ہے کہ یہ چیز تم استعمال کرو یہ چیز استعمال نہ کرو، کسی دوسرے کو حق نہیں ہے۔

دُنیا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مؤمن اور کافر میں فرق

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: آپ یہ بھی کہہ دیجئے، هِيَ ضمیر کا مرجع یہی نعمتیں ہیں جو زینت اور طیبات میں مذکور ہیں، یعنی کھانے پہننے کے انعامات، کھانے پہننے کی نعمتیں، اللہ نے زینت کے طور پر لباس پیدا کیا، کیسی پاکیزہ اور صاف ستھری چیزیں اللہ نے کھانے کے لیے پیدا فرمائیں، آپ یہ کہہ دیجئے کہ یہ نعمتیں جو دنیا میں استعمال ہوتی ہیں (توجہ فرمایئے!) یہاں اس

دُنیا میں رہتے ہوئے ان نعمتوں سے مؤمن بھی فائدہ اٹھاتا ہے کافر بھی فائدہ اٹھاتا ہے، اللہ کا فرمانبردار بھی فائدہ اٹھاتا ہے، باغی بھی فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن دونوں کے کھانے میں اور دونوں کے فائدہ اٹھانے میں فرق ہے، فرق کیا ہے؟ کہ مؤمن ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے یہ نعمتیں آخرت میں جاکر اس کے لیے وبال نہیں بنیں گی، جب یہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہے، اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت کا ذریعہ بناتا ہے، تو یہ نعمتیں حقیقت میں اس کے لیے نعمتیں ہیں اور آخرت میں جاکر وبال نہیں بنیں گی۔ اور ایک کافر فائدہ اٹھاتا ہے لیکن وہ ان نعمتوں کو لیتا ہے، لے کر ان کو اللہ کی نافرمانی کا ذریعہ بناتا ہے، انہی نعمتوں کے زور سے وہ فسق وفجور میں مبتلا ہوتا ہے، ٹھیک ہے کہ آج وہ نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، لیکن یہ نعمتیں اس کے حق میں حقیقتاً نعمتیں نہیں ہیں، بلکہ یہی نعمتیں قیامت کے دن اِس شخص کے لیے وبال بن جائیں گی، اور یہ کھایا پیا ہوا سارا ناک کے راستے نکلے گا، اس لے خاص طور پر یہ نعمتیں اگر ہیں تو مؤمنین کے لیے ہیں۔ دیکھو! ایک شخص کو اللہ تعالیٰ پیسے دیتا ہے، روپیہ پیسہ اس کو حاصل ہوگیا، اس روپیہ پیسے کو اُس نے زکوٰۃ میں لگایا، خیرات کی، حلال ذریعے سے کما کر اس کو کھایا، پہنا، اپنے بچوں کو کھلایا، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس کو استعمال کیا، غریبوں کی ہمدردی کی، یہ ساری کی ساری چیزیں کیں، تو یہ مال اس کے حق میں دنیا میں بھی باعثِ راحت ہوا، اور یہی مال اِس کے لیے آخرت میں بھی ترقیات کا باعث بنے گا، ترقیٔ درجات ہوگی، تو یہ مال حقیقت میں اِس شخص کے لیے نعمت ہے جس نے دنیا کے اندر بھی اس کو آسائش پہنچائی، اور آخرت میں بھی وہ ترقیٔ درجات کا ذریعہ بنا، تو یہ مال نعمت ہوا۔ اور ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ مال دیتے ہیں اور جس وقت اس کے پاس مال نہیں تھا، وہ چکلے نہیں جاسکتا تھا، سینمے میں نہیں جاسکتا تھا، رنڈی بازی نہیں کرسکتا تھا، شراب نہیں پی سکتا تھا، جوا نہیں کھیل سکتا تھا، اور اسی طرح دوسری خرافات اس مال کے ذریعے سے جو ہوا کرتی ہیں یہ ناچ رنگ کی وہ نہیں کرسکتا تھا، اب اس کو مال مل گیا، جب مال مل گیا تو یہ سینمے میں خرچ کرنے لگ گیا، چکلے میں اُڑانے لگ گیا، جوا کھیلنے لگ گیا، شراب پینے لگ گیا، اور عیاشی بدمعاشی جتنی بھی مال کے ذریعے سے ہوتی ہے، وہ ساری کرنے لگ گیا، تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ مال اس کے لیے نعمت ہے؟ یہ مال اس کے لیے نعمت نہیں، یہ تو وبال ہے، کہ اس نے دنیا میں چند روز کھا پی لیا، لیکن جس وقت مرجائے گا، قیامت میں جائے گا، اس کا حساب کتاب دینا پڑے گا، تو پھر اس کو پتا چلے گا کہ یہ کیا ہے؟

دُنیا کی ساری نعمتیں اصل میں کس کے لئے مفید ہیں؟

یا ایسے سمجھ لیجئے جس طرح سے ایک تو آپ صاف ستھرا کھانا کھائیں، مٹھائی ہو، حلوہ ہو، کوئی دوسری چیز جو صحیح اجزا کے ساتھ بنی ہوئی ہے، تو آپ اس کو کھاتے ہیں، تو اس میں لذت بھی پاتے ہیں، اور وہ آپ کے بدن میں قوت کا ذریعہ بھی بنے گا، جس سے آگے آپ اپنے بدن سے کام لیں گے۔ اور ایک آدمی یہ مٹھائیاں کھاتا ہے، لیکن اس کے اندر زہر ملی ہوئی ہے، کھاتے وقت تو ٹھیک ہے کہ اُس کو مزہ آئے گا لیکن تھوڑی دیر کے بعد انتریاں کٹنی شروع ہوجائیں گی، پھر معلوم ہوگا کہ اس نے جو کھایا تھا یہ نعمت نہیں تھی یہ تو عذاب تھا، تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوجائے گا، کہ یہ جو مزے لے لے کر کھارہا تھا یہ نعمت نہیں تھی یہ تو عذاب تھا، چند منٹوں کے بعد انتریاں کٹنی شروع ہوجائیں گی، اور جان باہر آجائے گی تو پھر معلوم ہوگا کہ یہ حلوہ، یہ مٹھائی، یہ روٹی، یہ بھنا ہوا

گوشت جس میں زہرملی ہوئی تھی یہ نعمت نہیں تھی، یہ عذاب تھا۔تو کافروں کے لیے دنیا کی نعمتیں ایسے ہی ہیں، گویا کہ وہ زہریلی ہیں، آج اگران کو مزے کے ساتھ کھارہے ہیں، تو یہ کل کوان کے لیے وبال بنیں گی، اور آج یہ نعمتوں کو فسق وفجور کا ذریعہ بنارہے ہیں، کل ان کے لیے باعث عذاب ہوں گی۔ اور دنیا کی ان نعمتوں کو اگرتم خالص استعمال کرنا چاہتے ہوتو خالص تو بھائی! یہ مؤمنین کے لیے ہیں، کہ آخرت میں بھی ان کے اُوپر کوئی وبال نہیں آئے گا۔یہی ہے اس آیت کا مطلب کہ آپ کہہ دیجئے کہ یہ ساری نعمتیں چاہے لباس کی ہیں چاہے طیبات کی ہیں، زینت اور طیبات یہ ایسے طور پر کہ قیامت کے دن خالص ہوں اور کسی وبال کا باعث نہ بنیں یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں دنیوی زندگی میں جوایمان لاتے ہیں، یعنی دنیا میں یہ نعمتیں اصل کے اعتبار سے مفید انہی کے لیے ہیں جو ایمان لاتے ہیں، ایسے طور پر کہ خالص ہوں گی قیامت کے دن، کہ قیامت کے دن یہ نعمتیں کسی قسم کے وبال کا باعث نہیں بنیں گی۔تو اس میں تنبیہ کردی کہ ٹھیک ہے کہ زینت سے فائدہ اٹھاؤ، اور خوب اچھی طرح سے مزے کی چیزیں کھاؤ، لیکن اگر یہ چاہتے ہو کہ نتیجتاً وبال نہ بنیں، تو پھرایمان لاؤ اور ایمان کے تقاضے کے مطابق ان چیزوں کو استعمال کرو۔ اور اگر ایمان نہیں لاؤ گے اور دُنیا کی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ گے، تو پھر قیامت کے دِن جب ان کا حساب کتاب دینا پڑے گا تو پھنس جاؤ گے، تو ایسے طور پر کہ آخرت میں وبال نہ بنیں بلکہ خالص رہیں یہ نعمتیں دنیوی زندگی میں صرف مؤمنین کے لیے ہیں۔ اور کافر جو فائدہ اٹھاتے ہیں تو خَالِصَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ نہیں ہیں، بلکہ آج وہ کھاتے ہیں کل کو یہی کھایا ہواان کے لیے وبال بن جائے گا۔ایسے ہی ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں، آیات، اپنی قدرت کی نشانیاں علم والے لوگوں کے لیے، جو جانتے بوجھتے ہیں وہ ہماری ان باتوں سے متاثر ہوکر فائدہ اٹھائیں گے۔

مشرکین اپنی اُلٹی چال کی وجہ سے حق سے دُور ہوتے جارہے ہیں

جن چیزوں کو مشرکوں نے اپنے طور پر حرام ٹھہرارکھا تھا وہ تو غلط، اُس کی تو ہوگئی تردید، اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو حقیقتاً حرام ہیں، جو اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہیں، اُس میں بدبختو! تم سب مبتلا ہو، کیا الٹا حساب کررکھا ہے، یعنی جو چیز حرام نہیں اُن کو تم حرام کیے بیٹھے ہو، ادھر سے بھی محروم ہوئے، اور جو حرام ہیں اُن کو حلال بنائے بیٹھے ہو، اور اُن پر عمل کرتے ہو تو اور وبال کا مصداق بنے۔ بھئی! ہر برائی میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ بُرائی میں مبتلا ہونے کے بعد آدمی نیکی سے بھی محروم ہوتا ہے، دوہرا نقصان ہے، جس طرح سے نیکی کرنے کے دو فائدے ہیں، ایک تو نیکی ہوگئی اور ایک بُرائی سے بچ گیا، اور جس وقت انسان کسی بُرائی میں مبتلا ہوتا ہے، تو دوہرا نقصان ہوتا ہے، کہ ایک تو برائی میں مبتلا ہو گیا دوسرا نیکی سے بھی محروم ہوگیا۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے کہ جو اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزیں تھیں اُن کو تو کرلیا حرام، اور جو حرام کی ہوئی تھیں اُن کو سمجھ لیا حلال، صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلے، تو یہ نہیں کہ اپنی منزل پر ٹھہرے ہوئے ہیں، صحیح راستے پر چلتے تو اپنے اصل ٹھکانے کی طرف پہنچتے، اب غلط راستے کی طرف چلنے کا نتیجہ یہ ہے، کہ جتنا چلتے ہیں اتنا ہی دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بدعت کی بھی یہی خاصیت ہے کہ جو شخص بدعت کے مطابق عمل کرے وہ سُنّت سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جانا تھا مشرق کو، منہ کرلیا مغرب کی طرف، تو جتنا کوشش اور ہمت کے ساتھ وہ چلے گا اپنی منزل کو

طے کرنے کے لیے، حقیقت کے اعتبار سے وہ اتنا ہی دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ کچھ نہ کرتا، کم از کم کھڑا تو رہتا، کہ منزل سے اتنی دُوری نہ ہوتی، لیکن جب وہ غلط راستے پر چل پڑا، تو جتنا چلتا جائے گا اتنا منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں نا، گلستاں میں آپ نے پڑھا ہوگا:

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی!　　کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

کہ اے بدو! مجھے اندیشہ ہے کہ تو کعبے نہیں پہنچ سکے گا، کیونکہ جس راستے پر تو چل پڑا ہے یہ تو ترکستان کو جاتا ہے، تو جب اس راستے پر جائے جو ترکستان کو جاتا ہے تو کعبے کیسے پہنچے گا؟ (گلستاں، باب ۲، حکایت ۶)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بدعت کے اختیار کرنے کے بعد اللہ کی رضا والی منزل انسان حاصل نہیں کرسکتا، جتنی محنت اور کوشش کے ساتھ وہ عمل کرے گا، اتنا اپنی منزل سے دُور ہوتا چلا جائے گا، اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ حرام ٹھہرائے ہوئے کام یہ ہیں جن کو تم کررہے ہو، اللہ کے حلال کیے ہوئے کاموں کو تم نے حرام ٹھہرالیا اور جو حرام ٹھہرائے ہوئے تھے ان کے اندر مبتلا ہوگئے۔

اللہ نے کن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے؟

آپ کہہ دیجئے کہ سوائے اس کے نہیں یعنی یہ بات پکی ہے، اس کے خلاف کوئی شبہ نہیں کہ میرے رَبّ نے حرام ٹھہرایا ہے بے حیائی کے کاموں کو۔ بے حیائی کے کاموں میں ننگا طواف کرنا بھی ہے، چاہے وہ کھلم کھلا بے حیائی ہو چاہے چھپی ہوئی ہو۔ کھلم کھلا جیسے وہ سب کے سامنے ننگے ہو کر طواف کرتے تھے یہ ایک مثال ہے، ورنہ بازار میں، مجلسوں میں جتنی بے حیائیاں ہوتی ہیں یہ سب مَا ظَهَرَ کا مصداق ہے، جو میٹنگیں اور مجلسیں لگا کے، دوست یار اکٹھے ہو کر محفلیں لگا کر جس قسم کے گناہ کرتے ہیں وہ سب مَا ظَهَرَ میں داخل ہے۔ اور مَا بَطَنَ وہ ہیں جو چھپ کے کیے جاتے ہیں جیسے زِنا ہو گیا، یا اور کوئی بدمعاشی، بدکاری، مَا بَطَنَ میں وہ داخل ہیں۔ یا مَا ظَهَرَ سے وہ گناہ مراد ہوں گے کہ جو بدن کے ظاہر سے کیے جاتے ہیں، اور مَا بَطَنَ ہوگئے دل کے جذبات۔ دل کے جذبات میں بے حیائی شامل ہو وہ مَا بَطَنَ ہے، اور ظاہری بدن سے اس قسم کے کام کیے جائیں جو بے حیائی کے ہیں تو مَا ظَهَرَ ہے۔ کوئی بے حیائی کا کام ہو چاہے وہ چھپا ہوا ہے چاہے ظاہر ہے، میرے رب نے اُس کو حرام ٹھہرایا ہے۔ ''اور گناہ کو حرام ٹھہرایا'' نیکی کے مقابلے میں گناہ آیا کرتا ہے۔ ''ناحق کسی پر ظلم کرنے کو حرام ٹھہرایا، اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤ ایسی چیز کو جس کے متعلق اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری''، بے دلیل اللہ کے ساتھ شریک بنالیے یہ بھی حرام ہے جو تم کررہے ہو۔ سُلْطٰنًا نکرہ ہے، اور مَا لَمْ يُنَزِّلْ یہ نفی ہے، اور آپ نحو کے اندر پڑھیں گے کہ نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی قسم کی دلیل اللہ نے نہیں اتاری نہ نقلی، نہ عقلی، نہ فطری، شرک کے جواز کے لئے دلیل نہیں ہے، آپ نہ کوئی عقلی وجہ بیان کرسکتے ہیں، کہ شرک جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک ہے، نہ کوئی نقلی بات بیان کرسکتے ہو، کہ توراۃ میں، اِنجیل میں، زبور میں، قرآن میں کوئی آیت ایسی آئی ہوئی ہے کہ جو جواز پیدا کرتی ہے کہ فلاں اللہ کے ساتھ شریک ہے، اور نہ انسان کی فطرت کا یہ تقاضا ہے۔ تو بالکل سراسر بے دلیل اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرارہے ہو یہ کام بھی حرام ہے۔ ''اور اللہ نے اس

بات کوحرام ٹھہرایا، کہ تم اللہ پرایسی باتیں بولو جن کا تمہیں علم نہیں'' اس کا مطلب پہلے آپ کے سامنے آ چکا، کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق وہی بات کہنی چاہیے کہ جس کی علمی دلیل موجود ہو، اور جس بات کی انسان کے پاس علمی دلیل نہیں ہے اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا کہ یہ اللہ کا حکم ہے یہ بھی زیادتی ہے، اوراس میں وہ سارے مشرک مبتلا تھے۔

سوال:-''شرک'' کسے کہتے ہیں؟

جواب:-''شرک'' کسے کہتے ہیں اور یہ ہوتا کس طرح سے ہے؟ یہ ان شاء اللہ العزیز! کسی دن بیان کروں گا، پچھلے سال سورۂ فاتحہ میں یہ مضامین اچھی طرح تفصیل سے عرض کردیے تھے، اب بھی چونکہ آپ میں سے بہت سارے لڑکے نئے ہیں، تو کسی دن''شرک'' کے متعلق تفصیل سے بیان ہوجائے گا۔

موت کے تقدّم وتأخر کی نفی پرایک اِشکال کا جواب

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ: یہاں سے سلسلہ شروع ہوا ترہیب کا۔ ترہیب بایں معنی کہ اب جو تم دندناتے پھرتے ہو، یہ نہ سمجھو کہ تمہیں پکڑنے والا کوئی نہیں ہے، اور تمہیں کھلی چھٹی ہے جو چاہو کرتے پھرو، ایسا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ ہر جماعت کو وہ کچھ وقت کے لیے مہلت دیا کرتا ہے، اور جس وقت اس کا وقت آجاتا ہے پھر نہ آگے کو سرک سکے نہ پیچھے کو ہٹ سکے، مطلب کیا؟ کہ پھر موقع پر دھرلی جاتی ہے۔ پیچھے نہیں ہٹ سکتی کہ ہم نے مثال کے طور پر پیر کا دِن متعین کیا ہے کہ ان پر عذاب آنا ہے، وہ منگل تک پہنچ جائے ایسا نہیں ہوگا، آگے نہیں بڑھ سکتی کہ دِن متعین ہو پیر کا، کہ جب پیر کا دِن آجائے گا تو اتوار کے دِن وہ نہیں مرسکتی، اب آپ جانتے ہیں کہ جب پیر کا دِن آجائے گا تو اتوار کے دِن مرنے کا کیا سوال، وہ تو یقینی طور پر نفی ہے کہ جب پیر کا دِن آگیا تو اتوار کو نہیں مرسکتی، یہ دو باتیں جو کہی جارہی ہیں، وہ اس لیے کہی جارہی ہیں کہ جیسے پیر کا دِن آجانے کے بعد اتوار کا دِن آنا ممکن نہیں، اسی طرح سے پیر کا دِن اگر اُن کی موت کے لئے متعین کردیا گیا ہے تو منگل کا دِن آنا بھی ممکن نہیں، جس طرح سے استقدام ممکن نہیں، اسی طرح سے استیخار بھی ممکن نہیں، نہ آگے بڑھ سکو گے نہ پیچھے ہٹ سکو گے، یہ محاورہ ہے، اصل میں ایک شق کی نفی کرنی ہوتی ہے، اور تاکید کے طور انسان دوسری شق کی بھی نفی کردیتا ہے، جیسے عام طور مثال دی جاتی ہے کہ آپ کسی دُکان پر جاتے ہیں، جا کر ایک چیز اٹھاتے ہیں، ایک کتاب آپ نے لی کہ یہ کتاب کتنے کی ہے؟ وہ کہتا ہے دس روپے کی، آپ کہتے ہیں کہ''کچھ گھٹ وَدھ ہے تے دس دیو'' (کچھ کمی بیشی ہو تو بتادو) اب پوچھنا تو اصل میں گھٹ ہے، وَدھ تو نہیں پوچھنی، یعنی آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ نے بتائے تو دس روپے ہیں، اگر اس کی قیمت گیارہ روپے قیمت ہے تو بھی بتادو، یہ مطلب ہوتا ہے؟ (نہیں)، آپ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر دس روپے سے کم ہے تو بتاؤ، یہ''گھٹ ودھ'' کا لفظ جو آپ بولتے ہیں یہ بطور محاورے کے ہے، اصل میں پوچھنا مقصود ہے کہ اس کی قیمت میں کچھ کمی ہے تو بتادو۔ اور دکان دار آگے سے کہتا ہے نہ گھٹ نہ ودھ، نہ کم نہ زیادہ، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی، اب نفی تو کمی کی کرنی ہے کہ دس روپے سے کم کی نہیں دوں گا، بیشی کی نفی بطور تاکید کے کردی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے میں نے اس کی قیمت دس روپے بتادی تو اب گیارہ نہیں مانگوں گا، اسی طرح سے جب اس کی

قیمت دس روپے بتادی تو نو نہیں لوں گا۔ گیارہ نہ مانگنا تو آپ کے علم میں ہے، کہ جب اُس نے اپنی زبان سے دس روپے قیمت بتائی ہے تو گیارہ کیسے مانگے گا۔ اب اگر لینے کا امکان ہے تو نو ہی لینے کا امکان ہے نا؟ وہ کہتا ہے نہ گھٹ نہ ودھ۔ کیا مطلب؟ کہ جس طرح سے دس کے گیارہ نہیں لوں گا، اسی طرح سے دس کے نو بھی نہیں لوں گا، تو اصل میں نفی کرنا مقصود ہے نو کی، اور گیارہ کی نفی بطور تاکید کے ہے۔ اسی طرح بتانا تو یہ ہے کہ اپنے وقت سے پیچھے نہیں ہٹ سکیں گے، کیا مطلب کہ سوموار سے منگل تک پہنچ جائے، ایسا نہیں، وہ وقت پیچھے نہیں ہٹے گا، اور یہ کہ اس اجل سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ اجل سے پہلے مرجائیں ایسا بھی نہیں ہوسکتا۔ تو جب اجل آجائے گی تو جیسے اس سے پہلے نہیں مرسکتے، اسی طرح سے اس اجل کے آنے کے بعد پیچھے نہیں ہٹ سکتے، یعنی اس میں دیر نہیں ہوسکتی۔ تو نفی اصل میں لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ کی کرنی ہے، اور لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ کی نفی بطور تاکید کے ہے۔ ورنہ جس وقت وقت معین آگیا تو اس سے آگے بڑھنے کا کیا سوال؟ پیچھے ہٹنے کا تو ہے، اس کی نفی کرنی مقصود ہے۔ تو یہ تنبیہ کردی ان کو، کہ یہ نہ سمجھو کہ تم جو دندناتے پھر رہے ہو، اور تمہیں کھلی چھٹی مل گئی، تمہیں پکڑنے والا کوئی نہیں، بلکہ اللہ کی یہ عادت ہے، وہ ہر جماعت کے لیے ایک وقت متعین کیا کرتا ہے، جب وہ وقت آجائے گا دھر لیے جاؤ گے، پھر ذرا بھی اپنی جگہ سے نہیں سرک سکو گے، نہ آگے بڑھ سکو گے نہ پیچھے ہٹ سکو گے۔

آدم علیہ السلام کی وساطت سے بنی آدم کو ہدایت

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ یہ وہ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے جنت سے آدم علیہ السلام کو نکالنے کے بعد دنیا پر بھیجتے ہوئے آدم علیہ السلام کی وساطت سے آدم کی اولاد کو دی تھی، شیطان کے چکر سے بچنے کے لیے، کہ آدم کے بچو! اگر تمہارے پاس رسول آئیں گے تمہی میں سے، جو بیان کریں گے تم پر میری آیات، پھر جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا، تقویٰ کے اختیار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مجھ سے ڈرے گا، میری نافرمانی نہیں کرے گا، وَاَصْلَحَ اس کا معنی ہے کہ اپنے حالات کو ٹھیک کرلے گا، فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ: وہ حقیقی کامیابی حاصل کرے گا، دوبارہ جنت میں آجائے گا، کیونکہ جنت کی شان یہی ہے فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ، دنیا میں رہتے ہوئے خوف اور حزن انسان کے آگے پیچھے لگا ہوا ہے، کبھی آپ مستقبل کے متعلق سوچیں گے تو دل دھڑکے گا کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے، کبھی ماضی کے اندر خلاف مرضی کوئی واقعہ پیش آجائے گا تو یاد آجائے گا تو دل دکھتا ہے، دنیا کی زندگی خوف وحزن میں گھری ہوئی ہے، البتہ جنت کی زندگی ایک ایسی ہوگی کہ جس میں خوف اور حزن نہیں ہے تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس جنت سے تمہارا اُبا نکلا ہے، اگر تم ہماری ہدایات پر عمل کرو گے تو دوبارہ تمہیں تمہاری وہ میراث مل جائے گی، اور تم جنت میں چلے جاؤ گے، وہاں پھر کوئی خوف اور کوئی حزن نہیں ہوگا۔ تو اب اس چھوٹی ہوئی میراث کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہوگا کہ ہم جو رسول بھیجیں گے اُن کی ہدایات پر عمل کرنا، تقویٰ اختیار کرنا، اور اپنے حالات کو صحیح رکھ لینا۔

اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والوں کا عبرتناک انجام

اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، اور اُن سے تکبر کریں گے، تکبر کا معنی یہی ہوتا ہے، کہ حق بات کو قبول نہ کرنا، اعراض

کرنا، یہی لوگ جہنم والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، وہ ہمیشہ کے لیے جنت سے محروم ہو گئے، وہ جہنم میں جائیں گے۔ ''پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے'' جس طرح سے مشرکین گھڑتے تھے کہ باتیں خود بناتے، نسبت اللہ کی طرف کر دیتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ ''یا اللہ کی آیات کو جھٹلائے'' کہ اللہ کا رسول اللہ کی باتیں لے کر آتا ہے، اُن کو مانتے نہیں، ان کو جھٹلاتے ہیں، وہی دونوں باتیں کہ غلط باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، صحیح باتوں کی تغلیط کرتے ہیں، یہ بہت بڑے ظالم ہیں۔ ''ان کو ان کا حصہ پہنچے گا کتاب سے'' کتاب کا کیا معنی؟ کہ تقدیر میں جو ان کے لیے عمر، راحت، رزق جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ انہیں پہنچے گا، وہ یہ کھائیں پئیں گے، جو ان کا مقدر ہے وہ اِن کو پہنچ کر رہے گا، دنیا کے اندر جو کچھ ان کے لیے لکھ دیا گیا وہ انہیں ملے گا۔ ''حتیٰ کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے رسول آجائیں گے'' اس سے مراد ملک الموت اور ان کے ساتھی جب وہ آجائیں گے ''وفات دیتے ہوں گے انہیں''۔ پھر وہ تنبیہ کرتے ہوئے اِن سے پوچھیں گے، ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو جائے گی، جیسے ایک استاذ طالب علم کو سزا دیتا ہے تو ساتھ ساتھ وہ بات بھی کیا کرتا ہے ذہنی طور پر تنبیہ کرنے کے لیے، اسی طرح سے وہ ماریں گے بھی یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (سورۂ انفال: ۵۰) جیسے دوسری جگہ آئے گا، کہ منہ پر بھی ماریں گے، دبروں پر بھی ماریں گے۔ ادبار دبر کی جمع ہے، دبر پشت کو کہتے ہیں، پشتوں پر بھی ماریں گے اور منہ پر بھی ماریں گے، اور پھر ساتھ ساتھ زبان سے کہیں گے کہ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکار رہے تھے کہاں چلے گئے؟ ان کو بلالو، آج تمہیں چھڑالیں، اب تم عذاب میں گرفتار ہو رہے ہو، انہیں کہو کہ تمہیں چھڑالیں، کہاں چلے گئے وہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارا کرتے تھے۔ وہ کہیں گے ضَلُّوْا عَنَّا: وہ تو کہیں نظر نہیں آرہے، وہ تو سارے ہی گم ہو گئے، کوئی اس موقع پر موجود نہیں جن کے سہارے تلاش کر رکھے تھے۔ ''اور وہ لوگ اقرار کریں گے اپنے نفسوں پر کہ وہ کافر تھے'' اُس وقت ان کو پتا چلے گا، کہ واقعی ہم نے کُفر اختیار کیا، ہم ایمان نہیں لائے، اور اس کُفر کے وبال میں آج ہم گرفتار ہو رہے ہیں، یہ تو مر گئے، یہ تو برزخ کا عذاب ہوا، کہ جان کنی کے وقت فرشتے پیٹتے بھی ہیں، اور زبان سے تنبیہ بھی کرتے ہیں۔

جہنم میں جانے کے بعد آپس میں لعنت کا منظر

اور پھر قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے، تو کافروں کی ساری جماعتوں کو اکٹھا کر کے جہنم میں بھیج دیں گے، جہنم میں جانے کے بعد پھر یہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، پھٹکار کریں گے۔ یہ جو اللہ تعالیٰ بات بتا رہے ہیں، یہ اس لیے بتا رہے ہیں کہ آج ان باتوں کو سوچو، تمہاری دوستیاں، تمہاری ملاقاتیں، تمہاری محبتیں جن لوگوں کے ساتھ ہیں، اگر ان تعلقات کی بنا پر، ان محبتوں کی بنا پر تم معصیت کی طرف جا رہے ہو تو یہ محبت دائمی نہیں، ایک وقت آئے گا جب تم ایک دوسرے پر لعنت کرو گے پھٹکار کرو گے، وہ کہے گا یا اللہ! مجھے اس نے گمراہ کیا، وہ کہے گا اس نے گمراہ کیا، وہ کہے گا اس کی پٹائی زیادہ کر، کہ اس نے مجھے بری عادت سکھائی تھی، وہ کہے گا اس کی پٹائی زیادہ کر، اس طرح ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور ایک دوسرے سے بیزار ہو جاؤ گے، یوں درمیان میں جوتا چلے گا۔ ہاں! البتہ دوستی اور محبت اگر ان لوگوں سے ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں اور فرمانبرداری کے راستے پر

چلاتے ہیں، وہ جنت میں جائیں گے تو اُن کی دوستی اسی طرح سے بحال ہوگی، اور اُن کی اسی طرح سے آپس میں محبتیں قائم رہیں گی، اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (سورۂ حجر: ۴۷) سب تختوں کے اوپر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، بھائیوں کی طرح ہوں گے۔ تو جنت کا ماحول ایسا محبت کا ماحول ہے، جہنم کا ماحول ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا ماحول ہے، تو ان دوستیوں کا انجام آج دکھایا جارہا ہے۔

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا داخل ہو جاؤ ان جماعتوں میں شامل ہو کر، فِیْ اُمَمٍ اَیْ مَعَ اُمَمٍ داخل ہو جاؤ ان جماعتوں میں شامل ہو کر، وہ جماعتیں جو تم سے پہلے گزر گئیں جنوں اور انسانوں کی، داخل ہو جاؤ جہنم میں'' جاؤ جہنم میں ان جماعتوں میں شامل ہو کر۔ ''جب کبھی کوئی جماعت داخل ہوگی تو اپنی جیسی جماعت پر لعنت کرے گی حتیٰ کہ جب سارے اکٹھے ہو جائیں اس جہنم میں''، اِذَا ادّٰرَکُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا کا معنی ہے سب نے ایک دوسرے کو پالیا۔ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ تو پچھلے کہیں گے، یعنی پچھلی جماعت جو بعد میں داخل ہوئی، کیونکہ بعد میں داخل ہونے والی تابعین کی جماعت ہے، پیچھے لگنے والوں کی ہے، یہ اس جماعت کے متعلق کہیں گے جو پہلی ہے، یعنی جو مقتدیٰ ہونے کے اعتبار سے پہلے چلے گئے اُن کے متعلق کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! اِن لوگوں نے ہمیں بھٹکایا تھا اِن کو دگنا عذاب دے، یعنی ہمارے مقابلے میں ان کی سزا زیادہ ہونی چاہیے، کیونکہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ تو ایک دوسرے کی سفارش تو کیا کرنی ہے، ایک دوسرے کو پھنسائیں گے۔ ''اللہ تعالیٰ کہے گا ہر کسی کے لیے دگنا ہے'' کیا مطلب؟ کہ ہر کسی کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا، ابھی تمہیں علم نہیں جس کی بنا پر ایسی باتیں کرتے ہو، کمی تم نے بھی نہیں کی، اگر تمہارے بڑوں نے کوئی رسم بد جاری کی تھی، اور وہ تمہارے لیڈر تھے تو تم نے کون سی کمی کی، تم بھی تو اپنے پچھلے آنے والوں کے لیے یہی راستہ چھوڑ کر آئے۔ تو جیسے اُن کی وجہ سے دوسرے لوگ گمراہ ہوئے تمہاری وجہ سے تمہارے پچھلے گمراہ ہوئے، اس طرح سے سب کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا۔ ہر کسی کے لیے دگنا عذاب ہے، دگنے سے یہاں زیادہ عذاب مراد ہے، جیسے دوسری جگہ الفاظ آتے ہیں زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (سورۂ نحل: ۸۸) آئے دِن اس میں جو تزاید (اضافہ) ہوگا، عذاب بڑھتا چلا جائے گا اس کو یہاں ضِعف سے تعبیر کیا ہے۔

بدعملی کی وجہ سے اِنسان پر دوطرح سے عذاب آتا ہے

اور بڑھنا اس اُصول کے تحت ہے (ذرا اشارہ کر دوں، تفصیل پھر کسی دن ہو جائے گی) کہ ایک وبال ہوتا ہے عمل کا، اور ایک ہوتا ہے سببیت کا۔ میں ایک نیکی کا کام کر رہا ہوں، ایک تو مجھے اُس نیکی کا ثواب ملے گا، اور ایک میری طرف دیکھ کر جو دوسرے لوگ نیکی کریں گے تو سبب بننے کا ثواب بھی ملے گا، یہ اضافہ ہے۔ اور اگر میں کوئی برا کام کر رہا ہوں تو ایک تو مجھے اس بُرائی کا عذاب ہوگا، اور ایک میری اس بُرائی کی وجہ سے جو دوسرے دیکھا دیکھی اس بُرائی میں مبتلا ہو جائیں گے، تو سببیت کا عذاب ہوگا، یہ اضافہ ہے۔ تو بدعملی کی وجہ سے انسان پر دو طرح سے عذاب آتا ہے، بدعملی کا بھی آئے گا، اور اس بدعملی کا سبب بننے کی وجہ سے جو دوسری مخلوق اس کی طرف دیکھ کر اس بُرے کام کو کرے گی اس کا وبال بھی اس کے اوپر آئے گا۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے،

سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، کہ دُنیا کے اندر جب بھی کوئی قتل ناحق ہوتا ہے تو آدم علیہ السلام کا وہ بچہ جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، قابیل جس نے ہابیل کو قتل کیا تھا، فرمایا کہ قتل ناحق کے وبال کا ایک حصہ قابیل کی طرف بھی جاتا ہے، قیامت تک جتنے ناحق قتل ہوں گے، اُن کے عذاب کے اندر وہ قابیل برابر کا شریک ہے، جس نے یہ قتل ناحق کی رسم ڈالی، جس نے یہ طریقہ جاری کیا۔[1] اسی طرح نیکوں کی نیکی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ دیکھو! ہمارے بڑوں نے جو نیکی کے طریقے بتائے، اچھے اچھے کام کر کے دکھائے، ہم جتنے اُن کے پیچھے لگیں گے، نقل اتارتے چلے جائیں گے، اُن کو ان کے کاموں کا ثواب بھی ملے گا، اور ہم جو ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو ہمارے عمل کا وہ جو سبب بنے ہیں، تو سببیت کی وجہ سے ان کے درجات بلند ہوں گے۔ ''ہر کسی کے لیے دگنا ہے'' وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ: لیکن تم جانتے نہیں۔ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ: جب یہ جواب ملے گا کہ تم سارے ہی ایسے ہو، اور سب کے لیے دگنا عذاب ہے، تو پھر وہ جو پہلے ہیں پچھلوں کو کہیں گے کہ بتاؤ، ہماری شکایت کر کے تم نے کیا لے لیا؟ جیسے تم ویسے ہی ہم، تم بھی اپنے کردار کا مزہ چکھو ہم بھی مزہ چکھتے ہیں۔'' کہے گی پہلی جماعت پچھلوں کو، نہیں ہے تمہارے لیے ہم پر کسی قسم کی کوئی فضیلت'' جیسے ہم عذاب میں ویسے تم عذاب میں، جیسے ہمارا عذاب دن بدن بڑھے گا تمہارا بھی بڑھے گا۔'' بس اب تم چکھو عذاب اُن کاموں کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ
بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اُن آیات سے تکبر کرتے ہیں نہیں کھولے جائیں گے اُن کے لئے آسمان کے
السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ
دروازے اور نہیں داخل ہوں گے وہ جنت میں جب تک کہ اُونٹ سُوئی کے ناکے میں داخل نہ ہوجائے،
وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ
اور ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں ہم جرم کرنے والوں کو ﴿۴۰﴾ اُن کے لیے جہنم سے بچھونا ہوگا اور
فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
اُن کے اُوپر سے اوڑھنے ہوں گے، ہم ظلم کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں

(۱) بخاری ۱/۴۶۹ باب خلق آدم۔ مشکوٰۃ ۱/۳۲، کتاب العلم۔ ولفظ الحدیث: لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا الخ

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

اور نیک عمل کرتے ہیں، نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو مگر اُس کی طاقت کے مطابق، وہ جنت

الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ

والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں﴿٤٢﴾ ہم نکال لیں گے جو کچھ اُن کے دلوں میں

غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

کینہ ہوگا، جاری ہوں گی اُن کے نیچے سے نہریں، اور یہ لوگ کہیں گے اللہ کا شکر ہے جس نے

هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ

ہمیں یہاں تک پہنچا دیا، اور ہم تو پہنچنے والے نہیں تھے اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا، البتہ تحقیق آگئے

رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا

ہمارے رَبّ کے رسول ہمارے پاس حق بات لے کر، اور وہ جنتی آواز دیے جائیں گے کہ یہی جنت، تم اس کے وارث بنادیے گئے بسبب

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ

اُن کاموں کے جو تم کیا کرتے تھے﴿٤٣﴾ آواز دیں گے جنت والے جہنم والوں کو کہ تحقیق

وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۗ

جو وعدہ ہم سے ہمارے رَبّ نے کیا تھا ہم نے اس کو حق پایا، کیا تم نے بھی حق پایا اس وعدے کو جو تم سے تمہارے رَبّ نے کیا تھا؟

قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى

وہ جہنم والے کہیں گے ہاں جی، پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا ان لوگوں کے درمیان کہ اللہ کی لعنت

الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ

ظالموں پر ﴿٤٤﴾ جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور طلب کرتے ہیں اس راستے میں کجی،

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ

اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں﴿٤٥﴾ ان جنت والوں اور دوزخ والوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا، اور اعراف پر

رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِیْمٰىهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ

کچھ لوگ ہوں گے پہچانیں گے وہ ہر کسی کو ان کی علامت کے ساتھ، اور وہ (اَعراف والے) آواز دیں گے جنّت والوں کو

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ ۫ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ یَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا صُرِفَتْ

کہ السلام علیکم، نہیں داخل ہوئے وہ اس (جنّت) میں اور وہ اُمیدوار ہیں﴿۴۶﴾ جب ان کی آنکھیں پھیر

اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ

دی جائیں گی جہنّم والوں کی طرف تو یہ کہیں گے اے ہمارے رَبّ! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ

الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ قَالُوْا

نہ کرنا﴿۴۷﴾ اور آواز دیں گے اَعراف والے کچھ لوگوں کو جن کو وہ پہچانتے ہیں اُن کی نشانی کے ساتھ، اور کہیں گے

مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ

کیا کام آئی تمہارے تمہاری جماعت اور تمہارا تکبّر کرنا﴿۴۸﴾ کیا یہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھایا کرتے تھے،

لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

کہ اللہ ان کو اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا، (انہیں کہہ دیا گیا) کہ داخل ہو جاؤ جنّت میں، نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمزدہ ہو﴿۴۹﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: بیشک وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، كَذَّبُوْا ماضی کا صیغہ ہے لیکن اسم موصول کے بعد جب آتا ہے تو اس کا ترجمہ مضارع کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، ''بیشک وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں'' وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا: اور اُن آیات سے تکبّر کرتے ہیں، یعنی اپنے آپ کو بڑا بنا کر اُن آیات سے اعراض کرتے ہیں، لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ: نہیں کھولے جائیں گے ان کے لئے اَبْوَابُ السَّمَآءِ: ابواب باب کی جمع، آسمان کے دروازے، وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ: اور نہیں داخل ہوں گے یہ لوگ جنت میں حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ: جمل اونٹ کو کہتے ہیں اور سَمّ: سوئی کا ناکا، سوراخ، جس میں تاگا ڈالا جاتا ہے، اور خیاط سوئی کو کہتے ہیں، سم الخیاط: سوئی کا ناکا، اور یَلِجَ یہ وُلوج سے لیا گیا ہے، وَلَجَ یَلِجُ: حَسِبَ کی طرح، داخل ہونا، وُلوج داخل ہونے کو کہتے ہیں، اور حَتّٰی کے بعد جس وقت مضارع آتا ہے تو میں نے آپ کی خدمت میں بارہا عرض کیا کہ محاورۃً اس کا ترجمہ نفی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے اردو محاورے کے اعتبار سے، اب یہاں معنی یوں ہوگا ''نہیں داخل ہوں گے وہ جنت میں جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے'' یوں ترجمہ کیا جائے گا، حتی کے بعد نفی کے ساتھ، اور اگر اس طرح سے ترجمہ

کریں مثبت کے ساتھ ہی تو یوں ادا کریں گے ''نہیں داخل ہوں گے وہ لوگ جنت میں حتی کہ داخل ہو جائے اونٹ سوئی کے ناکا میں'' وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ: اور ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں ہم جرم کرنے والوں کو، مجرموں کو ہم ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں، لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ: مِہاد بچھونے کو کہتے ہیں جو نیچے بچھایا جاتا ہے، وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ: غَوَاشٍ یہ غاشیۃ کی جمع ہے، غاشیۃ ڈھانپ لینے والی چیز، غَشِيَ يَغْشٰى: ڈھانپنا، تو اس سے مراد ہو گیا جیسے آپ اوپر لحاف اوڑھتے ہیں، تو غاشیہ اوڑھنا ہو گیا اور مہاد بچھونا ہو گیا، اور بچھونا اور اوڑھنا دونوں جو ہوتے ہیں وہ انسان کو پوری طرح سے گھیر لیتے ہیں پھر انسان کے بدن کا کوئی حصہ ننگا نہیں رہتا، ''ان کے لئے جہنم سے بچھونا ہو گا اور ان کے اوپر سے اوڑھنے ہوں گے'' یعنی جہنم کے ہی، یعنی آگ ہی ان کے لئے بستر کی جگہ ہو گی، آگ ہی ان کے لئے اوپر رضائی کی جگہ اور لحاف کی جگہ ہو گی۔ یعنی جس طرح سے ایک آدمی بستر پہ لیٹا ہوا ہو اور اوپر لحاف اوڑھا ہوا ہو تو وہ سارے کا سارا لپٹا ہوا ہوتا ہے کپڑوں میں، اور اس کے بدن کا کوئی حصہ ننگا نہیں ہوتا، اسی طرح سے ان کا اوڑھنا بچھونا سب آگ ہو گا، غَوَاشٍ غاشیۃ کی جمع ڈھانپنے والی چیز، اس سے مراد ہے جو اوپر کپڑا اوڑھا جاتا ہے، وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ: ہم ظلم کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اور نیک عمل کرتے ہیں، لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ: یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے، خبر اس کی آ رہی ہے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ، تو لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے، ''وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ جنت والے ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں'' مضمون یوں پورا ہوا، درمیان میں یہ بات کہہ دی لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ: نہیں تکلیف دیتے ہم کسی نفس کو مگر اس کی وسعت، اس کی طاقت کے مطابق، وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ: غِل کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں کچھ کینہ کدورت، ایک دوسرے کی طرف سے دل میں کچھ میل آ جاتی ہے، جس کی بناء پر ایک دوسرے سے محبت نہیں رہتی، کھوٹ پیدا ہو گئی دل میں، اس کو غِل کہا جاتا ہے، نَزَعْنَا: ہم نکال لیں گے کھینچ لیں گے، مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ: صدور صدر کی جمع، جو کچھ کینہ، خفگی، کدورت، میل ان کے دلوں میں ہو گی، صدر بول کے سینہ مراد ہے، ''ان کے سینے میں جو کچھ کدورت، میل اور خفگی ایک دوسرے کے متعلق ہو گی ہم وہ نکال دیں گے'' تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ: جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، اَنہار نہر کی جمع ہو گئی، وَقَالُوا: اور یہ لوگ کہیں گے، یہ ماضی کا ترجمہ مضارع کے ساتھ کر رہا ہوں، تحققِ وقوع کے طور پر اس کو ماضی سے تعبیر کیا گیا ہے، ''کہیں گے'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا: الحمد للہ کلمہ شکر ہے، معنی اس کا اگرچہ یہ ہوتا ہے ہر قسم کی ہر طرح کی تعریف، سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، لیکن یہ کلمۃ الشکر بھی ہے، اس لیے الحمد للہ کا لفظ ہم اللہ کے شکر کی جگہ بولا کرتے ہیں، تو الحمد للہ کا مفہوم یہاں ذکر کیا جائے کہ ''اللہ کا شکر ہے'' الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا: جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا، هَدٰى یہاں ایصال کے معنی میں ہے پہنچانے کے معنی میں، جیسے آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ ہدایت کے دو معنی آیا کرتے ہیں اِراءۃُ الطریق اور ایصال الی المطلوب، یہاں ایصال والی بات ہے، کیونکہ جنت میں پہنچنے کے بعد یہ اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں، ''شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا'' وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ: اور ہم تو پہنچنے والے نہیں تھے، لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ: اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا، لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ: البتہ تحقیق آ گئے ہمارے رَبّ کے رسول ہمارے پاس حق بات لے کر سچی بات لے کر، وَنُوْدُوْٓا: اور وہ جنتی آواز دیے جائیں گے،

نَادٰی یُنَادِیْ نِدَاءٌ: آواز دینا، یہ نُوْدُوْٓا مجہول کا صیغہ ہے، ’’وہ لوگ آواز دیے جائیں گے، اعلان کیے جائیں گے‘‘ اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ یہ اَن تفسیر یہ ہے، جیسے نحومیر میں آپ نے پڑھا تھا نَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ میں اَن تفسیر یہ ہے، نداء کی تفسیر ہے نداء کیا دیے جائیں گے؟ یہ اعلان کیے جائیں گے یہ آواز دے جائیں گے تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا: یہی جنت، تم اس کے وارث بنا دیے گئے، بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: بسبب ان کاموں کے جو تم کیا کرتے تھے۔ وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ: آواز دیں گے جنت والے جہنم والوں کو، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: جنت والے، اَصْحٰبَ النَّارِ: جہنم والے، ’’آواز دیں گے جنت والے جہنم والوں کو‘‘ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا: کیا آواز دیں گے؟ یہ اسی طرح اَن تفسیر یہ ہے، ’’کہ تحقیق پالیا ہم نے اس چیز کو جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے ہمارے رَبّ نے‘‘ حَقًّا: سچا، پالیا ہم نے سچا، اَنْ قَدْ وَجَدْنَا حَقًّا، حَقًّا یہ وَجَدْنَا کا مفعول ہے، جو وعدہ ہم سے ہمارے رَبّ نے کیا تھا ہم نے اس کو حق پایا، فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا: کیا تم نے بھی حق پایا اس وعدے کو جو تم سے تمہارے رَبّ نے کیا تھا، جو وعدہ تم سے کیا تھا کہ کُفر کی سزا میں تمہیں جہنم میں ڈالوں گا اور ایسی ایسی سزا ہوگی، کیا تم نے بھی اس وعدے کو سچا پایا؟، قَالُوْا: وہ جہنم والے کہیں گے نَعَمْ: ہاں جی! بالکل سچا ہے، وہ جواب نَعَمْ کے ساتھ دیں گے، ہاں، یعنی بالکل سچا وعدہ ہے، فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ: پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا، بَیْنَهُمْ: ان لوگوں کے درمیان، اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ: یہ اَن پھر تفسیر یہ ہے، کیا اعلان کرے گا؟ کہ اللہ کی لعنت ظالموں پر۔ یہ ظالم کون لوگ ہیں جن پر قیامت کے دن اللہ کی لعنت ہوگی، اعلان کرنے والے لعنت علی الاعلان کریں گے، وہ ظالم کون لوگ ہیں، اُن کا اِس دنیا میں تعارف کرایا جا رہا ہے اس لیے اگلے الفاظ جو ہیں وہ اعلان کے الفاظ نہیں، اعلان تو ظالمین پہ ختم ہو گیا، یہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بتاتے ہیں کہ اِن ظالموں سے کون لوگ مراد ہیں جن پر قیامت میں علی الاعلان لعنت ہوگی اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: ایسے لوگ جو روکا کرتے تھے اللہ کے راستے سے، جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے، صَدَّ یَصُدُّ: روکنا، جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے، وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: عِوَج کہتے ہیں کجی اور ٹیڑھ کو، اور طلب کرتے ہیں اس راستے میں کجی، یعنی اللہ کے راستے میں کجی پیدا کرتے ہیں، اعتراضات پیدا کرتے رہتے ہیں، لوگوں کو بدظن کرنے کے لئے اس میں کجیاں تلاش کرتے رہتے ہیں، وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ: اور وہ لوگ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں، یہ ہیں وہ ظالم، جو آج اللہ کے راستے سے روک رہے ہیں اور اسلام کی تعلیمات میں مختلف قسم کے اعتراضات پیدا کر کے لوگوں کے سامنے کجیاں نکالتے رہتے ہیں، اس راستے میں کجی طلب کرتے ہیں، اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، یہ ظالم ہیں جن پر قیامت کے دن علی الاعلان لعنت ہوگی۔ وَبَیْنَهُمَا حِجَابٌ: حجاب پردے کو کہتے ہیں رکاوٹ کو، ان جنت والوں اور دوزخ والوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا، ھُمَا کی ضمیر اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر پیچھے آیا، ’’ان کے درمیان حجاب ہوگا‘‘ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ: اور اَعراف پر کچھ آدمی ہوں گے، اَعراف یہ جمع ہے عُرف کی، عُرف اصل میں کہا جاتا ہے......! یہ آپ نے پرانے شہر دیکھے ہوں گے، پرانے شہروں کے اردگرد دیوار بنی ہوئی ہوتی ہے موٹی سی جس کو ’’فصیل‘‘ کہتے ہیں، شہر کی فصیل، یہ ملتان میں جاؤ تو جہاں دروازے ہیں، یہ حرم دروازہ آ گیا، یہ پاک دروازہ آ گیا، وہاں وہ دیوار ہے شہر کے اردگرد، پرانا شہر اتنا ہی ہے جو ان دروازوں کے اندر اندر ہے، پرانے زمانے میں جس وقت کہ لوگ پیدل آتے تھے لوٹنے کے لئے تو دروازے بند کر لیے جاتے تو شہر محفوظ ہو جاتا تھا، یہ دیوار جو اردگرد کی ہوئی ہوتی ہے

اس کو ''فصیل'' کہتے ہیں، اور اپنی کتابوں میں آپ نے لفظ پڑھا ہوگا کہ اس کو سُور البلد کہتے ہیں، سور البلد: شہر کی فصیل، اور اگر پرانے شہروں میں کسی شہر کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی اور آپ حضرات نے غور نہیں کیا تو کبھی جیل دیکھی ہو تو جیل کے اردگرد جو دیوار ہوتی ہے موٹی سی، یا فوجی چھاؤنیاں جو ہوا کرتی ہیں جہاں اسلحہ پڑا ہوتا ہے تو اس کے اردگرد دیوار ہوتی ہے، اہم دفاتر جس میں ہوتے ہیں اس کے اردگرد محفوظ دیوار ہوتی ہے، اس کو ''سور'' کہتے ہیں یا ''فصیل'' کہتے ہیں، ملتان سے مظفر گڑھ کی طرف جائیں تو قلعہ آتا ہے جس میں اسلحہ ہے تو وہاں بھی اردگرد دیوار ہے سڑک کے متصل ہی، جس کی ہر دیوار پر تھوڑی تھوڑی مسافت کے بعد لکھا ہے ''دوسوگز سے دُور رہیے'' دوسوگز کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، جگہ بہ جگہ دیوار پہ لکھا ہوا ہے، کبھی آپ مظفر گڑھ کی طرف گئے ہوں، تو اس میں کونوں پر دیوار کے وسط میں برجیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں جس میں پہریدار کھڑے ہوتے ہیں، دیوار کے اوپر چھت ڈال کر تھوڑی سی جگہ بنی ہوئی ہوتی ہے، جیل کی دیواروں میں بھی ہوتی ہے اسی طرح سے جس میں وہ پہریدار پہرہ دیتے ہیں تاکہ کوئی دیوار پھلانگ کے ادھر سے ادھر نہ جائے، قلعوں پر بھی اسی طرح سے ہوتی ہے، کبھی آپ لاہور شاہی قلعے میں جائیں تو وہاں دیکھیں گے کہ بہت بڑی دیوار جو کہ قلعے کی محافظ دیوار ہے فصیل، تو جگہ بہ جگہ اس میں فوجیوں کے کھڑے ہونے کے لئے، نگرانی کرنے والوں کے کھڑے ہونے کے لئے برجیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں، وہ چونکہ اس دیوار کے اوپر بہت نمایاں اور معروف ہوتی ہیں اس لیے ان میں سے ہر برجی ہر مورچہ اور ہر دیدبان ''عُرف'' کہلاتا ہے، اور اس کی جمع ہوگئی ''اَعراف''، تو گویا کہ اَعراف یہ وہی جگہیں ہیں جو اس دیوار کے اوپر ہوں گی جو جنت اور دوزخ کے درمیان میں ہے جس کو اس جگہ ''حجاب'' سے تعبیر کیا گیا، اور سورۂ حدید کے اندر ''سُور'' کا لفظ ہی آیا ہے: فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (آیت: ۱۳)، تو وہاں ''سُور'' کا لفظ آیا ہے تو یہ وہی ''سور البلد'' ہے بڑی اور موٹی دیوار جو اردگرد بنائی جاتی ہے جس کو ''فصیل'' کہتے ہیں، تو اس فصیل کے اوپر جو کھڑے ہونے کی ٹھہرنے کی جگہیں ہوں گی ان کو اَعراف سے تعبیر کریں گے، تو گویا کہ یہ اَعراف جو ہے وہ اسی فصیل کے اوپر ہے، اُس حجاب کے اُوپر ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان میں ہے، وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ: اَعراف پر کچھ لوگ ہوں گے، یَعْرِفُوْنَ كُلًّۢا بِسِیْمٰىهُمْ: یَعْرِفُوْنَ: پہچانیں گے، کُلًّا: ہر کسی کو یعنی جنتی کو بھی اور دوزخی کو بھی جن کا ذکر پیچھے اصحاب الجنۃ اصحاب النار میں آیا ہوا ہے، ''پہچانیں گے ہر کسی کو'' بِسِیْمٰىهُمْ: سیما: علامت، ''چہرے کی علامت کے ساتھ'' یعنی جنتیوں کے چہروں پر علامات ہوں گی جن کو دیکھ کے پہچانیں گے کہ یہ جنتی ہیں، جہنمیوں کے چہروں پر کچھ ایسے نشانات ہوں گے جن کو دیکھ کے پہچانیں گے کہ جہنمی ہیں، سیما علامت کو کہتے ہیں، یہ آپ کے سامنے پہلے سورۂ بقرۃ کے اندر بھی لفظ گزرا ہے تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ ۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (آیت: ۲۷۳) وہاں بھی سیما کا لفظ آیا تھا، اور سورۂ فتح کے اندر بھی یہ لفظ آئے گا سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ تو سیما علامت کو کہتے ہیں: ''پہچانیں گے وہ ہر کسی کو ان کی علامت کے ساتھ'' وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ: اور وہ اَعراف والے، جو اَعراف کے اوپر کچھ لوگ ہیں وہ آواز دیں گے جنت والوں کو، اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ: اَن تفسیر یہ ہے، کیا آواز دیں گے؟ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ یعنی انہیں سلام علیکم کہیں گے جنت والوں کو خطاب کر کے، لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ: وہ اَعراف والے جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ اُمید رکھتے ہیں جنت میں جانے کی، وہ ابھی تک جنت میں گئے نہیں، جنت میں جانے کے اُمیدوار ہیں، لَمْ یَدْخُلُوْهَا: نہیں داخل

ہوئے وہ اس جنت میں وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ: اور وہ اُمیدوار ہیں، وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ: جب پھیر دی جائیں گی ان کی آنکھیں جہنم والوں کی طرف، جنتیوں کو دیکھنے کے بعد، ان سے علیک سلیک ہونے کے بعد پھر ان کا رُخ جس وقت پھرے گا جہنمیوں کی طرف، کیونکہ اَعراف پر سے وہ جہنم بھی نظر آرہی ہوگی، ''جب ان کی آنکھیں پھیر دی جائیں گی جہنم والوں کی طرف'' قَالُوْا: تو یہ کہیں گے، رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ: اے ہمارے ربّ! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کرنا۔ آگے دو آیتیں اسی مضمون سے متعلق ہیں، دیکھ لیجیے، وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا: اور آواز دیں گے اَعراف والے کچھ لوگوں کو، يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ: جن کو وہ پہچانتے ہیں ان کی نشانی کے ساتھ، یعنی جہنم میں کچھ لوگ ہوں گے، سردار قسم کے لیڈر قسم کے چوہدری قسم کے، جن کو یہ علامت کے ساتھ پہچانتے ہوں گے کہ یہ بڑے لوگ ہیں، دنیا کے اندر جو بہت بڑے بڑے کہلاتے تھے، ان کو پہچانتے ہوں گے ان کی علامت کے ساتھ، ان کو آواز دیں گے، قَالُوْا: اور یہ اَصحابِ اَعراف کہیں گے، مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ: یہ 'مَا'' استفہامیہ ہے جس میں تنبیہ والا معنی ہے، جمع سے جماعت مراد ہے، ''کیا کام آئی تمہارے تمہاری پارٹی؟'' توجمع سے جماعت مراد ہے، تمہارا جتھا، تمہاری جماعت کیا کام آئی؟ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ: اور تمہارا تکبر کرنا تمہارے کیا کام آیا؟ دنیا کے اندر توتم بڑا اکڑا کرتے تھے، اپنی پارٹی پر، اپنے جتھے پر، اپنی قوم پر، اپنے قبیلے پر تمہیں بہت ناز ہوتا تھا، آج وہ تمہارے کیا کام آئی؟ یہ اِستفہام بطور تنبیہ کے ہے، تو''مَا'' کے اندر استفہام والا معنی پیدا کرلیا جائے تو اس میں سرزنش اور تنبیہ والا معنی ہے،''کیا کام آئی تمہارے آج تمہاری پارٹی اور جو تم تکبر کیا کرتے تھے، تمہارا تکبر کرنا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا کیا کام آیا؟''، لیکن اگر''مَا'' نافیہ بنالیا جائے تو نافیہ کے طور پر بھی ترجمہ ٹھیک ہے، لیکن اس میں وہ سرزنش اتنی نمایاں نہیں ہوتی، کہ ان کو دیکھ کے کہیں گے''نہ کام آئی تمہارے تمہاری جماعت اور جو تم تکبر کیا کرتے تھے، تمہارا تکبر کرنا اور تمہاری جماعت تمہارے کام نہ آئی'' یہ بھی اظہارِ افسوس کے طور پر ہی ہے، یعنی انہیں افسوس دلانے کے لئے حسرت پیدا کرنے کے لئے بات کہی جائے گی، اَغْنٰى عَنْهُ: فائدہ پہنچانا، کام آنا، دُور ہٹانا، اس کے تینوں معنی قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں لگتے رہتے ہیں، کام آنا، فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا، تو ''کام نہ آئی تمہارے تمہاری جماعت، فائدہ نہ پہنچایا تمہیں تمہاری جماعت نے، یا کوئی عذاب دُور نہ ہٹایا تم سے تمہاری جماعت نے اور تمہارے تکبر کرنے نے'' تینوں طرح سے مفہوم صاف ہوجاتا ہے، تو نفی کے طور پر ذکر کرو گے تو یہ خبر ہے کہ'' کام نہ آئی'' ان کو کہہ رہے ہیں، اور اِستفہام کے طور پر ذکر کرو گے تو اس میں سرزنش والا معنی ہے''کیا کام آئی تمہارے تمہاری جماعت اور تمہارا تکبر کرنا'' اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ: هٰٓؤُلَآءِ کا اشارہ اہلِ جنت کی طرف ہے، یہ جہنم کے لیڈروں کو خطاب کر کے کہیں گے،''کیا یہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا، لَا یَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ: اللہ تعالیٰ نہیں پہنچائے گا ان کو اپنی رحمت،'' یہی لوگ ہیں؟ جن کے متعلق تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اللہ ان کو اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا'' اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ: انہیں کہہ دیا گیا جن کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ یہ اللہ کی رحمت نہیں حاصل کر سکتے، یہ دنیا میں جو روٹی کپڑے مکان سے محروم ہیں کس طرح سے امیدیں لگائے پھرتے ہیں کہ آخرت میں ہمیں یہ ملے گا، جس طرح سے ہمیں یہاں نعمتیں حاصل ہیں اوّل تو قیامت ہوگی نہیں اگر ہوگی تو وہاں بھی ہم ہی سیٹھ ہوں گے، وہ ایسی باتیں کیا کرتے تھے، قرآنِ کریم میں

بہت ساری جگہ ان کی باتیں نقل کی گئی ہیں، ''کیا یہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا، انہیں کہہ دیا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں' لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ: کہ نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمزدہ ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ترغیب اور ترہیب کو ساتھ ذِکر کرنے کا مقصد

آیات کا ترجمے سے ہی آپ کے سامنے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ اس میں کچھ آخرت کے حالات ذکر کیے گئے ہیں جو کہ ترغیب وترہیب پر مشتمل ہیں، ترغیب کا معنی ہوتا ہے اچھے حالات ذکر کر کے ترغیب دینا کہ اگر یہ اچھی حالت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس راستے پر چلو، اور ترہیب کا معنی ہوتا ہے ڈرانا، کہ جہنم اور جہنمیوں کے حالات واضح کر کے یہ ڈرایا جارہا ہے کہ اس راستے کو چھوڑ دو جس راستے پر تم چل رہے ہو، ورنہ تمہارا انجام یہ ہوگا، اور آپ کہا کرتے ہیں: ''بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ'' کہ ایک چیز اپنی ضد کے ساتھ ہی واضح ہوتی ہے، جب اس کے مدمقابل کا تعارف کرایا جائے تبھی جا کے حقیقت نمایاں ہوا کرتی ہے، اَلْاَشْيَاءُ تُعْرَفُ بِاَضْدَادِهَا: چیزیں اپنے اضداد کے ساتھ ہی پہچانی جاتی ہیں، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر یہی انداز اختیار کیا ہے، کہ جہاں کافروں کا ذکر آتا ہے مقابلے میں مؤمنوں کا آجاتا ہے، جہاں دوزخ کا ذکر آتا ہے مقابلے میں جنت کا ذِکر آتا ہے، اور جہاں اللہ تعالیٰ کے غضب اور گرفت کا ذکر آتا ہے تو وہاں اس کے مقابلے میں رحمت کا ذکر آتا ہے، تاکہ آپ کے سامنے دونوں انجام خوب اچھی طرح سے نمایاں کر کے رکھ دیے جائیں، اور آپ کو درمیان میں کھڑا کر کے کہہ دیا جائے کہ یہ انجام پسند ہے تو اس راستے پر چل پڑو، یہ انجام پسند ہے تو اس راستے پر چل پڑو، پھر اگر عقل وہوش قائم ہوں اور انسان کچھ بھی اپنے بھیجے کے اندر عقل رکھتا ہو تو وہ پھر وہی طریقہ اختیار کرے گا جس کا انجام اچھا سامنے آنے والا ہے۔ تو دونوں انجام ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے تاکہ آپ کے ذہن پر یہ اثر پڑے کہ ان دونوں میں سے کون سی چیز حاصل کرنے کے قابل ہے، تو اگر آپ اپنا انجام اچھا چاہتے ہو تو اچھائی کا راستہ یہ ہے جو تمہیں اس انجام تک پہنچائے گا، اور اگر تم اپنا انجام برا چاہتے ہو تو برائی کا راستہ یہ ہے جو تمہیں اس انجام تک پہنچائے گا، اب تمہیں عقل دے دی، ہوش دے دی، قوتِ عمل دے دی، ارادہ دے دیا، اختیار دے دیا، درمیان میں تمہیں کھڑا کر دیا، اب چاہے یہ راستہ اختیار کرلو چاہے یہ راستہ اختیار کرلو، تو آخرت کے حالات دونوں قسم کے واضح کرنے سے یہی اصل میں قوتِ عمل کو ابھارنا مقصود ہے۔

موت کے وقت مؤمن اور کافر کی حالت میں فرق

پہلی آیت میں یہ کہا گیا کہ جو لوگ کُفر کی حالت میں مریں گے ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ان کی روح جب برے حال میں نکالی جاتی ہے تو فرشتے اس کو اوپر کی طرف لے کے جاتے ہیں تو

آسمان تک ان کو لانے کی اجازت نہیں دی جاتی، بلکہ زمین کی طرف اس کو پٹک دیا جاتا ہے، بخلاف اس کے کہ جس وقت نیک آدمی مرتا ہے اور فرشتے اس کی روح کو لے کے جاتے ہیں تو آگے فرشتوں کی جماعتیں بطور استقبال کے کھڑی ہوتی ہیں، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے پہلے دوست احباب رشتہ دار تعلق والے مرے ہوتے ہیں ان کو اطلاع ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص آ رہا ہے، وہ بھی استقبال کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، اور اس وقت اپنے رشتے داروں کے ساتھ ملاقات ہو جاتی ہے، دوستوں کے ساتھ رشتے داروں کے ساتھ ملنے والوں کے ساتھ مرتے ہی ملاقات ہو جاتی ہے، یہ مضمون حدیث شریف کے اندر صراحت کے ساتھ آتا ہے، تو اس کے لئے خوشی کی بات ہوتی ہے، اور ویسے بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر و بیشتر اچھے لوگ مرتے وقت مرنے سے پہلے ہی جب ان کی کیفیت بدلتی ہے تو اسی وقت وہ ایسی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں کہ فلاں آ گیا فلاں آ گیا، ایسے ہوتا ہے جیسے ان کے سامنے ساری چیز نمایاں ہوتی جا رہی ہے، اکثر و بیشتر آپ سنیں گے۔

اَصحابِ اَعراف کی جہنم والوں سے گفتگو

وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ: اور جب ان کی آنکھیں پھیر دی جائیں گی جہنمیوں کی طرف کہ ان کو بھی دیکھ لو، ادھر متوجہ کر دیے گئے، قَالُوْا: یہ کہیں گے کہ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالموں کے ساتھ نہ کرنا، یعنی یہ لوگ ظالم ہیں جن کا یہ انجام ہے، تو یہ بھی ایسے پناہ پکڑنے کی بات ہے جس طرح سے ہم کسی کو سزا پاتا ہوا دیکھ کر کہتے ہیں یا اللہ! توبہ توبہ، یا اللہ! ایسا نہ کرنا، تو بچے ہوئے تو وہ ہیں جیسے ان کو معلوم ہو گیا لیکن پھر بھی اس وقت وہ ایسا اظہار کریں گے گویا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ دُعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار! ہمیں ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا۔ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ: آواز دیں گے اَعراف والے کچھ لوگوں کو جن کو وہ پہچانتے ہوں گے ان کی علامت کے ساتھ، اور یہ لوگ وہ ہیں جو جہنم میں پڑے ہوئے ہیں، جن جہنمیوں کے ساتھ اِن کا (دنیا میں) الجھاؤ رہتا تھا آپس میں واسطہ تھا تعلق تھا، تو اَعراف والے ان کو آواز دے کے پوچھیں گے، قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ: اب دیکھو، یہ جملہ جو ہے یہ مبلغین کی طرف سے تنبیہ زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے، جو ان کے سامنے اپنی جماعت اور پارٹی پر اعتماد کرتے ہوئے اکڑتے تھے اور تکبر کرتے تھے، ان کی بات سنتے نہیں تھے مانتے نہیں تھے، اب آج یہ پوچھیں گے کہ بتاؤ! وہ پارٹی تمہارے کیا کام آئی؟ اور جو تم بڑے بن کے رہتے تھے وہ بڑا بننا تمہارے کیا کام آیا؟ تو یہ تنبیہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود خوش حال ہیں جن کے سامنے اپنا انجام اچھا ہے، اور اگر وہ ابھی پکڑ دھکڑ کے میدان میں ہی ہوں کہ کچھ چھوٹے کچھ پکڑے گئے تو ان کی زبان سے اس قسم کی تنبیہات ایسی جچتی نہیں ہیں، اس لیے زیادہ اصح بات یہی ہے کہ یہ تنبیہ کرنے والے، یہ گفتگو کرنے والے وہی لوگ ہیں جو کہ دین کے مبلغ تھے، نیک لوگ تھے جو لوگوں کو نیکی کی تلقین کیا کرتے تھے، اور بعض لوگ اپنی جماعت کے زور سے یا اپنی بڑائی کے زور سے مال و دولت کے زور سے ان کے سامنے اکڑا کرتے تھے اور ان کی بات مانتے نہیں تھے، آج یہ ان کی طرف سے تنبیہ ہوگی۔ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ: مَاۤ اَغْنٰى

میں ''مَا'' کو اِستفہام پر محمول کیا جائے تو ''کیا کام آئی تمہارے تمہاری جماعت؟'' پھر ترجمہ یوں ہوگا، جیسے تنبیہ کی جاتی ہے ''کیا کام آئی تمہارے تمہاری جماعت اور کیا کام آیا تمہارے تمہارا تکبر کرنا''، مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ یہ مصدری معنی میں ہو جائے گا، ''جو تم تکبر کیا کرتے تھے، تمہارا تکبر کرنا تمہارے کیا کام آیا؟'' یہ بطورِ تنبیہ کے ہے۔ اور اگر ''مَا'' نافیہ ہو تو ایک قسم کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے کہ تمہاری جماعت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تمہارا بڑا بننا اکڑنا کچھ کام نہ آیا...... یہ تو اُن کو تنبیہ کی، پھر یہ آپ کے سامنے قرآنِ کریم میں بہت سی آیات میں آئے گا کہ مشرکین کے جو رُؤسا تھے وہ اِن مساکین کی تحقیر کیا کرتے تھے، جو ایمان لاتے وہ چونکہ مسکین قسم کے لوگ ہوتے تھے، نہ ان کی طرح ان کی پوشاک، نہ ان کی طرح ان کی خوراک، اور نہ ان کی طرح ان کی رہائش، غریب طبقہ زیادہ تر انبیاء ﷺ کو ماننے والا ہوتا ہے، تو ان کا مذاق اڑاتے تھے، کہتے تھے لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ (سورۂ اَحقاف: ۱۱) اگر یہ کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے، جیسے دنیا میں ہر اچھی چیز اللہ نے ہمیں دی ہے اگر یہ دِین اچھا ہوتا تو یہ بھی ہمیں ملتا، اور کبھی یہ کہتے تھے کہ یہی لوگ ہیں جو اللہ کو پسند ہیں اور اللہ کے محبوب ہیں، جن کو نہ کھانے کو روٹی ملے نہ پہننے کو کپڑا، اس طرح سے ان کی تحقیر کرتے، آتے جاتے آنکھوں سے اشارے کرتے اور اس طرح سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے، تو یہ اَعراف والے پھر ان جہنمیوں کو خطاب کر کے کہیں گے ''یہی ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ان پر اللہ رحمت نہیں کرے گا، دیکھو آج ان کو کیسی کیسی بشارتیں مل گئیں'' یہ بھی ایک قسم کی ان کو ذہنی تکلیف پہنچانے کے لئے ایک بات ہے کہ جن کے متعلق تم اس قسم کی باتیں کہتے تھے ان کے متعلق اللہ کی طرف سے یہ اعلان ہو گیا، تو تمہارا وہ گمان بھی غلط نکلا کہ خوش حالی ہماری ہی قسمت میں ہے چاہے دُنیا ہو چاہے آخرت، کہا کرتے تھے کہ اوّل تو آخرت ہوگی نہیں وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی (حٰمٓ فصلت: ۵۰) کہ اگر میں اپنے رَبّ کی طرف لوٹا ہی دیا گیا بالفرض! تو وہاں بھی میری اچھی حالت ہی ہوگی، جیسے دنیا میں یہاں خوش حال کر رکھا ہے تو وہاں بھی ہم خوش حال ہی ہوں گے، لیکن آج اپنا حال بھی دیکھ لو اور ان مساکین کا حال بھی دیکھ لو جن کی تحقیر کیا کرتے تھے، اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ: کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اللہ ان کو اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا، ان کے متعلق تو کہہ دیا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ: نہ تم پر کوئی خوف نہ کوئی اندیشہ، اور نہ تم غمزدہ ہوگے، ان کے متعلق تو یہ کہہ دیا گیا، ان کا فیصلہ تو اچھا ہو گیا۔

وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا

جہنم والے آواز دیں گے جنت والوں کو، کہ بہا دو

عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا

ہم پر کچھ پانی یا کچھ اس میں سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے، تو جنتی جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرا دیا ان دونوں کو

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ

کافروں پر﴿۵۰﴾ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا اور دُنیوی زندگی نے انہیں دھوکے

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ

میں ڈال رکھا ہے، پس آج ہم ان کو بھول جائیں گے جس طرح سے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے ہوئے تھے،

وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ

اور جیسا کہ یہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے﴿۵۱﴾ البتہ تحقیق ہم اِن لوگوں کے پاس لے آئے ہیں ایسی کتاب

فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

جس کو ہم نے کھول کھول کر بیان کیا ہے اپنے علم پر، ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں﴿۵۲﴾

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ

نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر اس کتاب کے آخری انجام کا، جس دِن اس کتاب کا آخری انجام سامنے آجائے گا تو کہیں گے وہ

نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ

لوگ جو اس کو بھولے بیٹھے تھے اس سے قبل، تحقیق آگئے ہمارے پاس ہمارے ربّ کے رسول سچی بات لے کر، کیا ہمارے لیے

شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ

کوئی سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کردیں، یا ہم لوٹا دیے جائیں، پھر ہم کریں گے اس کام کے علاوہ دوسرا کام جو ہم کیا کرتے تھے،

قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع

ان لوگوں نے اپنے جانوں کو خسارے میں ڈال دیا، جو باتیں یہ گھڑا کرتے تھے وہ سب ان سے گم ہوگئیں﴿۵۳﴾

تفسیر

کفار پر جنت کی نعمتیں حرام ہیں

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ: پچھلی گفتگو تو ساری کی ساری اصحابِ جنت اور اصحابِ اعراف کی طرف سے تھی۔ اب یہ جہنمی چیخیں گے، ان کا آواز دینا بطور چیخنے کے ہے، جس طرح سے بے اختیاری کے ساتھ انسان بولتا ہے، وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ:

جہنم والے آواز دیں گے جنت والوں کو۔ کیا کہیں گے؟ اَنْ یہ نَادٰی کی تفسیر ہے اَفِیْضُوْا عَلَیْنَا: جاری کردو ہم پر، بہادو ہم پر، مِنَ الْمَآءِ: کچھ پانی اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ یا کچھ اس میں سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اب وہ آگ میں جل رہے ہوں گے، پیاس میں مَر رہے ہوں گے، بھوک سے تڑپ رہے ہوں گے، تو تڑپتے ہوئے آواز دیں گے، یہ بھی انہی کو آواز دیں گے جن کو جانتے پہچانتے ہوں گے، (مثلاً) ایک بھائی مؤمن ہے تو دوسرا کافر، تو کافر بھائی مؤمن کو آواز دے گا، ایک دوست مؤمن ہے دوسرا کافر، تو کافر دوست اپنے مؤمن دوست کو آواز دے گا، یہ آواز بے قراری کی ہے، یہ مزے کی گفتگو نہیں۔ کہیں گے بھائی! ہم پر کچھ تھوڑا سا پانی ڈال دو، یا جو کچھ اللہ نے تمہیں نعمتیں دی ہیں اُن میں سے کچھ ہماری طرف پھینک دو، یعنی اُس وقت ہاتھ پھیلائیں گے اور چیخیں گے کہ قطرہ پانی کا ہی دے دو ادھر، ہم پر کچھ پانی ڈال دو، ہمیں کچھ سہولت ہو جائے، یا جو کچھ تمہیں نعمتیں ملی ہیں ہمیں اُن میں سے کچھ دے دو۔ تو جنتی جواب دیں گے کہ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کو، خواہ وہ پانی ہو، خواہ دوسرا رزق ہو کافروں پر ممنوع ٹھہرادیا ہے، یہ نہیں دیا جاسکتا، یہ نہیں مل سکتا، اس کی قیمت تو ایمان ہے، اور ایمان تمہارے پاس ہے نہیں۔ ''حرام ٹھہرادیا ان دونوں کو'' حرام سے یہاں تحریم شرعی مراد نہیں ہے، کیونکہ وہاں شرعی تکلیف تو رہے گی نہیں۔ اس کا معنی ہے ممنوع ٹھہرادیا، یہ چیزیں جنت سے جہنم کی طرف نہیں آسکتیں، اور تم ان سے فائدہ نہیں اٹھاسکتے، ہم تمہیں ان میں سے کچھ نہیں دے سکتے، یہ ممنوع ہے۔ ''ممنوع ٹھہرادیا ان دونوں چیزوں کو'' یعنی پانی کو اور رزق کو عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: کافروں پر۔

جنتی نعمتوں سے محروم ہونے والوں کا تعارف

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا: اب یہ کافر جن پر جنت کی نعمتیں حرام اور ممنوع ہو گئیں، نہ ان کو پانی کا قطرہ ملے، نہ ان کو کھانے کے لیے کچھ ملے، یہ کون لوگ ہیں؟ ان کا آج دنیا میں تعارف کرایا جارہا ہے، یہی لوگ ہیں جو آج اس حال میں ہیں، یہی اس وقت چیخ چیخ کر پانی کا قطرہ مانگیں گے انہی مساکین سے جن کی آج یہ تحقیر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری روٹیوں پر پلتے ہیں، اور ہمارے چندوں پر پلتے ہیں، جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کل کو انہی کے سامنے یہ ہاتھ پھیلائیں گے، اور اُدھر سے ٹکا سا جواب ملے گا۔ جن کا یہ حال ہوگا یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دِین کو کھیل تماشا بنالیا، یعنی جو دِین ان کے پاس آیا تھا، جس کو انہیں قبول کرنا چاہیے تھا، اُس پر عمل کرنا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے اس دِین کی باتوں کو ہنسی مذاق ہی بنالیا۔ یہ آج جو دِین کو ہنسی مذاق بنارہے ہیں، اور دُنیوی زندگی ان کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے، پیٹ بھر کر کھالیتے ہیں اور مست ہو کر سو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں بس یہی کچھ ہے آگے کچھ نہیں، اپنی اس اچھی حالت پر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، انجام سے غافل ہیں، جنہوں نے دِین کو کھیل تماشا بنالیا۔

''لہو'' اور ''لعب'' میں فرق

''لہو'' اور ''لعب'' یہ دو لفظ ہیں، معنی دونوں کا قریب قریب ہی ہے، جس طرح ہم اپنی زبان میں ''کھیل کُود'' کا لفظ بولتے ہیں، ''کھیل تماشا''، ''کھیل کُود'' یہ دو لفظ جو ہم بولا کرتے ہیں تو اسی طرح سے ''لہو ولعب'' یہ دو لفظ بھی ایسے ہی ہیں، ''کھیل تماشا''،

"کھیل کود" لیکن اگر ان کے درمیان فرق کرنا ہو تو اس کو آپ ان الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں کہ لعب کہتے ہیں کھیلنے کو، غیر مفید چیز میں مشغول ہونا یہ "لعب" ہے، یعنی ایسے کام میں آپ مشغول ہو گئے جس میں کوئی نفع نہیں۔ اور جس وقت کوئی شخص غیر مفید چیز میں مشغول ہوا کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفید چیز سے غفلت ہو جاتی ہے، اب ایک وقت میں آپ دو کام تو کر نہیں سکتے، یا تو آپ تاش کھیلیں گے یا کتاب کا مطالعہ کریں گے، جو شخص تاش کھیلنے لگ گیا وہ کتاب کا مطالعہ کس طرح سے کرے گا؟ تو ایک تو یہ کہ بیکار کام کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک ہے کہ مفید کام سے غافل ہو گئے، تو بیکار کام کی طرف متوجہ ہونا یہ "لعب" ہے، اور مفید کام سے غافل ہو جانا یہ "لہو" ہے۔ یہ دونوں باتیں آ گئیں، کہ جس وقت ایک آدمی نکمے کام میں، بے کار کام میں، یا گناہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے، تو اُس وقت میں نیکی کے کام سے محروم ہو جاتا ہے، تو بے کار کام کی طرف متوجہ ہونا یہ "لعب"، اور نیکی کے کام سے غافل ہو جانا یہ "لہو" ہے۔

اِنسان کو دھوکا کس طرح لگتا ہے؟

حاصل مفہوم اس کا یہی ہے کہ تم دِین کی باتوں کو ایسے ٹرخا دیتے تھے جس طرح سے کوئی کھیل تماشا ہوتا ہے، تمہارے دل میں کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ "یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دِین کو کھیل تماشا بنا لیا اور دُنیوی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا" دھوکے میں دُنیوی زندگی کس طرح سے ڈالتی ہے، جوانی کا جوش ہے تو سمجھتا ہے کہ شاید ہمیشہ جوان ہی رہنا ہے، اُس کو خیال ہی نہیں آتا کہ بڑھاپا بھی آئے گا، اِس وقت زندہ ہے تو سمجھتا ہے کہ میں نے زندہ ہی رہنا ہے، اُس کو کبھی موت کا تصور ہی نہیں آتا کہ میں نے مرنا بھی ہے، اِس وقت اگر خوشحال ہے اور اُس کی جیب میں پیسے ہیں، تو سمجھتا ہے کہ شاید میں نے خوشحال ہی رہنا ہے، اس کو وہ وقت یاد ہی نہیں کہ میں کسی وقت محتاج بھی ہو جاؤں گا، اِس وقت اگر صحت مند ہے تو صحت پر اعتماد کر کے اُچھلتا کودتا ہے، اِس کو یہ اندیشہ ہی نہیں ہے کہ کسی وقت بیمار بھی ہو جاؤں گا، یہی ہے دھوکا جو انسان کو لگتا ہے، کہ موجودہ حال پر وہ اس طرح سے مست ہو جاتا ہے کہ اپنے انجام سے غافل ہے، ورنہ اگر جوانی کے زمانے میں بڑھاپے کی کمزوری مستحضر ہو تو آج غرور نہیں آ سکتا، اور مال داری کے زمانے میں اگر فقر کا اندیشہ رہے تو انسان اپنے مال پر اکڑتا نہیں، اور اگر صحت کے اندر مرض کا تصور رہے کہ یہ صحت جا بھی سکتی ہے اور اس کی جگہ مرض بھی آ سکتی ہے، تو انسان کو اس نعمت کی قدر ہوگی، انسان غافل نہیں ہوگا۔ تو یہی چیزیں ہیں جو انسان کو دھوکے میں ڈالتی ہیں، کہ کوئی نقد انعام اگر اس کو حاصل ہے، کوئی نقد اچھی حالت اگر اس کو حاصل ہے، تو دوسری بات کو سوچتا ہی نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ شاید ہمیشہ ایسے ہی رہنا ہے۔ اب یہ روز آپ کے سامنے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں، پھر بھی بسوں اور سکوٹروں والے ویسے ہی بدتمیزی کے ساتھ چلاتے ہیں، یہی غفلت ہے اُن کو، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہی تھا مرنے والا جو مر گیا، ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا، ہم بڑے ہوشیار ہیں، لیکن پتا اُسی وقت ہی لگتا ہے جب وہاں بھی پٹاخا ہو جاتا ہے۔ یہی غفلت اور یہی دھوکا ہے جو انسان کو لگا ہوا ہے، ورنہ ایک کا حال دیکھ کر عبرت حاصل کی جائے تو انسان اپنے عمل کا جائزہ لے کر اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہے، کہ دیکھو فلاں نے ایسا کیا تھا نتیجہ غلط نکلا، ہمیں اس سے احتیاط کرنی چاہیے۔ لیکن نہیں کرتے، یہی غرور ہے کہ وہ تو بے وقوف تھا،

بے عقل تھا، اسے تو یہ کام نہیں کرنا آتا تھا اس لیے ایسا ہو گیا، ہم تو بڑے سمجھ دار ہیں ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا، اس قسم کے دھوکے انسان کو زندگی میں لگتے ہیں۔ ''دُنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔''

اللہ کو بھلانے والوں کا آخرت میں انجام

فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ پس آج ہم ان کو بھول جائیں گے كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا: جس طرح وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے ہوئے تھے، جس طرح انہیں یہ نہیں یاد تھا کہ قیامت بھی آئے گی اور ہم نے اس میں اٹھنا ہے، اسی طرح سے آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔ ''بھلانا'' اِس کی ایک تو حقیقت ہے کہ حافظے سے بات نکل گئی، بھول گیا، مجھے یاد ہی نہیں رہا، بھول گیا، یہ نسیان اللہ پر نہیں آسکتا، کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بات یاد نہ رہے، اور ایک بھلانا ہوتا ہے کہ اُس کی پروانہ کرنا، جیسے آپ اپنے دوستوں سے شکوہ کیا کرتے ہیں، کہ فلاں وقت میں آپ نے ہمیں یاد ہی نہیں کیا، وہ کہے کہ نہیں جی! یاد کیا ہے، میں نے تو تسبیح پکڑ کر سو دفعہ تیرا نام لیا تھا، اب اس یاد کا کیا اعتبار؟ جب وقت پہ بلایا نہیں، وقت پہ اس کا اعزاز نہیں کیا، اس کو اپنی خوشی میں شریک نہیں کیا، تو صرف نام لینا تو یاد کرنا نہیں ہے۔ تو بھلا دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پروا نہیں کی، (جیسے کہتے ہیں) فلاں نے فلاں شخص کو بھلا ہی دیا، پس پشت ہی ڈال دیا۔ تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ ہم ان کی پروا نہیں کریں گے، ہم ان کا خیال نہیں کریں گے، جس طرح سے انہوں نے اپنی اس دن کی ملاقات کا خیال نہیں کیا۔ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ یہ بھی كَمَا کے کاف کے نیچے داخل ہے اَيْ كَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ جیسا کہ یہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔

قرآن ہدایت ورحمت اور واقع کے مطابق ہے

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ: باء تعدیہ کی آگئی۔ ''البتہ تحقیق ہم ان لوگوں کے پاس لے آئے ہیں ایسی کتاب جس کو ہم نے کھول کھول کر بیان کیا ہے اپنے علم پر، یا اپنے علمِ صحیح کی بنا پر ہم نے اس کتاب کے اندر ہر بات کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ اور ہدایت اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔'' آج اس کتاب کی قدر کرنی چاہیے، جس کو ہم نے ہدایت اور رحمت بنا کر اتارا۔ ہدایت: راہنمائی۔ اس کتاب کے ساتھ راستہ معلوم کرو، اور جب اس راستے کو معلوم کر کے اس پر چلو گے تو تمہیں اللہ کی رحمت حاصل ہوگی۔ ''جو ایمان لانا چاہتے ہیں اُن کے لیے ہم نے اس کتاب کو ہدایت اور رحمت بنا کر اتار دیا'' عَلٰى عِلْمٍ کا معنی ہے کہ ہم نے اپنے علم پر اس کی تفصیل کی ہے، جیسے ہمارا علم صحیح واقع کے مطابق ہے، تو اس کتاب میں جو کچھ آیا سارے کا سارا واقع کے مطابق ہے۔

کفار کی قیامت کے دِن بے فائدہ حسرتیں

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ: هَلْ کے بعد اِلَّا آئے تو ترجمہ نفی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ''نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر اس کتاب

کے آخری انجام کا''۔آخری انجام کا مطلب یہ ہے کہ جو خبریں اس میں دی گئی ہیں وہ واقعہ بن کر سامنے آجائیں، یہ جو مانتے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خبر کے واقع ہونے کا انتظار کررہے ہیں۔ جب یہ خبر واقع ہوجائے گی یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ جس دن اس کتاب کا آخری انجام سامنے آجائے گا یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ پھر کہیں گے وہ لوگ جو اس کو بھولے بیٹھے تھے مِنْ قَبْلُ اس سے قبل قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ تحقیق آگئے ہمارے پاس ہمارے رَبّ کے رسول سچی بات لے کر فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَیَشْفَعُوْا لَنَآ کیا ہمارے لیے کوئی سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کردیں، یا ہم لوٹا دیے جائیں، پھر ہم کریں گے اس کام کے علاوہ دوسرا کام جو ہم کیا کرتے تھے غَیْرَ الَّذِیْ کُنَّا نَعْمَلُ جو ہم کام کیا کرتے تھے اُس کے علاوہ اور عمل کریں گے، اگر ہم لوٹا دیے جائیں۔یعنی آج جو اس کتاب کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، اور منتظر ہیں کہ اس کا انجام سامنے آجائے، جب اس کا انجام سامنے آئے گا پھر یہ لوگ کہیں گے کہ واقعی رسول سچ کہتے تھے، اور پھر اُس کی تلافی نہیں کرسکیں گے، تلاش کرتے پھریں گے کیا کہ کیا کوئی آج ہماری سفارش کرنے والا ہے جو سفارش کرکے ہمیں بچادے، کیا کوئی ایسی صورت بن سکتی کہ ہم دوبارہ لوٹ کر چلے جائیں، پھر ہم ایسے کام کریں گے جو ان کاموں کے علاوہ ہوں گے جو ہم پہلے کرتے تھے، یعنی پہلے جو غلط کام کرتے تھے ہم وہ نہیں کریں گے، اُس کے علاوہ دوسرے کام کریں گے، پھر اس وقت یوں حسرت اور افسوس ہوگا۔

کافروں نے قیمتی چیز ''عمر'' ضائع کرکے مقابلے میں اللہ کا عذاب لے لیا

قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: ان لوگوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال دیا، اپنی جانوں کو خسارے میں ڈال دیا۔یہ خسارہ وہی ہے جس کی تفصیل بارہا آپ کے سامنے آئی کہ زندگی جو خرچ کررہے ہو اس کا نفع یہ ہے کہ اپنے انجام کو سنوار لو۔اگر ''عمر'' خرچ کرکے آپ نے اللہ کی رضا اور جنت حاصل کرلی تو تم نے نفع کمایا، اور اگر ''عمر'' جیسی قیمتی چیز تم نے خرچ کردی اور مقابلے میں لیا اللہ کا عذاب یا اللہ کی ناراضگی، تو یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔قیمتی سرمایہ دے کر آپ نے اپنی ہلاکت خریدلی۔تو یہی لوگ ہیں جنہوں نے نتیجۃً جہنم خریدی، اور اللہ کی کتاب کی باتوں سے متاثر نہیں ہوئے یہ اپنی عمر برباد کربیٹھے، قیمتی سرمایہ ضائع کربیٹھے، اور مقابلے میں کمایا کیا؟ اللہ کا عذاب! ''یہی ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال دیا''...... وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: جو باتیں گھڑا کرتے تھے، بنایا کرتے تھے، خواہ مخواہ کی باتیں بناکر اپنے آپ کو تسلیاں دیا کرتے تھے، جو باتیں یہ گھڑا کرتے تھے وہ سب اُن سے گم ہوگئیں۔اور ان کے شرکاء بھی مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ میں شامل ہیں جن پر یہ سہارے لیے بیٹھے ہیں، وہ بھی گھڑی ہوئی چیزیں ہیں، ان کی گھڑنت ہیں، ورنہ واقع کے اعتبار سے اُن کا کوئی وجود نہیں، کہ اللہ کا فلاں شریک بھی ہے اس کا کوئی وجود نہیں ہے، اپنے ذہن سے تراش کرکرکے انہوں نے ان کو سہارا بنالیا ہے، وقت آئے گا تو یہ سب چیزیں ان سے گم ہوجائیں۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ

بے شک تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا چھ دن میں پھر اُس نے قرار پکڑا

عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا

عرش پر، اڑھاتا ہے رات کو دن پر، طلب کرتا ہے وہ دن اس رات کو اس حال میں کہ اس کو برانگیختہ کیا ہوا ہوتا ہے،

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا

اور (پیدا کیا اُس نے) سورج کو اور چاند کو اور ستاروں کو اس حال میں کہ یہ سارے کے سارے تابع کیے ہوئے ہیں اس کے حکم کے ساتھ، خبردار!

لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۵۴) ادْعُوا رَبَّكُمْ

اسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا اور اسی کے لئے ہے حکم دینا، برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے (۵۴) پکارو اپنے رب کو

تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۵۵) وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ

گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، بے شک وہ پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو (۵۵) اور فساد نہ کرو زمین میں

بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ

اس زمین کی دُرستی کے بعد اور پکارو اس رب کو ڈرتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے، بے شک اللہ کی رحمت

قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ (۵۶) وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا

نیکوکاروں کے قریب ہے (۵۶) اور اللہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والی ہوتی ہیں

بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ

اللہ کی رحمت سے پہلے، حتیٰ کہ جب وہ اُٹھالاتی ہیں بوجھل بادلوں کو تو ہم چلا دیتے ہیں اس بادل کو

لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ

بنجر علاقے کی طرف پھر اُتارتے ہیں ہم اس بادل کے ذریعے سے پانی، پھر نکالتے ہیں ہم اس پانی کی وجہ سے ہر قسم کے میوے،

كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۵۷) وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ

ایسے ہی ہم نکالیں گے مُردوں کو، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (۵۷) اور عمدہ علاقہ، نکلتی ہے

نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ

اس کی نباتات اس کے ربّ کے حکم سے، اور جو علاقہ خبیث ہے نہیں نکلتی اس کی نباتات مگر رَدّی قسم کی، اسی طرح سے

نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ ۵۸ ع

ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات کو ان لوگوں کے لیے جو کہ شکر کرتے ہیں ۵۸

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ: بیشک تمہارا ربّ وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا چھ دن میں۔ سِتَّة: چھ۔ اَیَّام: یوم کی جمع۔ چھ دن میں پیدا کیا، ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ: پھر اس نے قرار پکڑا عرش پر، یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ: لیل: رات۔ نہار: دِن۔ غَشِیَ یَغْشٰی: ڈھانپنا۔ اور اَغْشٰی: اُڑھادینا، یعنی ایک چیز کو دُوسری چیز پر طاری کر دینا جس سے پہلی چیز دوسری چیز کو چھپا لے، یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ: اُڑھاتا ہے رات کو دِن پر، یعنی رات کے اُوپر دِن کی چادر ڈال دیتا ہے جس سے رات چھپ جاتی ہے، اور دُوسری طرح سے بھی ترجمہ کر دیا جاتا ہے ”اُڑھاتا ہے دِن پر رات کو“، کیونکہ دونوں طرح سے بات صحیح ہے، دِن آتا ہے تو رات چھپ جاتی ہے اور رات آتی ہے تو دِن چھپ جاتا ہے، یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا: طلب کرتا ہے وہ دِن اس رات کو، حَثِیْثًا: حَثَّ یَحُثُّ: برانگیختہ کرنا۔ حثیث محثوث کے معنی میں ہے۔ اس حال میں کہ اس کو برانگیختہ کیا ہوا ہوتا ہے، یعنی دوڑتا ہوا آتا ہے، تیزی سے آتا ہے، جلدی جلدی آتا ہے، وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: یہ منصوب ہیں فعل محذوف کی وجہ سے، یعنی خَلَقَ الشمسَ والقمرَ، محذوف نہ مانیں تو وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کا عطف السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ پر ہے، درمیان میں یہ بات آگئی تھی ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا، اور الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کا عطف السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ پر ہے، ”پیدا کیا اس نے سورج کو اور چاند کو اور ستاروں کو“ نُجُوم نجم کی جمع، ستارہ، مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ: اس حال میں کہ یہ سارے کے سارے یعنی سورج، چاند، ستارے یہ تابع کیے ہوئے ہیں اس کے حکم کے، مُسَخَّرٰت: تابع کیے ہوئے ہیں بِاَمْرِهٖ: اللہ کے حکم کے ساتھ، اَلَا: خبردار! یہ حرفِ تنبیہ ہے، لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ: اُسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا اور اُسی کے لئے ہے حکم دینا، یعنی خالق بھی وہی ہے اور حاکم بھی وہی ہے، تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ: برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔ عالَمین عالَم کی جمع، جہان۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً: پکارو اپنے ربّ کو تَضَرُّعًا: گڑگڑاتے ہوئے، عاجزی انکساری کرتے ہوئے، وَّخُفْیَةً: اور چپکے چپکے۔ تضرع عاجزی اور زاری کرنے کو کہتے ہیں، انکسار اور تواضع کا اظہار، جس کے لئے اُردو میں ”گڑگڑانے“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، ”پکارو اپنے ربّ کو گڑگڑاتے ہوئے، زاری کرتے ہوئے، تواضع اور انکسار کو ظاہر کرتے ہوئے، اور چپکے چپکے“ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ: بیشک وہ تمہارا ربّ پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو۔ معتدین: حد سے بڑھنے والے۔ اِعتداء: حد سے بڑھنا۔ وَلَا تُفْسِدُوْا

فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا: اور فساد نہ کرو زمین میں اُس زمین کی درستی کے بعد، وَادْعُوْهُ: اور پکارو اُس ربّ کو خَوْفًا وَّطَمَعًا: ڈرتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے، اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ: بیشک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے، احسان کرنے والوں کے قریب ہے، نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے، وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ: اور اللہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو۔ ریاح ریح کی جمع ہے۔ بُشْرًا: یہ اصل میں بُشُرًا تھا، یہ اس سے مخفف ہے، ضمہ کو گرایا ہوا ہے، اور یہ جمع ہے بَشُوْر کی،[1] یہ صفت کا صیغہ ہے، بشارت دینے والا۔ تو یہ بُشْرًا مُبَشِّرَات کے معنی میں ہے۔ ''بھیجتا ہے ہواؤں کو اس حال میں کہ وہ بشارت دینے والی ہوتی ہیں'' بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ: اللہ کی رحمت سے پہلے، اللہ کی رحمت کے سامنے۔ رحمت سے یہاں بارش مراد ہے۔ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا: اَقَلَّ: اُٹھالانا۔ حتّٰی کہ جب وہ اُٹھالاتی ہیں بوجھل بادلوں کو۔ سَحاب یہ جمع کے معنی میں ہے، سَحَابَۃ اس کا واحد آتا ہے، تَمْرَۃ اور تَمْر والا فرق ہے۔ ثِقَال یہ ثقیل کی جمع ہے۔ حتّٰی کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بوجھل بادلوں کو سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ: سَحاب چونکہ اسم جمع ہے اس لیے اس کی طرف مفرد ضمیر بھی لوٹ سکتی ہے، تو سُقْنٰهُ کی ''ہٗ'' ضمیر سحاب کی طرف چلی گئی۔ ''چلا دیتے ہیں ہم اس بادل کو، ہانک دیتے ہیں ہم اس بادل کو، لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ: بلد شہر کو کہتے ہیں۔ میت: بے جان۔ بلد سے یہاں علاقہ مراد ہے۔ ''بنجر علاقے کی طرف'' ارضِ میتہ، مری ہوئی زمین سے مراد بنجر زمین ہوتی ہے جس میں نباتات نہیں ہے خشک پڑی ہے۔ ساق یَسُوْقُ سے ہے سُقْنَا، قُلْنَا کی طرح۔ ''ہم چلا دیتے ہیں اس بادل کو بنجر علاقے کی طرف'' فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ: پھر اتارتے ہیں ہم اس بادل کے ذریعے سے پانی، فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ: پھر نکالتے ہیں ہم اس پانی کی وجہ سے ہر قسم کے میوے۔ ثمرات ثَمَرَۃٌ کی جمع ہے، میوہ۔ نکالتے ہیں ہم اس پانی کے ذریعے سے ہر قسم کے میوے، كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى: ایسے ہی ہم نکالیں گے مُردوں کو، موتی میت کی جمع ہے، لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: یہ باتیں تمہیں بتائی جارہی ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ: بلد طیب: عمدہ علاقہ۔ عمدہ علاقہ وہ ہوتا ہے جس کی مٹی اچھی ہو، زرخیز ہو، جس میں اچھی نباتات پیدا ہوتی ہے، بہترین علاقہ، پاکیزہ علاقہ۔ ''نکلتی ہے اس کی نباتات'' بِاِذْنِ رَبِّهٖ: اس کے ربّ کی توفیق سے، ربّ کے حکم سے وَالَّذِیْ خَبُثَ: اور جو علاقہ خبیث ہے۔ خبیث کا معنی ہے ردّی زمین، کلر والی، شور، نمکین زمین جس طرح سے ہوتی ہے۔ ''اور جو علاقہ خبیث ہے'' لَا یَخْرُجُ: اس کا فاعل ہے نَبَاتُهٗ، جس طرح سے پیچھے یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ آیا ہوا ہے اسی طرح سے یہاں لا یخرج نباتہ ہے۔ ''نہیں نکلتی اس کی پیداوار، نباتات'' اِلَّا نَكِدًا: نباتا نکدا، مگر ردّی قسم کی۔ نَکِد: ردّی قسم کی، بے کار، فضول، اور اس کے اندر قلت والا معنی بھی ہے، بہت کم اور ردّی۔ ''نہیں نکلتی اس کی نباتات مگر کم اور گھٹیا'' كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ: اسی طرح سے ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیات کو لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ: شکرگزار لوگوں کے لئے، ان لوگوں کے لئے جو کہ شکر کرتے ہیں۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

---

(۱) دیکھئے نسفی و آلوسی وغیرہ سورۂ فرقان آیت ۴۸ کے تحت۔

تفسیر

ماقبل کا مضمون

پچھلے رکوع جو آپ کے سامنے ذکر کیے گئے، حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد ان میں زیادہ تر ذکر معاد کا ہے، یعنی آخرت کے احوال، جیسے کہ جنت اور دوزخ میں جانے والے لوگوں کی آپس میں گفتگو نقل کی ہے، اصحابِ اعراف کی گفتگو نقل کی، اور پچھلے رکوع میں متصل ہی آیا تھا کہ جب یہ آخرت میں اللہ کے سامنے جائیں گے، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی تو اُس وقت یہ کہیں گے کہ واقعی ربّ کے رسول ہمارے پاس سچی بات لے کر آئے تھے، پھر یہ سفارشی ڈھونڈتے پھریں گے، پھر یہ تمنائیں کریں گے کہ ہمیں واپس بھیج دیا جائے، لیکن وقت گزر چکا ہوگا، پھر ان کی تمنائیں پوری نہیں ہوں گی۔

مسئلۂ معاد کے متصل قدرتِ باری کے ذِکر کرنے کی وجہ

قرآنِ کریم میں اکثر وبیشتر اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہی ہے کہ جس وقت بھی معاد کا مسئلہ ذکر کرتے ہیں، یعنی جی اٹھنے کا، آخرت کا، تو اس کے بعد خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر آتا ہے، اور قدرت کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کے سامنے جب بھی یہ ذکر کیا جاتا تھا کہ مُردوں کو زندہ کیا جائے گا تو وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسے ہوگا؟ جب ایک دفعہ انسان مَر گیا، مَرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہوگیا، ہڈیاں بوسیدہ ہوگئیں، تو پھر بھلا ان میں دوبارہ کیسے جان ڈالی جاسکتی ہے؟ فوراً ان کی زبان پر یہی بات آتی تھی: مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ (سورۂ یٰسٓ: ۷۸) ہڈیوں کے بوسیدہ ہوجانے کے بعد پھر ان کو کون زندہ کرے گا؟ یعنی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی مرجائے، ذرات اس کے بکھر جائیں، کیڑے اس کو کھا جائیں، جانور اس کو نوچ نوچ کرلے جائیں، دریا میں بہہ جائے، تو ہزاروں لاکھوں مچھلیاں اس کو کھا جائیں، ذرات اس کے بکھر جائیں گے، تو پھر دوبارہ ان کو زندہ کس طرح سے کیا جائے گا؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ شبہ جو ان کے دل میں آتا ہے اس کا براہِ راست تعلق قدرتِ خداوندی کے ساتھ ہے، تو اللہ تعالیٰ جب بھی اس مسئلے کو ذکر فرماتے ہیں، کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے، اور آخرت آنے والی ہے، تو اس کے متصل آیاتِ قدرت کو ذکر فرماتے ہیں تاکہ انسان اُن کے اندر غور کرے اور سمجھے، کہ جو اللہ اتنی قدرتوں والا ہے، اُس کے لیے ایک دفعہ انسان کو مار کر دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ کہیں اللہ تعالیٰ اس انداز سے بیان فرمائیں گے قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ (حوالہ مذکورہ) کہ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ دوبارہ وہی انہیں زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ بنایا تھا۔ یہ بہت بڑی دلیل ہے اس اِحیائے موتی کے لیے جس کی طرف اشارہ کیا گیا، ہمیشہ پہلی دفعہ کسی چیز کا بنانا (انسانوں کے عُرف میں، اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں!) انسانوں کے عرف میں پہلی دفعہ کسی چیز کا بنانا مشکل ہوتا ہے، اور اگر وہ دوبارہ بنانی پڑ جائے تو اس میں کوئی مشکل نہیں۔ تو جب تم یہ مانتے ہو کہ تمہیں پہلی دفعہ اللہ نے پیدا کیا، تو پھر تمہیں یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے۔ بہرحال اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز کے ساتھ اپنی قدرت کو واضح کرکے بیان کیا ہے، اور اکثر وبیشتر مثال اِحیائے ارض

کے ساتھ دی ہے، کہ تم اپنے اردگرد دیکھو! یہ زمین خشک ہو جاتی ہے، بنجر ہو جاتی ہے، اس میں کوئی نباتات نہیں ہوتی، یہ علامت ہے کہ یہ زمین مرگئی، اس میں حیات نہیں ہے، یہ خشک مٹی ہوگئی، گرد اُڑ رہی ہے، گھٹا (غبار) اُڑ رہا ہے، اس میں کوئی زندگی کے آثار نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بارش ہوتی ہے، پانی برستا ہے تو تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے ہو کہ زمین لہلہانے لگ جاتی ہے، گویا کہ وہ زمین بنجر ہونے کے بعد زندہ ہوگئی۔ تو یہ صبح شام تمہارے سامنے نقشے آتے ہیں، اسی طرح سے سمجھو کہ انسان کو اللہ تعالیٰ ایک دفعہ ماریں گے، مارنے کے بعد اس کو زندہ کر دیں گے، یہ تمہارے سامنے مثالیں دائیں بائیں آگے پیچھے پھیلی ہوئی ہیں، ان میں غور کر کے تم اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھتے؟ اس مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ آیاتِ قدرت ذکر فرمایا کرتے ہیں۔

آیاتِ قدرت سے توحید اور معاد دونوں چیزیں ثابت ہوتی ہیں

اور پھر یہ جو آیاتِ قدرت ہوتی ہیں، جہاں یہ اثباتِ معاد کا فائدہ دیتی ہیں، کہ اس کے ساتھ آخرت کا امکان سامنے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت واضح ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ آیاتِ توحید بھی ہوتی ہیں، کہ ان کے ساتھ یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق، مالک اور حاکم ہے، اور ہر قسم کی قدرت اسی کے لیے ہے، اُس کی پیدا کی ہوئی کائنات میں کسی دوسرے کا حکم نہیں چلتا، اس لیے یہاں رہتے ہوئے تم اُسی کے ہی محتاج ہو، اپنی ضرورتیں اُسی کے ساتھ ہی متعلق رکھو، اپنی حاجات کے لیے اسے ہی پکارو، اسی سے ڈرو، اسی سے امید رکھو، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو اس کائنات کے اندر متصرف سمجھ لینا کہ اس کا حکم بھی چلتا ہے، یا وہ ہماری موت وحیات کا یا رزق کا مالک ہے، کہ اگر وہ چاہے تو ہمیں فقیر کر دے، چاہے تو ہمیں غنی کر دے، ہماری صحت اور بیماری کا اُس کو اختیار ہے، اس قسم کے خیالات اپنے دل کے اندر لانا یہ اللہ تعالیٰ کے مالک اور حاکم ہونے کے خلاف ہے۔ تو توحید اس طرح سے ثابت ہوتی ہے کہ جب تم اس زمین پر بستے ہو، آسمان کے نیچے رہتے ہو، اور یہ کائنات اللہ کی بنائی ہوئی ہے، تو اللہ ہی اس کائنات کا بادشاہ ہے اور اسی کا ہی تصرف سارے کا سارا کائنات کے اندر چلتا ہے، اُس کے حکم کے خلاف یہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا، پھر تم اپنے آپ کو محتاج قرار دو تو اسی کا قرار دو، ہاتھ پھیلاؤ تو اسی کے سامنے پھیلاؤ، ہر قسم کے اختیارات اسے ہیں، کسی دوسرے کا اس کائنات کے اندر حکم نہیں چلتا، اس طرح سے اللہ تعالیٰ توحید کو بیان فرماتے ہیں۔ تو ان آیات سے دونوں باتیں ثابت ہوں گی، توحید بھی اور معاد بھی۔

اللہ تعالیٰ کا تعارف لفظ ''رَبّ'' سے کیوں؟

پہلے اپنے خالق ہونے کا ذکر کیا، کہ تمہارا رَبّ وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔ ''رَبّ'' کہتے ہی اُس کو ہیں جو ضرورتیں پوری کرنے والا ہوتا ہے، اس کا ترجمہ آپ کر لیتے ہیں ''پالنے والا''۔ اصل معنی ہوتا ہے کہ جو ابتدا سے لے کر انتہا تک نشوونما کرے، تو گویا کہ یہی تمہارا رَبّ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف سب سے پہلے آپ کو رُبوبیت کے ساتھ ہی کروایا ہے، آپ کی جو ابتدائی تاریخ نقل کی گئی ہے قرآن اور حدیث میں، اس میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود دینے کے بعد عالمِ ارواح میں حاضر کیا، حاضر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو تمہارے کان میں آواز ڈالی تھی، وہ کیا تھی اَلَسْتُ

بِرَبِّكُمْ (سورۂ اعراف: ۱۷۲) کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ اور آپ سب نے کہا تھا: بَلٰى! کیوں نہیں، گویا کہ اقرار کرلیا تھا کہ تُو ہمارا رَبّ ہے۔ تو رُبوبیت کا اقرار پہلے کروایا تھا، کیونکہ انسان اگر کسی سے جڑتا ہے تو پہلے یہی اپنے کھانے پینے کی ضرورتوں کی بنا پر جڑتا ہے، اور رَبّ وہی ہوتا ہے جو کھلائے پلائے اور ضرورتیں پوری کرے، تو یہیں سے تعارف کرایا۔ اور کتاب اللہ میں جو پہلی سورت (فاتحہ) آپ کے سامنے رکھی گئی، اس میں اللہ نے اپنی ذات کا تعارف کس لفظ کے ساتھ کروایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبّ العالمین کے ساتھ ہی وہاں تعارف کروایا، سب سے پہلی سورت میں اللہ کا ذکر کرنے کے بعد اس کی پہلی صفت جو ذکر کی گئی ہے وہ رَبّ العالمین ہے۔ اور جو مطالبہ آپ سے کیا گیا ہے، قرآنِ کریم میں جس کا ذکر آیا ہے، وہ مطالبہ بھی آپ سے یہی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (سورۂ حم سجدہ: ۳۰) اِستقامت جس بات پر مطلوب ہے وہ اسی عقیدے پر اِستقامت ہے، کہ رَبّ صرف اللہ ہے۔ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے، پھر اسی کے اوپر جم گئے ڈٹ گئے، اور اس عقیدے میں فرق نہیں آنے دیا، اپنا پالنے والا اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے والا رَبّ کو قرار دیتے ہیں، پھر اسی پر ڈٹ جاتے ہیں، کسی اور کا اپنے آپ کو محتاج نہیں سمجھتے، یہی ہیں جن کے اوپر فرشتے اترتے ہیں بشارتیں لے کر۔ اور جس وقت آپ مرجائیں گے تو مرنے کے بعد پرچے کا پہلا سوال کون سا ہے؟ مَنْ رَّبُّكَ؟ وہ یہی سوال ہے کہ جس کے متعلق اقرار کیا تھا اُس کو پھر کہاں تک نبھایا، اپنی زندگی کے اندر تم رَبّ کس کو سمجھتے رہے، وہاں جا کر آپ جھوٹ تو بول نہیں سکیں گے، اگر تو واقعی اللہ کو رَبّ سمجھا تھا اور اللہ کے ساتھ رَبّ ہونے والا تعلق رکھا تھا تو وہاں جواب صحیح دے دو گے: رَبُّنَا اللّٰهُ! اور اگر پالنے والا کسی اور کو سمجھتے رہے، اور ضرورتیں کسی اور سے متعلق کرتے رہے تو وہاں جھوٹ نہیں بول سکو گے، وہاں پھر زبان سے یہ نہیں کہہ سکو گے: ربنا اللہ۔ دیکھو! سوال بھی بتایا ہوا ہے اور جواب بھی بتایا ہوا ہے کہ اس کا صحیح جواب یہ ہے، لیکن اگر عملی زندگی نے ساتھ نہیں دیا ہوگا تو برزخ میں آپ اس سوال کا یہ جواب نہیں دے سکیں گے، وہاں سچ بولیں گے، زندگی کے اندر جس کو رَبّ سمجھتے رہے، اُسی کا اقرار آپ وہاں جا کر کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کا تعارف بھی اسی سے ہوا اور مطالبہ بھی اسی کے اوپر جمنے کا ہے۔

کائنات کی تخلیق کے ذِکر میں ''چھ دِن'' سے کیا مُراد ہے؟

''تمہارا رَبّ وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔'' تو خالق تو یہی ہوا، اب ساری کائنات اسی میں آ گئی، کائنات کا کچھ حصہ زمین کی طرف ہے کچھ آسمان کی طرف ہے، گویا کہ جتنی بھی آپ کے علم میں یہ کائنات ہے سب کا خالق وہی ہے، نہ زمین کی طرف میں کوئی چیز ہے جو کسی اور کی پیدا کی ہوئی ہو، اور نہ آسمان کی جانب میں کوئی چیز ہے جو کسی اور کی پیدا کی ہوئی ہو، تو ابتدا اسی نے کی، پیدا اُسی نے کیا۔ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: چھ دِن میں۔ ''چھ دِن'' سے کیا مراد ہے؟ اگر یہی دِن رات مراد ہیں جو آپ کے سامنے چلتے ہیں، تو پھر چھ دِن کا اندازہ مراد ہے، کیونکہ یہ دُنیا کے دِن رات کا تعلق ہے سورج اور چاند کی حرکت کے ساتھ، زمین و آسمان کی حرکت کے ساتھ، سورج کبھی نمایاں ہوتا ہے، کبھی چھپتا ہے، تو دِن بنتے ہیں اور رات بنتی ہے۔ اور جس وقت اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان کو پیدا کر رہے تھے اُس وقت نہ سورج تھا، نہ زمین کا چکر تھا، کوئی چیز بھی نہیں تھی، تو پھر یہ دِن رات کیسے وجود میں

آسکتے ہیں؟ پھر تو یہ چھ دِن کا وقت مراد ہے، کہ اتنے اندازے میں کہ جتنا چھ دِن کا وقت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا۔ اگر یہی دِن مراد لیے جائیں جو ہمارے ہیں تو پھر تو یہ مطلب ہوگا۔ اور اگر ان ''دِنوں'' سے آخرت کے دِن ہی مراد لیے جائیں، تو پھر اس کا اندازہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، آخرت کے دِن علیحدہ ہیں، اُن کا اندازہ علیحدہ ہے، جیسے کہ آپ کے سامنے سورۂ حج کے اندر آئے گا کہ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ: بے شک ایک دن اللہ کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے تمہارے شمار کے مطابق، تم جو شمار کرتے ہو تو تمہارا ایک ہزار سال اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دِن۔ اور سورۂ معارج (پارہ ۲۹) کے اندر ذِکر کیا گیا: فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ کہ ایک دن ایسا بھی ہے کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ اب یہ ایک دن پچاس ہزار سال کا ہوجائے، یا ایک دن ہزار سال کا ہوجائے، یہ آخرت کے دِن ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ان کا طول وعرض کتنا ہے۔ یہاں دُنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی بھئی! دِنوں کی مقدار ایک جیسی نہیں ہے، کہیں دِن چھوٹا ہوتا ہے، کہیں دِن لمبا ہوتا ہے، اور آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ قطب شمالی میں چھ مہینے کا دِن ہوتا ہے، چھ مہینے کی رات، یہیں آپ کی دُنیا میں، یعنی سال میں صرف دو ہی آتے ہیں ایک دِن ہے اور ایک رات، سورج نظر آنے لگ گیا تو چھ مہینے تک نظر ہی آتا رہے گا، چھپ گیا تو چھ مہینے تک نظر آئے گا ہی نہیں، کہ یہاں دُنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی ایسا ہے، اور بعض بعض جگہیں ایسی ہیں جہاں بائیس گھنٹے کا دِن ہے دو گھنٹے کی رات ہے، اور ادھر سے سورج چھپا، اور ابھی ادھر سرخی غائب نہیں ہونے پاتی کہ طلوعِ فجر کے آثار شروع ہوجاتے ہیں۔ اسی دُنیا میں بھی اس طرح سے کمی بیشی ہے، تو آخرت کے ایام کا اندازہ اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

کائنات کی تدریجاً تخلیق حکمت پر مبنی ہے

بہر حال اتنے عرصے میں اللہ تعالیٰ نے اس زمین آسمان کو بنایا، اور کس ترتیب کے ساتھ بنایا؟ اس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی، جس میں آئے گا کہ زمین اللہ تعالیٰ نے دو دِن میں بنائی، پھر دو دِن میں اس کے اندر باقی چیزیں قائم فرمائیں، پہاڑ، درخت، دریا، معدنیات جو کچھ بھی اس میں تھا، اور اس کے بعد پھر دو دِن میں آسمان کو بنایا۔ اور جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اتوار کو شروع کیا تھا اور جمعہ کے دِن یہ تخلیق ختم ہوئی (عام تفاسیر)، اور ایک روایت میں آتا ہے کہ عصر کے بعد کا وقت جو تھوڑا سا بچ گیا تھا چھٹے دِن میں، اس میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بنایا،[1] گویا کہ اس کائنات کی تخلیق کے آخر میں آدم علیہ السلام کو بنایا۔ بہر حال ان روایات سے کچھ اشارے نکلتے ہیں، اندازہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اس کی تخلیق تدریجاً ہوئی ہے، یک دَم اس کو کلمۂ کن کے ساتھ نہیں بنا دیا، کہ ہو جاؤ اور یک دَم زمین وآسمان کھڑے ہوگئے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ہے۔ اور یہ سمجھنے میں آپ کو دِقت پیش نہ آئے بھئی! آپ میں سے کوئی اٹھارہ سال کا ہے، کوئی بیس سال کا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک منٹ میں ہی اتنے بڑے بنا دیتا، لیکن اللہ کی حکمت کے تحت پہلے تم بالکل چھوٹے سے تھے، پھر تم بڑھتے چلے گئے، اب

---

(۱) مسلم ۲/۳۷۱، باب صفة القيامة/ مشكوة ۲/۵۱۰، باب بدء الخلق/ قلت لعل المراد بخلق آدم تقديره في اللوح المحفوظ يدل عليه (مظہری، سورۂ ق)۔

جو تمہارا وجود ہے، کوئی اٹھارہ سال میں بنا ہے، کوئی بیس سال میں بنا ہے، کوئی پچیس سال میں بنا ہے، تو جیسے اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت ہے کہ تمہیں تدریج کے ساتھ ایک کمال تک لے جاتا ہے، اسی طرح سے اس نے کائنات کو بھی تدریجاً وجود دیا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو آپ کے لئے پکی پکائی روٹیاں اُوپر سے آجایا کرتیں، پکی پکائی دال نازل ہو جایا کرتی اور آپ کھالیا کرتے، لیکن ایک گندم کا دانہ بننے میں چھ مہینے لگ جاتے ہیں آپ کے ہاں، اُس کو بوتے ہو اور بونے کے بعد کیا کیا دھندے کرتے ہو، پہلے زمین بناتے ہو، پھر دانہ بوتے ہو، پھر کیا کیا کرتے ہو، اور پھر کٹتا ہے، گاہا جاتا ہے، پھر آپ کے ہاں آتا ہے، پھر پستا ہے، پھر گوندھا جاتا ہے، پھر کہیں جا کر روٹی بنتی ہے، تو ایک روٹی تیار ہونے کے لیے آپ کا کتنا وقت لگتا ہے، چھ مہینے میں کہیں یہ روٹی تیار ہوتی ہے، جس کا لقمہ آپ کے منہ میں جاتا ہے۔ تو جس طرح یہ کام سارے کے سارے تدریجاً ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت، اسی طرح سے زمین و آسمان کی تخلیق جو ہوئی ہے یہ بھی اللہ کے حکم کے تحت تدریجاً ہوئی ہے، اور وقت کا اندازہ جو بھی ہے اللہ کے علم میں ہے، ہم اس کی صحیح پیمائش نہیں کر سکتے، بہرحال یہ تخلیق تدریجاً ہوئی ہے۔

صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ایک اُصولی بات

چھ دن کے اندر اس کو کمال تک پہنچایا، ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ: اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا لفظی معنی یہ ہے کہ پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا۔ عرش کہتے ہیں تخت کو، جس طرح سے بادشاہ کا تخت ہوا کرتا ہے، جس پر بادشاہ بیٹھا کرتا ہے یہ عرش ہے، اور اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا معنی ہو گیا کہ اُس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات جس وقت بھی ذکر کی جائیں اس کے بارے میں ایک اُصولی بات سمجھ لیجئے!...... اللہ تعالیٰ کا ذکر آئے اور اس کی صفات کا ذکر آئے، جیسے ہاتھ کا ذکر آجائے، منہ کا ذکر آجائے، وہاں یوں کہا جایا کرتا ہے ''جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے''، ہم اس کا کوئی نقشہ اپنے ذہن میں نہیں لا سکتے، کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کیسا ہے، اللہ تعالیٰ کا منہ کیسا ہے، ہم اس کا نقشہ ذہن میں نہیں لا سکتے لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (سورۂ شوریٰ:۱۱) جو بھی صورت ہم بنائیں گے تشبیہ لازم آجائے گی، اور اس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ جیسے بھی اللہ کی شان کے لائق ہے، اسی طرح سے صفت اس کے لیے ثابت ہے۔ اسی طرح سے ''عرش پر قرار پکڑنا!'' اس کا یوں تصور نہ کیجئے جیسے کہ ایک تخت ہے، تخت کے اوپر ایک انسان بیٹھ جاتا ہے، اس طرح سے تصور نہ کیجئے، یہ تصور غلط ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو یوں نہیں سوچا جا سکتا، ہم یہی کہیں گے کہ عرش کے اوپر قرار پکڑنا جیسا اُس کی شان کے لائق ہے، ذرا اور وضاحت کے ساتھ اس بات کو سمجھئے، کسی چیز کی صفت کو سمجھنے کے لئے اور اس کا صحیح تصور کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اُس چیز کی حقیقت معلوم ہو، تب جا کر آپ اُس کی صفت کا صحیح تصور کر سکتے ہیں۔ چیز کی حقیقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُس کی صفت کا مفہوم بدل جاتا ہے، مثلاً آپ کہتے ہیں کہ زید آیا، اب یہاں ''آیا'' کا جو ذکر آیا ہے، تو جب آپ زید کو جانتے ہیں کہ یہ انسان ہے، تو آپ کے علم میں آ گیا، سمجھ میں آ گیا کہ زید کس طرح سے آتا ہے، جیسے انسان آیا کرتا ہے، تو چونکہ زید کی حقیقت آپ سمجھتے ہیں تو اس کا آنا بھی آپ کی سمجھ میں فوراً آ گیا کہ زید اس طرح سے آتا ہے۔ اور جس وقت آپ کہتے ہیں کہ بخار آ گیا، اگر کہا جائے کہ بخار آ گیا تو کیا اس کا بھی یہی مطلب ہے؟ کہ دو ٹانگوں پر چلتا ہوا آ رہا ہے، یا تانگے پر چڑھا

ہوا آرہا ہے، یا سائیکل پر چڑھا ہوا آرہا ہے، یہی مطلب ہوتا ہے بخار کے آنے کا؟ جب آپ بخار کی حقیقت کو سمجھتے ہیں، تو جس وقت کہا جائے بخار آگیا تو فوراً آپ اس کی صفت سمجھ گئے کہ کس طرح سے آتا ہے۔ اور جس وقت آپ کسی نہر کے کنارے پر کھڑے ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ پانی آگیا، اب چونکہ پانی کی حقیقت آپ سمجھتے ہیں تو اس کا آنا بھی آپ کی سمجھ میں آگیا کہ پانی کس طرح سے آتا ہے، وہاں آپ یہ نہیں کہتے کہ پانی اس طرح سے آرہا ہے جس طرح سے ریل گاڑی آتی ہے، یا پانی اس طرح سے آتا ہے جیسے بخار آتا ہے۔ ہوائی جہاز آگیا، جب آپ ہوائی جہاز کی حقیقت کو سمجھیں گے تو اُس کے آنے کا بھی مطلب سمجھیں گے کہ ہوائی جہاز کس طرح سے آتا ہے۔ اسی طرح ریل گاڑی آگئی۔ اور یہاں سے آپ سفر شروع کرتے ہیں لودھراں کی طرف، تو آپ کہتے ہیں کہ دھنوٹ آگیا، اب دھنوٹ کے آنے کا کیا مطلب؟ کیا یہ اسی طرح سے آتا ہے جس طرح سے دریا میں پانی آرہا ہے؟ یا دھنوٹ یوں آتا ہے جس طرح سے بخار آتا ہے؟ کیا ایسی صورت ہے؟ تو جب آپ دھنوٹ کی حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بستی ہے، تو جب بھی کہا جائے ''دھنوٹ آگیا''، ''کہروڑپکا آگیا''، ''لودھراں آگیا''، تو فوراً ایک تصور اس کا آپ کے ذہن میں آجاتا ہے، کہ اس کے آنے کا یہ مطلب ہے۔ اور اگر کسی چیز کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں تو اُس وقت تک آپ اس کا صحیح تصور نہیں کر سکتے، جس طرح حضرت (مولانا عبد القادر) رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں لکھا ہے، کہ حضرت اپنی عمر کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے، کہ پوری طرح سے تو یاد نہیں کہ عمر کتنی تھی، لیکن اتنا یاد ہے کہ جس وقت یہ تیرہویں صدی ختم ہو رہی تھی، اور چودھویں صدی آنے والی تھی، تو ہم اپنے بڑوں کو گھروں میں ذکر کرتے ہوئے سنا کرتے تھے، کہ چودھویں صدی چڑھنے والی ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم یوں دیکھا کرتے تھے آسمان کے کنارے کی طرف، کہ شاید صدی ایسے ہی چڑھے گی جیسے سورج چڑھتا ہے، کہتے ہیں کہ اتنی سی ہوش تھی کہ بڑے تذکرے کیا کرتے تھے کہ صدی چڑھنے والی ہے، تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ شاید جس طرح سے سورج چڑھتا ہے یہ صدی بھی اسی طرح سے چڑھے گی۔ جیسے اب آپ اگر گھروں میں تذکرے کریں کہ پندرھویں صدی چڑھنے والی ہے، صرف دو مہینے رہ گئے، چودھویں صدی کے پورا ہونے میں، آج جمعرات ہے، کل ۲۹ تھی، اور آج ذی قعد شروع ہو گیا، تو آگے آگیا ذی الحج، دو مہینے پورے ہوئے تو چودہویں صدی پوری، اور آگے آگئی پندرہویں صدی۔ دو مہینے کے بعد جاہلوں کی اس بات کی تردید بھی ہو جائے گی جو کہتے ہیں کہ صدیاں چودہ ہی ہیں، پندرہویں تو ہے ہی نہیں، تو میں اُن کو یہی کہا کرتا ہوں کہ تھوڑا سا وقت ٹھہرو، پندرھویں آجائے گی، پھر کہنا شروع کر دینا، کہ یہی آخری صدی ہے، اگلی ہے ہی نہیں۔ یہ سب جاہلانہ باتیں ہیں، کسی کو پتا نہیں کہ کتنا وقت قیامت میں باقی ہے؟ کتنا باقی نہیں ہے؟ کتنی صدیوں پہ صدیاں آتی چلی جائیں گی کوئی پتا نہیں، اور کب ختم ہو جائیں گی؟ کوئی علم نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ وقت کسی کو نہیں بتایا۔ تو بہر حال جب بچے کے ذہن میں صدی کا مفہوم نہیں کہ صدی کیا ہوتی ہے، تو صدی کے چڑھنے کا صحیح مطلب وہ کیا سمجھے؟ یہ مثالیں دینے کا مقصد یہ ہے کہ جب کسی چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو، اُس وقت تک اُس کی صفت کا صحیح تصور نہیں آتا، ''سورج چڑھتا ہے'' آپ کے ذہن میں فوراً اس کا نقشہ آجائے گا، چونکہ آپ سورج کی حقیقت سمجھ گئے۔ ''بخار چڑھتا ہے'' فوراً آپ کے ذہن میں آجائے گا، کہ بخار کس طرح سے چڑھا کرتا ہے؟ اس میں آپ کو کوئی اشکال نہیں ہوگا۔ تو پہلے وہ چیز اچھی طرح سے سمجھی ہوئی ہو تب جا کے اُس کی صفت صحیح طرح سے سمجھی جاتی ہے، اب (مثلاً) ایک

پاؤں کی بات ہے یعنی پیر، انسان کا پیر اور طرح کا ہوتا ہے، گھوڑے کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے، ہاتھی کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے، چڑیا کا پاؤں اور طرح کا ہوتا ہے، تو جس چیز کا آپ پیر کہیں گے پاؤں کہیں گے، اگر اُس کی حقیقت آپ کو معلوم ہے، تو آپ اُس کے پیر کا صحیح نقشہ سمجھ جائیں گے، اگر اُس کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں تو اس کے پیر کا صحیح نقشہ نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ منہ ہر چیز کا ایک جیسا نہیں ہوتا، انسان کا منہ اور طرح کا ہے، دوسرے ہر جانور کا منہ اور طرح کا ہے، جیسی چیز ہوگی ویسے اُس کا منہ، تو جب بھی آپ کسی چیز کے منہ کا ذکر کریں گے، تو اگر آپ کو اُس چیز کی حقیقت معلوم ہے، تو آپ اُس کے منہ اور شکل کا تصور صحیح کرلیں گے، اور اگر اُس کی حقیقت آپ کو معلوم نہیں تو آپ صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ بس اس سے سمجھ جائیے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں، تو ہم اُس کی صفات کا تصور کس طرح سے کرلیں کہ وہ ایسا ہے، نہ اُس کے آنے کے متعلق سوچ سکتے ہیں، نہ اُس کے ہاتھ کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں، جب تک حقیقت معلوم نہ ہو صفات کا صحیح تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تو جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت آپ کے سامنے ذِکر ہو تو فوراً ذہن میں یوں آنا چاہیے جیسے اُس کی شان کے لائق ہے، ہم اُس کا تصور ذہن میں نہیں لا سکتے۔

پھر ایک ہے اُس صفت کا مبدأ، اور ایک ہوتا ہے منتہا، مبدأ کے بارے میں تو ہم یہی کہیں گے کہ جیسے اُس کی شان کے لائق ہے، منتہا کے بارے میں تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ''دیکھنا'' ہے، دیکھنا ایک صفت ہے، اب یہ دیکھنا ہوتا ہے آنکھ کے ذریعے سے، آنکھ اس کا مبدأ ہے، ہم یہ تو تصور نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ ایسی ہے اور اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، حالانکہ آنکھ کا لفظ استعمال ہوا ہے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا (سورۂ ہود: ۳۷) ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بناؤ۔ اب آنکھ کا تصور ہم نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ کیسی ہے؟ لیکن آنکھ کا منتہا کیا ہے؟ کہ جو چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں وہ علم میں آجائیں، مبصَرات جتنے ہیں وہ علم میں آجائیں، تو مبصَرات جتنے بھی ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں اور احاطے کے ساتھ، کوئی مبصر ایسا نہیں جو اللہ کی آنکھ سے چھپا ہوا ہو، یہ بات ہم کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سننے والا ہے۔ سمع کا ایک تو مبدأ ہے، کہ کان کے ذریعے سے سنا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سمیع ہے بصیر ہے سنتا ہے دیکھتا ہے، تو ہم کان کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتے، کہ اللہ تعالیٰ کا وہ سماعت کا آلہ کس طرح سے ہے، کیسے سنتا ہے، اس کے کان کیسے ہیں، سننے کی کیا صورت ہے؟ ہم یہ نہیں بیان کر سکتے، جیسے اللہ کی شان۔ لیکن اس کا منتہا کیا ہے کہ مسموعات جتنی ہیں وہ سب علم میں آجائیں، تو جتنی باتیں سننے کی ہیں سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، کوئی بات باہر نہیں ہے، اس طرح سے ہم اس کے منتہا کو ذِکر کر سکتے ہیں...... ایسے ہی یہ بات ہے جو آپ کے سامنے آرہی ہے، عرش کہتے ہیں تخت کو اور استواء کہتے ہیں قرار پکڑنے کو، اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا معنی ہوگیا کہ اُس نے تخت کے اوپر قرار پکڑا۔ اب یہاں یوں تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس طرح سے بیٹھ گیا جس طرح سے بادشاہ تخت پر بیٹھا کرتا ہے، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے، یہ تو اللہ کی شان جیسی ہے ویسے ہی اُس کا قرار پکڑنا ہے۔ لیکن ایک ہے اس کا اثر اور منتہا، وہ کیا؟ کہ جس مُلک کے اندر کوئی بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ اس مُلک میں حکومت اِسی کی ہے، ہندوستان میں بابر تخت نشین ہوگیا، کیا مطلب؟ کہ باقیوں کی حکومت ختم، بابر کی حکومت آگئی، اب اس مُلک میں حکم اُسی کا چلے گا، بابر کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوگیا، تو اب حکم اُسی کا چلے گا، اور اُس کے بعد اکبر تخت نشین

ہوگیا، شاہ جہاں تخت نشین ہوگیا، جہانگیر تخت نشین ہوگیا، تو تخت نشین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور اُس نے سنبھال لی، اور اس ملک کے اوپر اُس کی حکومت آگئی، اب اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کا کوئی حکم نہیں چلے گا، اس حدودِ مملکت کے اندر حاکم بادشاہ یہ ہے، تخت نشین ہونے کا اثر یہ ہوتا ہے۔ بڑے درجے میں نہ سمجھ سکو تو یہ جو آپ کے چیئر مین ہوتے ہیں، ''چیئر مین'' کا کیا مطلب؟ کُرسی نشین، ''چیئر'' کُرسی کو کہتے ہیں، ''مین'' آدمی کو کہتے ہیں، تو ''چیئر مین'' کا معنی ''کُرسی کا آدمی''، یعنی ایسا آدمی جو کُرسی پر بیٹھ گیا ہے، اور یہاں اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کہ جتنی بلدیہ کی حدود ہے اس میں کُرسی اس کو مل گئی، اور یہ کُرسی نشین ہوگیا، اب یہاں ساری کی ساری حکومت اس کی ہے، اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حکم نہیں چلے گا۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی کُرسی کا ذکر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے تخت کا ذکر ہے، تو انسانی محاورے کے تحت یہ بات بتادی گئی کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس کائنات کا بادشاہ اور تخت نشین بھی اللہ ہی ہے، اس کائنات کے اندر کُرسی پہ بیٹھنے والا بھی اللہ ہی ہے۔ اب اُس کی شکل تو ہم متعین نہیں کر سکتے، کہ عرش پہ کیسے بیٹھا ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کُرسی پر کس طرح سے بیٹھا ہے؟ ہم یہ متعین نہیں کر سکتے، لیکن اس کا جو اثر ہے کہ حدودِ مملکت کے اندر کسی دوسرے کا حکم نہیں چلے گا، بادشاہی صرف اللہ کی ہے، اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے ساتھ یہ چیز ثابت ہوگئی، کہ زمین وآسمان کو پیدا کرنے کے بعد کسی اور کو یہاں اس نے بادشاہ نہیں بنادیا، کہ پیدا میں نے کردی، حکم تم چلاؤ، ایسی بات نہیں ہے، پیدا کرنے کے بعد عرش پر مستوی خود ہوا، جب مستوی خود ہوا تو اس کائنات کے اندر حکومت اُسی کی چلتی ہے، حکم اُسی کا چلتا ہے، اس کے مقابلے میں کوئی بادشاہ نہیں، اور کوئی اس زمین وآسمان کے اندر تصرف کرنے والا نہیں، اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا یہ معنی ہے، بادشاہ اس کائنات کا، تخت نشین اس کائنات میں صرف اللہ ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔ ایک دفعہ صفاتِ الٰہیہ کے بارے میں وضاحت کردی، پھر جب بھی اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا ذکر آئے، یا اللہ کی کسی صفت کا ذکر آئے، تو میں صرف اتنا لفظ بولوں گا کہ جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے، تو آپ یہ ساری تقریر اس وقت مستحضر کرلینا۔

کائنات کا سارا نظام اللہ کے حکم کے تابع ہے

اب آگے اُس کے تصرفات کا ذکر شروع ہوا، کہ پیدا کرنے کے بعد جب اُس نے حکومت سنبھال لی، باگ ڈور ساری کائنات کی اُس کے ہاتھ میں ہے، اب زمین ہو، زمان ہو، آسمان ہو، آسمان وزمین کا درمیان ہو جو کچھ ہو سب میں احکام اُسی کے چلتے ہیں۔ یہ تو زمانے کی بات لیجئے کہ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ رات کو دن پر چڑھا دیتا ہے، دن کو رات پر چڑھا دیتا ہے، کبھی رات آگئی، کبھی دن آگیا، دن آگیا تو رات چھپ گئی، رات آگئی تو دن چھپ گیا، کس طرح سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے آتے ہیں، درمیان میں کوئی فرق نہیں کہ دن تو چلا جائے اور ابھی رات نہ آئے، یا رات چلی جائے اور ابھی دن نہ آئے، یہ ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور باری باری آ جا رہے ہیں کبھی رات آجاتی ہے دن چھپ جاتا ہے، کبھی دن آجاتا ہے رات غائب ہوجاتی ہے۔ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا بھاگتے دوڑتے ہوئے اُس کو طلب کرتے ہیں۔ یَطْلُبُ کی ضمیر لیل کی طرف، تو ''ہٗ'' ضمیر نہار کی طرف، یا ان کے برعکس۔ حَثِیْثًا کے معنی اس حال میں کہ اس کو برانگیختہ کیا ہوا ہے، بھڑکایا ہوا ہے یعنی دوڑتا ہوا آتا ہے، چاہے رات دوڑتی

ہوئی آتی ہے دِن کے پیچھے، چاہے دِن دوڑتا ہوا آتا ہے رات کے پیچھے۔ اس زمانے پر تصرف اللہ ہی کا ہے، اور پھر اس کائنات کے اندر جو اثرات نمایاں ہیں، سورج کے ہیں، چاند کے ہیں، ستاروں کے ہیں وہ سب کے سب اللہ نے اپنے حکم کے تابع کیے ہوئے ہیں، اللہ کے حکم کے ساتھ ہی سورج چڑھتا ہے غروب ہوتا ہے چلتا ہے، اسی طرح سے چانداور ستارے، اور ان کے اثرات جیسے سورج کے نکلنے سے روشنی آگئی، گرمی آگئی، فصلیں پکتی ہیں، پھل پکتے ہیں، چاند کے نکلنے کے ساتھ روشنی ہوتی ہے، ٹھنڈک ہوتی ہے، پھولوں میں رنگت پیدا ہوتی ہے، پھلوں میں مزہ آتا ہے، اور اس طرح سے ستاروں کے طلوع کرنے کے ساتھ زمین میں مختلف قسم کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، یہ سب اللہ کے حکم کے تحت ہے، نہ سورج کچھ کر سکتا ہے، نہ چاند کچھ کر سکتا ہے، جو کچھ ہے سب مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ یہ سب کے سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ سورج کو پُوجنے والے جنہوں نے سمجھا کہ سورج سب کچھ کرتا ہے وہ بھی احمق، اور اسی طرح سے چاند کی پُوجا کرنے والے بھی حقیقت سے جاہل، یہ تو سب اللہ نے کام میں لگا دیے ہیں۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ: خبردار! پیدا کرنا بھی اسی کے لئے ہے، اور حکم دینا بھی اسی کا کام ہے، خالق بھی وہی ہے اور حاکم بھی وہی ہے۔ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: برکت والا ہے اللہ، عظیم الشان ہے، تبارک تعالیٰ کے معنی میں ہے، بلند شان والا ہے، برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اِحسانات باری تعالیٰ کا تقاضا

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً: رکوع کی پچھلی آیت جو آپ کے سامنے گزری ہے، اُس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے سامنے اس حقیقت کو کھولا تھا کہ تمہارا رَبّ وہی ہے، اور رَبّ کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا تھا پیدا کرنے والا اور ضرورتیں پوری کرنے والا۔ آگے اپنی قدرت کے اظہار کے طور پر اُس نے ذکر کیا تھا کہ خالق وہی ہے، حاکم وہی ہے، اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد تخت نشین اس کائنات میں وہی ہے، سورج چاند ستارے جو کچھ ہیں سب اُسی کے مسخر کیے ہوئے ہیں، اُسی کے کام میں لگائے ہوئے ہیں، پیدا کرنا حکم دینا اُسی کا کام ہے، تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: عالمین کا رَبّ برکت والا ہے، علو والا ہے، عالی صفتوں والا ہے، پچھلی آیت میں یہ مضمون آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا۔ تو جب یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ خالق وہی، مالک وہی، بادشاہ وہی، پیدا کرنے والا وہی، اور ضرورتیں پوری کرنے والا وہی، تو اسی کا پھر آگے یہ تقاضا ہے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً۔ اُدْعُوْا کا معنی اگر لیا جائے پُکارنا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ جب بھی کسی قسم کی کوئی ضرورت پیش آجائے اپنے اُسی رَبّ کو پُکارو جو تمہارا خالق ہے، جو اس کائنات کا بادشاہ ہے، جس کا حکم اس کائنات کے اندر چلتا ہے اُسے پُکارو۔ اور اگر اُدْعُوْا کا معنی عبادت کرنا لے لیا جائے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ صرف اپنے رَبّ کی ہی عبادت کرو جو تمہیں پالنے والا ہے تمہاری ضرورتیں پوری کرنے والا ہے، کائنات کا بادشاہ ہے، جس کا تصرف اس کائنات کے اندر چلتا ہے، عبادت اُسی کی کرو۔ دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذکر کیا جا سکتا

ہے دعاء عبادت کے معنی میں بھی آتا ہے، حدیث شریف میں ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ''(۱) مخ کہتے ہیں یہ ہڈیوں کے اندر جو مغز ہوا کرتا ہے، جس کو عام طور پر اس علاقے میں ''مِخ'' سے تعبیر کرتے ہیں، ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ'' دُعا عبادت کا مغز ہے، عبادت کا اصل ہے۔ تو دُعا کا لفظ بول کر عبادت کا معنی لیا جاتا ہے، عبادت کرو اپنے رَبّ کی، یا پکارو اپنے رَبّ کو، دونوں طرح سے اس کا مفہوم ذِکر کرسکتے ہیں۔ کیوں پکارو؟ رَبَّکُم کے اندر اس کا جواب موجود ہے کہ رَبّ وہی ہے، ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے، اس لیے عبادت کا حق دار وہی، اور اپنی حاجات کے اندر پکارے جانے کا حق دار بھی وہی۔

آدابِ دُعا اور اس کے ثمرات

اور آگے یہ ادب ذکر کردیا تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً: تضرع: زاری کرنا۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ زاری کو ظاہر کرتے ہوئے، تاکہ خفیۃ کے ساتھ اس کا مقابلہ ظاہر ہوجائے۔ عاجزی نمایاں ہو تمہارے اس پکارنے میں، گڑگڑاہٹ ہو، اور یہ عاجزی کا نمایاں ہونا بدنی طور پر ظاہری طور پر بھی ہوتا ہے، اور لسانی طور پر بھی ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت آپ دُعا کریں تو الفاظ بھی ایسے استعمال کرو جس سے عاجزی نمایاں ہو، اور ہیئت بھی ایسی اختیار کرو جس سے آپ کا عجز اور آپ کا فقر اور آپ کا احتیاج نمایاں ہو، دونوں باتوں کو رعایت رکھی جائے تو تب جاکر دُعا صحیح طور پر ہوا کرتی ہے، الفاظ ایسے استعمال کرو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ تم واقعی اُس کے محتاج ہو، اور اُس کے بغیر تمہارا کوئی کام بنا نہیں سکتا، کوئی شخص بھی تمہاری ضرورت پوری نہیں کرسکتا، جب انسان کسی کا اس طرح سے محتاج ہوتا ہے تو پھر ظاہری طور بھی اس کے سامنے لجاجت کرتا ہے، بدن پر بھی ایسے اثرات نمایاں ہوتے ہیں، اور الفاظ بھی ایسے استعمال کرو جس سے اُس کی قدرت کا اعتراف ہو، اور اپنے عجز، درماندگی، اپنے ضعف، اپنی کمزوری اور اپنے احتیاج کا اقرار ہو، تب جاکر دُعا کے اندر حقیقت پیدا ہوتی ہے۔ اعلیٰ صورت تو اس کی نماز ہے کہ جس طرح سے آپ نماز پڑھتے ہیں، اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور نماز کے ضمن میں دُعائیں بھی ہیں، تو دیکھو! ہیئت بھی عاجزانہ ہے، ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، کبھی اُس کے سامنے جھکتے ہیں، کبھی ناک رگڑتے ہیں، یہ ساری کی ساری ہیئت ایسی ہے جو کہ آپ کے عجز و درماندگی اور بندگی پر دلالت کرتی ہے۔ پھر اُس کے اندر جو تسبیح کے کلمات پڑھے جاتے ہیں، دُعائیہ کلمات پڑھے جاتے ہیں، اُس میں بھی اللہ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اپنے فقر اور اپنے احتیاج کا اقرار ہوتا ہے، یہ نماز اللہ کی عبادت کی بہت اعلیٰ صورت ہے، جس میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور عام حالات میں اگر دُعا کرنی ہو تو یہ جو ہاتھ پھیلانا ہے، تو ہاتھ پھیلانا بھی اپنے عجز کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے، کہ جب کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا جائے تو گویا کہ انسان اپنے آپ کو اس کا محتاج ظاہر کردیتا ہے، اور اُس کی عظمت کا اعتراف کرلیتا ہے، اس لیے دُعا کا ادب یہ ہے کہ جب گڑگڑا کر عاجزی اور زاری کے ساتھ دُعا کی جاتی ہے، تو ہاتھ خُوب پھیلائے جاتے ہیں، حدیث شریف میں آتا کہ سرورِ کائنات ﷺ ہاتھ پھیلایا کرتے تھے، تو آپ کی بغلیں یعنی یہ حصے بیٹھنے والوں کو

---

(۱) ترمذی ۱۷۵/۲ ابواب الدعوات۔ مشکوۃ ۱۹۴/۱، کتاب الدعوات، فصل ثانی۔

نظر آجایا کرتے تھے،[۱] اور یہ نظر کس طرح سے آئیں گے؟ جب یوں ہاتھ پھیلیں گے تو تبھی جا کر یہ نظر آتے ہیں، یعنی آپ منبر پر بیٹھے ہوں، کسی اُونچی جگہ بیٹھے ہوں یا مجلس میں بیٹھے ہوں تو جب یوں ہاتھ پھیلیں گے تو یہ جگہ کھل جاتی ہے۔ اور اگر اس طرح سے دُعا کی جائے گی، یوں بازوؤں کو اپنے پہلوؤں کے ساتھ جوڑ کر، تو یہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھتے تھے، اتنے آپ نے ہاتھ پھیلائے، تو پھر وہ صورت اس پر صادق نہیں آتی۔ تو گڑگڑانے کی صورت میں جتنا ہاتھ پھیلائیں گے، ''كَالْمُسْتَطْعِمِ الْمِسْكِيْنِ''[۲] جیسے کھانا مانگنے والا مسکین ہاتھ پھیلایا کرتا ہے، دُعا کرتے ہوئے اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، آپ خود دیکھیں گے کہ جس وقت ہاتھ پھیلتے ہیں اتنا ہی انسان کے قلب پر اپنے ضعف اور عجز کا اثر زیادہ پڑتا ہے، ہاتھ پھیلنے کا یہ اثر ہے۔ اور الفاظ بھی حضور ﷺ اس قسم کے بیان کیا کرتے تھے کہ اس سے زیادہ عاجزی اور تواضع کے الفاظ کیا ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی دربار میں، جیسے ایک دُعا آپ ﷺ کی احادیث میں نقل کی گئی ہے (الفاظ دیکھئے!) ''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ اَمْرِيْ. اَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ، الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ، الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ. اَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَاَبْتَهِلُ اِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ، وَاَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ، دُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ، وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ، وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ، وَرَغِمَ لَكَ اَنْفُهٗ''[۳] دیکھو! اِنتہا ہے عاجزی کے الفاظ کی۔ اے اللہ! تُو میری کلام کو سنتا ہے، تُو میرے حال کو دیکھتا ہے، میرا ظاہر باطن تیرے سامنے ہے، کوئی چیز تجھ پہ مخفی نہیں، میں تجھ سے ایسے مانگتا ہوں جس طرح سے مسکین مانگا کرتا ہے، اور میں تیرے سامنے ایسے گڑگڑاتا ہوں جیسے گناہگار، درماندہ گڑگڑاتا ہے، اور میں تجھے اس طرح سے پکارتا ہوں جس طرح سے کوئی اندھا جوڈرا ہوا ہو کسی بات سے، وہ کسی کو اپنی مدد کو پکارتا ہے۔ اے اللہ! میں اس طرح سے تجھے پکارتا ہو جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہے، جس کے آنسو تیرے سامنے بہہ رہے ہیں، جس کا جسم بھی تیرے سامنے پست ہو گیا، جس کا ناک تیرے سامنے رگڑا ہوا ہے، میں ایسے شخص کی طرح تجھے پکارتا ہوں، یہ لفظ ہیں کتنے زاری کے ہے! اور کتنے تضرع اور انکساری کے ہیں! تو الفاظ بھی اس قسم کے استعمال کیے جائیں، اور پھر ساتھ ساتھ ہاتھ بھی پھیلے ہوئے ہوں، اور چہرے اور بدن پر بھی عاجزی نمایاں ہو تو یہ ہے تَضَرُّع، تو جب اس طرح سے اپنے آپ کو محتاج قرار دے کر، اپنے آپ کو عاجز ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے یہ سمجھتے ہوئے کہ ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے، اور اسی نے وعدہ کیا ہوا ہے ہماری ضرورتیں پوری کرنے کا، تو جب اس کیفیت کے تحت کی دُعا جاتی ہے، یعنی یہ کیفیت حقیقتاً طاری کر کے، صرف لفظوں لفظوں کی بات نہیں، کہ اکڑے ہوئے تو ہو رانگڑوں کی طرح، اور اللہ تعالیٰ سے دُعا ایسے کرو جیسے کسی کو جھڑکیاں دی جاتی ہیں، وہ بات نہیں ہے۔ بدن پر بھی عجز اور انکسار نمایاں ہو، اور الفاظ بھی بالکل اس قسم کے ہوں جو کہ ضعف و عجز اور مسکنت پر دلالت

(۱) مسلم ۱/۲۹۳ باب رفع الیدین بالدعاء/ مشکوۃ ۱۹۶/۱، کتاب الدعوات، فصل ثالث، عن انس/ نیز بخاری ۹۳۸/۲ باب رفع الایدی فی الدعاء۔
(۲) سنن کبریٰ بیہقی ۱۹۰/۵ ــ ولفظ الحدیث عن ابن عباس قال رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَدْعُوْ بِعَرَفَةَ وَيَدَاهُ اِلٰى صَدْرِهٖ كَالْمُسْتَطْعِمِ الْمِسْكِيْنِ.
(۳) فضل عشر ذی الحجۃ للطبرانی، رقم ۵۴/ احادیث مختارہ للمقدسی ۳۶/۱۱/ الدعاء للطبرانی رقم ۸۷۷۔

کرنے والے ہیں، جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے تو پھر حدیث شریف میں آتا ہے: ''اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ'' تمہارا ربّ بڑا باحیا ہے، بڑا کریم ہے، ''يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ اَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا''(۱) اس کو حیا آتی ہے کہ جس وقت اس کا بندہ اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو اُن ہاتھوں کو خالی واپس کردے، خالی واپس کرنے سے وہ شرماتا ہے۔ تو اس میں یہی بتایا کہ جس وقت بندہ بندہ ہونے کی حیثیت میں ربّ کو ''ربّ'' سمجھ کر ہاتھ پھیلائے پھر اللہ خالی واپس نہیں کرتا، پھر اُس میں کچھ نہ کچھ رحمت آہی جاتی ہے، ''اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ'' تمہارا ربّ بڑا باحیا ہے، بڑا کرم والا ہے، اُس کو بندے سے حیا آتی ہے جس وقت بندہ اپنی ہتھیلیاں اُس کے سامنے پھیلاتا ہے، حیا کس بات سے آتی ہے؟ کہ بندوں کو وہ خالی واپس کردے، اپنے بندے کے ہاتھ خالی واپس کردے اس سے اُس کو حیا آتی ہے۔ تو پھر قبولیت بہت قریب ہوجاتی ہے جس وقت انسان اپنے دل اور بدن پر یہ کیفیت طاری کرکے یوں ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگتا ہے۔ وَّخُفْيَةً کے اندر ذکر کردیا کہ چپکے چپکے پکارو، چیخنے چلّانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ دُعا جو چپکے چپکے ہوا کرتی ہے وہ رِیا سے بھی دُور ہوتی ہے، اور اس میں بھی انسان کی تواضع اور انکسار زیادہ نمایاں ہے، ورنہ یہ جو چیخنا ہے، چیخ چیخ کر جو دُعا کی جاتی ہے، پکارا جاتا ہے اس کی ممانعت حدیث شریف میں آتی ہے، چیخنے سے مراد ہے ایسے زور لگا لگا کر بلاوجہ شور مچانا، جیسے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تکبیر بہت بلند آواز سے کہی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے، تم اس کو پکار رہے ہو جو تمہارے بالکل قریب ہے اور تمہاری ہر بات کو سنتا ہے۔(۲) اس لیے اعتدال کے ساتھ (دُعا ہونی چاہیے)، یہ جہراً دُعا کرنا کوئی ممنوع بھی نہیں، لیکن ایسے جہر کے ساتھ کہ جس میں وہی تواضع اور انکسار ہو، کچھ آواز اگر بلند ہوجائے اعتدال کے ساتھ تو اس کا کوئی حرج نہیں، خاص طور پر اجتماعی دُعاؤں میں جہر کرلیا جائے تاکہ دوسروں کو پتا چل جائے کہ ہم کیا دُعا کررہے ہیں، اور دوسرے بھی اس کو سمجھ کر اس کے اُوپر ''آمین'' کہیں، تو جہر جائز ہے، تعاملِ اُمت ہے، اکابر کا معمول ہے۔ لیکن چیخنا چلّانا یہ کسی صورت میں دُرست نہیں ہے۔ خُفْيَةً کا معنی یہ ہے کہ چپکے چپکے، جیسے حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا سورۂ مریم میں جہاں ذکر ہوئی ہے، وہاں لفظ یہی آئے ہیں: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (سورۂ مریم: ۳) جب اس نے ربّ کو چپکے چپکے پکارا۔ تو چپکے چپکے پکارنا یہ بھی دُعا کا ایک ادب ہے، کہ زیادہ چیخا اور چلّایا نہ جائے۔

دُعا میں اِعتداء کیا ہے؟

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ: بے شک وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو دُعا کے اندر بھی حد سے بڑھنا نہیں چاہیے، ایسی چیز نہ مانگو جس کا دینا اللہ کی عادت نہیں یا وہ خلافِ شریعت ہے، گناہ کی دُعا نہ کرو، ایسی دُعا کرو کہ جس کا دینا اللہ کی عادت ہے، اور ظاہر کے اسباب اُس کی تائید کرتے ہیں، اور جس کا دینا اللہ کی عادت نہیں ہے، وہ نہ مانگو، خلافِ شریعت چیز نہ مانگو، گناہ کی دُعا نہ کرو، اس قسم کی چیزیں جو ہیں وہ سب ''اِعتداء'' میں داخل ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ

---

(۱) مشکوۃ ۱/۱۹۵، کتاب الدعوات، فصل ثانی، عن سلمان۔ ابن ماجہ ص ۲۷۵ باب رفع الیدین فی الدعاء/ ترمذی ۲/۱۹۶، ابواب الدعوات کا تقریباً آخر۔

(۲) بخاری ۱/۴۲۰ باب ما یکرہ من رفع الصوت فی التکبیر۔ مشکوۃ ۱/۲۰۱ باب ثواب التسبیح، فصل اول۔

یہ حضور ﷺ کے ایک صحابی ہیں، اُن کا بیٹا دُعا کر رہا تھا ایک دفعہ، کہنے لگا کہ اے اللہ! میں تجھ سے جنّت کی دائیں جانب سفید محل تجھ سے مانگتا ہوں، تو حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دیکھو! ایسی دُعا نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے جنّت مانگو، پھر وہ جہاں ٹھہرا دے اُس کی مرضی، یہ تعیین کرنا کہ میں جنّت مانگتا ہوں، اور جو دائیں جانب سفید محل ہے وہ مانگتا ہوں، اس قسم کی تعیین کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں، بس اللہ سے جنّت مانگو۔ پھر کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے کہ اس اُمت میں کچھ لوگ آئیں گے جو دُعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔[1] یا اب اگر کوئی شخص دُعا کرنی شروع کر دے کہ اے اللہ! مجھے نبی بنادے۔ یہ خلافِ شریعت ہے، کیونکہ اب نبی بنانا اللہ کی عادت ختم ہوگئی۔ یا اس قسم کے اسبابِ ظاہری کی بالکل موافقت نہ کریں، اور شادی کریں نہ، اور بیٹھے ساری رات اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اولاد دے دے، یہ باتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عادت کے خلاف ہیں، پہلے اُس کے مطابق کچھ اسباب حاصل کیجئے، یا اسباب حاصل ہونے کی دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اسباب پیدا کر دے، اور اس کے بعد پھر اپنا مطلوب مانگئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس دُنیا کے اندر ظاہر ہوتی ہے تو کسی درجے میں اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتی ہے، اور اس کے خلاف کرنا یہ سب ''اِعتداء'' ہے۔

اِصلاح کے بعد فساد فی الارض کی ممانعت

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا: زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ مچاؤ۔ یعنی ڈاکا زنی، گڑبڑ، زمین کو ویران اور اُجاڑنے کی کوشش کرنا، اسی طرح معصیت پھیلانا، نیکی کی مخالفت کرنا یہ سب اِفساد فی الارض ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ اصلاحی قانون نافذ کرتے ہیں، اور ان اصلاحی قانونوں کے نافذ ہونے کے بعد ان کی خلاف ورزی کرنا یا خلاف ورزی پر اُکسانا یہ سب لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ کے تحت منع ہے۔ ''زمین میں فساد نہ مچاؤ اس کی اصلاح کے بعد۔''

نفع ونقصان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا یہ دوسری کیفیت آگئی۔ پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے...... یہ بہت جامع لفظ ہیں، ذرا ان پر توجہ فرمالیجئے...... آپ اگر اپنے حالات پر غور کریں گے، تو دو قسم کے حالات ہی آپ کی زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں، بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے آپ ڈرتے ہیں اور بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان چیزوں سے بچنے کے لیے آپ کو کسی سہارے کی ضرورت ہے، اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو آپ چاہتے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ یہ ہمیں حاصل ہو جائیں، دو ہی قسم کے حالات ہوتے ہیں، اور یہ دونوں قسم کے حالات ہی انسان کی کمزوری ہے، ابلیس جب انسان کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے پھیرتا ہے، تو ان دو راستوں میں سے کسی ایک راستے سے گھماتا ہے، اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے، آپ ایک بات سے ڈر رہے ہیں تو کوئی غلط کار آدمی یا شیطان آپ کے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ اس نقصان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم یوں کرلو، اور آپ اس خوف کی بنا پر اس طرح سے کرلیں گے، جیسے ایک بچہ بیمار ہوگیا، ماں باپ کو اندیشہ ہے کہ کہیں مر نہ جائے، کوئی شیطان آئے گا، کہے گا فلاں قبر

(۱) ابو داؤد ج۱ ص ۱۳ باب الاسراف فی الماء/ ابن ماجہ ۱/ ۲۷۵ باب کراہیۃ الاعتداء فی الدعاء/ مشکوۃ ۱/ ۴۷ باب سنن الوضوء، فصل ثانی۔

پر جا کر پیر کے نام پر چڑھاوا چڑھا آؤ، بچہ بچ جائے گا، اب بچے کی موت سے ڈر کر ماں باپ چلے جاتے ہیں قبروں پر، جا کر شرک کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک چیز کی آپ کو چاہت ہے مثلاً رزق کی چاہت ہے، اولاد کی چاہت ہے، صحت کی چاہت ہے، تو ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے شیطان آپ کو طمع دلاتا ہے، کہ یوں کرلو تمہیں اولاد مل جائے گی، یوں کرلو تمہیں عزت مل جائے گی، یوں کرلو یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ تو انسان کی طبیعت کے اندر بعض چیزوں کے حاصل کرنے کا جذبہ ہے، اور بعض چیزوں سے بچنے کا جذبہ ہے، اور یہی انسان کی کمزوری ہے، جب انسان متاثر ہوتا ہے انہی دو راستوں سے متاثر ہوتا ہے، یا خوف کے راستے سے یا اُمید کے راستے سے، اور شیطان جب انسان کو بہکاتا ہے انہی دو راستوں میں سے کسی ایک راستے سے بہکائے گا، آپ سے کہے گا کہ یہ کام جو کر رہے ہو بھائی! اس کے نتیجے میں تو تمہیں خسارہ پڑ جائے گا، یہ کام چھوڑ دو۔ اور ایک غلط کام کی ترغیب دے گا، اور کہے گا یوں کرلو دیکھو! تمہیں یہ چیز حاصل ہو جائے گی، بہکانے کا انداز یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر بار بار اس چیز کو دُہرایا، اور انسانوں کے ذہن کے اندر یہ بات ڈالی ہے کہ نفع ہو یا نقصان یہ اللہ کے قبضے میں ہے، کسی دوسرے کے قبضے میں نہیں، اس لیے اگر تم کسی چیز سے ڈر رہے ہو تو اسے پکارو، اور اگر تم کسی چیز کی اُمید رکھ رہے ہو تو اسے پکارو، خوف کی حالت میں بھی تمہارا کارساز وہی ہے، وہی تمہیں اس خوف کی چیز سے بچا سکتا ہے، اور اُمید کی حالت میں بھی تمہارا سہارا وہی ہے، کہ جو تم چاہتے ہو اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، اسے پکارو، وہی دے سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ تو جو لوگ خوف اور طمع دونوں حالتوں میں اللہ کی طرف رُجوع کرتے ہیں یہی محسنین ہیں، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کیا کرتے ہیں۔ اور اگر ڈر کر کسی دوسرے کے دروازے پر چلے گئے تو بھی تم توحید کے راستے سے ہٹ گئے، اور اگر لالچ میں آ کر کسی دوسرے دروازے پر چلے گئے تو بھی تم توحید سے ہٹ گئے، موحد وہی ہے کہ لالچ اور خوف کسی چیز سے متاثر ہو کر اپنے صحیح اُصول کو نہ چھوڑے، بلکہ دونوں صورتوں میں اُس کا رُجحان اللہ تعالیٰ کی طرف رہنا چاہیے۔ دیکھیے! ''گلستاں'' وہ کتاب ہے جو ابتدا میں آپ کو پڑھائی جاتی ہے، لیکن اس کو آپ اچھی طرح سے اِس دور میں سمجھتے نہیں، اس میں بڑے حقائق ہیں، شیخ (سعدی رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

موحد چہ در پائے ریزی زرش — چہ شمشیرِ ہندی نہی بر سرش

امید وہراسش نباشد زِکس — بریں است بنیادِ توحید و بس

''چہ چہ'' فقرے میں دو دفعہ آ جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے برابری، جیسے ''گلستاں'' (باب اول) کے شروع شروع میں پڑھا تھا:

چو آہنگ رفتن کند جانِ پاک — چہ برتخت مُردن چہ بر روئے خاک

کہ جس وقت یہ جانِ پاک جانے کا ارادہ کرلے تو تو پھر تخت پہ مرنا یا زمین پہ مرنا برابر ہے۔ تو برابری کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے ''چہ چہ'' دو دفعہ آجایا کرتا ہے، یہاں بھی اسی طرح سے ہے کہ موحد کے سامنے اس کے پاؤں میں سونے کے ڈھیر لگادو، یا اس کے سر کے اوپر تلوار لے کر کھڑے ہو جاؤ، اس کو نہ کسی سے اُمید ہوتی ہے نہ کسی سے ڈر ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اسی پہ ہے کہ نہ کسی سے اُمید ہو اور نہ کسی سے خوف ہو (باب ۸ کا آخر)۔ اگر کوئی سر پر تلوار لیے کھڑا ہے تو بھی تمہارے دل کو یقین ہو کہ اللہ چاہے گا تو موت

آئے گی ورنہ یہ ہمارا کچھ نہیں کرسکتا، اور اگر تمہارے سامنے کوئی سونے کے ڈھیر لگادے تو آپ اس کوٹھوکر ماردیں کہ اللہ کے حکم کے خلاف یہ بھی کوئی چیز نہیں ہے، ہم اتنا سونے کا ڈھیر بھی لینے کے لیے تیار نہیں۔ اس طرح سے پختگی اگر دل میں آجائے، کہ انسان نہ لالچ سے متاثر ہو، نہ خوف سے متاثر ہو، تو یہ ہوتا ہے صحیح طور پر موحد ''بریں است بنیادِ توحید وبس!'' اور قرآنِ کریم نے یہی بات ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی ہے، کہ نفع نقصان کا مختار اُسے ہی جانو، وہی تمہیں بچا سکتا ہے، وہی تمہیں نفع پہنچا سکتا ہے، جب تک اپنے دل کو ان دو باتوں پر مضبوط نہیں کروگے، اُس وقت تک اندیشہ ہے کہ شیطان تمہیں یا ڈرا کر بہکالے گا، یا طمع دے کر بہکالے گا۔

ایسے ہی ''گلستاں'' میں آپ نے پڑھا ہوگا، کہ حضرت شیخ (سعدی رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

گر گزندت رسد ز خلق مرنج کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

اگر مخلوق کی طرف سے تجھے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو رنجیدہ نہ ہوا کر، نہ تو مخلوق کی طرف سے راحت پہنچا کرتی ہے نہ مخلوق کی طرف سے رنج پہنچا کرتا ہے۔

از خدا داں خلافِ دشمن و دوست کہ دلِ ہر دو در تصرفِ اوست

کتنا پیارا نکتہ واضح کیا۔ چاہے تمہیں مخلوق کی وساطت سے راحت پہنچے، چاہے تمہیں مخلوق کی وساطت سے رنج پہنچے، اس کو اللہ کی طرف سے جان، دوست اور دشمن کی طرف سے نہ سمجھ، اگر نفع دوست کے ذریعے سے پہنچا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ تجھے دوست نے نفع پہنچایا ہے، تکلیف دشمن کی طرف سے پہنچی ہے تو یہ نہ سمجھ کہ تجھے تکلیف دشمن نے پہنچائی ہے، کہ ''دلِ ہر دو در تصرف اوست'' کہ دونوں کے دِلوں پر قبضہ اسی کا ہے، اس نے دوست کا دِل تیرے پہ مہربان کردیا، تجھے فائدہ پہنچ گیا، دشمن کا دِل تیرے خلاف کردیا، اس نے تجھے نقصان پہنچادیا، تو اصل تو رسّی اُدھر سے ہلتی ہے، اگر کسی کے دل میں تمہاری محبت ڈال دے تو دوستی لگ جائے گی، اگر کسی دل میں تمہاری عداوت ڈال دے تو دشمنی ہوجائے گی، دِلوں کی رسّی، دِلوں کی تار اسی کے ہاتھ میں ہے، چاہے کسی کو آپ کا موافق کردے چاہے کسی کو آپ کا مخالف کردے۔

اس بات کو سمجھانے کے لیے آگے (شیخ سعدی رحمہ اللہ) ایک مثال دیتے ہیں:

گرچہ تیر از کماں ہمی گزرد از کماں دار بیند اہلِ خرد

کہ ایک آدمی تیر چلاتا ہے (اس زمانے میں یہی تھے، گولیاں، پستول اور رائفلیں تو ہوتی نہیں تھیں) تو ایک آدمی تیر مارتا ہے جس سے دوسرا آدمی زخمی ہوگیا، وہ کہتے ہیں کہ ظاہری طور پر تیر اگرچہ کمان سے نکل کر آیا ہے، لیکن عقل مند آدمی کمان والے ہاتھ کو دیکھا کرتا ہے، کمان کو نہیں دیکھا کرتا (باب ا، حکایت ۲۵)۔ نکلا تو یہ کمان سے ہے اس میں کوئی شک نہیں، لیکن جس نے چلایا ہے عقل مند آدمی اس کو دیکھا کرتا ہے۔ اسی طرح سے دوست دشمن انسان جتنے بھی ہیں، آپ کے نفع نقصان کے لیے یہ تو اللہ کی کمانیں ہیں، اور ان کو چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے کبھی اس بات سے متاثر ہو کر اپنے اُصول کو نہ چھوڑیئے کہ فلاں شخص نے چونکہ ہم پر احسان کیا ہے، فلاں نے نفع کیا ہے، لہٰذا ہم اُس کی بات موڑ نہیں سکتے، جو غلط بات کہے مان لو ایسی بات نہیں ہے، کہو، حقیقت میں نفع اللہ نے پہنچایا، اللہ کے حکم کے مطابق تو کسی کی بات مانی جاسکتی ہے، اللہ کے حکم کے خلاف نہیں مانی جاسکتی۔ اور اسی طرح سے اگر کوئی

نقصان پہنچا بیٹھا، تو اس سے متاثر ہو کر آپ اس کو سجدہ کر دیں اور اُس کے سامنے جھک جائیں، بالکل نہیں، کہو کہ نقصان ہمارے مقدر میں اللہ نے رکھا تھا بس اس کے ذریعے سے کروادیا، اگر اللہ نہ چاہتا تو یہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اس لیے نہ ڈر کر کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہ لالچ میں آ کر کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت۔ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا: ڈر ہو تو اسی کا پکارو، اُمید ہو تو اُسی کو پکارو۔

''إحسان فی العبادۃ'' کا مفہوم

جن کے دل میں کیفیت آجایا کرتی ہے کہ خوف اور اُمید دونوں صورتوں میں ان کا رجحان اللہ کی طرف ہوتا ہے ان کو کہتے ہیں محسنین، یہ ہیں نیکوکار، احسان کی صفت ان کو حاصل ہے، اللہ کی رحمت انہی کے قریب ہے، اللہ کی رحمت کو یہی حاصل کر سکتے ہیں۔ قریب کا لفظ یہ فعیل کے وزن پر آ گیا، مذکر مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ میں بظاہر جو فرق آپ کو نظر آتا ہے کہ رَحْمَتَ اللّٰهِ مؤنث ہے اور قَرِيْبٌ مذکر ہے، تو یہ مؤنث کی خبر مذکر کیسے آ گئی، اس کا جواب عرض کر رہا ہوں، کہ فعیل کا وزن مذکر مؤنث دونوں کے لیے آجایا کرتا ہے، اور ویسے بھی رحمت مؤنث حقیقی نہیں ہے۔ محسنین کا مفہوم بھی آ گیا، محسنین: إحسان کرنے والے، صفت احسان اختیار کرنے والے، اور صفت احسان کا لفظی معنی ہوا کرتا ہے ہر کام کو اچھی طرح سے کرنا، اور ''إحسان فی العبادۃ'' کی تفسیر حدیث شریف میں آتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ سے جبریل علیہ السلام نے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ ''مَا الْاِحْسَانُ؟'' إحسان کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ''[1] اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ اللہ آنکھوں کے سامنے ہے، اتنے یقین کے ساتھ اور اتنے اعتماد کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یہ ہے إحسان فی العبادت۔

بارش کے نظام میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور إحسان

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ: اللہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہوائیں جو اُس کی رحمت سے پہلے بشارت دینے والی ہیں۔ عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ بارش آنے سے قبل کچھ ہوائیں چلتی ہیں، جس سے انسان اندازہ کر لیتا ہے کہ اب بارش آنے والی ہے، اُن کو اللہ تعالیٰ نے مبشرات قرار دیا، وہ چلتی ہیں تو انسان خوش ہو جاتا ہے کہ اب بارش ہوگی، اور بارش کے ساتھ اس زمین کو تازگی ملے گی اور ہماری ضرورتیں پوری ہوں گی، اور ان کے آنے سے ایک تنبیہ بھی ہو جاتی ہے کہ بارش ہونے والی ہے اپنے آپ کو سنبھال لو، سامان باہر پڑا ہے تو اٹھا لو، کوئی دوسری چیز سنبھالنی ہے، تو اس کو سنبھال لینا چاہیے یہ بھی ایک اللہ کی رحمت ہے۔ اور اس کا تصرف جس طرح سے چلتا ہے اُس کی یہ ایک تصویر ہے، بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ ہوائیں بوجھل بادلوں کو اٹھا لاتی ہیں، یہ ظاہری طور پر بارش ہونے کا اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے، یہ بادل جو آیا کرتے ہیں اصل کے اعتبار سے یہ بخارات ہیں، جو سمندر یا دریاؤں سے اٹھتے ہیں، جس طرح سے آپ چولہے کے اوپر دیگچی رکھ کر آگ جلاتے ہیں تو اس میں سے بھاپ اٹھتی ہے، تو کچھ حرارت کا اثر پڑتا ہے سورج کی گرمی ہوتی ہے، یا کوئی داخلی خارجی حرارت کے ساتھ وہ بخارات اٹھتے ہیں،

---

(۱) صحیح البخاری ص ۱۲ باب سؤال جبریل النبی ﷺ / مشکوٰۃ کی دوسری حدیث۔

دریاؤں سے اور سمندروں سے، اُن کے اندر پانی ہوتا ہے، جس طرح سے بھاپ میں بھی پانی ہوتا ہے، آپ ڈھکنا اُوپر رکھے ہوتے ہیں تو دیکھو! ڈھکنے کے ساتھ سارا پانی ہی پانی لگا ہوا ہوتا ہے، وہ ہوائیں اللہ کا حکم جدھر ہوتا ہے اُدھر کو وہ اُن بادلوں کو لے جاتی ہیں، اور جتنا اللہ کا حکم ہوتا ہے اتنا وہ بادل جا کر برس پڑتے ہیں، تو یہ اللہ تعالیٰ کے بھیجنے کے ساتھ اور اللہ کی قدرت کے ساتھ ہی سب کچھ ہوتا ہے، اگر بخارات نہ اُٹھیں یا ہوائیں اُن کو نہ لے کر آئیں تو بارش کسی صورت میں بھی نہیں ہوسکتی، ہزار جتن کرلو ایک قطرہ نہیں برس سکتا۔ ''حتیٰ کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بوجھل بادلوں کو تو چلا دیتے ہیں ہم اس بادل کو کسی میت بلد کی طرف، میت علاقے کی طرف، بنجر علاقے کی طرف'' زمین کی موت یہی ہے کہ اس میں نباتات نہ ہو، خشک پڑی ہوئی زمین یہ مردہ زمین ہے۔ ''مُردہ علاقے کی طرف ہم اس کو چلا دیتے ہیں'' فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ پھر ہم اس بادل کے ذریعے سے پانی اتارتے ہیں۔ یہ نقشے آپ دیکھتے رہتے ہیں، چونکہ روز پیش آتے ہیں اس لیے آپ کی توجہ نہیں ہوتی، ورنہ اس میں اللہ کی بڑی قدرت نمایاں ہے، پانی کس طرح سے قطرہ قطرہ کر کے برستا ہے، اگر پرنالے کی طرح پانی چھوٹ جایا کرتا تو بڑے بڑے محلات بھی سامنے مسمار ہوجایا کرتے، اور جس کے سر کے اوپر منوں پانی گرتا تو اُس کی کھوپڑی ٹوٹ جایا کرتی، زمین کے اندر گڑھے پڑ جایا کرتے، لیکن کیسے اللہ تعالیٰ قطرہ قطرہ کر کے اتارتے ہیں، جس کو آدمی بھی برداشت کرلیتا ہے، مکان بھی برداشت کرلیتے ہیں، زمین بھی برداشت کرلیتی ہے، نہ زمین میں گڑھے پڑتے ہیں، نہ مکان گرتے ہیں، نہ کوئی دوسرا نقصان ہوتا ہے، قطرہ قطرہ کر کے اترتا ہے، جس طرح سے چھلنی میں چھن چھن کر پانی آرہا ہے، صاف ستھرا۔ ''پھر اس کے ذریعے سے ہم ہر قسم کے میوے پیدا کرتے ہیں''۔ یہی مٹی کرکری سی جس میں کوئی مزہ نہیں تھا، اور بالکل بے سود پڑی ہوئی تھی، مردہ بنجر، جس وقت آسمان سے پانی برسا تو کس قسم کی اس میں فصلیں اُگتی ہیں، پھول اُگتے ہیں، پھل اُگتے ہیں، اور ہر قسم کے غلہ جات اُگتے ہیں، گویا کہ پانی کے اُترتے ہی اس خشک مردہ مٹی کے اندر جان پڑگئی اور کھیت لہلہانے لگ گئے۔ تو اس میں جہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے احسانات بھی ہیں، آج کتنے قسم کے پھل ہیں جو آپ استعمال کرتے ہیں، کتنے قسم کے غلے ہیں جو آپ کھاتے ہیں، اور کتنے قسم کے پھول ہیں جو آپ سونگھتے ہیں، اور یہ سارے کے سارے آپ کو اگر ملتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر بارش ہونے کے بعد ملتے ہیں، اور اگر اللہ کی طرف سے پانی نہ برسے تو یہ زمین آپ کو سوائے خاک کے کچھ نہیں دے سکتی، یہ پانی برستا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوتی ہے، کہ یہ سب کچھ دُنیا کے اندر رونق آجاتی ہے۔ تو قدرت بھی ہے اور قدرت کے ساتھ ساتھ احسان بھی ہے۔

اِحیائے اَرض کو اَحیائے موتیٰ کے لئے بطور مثال ذِکر کیا گیا ہے

لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھو! قرآنِ کریم کی جس طرح سے عادت ہے، میں نے آپ کے سامنے واضح کیا تھا، کہ یہ اُصول کو مختلف انداز کے ساتھ واضح کرتا چلا جاتا ہے، بنیادی طور پر اسلام کے تین اُصول ہیں توحید رسالت معاد، موقع بہ موقع ان کی وضاحت ہوتی جاتی ہے۔ اب یہ زمین کی مثال جو سامنے آئی تو فوراً اس سے منتقل کردیا گیا آپ کو آخرت کے عقیدے کی طرف، كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى کہ دیکھو! جس طرح سے ہم بنجر زمینوں کو آباد کردیتے ہیں، خشک مٹی میں جان ڈال کر اس میں کیسے کیسے پودے

کیسے کیسے پھل اور پھول پیدا کر دیتے ہیں، مرنے کے بعد اسی طرح سے ہم مردوں کو دوبارہ زندہ کر دیں گے، یعنی جیسے روز آپ کے سامنے زمین مردہ بھی ہوتی ہے اور زندہ بھی ہوتی ہے، اسی طرح سے ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے، تمہیں یہی اشکال ہے کہ مرنے کے بعد ہم مٹی ہو جائیں گے، تو پھر دوبارہ زندگی کس طرح سے آئے گی؟ جس طرح سے یہ مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ نبات اُگتی ہے، اسی طرح سے مٹی ہونے کے بعد ہم تمہیں دوبارہ کھڑا کر لیں گے، گویا کہ اس اِحیاءُ الارض کو اِحیائے موتی کے لیے بطور مثال کے ذکر کر دیا، کہ اگر اس حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہو تو زمین کے حالات کو ہی دیکھتے رہو، موت وحیات اس کے اوپر یکے بعد دیگرے کیسے طاری ہوتی ہے، اسی طرح سے تم پہلے مٹی تھے، تم پہلے مردہ تھے بے جان تھے، ہم نے تمہیں زندگی دی، زندگی دینے کے بعد ہم پھر اسی طرح سے تمہیں مٹی کر دیں گے، مٹی کرنے کے بعد پھر دوبارہ زندگی دے دیں گے، یہ روز مرہ کے واقعات آپ کے سامنے ہیں، زمین مردہ ہوتی ہے، پھر زندہ ہوتی ہے، پھر مردہ ہوتی ہے، پھر زندہ ہو جاتی ہے، كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے سامنے یہ مثالیں واضح کرتے ہیں، تاکہ تمہیں یاددہانی ہو جائے، تم ان باتوں کو یاد رکھو اور ان سے نصیحت پکڑو۔

بارش برسنے کے بعد زمین کے مختلف حالات

پھر اس بارش کے اترنے کے بعد زمین کے حالات مختلف ہو گئے، بعض علاقے زرخیز ہوتے ہیں، اُسے بلدِ طیب کے ساتھ تعبیر کیا، طیب سے یہاں عمدہ زرخیز علاقہ مراد ہے، اس پر بارش ہوئی، نباتات اُگی اللہ کے اذن کے ساتھ، بہت کثرت کے ساتھ اُگی، بہت مفید پھل پھول اس میں آ گئے، اور ایک علاقہ خَبُثَ کا مصداق ہے، یعنی خبیث، ردّی، شوریلا، نمکین، جس کی مٹی میں حیات قبول کرنے کی صلاحیت نہیں، وہی بارش وہاں بھی ہوئی، لیکن لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا اَى لَا يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ: لَا يَخْرُجُ کا فاعل نَبَاتُهٗ ہے، ضمیر نباتہ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور نباتات نہیں نکلتی مگر بہت قلیل اور ردّی، یعنی اوّل تو نکلتی نہیں، اور اگر نکلے بھی تو کسی کام کی نہیں ہوتی، کانٹے دار جھاڑیاں اُگ پڑیں گی، بیکار سے پودے اُگ کھڑے ہوں گے، جس طرح سے شوریلی زمین میں ہوتا ہے۔ تو جب اس زمین کے اندر اللہ نے استعداد نہیں رکھی تھی، تو اس وقت بارش ہونے کے بعد اس میں سوائے کانٹے دار بے کار جھاڑیوں کے اس میں کچھ بھی نہیں پیدا ہوتا۔ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ہم اسی طرح سے تمہاری طرف پھیر پھیر کر آیات کو بیان کرتے ہیں، تاکہ تم شکر کرو اور قدر کرو۔

ظاہری بارش زمین پر اور باطنی بارش قلوب پر

اس مثال میں بھی ایک حقیقت نمایاں کر دی کہ جیسے بارش تو ایک ہی ہے، جو آسمان کی طرف سے اترتی ہے اور زمین پر برستی ہے، لیکن اس کے باوجود زمین کی صلاحیتوں کی وجہ سے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سے اللہ کی طرف سے یہ ہدایت، یہ قرآنِ کریم، یہ قرآنِ کریم کی آیات، یہ بھی اللہ کی رحمت بارش کی طرح برستی ہے آسمان کی طرف سے انسانوں کے قلوب

پر، جس طرح سے اس ظاہری بارش کو بادل لاتے ہیں، اس باطنی بارش کو انبیاء ﷤ لاتے ہیں، انبیاء ﷤ کی وساطت کے ساتھ یہ بارش انسانوں کے قلوب پر اترتی ہے، اور یہ بہت حیات بخش چیز ہے، جیسے کہ آگے لفظ آئیں گے قرآنِ کریم میں ایک جگہ سورۂ انفال میں اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (سورۂ انفال: ۲۴) اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو مانو جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی دیتی ہے، تمہیں حیات بخشتی ہے، قرآنِ کریم کی آیات یہ اللہ کی رحمت کی بارش ہے، اس کے ذریعے سے قلوب زندہ ہوتے ہیں، انبیاء ﷤ کی وساطت سے یہ بارش آتی ہے، اللہ تعالیٰ کی آیات اترتی ہیں، انسانوں کے قلوب پر اترتی ہیں، لیکن انسانوں کے قلوب میں پھر آگے کیا ہوتا ہے، جو تو طیب ہوتے ہیں اُن میں تو یہی بارش عجیب وغریب قسم کے اثرات دکھاتی ہے، دلوں کے اندر کیا کیا بہار آجاتی ہے، اور ایسی ایسی مفید چیزیں اس دل میں پیدا ہوتی ہیں، کہ خود دل والا بھی فائدہ اٹھاتا ہے، دوسری مخلوق کو بھی راحت پہنچتی ہے۔ اور جو اپنے باطن کے اندر خبث لیے ہوئے ہوتے ہیں، وہ جتنا ان نصیحتوں کو سنتے ہیں، باتوں کو سنتے ہیں اتنے زیادہ ضد میں آکر اپنی نالائقی پر زیادہ اتر آتے ہیں، یہ ایسے ہی ہیں جیسے کانٹے دار جھاڑیاں اُن کے قلوب میں اُگ آئیں۔

نزولِ وحی کے بعد لوگ مختلف حصوں میں بٹ جاتے ہیں

سرورِ کائنات ﷺ نے اس علم وہدایت کی ایک مثال دی ہے، فرماتے ہیں کہ جیسے زمین پر بارش ہو تو زمین کے مختلف ٹکڑے ہوجاتے ہیں، بعض تو اچھے ٹکڑے ہوتے ہیں جو بارش کو قبول کرتے ہیں، پھر پھل پھول اُگاتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو تالاب کی شکل میں پانی کو سنبھال لیتے ہیں، پھر اس پانی سے مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے، اور بعض ایسے ردّی قسم کے علاقے ہوتے ہیں کہ نہ پانی کو سنبھالتے ہیں نہ کوئی پھل پھول ہی اُگاتے ہیں، بلکہ وہ سارے کا سارا ضائع کردیتے ہیں۔ فرمایا اسی طرح سے یہ علم وہدایت جو اللہ کی طرف سے اُترتی ہے، بعض تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں، بعض خود فائدہ نہیں اُٹھاتے کم از کم دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو سر اُٹھا کر اس ہدایت کی طرف دیکھتے ہی نہیں، قبول ہی نہیں کرتے اور وہ اس کو ضائع کردیتے ہیں۔[1] تو یہ زمین کے ٹکڑے جس طرح سے ہیں اسی طرح سے انسان کے قلوب کی یہ کیفیت ہے۔ اس مضمون کو بھی حضرت شیخ (سعدی ﷫) نے بہت اچھے انداز کے ساتھ اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے، فرماتے ہیں (گلستاں کا شعر ہے)۔

شمشیرِ نیک ز آہن بد چوں کند کسے ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

فرماتے ہیں کہ اگر لوہا ردی ہو تو کاریگر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، وہ اس سے اچھی تلوار نہیں بنا سکتا۔ اس لیے اگر کوئی ناقص ہے اُس کے اندر کوئی انسانیت نہیں، تو عقل مند آدمی اس کی کتنی ہی تربیت کیوں نہ کرتا رہے وہ انسان نہیں بنا کرتا۔ آگے (شیخ) مثال دیتے ہیں:

(۱) بخاری ۱/ ۱۸ باب فضل من علم وعلم / مشکوٰۃ ۱/ ۲۷ باب الاعتصام فصل اول۔ ولفظہ: مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الخ

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

کہ بارش کی طبیعت میں کوئی اختلاف نہیں، وہ باغ میں بھی برستی ہے، کلر اور شور والی زمین میں بھی برستی ہے، لیکن باغ میں برستی ہے تو کیسے پھول اور پھل اُگتے ہیں، اور شور والی زمین پر برستی ہے تو سوائے کانٹے دار جھاڑیوں کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا (باب ۱، حکایت ۴)۔

تو یہ مثال جو یہاں دی گئی ہے اس میں بھی یہی بات ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے ساتھ وہ قلوب جن کے اندر صلاحیت ہے، جو نیک ہیں، اچھے ہیں، وہ تو ان سے متاثر ہوں گے، اور اُن پر اچھے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے دلوں کو فاسد کر لیا ہے، وہ کھیتی کے قابل نہیں رہے، اب یہ بیج اُن کے اندر ڈالا بھی جائے، باتیں اُن قلوب کے اندر ڈالی بھی جائیں، تو ضد میں آ کر وہ اُس کے خلاف حرکتیں کر کے اپنے آپ کو زیادہ تو برباد کر لیں گے، ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان آیات کو بار بار پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، لیکن ان سے فائدہ کون اٹھائیں گے؟ جو قدر دان ہیں، شکر گزار لوگ ان سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
یہ پکی بات ہے کہ ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا، پھر نوح نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، نہیں ہے تمہارے لیے
اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۝۵۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ
اللہ کا غیر کوئی اِلٰہ، بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب کا۵۹ نوح علیہ السلام کی قوم میں سے سرداروں نے کہا
قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝۶۰ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ
بے شک ہم تجھے دیکھتے ہیں صریح غلطی میں۶۰ نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! مجھ میں کسی قسم کی غلطی نہیں، لیکن میں رَبّ العالمین
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ
کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۶۱ میں پہنچاتا ہوں تمہیں اپنے رَبّ کے پیغامات اور میں تمہارے لیے خیر خواہی کرتا ہوں
وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝۶۲ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ
اور اللہ کی طرف سے میں جانتا ہوں وہ بات جو تم نہیں جانتے۶۲ کیا تمہیں تعجب ہے کہ آ گئی تمہارے پاس نصیحت

رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾

تمہارے رَبّ کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی پر تاکہ وہ آدمی تمہیں ڈرائے اور تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو اور تاکہ تم رحم کیے جاؤ ﴿٦٣﴾

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ

پھر وہ نوح کو جھٹلاتے ہی رہے پھر ہم نے نجات دے دی نوح کو اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں، اور غرق کر دیا ہم نے اُن لوگوں کو

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ ع وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ

جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیات کو، بے شک وہ اندھے لوگ تھے ﴿٦٤﴾ اور ہم نے بھیجا عاد کی طرف اُن کے بھائی

هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

ہود کو، ہود علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارے لیے کوئی معبود نہیں،

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ

کیا پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿٦٥﴾ کہا اُن وڈیروں نے جو کافر تھے ہود کی قوم میں سے، بے شک ہم البتہ تجھے دیکھتے ہیں

فِىْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ

نادانی میں، اور بے شک ہم تجھے سمجھتے ہیں جھوٹوں میں سے ﴿٦٦﴾ ہود علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! میرے اندر

بِىْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾ اُبَلِّغُكُمْ

کسی قسم کی نادانی نہیں ہے، لیکن میں رَبّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿٦٧﴾ میں تمہیں اپنے رَبّ کے

رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ

پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے خیر خواہ ہوں امانت دار ہوں ﴿٦٨﴾ کیا تمہیں تعجب ہے اس بات پر کہ آگئی

ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا

تمہارے پاس نصیحت تمہارے رَبّ کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی پر تاکہ وہ آدمی تمہیں ڈرائے، یاد کیجیے!

اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ

جب تمہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے نائب نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد، اور زیادہ کیا تمہیں ساخت میں

بَصْطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا

از رُوئے کشادگی کے، پس یاد کرو تم اللہ کے انعامات کو تاکہ تم فلاح پاجاؤ﴿۶۹﴾ وہ وڈیرے کہنے لگے

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ

کیا تُو آیا ہے ہمارے پاس تاکہ ہم ایک اللہ کی پُوجا کرنے لگ جائیں اور چھوڑ دیں ان چیزوں کو جن کی پُوجا کیا کرتے تھے

اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ

ہمارے آباء، لے آ تُو ہمارے پاس وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے اگر تُو سچوں میں سے ہے﴿۷۰﴾ ہود علیہ السلام نے کہا تحقیق واقع ہوگئی

عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ

تم پر تمہارے رَبّ کی طرف سے پلیدی اور غضہ، کیا تم جھگڑتے ہو میرے ساتھ ایسے ناموں کے بارے میں

سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا

جو رکھ لیے تم نے اور تمہارے آباء نے؟ نہیں اُتاری اللہ نے ان کے متعلق کوئی دلیل، پس تم انتظار کرو،

اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ

میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں﴿۷۱﴾ پھر ہم نے نجات دے دی ہود کو اور ان لوگوں کو جو ہود کے ساتھ تھے

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾

اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے اور ہم نے کاٹ دی جڑ اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے﴿۷۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ: لام اور قد یہ دونوں ہی تاکید کے لئے ہیں، یہ پکی بات ہے جس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، فَقَالَ: پھر نوح علیہ السلام نے کہا، يٰقَوْمِ: میم کے نیچے کسرہ جو ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے، اصل میں تھا یاقومی، اے میری قوم! اُعْبُدُوا اللّٰهَ: اللہ کی عبادت کرو، مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کا غیر کوئی اِلٰہ، اللہ کا غیر کوئی الٰہ تمہارے لیے نہیں ہے، یعنی اللہ کے علاوہ کوئی معبود تمہارے لیے نہیں، اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ: بیشک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ بڑے دن کے عذاب کا، قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖ: ملأ کا لفظ پہلے بھی گزر گیا، یہ سرداروں کی جماعت، آبرودار لوگ، قوم اور برادری کے چوہدری، گاؤں کے شہر کے وڈیرے، یہ ملأ کا مصداق

ہو گئے،''نوح علیہ السلام کی قوم میں سے آبرو دار لوگوں نے کہا، وڈیروں نے کہا، سرداروں نے کہا'' اِنَّا لَنَرٰىكَ: بیشک ہم تجھے دیکھتے ہیں، فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: صریح گمراہی میں، صریح غلطی میں، ضَلال اصل میں بھٹکنے کو کہتے ہیں، یہاں سے غلطی مراد ہے،''ہم تجھے صریح غلطی میں دیکھتے ہیں'' اور یہ رُؤیت جو ہے دیکھنے سے یہاں سمجھنا مراد ہوتا ہے، جسے رُؤیت قلبی کہتے ہیں، قَالَ یٰقَوْمِ: نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ: مجھ میں کسی قسم کی غلطی نہیں، ضَلٰلَةٌ یہ نکرہ تحت النفی آ گیا جو عموم پر دلالت کرتا ہے،''اے میری قوم! مجھ میں کسی قسم کی غلطی نہیں'' وَلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ: لیکن میں رَبّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ: رِسالات رِسالۃ کی جمع، میں پہنچاتا ہوں تمہیں اپنے رَبّ کے پیغامات، وَاَنْصَحُ لَكُمْ: اور میں تمہارے لیے خیر خواہی کرتا ہوں، وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اور اللہ کی طرف سے میں جانتا ہوں وہ بات جو تم نہیں جانتے، اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: کیا تمہیں تعجب ہے کہ آ گئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رَبّ کی طرف سے، عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ: تم میں سے ہی ایک آدمی پر، لِیُنْذِرَكُمْ: تاکہ وہ آدمی تمہیں ڈرائے، وَلِتَتَّقُوْا: اور تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو، وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: اور تاکہ تم رحم کیے جاؤ، فَكَذَّبُوْهُ: ان لوگوں نے نوح کو جھٹلایا، یہاں تکذیب کے اندر دوام والا معنی ہے،''پھر وہ نوح کو جھٹلاتے ہی رہے'' نوح کو انہوں نے مانا نہیں، جھوٹا بتلاتے رہے، فَاَنْجَیْنٰهُ: پھر ہم نے اس نوح کو نجات دے دی، وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ: اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو اس کے ساتھ تھے، فِی الْفُلْكِ: کشتی میں، وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اور غرق کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیات کو، اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ: بیشک وہ اندھے لوگ تھے، عَمِیْنَ یہ عَمِیَ یَعْمٰى سے ہے اندھا ہونے کے معنی میں، اندھا ہونا آنکھوں کا بھی ہوتا ہے دل کا بھی ہوتا ہے، جیسے کہ سورۂ حج کے اندر الفاظ آئیں گے لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (آیت:۴۶) آنکھیں اندھی نہیں، دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر رکھے ہوئے ہیں، تو یہاں وہ اندھے لوگ تھے، اندھے لوگوں سے یہاں وہی! عقل کے اندھے، دل کے اندھے مراد ہیں،''بیشک وہ اندھے لوگ تھے''۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا: اور ہم نے بھیجا عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو،''عاد'' یہ قبیلے کا نام ہے قوم کا، اور اِلٰى عَادٍ یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے جو لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا کے اندر گزرا ہے،''بھیجا ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو'' قَالَ یٰقَوْمِ: ہود علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! اعْبُدُوا اللّٰهَ: اللہ کی عبادت کرو، مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ: اس کے علاوہ تمہارے لیے کوئی معبود نہیں، اَفَلَا تَتَّقُوْنَ: کیا پھر تم ڈرتے نہیں ہو؟ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: کہا ان آبرو دار لوگوں نے جو کافر تھے ہود کی قوم میں سے، کہا ان وڈیروں نے جو کافر تھے ہود کی قوم میں سے، اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ: یہ قَالَ کا مقولہ ہے، بیشک ہم البتہ تجھے دیکھتے ہیں نادانی میں، سَفَاهَةٍ: عقل کی کمزوری، نادانی، یہ لفظ بھی آپ کے سامنے پہلے گزرا ہے سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ (سورۂ بقرہ:۱۴۲) سفہاء سفیہ کی جمع ہے، یہ وہی لفظ سفاہت سے ہے، اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (سورۂ بقرہ:۱۳۰)، وہاں بھی سَفِهَ کا لفظ جو آیا تھا وہ بھی سفاہت سے ہے، خفیف العقل ہونا، ناقص العقل ہونا، کمزور عقل والا ہونا، نادان ہونا،''بیشک ہم دیکھتے ہیں تجھے نادانی میں'' وَاِنَّا لَنَظُنُّكَ: اور بیشک ہم تجھے سمجھتے ہیں مِنَ الْكٰذِبِیْنَ: جھوٹوں میں سے۔ قَالَ یٰقَوْمِ: ہود علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ: میرے اندر کسی قسم کی نادانی نہیں ہے، میرے اندر کوئی عقل کی کمزوری نہیں

ہے، وَلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: میں رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ: میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ: اور میں تمہارے لیے خیرخواہ ہوں، اَمِيْنٌ: امانت دار ہوں، خائن نہیں، جو کچھ اللہ کی طرف سے آتا ہے پوری امانت داری کے ساتھ تمہیں وہ پہنچاتا ہوں، نَاصِحٌ اَمِيْنٌ: میں تمہارے لیے نصیحت کرنے والا خیرخواہ ہوں امانت دار، دیانت دار، اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: کیا تمہیں تعجب ہے اس بات پر کہ آگئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے، عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ: تم میں سے ہی ایک آدمی پر، لِيُنْذِرَكُمْ: تاکہ وہ آدمی تمہیں ڈرائے، وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ: خلفاء خلیفہ کی جمع ہے، یاد کیجیے جب تمہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے نائب، مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ: نوح کی قوم کے بعد، تمہیں نائب بنادیا، خلفاء فی الارض، تم نائب ہوگئے، وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً: زَادَكُمْ: زیادہ کیا تمہیں، فِي الْخَلْقِ: خلق سے یہاں ساخت مراد ہے، بناوٹ، ''زیادہ کیا تمہیں تمہارے بدن میں، تمہاری بناوٹ میں ازروئے کشادگی کے'' بڑے چوڑے چکلے انسان ہو، قدآور ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ظاہری باطنی بڑی بساطت دی ہے، بڑے کشادہ ہو، عقل بھی وافر دی، بدن بھی بڑے اچھے دیے، ''زیادہ کیا تمہیں ساخت میں، بدن میں ازروئے کشادگی کے، ازروئے پھیلاؤ کے'' بَصْۜطَةً ''سین'' کے ساتھ بھی ہوتا ہے ''صاد'' کے ساتھ بھی، اس لیے ''صاد'' کے اُوپر دوسری ''سین'' لکھی ہوئی ہے یہاں، دونوں قراءتیں ہیں ''سین'' کے ساتھ بھی، ''صاد'' کے ساتھ بھی، معنی دونوں کا ایک ہے، فَاذْكُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ: پس یاد کرو تم اللہ کے احسانات کو، اللہ کے انعامات کو، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم فلاح پاجاؤ، قَالُوْا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ: وہ کہنے لگے، وہ آبرودار لوگ، قوم کے چوہدری، وڈیرے، اَجِئْتَنَا: یہ استفہام تعجب کے لئے ہے، کیا تُو آیا ہے ہمارے پاس لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ: تاکہ ہم ایک اللہ کی پوجا کرنے لگ جائیں، وَنَذَرَ: اور چھوڑ دیں مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا: ان معبودوں کو جن کو ہمارے آباء پوجا کرتے تھے، تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے؟ ہمارے باپ دادوں کے معبود چھڑانے کے لئے آیا ہے؟ نَذَرَ وَذَرَ يَذَرُ سے، ''چھوڑ دیں ہم ان چیزوں کو جن کی پوجا کیا کرتے تھے ہمارے آباء'' آباء اَب کی جمع، فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ: لے آ تو ہمارے پاس وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے، وَعَدَ يَعِدُ وَعْدًا اگر ہو تو وعدہ کرنا، وَعِيْد ہو تو ڈرانا، تو یہاں مَا تَعِدُنَآ سے وہ چیز مراد ہے جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے، یہ جو عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ وغیرہ کہتے ہو، لے آ ہمارے پاس جس عذاب سے تو ہمیں ڈراتا ہے، اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: اگر تو سچوں میں سے ہے۔ قَالَ: ہود علیہ السلام نے کہا، قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ: رجس کہتے ہیں ناپاکی کو پلیدی کو، یہاں خیالات کی عقائد کی اور کردار کی پلیدی مراد ہے، ''تحقیق واقع ہوگئی تم پر تمہارے رب کی طرف سے پلیدی اور غصہ'' یعنی تم پلیدی میں مبتلا ہوگئے، اور اللہ کے غصے کا نشانہ بن گئے، یہ گمراہی تمہارے اوپر چسپاں ہوگئی، اور رجس کا معنی عذاب بھی کیا گیا ہے اور غضب کا معنی غصہ، ''واقع ہوگیا تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ'' یوں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، اَتُجَادِلُوْنَنِيْ: تجادلون مجادلة سے، جَادَلَ مُجَادَلَةً: ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا، ''کیا تم جھگڑتے ہو میرے ساتھ؟ فِيْٓ اَسْمَآءٍ: ایسے ناموں کے بارے میں، سَمَّيْتُمُوْهَآ: جو تم نے رکھ لیے، اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ: تم نے اور تمہارے آباء نے، وَاٰبَآؤُكُمْ کا عطف چونکہ سمیتموھا کی ضمیر پر ہے اس لیے اس کو منفصل کے ساتھ مؤکد کردیا، یہ قاعدہ پہلے بھی میں نے آپ کے سامنے کئی دفعہ بیان کیا ہے، کہ

ضمیر مرفوع متصل پر جب عطف کیا جاتا ہے تو اس کو منفصل کے ساتھ مؤکد کر لیا جاتا ہے، یہاں بھی اَنْتُمْ ضمیر منفصل آ گئی، مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ: نہیں اتاری اللہ نے ان کے متعلق کوئی دلیل، سُلْطٰن یہ بھی نکرہ تحت النفی ہے، کسی قسم کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق نہیں اتاری، فَانْتَظِرُوْٓا: پس تم انتظار کرو، اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ: میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں، فَاَنْجَیْنٰهُ: پھر ہم نے ہود کو نجات دے دی، وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ: اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو ہود کے ساتھ تھے، بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے، وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اور ہم نے کاٹ دی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ: اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے، جو ایمان لانے والے نہیں تھے جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ہم نے ان کی جڑ کاٹ دی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط و تعلق

شروع سورت سے دین کے اُصولِ ثلاثہ کا ذکر آپ کے سامنے مختلف پیراؤں سے آ رہا ہے، یعنی اثباتِ توحید اور اُس کے ساتھ ساتھ ردِ شرک، اور اثبات رسالت اور اثبات معاد، اور بُرائی سے نفرت دلانا اور نیکی کی ترغیب دینا، حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ جو ذکر کیا گیا تھا وہ اسی کشاکشی کو بیان کرنے کے لیے تھا، اب جو باتیں ایک اُصولی رنگ میں ذکر کی گئی تھیں، یہاں ان کو واقعات کے رنگ میں دُہرایا جا رہا ہے۔

واقعات کے ذریعے اُصولوں کی تائید

یہ ہمیشہ قاعدہ ہوتا ہے جیسے یوں سمجھائیں کہ بھائی! جوا نہ کھیلا کرو ورنہ کنگال ہو جاؤ گے، لٹ پٹ جاؤ گے، جوا کھیلنے والے کبھی خوش حال نہیں ہوتے، یہ تو ایک اُصولی رنگ میں بات ہو گئی، پھر کہیں کہ دیکھو! فلاں شخص مثلاً زید صاحبِ جائیداد تھا، اور اسی جوئے کی وجہ سے لٹ پٹ گیا، اور آج ایک ایک لقمے کو ترستا پھر رہا ہے، کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں، تو جو ایک واقعہ بیان کیا ہے تو اس کے ساتھ اس اُصول کا گویا کہ عملی نقشہ سامنے آ گیا، کہ جو اُصول ہم آپ کے سامنے بیان کر رہے ہیں، اس کا اگر عملی نمونہ دیکھنا ہے تو فلاں شخص کو دیکھ لو، اُس نے اس بات کی خلاف ورزی کی تھی نتیجہ یہ نکلا، اور یہ ہم جو آپ کے سامنے کامیابی کے اُصول ذکر کر رہے ہیں، ان کا خیال کرو، دیکھو! فلاں شخص بالکل محتاج تھا اُس کے پاس کچھ نہیں تھا، لیکن اُس نے ہمارے بتائے ہوئے اُصولوں پر عمل کیا، تو آج کتنا عزت کے ساتھ وقت گزر رہا ہے۔ تو پہلے اُصول بتائے جاتے ہیں کہ عزت حاصل کرنے کے یہ اُصول ہیں، عزت کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ طریقہ ہے، پھر مثال اگر ساتھ دے دی جائے کہ فلاں شخص کو دیکھ لو، وہ پہلے کیا تھا، اور جس وقت اُس نے ہماری بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا، ہمارے بتائے ہوئے اُصولوں پر چلا تو اُس نے کس طرح سے عزت حاصل کر لی۔

تو انسان کی فطرت ہے کہ واقعات سے یہ زیادہ متاثر ہوتا ہے، اس لیے وعظ و نصیحت کے اندر واقعات کا ایک معتد بہ حصہ انسان لایا کرتا ہے، کہ مثالوں کے ساتھ اور واقعات کے ساتھ وہ باتیں انسان کے ذہن میں اچھی طرح راسخ ہو جاتی ہیں جو پہلے ایک اُصولی رنگ میں بیان کی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں گزشتہ اُمتوں کے واقعات بہت کثرت کے ساتھ بیان کیے ہیں، اُن واقعات کے ساتھ ان اصولوں کی تائید ہوتی ہے جو قرآنِ کریم نے بنیادی مقاصد کے تحت بیان کیے ہیں۔

دُنیا میں بُت پرستی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے شروع ہوئی

نوح علیہ السلام، بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہوئے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے زمانے میں سب لوگ ایک ہی دِین پر تھے، جو آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو سکھایا تھا، آہستہ آہستہ خواہشات کے اختلاف کے ساتھ فسادات بڑھتے چلے گئے، نوح علیہ السلام تک پہنچتے پہنچتے قوم کچھ کُفر میں کچھ شرک میں مبتلا ہو گئی تھی، اور نوح علیہ السلام کی قوم کے وہ پانچ بُت سورۂ نوح کے اندر مذکور ہیں جن کی وہ قوم پُوجا کرتی تھی: لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (پ ۲۹، سورۂ نوح) یہ پانچ ان کے بُت ہیں، یہ ''پنج تنوں'' کو پُوجنے والے تھے جن کے نام یہاں ذکر کیے گئے ہیں، اور بخاری شریف کی ایک روایت میں آتا ہے، کہ یہ سارے کے سارے اللہ کے مقبول بندے تھے، جن کا نام یہاں قرآن میں ذکر کیا گیا ہے یہ سارے کے سارے صالحین تھے، اور قوم ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔[1] اور جس وقت یہ مر گئے، تو مرنے کے بعد شیطان نے پٹی پڑھائی کہ ان کی تصویریں بنا کر سامنے رکھ لو، یہ یاد رہیں گے اور ان کے یاد رہنے کی وجہ سے تمہیں نیکی کی توفیق ہوتی رہے گی، تمہارا پیر، تمہارا اُستاذ جس وقت سامنے متشکل ہوگا تو تم اُس کو دیکھ کر کچھ حیا کرو گے، اور تم نیکی کے کام کرتے رہو گے، اس طرح سے اُن کے بُت بنوالیے، پتھروں پر ان کی تصویریں بنوالیں، اور آہستہ آہستہ لوگوں نے اُن کو سلام کرنا شروع کیا، جھکنے لگ گئے، عقیدہ بدلتے بدلتے سب کچھ انہی کے متعلق ہی ہو گیا، انہی کو آلِہہ بنا لیا گیا، انہی کو معبود بنا لیا گیا، گویا کہ یہ مقبول بندے تھے جن کے مرنے کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم نے ان کو اللہ کے نائبین قرار دے کر خدائی کے اختیارات ان کو دے دیے، اور ان کی پُوجا شروع کر دی، تو حضرت نوح علیہ السلام نے اس قوم کے سامنے اپنی تبلیغ کی جو ابتدا کی تو سب سے پہلے اللہ کی توحید کو بیان کیا۔ تو ان واقعات میں رسالت کا مسئلہ بایں معنی آ گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! میں نے نوح علیہ السلام کو بھیجا تھا، معلوم ہو گیا کہ آج جو میں نے رسول بھیجا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، پہلے سے اللہ تبارک وتعالیٰ اسی طرح سے رسولوں کو بھیجتے رہے ہیں، مسئلہ رسالت اس طرح سے ثابت ہو گیا۔ پھر وہ رسول جو آتا ہے تو سب سے پہلے توحید کو بیان کرتا ہے، تو معلوم ہو گیا کہ اول سے لے کر اس وقت تک ہر رسول کا متفق علیہ مسئلہ ہے اللہ کی توحید، اس لیے اگر تمہارے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی تقریر کر رہے ہیں، توحید کا مسئلہ بیان کر رہے ہیں، یہ مسئلہ کوئی آج کا نہیں ہے، جو نبی بھی آیا اُس نے یہی مسئلہ بیان کیا۔ اور پھر ہر نبی نے اپنی تقریر کے اندر ردِ شرک بھی کیا، اور

(۱) صحیح البخاری ج ۲ ص ۷۳۲، کتاب التفسیر تفسیر سورۃ نوح۔

ہر نبی نے اپنی تقریر کے اندر آخرت کا عذاب بھی یاد دلایا۔ دیکھو! تینوں باتیں آگئیں واقعے کے تحت، رسالت بھی آگئی، توحید بھی آگئی، معاد بھی آگیا۔ اور توحید اور رسالت کے بارے میں جو ان لوگوں کے شبہات تھے، اُن کو بھی اُس نبی نے رَدّ کیا، اور پھر ماننے والوں کا اچھا انجام بھی سامنے واقعہ کی صورت میں آگیا، نہ ماننے والوں کا معذّب اور برباد ہونا بھی واقعے کی صورت میں آگیا تو یہ ترغیب اور ترہیب کا پہلو بھی مکمل ہو گیا۔

اُممِ سابقہ کے واقعات میں سبق

اور پھر سرورِ کائنات ﷺ کے لیے اور آپ کے ماننے والوں کے لیے بھی ان واقعات میں سبق ہے، کہ پہلے انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کو کس طرح سے سمجھایا تھا، اور اس پر کتنی محنت کی تھی، اور قوموں نے کس طرح سے بداخلاقی کے ساتھ اور بےرُخی کے ساتھ ان کے ساتھ معاملہ کیا تھا، نصیحت کرنے والوں کو جھٹلایا تھا، اُن کو برا بھلا کہا تھا، اُن کی بات وہ مانتے نہیں تھے، حتیٰ کہ ان کو تکلیف تک پہنچاتے تھے، تحقیر اُن کی کرتے تھے، لیکن جو اللہ کے پیغمبر ہوتے ہیں وہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں، اور اپنی قوم اور برادری کی ہمدردی میں اُن کو مسلسل سمجھاتے ہی رہتے ہیں۔ تو اس میں حضور ﷺ کے لیے بھی نمونہ ہے کہ تبلیغ کے میدان میں محنت کس طرح سے کرنی پڑتی ہے، اور آپ کے ماننے والوں کے لیے بھی نمونہ ہے، کہ حق کو قبول کرنے کے بعد ان چوہدریوں اور وڈیروں کے ساتھ کس طرح سے ٹکر ہوا کرتی ہے، اور یہ چوہدری اور وڈیرے کس طرح سے تحقیر کیا کرتے ہیں، اور کس طرح سے بُرا بھلا کہتے ہیں، ان باتوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، پچھلی تاریخ یہی ہے، آخر انجام جو ہوتا ہے وہ انہی مسکینوں غریبوں کا، حق قبول کرنے والوں کا اچھا ہوتا ہے، اور یہ وڈیرے اور یہ چوہدری سب اللہ کے عذاب میں دُنیا میں بھی گرفتار ہو کر بھی ذلیل ہوتے ہیں، اور آخرت کا عذاب تو پھر ہے ہی ان کے لیے۔ ان واقعات کے دُہرانے کے ساتھ ان تمام لوگوں کے لیے اس قسم کے سبق بھی موجود ہوتے ہیں، سرکشوں کے لیے تنبیہ ہے، اور نیکوکاروں کے لیے جو قوم کے چوہدریوں کے سامنے دبے ہوئے ہوتے ہیں، اور قوم کے چوہدری اُن کی تحقیر کر کے اُن کو پریشان کرتے ہیں، اُن کے لیے تسلی ہے کہ پچھلی ساری تاریخ اسی طرح سے چلی آتی ہے، کہ حق قبول کرنے والوں کے ساتھ دنیا میں جاہ وجلال رکھنے والوں نے ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے، لیکن جب حق والے حق پر جمے رہتے ہیں، اور دوسرے ضد میں آکر تکذیب کرتے رہتے ہیں، نتیجہ پھر سامنے ہے کہ جو ماننے والے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو بچالیتا ہے، اور جو تکذیب کرنے والے ہوتے ہیں اللہ اُنہیں برباد کر دیتے ہیں، بار بار واقعات دُہرا کے یہ اُصول آپ کے ذہن کے اندر اُتارے جائیں گے۔

تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کا عقائد ونظریات میں اتحاد

اسی سلسلے میں پہلا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کا آرہا ہے، اور دوسرا واقعہ حضرت ہود علیہ السلام کا آرہا ہے، انبیاء علیہم السلام چونکہ ایک ہی حق کے منادی ہیں، اعلان کرنے والے ہیں، وہ حق جو اللہ کی طرف سے آیا ہے، دِین اللہ کے نزدیک ایک ہی ہے، دِین واحد ہے، سب انبیاء علیہم السلام اسی دِین کے مبلغ ہیں، وقتی طور پر کچھ اَحکام بدل جائیں وہ ایک علیحدہ بات ہے، وہ فروعی اور عملی اَحکام ہوتے ہیں،

لیکن جہاں تک نظریات اور عقیدے کا تعلق ہے آدم علیہ السلام سے لے کر سرورِ کائنات ﷺ تک تمام نبی ایک ہی عقیدے اور ایک ہی نظریے کے تھے، اس لیے اُن کی تبلیغ میں اور اُن کی اس نشر و اشاعت میں آپ کو بالکل یگانگت اور یک جہتی معلوم ہوگی، کہ جیسا تقریر کرنے کا طریقہ نوح علیہ السلام کا ہے ویسا ہی تقریر کرنے کا طریقہ ہود علیہ السلام کا ہے، اور پھر کفر کے اندر بھی اسی طرح سے کہ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے مدمقابل آ کر شکوک شبہات پیدا کرتے تھے اور اکڑتے تھے اسی طرح سے ہود علیہ السلام کے مقابلے میں آنے والے، یوں ہی ہر قوم کو دیکھتے چلے جاؤ گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ حق کا سلسلہ کس طرح سے مسلسل ہے، اور یہ نظریات جو آج واضح کیے جا رہے ہیں تمام انبیاء علیہم السلام انہی کے مبلغ تھے، یہی مختلف امتوں کے واقعات آپ کے سامنے آ رہے ہیں، پہلا واقعہ نوح علیہ السلام کا ہے اس پر نظر ڈالتے چلیے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اندازِ دعوت و تبلیغ

البتہ تحقیق، بے شک، ضرور ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو اُس کی قوم کی طرف فَقَالَ یٰقَوْمِ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دیکھو! کیسے محبت کے ساتھ کہا، اے میری قوم! کہہ کے خطاب کیا کہ میں تم میں سے ہی ہوں، تم مجھے جانتے ہو بوجھتے ہو، میرے حالات سارے کے سارے تمہارے سامنے ہیں۔ میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے علاوہ تمہارے لیے کوئی معبود نہیں، کسی دوسرے کو معبود نہ سمجھو، عبدیت کا، بندگی کا، نیازمندی کا تعلق جتنا ہے صرف اللہ سے ہونا چاہیے، اور اگر یہ میری بات نہیں مانو گے اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ میں بڑے دِن کے عذاب سے تم پر اندیشہ کرتا ہوں، کہ کسی بڑے دِن کے عذاب میں نہ پھنس جاؤ۔ اس ''بڑے دِن کے عذاب'' سے آخرت کا دِن بھی مراد ہو سکتا ہے قیامت کے دِن کا عذاب، اور جو دُنیا میں عذاب آیا کرتا ہے وہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یہ انہوں نے تبلیغ کی، اس اُصول کو ذکر کیا، اب یہ دیکھو! چونکہ یہ تو آپ کے سامنے ایک نقل آ رہی ہے، تو اس کا صرف اتنا ہی مطلب نہیں کہ نوح علیہ السلام نے یوں اعلان کیا تو قوم نے یوں کہہ دیا، اور چند منٹوں میں فیصلہ ہو گیا، طوفان آ گیا، اور سارے ہی غرق ہو گئے، جیسے یہاں چار پانچ سطروں میں واقعہ بیان کر دیا گیا، یہ کوئی اتنا سا وقت نہیں لگا، قرآنِ کریم آپ کے سامنے واضح کرے گا فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (سورۂ عنکبوت: ۱۴) کہ نوح علیہ السلام پیغمبرانہ شان کے ساتھ اپنی قوم میں پچاس سال کم ایک ہزار سال ٹھہرے، پچاس سال کم ایک ہزار سال کتنے ہو گئے؟ ساڑھے نو سو سال۔ ساڑھے نو سو سال حضرت نوح علیہ السلام کی پیغمبرانہ عمر ہے، چالیس سال میں اگر نبوت ملی ہو تو وہ ڈال لیجئے تو نو سو نوے ہو گئے، اور پھر طوفان کے بعد بھی حضرت نوح علیہ السلام زندہ رہے ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سو ڈیڑھ سو سال تک پھر بھی زندہ رہے ہیں، تو گیارہ ساڑھے گیارہ سو سال عمر ثابت ہوتی ہے حضرت نوح علیہ السلام کی، تو یہ ساڑھے نو سو سال قوم کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کا تبلیغ کا زمانہ ہے، اور اسی اُصول کو ذکر کرتے رہے کہ شرک سے باز آ جاؤ، توحید اختیار کر لو، توحید کا راستہ نجات کا ہے، شرک کا راستہ ہلاکت کا ہے بار بار اس بات کو سمجھاتے ہیں، جس طرح سے سورۂ نوح کے اندر آپ کے سامنے اس کی کچھ تفصیل آئے گی کہ نبی کتنے دردِ دل کے ساتھ اپنی قوم کے پیچھے پڑتا ہے، اور قوم کو سمجھانے کے لیے دِن رات صبح شام کتنی محنت کرتا ہے، لیکن اتنی محنت کے نتیجے میں جن کو دُنیا کے اندر

مال، دولت، عزت، جاہ حاصل تھی ان کے آگے کیا خیالات تھے، وہ کہنے لگے، قوم میں سے جو وڈیرے، آبرودار لوگ تھے وہ کہنے لگے اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ہم تو تجھے کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں، تو تو بہت بھٹک گیا، جس نے باپ دادے کا طریقہ چھوڑ دیا خاندانی روایات کو چھوڑ دیا وہ بھی کوئی آدمی اچھا ہو سکتا ہے، وہ اپنی خاندانی روایات پر، باپ دادا کے طریقے پر اڑے ہوئے تھے۔

انبیاء اور وارثینِ انبیاء کا طرزِ تبلیغ

''ہم تجھے صریح غلطی میں دیکھتے ہیں''، حضرت نوح علیہ السلام کہتے کہ یٰقَوْمِ۔ دیکھو! وہ ضلالِ مبین کا لفظ بولتے ہیں، یعنی بھٹکے ہوئے، گمراہ، صریح طور پر گمراہی میں پڑے ہوئے، صریح غلطی میں پڑے ہوئے، یہ کیسا گستاخانہ لفظ ہے حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے جو بولتے ہیں، لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے لب و لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تو مبلغ کی شان یہی ہوتی ہے کہ آگے کوئی جاہل اگر جہالت کر لے، تو اسی وقت غصے میں آ کر ترکی بہ ترکی جواب نہ دینا شروع کر دے، جس طرح سے آپ لوگوں نے آج کل ایک فلسفہ بنالیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے ہونا چاہیے، آج کل تو آپ لوگوں کا یہی فلسفہ ہے نا؟ کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو، کہ اگر ذرا سی کسی نے بات کہی ہے تو اسے دس گنی کر کے آگے سے کہو، یہ غلط فلسفہ ہے، مبلغین کے لیے یہ فلسفہ نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ نہیں ہے، قوم آگے سے جہالتیں کرتی ہے، پتھر مارتی ہے، بُرا بھلا کہتی ہے لیکن نبی کے لب و لہجے میں فرق نہیں آتا۔ نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ اے میری قوم! لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ میرے اندر کوئی گمراہی نہیں، کوئی غلطی نہیں، میں تو ربّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، تم ہو اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کے پابند، تم ہو خاندانی روایات کو پوجنے والے، میں کسی بڑی ہستی کی طرف سے آیا ہوں، وہ تو جو کہتا ہے میں تو وہ پہنچاتا ہوں، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام آتا ہے میں وہ دے رہا ہوں، میں کسی باپ کی بات سے استدلال نہیں کر رہا، دادے کی بات سے نہیں کر رہا، کوئی خاندانی روایات کا حوالہ نہیں دے رہا، میں تو ربّ العالمین کا رسول ہوں اور تمہیں اسی کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ: میں اپنے ربّ کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں، وَاَنْصَحُ لَكُمْ خیال کر لو میں تمہارا خیر خواہ ہوں، میں تمہارے ساتھ خیر خواہی کر رہا ہوں، تمہارا بھلا چاہ رہا ہوں، اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں، وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اللہ کی طرف سے ایسی باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ بات وہی آ گئی کہ میرے پاس علمِ الٰہی ہے، اللہ کی طرف سے میرے پاس علم آ گیا، اور تم ہو لَا تَعْلَمُوْنَ کا مصداق، تمہارے پاس علم نہیں ہے، قاعدے کی بات ہے کہ جس کے پاس علم ہو اس کی بات ماننی چاہیے، جاہلوں کا فرض ہے کہ علم والوں کے پیچھے لگیں، اس لیے میری بات کو مانو، چونکہ میں علم کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔

منکرینِ انبیاء کا ردّ...... انبیاء علیہم السلام کا انسانوں میں سے ہونے کی وجہ

اَوَعَجِبْتُمْ پھر یہ تمہیں تعجب ہے کیونکہ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یہ تو تم جیسا انسان ہے، یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ (سورۂ مؤمنون: ۲۴) یہ تو تمہارے مقابلے میں بڑا بننا چاہتا ہے، تاکہ سارے اس کو مان لو اور سارے اس کے پیچھے لگ جاؤ، چوہدری یہ بن جائے، ہماری چودراہٹوں کو نقصان پہنچا کر خود بڑا بننا چاہتا ہے، یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ یہ تم پہ بڑا بننا چاہتا

ہے۔ ان کو اپنی کرسی اور اپنے اقتدار کی فکر پڑی ہوئی تھی، کہ اگر نوح علیہ السلام کا کلمہ پڑھ لیا تو ہم سارے چھوٹے ہو جائیں گے، نوح علیہ السلام بڑا ہو جائے گا، تو ہماری بڑائی ختم ہو جائے گی، اس قسم کی باتیں کرتے تھے کہ ایک انسان ہے، ہماری طرح کھاتا ہے، پیتا ہے، یہ کہاں سے اللہ کا پیغمبر بن کے آ گیا، کیا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ایسے ہوتے ہیں جن کو نہ کھانے کو ملے، نہ پہننے کو ملے، نہ رہنے کے لیے کوئی مکان شان دار ہو، اللہ نے نعمتیں ہمیں دے رکھی ہیں، خوش پوشاک ہم ہیں، خوش خوراک ہم ہیں، بڑے بڑے ڈیرے ہمارے ہیں، چوہدراہٹ ہمیں حاصل ہے، مال ہے، دولت ہے، جاہ ہے، تو اللہ نے اگر کسی کو پیغمبر بنانا ہوتا، یا اپنی باتیں پہنچانے والا بنانا ہوتا تو ہمیں نہ بناتا؟ یہی مسکین سا ملا اللہ کو پیغمبر بنانے کے لیے؟ اس قسم کی باتیں وہ کرتے تھے، یہی تکبر اور یہی بڑائی تھی اُن کی، جیسے قرآنِ کریم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل جو لوگ تھے ان کا قول بھی تو نقل کیا گیا ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف: ۳۱) مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ یہ اگر اللہ کی کتاب ہے، قریتین سے مکہ اور طائف مراد ہیں، مکہ اور طائف میں کتنے بڑے بڑے رئیس اور کتنے بڑے بڑے آدمی موجود ہیں، تو دونوں شہروں میں کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن کیوں نہیں اترا؟ ایسے مسکین پر اُترنا تھا؟ جو یتیم ہے، جس کے پاس کوئی جائیداد نہیں، اللہ کا قرآن اُترنا تھا تو اسی پر اترنا تھا؟ یعنی وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح سے دُنیا کا مال و دولت ہمیں حاصل ہے، اگر کوئی دینی چیز ہوتی تو یہ جاہ و جلال بھی ہمیں حاصل ہوتا، یہ ان کے حصے میں کیسے آ گیا؟ یہ بڑا بننے کے لیے اور اس راستے سے اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس نصیحت آ گئی تمہارے رَبّ کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی پر، اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، تم میں سے ایک آدمی نصیحت لے کر آ گیا تمہیں تو شکر ادا کرنا چاہیے، تمہاری زبان بولتا ہے، تمہارے جیسے جذبات رکھتا ہے، تم اس کے آگے پیچھے کو جانتے ہو، کوئی اور مخلوق آ جاتی اور آ کر تمہیں سمجھاتی تو تم یہ کہتے کہ یہ تو اور مخلوق ہے ہم اور ہیں، اس کو کیا پتا ہماری کیا ضرورتیں ہیں، اگر سمجھانے کے لئے فرشتہ آ جاتا تو لوگ یہ کہتے کہ اس کو نہ کھانے کی ضرورت، نہ پینے کی ضرورت، نہ پہننے کی ضرورت، نہ رہنے کے لیے مکان کی ضرورت، نہ اس کی بیوی، نہ بچے، اور ہم ان سب دھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ کہتا ہے نماز پڑھو، یہ تو فارغ ہے اس کے ذمے تو کوئی کام ہی نہیں ہے، اور ہم نے ہزاروں کام کرنے ہیں ہم نماز کس طرح سے پڑھیں؟ وہ کتنا موٹا عذر کر دیتے، اس کی نہ بیوی، نہ بچے، نہ کاروبار، نہ جائیداد، نہ کھانے کی ضرورت، نہ پینے کی ضرورت، نہ پہننے کی ضرورت، اسے کیا پتا کہ دُنیا میں کیسے رہنا ہے، جیسے اب آپ بھی اگر کسی کو نصیحت کریں تو کہتے ہیں مولوی صاحب! تمہیں کیا پتا دُنیا کا کاروبار کس طرح سے چلتا ہے، کاروباری تو ہم ہیں، ہمیں پتا ہے کیا مجبوریاں ہیں، لیکن اگر کاروباری ہی کاروباری آدمی کو سمجھائے تو پھر کیا عذر؟ دُنیا کی حالت پر نظر ڈالو، کوئی محکمہ ایسا نہیں کہ جس محکمے کے اندر دیانت دار آدمی موجود نہ ہوں، ٹھیک ہے کم ہوں گے، لیکن ہوں گے ضرور، پولیس آپ کے نزدیک سب سے زیادہ گندا محکمہ ہے، لیکن پولیس کے اندر بھی ایسے ایسے نیک آدمی موجود ہیں، جو کسی سے ایک پیسہ رشوت کا نہیں لیتے، اور وہ اسی تنخواہ پر اپنا غریبانہ مسکینانہ گزارہ کریں گے، اب اگر یہ سپاہی یا یہ پولیس مین کسی دوسرے کو کہے گا کہ بھائی! رشوت نہ لے، تو پولیس والا آگے کیا عذر کر سکتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے اِتمامِ حجت ہے، کوئی سپاہی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم اپنے حالات کے اعتبار سے مجبور تھے، اللہ تعالیٰ کہے گا یہ بھی تو تمہارے ساتھ تھا، یہ کیوں نہیں مجبور ہوا۔

ایک پولیس افسر کا ایمان افروز واقعہ

رینالہ خورد (اوکاڑہ) میں ایک بزرگ مدفون ہیں مولانا عبدالصمد صاحب، یہ ہیں تو کیمل پور کی طرف کے، لیکن مرسے کے قریب کہیں رہتے تھے، سنا ہے کہ ان کا پیر پولیس میں کوئی افسر تھا، کسی نے ان کے خلاف درخواست دے دی، کہ اس نے فلاں واقعے میں رشوت لی ہے، اُوپر سے تحقیقات کرنے والے افسر آگئے، انگریزوں کے زمانے کی بات ہے، اُوپر والے رشوت کی تحقیق کرنے کے لئے آگئے، اس سے آکر پوچھا کہ آپ نے رشوت لی ہے؟ تو یہ کہنے لگا کہ اس کا جواب میں یوں دیتا ہوں کہ یہ میرا گھوڑا کھڑا ہے، اس کو تین دِن تک بھوکا رکھو، اس کو چارہ نہ ڈالو، اور پھر رشوت کے پیسوں کا گھاس لاکر اسے ڈالو، اگر یہ رشوت کا گھاس کھا گیا، تو آپ سچے اور میں جھوٹا، اور اگر میرا گھوڑا بھی رشوت کا گھاس نہ کھائے تو پھر میرے اُوپر کیا توقع ہے، کہ میں رشوت کھاتا ہوں۔ چنانچہ ایسے ہی انہوں نے تجربہ کیا کہ رشوت کا گھاس لاکر ڈالا، گھوڑے نے منہ نہیں لگایا، تو سارا مقدمہ خارج ہوگیا کہ جس کا گھوڑا رشوت کا گھاس نہیں کھاتا وہ خود کسی سے رشوت کس طرح سے کھائے گا؟ اب اس قسم کے لوگ جو موجود ہیں تو کوئی پولیس والا اللہ کے دربار میں عذر کرے گا کہ جی ہم اپنے حالات کی وجہ سے مجبور تھے، دس تھانیدار اللہ تعالیٰ سامنے کھڑے کردے گا، کہ یہ بھی تو تمہارے محکمے میں تھے، یہ کیوں نہیں مجبور ہوئے؟ پٹواریوں میں دیکھو تو اُن میں بھی دیانت دار موجود ہیں، چھوٹے سے لے کر بڑے افسروں تک جو بھی محکمہ ہے، ٹھیک ہے کہ زیادہ اس میں خراب ہوں گے، لیکن کچھ نہ کچھ اچھے ضرور ہیں، اور انہی کے ذریعے سے اِتمامِ حجت ہوتا ہے اس محکمے والوں پر، وہ کہیں کہ جی! ہم مجبور تھے ہم ایسے نہیں کر سکتے تھے، تو دوسرے سامنے کھڑے ہوں گے، کہ یہ بھی تو تمہارے پیشے کے تھے، یہ کس طرح سے کرتے تھے، اس لیے کوتاہی تمہاری ہے کہ تم نے فکر نہیں کیا، ورنہ فکر کرتے تو تم بھی اُن کی طرح زندگی گزار سکتے تھے۔ تو ہم پیشہ، ہم قوم، ہم علاقہ آدمی جس وقت دوسرے کو سمجھایا کرتا ہے تو کسی کے پاس عذر نہیں ہوتا۔

اِنسانوں کے جذبات سے اِنسان ہی واقف ہوتے ہیں

اب نوح علیہ السلام کی بیوی بھی تھی، اولاد بھی تھی، اور باقی مشاغل جو ہوتے ہیں سارے تھے، اور وہ جس وقت کہتے تھے کہ زندگی یوں گزارو، یوں نہ گزارو، تو اب کسی کے پاس کیا عذر ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سمجھانے کے لیے ہمیشہ انسان ہی بھیجے ہیں، کہ وہی انسانوں کے جذبات سے آگاہ ہو سکتے ہیں، وہی انسانی ضرورتوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں، اس لیے کوئی دوسرا آدمی آگے سے عذر نہیں کر سکتا، انسان کے لیے اگر نمونہ بن سکتا ہے تو انسان ہی بن سکتا ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ سے انسانوں میں سے آئے، آدمیوں میں سے آئے، بشروں میں سے آئے۔ اور اُن کا یہ جو اعتراض ہوتا تھا کہ اللہ کا نبی بشر نہیں ہونا چاہیے اس کو غلط قرار دیا گیا۔ ''کیا تمہیں تعجب ہے کہ آگئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رَبّ کی طرف سے تمہیں میں سے ایک آدمی پر، تاکہ وہ

تمہیں ڈرائے، اور تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو اور تاکہ تم رحم کیے جاؤ" فَكَذَّبُوْهُ وہ نوح علیہ السلام کو جھٹلاتے ہی رہے، یہ اُن کے اسی فعل کا دوام ہے، یعنی پہلے سے جو انہوں نے شغل اختیار کر لیا تھا وہی اختیار کیے رہے فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ: پھر واقعہ مفصل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں آئے گا، کہ پھر کس طرح سے نوح علیہ السلام سے اللہ نے کشتی بنوائی، پھر کیسے طوفان آیا، اور نوح علیہ السلام کو اور اُن کے ساتھیوں کو اللہ نے کشتی میں نجات دے دی وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اور ڈبو دیا ہم نے، غرق کر دیا ہم نے اُن لوگوں کو (جس طرح سے آپ کہتے ہیں ان کا بیڑا غرق کر دیا) غرق کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، بے شک وہ اندھے لوگ تھے، کتنا ہی اُن کو حق سمجھایا گیا، حق دکھایا گیا، لیکن انہوں نے دل کی آنکھیں نہیں کھولیں، تو جب وہ ایسے اندھے تھے تو اُن کو باقی کیا رکھنا، خس کم جہاں پاک، سارے کے سارے غرق کر کے ڈبو دیے، ختم کر دیے، واقعے کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں آ رہی ہے آگے، اس میں زیادہ مفصل واقعہ آئے گا۔

نوح علیہ السلام ''آدمِ ثانی'' کیوں کہلاتے ہیں؟

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا: اور پھر نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد یہ عاد کا قصہ آ گیا، یہ نوح علیہ السلام کی کوئی چھٹی نسل کے اندر تھے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جتنے لوگ پھیلے تھے، نوح علیہ السلام کے طوفان میں سارے غرق ہو گئے تھے سوائے اُن کے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے، کشتی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی جو روایت ہے کہ وہ کتنے لوگ تھے وہ اَسّی ہیں، چالیس مرد اور چالیس عورتیں، لیکن اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ اولاد صرف حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی چلی ہے، حام، سام اور یافث۔ اور اَب انسانی آبادی جتنی ہے وہ ساری کے ساری حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی ہے، گویا کہ نوح علیہ السلام ''آدمِ ثانی'' ہیں، جس طرح سے سارے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے، اسی طرح سے موجودہ آبادی جتنی ہے وہ ساری نوح علیہ السلام کی اولاد ہے، تو ان کی چھٹی ساتویں پشت کے اندر یہ قوم تھی جن کا یہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

قومِ عاد کا پس منظر اور تعارف

عاد ایک شخص کا نام ہے پھر اس کی اولاد جو پھیلی تو قبیلے کو بھی عاد کہنے لگ گئے، اور یہ بڑے قدآور اور بڑے تن آور تھے، جس طرح سے آپ دیکھتے ہیں کہ سارے انسان ہی ہیں، سارے پاکستان میں رہنے والے ہیں، لیکن کسی علاقے کے لوگ چھوٹے چھوٹے قد والے ہوتے ہیں، کسی علاقے کے لوگ بڑے بڑے قد والے ہوتے ہیں، میانوالی کے جو اصل باشندے ہیں اُن کو دیکھو گے تو بڑے لمبے لمبے قدآور، اور دوسرے علاقوں کے بسا اوقات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، اور بنگال کی طرف چلے جاؤ گے تو بالکل ہی چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔ تو یہ جو لوگ تھے یہ بہت قدآور تھے، بڑے ڈیل ڈول والے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو بدن بڑا قوی دیا تھا قوت والے تھے، تو آس پاس کے جتنے لوگ تھے اُن سب پر ان کو غلبہ حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ جس وقت حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو عذاب سے ڈرایا تو یہ کہتے ہیں کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ حم سجدہ: ۱۵) ہم سے زیادہ زور بھی کسی میں ہے جو ہمارے

اُوپر چڑھ آئے گا، کون ہمیں دبا سکتا ہے، یہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً انہی کا نعرہ تھا، ہم سے زیادہ کون ہے از روئے قوت کے، سب سے زیادہ قوت ہم میں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو ہوا کے ذریعے سے ہلاک کر دیا تھا، جس طرح سے تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

دعوتِ حق قبول کرنے کی صلاحیت کن لوگوں میں ہوتی ہے؟

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا: عاد کی طرف اُن کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا (دیکھو! الفاظ بالکل ملتے جلتے ہیں، جب ایک دفعہ ان کا ترجمہ اور تفسیر ہوگی، پھر بار بار کہنے کی ضرورت نہیں، انبیاء علیہم السلام کا وعظ ایک ہی جیسا ہے) کہا ہود علیہ السلام نے کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کیا تم ڈرتے نہیں ہو، کہا ان چوہدریوں نے، ان وڈیروں نے ان آبرودار لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا تھا اس کی قوم میں سے۔ مگر جب لیتے ہیں حق کے ساتھ تو عموماً اسی قسم کے لوگ ہی لیا کرتے ہیں، جن کو دُنیا کے اندر جاہ وجلال حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ تقسیم ہی ایسی ہے کہ جس کو دُنیا میں مال دولت، جاہ عزت مل گئی حق سے وہ محروم ہو گیا، اکثر وبیشتر یہ لوگ اپنی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں، حق چونکہ ان کی خواہشات کے ساتھ ٹکراتا ہے اور یہ اپنی خواہش کو چھوڑ نہیں سکتے، اس لیے خواہشات کے پیچھے لگ کر حق کی مخالفت کرتے ہیں، اکثر وبیشتر ایسا ہی ہوا ہے، اور غرباء اور مساکین بیچاروں کی کوئی خواہشات ہی نہیں ہوتیں، اس لیے جس وقت حق اُن کے سامنے آتا ہے تو صاف دل ہوتے ہیں، بات جلدی سے اُن کی سمجھ میں آجاتی ہے، اور وہ مان لیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والوں میں سے اکثریت اسی طرح سے مساکین کی ہوتی ہے، ان میں تکبر نہیں ہوتا، خواہشات کا غلبہ نہیں ہوتا، اس طرح سچی بات ماننا ان کے لیے آسان ہوتا ہے، اور ان (وڈیروں) کی خواہشات ڈھیروں ہوتی ہے، تو جب دیکھتے ہیں کہ اگر ہم نے مان لیا تو ہم سے یہ لذت چھوٹ جائے گی، یہ مزہ چھوٹ جائے گا، یہ عیش چھوٹ جائے گی، تو عیش اور مزے کے پیچھے مرتے ہیں، پھر وہ حق کو قبول نہیں کرتے۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں جب بھی آئے ہیں تو اسی قسم کے وڈیرے ہی آئے ہیں۔ ''کہا ان لوگوں نے جو آبرودار تھے جنہوں نے کُفر کیا تھا اُن کی قوم میں سے بے شک ہم تجھے دیکھتے ہیں بے عقلی میں'' یعنی تُو تو بے عقل ہے، تجھے تو عقل ہی نہیں ہے، جس طرح سے آج بھی دِین دار طبقے کو لوگ کہتے ہیں کہ یہ احمق ہیں، ان کو کیا عقل ہے، کمانا یہ نہ جانیں، جائیداد بنانی یہ نہ جانیں، اور کوئی ان کے پاس کسی قسم کی چیز نہیں ہے، تو آج بھی اسی طرح سے نادان بے وقوف اور گمراہ، اس قسم کے لفظ ان کے لیے بولے جاتے ہیں، جو انبیاء علیہ السلام کے وارث ہیں حق کی آواز کو بلند کرنے والے۔ ''بے شک البتہ ہم تجھے دیکھتے ہیں نادانی میں'' وَاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ: اور بے شک ہم تجھے سمجھتے ہیں جھوٹوں میں سے۔ تو جو کہتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کے فرشتے میرے پاس آتے ہیں، ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوگا، بے عقلی کی باتیں ہیں، تیری عقل ماری گئی ہے، ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں جو تو کرتا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کا حال

حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! مجھے کسی قسم کی نادانی نہیں، میرے اندر کوئی بے عقلی نہیں، لیکن میں رسول ہوں رَبّ العالمین کا (جیسے نوح علیہ السلام کا اعلان تھا ویسے ہی ان کا ہے) پہنچاتا ہوں تمہیں اپنے رَبّ کے پیغامات اور میں تمہارے

لیے خیر خواہ ہوں، اور دیانت دار ہوں، میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا، اللہ کی طرف سے جو حق آ رہا ہے میں بے کم وکاست تم تک پہنچا رہا ہوں، اپنی طرف سے میں اس میں کچھ آمیزش نہیں کرتا جو دیانت کے خلاف ہو، امانت کے خلاف ہو، میں بہت امانت دار ہوں دیانت دار ہوں تمہارا خیر خواہ ہوں میری باتوں کو توجہ سے سنو۔ ان کو بھی وہی اعتراض تھا کہ ہم میں سے ایک آدمی کو یہ کیسی چیز حاصل ہوگئی۔ ''کیا تمہیں تعجب ہے اس بات پر کہ آ گئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رَبّ کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر، تاکہ وہ تمہیں ڈرائے، یاد کرو جب بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلفاء قومِ نوح کے بعد'' جس سے معلوم ہوا کہ اُن کو قومِ نوح کا واقعہ یاد تھا کہ پہلے یہ قوم بڑی ترقی یافتہ تھی، اور یہ غرق ہوگئی، اور اس کے بعد یہ اقتدار ہمیں حاصل ہوگیا، اتنی سی باتیں تو چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں، جیسے یہاں ایک حکومت آتی ہے تو اس کو پتا ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے فلاں حکومت تھی، اور اپنی غلطیوں کے نتیجے میں وہ کس طرح سے انجام کو پہنچی، اور اب یہ حکومت کر رہے ہیں، تو جب ان کے بعد دوسرا آئے گا تو اُس کو ان کے حالات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ تو وہ بھی اسی طرح سے حوالہ دیتے ہیں کہ پہلے نوح علیہ السلام آئے تھے، اور انہوں نے قوم کو سمجھایا تھا، یہی باتیں کہیں تھیں جو میں کہہ رہا ہوں، لیکن وہ نہیں مانے تو دیکھو! ترقی یافتہ قوم کس طرح سے صفحۂ ہستی سے مٹادی گئی، کہ آج اُن کا نام ونشان موجود نہیں، آج دُنیا میں اقتدار تمہیں مل گیا، اور اگر تم وہی اُصول اپناؤ گے تو اللہ کی عدالت تو ایک ہی ہے، وہاں تو فیصلہ پھر ایک ہی نہج سے ہوگا، جو غلط اصول استعمال کریں گے وہ ویسے ہی برباد ہوں گے جس طرح سے پہلے برباد ہوگئے، یہ نہیں کہ وہاں کسی کے لیے اور باٹوں سے تلتا ہے اور کسی کے لیے کوئی دوسرا ترازو ہے، ایسی بات نہیں ہے، وہاں ہر کسی کے ساتھ ایک ہی ترازو، ایک ہی باٹ ہے، جو قوم شرک میں مبتلا ہوگئی اور غلط اُصولوں کی حامل ہوگئی، اسی طرح سے صفحۂ ہستی سے مٹادی جائے گی جس طرح سے نوح علیہ السلام کی قوم کو مٹادیا گیا، تم ان باتوں کو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹانے کے بعد تمہیں اقتدار بخشا ہے، اُن جیسے غلط اُصول نہ اپناؤ، اس طرح سے ہود علیہ السلام اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں۔ ''یاد کیجئے جبکہ بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلفاء قومِ نوح کے بعد، اور زیادہ کیا تمہیں ساخت میں، بناوٹ میں از روئے کشادگی کے'' کیسے خوبصورت بدن اللہ نے تمہیں دیے، کیسے اونچے اونچے قد اور کیسے چوڑے چوڑے بدن تمہارے ہیں، اور اس طرح سے عقل کی وسعت تمہیں کس طرح سے دی، کیسی کیسی صنعت اور کاریگریاں تم اختیار کر رہے ہو، یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ کا عطیہ ہیں، ان کو یاد کرو، اللہ کے انعامات کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ، اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو، اسی کا شکر ادا کرو۔

قومِ ہود کی بے حیائی کی اِنتہا

آگے سے اُن کی وہی بڑ ہے جو عام طور پر مشرک مارتے ہیں، قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم پُوجنے لگ جائیں ایک اللہ کو، اور چھوڑ دیں ہم ان کو جن کو پُوجا کرتے تھے ہمارے آباؤاجداد ہم اپنے آباؤاجداد کا طریقہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، بس سب سے بڑی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ جب انسان خاندانی روایات کا پابند ہوجاتا ہے، خاندانی روایات کے خلاف چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، تو قدم جب ڈگمگاتا ہے تو یہیں ڈگمگاتا ہے، رسم ورواج کے خلاف چلنا مشکل ہوگیا،

جو آباؤ اجداد کا طریقہ تھا ہم تو اسی پر چلیں گے۔ ”کیا تو آیا ہے ہمارے پاس اس لیے تا کہ پوجنے لگ جائیں ہم ایک اللہ کو اور چھوڑ دیں ہم اُن کو جن کو پُوجا کرتے تھے ہمارے آباءُ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ: یہ ڈھٹائی کی انتہا ہے، یعنی کسی کی بات پر توجہ کرنے کی بجائے یوں کہہ دیں کہ یار! کرلے جو تجھ سے ہو سکتا ہے، میں تیرا کہنا نہیں مانتا، کیا تو آئے دِن ڈراتا رہتا ہے عذاب آجائے گا، عذاب آجائے گا، جالے آعذاب، جس سے تو ڈراتا ہے، یہ آخری بے حیائی کی انتہا ہوتی ہے کہ جس کے بعد پھر سوائے تباہی کے کوئی اور بات باقی نہیں رہ جاتی، یعنی خوف اور ڈر کی بجائے آدمی ڈھیٹ ہو جائے، کہ اچھا کرلو جو کچھ کرنا ہے، تو پھر اُس کے بعد بربادی کے علاوہ کیا رہ گیا، فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ یہ ایسی ہی بات ہے کہ جب وہ بار بار سمجھاتے تھے تو کہتے تھے، کہ کیوں ہر روز پیچھے لگے رہتے ہو، جاؤ لے آؤ عذاب جس سے تم ڈراتے ہو، اگر تم سچے ہو تو لا کر دکھاؤ۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم پر عذاب کدھر سے آسکتا ہے، اتنے ہم ترقی یافتہ ہیں اور اتنے ہم نے مضبوط محل بنا رکھے ہیں، اتنی ہمیں آسائش حاصل ہے، تو عذاب کہاں سے آجائے گا، ایسے ہی باتیں بناتا ہے۔ ”لے آ ہمارے پاس وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے“ قَالَ: ہود علیہ السلام کی کلام پھر دیکھو! کتنی حقیقت پر مبنی ہے، کہ تمہاری باتوں سے معلوم ایسے ہوتا ہے کہ اللہ کا غصہ اور اللہ کا عذاب تم پر واقع ہو چکا، فیصلہ ہو گیا تم پر عذاب کا، تمہاری باتوں سے یوں معلوم ہوتا ہے، لیکن اس عذاب کا لے آنا میرے بس کی بات نہیں ہے، اب تو اس عذاب کا انتظار ہے، تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں، لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یوں سمجھو کہ تمہارا فیصلہ ہو چکا ہے، اس بات پر یقین ہے کہ اللہ کا غضب اور اللہ کا غصہ تم پر واقع ہو چکا، لیکن وہ آگے آئے گا کب، اور اس کا ظہور کب ہو گا، تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں، یہ میرے بس میں نہیں کہ لا کر دکھا دوں۔ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ ہود علیہ السلام نے کہا کہ تحقیق واقع ہو چکا تم پر تمہارے رَبّ کی طرف عذاب اور غصہ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ کیا تم جھگڑا کرتے ہو میرے ساتھ اُن ناموں کے بارے میں جو تم نے رکھ لیے، اور تمہارے آباء نے رکھ لیے وہ جو کہتے تھے مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا کیا چیز ہے؟ کسی کو مشکل کشا بنا لیا، کسی کو بچہ دینے والا کہتے ہو، کسی کو بارش دینے والا کہتے ہو، یہ تمہارے رکھے ہوئے نام ہیں، اِن میں تو حقیقت کچھ بھی نہیں، یہ تو نام ہی نام ہیں، باقی اِن کے اندر کچھ نہیں ہے، ان ناموں کے بارے میں تم میرے ساتھ جھگڑ رہے ہو؟ کسی قسم کی کوئی دلیل ان کے متعلق اللہ نے نہیں اتاری، نہ کوئی عقلی دلیل تمہارے پاس موجود، نہ کوئی فطری دلیل موجود، نہ کوئی نقلی دلیل موجود، اور بلا وجہ ہی تمہارے باپ دادا نے کسی چیز کا کوئی نام رکھ دیا، کسی کا کوئی نام رکھ دیا، اور تم سارے کے سارے انہی کے پیچھے لگے ہوئے ہو، اور بلا وجہ بغیر دلیل کے میرے ساتھ جھگڑ رہے ہو۔ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ کیا تم میرے ساتھ جھگڑا کرتے ہو فِيْٓ اَسْمَآءٍ ناموں میں؟ یعنی یہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے رکھے ہوئے ہیں، کسی کا نام رکھ لیا کہ بارش دینے والا ہے، کسی کا نام رکھ لیا کہ بچے دینے والا ہے، کسی کا نام رکھ لیا کہ یہ عزت دینے والا ہے، کسی کا نام رکھ لیا کہ یہ روزی دینے والا ہے، یہ سارے تمہارے رکھے ہوئے نام ہیں۔ ”تم نے رکھ لیے تمہارے آباء نے رکھ لیے“ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ: اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں اتاری فَانْتَظِرُوْٓا: تو تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ عذاب لے آنا میرا اختیار نہیں، اتنا میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم نے اپنا فیصلہ خود کر لیا، جب اس ڈھٹائی پر آگئے تو اللہ کی طرف سے غضب کا نشانہ تم بن گئے، باقی اس کا ظہور کب ہو گا تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

قومِ ہود کا عبرتناک انجام

فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ: پھر وہ عذاب آیا، کس طرح سے عذاب آیا وہ آگے تفصیل آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے سَخَّرَهَا عَلَیْهِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَةَ اَیَّامٍ سات راتیں اور آٹھ دن اُن پر اللہ تعالیٰ نے آندھی مسلط کی، اس ہوا کو اللہ تعالیٰ نے ان پر مسخر کردیا سات راتیں اور آٹھ دن، پورا ایک ہفتہ ان پر آندھی چلی، اور اس طرح سے پٹخ پٹخ کر مارے کہ وہ یوں گرے پڑے تھے فَتَرَى الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَةٍ (سورۂ حاقہ: ۷) اس طرح سے گرے پڑے تھے جیسے کھجور کے بودے تنے گرے ہوئے ہوتے ہیں، یوں اٹھا اٹھا کے مارے، جو کہتے تھے مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اللہ کی طرف سے عذاب آیا تو ہوا کا مقابلہ نہیں کرسکے، اور تو کسی چیز کا کیا مقابلہ کرنا تھا، سارے اٹھا اٹھا کر پٹخ دیے، یہ تفصیل آگے آئے گی۔ ''ہم نے اُس کو نجات دی یعنی ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے اپنی طرف سے رحمت کے سبب سے، اور جڑ کاٹ دی ہم نے اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
اور بھیجا ہم نے ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو، صالح علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے
مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ
اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تحقیق آگئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے، یہ اللہ کی
اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا
اُونٹنی ہے تمہارے لیے بطور نشانی کے، چھوڑو اس اُونٹنی کو، کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں، نہ چھوؤ اس کو
بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۷۳ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
بُرائی کے ساتھ، پھر پکڑ لے گا تمہیں دردناک عذاب ۝۷۳ یاد کرو جب کہ بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلیفہ
مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا
عاد کے بعد اور ٹھکانا دیا تمہیں زمین میں، بناتے ہو تم زمین کے نرم حصوں میں

قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا

محلات، اور تراشتے ہو تم پہاڑوں کو از رُوئے گھروں کے، پس یاد کرو تم اللہ کے احسانات کو اور زمین میں

فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ

فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو﴿۷۴﴾ کہا اُن بڑے لوگوں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا اُس کی

قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ

قوم میں سے (کہا) اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے گئے تھے یعنی ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائے تھے، کیا تم جانتے ہو کہ

اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

صالح بھیجا ہوا ہے اُس کے ربّ کی طرف سے، ان مؤمنین نے کہا ہم ایمان لانے والے ہیں اس چیز پر جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں﴿۷۵﴾

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

کہا اُن لوگوں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے بے شک ہم انکار کرنے والے ہیں اس چیز کا جس پر تم ایمان لائے ہو﴿۷۶﴾

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا

پس انہوں نے کونچیں کاٹ دیں اس اُونٹنی کی اور انہوں نے سرکشی کی اپنے ربّ کے حکم سے، اور کہنے لگے اے صالح! لے آ ہمارے پاس

بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے اگر تُو بھیجے ہوؤں میں سے ہے﴿۷۷﴾ پس پکڑ لیا اُنہیں زلزلے نے

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ

پس ہوگئے وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرنے والے﴿۷۸﴾ صالح علیہ السلام نے ان سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم!

لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ

البتہ ضرور پہنچایا میں نے تمہیں اپنے ربّ کا پیغام اور میں نے تم سے خیرخواہی کی، لیکن تم خیرخواہی کرنے والوں کو

النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ

پسند ہی نہیں کرتے﴿۷۹﴾ اور بھیجا ہم نے لُوط کو، جس وقت کہا لُوط نے اپنی قوم کو کیا تم بے حیائی کے پاس آتے ہو؟ نہیں سبقت لے گیا

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً

تم سے اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی ﴿۸۰﴾ بے شک تم آتے ہو مردوں کے پاس ازروئے شہوت کے

مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ

عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہو ﴿۸۱﴾ اور نہیں تھا جواب

قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ

لُوط کی قوم کا مگر یہ کہ انہوں نے کہا نکال دو ان کو اپنی بستی سے، بیشک یہ لوگ ہیں جو پاک صاف

يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾

رہتے ہیں ﴿۸۲﴾ پس ہم نے نجات دی لُوط کو اور اُس کے گھر کے افراد کو سوائے اُس کی بیوی کے، وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ﴿۸۳﴾

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم نے بَرسائی ان پر ایک خاص قسم کی بارش، دیکھ تو، جرم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا ﴿۸۴﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا: اور بھیجا ہم نے (یہ بھی اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے جو اَرْسَلْنَا نُوْحًا میں آیا) اور بھیجا ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، قَالَ يٰقَوْمِ: صالح علیہ السلام نے کہا اے میری قوم!، اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: تحقیق آ گئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے، اور اس واضح دلیل کا بیان یہ ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ: یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، ناقہ اُونٹنی کو کہتے ہیں، یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، لَكُمْ اٰيَةً: تمہارے لیے بطور نشانی کے، فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ: ذَرُوْهَا چھوڑ و اس اُونٹنی کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں، یعنی کہیں یہ چرتی پھرے اس کے سامنے رُکاوٹ نہ ڈالنا، چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کہیں سے روکو نہیں، چھوڑ و اس اُونٹنی کو کھاتی رہے اللہ کی زمین میں، وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ: اور نہ چھونا اس کو کسی بُرائی کے ساتھ، مَسّ یَمَسّ: چھونا، لَا تَمَسُّوْ نہی کا صیغہ، نہ چھوؤ اس اُونٹنی کو برائی کے ساتھ، یعنی اس کے ساتھ کوئی بُرائی کا برتاؤ نہ کرنا، بُرا برتاؤ نہ کرنا، جیسے مارنا، روکنا، ''نہ چھوؤ اس کو بُرائی کے ساتھ'' فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: پھر پکڑ لے گا تمہیں دردناک عذاب۔ وَاذْكُرُوْٓا: یاد کرو، اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ: جبکہ بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلیفہ، نائب، مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ: عاد کے بعد، وَبَوَّاَكُمْ: اور ٹھکانا دیا تمہیں فِي الْاَرْضِ: زمین میں، بَوَّاَ: ٹھکانا دینا، ''ٹھکانا دیا تمہیں زمین میں'' تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا: سُہول یہ سہل کی جمع ہے، سہل کہتے ہیں نرم میدانی زمین کو، جو پہاڑوں کے مقابلے میں میدانی

ہوتی ہے نرم زمین، اور قصور یہ جمع ہے قصر کی، قصر کہتے ہیں محل کو، ''بناتے ہوتم زمین کے نرم حصوں میں محلات'' میدانی حصوں میں تم محلات بناتے ہو، وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا: تَنْحِتُوْنَ یہ نحت سے لیا گیا ہے، تراشنا، چھیلنا، اور تراشتے ہوتم پہاڑوں کو ازروئے گھروں کے، یعنی پہاڑوں کو بھی تراش تراش کے گھر بناتے ہو، فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ: پس یاد کرو تم اللہ کے احسانات کو، وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ: عَثِيَ يَعْثٰى فساد مچانے کو کہتے ہیں، زمین میں فساد نہ مچاؤ، مُفْسِدِيْنَ یہ حال مؤکدہ ہے، جو معنی عامل کے اندر پایا گیا ہے وہی معنی اس میں ہے، مُفْسِدِيْنَ کا معنی فساد کرنے والے، اور لَا تَعْثَوْا کے اندر بھی یہی معنی موجود ہے، اس کو حال مؤکدہ کہتے ہیں، جس نے اپنے عامل والے معنی کو پکا کردیا، تو ہم محاورۃً اس معنی کو یوں ادا کریں گے ''زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو'' قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: اب آپ دیکھتے جائیں گے کہ اِن واقعات میں کوئی کوئی لفظ نیا آئے گا، ورنہ تمام واقعات میں ایک ہی جیسے الفاظ ہیں، ''کہا ان بڑے لوگوں نے، آبرودار لوگوں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا اس کی قوم میں سے'' صالح علیہ السلام کی قوم میں سے جو بڑے لوگ متکبر تھے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھ بیٹھے تھے انہوں نے کہا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا: جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا، جو کمزور قرار دیے گئے تھے، ''کہا ان سرداروں نے جنہوں نے تکبر کیا اس کی قوم میں سے ان لوگوں کو جو کمزور قرار دیے گئے تھے'' ضعیف قسم کے، ضعفاء کا گروہ، کمزور لوگوں کا ٹولہ، یہ کمزور بدن کے اعتبار سے نہیں ہوتے، عزت وجاہ اور مال دولت کے اعتبار سے جن کو گھٹیا اور کمزور سمجھا جاتا ہے، ''کہا ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے گئے تھے'' لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ: یہ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے بدل ہے، یعنی ان لوگوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے تھے، اَتَعْلَمُوْنَ: کیا تم جانتے ہو اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: کہ صالح بھیجا ہوا ہے اس کے رَبّ کی طرف سے، قَالُوْٓا: ان مستضعفین نے کہا، ان مؤمنین نے جو اس معاشرے کے اندر دبے دبائے تھے جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا جو ایمان لانے والے تھے انہوں نے اِن متکبرین کو جواب دیا کہ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ: ہم اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں ایمان لانے والے ہیں، ہم ایمان لانے والے ہیں اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں، یعنی ان کا سوال تو یہ تھا کہ تم یہ جانتے ہو؟، تمہیں پتا ہے؟ کہ صالح مرسل ہے یہ رسول ہے، اب مختصر جواب تو اس کا یہی تھا کہ ہاں ہمیں پتا ہے کہ وہ مرسل ہے، تو یہ نہیں کہا، بلکہ انہوں نے اس سے بڑھ کے جواب دیا کہ ان کا مرسل ہونا تو ہمارے نزدیک ایسا یقینی ہے کہ جو باتیں بھی وہ اللہ کی طرف سے لائے ہیں ہم نے سب مان لیں، یہ زوردار جواب ہے کہ تم صرف ان کے مرسل ہونے کا پوچھتے ہو، مرسل تو وہ ہیں ہی، اور اللہ کی طرف سے جتنی باتیں لائے ہیں ہم سب پہ ایمان لے آئے، یہ زوردار جواب ہے، قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا: کہا ان لوگوں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ: بیشک ہم اس چیز کے ساتھ جس پر تم ایمان لائے ہو کفر کرنے والے ہیں، ہم انکار کرنے والے ہیں اس چیز کا جس پہ تم ایمان لائے ہو، فَعَقَرُوا النَّاقَةَ: ناقہ کا لفظ پہلے آ گیا، اُونٹنی، اور عقر کا معنی ہوتا ہے کونچیں کاٹ دینا، ''پس انہوں نے کونچیں کاٹ دیں اس اُونٹنی کی'' کونچیں کاٹ دینے سے یہاں ہلاک کرنا ہی مراد ہے، انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، چونکہ پیچھے سے جب حملہ کیا جائے کسی بھاگتے ہوئے جانور پر تو پہلے پیچھے سے کونچیں ہی کٹتی ہیں، اور پھر اس کے نتیجے میں وہ جانور مر جاتا ہے، ''پس انہوں نے کونچیں کاٹ دیں اس ناقہ کی'' وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ

رَبِّهِمْ: اور انہوں نے سرکشی کی اپنے رَبّ کے حکم سے، وَقَالُوْا: اور کہنے لگے یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ: اے صالح! لے آ ہمارے پاس وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے، تَعِدُ وعید سے ہے، جیسے کل عرض کیا تھا، وَعَدَ یَعِدُ وَعْدًا وَعِیْدًا، دونوں طرح سے آتا ہے، وعد بالخیر اور وعید بالشر ہوتی ہے، اچھے کام کا جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کو عربی میں وَعد کے ساتھ ہی تعبیر کرتے ہیں، اور جو دھمکی دی جاتی ہے وہ بھی ایک وعدہ ہی ہوتا ہے کہ اگر تم ایسے کرو گے تو میں یوں کر دوں گا لیکن اس کو وعید سے تعبیر کرتے ہیں، فرق کرنے کے لئے، کہ اچھی چیز کا وعدہ ہوتا ہے اور بُری چیز کے ساتھ دھمکی ہوتی ہے وعید ہوتی ہے،''لے آ ہمارے پاس وہ چیز جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے'' اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اگر تو بھیجے ہوؤں میں سے ہے، فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ: رَجَفَ یَرْجُفُ اس کا معنی ہوتا ہے کانپنا، کپکپی لگ جانا، اس لیے یہ لفظ زلزلے کے لئے بھی بولا جاتا ہے،''پس ان کو تھرتھراہٹ نے، کپکپی نے، زلزلے نے پکڑ لیا، پکڑ لیا انہیں زلزلے نے'' فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ: پس ہو گئے وہ اپنے گھر میں منہ کے بل گرنے والے، جاثم اصل میں کہتے ہیں جو اس طرح سے گر جائے کہ اس میں اُٹھنے کی ہمت نہ رہے، اور جب ایک آدمی اوندھے منہ گر جاتا ہے، منہ کے بل گر جاتا ہے، تو تبھی گرتا ہے جب اس کی ہمت جواب دے دیتی ہے، تو جُثُوْم بالأرض: زمین سے چمٹ جانا، ایسے طور پر گر جانا کہ اُٹھنے کی ہمت نہ ہو،''پس وہ اپنے گھروں کے اندر ڈھیر ہونے والے ہو گئے، ڈھیر ہو گئے'' جیسے مٹی کا ڈھیر لگ جاتا ہے اس میں جان نہیں ہوتی، حرکت نہیں کر سکتی، تو انسان جب یوں گر جائے کہ اس میں حرکت کرنے کی طاقت نہ رہے تو اسے یہی کہتے ہیں کہ وہیں ڈھیر ہو گیا، اردو کا محاورہ اسی طرح سے ہے،''ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرنے والے، ڈھیر ہو جانے والے'' فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ: حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے منہ پھیرا، ان سے تولی کی، ان سے منہ پھیرا، وَقَالَ: اور کہا، یٰقَوْمِ: اے میری قوم! لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ: البتہ ضرور پہنچایا میں نے تمہیں اپنے رَبّ کا پیغام، وَنَصَحْتُ لَكُمْ: اور میں نے تم سے خیر خواہی کی، وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ: لیکن تم خیر خواہی کرنے والوں کو پسند ہی نہیں کرتے، تمہیں خیر خواہی کرنے والوں سے محبت ہی نہیں۔ وَلُوْطًا: یہ بھی اَرْسَلْنَا کا مفعول ہے، اور بھیجا ہم نے لوط علیہ السلام کو، اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت، اِذْ کا عامل محذوف نکالیں گے، قابلِ ذکر ہے وہ وقت جس وقت کہا لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو، اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: فاحشہ اور فحشاء ایک ہی چیز ہے جس کا ذکر پہلے ننگے طواف کرنے کے ضمن میں آیا تھا (سورۂ اعراف: ۲۸)، بے حیائی، فاحشہ بے حیائی کی حرکت کو کہتے ہیں، اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: کیا تم بے حیائی کے پاس آتے ہو؟ یعنی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو، اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: کیا تم بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو، بے حیائی کے پاس آتے ہو، مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: نہیں سبقت لے گیا تم سے اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی، یعنی جس قسم کی بے حیائی تم نے اختیار کر رکھی ہے جہانوں میں سے اس قسم کی بے حیائی کا ارتکاب تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا، مَا سَبَقَكُمْ بِهَا: نہیں سبقت لے گیا تم سے اس بے حیائی کے ساتھ مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: عالمین میں سے کوئی بھی، اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً: یہ فاحشہ کی تفصیل ہے، وہ کیا بے حیائی ہے جو تم نے اختیار کر رکھی ہے اور اس سے پہلے کسی نے نہیں کی،''بیشک تم آتے ہو مردوں کے پاس از روئے شہوت کے، مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ: عورتوں کو چھوڑ کر، عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس تم شہوت کے طور پر آتے ہو، بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ: بل یہ

اِضراب ہوتا ہے پہلی کلام سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دلیل سے تمہارے لیے یہ مسئلہ مشتبہ نہیں ہوا کہ اس کا کوئی تقاضا ہو، کوئی دلیل ہو، بلکہ تم حد انسانیت سے نکلنے والے ہو، اَسْرَفَ: حد سے تجاوز کرنا، بلکہ تم لوگ ہو حد سے تجاوز کرنے والے، یعنی حد انسانیت سے نکل گئے ہو اس حرکت کے ساتھ، وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ: اور نہیں تھا جواب لوط کی قوم کا، لوط علیہ السلام کی قوم کا جواب نہیں تھا مگر یہ کہ انہوں نے کہا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ: نکال دو ان کو اپنی بستی سے، اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ: یہ لوگ صاف ستھرا بنتے ہیں، یہ بطور استہزا کے ہے کہ بڑے پاک صاف صوفی لوگ آگئے، ان کا ہم بدمعاشوں کے ساتھ کیا تعلق؟ ان کو یہاں سے نکال باہر کرو، ہر روز یہ اس قسم کی باتیں کر کے پریشان کرتے ہیں، اپنے پاکی جتلاتے اور ہمیں گندے کہتے ہیں، تو ان کو ان گندوں میں رہنے کی کیا ضرورت ہے، انہیں نکالو یہاں سے، یہ مطلب ہے ان کی اس کلام کا، ''نکال دو ان کو اپنی بستی سے، بیشک یہ لوگ ہیں جو پاک صاف رہتے ہیں'' فَاَنْجَيْنٰهُ: پس ہم نے لوط علیہ السلام کو نجات دی، وَاَهْلَهٗٓ: اور اس کے گھر کے افراد کو نجات دی، اِلَّا امْرَاَتَهٗ: سوائے اس کی بیوی کے، اس کی بیوی کے علاوہ باقی گھر کے افراد کو نجات دی، كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: وہ بیوی پیچھے رہنے والوں میں سے تھی، غابر: پیچھے رہنے والے، باقی رہنے والے، پیچھے رہنے والے، دونوں سے ترجمہ کیا جا سکتا ہے، وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا: اور ہم نے ان کے اوپر ایک خاص قسم کی بارش برسائی، اَمْطَرْنَا: ہم نے برسائی، عَلَيْهِمْ: ان پر، مَطَرًا: بارش، لیکن یہاں بارش پانی کی مراد نہیں ہے جس طرح سے قطرے برستے ہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ تفصیل آئے گی کہ ان پر پتھر برسے تھے، ''ہم نے ان پر ایک خاص قسم کی بارش برسائی'' فَانْظُرْ: دیکھ تو، كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ: جرم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا، دیکھ تو، اے مخاطب! تو غور کر لے، جرم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ پر ہونے والے اعتراض کا جواب

واقعات کے سلسلے میں یہ تیسرا واقعہ آیا ہے قوم ثمود کا، اور یہ عاد کی ہی شاخ ہے، اسی قبیلے کے ہی بچے کھچے لوگ، یا دوسری شاخ جس طرح سے ایک قبیلے میں سے ہوتی ہے یہ ویسے ہی ہیں، اس لیے پہلے جس قبیلے کا ذکر آیا تھا اس کو ''عادِ اُولیٰ'' کہتے ہیں، اور یہ ''عادِ اُخریٰ'' کہلاتے ہیں، تو ثمود ''عادِ اُخریٰ'' ہے، اسی قبیلے کی شاخ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ بھائی کا مطلب یہ ہے کہ صالح علیہ السلام انہی کے نسب اور نسل سے تھے، اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، یہ اُخوتِ نسبی ہے، یعنی صالح علیہ السلام ثمود کے قبیلے میں سے ہی تھے، اُن کی نسل میں سے ہی تھے۔ تو یہاں ایک نبی کو ان مشرکوں کا بھائی کہا جا رہا ہے، کہ صالح اُن کا بھائی تھا، تو یہ بھائی ہونا کوئی عیب کی بات نہیں، اور اس کی کسی کی طرف نسبت کرنے سے کوئی نقص لازم نہیں آتا، یہ جو دیوبندیوں پر لوگ عام طور پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا بھائی کہتے ہیں، آپ کے سامنے اس کی حقیقت ہونی چاہیے،

کہ حدیث شریف میں ایک روایت موجود ہے، حضرت مولانا سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اُسی کا ترجمہ کیا ہے، اور جاہل اُسی کو لے اڑے۔ بسا اوقات جاہل اپنی جہالت کی بنا پر، اور بعض لوگ پھر ضد کی بنا پر ایسا کرتے ہیں، جب دیکھتے ہیں کہ جاہل آدمی کا دماغ اس بات کو قبول کر کے مشتعل ہوتا ہے، تو انہوں نے مخالفت میں فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ لو جی! بھائی کہہ دیا، اصل یہ ہے کہ حدیث شریف میں روایت موجود ہے، حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی تھی کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ''(۱) کہ سجدہ تو ایک عبادت ہے، عبادت اپنے ربّ کی کرو، سجدہ ہمیشہ ربّ کو کرو، ''اَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ'' میں تمہارا بھائی ہوں، اپنے بھائی کی عزت کرو، جو عزت کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔ یہاں بھائی ہونا بطورِ انسان کے اور بطورِ بشر کے ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نسب تھے، ہم قبیلہ تھے، ہم قوم تھے، ہم وطن تھے، جس طرح سے صالح علیہ السلام ثمود کے بھائی ہیں، اسی طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے بھائی تھے، اپنے بھائی کی عزت کرو، میں تمہاری برادری سے ہوں، انسانی برداری سے ہوں، تو میرے ساتھ اکرام کا معاملہ کرو، باقی! ایسا کوئی معاملہ جو عبادت کا ہو وہ میرے ساتھ نہیں کرنا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، کہ انسان سارے ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں، کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ اب اسی کو وہ جاہل لے اڑے کہ دیکھو جی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا بھائی کہہ دیا، ارے بھائی، بھائی کہا جا سکتا ہے، بڑا تو اپنی جگہ رہ گیا، یہاں دیکھو! صالح علیہ السلام کو ثمود کا بھائی کہا جا رہا ہے، حالانکہ ثمود سارا قبیلہ مشرک ہے۔ اور پھر وہ روایت کے الفاظ ہیں جو اوپر بیان ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے، جا کے ذکر کیا کہ میں عمرہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں، اجازت لینے کے لیے گئے، اطلاع دینے کے لیے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یَا اُخَیَّ لَا تَنْسَنَا فِیْ دُعَائِكَ''(۲) اے بھائی! ہمیں بھی اپنی دُعا میں یاد رکھنا، بھول نہ جانا۔ تو ''بھائی'' کہہ کے خطاب کیا۔ اس طرح سے اور بیسیوں روایتیں ہیں، تو بھائی ہونے میں کون سی بات ہے؟ انسانی برداری سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، کسی کو اللہ کتنی عظمت دے دی، باقی اعظمت کی کوئی حد نہیں، ''بعد از خدا بزرگ تُوئی قصہ مختصر!'' اب اگر حضرت عبد اللہ کا کوئی دوسرا بیٹا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حقیقی بھائی ہوتے یا نہ ہوتے؟ اگر آمنہ کا کوئی دوسرا بچہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حقیقی بھائی ہوتے یا نہ ہوتے؟ اب وہ چھوٹے بھی ہو سکتے تھے کہ بڑا کوئی اور ہوتا اور یہ چھوٹے ہوتے، اب اگر وہ ایمان لے آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی بھی ہوتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا چھوٹا بھائی بھی کہتا، تو چھوٹا بھائی کہنے کے ساتھ اس کا کیا کُفر لازم آ جاتا؟ اور اگر آمنہ کا کوئی دوسرا بچہ آپ سے چھوٹا ہوتا تو وہ آپ کو اللہ کا رسول بھی مانتا، آپ پر ایمان بھی لاتا اور آپ کو اپنا بڑا بھائی بھی کہتا۔ ابو طالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کرتے تھے تو ''اے بھتیجے'' کہہ کر ذکر کرتے تھے۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور آپ کے اُمتی بھی تھے، اب اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ یہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟ تو عباس رضی اللہ عنہ کیا کہتے؟ (میرا بھتیجا ہے)، بھائی تو پھر بڑا ہوتا ہے، بھتیجا تو دوسرے درجے میں آ گیا۔ اگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے کوئی پوچھتا کہ یہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟ تو کیا جواب دیتے؟ کہ

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۲۸۳ باب عشرۃ النساء، فصل ثالث، عن عائشہؓ / مسند احمد ج ۴۱ ص ۱۹، رقم ۲۴۴۷۱۔

(۲) الاحادیث المختارۃ، رقم ۱۸۱ / نیز دیکھیں ترمذی ۲/ ۱۹۶، احادیث شتی من ابواب الدعوات۔ ولفظہ: اَیْ اُخَیَّ اَشْرِکْنَا فِیْ دُعَائِكَ وَلَا تَنْسَنَا

ہمارے بھتیجے ہیں، تو بھتیجا کہنا کون سا کفر کا کلمہ آ گیا، اُمتی بھی ہیں، کلمہ بھی پڑھتے ہیں، اللہ کا رسول بھی کہتے ہیں، لیکن رشتے کے لحاظ سے، نسل اور نسب کے لحاظ سے بھائی بھی ہو سکتے ہیں، بھتیجے بھی ہو سکتے ہیں، تو اس میں ایسی کون سی بات ہے؟ حضرت عباس ﷛ سے کسی نے پوچھا، حضرت عباس ﷛، حضور ﷺ کے حقیقی چچا ہیں، کسی نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا حضور ﷺ بڑے ہیں؟ تو حضرت عباس ﷛ نے کتنے سلیقے کا جواب دیا فرمانے لگے کہ "هُوَ اَكْبَرُ وَاَنَا اَسَنُّ"(1) بڑے تو وہ ہیں اور عمر میری زیادہ ہے، عمر میری زیادہ ہے لیکن بڑے وہ ہیں، دیکھو! اس میں علمی لطافت آ گئی، کہ عمر میری زیادہ ہے لیکن فضیلت کے اعتبار سے بڑائی اُن کو حاصل ہے۔ بہرحال یہ جو نسبی نسلی رشتے ہوا کرتے ہیں ان کے اندر نہ کوئی توہین کا پہلو ہوتا ہے نہ کوئی اور اس قسم کی بات ہوتی ہے، یہ صاف بات آ گئی کہ صالح علیہ السلام جو اللہ کے پیغمبر ہیں اُن کو ثمود کا بھائی قرار دیا، اور یہ نسلی نسبی بھائی ہیں، اور وطنی بھائی بھی ہو سکتے ہیں، کہ ایک ہی علاقے کے رہنے والے، ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے، ایک ہی قبیلے کے، اس قوم کے بھائی تھے، ہم نے انہی کو اُن کی طرف بھیجا تا کہ وہ اُن کے حالات کو اچھی طرح سے جانتے ہوئے انہیں سمجھائیں۔ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت

اگلے الفاظ آپ کے سامنے گزر گئے، یہ حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ ہے، سب سے پہلے آ کر توحید بیان کی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صالح علیہ السلام انہیں تبلیغ کرتے رہے، سمجھاتے رہے، قوم کے ساتھ الجھاؤ رہا، یہ کوئی ایک دِن کی بات نہیں ہوتی کہ یوں بات ہوئی، انہوں نے یہ کہا اور یہ جواب آیا اور عذاب آیا اور ہلاک ہو گئے، صبح سے لے کر شام تک قصہ ختم ہو گیا، ایسی بات نہیں، یہ برسوں کا جھگڑا ہوتا ہے، واقعہ جب نقل کیا جائے گا وہ تو ایسے ہی ہو گا، لیکن آپ واقعے کے لحاظ سے تفصیل میں جس وقت آئیں گے تو اس میں وہ برسوں کی بات ہے، مختلف قسم کے اُن کی طرف سے اِعتراضات، اِشکالات ہوتے، صالح علیہ السلام پوری خیر خواہی کے ساتھ، دِل سوزی کے ساتھ، جگر سوزی کے ساتھ اُن کو سمجھاتے۔

ناقۂ صالح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں؟

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا، کہ ہماری مرضی کے مطابق اگر آپ ایک نشانی اور معجزہ دکھا دیں تو پھر ہم مان جائیں گے، اور وہ یہ ہے کہ یہ پہاڑی جو سامنے ہے اس میں سے ایک گابھن اُونٹنی نکل آئے، پتھر میں سے ایک اُونٹنی پیدا ہو جائے، ہماری آنکھوں کے سامنے اگر اس طرح سے ہو جائے تو پھر ہم مان جائیں گے، صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کا یہ معجزہ ظاہر کر دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چٹان پھٹی، یا وہ پہاڑ پھٹا اور اس میں سے اُونٹنی باہر آ گئی، تو یہ اُونٹنی جو کہ عام عادت کے خلاف پیدا ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی عام عادت تو یہی ہے کہ اُونٹنی اُونٹنی سے پیدا ہوتی ہے، نسل یونہی چلتی ہے، لیکن پتھر میں سے اُونٹنی نکل آئے یہ اللہ کی عام عادت کے خلاف ہے، اس لیے اس کو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ قرار

(1) مرقاۃ شرح مشکوۃ کتاب الایمان کی حدیث نمبر ۹ کے تحت/ نیز دلائل النبوۃ لابی نعیم، رقم ۸۴/ دلائل النبوۃ للبیہقی ۳۱/۲ باب سن رسول اللہ.

دیا گیا، اور اسی وجہ سے اس ناقہ کو نَاقَۃُ اللہِ کہا گیا، کہ یہ اللہ کی اُونٹنی ہے، جس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت عام حالات کے خلاف ہوئی، جس طرح سے انسان عام طور پر پیدا ہوتے ہیں ویسے عیسیٰ علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے، بے باپ کے پیدا ہوئے، اس میں باپ کی وساطت نہیں ہے، اس لیے ان کو "کلمۃُ اللہ" کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئے ہیں، اور اسباب کا سلسلہ یہاں آکر ختم ہو گیا، تو ان کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا، اسی طرح سے یہاں بھی اس ناقہ کی نسبت "نَاقَۃُ اللہِ" کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی گئی، اور اس کو حضرت صالح علیہ السلام کی نشانی اور معجزہ قرار دیا گیا، جو نشانی انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت پر مانگی تھی تو وہ نشانی آ گئی۔

"نَاقَۃُ اللہِ" کے حالات

اور اس اُونٹنی کے حالات بھی کچھ عجیب وغریب تھے، عام اُونٹ اور اُونٹنیوں کے مقابلے وہ عظیم الجثہ تھی، بڑے قد کی تھی، کھانا پینا اس کا زیادہ تھا بمقابلہ دوسرے اُونٹوں کے، اور جدھر وہ جاتی دوسرے جانور ڈر کر بھاگ جاتے تھے، اس لیے وہ کسی کنویں پر پانی پینے کے لیے چلی جاتی ان کے تالاب میں، تو جتنا پانی ہوتا سارا پی جاتی، اب مانگ تو لی اپنے منہ سے، اور اللہ تعالیٰ نے وہ عجیب الخلقت اُونٹنی ظاہر کر دی، اب قوم اس معاملے میں پریشان ہونے لگ گئی، جب پریشان ہونے لگی تو صالح علیہ السلام نے باریاں باندھ دیں، کہ ایک دِن باری اس کی ہے یہ پانی پیا کرے گی، اس دِن تمہارے جانور وہاں نہ جایا کریں، دوسرے دِن تمہارے جانور پانی پی لیا کریں، اور یہ کہیں بھی پھرتی رہے اُس کو روکو نہ، منع نہ کرو، اللہ کی زمین میں اللہ کی اُونٹنی جہاں چاہے چرتی پھرے اسے نہ چھیڑنا، اگر اسے چھیڑو گے تو دیکھو! اللہ کا عذاب آ جائے گا۔

اُونٹنی کا قتل اور قوم پر عذاب

جب یہ معجزہ ظاہر ہوا تو بعض لوگ مانے، لیکن بعض جو ضدی تھے وہ اسی طرح سے اَڑے رہے، جب اَڑے رہے تو اُن کی ضد اور بڑھ گئی، جب اس اُونٹنی کی وجہ سے اُن کے جانوروں میں کچھ پریشانی سی پھیلنے لگی، یا اس قسم کی کوئی بات ہوئی، تو ضد میں آ کے آخر وہ آمادہ ہوئے کہ اس اُونٹنی کو مار دیا جائے، جان سے مار دو۔ اور اب جان سے مارنے کے لیے تیار کوئی نہ ہو، تو پھر جو عام طور پر لوگوں کے پھسلنے کی بات ہے وہ یہاں پیش آئی، جیسے روایات میں آتا ہے کہ کوئی خوبصورت عورت تھی، اور کوئی دوسرا آدمی اُس سے محبت کرنے والا تھا، اُس نے اپنے ساتھ ملاقات کے لیے یہ شرط لگا دی کہ صالح علیہ السلام کی اُونٹنی کو قتل کر دے (مظہری)، اب اس عورت کو حاصل کرنے کے شوق میں وہ اندھا بہرہ ہو کر تلوار اُٹھا کر اُونٹنی کے پیچھے لگ گیا، اور اُس کی کونچیں کاٹ کر اُس کو مار دیا، چونکہ یہ کام ساری کی ساری قوم کی منشا کے مطابق تھا، قوم بھی اس اُونٹنی سے جان چھڑانا چاہتی تھی، اس لیے اس کو ہلاکت کی نسبت ساری قوم کی طرف کر دی، فَعَقَرُوا النَّاقَۃَ قوم کے لوگوں نے اُونٹنی کو ہلاک کر دیا، نسبت سب کی طرف کر دی، کیونکہ یہ کام اُن کی منشا اور مرضی کے مطابق ہوا تھا، ورنہ یہ حرکت کرنے والا "قدار" یا "قذار" (بعض کتابوں میں دال کے اوپر نقطہ ہے اس لیے اس کو "قُذار" پڑھیں گے، اور اکثر میں نقطہ نہیں ہے تو "قُدار" پڑھیں گے)[1] "قدار بن سالف" ایک شخص تھا جس نے اس کی کونچیں

(۱) تفسیر مظہری میں "قُذار" ہے، جبکہ عام تفاسیر وغیرہ میں "قُدار" ہے۔

کاٹی تھیں، لیکن باقی قوم چونکہ اس کے ساتھ متفق تھی، دل سے چاہتی تھی کہ ایسا ہو جائے، اس لیے نسبت سب کی طرف کر دی۔ اب یہ آخری حد ہے جہاں تک کوئی قوم پہنچ سکتی ہے، کہ اپنے منہ سے ایک معجزہ مانگا، نشانی مانگی، اور اس کے ظاہر ہونے کے بعد بھی قدر نہ کی، بلکہ الٹا سرکش ہو گئے، اور اُس اللہ کی نشانی کو مٹانے کی کوشش کی باوجود حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے بار بار تنبیہ کے، اور پھر ساتھ زبان سے بھی کہہ دیا کہ لو ہم نے تو یہ کام کر دیا، تو جس عذاب سے ہمیں ڈراتا ہے، وہ عذاب لے آ۔ یہ پہلے بھی آپ کے سامنے عاد کے قصے میں آیا تھا، کہ جب کوئی قوم یہاں تک پہنچ جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اب ان کے ماننے کی گنجائش نہیں ہے، تو پھر ان پلیدوں کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت؟ پھر اللہ تعالیٰ اپنی زمین کو اس قسم کے نجس لوگوں سے پاک کر دیتے ہیں، تو پھر ان کے اوپر عذاب آیا، اور عذاب ان پر آیا تھا زلزلہ، اور اس زلزلے کے اندر کچھ اس قسم کا شور اور چیخ و پکار تھی، جس طرح سے بعض جگہ ''صیحہ'' کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تو اپنے گھروں میں یہ لوگ منہ کے بل گر گئے اور سارے کے سارے وہیں فنا ہو گئے۔

فنِ تعمیر میں قومِ ثمود کی مہارت

اور یہ قوم بہت ترقی یافتہ تھی، خاص طور پر فنِ تعمیر کے اندر ان کو بہت مہارت حاصل تھی، پہاڑوں کو تراش تراش کر بڑے خوبصورت محلات بناتے، اور میدانی علاقے کے اندر بھی اونچی اونچی عمارتیں بناتے، اور ان کے باغات اور نہروں کا ذکر بھی آپ کے سامنے سورۂ شعراء میں آئے گا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ترقی یافتہ اور بڑی متمدن قوم تھی، لیکن جب وہ حق کے مقابلے میں آ گئی، اور اپنے نبی کا انہوں نے کہنا نہ مانا تو ایسی صورت میں پھر سارے کے سارے فنا کر دیے گئے، یہ تاریخ بھی دوہرائی جا رہی ہے۔ اور مدینہ منورہ سے یا مکہ معظمہ سے شام کو جاتے ہوئے راستے کے اندر یہ علاقہ آتا ہے وادیٔ حجر، اصحاب الحجر کے لفظ کے ساتھ قرآنِ کریم نے ان کو ذکر کیا ہے، اور آج کل اس علاقے کو ''مدائن صالح'' کہتے ہیں، ''مدائن صالح'' کے ساتھ ان کو تعبیر کیا جاتا ہے، اور باوجود اس بات کے کہ ہزاروں سال گزر گئے، اس وقت تک اس وادی میں پہاڑوں کے اندر ان کے بنے بنائے محلات اصل حالت میں موجود ہیں، یعنی آج بھی ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی اس فنِ تعمیر کے اندر یہ لوگ کتنا آگے نکل گئے تھے، چنانچہ اور کسی جگہ تو دیکھنے میں نہیں آیا، ''تفہیم القرآن'' جو مولانا مودودی صاحب کی تصنیف ہے، جس وقت یہ مودودی صاحب نے لکھی ہے، تو اس وقت یہ اس علاقے میں گئے تھے، اور جا کر سیر سیاحت کر کے پورے علاقے کو دیکھ کر آئے تھے، اور ہر جگہ کا انہوں نے فوٹو لیا، اور ''تفہیم القرآن'' کے اندر وادیٔ حجر کا بھی انہوں نے فوٹو دیا ہے، اور مختلف قسم کے پہاڑوں کے نقشے لے کر، دروازے وغیرہ بنے ہوئے، اور محلات کے نام و نشان ان فوٹوؤں کے اندر اس وقت تک نمایاں ہیں، اور اس وقت تک جو لوگ جاتے ہیں اور جا کر دیکھتے ہیں تو ان کو وہاں کا تمدن سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کیسے لوگ تھے؟ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے، جیسے یہ پہاڑ ہے تو تراش کر اسی طرح سے کمرہ بنا لیا۔ اور ہمارے ہاں بھی آپ قبائلی علاقے میں چلے جائیں، لنڈی کوتل کی طرف جائیں تو راستے میں جو پہاڑ آتے ہیں، تو وہاں بھی رہنے والوں نے پہاڑ کو تراش تراش کر اندر رہنے کی جگہیں بنائی ہوئی ہیں، اور کبھی آپ نمک کی کان کے اندر چلے جائیں تو وہاں دیکھیں گے کہ کھود کھود کر نمک اندر سے لاتے ہیں، اور اندر ہی انہوں نے اپنے دفتر بنائے ہوئے

ہیں، رہنے کے لئے کمرے بنائے ہوئے ہیں، تو اس طرح سے وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر مکان بناتے تھے یہ اُن کا گویا کہ ایک تمدّن کا نشان ہے، کہ اتنے متمدن تھے کہ میدانی علاقوں میں بھی اُونچے اُونچے محلات بناتے تھے، اور پہاڑی علاقوں میں بھی پہاڑ کو تراش تراش کر گھر بنانے کی اُن کو عادت تھی، لیکن جب وہ حق کے ساتھ ٹکرائے اور تکبّر میں آ گئے، تو نتیجۃً سارے کے سارے ہلاک کر دیے گئے۔

قومِ ثمود کو اِحسانات کی یاددہانی

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً: یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لیے بطورِ نشانی کے ہے، اور چھوڑ دو اسے، کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں، اور نہ چھوؤ اسے کسی تکلیف کے ساتھ، کسی برائی کے ساتھ کہ پکڑ لے گا تمہیں دردناک عذاب۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نائب بنایا قومِ عاد کے بعد، اور عاد کی ہلاکت کے قصے اُن کے ہاں مشہور ہوں گے، کیونکہ پچھلی قوموں کی تاریخ چلی آتی ہے، انہیں کہا کہ دیکھو! تم سے پہلے عاد آباد تھے، وہ کیسے تباہ ہوئے، اور اُس کے بعد تمہارا عروج ہو گیا، دنیا میں جس طرح سے چلتا ہے، ایک خاندان آتا ہے عروج پر، وہ مٹتا ہے تو دوسرا خاندان آجاتا ہے، وہ مٹتا ہے تیسرا خاندان آجاتا ہے، تو موجودہ خاندان کو پچھلے خاندان کا حوالہ دے کر سمجھایا جاتا ہے، جس طرح سے آج کل جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں آپ کے ہاں حکومت میں، انہیں یہ کہا جائے کہ بھائی! اس کرسی پر ناز نہ کرنا، تم سے پہلے جو تمہارا پیشوا (بھٹو) گزرا ہے اُس کی کرسی بڑی مضبوط تھی، اور وہ اعلان کرتا تھا کہ میری کرسی بڑی مضبوط ہے، اٹھارہ مارچ کو کرسی کے مضبوط ہونے کا اعلان کیا، اگلے سال اٹھارہ مارچ (۱۹۷۸ء) کو پھانسی کا حکم ہو گیا، جس تاریخ کو کرسی کے مضبوط ہونے کا اعلان کیا تھا اُسی تاریخ کو اگلے سال پھانسی کا اعلان ہو گیا، تو یہ مضبوط کرسیاں جب ٹوٹنے لگتی ہیں تو دیر نہیں لگتی، اس لیے ان کرسیوں پر ناز نہ کرو۔ تو جس طرح سے پچھلی قوم کا حوالہ دے کر سمجھایا جاتا ہے، اسی طرح سے یہاں بھی عاد کے حالات کا حوالہ دے کر، کہ تم سے پہلے وہ بڑے عروج پر تھے، بڑے طاقتور تھے، کہتے تھے مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (سورۂ حم سجدہ: ۱۵) ہم سے زیادہ زور آور کون ہے؟ لیکن ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس لیے تم بھی اپنی قوت پر ناز نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی پابندی کرو، یہ طرزِ تبلیغ ایسے ہی ہے۔ یاد کرو جب بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلفاء عاد کے بعد، یعنی زمین کے اندر نائب متصرف عاد کے ہلاک ہونے کے بعد تم ہو گئے، وَبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ: اور اللہ نے تمہیں زمین میں ٹھکانا دیا، تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا: بناتے ہو تم زمین کے نرم حصوں سے محلات، یعنی میدانی علاقے میں بھی تم محلات بناتے ہو وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا: اور پہاڑوں کو بھی از روئے گھروں کے تراشتے ہو، تراش تراش کر گھر بناتے ہو، یاد کرو اللہ کے احسانات کو اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو۔ کفر، شرک پھیلانا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پھیلانا یہ زمین کے اندر فساد ہے۔ ''فساد نہ پھیلاؤ!''

اکثر و بیشتر حق سے ٹکرانے والا طبقہ

آگے وہی جواب ہے جس طرح سے کہ ہود علیہ السلام کے مخاطبین نے جواب دیا تھا۔ ''کہا ان لوگوں نے جو متکبر ہو گئے اُن کی

قوم میں سے ''مَلَأ'': آبرودار لوگ، چوہدری، وڈیرے۔'' کہنے لگے وہ وڈیرے جو متکبر تھے اس کی قوم میں سے اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے''، یہ کمزور تھے مال کے اندر، جاہ کے اندر جن کو بڑائی حاصل نہیں تھی، جن کو آج کل کے محاورے میں ''کمی لوگ'' کہتے ہیں، یہ محنت مزدوری کرنے والے چھوٹے موٹے۔ اور اکثر و بیشتر حق قبول کرنے کی توفیق انہیں ہوتی ہے انبیاء ﷺ کے زمانے میں، کیونکہ ان کے لیے کوئی شہوات پرستی کے اسباب مہیا نہیں ہوتے، تکبر ان میں نہیں ہوتا، جب حق کی آواز آتی ہے اور ان کی سمجھ میں آجاتی ہے تو فوراً قبول کر لیتے ہیں، بخلاف اس کے کہ مال دار طبقہ اور صاحب اقتدار لوگ وہ چونکہ بہت خواہشات اور لذّات کے اندر مشغول ہوتے ہیں، اُن کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اس بات کو قبول کر لیا تو ہماری یہ خواہش مٹ جائے گی، یہ لذّت جاتی رہے گی، ہمارا مزہ کرکرا ہو جائے گا، وہ اکثر و بیشتر حق سے ٹکرا جاتے ہیں، دنیا کی تاریخ ایسے ہی ہے۔ اس لیے آج مذہبی طبقہ اگر آپ کو غریب نظر آتا ہے، یا غریب لوگ آپ کو مذہبی نظر آتے ہیں، تو یہ پرانی تاریخ اسی طرح سے ہے، کہ خواہشات کا قربان کرنا انہی لوگوں کا کام ہوتا ہے جن کے پاس خواہشات کے پورا کرنے کے زیادہ تر اسباب بھی نہیں ہوتے، اور جن کو اسباب مہیا ہو جاتے ہیں تو اکثر و بیشتر انسان طاغی اور سرکش ہو جاتا ہے، خود قرآنِ کریم نے کہا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (پ ۳۰، سورۂ علق) جس وقت آدمی اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے، مال والا ہے، دولت والا ہے، وہ سمجھتا ہے مجھے کسی کی ضرورت نہیں لَيَطْغٰۤى سرکش ہو جاتا ہے، انسان البتہ سرکش ہو جاتا ہے جس وقت اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے، یہ انسان کا ایک مزاج ہے۔ ''اُن لوگوں سے کہا جو کمزور سمجھے جاتے تھے، یعنی اُن لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے'' یہ بدل ہے اس سے۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام مرسل ہے اپنے رَبّ کی طرف سے'' تمہیں پتا ہے کہ یہ بھیجا ہوا ہے؟'' وہ کہنے لگے کہ ہم تو ان سب باتوں پر ایمان لے آئے جن کے ساتھ اُس کو بھیجا گیا'' یعنی بھیجا جانا تو یقینی ہے، باقی جتنی باتیں وہ لائے ہیں اپنے رَبّ کی طرف سے، ہم نے سب تسلیم کر لیں، ہم سب پر ایمان لے آئے، یہ گویا کہ اُن کے سوال کا ایک زوردار جواب ہے، ڈرنے جھجکنے کی بات نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کو رسول مانتے ہیں، اور جتنی باتیں یہ کہتا ہے ہم نے سب تسلیم کر لیں۔'' وہ کہنے لگے جنہوں نے تکبر کیا کہ بیشک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔''

قومِ ثمود کی ڈھٹائی پر اللہ کی طرف سے عذاب

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ: اس کشاکشی کا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اُونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، اسے ہلاک کر دیا۔ ''اور اپنے رَبّ کے حکم سے سرکش ہو گئے، کہنے لگے کہ اے صالح! لے آ ہمارے پاس وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے'' یعنی جس عذاب کی تُو ہمیں دھمکیاں دیتا ہے، لے آ۔ یہ انتہا ہوتی ہے ڈھٹائی کی، اگر تو مُرسلین میں سے ہے، تو وہ عذاب لے آ جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے، فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ: پھر اُن کو زلزلے نے پکڑ لیا۔ رجفۃ کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا زلزلہ، کپکپی۔ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ: ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر ڈھیر ہونے والے، یعنی ایسے گرے کہ ہلنے کی طاقت نہ رہی، منہ کے بل گر گئے، یہ بھی اُن کے اسی عجز کو بیان کرنے کی بات ہے، ورنہ جَثَمَ جثوماً کا اصل معنی ہوتا ہے کہ زمین سے یوں چمٹ جانا، کہ پھر وہاں سے ہلنے کی طاقت نہ

رہے۔ ''ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر'' دار سے مراد سارا علاقہ ہے، دار، دیار کے معنی میں ہے۔(۱) ''اپنے گھروں میں ہو گئے وہ منہ کے بل گرنے والے، گھٹنوں کے بل گرنے والے، ڈھیر ہو جانے والے'' جس لفظ سے بھی چاہیں آپ اس مفہوم کو ادا کر سکتے ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب

جب یہ واقعہ پیش آ گیا تو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا۔ اس میں مفسرین کی دونوں رائیں ہیں، کہ صالح علیہ السلام نے عذاب آنے سے پہلے یہ کہا تھا یا عذاب میں ہلاک ہونے کے بعد کہا تھا، یہ اگلی کلام جو حضرت صالح علیہ السلام کی آ رہی ہے۔ اگر پہلے کہی تھی تو بات واضح ہے کہ اپنی قوم کو کہتے ہیں کہ اے میری قوم! میں نے تو جتنا سمجھانا تھا تمہیں سمجھا لیا، جتنی خیر خواہی میں کر سکتا تھا میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کر لی، لیکن میں کیا کروں تم خیر خواہ کو اچھا ہی نہیں سمجھتے، تمہیں اپنے خیر خواہ سے نفرت ہے، اور جو تمہیں تباہی کے راستے کی طرف لے جاتے ہیں، وہ تمہارے لیڈر ہیں، اُن کے لیے تم زندہ باد کے نعرے لگاتے ہو، اُن کے قصیدے پڑھتے ہو جو تمہیں بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں، لیکن جو تمہیں صحیح بات بتاتا ہے، خیر خواہ ہے، وہ تمہیں اپنا دشمن قوم کا دشمن اور غدار نظر آتا ہے، تم نصیحت کرنے والے کو خیر خواہی کرنے والے کو اچھا ہی نہیں سمجھتے، یہ اظہار افسوس ہے۔ اور اگر وہ ہلاک ہو گئے تھے، بعد میں اُن کی لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر صالح علیہ السلام کہتے ہیں، تو یہ بھی ایک حسرت کا اظہار ہے، جیسے ایک آدمی کو آپ نے سمجھایا کہ بھائی! ادھر نہ جانا، ادھر سانپ ہے، ڈس لے گا، لیکن آپ کے روکنے کے باوجود وہ ادھر چلا گیا، اور سانپ نے ڈس لیا، اور مر گیا، اور جب آپ وہاں جاتے ہیں، اور اُس کو پڑا ہوا دیکھتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ میں نے تو تجھے بہت سمجھایا تھا، لیکن تُو نے ایک نہ مانی، اس وقت یہ ایک اظہار افسوس ہوتا ہے، اور اس میں فائدہ یہ ہوتا ہے، کہ دوسرے لوگوں کے ذہن میں یہ بات آ جائے کہ دیکھو! خیر خواہوں کی بات ماننے میں بہتری ہوتی ہے، اگر کوئی خیر خواہ کی بات نہیں مانتا تو یہ نتیجہ نکلتا ہے، اس بات کے اظہار میں دوسرے سننے والوں کو تنبیہ ہوتی ہے۔ اے میری قوم! لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ: میں نے تمہیں اپنے رَبّ کا پیغام پہنچا دیا، وَنَصَحْتُ لَكُمْ اور تم سے خیر خواہی کر لی وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو، خیر خواہوں کو اچھا ہی نہیں سمجھتے۔ یہ واقعہ ختم ہوا۔

حضرت لُوط علیہ السلام کے علاقے کا مختصر تعارف

چوتھا واقعہ...... وَلُوْطًا: اور بھیجا ہم نے لُوط علیہ السلام کو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، اصل میں یہ عراق کے علاقے کے رہنے والے ہیں، بصرہ کے آس پاس علاقہ ہے بابل کا، حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں کے تھے، جہاں نمرود کی حکومت تھی، عراق کا علاقہ۔ اور حکومت کے ساتھ ٹکرانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کی تھی، اور ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والے یہی تھے، قرآنِ کریم میں جس طرح آئے گا فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (سورۂ عنکبوت: ۲۶) ایمان لائے اُن پر لُوط علیہ السلام، یہ بھتیجے ہیں۔ تو آپ کی بیوی حضرت سارہ اور یہ بھتیجا لُوط، یہ بھی آپ کے ساتھ ہی ہجرت کرنے والے ہیں۔ ہجرت کر کے جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام شام کے علاقے میں پہنچے، تو اُردن کے کنارے پر جو کنعان کا علاقہ کہلاتا ہے، وہاں آ کر آپ نے قیام کیا، اور اُردن کا وہ علاقہ جسے

(۱) فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ أَيْ بَلَدِهِمْ. وَقِيلَ: وُحِّدَ عَلَى طَرِيقِ الْجِنْسِ. وَالْمَعْنَى: فِي دُورِهِمْ (قرطبی)

دریائے اُردن کا مغربی کنارہ کہتے ہیں، جو اسرائیل کے قبضے میں ہے، وہاں اب بھی ایک بستی ہے، اس کا نام ہے "قریۂ خلیل"، اور وہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے، تو یہ تاریخی طور پر ایک ثبوت ہے کہ یہ علاقہ تھا جہاں آ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام ٹھہرے تھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا مرکز وہاں بنایا، اور دوسری آبادی جو اس کنعان سے کچھ فاصلے پر تھی، وہ بھی آج کل اسرائیل کے قبضے میں ہے، نقشے کے اندر لکھا ہوا کبھی آپ دیکھیں گے "بحرِمیت"، یا کسی جگہ لکھا ہوتا ہے "بحرِ لُوط"، انگریزی میں اس کو کہتے ہیں: "Dead Sea"، مُردہ سمندر، بحرِمیت: مُردہ سمندر، یا اس کو "بحرِ لُوط" لکھتے ہیں نقشوں میں، یہ پانی کی ایک جھیل ہے، اس کا پانی بہت زہریلا ہے، کوئی جاندار چیز اس میں زندہ نہیں رہتی، پانیوں کے اندر جو جانور ہوا کرتے ہیں مینڈک، مچھلی، کچھوا وغیرہ عام طور پر پانیوں میں ہوتے ہیں، اس پانی میں کوئی جاندار چیز زندہ نہیں رہتی، اُس کو "بحرِمیت" کہتے ہیں یا "بحرِ لُوط" کہتے ہیں، یہ علاقہ تھا جس میں ایک بڑا مرکزی شہر "سدوم" تھا، اور اس کے اردگرد بستیاں تھیں، حضرت لُوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سدوم کے اندر ٹھہرایا تھا، کہ آپ اس علاقے کے اندر تبلیغ کریں۔ تو وہ علاقہ جو برباد ہوا اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے کے ساتھ ایسا تلپٹ ہوا، ایسا اُلٹا پلٹا گیا، کہ اب وہ صرف ایک جھیل کی شکل میں موجود ہے، اس میں زہریلا پانی ہے، باقی کسی جگہ کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا، وہ علاقہ اس وقت بھی ممتاز ہے، اس کو "بحرِ لُوط" کہتے ہیں یا "بحرِمیت" کہتے ہیں، اس کے اندر کوئی جانور زندہ باقی نہیں رہتا، اس قسم کا اس کا پانی ہے، گویا کہ عذاب کے اثرات اُس میں اِس وقت تک نمایاں ہیں، وہ علاقہ ہے، جس میں مرکزی بستی سدوم تھی، اور اُس کے اردگرد کچھ اور بستیاں تھیں، کیونکہ کئی بستیوں کا ذکر ہے، اِن کو مُؤْتَفِكَات کے ساتھ قرآنِ کریم نے تعبیر کیا، اُلٹ جانے والی بستیاں، معلوم ہوتا ہے کہ کئی بستیاں تھیں، اور مرکزی شہر سدوم تھا، یہاں حضرت لُوط علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ حضرت لُوط علیہ السلام یہاں نسب اور نسل کے اعتبار سے ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں، ہاں! البتہ وہاں چونکہ رہن سہن ہو گیا، اور انہی میں شادی کر لی، میں نے عرض کیا نا کہ یہ کوئی چند دِنوں کا واقعہ نہیں ہوتا، کہ چند لفظوں میں ذکر ہو گیا تو آپ سمجھیں کہ شاید اتنی بات ہے، وہاں جا کر مبلغ ہونے کی حیثیت میں ٹھہر گئے، انہی میں شامل ہو گئے، انہی میں شادی کر لی، انہی میں رہنا سہنا ہو گیا، تو ایسے ہو گئے، جیسے کہ ایک ہی قوم ہوتے ہیں، یہاں قومیت اُن کی ان کے ساتھ علاقہ اور وطن کے اعتبار سے ہے، ورنہ نسل کے اعتبار سے حضرت لُوط علیہ السلام ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں، یہ تو عراق کے علاقے سے آئے تھے، لیکن وہاں رہائش اختیار کر لی اور ایسے ہو گئے جیسے اسی قوم کے فرد ہوتے ہیں۔

لُوط علیہ السلام کے وعظوں میں زیادہ تر کس چیز کا ذِکر ہے؟

تو اللہ تعالیٰ نے لُوط علیہ السلام کو جو بھیجا تھا، تو وہ قوم کُفر وشرک میں بھی مبتلا تھی، اس میں کوئی شک نہیں ہے، اس لیے حضرت لُوط علیہ السلام کی دعوت میں توحید کا ذکر بھی آئے گا دوسرے قصوں میں، یہاں نہیں ہے، لیکن ایک بات اُن میں اس قسم کی پائی جاتی تھی، اتنی گندی اور اتنی لچر قسم کی کہ حضرت لُوط علیہ السلام کی نظر جب اُٹھتی، تو قوم کے اسی عیب پر اُٹھتی، کہ جب تک یہ لوگ اتنی فحش اور اتنی بےحیائی کی حرکت سے باز نہیں آتے، ان کو باقی نیکی کی تلقین کیا کرنی ہے۔ ایک آدمی کافر ہے، مشرک ہے، بت پرست ہے، قبریں

پُوجتا ہے، ہر قسم کا عیب اُس کے اندر موجود ہے، آپ اُس کو سمجھانے کے لیے گئے، اُس کے گندے عقیدے جو ہیں، وہ تو ایک باطنی گندگی ہے، آپ نے اُس کو سمجھانا ہے، لیکن جس وقت آپ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیٹھا وہ گوبر چاٹ رہا ہے یا پاخانہ کھا رہا ہے، آپ جاتے ہی پہلے اُس کو اس نجاست سے نکالنے کی کوشش کریں گے، کہ جس کو اتنی تمیز نہیں کہ یہ کھانے کی چیز نہیں ہے، یہ چاٹنے کی چیز نہیں ہے، اتنا گندا اتنا لچر آدمی، اس کو دوسری باتیں کیا سمجھانی ہیں، پہلے اس کی یہ عادت تو چھڑاؤ، جب تک یہ اس ظاہری نجاست سے نہیں بچتا اور صاف ستھرا نہیں ہوتا تو اس کو اور کیا سمجھائیں۔ اب اس کا یہ معنی نہیں کہ کُفر کے مقابلے میں گوبر کھانا زیادہ بُرا ہے، گوبر کھانا ایک عمل ہے، اور کُفر ایک اعتقاد ہے، لیکن بعض عادتیں ظاہری طور پر اس قسم کی بُری ہوتی ہیں کہ جب تک وہ نہ چھڑائی جائیں اگلی بات سمجھانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، اس لیے حضرت لُوط علیہ السلام کی وعظوں میں توحید کا اتنا تذکرہ نہیں ہے، ردِّ شرک کا اتنا ذکر نہیں ہے، جتنا کہ اس بدعادت کے اوپر تنقید حضرت لُوط علیہ السلام کی قرآن نے نقل کی ہے، اور یہ بدعادت ان میں کیا تھی؟ جس کے اندر وہ قوم کی قوم ہی مبتلا تھی، پوری بے حیائی اور بے غیرتی کے اندر مبتلا تھے، یہ تھی اُن کے اندر بدعادت جس کو آج کل ''لونڈا بازی'' سے تعبیر کرتے ہیں، مرد کا مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرنا۔

لفظ ''لواطت'' مُحدَث ہے

اور اس کے لیے آپ کی کتابوں میں ''لواطت'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ لفظ ٹھیک ہے کہ اب فقہ کی کتابوں میں بھی آتا ہے، شراحِ حدیث نے بھی لکھا ہے، ادب کی کتابوں میں بھی آتا ہے، لیکن یہ لفظ مُحدَث ہے، بعد کا بنا ہوا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزولِ قرآن کے وقت، آپ کی احادیث مرتب ہونے کے وقت یہ لفظ نہیں تھا، اس لیے کسی روایتِ حدیث میں ان کے بدفعل کو ''لواطت'' کے لفظ سے ذکر نہیں کیا گیا، اور نہ قرآنِ کریم نے یہ لفظ ذکر کیا ہے، اور یہ لفظ ہے بھی بڑا مستقبح، قبیح سمجھا ہوا، کوئی اچھا لفظ نہیں ہے، کیوں اچھا لفظ نہیں؟ کہ بدکردار تو قوم تھی، اور اُن کے عمل کی تعبیر کے لیے لفظ جو اختیار کیا گیا وہ حضرت لُوط علیہ السلام کے نام سے لے لیا گیا، لُوط علیہ السلام کے نام سے یہ لفظ ''لواطت'' بنالیا گیا، لُوط علیہ السلام کا اس کام سے کیا تعلق تھا، کہ آپ کے نام کو اس کے لئے ماخذ بنالیا گیا، اس لیے اب اس عمل کے لیے جو صیغہ آتا ہے لَاطَ یَلُوْطُ لِوَاطَۃً، مرد کا مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرنا، اب یہ لفظ یوں استعمال ہوتا ہے، اور اس کا ایک اتنا بُرا اثر یہ پڑا کہ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عقیدت کی بناء پر ایک شخص ''موسوی'' کہلا سکتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عقیدت کے طور پر ایک شخص ''عیسوی'' کہلا سکتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت کی بنا پر ایک آدمی ''محمدی'' کہلا سکتا ہے، ابراہیمی کہلا سکتا ہے، کسی نبی کے نام کے ساتھ ''یاء'' نسبت کی لگا کر آپ اپنے ساتھ برداشت کر سکتے ہیں، لیکن لُوط علیہ السلام کا نام اس درجے میں آ گیا کہ کوئی شخص اس کے ساتھ ''یاء'' نسبت کی لگا کر اپنے لیے استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، کہ اپنے آپ کو ''لُوطی'' کہنا شروع کر دے، کیونکہ جس وقت یہ ''لوطی'' کا لفظ آپ بولیں گے تو جلدی سے ذہن ادھر جاتا ہے، کہ اس کو وہ عادت ہے مرد کے ساتھ قضائے شہوت کرنے کی، لونڈا بازی کی، لُوطی اُسے کہتے ہیں۔ تو گویا کہ ایک نبی کا نام کتنے بُرے کام کے لیے استعمال ہو گیا، اس لیے یہ لفظ اچھا نہیں، جس نے پہلے پہلے اس لفظ کو بنایا ہے، اُس نے اس

نام پر ظلم کیا ہے، لیکن بعد میں جب ایک چیز عام ہو جاتی ہے تو پھر سارے استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں جہاں اس لفظ کا ذکر آیا ہے، اس عمل کا ذکر آیا ہے، تو اتنی لمبی ترکیب حضور ﷺ استعمال کرتے ہیں: ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ''[1] یہ روایت مشکوۃ میں موجود ہے۔ جو قومِ لُوط جیسا عمل کرے تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دیا کرو۔ تو اتنی لمبی ترکیب کی ہے ''یَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ''، یوں مختصر نہیں کہہ دیا لاط۔ اگر یہ لفظ اس وقت مستعمل ہوتا تو لاط ایک ہی لفظ اس سارے مفہوم کو ادا کرتا، لیکن یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا، ''مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ'' قومِ لُوط والا عمل جو شخص بھی کرے تو فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دیا کرو۔

عملِ قومِ لُوط خالص شیطنت ہے

اس حرکت کے اندر یہ مبتلا تھے، اور یہ حرکت خلافِ فطرت، خلافِ عقل، خلافِ نقل ہے، کوئی اس کے اندر جواز کا شبہ نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت اس قسم کی بنائی ہے، بلکہ انسان کی نہیں حیوان کی بھی! ہر حیوان کی یہ فطرت ہے، کہ نَر کو مادہ کی طرف رجحان ہے، اور اسی تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ آگے نسل چلاتا ہے، نَر کا رُجحان مادہ کی طرف ہوتا ہے، تو انسان بھی حیوانوں میں سے ایک ترقی یافتہ اعلیٰ قسم کا حیوان ہے، جیسے آپ کہتے رہتے ہیں: ''کُلُّ اِنْسَانٍ حَیَوَانٌ'' تو اس کی فطرت بھی ایسی ہے کہ اس میں نَر کا رُجحان مادہ کی طرف ہے فطری طور پر، نَر کا رُجحان نَر کی طرف یہ حیوان کی تاریخ میں نہیں ہے، انسان کو چھوڑو، باقی جنس حیوان کو اگر آپ دیکھیں تو آپ کو کوئی حیوان نظر نہیں آئے گا کہ قضائے شہوت کے لیے نَر، نَر کی طرف متوجہ ہو، کسی کتے کو آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کتے کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، کسی مرغے کو آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ مرغے کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

خلاصۂ آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلُوْطًا: یہ مفعول ہے ارسلنا کا، اَرْسَلْنَا لُوْطًا، اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ: ہم نے لُوط کو بھیجا، قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم کو، اِذْ کا عامل محذوف نکالیں گے، یاد کیجئے اس وقت کو جبکہ کہا انہوں نے اپنی قوم کو، اُذْكُرْ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ۔ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ: فاحشہ: بے حیائی کا کام۔ کیا تم فاحشہ پہ آتے ہو؟ لفظی ترجمہ یوں ہوتا ہے، کیا تم فاحشہ پہ آتے ہو؟ لیکن یہاں اِتیانِ فاحشہ سے مُراد اِرتکابِ فاحشہ ہے۔ کیا تم بے حیائی کا اِرتکاب کرتے ہو؟ بے حیائی کا عمل کرتے ہو؟ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: نہیں سبقت لے گیا تم سے اس بے حیائی کے ساتھ جہانوں میں سے کوئی بھی، یعنی پہلے کسی نے یہ بے حیائی نہیں کی جس قسم کی بے حیائی تم نے شروع کر رکھی ہے، کہ تم صرف بے حیائی نہیں کرتے بلکہ اس بے حیائی کے موجد ہو، ایجاد

---

(۱) مسند بزار، رقم ۹۰۷۹۔ نیز ترمذی ۱/۲۷۰۔ مشکوۃ ۲/۳۱۲، کتاب الحدود۔ ولفظھما: من وجدتموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ۔

کرنے والے ہو، وہ بے حیائی کیا ہے؟ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً: بیشک تم البتہ آتے ہو مردوں کے پاس از روئے شہوت کے، مِنْ دُوْنِ النِّسَآءِ: عورتوں کو چھوڑ کر، بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ: بلکہ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو۔ قوم کو افراد کے معنی میں کر کے ترجمہ جمع کا کر رہا ہوں، جس طرح سے آگے مسرفون جمع آ گیا۔ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو، وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ: نہیں تھا لُوط کی قوم کا جواب مگر یہ کہ کہا انہوں نے اَخْرِجُوْهُمْ: نکال دو ان کو، مِّنْ قَرْيَتِكُمْ: اپنی بستی سے، اِنَّهُمْ اُنَاسٌ: بیشک یہ لوگ ہیں يَّتَطَهَّرُوْنَ: صاف ستھرا رہتے ہیں، بیشک یہ صاف ستھرا رہنے والے لوگ ہیں، پاک صاف لوگ ہیں، ان کو اپنی بستی سے نکال دو، فَاَنْجَيْنٰهُ: پھر ہم نے اس لُوط کو نجات دی، علیہ السلام، وَاَهْلَهٗٓ: اور اس کے متعلقین کو نجات دی، اِلَّا امْرَاَتَهٗ: سوائے اس کی بیوی کے، كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ اس کی بیوی جو تھی وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی، وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا: اور ہم نے ان کے اُوپر بارش برسائی خاص قسم کی بارش، پانی کی بارش مراد نہیں، پتھروں کی بارش مراد ہے، جیسے کہ تفصیل دوسری آیات میں موجود ہے، فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ: پس دیکھ تو، کیسا انجام ہوا جرم کرنے والوں کا۔

تفسیر

لُوط علیہ السلام کا تعارف، قومِ لُوط کا علاقہ

یہ آیات کل بھی آپ کے سامنے زیر بحث آئی تھیں، ترجمہ بھی کچھ عرض کر دیا گیا تھا اور قومِ لُوط کے ابتدائی حالات بھی آپ کے سامنے آ گئے تھے، لُوط علیہ السلام یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجا ہیں، اور آپ کے ساتھ ہی ہجرت کر کے آئے تھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ کنعان کے علاقے میں دریائے اُردن کے کنارے پر آ کر آباد ہو گئے تھے، اور آج بھی وہ قریہ خلیل ہے جس کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے، اور سن ۶۷ء (۱۹۶۷ء) کی جنگ میں اس پر اسرائیل نے قبضہ کیا، پہلے وہ شاہِ اُردن کے قبضے میں تھی، اس آباد علاقے میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا مرکز بنایا، اور وہاں سے کچھ فاصلے پر دوسری آبادی ہے جس کا مرکزی شہر ہے سدوم، اور اس کے ارد گرد اور بستیاں بھی ہیں، اس لیے قرآنِ کریم نے ان کو جمع کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا، مُؤْتَفِكَات: پلٹا کھانے والی بستیاں، اُلٹی جانے والی بستیاں، جس سے معلوم ہوتا ہے کئی بستیاں تھیں، لیکن ان کی مرکزی جگہ سدوم کہلاتی تھی، تو حضرت لُوط علیہ السلام کو جس وقت اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنایا تو ان کو اُس مرکز میں متعین کر دیا گیا تبلیغ کرنے کے لئے، یہ علاقہ ویران ہے اور اسرائیل کے ہی قبضے میں ہے، وہاں چھوٹی سی جھیل ہے بحرِ لُوط، اور بحرِ میّت کا لفظ اس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یعنی وہ سمندر کی شکل کی ہے لیکن پانی اس کا ایسا زہریلا ہے کہ اس میں کوئی جاندار چیز زندہ نہیں رہتی، جس طرح سے عام طور پر پانی کھڑے ہوتے ہیں تو اس میں مینڈک کچھوے ہر چیز پیدا ہو جاتی ہے، تو اُس میں کوئی ایسی چیز نہیں، اس لیے اس کو ''بحرِ میّت'' کہتے ہیں، تو تاریخی طور پر تو ثابت ہے کہ حضرت لُوط علیہ السلام کے مخاطب جو لوگ تھے وہ اسی علاقے کے اندر آباد تھے، برباد ہونے کے بعد ان کے علاقے کا یہ حال ہو گیا۔

لُوط علیہ السلام کی تقریروں میں توحید کی بجائے زیادہ تر ان کے فعلِ بد پر اِنکار کیوں ہے؟

تو وہ جو لوگ تھے سدوم کے رہنے والے وہ کُفر وشرک میں بھی مبتلا تھے، اس لیے قرآنِ کریم میں بعض جگہ حضرت لُوط علیہ السلام کی تقریروں میں توحید کی تعلیم بھی ہے، لیکن زیادہ تر تذکرہ جو ہے وہ ان کے اس بے حیائی کے ارتکاب کا ہے جو آپ کے سامنے یہاں بھی آیات میں ذکر کیا گیا ہے، وجہ ظاہر ہے، کہ ان لوگوں میں عقیدے کی نجاست بھی تھی، عقیدے کی پلیدی میں بھی وہ مبتلا تھے، کافر تھے، مشرک تھے، لیکن سب سے زیادہ ظاہری طور پر جو ان کے اخلاق میں بگاڑ تھا وہ ایسا بگاڑ تھا کہ جس وقت تک ان کو اس قبیح حرکت سے روکا نہ جائے دوسری بات ان کے لئے سمجھانی بے سُود ہے، اور جو اس قسم کی گندگی کے اندر ظاہری طور پر آلودہ ہوتے ہیں وہ باطنی گندگی سے کسی صورت میں بھی صاف نہیں ہو سکتے، اس لیے حضرت لُوط علیہ السلام کی تقریروں میں زیادہ تر انکار جو آ رہا ہے وہ قومِ لُوط کی اس بے حیائی پر آ رہا ہے۔

لفظِ ''لواطت'' محدَث ہے

اور وہ حرکت جس کے اندر وہ مبتلا تھے اس کو قرآنِ کریم نے فاحشہ کے لفظ کے ساتھ ادا کیا ہے، اور آج کل کے محاورات میں اس کو ''لواطت'' کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے کل آپ کے سامنے تفصیل عرض کی تھی یہ ''لواطت'' کا لفظ محدَث ہے، یہ لفظِ لُوط سے بنا لیا گیا، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ لفظ اس معنی میں مستعمل نہیں تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو ذکر کرتے ہیں تو عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، ''جو شخص قومِ لوط والا عمل کرے''، مفرد لفظ کے ساتھ اس کی تعبیر نہیں کی گئی، اُس وقت تک یہ لفظ نہیں تھا، بعد میں ادبِ عربی کے اندر یہ لفظ پیدا ہوا، اور پھر یہ فقہ کی کتابوں میں، تفسیر کی کتابوں میں، شارحین نے، ہر ایک نے استعمال کیا، اب یہ لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ نبی کے نام سے جو اس کو مشتق کر لیا گیا یہ کسی درجے میں اچھا نہیں ہوا، کیونکہ اب ''لُوطی'' جس وقت کسی کو کہا جائے تو ''موسوی'' کہلانے میں کوئی عزت محسوس کر سکتا ہے، ''عیسوی'' کہلانے میں کوئی عزت محسوس کر سکتا ہے، کوئی شخص اپنے آپ کو ''محمدی''، ''احمدی'' لکھ سکتا ہے، ''ابراہیمی'' لکھ سکتا ہے، اپنے آپ کو ''داؤدی'' کہہ سکتا ہے، جتنے بھی پیغمبر ہیں ان کی طرف نسبت گوارا ہے، لیکن لُوط علیہ السلام کا نام کچھ ایسا آ گیا کہ اب اس کی طرف یائے نسبت کے ساتھ کوئی شخص اپنے آپ کو کہلوانے کے لئے تیار نہیں، کوئی اپنے آپ کو ''لُوطی'' نہیں کہلا سکتا، کیونکہ جب بھی کسی کو ''لُوطی'' کہا جائے تو نسبت اگرچہ اس کی لُوط علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے لیکن مفہوم اس کا ہے کہ قومِ لُوط والا عمل کرنے والا، اس لیے اب یہ لفظ اسی معنی کے ساتھ ہی خاص ہو گیا، جب بھی بولیں گے آپ کے ذہن میں یہی معنی آئے گا، بہرحال جب ایک لفظ بن گیا تو اب استعمال ہوتا ہے، لَاطَ يَلُوْطُ اس سے فعل استعمال ہوتا ہے۔ تو یہ بے حیائی ہے جس کو قرآنِ کریم نے اس قوم کے اندر ذکر کیا ہے، اور ساتھ یہ بھی کہا کہ جہانوں میں سے کوئی بھی تم سے سبقت نہیں لے گیا اس بے حیائی میں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی سطح پر یہ بیماری سب سے پہلے قومِ لُوط میں ہی آئی ہے، اور اس سے پہلے کسی قوم کے اندر یہ بیماری موجود نہیں تھی۔

''لواطت'' حیوانی فطرت کا تقاضا بھی نہیں، بلکہ یہ خالص شیطانی حرکت ہے

یہ فعل خلافِ فطرت ہے، اسی کی تفصیل کل آپ کے سامنے ہو رہی تھی، خلافِ فطرت اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حیوان کی فطرت یہ بنائی ہے کہ اس میں یہ دو قسمیں جو بنائیں نر اور مادہ، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت یہ تدبیر ہے کہ حیوان کی نسل اسی نر اور مادہ کے ملنے کے ساتھ پھیلتی ہے، اور ان کو آپس میں ایک دوسرے کی طرف کشش ہے، نر کا رُجحان مادہ کی طرف ہوتا ہے، اور بسا اوقات مادہ بھی اپنے جذبات کے تحت نر کی طرف رُجحان رکھتی ہے، دونوں کو ایک دوسرے کی طرف کشش ہوتی ہے، اور یہ تدبیر ہے اس عالَم کے اندر حیوانات کی نسل پھیلنے کے لئے، تو انسان بھی چونکہ حیوانوں میں سے ایک حیوان ہی ہے، ''کُلُّ انسانٍ حیوانٌ''، تو اس کے اندر بھی یہی تدبیر ہے کہ نر اور مادہ کی تقسیم ہے، دونوں کا آپس میں ایک دوسرے کی طرف رُجحان ہے، اسی کے ساتھ ہی آدم کی یہ نسل دُنیا میں پھیل رہی ہے، تو راحت کے ساتھ ساتھ لذت کے ساتھ ساتھ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ بقائے نسل ہے، یہ ہے اصل حیوانی فطرت، اور حیوانی فطرت کے اندر یہ بات نہیں کہ نر، نر کی طرف رُجحان کرے قضائے شہوت کے لئے، اس لیے آپ جملہ حیوانات کو دیکھ لیجئے، سب کا رُجحان نر کا مادہ کی طرف ہوگا، پرندوں میں دیکھ لو، چڑیا کو دیکھ لو، کبوتروں کو دیکھ لو، جس کو بھی دیکھو، جو پرندہ بھی آپ کے سامنے آئے گا، تو ان کا رُجحان نر کا مادہ کی طرف ہوتا ہے، نر کو، نر کے ساتھ قضائے شہوت کرتے ہوئے آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، صرف کتاب کے اندر ایک فقرہ نظر سے گزرا ہے، عربی کی سیرت ہے ''سیرتِ حلبیہ''، ''انسان العیون'' اس کا اصل نام ہے، لیکن ''سیرتِ حلبیہ'' کے نام سے مشہور ہے، عربی میں ہے، اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دفع یہ فقرہ نظر سے گزرا تھا کہ ''قِیْلَ وَلَا یَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ مِنَ الْحَیَوَانِ اِلَّا الْحِمَارُ وَالْخِنْزِیْرُ'' (ص ۳۳) کہ یہ فعل جس کو آج کل ''لواطت'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ پوری حیوانیت کی تاریخ میں نہیں پایا جاتا، ہاں! البتہ گدھوں میں اور خنزیروں میں یہ عادت موجود ہے، حمار اور خنزیر یہ کام کرتے ہیں، اس کے علاوہ حیوانات کے اندر یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس فقرے کو پڑھنے کے بعد (کتاب پر میرا نشان لگا ہوا ہے، جو کوئی اہم بات سامنے آجاتی ہے اس پہ نشان لگا دیتا ہوں) لیکن اس کے بعد میں نے اپنے طور پر، (خنازیر کے ریوڑ تو ہم نے دیکھے نہیں، ان کے ساتھ تو کوئی زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہ ملا، کہ انسان یہ دیکھتا کہ اُن کی عادت کیا ہے، اگرچہ اُن کی شکلیں دیکھی ہیں، پھرتے ہوئے بھی دیکھے ہیں) لیکن گدھے تو ہمارے ہاں آس پاس ہینگتے رہتے ہیں، اور آپ ہر روز سنتے رہتے ہیں، اور کئی گدھوں والوں سے میں نے پوچھا بھی، اور تحقیق بھی کی کہ کسی شخص نے اپنی زندگی کے اندر کبھی ایسا دیکھا ہو کہ کوئی گدھا گدھے کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، کسی کے سامنے کوئی واقعہ ہے؟ مجھے تو اپنی زندگی میں یاد نہیں کہ میں نے یہ دیکھا ہو، اور جتنوں سے میں نے پوچھا ہے کسی نے نہیں کہا کہ ہم نے دیکھا ہے، اس لیے وہ کتاب میں لکھنے والے نے ممکن ہے کوئی شاذ ونادر واقعہ اس قسم کا علم میں آگیا ہو، ورنہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ گدھا گدھے کی طرف رُجحان کر کے ''اِدْخَالُ الْفَرْجِ فِی الْفَرْجِ'' کے ساتھ قضائے شہوت کر رہا ہو، ہم نے آج تک یہ نقشہ نہیں دیکھا، حالانکہ ہمارے اردگرد گدھوں کی بہتات ہے، اور خنازیر کے بارے میں ہم کہہ نہیں سکتے کہ خنزیروں کے اندر بھی اس قسم کی عادت ہو، چونکہ ایسی جگہ ہمیں کوئی وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا کہ

اس جانور کے کوائف ہم دیکھتے۔ بہرحال اس کتاب کے فقرے سے ہی معلوم ہوتا ہے، کہ باقی حیوانوں کے اندر یہ بات نہیں کہ نر قضائے شہوت کے لیے نر کی طرف رُجحان کرے، لہٰذا اس حرکت کو ہم حیوانی فطرت کا تقاضا بھی نہیں کہہ سکتے، اگر کوئی شخص اس بدعادت کے اندر مبتلا ہو تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ تو حیوان ہے، کیونکہ حیوان تو یہ کام کرتے نہیں، یہ تو خالص شیطانی حرکت ہے، اس کو شیطان کے بغیر کسی دوسرے کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، یہ حیوانیت کا تقاضا بھی نہیں ہے، خالص شیطنت ہے۔

عملِ قومِ لُوط کی اِبتدا

چنانچہ اس بدعادت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بعض جگہ یہ بات نظر سے گزری، کہ قومِ لوط کے اندر یہ عادت جو پھیلی تھی، اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ جب یہ بالکل خلافِ فطرت ہے، تو انسان کے دل دماغ میں فطرت کے خلاف ایسا خیال ہی نہیں آنا چاہیے، مثلاً گندگی کھانا خلافِ فطرت ہے، تو کبھی کسی شخص کا رُجحان گندگی کھانے کی طرف نہیں ہوتا، اینٹ، پتھر کھانا خلافِ فطرت ہے، تو آپ میں سے کبھی کسی کے دل میں وسوسہ نہیں آتا کہ ہم اینٹ، پتھر کھالیں، جو چیز فطرت کے خلاف ہے اُس کا دل میں خیال ہی نہیں آنا چاہیے، اور جو فطرت کا تقاضا ہے وہ خواہشات دل میں اُبھرتی ہیں، تو جب اس فعل کو ہم فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں تو آخر یہ بدعادت انسانوں میں آئی کہاں سے؟ حضرت تھانوی ﷫ نے ایک جگہ ذکر کیا ہے، اسرائیلی روایات کے اندر موجود ہے، کہ یہ بدعادت براہِ راست شیطان کی اشاعت ہے، ایک وعظ میں حضرت تھانوی ﷫ بیان فرماتے ہیں کہ ابلیس نے جس وقت انسان کو، آدم علیہ السلام کی اولاد کو بگاڑنا چاہا (جیسا کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ بات بطور چیلنج کے کہی تھی) تو وہ ایک خوبصورت لونڈے کی شکل میں ایک آدمی کے باغ میں چلا گیا، اور جا کر اُس کے باغ کو خراب کرنا شروع کر دیا، پھل توڑنے شروع کر دیے، شاخیں توڑنی شروع کر دیں، جس طرح سے گڑبڑ ہوتی ہے۔ باغ والے نے اُس کو پکڑ لیا، پکڑ کر مارا، اور مار مار کر اس کو باغ سے باہر نکال دیا۔ وہ اگلے دِن پھر آ گیا پھر اُس نے آ کر اسی طرح سے حرکتیں شروع کر دیں، باغ کو اُجاڑنے لگ گیا، تو اُس نے پھر پکڑ لیا، پھر اُس کی زبردست طریقے سے پٹائی کی، پھر اُس کو باغ سے نکال دیا۔ اگلے دِن وہ پھر آ گیا، یعنی وہ باغ والا مارتا مارتا اُس کو تنگ آ گیا لیکن وہ باغ میں آ کر گڑبڑ کرنے سے باز نہیں آیا، آخر باغ والا اُس کو پوچھتا ہے کہ بدبخت! تُو کسی طرح سے باز آ بھی سکتا ہے؟ میں تو تجھے مار مار کر تھک گیا۔ وہ کہنے لگا کہ ہاں ایک تدبیر ہے! اگر اس طرح سے کرو تو میں باز آ جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا: وہ کیا؟ تو اس نے پھر اس فعل کی نشاندہی کی کہ میرے ساتھ یوں کرو، جب میرے ساتھ یوں کرو گے تو میں یہ نقصان کرنا چھوڑ دُوں گا۔ یہ راہنمائی اُس نے کر دی۔ تو جب وہ شخص اُس کے ساتھ مبتلا ہوا تو اس کو طبعی طور پر تلذّذ حاصل ہوا، تو پھر اُس کو اس کی طرف رغبت ہوگئی۔ اس طرح سے اس فعل کی بنیاد اُٹھی، ایک سے دوسرے تک پھیلتے پھیلتے ساری قوم اس بیماری کی لپیٹ میں آ گئی۔

عملِ قومِ لُوط کا معاشرتی واخلاقی نقصان

پھر تو حال یہ ہو گیا کہ عورتوں کی طرف رغبت ختم ہوگئی، اور مرد، مردوں کی طرف ہی مشغول ہو گئے، اور ویسے بھی اس بدفعل کی خصلت ہے کہ جس کو بھی یہ عادت پڑ جائے اُس کو عورت کی طرف رُجحان نہیں ہوتا، وہ اپنی زندگی پھر اسی راستے میں برباد

کرتا ہے، عورت کی طرف رُجحان تو اس طرح سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے عورت کو کھیت قرار دیا، اور یہ فعل اس طرح سے ہے جیسے کھیتی بوئی جاتی ہے، اور اس کو پانی دیا جاتا ہے، تو اُس سے یہی نسل پیدا ہوتی ہے جو آپ کے سامنے موجود ہے۔ اور اس مقام میں جو یہ قضائے شہوت کی جاتی ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جس طرح سے بالکل بنجر ویران اور ردّی زمین کے اندر بیج بھی ضائع کردیا، پانی بھی ضائع کردیا۔ تو اس حرکت کا نتیجہ یہ ہے کہ نسل بھی منقطع، اور اس طرح سے انسان کو غیر مصرف کے اندر استعمال کرنے کے ساتھ انسانیت کی بھی پرلے درجے کی توہین ہے، اس عادت میں مبتلا ہوجانے کے بعد دُنیا اُجڑتی ہے، نسل منقطع ہوتی ہے، یوں سمجھو کہ بنجر سیراب ہونا شروع ہوگئے اور کھیتیاں اُجڑ گئیں، ویران ہوگئیں، اور اس کا نتیجہ اس دُنیا کے اندر سوائے تباہی بربادی کے اور کیا ہوتا ہے؟

عملِ قومِ لُوط زِنا سے زیادہ بُرا فعل ہے

اس لیے اس فعل کو زِنا کے مقابلے میں بھی زیادہ اَشنع (بُرا) قرار دیا گیا ہے، یعنی مرد کا عورت کی طرف رُجحان تو ایک فطری ہے، فرق یہ ہے کہ اگر اس رُجحان کو آپ شرعی قاعدے کے تحت رکھیں گے، تو آپ کامل انسان ہیں، مرد کا عورت کی طرف رُجحان ہے اور عورت کا مرد کی طرف ہے، اگر تو یہ کسی قاعدے قانون کا پابند رہا جو اللہ نے بتایا ہوا ہے، تو پھر تو انسان ہے، مسلمان ہے، مؤمن ہے، اچھا آدمی ہے، اور اگر یہ قاعدہ قانون سے آزاد ہوگیا تو پھر آپ اس کو زیادہ سے زیادہ حیوان کہہ لیں گے، انسانیت سے نکل گیا، مسلمان نہیں، مؤمن نہیں، ایمان کا تقاضا نہیں، البتہ حیوانیت سے باہر نہیں ہے، اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے کہ اس رُجحان کو باقی رکھو، لیکن کسی قاعدے قانون کے تحت، یہاں قضائے شہوت کرو یہاں نہ کرو، یہاں نکاح کرو یہاں نہ کرو، ایسے وقت جماع کرو، ایسے وقت میں نہ کرو، یہ حالات ہیں جو پابندیاں لگادی گئیں، ان پابندیوں کی رعایت رکھتے ہوئے اگر آپ چلیں گے تو یہ اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے، اور اگر ان پابندیوں کی رعایت نہیں رکھو گے تو زیادہ سے زیادہ حیوانیت ہے، یہ اس فعل کی طرح شیطنت نہیں، تو شریعت نے اس کو اسی لیے زِنا کے مقابلے زیادہ آشنع قرار دیا۔

عملِ قومِ لُوط کی سزا

سرورِ کائنات ﷺ کا فرمان کل بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا (چونکہ یہ واقعہ پہلی دفعہ آیا ہے، اس لیے میں اس کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، پھر یہ بار بار آئے گا، پھر اتنی تفصیل نہیں ہوگی) سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ'' (حوالہ گزر چکا) جس شخص کو تم پاؤ کہ وہ قومِ لُوط والا عمل کرتا ہے تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کردو۔ یہ خطاب حکام کو ہے، کیونکہ یہ سزا دینا حاکموں کا کام ہے، حکومت کا کام ہے، عام آدمی عام آدمی کو حد اور قصاص کے طور پر قتل نہیں کرسکتا، یہ مسئلہ یاد رکھیے! یہ حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ زِنا کا انسداد کرے، لواطت کا انسداد کرے، اور یہ تعزیری احکام حکومت کو دیے گئے ہیں۔ ایک روایت میں تو یہ ہے، اور بعض روایت میں ہے: ''فَارْجُمُوْا'' کا لفظ بھی ہے[1] کہ ان کو پتھر مار مار کر مار دو، حضور ﷺ کی کلام کے اندر اس قسم کی شدّت موجود ہے۔ اور پھر صحابہ کرام ﷢ میں اس

(۱) ابن ماجہ ۱۸۳/۲ سو لفظہ: عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِي الَّذِي يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ قَالَ ارْجُمُوا الْأَعْلَى وَالْأَسْفَلَ ارْجُمُوْهُمَا جَمِيْعًا.

کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ تو فرمایا کرتے تھے کہ فاعل مفعول دونوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی لاشوں کو جلا دینا چاہیے، ان کو عام انسانوں کی طرح دفن بھی نہیں کرنا چاہیے۔[۱] اور بعض صحابہ کا قول یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے ان کے اُوپر اس مکان کو گرا دیا جائے تاکہ جس طرح سے قومِ لُوط برباد ہوئی تھی اِن کی بربادی بھی اسی طرح سے ہو۔[۲] اور غالباً ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ اس آبادی کے اندر اُونچی سے اُونچی عمارت پر لے کر ان کو سَر کے بَل گرا دیا جائے، اس طرح سے ان کی گردن ٹوٹے، اور اس طرح سے ان کو اُلٹا کر کے مارا جائے (آلوسی)۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کے اندر بھی اس قسم کی شدت نمایاں ہے، کوئی زندہ جلانے کو کہتا ہے، کوئی قتل کرنے کو کہتا ہے، کوئی عمارت کے نیچے دے کر مارنے کو کہتا ہے، کوئی پہاڑ کی چوٹی سے یا اُونچی عمارت سے گرا کر مارنے کو کہتا ہے، تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سب باتوں کے اندر شدّت ہے۔ اور آگے ائمۂ فقہاء کے ہاں بھی اسی طرح سے ہے، حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ فعل زِنا کے حکم میں نہیں، یعنی اس پر زِنا والی سزا نہیں آتی، تعزیر ہے، حاکم کو اختیار ہے کہ سخت سے سخت سزا دے کر اس فعل کو روکے، اور اگر اس کے بار بار تنبیہ کرنے کے باوجود وہ نہیں رُکتا تو قتل کرنے کی بھی اجازت ہے، تعزیر کے حدود یہاں تک وسیع ہیں۔ اور حضرت اِمام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس فعل کی سزا ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد قتل ہے، فاعل اور مفعول یہ دونوں کا۔ اور حضرت اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اِمام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بالکل زِنا کے حکم میں ہے کہ اگر فاعل شادی شدہ ہو تو اس کو سنگسار کر دو، اور اسی طرح مفعول کے بارے میں ہے۔ ورنہ ان کو سو سو دُرّے لگاؤ، اور سال سال کے لیے ان کو جیل میں بھیج دو۔ بہر حال یہ فقہ کے اندر جو مختلف اقوال موجود ہیں، تو ان مختلف اقوال کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کی نظر میں بھی اس فعل میں شدت زِنا کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

قومِ لُوط کی ہٹ دھرمی اور ان کا انجام

تو یہ قومِ لُوط جو اس کے اندر مبتلا تھی، تو حضرت لُوط علیہ السلام نے اس کو جو روکا سمجھایا، اور یہ نہیں باز آئے، تو آخر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا ہوئی تھی، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں آئے گی۔ حضرت لُوط علیہ السلام سمجھاتے تھے اور وہ لوگ سمجھتے نہیں تھے، اُلٹا دیکھو! یہ ڈھٹائی کی اِنتہا ہے: اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ کہ حضرت لُوط علیہ السلام جب ان کے سامنے جب اس قسم کی تقریر کرتے تو وہ لوگ مذاق کرتے، کہ بڑے پاک صاف لوگ ہیں، بڑے صوفی ہیں، ہم گندے ہیں، ہم گناہ گار ہیں، انہیں کہو کہ تمہیں ان گناہ گاروں میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان گندوں میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان صوفیوں کو، ان پاک باز لوگوں کو، ان طہارت والوں کو نکالو یہاں سے، یہ جائیں کسی اور جگہ، ہمارے اندر ان کے رہنے کا کیا کام؟ یہ اُلٹا اُن کا اس طرح سے اِستہزا کرتے اور مذاق کرتے: اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ یہ گویا کہ ایک قسم کا اِستہزا ہے، کہ یہ بڑے پاک صاف لوگ ہیں، ان کو ہم گندوں سے کیا تعلق، ہم تو ایسے ہیں، ان کو کہو کہ نکلو یہاں سے، وہاں چلے جاؤ جہاں تمہارے جیسے کوئی پاک صاف لوگ

---

(۱) تفسیر مظہری سورۂ نساء آیت ۱۶ کے تحت۔ قال هذا ذنب لم يعص به الا امة واحدة صنع الله بهم ما علمتم نرى ان نحرقه بالنار.

(۲) ہدایہ میں ہے: لاختلاف الصحابة رضي الله عنهم في موجبه من الاحراق بالنار وهدم الجدار والتنكيس الخ۔ نیز دیکھیں تفسیر کبیر، سورۂ نور کے تحت۔

موجود ہیں۔اس قسم کی دھمکیاں دیتے تھے، تو آخر نتیجہ وہی ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا وقت آیا، تفصیل آئے گی سورۂ ہود میں، کہ فرشتے نوجوان لڑکوں کی شکل میں حضرت لُوط علیہ السلام کے ہاں مہمان ہو گئے، جس وقت وہ لُوط علیہ السلام کے گھر میں آ گئے تو ایک نبی مہمان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، مہمان کا اِکرام اور اس کا احترام، اس کو کھلانا پلانا، عزت سے رکھنا یہ تو اِیمان کا تقاضا ہے، لیکن سورۂ ہود میں یہ لفظ آئیں گے کہ جس وقت وہ حضرت لُوط علیہ السلام کے گھر میں آئے تو سِیْٓءَ بِهِمْ ان کی وجہ سے لُوط علیہ السلام غم میں مبتلا ہو گئے کہ یہ میرے گھر کیوں آ گئے؟ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا (سورۂ ہود: ۷۷) اُن کی وجہ سے دِل تنگ ہو گیا حضرت لُوط علیہ السلام کا، ان کو دیکھ کر غمزدہ ہو گئے کہ یہ میرے گھر کیوں آ گئے؟ وجہ کیا؟ کہ قوم کو پتا چلے گا کہ خوبصورت لڑکے یہاں آئے ہیں، وہ قوم آجائے گی حملہ کر کے، مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گی، تو میں ان مہمانوں کو کس طرح سے بچاؤں گا اور ان کی عزت کا تحفظ کیسے کروں گا؟ اس وجہ سے غم طاری ہو گیا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ قوم کو جب پتا چلا تو سارے کے سارے حملہ کر کے آ گئے، اس طرح سے آ گئے جیسے پیچھے سے کوئی دھکے دے کر بھگا رہا ہے، یعنی بے حیائی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ کوئی شرم وحیا تو رہی نہیں تھی کسی چھوٹے بڑے کی، مکان کا گھیرا ڈال لیا اور کہنے لگے کہ یہ لڑکے ہمارے سپرد کر دو، ہم نے تمہیں پہلے جو کہا ہے کہ آنے جانے والوں کو ہمارے حال پر رہنے دیا کرو، آپ نہ سنبھالا کریں، یہ آپ نے کیوں رکھے ہیں؟ یہ ہمارے سپرد کر دو۔ اب مہمان گھر میں بیٹھے ہیں، حضرت لُوط علیہ السلام کے نزدیک اُن کی عزت کی حفاظت کا مسئلہ ہے، ہر طرح سے اُن کو سمجھایا کہ دیکھو! مجھے رُسوانہ کرو، اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ (سورۂ حجر: ۶۸) یہ میرے مہمان ہیں، ایسانہ کرو، مجھے ان کی نظروں میں رُسوانہ کرو، کہ یہ کیا کہیں گے کہ اچھے شریف آدمی کے گھر ہم گئے تھے کہ وہ ہمارا تحفظ ہی نہیں کر سکا، ہماری عزت کا خیال ہی نہیں کر سکا، ان کی نظروں میں مجھے ذلیل نہ کرو، یہ میرے مہمان ہیں، رہنے دو، لیکن وہ باز نہیں آئے، حتیٰ کہ تنگ آ کر حضرت لُوط علیہ السلام کے یہ لفظ بھی سورۂ ہود کے اندر آئے ہیں: هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (آیت: ۷۸) یہ انتہائی درجے کی پریشانی کے حالات ہیں، جیسے کسی کو غیرت دلانے کے لیے انسان کہتا ہے، کہ بدبختو! اگر تم کسی طرح سے باز نہیں آ سکتے تو یہ تو میرے مہمان ہیں، ان کو چھوڑو، یہ میری بیٹیاں بیٹھی ہیں ان کو لے لو، یہ انتہائی درجے کے ایک انسان کے عجز اور درماندگی کے لفظ ہوتے ہیں۔ جس طرح سے آپ کا ایک اُستاذ ہے، آپ دو آدمی لڑ رہے ہیں، جھگڑ رہے ہیں، اور ایک آدمی کو بڑا غصہ چڑھا ہوا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں تو ماروں گا، میں تو نہیں چھوڑتا، وہ ہر طرح سے سمجھاتے ہیں، تو وہ آگے سے کہے آپ کا بزرگ، آپ کا بڑا بھائی، باپ، اُستاذ، ہر قسم کے واقعات معاشرے میں پیش آ جاتے ہیں، کہ بھائی! اگر کسی طرح سے بھی تیرا غصہ نہیں اُترتا ہے، تو میرا سر حاضر ہے، تو میرے چار جوتا لگا لے۔ اب اگر کسی کے دل میں ذرا برابر بھی غیرت ہوتی ہے، تو ایسے وقت میں پانی پانی ہو جاتا ہے، اس قسم کے لفظ سننے کے بعد۔ تو حضرت لُوط علیہ السلام نے یہاں تک کہا، لیکن وہ کہنے لگے کہ تجھے پتا ہے کہ عورتوں کی طرف تو ہمیں رغبت ہی نہیں، تو جب حضرت لُوط علیہ السلام انتہائی عاجز آ گئے، اور اُن کے منہ سے یہ لفظ نکلے لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (سورۂ ہود: ۸۰) ہائے کاش! میرے پاس آج قوت اور طاقت ہوتی جس کے ساتھ میں تمہارا مقابلہ کرتا، یا میرا کوئی اور سہارا ہی ہوتا جو اس وقت مجھے مدد دیتا، تو آج میں اس مصیبت سے اپنے مہمانوں کو بچا لیتا۔ تو جب حضرت لُوط علیہ السلام نے اس قسم کی اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو پھر فرشتوں نے اشارہ کیا، کہ آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟ یہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے، فکر نہ کیجئے، ہم تو اللہ کی طرف سے ان کے

لیے عذاب لے کر آئے ہیں، ہم تو فرشتے ہیں، پھر انہوں نے اشارہ کیا، جب اشارہ کیا تو حضرت لُوط علیہ السلام بات کو سمجھ گئے، کہنے لگے: بس ان کو اس حال پر رہنے دیجئے، یہ رات گزرنے دو، تم راتوں رات اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ، ہم جانیں اور یہ جانیں، فرشتوں نے پھر حضرت لُوط علیہ السلام سے یہ کہا کہ صبح کو ان کا خاتمہ ہو جائے گا، رہنے دیجئے، یہ رات گزرنے دو جس طرح سے یہ کر رہے ہیں، آپ راتوں رات اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیں، اپنی بیوی کو ساتھ لے کر نہ جانا، کیونکہ یہ اسی قوم کی تھی اور کافرہ تھی، اس کی ہمدردیاں قوم کے ساتھ تھیں، چنانچہ رات ہوئی تو حضرت لُوط علیہ السلام خود، اور جو بھی ان کے ساتھ ایمان لانے والا تھا، اپنی بچیوں کو لے کر، اور ان مؤمنوں کو لے کر نکل گئے، اور بعد میں اس قوم کے اُوپر ان بستیوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوئی، اور ان کو بستیوں کو جس طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، کہ جبریل علیہ السلام نے اُٹھا کر اس طرح سے پلٹا کہ اُوپر کا حصہ نیچے، اور نیچے کا اُوپر ہو گیا، جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا یہ لفظ سورۂ ہود میں آئیں گے۔ ہم نے ان بستیوں کے اُوپر والے حصے کو نچلا حصہ کر دیا، یوں اُلٹ دیا، ان لفظوں سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ اُن کا نچلا حصہ اُوپر ہو گیا تھا، تو لفظی ترجمے کے تحت اگر دیکھا جائے تو ایسے ہی ہے جیسے تفسیری روایات میں موجود ہے کہ جبریل علیہ السلام نے وہ ٹکڑا اُٹھایا اور اُٹھانے کے بعد اس کو اُلٹا کر کے پلٹ دیا، پہلے پتھروں کی بارش ہوئی، اس طرح سے ان کو سنگسار کیا گیا، اور پھر اس طرح سے اُن کی بستیاں اُلٹ دی گئیں۔ ورنہ اگر ان لفظوں کو محاورے پر محمول کیا جائے، تو جس طرح کہتے ہیں کہ فلاں شہر کو تہہ و بالا کر دیا گیا، تہہ و بالا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عمارتیں گر گئیں، اُجڑ گیا، اور سارے کا سارا ستیاناس ہو گیا، اسی طرح سے وہ شہر گر گیا، تہہ و بالا ہو گیا، اور اُن کے اُوپر پتھروں کی بارش برسی، اور یہ جتنے پلید تھے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس سارے کے سارے معاشرے کو یوں ختم کر دیا۔ تو اس فعل کی سزا اس قوم کے اُوپر مجموعی حیثیت میں جو آئی اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں آئے گی، یہ جو میں آپ کے سامنے ذکر کر رہا ہوں، آخر نتیجہ یہ نکلا۔ تو یہ لفظ جو آئے ہیں: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا، اس مطر سے وہی سجیل کی بارش مراد ہے، سجیل کا لفظ آئے گا، سجیل کہتے ہیں سنگِ گِل کو، یہ سنگ گل سے معرب ہے، بمعنی کھنگر، کھنگروں والے پتھر ان کے اُوپر برسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور ساری کی ساری قوم تباہ ہو گئی، تو مَّطَرًا کا مصداق یہاں وہی پتھروں کا برسنا ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ یہ خطاب ہے ہر سننے والے پڑھنے والے کو، کہ اے مخاطب! فَانْظُرْ۔ ''اے مخاطب'' کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ ہر مخاطب کو یہ خطاب ہے، کوئی ایک متعین نہیں، دیکھو! مجرموں کا انجام کیسے ہوا۔ اب اگر اِنفرادی طور پر کوئی شخص اس فعل کے اندر مبتلا ہو تو ٹھیک ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے مہلت ملتی ہے، اُس کے اوپر پتھر نہیں برستے، اور وہ زمین میں دھنستا نہیں ہے، لیکن اس سے گناہ کی شناعت کا آپ اندازہ کر لیجئے کہ آخرت کے اعتبار سے وہ ایسے ہی ہے کہ اس کو بدترین قسم کی سزا ملے گی، جو زانی کے مقابلے میں بھی زیادہ ہو گی، وہ تو آخرت میں ہو گی، ویسے دُنیا کے اندر اس قسم کے لوگوں کی تباہی اور ذِلّت بھی قابلِ عبرت ہو گی، مختلف حالات کے اعتبار سے ذلیل ہو جائیں گے، صحت برباد ہو جائے گی، حوصلہ نہیں رہتا، اُولوالعزمی نہیں رہتی، اور اِنسان احساسِ کہتری میں مبتلا ہوتا ہے، اس قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہونے کے بعد ایک قسم کی دُنیا کے اندر بھی ذِلّت کی زندگی گزرتی ہے۔ اور اگر یہ فعل ظاہر ہو جائے، پکڑا جائے، کھل جائے تو پھر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جیسی ذِلّت ہوتی ہے اس کا تو پھر کہنا ہی کیا۔ تو یہ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ کو پیش کر کے متنبہ کیا

جا رہا ہے، کہ نیک بخت وہ ہوا کرتے ہیں جو دوسروں کا حال دیکھ کر عبرت حاصل کر لیں۔ تو ان مجرموں کا انجام دیکھو، تمہیں پتا چلے کہ اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کا آخر کیا نتیجہ نکلا!

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور بھیجا ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو، شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لیے

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ

کوئی معبود اس کے علاوہ، تحقیق آ گئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رب کی طرف سے، پورا کیا کرو کیل کو

وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ

اور میزان کو، لوگوں کو اُن کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو، اور فساد نہ مچاؤ زمین میں

بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿۸۵﴾

اس زمین کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم یقین کرنے والے ہو ﴿۸۵﴾

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور نہ بیٹھا کرو ہر راستے پر کہ تم ڈراتے ہو اور روکتے ہو تم اللہ کے راستے سے

مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا

اس شخص کو جو اللہ پر ایمان لائے، اور طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی، یاد کرو جبکہ تم تھوڑے تھے

فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ

پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں زیادہ کر دیا اور دیکھو کیسے انجام ہوا فساد کرنے والوں کا ﴿۸۶﴾ اور اگر

طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا

تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا اُس چیز پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا

فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

تو تم صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۷﴾

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ

کہا اُن سرداروں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا اُس کی قوم میں سے، البتہ ضرور نکال دیں گے ہم تجھے اے شعیب!

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ

اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنے شہر سے، یا البتہ ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں، شعیب علیہ السلام نے کہا

اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۟ؕ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ

کہ کیا (تم ہمیں نکال دو گے) اگرچہ ہم کراہت کرنے والے ہی ہوں ﴿۸۸﴾ تحقیق ہم نے جھوٹ گھڑا اللہ پر اگر ہم لوٹ آئے

مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ

تمہارے طریقے میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دے دی، نہیں ہے ہمارے لیے کہ ہم لوٹ کے آئیں گے

فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ

تمہارے طریقے میں مگر اللہ کے چاہنے کے وقت جو ہمارا ربّ ہے، وسیع ہے ہمارا ربّ ہر چیز سے از روئے علم کے،

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ

ہم نے اللہ پر ہی بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار! فیصلہ کرے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک

وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۟ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ

اور تُو بہت اچھا فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۹﴾ کہا اُن سرداروں نے جنہوں نے کُفر کیا تھا اُس کی قوم میں سے البتہ اگر

اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۟ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

اتباع کی تم نے شعیب کی تو بے شک تم البتہ خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے ﴿۹۰﴾ پس پکڑ لیا اُن کو زلزلے نے

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۟ۚۖ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ

پھر ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرنے والے ﴿۹۱﴾ وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا گویا کہ

لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۟

نہیں ٹھہرے وہ اس شہر میں، وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ پانے والے تھے ﴿۹۲﴾

فَتَوَلّٰى	عَنْهُمْ	وَقَالَ	يٰقَوْمِ	لَقَدْ	اَبْلَغْتُكُمْ	رِسٰلٰتِ	رَبِّيْ

پھر منہ پھیر لیا شعیب علیہ السلام نے اُن سے، اور فرمایا اے میری قوم! تحقیق پہنچا دیے میں نے تمہیں اپنے رَبّ کے پیغامات

وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور میں نے تمہارے لیے خیر خواہی کی، کیسے افسوس کروں میں کفر کرنے والے لوگوں پر ﴿۹۳﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: اِلٰى مَدْيَنَ یہ متعلق ہے اَرْسَلْنَا کے جو شروع شروع میں آیا تھا اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ۔ ''اور بھیجا ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو'' مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادوں میں سے ایک صاحبزادے کا نام ہے، بعد میں جو ان کی اولاد پھیلی تو وہ قبیلہ بھی مدین کہلایا، اور جہاں وہ آباد ہوئے تو ان کی مرکزی جگہ مرکزی شہر وہ بھی ''مدین'' کہلاتا تھا، تو اب یہاں ''مدین'' سے اگر قبیلہ مراد لے لیا جائے تو بات صاف ہے کہ ''مدین'' کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا علیہ السلام، کیونکہ یہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، اور اگر ''مدین'' سے شہر مراد لیا جائے تو پھر اہلِ مدین مراد ہوں گے، ''اہلِ مدین کی طرف ہم نے شعیب کو بھیجا''، قَالَ يٰقَوْمِ: شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم! اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ: عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لیے کوئی معبود اس کے علاوہ، قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: تحقیق آ گئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے، یعنی میری صداقت پر، یہ اپنے کسی معجزے کی طرف اشارہ ہے، ''آ گئی تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے'' فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ: اَوْفُوْا: پورا کرو، اِیفاء: پورا پورا اُدا کرنا ''پورا کرو کیل کو اور میزان کو''، میزان ترازو کو کہتے ہیں، اور کیل ہوتا ہے برتن جس کے ذریعے سے غلہ وغیرہ ماپا جاتا ہے، جیسے آپ کے ہاں دُودھ ماپنے کے لئے یا تیل وغیرہ ماپنے کے لئے کپیاں سی بنی ہوئی ہوتی ہیں، ان کے ساتھ اندازہ لگاتے ہیں، تو پہلے غلہ جات یہ بھی کیل کے ذریعے سے ہی ان کا لین دین ہوتا تھا، اور آج کل اکثر چیزیں وزنی ہوگئیں، وزن کر کے بیچتے ہیں، یہاں کیل سے وہ آلہ مراد ہے جس کے ذریعے سے اندازہ کیا جاتا ہے، جس طرح سے کہ میزان سے ترازو مراد ہے، کیل پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ برتن جس کے ساتھ غلے کا اندازہ لگایا کرتے ہو اس کو ٹھیک بھرا کرو، اور میزان کو درست رکھنے اور پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تولا ٹھیک کرو، ''پورا کیا کرو کیل کو اور میزان کو'' وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ: لَا تَبْخَسُوْا یہ بَخْس سے لیا گیا ہے، بخس کم کرنے کو کہتے ہیں، لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو، نہ کم کیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں، یعنی لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو، وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا: اور فساد نہ مچاؤ زمین میں اس زمین کی اصلاح کے بعد، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ: یہ بہتر ہے تمہارے لیے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اگر تم یقین کرنے والے ہو، وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ: اور نہ بیٹھا کرو ہر راستے پر تُوْعِدُوْنَ: کہ تم ڈراتے ہو، وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو، مَنْ اٰمَنَ بِهٖ: اس شخص کو جو اللہ کے ساتھ ایمان لائے'' روکتے ہو تم اللہ کے راستے سے اس شخص کو جو اللہ

کے ساتھ ایمان لائے' وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: اور طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی، عِوَج کجی کو کہتے ہیں،'' تلاش کرتے ہو، طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی، ٹیڑھا پن'' وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا: یاد کرو جبکہ تم تھوڑے تھے، فَكَثَّرَكُمْ: پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں زیادہ کردیا، وَانْظُرُوْا: اور غور کرو، دیکھو، كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: کیسے انجام ہوا فساد کرنے والوں کا، مفسدین: فساد کرنے والے، عاقبہ: انجام،'' کیسا انجام ہوا فساد کرنے والوں کا'' وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ: اور اگر تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اگر تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا، وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا: اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا فَاصْبِرُوْا: تو تم صبر کرو، حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردے، وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ: اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے، قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: کہا ان وڈیروں نے، ان سرداروں نے جنہوں نے تکبر کیا تھا اس کی قوم میں سے، لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ: البتہ ضرور نکال دیں گے ہم تجھے اے شعیب! اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے، مِنْ قَرْيَتِنَآ: اپنے شہر سے، اپنی بستی سے، قریہ: بستی، اور قریہ کا اطلاق بڑے شہر پر بھی ہوتا ہے، جیسے قرآنِ کریم میں ہی یہ لفظ سورۂ زخرف میں آیا ہوا ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (آیت: ۳۱) وہاں قریتین سے بالاتفاق مکہ اور طائف دونوں شہر مراد ہیں، ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن کیوں نہیں اتارا گیا، (اسی طرح) وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا (سورۂ یوسف: ۸۲) یہاں ''قریہ'' سے ''مصر'' مراد ہے، اس بستی کے رہنے والوں سے پوچھ لو جس بستی میں ہم تھے یا اس قافلے والوں سے پوچھ لو جس قافلے میں ہم آئے ہیں، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں ہے۔ تو وہاں ''قریہ'' کا مصداق ''مصر'' ہے، تو لفظ ''قریہ'' مطلقاً دیہات یا بستی پر نہیں بولا جاتا، شہر پر بھی بولا جاتا ہے، تو اگر مدین بڑا شہر ہو تو ''قریہ'' کا مصداق ہے، لَنُخْرِجَنَّكَ: لام تاکید اور نون تاکید، البتہ ضرور نکال دیں گے ہم تجھے اے شعیب! اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنے شہر سے، اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا: یا البتہ ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں، ہمارے دین میں، یعنی دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی یا تو لوٹ کے ہمارے طریقے پہ آجاؤ گے یا پھر ہم تمہیں شہر میں رہنے نہیں دیں گے، قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ: شعیب علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم ہمیں نکال دو گے اگرچہ ہم کراہت کرنے والے ہی ہوں، اگرچہ ہم تمہارے طریقے کو مکروہ جاننے والے ہی ہوں، پھر بھی تم ہمیں لوٹا لو گے، قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: اِفْتَرٰى يَفْتَرِيْ: جھوٹ گھڑنا، تحقیق ہم نے جھوٹ گھڑا اللہ پر، اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ: اگر ہم تمہارے طریقے میں لوٹ کے آگئے، عُدْنَا عَادَ يَعُوْدُ سے،'' اگر ہم لوٹ آئے تمہارے طریقے میں تو ہم نے اللہ پر جھوٹ گھڑا، بہتان باندھا، بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا: اگر ہم لوٹ کے آگئے تمہارے طریقے میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دے دی، وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ: نہیں ہے ہمارے لیے کہ ہم لوٹ کے آئیں تمہارے طریقے میں، اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا: مگر چاہنا ہمارے اللہ کا جو ہمارا رَبّ ہے، مگر ہمارے اللہ ہمارے رَبّ کی مشیت ہی واقع ہونی والی ہے، اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ میں اَن مصدریہ ہے، تو مطلب یہ ہوگا'' مگر اللہ کے چاہنے کے وقت جو ہمارا رَبّ ہے'' یعنی اللہ کی مشیت ہوجائے تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، پھر کسی کا زور نہیں چلتا، ورنہ ہم تمہارے طریقے پہ نہیں آسکتے، اللہ کی طرف سے کسی کے متعلق مشیت ہوجائے کوئی دھکا لگ جائے تو علیحدہ بات ہے، ورنہ جہاں

تک ہمارے ظاہری اختیار کا تعلق ہے ہم تمہارے طریقے کی طرف لوٹ کے آنے والے نہیں ہیں، وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: وسیع ہے ہمارا رب ہر چیز سے از روئے علم کے، عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا: ہم نے اللہ پر ہی بھروسہ کیا، رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا: اے ہمارے پروردگار! فیصلہ کردے ہمارے درمیان وَبَيْنَ قَوْمِنَا: اور ہماری قوم کے درمیان، بِالْحَقِّ: ٹھیک ٹھیک، ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے، وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ: اور تو بہت اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: کہا ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کیا تھا اس کی قوم میں سے، لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ: البتہ اگر اتباع کی تم نے شعیب کی تو بیشک تم البتہ خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے، لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ: اگر تم نے اتباع کی شعیب کی، اگر تم شعیب کے پیچھے لگ گئے تو بیشک تم اس وقت، اِذًا: یعنی جب تم اس کی اتباع کرو گے، البتہ خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے، اِذًا کا معنی ہم اپنی زبان میں کریں گے تب، ''اگر تم شعیب کے پیچھے لگ گئے تب تم خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے'' فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ: رجفہ کا لفظ پہلے بھی آچکا آپ کے سامنے، زلزلہ، پس پکڑ لیا ان کو زلزلے نے، فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ: پھر ہو گئے وہ اپنے گھروں کے اندر منہ کے بل گرنے والے، ڈھیر ہونے والے، اپنے گھروں میں ڈھیر ہو کے رہ گئے، اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا: وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا، كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا: غَنِيَ يَغْنٰى، غَنِيَ بِالْمَكَانِ: ٹھہرنا، گویا کہ وہ اس بستی میں رہے ہی نہیں وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا یعنی وہ ایسے نیست ونابود ہو گئے ایسے بے نام ونشان ہو گئے گویا کہ وہ اس شہر میں رہے ہی نہیں، نام ونشان مٹ گیا، ''گویا کہ نہیں رہے، نہیں ٹھہرے وہ اس شہر میں'' اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا: وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا، كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ: وہی خسارہ پانے والے تھے، فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ: پھر منہ پھیر لیا شعیب نے ان سے، شعیب علیہ السلام نے ان سے منہ پھیرا، وَقَالَ: اور فرمایا، يٰقَوْمِ: اے میری قوم! لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ: تحقیق پہنچا دیے میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات، وَنَصَحْتُ لَكُمْ: اور میں نے تمہارے لیے خیر خواہی کی، میں نے تمہیں نصیحت کی، ''میں نے خیر خواہی کی تمہارے لیے'' فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ: اَسِيَ يَأْسٰى: افسوس کرنا، کیسے افسوس کروں میں کفر کرنے والے لوگوں پر۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

قومِ شعیب کی بدمعاملگی

گزشتہ اُمتوں کے واقعات کا سلسلہ آپ کے سامنے شروع ہے، اور یہ اس سلسلے میں غالباً پانچواں واقعہ ہے، حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم کا، چار واقعے پہلے گزر چکے، اور آپ نے ترجمے سے ہی خیال فرما لیا ہوگا، کہ اکثر و بیشتر الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا طرزِ تقریر ایک ہی ہے، اور بدبخت قوم جو مانتی نہیں اُن کے آگے سے جو اِشکالات یا کوئی باتیں ہیں وہ بھی ایک ہی انداز کی ہیں، چند الفاظ کا فرق ہے، وہ جو قومی خصوصیات ہیں کہ پیچھے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا ذکر آیا تھا، اُن میں اخلاقی بے راہ روی تھی، بدکرداری تھی، تو حضرت لوط علیہ السلام کی کلام میں اس کے اوپر زور دیا گیا تھا، اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم

جہاں شرک کے اندر مبتلا تھی، وہاں بد معاملگی کے اندر بھی مبتلا تھی، ان کا معاملہ خراب تھا، جیسے اُن (قومِ لُوط) کا اخلاق برباد تھا، ان کا معاملہ خراب تھا، لینے دینے کے بہت گندے تھے، یعنی یہ تاجر قوم تھی، شاہراہ پر واقع تھی، جہاں سے قافلے گزرتے تھے، تو تاجر ہونے کی وجہ سے ان کے اندر کم تولنے اور کم ماپنے کی بیماری تھی، جب یہ کسی سے لیتے تو پورا لیتے، اور جس وقت دیتے تو وہ اپنی چابک دستی کے ساتھ وزن، تول ٹھیک نہ دیتے۔ گویا کہ دوسرے کا حق دبا جاتے، یہ لین دین کی خرابی اور حقوق العباد کے اندر کوتاہی اس قوم کا شعار تھا۔

تاجر طبقے کی بیماری اور اس کا دُنیا و آخرت میں نقصان

اور اکثر تاجر طبقے میں ایسی ہی بیماریاں ہوتی ہیں، تاجر طبقے میں جو بیماری ہوتی ہے وہ زیادہ تر بد معاملگی کی ہوتی ہے، چابک دستی کے ساتھ ڈنڈی مار لی، اور سیر کی بجائے تین پاؤ دے دیا، اور اسی طرح سے پیمانے کے ساتھ ماپتے ہوئے، اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے جس طرح سے دُودھ والے کرتے ہیں، کہ دُودھ کا پوا بھر تو ٹھیک لیا، (یعنی وہ برتن وہ جو پاؤ کا پیمانہ ہوتا ہے) لیکن ڈالتے ہوئے یوں یوں کر کے تھوڑا سا تولہ ڈیڑھ تولہ گرا لیا، تو یہ بُری عادت کا اس طرح سے چسکا پورا ہو جاتا ہے، اور لوگوں کے حقوق خراب کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ہم اس طرح سے کمائی زیادہ کر لیتے ہیں، حالانکہ یہ ایسی چیز ہے جو دُنیا کے اندر بھی بے اعتباری پیدا کر کے کاروبار کو نقصان پہنچاتی ہے، اگر کسی تاجر کے متعلق پتا چل جائے کہ یہ صحیح نہیں تولتا تو لوگ اُس کے پاس خرید و فروخت کے لیے جاتے ہی نہیں، کاروبار خراب ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی تاجر دیانت دار ہو جو دُوسرے سے لیتے وقت صحیح پیمائش کر کے اور صحیح اندازے کے ساتھ چیز لیتا ہے، اور دیتے وقت بھی صحیح دیتا ہے، تو اس کا اعتبار بڑھ جاتا ہے اور اس کی تجارت کو فروغ ہوتا ہے، اور نفع بھی زیادہ ہوتا ہے، تو دُنیا کے اندر بھی پورا تولنا اور پورا ماپنا یہ مفید ہے، اپنے کاروبار کے نظریے سے بھی۔ اور آخرت کے اندر تو ہے ہی کہ جو شخص یہ کوتاہی کرتا ہے، کہ لوگوں کے حقوق دبا لیتا ہے، آخرت میں جب حساب دینا پڑے گا تب پتا چلے گا، جہاں پیسے تو ہوں گے نہیں، پھر اپنی نیکیاں اہلِ حقوق کو دینی پڑیں گی، جن کے حقوق دبائے ہیں، اور اس طرح سے زندگی بھر کی نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، جن کو دُنیا کے اندر ڈنڈی مارنے کی یا اس طرح سے پیمائش کرتے وقت کوئی گڑبڑ کرنے کی عادت ہوتی ہے، تو آخرت کی تباہی بھی ہے، دُنیا کی تباہی بھی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی وعظ و نصیحت

تو حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر میں ان دونوں باتوں کا ہی ذکر ہے، شرک کی تردید بھی ہے اور معاملے کی اصلاح بھی ہے، تو پھر یہ لوگ چونکہ تاجر تھے اور بیٹھے تھے شاہراہ پر، قافلے گزرتے رہتے تھے، تو ان کو ڈاکے ڈالنے کی بھی عادت تھی، اکیلا اِکا دُکا آدمی ملا تو اس کو لوٹ لیا، یا کوئی باہر سے آنے والے ہوتے، اور یہ راستے دبا کے بیٹھے ہوئے ہوتے، اُن کو ڈراتے دھمکاتے، اُن سے کوئی فیس وصول کرتے، جس طرح سے آج کل پاکستان میں عام طور پر غنڈا ٹیکس چل رہا ہے، کہ غنڈے مل کر کسی منڈی پر، یا کسی اڈے پر، یا کسی چیز پر قبضہ کر لیتے ہیں، اور پھر جو ان کو ٹیکس اَدا کرتا ہے اُس کو تو گزرنے دیتے ہیں، اور جو ٹیکس اَدا نہیں کرتا اس

کو پھر تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اس طرح سے آنے جانے والوں پر یوں بھی اپنی دھونس جماتے تھے، چونکہ بیٹھے تھے شاہراہ پر، اور طاقتور قبیلہ تھا، تو یہ بات بھی ان کے اندر تھی دھونس جمانے کی اور دوسرے کو ڈرانے کی دھمکانے کی، اور اس سے اس طرح مختلف فائدے اُٹھانے کی، یا جو شخص شعیب علیہ السلام کو ملنے کے لیے آتا، تو اُس کو راستے میں ڈراتے دھمکاتے، کہ دیکھ! اُن کے پاس نہ جانا، اگر تم ایمان لے آئے یا اُس کے پاس گئے تو ہم یوں کر دیں گے، اس طرح سے بھی وہ کرتے تھے۔ تو یہ ایک نئی چیز ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر میں آئی ہوئی ہے، ورنہ وہی باتیں ہیں جو پہلے انبیاء علیہم السلام کی تقریر میں گزری ہیں، اور آگے سے قوم ماننے والی نہیں تھی، وہ کہتے تھے کہ دیکھو! مال ہمارا ہے، ہم اپنی مرضی کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، تو جس صورت میں ہمیں نفع زیادہ ہو ہمیں ایسا کرنا چاہیے، ہم آپ کے پیچھے لگ کر اپنا کاروبار کیسے تباہ کرلیں، جیسے آج عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا، گزشتہ اُمتوں کی بیماریاں آج بھی موجود ہیں، آج بھی اگر آپ کاروباری طبقے کے اندر بیٹھیں گے اور باتیں سنیں گے تو اکثر و بیشتر اُن کی زبان پر ایک بات آتی ہے، کہ بھائی! آج کل اگر دیانت داری برتیں تو کاروبار ہی ٹھپ ہوتا ہے، جب ہر طرف بددیانتی ہی بددیانتی ہے تو دیانت دار آدمی منڈی میں بیٹھ کر کیسے کام کرلے؟ اور اگر دیانت داری برتیں تو کام کیسے چلے؟ اس لیے جب یہ ملاوٹ کا دور چل رہا ہے تو ہر کوئی ضرورت سمجھتا ہے کہ ملاوٹ کریں، اور جس طرح سے دھوکا دہی چل رہی ہے تو سارے کے سارے، جب ایک رَو آتی ہے، ایک سیلاب آتا ہے، تو سارے ہی اس میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں، تو اب بھی ذہن وہی ہے کہ اب اگر ان کی بات مان لی جائے گی، کہ یوں نہ بیچو یہ غلط ہے، یوں نہ تولو یہ غلط ہے، تو پھر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنا کاروبار ہی برباد کرلیں، آج کل دیانت داری سے کام نہیں چلتا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ علی الاعلان ڈھٹائی کے ساتھ بددیانتی کرتے ہیں، اور خیانت کرتے ہیں، کم تولنا کم ماپنا، ملاوٹ کرنا، اس طرح سے تاجروں کے اندر آج بھی یہ بیماریاں اسی طرح سے عروج پر ہیں، جس طرح سے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے میں تھیں، اُن کو بھی یہی اِشکال تھا کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف کرتے ہیں، جیسے چاہیں کریں، تمہیں اس سے کیا دخل؟ سورۂ ہود کے اندر قوم کی تقریر اسی انداز کی آئے گی شعیب علیہ السلام کے مقابلے میں، کہ کیا تیری نماز تجھے یہی سکھاتی ہے؟ کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف نہ کریں، اور اپنے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ دیں، جس کی پُوجا ہمارے باپ دادا کرتے تھے اُن کو ترک کردیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ قوم آگے سے یہی جواب دیتی ہے۔

قوم کی ضد اور اس کا انجام

جب حضرت شعیب علیہ السلام بار بار سمجھاتے ہیں، بار بار سمجھاتے ہیں، تو پھر چونکہ حضرت شعیب علیہ السلام اور آپ کی جماعت بظاہر دیکھنے میں غریب اور کمزور، نہ اُن کے پاس وہ مال، نہ اُن کے پاس وہ دولت، نہ اُن کے پاس ظاہری طور پر وہ قوت، تو پھر وہ سرمایہ دار طبقہ جس وقت اس طبقے کو اپنی خواہشات کے درمیان میں رکاوٹیں پیدا کرنے والا سمجھتا ہے، کہ یہ ہمیں پوری طرح سے کمانے نہیں دیتے، اپنی مرضی کے مطابق ہمیں رہنے نہیں دیتے، ہماری چوہدراہٹ ختم کرتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ آنے والوں پر دھونس نہ جمایا کرو، تو پھر قوموں پر ہمارا رعب کس طرح سے رہے گا؟ اب کم از کم لوگ جو چلتے ہیں تو ہم سے ڈرتے ہیں، اور ہمیں

سلام کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس طرح سے وہ ہمیں فیس دے دے کر گزرتے ہیں، تو کس طرح سے ہماری بالادستی ہے۔ اور ان کی باتیں مان لی جائیں تو ہمارا قوموں کے درمیان میں کیا مقام رہ جائے گا؟ اور ہم کمائیں گے کس طرح؟ ہماری آمدنی میں فرق پڑ جائے گا۔ تو جب اس قسم کی باتیں محسوس کرتے ہیں تو آخر وہی پھر جاہلوں والا حربہ ہے، کہ یا تو یہ طریقہ چھوڑ دو، ہمیں روکنا چھوڑ دو اور ہمارے طریقے پر آ جاؤ، ورنہ پھر ہم تمہیں شہر میں نہیں رہنے دیں گے، شہر سے نکال دیں گے، آخر کار یہی دھمکی ہوتی ہے، پہلے بھی آپ کے سامنے اس قسم کی بات آئی، جب وہ نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں تو پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب یہ قوم سنبھلنے سدھرنے کے قابل نہیں رہی۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا ایک ہی جھاڑو آتا ہے، سب کو سمیٹ دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہوتے ہیں اُن کے لیے زمین خالی ہو جاتی ہے، اور اس قسم کا پلید گروہ جتنا ہوتا ہے سب کو صاف کر دیا جاتا ہے، تو پھر نتیجہ نکال کر بتا دیا کہ وہ تو کہتے تھے کہ شعیب علیہ السلام کے پیچھے لگنے میں خسارہ ہے، وہ خسارہ یہی کہ مال کم ہو جائے گا، ہماری چوہدراہٹ ختم ہو جائے گی، وہ کہتے تھے کہ جو شعیب علیہ السلام کے پیچھے لگ جائیں گے وہ خسارہ پانے والے ہیں، لیکن آنے والے وقت نے ظاہر کر دیا، کہ خسارے میں وہی رہے جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی بات نہیں مانی، اور جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی بات مان لی حقیقت کے اعتبار سے دُنیا اور آخرت میں نفع والے وہی رہے۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام پھر قوم کی بربادی کو دیکھتے ہیں تو بطور افسوس کے کہتے ہیں، یعنی اس عذاب کے آنے کے بعد قوم کو اس طرح سے برباد پڑے ہوئے دیکھا تب خطاب کیا، تو یہ محض اظہار افسوس ہے۔ اور اگر سمجھانے کے بعد ہی جب دیکھا، کہ اب یہ سمجھتے نہیں ہیں تو اس وقت: فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ اُن سے منہ موڑ لیا جب عذاب کے آثار نظر آ گئے، تو اس وقت اُن کو کہنا یہ بھی ایک قسم کی آخری تنبیہ ہے کہ بھائی! میں نے تو اپنے رَبّ کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے، اور جتنی خیر خواہی میں تمہارے ساتھ کر سکتا تھا میں نے کر لی، لیکن تم نے نہ اللہ کے حکم کو مانا، نہ میری خیر خواہی کی قدر کی، اب تم کافر رہو، بھاڑ میں جاؤ، مجھے کیا، جو چاہو کرو، تمہارا جو چاہے انجام ہو، فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ جس طرح سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے محاورے کے طور پر مطلب ظاہر کرنے کے لیے کہا کہ ایسی تیسی میں جائیں، ہمیں کیا، اُردو میں جیسے کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کا جو بھی نتیجہ نکلے، ہمیں کیا، ہم خیر خواہی کرتے ہیں، یہ ہمیں خیر خواہ سمجھ کر ہماری بات کی قدر نہیں کرتے، ہم ان کو ان کے پروردگار اور ان کے اللہ کے پیغام پہنچاتے ہیں، یہ کان نہیں دھرتے، تو یہ بھاڑ میں جائیں، جہنّم میں جائیں، ہمیں کیا، پھر یہ آخری گویا کہ مایوس کن بات ہوتی ہے جو پیغمبر کی زبان سے نکلتی ہے، یہی ہے سارے واقعے کا حاصل جو آپ کے سامنے پڑھا گیا، دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔

آیات پر ایک نظر

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: مدین کے متعلق میں نے عرض کر دیا کہ شہر مراد ہو تو اہل مدین مراد ہیں، ذکر یونہی کیا جاتا ہے کہ فلاں شہر کی طرف فلاں پیغمبر آیا، مراد ہوتے ہیں شہر والے، یا مدین سے قبیلہ مراد ہے، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ تو مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا، قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ یہ تو وہی نعرہ توحید ہے جس

طرح سے ہر پیغمبر اپنی قوم کے سامنے لگاتا ہے، کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس واضح دلیل آگئی تمہارے رَبّ کی طرف سے، جس سے معلوم ہو گیا کہ میں حق پر ہوں، اللہ کا فرستادہ ہوں، یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے کسی معجزے کی طرف اشارہ ہے، فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ: توحید اختیار کرو، شرک سے باز آجاؤ، اور اپنا معاملہ درست کرلو، پورا کیا کرو کیل اور میزان، یعنی برتن کے ساتھ غلے کا اندازہ کرنا ہو تو بھی پورا کر کے دیا کرو، اور ترازو کے ساتھ تولنا ہو تو بھی پورا کر کے دیا کرو۔ تیسویں پارے میں ایک سورت آئے گی سورۂ مطففین وہ اسی مسئلے سے متعلق ہے۔ مطففین: گھٹا کر دینے والے، لفظی معنی اُس کا یہی ہے، وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ: مطففین کے لیے ہلاکت ہے کہ جب لوگوں سے کیل کر کے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب اُن کو کیل کر کے دیتے ہیں یا اُن کو وزن کر کے دیتے ہیں تو پھر گھٹا دیتے ہیں۔ تو وہاں بھی انہی کا ذکر ہے، تو فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ کیل اور میزان کو پورا کیا کرو، یعنی تولو تو بھی پورا تول کر دو، اور کسی برتن ٹوپے وغیرہ کے ساتھ اندازہ کرو تو بھی ٹھیک کر کے دیا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو، اور علاقے میں فساد نہ مچاؤ، بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس کی درستی کے بعد، جب اس علاقے میں درستی کے قوانین جاری کر دیے گئے اور اصلاحی سکیم شروع کر دی گئی تو اب اُس کی مخالفت ایک فساد ہے، ایسا نہ کرو۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ یہ تو بد معاملگی ہوگئی، اور یہ اگلی بات وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ: ہر راستے پر نہ بیٹھا کرو، راستے نہ روکا کرو لوگوں کے، بیٹھنا اُن کا دونوں طرح سے ہوتا تھا، یا تو لوٹ مار کرنے کے لیے، جیسے کہ قافلے جب گزرتے تو کوئی اِکّا دُکّا آدمی ملا تو اُس کے کپڑے اُتار لیے، جیسے عام طور پر ہوتا ہے، اور یہ دھونس جما کر اُن سے مفاد حاصل کرنے کے لیے، ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے جس کو آج کل کی اصلاح میں ''غنڈہ ٹیکس'' کہتے ہیں، کہ گزرنے والے کچھ نہ کچھ نذرانہ پیش کر کے جائیں، تاکہ ہماری بالادستی قائم رہے۔ یا وہ راستوں پر بیٹھ جاتے تھے، جو باہر سے آتا ہے اُس سے پوچھتے کہ تُو نے کہیں شعیب علیہ السلام کے پاس تو نہیں جانا؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں! میں نے وہیں جانا ہے، پھر اُسے ڈراتے دھمکاتے۔ یا دھمکیاں دیتے کہ دیکھو! شہر میں جا رہے ہو، وہاں فلاں شخص اس قسم کی باتیں کرتا ہے، وہاں نہ جانا، ورنہ جب یہاں سے دوبارہ گزرو گے تو ہم پٹائی کریں گے، یوں ڈراتے دھمکاتے تھے، دونوں باتیں تھیں۔ ''نہ بیٹھا کرو ہر راستے پر ڈراتے ہوئے، اور اللہ کے راستے سے روکتے ہوئے اس شخص کو جو اللہ پر ایمان لاتا ہے، اور طلب کرتے ہو تم اس راستے میں کجی'' یعنی مختلف اعتراضات پیدا کر کے لوگوں کو وہ راستہ ٹیڑھا کر کے دکھاتے ہو، سیدھے راستے میں تم خواہ مخواہ اعتراضات پیدا کر کے اس میں کجیاں تلاش کرتے ہو۔

''خاندانی منصوبہ بندی'' اللہ کے اِحسان کی ناشکری ہے

آگے احسانات کا یاد دلانا ہے، کیونکہ انسان احسان سے متاثر ہوتا ہے۔ ''یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کثیر کر دیا'' آج تمہاری قوم ہے، جتھا ہے، کتنی بڑی قوم بن گئی، کتنا بڑا قبیلہ بن گیا، یہ اللہ کا کتنا احسان ہے، تو گویا کہ کسی

قوم کا قلت سے کثرت کی طرف آنا یہ بھی اللہ کا احسان ہے جس کو نبی یاد دلاتا ہے۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ یہ ''برتھ کنٹرول'' اور ''خاندانی منصوبہ بندی'' فطرت کے خلاف ہے، ورنہ کثرت تو ہمیشہ مطلوب رہی ہے، اور اب یہ لوگ کثرت سے ڈرنے لگ گئے اور قلت کی طالب ہوگئے، یہ بات فطرت کے خلاف ہے، نقصان دہ ہے، اس لیے اس کی مخالفت کی جاتی ہے کہ یہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' ٹھیک نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے انسان پیدا ہوجائیں، قوم کے اندر کثرت ہو، اللہ تعالیٰ رزق بھی اسی حساب سے دیتا ہے، جو پیدا کرتا ہے وہ رازق بھی ہے۔ تو یہاں دیکھو! یہ احسان جتلایا کہ تم تھوڑے سے تھے پھر اللہ نے تمہیں زیادہ کردیا، معلوم ہوگیا کہ قلت سے کثرت کی طرف آنا یہ اللہ کا احسان ہے، جس کو نبی یاد دلا رہا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی جگر سوزی اور دِل سوزی

وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: اور دیکھو! مفسدوں کا انجام کیسے ہوا؟ یہ آپ کے سامنے تو دو لفظ نقل کیے جارہے ہیں، حضرت شعیب علیہ السلام کی اس میں مفصل تقریریں ہوں گی، کہ فلاں قوم تھی اُس نے یوں فساد کیا، پھر دیکھو! اُن کے ساتھ یہ ہوا، فلاں قوم تھی اس نے یوں فساد کیا اس کے ساتھ یہ ہوا، حضرت شعیب علیہ السلام کی جو لمبی لمبی تقریریں نقل کی گئی ہیں اور بڑے اچھے انداز کے ساتھ، اسی لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں لکھا ہے کہ ان کی کمالِ فصاحت کی وجہ سے ''خطیب الانبیاء'' کہا جاتا ہے، یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے کمال فصاحت کی وجہ سے ''خطیب الانبیاء'' کہا جاتا ہے، یعنی انبیاء میں سے خطبے کے لحاظ سے، تقریر کے لحاظ سے اُن کا بہت اعلیٰ نمبر ہے، ''خطیب الانبیاء'' ہیں، تو یہ صرف اتنی بات نہیں کہ یوں کہہ دیا کہ مفسدین کا انجام دیکھو! کیسا ہوا؟ مفسدین کی تفصیل بتائی جاتی ہے، اُن کا انجام دکھایا جاتا ہے، جیسے سمجھاتے وقت انسان یہ کہتا ہے کہ دیکھ! جو تو نے عادت اختیار کر رکھی ہے، فلاں نے بھی یہ عادت اختیار کی تھی، ذرا دیکھ تو سہی، پھر اُس کا جنازہ کیسے نکلا، فلاں شخص نے بھی یہ عادت اختیار کی تھی دیکھ تو سہی، کیسے علم و عمل سے محروم ہوگیا، کیسے اُس کی عزت گئی، کس طرح سے گھر بار برباد کر کے بیٹھ گیا، یہ مثالیں دی جاتی ہیں، کیونکہ ان مثالوں کے ساتھ پھر اس نصیحت میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، ایسے ہی حضرت شعیب علیہ السلام مفسدین کے واقعات سناتے ہوں گے اور اُن کا انجام دکھاتے ہوں گے۔ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا یہ دو گروہ ہوگئے قوم کے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا اس چیز کے ساتھ جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، اور ایک نہیں لایا، تو ہوگیا تم میں اختلاف، اب تم دلیل کے ساتھ تو مانتے نہیں، تو پھر صبر کرو، تھوڑی دیر ان حالات کو برداشت کرو، حتیٰ کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کردے گا، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے حال پر جمے رہو، پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فیصلہ سامنے آجائے گا، یہ تو حضرت شعیب علیہ السلام کی جگر سوزی ہے، دل سوزی ہے، جس کے ساتھ وہ قوم کو سمجھاتے ہیں۔

انبیاء کی تحریک کے مدِّمقابل کون اور کیوں؟

آگے قوم کی بڑ بھی سن لیجئے...... قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا: دیکھو! بار بار آپ کو متوجہ کر رہا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کی تحریک کا مقابلہ کرنے والے اکثر و بیشتر وہی لوگ ہیں جو معاشرے میں ''بڑے'' کہلاتے ہیں، جن کو بڑائی حاصل ہوتی ہے وڈیرے،

چوہدری، ذیلدار، نمبردار، اس قسم کے عہدیدار جو قوم میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ بھی آپ کے سامنے بارہا ذکر کی، کہ ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو یہ بن گیا بڑا، ہم ہو گئے چھوٹے، تو ہماری یہ بڑائی اور ہمارا جاہ ختم ہو جائے گا، ہمارا حلقہ ختم ہو کے ہم سارے کے سارے اس کے تابع ہو جائیں گے، ایک تو یہ بڑائی اُن کو جھکنے نہیں دیتی۔ دوسرے یہ ہے کہ مالیات کے اندر بھی چونکہ یہ لوگ اعلیٰ ہوتے ہیں، تو مرضی کے ساتھ کمانا اور مرضی کے ساتھ کھانا، اس لیے لذت پرستی ان میں بہت آئی ہوئی تھی، ایک غریب آدمی جو دو روپے کی مزدوری روز کرتا ہے، وہ کافر ہو تو بھی اس نے دو روپے کی مزدوری کرنی ہے، مؤمن ہو گیا تو بھی اُس کی وہی دو روپے کی مزدوری، اُسے کیا فرق پڑتا ہے، وہ پہلے بھی تابع ہی تھا، اور ایمان لانے کے بعد بھی تابع ہی رہا، تو اُس کو کیا فرق پڑا؟ اس لیے اگر اُس کی عقل ایک بات کو تسلیم کر لیتی ہے کہ یہ صحیح ہے تو پھر اُس کو ماننے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ لیکن یہ جو بڑے لوگ ہوتے ہیں، یہ دیکھتے ہیں، کہ اب تو ہم چوہدری ہیں، لوگ ہمارے حقے بھرتے ہیں، اور ہمارے ہاں لوگ آ کر بیٹھتے ہیں، اپنی ضروریات ہمارے پاس لاتے ہیں، ہمارا ان پہ رُعب چلتا ہے، اور اگر ہم نے مان لیا تو یہ بڑے بن جائیں گے، ہم چھوٹے، تو ہمارا جاہ گیا۔ دوسرے یہ کہ اب تو ہم نے غنڈے رکھے ہوئے ہیں، ادھر اُدھر سے لوٹ مار کر کے لاتے ہیں۔ اور تاجر سوچتے ہیں کم بیچ کر، کم تول کر، کم ماپ کر کے ہمیں تجارت میں نفع زیادہ ہوتا ہے، بے ایمانی کر کے ہم جو شام کو پچاس روپے کما کر لاتے ہیں، صحیح اصول پر چلیں تو ہماری آمدنی بیس روپے رہ جائے گی، اور وہ تیس روپے کے جو ہم نے لذت پرستی کے اخراجات اٹھا رکھے ہیں، کہ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اور اس قسم کی آرام طلبی، پھر وہ خرچ کہاں سے پورا کریں گے، پھر ہم بھی ایسے ہی مسکین ہو جائیں گے، کہ نہ اس طرح سے خوش پوشاک رہ سکیں، نہ خوش خوراک رہ سکیں۔ اس قسم کے اشکالات اُن کے دل میں آتے ہیں، نفسانی لذت ان کے سامنے رکاوٹ ڈالتی ہے، حب جاہ ان کے سامنے رکاوٹ ڈالتی ہے، اس لیے اکثر و بیشتر یہی طبقہ ہے جو اہلِ حق کے ساتھ ٹکرایا کرتا ہے۔ اور آج بھی آپ دیکھ لیں، غریب طبقہ جتنا ہے وہ سب علماء کی قدر کرنے والا ہوگا، علماء کی بات پر کان دھرنے والا ہوگا، عزت کی نگاہ سے دیکھنے والا ہوگا، اور یہ سرمایہ دار جنہوں نے اپنا غلط طور طریقہ اختیار کر رکھا ہے، جن کے کاروبار غلط ہیں، جن کی آمدنی غلط ہے، جن کے اخراجات غلط ہیں، سب سے زیادہ مولوی کی اور نیک آدمی کی مخالفت کرنے والے اور اُن کا مذاق اڑانے والے یہی لوگ ہیں، وہ گویا کہ اپنے طبعی جذبے کے تحت ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں، کہ اگر ان کی بات مان لی تو نہ ہماری یہ مالی حیثیت رہے گی، نہ ہماری یہ چوہدراہٹ رہے گی، تو اپنی چوہدراہٹ کی حفاظت وہ اسی میں سمجھتے ہیں کہ اہلِ علم کی بات نہ مانی جائے، لوگوں کو بھی متنفر کرتے ہیں، کہ ان کے قریب نہ جاؤ۔ کیونکہ اگر ان کے قریب لوگ چلے گئے تو وہاں جا کر ہمارے خلاف ذہن بنے گا، پھر یہ ہماری چوہدراہٹ کہاں قبول کرتے ہیں؟

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اثر کیا ہوتا ہے؟

اور یہ قدرتی بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جو شخص بھی متاثر ہوگا وہ جلدی سے کسی کی بڑائی کا معتقد نہیں ہوتا، اس کے دل دماغ کے اندر اتنی قوت آ جاتی ہے، اور وہ اپنے دل دماغ کے اندر اتنا اپنے آپ کو سمجھنے لگ جاتا ہے، ساری مخلوق کو اللہ کے

مقابلے میں حقیر اور ذلیل سمجھتے ہوئے وہ کسی کی بڑائی کا جلدی سے قائل نہیں ہوتا، اور اگر وہ کسی کی بڑائی مانے گا، تو اُسی کی مانے گا جس کے پاس علم ہوگا اور عمل صالح ہوگا، اس لیے ان دُنیاداروں کے مقابلے میں اکثر و بیشتر اہلِ علم طبقہ جن کو اللہ نے صحیح علم دیا ہے، اور انبیاء ﷩ کی تعلیمات سے متاثر ہیں وہ مرعوب نہیں ہوتے، اور یہی چیز ان کو چبھتی ہے، کہ دوسرے لوگ تو ہمارے سامنے جلدی سے ڈر جاتے ہیں، دَب جاتے ہیں، ہم ان پر رُعب ڈال لیتے ہیں، یہ غریب مسکین، چٹائیوں پر بیٹھنے والے، ٹوٹی جوتیوں والے، پھٹے کپڑوں والے، ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں، یہ چیز ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی جس کی بنا پر یہ مخالفت کرتے ہیں، کہ ان کے طریقے پر کوئی نہ لگے، اور ان کی بات کوئی نہ مانے۔ یعنی اس تعلیم کا اثر ہے کہ غریب سے غریب آدمی، مسکین سے مسکین آدمی، بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے ڈٹ جاتا ہے، یہ انبیاء ﷩ کی اس تعلیم کا اثر ہے، اس لیے وڈیرے اور چوہدری اس کو اپنے لیے بڑا خطرناک سمجھتے ہیں۔

مولوی حکومت سے کیوں نہیں ڈرتا؟ اور سرمایہ دار کیوں ڈرتے ہیں؟

حکومتوں کے ساتھ ہمیشہ معاملہ ایسے ہی رہا ہے کہ جتنے کاروباری لوگ ہوں گے، جتنے صاحب جائیداد ہوں گے، جتنے صنعت کار ہوں گے، سب حکومت کو سلام کرنے والے ہوتے ہیں، اُن کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے حکومت کی مخالفت کی تو ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچے گا، اور حکومت کے پاس چونکہ ڈنڈا ہوتا ہے، اس لیے سارے اُس کے کاسہ لیس ہوتے ہیں، اس کے پیالے چاٹنے والے، اس کے بوٹ چاٹنے والے، حاکم کے سب سے زیادہ چاپلوس قسم کے لوگ یہی سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ اور یہ مولوی ملّاں بیچارہ، اس کو کسی چیز کا ڈر نہیں ہوتا، لہٰذا اس کو ڈٹنا پڑ جائے تو بادشاہِ وقت کے سامنے بھی ڈٹ جاتا ہے، کہے گا کیا ہوگا پہلے بھی چٹائی پر بیٹھتے ہیں، چٹائی چھین لیں گے تو زمین پر بیٹھنا شروع کر دیں گے، ہماری کیا بات ہے، اور جیسی روٹی ہم گھر کھاتے ہیں ایسی جیل میں مل ہی جاتی ہے، اگر جیل میں چلے جائیں گے تو کیا ہوگا، اور جیسے مکان ہمارے رہنے کے یہاں ہیں جیل کے کمرے اس سے اچھے ہوں گے بُرے نہیں ہیں، اس لیے وہ بازی لگاتے ہوئے اور ٹکراتے ہوئے حق بات کہتا ہوا نہیں ڈرتا۔ اور مولوی جتنا آرام طلب ہوتا جا رہا ہے، اتنی حق کی آواز دبتی چلی جا رہی ہے، اور مولوی جتنا مسکین تھا اتنا ہی حق گو زیادہ تھا، یعنی جو مولوی بھی سرمایہ دار قسم کا ہوتا جا رہا ہے، اچھا کھانا، اچھا پہننا، آرام راحت کا جو عادی ہوتا چلا جا رہا ہے، جو ائیر کنڈیشن کمروں میں رہنے لگ گئے، وہ حق نہیں کہہ سکتے، اُن کے لیے بہت مشکل ہے، کیونکہ آگے جو مشکلات آنے والی ہیں اُن کا اندازہ کر کے وہ دبتے ہیں کہ کیا کریں گے، اگر یہ آرام نہ رہا تو پھر کیا ہوگا، اگر وہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری ﷫ جیسے مسکین لوگ، جنہوں نے نہ اپنا مکان بنایا، نہ کوئی آرام کی زندگی سوچی، حضرت مدنی ﷫ جیسے، ان کو کیا، وہ جیل میں ہوئے تو کیا، گھر ہوئے تو کیا، اُن کی تو پوزیشن ایک ہی جیسی ہے، جتنا سا سامانِ راحت اُن کو گھر حاصل تھا، اتنا سا جیل میں مل جاتا تھا، پھر وہ حق کہنے سے کیوں ڈریں؟ جائیداد، کارخانے اُن کے نہیں تھے، جن پہ ڈر ہوتا کہ حکومت قبضہ کر لے گی، وہی ایک کپڑا ہے جو کندھے پر رکھا اور چل دیے، یہی

ساری کائنات ہے، لے جاؤ جہاں لے جاتے ہو۔ باقی جہاں تک جان کا معاملہ ہے اُس کے بارے میں یقین ہے کہ اللہ کا حکم آئے گا تو موت آئے گی، کسی کے بس میں نہیں ہے، ساری زندگی انگریزوں کی مخالفت کی اور اُن کے سامنے ڈٹ کر حق کہا، لیکن مرے اپنی طبعی موت ہیں، یہ بھی تو ایک عبرت کی بات ہے، یعنی ساری زندگی مخالفت کی اور اُن کو مخالفت کی جو توپوں والے تھے، ہوئی جہازوں والے تھے، ٹینکوں والے تھے، فوجوں والے تھے، ہر قسم کی قوتیں اُن کو حاصل تھیں ان سے ٹکرائے اور بہت کھل کر ٹکرائے، علی الاعلان دشمنی کی، لیکن وفات اپنی طبعی موت سے ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس زبردست دشمن کو قدرت نہیں دی کہ ان کا قاتل بن جائے، تو کیا یہ اللہ کی طرف سے نمونے نہیں؟ اس سے معلوم ہوگیا کہ موت وحیات پر تو کسی کا زور چلتا نہیں، باقی اگر ظاہری طور پر کوئی پکڑ دھکڑ کر لے گا تو ہمارا کیا لے لے گا، ہمارے پاس ہے کیا جو لے لے گا، اس لیے یہ لوگ پھر حق کہنے سے چوکتے نہیں ہیں، تو جس طرح انبیاء علیہم السلام فرعونِ وقت کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں، اور اُن کے سامنے کسی قسم کی کوئی خوف کی بات نہیں ہوتی، اسی طرح سے اُن کے ورثاء کا بھی یہی حال ہے۔ جتنا مولوی مسکین زیادہ ہوگا اتنا حق گو زیادہ ہوگا، اور جتنا سرمایہ دار ہوتا چلا جائے گا اتنا حق کہنے کی جرأت ختم ہوتی چلی جائے گی، کیونکہ وہ اپنی لذات اور اپنی دوسری چیزیں چھوڑنے کے لیے پھر جلدی سے آمادہ نہیں ہوتا، تو پھر وہی بات ہوجاتی ہے، کہ حق کے سامنے پھر انسان اپنے آرام کو دیکھتا ہے، اپنے جاہ کو دیکھتا ہے، اپنی عزت کو دیکھتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ اگر میں نے یہ بات کہی تو یہ ساری کی ساری چیزیں مجھ سے چھوٹ جائیں گی، اس لیے گدی نشین قسم کے لوگ، یہ جیسے بڑے بڑے مزاروں پر قبضے کیے بیٹھے ہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ اگر اہلِ علم کی بات مانی تو ہماری آمدنیاں بند ہوتی ہیں، چاہے وہ سمجھتے ہوں کہ سجدہ کروانا غلط ہے، چڑھاوے چڑھانے غلط ہیں، لیکن چونکہ آمدنیاں بند ہوتی ہیں، اس لیے کسی صورت میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تو لذت اور شہوات کی جب عادت پڑ جاتی ہے، تو پھر حق قبول کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اس لیے وڈیرے لوگ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں آئے، تمام واقعات میں یہ چیز آپ کو ایک مرکزی حیثیت میں ملے گی۔

کیا مال دار کو سلام کرنا ممنوع ہے؟

(کسی کے سوال پر فرمایا)...... سلام کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے، یہ جو کہا جاتا ہے، سلام کرتے ہیں، فلاں کے سلامی ہیں، اس کا مطلب ہوتا ہے چاپلوس، کہ وہ کوئی ناجائز قسم کی بات بھی کریں تو بھی ان کی حمایت کرنی ہے مخالفت نہیں کرنی، یہ لفظ محاورے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، کہ یہ حکومت کے سلامی ہیں، حکومت کو سلام کرنے والے ہیں، ویسے "السلام علیکم" کہنا تو مطلقاً انسان کا حق ہے، چاہے غریب ہو چاہے امیر ہو، مسلمان کو سلام کہو، یہ تو نہیں کہ سرمایہ دار کو سلام کہنا جائز نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں "فلاں آدمی فلاں کا سلامی ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چاپلوس قسم کا ہے، کہ چاہے وہ غلط بات ہی کہے تو بھی انہوں نے اس کی حمایت ہی کرنی ہے، مخالفت نہیں کر سکتے، یہ لفظ بطور محاورے کے استعمال ہوتے ہیں۔ سلام کرنا ممنوع نہیں، سلام تو غریب کو بھی کرو اور امیر کو بھی کرو۔ اگر کوئی شخص امیر کو سلام کرتا ہے، غریب کو نہیں کرتا، یہ اس کی عادت غلط ہے۔ ویسے یہ نہیں

کہ امیر اور دولت مند کو سلام کرنا ممنوع ہے، البتہ اگر وہ کسی گناہ کے کام میں مشغول ہے، پھر سلام نہیں کہنا چاہیے، مثلاً بیٹھا ہوا داڑھی منڈوا رہا ہے تو اس وقت سلام نہ کہو، تاش کھیل رہا ہے تو اس وقت سلام نہ کہو، اس قسم کے کسی اور ایسے مشغلے میں مبتلا ہے جو معصیت ہے تو اس وقت سلام نہیں کہنا چاہیے۔

قوم کی دھمکی اور شعیب علیہ السلام کا جواب

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ: کہا وڈیروں نے، بڑوں نے، سرداروں نے، جو متکبر تھے ان کی قوم میں سے، البتہ ضرور نکال دیں گے تجھے اے شعیب! تجھے بھی نکال دیں گے اور اُن لوگوں کو بھی نکال دیں گے جو تیرے ساتھ ہیں اپنی بستی سے، اپنے شہر سے، قَرْیَتِنَآ گویا کہ وہ کہتے ہیں کہ شہر تو ہمارا ہے، تم اُس کے کیا لگتے ہو، یا تو سیدھے ہو کر رہو ہمارے طریقے پر، ورنہ یہاں سے بوریا بستر گول کرو۔ ''ہم اپنے شہر سے تمہیں نکال دیں گے، یا ضرور لوٹ آؤ گے تم ہمارے طریقے میں'' عود کہتے ہیں حالت سابق کی طرف لوٹ آنا، پہلی حالت کی طرف لوٹ آنا، یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کے اعتبار سے تو حقیقت ہے کہ پہلے وہ بھی اسی قسم کے کردار پہ ہوتے ہیں، اسی قسم کا ان کا رویہ ہوتا ہے، پھر ایمان لے آئے تو چھوڑ دیا، اُن کا واپس لوٹ آنا تو حقیقی ہے، شعیب علیہ السلام پر یہ لفظ صادق نہیں آتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کسی دور میں بھی کردار کے گفتار کے کمزور نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں، اُن کے لیے لوٹنا یا تو مجازی ہے کہ ہمارا دین اختیار کر لو، یا اکثر ساتھیوں کے اعتبار سے ہے، یا یہ ہے کہ جس وقت تک کوئی نبی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے منصبِ نبوّت پر فائز نہیں ہوتا، اس وقت چونکہ وہ روک ٹوک نہیں کرتا، تو لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہمارے ہی طریقے پر ہے، اور جب وہ نبوّت کے منصب پر فائز ہوگا، تو روک ٹوک شروع کر دی تو وہ سمجھتے ہیں اب انہوں نے مخالفت شروع کر دی، اس لیے کہتے ہیں کہ پہلے طریقے پر آجاؤ، جس طرح سے پہلے رہتے تھے ویسے ہی رہو، تو روک ٹوک نہ کرنے کو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شاید یہ ہمارے طریقے پر ہی ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے کہا کہ کیا ہم لوٹ آئیں گے تمہارے طریقے کی طرف، اگرچہ ہم کراہت کرنے والے ہی ہوں، اگرچہ ہمیں وہ پسند نہ ہو؟ اگر ایسا ہو گیا کہ ہم تمہاری طرف لوٹ کر آجائیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس وقت تک اللہ پر جھوٹ ہی بولتے رہے ہیں، ہم جو کہتے تھے کہ اللہ کہتا ہے شرک نہ کرو، اللہ کہتا ہے پورا تولو، اب پھر ہم آجائیں تمہارے طریقے پر، تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے پہلے اللہ تعالیٰ پر افترا ہی کیا تھا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ یہ باتیں صحیح اور سچی ہیں جو ہم کہہ رہے ہیں، تو کل کو اُس کے خلاف ہم کس طرح سے کر لیں، یا سمجھ آجانے کے باوجود پھر وہی طریقہ تمہارا اپنائیں گے، تو گویا کہ اپنے عمل کے ساتھ پھر اللہ پر جھوٹ بولیں گے، دونوں مطلب ہی ہیں، یا تو یہ ہے کہ جو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق کہہ رہے ہیں، اگر کل کو ہم تمہارا طریقہ اختیار کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ ہم نے پہلے جھوٹ بولا تھا، یا یہ ہے کہ جب ہم تمہارا طریقہ اختیار کر لیں گے، تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اللہ پر جھوٹی باتیں گھڑنے لگ جائیں گے، ایسا نہیں ہو سکتا، ہم اللہ پر جھوٹ نہیں باندھ سکتے، ہم جو کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں اور آئندہ سچی بات ہی اختیار کریں گے۔ ''تحقیق گھڑا ہم نے اللہ پر جھوٹ اگر لوٹ آئے ہم تمہارے طریقے میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دے دی'' دیکھو! یہ بھی ایک

احساسِ عبدیت ہے کہ ہر چیز کی نسبت اللہ کی طرف ہے، کہ اللہ نے ہمیں نجات دے دی تمہارے طریقے سے، اللہ نے ہمیں اس طریقے سے بچا لیا جو تمہارا شرک والا گندا طریقہ ہے، تو اللہ کے اس نجات دلانے کے بعد کیا ہم پھر لوٹ آئیں گے؟ ایسا نہیں ہوسکتا، مَایَكُوْنُ لَنَاۤ: ہمارے لیے یہ مناسب ہی نہیں کہ ہم لوٹ آئیں اس طریقے میں، ہاں مگر اللہ کا چاہنا ہو کر رہتا ہے اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا یہ بھی عبدیت ہے، اگر یوں کہتے کہ بالکل میں تمہارا طریقہ اختیار نہیں کروں گا، ایسے معلوم ہو، تو یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کا نہیں ہے، ہر بات میں عبدیت اور تواضع نمایاں ہے، کہ بھائی! اگر اللہ کے مشیت ہی کسی کے متعلق ہو جائے، کوئی دھوکا کھا جائے، تمہارے طریقے کی طرف آ جائے، اس کا تو کوئی علاج نہیں، باقی جہاں تک ظاہری حالات کا تعلق ہے ہم کبھی تمہارا طریقہ نہیں قبول کرسکتے۔ ''مگر چاہنا اللہ کا جو ہمارا ربّ ہے وہ ہو کر رہتا ہے'' یا ''اِلَّا وقتَ مشیئۃِ اللہ'' اللہ تعالیٰ کی مشیت کے وقت۔ ''وسیع ہے ہمارا پروردگار ہر چیز سے از روئے علم کے'' عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا: ہم نے اللہ پر ہی بھروسا کیا ہے، اے ہمارے پروردگار! فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ اور تو بہت بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، یعنی ہم بحث مباحثے کر کے تو تھک گئے، دلیلوں کے ساتھ تو یہ مانتے نہیں، اب یہ فیصلہ جو طلب کیا جا رہا ہے تو یہ عملی فیصلہ ہے، اور عملی فیصلہ یہ ہے کہ اہلِ حق نجات پا جائیں اور اہلِ باطل کا رگڑا نکل جائے، پھر لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ واقعی یہ ٹھیک تھے یا غلط تھے۔

سرداروں کی ہٹ دھرمی اور انجام

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ: کہا ان وڈیروں نے، سرداروں نے جو کافر تھے شعیب علیہ السلام کی قوم میں سے، کہا یعنی آپس میں ایک دوسرے کو، کہ اگر تم نے اتباع کی شعیب علیہ السلام کی تو تب تم خسارہ پانے والے ہو جاؤ گے، یعنی آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ اس کی باتیں نہ مانو، اس کی باتیں ماننے کا مطلب تو نقصان ہی نقصان ہے، اپنی تجارت تباہ کرلو، اپنی چوہدراہٹ ختم کردو، اس کی باتوں کا تو یہ نتیجہ ہے، اس لیے اس کی بات نہیں ماننی، آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے۔ ''اگر تم نے اتباع کی شعیب علیہ السلام کی، تو بے شک تم تب البتہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے''، فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پھر اُن کو زلزلے نے پکڑ لیا، فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ: پھر ہو گئے وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرنے والے، ڈھیر ہو جانے والے، وہیں اپنے گھروں میں ڈھیر ہو گئے، ہلنے کی طاقت نہ رہی، جو بڑیں مارتے تھے، اور بڑکیں مارتے تھے۔

تکذیب کی وجہ سے قومِ شعیب بے نام ونشان

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا: یہ تو نکالتے تھے اپنے شہر سے شعیب علیہ السلام کو اور اس کے ساتھیوں کو۔ جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی تھی، وہ ایسے ہو گئے گویا کہ اس شہر میں کبھی آباد ہی نہیں رہے، نام ونشان نہیں رہا، كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا گویا کہ انہوں نے کبھی یہاں اقامت ہی اختیار نہیں کی، یعنی یوں بے نام ونشان ہو گئے۔ وہ لوگ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا وہی خسارہ پانے والے تھے۔ وہ تو کہتے تھے کہ شعیب علیہ السلام کی بات ماننے میں خسارہ ہے، لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ خسارے

میں وہی رہے جنہوں نے شعیب علیہ السلام کی بات نہیں مانی۔ فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ: شعیب علیہ السلام نے ان سے منہ پھیرا، وَقَالَ: اور کہا اے میری قوم! یہ اظہارِ افسوس ہے، اگر عذاب آنے کے بعد مرے پڑے ہوئے دیکھ کر کہہ رہے ہیں تو یہ محض اظہارِ افسوس ہے، اور اگر عذاب آنے سے قبل کہہ رہے ہیں تو یہ آخری تنبیہ ہے، اے میری قوم! البتہ تحقیق پہنچا دیے میں نے تمہیں اپنے رَبّ کے پیغامات وَنَصَحْتُ لَكُمْ اور میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کی، تمہیں نصیحت کی فَكَيْفَ اٰسٰى جب میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی تو پھر میں کیسے افسوس کروں؟ یعنی میرے لیے اب کیا افسوس کا موقع ہے، جاؤ جدھر جاتے ہو، برباد ہوتے ہو تو برباد ہو جاؤ، میں تمہاری اس بربادی پر آنسو کیوں بہاؤں؟ میں نے کون سی کمی کی ہے تمہیں سمجھانے میں، جب تم نہیں سمجھتے اور کسی طریقے سے سُدھرنے والے نہیں، تو اپنی ہلاکت کی ذمہ داری تمہارے اُوپر ہے، ہمیں کیا، جاؤ، یہی ہوتی ہے آخری آخری بات، فَكَيْفَ اٰسٰى کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری بربادی پر آنسو کیوں بہاؤں؟ ایسی تیسی میں جاؤ، بھاڑ میں جاؤ، جدھر جاتے ہو جاؤ، ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا، آگے تمہاری مرضی، کیسے افسوس کروں میں اُن لوگوں پر جو کُفر کرنے والے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ

نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر پکڑا ہم نے اس بستی والوں کو مالی تنگی کے ساتھ اور بدنی تکلیف کے ساتھ تاکہ

يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا

وہ عاجزی کرنے لگ جائیں ﴿۹۴﴾ پھر بدل دیا ہم نے بُرائی کی جگہ اچھائی کو حتّٰی کہ وہ بہت پھل پھول گئے، اور کہنے لگے

قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

تحقیق پہنچی ہمارے آباء کو بھی بدحالی اور خوش حالی، پھر ہم نے انہیں پکڑ لیا اچانک اس حال میں کہ ان کو

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ

خبر بھی نہ تھی ﴿۹۵﴾ اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو کھول دیتے ہم ان پر

بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

آسمان کی اور زمین کی برکتیں، لیکن انہوں نے تکذیب کی پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا ان کاموں کے سبب سے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۹۶﴾

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ

کیا پھر بے خوف ہو گئے بستیوں والے کہ آ جائے ان کے پاس ہمارا عذاب رات کے وقت اس حال میں کہ وہ

نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ

سوئے ہوئے ہوں ﴿۹۷﴾ کیا بے خوف ہو گئے بستیوں والے کہ آ جائے ان کے پاس ہمارا عذاب چاشت کے وقت اس حال میں کہ وہ

يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ

اپنے کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں ﴿۹۸﴾ کیا یہ لوگ بے خوف ہو گئے اللہ کی تدبیر سے؟ نہیں بے خوف ہوا کرتے اللہ کی تدبیر سے مگر

الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ

خسارہ پانے والے لوگ ﴿۹۹﴾ جو لوگ وارث بنے ہوئے ہیں اس زمین کے اس کے اہل کے بعد کیا ان کی راہنمائی نہیں کر دی (ان واقعات نے

اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

جو پہلے گزرے ہیں) اس بات کی کہ اگر ہم چاہیں تو ہم انہیں بھی مصیبت پہنچا دیں ان کے گناہوں کی وجہ سے، اور ہم مُہر کر دیتے ہیں اُن کے

فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ

دلوں پر پس یہ سنتے نہیں ﴿۱۰۰﴾ یہ بستیاں، بیان کرتے ہیں ہم آپ پر ان کے کچھ حالات،

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا

البتہ تحقیق ان کے پاس ان کے رسول آئے تھے واضح دلائل لے کر، پس وہ ایمان لانے والے نہیں تھے اس چیز پر جس کو انہوں نے

مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا

پہلے جھٹلا دیا، اسی طرح سے مُہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر ﴿۱۰۱﴾ نہیں پایا ہم نے

لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

ان میں سے اکثر کے لئے عہد کا پورا کرنا، اور بیشک پایا ہم نے ان میں سے اکثر کو البتہ نافرمان ﴿۱۰۲﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ: مِنْ نَّبِیٍّ یہ نکرہ آ گیا، اور مَآ اَرْسَلْنَا کلام منفی ہے، اور یہ ضابطہ آپ سنتے پڑھتے رہتے ہیں کہ نکرہ تحت النفی عموم کا فائدہ دیتا ہے، اس لیے ہم اس کا ترجمہ یوں کریں گے، نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی، قریۃ کے اندر بھی عموم آ گیا، اور نبی کے اندر بھی عموم آ گیا۔ نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا

بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ: باساء کا لفظ مالی تنگی کے لئے بولا جاتا ہے، اور ضراء کا لفظ بدنی تکلیف کے لیے بولا جاتا ہے، مالی تنگی کے اندر قحط فقر وفاقہ، اور بدنی تکلیف کے اندر بیماری اور اس قسم کے وہ حادثات جو انسان کے بدن سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب ضراء میں آجائیں گے۔ ''مگر پکڑا ہم نے اس بستی والوں کو مالی تنگی کے ساتھ اور بدنی تکلیف کے ساتھ، مؤاخذہ کیا ہم نے ان پر، پکڑا ہم نے انہیں مالی تنگی کے ساتھ اور بدنی تکلیف کے ساتھ'' لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ: يَضَّرَّعُوْنَ اصل میں يَتَضَرَّعُوْنَ تھا، تَضَرَّعَ سے اِطَّرَّعَ بن جائے گا، اِثَّاقَلَ، اِطَّهَّرَ کی طرح اس میں توجیہ ہوجائے گی، تائے تفعل کو فاء کلمہ کے ساتھ تبدیل کر کے ادغام کیا ہوا ہے۔ يَتَضَرَّعُوْنَ تا کہ وہ عاجزی کرنے لگ جائیں، تضرع کرنے لگ جائیں۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ: پھر بدل دیا ہم نے برائی کی جگہ اچھائی کو سیئۃ کا مصداق یہاں وہی باساء اور ضراء ہے، جو ان کو بُری حالت پیش آئی ہوئی تھی مالی طور پر یا بدنی طور پر، پھر ہم نے اُس کو حسنہ سے بدل دیا، اچھی حالت کے ساتھ بدل دیا۔ ''پھر بدل دیا ہم نے بُرائی کی جگہ اچھائی کو'' حَتّٰى عَفَوْا: عفا یعفو بڑھنے کے معنی میں، عفا النبات: نباتات بڑھ گئی۔ حَتّٰى عَفَوْا کا معنی ہے حتیٰ کہ وہ ترقی کر گئے، بہت پھل پھول گئے، وَقَالُوْا: اور کہنے لگے قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ: سراء خوش حالی کو کہتے ہیں، اور خوش حالی کے مقابلے میں ضراء بدحالی ہوگئی، پچھلی آیت میں تو آپ کے سامنے یہ ذکر کیا تھا کہ ضراء بدنی تکلیف کو کہتے ہیں، تو جس وقت ضراء اور باساء اکٹھے آجائیں اُس وقت تو فرق کرلیا جاتا ہے مالی تکلیف کا اور بدنی تکلیف کا، کہ باساء کا مصداق مالی تکلیف اور ضراء کا مصداق بدنی تکلیف، لیکن جس وقت ضراء کا مقابلہ سراء کے ساتھ آجائے تو پھر خوش حالی کے مقابلے میں اس کا مفہوم بدحالی ہے، چاہے وہ مصیبتوں بیماریوں کی شکل میں ہو، چاہے وہ مالی تکلیف کی شکل میں ہو، پھر ضراء کا لفظ دونوں حالتوں کو عام ہے، پہلے چونکہ باساء کا لفظ ساتھ آیا ہوا تھا اس لیے ہم نے اس سے بدنی تکلیف مراد لے لی، اور یہاں سراء کے ساتھ مقابلۃً یہ لفظ آیا ہوا ہے تو یہاں مطلقاً بدحالی مراد ہے، چاہے وہ مالی تنگی کے ساتھ ہو، چاہے بدنی تکلیف کے ساتھ ہو، اس کا مفہوم عام ہے۔ اور کہا انہوں نے قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا تحقیق پہنچی ہمارے آباء کو بھی بدحالی اور خوشحالی۔ آباء اب کی جمع، ہمارے آباؤ اجداد کو بھی بدحالی اور خوش حالی پہنچی تھی۔ فَاَخَذْنٰهُمْ پھر ہم نے اُنہیں پکڑلیا بَغْتَةً اچانک، وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اس حال میں کہ اُن کو شعور نہیں تھا، اُن کو سمجھ بھی نہیں تھی، پتہ بھی نہیں چلا کہ ہم پر کوئی عذاب آرہا ہے، اس طرح سے ہم نے اُن کو پکڑ لیا۔ اس حال میں کہ اُن کو خبر نہیں تھی، وہ سمجھتے نہیں تھے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا: اگر بستیوں والے ایمان لے آتے، وَاتَّقَوْا: اور تقویٰ اختیار کرتے لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ تو کھول دیتے ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں۔ برکات برکت کی جمع ہے، برکت کے اندر بھی بڑھنے اور ترقی کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہم ان پر زمین وآسمان سے ترقیات کے دروازے کھول دیتے، برکتوں کے دروازے کھول دیتے، فوائد اور منافع کے دروازے کھول دیتے، ''برکت'' کا مفہوم یہاں یہی ہے، خیر وبرکت جس طرح سے آپ کہتے ہیں۔ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا: لیکن اُن بستی والوں نے تکذیب کی فَاَخَذْنٰهُمْ پھر ہم نے اُن کو پکڑلیا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اُن کے کسب کے سبب سے، ''ما'' مصدریہ ہوجائے گا۔ (یا) جو کام وہ کیا کرتے تھے اُن کے سبب سے ہم نے انہیں پکڑلیا۔ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى: اَمِنَ: بے خوف ہوجانا۔ کیا پھر بے خوف ہوگئے بستیوں والے اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا کہ آجائے اُن کے پاس ہمارا عذاب۔ باس: عذاب۔ بیاتًا یہ لفظ پہلے بھی آپ کے سامنے گزرا، بَاتَ يَبِيْتُ: رات گزارنا۔ تو وقت بیاتٍ آجائے اُن کے پاس

ہماراعذاب رات گزارنے کے وقت، یاہٰائِمِیْنَ کے معنی کر کے حال واقع کر لیجئے، اس حال میں کہ وہ رات گزار رہے ہوں۔ بَیَاتًا: رات کے وقت۔ کیا بےخوف ہوگئے بستیوں والے کہ آجائے اُن کے پاس ہماراعذاب رات کے وقت اس حال میں کہ وہ سوئے ہوئے ہوں۔ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰی: کیا بےخوف ہوگئے بستیوں والے اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًی کہ آجائے اُن کے پاس ہماراعذاب چاشت کے وقت۔ ''ضُحًی'' کہتے ہیں اِستواسے پہلے، دوپہر سے پہلے سورج کے اُونچا ہوجانے کے بعد جو وقت ہوتا ہے وہ ''ضُحٰی'' کہلاتا ہے، جو انتہائی مشغولیت کا وقت ہے، ہر کوئی اپنے کاموں میں مشغول ہوتا ہے، اس لیے حضرت شیخ (الہند رحمہ اللہ) ''ضُحٰی'' کا ترجمہ ''دِن چڑھے'' کررہے ہیں۔ دِن جس وقت اچھی طرح سے روشن ہوجاتا ہے، تو استوا سے پہلے پہلے جو وقت ہوتا ہے یہ ضُحٰی کا وقت کہلاتا ہے، جس کو ہم عام طور پر چاشت کا وقت کہتے ہیں۔ کیا بےخوف ہوگئے بستیوں والے کہ آجائے اُن کے پاس ہمارا عذاب چاشت کے وقت وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ: اس حال میں کہ وہ اپنے کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں، لعب کا معنی چونکہ بے کار کاموں میں مشغول ہونا ہوتا ہے، تو اس سے وہ سارے کاروبار مراد ہوسکتے ہیں جو اللہ سے غفلت کے تحت کیے جائیں، اس سے گیند بلا، گلی ڈنڈا ہی مراد نہیں کہ وہ کھیل رہے ہوں، بلکہ دُنیا کے جتنے کام جن میں آخرت مقصود نہیں ہوتی، اللہ کی رضا مقصود نہیں ہے، دُنیا کے وہ سارے کے سارے کام لہو ولعب کا مصداق ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم نے خود اس بات کی صراحت کی اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ (سورۂ محمد: ۳۶) کہ دُنیوی زندگی کے جتنے کام کاج ہیں جن میں آخرت مقصود نہیں، اللہ کی رضا مقصود نہیں، وہ سب لہو ولعب کا مصداق ہیں، اس لیے يَلْعَبُوْنَ کا مفہوم یہ بھی ہوگا کہ جس وقت وہ اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہوں، وہ بھی لعب کا مصداق ہی ہے۔ کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں، کاروبار میں لگے ہوئے ہوں ایسے وقت میں اُن کے پاس ہماراعذاب آجائے۔ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ: کیا یہ لوگ بےخوف ہوگئے اللہ کی تدبیر سے فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ: نہیں بےخوف ہوا کرتے اللہ کی تدبیر سے مگر خسارہ پانے والے لوگ۔ قوم کا لفظ چونکہ افرادِ کثیرہ پر دلالت کرتا ہے، اس لیے الْخٰسِرُوْنَ صفت جمع کے طور پر آگئی، مگر خسارہ پانے والے لوگ۔ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ: هَدٰی يَهْدِيْ: راہنمائی کرنا، پتا نشان دینا۔ جیسے کہ آپ اِراءۃُ الطریق اور ایصال الی المطلوب یہ معنی لفظِ ''ہدایت'' کا کرتے رہتے ہیں، لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ: اَهْلِهَاۤ کی ضمیر اَرض کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اَوَلَمْ يَهْدِ کا فاعل ہے مَا جرٰی علی الاُمَمِ السابقۃِ (آلوسی) جو پہلے گزرے ہوئے واقعات ہیں، اور اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ یہ لَمْ يَهْدِ کا مفعول ہے، ترجمہ اچھی طرح سے سمجھ لیجئے......! کیا ان واقعات نے راہنمائی نہیں کی، کیا ان واقعات نے دکھلا نہیں دیا؟ ان لوگوں کو جو وارث بنے ہیں اس زمین کے اس زمین کے اہل کے بعد، جو لوگ اس زمین کے وارث بنے ہیں زمین کے اہل کے بعد یعنی پہلے لوگوں کے تباہ ہونے کے بعد دوسرے جو زمین کے وارث بنے، کیا ان لوگوں کے لیے نمایاں نہیں کردیا ان واقعات نے جو پہلے گزرے ہیں، ان کی راہنمائی نہیں کردی ان واقعات نے؟ کس بات کی راہنمائی نہیں کردی، یا کیا بات ان کو نہیں بتلادی اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ کہ اگر ہم چاہیں تو ہم اِن کو بھی اِن کے گناہوں کی وجہ سے مصیبت پہنچادیں۔ کیا ان واقعات کو دیکھ کر یہ لوگ سمجھے نہیں؟ یہ واقعات اِن کے لیے سمجھنے کا ذریعہ نہیں بنے؟ ان کے لیے باعثِ ہدایت نہیں ہوئے؟ ان واقعات سے ان کے سامنے یہ بات واضح نہیں ہوگئی؟ ان واقعات نے اِن کے سامنے اس مفہوم کو

روشن نہیں کر دیا، کہ اگر ہم چاہیں تو ہم انہیں بھی مصیبت پہنچا دیں ان کے گناہوں کی وجہ سے۔ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: اور ہم مہر کر دیتے ہیں ان کے دلوں پر فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ پس یہ سنتے نہیں، یہاں سنا ماننے کے معنی میں ہے، کیونکہ جو شخص کان سے سنتا ہے لیکن دل سے مانتا نہیں، تو اس کا سننا نہ سننا برابر ہے، یہ اسی محاورے کے مطابق بات ہے جس طرح سے ہم کہا کرتے ہیں کہ میں نے آپ کو ہزار دفعہ سمجھایا ہے، لیکن آپ میری ایک نہیں سنتے۔ ''ایک نہیں سنتے'' کا کیا معنی ہوتا ہے؟ کہ آپ مانتے نہیں ہیں، ورنہ کان میں آواز تو جاتی ہے۔ تو محاورے کے طور پر نہ سننے سے نہ ماننا مراد ہوتا ہے، کیونکہ جب ایک بات سنی جائے لیکن دل سے اُس کو قبول نہ کیا جائے تو سننا نہ سننا برابر ہے۔ ''پس وہ سنتے ہی نہیں''۔ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا: انباء نبأ کی جمع ہے، نبا بڑی خبر کو کہتے ہیں۔ یہی بستیاں، ہم ان کے کچھ حالات آپ پر بیان کرتے ہیں۔ مِن تبعیضیہ ہے۔ قَصَّ يَقُصُّ: بیان کرنا۔ یہ لفظ پہلے بھی اسی سورت میں گزرا ہے۔ یہ بستیاں، بیان کرتے ہیں ہم آپ پر ان بستیوں کے کچھ حالات۔ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: البتہ تحقیق ان کے پاس ان کے رسول آئے تھے واضح دلائل لے کر فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا پس نہیں تھے وہ لوگ کہ ایمان لے آئیں، وہ ایمان لانے والے نہیں تھے، بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ: نہیں ایمان لانے والے تھے اُس چیز کے ساتھ جس کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا۔ جس کو انہوں نے ایک دفعہ جھٹلا دیا پھر اُس کو وہ ماننے والے نہیں تھے۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ: اسی طرح سے مہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر۔ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ: مِنْ عَهْدٍ سے مِن ایفاءِ عهدٍ مراد ہے۔ نہیں پایا ہم نے ان میں سے اکثر کے لیے عہد کا پورا کرنا، ہم نے ان میں سے اکثر کے لیے عہد نہیں پایا، یہ لوگ اپنے عہد کے پابند نہیں تھے۔ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ: یہ ان مخففہ من المثقلہ ہے۔ اور بے شک پایا ہم نے ان میں سے اکثر کو البتہ نافرمان، فاسق۔

تفسیر

ماقبل سے ربط اور مذکورہ بالا آیات لانے کا مقصد

واقعات کے سلسلے میں پانچ واقعات آپ کے سامنے ذکر کیے گئے ہیں، پہلے قومِ نوح کا قصہ ذکر کیا گیا تھا، پھر اُن کے بعد قومِ عاد کا ذکر کیا گیا تھا، پھر قومِ ثمود کا ذکر کیا گیا تھا، پھر قومِ لُوط کا ذکر کیا گیا تھا، اور اس کے بعد اہلِ مدین یعنی قومِ شعیب کا ذکر آیا تھا۔ جہاں تک آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے، ان آیات کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ آ رہا ہے، اور وہ مفصل قصہ ہے جو کئی رکوع تک چلے گا۔ تو واقعات کے درمیان میں یہ چند ایک آیات گویا کہ ان واقعات پر ایک تبصرہ ہے، اور قرآنِ کریم کے مخاطبین کو متنبہ کرنا ہے کہ ان واقعات سے ذرا عبرت حاصل کرو، اُن قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ تھا تمہارے ساتھ بھی وہی ہوگا، جس ترازو کے ساتھ اُن کو تولا گیا تھا انہی باتوں سے تمہارا وزن کیا جائے گا، یہ نہیں کہ اُن کے ساتھ کسی اور طرح کا معاملہ تھا اور تم جو چاہو کرتے رہو تمہاری رسّی ڈھیلی رہے گی، سمجھ جاؤ، یہ واقعات آگے پیچھے جو ذکر کیے جا رہے ہیں ان سے متنبہ ہو جاؤ۔ تو متنبہ کرنے کے لیے، خبردار کرنے کے لیے، قرآنِ کریم کے مخاطبین کو بیدار کرنے کے لیے ان واقعات کے تازیانے سے درمیان میں یہ آیات آگئیں، ان آیات کے بعد پھر اسی طرح سے واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

تنبیہی واقعات کا مقصد

پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک عام ضابطے کے طور پر بات بیان فرمائی، کہ ہماری عادت یہی ہے کہ جب ہم کسی بستی کے اندر نبی کو بھیجتے ہیں، اور وہ نبی آ کے اس بستی والوں کو اُن کی غلطیوں پر متنبہ کرتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس بستی پر کچھ مصائب بھی بھیجے جاتے ہیں، کچھ پریشانیوں کے اندر اُن کو مبتلا کر دیا جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تازیانہ عبرت ہوتا ہے، کہ نبی جو تمہیں ڈراتا ہے یہ واقعات اُس کا نمونہ ہیں، اور انسان بسا اوقات مصیبت اور تکلیف میں آ کر نرم دل ہو جاتا ہے، جب وہ نبی کی نصیحت بھی سنے گا کہ اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں دنیا میں بھی عذاب آ سکتا ہے، اور اُس کے تھوڑے تھوڑے واقعات اور نمونے بھی سامنے آنے شروع ہو گئے، بیماریاں آ گئیں، قحط پڑ گیا، سیلاب آ گیا، زلزلہ آ گیا، معمولی معمولی جھٹکے، اس قسم کے مصائب اُس قوم پر بھیجے جاتے ہیں، اس بستی پر بھیجے جاتے ہیں تاکہ اُن میں تواضع پیدا ہو، اُن میں عاجزی آ جائے، وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، پھر نبی کی نصیحت کی قبول کر لیں، تو یہ ایک قسم کی عبرت اور تنبیہ کے لیے اس قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھیجے جاتے ہیں۔

تنبیہی واقعات کی لپیٹ میں نیک وبد کا اِمتیاز نہیں ہوتا

اور یہ واقعات جو بطور تنبیہ کے ہوا کرتے ہیں یہ عام ہوتے ہیں، جس میں نیک وبد سارے ہی لپیٹ میں آ جاتے ہیں، جو تکلیف بطور آزمائش کے ہوتی ہے اس میں نیک اور بد کا امتیاز نہیں ہوتا، جو تکلیف بطور آزمائش کے ہوتی ہے کہ یہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، اِستغفار کرنے لگ جائیں، توبہ کریں، دیکھیں اس میں صبر کرتے ہیں یا نہیں کرتے، اس مصیبت کو اللہ کی طرف سے جانتے ہوئے کیا اللہ کے سامنے جھکتے ہیں یا نہیں، جو مصیبتیں اس انداز کی ہوا کرتی ہیں جس کو آزمائش کی مصیبتیں کہہ سکتے ہیں، اس میں نیک وبد کا امتیاز نہیں ہوتا، مثلاً سیلاب جس وقت آتا ہے تو وہ نیکوں کو بھی بہا کر لے جاتا ہے، بُروں کو بھی بہاتا ہے، زلزلہ جب آتا ہے تو جہاں مندر گرتے ہیں وہاں مسجدیں بھی گر جاتی ہیں، اور مکانوں کے نیچے دب کر جہاں کافر مرتے ہیں مسلمان بھی مر جاتے ہیں، اور جب کسی علاقے کے اندر وبا پھوٹتی ہے تو بخار بُروں کو بھی چڑھتا ہے اچھوں کو بھی چڑھتا ہے، ظاہری صورت اس کی ایک عام ہوتی ہے، نیک وبد سب کو لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

تنبیہی واقعات کی حقیقت نیک وبد کے لئے مختلف ہوتی ہے

ظاہری صورت عام ہوتی ہے، حقیقت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، کہ جو لوگ ان مصیبتوں سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، توبہ استغفار کی طرف لگ جاتے ہیں، اُن کے لیے یہ مصیبتیں رحمت ہوتی ہیں، اُن کے لیے یہ عذاب نہیں، یہ رحمت ہیں۔ جس طرح سے ایک بچے کو تھپڑ مارا، اور تھپڑ مار کر بیدار کر دیا، بیدار کر کے اس کو نماز پڑھوا دی اور اُس کو سبق یاد کروا دیا، تو یہ تھپڑ اُس کے لیے رحمت ہے جس کے ساتھ وہ بیدار ہو گیا، وقت پر اُس نے نماز پڑھ لی، اپنا سبق یاد کر لیا۔ تو جس کے

نتیجے میں اللہ کی طرف توجہ ہوجائے، انسان اپنی کوتاہیوں پر متنبہ ہوجائے، یہ مصیبت اُس کے لیے رحمت ہے۔ اور اگر اس قسم کی مصیبت میں وہ اور اکڑ جائے، جس طرح سے تنبیہ کے بعد بسا اوقات اکڑ پیدا ہوجاتی ہے، کہ اچھا! کرلو جو کچھ کرنا ہے، میں نہیں مانتا۔ ایک تو ہے کہ لفظی طور پر تنبیہ ہوئی، اور آگے سے اکڑ گیا، اور اسی طرح واقعات کے تحت بھی انسان اکڑ جاتا ہے، کہ جیسے جیسے مصیبتیں اُس کے اندر آتی ہیں وہ اُلٹا اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے لگ جاتا ہے، بُرا بھلا کہنے لگ جاتا ہے، ایسے واقعات ہیں، دُنیا میں پھریں، آپ دیکھیں، جیسے جیسے پریشانیاں پیش آتی ہیں، اسی طرح سے لوگ اور زیادہ سرکش ہوتے چلے جاتے ہیں، اور زیادہ فاسق وفاجر ہوتے چلے جاتے ہیں کہ ''چلو! اللہ تعالیٰ نے اگر ہمارے ساتھ یوں کردیا تو ہم نماز ہی نہیں پڑھتے، پڑھوا لے ہم سے نماز'' یا ''ہم کیوں اللہ کے لیے روزے رکھیں؟ اُس نے ہمارا کیا کیا ہے؟'' اس قسم کے کُفریہ کلمے اور اس قسم کی سرکشی اُن کے اندر اور آجاتی ہے، تو اصل کے اعتبار سے یہ مصیبتیں اُن کے لیے عذاب ہوتی ہیں، کیونکہ ان مصیبتوں سے متاثر ہوکر نیکی کی طرف آنے کی بجائے وہ ان مصیبتوں سے دھکا کھا کر اور جہنم میں چلے گئے۔ تو ظاہری صورت اگرچہ تکلیفوں کی ایک جیسی ہوتی ہے لیکن معنوی طور پر فرق ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کبھی تو ہم یوں کرتے ہیں کہ تنبیہات کے لیے چھوٹے چھوٹے واقعات بھیجتے ہیں، تاکہ ان کے اندر عاجزی پیدا ہوجائے۔

تفہیم بصورتِ خوش حالی اور اس میں نیک وبد کا فرق

لیکن اگر کوئی قوم ان واقعات کو برداشت کرجائے، اور ان سے متنبہ نہ ہو تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں، وہ قوم خوش حال ہوجاتی ہے، انبیاء علیہم السلام کی مخالف قوم، ناصحین کی مخالفت کرنے والی قوم خوش حال ہوجاتی ہے، مال دولت کے دروازے اُن پر کھول دیے، تو ان بدکردار لوگوں پر جو انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے ہوتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دوسرا واقعہ یہ پیش آتا ہے کہ ان پر خوش حالی کے دروازے کھل گئے، اور اس میں بھی ایک آزمائش ہوتی ہے کہ بسا اوقات انسان ڈرانے دھمکانے سے نہیں مانتا تو کھلانے پلانے سے مان جاتا ہے، احسان سے متاثر ہوکر ہی سیدھا ہوجاتا ہے، اب اگر وہ اللہ تعالیٰ کا کھائیں، اور کھانے کے بعد شکر کی طرف متوجہ ہوجائیں کہ جس نے ہمیں یہ نعمتیں دی ہیں ہمیں اس کا کہنا ماننا چاہیے تو بھی انسان کی ایک سعادت ہے، پھر اس کے لئے یہ مال ودولت بھی نعمت ہے جس نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کردیا، تو یہ اس کے لئے نعمت ہوجائیں گی، اور اگر وہ کھاپی کر اور غرانے لگ گیا بلکہ اس کا کُفر دوہرا ہوگیا، وہ کہتا ہے کہ تم تو کہتے تھے کہ یہ مصیبتیں ہمارے اوپر اس لیے آرہی ہیں کہ چونکہ ہم ایمان نہیں لائے، یہ مصیبتیں اس لیے آرہی ہیں کہ تم نبیوں کی نصیحتوں کی مخالفت کرتے ہو، تو اگر وہ مصیبتیں نبیوں کی نصیحتوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے تھیں اور ایمان نہ لانے کی وجہ سے تھیں تو اَب یہ خوش حالی کیوں آگئی؟ اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ ایسے ہی اتفاقی واقعات ہیں، ہمارے باپ دادے کو بھی اسی طرح سے ہوتا تھا، کبھی بیمار ہوجاتے تھے کبھی صحت ہوجاتی تھی، کبھی فقر وفاقہ ہوتا تھا کبھی خوشحال ہوجاتے تھے، یہ واقعات ایسے ہوا ہی کرتے ہیں، ہمارے آباؤاجداد کو بھی ایسے واقعات پیش آتے تھے اس لیے ہمیں بھی یہ پیش آگئے، نہ اس کا تعلق اچھے اخلاق سے ہے نہ بُرے

اخلاق سے ہے، نہ ایمان سے ہے نہ کفر سے ہے، یہ تو دُنیا کے واقعات ہیں، ہوتے رہتے ہیں، ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ بھی یونہی ہوتا آیا، کبھی خوش حال کبھی بدحال۔ تو جب وہ اس ذہن کے ساتھ سوچنے لگ جاتے ہیں تو پھر وہ احسانات سے بھی متاثر نہیں ہوتے، جب احسانات سے متاثر نہیں ہوتے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو گرفت ہوتی ہے وہ آزمائش کی صورت میں نہیں، وہ عذاب کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور جب یہ گرفت عذاب کی صورت میں ہو تو اس میں پھر نیک اور بد کو چھانٹ دیا جاتا ہے، کہ پھر اس کی زد کے اندر بد ہی آئیں گے، اس کی زد کے اندر نیک نہیں آتے، انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے اس عذاب سے بچا لیے جاتے ہیں، اور جو انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے نہیں ہوتے وہ چن چن کے دھر لیے جاتے ہیں۔ ان واقعات کے اندر آپ کے سامنے یہی حقائق نمایاں کئے گئے ہیں، کہ جب اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے تو اس وقت پھر نیک اور بد کو ممتاز کرلیا جاتا ہے، جس طرح سے دوسری جگہ قیامت کے دن کے متعلق آیا ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یٰسٓ: ٥٩) مجرم اور صالح جدا جدا ہو جائیں گے، اور جس وقت تک آزمائشی دور ہوتا ہے تو آزمائشی دور کے اندر یوں سمجھ لیجئے کہ اس میں نیک اور بد کے ساتھ ظاہری طور پر یکساں معاملہ ہوتا ہے، باطن کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے، ایک آدمی کے لئے مصیبت عذاب ہے اور ایک آدمی کے لئے وہی مصیبت رحمت ہے۔

مثال سے وضاحت

اس کو اب آپ ایک مثال سے سمجھیں! ایک آدمی نے چوری کی اور وہ چوری کرتا ہوا پکڑا گیا، اسلامی حکومت ہو، پاکستان جیسی نہ، ایسی اسلامی حکومت جس میں عمل بھی ہوتا ہو، ہمارے امیر المؤمنین صاحب (ضیاء الحق) تو اعلان کر کے سمجھ گئے کہ پاکستان میں اسلام آگیا، یہ اسلام تو صرف زبان تک ہے یا زیادہ سے زیادہ کاغذوں میں آرڈیننس تک ہے، حدود نافذ ہوئے ہوئے دو سال ہو گئے لیکن ابھی تک کسی پہ بھی عمل نہیں ہوا، تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے دو سال میں پاکستان میں نہ کوئی چوری ہوئی، نہ کوئی ڈاکا ہوا، نہ کوئی زنا ہوا، سمجھو اعلان ہوتے ہی خلافتِ راشدہ والا نظام آگیا اور دُنیا ساری نیک اور صالح ہو گئی، اس لیے عمل کا ایک جگہ بھی موقع نہیں آیا، تو اس طرح سے نہیں، صحیح معنی میں کوئی امیر المؤمنین ہو، اور اس نے حدودِ اسلامی کا اعلان کیا ہوا ہے، اسلامی حکومت ہے، ایک چور، چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا، تو چور کی کیا سزا ہے؟ ہاتھ کاٹ دو، اب حکومت نے پکڑ کے اس کا ہاتھ کاٹ دیا، ایک تو یہ شخص ہے جس کا ہاتھ کٹا ہوا ہے، اور ایک آدمی وہ ہے جس کے ہاتھ پر کینسر ہو گیا، پھوڑا نکل آیا، اور وہ پھوڑا اس قسم کا زہریلا ہے کہ ڈاکٹروں کی تجویز یہ ہوئی کہ اگر اس کے ہاتھ کو یہاں سے کاٹ دیا جائے تو اس کی جان بچ جائے گی، اور اگر اس کے ہاتھ کو کاٹا نہ گیا تو اس کی زہر سارے بدن میں پھیلتی چلی جائے گی حتیٰ کہ اس کی جان لے لے گی، ہوتا ہے نا اس طرح سے؟ کوئی پھوڑا وغیرہ ایسا زہریلا نکل آیا کہ ڈاکٹروں کا مشورہ یہ ہوا کہ اگر اس کو نہ کاٹا گیا تو یہ زہر سارے بدن میں پھیل کر سارے بدن کو خراب کر دے گی، اب یہ قابلِ علاج نہیں ہے، تو جب ڈاکٹروں یہ مشورہ کا ہوتا ہے تو جس کے ہاتھ پہ پھوڑا نکلا ہوا ہے وہ ڈاکٹروں کو فیس دے کر بھی اپنا ہاتھ کٹواتا ہے، اور ہاتھ کے کٹ جانے کے بعد وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ مرض دفع ہو گئی اور باقی بدن بچ گیا۔

اب ہاتھ تو ان دونوں کا گٹے سے کٹا ہوا ہوگا، لیکن کیا دونوں کی حقیقت ایک ہے؟ (نہیں) ایک کا ہاتھ کٹنا گناہ کی سزا کے طور پہ ہے، اور ایک کا ہاتھ کٹنا اس کے حق میں رحمت ہے، ظاہری تکلیف ایک جیسی ہے۔ اس لیے بظاہر ایک تکلیف نیک کو بھی آئی ہوئی ہے، بد کو بھی آئی ہوئی ہے، لیکن بد کو گناہوں کی سزا کہیں گے، نیک کے لئے یہ تکلیف رحمت ہے، باطن کے اعتبار سے یوں فرق ہوگا۔ اور اس کی ظاہری علامت یہی ہوتی ہے کہ جس تکلیف سے متاثر ہو کر اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگ جاؤ تو یوں سمجھو کہ وہ تکلیف آپ کے لئے رحمت ہے، اور جس تکلیف کے آنے کے بعد انسان میں مزید سرکشی پیدا ہوا اور اللہ کے اَحکام سے روگردانی ہو، اللہ کی طرف رُجوع پیدا نہ ہو، تو سمجھو کہ یہ کسی گناہ کی شامت ہے۔ اب ایکسیڈینٹ ہوتا ہے حادثہ ہوتا ہے، اس میں کوئی نیک آدمی ہوتا ہے وہ بھی مرجاتا ہے، بدہوتا ہے وہ بھی مرجاتا ہے، لیکن نیک کے لئے شہادت ہے، بُرے کے لئے عذاب ہے، تو حقیقت کے اعتبار سے فرق یوں پڑ جاتا ہے، اگرچہ ظاہری صورت ایک جیسی ہی ہو۔

اسی طرح سے ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ خوش حال کر دیتے ہیں اب ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نیکی کی برکت سے خوش حالی آ گئی، ہم کہتے ہیں کہ تقویٰ اور نیکی کی برکت سے بھی خوش حالی آتی ہے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی رَسّی ڈھیلی چھوڑ دی گئی ہو، تاکہ یہ خوب اچھی طرح سے کھا پی کر اور غرّا لے جتنا غرّا سکتا ہے، مستیاں کر لے جتنی کر سکتا ہے، تاکہ جب اس پر پکڑ ہو تو پھر چھوٹنے کی گنجائش نہ ہو، اب انسان تو ظاہری طور پر سمجھے گا کہ دیکھو! مجھے کتنا وسعت کے ساتھ رزق مل رہا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے اس کو رزق نہیں مل رہا، یہ اس کے گلے میں کانٹا پھنسایا جارہا ہے، اور وہ جب پھنسے گا تو پھر اس کو پتا چلے گا کہ یہی رزق کی وسعت اس کے لیے کیسے ہلاکت کا باعث بن گئی، جیسے اُردو کا ایک شعر بھی آتا ہے اسی مفہوم کا، کہ:

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے ۔۔۔ صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

جس وقت مچھلی پکڑنے کے لئے پانی میں کانٹا ڈالا کرتے ہیں تو اس کے اوپر کچھ خوراک لگایا کرتے ہیں جو مچھلی کی مرغوب خوراک ہوتی ہے، مچھلی اس کی طرف دوڑ کر اور لپک کر آتی ہے، اور جب منہ کھول کر اس کو نگلتی ہے تو کتنی خوش ہوتی ہوگی کہ مجھے لقمہ مل گیا، ایسے ہی ہوتا ہے نا؟ وہ خوش ہوتی ہے کہ مجھے لقمہ مل گیا، کتنی لذیذ چیز مل گئی، جو دریا میں تو ملتی نہیں تھی، یہ دیکھو! باہر سے کیسی چیز آ گئی، لیکن وہ جس وقت کانٹا نگلے گی تو ایک ہی جھٹکا لگے گا اور وہی نگلا ہوا لقمہ اس کی موت کا باعث بن جائے گا۔ بالکل اسی طرح سے ہوتا ہے کہ دُنیا کی خوش حالی ہمیشہ نعمت نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بسا اوقات ایسی ڈھیل ہوتی ہے کہ اگر یہ خوش حال نہ ہوتا تو اس کو چکلے جانے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ ہوتے تو یہ بدمعاشی نہ کرتا، سینما میں جانے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ ہوتے تو یہ عیاشی میں مبتلا نہ ہوتا، شراب پینے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ ہوتے تو یہ اس قسم کے فسق وفجور میں مبتلا نہ ہوتا، تو کتنے جرائم ہے جن سے انسان بچ جاتا ہے، پیسے نہ ہونے کی صورت میں، اب اللہ تعالیٰ اس کی بدکرداریوں کی بنا پر اس کو آخری حد تک پہنچانا چاہتے ہیں، کہ اس کو گناہ کے اسباب مہیا نہیں تو اَب اس کو اسباب دینا شروع کر دیے، اِدھر سے پیسے آ رہے ہیں، اُدھر سے پیسے آ رہے ہیں، فصل اچھی ہو رہی ہے، کاروبار میں نفع ہو رہا ہے، وہ شام کو جس وقت دیکھتا ہے کہ جیب پیسوں سے بھری ہوئی

ہے تو پھر وہ مستیاں کرتا ہے، شراب کی بوتل آرہی ہے، رنڈی آرہی ہے، ناچ ہورہا ہے، گانا ہورہا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ دیکھو! ہمارے لیے رزق کی کتنی وسعت گئی، بدبختو! یہ وسعت نہیں ہے، یہ تو تمہیں دھکے دے دے کے اس گلی کی طرف پہنچایا جارہا ہے کہ جہاں شاید آپ فقر وفاقہ کی حالت میں جلدی نہیں پہنچ سکتے جتنی جلدی تمہیں وہاں بھیجا جارہا ہے، بس یہی مغالطہ ہے جو انسان کو لگتا ہے۔

لیکن یہی مال اور دولت ایسی چیز بھی ہے کہ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں تو آپ صدقہ نہیں کرسکتے، خیرات نہیں کرسکتے، قربانی نہیں دے سکتے، حج نہیں کرسکتے، کسی غریب کے ساتھ آپ خیر خواہی نہیں کرسکتے، آپ کے دل میں نیکی کا جذبہ ہے، اس نیکی کی برکت سے اللہ نے آپ کی طرف مال کا سیلاب چھوڑ دیا، اب مال آرہا ہے، اِدھر سے غریبوں میں بکھیر رہے ہیں، اُدھر سے نیک کاموں میں دے رہے ہیں، اور صدقات کررہے ہیں، صدقہ جاریہ کررہے ہیں، غریب پروری کررہے ہیں، یتیم کے اُوپر نوازش کررہے ہیں، تو یہی مال آپ کو اتنی تیزی کے ساتھ جنت کی سیڑھیاں عبور کرارہا ہے جیسے لفٹ کے ساتھ ایک ہی چٹکی میں انسان کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، کہ اگر یہ پیسے نہ ملتے تو شاید اتنی جلدی آپ ترقی نہ کرسکتے جتنی پیسے ملنے کے بعد آپ نے جلدی سے ترقی کرلی۔

اب دیکھو! اس میں دونوں حیثیتیں ہیں، تو مال کا مل جانا اور خوش حالی کا ہوجانا بسااوقات یہ اللہ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے تاکہ یہ اپنے منتہا کو جلدی پہنچے، پھر پکڑا جائے تو چھوٹنے کی گنجائش نہ ہو، اور بسااوقات یہ مال اللہ کی رحمت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کے لئے نیکیاں اور آسان ہوجاتی ہیں۔ تو نہ تو کسی کو ظاہری طور پر بدحال دیکھ کر یہ سمجھو کہ یہ اللہ کی گرفت میں ہے، اور نہ کسی کو خوش حال دیکھ کر یہ سمجھو یہ اللہ کا مقبول بندہ ہے، نہ ظاہری خوش حالی اللہ کے ہاں مقبول ہونے کی علامت ہے، نہ ظاہری بدحالی اللہ کے ہاں مردود ہونے کی علامت ہے، اس میں دونوں حیثیتیں ہوتی ہیں، فرق یونہی معلوم ہوتا ہے کہ مال جیسے جیسے ملتا جائے اگر شکرگزاری پیدا ہوتی جارہی ہے اور نیکی کے دروازے کھلتے جارہے ہیں تو یہ مال نعمت ہے، اور اگر ان پیسوں کے ملنے کے ساتھ بدمعاشی کی طرف رجحان ہوتا چلا جارہا ہے تو یہ مال عذاب ہے۔ مصیبت اگر آئی اور اس مصیبت میں اگر تو آپ کی توجہ اللہ کی طرف ہوتی چلی جارہی ہے اور آپ اپنے گناہوں پہ توبہ اور استغفار کرتے ہیں تو یہ مصیبت آپ کے لئے رحمت ہے، اور اگر اس مصیبت اور پریشانی کے آنے کے ساتھ آپ پہلی نیکیوں سے بھی محروم ہوگئے اور اسی طرح سے اللہ کے خلاف اور اللہ کے رسول کے خلاف بغاوت کے جذبات اور اعتراض کے جذبات قلب کے اندر پیدا ہوتے ہیں تو سمجھو کہ یہ مصیبت کسی بدعملی کی شامت ہے۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں اپنی یہی سُنّت نمایاں کرتے ہیں کہ ہمارا یہ طریقہ ہے کہ جب نبی آتا ہے تو ہم ان بستی والوں کے اُوپر کچھ تکلیفیں بھیجتے ہیں، جب وہ تکلیفوں سے نہیں سمجھتے تو پھر خوش حالی کے دروازے کھول دیتے ہیں، آخر ایسے طور پر پکڑتے ہیں کہ پھر چھوٹنے کی گنجائش نہیں ہوتی، تو ان واقعات کے ضمن میں یہ نصیحت کی جارہی ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ: نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر پکڑا ہم نے اس بستی والوں کو مالی تنگی میں اور بدنی تکلیف میں تاکہ وہ عاجز ہوجائیں اور زاری کرنے لگ جائیں، تضرُّع کرنے لگ جائیں، ''پھر بدل دیا ہم نے'' یعنی کچھ دیر کے بعد، ثم للتراخی آپ نحو میں پڑھتے رہتے ہیں، کہ پہلے تو ان کو کچھ دیر تک اس طرح سے جھنجوڑا، لیکن جھنجوڑنے کے بعد پھر ہم بدحالی کی جگہ خوش حالی لے آئے، اس میں دونوں باتیں

ہیں، سیئہ ہر اس حالت کو کہیں گے جو انسان کی مرضی اور خواہش کے خلاف ہے، اور حسنہ اس کو کہیں گے جو اس کی مرضی کے مطابق ہوگی، بیماری مرضی کے خلاف ہے وہ سیئہ کا مصداق ہے، صحت مرضی کے موافق ہے وہ حسنہ کا مصداق ہے، مالی تنگی یہ اپنی خواہش کے خلاف ہے اس لیے سیئہ کا مصداق ہے، اور مالی وسعت اپنی خواہش کے موافق ہے اس لیے یہ حسنہ کا مصداق ہے۔ ''پھر ہم ان کی بدحالی کی جگہ خوشحالی بدل دیتے ہیں'' اس کا مفہوم یوں گا، یہ ساری چیزوں کو شامل ہو جائے گا، ''پھر بدل دیتے ہیں ہم ان کی بدحالی کی جگہ خوش حالی کو''۔ حَتّٰى عَفَوْا: یہاں تک کہ وہ خوب ترقی کر جاتے ہیں، خوب بڑھ جاتے ہیں، پھل پھول جاتے ہیں، اور کہتے ہیں قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ: ہمارے باپ دادوں کو بھی بدحالی اور خوش حالی پہنچتی رہی ہے، کیا مطلب؟ کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتفاقی واقعات ہیں کہ جس طرح سے گرمی سردی خشکی تری دُنیا میں ہوتی رہتی ہے، اسی طرح سے بدحالی، خوش حالی، صحت، بیماری آتی رہتی ہے، ہمارے بڑوں پر بھی آتی رہتی تھی، اس لئے اس کا تعلق کفر و ایمان کے ساتھ، یا اخلاق اور بد اخلاقی کے ساتھ نہیں ہے، تو یہ سوچ کر پھر وہ اللہ کی طرف نسبت نہیں کرتے نہ خوش حالی کی نہ بدحالی کی، بلکہ اور اپنے لیے غفلت کا سامان ان کو بنا لیتے ہیں، فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً: پھر ہم ان کو اچانک پکڑ لیتے ہیں، وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: اور ان کو پتا بھی نہیں ہوتا کہ ہم اللہ کی گرفت میں آرہے ہیں۔

باعثِ برکت مال کون سا ہوتا ہے؟

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا: اہل قریٰ سے وہی بستیوں والے مراد ہیں جن کا ذکر واقعات میں آیا ہے۔ اگر یہ بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے اوپر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، یہ جو خوش حالی آتی ہے یہ برکت کا مصداق ہوتی ہے، ہر خوش حالی برکت کا مصداق نہیں، یہ خوش حالی برکت کا مصداق ہے جو ایمان اور تقویٰ کے نتیجے میں آتی ہے، جس میں خیر و برکت ہوتی ہے، یعنی جو نعمتیں انسان کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں وہ نعمتیں برکت کہلاتی ہیں، جیسے کہتے ہیں ''اس کے مال میں بڑی برکت ہے'' کیا مطلب؟ کہ وہ مال سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ مال اس کے لئے مفید ہے، اور اگر آپ کے پاس مال آیا اور کوئی جیب کاٹ کر لے گیا تو کہیں گے یہ مال ہی بے برکت ہے، اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا، جیسے آج گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں زمین کی پیداوار بھی زیادہ ہے، کاروبار بھی زیادہ ہے، پیسے کی ریل پیل بھی زیادہ ہے، اور سامانِ راحت بھی اتنے کہ گزشتہ سالوں کے اندر شاید اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے ان چیزوں کا تصور نہیں کر سکتے تھے، آج آپ کو ائیر کنڈیشن حاصل ہیں، رُوم کولر حاصل ہیں، روشنی کے سامان حاصل ہیں، راحت اور آرام کی اتنی چیزیں ہیں، سواریاں کتنی رنگ برنگ کی پیدا ہوگئیں، راحت کا کتنا سامان آگیا، لیکن انسانیت اتنی پریشان ہے جس کا حد و حساب کوئی نہیں، سکون کہیں تلاش کیا ہوا نہیں ملتا، جس کو دیکھو پریشان، جس کو دیکھو پریشان، جس کو دیکھو پریشان، راحت اور سکون کا نام و نشان نہیں، یہ علامت ہے اس بات کی یہ اسباب جتنے بھی حاصل ہیں ان میں انسان کے لئے برکت نہیں ہے بے برکتی ہے، اور اگر تھوڑا ہو لیکن قلب کے لئے سکون کا باعث بن جائے، راحت کا باعث ہو تو وہی مال بابرکت ہوتا ہے، تو اس لیے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے بابرکت مال مانگنا چاہیے جو آپ کو راحت اور سکون پہنچائے، وہ مال آپ کے لئے باعث برکت ہے، اور جس مال کے

آنے کے ساتھ اُلٹا پریشانیاں بڑھ جائیں وہ مال باعثِ برکت نہیں، باعثِ نحوست ہے۔تو یہاں ''برکات'' کا لفظ بولا ہے کہ ''ہم ان کے اُوپر زمین وآسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے'' کیا مطلب؟ کہ زمین سے نباتات بھی ایسی پیدا ہوتی جو ان کے لئے باعثِ سکون ہوتی، آسمان کی طرف سے بارش کے اور دیگر موسمیات کے ایسے حالات ہوتے جو انسان کے لئے مفید ہوتے، اور کُفر کے زمانے میں جو کچھ آیا ہے وہ برکت نہیں ہے، وہ تو باعثِ نحوست ہے۔ ''لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو پکڑ لیا ان کے کردار کی وجہ سے، ان کے کسب کی وجہ سے ہم نے پکڑ لیا۔''

گزشتہ قوموں کا حال بیان کرنے کے بعد موجودہ کُفّار کو تنبیہ

''کیا پھر بے خوف ہو گئے بستیوں والے؟'' اب یہ موجودہ بستیوں والوں کو تنبیہ ہے کہ ''کیا یہ بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ان کے پاس ہمارا عذاب آجائے رات کے وقت اس حال میں کہ وہ سوئے ہوئے ہوں'' سونے کی حالت میں بھی عذاب آسکتا ہے، ''یا یہ بستیوں والے بے خوف ہو گئے؟ کہ ان کے پاس ہمارا عذاب دِن چڑھے آجائے اس حال میں کہ وہ اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہوں'' مطلب کیا؟ کہ دونوں طرح سے ہوسکتا ہے، ہمارا عذاب جس وقت آئے تو نہ تو رات کے اندھیرے میں کوئی بچے، اور نہ کوئی دِن کی روشنی میں اپنے آپ کو بچا سکے، تو یہ بے خوف ہونے کی بات نہیں ہے، رات کے اندھیرے میں آئے تو بھی کوئی نہیں بچ سکتا، اور دِن کی روشنی میں آئے تو بھی کوئی نہیں بچ سکتا، جیسے شروع سورت میں پہلے رکوع کے اندر آیا تھا، اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ: قیلولہ کرتے وقت، دوپہر کو لیٹے وقت عذاب آجائے۔تو رات کو آجائے، دوپہر کے وقت آجائے، کسی وقت آجائے، مطلب یہ ہے کہ دِن ہو، رات ہو، سویرا ہو، دوپہر ہو، اللہ کا عذاب جس وقت آئے گا تو کوئی وقت ایسا نہیں کہ جس میں انسان بچ سکے، اس لیے بے خوف ہونے کی بات نہیں ہے۔

''کیا یہ اللہ کی تدبیر سے امن میں ہو گئے؟ بے خوف ہو گئے؟ اللہ کے مکر سے، اللہ کی تدبیر سے انہیں کوئی ڈر نہیں لگتا؟'' ''مکر'' خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اچھے کام کے لئے کی جائے تو اچھی ہوتی ہے، بُرے کام کے لئے کی جائے تو بُری ہوتی ہے، جس طرح قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آتا ہے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (سورۂ آلِ عمران: ۵۴) تو ''مکر'' کی نسبت ان کی طرف بھی ہے اور اللہ کی طرف بھی ہے، لیکن اللہ خیر الماکرین ہے، تو مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر اچھے مقصد کے لئے ہو تو اچھی ہے، بُرے مقصد کے لئے ہو تو بُری ہے۔ ''کیا یہ اللہ کے مکر سے بے خوف ہو گئے؟ نہیں بے خوف ہوتے اللہ کے مکر سے مگر وہی لوگ جو خسارہ پانے والے ہوتے ہیں'' ۔ اَوَلَمْ يَهْدِ کا مفہوم میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا، مَاجَرٰی عَلَی الْاُمَمِ السَّابِقَۃِ: پہلی اُمتوں پر جو واقعات گزرے ہیں کیا ان واقعات نے ان لوگوں کے لئے جو زمین کے وارث بنے ہوئے ہیں اس زمین کے اہل کے بعد، یعنی پہلی امتوں کے تباہ ہونے کے بعد اب جو زمین کے وارث بنے بیٹھے ہیں کیا پہلی امتوں کے واقعات نے ان کی راہنمائی نہیں کی؟ اس بات کی طرف کہ اگر ہم چاہیں تو ہم انہیں بھی مصیبت پہنچا دیں ان کے گناہوں کے سبب سے، کیا اُن

واقعات کو سن کے یہ اس نتیجے تک نہیں پہنچے؟ یہ حقیقت ان کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی؟ کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی مصیبت پہنچادیں ان کے گناہوں کے سبب سے۔

بدکرداری کے نتیجے میں دِل پر مہر لگ جاتی ہے

وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: یہ ایک حقیقت کا بیان ہے، کہ ہم لوگوں کے دلوں پہ مہر کر دیتے ہیں، پس وہ پھر کچھ نہیں سنتے، یعنی بدکرداری کے نتیجے میں آخر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ دل سخت ہو جاتے ہیں، جتنا چاہو سمجھالو وہ نصیحت ان کے کان میں جاتی ہی نہیں، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان جب ایک گناہ کرتا ہے تو دل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے، توبہ کر لے تو دل دھل گیا اور پھر صاف ہو گیا، ورنہ وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے بڑھتی جاتی ہے، آخر ایک وقت آتا ہے کہ قلب بالکل سیاہ ہو جاتا ہے،(1) اور جب سیاہ ہو جائے تو پھر اس میں تاثر نہیں رہتا، انسان نفع نقصان کی تمیز اٹھا دیتا ہے، صرف اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جاتا ہے، یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کی نصیحت نہ سنتا ہے نہ مانتا ہے، یوں سمجھو کہ اس کے دل پر طبع ہو گیا اور مہر لگ گئی۔

کُفّار کی ضد اور بدعہدی

تِلْكَ الْقُرٰى: اس کا اشارہ انہی بستیوں کی طرف ہے جن کا ذکر پہلے واقعات میں آیا۔ ''یہ بستیاں، بیان کرتے ہیں ہم آپ پر ان کے بعض واقعات'' ان کے کچھ حالات ہم آپ پہ بیان کرتے ہیں، حاصل سب کا یہی ہے کہ ''ان کے پاس رسول واضح دلائل لے کر آئے تھے، پس نہیں تھے وہ لوگ کہ ایمان لے آتے اس چیز پر جس کو انہوں نے پہلے جھٹلایا'' یعنی ایک دفعہ جو ان کے منہ سے ''نہ'' نکل گئی تو پھر وہ ''نہ'' جو تھی وہ ''ہاں'' سے نہیں بدلی، ضدی لوگوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ جو نہ کر دیں، نہ مانوں کہہ دیں تو پھر اس کے بعد ہزار دلائل لے آؤ، ہزار فائدے سمجھالو، پھر وہ ماننے کے نہیں ہوتے۔ تو یہی ان کی اکڑ اور یہی ان کی ضد تھی کہ جب ایک دفعہ جھٹلا بیٹھے تو پھر آخر وقت تک انہوں نے اس جھٹلانے کو نبھایا، پھر وہ مانے نہیں، جس کی انہوں نے پہلے تکذیب کی تھی پھر اس پر ایمان نہ لائے۔ ''ایسے ہی مہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کے قلوب پر۔''

''نہیں پایا ہم نے ان میں سے اکثر کے لئے ایفائے عہد'' یہ اپنے عہد کے پابند نہیں تھے، ''عہد'' سے یا تو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ والا عہد مراد ہے جس کی تفصیل آپ کے سامنے اسی سورت میں آ رہی ہے، کہ دُنیا میں بھیجنے سے پہلے عالمِ اَرواح میں اللہ نے عہد لیا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے تحت، وہ عہد انہوں نے پورا نہیں کیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو انسان کچھ نہ کچھ کہتا ہی ہے کہ اب اگر میں بچ گیا تو یوں کروں گا، یہ عام طور پر مسلمانوں میں تو یہ ہوتا ہی ہے نا؟ کہ کسی مصیبت میں پھنس ہو گیا، پریشان ہو گیا تو کہتا ہے یا اللہ! اب جان چھوڑ دے، اب اگر صحت ہو گئی تو اب نماز پڑھا کروں گا، اور فلاں کام ایسے نہیں کروں گا، فلاں نیکی کا کام کروں گا، انسان اس وقت اللہ سے بڑے لمبے چوڑے وعدے کرتا ہے، لیکن جس وقت وہ مصیبت دُور ہو جاتی ہے دوبارہ

(1) ترمذی ۲/ ۱۷۷، ابواب التفسیر، سورۃ المطففین/ مشکوۃ ۱/ ۲۰۴، باب الاستغفار، فصل ثانی، عن ابی ہریرہؓ۔

صحت مند ہو جاتا ہے تو جس طرح پہلے دولتیاں مارتا پھرتا تھا وہی حالت پھر شروع ہو جاتی ہے، انسان مصیبت میں جو عہد، اقرار کرتا ہے، سب بھول جاتا ہے، ایسے ہوتا رہتا ہے، ''نہیں پایا ہم نے ان میں سے اکثر کے لئے ایفائے عہد'' وَ اِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِیْنَ: یہ اِنْ مخففہ من المثقلہ ہے۔ اور بیشک پایا ہم نے ان میں سے اکثر کو البتہ نافرمان۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰیٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىٕهٖ فَظَلَمُوْا

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، انہوں نے ان آیات پر

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى یٰفِرْعَوْنُ

ظلم کیا، پھر دیکھ تو، فسادیوں کا انجام کیا ہوا ﴿١٠٣﴾ اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے فرعون!

اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِیْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى

میں رَبّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿١٠٤﴾ میں قائم ہوں اس بات پر کہ نہیں بولوں گا

اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِیَ

اللہ پر مگر سچی بات، لایا ہوں میں تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے، پس بھیج دے تُو میرے ساتھ

بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰیَةٍ فَاْتِ بِهَاۤ اِنْ

بنی اسرائیل کو ﴿١٠٥﴾ فرعون نے کہا کہ اگر تُو کوئی نشانی لایا ہے تو اس کو لے آ (ہمارے سامنے)

كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿١٠٧﴾

اگر تُو سچوں میں سے ہے ﴿١٠٦﴾ پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی، پس اچانک ایک بہت واضح اژدہا بن گیا ﴿١٠٧﴾

وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿١٠٨﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ

اور کھینچا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کو پس اچانک وہ سفید تھا دیکھنے والوں کے لئے ﴿١٠٨﴾ قوم فرعون میں سے سرداروں

فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿١٠٩﴾ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ

نے کہا بیشک یہ البتہ جادوگر ہے بہت علم رکھنے والا ﴿١٠٩﴾ یہ ارادہ کرتا ہے کہ تمہیں نکال دے

اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي

تمہارے علاقے سے، پس تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ ﴿۱۱۰﴾ وہ کہنے لگے مہلت دے دے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو، اور بھیج دے

الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ

شہروں میں جمع کرنے والے ﴿۱۱۱﴾ لے آئیں گے وہ تیرے پاس ہر علم والا جادوگر ﴿۱۱۲﴾ آگئے جادوگر

فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ

فرعون کے پاس، کہنے لگے بیشک ہمارے لیے البتہ اجر ہے؟ اگر ہم غلبہ پانے والے ہوگئے ﴿۱۱۳﴾ فرعون کہنے لگا ہاں

وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ

اور بے شک تم البتہ میرے مقربوں میں سے ہو جاؤ گے ﴿۱۱۴﴾ وہ جادوگر کہنے لگے کہ اے موسیٰ! یا تو تُو ڈال

اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ

یا ہم ہو جائیں ڈالنے والے ﴿۱۱۵﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈال لو، جب انہوں نے ڈالا تو جادو کردیا لوگوں کی

النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى

آنکھوں پر اور ڈرالیا ان کو اور بہت بڑا جادو لے آئے ﴿۱۱۶﴾ اور ہم نے موسیٰ کی طرف

مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ

پیغام بھیجا کہ تُو بھی اپنی لاٹھی ڈال دے، پس اچانک وہ لاٹھی نگلتی تھی اس کو جو کچھ انہوں نے گھڑا تھا ﴿۱۱۷﴾ حق ثابت

الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا

ہوگیا اور باطل ہوگئی وہ چیز جو وہ کر رہے تھے ﴿۱۱۸﴾ اسی موقع پر وہ مغلوب ہوگئے اور لوٹے

صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾

ذلیل ہوکر ﴿۱۱۹﴾ گرادیے گئے جادوگر اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے ﴿۱۲۰﴾ کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے ربّ العالمین پر ﴿۱۲۱﴾

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ

جو موسیٰ کا اور ہارون کا ربّ ہے ﴿۱۲۲﴾ فرعون نے کہا اچھا! ایمان لے آئے ہو تم اس پر قبل اس کے کہ میں

اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ

تمہیں اجازت دُوں؟ بیشک یہ تمہاری کوئی سازش ہے جو تم نے شہر میں کر رکھی ہے تا کہ تم اس شہر سے

اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٢٣﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ

شہر والوں کو نکال دو، عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا﴿١٢٣﴾ البتہ ضرور کاٹوں گا میں تمہارے ہاتھ اور تمہاری ٹانگیں

مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا

مخلف جانبوں سے پھر میں تمہیں ضرور سُولی دُوں گا سب کو﴿١٢٤﴾ وہ جادوگر کہنے لگے بیشک ہم اپنے رَبّ کی طرف

مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ

پھرنے والے ہیں﴿١٢٥﴾ اورنہیں عیب لگاتا تُو ہم پر مگر یہی کہ ہم ایمان لے آئے اپنے رَبّ کی آیات پر جبکہ وہ ہمارے پاس پہنچ گئیں،

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿١٢٦﴾

اے ہمارے پروردگار! ہمارے اُوپر صبر ڈال دے اور وفات دے ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں﴿١٢٦﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى: پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ علیہ السلام کو، بِاٰيٰتِنَآ: اپنی آیات کے ساتھ، آیات سے معجزات بھی مراد ہو سکتے ہیں اور آیاتِ تورات بھی مراد ہو سکتی ہیں، اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ: فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، یعنی اس کے درباریوں میں جو عظماء تھے بڑے لوگ تھے ان کی طرف، فَظَلَمُوْا بِهَا: ھا کی ضمیر آیات کی طرف لوٹ گئی، انہوں نے اُن آیات پر ظلم کیا، یعنی ان آیات کا حق ادا نہ کیا، حق تلفی کی ان آیات کی، یا باء کی وجہ سے ظلموا کے اندر کفروا کا معنی مضمن کر لیجیے، ''انہوں نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر اور کُفر کیا آیات کا'' آیات کا انکار کیا اور اس انکار کرنے کے ذریعے سے انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اس طرح سے بھی اس کا مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے، فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: پھر دیکھ تو کیسا انجام ہوا فساد مچانے والوں کا، فسادیوں کا انجام کیا ہوا، وَقَالَ مُوْسٰى: اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا، يٰفِرْعَوْنُ: اے فرعون! اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: میں رَبّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، ''فرعون'' اس وقت کے بادشاہ کا لقب ہے، نام اس کے مختلف نقل کیے ہیں، ''معارف القرآن'' میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے غالباً ''قرطبی'' کے حوالے سے اس کا نام ''قابوس'' نقل کیا ہے، لیکن بعض دوسری کتابوں میں اس کا نام کچھ اور بھی ہے، اور ''فرعون'' لقب ہے، جو بھی اس وقت مصر کا بادشاہ ہوتا تھا اس کو ''فرعون'' کہتے تھے، اس لیے ان کی تاریخ جو مرتب کی ہوئی ہے تو اس میں عنوان ''فراعنۂ مصر'' آتا ہے، مصر کے فرعون، یعنی وہ ایک نہیں کئی فرعون، جو

بھی مصر کا بادشاہ ہوتا تھا ''فرعون'' کہلاتا تھا، تو چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اس نے بہت زیادہ تکبّر اور سرکشی کی تھی اور قرآنِ کریم نے اس کی تاریخ کو محفوظ کر دیا تو اس کی صفتِ مشہورہ متکبر ہے، حق کے مقابلے میں اڑ جانے والا، متکبر، اس لیے اب ''فرعون'' اپنے اَشہر معنی کے اندر استعمال ہوتا ہے بمعنی متکبر، کہتے ہیں: ''فلاں بڑا فرعون ہے!'' تو فرعون سے مراد متکبر ہوتا ہے، جو حق بات کے سامنے اڑ جاتا ہے اور حق بات کو قبول نہیں کرتا، اور اس کا مقابلہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے ہی اسکا سر کوٹا، انہی کے ہاتھوں اس کا تختہ اُلٹا گیا اور یہ برباد ہوا، تو اس لیے وہ محاورہ جو عربی میں آتا ہے: ''لِكُلِّ فِرعونٍ موسىٰ'' ہر فرعون کے لئے کوئی نہ کوئی موسیٰ ہوتا ہے، تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ جو بھی کوئی سرکش ہو جائے اس کا سَر کُوٹنے کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی بھیج ہی دیتے ہیں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفتِ مشہورہ مُحِق، حق پرست، حق کو ثابت کرنے والے، اور فرعون کی صفتِ مشہورہ متکبر، تو اس کا معنی یہ ہو جائے گا کہ ہر متکبر کا سَر کُوٹنے والا کوئی نہ کوئی ہوتا ہے: لِكُلِّ فِرعونٍ موسىٰ، تو یہ اپنے اَشہر معنی کے اعتبار سے ہے، تو ''فرعون'' اس کا نام نہیں بلکہ اس کا لقب ہے، ''اے فرعون!'' اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ: بیشک میں رسول ہوں رَبّ العالمین کی طرف سے، تو گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت کے بادشاہ کو اس کے لقب کے ساتھ خطاب کیا ہے، اور اِس لقب کے ساتھ اس کو بلایا جاتا ہوگا، خطاب کیا جاتا ہوگا، جیسے آج پاکستان کے جو صدر ہیں تو ان کو آپ ''صدر صاحب'' کہہ کے بلائیں گے، تو یہ گویا کہ اس کے منصب کے لحاظ سے ایک طریقہ ہے اس کو بُلانے کا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جب دربار میں گئے تھے تو جاتے ہی نام کے ساتھ اس کو خطاب نہیں کیا، کیونکہ نام کے ساتھ خطاب کرنے کا رواج نہیں ہوگا پہلی بات پہ ہی چڑ جائے گا کہ یہ کون آ گیا میرا نام لینے والا، اس لیے جو اس کا منصب ہے جو اس کا مرتبہ ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو یٰفِرْعَوْنُ کہہ کے بُلایا، حَقِیْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: حَقِیْقٌ یہ حَقَّ یَحِقُّ سے ہے، ثابت ہونا، قائم ہونا، ''میں قائم ہوں اس بات پر'' ثابت ہوں، جما ہوا ہوں، اپنے اس موقف سے ہلایا نہیں ہلوں گا، میں اپنے اس موقف پہ ڈٹا ہوا ہوں، ''کہ میں اللہ کے بارے میں سوائے سچی بات کے کوئی نہیں کہوں گا''، ''میں ثابت اور قائم ہوں اس بات پر کہ نہیں بولوں گا اللہ پر مگر سچی بات''، میرا یہ موقف ہے کہ میں اللہ کے متعلق سچی بات ہی کہوں گا غلط بات نہیں کہوں گا اور اس موقف پر میں ڈٹا ہوا ہوں، اپنی کسی مصلحت کے تحت، کسی لالچ کے تحت، کسی خوف کے تحت اللہ کی طرف غلط بات منسوب نہیں کروں گا، جو کہوں گا صحیح کہوں گا، تو حَقِیْقٌ کا مفہوم اس طرح سے ادا ہو جائے گا، یا یہ ہے کہ میں اس بات کے لائق ہوں، میں اس بات پہ حریص ہوں، یہ مختلف لفظوں کے ساتھ اس کے ترجمے کو ادا کیا گیا ہے، لیکن سب سے بہتر ترجمہ یہی ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، اور حضرتِ شیخ الہندؒ نے یہی ترجمہ کیا ہے، یعنی میں اپنے اس موقف پر مضبوطی سے قائم ہوں کہ اللہ پر سوائے سچی بات کے کچھ نہیں کہوں گا، نہ کسی کے ڈر سے کوئی غلط بات کہوں، نہ کسی لالچ میں آ کے غلط بات کہوں، میرے منصب کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کے متعلق سچی بات بولوں، قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: جَاءَ یَجِیْءُ: آنا، اور باء تعدیہ کی آ گئی، ''میں تمہارے پاس واضح دلیل لایا ہوں، لایا ہوں میں تمہارے پاس واضح دلیل تمہارے رَبّ کی طرف سے'' فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: پس چھوڑ دے تو میرے ساتھ، بھیج دے تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو، بنی اسرائیل یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنا قبیلہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد، قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰیَةٍ: فرعون نے کہا کہ اگر تو کوئی نشانی لایا ہے تو فَاْتِ بِهَاۤ: تو لے آ ہمارے

سامنے، تُو جو کہتا ہے کہ میں نشانی لایا ہوں، واضح دلیل لایا ہوں، تو اگر تُو کوئی نشانی لایا ہے تو لے آ ہمارے سامنے، لایا ہے تو لے آ ہمارے سامنے، یہ دونوں لفظوں کا ترجمہ آ گیا، اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ: اگر تو کوئی نشانی لے کے آیا ہے فَاْتِ بِهَآ: تو اس کو لے آ یعنی ہمارے سامنے نمایاں کردے، اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: اگر تو سچوں میں سے ہے، فَاَلْقٰى عَصَاهُ: پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی، فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ: پس اچانک وہ لاٹھی، ثُعبان: اژدہا، بڑا سانپ، قدآور، مُبین کا معنی بالکل واضح، جس میں دیکھنے والے کو کوئی اشتباہ نہیں ہورہا تھا، کھلم کھلا نظر آرہا تھا، بہت بڑا سانپ بن گیا، ثعبان: اژدہا، مبین کے معنی کھلم کھلا، واضح ''پس اچانک وہ لاٹھی ایک بہت واضح، کھلم کھلا، نمایاں قسم کا سانپ بن گیا'' ثعبان بڑے سانپ کو کہتے ہیں، اژدہا کو، وَّنَزَعَ يَدَهٗ: اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ نکالا، اپنا ہاتھ کھینچا، کھینچنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ یوں بغل میں دبایا کرتے تھے اور اس طرح سے پھر اس کو کھینچتے تھے، دونوں قسم کے الفاظ قرآنِ کریم میں آئے ہیں، وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ (سورۂ طٰہٰ: ۲۲) اپنے ہاتھ کو اپنے پہلو کے ساتھ ملا تو یہ نکلے گا سفید ہوکر، اور ایک جگہ غالباً الفاظ اس قسم کے بھی ہیں کہ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ (سورۂ نمل: ۱۲) ''جیب'' گریبان کو کہتے ہیں، کہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال تو پھر یہ روشن ہوکے، سفید ہوکے نکلے گا، تو ہوسکتا ہے دونوں صورتیں پیش آتی ہوں گریبان میں ہاتھ ڈال کے یوں دباتے ہوں اور دبانے کے بعد اس طرح سے نکالتے ہوں تو سفید روشن چمکتا ہوا نکلتا ہو، تو نزع کا یہی معنی ہے اپنی بغل سے کھینچا، اپنے گریبان سے نکالنا، ''نکالا اس نے اپنے ہاتھ کو، کھینچا اس نے اپنے ہاتھ کو'' فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ: پس اچانک وہ سفید تھا، روشن، لِلنّٰظِرِيْنَ: دیکھنے والوں کے لئے، یعنی دیکھنے والوں کو کھلی آنکھوں نظر آرہا تھا کہ کس طرح سے وہ سفید اور روشن ہوگیا ہے، قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ: قومِ فرعون میں سے ملأ نے کہا، ''ملأ'' کا لفظ آپ کے سامنے کئی دفعہ گزر گیا، یعنی جو لوگ صاحبِ اقتدار تھے، جو وقت کے چوہدری ہوتے ہیں، بادشاہ کے مقربین، جن کو دربار کے اندر عظمت حاصل تھی، یہاں ملأ کا وہی معنی ہے، فوج کے جرنیل جس طرح سے ہوتے ہیں، فرعون کے جرنیل، اس کے نائبین، اس کے دربار کے اندر مقربین، جن کو چوہدراہٹ حاصل تھی، ''قومِ فرعون میں سے ملأ نے کہا'' اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ: بیشک یہ البتہ جادوگر ہے بہت علم رکھنے والا، علیم یہ مبالغے کا صیغہ ہے، یہ جادوگر ہے بہت علم رکھنے والا ہے، يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ: یہ ارادہ کرتا ہے کہ تمہیں نکال دے مِّنْ اَرْضِكُمْ: تمہارے علاقے سے، فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ: پس تم کیا مشورہ دیتے ہو، تم کیا حکم دیتے ہو، تمہاری کیا صلاح ہے، قَالُوْٓا: وہ کہنے لگے اَرْجِهْ وَاَخَاهُ: اَرْجِ کا خطاب فرعون کو ہے، اور یہ اِرجاء سے لیا گیا ہے، اِرجاء کا معنی ڈھیل دینا، اَرْجٰی یُرْجِیْ اِرْجَاءً، تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ (سورۂ احزاب: ۵۱) قرآنِ کریم میں یہ لفظ آئے گا: تُرْجِيْ، مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ: ۱۰۶) یہ لفظ بھی قرآنِ کریم میں ہے، وہ سب اسی سے ہی ہیں، ڈھیل دینا، مؤخر کرنا، تو اصل میں یہ تھا اَرْجِئْهُ، یعنی اَمر کے بعد ''ہٗ'' مفعول ہے، ہمزہ کو گرادیا گیا اور ہاء کو بھی ساکن کردیا گیا (آلوسی)، یہ بطورِ تخفیف کے ہے، تو یہ ''ہ'' ضمیر اس میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اَرْجِ یہ ہے اَمر کا صیغہ، ''ڈھیل دے دے، مہلت دے دے اِس موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو'' ان کا معاملہ کچھ مؤخر کردو، وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ: مدائن مدینہ کی جمع ہے، مدینہ شہر کو کہتے ہیں، حاشرین کے معنی جمع کرنے والے، ''اور بھیج دے شہروں میں جمع کرنے والے'' شہروں میں چپڑاسیوں کو دوڑا دے، يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ: لے آئیں گے وہ تیرے پاس ہر علم والا جادوگر، ہر جادوگر جو علم والا ہے

وہ اس کو لے آئیں گے، وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ: سَحَرَةٌ یہ ساحر کی جمع ہے، جادوگر آ گئے فرعون کے پاس، آ گئے جادوگر فرعون کے پاس، قَالُوْٓا: کہنے لگے اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ: بیشک ہمارے لیے البتہ اجر ہے؟ اگر ہم غلبہ پانے والے ہو گئے، یہ اِستفہام ہے، یہ لب ولہجہ سے اِستفہام پیدا ہوتا ہے، اگرچہ لفظوں میں اِستفہام کا کوئی حرف نہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی کو بلایا جائے کہ ہمارا یہ کام کر دو، وہ کہتا ہے کہ پانچ روپے لوں گا، مجھے پانچ روپے ملیں گے؟ اگر میں نے یہ کام کر دیا، اب اگرچہ یہاں حرفِ اِستفہام کوئی نہیں لیکن لب ولہجہ اِستفہام والا ہے، مجھے پانچ روپے ملیں گے؟ اگر میں نے یہ کام کر دیا، تو تبھی جا کے آگے جواب بنے گا کہ ہاں ہاں پانچ روپے کیا، ساتھ روٹی بھی کھلائیں گے۔ گفتگو کا انداز اسی طرح سے ہوتا ہے، تو اس نے جو آگے ہاں سے جواب دیا ہے تو معلوم ہو گیا کہ پہلا اِستفہام ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے البتہ اُجر ہوگا؟ اگر ہم غلبہ پانے والے ہو گئے، اگر ہم نے اس میدان میں غلبہ پالیا تو ہمیں اس کی کوئی اُجرت ملے گی؟ کوئی اِنعام ملے گا؟ قَالَ نَعَمْ: فرعون کہنے لگا: ہاں! ہاں کا مطلب یہ کہ اُجر بھی ملے گا، اُجرت بھی ملے گی، وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ: اور بیشک تم البتہ میرے مقربوں میں سے ہو جاؤ گے، پھر بعد میں کرسی بھی مل جائے گی، میرے مقرّب ہو جاؤ گے، میرے نزدیکی ہو جاؤ گے، اس سے جان تو چھڑاؤ، موسیٰ سے جو معاملہ گڑبڑ ہو رہا ہے، تمہیں تقرّب بھی نصیب ہو جائے گا، اُجرت بھی ملے گی اور تقرّب بھی نصیب ہوگا، تو گویا کہ اُجر کے اندر تو مالی طمع آ گئی اور مقرّبین میں سے ہونے کا ذکر کر کے جاہ کی طمع دے دی، کہ اس مقابلے کو اگر تم جیتو گے تو اس جیتنے کے نتیجے میں تمہیں انعام بھی ملے گا اور کرسی بھی ملے گی، مقرّب بھی بن جاؤ گے، تو مال اور جاہ دونوں کی طمع دے دی، اور اِنسان ان دونوں کے لئے مرتا ہے، تو ان پہلوانوں کو حوصلہ دلا دیا کہ اس کُشتی میں فتح پاؤ، بہت کچھ ملے گا اور ہمارے مقرّب بھی بن جاؤ گے۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى: وہ جادوگر کہنے لگے کہ اے موسیٰ! اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ: یا تو تُو ڈال یا ہم ہو جائیں ڈالنے والے، تُلْقِيَ اِلقاء سے ہے، اِلقاء: ڈالنا، یا تو تیری طرف سے ڈالنے کا معاملہ پیش ہونا چاہیے یعنی اِبتداءً تُو اِلقاء کر، تُو اپنا جادو ڈال، یا ہم ہو جائیں ڈالنے والے، قَالَ اَلْقُوْا: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈال لو، اَلْقُوْا یہ امر کا صیغہ ہے، تم ڈالو، فَلَمَّآ اَلْقَوْا: یہ ماضی کا صیغہ آ گیا، جب ان جادوگروں نے ڈالا، کس چیز کو ڈالا؟ یہاں اَلْقَوْا کا مفعول مذکور نہیں ہے، دوسری جگہ ذکر آئے گا اس کے مفعول کا، حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ (سورۂ شعراء:۴۴) حبال حبل کی جمع، رسّی، عِصِيّ عصا کی جمع، لاٹھیاں، تو وہ جو لاٹھیاں اور رسیاں ساتھ لے کے آئے تھے وہ انہوں نے میدان میں پھینک دیں، اَلْقَوْا کا مفعول یہی ہے جو دوسری جگہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے، "جب انہوں نے ڈال دیا اپنا سامان، اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈال دیں" سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ: انہوں نے جادو کر دیا لوگوں کی آنکھوں پر، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ: اور لوگوں کو ڈرا لیا، لوگ خوف میں مبتلا ہو گئے، "اور ڈرا لیا ان لوگوں کو" وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ: اور بہت بڑا جادو لے آئے، بِسِحْرٍ میں باء تعدیہ کی ہو گئی، بہت بڑا جادو لے آئے، وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى: اور ہم نے موسیٰ کی طرف پیغام بھیج دیا، اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ: کہ تو بھی اپنا ڈنڈا ڈال دے، اپنی لاٹھی تو بھی ڈال دے، فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ: لَقِفَ يَلْقَفُ: نگل جانا، اَفَكَ يَاْفِكُ: گھڑنا، تراشنا۔ جھوٹا فعل اور جھوٹی حرکت اس کو افك سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے قرآنِ کریم میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ (سورۂ نور:۱۱) مِنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿ وَلَدَ اللّٰهُ (سورۂ صافات:۱۵۱) یہ جھوٹ بولتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے۔ تو بہتان، جھوٹی بات، غلط

فعل، غلط کردار، اس کو افک کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، ''پس اچانک وہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی نگلتی تھی اس چیز کو جو کچھ انہوں نے بنایا تھا'' جو کچھ انہوں نے گھڑا، تراشا تھا، یعنی جھوٹ موٹ سے جو کچھ نقشہ لوگوں کو دکھا دیا تھا موسیٰ علیہ السلام کا عصا اس کو نگل گیا، فَوَقَعَ الْحَقُّ: حق ثابت ہو گیا، وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور باطل ہو گئی وہ چیز جو وہ کر رہے تھے، بے اثر ہو گئی، فنا ہو گئی، بطل کا یہی معنی ہے، جو کچھ انہوں نے کیا سب باطل ہو گیا غلط ہو گیا، لوگوں کے سامنے اس کا غلط ہونا واضح ہو گیا، فنا ہو گیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا اور حق ثابت ہو گیا، فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ: هُنَالِكَ: اسی موقع پر، اسی موقع پر وہ لوگ مغلوب ہو گئے، ہار گئے، مغلوب کر دیے گئے، وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ: اور لوٹے ذلیل ہو کر، صٰغِرِيْنَ یہ حال واقع ہو گیا انْقَلَبُوْا کی ضمیر سے، وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ: سَحَرَة کا لفظ پہلے بھی آ گیا کہ یہ ساحر کی جمع ہے، ڈال دیے گئے جادوگر اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے تھے، وہ سجدے میں گرا دیے گئے، اُلْقِيَ مجہول کا صیغہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کے اس طرح سے مرعوب ہوئے جیسے بے اختیار سجدے میں گر گئے: ''گرا دیے گئے جادوگر سجدہ کرنے والے، اس حال میں کہ وہ سجدہ کرنے والے تھے'' قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: تو سجدے میں بھی گرے اور ساتھ یہ نعرۂ حق بھی بلند کر دیا، کہنے لگے کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: ہم ایمان لے آئے ربّ العالمین پر، لیکن ربّ عالمین سے کہیں فرعون یہ نہ سمجھ لے کہ میں ہی مراد ہوں، اور جادوگروں نے میرے اُوپر ایمان کا اظہار کیا ہے، اس لیے رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ بطور بدل کے ذکر کر دیا، کہ ربّ العالمین سے ہماری مراد ربِّ موسیٰ وہارون ہے جس کو موسیٰ اور ہارون ربّ کہتے ہیں، یہ فرعون بھی اپنے آپ کو رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (سورۂ نازعات) کہتا تھا تو رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کہہ کے وضاحت کر دی کہ ہمارا مقصد ربّ العالمین سے وہ ربّ ہے جو موسیٰ اور ہارون کا ربّ ہے، جس کو موسیٰ اور ہارون ربّ کہتے ہیں ہم اس ربّ پہ ایمان لے آئے، قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ: یہ بھی اِستفہام ہے جو لب ولہجے سے پیدا ہو رہا ہے، فرعون نے کہا اچھا! تم اس پہ ایمان لے آئے ہو میری اجازت سے پہلے ہی؟ ایمان لے آئے ہو تم قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ: اٰذَنَ یہ اَذِنَ يَاْذَنُ سے متکلم کا صیغہ ہے، اور اٰذَنَ کے نون پر جو فتحہ ہے یہ اَنْ کی وجہ سے ہے، صرفی حضرات اس کو کہیں باب اِفعال سے ماضی کا صیغہ نہ بنا لیں اٰذَنَ يُؤْذِنُ اِيْذَانًا، تو یہ ماضی کا صیغہ نہیں ہے یہ مضارع کا صیغہ ہے اور مجرد سے ہے، اَذِنَ يَاْذَنُ سے، اصل میں تھا أَأْذَنُ، دوسرے ہمزے کو الف سے بدل دیا تو اٰذَنُ ہو گیا، اَنْ کی وجہ سے اٰذَنَ بن گیا، ''قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں'' یعنی میری اجازت دینے سے پہلے ہی تم ایمان لے آئے؟ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ: بیشک یہ تمہاری کوئی سازش ہے جو تم نے شہر میں کر رکھی ہے، مکر: خفیہ تدبیر، یہاں اس کا مفہوم سازش والا ہے، یہ تمہاری کوئی سازش ہے جو تم نے شہر میں کر رکھی ہے، لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا: تاکہ تم اس شہر سے شہر والوں کا نکال دو، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا، تَعْلَمُوْنَ کا آگے مفعول نہیں ذکر کیا، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم بھی بولا کرتے ہیں اچھا! عنقریب پتا چل جائے گا، کس چیز کا پتا چل جائے گا؟ کہ تمہارا انجام کیا ہوتا ہے، یہ مفہوم خود واضح ہے، لیکن جو دھمکی ہوا کرتی ہے اس میں تفصیلی الفاظ اگر آ جائیں تو زور ختم ہو جایا کرتا ہے، دھمکی ایسے ہی ہوتی ہے ''بہت اچھا! پتا کر لوں گا'' اب کیا پتا کر لو گے؟ اگر یہ تقریر شروع کر دی تو کلام میں وہ زور ختم ہو جاتا ہے، ''عنقریب تمہیں پتا چل جائے گا'' مزہ چکھ لو گے تم اپنی اس سازش کا، لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ: البتہ میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ وَاَرْجُلَكُمْ: اور تمہاری ٹانگیں، مِّنْ خِلَافٍ: مختلف جانبوں سے، یعنی دائیں جانب کا ہاتھ اور بائیں جانب کی

ٹانگ، تا کہ دونوں پہلو خراب ہو جائیں، ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ: پھر میں تمہیں ضرور سولی دوں گا، اَجْمَعِيْنَ: سب کو، تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹوں گا اور کاٹ کے پھر تمہیں سولی پہ لٹکاؤں گا، قَالُوْٓا: وہ جادوگر کہنے لگے اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ: بیشک ہم اپنے رب کی طرف پھرنے والے ہیں، وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ: اور نہیں عیب لگاتا تو ہم پر مگر یہی کہ ہم ایمان لے آئے اپنے رب کی آیات پر، نَقَمَ يَنْقِمُ عیب لگانے کے معنی میں، اور اسی طرح سے انتقام لینے والا مفہوم بھی ہوسکتا ہے ''نہیں انتقام لیتا تو ہم سے مگر اسی بات کا کہ ہم ایمان لے آئے اپنے رب کی آیات پر'' اسی بات کا تو انتقام ہم سے لینا چاہتا ہے، ''نہیں عیب لگاتا تو ہم پر مگر یہی کہ ہم ایمان لے آئے اپنے رب کی آیات کے ساتھ'' لَمَّا جَآءَتْنَا: جبکہ وہ آیات ہمارے پاس آگئیں، رَبَّنَآ: اے ہمارے پروردگار! اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا: ہمارے اوپر صبر ڈال دے، ہمیں صبر کی توفیق دے، استقامت بخش، وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ: اور ہمیں وفات دینا مسلمان ہونے کی حالت میں، یعنی اللہ سے توفیق مانگی کہ وفات تک ہم اِسی اسلام پر اِسی دین پر ثابت قدم رہیں، فرعون کی سختی سے کہیں ہمارا قدم ڈگمگا نہ جائے، ہمیں فرعون کی سختیاں جھیلنے کی توفیق دے، اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا کا یہ مفہوم ہوگا، ڈال ہمارے اوپر صبر وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ: اور وفات دے ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کا سبب

اُمم سابقہ کے واقعات گزرنے کے بعد اب یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مدمقابل فرعون کا قصہ شروع ہوا، اور یہ قصہ یہاں بہت مفصل ذکر کیا گیا ہے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی سوانح حیات، کہ کن حالات میں پیدا ہوئے تھے، کن حالات میں انہوں نے پرورش پائی، وہ اِس سورت میں مذکور نہیں ہے، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ طٰہٰ میں آئے گی، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص ان دونوں سورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے اور اس وقت کے سیاسی حالات، جن حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ان کی نشوونما، کہ کس طرح سے ان کی جان بچائی گئی اور کس طرح سے یہ پلے اور بڑھے، اور پھر یہ کیسے اس درجے تک پہنچے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوّت سے سرفراز فرمایا، اور نبوّت سے سرفراز فرمانے کے بعد پھر ان کو مامور کیا کہ اب اسی فرعون کی طرف تبلیغ کرنے کے لئے جاؤ جہاں سے ڈر کے بھاگ کے آئے تھے، یہ داستان جتنی بھی ہے، یہ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ قصص کے اندر آئے گی، یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صرف وہ حصہ نقل کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے ساتھ گفتگو پر مشتمل ہے، اور یہ تفصیل کے ساتھ جو سُنایا جارہا ہے تو اس لیے کہ اُس وقت جب یہ قرآنِ کریم اتر رہا تھا اُس وقت اس ماحول میں اردگرد یہودی تھے، اور یہودیوں کو بھی متنبہ کرنا مقصود تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ کو دوہرا کر، اور جس طرح سے اس وقت کے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ٹکر لی تھی، لیکن اس ٹکر کے نتیجے میں اپنے آپ کو برباد کر بیٹھا، تو سرورِ کائنات ﷺ کے مقابل بھی کوئی فرعونوں سے کم نہیں تھے، جیسے کہ ابوجہل کو ''فِرعونُ هٰذِهِ الْاُمَّة'' کہا جاتا ہے، یہ اس اُمت کا بہت بڑا فرعون تھا، تو وہ

فرعون جو اپنے آپ کو مصر کا بادشاہ قرار دیتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اکڑا تھا، جب موسیٰ علیہ السلام کی نصیحتیں اُس نے نہیں مانیں، برس ہا برس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن جب وہ نہیں مانا تو نہ اُس کی فوجیں کام آئیں، نہ وہ ملک مصر اُس کے کام آیا، اور نہ ہی اس کا اقتدار اُسے بچا سکا، پانی کے اندر اللہ نے غوطہ دے کر ناک میں پانی ڈال کر مار دیا، یہ تاریخ ان لوگوں کو سنانی مقصود ہے کہ وہی نیل، وہی دریا جس کی وجہ سے وہ فخر کرتا تھا کہ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (سورۂ زخرف:۵۱) دیکھو! میں مُلک مصر کا مالک ہوں، میرے باغات میں یہ دریا اور نہریں بہتی ہیں، تو یہ میرے مقابلے میں کیسے آسکتا ہے؟ تو وہی دریا یا سمندر کا پانی اُس کی موت کا باعث بنا، اور اس کا اقتدار، اختیار، اس کے خزانے، اس کی بڑی بڑی فوجیں اس کے کام نہ آسکیں۔ تو یہ تاریخ دوہرائی اس وقت کے فراعنہ کو سنانے کے لیے، کہ تم بھی اپنی فرعونیت سے باز آجاؤ، ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی تو پھر تمہارا یہ جتھا، تمہاری یہ قوت کسی قسم کے کام نہیں آئے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت سے اسباق پر مشتمل ہے، اس لیے قرآنِ کریم میں جتنا اس واقعہ کو دوہرایا گیا ہے کوئی دوسرا واقعہ اتنا تکرار کے ساتھ نہیں آیا، اکثر و بیشتر سورتوں میں اس کے مختلف اجزا ذکر کیے گئے ہیں، خاص طور پر سورۂ طٰہٰ میں، سورۂ قصص میں، سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل سب سے زیادہ ہے، ورنہ اور سورتوں میں بھی ان کا ذکر آتا ہے۔ تو یہاں صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت جو فرعون کے سامنے ہوئی اور گفتگو جو ہوئی صرف وہ واقعہ نقل کیا جارہا ہے، ابتدائی حالات یہاں مذکور نہیں ہیں، وہ ان شاء اللہ! سورۂ طٰہٰ میں آئیں گے۔

آیات کا حق ادا نہ کرنے والوں کا انجام

موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بھیجا اپنی آیات دے کر، ''آیات'' سے مراد میں نے عرض کر دیا کہ معجزات دے کر، اپنی باتیں دے کر، اپنی نشانیاں دے کر بھیجا فرعون اور اُس کے رؤساء کی طرف۔ فرعون کی طرف جو ملأ کی نسبت ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اُس کی فوج کے جرنیل، اُس کے دربار کے چوہدری، اُس کے متعین کیے ہوئے وڈیرے، اُس کے نائبین جو اُس کے معاون سمجھے جاتے تھے، یہاں ملأ کا مصداق وہ ہیں۔ انہوں نے اُن آیات کا حق ادا نہیں کیا، حق ان کا یہ تھا کہ ان آیات سے متاثر ہوتے اور متاثر ہو کر ایمان لاتے، لیکن انہوں نے ان کی حق تلفی کی اور کفر کیا، تو پھر یہ نتیجہ فوراً ظاہر کر دیا گیا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: جنہوں نے ہماری آیات کی حق تلفی کی تھی، اور ہماری آیات کا حق ادا نہیں کیا تھا، اور اُن سے متاثر ہو کر ایمان نہیں لائے تھے، تو اے مخاطب! تو دیکھ لے پھر ان کا انجام ہوا؟ یہ نتیجہ کی طرف نقد بہ نقد متوجہ کر دیا گیا، تا کہ یہ بات ذہن میں آجائے کہ اب اللہ کی آیات تمہارے پاس بھی آرہی ہیں، اگر ان آیات سے تم متاثر نہ ہوئے تو تم بھی مفسدین بن جاؤ گے، جو نبی کی اصلاحی سکیم کی مخالفت کرتے ہیں وہ سب مفسد ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کی طرف سے دُنیا کی اصلاح کے لیے جو قواعد نافذ کیے جاتے ہیں، جو اُن کے اندر رُکاوٹ ڈالتے ہیں وہ سب مفسدین کا مصداق ہیں، ''پھر دیکھ لو مفسدین کا انجام کیا ہوا'' فوراً ہی نتیجے کی طرف متوجہ کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کو دعوتِ حق

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں پہنچ گئے، اور جا کر پہلی بات یہ کہی کہ میں رَبُّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا آیا

ہوں، دعوت دی، موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مختلف اجزاء مختلف سورتوں میں بکھرے ہوئے ہیں، فرعون کو حق قبول کرنے کی دعوت دی، توحید کی دعوت دی، اور اُس کا ذکر بھی دوسری آیات میں ہے، صرف یہ نہیں کہ جاتے ہی اپنی قوم کا مسئلہ ہی سامنے رکھ دیا، اپنی قوم کو آزادی دلانے کا مسئلہ ہی فوراً جا کر سامنے رکھ دیا، ایسی بات نہیں ہے، اپنی رسالت کا ذکر کیا ہے، پھر اُس کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف متوجہ کیا ہے، یہ گفتگو سورۂ شعراء کے اندر، اور دوسری سورتوں میں آئے گی۔ تو اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں رَبّ العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، حَقِیْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: یہ اپنا منصب واضح کیا ہے، کہ میں اس موقف پر قائم ہوں، کہ اللہ پر سوائے سچی بات کے کچھ نہیں کہوں گا، جیسا کہ سورۂ حٰم الدخان میں آئے گا کہ میں رسول امین ہوں، امانت دار۔ امانت دار وہی ہوتا ہے کہ جو میرے پاس آئے میں صحیح صحیح آگے پہنچاؤں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہوں گا، جس کے جواب میں فرعون نے کہا تھا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (سورۂ شعراء: ٢٣) رَبّ العالمین کیا ہوتا ہے جس کی طرف سے تُو آگیا؟ رَبّ العالمین کیا ہے؟ وہ کیا ہوتا ہے رَبّ العالمین جس کی طرف سے تُو آگیا؟ اس قسم کی گفتگو کے مختلف اجزا مختلف سورتوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں صرف اپنا یہ دعویٰ ہی دعویٰ لے کر نہیں آیا کہ میں رَبّ العالمین کی طرف سے رسول ہوں، بلکہ اپنے اس دعوے پر صریح دلیل بھی لایا ہوں، تو جب یہ میرا دعویٰ مدلل ہے، میں اس منصب پر قائم ہوں اور میرے پاس اس کی رسید ہے، میرے پاس ثبوت ہے کہ میں اس منصب پر ہوں، تو پھر میری بات تو مان لے، یہ جو میری قوم، میرا قبیلہ ہے، اس کو تُو نے غلام بنا رکھا ہے، اور اِن کے اوپر تیرا انتہائی درجے کا ظلم وستم ہے، ان کو اجازت دے دے، میں ان کو کسی طرف لے کر چلا جاؤں، فَاَرْسِلْ مَعِیَ میرے ساتھ ان کو چھوڑ دے، میں ان کو لے جاؤں گا، اپنی قوم کو سنبھال لوں گا، کہیں لے جا کر ان کو آباد کرلوں، جو چاہوں کروں، تو ان کو اپنی غلامی سے نجات دے دے۔ یہ غلام کس طرح سے بن گئے تھے؟ یہ داستان بھی آپ کے سامنے دوسری سورتوں میں آئے گی۔ ''چھوڑ دے میرے ساتھ، بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو'' یہ گفتگو ہوگئی۔

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا دلچسپ واقعہ

اب یہ نہیں کہ پہلی مجلس کے اندر اتنی بات ہوگئی، میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ واقعات جب نقل کیے جاتے ہیں، تو اتنا ہی ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تھا، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب لکھی ہے ''یوسف وزلیخا'' جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ مکمل لکھا ہوا ہے۔ لطیفہ مشہور ہے کہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کہیں سفر میں جا رہے تھے، اور ایک اور بھی چالاک سا آدمی مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوگیا، ایک جگہ کوئی تھوڑا سا کھانا ملا تو دوسرے آدمی کا خیال یہ ہوا کہ اگر دونوں کھائیں گے تو یہ گزارے کے لیے کافی نہیں، میں ہی کھا جاؤں تو اچھا ہے، اور تدبیر اُس کی یہ سوچی کہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کو باتوں میں لگا دو، بے چارہ درویش سا آدمی ہے، میرے چکر میں آجائے گا، تو باتوں میں لگا دو، یہ باتیں کرتے رہیں گے، میں کھاتا رہوں گا، ہوں ہوں کرتا رہوں گا، کھانے کے درمیان میں ہوں ہوں کرنے میں کیا مشکل ہوتی ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو شخص بات شروع کردے اُس کا لقمہ رُک جاتا ہے، وہ باتیں کرتا ہوا کھا نہیں سکتا، اور دوسرا کھاتا جائے گا اور ساتھ ساتھ ''ہاں جی، ہاں جی''، ''ہوں ہوں'' کرتا رہے گا، اور رفتار

جاری رہتی ہے۔ تو اُس نے یہ اسکیم بنائی کہ اس طرح سے کر کے میں سارا کھانا کھا جاؤں، جب وہ شروع ہوئے تو وہ شخص مولانا سے کہتا ہے، مولانا! میں نے سُنا ہے کہ آپ نے یوسف علیہ السلام کے حالات پر کوئی کتاب لکھی ہے؟ فرمانے لگے ہاں لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے ذرا واقعہ تو سُناؤ، وہ کیا واقعہ ہے یوسف علیہ السلام کا؟ اب مقصد اُس کا تھا کہ اب اِس کی تقریر شروع ہو جائے گی، میں کھاتا رہوں گا، اتنے میں فارغ ہو جاؤں گا، تو مولانا بھی تو آخر مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ تھے، رئیس العاشقین، بڑے چست قسم کے، وہ لقمہ بھی توڑ رہے ہیں ساتھ ساتھ کہتے ہیں: ''پیرے بود، پسرے داشت، گم کردہ، باز یافت'' کہ ایک بوڑھا تھا، اس کا بیٹا گم ہو گیا تھا، بعد میں مل گیا۔ اتنا سا قصہ ہے سارا، تو اتنے بڑے قصے کو دو لفظوں میں سمیٹ دیا، تو بات اتنی سی تو نہیں ہوتی۔

کبھی واقعے کو قرآنِ کریم اِجمالی انداز میں نقل کرتا ہے

اب یہاں بھی یہ نہیں، کہ موسیٰ علیہ السلام مصر کی حدود میں داخل ہوئے اور اپنا ڈنڈا کھڑکاتے ہوئے سیدھے فرعون کے دربار میں پہنچے، اور جا کر کہتے ہیں کہ میری قوم چھوڑ دے، یہ صرف اتنا سا قصہ نہیں ہے۔ گئے ہیں، جا کر گفتگو ہوئی ہے، بار بار جس طرح سے انسان جا کے ملتا ہے، مذکرات کرتا ہے، گفتگو کرتا ہے، ہر طریقے سے سمجھاتا ہے، بحث ہوتی ہے، مباحثے ہوتے ہیں، قوم کے اندر اس بات کا چرچا ہوتا ہے، اپنی قوم کو بھی متاثر کرنا ہوتا ہے، اب یہ نہ ہو کہ فرعون سے تو پروانہ لے لے کہ اچھا جا، اور قوم ڈٹی بیٹھی رہ جائے، کہ نہیں، ہم فرعون کے درباری رہیں گے، اور ہم تو اسی کی خدمت ہی کریں گے، ہم نہیں جاتے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ جو قوم کا راہنما اور مقتدیٰ ہے وہ ایک مطالبہ منوالے، پہلے قوم کو اعتماد میں نہ لے، اور جس وقت مطالبہ منوالے تو قوم ہی اَڑ جائے کہ ہم تو ایسا کرنے کے نہیں، تو پھر مقتدیٰ کی کیا رہی، اور راہنما کا کیا ہوگا؟ اس لیے ہمیشہ مقتدیٰ راہنما جو عقل مند ہوتے ہیں وہ پہلے اپنی قوم کو اور پارٹی کو ہاتھ میں لیا کرتے ہیں، اُس کا اعتماد لیتے ہیں، اعتماد لینے کے بعد پھر مطالبہ کرتے ہیں، تاکہ اگر ان کا مطالبہ مان لیا جائے تو کم از کم اپنی قوم اور اپنی جماعت تو باغی نہ ہو جائے۔ اب یہاں بھی اگر بنی اسرائیل کو پہلے اعتماد میں نہ لیتے، اور جا کر سیدھا ہی فرعون کو کہتے کہ میں تیرے پاس یہ مطالبہ لے کر آیا ہوں، کہ میری قوم کو آزادی دے دے اور چھوڑ دے، میں اس کو تیرے علاقے سے نکال کر دوسرے علاقے میں لے جاتا ہوں، ہم تیرے مُلک میں نہیں رہتے، میں ان کو دوسرے مُلک میں لے جاؤں گا، تُو جوان کو ذلیل کر رہا ہے۔ تو فرعون کہہ دیتا کہ اچھا! تُو لے جا۔ اور قوم کہتی کہ نا جی! ہم کہاں جائیں گے، ہم تو یہاں مزے سے رہتے ہیں، بادشاہ کے درباری ہیں، اور اس کی خدمت کرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، باغات ہیں، نہریں ہیں، تُو ہمیں کہاں لے جائے گا؟ قوم آگے سے جواب دے کر بیٹھ جائے، تو یہ بات نہیں ہوتی، یہ مطالبہ تب ہوتا ہے جس وقت قوم بھی یہ چاہتی ہو، اور قوم نے اعتماد کر کے اپنا نمائندہ بنا دیا، کہ جی ہاں! اگر اس طرح سے ہو جائے، فرعون ہماری جان چھوڑ دے تو ہم اس سے چھوٹ کر نکل جائیں گے، ہم اس سے بڑے تنگ ہیں۔ اس پر برسوں لگتے ہیں، برس خرچ ہوتے ہیں، یہ کوئی دنوں کی بات نہیں ہوتی ہے، قرآنِ کریم جب نقل کرتا ہے وہ تو خلاصے کی بات نقل کرتا ہے، کہ یوں ہوا، کہ جا کے فرعون سے اس طرح سے بات کی۔

دربارِ فرعون میں معجزات کا مظاہرہ

جب یہ بات کی تو پہلے تو فرعون نے یہی پوچھا کہ تیرے پاس دلیل کیا ہے کہ تو ربّ کی طرف سے آیا ہے؟ تو کہتا ہے کہ میرے پاس ثبوت ہے، میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں، کہ میں اللہ کی طرف سے آیا ہوں، پہلے وہ ثبوت پیش کر، وہ کیا ثبوت لے کر آیا ہے، جیسے کسی دوسرے ملک کا سفیر ہمارے صدر صاحب کے پاس آئے، اور کہے کہ میں فلاں قوم کی طرف سے اور فلاں ملک کی طرف سے آیا ہوں، اور میں یہ بات کرنے کے لیے آیا ہوں تو پہلے وہ اپنا اتھارٹی کارڈ، اپنے وہ کاغذات جس سے معلوم ہو کہ واقعی یہ فلاں حکومت کا نمائندہ ہے، گفتگو کرنے کے لیے آیا ہے وہ دکھاتا ہے، یہ اخباروں میں فوٹو نہیں آتے رہتے؟ کہ فلاں ملک کا سفیر اپنی اسناد پیش کر رہا ہے، اخباروں میں کبھی کبھی آپ فوٹو دیکھا ہوگا۔ تو اسناد پیش کرنے کا یہ معنی ہوتا ہے کہ وہ ثبوت مہیا کرتا ہے، کہ واقعی فلاں حکومت نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے، تو فرعون کہتا ہے کہ وہ کیا نشانی ہے، لے آ، ثبوت لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے تو ثبوت دے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نشانی واضح کر دی، کہ وہی ڈنڈا اٹھا کر مارا کہ یہ میری نشانی ہے، کہ میں ربّ العالمین کی طرف سے آیا ہوں، اور وہ پھینکتے ہی ایک بہت بڑا سانپ بن گیا، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو گیا کہ میں کسی بہت بڑی طاقت کی طرف سے آیا ہوں، دیکھو! یہ ایک بے جان سی لاٹھی ہے، اور میں یہ تیرے سامنے رکھ رہا ہوں، اور ابھی دیکھتے دیکھتے سانپ بن گیا، تو معلوم ہو گیا کہ میں کسی بڑی قوت کی طرف سے نمائندہ بن کر آیا ہوں، یہ ربّ العالمین کی طرف سے میرے آنے کی نشانی ہے کہ دیکھو! میں نے یہ لاٹھی پھینکی اور اژدھا بن گیا، یہ معجزہ ہے اور معجزہ نبوّت کی دلیل ہوتا ہے۔

''عصائے موسیٰ'' کا تعارف

فَاَلْقٰى عَصَاهُ: انہوں نے لاٹھی ڈال دی جو ہاتھ میں تھی، جس کو ساتھ لے کر گئے تھے، یہ وہی لاٹھی تھی کہ جب بکریاں چرانے جایا کرتے تھے تو وہ ساتھ ہوتی تھی، سورۂ طٰہٰ کے اندر واقعہ آئے گا مَاتِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى: اے موسیٰ! تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ قَالَ هِيَ عَصَايَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ میری لاٹھی ہے، اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا: اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں، سہارا لے کر کھڑا ہو جاتا ہوں، آپ نے چرواہوں کو دیکھا ہوگا، کہ جب بکریاں چر رہی ہوتی ہیں اور وہ خود کھڑے نگرانی کر رہے ہوتے ہیں، تو اپنی لاٹھی یوں کندھے میں لے کر یوں کھڑے ہو جاتے ہیں سہارا لگا کر، تو ایک قسم کا وزن لاٹھی کے اُوپر ہو گیا تو ٹانگیں تھکتی نہیں ہیں، اُوپر والے دھڑ کا وزن ہلکا ہو جاتا ہے، اور کہیں کھالا (ندی) اچھلنا پڑ گیا، کوئی گھاٹی عبور کرنی پڑ گئی، تو بھی انسان لاٹھی کا سہارا لے لیتا ہے، وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ: اسی لاٹھی کے ساتھ میں اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں، درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں، پتے گرتے ہیں بکریاں کھاتی ہیں، وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى: اور بھی اس سے کئی کام لیتا ہوں، یہ سارا اپنی لاٹھی کا تعارف کرا دیا تھا، یہ وہی لاٹھی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اچھا! اسے ذرا پھینک، جب وہ سانپ بنا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے، لگے بھاگنے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ نہیں، پکڑ لے اس کو، یہ ویسے ہی ہو جائے گی جیسے پہلے تھی خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى: ہم اس کو پہلی حالت کی طرف ہی لوٹا دیں گے۔ تو وہاں مفسرین نے لکھا ہے، سورۂ طٰہٰ میں آئے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس کو پکڑ لے، تو کہتے ہیں کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس کو پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹا، سانپ جو بنا ہوا تھا، تو کہتے ہیں کہ فرشتے نے کہا اے موسیٰ! اگر تجھے اللہ نہیں بچانا چاہے گا، تو کیا یہ کپڑا تجھے بچالے گا؟ تو موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ نہیں، کپڑا بچا نہیں سکتا، لیکن میں ایک عاجز مخلوق ہوں، کمزور مخلوق ہوں، کیا مطلب؟ کہ میں ایسی مخلوق ہوں جس کو ظاہری طور پر اسباب سے تسلی ہوتی ہے، اور اسباب کا سہارا لیا جاتا ہے، ورنہ بچانا تو اللہ نے ہے، یعنی اسی عادت کے مطابق کہ جیسے کسی کو پکڑنا ہو تو کپڑا لپیٹا جاتا ہے، تو موسیٰ علیہ السلام ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر اس کو پکڑنے لگے۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا کہ نہیں، اس کو پکڑو، اور یہ پہلی حالت کی طرف آجائے گا، کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، تو پھر کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُسے ہاتھ ڈالا۔ اور عصا کی جو بناوٹ تھی، وہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی کھونٹی نہیں تھی جیسی ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کی کھونٹی کا ذکر تو ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے، کہ اُوپر سے یوں مڑی ہوئی، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے عصا کر ذکر جو آتا ہے، تو اس لاٹھی کے اُوپر یہ کیفیت تھی، یوں (دوشاخہ)، کیونکہ وہ اسی حصے کو کندھے کے نیچے لے کر سہارا لے کر کھڑے ہو جاتے تھے، یہ بعض بعض ملنگوں کے پاس آپ نے دیکھے ہوں گے، سریے کا بنا ہوا ہوتا ہے، یا لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے، وہ اوپر سے جا کر اس طرح (دوشاخہ) ہو جاتا ہے، یہاں (اوپر دو مونہوں کے درمیان) ہاتھ ڈال کر پکڑتے ہیں، اور اسی کو کندھے کے نیچے لے کر سہارا لے لیا جاتا ہے۔ ''کبیر والے'' میں اگر آپ گئے ہوں تو وہاں جمعہ کے لیے جو لاٹھی نکال کر رکھی ہوئی ہوتی ہے، وہ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بنوائی تھی، وہ اسی نمونے کی ہے، وہاں خطبہ دیتے وقت جو ہاتھ میں لیا کرتے ہیں اُس کی بناوٹ بالکل اسی طرح سے ہے، اور حضرت نے اسی وقت ہی فرمایا تھا کہ یہ عصائے موسوی کی شکل ہے، ویسے ہی یہاں اُوپر ہاتھ ڈال لیتے ہیں، ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو وہی جو اُوپر والا حصہ تھا وہی اس کا منہ بن گیا تھا، کیونکہ اُوپر والا حصہ جو تھا وہی اس کے منہ کی شکل تھی، تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہیں اس کے منہ میں ہاتھ ڈالا، جب اس کے منہ میں ہاتھ ڈالا تو لاٹھی بن گئی، اتنی سی بات تھی، تو یہی معجزہ دکھایا۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ: مبین کا مطلب یہ ہے، کہ بالکل کھلم کھلا، جس کے اندر کوئی شک اور اشتباہ کی بات نہیں تھی، اس طرح سے وہ سانپ بن گیا۔ یہ ایک معجزہ ہو گیا، وَنَزَعَ يَدَهٗ اسی طرح سے ہاتھ بغل میں ڈال کر نکالا، فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ: تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل سفید روشن، کہ پہلے یوں ہاتھ تھا جس طرح سے عام ہوا کرتا ہے، لیکن جب وہ یوں کر کے نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے وہ ایک چمک دار اور سفید چیز بن گئی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا سیاسی رنگ دینا

فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دونوں معجزوں کا اظہار کیا، کہ لاٹھی ڈالی اور وہ بہت بڑا سانپ بن گیا، اور ہاتھ اپنے گریبان میں دے کر یا بغل کے نیچے دبا کر کھینچا تو وہ روشن ہو گیا، تو فرعون کہنے لگا اپنے اُس ماحول کے مطابق، چونکہ اس زمانے میں مصر کے اندر جادوگروں کا بہت زور تھا، اور وہ اپنے جادو کے ساتھ مختلف قسم کے کرشمے دکھاتے رہتے تھے۔ تو

فرعون کہنے لگا کہ یہ تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے جادو کے ذریعے سے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے، تو پہلے تو یہ اظہار فرعون نے کیا جیسے کہ دوسری آیات میں ہے،[1] اور جس وقت فرعون کی طرف سے یہ اظہار ہوا، تو پھر جو وظیفہ خوار ہوتے ہیں، دربار میں بیٹھنے والے، جن کو آج کل ہماری اصطلاح میں ''چمچے'' کہتے ہیں، ''کڑچھے'' کہتے ہیں، یا پنجابی کے اندر جن کو ''جھولی چک'' کہتے ہیں، جو دوسرے کے آگے پیچھے جھولی اُٹھا کے پھرتے رہتے ہیں، کاسہ لیس، دوسرے کے پیالے چاٹنے والے، دوسرے کی جوتیاں چاٹنے والے، اس قسم کے الفاظ اس طبقے کے لیے ہر زبان کے اندر استعمال کیے جاتے ہیں، یہ چاپلوس قسم کا طبقہ ہوتا ہے، ہاں میں ہاں ملانے کے لیے ہر وقت یہ تیار ہوتے ہیں، اور انہیں پتا ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے بڑے کی ہاں میں ہاں ملائیں گے تو ہی جا کر ہمارے لیے عزت اور جاہ بچ سکتا ہے، اس قسم کے درباری جو ہوا کرتے ہیں، وہ ہمیشہ حکام کے لیے گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔ فرعون نے اس قسم کا اظہار کیا تو یہ بھی ساتھ ہی بول پڑے کہ ہاں جی! یہ تو بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے، یہ تو بہت بڑا علم والا جادوگر ہے۔ اور پھر فوراً ہی اس کو سیاسی رنگ دے دیا، دیکھو! سیاست کا مزاج ابتدا سے ایک ہی جیسا ہے، لیڈروں کا مزاج ایک ہی جیسا ہے، کوئی اصلاح کی بات کرے فوراً کہہ دیں گے، یہ کرسی کا بھوکا ہے، یہ اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اور اس موجودہ حکومت کے خلاف انقلاب لانا چاہتا ہے، یہ باغی ہے۔ تو باغی بنا کر، حکومت کے آئین کی خلاف ورزی کرنے والا بنا کر اُس پر مقدمہ چلا کر، اُسے سزا دے دو۔ تو یہاں انہوں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اِقدام کو جو انہوں نے کیا تھا، توحید کی دعوت دی تھی اور اُس کے بعد یہ معجزہ دکھایا تھا، انہوں نے فوراً اس کو سیاسی رنگ دے دیا، سیاسی رنگ دے کر کہتے ہیں کہ ان کا تو مقصد ہی اس حکومت پر قبضہ کرنا ہے، اور جو یہاں کے رہنے والے اصل حکومت کے مستحق ہیں، یہ قبطی، فرعون کی قوم، ان کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔

فرعون اور اس کے حواریوں کی سیاسی چال

اب چونکہ مصر کی آبادی دو طبقوں میں تقسیم تو تھی، ایک تھے قبطی، فرعون کی قوم اور دوسرے تھے سبطی، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اَسباط کی اولاد، جن کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، تو بنی اسرائیل جتنے تھے وہ سب غلامی کی زندگی گزار رہے تھے، بالکل پسے ہوئے تھے، اُن کو کسی قسم کے کوئی حقوق اس مصر میں حاصل نہیں تھے، اور قبطی جو تھے وہ حکومت پر فائز تھے، اب دل تو اندر سے ڈر رہا ہے کہ کہیں موسیٰ علیہ السلام سے متاثر ہو کر جس طرح بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ہیں، کہیں قبطیوں میں سے بھی کچھ لوگ متاثر نہ جائیں، اگر وہ متاثر ہو جائیں گے تو حکومت کا تختہ اُلٹنا آسان ہے، فرعون کے خاندان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ تو انہوں نے اس کو فوراً یہی رنگ دیا کہ یہ تو تمہیں اس علاقے سے نکالنا چاہتے ہیں، جو اصل حکومت کے مستحق ہیں، اس لیے اس کا مقابلہ جادوگروں کے ذریعے سے کرنا چاہیے، اور لوگوں کو چوکنا کر دینا چاہیے، تو انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے فرعون کو یہی کہا کہ ابھی اسے کچھ نہ کہو، اسے چند دن کی مہلت دے دو، اور اسے کہو کہ تو کوئی اللہ کا فرستادہ نہیں، نہ کوئی رَبّ العالمین ہے، نہ تو کسی کا بھیجا ہوا ہے تو جادوگر ہے، ہم تیرا مقابلہ جادوگروں سے کروائیں گے۔ تو انہوں نے اس کو یہ رنگ دے دیا اور مشورہ دے دیا فرعون کو کہ

(۱) پارہ نمبر ۱۹ سورۃ شعراء آیت ۳۴۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ۔

ملک میں بڑے بڑے جادوگر پڑے ہوئے ہیں، اس کو ڈھیل دے دو، مہلت دے دو، اور شہروں کے اندر اپنے فرستادے بھیج دو، چپڑاسی جائیں، اور جا کر سارے ملک میں سے بڑے بڑے جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں، اور اس کے ساتھ مقابلے کا ایک وقت متعین کرلو۔

فرعونیوں کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے کے لئے تیاریاں اور جائزہ

جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کے اندر آئے گا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے لیے کوئی وقت متعین کر، جس میں ہم تمہارے ساتھ مقابلہ کریں گے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت استغناء کے ساتھ کہہ دیا کہ وہی یَوْمُ الزِّیْنَۃِ تمہارے جشن کا دن، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی سالانہ جشن منایا کرتے تھے، جس میں سارے کے سارے لوگ اکٹھے ہوتے، جیسے میلوں میں اجتماع ہوتا ہے، یَوْمُ الزِّیْنَۃِ: جشن کا دن، جو تمہارے میلے کا دن ہے وہی مقابلے کا دن ٹھہرا، جب کہ ساری مخلوق آئی ہوئی ہوگی، اور وقت بھی متعین کر دیا، ضُحًی: چاشت کا وقت، یعنی سورج چڑھنے کے بعد دوپہر سے پہلے پہلے یہ جو وقت ہوا کرتا ہے، یہ وقت متعین، جشن کا دن متعین، اور جگہ بھی متعین کر لی ہوگی جس کا ذکر مَکَانًا سُوًی کے تحت ہے، کہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سب کا پہنچنا آسان ہو، برابری جگہ، یہ سارے لفظ آپ کے سامنے سورۂ طٰہٰ میں آئیں گے، تو یہ جگہ کی تعیین ہوگئی، دن کی تعیین ہوگئی، گویا کہ مقابلے کا اعلان ہوگیا۔ اب فرعونیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جادوگروں کو اکٹھا کرنے کے لیے اپنے آدمی دوڑا دیے، اور جادوگروں کو اکٹھا کرلیا گیا ......ذرا خیال فرمائیے!...... واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہوتی ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ فرعون کے ساتھ اپنا وقت متعین کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام چپ ہو کر بیٹھ گئے ہوں، جس طرح سے تشہیر فرعون نے کرنی تھی اس خیال سے کہ اتنے بڑے بڑے جادوگر میری سلطنت میں ہیں، جب یہ اُن کے مقابلے میں آ کر شکست کھا جائے گا، عوام کی نظروں میں گر جائے گا، لوگ اس کے پیچھے نہیں لگیں گے تو میرا مقصد حل ہو جائے گا، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی کامیابی کا یقین تھا، تو یقیناً اُن دنوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جگہ بہ جگہ تقریریں کر کے لوگوں کو کہا ہوگا، کہ مقابلہ دیکھنے کے لیے آنا، مقابلہ ہوگا، تمہیں پتا چلے گا کہ جادوگر کون ہے اور اللہ کا رسول کون ہے؟ صبح و شام، رات دن تقریریں ہوتی ہیں، اور ان کا تو مشن ہی تقریریں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی توحید سمجھانی تھی، لوگوں کے حقوق بتلانے تھے، ظالموں کو ظلم سے روکنا تھا، مظلوموں کو حوصلہ دلانا تھا، یہ وعظ تقریر جس طرح سے ہوتی ہے اسی طرح سے ہوتی رہی ہوگی، چونکہ مقابلے کا دن متعین ہوگیا، سب کو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے، کہ مقابلہ دیکھنے کے لیے آئیں، جو غلبہ پا گیا وہ سچا ہوگا، جیسے فرعونیوں کی طرف سے سارے ملک میں مقابلے کی تحریک چل رہی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح سے تقریریں کرتے ہوں گے، چنانچہ حکومت کے لیے کیا مشکل تھا، سارے ملک میں لوگ بھیج دیے، بڑے بڑے جادوگر سارے کے سارے اکٹھے ہوگئے، اب جس وقت جادوگر مصر میں اکٹھے ہو گئے ہوں گے (عقلی طور پر واقعات کی ترتیب اس طرح سے ہوگی) کہ جب ایک آدمی کے مقابلے کے لیے کسی دوسرے کو بلایا جاتا ہے، تو مقابلے میں آنے والا اپنے مدمقابل کے حالات کا مطالعہ کرتا ہے، کہ یہ کیا چیز ہے؟ کیا دکھاتا ہے؟ کس طرح سے کرتا ہے؟ جس طرح سے پہلوان جس وقت کشتی لڑتے ہیں، تو ایک

دوسرے کے داؤ دیکھتے ہیں، کہ پچھلی کشتی میں اس نے کیا داؤ استعمال کیا تھا، تاکہ ہم اس کا توڑ مہیا کریں، مقابلے میں ہمیشہ ایک دوسرے کے حالات کا جائزہ شدت سے لیا جاتا ہے، تو یہ بالکل صحیح بات ہے کہ جب یہ جادوگر اکٹھے ہو گئے ہوں گے، تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریریں سنتے جاتے تھے، کہ یہ ہے کیا چیز؟ اور کہتا کیا ہے؟ اور یہ کس رنگ میں لوگوں کو بھڑکاتا ہے؟ یا کس طرح سے لوگوں کے سامنے تبلیغ کرتا ہے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وعظ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر چاہے وہ سامنے جا کر سنتے ہوں، چاہے وہ چھپ کر سنتے ہوں، بہرحال انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وعظ کا جائزہ لیا، ان کے خیالات پرکھے، ان کے حالات کو دیکھا اور یہ معلوم کیا کہ یہ کیا ڈھنگ استعمال کرتے ہیں، اور کس طرح سے ہیں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سارے کے سارے اُن کے سامنے آ گئے۔ یہ ایک قاعدے کی بات ہے کہ سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد مقابلہ کیا جایا کرتا ہے، یہ نہیں کہ اندھا دھند آئے، اور نہیں دیکھا کہ میرا مدِمقابل کون ہے، وہ کیا کرتا ہے اور کیا نہیں کرتا، اور آتے ہی میدان میں بھڑ جائے، ایسا نہیں ہوا کرتا، دُنیا میں طریقہ اسی طرح سے چلا آتا ہے۔

حق پرست کی علامت

جب وہ جادوگر اکٹھے ہوئے...... اب ذرا خیال کریں...... حق اور باطل کا فرق معلوم کرنے کے لیے کوئی زیادہ غور و خوض کی ضرورت نہیں ہوتی، بالکل ان میں اس طرح سے فرق ہوا کرتا ہے جس طرح سے رات اور دن میں ہے، جس طرح سے روشنی اور تاریکی، ظلمت اور نُور آپس میں مشتبہ نہیں ہوتے، اسی طرح سے حق اور باطل بھی آپس میں مشتبہ نہیں ہیں، بشرطیکہ اپنی آنکھ کے اندر روشنی صحیح ہو اور دیکھنے کا ارادہ ہو۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، اور آپ پڑھیں گے، کچھ آپ نے پڑھ لی، کہ جس وقت انبیاء علیہم السلام قوم کے سامنے پیش ہوتے ہیں، تو اُن کا پہلا نعرہ یہ ہوتا ہے کہ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا (سورۂ ہود: ۵۱) کہ میں اس کو روٹی کمانے کا ذریعہ نہیں بنا رہا، میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا کہ مجھے پیسے دو، میں کوئی بھوکا نہیں ہوں کہ میں نے یہ کوشش اس لیے شروع کی ہو، تاکہ میں اس کو اپنے لیے آمدنی کا ذریعہ بنا لوں، میں تم سے اَجر نہیں مانگتا، میری اُجرت تو اللہ کے ذِمّے ہے، وہی مجھے اجر و ثواب دے گا، میں تو تمہارا خیرخواہ بن کر آیا ہوں، تم خیرخواہی چاہتے نہیں تو بھی میں کر رہا ہوں، تم آگے سے گالیاں دو تو بھی میں تمہیں نصیحت کروں گا، تم آگے سے مارو تو بھی میں تمہیں بھلائی کی بات کہوں گا، یعنی معاشرے کے اندر ان کو عزت اور محبوبیت اور جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ حق کی خاطر ہر چیز کی قربانی دیتے ہیں، اور حق کا معاوضہ قوم سے نہیں مانگتے کہ تم ہمیں یہ معاوضہ دو۔ یہی علامت ہوتی ہے سب سے زیادہ حق پرستی کی، کہ ایک آدمی کھاتا اپنی جیب سے ہے، تم سے کچھ مانگتا نہیں، اور صبح شام رات دن تمہیں سمجھانے کے لیے تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے، تو یہاں اگر انسان تھوڑا سا بھی سوچے تو اُس کے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے، کہ واقعی یہ کوئی حق پرست آدمی ہے، جو قوم کی ہمدردی میں ساری کی ساری محنت اُٹھا رہا ہے، ورنہ نہ کسی سے کپڑا مانگے، نہ روٹی مانگے، نہ مکان مانگے، نہ کرایہ مانگے، کچھ بھی نہیں۔

باطل پرست کی علامت

اور دوسری طرف جو باطل پرست ہوا کرتے ہیں، اُن کے سامنے چونکہ آخرت کا تصور تو ہوتا نہیں، انہوں نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے سب پیٹ کا دھندا ہوتا ہے، پیٹ کے دھندے کے لیے کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں، اس لیے جس وقت فرعون کے سامنے آئے ہوں گے، اور اُن کی میٹنگ ہوئی ہوگی، اور فرعون بھی اس میں بیٹھا ہوگا، فرعون نے کہا ہوگا کہ اس سے میری جان چھڑاؤ، یہ کیا آگیا، یہ تو خطرہ ہے کہ یہ تختہ اُلٹ دے گا، یہ تو ہماری حکومت چھین لے گا، پورے خطرات سے جس طرح سے آگاہ کیا جاتا ہے، جب وہ سارے کے سارے خطرات فرعون نے پیش کیے ہوں گے، تو پھر آگے سے ان کا پہلا سوال یہی ہے، یہ نہیں کہ دربار میں آتے ہی کہا ہوگا کہ ہم پیسے لیں گے، یوں نہیں، بلکہ اس طرح سے ترتیب ہوا کرتی ہے، کہ آپس میں میٹنگ ہوئی، خطرات کا اظہار ہوا، وہ سمجھ گئے کہ اب یہ فرعون دباؤ میں آیا ہوا ہے، تو کہتے ہیں دیکھو جی! مقابلہ ہم کریں گے، اور جیتنے کی صوت میں پھر بہت بڑی اُجرت لیں گے، اَجْرًا پر تنوین تعظیم کی ہے، اگر ہم جیت گئے تو جیتنے کی صورت میں ہمارے لیے اُجرت ہوگی، ہم بہت زیادہ اَجر لیں گے، اب فرعون تو مرعوب ہو چکا تھا، وہ کہتا ہے ہاں ہاں اُجرت بھی ملے گی، اور پھر میں بالکل تمہیں اپنا مقرب بھی بنالوں گا، تم میرے درباری ہو جاؤ گے، یعنی جن کی وجہ سے مجھے فتح حاصل ہوگی، اور میرا مدمقابل شکست کھا جائے گا، اُن کی کتنی عزت ہوگی میری نگاہ میں، اس طرح سے اُن کو جاہ کی بھی طمع دِلاتا ہے، اور اَجر کا وعدہ کر کے اُن کو مال کی بھی طمع دلاتا ہے، تو جو آتے ہی پہلے تنخواہ مانگتا ہے، اور آتے ہی پہلے اُجرت مانگتا ہے، اس میں اور اُس میں کتنا فرق ہے؟ دیکھنے والا تو یہیں سے سمجھ سکتا ہے، کہ ایک پیشہ ور ہے، اور دُوسرا کوئی پیشہ ور نہیں، وہ تو معلوم ایسے ہوتا ہے کہ جیسے اللہ کی طرف سے اس کے ذِمّے ایک منصب لگا ہے، اور قوم چاہے نہ چاہے وہ سمجھانے پر تلا ہوا ہے، اگر آنکھوں میں نُور ہو اور دِل میں کچھ تھوڑی سی بھی بصیرت ہو تو یہی بات ہی حق اور باطل میں فرق کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے، کہ کون دُنیادار ہے، کون دُنیا کمانے کے لیے اس قسم کی چیزیں لاتا ہے، اور کون مخلص ہے؟ جس کو دُنیا کی کوئی پروانہیں، چاہے اس کی عزت کرو نہ کرو، چاہے اس کو اچھے لفظ سے یاد کرو یا نہ کرو، چاہے گالیاں دو، چاہے پتھر مارو، وہ تمہیں سمجھا رہا ہے، اور تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ان دونوں باتوں میں فرق اس طرح سے ہی ہے، جس طرح سے دِن اور رات میں فرق ہوتا ہے، جیسے ظلمت اور نُور میں فرق ہوتا ہے، جیسے تاریکی اور روشنی میں فرق ہوتا ہے، حق اور باطل میں اسی طرح سے فرق ہوتا ہے، اور اہلِ حق اور اہلِ باطل میں اسی طرح سے فرق ہوتا ہے، کہ ایک کے سامنے سوائے دُنیا کے کچھ نہیں ہوتا، اور ایک کے سامنے سوائے آخرت کے کچھ نہیں ہوتا۔

جادوگروں کے مقابلے کے لیے تیاریاں اور میدان کا منظر

بات ہوگئی، اُجرت کا وعدہ بھی ہوگیا، اب جتنے دِن تک وہ یَوْمُ الزِّیْنَۃ نہیں آیا تھا، تو وہ اسی طرح سے مصر میں رہے ہوں گے، اپنے کرتب تیار کرتے رہے ہوں گے، مقابلے کے لیے پر تولتے رہے ہوں گے، اب وہ سارے کے سارے حالات کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام ایک لاٹھی کو سانپ بناتا ہے، تو ہم جس وقت مقابلے میں جائیں گے تو ہمیں اُس کے اوپر قوم کو

کچھ اضافہ دکھانا چاہیے، تاکہ لوگ یہ کہیں کہ دیکھو! جیسے موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کا سانپ بنا دیا، مقابلے میں جو آئے تھے انہوں نے لاٹھیوں کے بھی سانپ بنا دیے اور رسیوں کے بھی سانپ بنا دیے، اس لیے جب وہ مقابلے میں آئے ہیں تو لاٹھیوں کے ساتھ ساتھ رسّے بھی لے کر آئے، یہ اضافہ کی بات ہے، تاکہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جب ہم لوگوں کے سامنے آئیں گے، تو جو کچھ موسیٰ علیہ السلام دکھاتے ہیں، ہماری طرف سے اُس کے اوپر اضافہ ہونا چاہیے، تفسیری روایات میں آتا ہے جو اکثر اسرائیلیات ہوتی ہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق تاریخ سے ہے، اس لیے ان کے لینے میں اور بیان کرنے میں حرج بھی کوئی نہیں، کہتے ہیں کہ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے تو انہوں نے شکل صورت ہیئت سب موسیٰ علیہ السلام جیسی بنائی ہوئی تھی، تاکہ دیکھنے والے لوگ یہ سمجھیں کہ جیسے یہ ہے ویسے یہ ہیں، ویسے لباس بنالیا، ویسی شکل بنالی، ویسی صورت بنالی، خلط ملط کرنے کے لیے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ظاہری صورت کے اعتبار سے بھی ایک ہی جیسے ہیں، کرتب بھی دونوں نے ایک ہی جیسا دکھایا ہے، ایک نے ایک چیز کا دکھایا دوسرے نے دو چیزوں کا دکھا دیا۔ یہ ڈھنگ ہوتے ہیں اہل فن کے آپس میں مقابلہ کرنے کے، انہی ڈھنگوں کی بنا پر وہ اسی طرح سے لباس، ویسے ہی ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ کر، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اسی آن بان کے ساتھ وہ میدان میں آگئے، اب وہ آئے شاہی اعزاز کے ساتھ، اُن کے ساتھ تھیں شاہی فوجیں، اُن کو بٹھایا گیا ہوگا، اچھی اچھی کرسیوں پر، اچھے اچھے کاؤچ رکھے ہوں گے، صوفہ سیٹ رکھے ہوئے ہوں گے، اس زمانے کے اعتبار سے جو بھی زیب و زینت کا سامان تھا، بڑی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ آئے ہوں گے، اور ساری قوم ان کے ساتھ ہوگی۔ اور ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام درویش اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام، اور جو غلامی کے پٹے ہوئے لوگ ڈرتے ڈرتے جو فرعون کے سامنے جانے کی کچھ تھوڑی بہت جرأت کرتے ہوں گے وہ ساتھ ہوں گے، نہیں تو یہ اکیلا ہی مردِ خدا ہوگا، اور اس کے ساتھ اس کا بھائی، کیونکہ جب سامنے فرعون نے بیٹھنا تھا، اور سارے حکام نے بیٹھنا تھا تو کون نمایاں ہو؟ کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کی پارٹی کے ہیں، اُن کو پتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام شکست کھا گئے تو کل کو ہمارا کیا حال ہوگا؟ غلام قوم جو ہوا کرتی ہے وہ حاکم کے سامنے جلدی نمایاں نہیں ہوا کرتی، پتا نہیں چلنے دیتے کہ یہ اس پارٹی کا ہے، کہ کہیں حکومت ہمیں مخالف سمجھ کر ہمارا رگڑا نہ نکال دے، پھر فرعونِ وقت کے مقابلے میں؟ موسیٰ علیہ السلام کے پاس تو خدائی طاقت تھی، انہوں نے تو کسی سے کیا ڈرنا تھا، لیکن باقی قوم نہیں جرأت کر سکتی تھی، اس لیے صورتحال ایسی ہوگی، کہ اُن کے پیچھے واہ واہ کرنے والے لاکھوں ہوں گے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام خود ہوں گے، یا دو چار نوجوان جو فرعون سے ڈرتے ہوئے ایمان لائے تھے، جس طرح سے سورۂ یونس میں آپ کے سامنے آئے گا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ (سورۂ یونس: ۸۳) فرعون اور اُس کے سرداروں سے ڈرتے ڈراتے کچھ نوجوان جو ایمان لائے ہوں گے، ممکن ہے وہ ساتھ ہوں، ورنہ اکیلا مردِ خدا، اور اُس کا ساتھی اور اُس کا وزیر ہارون علیہ السلام۔ چلے گئے، میدان قائم ہو گیا، اور سارے ملک میں چونکہ تشہیر ہو چکی تھی، کہ حق اور باطل کا فیصلہ ہونا ہے، سچا کون ہے جھوٹا کون ہے؟ تو اس لیے اجتماع جو ہوگا وہ آپ کے سامنے ہی ہے کہ کس طرح سے ہوگا، مقابلہ دیکھنے کے لیے مخلوق کتنی آئی ہوئی ہوگی، آگئے۔ جادوگروں کی طرف سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ جس وقت وہ میدان مقابلہ قائم ہو گیا، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں جادوگر سامنے بیٹھے ہیں، اور اِدھر یہ اکیلا مردِ خدا درویش، پتا نہیں کہ بیٹھنے کے لیے چٹائی بھی ہوگی کہ نہیں ہوگی، مسکنت کی شکل میں نظر آتا ہوگا، اکیلا نظر آتا ہوگا، بظاہر اس کے پاس

کوئی ساز وسامان نہیں ہوں گے، اس طرح سے ہوگا، تو یہ فرق جو ہے یہ بالکل نمایاں ہوگیا مادّی زندگی کا اور غیر مادّی زندگی کا۔ یہی صورت ہوگی۔ جب آگئے، تو سورۂ طٰہٰ میں آپ کے سامنے آئے گا، کہ وہاں اس میدان میں کھڑے ہوکر مقابلہ شروع ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر تقریر کی ہے، لیکن اس تقریر کا رُخ سراسر جادوگروں کی طرف تھا، جادوگروں کو خطاب کرکے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بدبختو! دیکھو! اگر تمہاری وجہ سے قوم گمراہ ہوگئی تو وبال تم پر آئے گا، تم جانتے ہو کہ جادو کے کیا اُصول ہیں، اگر حق تمہارے سامنے نمایاں ہوگیا، اور تم یہ سمجھ گئے تو حق کا اقرار کرنا ہوگا، ورنہ یاد رکھو! تم آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوجاؤ گے، اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر جادوگروں کو خطاب کرکے اس میدانِ مقابلہ میں یہ سورۂ طٰہٰ کے اندر آئے گی، اُن کو خطاب کرکے سمجھایا کہ دیکھو! تم آگئے ہو، اس وقت تم قوم کے نمائندے ہو، اگر حق کا اقرار تم نے نہ کیا، اور حق بات تمہارے سامنے واضح ہوگئی، اور تم نے قبول نہ کیا، تم نے اللہ پر اِفترا باندھا، تو یاد رکھو! ہلاک ہوجاؤ گے، اللہ تعالیٰ تمہارا اِستیصال کردے گا، تم عذاب کے اندر مبتلا ہوجاؤ گے، یہ جو فرض تھا تبلیغ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے براہِ راست جادوگروں کو خطاب کرکے بھی سمجھایا۔ تو جادوگر ساری کی ساری حقیقت سمجھے ہوئے تھے، کہ موسیٰ علیہ السلام کس کا نام لیتے ہیں، کس پہ ایمان کی دعوت دیتے ہیں، آخرت کیا ہے، آخرت کے متعلق کیا کہتے ہیں، یہ ساری کی ساری تقریریں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سنی ہوئی تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگر مقابلے کے لیے آمنے سامنے

مقابلے کا اعلان ہوگیا، وقت ہوگیا مقابلے کا، آئیے میدان میں، اب یہ بھی ایک قاعدہ ہوتا ہے کہ بسااوقات جو پہلے وار کردے اس کا وار کامیاب ہوتا ہے، اور دوسرا اگر اس وار میں سنبھل نہ سکے تو اس کی شکست یقینی ہوجاتی ہے، اس لیے اکثر وبیشتر مناظروں کے اندر بھی لوگ کوشش یہی کیا کرتے ہیں کہ پہلی تقریر کا موقع ہمیں ملے، تاکہ ہم الزامات لگائیں اور دوسرا دفاع کرنے پر مجبور ہو، بسااوقات الزام سمجھ میں جلدآ جایا کرتے ہیں، دفاع جلدی نہیں ہوا کرتا، اب جادوگروں نے سوال اٹھایا کہ پہلے کون اپنا کرتب دکھائے، سوال یہ اٹھا کہ اِبتدا کون کرے گا، موسیٰ! تو ڈالے گا اپنا جادو، یا ہم ڈالیں؟ موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوت حاصل تھی، انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ اگر میں نے پہلے ڈال دیا اور یہ آگے سے کچھ دکھا نہ سکے، پھر ان کو بہانہ مل جائے گا کہ چونکہ پہلے اُس نے کردیا تھا اس لیے ہمارا جادو کامیاب نہیں ہوا، تو کیوں ان کو خواہ مخواہ ایک اعتراض کا موقع دیا جائے، پوری لاپروائی کے ساتھ کہہ دیا کہ بھائی! مجھے کوئی اعتراض نہیں، پہلے تم دکھالو، یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام پہلے وار کردیتے اور اُن کا جادو آگے چلتا ہی نا، تو اس طریقہ سے باطل کی شکست نمایاں نہ ہوتی، دوسرا کہنے والا کہہ سکتا تھا، کہ شاید چونکہ انہوں نے وار پہلے کیا ہے اس لیے وہ غلبہ پاگئے، اور اگر اُن کو وار کرنے کا پہلے موقع مل جاتا تو وہ غالب آجاتے، پھر ایک اشتباہ کی بات ہوسکتی تھی، اور اُن کا جادو جو تھا پوری طرح سے مقابلے میں نمایاں نہ ہوتا، تو اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورے استغناء کے ساتھ کہہ دیا کہ بھائی! تم ہی دکھاؤ، کیا دکھاتے ہو، ڈالو کیا ڈالتے ہو۔ جس وقت یہ کہا تو انہوں نے اسی طرح سے جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام معجزہ دکھایا کرتے تھے، جتنے جادوگر آئے ہوئے تھے سحرۃ جمع کا صیغہ ہے بہت جادوگر آئے ہوں گے مقابلے میں، انہوں نے اپنی لاٹھیاں جو ہاتھ میں

پکڑی ہوئی تھیں، اور جور سے ساتھ لائے تھے اُٹھا کر یوں میدان میں پھینک دیے، جس وقت میدان میں پھینک دیے تو قرآن کہتا ہے سَحَرُوٓا اَعْيُنَ النَّاسِ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا تھا، اس جادو کا کیا اثر ہوا یُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (سورۂ طٰہٰ:۶۶) کہ موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ بات آنے لگ گئی کہ یہ بھاگے پھر رہے ہیں، ایسی چشم بندی کر دی کہ لاٹھیاں بھی اسی طرح سے بھاگتی ہوئی نظر آئیں جس طرح سے سانپ بھاگتا ہے، اور رسے بھی اس طرح سے بھاگتے ہوئے نظر آ رہے ہیں جس طرح سے کہ سانپ بھاگتا ہے، سَحَرُوٓا اَعْيُنَ النَّاسِ سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اُن کے جادو کا اثر لوگوں کی آنکھوں پر تھا، کہ ایسا تصرف کیا، تصرف کرنے کے ساتھ اُن کو لاٹھیاں سانپ کی شکل میں نظر آنے لگ گئیں، اور رسیاں بھی سانپ نظر آنے لگ گئیں، ایسا جادو کیا، بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ: بڑا جادو لائے، لوگوں کی آنکھیں بدل کر رکھ دیں۔ اب وہ ساری کی ساری قوم چیخ اٹھی ہوگی، واہ واہ کر کے کہا ہوگا، کہ دیکھو! وہ تو ایک لاٹھی کو سانپ بناتے تھے، ہمارے جادوگروں نے کتنے سانپ بنا دیے، اور اس میں اضافہ کر دیا، کیونکہ مقابلے میں پہلوان کے ساتھ جو پیچھے ہوا کرتے ہیں، وہ شور زیادہ مچایا کرتے ہیں، نعرے وہی پچھلے لگایا کرتے ہیں، یہ میں ایسے نہیں کہہ رہا، یہ قرآنِ کریم کے اشاروں کی تفصیل ہے، لاٹھیاں ڈالیں، رسیاں ڈالیں، دیکھنے والوں کو وہ سانپ نظر آنے لگ گئے، اور ساتھ انہوں نے نعرہ لگایا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ (سورۂ شعراء:۴۴) فرعون کی عزّت کی قسم! بے شک ہم غلبہ پا گئے۔ جس وقت یہ جادو ان کا سامنے کامیاب سا نظر آیا، کہ سانپ نظر آ گئے تو پھر کہا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ فرعون کی عزّت کی قسم! یعنی "فرعون کی جے" پکار دی، اور اس کی فتح کا اعلان کر دیا، کہ فرعون کی عزّت کی قسم! ہم غلبہ پا گئے، اس طرح سے کر کے ساتھ ہی شور مچایا۔

سوال:- حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سانپ چلتے ہوئے نظر آ رہے تھے؟

جواب:- جی ہاں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح سے معلوم ہو رہا تھا، یہ دیکھو! میں آپ کی خدمت میں عرض کروں، آگے لفظ آئیں گے قرآنِ کریم میں کہ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى (سورۂ طٰہٰ:۶۷) کہ موسیٰ علیہ السلام تو اپنے دل کے اندر خوف محسوس کرنے لگ گئے، وہ خوف محسوس کس طرح سے کرنے لگ گئے، وہ اس طرح سے ڈر گئے کہ یہ کیا معاملہ ہو گیا، اُن کو پتا نہیں کہ انہوں نے کیا کرنا تھا، جادوگروں کو تو پتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کیا کرنا ہے، موسیٰ علیہ السلام کو پتا نہیں تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے، جب یکدم وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی شکل میں نظر آئیں تو موسیٰ علیہ السلام تو دھڑک گئے اندر سے، وہ دھڑک گئے کس طرح سے؟ کیا ہوا؟ کہ یا اللہ! یہ کیا قصہ ہوا، اب میں بھی لاٹھی پھینکوں گا، وہ بھی سانپ بنے گی، تو قوم فرق کس طرح سے کرے گی کہ معجزہ کیا ہے اور جادو کیا ہے؟ لوگوں کو تو دونوں چیزیں ایک ہی جیسی نظر آئیں گی، میں لاٹھی ڈالوں گا تو وہ بھی سانپ نظر آئے گا، اور انہوں نے جو لاٹھیاں ڈالی ہیں یہ بھی سانپ نظر آنے لگ گئے ہیں، تو یہ حق اور باطل کا فرق کیسے ہوگا؟ اس بات پہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں دھڑکا پیدا ہو گیا، چونکہ پہلے معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کرنا کیا ہے، موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تو انہوں نے دیکھا ہوا تھا، سنا ہوا تھا کہ یہ یوں کرتے ہیں، باقی یہ جادوگر کیا کریں گے یہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے نہیں تھا، اس لیے جب یہ صورت سامنے آئی تو قرآن کہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو دل میں ڈر گئے، ڈرنے کی وجہ یہ ہے جو میں عرض کر رہا ہوں، کہ جو کچھ انہوں نے دکھایا ہے، قوم کو نظر یوں ہی آ رہا ہے کہ سانپ بن گئے،

میں لاٹھی ڈالوں گا وہ بھی تو سانپ ہی بنے گا، تو یہ جاہل عوام کالانعام کس طرح سے فرق کریں گے کہ یہ جادو ہے اور یہ حقیقتاً معجزہ ہے، یہ لوگ فرق کس طرح سے کریں گے، یہ تو حق اور باطل میں اشتباہ ہو جائے گا۔

جادوگروں کی شکست

اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل کے اندر یہ خوف سا پیدا ہوا، تو فوراً اللہ کی طرف سے بات آئی، اللہ تعالیٰ کہتے ہیں، کہ ہم نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو ڈال دے، ابھی نگل جائے گا سب کو، تو موسیٰ علیہ السلام نے جو اپنی لاٹھی پھینکی تو لاٹھی پھینکنے کا اثر یہ ہوا کہ اُس نے جو یوں کر کے منہ کھولا تو جتنے میدان میں پھر رہے تھے سب کو نگل گیا دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان صاف کر دیا، جب سارا میدان صاف کر دیا، بعد میں ہاتھ جو پکڑا تو اپنی لاٹھی ہاتھ میں ہے باقی سب کچھ غائب، اب یہ قصہ جو ہوا تو قرآن کہتا ہے فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وہیں سارے ہار گئے، لیکن آپ ذرا ذِلّت کا اندازہ کیجئے کہ اس فرعون کو فرعون کی ساری قوم کو اور سارے کے سارے ملک کے قبطی باشندوں کو کتنی ذِلّت اس میدان میں اٹھانی پڑی ہوگی، کہ ساری قوم دیکھ رہی ہے کہ یہ تو غلبہ پا گئے، اور وہ سارے کے سارے ہار گئے، اُن کے پلّے تو رہا ہی کچھ نہیں۔ اس میں مفسرین کی دونوں رائیں ہیں، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سانپ سب کو نگل گیا، تو نگلنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسیاں سانپ جو کچھ تھا وہ سب کو نگل گیا، کوئی چیز باقی نہیں رہی (عام تفاسیر)، اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ نگلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا میدان میں جانا ہی تھا، کہ اُن کے جادو کا اثرات ختم ہو گئے، لوگوں کو نظر آنے لگ گیا کہ یہ رسیاں ہیں یہ ڈنڈے ہیں، اور یہ حقیقت میں سانپ ہے جو اس طرح سے پھر رہا ہے، اس کے جانے کے ساتھ ان کا سارا جادو ختم ہو گیا، گویا کہ جو ہیئت انہوں نے بنائی تھی، جو شکل انہوں نے اختیار کی تھی اس کو نگل گیا، یعنی اس کے جانے کے ساتھ سب ختم ہو گیا۔[1] پہلا معنی زیادہ واضح ہے کہ وہ سانپ جو پھرتے ہوئے نظر آرہے تھے، جس طرح سے ایک بڑا سانپ چھوٹے سانپ کو کھا جاتا ہے، اسی طرح سے موسیٰ علیہ السلام کا اژدھا منہ کھول کر سب کو نگل گیا۔

جادوگروں کا ایمان قبول کرنا اور اس کی وجہ

اب جاہل کے سامنے فرق کرنا تو مشکل ہوتا، وہ تو یہی سمجھے گا کہ یہ بڑا جادوگر ہے، اس کا جادو چھوٹے جادوؤں پر غالب آگیا، وہ تو زیادہ سے زیادہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ بڑا جادوگر ہے، اور یہ چھوٹے جادوگروں پر غالب آگیا، لوگوں کے ذہن میں تو یہی آتا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ صاحب فن حقیقت کو سمجھتا ہے، جب جادوگروں نے یہ نقشہ دیکھا تو نقشہ دیکھتے ہی وہ دیانت داری کے ساتھ سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں، کیونکہ جادوگر کے سامنے تو جادو کے اُصول ہوتے ہیں، غیر جادوگر تو فرق نہیں کر سکتا۔ آپ علم والے ہیں، آپ کے سامنے کوئی بات کرے گا تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ نحو کا مسئلہ بیان کر رہا ہے، صرف کا مسئلہ بیان کر رہا ہے، معانی کا مسئلہ بیان کر رہا ہے، یا یہ حدیث کے مسئلے کی بات ہے یا یہ تفسیر کی بات ہے۔ لیکن جو جاہل ہوتے ہیں جن کے سامنے علم تو ہوتا نہیں، آپ صرفی صیغہ بیان کریں گے وہ کہیں گے قرآنِ کریم کی تفسیر کر رہا ہے، اور آپ قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھیں گے وہ

(۱) تفسیر عثمانی سورۂ شعراء آیت ۴۵ بحوالہ ابن عربی۔

کہیں گے کہ پتا نہیں کیا کر رہا ہے، حدیث آپ پڑھیں گے تو حدیث اور قرآن میں اُن کو کوئی فرق نہیں ہوتا، یعنی اگر آپ کی منطق کی کتاب کا کوئی ورق پھٹا ہوا کسی جگہ پڑا ہوا ہو، اور وہ دیہاتی کے ہاتھ میں آ جائے تو وہ چوم چوم کر، چاٹ کر چاٹ کر، سر پہ رکھ کر کے، پتا نہیں اُس کو کہاں لے جائے گا، اور آپ جس وقت اُس کو دیکھیں گے کہ اس میں لکھا ہوا کیا ہے؟ تو اس میں جنس کی تعریف لکھی ہوئی ہے، نوع کی تعریف لکھی ہوئی ہے، فصل کی تعریف لکھی ہوئی ہے، تو جس طرح سے ایک اخباری کاغذ ہوتا ہے، آپ ایسے کر کے پھینک دیں گے۔ اہل علم فرق جانا کرتے ہیں، دوسرا آدمی فرق نہیں جانتا، تو جس وقت ایک آدمی آپ کے سامنے جملہ کی ترکیب کر رہا ہے، تو آپ سمجھیں گے کہ یہ نحو کا مسئلہ ہے منطق کا نہیں، اور جہاں وہ مقدمے جوڑ کر نتیجہ نکال رہا ہے تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ منطق کا مسئلہ ہے یہ نحو کا نہیں، جہاں وہ لفظوں کی نشست بیان کر رہا ہے کہ دیکھو! یہ جملہ ایسے بولا، ایسے نہیں بولا، تو آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ فصاحت بلاغت کا مسئلہ ہے، صرف نحو کا نہیں، اور جہاں آپ اسماء الرجال پر بحث کر رہے ہوں گے، اور روایت بیان کر رہے ہوں گے تو سمجھ جائیں گے کہ یہ حدیث کا مسئلہ ہے، یہ قرآنِ کریم کی آیت نہیں، آپ فرق کرتے ہیں۔ اسی طرح سے جب ان جادوگروں نے دیکھا تو جادوگر اپنے فن کے لحاظ سے سمجھ گئے، کہ بھائی! یہ مسئلہ اس فن کا نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے یہ اس فن کا مسئلہ نہیں، جادوگر فرق کر گئے، جب جادوگر فرق کر گئے، تقریریں پہلے سنی ہوئی تھیں، حالات سارے کے سارے سامنے تھے، چونکہ ان کے سامنے فرعون جیسی بات تو تھی نہیں، کہ اپنا تخت بچانا ہے، اس لیے کہ یہ مزدور قسم کے لوگ تھے، پیٹو قسم کے، پیٹ پرست قسم کے، لیکن جب ان کے سامنے حقیقت کھلی تو جو رکاوٹیں بڑے لوگوں کے سامنے ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کے سامنے نہیں ہوتیں، یہ تو فوراً پکار اُٹھے کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ کہتا ہے صحیح کہتا ہے، یہ رَبّ العالمین کا رسول ہے، ہم نے رَبّ العالمین کو مان لیا، فوراً انہوں نے اپنی ہار مان کر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا اعلان کر دیا، گویا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں کے ساتھ بات تفصیل سے اُن کے سامنے پہلے آئی ہوئی تھی، لیکن ابھی قبول نہیں کی تھی، اور جس وقت معجزہ دیکھا اور سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں تو اُن کے دل میں آ گیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے یہ صحیح ہے، یہ کسی غیبی طاقت کا کرتب ہے، یہ جادو کا مسئلہ نہیں ہے، فوراً انہوں نے ایمان کا اعلان کر دیا، تو گویا کہ نیک نیت ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اُن کو اپنی ہار ماننے میں اور حق کے قبول کرنے میں کوئی عار نہیں آئی۔ تو جس وقت جادوگروں نے ایمان کا اعلان کیا، رَبّ العالمین کے ساتھ ساتھ رَبّ موسیٰ وھارون کا لفظ بڑھا دیا کہ کہیں فرعون یہ نہ سمجھے کہ رَبّ العالمین سے میں ہی مراد ہوں، کیونکہ وہ بھی تو اپنے آپ کے متعلق رَبّ ہونے کا اعلان کر رہا تھا، اس لیے ربّ موسیٰ وھارون کہہ دیا اور پھر فوراً سجدے کے اندر گر گئے، سجدے میں گر کر گویا کہ اللہ کے سامنے اپنی توبہ کا اعلان کیا، اور موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کیا، اور قرآن کہتا ہے اُلْقِيَ السَّحَرَةُ: ڈال دیے گئے، ڈال دیے گئے کا مطلب یہ ہے کہ حق کے سامنے وہ اس طرح سے مجبور ہوئے گویا کہ اُنہیں اختیار ہی نہیں رہا، اس کے بغیر اُن کے سامنے کوئی ان کے بس میں بات نہیں تھی کہ مان جائیں کہ موسیٰ ٹھیک کہتا ہے، باطن کی کیفیت سے وہ اس طرح سے مجبور ہوئے، سجدے میں گر گئے، جب سارے کے سارے جادوگر ایمان بھی لے آئے، سجدے میں گر گئے تو اب بتاؤ کہ جب پہلوان خود کہہ دے کہ دوسرا مجھ سے طاقت میں زیادہ ہے، میں ہار گیا، وہ اپنی ہار کا اعلان کر دے تو پیچھے کوئی تاویل کر سکتے ہیں؟ ورنہ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس نے الیکشن میں شکست کھائی ہے وہ

کبھی کھل کر نہیں کہا کرتا کہ میں شکست کھا گیا، وہ کہتا ہے دھاندلی ہوئی ہے، اگر انصاف کے ساتھ الیکشن ہوتا تو میں کامیاب ہوں، فلاں نے گڑبڑ کی ہے، افسر نے گڑبڑ کی ہے، در پردہ پولیس نے اُس کی حمایت کی اور لوگوں کو دبایا، یوں ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی الیکشن میں شکست کھانے کے بعد شکست خوردہ فریق ہزار بہانے بناتا ہے، لیکن اگر لیڈر، مان جائے کہ الیکشن انصاف سے ہوا، میں ہار گیا، تو پھر پیچھے قوم کے لیے کچھ کہنے کا جواز ہوتا ہے؟ پہلے تو لیڈر بیان دیا کرتا ہے کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، میرے ساتھ دھاندلی ہوئی ہے، افسروں نے اُس کی حمایت کی ہے، پولیس نے در پردہ اس کی حمایت کی ہے، پہلے لیڈر بیان دیا کرتا ہے اور پیچھے قوم اچھلا کرتی ہے، اس لیے ذہنی طور پر وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اور اپنی خفگی کو ان تاویلوں کے ساتھ مٹا لیتے ہیں، لیکن جب لیڈر کھل کر بیان دے دے کہ الیکشن انصاف سے ہوا ہے، اور وہ واقعی جیت گیا میں ہار گیا، تو لیڈر کے ہار جانے کے بیان کے بعد پھر قوم کے پلے کیا رہ گیا۔ تو یہاں صورتِ حال وہی پیش آئی کہ جو مقابلے میں گئے تھے وہی مان گئے کہ ہم ہار گئے، اور سجدہ ریز ہو گئے، اور موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اقرار کر گئے، اور وہی موسیٰ علیہ السلام کی باتوں پر ایمان کا اعلان کر گئے، اب فرعون یا فرعونیوں کے پاس تاویل کی کیا گنجائش رہ گئی تھی، اب وہ اپنے پہلوانوں کے لیے کوئی تاویل تو نہ کر سکے۔

جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون کی سیاسی چال

لیکن اب نقشہ اُن کے سامنے آ گیا کہ اب تو تختہ اُلٹا ہی اُلٹا، کہ ہم تو سمجھے تھے کہ موسیٰ شکست کھا جائے گا، چلو! یہ بات یہیں دب جائے گی، اب ساری دنیا کو اکٹھا کر کے اِس کے مقابلے میں ہم ذلیل ہو گئے، یہ تو سارا ملک اِس کے پیچھے لگ جائے گا، اور جو انقلاب کئی سالوں کے بعد آنا تھا ہماری اس تدبیر کے ساتھ وہ تو ایک دن میں آ گیا، اب اُن کے سامنے وہ بات آ گئی۔ لیکن یہ سیاسی لیڈر اپنے اغراض میں بڑے شیطان ہوتے ہیں، آخر وہ بھی تو وقت کا فرعون تھا، اُس نے فوراً دوسرا پینترا بدلا، اب اُس کا غصہ موسیٰ علیہ السلام پر نہیں ہے، اب وہ اپنے ان وظیفہ خواروں کو خطاب کر کے کہتا ہے، کہ اچھا! میری جازت سے پہلے ہی مان لیا؟ مجھ سے پوچھا ہی نہیں؟ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہاری آپس میں سازش ہے، اب اس نے رنگ یہ دیا کہ یہ تم نے سازش کی ہے، اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ تو یہاں تو یہ الفاظ ہیں، اور دوسری جگہ قرآنِ کریم میں آئے گا اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (سورۂ طٰہٰ و سورۂ شعراء) یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، یہ موسیٰ اُستاذ ہے، اور تم سب اس کے شاگرد ہو، اور تمہاری آپس میں سازش ہے، تم نے اس طرح انڈر گراؤنڈ حکومت کے خلاف سازش کی ہے، اندر اندر خفیہ طور پر سازش کی ہے، اور اُس کا پلان تم نے یوں بنا دیا، تمہارا منصوبہ یہ ہے کہ پہلے تمہارا اُستاذ جا کر چیلنج کر دے، اور پھر تم مقابلے میں آ جاؤ، اور پھر تم میدان میں شکست کا اعتراف کر دینا تا کہ لوگ ذہنی طور پر فوراً متاثر ہو کر فرعون کے خلاف ہو جائیں، یہ تو تمہاری سازش ہے جو تم نے مل جل کر کی ہے، اور یہ تمہارا بڑا ہے جس کو تم نے پہلے بھیجا، اور تم سارے اس کے شاگرد ہو، دیکھو! پورا اُس کو سیاسی رنگ دے دیا، اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ یہ تمہارا بڑا ہے، یہ تمہارا اُستاذ ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اور تم نے در پردہ سازش کی ہے، سازش یہی کہ انڈر گراؤنڈ، اندر اندر، خفیہ خفیہ سارا معاملہ طے کر لیا، اس کو پہلے بھیج دیا اور پلان یوں بنا لیا کہ مقابلہ ہو گا، مقابلہ میں ہم فوراً شکست کھا جائیں گے، جب ہم فوراً

شکست کھا جائیں گے تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ موسیٰ صحیح ہے، سارے ہی اس کو پیر مان لیں گے، اور سارے ہی اس کے پیچھے لگ جائیں گے، اور اس طرح سے قبطیوں کا، فرعون کا تختہ اُلٹنا آسان ہو جائے گا، یہ سازش ہے جو تم کر کے آئے ہو۔ فوراً اس طرح سے لوگوں کے ذہن میں بات ڈال دی، کہ یہ تو تمہارا تختہ اُلٹنا چاہتے ہیں، تمہاری قوم کی حکومت ختم کرنا چاہتے ہیں، یہ تو تمہیں یہاں سے نکال دیں گے، جب یہ نقشہ سامنے کھینچ دیا جائے گا تو کم از کم قبطی تو موسیٰ علیہ السلام سے متاثر نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ سیاسی طور پر مدمقابل آ گئے، کہ جس طرح سے ہم نے اِن کو غلام بنا رکھا ہے، آئندہ یہ ہمیں غلام بنائیں گے، یوں کر کے اپنی ساری کی ساری پارٹی کو مشتعل کر دیا اور اپنے قبطی عوام کو اسرائیلیوں کے خلاف کھڑا کر دیا، یہ اس نے سازش کھیلی، کہ فوراً یہ سیاسی پوائنٹ اختیار کر لیا، اور یوں اپنی قوم کے ذہن پر اثر انداز ہو گیا، قرآنِ کریم میں ہے فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ (سورۂ زخرف: ۵۴) اس نے اپنی قوم کو خفیف العقل بنا لیا، وہ سارے کے سارے ہلکے پھلکے اُس کے پیچھے لگ گئے، کسی نہیں سوچا کہ اتنا کھلا مقابلہ، اور اتنا حق اور باطل کا مقابلہ، حق بھی نمایاں اور باطل بھی نمایاں، یہ سازش کس طرح ہو سکتی ہے، یہ بات کسی نے سوچی ہی نہیں، بس ساری کی ساری قوم اُس کے پیچھے لگ گئی۔ یہ تو پہلے قوم پر اثر ڈالا، اور قوم پر اثر ڈالنے کے ساتھ ساتھ پھر وہ اُن جادوگروں کو کہتا ہے "پتا چل جائے گا" یہ ہوتا ہے دھمکانے کا انداز، جب یوں ابہام کے ساتھ کہا جائے "بہت اچھا! کوئی بات نہیں، پتا چل جائے گا، یہ جو سازش کر کے آئے ہو، اندر اندر سے ایک دوسرے سے تمہاری ملی بھگت ہے، اور تم تختہ اُلٹنا چاہتے ہو، تم حکومت کے باغی ہو، جب حکومت کے باغی ہو تو میں ابھی تمہیں گرفتار کر کے تمہارے اوپر بغاوت کا مقدمہ چلاتا ہوں، اور ملک کے قانون میں جو بغاوت کی سزا ہے وہی تمہارے اُوپر لگے گی، وہ سزا کیا ہے؟ کہ جو بھی باغی پکڑا جائے اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے ہیں، کاٹنے کے بعد اُس کو سُولی چڑھایا جاتا ہے، اور لٹکا کے مارا جاتا ہے، اسی طرح سے میں بھی تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹوں گا اور تمہیں سُولیوں پر لٹکاؤں گا، یہ گویا کہ باغیوں والی سزا کی دھمکی فرعون نے اُن کو دے دی کہ تم سب باغی ہو، اور اندر اندر تم نے حکومت کے خلاف سازش کی ہے۔

ایمان کی نشانی

اب ذرا ایک بات کی طرف توجہ فرمائیے......! یہ وہی جادوگر ہیں جو کل وظیفے کا مطالبہ کر رہے تھے، جن کے سامنے اپنے پیٹ کے علاوہ کچھ نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے جس وقت اُن کو آخرت کا یقین آیا، اور اُن کے دل کے اندر واقعتاً حق اُتر گیا، اب دُنیا کی بڑی سے بڑی دھمکی ان کے قدم نہیں ہلا سکی، یہ ہے ایمان کی شان کہ جب قلب کے اندر ایمان اُتر آتا ہے، تو پھر نہ انسان لالچ سے متاثر ہو، نہ کسی کے ڈرانے سے متاثر ہو، جب حقیقت سامنے آ گئی اور دُنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی بقاء جو موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے انہوں نے بھی ہوئی تھی، جب اُن کے قلب کے اندر اُتر گئی، وہ سمجھے کہ اب یہ ایک دو دن کی بات ہے، فرعون مار بھی دے گا تو کیا ہے، کم از کم آخرت تو سدھرے گی، اس لیے بڑی سے بڑی دھمکی بھی اُن کے قدم ڈگمگا نہیں سکی، نبی کی صحبت میں ایمان لانے والوں اور دوسروں کے درمیان میں یہی فرق ہوتا ہے، ہم برسوں سے "لا الٰہ الا

اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھتے ہیں، برسوں سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں، لیکن اگر کسی معمولی حکومت کی طرف سے یا کسی اور طرف سے دھمکی آتی ہے تو ہمارے پیچ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں، لیکن نبی کی صحبت میں ایمان لانے والے جو ہوتے ہیں، وہ ایسے پختہ ہوتے ہیں کہ وقت کا فرعون جس کے متعلق پتا تھا کہ کل تک ہم اس کو رَبّ کہتے رہے ہیں، اور معلوم تھا کہ اس کے فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا، اگر اس نے سزا کا فیصلہ کر دیا تو وہاں کوئی ہائی کورٹ نہیں جہاں ہم اپیل دائر کر دیں گے اور نظر ثانی کے لیے کہہ دیں گے، یا کسی دوسری طاقت کا ہم سہارا لے لیں گے، کوئی بات نہیں ہے۔ اور یہ جو کچھ منہ سے کہے وہ کر سکتا ہے، اس قسم کا مطلق العنان ظالم قسم کا حاکم ہے، دھمکی بھی اُس نے دی اور دی بھی انتہائی اشتعال کی حالت میں، بغاوت کا اُن پر کیس کیا، اور یہ سزا سنا دی۔

اہلِ حق کی نظر اللہ پر ہوتی ہے

لیکن وہ آگے سے اتنے پختہ ثابت ہوئے، کہنے لگے فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (سورۂ طٰہٰ) اب تو جو تجھ سے ہوتا ہے کر لے، یہ لفظ سورۂ طٰہٰ میں آئیں گے، جو تجھ سے ہوتا ہے کر لے، اب تو ہم نے حقیقت مان لی، حقیقت ہمارے سامنے کھل کر آ گئی، اب تو ہم اللہ کے سامنے توبہ واستغفار کرتے ہیں، کہ اس حق کے مقابلے میں تو ہمیں جو اٹھالایا تھا اللہ ہمارا یہ جرم معاف کر دے، تیرے کہنے کی بنا پر ہم نے جو اس حق کا مقابلہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے اس جرم کو معاف کر دے، لفظ وہاں آئے گا: مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ (سورۂ طٰہٰ: ۷۳) کہ جو تو نے ہمیں مجبور کیا ہے، تیرے مجبور کرنے سے جو ہم اس حق کے ساتھ ٹکرا گئے، ہم اللہ سے معافی مانگتے ہیں کہ اللہ اسے معاف کر دے۔ باقی تو کیا کر سکتا ہے، اب فرعون کو وہ جادوگر کہہ رہے ہیں کہ تو کیا کر سکتا ہے، اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (سورۂ طٰہٰ: ۷۲) جو تیرا فیصلہ ہوگا وہ اسی دنیوی زندگی پر ہے نا؟، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ کہ مر جائیں گے، باقی آگے جانا ہم نے اپنے رَبّ کے پاس ہے، اور وہاں جا کے حق پرستوں کے لیے جو کچھ ہے وہ ہمیں مل جائے گا، ان کا ایمان اتنا پختہ ہو گیا کہ فرعون کی کوئی دھمکی اُن کے قدم نہ ہلا سکی۔ لیکن پھر وہی نیک بندوں کی طرح اللہ کی طرف رجوع بھی ہے، کہ یا اللہ! اس بات پہ اب ثابت قدم تو ہی رکھنا، اس کے خوف سے، اس کے لالچ سے، اس کے ڈر سے کہیں ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔ اہلِ حق کی شان یہی ہوا کرتی ہے کہ اپنے اوپر اعتماد کرنے کی بجائے اُن کی نظر اللہ پر ہی ہوتی ہے۔ جس طرح سے آیا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا اے اللہ! ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمیں ثابت قدم رکھنا، یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے دُعا کی۔ یہ حاصل ہے اس رکوع کے مضمون کا، ذرا سرسری طور پر پھر نظر ڈال لیجئے، تا کہ آپ کے سامنے تقریر الفاظ پر منطبق ہو جائے۔

خلاصۂ آیات

قومِ فرعون میں سے سرداروں نے کہا کہ بیشک یہ البتہ جادوگر ہے علم والا، ارادہ کرتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہارے علاقے سے، یعنی یہ انقلاب لانا چاہتا ہے، حکومت پہ قبضہ کرنا چاہتا ہے، تمہیں یہاں سے نکال دے گا، خود حکومت پہ قابض ہو جائے

گا،تمہارا کیا مشورہ ہے؟ تمہاری کیا صلاح ہے؟ آپس میں تم کیا کہتے ہو؟ وہ کہنے لگے کہ ڈھیل دے دے اس موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو، اور بھیج دے شہروں میں جمع کرنے والے، لے آئیں گے وہ ہر علم والے جادوگر کو۔ آ گئے جادوگر فرعون کے پاس (یہ تو وہی بات ہے نا، کہ واقعہ نقل کرتے ہوئے تو مختصر الفاظ ہوتے ہیں، باقی معلوم نہیں کتنے مہینوں کا فصل تھا، کتنی دیر کا فصل تھا، اس میں یہ ساری کارروائی چلتی رہی) آ گئے جادوگر فرعون کے پاس، کہنے لگے بیشک ہمارے لیے البتہ اجر ہے؟ مزدوری ہے؟ اگر ہم غلبہ پانے والے ہو گئے۔ فرعون نے کہا کہ ہاں، اور بیشک تم البتہ مقربین میں سے ہو۔ نَعَمْ میں اجر کا بھی اقرار کر لیا، اور آگے حبِ جاہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو جاہ کی طمع بھی دلا دی، کہ وظیفہ بھی ملے گا اور تم میرے بڑے مقرب بن جاؤ گے۔ قَالُوْا یٰمُوْسٰی: وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ! یا تو تو ڈال، یا ہم ہو جائیں ڈالنے والوں میں سے، تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اَلْقُوْا: تم ہی ڈالو۔ مفعول یہاں محذوف ہے، یعنی جو کچھ ڈالنا چاہتے ہو ڈالو، جو کچھ لیے کھڑے ہو، جو کچھ میدان میں لانا ہے لے آؤ۔ فَلَمَّآ اَلْقَوْا: جس وقت انہوں نے ڈال دیا تو لوگوں کی آنکھوں پہ جادو کر دیا، وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ: اور انہیں ڈرا لیا، وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ: اور بڑا جادو لے آئے۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی یعنی اس کے دل میں بات ڈالی، اور اسے کہا کہ اَلْقِ عَصَاكَ: تو بھی اپنی لاٹھی ڈال دے، پس اچانک نگل جائے گی وہ جو کچھ وہ بناتے ہیں۔ حق ثابت ہو گیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے بے اثر ہو گیا۔ بَطَلَ کا معنی ہے غلط ہو گیا، بے اثر ہو گیا۔ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ: اس موقع پر وہ مغلوب ہو گئے، وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ: اور ذلیل ہو کر واپس لوٹے۔ اور جادوگر سجدے میں گرا دیے گئے، کہنے لگے ہم ایمان لے آئے...... گویا کہ سجدہ کر کے عملاً اظہار کیا، اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مان لیا، موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کر لیا، اور اپنی زبان سے بھی کلمہ پڑھا، اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ہم رَبّ العالمین پہ ایمان لے آئے، موسیٰ اور ہارون کے رَبّ پہ ایمان لے آئے۔ یہ بدل اس لیے ذکر کر دیا کہ کہیں فرعون یہ نہ سمجھے کہ رَبّ العالمین سے میں مراد ہوں۔ تو معلوم ہوتا ہے نا، کہ انہوں نے رَبّ العالمین کو سُن لیا تھا موسیٰ علیہ السلام سے، اور اس قسم کی ایمان کی باتیں جتنی ہیں وہ سب ان کے سامنے آ گئی تھیں، اور انہوں نے یہ جو کہا کہ تیرا فیصلہ اسی دنیا میں چلتا ہے، ہم اپنے رَبّ کی طرف لوٹ کے جائیں گے، یہ آخرت کا عقیدہ ہے، تو آخرت کا عقیدہ بھی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے سن لیا تھا، اور یہ تفصیلات ان کے سامنے آ گئی تھیں موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کی۔ فرعون کہنے لگا کہ تم ایمان لے آئے اس کے ساتھ قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟ بیشک یہ البتہ سازش ہے جو تم نے کر لی۔ مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں۔ یہ کوئی خفیہ تدبیر ہے جو تم نے کی ہے شہر میں، مقصد تمہارا یہ ہے کہ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا: تا کہ اس شہر سے تم یہ شہر والوں کو نکال دو۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: تمہیں عنقریب پتا چل جائے گا۔ یہ دھمکی ہے۔ ضرور کاٹوں گا میں تمہارے ہاتھوں کو (یہ باغی کی سزا ہے، یعنی تم باغی ہو، تم حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہو، تو جو باغیوں والی سزا ہے وہ تمہیں دوں گا) کاٹوں گا میں تمہارے ہاتھوں کو اور پاؤں کو مخالف جانب سے، پھر البتہ تم سب کو سُولی چڑھا دوں گا۔ اور سُولی چڑھانے کے [illegible] جیسے دوسری جگہ لفظ آیا لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (سورۂ طٰہٰ: ۷۱) ''فی'' وہاں ''علیٰ'' کے معنی میں ہے، جیسے نحو کی کتابوں میں پڑھا ہوگا،

یعنی کھجور کے تنوں پر تمہیں لٹکاؤں گا، کھجوروں کے اونچے اونچے تنے، اوران کے اوپر تمہیں لٹکاؤں گا۔ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ: پھر میں تم سب کوسُولی چڑھادوں گا۔ وہ کہنے لگے اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ: دیکھو! یہ آخرت کے عقیدے کا اظہار کیا، تو موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں سے پہلے اس عقیدے کو سمجھا ہے، تبھی تو اس کا اظہار کررہے ہیں۔ ہم اپنے رَبّ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ باقی تو جو ہمیں یہ سزادے گا، ہمارا کوئی جرم نہیں ہے، اللہ جانتا ہے کہ ہمارا کوئی جرم نہیں، سوائے اس کے کہ ہم نے حق کو قبول کیا ہے، نہ ہماری تیرے خلاف کوئی سازش ہے، نہ ہم کوئی مشورہ کرکے آئے ہیں کہ تیرا تختہ اُلٹنا ہے، نہ ہمارا یہ اُستاذ ہے، اور نہ ہم نے اس کواس لیے بھیجا ہے کہ تو پہلے جا کر چیلنج کر، ہم مقابلے میں آئیں گے، ہار جائیں گے، کوئی سازش نہیں، کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اللہ کی آیات ہمارے سامنے آگئیں، ہم نے مان لیا، بس یہ ایک جرم ہے جس کا ہم سے تو انتقام لینا چاہتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی جرم نہیں۔ تو انتقام کس چیز کا ہم سے لیتا ہے؟ اس بات کا کہ ہم اپنے رَبّ کی آیات پہ ایمان لے آئے؟ یعنی یہ کوئی جرم ہے؟ جس کی تو ہمیں سزادینا چاہتا ہے۔ باقی تو ہم پہ سازش کا الزام لگاتا ہے، بغاوت کا الزام لگاتا ہے، کوئی سازش نہیں، کوئی اندر پروگرام نہیں تھا، حق واضح ہوگیا تو ہم نے مان لیا، تو یہ کون سا عیب ہے جس کی بنا پر تو ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ ''نہیں انتقام لیتا تو ہم سے مگر اس بات کا کہ ہم ایمان لے آئے اپنے رَبّ کی آیات پر جب وہ ہمارے سامنے آگئیں۔'' پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کی کہ اے ہمارے پروردگار! ڈال دے ہم پر صبر، اور وفات دے ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى
قوم فرعون میں سے بڑے لوگوں نے کہا کیا چھوڑتا ہے تُو موسیٰ کو اور اُس کی قوم کو تاکہ وہ فساد کرتے رہیں
الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ
ملک میں اور چھوڑے رہیں وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو، فرعون نے کہا عنقریب قتل کریں گے ہم ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے ہم
نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ
ان کی عورتوں کو، اور بے شک ہم اِن کے اُوپر زورآور ہیں ﴿۱۲۷﴾ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد طلب کرو
وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کے لیے ہے، وارث بنادیتا ہے اِس زمین کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ

اچھا انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے ﴿١٢٨﴾ وہ بنی اسرائیل کہنے لگے ہم تکلیف دیے گئے تیرے آنے سے پہلے بھی اور تیرے

بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ

آنے کے بعد بھی، موسیٰ علیہ السلام نے کہا قریب ہے کہ تمہارا رَبّ ہلاک کر دے تمہارے دشمن کو،

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٩﴾ وَلَقَدْ

اور نائب بنادے تمہیں مُلک میں پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسا عمل کرتے ہو ﴿١٢٩﴾ اور البتہ تحقیق

اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ

ہم نے پکڑا فرعون کے لوگوں کو قحط سالیوں اور پھلوں کے گھٹانے میں تاکہ وہ

يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاِذَا جَاۗءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ

نصیحت حاصل کریں ﴿١٣٠﴾ پس جب اُن کے پاس اچھی حالت آجاتی تو کہتے کہ یہ ہمارے لیے ہی ہے، اور اگر

تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ

اُن کو کوئی بُری حالت پہنچ جاتی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اُن کے ساتھیوں کی، خبردار! سوائے اس کے نہیں کہ اُن کی نحوست کا

عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا

باعث اللہ کے علم میں ہے، لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں ﴿١٣١﴾ فرعونی کہنے لگے کہ جو نشانی بھی تو ہمارے پاس

بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾

لے آئے تاکہ تُو ہم پر جادو کرے اُس کے ذریعے سے پھر بھی ہم ماننے والے نہیں ہیں ﴿١٣٢﴾

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ

پھر بھیج دیا ہم نے اُن کے اُوپر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک

وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿١٣٣﴾

اور خون اس حال میں کہ یہ نشانیاں تھیں علیحدہ علیحدہ، پھر بھی وہ اکڑے رہے اور وہ جرم کرنے والے لوگ تھے ﴿١٣٣﴾

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا

اور جس وقت واقع ہوتا اُن پر کوئی عذاب تو وہ کہتے کہ اے موسیٰ! دُعا کر تُو ہمارے لیے اپنے رَبّ سے بسبب اُس

عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ

عہدے کے جو تیرے پاس ہے، اگر تُو نے دُور ہٹا دیا ہم سے عذاب کو تو ہم تجھ پہ ایمان لے آئیں گے اور ہم بھیج دیں گے

مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى

تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ﴿۱۳۴﴾ اور جب ہم نے دُور کیا اُن سے عذاب کو ایک مدت تک جس تک وہ پہنچنے والے تھے

اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ

اچانک وہ عہد کو توڑتے تھے ﴿۱۳۵﴾ پھر ہم نے اُن سے انتقام لیا پھر ہم نے انہیں ڈبو دیا

فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

دریا میں اس سبب سے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، اور ہماری آیات کی طرف سے غفلت برتتے تھے ﴿۱۳۶﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ: قومِ فرعون میں سے بڑے لوگوں نے کہا۔ ملأ کا لفظ بار بار آپ کے سامنے گزر گیا، یہاں فرعون کے درباری، اعیانِ سلطنت، ارکانِ سلطنت مراد ہیں۔ ''فرعون کی قوم میں سے بڑے لوگوں نے کہا'' اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ: کیا چھوڑتا ہے تو موسیٰ کو اور اس کی قوم کو؟، لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ: تا کہ زمین میں فساد مچاتے رہیں وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ: اور چھوڑے رہیں وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو۔ آلهه إله کی جمع ہے۔ وَذَرَ يَذَرُ چھوڑنے کے معنی میں ہے۔ ''کیا چھوڑتا ہے تو موسیٰ کو اور اس کی قوم کو تا کہ وہ فساد کرتے رہیں ملک میں'' ارض سے ارضِ مصر مراد ہے، ''اور چھوڑے رہیں تجھے اور تیرے معبودوں کو'' قَالَ: فرعون نے کہا، سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ: عنقریب قتل کریں گے ہم اِن کے بیٹوں کو، وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ: اور زندہ رکھیں گے ہم اِن کی عورتوں کو، وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ: اور بیشک ہم اِن کے اوپر زورآور ہیں۔ قہر اصل میں کنٹرول کرنے کو کہتے ہیں، اس لیے قہار جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں ہے اس کا معنی یہی ہوتا ہے سب کو سنبھالنے والا، سب کو اپنے بس میں لانے والا، سب پر کنٹرول کرنے والا، اس کے کنٹرول سے کوئی باہر نہیں، تو یہاں بھی قٰهِرُوْنَ کا مفہوم کچھ ایسے ہی ہے، ہم ان پر زورآور ہیں، ہمارا ان پر پورا کنٹرول ہے، ہم ان کا انتظام کر سکتے ہیں، قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ: موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا، اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ: اللہ سے مدد

طلب کرو، وَاصْبِرُوْا: اور ثابت قدم رہو، صبر کرو، اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ: بیشک زمین اللہ کے لئے ہے، یُوْرِثُہَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ: وارث بنادیتا ہے اس زمین کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ: اچھا انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے، متقین کے لئے ہے۔ قَالُوْٓا اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا: وہ بنی اسرائیل کہنے لگے، اُوْذِیْنَا: ہم تکلیف پہنچائے گئے، تکلیف دیے گئے، مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا: قبل اس کے کہ تو ہمارے پاس آتا، تیرے آنے سے پہلے بھی ہم تکلیف پہنچائے گئے، وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا: اور تیرے آنے کے بعد بھی ہم تکلیف پہنچائے گئے قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، عَسٰی رَبُّکُمْ قریب ہے کہ تمہارا رب، اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ: ہلاک کردے تمہارے دشمن کو وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ: اور نائب بنادے، خلیفہ بنادے تمہیں ملک میں، فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ: پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ: اور البتہ تحقیق ہم نے پکڑلیا فرعون کے لوگوں کو۔ آلِ فرعون سے فرعون کے متعلقین اور اس کے متبعین مراد ہیں، یہاں اولاد کے معنی میں نہیں، کیونکہ یہ فرعون جس نے موسیٰ کو اٹھایا تھا اور پالا تھا یہ تو خود بے اولاد تھا، اسی لئے تو ان کو یہ خیال آیا تھا کہ ہم اس کو متبنّٰی بنالیں گے، گھر میں رکھیں گے، بچہ بنا کے رکھیں، جیسے دوسری جگہ ہے عَسٰٓی اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا (سورۂ قصص:۹) تو یہاں ''آل'' سے مراد ہیں اس کے متبعین، اس کے پیروکار، اس کے ماننے والے، اس کی پارٹی کے لوگ۔ ''تحقیق پکڑا ہم نے فرعون کے لوگوں کو'' بِالسِّنِیْنَ: سنین سَنَۃٌ کی جمع ہے، سَنَۃ مطلق سال کے معنی میں بھی ہوتا ہے، اور قحط سالی کے معنی میں بھی ہوتا ہے، خشک سالی، اس معنی میں بھی یہ لفظ حدیث شریف میں بہت استعمال ہوا ہے، تو یہاں قحط سالیاں مراد ہیں، قحط مراد ہے، وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ: اور پھلوں کا گھٹانا، ''پکڑا ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط سالیوں میں اور پھلوں کے گھٹانے میں'' یعنی پھلوں کے اندر نقص ڈال دیا، پھل کم پیدا ہونے لگ گیا، قحط سالیوں میں مبتلا ہو گئے، لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ: تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، فَاِذَا جَآءَتْھُمُ الْحَسَنَۃُ: پس جب ان فرعونیوں کے پاس اچھی حالت آجاتی، قَالُوْا لَنَا ھٰذِہٖ: تو کہتے کہ یہ ہمارے لیے ہی ہے، یعنی ہم اسی کے لائق ہیں، وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ: اور اگر ان کو کوئی بُری حالت پہنچ جاتی یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗ: تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور ان کے ساتھیوں کی۔ تَطَیُّر بدفالی لینے کو کہتے ہیں، تَطَیُّر کا لفظ طیر سے لیا گیا ہے، طائر: اڑنے والی چیز، پرندہ، اور عرب میں پرانے زمانے میں، گزشتہ دور میں وہم پرست قومیں جتنی بھی ہیں ان میں پرندوں کو اُٹھا کر فال لینے کا رواج تھا، کہ جب کوئی کام کرنے لگتے، کوئی پرندہ سامنے آتا اس کو اڑادیتے، دائیں طرف نکلتا تو سمجھتے کہ یہ بڑا مبارک ہے، کام ہو جائے گا، بائیں طرف کو اڑ جاتا تو سمجھتے کہ یہ منحوس ہے، کام نہیں ہوگا، اس طرح سے فال لینے کی ان کے ہاں عادت تھی، پھر ''طائر'' کا لفظ ہر اس چیز پر بولنے لگ گئے جس کے ذریعے سے فال لی جائے، اور قسمت، حصہ، نصیب کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگ گیا، تو اکثر وبیشتر اس سے بدفالی مراد ہوتی ہے، ''تو بدفالی لیتے تھے وہ، نحوست بتلاتے تھے وہ موسیٰ کی اور ان کے ساتھیوں کی'' اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُھُمْ عِنْدَ اللّٰہِ: خبردار! بیشک اُن کا نصیب، اُن کا حصہ اللہ کے پاس ہے، یا ان کی نحوست کا باعث اللہ کے علم میں ہے کہ کون سی چیز ان کے لئے نحوست کا باعث بنی ہوئی ہے، وہ ان کے اپنے اعمال ہیں، ان کے اپنے کرتوت ہیں، اللہ جانتا ہے کہ ان کے لئے

بدقسمتی کا باعث کیا چیز بنی ہوئی ہے، نحوست کا باعث کیا چیز بنی ہوئی ہے یہ اللہ جانتا ہے؛ ”خبردار! سوائے اس کے نہیں کہ ان کی بدبختی کا باعث، ان کی نحوست کا باعث اللہ کے علم میں ہے“ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ: مَهْمَا یہ مَا کے معنی میں ہے، جس میں موصول کا معنی بھی ہوتا ہے اور شرط کا بھی، مِنْ اٰيَةٍ اسی کا بیان ہے، بِهٖ کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ: وہ فرعونی کہنے لگے کہ جو نشانی بھی تو ہمارے پاس لے آئے۔ مِنْ اٰيَةٍ کو مَهْمَا کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ جو نشانی بھی تو ہمارے پاس لے آئے لِّتَسْحَرَنَا بِهَا: تا کہ تو ہم پر جادو کرے اس کے ذریعے سے فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ: پھر بھی ہم ماننے والے نہیں ہیں۔ جو نشانی بھی لے آئے اور اس کے ذریعے سے تو ہم پر جادو کرنا چاہے تو ہم ماننے والے نہیں، فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ: نہیں ہیں ہم ایمان لانے والے تیرے لیے، ہم تجھ پہ ایمان نہیں لائیں گے۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ: پھر بھیج دیا ہم نے ان کے اوپر طوفان، وَالْجَرَادَ: ٹڈیاں، یہ ٹڈی جو کہ فصل کھا جایا کرتی ہے، سبزے کو چاٹ جاتی ہے، جراد سے وہ ٹڈی مراد ہے، وَالْقُمَّلَ: قُمّل جوں کو بھی کہتے ہیں یہ جو سر کے بالوں میں پڑ جاتی ہے، گھن کے کیڑے کو بھی کہتے ہیں جو غلے کو لگتا ہے اور غلے کو کھا جاتا ہے، تو اس لیے اس کا ترجمہ جوں کے ساتھ اور چچڑی کے ساتھ بھی کیا گیا ہے اور گھن کے کیڑے کے ساتھ بھی کیا گیا ہے، الضَّفَادِعَ: ضِفْدَع کی جمع ہے مینڈک۔ ”بھیج دیا ہم نے ان کے اوپر مینڈک“ وَالدَّمَ: اور خون، اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ: اس حال میں کہ یہ نشانیاں تھی علیحدہ علیحدہ، یا کھلم کھلا واضح طور پر یہ نشانیاں تھی، مُفَصَّلٰتٍ کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا گیا ہے، فَاسْتَكْبَرُوْا: پھر بھی وہ متکبر ہو گئے، اکڑے رہے، تکبر تو ان کا پہلے ہی تھا، تو فَاسْتَكْبَرُوْا کا معنی ہے کہ وہ اپنے تکبر پر دائم ہو گئے، پھر بھی وہ اکڑے رہے، وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ: اور وہ جرم کرنے والے لوگ تھے، یعنی جرم کرنا ان کی عادت بن گئی تھی، وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ: اور جس وقت واقع ہوتا ان پر کوئی عذاب، رجز عذاب کو کہتے ہیں، قَالُوْا يٰمُوْسَى: وہ کہتے کہ اے موسیٰ! اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ: پکار تو، دعا کر تو ہمارے لیے اپنے رب سے، بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ: بسبب اس چیز کے، بسبب اس عہدے کے جو تیرے پاس ہے، یعنی مُتَوَسِّلًا بِعَهْدِهٖ عِنْدَكَ، اللہ تعالیٰ کا عہد، اللہ تعالیٰ کا عُہدہ جو تیرے پاس ہے اس کے وسیلے سے، یعنی اپنے عہدۂ نبوّت کے وسیلے سے دُعا کر، یوں بھی اس کا مفہوم ادا کیا گیا ہے، کہ جب عذاب میں پکڑے جاتے، کسی تکلیف میں آتے پھر وہ کہتے کہ جو اللہ کا عہد تیرے پاس ہے اس کے سبب سے، اس کے وسیلے سے دُعا کر، اگر اللہ تعالیٰ یہ عذاب ہم سے ٹال دے گا، تیرا رب یہ عذاب ہم سے ٹال دے گا تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ یا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ”دُعا کر اپنے پروردگار سے اس چیز کی جو تیرے نزدیک معلوم ہے“ وہ یہی ہے کہ جس وقت ہم توبہ کر لیں گے تو عذاب ٹل جائے گا، اس بات کی دُعا کر دے، ہم توبہ کرتے ہیں، عذاب ٹل جائے، جب عذاب ٹل جائے گا تو ہم ایمان لے آئیں گے، لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ: یہ اسی کی تفصیل ہے۔ اگر تُو نے دُور ہٹا دیا ہم سے عذاب کو، یعنی تو واسطہ بن گیا دُور ہٹانے کا، تیرے دُعا کرنے کی وجہ سے یہ عذاب ٹل گیا، ”اگر دُور ہٹا دیا تُو نے ہم سے عذاب کو“ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ: تو ہم تجھ پہ ایمان لے آئیں گے، وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اور ہم بھیج دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو،

بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ: اور جب ہم نے دُور کیا اُن سے عذاب کو، اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ: ایک مدت تک جس تک وہ پہنچنے والے تھے۔ بٰلِغُوْهُ کی ''ہٗ'' ضمیر اَجل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اَجل: مدّت۔ یعنی ہمارے علم میں ایک وقت متعین تھا تو اس وقت تک عذاب ٹال دیا جہاں تک انہوں نے پہنچنا تھا، اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ: اچانک وہ عہد کو توڑتے تھے، یہ جو انہوں نے عہد کیا تھا کہ عذاب ٹل جائے گا تو ہم مان لیں گے، جب ہم ایک مدّت کے لئے عذاب کو دُور کر دیتے تو وہ اس عہد کو توڑ دیتے۔ نَكَثَ يَنْكُثُ توڑنے کو کہتے ہیں۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ: پھر ہم نے اُن سے انتقام لیا۔ کیا انتقام لیا؟ یہ (اگلی) فاء تفصیل کی ہے فَاَغْرَقْنٰهُمْ: پھر ہم نے انہیں ڈبو دیا۔ یہ اسی انتقام کا بیان ہے۔ پھر ہم نے انہیں ڈبو دیا، فِي الْيَمِّ: دریا میں، بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: اس سبب سے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ: اور ہماری آیات کی طرف سے بے خبر تھے، غفلت برتتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط..... فرعون کا مرعوب ہونا مستقل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے

کل کے سبق میں آپ کے سامنے فرعونیوں کی مغلوبیت اور اُن کی ذِلّت کا ذکر آیا تھا، کہ مقابلے میں وہ ہار گئے، اور جادوگر جو فرعون کی حمایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے تھے وہ ایمان لے آئے، اور فرعون نے سارے کا سارا غصہ جادوگروں پر ہی جھاڑا تھا، جیسا کہ پچھلی آیات میں آیا کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق تو وہ بولا تک نہیں، جتنا غصہ وہ دکھا رہا ہے سارے کا سارا اپنے جادوگروں پر دکھا رہا ہے، میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا، میں تمہیں سُولی پر لٹکا دوں گا، لیکن موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق کچھ نہیں بولا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ایک مستقل معجزہ ہے، کہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس کوئی فوج تھی، اور نہ وہ کسی ایسے اسلحہ کے ساتھ مسلح تھے، کہ جس سے فرعون ڈر گیا ہو، ظاہری طور پر سامانِ جنگ جس طرح سے ہوا کرتا ہے۔ ایک درویش آدمی ہے، ڈنڈا ہاتھ میں ہے، اور دربار میں دندنا رہا ہے، فرعون اُس سے بات نہیں کرتا، اُس سے آنکھیں نہیں لڑاتا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت فرعون پر اتنا رُعب پڑ گیا تھا، کہ اُس میں جرأت نہیں تھی کہ موسیٰ علیہ السلام سے آنکھ لڑا سکے، اس لیے اُس کو جو غصہ چڑھتا تھا تو وہ اپنے دوسرے آدمیوں پر ہی چڑھتا تھا، اسی کو کہتے ہیں کہ:

ہیبتِ حق است، ایں از خلق نیست ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

یہ صاحبِ دلق (گدڑی والے) کا رُعب نہیں، بلکہ ہیبتِ حق ہے (مثنوی، دفتر:۱، حکایت:۷۸)، حق کی طاقت اس کے ساتھ جو تھی اس سے فرعون مرعوب تھا، اور موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی طرف آنکھ نہیں اٹھا سکتا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کر کے بھیجا تھا لَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا کہ فرعونی تم تک نہیں پہنچ سکیں گے (سورۂ قصص: ۳۵) تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے، اس لیے فرعون کا سارے کا سارا زور جادوگروں پر ہی چلا ہے۔ باقی یہ تفصیل آگے کتابوں میں مذکور نہیں کہ اس نے پھر جادوگروں کے ساتھ کیا کیا

تھا؟ کیا اُن کو قتل کر دیا تھا، اور اپنے اس منصوبے کے مطابق سُولی چڑھا دیا تھا، یا وہ اِن پر بھی قدرت نہیں پا سکا، یہ تفصیل مذکور نہیں ہے، ظاہر یہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے رُعب اور دبدبے کی وجہ سے اُن کے ساتھ بھی وہ ایسا نہیں کر سکا ہوگا، موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین اس کے بس سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔(۱)

فرعون کے اراکینِ سلطنت کا فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے خلاف برانگیختہ کرنا

تو جب یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، آپ سوچ سکتے ہیں اسبابِ طبعیہ کے تحت یقیناً لوگوں کے ذہن متاثر ہوئے ہوں گے، جادوگر جن کو اُس وقت قوم کی قیادت حاصل تھی نچلے طبقے میں، جب وہ مسلمان ہو گئے تو آخر قوم پر بھی اثر پڑتا تھا، تو فرعون اور فرعون کے اراکینِ سلطنت بہت زیادہ ڈرنے لگ گئے، کہ اب تو یہ انقلاب آیا ہی آیا، یہ تو دن بدن زور پکڑتے جا رہے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ کسی دن زور پکڑیں گے اور ہمارا تختہ الٹ دیں گے، تو فرعون کو وہ برانگیختہ کرتے ہیں، کہ کیا بات ہے کہ آپ اُن کو ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے، کہ یہ علاقے میں فساد مچاتے پھریں، فساد سے یہی بغاوت والا فساد مراد ہے، اور فساد انہوں نے کیا کرنا تھا، نہ ڈاکے ڈالتے تھے، نہ اغوا کرتے تھے، نہ کوئی اور اس قسم کا شر و فساد پھیلاتے تھے، یہاں فساد فی الارض فرعونیوں کی نظر میں بغاوت والا فساد ہے، یہ تو سارے ملک کے اندر بغاوت پھیلاتے پھر رہے ہیں، تُو نے اُن کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے؟ اس کو بھی اور اس کی قوم کو بھی؟ یہ انہوں نے فرعون کو بہکایا تاکہ وہ ہاتھ ڈالے، اُن کی گرفتاریاں شروع کرے، اُن کو جیل میں ٹھونسے، اور اُن کو اس طرح سے سزا دے تاکہ یہ پابندی لگے، ورنہ یہ انقلاب تو بڑی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے، اور لوگ اس سے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس میں لفظ آئے گا وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ: تُو نے ان کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے، کہ وہ تجھے بھی چھوڑے ہوئے ہیں، کہ تیری بھی پروا نہیں کرتے، اور تیرے معبودوں کو بھی چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان معبودوں سے کیا مراد ہے؟ آلِهَتَكَ یہ اِلٰہ کی جمع ہے، فرعون اپنے آپ کو أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (پ ۳۰۔ سورۂ نازعات) کہلاتا تھا کہ میں تمہارا رَبِّ اعلیٰ ہوں، اور پھر اس نے اپنے تابوت بنائے ہوئے تھے، اپنی شکل کے بت، اور جگہ بہ جگہ شہروں میں چوکوں کے اندر گاڑے ہوئے تھے، جو لوگ براہِ راست فرعون تک نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ انہی کو فرعون کا مجسمہ سمجھ کے انہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے (تفسیر عثمانی)، یہاں آلِهَه کا مصداق یہی بت ہیں، جو فرعون نے قائم کرائے ہوئے تھے، اور لوگ اُن کے سامنے جھکتے تھے، اور اُن کو سلامی دیتے تھے۔ سرداروں نے کہا نہ تو یہ تیری پروا کرتے ہیں، اور جس جس جگہ ان کے اثرات پھیلتے جا رہے ہیں، وہ تیرے بتوں کی بھی پروا نہیں کرتے، یہ تو سارے کا سارا نظام ہی بدل دیں گے، تو ان کو تُو نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے؟ اس طرح انہوں نے فرعون کو بہکایا تاکہ وہ اُن پہ گرفت کر کے حالات کو کنٹرول کیا جائے۔

---

(۱) وقال الإمام: لم يصح ذلك في الاخبار. وانت تعلم ان الظاهر السلامة (آلوسی) ذكر الكلبي ان فرعون قطع ايديهم وارجلهم وصلبهم وذكر غيره انه لم يقدر عليهم لقوله تعالى لا يصلون الخ (بغوی مظهری) قال ابن عباس كانوا في أول النهار سحرة وفي آخره شهداء (ابن كثير)

فرعون کا اپنے ارا کینِ سلطنت کو جواب

فرعون آگے سے کہتا ہے (یہاں بھی دیکھو! اس قوم کی قیادت کرنے والے جن کو آج کی اِصطلاح میں آپ ''لیڈر'' کہتے ہیں، ''لیڈر'' کا لفظی معنی ہوتا ہے راہنمائی کرنے والا، ''لیڈ'' راہنمائی کرنے کو کہتے ہیں، تو ''لیڈر'': راہنمائی کرنے والا۔ قائد کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے کہ جو قوم کو آگے آگے چل کے خود چلاتا ہے، قائِد: آگے سے پکڑ کر چلانے والا۔ سَوق: پیچھے سے ہانکنے کو کہتے ہیں، قَود: آگے سے پکڑ کے چلانے کو کہتے ہیں، تو جو قوم کی قیادت کرنے والا ہوتا ہے اُس کو قائد یا لیڈر کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے) فرعون سمجھ رہا ہے کہ اب یہ ساری کی ساری عوام جو بیدار ہوتی جا رہی ہے، یہ تو سارا نتیجہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت کا، کہ اس قوم کو ایک بڑا اچھا ہونہار، بڑا قوی اور بڑا مضبوط قسم کا لیڈر مل گیا، اس لیے یہ قوم کھڑی ہوتی جا رہی ہے، اب قاعدے کے مطابق چاہیے تو یہ تھا کہ اس لیڈر کو ہاتھ ڈالے، قائد کو ہاتھ ڈالے، تا کہ قوم قیادت سے محروم ہو جائے، لیکن یہاں کچھ اس قسم کی باطن سے پابندی لگی ہوئی ہے، کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تو وہ سوچتا ہی نہیں۔ تو اپنے ان درباریوں کو کہتا ہے، کہ کوئی بات نہیں آپ فکر نہ کریں، یہ جماعت اگر زور پکڑتی جا رہی ہے تو ہمارے پاس اس کا علاج ہے، یہ ہمارے بس سے باہر نہیں، وہ کیا؟ کہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دو، لڑکیوں کو کچھ نہ کہو، کیونکہ ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ اب لڑکوں کو قتل کرنے کی سکیم ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے اُس نے چلائی تھی، تا کہ اِن میں کوئی ایسا بچہ پیدا ہی نہ ہو جو ان کو سنبھال سکے، اور اب یہ دوبارہ تجویز ہوگئی کہ یہ قوم زور نہ پکڑے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نوجوان بچے یا جو پیدا ہوں ان کو پکڑ پکڑ کے مارتے جاؤ۔ تو جب ان کی نفری اور ان کی تعداد بڑھے گی نہیں تو پھر یہ ہمارے مقابلے میں انقلاب نہیں لا سکتے، ہم ان کے اوپر پوری طرح سے قابو پائے ہوئے ہیں، قٰہِرُوْنَ: ہمیں ان پر پوری طرح سے بس حاصل ہے، یہ ہمارے بس میں ہیں، ہمارے بس سے نکلے ہوئے نہیں، اس لیے آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں، اس تجویز کے ساتھ ہم ان کی قومی طاقت کو توڑ دیں گے۔

''فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!''

اکبر الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ایک شخص گزرے ہیں ''الٰہ آباد'' ہندوستان میں، بہت قومی قسم کے شاعر تھے، جس طرح سے علامہ اقبال ہیں، اسی طرح سے یہ تھے، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، قریب ہی زمانے میں گزرے ہیں، ویسے خود وہ بیچارہ انگریزی خواں تھا، انگریزوں کی عدالت میں جج تھا، لیکن دل دماغ اس کا مسلمان تھا، تو اُس نے انگریزی تہذیب کے اُوپر بہت اچھی اچھی چوٹیں کی ہیں، اور قوم کو بڑے اچھے اچھے سبق پڑھائے ہیں۔ کالج کی زندگی کے متعلق ہمیشہ وہ تنقید کرتا تھا، کہ یہ کالج کی زندگی اچھی نہیں، کہ جو بچے کالج میں پڑھتے ہیں، وہ سارے کے سارے اگرچہ شکل وصورت کے اعتبار سے ہندوستانی ہوتے ہیں، لیکن دل دماغ کے اعتبار سے وہ انگریز بن جاتے ہیں، اور وہ انگریز کے وفادار ہوتے ہیں، انگریز کی حکومت کو مضبوط کرتے ہیں، قوم کے ہمدرد نہیں ہوتے، اپنی عیش میں آ کے انگریزوں کے ساتھ مل کے، گویا کہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ کر قوم کا ستیاناس کرتے ہیں، یہ تھا اُن کا تاثر کالج کی تعلیم کے متعلق، وہ کہتا ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس! کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کہ اُس نے جونسل کو ختم کرنے کے لیے بچوں کو قتل کرنے کی سکیم بنائی، خواہ مخواہ بدنام ہوا، یہ آج کل کے فرعونوں کی طرح کالج جاری کردیتا، اس میں بچوں کو پڑھاتا، پڑھانے کے بعد اگرچہ وہ نسلاً اسرائیلی ہوتے، لیکن حامی فرعونیوں کے ہوتے، توانہی بچوں کو اپنی فوج بنالیتا۔ مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کی سیاست فرعون سے بھی آگے ہے، کہ انہوں نے بچوں کو قتل تو نہیں کیا، لیکن کالج میں پڑھا کے ان کو حامی بنالیا۔ اسی طرح سے فرعون کو اگر یہ سکیم سوجھ جاتی کہ وہ کوئی تعلیم اس قسم کی جاری کردیتا، جس طرح سے انگریزوں نے جاری کردی ہے، تو بچے ہوتے اسرائیلیوں کے، پڑھتے ان کے کالجوں میں، اور کالجوں سے نکلنے کے بعد وہ اسرائیلیوں کے حامی نہ ہوتے، بلکہ اس صاحبِ اقتدار طبقے کے حامی ہوتے تو وہ فوج ان کی بن جاتی، افسوس! کہ اُس کو یہ سکیم نہ سوجھی اور وہ کالج جاری نہ کرسکا۔ یہ کتنی زبردست تنقید ہے کالج کی زندگی پر۔ تو اس وقت چونکہ کالج تو بنائے نہیں جاسکتے تھے، تعلیم تو ان کو دی نہیں جاسکتی تھی، اس قسم کا رواج نہیں تھا، تو اُس نے اپنی وہی جاہلانہ حرکت، کہ جاہل کے پاس جس وقت کوئی دلیل نہ رہے تو آخر وہ مکا بازی پر اُتر آتا ہے۔ تو کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں ہم ان کے بچوں کو قتل کروائیں گے، اور اس طرح سے ہم ان کی قومی طاقت توڑ دیں گے، یہ ہمارے مقابلے میں انقلاب نہیں لاسکتے۔

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو تسلی دینا، اور قوم کا شکوہ در شکوہ

جس وقت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو یہ پتا چلا کہ فرعون دوبارہ ہمارے قتلِ اَبناء کی سکیم سوچ رہا ہے، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رونا دھونا شروع کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی کہ کوئی بات نہیں، آزادی ایسے ہی مفت میں حاصل نہیں ہوا کرتی، غلبہ ایسے ہی حاصل نہیں ہوا کرتا، اس کی بڑی قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں، تم اللہ سے مدد طلب کرو، اور صابر رہو، ثابت قدم رہو، ان شاء اللہ العزیز! آخر فتح تمہاری ہے۔ یہ زمین، یہ علاقہ، یہ ملک اصل میں اللہ کی ملکیت ہے، وہ جس کو چاہتا ہے وارث بنادیتا ہے، آج اگر فرعونی اس کے وارث ہیں، تو تم اگر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہوگے، اور اسی طرح سے صبر کے ساتھ ان مشکلات کو برداشت کرتے رہوگے، تو یہی ملک اللہ تعالیٰ تمہیں دے دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم اس میں کس قسم کے کام کرتے ہو؟ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کو تسلی دی۔ وہ قوم آگے سے دوبارہ شکوے کے طور پر کہتی ہے کہ جی! ہم تو ہمیشہ مصیبت میں رہے، تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے، فرعون کے غلام تھے، اور وہ ہمارے بچوں کو قتل کرتا تھا، ہم سے بیگار لیتا تھا، تیرے بعد بھی یہی حال ہے، یہ ایک قسم کا شکوے کا اظہار ہے کہ ہماری مصیبتیں ختم ہوتی نظر نہیں آتیں، تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں تھے، اور تیرے آنے کے بعد بھی ہم مصیبتوں میں ہی ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو اسی طرح سے تسلی دیتے ہیں، کہ فکر نہ کرو، تم اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرو، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو ہلاک کردے گا، پھر تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، پہلے رکوع کا مضمون تو یہی ہے جو آپ کے سامنے پڑھا گیا، ذرا الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔ قوم فرعون میں سے وڈیروں نے کہا کہ کیا تو موسیٰ کو اور اس کو قوم کو چھوڑے ہوئے ہے، یعنی آپ ان کے اوپر کوئی ہاتھ نہیں ڈالتے؟ ان کو کھلی چھٹی

دے رکھی ہے؟ کہ وہ فساد مچاتے رہیں ملک میں، اور چھوڑے رہیں تجھے اور تیرے آلہہ کو، تیرے معبودوں کو، یعنی جو تیرے تجویز کردہ معبود ہیں، یہ اسی کے مجسمے ہوتے تھے، فرعون نے کہا کہ ہم عنقریب قتل کریں گے ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے ان کی لڑکیوں کو، بیشک ہم ان کے اوپر پوری طرح سے قادر ہیں، ان کو پوری طرح سے اپنے بس میں لیے ہوئے ہیں، کنٹرول میں ہیں، یہ ہمارے کنٹرول سے باہر نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، ثابت قدم رہو، بیشک علاقہ، زمین اللہ کی ہے۔

''اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ'' سے سوشلسٹ لوگوں کا غلط اِستدلال

يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ: وارث بنائے گا اس زمین کا جس کو چاہے گا اپنے بندوں میں سے۔ یہ سوشلسٹ قسم کے لوگ جو زمین کی انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں، وہ اکثر و بیشتر قرآنِ کریم کے ان الفاظ کو اپنی زبان کے اُوپر اَدا کرتے ہیں اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ، اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ کہ زمین تو اللہ ہی کی ہے، کسی کی ملکیت نہیں، اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ زمین پر ملکیت اللہ کی ہے کوئی دوسرا اس کا مالک نہیں ہے۔ ایک دفعہ اسلام آباد میں اجلاس تھا جس میں مختلف قسم کے لوگوں نے مقالے پڑھے تھے، اُن میں ایک مسعود بھی تھا، سی ایس پی افسر رہا تھا، اس وقت محکمۂ اوقاف کا سربراہ تھا، اُس نے ایک مقالہ پڑھا تھا، وہ بھی چونکہ اسی ذہن کا تھا، تو اُس نے بھی استدلال کے اندر یہی آیت پیش کی تھی کہ دیکھو! قرآنِ کریم میں آتا ہے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ کہ زمین تو ساری اللہ کی ہے، کوئی اس کا مالک نہیں ہے، تو اس کا جواب ہمارے علماء کی طرف سے یہی دیا گیا تھا، کہ یہ تو ویسی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ نماز کے قریب نہ جانا، آخر لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ یہ بھی تو قرآنِ کریم کے ہی الفاظ ہیں، اور ان کا کیا معنی ہے؟ کہ نماز کے قریب نہ جانا، تو جس طرح سے کوئی استدلال کرے کہ نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کیونکہ قرآنِ کریم میں آتا ہے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ، اسی قسم کا استدلال یہاں ہے، نہ آگا دیکھا نہ پیچھا دیکھا، وہاں ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (سورۂ نساء: ۴۳) نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو، وہاں نشے سے روکنا مقصود ہے، نماز تو وقت پر پڑھنی ہے، اسی طرح اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ اتنا تو یاد رہ گیا: يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ یاد نہیں۔ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ زمین ہے تو اللہ کی، لیکن اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وہ زمین کا وارث بنا دیتا ہے، تو جس کو اللہ تعالیٰ زمین کا وارث بنا دے تو وہ عارضی طور پر مالک بن گیا، جس طرح ہر چیز کے اوپر عارضی ملکیت ہے دُنیا کے اندر ایک انتظام قائم کرنے کے لئے، اسی قسم کی ملکیت اس شخص کو مل جائے گی جس کو وراثت میں زمین مل گئی۔ تو صرف اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ کے اُوپر نظر رکھنا اور يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ کے اوپر نظر نہ رکھنا یہی وہ تحریفات ہیں جو باطل پرست لوگ قرآنِ کریم میں کیا کرتے ہیں، وہ چونکہ شخصی ملکیت کے قائل نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شخصی ملکیت کوئی چیز نہیں ہے، اس لیے وہ اس قسم کے الفاظ سے سہارا لیتے ہیں، یہ باطل نظریہ ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ: اچھا انجام متقین ہی کے لئے ہے۔ قَالُوْٓا: وہ اسرائیلی کہنے لگے کہ ہم تکلیف پہنچائے گئے تیرے آنے سے پہلے بھی (یہ شکوہ شکایت ہے، جس طرح سے تکلیف کا اظہار ہوتا ہے کہ جی! ہم تو ہمیشہ مصیبت میں رہے، آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں دکھ پہنچایا گیا، تکلیف پہنچائی گئی اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہمیں اسی طرح سے تکلیف پہنچائی گئی۔ آپ علیہ السلام

نے پھر تسلی دی، قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے گا۔ اور تمہیں اس ملک کے اندر خلیفہ بنائے گا، زمین میں خلافت دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

فرعونیوں پر تنبیہات کا سلسلہ

اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت کے مطابق، جس طرح سے آپ کے سامنے پہلے ان واقعات کے ختم ہونے کے بعد ایک رکوع آیا تھا، اُس میں ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو جب بھیجتے ہیں، تو پھر چھوٹی چھوٹی آفات اور مصیبتیں بھی اس قوم کے اوپر اتارتے ہیں، تاکہ ان کا تکبر ٹوٹے اور یہ ان مصیبتوں کی وجہ سے اللہ کی طرف جھکیں، اور ایمان لے آئیں، اسی عادت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو رَدّ کرنے کے بعد فرعونیوں پر بھی اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے متعدد چھوٹے چھوٹے عذاب بھیجے تاکہ ان کا تکبر ٹوٹے۔ پہلے پہلے جس کو ذکر کیا وہ ہے قحط سالی کا عذاب، اُن کو قحط سالی میں مبتلا کر دیا، زمین سے پیداوار کم ہوگئی، فصل نہ اُگی، اس کا تعلق ہے کھیتوں کے ساتھ، اور باغات جو درخت پہلے سے کھڑے ہوتے ہیں، اُن پر اثر یہ پڑا کہ اُن کا پھل کم ہو گیا، تو غلے کے اندر بھی کمی آگئی کہ زمین سے غلہ پیدا نہ ہوا، اور پھلوں کے اندر بھی کمی آگئی کہ درختوں کو پھل نہ لگے، اس طرح اُس قوم کو معاشی تنگی کے اندر مبتلا کر دیا گیا، تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جائیں لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ یہ نصیحت حاصل کریں، یہ معاشی تنگی کے اندر مبتلا کرنے میں دو باتیں آگئیں قحط سالی اور پھلوں کی کمی، قحط سالی کا تعلق ہو گیا کھیتوں کے غلہ کے ساتھ، جیسے گندم، مکی، کپاس ہے، یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں، تو قحط سالی ہوگی تو یہ پیدا نہیں ہوں گی، اور نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ کا تعلق ہو گیا باغات کے ساتھ، کہ جو درخت پہلے کھڑے تھے، اُن کے اوپر پھل نہ لگے، اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تنبیہی سلسلہ شروع ہوا۔

خوش حالی اور تنگی کے متعلق فرعونیوں کا بے ہودہ نظریہ

لیکن ان فرعونیوں کا ذہن ایسا تھا کہ جب اُن کو کوئی خوش حالی پہنچتی، مثال کے طور پر اُن کی مرضی کے مطابق غلہ حاصل ہو گیا، یا مرضی کے مطابق پھل حاصل ہو گیا تو کہتے لَنَا هٰذِهٖ۔ لَنَا هٰذِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہے، ہماری محنت کا نتیجہ ہے، ہم نے جس طرح سے آب پاشی کا انتظام قائم کر رکھا ہے، جیسے ہم نے عمدہ بیج ڈالے ہیں، جیسے ہم زمینوں کو جوتتے اور باہتے ہیں، تو یہ غلہ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا، لَنَا هٰذِهٖ کا یہ معنی ہے، اس کو وہ اپنی کوشش کی طرف منسوب کرتے، اللہ کا احسان سمجھ کر شکر ادا نہیں کرتے تھے، اپنی ہمت اور کوشش کا نتیجہ سمجھتے، کہ ہم اسی لائق ہیں جس طرح سے اللہ نے ہمیں خوشحالی دے دی۔ اور اگر کبھی اُن کی مرضی کے خلاف حال پیش آجاتا، جیسے قحط سالی آگئی یا درختوں کو پھل نہ لگا، یا پھلوں میں کیڑا پڑ گیا، تو کہتے کہ یہ سب ان کی نحوست ہے، یہ چونکہ ہمارے بتوں کی مخالفت کرتے ہیں، اور اُن کا سب سے بڑا دیوتا سورج تھا، اور سورج کے قائم مقام وہ اپنے بادشاہ کو سمجھتے تھے، کہتے کہ اس کی مخالفت کرنے کی بنا پر وہ دیوتا ناراض ہو گیا، جس کی وجہ سے پیداوار کم ہوگئی، اور پھلوں میں نقص آگیا، تو یہ نحوست بتاتے موسیٰ علیہ السلام کی اور ان کے ساتھیوں کی، کہتے کہ ان کی اس قسم کی حرکتوں کی وجہ سے ہمارے جو دیوتا ہیں، ہمارے جو معبود ہیں وہ ناراض ہو رہے ہیں، ان کے ناراض ہونے کی بنا پر زمین کے اندر اس قسم کی مصیبتیں آرہی ہیں۔'' اور جب

ان کو کوئی مصیبت پہنچتی تو نحوست بتلاتے موسیٰ علیہ السلام کی اور ان کے ساتھیوں کی‘‘۔ اللہ تعالیٰ تنبیہ فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کی نحوست نہیں، ان کی نحوست کا سبب اللہ کے علم میں ہے، لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔ اور پھر اس قسم کی تنبیہات پر جیسے پہلے واقعات میں آپ کے سامنے آیا تھا، متنبہ ہونے کی بجائے وہ اور اکڑے، اور صاف موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ تُو جس قسم کی جو بھی نشانی لے آ، تاکہ تو اس کے ذریعے سے ہم پر جادو کرے اور متاثر کرے، ہم ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ اُن کے تکبر کی انتہا ہے، گویا کہ اپنی طرف سے وہ فیصلہ سنا رہے ہیں فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ: ہم تجھے ماننے والے نہیں، چاہے تو کیسی ہی نشانی لے آ۔

فرعونیوں پر آنے والے مختلف تنبیہی عذابات

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اُن کے اوپر اور تنبیہی عذاب بھیجے فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ: ہم نے اُن کے اوپر طوفان بھیج دیا، طوفان دریا میں بھی آتا ہے، اور طوفان سے بادوباراں کا طوفان بھی مراد ہوتا ہے، آندھیاں آئیں، بارشیں اتنی کثرت کے ساتھ ہوئیں کہ وہ بھی فصلوں اور مکانوں کو تباہ کرنے کا ذریعہ بن گئیں، اور اُن میں تنبیہی عذاب ہونے والی بات اس طرح تھی، کہ جب بھی کوئی اس قسم کی مصیبت آتی تو اُس کے اثرات فرعونیوں پر پڑتے، اسرائیلی محفوظ رہتے، یہ کھلی علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عذاب ہے۔ ’’طوفان ہم نے ان کے اوپر بھیج دیا‘‘ طوفان کے ساتھ فصلیں تباہ ہونے لگیں، جیسے آگے جا کے کلیہ ذکر کیا ہوا ہے، کہ جب بھی ان پر کوئی عذاب آتا تو یہ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگ جاتے کہ موسیٰ! بس دُعا کر دے اپنے عہدے کے وسیلے سے، اپنے عہدے کی برکت سے، یا جو طریقہ تجھے معلوم ہے وہ دُعا کر دے، اگر یہ عذاب تیری وجہ سے ٹل گیا تو ہم تجھے مان لیں گے، بس یہ مصیبت ٹال دے۔ جب وہ یوں کرتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام دُعا کرتے، عذاب ٹل جاتا، جب عذاب ٹل جاتا تو کہتے جا جا، تُو کون اور ہم کون، یہ تو ایسی ہی بات تھی جو ہم نے وقتی مصلحت کے طور پر کر دی، جیسے سیاسی لوگوں کی بھی عادت ہوتی ہے کہ جب ووٹ لینا ہوتا ہے تو بڑے بڑے وعدے کر لیتے ہیں، اور جب ووٹ لے کر کرسی تک پہنچ جاتے ہیں، تو اس کے بعد پھر جب ان کے پاس جاؤ، اور انہیں کہو بھئی! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم یہ کام کروا دیں گے، یہ کروا دیں گے، اب ان کاموں کو کرو۔ وہ کہتے ہیں، کہ جی! وہ تو بس ایسے ہی باتیں ہوتی ہیں وقتی طور پر، جب گنجائش ہوگی دیکھی جائے گی۔ تو یہ لوگوں کی عادت ہے کہ جب کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں تو وعدے کسی اور قسم کے کرتے ہیں، اور جب مصیبت سے چھوٹ جاتے ہیں پھر اپنے عہد یاد نہیں رہا کرتے۔ تو موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاتے، موسیٰ علیہ السلام تو مجسمۂ رحمت تھے، وہ ان کی لجاجت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کر دیتے کہ یا اللہ! یہ عذاب اِن سے ٹال دے، اب یہ سیدھے ہونے لگے ہیں، تو دُعا کروا کے طوفان ہٹا لیا، جب طوفان ہٹ گیا تو سمجھے کہ بارشوں کی وجہ سے زمین زیادہ سیراب ہوگئی، فصلیں پہلے سے بھی زیادہ اُگ آئیں، تو پھر اکڑ گئے، جب اکڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عذاب مسلط کر دیا کہ ٹڈی دل بھیج دیا، شاید آپ کے ہوش میں کبھی یہ ٹڈی نہیں آئی ہوگی، ورنہ اگر آئے تو آپ دیکھیں کہ یہ کس طرح سے فصلوں کو چاٹ جاتی ہے، درختوں کے اُوپر سبز پتا نہیں رہنے دیتی، بہت کثرت کے ساتھ آیا کرتی ہے، میں نے تو دو تین دفعہ اس کا نمونہ دیکھا ہے، قریب قریب زمانے میں اس علاقے کے اندر یہ نہیں آئی، تو یہ ٹڈی جب آتی ہے تو

فصلوں کو کھا جاتی ہے، کوئی سبزہ نہیں چھوڑتی، تو ٹڈی دل آ گیا، اور کھڑی فصلیں کھانے لگ گیا، اب فرعونیوں کے پھر ہوش ٹھکانے لگے کہ ہم تو بھوکے مریں گے، یہ تو سب کچھ ٹڈی کھا جائے گی۔ پھر دوڑے موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ اے موسیٰ! بس صرف یہ مصیبت ٹال دے، اگر یہ ٹل گئی تو پھر ہم تجھے مان لیں گے، موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی، وہ ٹڈی دل ٹل گیا، اب فصل محفوظ ہو گئی اور غلّہ آ گیا۔ وہ سمجھے کہ جب ہم نے غلّہ نکال لیا، گھروں میں کوٹھیوں میں بھر لیا، اب یہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے، غلّہ محفوظ ہو گیا ہے۔ پھر لگے وہ اکڑنے، تو اللہ تعالیٰ نے غلّے کو گھن کا کیڑا لگا دیا، وہ جو ذخیروں میں رکھا ہوا غلّہ تھا اس کو گھن لگ گیا۔ تو ''قُمّل'' سے یہ گھن کا کیڑا مراد ہے، اور جوئیں اور چیچڑیاں بھی اس سے مراد لی گئی ہیں، گھن کا کیڑا بھی مراد لیا گیا ہے، اور واقعات کی ترتیب میں یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی فصلیں ٹڈی کھانے لگی، تو پھر یہ جھک گئے، پھر غلّہ محفوظ ہو گیا، پھر اکڑے تو پھر غلّے کو کیڑا لگ گیا۔ اور پھر دُعائیں کرا کے یہ مصیبت ٹالی، پھر اللہ کی طرف سے ''ضفادع'' کا عذاب آ گیا کہ مینڈکیں اتنی کثرت سے پیدا ہو گئیں کہ ان کا رہنا، کھانا پینا، سب کچھ مکدر ہو گیا، کھانے کے وقت اچھل اچھل کر آ گرتیں، اور چلنے پھرنے میں بھی تکلیف ہو گئی، جہاں بیٹھتے وہاں مینڈکیں ہی مینڈکیں، لیٹتے تو بستر پر مینڈکیں ہی مینڈکیں، یہ بھی پریشان کرنے کے لیے کافی بات تھی۔ پھر یہ مصیبت ٹلی تو خون کا عذاب آ گیا، کہ ان کا پانی خون کی صورت اختیار کر گیا، جو چیز پینے لگتے وہ ایسے ہوتی جیسے خون ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ساری کی ساری آیاتِ مفصلات تھیں، یہ جدا جدا مستقل نشانیاں تھیں اللہ کی طرف سے، یہ عذاب اللہ کی طرف سے مستقل تنبیہات تھیں، بہت واضح واضح۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو (۹) معجزات

اب یہاں دیکھو! سات چیزوں کا ذکر آیا۔ ۱۔سنین۔ ۲۔نقص من الثمرات۔ ۳۔طوفان۔ ۴۔جراد۔ ۵۔قمل۔ ۶۔ضفادع۔ ۷۔دَم۔ اور دو کا ذکر پہلے آیا تھا: عصائے موسیٰ اور یدِ بیضاء، اس طرح سے یہ نو نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کو واضح طور پر دی گئی تھیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ جو لفظ آئے گا وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ (سورۂ اسراء: ۱۰۱) تو تِسْعَ اٰيٰتٍ سے بھی نو (۹) نشانیاں مراد ہیں، اِن میں سے بڑی نشانیاں عصا اور ید بیضاء تھے، اور ان واقعات کو اللہ تعالیٰ نے مستقل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں شمار کرایا ہے، کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی واضح واضح نشانیاں تھیں، کہ یہ تکذیب کرتے تو عذاب آتا، اور وہ دُعا کرتے تو ٹل جاتا، تو اگر یہ اتفاقی واقعات ہوتے تو بار باریوں تو نہ ہوتا کہ وہ اکڑتے ہیں تو آتا ہے، اور جب وہ جھک جاتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام دُعا کر دیتے ہیں تو ٹل جاتا ہے، اگر وہ چاہتے تو انہی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے نشانات بنا سکتے تھے اور ایمان لا سکتے تھے، لیکن وہ نہیں لائے فَاسْتَكْبَرُوْا: اکڑے رہے اسی طرح سے جیسے تکبر میں تھے ویسے اکڑے رہے، وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ: اور یہ مجرم لوگ تھے، یعنی ان کو عادت پڑی ہوئی تھی جرم کی، اور جو عادی مجرم ہوا کرتے ہیں وہ گرفت میں آنے کے بعد چاہے توبہ توبہ کرنے لگ جاتے ہیں، لیکن جب گرفت ڈھیلی ہوتی ہے تو دوبارہ پھر اسی ڈگر پہ چلتے ہیں، اِن کا حال یہی تھا۔

سوال:۔جس طرح قومِ فرعون قحط سالی سے متاثر ہوئی، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی متاثر ہوئے؟

جواب:- روایات سے معلوم یوں ہوتا ہے، مفسرین نے یہاں صراحت کی ہے، کہ اس قسم کے عذاب فرعونیوں پر اثر انداز ہوتے تھے، اسرائیلی محفوظ رہتے تھے، تبھی تو ان کے اندر ایک مفصل اور واضح نشان تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے تنبیہی عذاب ہے۔ مثال کے طور پر مینڈک جب کثرت سے پیدا ہوئے تو فرعونی جہاں رہتے تھے ان محلوں میں، ان گلیوں میں بہت زیادہ تھے، اور جدھر اسرائیلی رہتے تھے وہاں یہ چیز نہیں تھی۔ اور غلے کو کیڑا لگنا شروع ہوا تو فرعونیوں کے ذخیرے میں تو کیڑا لگ رہا تھا لیکن جو اسرائیلیوں کے گھروں تھوڑا بہت غلہ محفوظ تھا ان کے ہاں یہ کیڑا نہیں تھا۔ اور اسی طرح سے سیلاب اور بارشوں کے ساتھ مکان جو منہدم ہونے لگے، اس قسم کی مصیبتیں جو آنے لگیں، تو فرعونی اس سے زیادہ متاثر ہو رہے تھے، جن علاقوں میں، جن محلوں میں اسرائیلی آباد تھے وہاں اس قسم کے اثرات نہیں تھے، تو جس کی وجہ سے ان کا عذاب ہونا کھلی بات تھی، پھر ان کے اکڑنے پر آنا، اور موسیٰ علیہ السلام کے دُعا کرنے پر ٹل جانا، یہ ایک ایسی علامت تھی جس کو وہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ اتفاقی واقعات نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارا دماغ سیدھا کرنے کے لئے ہیں، مفسرین نے یہاں اس بات کی صراحت کی ہے (مظہری وغیرہ)۔

فَاسْتَكْبَرُوا: پھر وہ اکڑ گئے، یعنی اسی طرح سے اکڑے رہے، ان واقعات کے ساتھ ان کا تکبر نہ ٹوٹا۔ وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ: اور وہ جرم کرنے والے لوگ تھے، یعنی عادی مجرم تھے، جرم کرنے کے عادی ہو چکے تھے، اور عادی مجرموں کا حال یہی ہوا کرتا ہے کہ گرفت میں آنے کے بعد اگر وہ توبہ کا ارادہ کر بھی لیتے ہیں، یا وہ اپنی زبان سے کہہ بھی دیتے ہیں کہ اب چھوڑ دو، آئندہ ہم ایسا جرم نہیں کریں گے، لیکن چھوٹنے کے بعد پھر ان کی وہی عادت عود کر آتی ہے۔

فرعونیوں سے انتقامِ خداوندی

یہ ان کی عام عادت ذکر کی ہے وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ: رجز عذاب کو کہتے ہیں۔ جب اُن پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو کہتے کہ اے موسیٰ! اپنے رَبّ سے دُعا کر، بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اُس چیز کی جو تیرے نزدیک معلوم ہے، وہ کیا؟ کہ ہمارے توبہ کرنے پہ عذاب ٹل جائے گا، اس چیز کی دُعا کر دے، ہم توبہ کرتے ہیں تو عذاب ٹال دے، یا یہ ہے کہ اپنے عہدۂ نبوّت کی وجہ سے، اس عہدۂ نبوّت کے توسل سے تو دُعا کر دے، اگر تُو نے یہ عذاب ہٹا دیا یعنی تو اس کے ہٹنے کا ذریعہ بن گیا، ہم سے اس عذاب کے ٹالنے کا اگر تو ذریعہ بن گیا، لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ: تو ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ: اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ: اور جس وقت ہم ان سے عذاب کو دُور کرتے ایک وقت تک جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے، اس وقت سے مراد ہے دوسرا عذاب آنے کا وقت، ایک مہلت دیتے، اس مہلت تک ان سے جب ہم عذاب دُور ہٹا دیتے إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ: اچانک پھر وہ عہد کو توڑ دیتے۔ جو وہ عہد کرتے تھے، کشادگی ہو جانے کے بعد، اس عذاب کے کشف ہو جانے کے بعد دوبارہ پھر وہ عہد کو توڑ دیتے تھے۔ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ: پھر ہم نے ان سے انتقام لیا۔ پہلے انتقام نہیں تھا، پہلے تنبیہ تھی کہ باز آ جاؤ، اس لیے ان کو ذرا جھنجوڑا جا رہا تھا، انتقام کی نوبت اب آئی۔ ''پھر ہم نے اُن سے انتقام لیا''۔ اور

انتقام کیا لیا؟ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ: فاء تفصیل کے لئے ہے۔ کہ پھر ہم نے ان کو پانی میں ڈبو دیا، دریا میں غرق کر دیا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے دوسری سورتوں میں آئے گی کہ پھر یہ غرق کس طرح ہوئے، کس طرح سے ڈوبے؟ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اس سبب سے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ: اور ان آیات کی پروا نہیں کرتے تھے، ان سے غفلت برتتے تھے، ان آیات سے نصیحت حاصل نہیں کرتے تھے، اس وجہ سے ہم نے اُن سے انتقام لیا، اور اس انتقام کے نتیجے میں ہم نے اُن کو دریا کے اندر ڈبو دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ
ہم نے وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے زمین کے مشرقوں کا
وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی
اور مغربوں کا، وہ زمین کہ جس میں ہم نے برکت دی تھی، پورا ہوگیا آپ کے رَبّ کا اچھا وعدہ
عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ
بنی اسرائیل پر اُن کے صبر کرنے کی وجہ سے، برباد کر دیں ہم نے وہ چیزیں جن کو فرعون
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
اور اس کی قوم بناتی تھی اور جو اُونچی اُونچی عمارتیں بناتے تھے ﴿۱۳۷﴾ اور گزار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو
الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا
سمندر سے پھر آئے بنی اسرائیل ایسی قوم پر جو جمے بیٹھے تھے اپنے بتوں پر، تو بنی اسرائیل نے کہا
یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ
اے موسیٰ! بنا دے ہمارے لیے معبود جیسے ان کے لیے مختلف معبود ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک تم جاہل
تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾
لوگ ہو ﴿۱۳۸﴾ بے شک یہ لوگ، برباد کی ہوئی ہے وہ چیز جس میں یہ لگے ہوئے ہیں اور باطل ہے وہ چیز جو یہ کرتے ہیں ﴿۱۳۹﴾
قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾
موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا اللہ کا غیر میں تمہیں اِلٰہ تلاش کردوں؟ حالانکہ اُس نے فضیلت دی تمہیں تمام جہانوں پر ﴿۱۴۰﴾

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

یاد کیجئے جبکہ ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے جو تمہیں سخت عذاب پہنچاتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۗ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے، اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی ﴿۱۴۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا: ہم نے وارث بنا دیا ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا یہ اَوْرَثْنَا کا مفعول ہے، يُسْتَضْعَفُوْنَ کا مفعول نہیں، يُسْتَضْعَفُوْنَ کا مفعول بناؤ گے تو معنی بن جائے گا ''کمزور سمجھے جاتے تھے زمین کے مشرقوں میں اور مغربوں میں'' یہ مفہوم نہیں ہے، (بلکہ) اَوْرَثْنَا مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا، وارث بنا دیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، وارث بنا دیا زمین کے مشرقوں کا اور مغربوں کا۔ مشارق مشرق کی جمع ہے اور مغارب مغرب کی جمع ہے، مشرق: جدھر سے سورج نکلتا ہے، اور مغرب: جدھر سورج ڈوبتا ہے، اس کو مشرقین اور مغربین کے ساتھ بھی قرآنِ کریم میں تعبیر کیا گیا ہے (سورۂ رحمٰن)، مشارق، مغارب کے ساتھ بھی تعبیر کیا گیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ سال کے جو تین سو ساٹھ دِن ہیں ہر روز سورج نئی جگہ سے نکلتا ہے، اسی لیے دنوں کے اندر اور رات کے اندر فرق پڑتا ہے، کہ کبھی دِن چھوٹے ہوتے ہیں رات بڑی ہوتی ہے، کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے دِن بڑے ہوتے ہیں، یہ سورج بدلتا رہتا ہے، تو ۳۶۰ مشرق ہیں اور ۳۶۰ مغرب ہیں، اور ممتاز مشرق دو ہیں ایک سردی کا ایک گرمی کا، ان دونوں میں بہت نمایاں فرق ہے، تو سردی اور گرمی کے مشرق کا اعتبار کرتے ہوئے ''مشرقین'' کہہ دیا جاتا ہے، اور اسی طرح سے سردی اور گرمی کا اعتبار کرتے ہوئے ''مغربین'' کہہ دیا جاتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ سردیوں میں سورج یہیں ڈوب جاتا ہے اور گرمیوں میں چکر کاٹتا ہوا یہاں تک آتا ہے، اور اس طرح سے گرمیوں میں اِدھر سے نکلے گا اور سردیوں میں یہیں سے نکلے گا، اور یہاں سے آ کے یہیں غروب ہو جائے گا، تو سردی اور گرمی کے دو مشرقوں اور مغربوں میں بہت نمایاں فرق ہوتا ہے، اس لیے تثنیہ کے ساتھ بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ[1] کے اندر اس کو مفرد ہی رکھا گیا ہے وہ معنی جنس ہے، تو تینوں طرح سے یہ لفظ قرآنِ کریم میں استعمال ہوا ہے۔ الْاَرْض: زمین، علاقہ، ''ہم نے زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جو کہ کمزور سمجھے جاتے تھے'' زمین کونسی؟ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا: یہ الْاَرْض کی صفت ہے، وہ زمین کہ جس میں ہم نے برکت دی تھی، برکت کا معنی ہے کہ اس میں ہم

---

(۱) پارہ ۱۹ سورۃ الشعراء آیت ۲۸۔ پارہ ۲۹ سورۃ مزمل آیت ۹۔

نے بہت منافع رکھے تھے، ظاہری باطنی دونوں قسم کی برکت اس کو حاصل تھی، اس سے شام کا علاقہ مراد ہے یا شام اور مصر دونوں مراد ہیں، وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ: آپ کے رَبّ کا اچھا وعدہ پورا ہوگیا، پورا ہوگیا آپ کے رَبّ کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر بِمَا صَبَرُوْا: اس میں ''مَا'' مصدریہ ہے، ان کے صبر کرنے کی وجہ سے، مشکلات برداشت کرنے کی وجہ سے آپ کے رَبّ کا وعدہ پورا ہوگیا، وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ: دَمَّرَ تَدْمِیْرًا... دَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ آئے گا،[1] اس کا معنی ہوتا ہے نیست ونابود کردینا، توڑ پھوڑ دینا، ''ہم نے خراب کردیا، نیست ونابود کردیا، توڑ پھوڑ دیا'' مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ: اس چیز کو جو فرعون کرتا تھا، وَقَوْمُهٗ: اور اس کی قوم کرتی تھی، ''جو کچھ فرعون اور اس کی قوم بناتی تھی ہم نے ان کو توڑ پھوڑ دیا، ان کو خراب کردیا'' وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ: عَرَشَ یَعْرِشُ اونچا کرنے کو کہتے ہیں، تو مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ جو وہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے، یہ مفہوم بھی صحیح ہے، اور باغات کے اندر بعض بیلیں ہوا کرتی ہیں جیسے انگور کی، اور ان کو جو اونچا کیا جاتا ہے نیچے سے سہارے دے کے، اس کو بھی عرش کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ (سورۂ انعام: ۱۴۱) یہ لفظ آپ کے سامنے پہلے گزر چکا ہے، ایسے باغات جو کہ سہارے دے کے اونچے کیے ہوئے ہوتے ہیں اور ایسے باغات جن کو سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی، یا تو بیل زمین پہ پھیلتی ہے یا اپنے تنے پہ کھڑے ہوجاتے ہیں، غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کا مصداق ہوتے ہیں جن کے نیچے سہارا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے زمین پہ بیل پھیل گئی، آپ کے ہاں تربوز ہیں خربوزے ہیں، اور اس قسم کی چیزیں زمین پہ پھیل جاتی ہیں، اور یا وہ اپنے تنے پہ کھڑے ہوتے ہیں، جس طرح سے آم کا درخت ہوگیا، انار کا درخت ہوگیا، آپ کے مالٹے سنگترے ہوگئے، کھجوروں کے درخت ہوگئے یہ سب اپنے تنوں پہ کھڑے ہوتے ہیں، اور مَعْرُوْشٰتٍ ہوتے ہیں کہ جن کو نیچے سے سہارا دیا جاتا ہے، جیسے انگور کی بیلیں ہوگئیں، اور مصر کے اندر انگور کی پیداوار بہت تھی، تو مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ کا مفہوم یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ان کے وہ باغات جن کے نیچے وہ سہارے دیتے تھے، ''برباد کردیں ہم نے وہ چیزیں جن کو فرعون اور اس کی قوم بناتی تھی، اور برباد کردیے ہم نے ان کے باغات جن کو وہ اونچا کرتے تھے'' اس طرح سے بھی مفہوم ہوسکتا ہے، یا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ میں باقی سب چیزیں آگئیں اور یَعْرِشُوْنَ کے اندر ان کی عمارات آگئیں، ''جو کچھ فرعون اور اس کی قوم بناتی تھی ان کو اور جو اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کرتے تھے ہم نے سب کو برباد کردیا'' وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ: باء تعدیہ کی آگئی، اور گزار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے، پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو، گزار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے، فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ: پھر وہ اسرائیلی آئے کچھ لوگوں پر، یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ: عَكَفَ عُكُوْفٌ: کسی چیز پہ جم کے بیٹھ جانا، یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ بقرۃ کے اندر بھی گزرا ہے، لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ (آیت: ۱۸۷) عورتوں سے ملاملایا نہ کرو جس وقت کہ تم مسجدوں میں جم کے بیٹھنے والے ہو، یعنی تمہاری اعتکاف کی حالت ہو، اعتکاف کا لفظ اسی سے لیا گیا ہے، اور سورۂ انبیاء کے اندر بھی غالباً لفظ کچھ اس طرح سے

---

(۱) پارہ ۱۵ سورۃ الاسراء آیت ۱۶۔ پارہ ۱۹ سورۃ الفرقان آیت ۳۶۔

آتا ہے مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (آیت:۵۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر میں یہ لفظ آیا ہے، اور سورۂ بقرہ میں ایک اور جگہ بھی یہ لفظ آتا ہے اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (آیت:۱۲۵)، عاکفین کا لفظ وہاں بھی آتا ہے اعتکاف کرنے والے، رکوع سجدہ کرنے والے، طواف کرنے والے اور اعتکاف کرنے والے، تو یہ لفظ مختلف جگہ قرآنِ کریم میں آیا ہے، اور اس کا معنی ہوتا ہے جم کے بیٹھ جانا، کسی چیز سے لگ لپٹ جانا، ''ایسی قوم پر گزرے جو اپنے بتوں پہ جمے بیٹھے تھے'' يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ: اصنام صنم کی جمع ہے، گزرے بنی اسرائیل ایسی قوم پر، '' آئے بنی اسرائیل ایسی قوم پر جو جمے بیٹھے تھے اپنے بتوں پر'' یعنی بتوں کے سامنے اعتکاف کیے ہوئے تھے، جم کے بیٹھ کے ان کی عبادت کر رہے تھے، قَالُوْا: تو بنی اسرائیل نے کہا، يٰمُوْسٰى: اے موسیٰ! خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کرتے ہیں نام کے ساتھ ہی، یہ بھی ان کا ایک ایسے ہی انداز ہے، ورنہ ہمارے ہاں سرورِ کائنات ﷺ کو نام لے کر خطاب کرنے کی ممانعت ہے، یا رسول اللہ، یا نبی اللہ، اس طرح سے خطاب کرتے تھے صحابہ کرام، نام نہیں لیا کرتے تھے، پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جس طرح سے قرآنِ کریم نے جو نقل کیا ہے کہ تو ایسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ امتیں اپنے نبی کو نام لے کے بلاتی تھیں، يٰعِيْسٰى دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ہے (سورۂ مائدہ:۱۱۲)، اس طرح سے يٰمُوْسٰى، یا نوح، يٰمُوْسٰى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا: اے موسیٰ! بنادے ہمارے لیے معبود، كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ: جیسے ان کے لیے مختلف معبود ہیں، جیسے ان کے یہ مختلف معبود ہیں تراشے ہوئے پتھروں کے، لکڑیوں کے، ہمارے لیے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنادے، قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ: بیشک تم جاہل لوگ ہو، تم لوگ ہو جو جہالت کرتے ہو، جاہلوں والے تمہارے جذبات ہیں، اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ: مُتَبَّرٌ یہ مُدَمَّر کے معنی میں ہی ہے، جس طرح سے دَمَّرَ آیا تھا اسی طرح سے یہ تَبَّرَ ہے، ''بیشک یہ لوگ'' مَّا هُمْ فِيْهِ! جس کام میں یہ لگے ہوئے ہیں یہ برباد کیا ہوا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو برباد کیا جائے گا، جیسے حق کے مقابلے میں باطل برباد ہوجایا کرتا ہے، وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں یہ سب باطل ہے، بے بنیاد ہے، یہ حق نہیں کہ جو کسی دلیل پر قائم ہو، یعنی فی الحال باطل ہے، انجام کار متبر ہے، برباد ہو کے رہے گا، ''بیشک یہ لوگ، برباد کی ہوئی ہے وہ چیز جس میں یہ لگے ہوئے ہیں، اور باطل ہے وہ چیز جو یہ کرتے ہیں'' قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا: کیا اللہ کا غیر میں تمہیں الٰہ تلاش کر دوں؟ اَبْغِيْكُمْ: تلاش کر دوں میں تمہیں، اِلٰهًا: معبود، کیا اللہ کا غیر میں تمہیں الٰہ طلب کر دوں، ڈھونڈ دوں، تلاش کر دوں؟ وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: حالانکہ اس نے فضیلت دی تمہیں تمام جہانوں پر، فضیلت دی اس نے تمہیں تمام جہانوں پر، وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: یاد کیجیے (یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پہ احسان جتلایا جارہا ہے) یاد کیجیے جبکہ ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے، يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ: جو تمہیں سخت عذاب پہنچاتے تھے يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ: تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے، وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ: اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے، وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ: ذٰلِكُمْ کا اشارہ اگر يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کی طرف کیا جائے تو بلاء کا معنی مصیبت، ''اس میں مصیبت تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی''، اور اگر ذٰلِكُمْ کا اشارہ اَنْجَيْنٰكُمْ کی طرف کرلیا جائے تو

بلاء انعام کو بھی کہتے ہیں، ''اس میں انعام تھا تمہارے رَبّ کی طرف سے بہت بڑا''، اور اگر دونوں کی طرف، مجموعے کی طرف اشارہ کرلیا جائے فرعونیوں کا عذاب پہنچانا اور اللہ کا نجات دینا، تو بلاء آزمائش کے معنی میں ہے، بلاء کے تینوں معنی آتے ہیں، مصیبت بھی، اِنعام بھی، اور آزمائش بھی، ''اس سارے سلسلے میں'' فرعونیوں کے عذاب دینے میں اور اللہ تعالیٰ کے نجات دینے میں ''تمہارے لیے آزمائش تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بڑی۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور رُکوع میں بیان کردہ مضمون

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے چلا آ رہا ہے فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ یہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ ہے جو فرعون کے ساتھ معاملات پر مشتمل ہے، اور فرعون کے غرق ہونے کے بعد اب یہ دوسرے معاملات بنی اسرائیل کے ساتھ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پیش آئے تھے، اگلی آیات کے اندر وہ مذکور ہیں، فرعون کے غرق ہونے کے ساتھ بنی اسرائیل کے حالات کا ایک حصہ ختم ہوگیا، موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ فرعون سے، اسرائیلیوں کا معاملہ فرعون سے جو چل رہا تھا فرعون کے غرق ہونے کے ساتھ یہ باب ختم ہوگیا، اب اور معاملات اللہ تعالیٰ کے جو اسرائیلیوں کے ساتھ ہوئے ہیں، اگلی آیات کے اندر اُن کو ذکر کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیلیوں کی سیاسی بدحالی اور اللہ کی طرف سے اِنعام

پہلے تو یہ انعام جتلایا کہ یہ اسرائیلی جو کہ مصر کے اندر کمزور سمجھے جاتے تھے، یعنی واقع میں کمزور نہیں تھے، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور طاقت اِن کے ساتھ تھی، حقیقت کے اعتبار سے یہ بہت قوت کے مالک تھے، لیکن ظاہری طور پر چونکہ قبطیوں نے اِن کو غلام بنا رکھا تھا، اور اِن کو سیاسی طور پر بے بس کر دیا تھا، اس لیے سمجھے جاتے تھے کہ یہ ضعیف لوگ ہیں، کمزور ہیں، ان کے پاس کسی قسم کی قدرت نہیں، یہاں سیاسی ضعف مراد ہے، یہ نہیں کہ بدن کے لحاظ سے وہ کمزور تھے، بدن کے لحاظ سے تو یہ بہت قوی تھے، کیونکہ ان کا درجہ تھا مزدوروں والا، جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ گھروں سے گوبر اٹھا کے اوپلے تھاپنے سے لے کر جتنے بھی سخت سے سخت کام تھے، اینٹیں تھاپنے کے، مکان بنانے کے، تعمیرات کرنے کے، وہ سارے کے سارے قبطی انہی اسرائیلیوں سے لیا کرتے تھے، اور ان کو خوب اچھی طرح سے محنت مزدوری کے اندر پیستے تھے، اور ضروریات ان کی پوری نہیں کرتے تھے، ان کی عورتیں گھروں میں کام کرتی تھیں، اور مرد اس قسم کے دوسرے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ تو جو اس قسم کے کام کرنے والے ہوتے ہیں، بدنی طور پر تو مضبوط ہوتے ہیں، معاشی طور پر کمزور تھے، سیاسی لحاظ سے کمزور تھے، کسی قسم کی قوت اور اقتدار ان کو

حاصل نہیں تھا، اس لیے غلامی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے یہ اس علاقے کے اندر کمزور سمجھے جاتے تھے، کہ یہ دبے ہوئے لوگ ہیں۔ تو بدنی قوت یہاں مراد نہیں، بلکہ معاشی قوت اور سیاسی قوت کے لحاظ سے کمزور تھے، اور اقتدار اور عہدہ کے لحاظ سے کمزور تھے، ان کو اس طرح سے دبایا ہوا تھا، اس ملک کے اندر ان کو کمزور سمجھا جاتا تھا، ان کو ہم نے وارث بنا دیا، یعنی فرعونیوں کو غرق کر دیا، اور ان کے غرق کرنے کے بعد زمین کے مالک یہ لوگ ہو گئے، مشرق ومغرب کا مالک بنا دیا یعنی اس علاقے کے مشرق ومغرب، سارے علاقے کے یہ مالک ہو گئے۔

مسجدِ اقصیٰ کی جغرافیائی حیثیت

اب یہاں ارض کے ساتھ چونکہ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا کی صفت لگی ہوئی ہے، اس لیے یہاں سے اصل اشارہ تو نکلتا ہے شام کے علاقے کی طرف، کیونکہ قرآنِ کریم میں زیادہ تر شام کی زمین کو ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ یہ پندرھویں پارے کی ابتدا میں آئے گا، مسجدِ اقصیٰ جس کے ارد گرد علاقے میں ہم نے برکتیں دی ہیں، تو مسجدِ اقصیٰ پرانے جغرافیہ کے لحاظ سے شام میں تھی، اور اس کے ارد گرد کا جو علاقہ ہے وہ برکت والا ہے، انبیاء ﷺ وہاں کثرت سے آئے، اللہ کی رحمت وہاں نازل ہوئی، اور ظاہری طور پر بھی شادابی ہے، پرانے جغرافیہ کے لحاظ سے مسجدِ اقصیٰ کی نسبت شام کی طرف ہے، بعد میں یہ مختلف تقسیمات ہوتی رہیں، سن ۱۹۶۷ء سے قبل مسجدِ اقصیٰ جس کو بیت المقدس کہتے ہیں یہ اُردن میں تھا، اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا تو اب وہ اسرائیل میں ہے۔ اب اگر آپ کہیں کسی تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر وعظ کہتے ہوئے یہ بات کہیں گے کہ بیت المقدس شام میں ہے، تو لوگ ہنسیں گے کہ ان مولویوں کو جغرافیہ نہیں آتا، کہ یہ ہے تو اسرائیل میں، اور یہ کہتا ہے کہ شام میں ہے، کیونکہ شام اب ایک علیحدہ ملک ہے، اسرائیل علیحدہ ملک ہے، اُردن علیحدہ ملک ہے، یہ نئی تقسیم ہے۔ جس طرح سے کوئی باہر کے ملکوں کا رہنے والا ہندوستان کی تاریخ پڑھے ہوئے ہو، اور ہندوستان کا جغرافیہ پڑھے ہوئے ہو، آج وہ تقریر کرتا ہوا کہہ دے کہ لاہور ہندوستان کا ایک بہت بڑا شہر ہے، یا پشاور ہندوستان میں ہے، تو لوگ کہیں گے اس پاگل کو پتا نہیں کہ پشاور تو پاکستان کا شہر ہے، ہندوستان کا کہاں ہے؟ یا لاہور تو پاکستان کا شہر ہے یہ ہندوستان کا کہاں ہے؟ حالانکہ وہ پچاس کتابوں کے حوالے دے دے گا کہ فلاں کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ لاہور ہندوستان کا شہر ہے، فلاں کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ پشاور ہندوستان کا شہر ہے۔ بات اُس کی بھی اپنی جگہ صحیح ہوگی، کہ آج سے ۳۳ سال پہلے یہ سارے کے سارے شہر ہندوستان کے کہلاتے تھے، جس کو ہم متحدہ ہندوستان کہہ سکتے ہیں، تو صوبہ سرحد بھی ہندوستان میں تھا، بلوچستان بھی ہندوستان میں تھا، پنجاب بھی ہندوستان میں تھا، ۳۳ سال قبل یہ دوسرا ملک وجود میں آیا تو اب جغرافیائی نام بدل گیا، اب ایک ہندوستان ہے جو لاہور سے پرے امرتسر پہ ختم ہو گیا، آگے پاکستان شروع ہو گیا، تو ۳۲، ۳۳ سال پہلے پاکستان کو کوئی وجود نہیں تھا، تو یہ نئی تقسیم ہے جغرافیائی، اسی طرح سے نئی تقسیم کے تحت اب بیت المقدس اسرائیل میں ہے، اور اسرائیل کے قبضہ

کرنے سے قبل اُردن میں تھا، ورنہ اصل اس مسجد کی نسبت شام کی طرف ہے۔تو (مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا سے) شام کا علاقہ مراد ہوگا (آلوسی) جو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے اسرائیلیوں کے نکلنے کے بعد (وادیٔ تیہ میں چالیس سال گزارنے کے بعد) فتح کروادیا تھا، عمالقہ قوم ان کے سامنے مفتوح ہوگئی تھی، یا مصر اور شام دونوں مراد ہیں (مظہری)۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى: اللہ تبارک وتعالیٰ کا اچھا وعدہ اسرائیل پر پورا ہوگیا اُن کی مشکلات برداشت کرنے کی وجہ سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انہوں نے ساتھ دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں انہوں نے آپس میں اتفاق پیدا کیا، اور جو بھی تھی آزادی کی تحریک چلی، اور انہوں نے فرعونیوں کا ظلم برداشت کیا، آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دے دی۔اور جو کچھ فرعون کرتا تھا، اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے، باغات سنوارتے تھے، سب ہم نے تباہ کردیے۔تو یہ فرعون کو جو قوت اور طاقت حاصل تھی چونکہ اللہ کے مقابلے میں آگئی، اس لیے اللہ نے نیست ونابود کر کے رکھ دیا، اور ان کمزوروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہوگئی تو اللہ نے ان کو عزت دے دی اور وراثت دے دی۔وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ: اس واقعہ کی تفصیل بھی دوسری آیات میں آپ کے سامنے آئے گی، کہ کس طرح فرعون کی فوجیں پیچھے آئی تھیں، اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں کے لئے سمندر میں راستے بنادیے، اور اسرائیلی آگے گزر گئے، اور فرعونی جس وقت ان راستوں کے اندر گھسے تو پانی آپس میں مل گیا، اور فرعون کی ساری کی ساری فوج بمع فرعون کے وہیں پانی کے اندر غرق ہوگئی۔''ہم نے گزار دیا بنی اسرائیل کو سمندر سے۔''

ماتحت اپنے حاکم کے اثرات قبول کرتا ہے

اب ان کے سامنے فرعون غرق ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اِن کے برسہا برس گزرے، لیکن چونکہ یہ فرعونیوں کے ساتھ رہتے تھے، انہی کے گھروں میں کام کرتے تھے، اور یہ انسان کی ایک کمزوری ہے کہ جو شخص ماتحت ہوتا ہے وہ اپنے حاکم کے اثرات قبول کرتا ہے، چاہے اُس کی تہذیب کتنی گندی کیوں نہ ہو، اور اپنی تہذیب کتنی اچھی کیوں نہ ہو، لیکن حاکم کی تہذیب کے اثرات ماتحتوں پر پڑا کرتے ہیں، دیکھو! انگریز یہاں آیا، جس وقت انگریز یہاں پہلے نہیں آیا تھا تو سارے مسلمان داڑھی بھی رکھتے تھے، لباس بھی اسلامی تھا، نماز بھی پڑھتے تھے، سب کچھ تھا، لیکن انگریز نے آ کر داڑھی رکھنے کی ممانعت نہیں کی کہ داڑھی نہ رکھا کرو، اس نے کوئی وعظ نہیں کہا، اور نہ اس نے یہ کہا کہ نماز نہ پڑھا کرو۔اُس کی اپنی تہذیب جو تھی جس وقت اس نے اپنی وہ تہذیب خوشنما رنگ میں پیش کردی تو بغیر اس کے مجبور کرنے کے قوم انہی کی تہذیب میں رنگی گئی، پینٹ چاہے کتنا ہی بری قسم کا لباس سمجھا جاتا تھا، لیکن جب اُن کو پہنے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی عزت اسی میں سمجھنی شروع کردی، اور اسی طرح سے جب اُن کو دیکھا کہ ہر روز اٹھ کے صبح صبح اپنے کلے (جبڑے) اور گالیں صاف کرتے ہیں (یعنی داڑھی منڈاتے ہیں)، تو انہوں نے بھی صاف کرنا شروع کردیں، تو ماتحت جو ہوتا ہے وہ اپنے حاکم کے اثرات قبول کرتا ہے۔

اِسرائیلوں کی طرف سے مجسم خدا کا مطالبہ اور موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ

تو فرعونی چونکہ بت پرست تھے، اور خاص طور پر گائے اُن کا معبود تھا، گائے کی پُوجا کیا کرتے تھے، تو اسرائیلی بھی کچھ نہ

کچھ بت پرستی کے ساتھ مانوس تھے، تو جب وہ آگے آئے تو ایک قوم ایسی تھی جو اپنے بتوں کے سامنے سجدہ ریز تھی، بیٹھے ہوئے اپنے بتوں کی عبادت کررہے تھے، تو اسرائیلیوں کی وہی رگ پھر پھڑکی، موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی کوئی ایسے ہی بنادے جس کی ہم پوجا کیا کریں، جس طرح سے ان لوگوں نے بنا رکھے ہیں، مطلب یہ تھا کہ جیسے یہ لوگ ان کو سامنے رکھ کر عبادت کرتے ہیں، تو ہمیں بھی کوئی مجسم خدا بنادے تاکہ ہم بھی اُس کو سامنے رکھ کر عبادت کیا کریں، اب یہ بات مشرکانہ تھی، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تنبیہ کی کہ بڑے جاہل لوگ ہو، برسہابرس ہوگئے تمہیں توحید سمجھاتے ہوئے، اور بت پرستی کی تردید کرتے ہوئے لیکن جب موقع آتا ہے تمہاری رگ ایسے ہی پھڑکتی ہے، تو تَجْهَلُوْنَ کے لفظ کے اندر بتادیا کہ یہ تمہاری جہالت کی بات ہے، نادانی کی بات ہے، یہ تمہارے غلط قسم کے جذبات کا نتیجہ ہے کہ تم ایسی بات کرتے ہو۔ یہ تو جو کچھ کررہے ہیں، جو ان کا عمل ہے، جو کردار ہے، جو مذہب ہے، جو نظریہ ہے، اللہ بھی اسے تباہ و برباد کرے گا اور فی الواقع بھی یہ باطل ہے، یہ کسی دلیل پر مبنی نہیں، تو ایسی باطل چیز کی طرف تم راغب ہو حق کو چھوڑ کر؟ اور ایسی چیز کو اپنانا چاہتے ہو جس کو اللہ تعالیٰ آئندہ تباہ و برباد کرنے والے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تنبیہ کی، اور یہ اسی تنبیہ کا حصہ ہے کہ کیا میں تمہیں اللہ کا غیر کوئی الٰہ تلاش کردوں؟ حالانکہ اس نے تمہیں فضیلت دی ہے عالمین پر۔

''فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ'' کی وضاحت

''عالمین پر تمہیں فضیلت دی'' (یہ لفظ پہلے بھی کئی دفعہ گزرا) یعنی بعض معاملات میں، یا اس وقت میں۔ اگر تو العالمین سے عام مراد لیے جائیں کہ تمام جہانوں کے مقابلے میں اسرائیلیوں کو فضیلت حاصل تھی، پھر مراد ہوگا اس وقت کے لوگ، اس وقت ان جیسا کوئی دوسرا نہیں تھا، جتنے انعامات ان پر اللہ تعالیٰ کے ہورہے تھے، اہلِ حق یہ تھے، نبی ان کے ساتھ تھے، اہلِ علم یہ تھے، اس لیے اس وقت تو اُن کو تمام جہانوں پر فضیلت حاصل تھی یعنی باقی لوگوں کے مقابلے میں، اور پھر سرورِ کائنات ﷺ کا زمانہ آیا اور یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو یہ مغضوب ہوگئے، ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا، پھر یہ شرالناس ہوگئے، پھر انہوں نے افضل العالمین کیا ہونا تھا۔ اور اگر اس سے مراد سارے جہان لیے جائیں تو پھر بعض معاملات مراد ہیں، کہ بعض معاملات اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسے کیے ہیں جو کسی کے ساتھ نہیں کیے، دُھوپ کے وقت میں بادل بھیج کے سائے کیے، بھوک کے وقت میں من وسلویٰ عطا کیا، دشمن کو اجتماعی حیثیت میں دریا میں ڈبو کر ماردیا، یہ معاملات ایسے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسرائیلیوں کے ساتھ کیے ہیں، دوسروں کے ساتھ نہیں کیے۔ علمی عنوان کے تحت آپ اس کو یوں ادا کرسکتے ہیں، کہ اگر جزوی فضیلت مراد لی جائے تو پھر سارے جہانوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے اس جزوی فضیلت کے اعتبار سے، اور اگر کلی فضیلت مراد لی جائے تو اس زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا کیا میں اللہ کا غیر تمہیں الٰہ تلاش کردوں حالانکہ اس نے فضیلت تمہیں تمام جہانوں پر۔

بنی اسرائیل کو اِحسان کی یاددہانی اور اس کا مقصد

آگے اللہ تعالیٰ نے یہ احسان جتلایا (سورۂ بقرۃ میں بھی یہ آیت آپ کے سامنے انہی الفاظ کے ساتھ گزری) یاد کیجئے!

جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے۔آلِ فرعون سے فرعون کی اولاد مراد نہیں ہے، جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ فرعون تو ویسے ہی بے اولاد تھا، آلِ فرعون سے فرعون کے متبعین مراد ہیں، فرعون کی فوجیں، فرعون کے دوست، اہل وعیال، جتنے بھی متعلقین ہوتے ہیں وہ سارے کے سارے مراد ہیں، اس لیے اس کا ترجمہ کردیا جاتا ہے فرعون کے لوگوں سے۔''نجات دی ہم نے تمہیں فرعون والوں سے، فرعون کے لوگوں سے، جو تمہیں سخت عذاب پہنچاتے تھے۔'' يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ: قتل کرتے تھے وہ تمہارے بیٹوں کو، وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ: اور زندہ چھوڑتے تھے وہ تمہاری لڑکیوں کو۔تو لڑکیوں کا زندہ چھوڑنا یہ کوئی انعام نہیں تھا، بلکہ لڑکیوں کو اس لیے زندہ چھوڑتے تھے، کہ اِن کی طرف سے خطرہ تو کوئی نہیں تھا، کہ انقلاب لے آئیں گی، اور گھروں میں کام کرنے کی ضرورت تھی، اُن کو گھروں میں باندیوں کے طور پر رکھتے تھے، اور اُن سے گھروں کا کام کرواتے تھے، چونکہ اُن کی طرف سے انقلاب کا ڈر نہیں تھا، اس لیے اُن کو مارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔تو کسی قوم کی لڑکیوں کو زندہ رکھ کے اُن کو اپنے کام کاج میں لگایا جائے، یہ بھی اس قوم کے لیے ایک عذاب ہے، لڑکوں کا قتل کرنا جس طرح سے عذاب ہے لڑکیوں کو زندہ چھوڑ کے اپنے کام میں لانا یہ بھی عذاب ہے، اس لیے دونوں کو برابر سرابر ذکر کیا جارہا ہے، کہ تمہارے لیے یہ بات بھی تکلیف دہ تھی کہ وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے، اور یہ بات بھی تکلیف دہ تھی کہ لڑکوں کو قتل کرکے لڑکیوں کو زندہ رکھ کے پھر اپنے کام میں لاتے تھے۔''اور اس میں آزمائش تھی تمہارے ربّ کی طرف سے بہت بڑی۔'' یہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے جتلایا، اور اس سے مقصد بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار رہیں اور اللہ کی توحید کو پہچانیں، اور نافرمانی کی طرف نہ جائیں۔

حضرت حکیم العصر رحمۃ اللہ علیہ کی سفرِ حج پر روانگی

بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ چودہویں صدی میں آپ کا تفسیر کا آخری سبق ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اب سفر پہ جانا ہوجائے گا، آپ حضرات کی دُعائیں ساتھ رہیں تو خیریت کے ساتھ سفر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا، اگلا سبق ان شاء اللہ العزیز! پندرہویں صدی میں واپس آکر محرّم کے آخر میں پڑھیں گے۔دُعاؤں میں یاد رکھنا، اور اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے گا، میں بھی آپ کے لیے دُعائیں کروں گا۔پاکستان میں واپس آنے کی خواہش اگر ہے کسی درجے میں یا ارادہ ہے تو محض اسی کام کے لئے ہے، کہ اللہ تعالیٰ کچھ قرآن اور حدیث پڑھانے کی توفیق دے دیں گے، ورنہ ہمارا پاکستان میں کچھ نہیں ہے۔تو زندگی رہی اور خیریت سے آگئے تو اللہ تعالیٰ اسی کام میں لگائے رکھے، ورنہ ایمان پر اللہ تعالیٰ خاتمہ کرے اور کسی پاکیزہ زمین میں پیوندِ خاک کردے تو یہ بھی اس کا انعام ہے۔دُعا کی بار بار درخواست ہے، میں بھی ان شاء اللہ! آپ کے لئے دُعا کرتا رہوں گا۔آج ۲۳؍ذیقعدہ ہے، اور کل ۲۴؍ذیقعدہ ہے، ۲۵؍کی صبح کو اِن شاء اللہ! جاؤں گا۔اور اکتوبر کی ۶؍ہوگی، اور ۱۳؍اکتوبر کو آگے پرواز ہے، تو ۱۳؍اکتوبر کو چلے گئے تو اگر ۴۵ دِن ہوئے حکومت کے حساب سے، تو ۱۳؍نومبر کو ایک مہینہ ہوجائے گا، اور ۱۵ دِن اوپر۔تو ۲۰؍محرّم کے آس پاس واپسی کی تاریخ ہوگی۔تو اِن شاء اللہ! آپ کے سہ ماہی سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا، اور اللہ کی توفیق سے پھر کچھ کام ہوتا رہے گا۔

اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ

اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا اور ہم نے تتمہ بنایا ان تیس راتوں کا دس کو، پھر پورا ہو گیا

مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ

اُس کے رَبّ کا متعین کیا ہوا وقت چالیس راتیں، اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا

اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

میرا خلیفہ بن جا میری قوم میں، حالات کو ٹھیک رکھنا اور نہ پیروی کرنا ان لوگوں کے راستے کی جو کہ فساد کرنے والے ہیں ﴿۱۴۲﴾

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ

اور جب آ گئے موسیٰ ہمارے متعین وقت پر اور کلام کی اُس سے اس کے رَبّ نے، موسیٰ نے کہا دکھلا مجھ کو، میں تیری طرف

اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ

دیکھ لوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تُو ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکے گا لیکن دیکھ تُو پہاڑ کی طرف، اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ

مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا

برقرار رہا پھر عنقریب تُو بھی مجھے دیکھ لے گا، پس جس وقت ان کے رَبّ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی تو کر دیا اُس پہاڑ کو ریزہ ریزہ

وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ

اور موسیٰ گر گئے بے ہوش ہو کر، جب موسیٰ کو اِفاقہ ہوا تو کہا اے اللہ! میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں، میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى

اور میں ایمان لانے والے میں سے پہلا ہوں ﴿۱۴۳﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! بے شک میں نے تجھے چُن لیا

النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۫ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ

لوگوں پر اپنے اَحکام کے ساتھ اور اپنی کلام کے ساتھ، پس پکڑ تُو اس چیز کو جو میں نے تجھے دی اور ہو جا تُو

الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً

شکر گزاروں میں سے ﴿۱۴۴﴾ اور لکھ دی ہم نے موسیٰ کے لیے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت

وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا

اور ہر چیز کی تفصیل، (ہم نے کہا کہ) پکڑلو ان تختیوں کو مضبوطی کے ساتھ اور حکم دو اپنی قوم کو کہ وہ اختیار کریں ان تختیوں میں سے

بِاَحْسَنِهَا ۗ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ

احسن کو، عنقریب میں دکھاؤں گا تمہیں نافرمانوں کا ٹھکانا﴿۱۴۵﴾ عنقریب پھیر دوں گا میں اپنی آیات سے

الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ

ان لوگوں کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق، اگر وہ دیکھ لیں ہر قسم کی

اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ

نشانی تو اُس پر ایمان نہیں لائیں گے، اگر وہ دیکھیں گے ہدایت کا راستہ تو اُس کو راستہ اختیار نہیں

سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۗ ذٰلِكَ

کریں گے، اور اگر دیکھیں گے گمراہی کا راستہ تو اس کو راستہ اختیار کرلیں گے، یہ

بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

اس وجہ سے کہ یہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور اُن (آیات) سے غفلت برتتے تھے﴿۱۴۶﴾ اور جو لوگ ہماری آیات کو

وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۗ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

اورآخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں اُن کے اعمال بے کار ہو گئے، نہیں بدلہ دیے جائیں گے وہ مگر اس چیز کا جو وہ کرتے تھے﴿۱۴۷﴾

سفرِ حج سے واپسی

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حج بیت اللہ سے واپسی ۲۵ر محرّم بمطابق ۴ر دسمبر بروز جمعرات ہوئی، صبح دس بجے بہاولپور پہنچ گئے تھے، ساڑھے گیارہ بجے باب العلوم میں پہنچ گئے، کل ۷۴ دِن حرمین شریفین میں گزرے، ۲۶ دِن مکہ معظمہ میں، اور ۲۱ دِن مدینہ منورہ میں، واپس اگرچہ ۲۵ر محرّم کو آگئے لیکن آنے والا ہفتہ چونکہ امتحان کا تھا، اور اس کے بعد پھر طلبہ چھٹی پر چلے گئے، جس کی وجہ سے سبق آج ۸ر صفر (۱۴۰۱ھ) بمطابق ۱۷ر دسمبر کو شروع ہو رہا ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً: اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا، وَاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ:

''ھا'' کی ضمیر ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً کی طرف لوٹ رہی ہے، تو اس کا ترجمہ ہم یوں کریں گے''ان تیس رات کا تتمہ بنادیا ہم نے دس کو، ہم نے تتمہ بنایا ان تیس راتوں کا دس کو'' فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً: پھر پورا ہو گیا اس کے رَبّ کا متعین کیا ہوا وقت چالیس راتیں، تیس راتوں کا تتمہ دس راتیں اور مجموعہ وقت چالیس راتیں پورا ہو گیا، تَمَّ: پورا ہو گیا، مِیْقَاتُ: یہ وقت کے معنی میں ہی ہے لیکن وقت کے مقابلے میں ''میقات'' کا لفظ بطورِ اَخص کے استعمال ہوتا ہے، جیسے اَعم اور اَخص کی نسبت دو لفظوں میں ہوا کرتی ہے، ''وقت'' عام ہے، ''میقات'' خاص ہے، ''میقات'' اس وقت کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کے لئے متعین کر دیا گیا ہو، میقات الصلوۃ، میقات الصیام، یہ لفظ آپ استعمال کرتے ہیں، مواقیتِ صلوٰۃ، متعینہ اوقات، اور لفظ ''وقت'' دونوں معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے چاہے وہ کسی کا متعین کیا ہوا ہو چاہے متعین کیا ہوا نہ ہو، اس میں عموم ہے، اور ''میقات'' اس وقت کو کہیں گے جو کسی کام کے لئے مقدر کر دیا گیا ہو، ''تیرے رَبّ کا متعین کیا ہوا وقت''، یہ ''متعین کیا ہوا وقت'' یہ مفہوم میقات کے لفظ سے اخذ کیا جا رہا ہے، ''موسیٰ علیہ السلام کے رَبّ کا متعین کیا ہوا وقت پورا ہو گیا چالیس راتیں''، وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ: اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنے بھائی کو، لام کا ترجمہ ''لیے'' کے ساتھ نہیں کرنا، جیسے میں نے عرض کیا کہ قال کے بعد، قلتُ لزیدٍ، تو جس وقت زید آپ کا مخاطب ہو تو قلتُ لزیدٍ کا ترجمہ ہوتا ہے میں نے زید کو کہا، یا، زید سے کہا، دونوں طرح سے اس کو ادا کر سکتے ہیں، ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی سے کہا، یا، اپنے بھائی کو کہا''، هٰرُوْنَ: یہ اَخِیْهِ کا بیان ہے، ''اپنے بھائی ہارون سے کہا'' اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ: میرا خلیفہ بن جا میری قوم میں، میرا جانشین ہو جا، یعنی میں جا رہا ہوں، میرے پیچھے تو میرا خلیفہ اور میرا جانشین ہے، جو انتظامی اُمور میرے ذِمّے تھے ان کا انتظام تُو نے کرنا ہے، ''خلیفہ بن جا میرا میری قوم میں'' وَاَصْلِحْ: یہ اَمر کا صیغہ آ گیا، اور اصلاح کر، ''اصلاح کر'' کا مفہوم یہاں ادا کریں گے ''معاملات کو درست رکھنا''، اَصْلِحْ کا یہ معنی ہے، معاملات کو درست رکھنا، انتظام کو ٹھیک رکھنا، یعنی یہ آئندہ کے لئے ہدایت دی جا رہی ہے، اَصْلِحْ امر کا صیغہ ہے، درست کر، ''درست کر'' کے ساتھ اگر آپ ادا کریں گے تو صحیح مفہوم ادا نہیں ہوگا، کیونکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جاتے وقت اپنے بھائی سے کہہ رہے ہیں، اَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ: حالات کو ٹھیک رکھنا اور فساد مچانے والوں کے راستے کی اتباع نہ کرنا، نہ پیروی کرنا ان لوگوں کے راستے کی جو کہ فساد کرنے والے ہیں، وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا: اور جب آ گئے موسیٰ علیہ السلام ہمارے متعین وقت پر، وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ: اور کلام کی اُس موسیٰ سے اس کے رَبّ نے، قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ: اَرِ امر کا صیغہ آ گیا، اَرِنِیْ: دِکھلا مجھ کو اَنْظُرْ اِلَیْكَ: میں تیری طرف دیکھ لوں، اَرِ کا مفعول محذوف ہے، کیا دِکھا؟ اَرِنِیْ: دِکھلا مجھ کو، اَنْظُرْ اِلَیْكَ: میں تیری طرف دیکھ لوں، تو اَنْظُرْ اِلَیْكَ کے اندر بات واضح ہو گئی کہ اَرِ کا مفعول ہے نَفْسَكَ، اپنے آپ کو میرے سامنے نمایاں کر، مجھے اپنا دیدار کرا، حجاب اُٹھا دے تاکہ میں تجھے دیکھ لوں، اَرِنِیْ کا یہ مفہوم ہے، مجھے دِکھا تو اپنا آپ، یعنی اپنے آپ کو تو میرے سامنے نمایاں کر دے، ظاہر کر دے، حجاب اُٹھا دے، اَنْظُرْ اِلَیْكَ: میں تیری طرف دیکھ لوں، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، لَنْ تَرٰىنِیْ: تو ہرگز مجھ کو نہیں دیکھے گا، یا، ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکے گا، وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ: لیکن دیکھ تو، نظر ڈال تو پہاڑ کی طرف، فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ: اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہا، برقرار رہا، اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہا، قرار پکڑے رہا، فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ: پھر عنقریب تو بھی مجھے دیکھ لے گا، اس

میں دوسرا مفہوم یوں نکل آیا کہ اگر پہاڑ ہی نہ برداشت کر سکا اور پہاڑ اپنی جگہ پہ برقرار نہ رہ سکا تو تیرے سامنے یہ بات عیاناً مشاہدۃً آجائے گی کہ تیری آنکھ بھی برداشت نہیں کر سکے گی، یہ دوسرا مفہوم اس سے خود نکل آیا" اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہا پھر تو بھی عنقریب مجھے دیکھ لے گا" فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ: پس جس وقت ظاہر ہوا موسیٰ کا رَبّ لِلْجَبَلِ: پہاڑ کے لئے، جب جلوہ دکھایا موسیٰ کے رَبّ نے پہاڑ کے لئے، تجلّی ڈالی پہاڑ پر، تَجَلّٰى نمایاں ہونے کو کہتے ہیں، جلوہ سے یہ لفظ لیا گیا ہے،" جس وقت ظاہر ہوا موسیٰ علیہ السلام کا رَبّ پہاڑ کے لئے" جَعَلَهٗ دَكًّا: کر دیا اس پہاڑ کو کوٹا ہوا، ریزہ ریزہ، دَكَّ الارض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین کے نشیب وفراز کو ٹھیک کر کے پدھرا (برابر) کر دینا، اسی طرح سے وہ پہاڑ جو تھا وہ ریزہ ریزہ ہو گیا، یوں ہو گیا جس طرح سے ایک میدان ہوتا ہے، وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا: خَرَّ کے معنی گر گئے، صَعِقًا: بے ہوش کر،" موسیٰ علیہ السلام گر گئے بیہوش ہو کر" فَلَمَّاۤ اَفَاقَ: جب موسیٰ علیہ السلام کو افاقہ ہوا، اپنی صحیح حالت پہ آئے، وہ بیہوشی والی کیفیت دُور ہوئی، قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا سُبْحٰنَكَ: اے اللہ! میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں، تُبْتُ اِلَیْكَ: میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں، وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور میں ایمان لانے والوں میں سے پہلا ہوں، اوّل ایمان لانے والا ہوں، مؤمنین میں سے اوّل ہوں، یعنی سب سے پہلے یقین کرنے والا ہوں، تفصیل اس کی بعد میں آجائے گی، قَالَ یٰمُوْسٰۤى: اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ: بیشک میں نے تجھے چُن لیا عَلَى النَّاسِ: لوگوں پر، بِرِسٰلٰتِیْ: اپنے احکام کے ساتھ، وَبِكَلَامِیْ: اور اپنی کلام کے ساتھ، فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ: پس پکڑ تو اس چیز کو جو میں نے تجھے دی، جو چیز میں نے تجھے دی اسے تو پکڑ، وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ: اور ہو جا تو شکر گزاروں میں سے، شاکر کا مفہوم آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا، اصل میں شاکر "قدردان" کو کہتے ہیں،" ہو جا تو قدردانوں میں سے"، شکرِ نعمت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس نعمت کی قدر کی جائے، وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ: الواح لوح کی جمع ہے، لوح تختی کو کہتے ہیں، اور لکھا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے تختیوں میں، مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ: ہر چیز سے نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل، كُلِّ شَیْءٍ یہاں جو آیا ہے، کلام کے اندر جب اس قسم کا جو لفظ آیا ہوا ہوتا ہے یعنی لفظ کُل، تو یہ استغراقِ حقیقی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ جس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اسی کے متعلقات مراد ہوتے ہیں،" ہم نے ہر قسم کی نصیحت اسے کر دی، ہر چیز کی تفصیل بتا دی" یعنی وہ اشیاء جن کی موسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی قوم کو ضرورت تھی، ان کے ماحول میں جن چیزوں کی ضرورت تھی بطور نصیحت کے کہنے کی وہ ہم نے نصیحتیں کر دیں، اور جس چیز کی تفصیل بتانے کی ضرورت تھی تفصیل بتا دی، تو یہ کُل اس ماحول کے اعتبار سے ہے،" لکھ دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل"، فَخُذْهَا: اس سے پہلے فعل محذوف ہوگا کہ ہم نے کہا کہ لے لے ان تختیوں کو، پکڑ لے ان تختیوں کو، بِقُوَّةٍ: مضبوطی کے ساتھ، پوری قوت کے ساتھ ان تختیوں کو تھام لو، وَاْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا: اور حکم دو اپنی قوم کو کہ وہ اختیار کریں ان تختیوں میں سے احسن کو، بِاَحْسَنِهَا کا مفہوم یہاں یہ ہوگا جس کو ہم اپنی زبان میں یوں ادا کریں گے کہ ان تختیوں میں جو بہترین باتیں ہیں وہ اختیار کریں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ پچھلے رکوع میں موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کا واقعہ بیان ہوتے ہوئے بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار دیا اور فرعونیوں کو غرق کردیا، فرعونیوں کے غرق ہوجانے کے بعد بنی اسرائیل کسی درجے میں مطمئن ہوئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اب اگر ہمارے لیے کوئی شریعت آجائے ہم اُس پر عمل کریں گے، کوئی قانون اترنا چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایات آنی چاہئیں، جیسے کہ واقعہ مفسرین نے لکھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے درخواست کی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ طور پر آجاؤ، اور آکے ایک چلہ گزارو، اور اُس کے بعد تمہیں کتاب دے دی جائے گی۔

چالیس دِن کو دو حصوں میں ذِکر کرنے کی وجوہات

سورۂ بقرہ میں جہاں واقعات کا سلسلہ آیا تھا، وہاں اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اکٹھا ذکر کیا گیا تھا، وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ کیا، تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ارشاد ہوا تھا وہ چالیس رات کے متعلق ہی تھا، اور یہاں اُس کو دو حصوں میں کر کے ذکر کردیا گیا، ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً کو علیحدہ ذکر کردیا گیا، وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ کو علیحدہ ذکر کردیا گیا، کہ پھر ان کا تتمہ دس راتوں کو بنایا گیا، اس طرح سے وقت معین چالیس راتیں پورا ہوگیا، معلوم یہاں سے بھی یہی ہوا کہ وقت معین چالیس راتیں ہی تھیں، لیکن ان کو تیس اور دس دو ٹکڑوں میں کر کے ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ ممکن ہے کہ یہ چالیس کے لیے ایک اندازِ بیان ہی ہو (تفسیر عثمانی)۔

۲۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تیس دن بطور عزیمت کے ہوں اور دس کا اضافہ بطور رُخصت کے ہو، کہ کم از کم تیس دِن اور زیادہ سے زیادہ چالیس دن، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زیادہ سے زیادہ مدت کو پورا کیا، جیسا کہ سورۂ قصص میں آپ کے سامنے آئے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاں گئے ہیں، اور حضرت شعیب علیہ السلام نے مطالبہ کیا تھا، کہ تو میری بکریاں چَرا تو میں ایک بیٹی کا نکاح تیرے ساتھ کردوں گا، وہاں ذکر کیا تھا کہ اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (آیت:۲۷) کہ میں تیرے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرتا ہوں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال تک بکریاں چَرا، میرے پاس اُجرت پہ کام کر، اور اگر تُو دس سال پورے کردے تو یہ تیری مرضی۔ تو گویا کہ آٹھ سال ضروری اور دس سال جو ہیں اگر کردو گے تو یہ تمہاری طرف سے ایک اچھا معاملہ ہے، اور اگر نہ پورا کرو تو میری طرف سے کوئی زور نہیں ہوگا، کم از کم آٹھ سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال۔ تو وہاں بھی تفاسیر کے اندر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال تک ہی وہاں اُجیرانہ کام کیا۔ اُجرت کے طور پر، مزدوروں کی طرح دس سال ہی کام کیا، تو زائد مدت ایک استحبابی مدت ہے۔ تو اسی طرح سے یہاں ہو کہ کم از کم تیس دِن اور زیادہ سے زیادہ چالیس

دن، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس دن زائد گزارے، جس سے چلّہ پورا ہوگیا، اور اللہ کے علم میں بھی یہی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اعلیٰ معیار کو اختیار کریں گے، تو اس طرح سے چالیس رات کا جو وقت تھا وہ تمام ہوگیا (تفسیر عثانی)۔

۳- اور ایسا بھی ہوسکتا ہے، یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ تیس راتیں گزرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کتاب کا نزول شروع ہوگیا ہو اور دس راتوں میں اُس کو مکمل کردیا گیا، اس طرح سے چالیس راتیں پوری ہونے کے بعد وہ الواح اور تختیاں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی تھیں اُتری تھیں وہ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فارغ ہوگئے۔ تو دس دن گویا کہ نزولِ کتاب کے لئے، نزولِ الواح کے لئے ہوگئے، اور تیس دن کے بعد اُس کا نزول شروع ہوگیا تھا، اور دس دن اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کے تحت صرف ہوئے، اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چلّہ پورا ہوگیا۔[1]

موسیٰ علیہ السلام کی چلّہ گاہ اور وہاں موجود معبد خانے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جو چلّہ گزارا ہے، تاریخی روایات میں مذکور ہے، جس کو مفسرین نے نقل کیا کہ کوہِ طور پر ایک غار ہے، اور اس غار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا وقت گزارا ہے، اور اسی غار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الواح اتری ہیں، اور آج تک وہ غار لوگوں کے لئے زیارت گاہ ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے بھی مانا تو وہاں اُس غار کے پاس یہودیوں کا معبد بھی ہے، اور عیسائی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں میں سے تھے تو اُن کا وہاں گرجا بھی ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے مسلمان بھی تھے، تو جس وقت وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا، تو انہوں نے اُس کے پاس ایک مسجد بھی بنادی، تو گویا کہ اس علاقے میں جہاں لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس غار کی زیارت کے لیے جاتے ہیں، جو کہ طورِ سینا پر ہے جس کو آج کل ''جبلِ موسیٰ'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، تو وہاں یہودیوں کا معبد بھی ہے، عیسائیوں کا معبد بھی ہے اور مسلمانوں کا معبد بھی ہے۔

خلوت گزینی کی ضرورت واہمیت

تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے، کہ فیضانِ الٰہی اخذ کرنے کے لئے کسی درجے میں خلوت بہت ضروری ہے، جس وقت تک انسان کہیں تنہائی اور خلوت میں بیٹھ کر اللہ کو یاد نہیں کرتا، تفکر وتدبر کے ساتھ وقت نہیں گزارتا، اس وقت تک قلب کے اندر وہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلیات اور اُس کے فیوض کو اخذ کرتی ہے، انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں کچھ اس قسم کے واقعات ہیں۔ اوروں کو رہنے دیجئے، خود سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی کی ابتدا بھی ایسے ہی ہے، کہ جس وقت آپ اس عمر کو پہنچے جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی آپ پر نازل ہونا تھی، تو اس وقت جیسے بخاری شریف (ص: ۲) میں آتا ہے: ''حُبِّبَ إِلَیْهِ الخَلَاءُ'' سرورِ کائنات ﷺ کی طرف خلوت کو محبوب بنادیا گیا، خلوت میں آپ کا دل بہت لگتا تھا، تنہائی میں، جہاں مخلوق میں سے کوئی نہ ہو، تو پھر خلوت اختیار کرنے کے لئے آپ نے بھی غارِ حرا کو اختیار کیا، وہ حرا بھی پہاڑ ہے جس کی

---

(۱) وَالوَجهُ الثَّانِی... ثُمَّ أُنزِلَتِ التَّورَاةُ عَلَیهِ فِی العَشرِ البَوَاقِی وَكَلَّمَهُ أَیضًا فِیهِ فَهٰذَا هُوَ الفَائِدَةُ فِی تَفصِیلِ الأَربَعِینَ إِلَی الثَّلَاثِینَ وَإِلَی العَشرِ (الاتفسیر کبیر)۔ نوٹ: عام تفاسیر میں یہ قول ہے کہ تیس دن کے بعد مسواک کرلی تھی اس لیے مزید دس روزوں کا حکم ہوا۔ (نسفی، جلالین، بغوی، خازن، مظہری، وغیرہ)۔

چوٹی پر یہ غار ہے، اور اتنے دشوار گزار راستے میں ہے، کہ اس زمانہ میں وہاں کون آتا ہوگا، کسی کے آنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ تو وہیں آپ خلوت اختیار کرتے تھے، اور وہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ پر بھی نزولِ وحی ہوا۔ تو اس طرح سے روحانی کمالات حاصل کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیوض اخذ کرنے کے لئے، معلوم یونہی ہوتا ہے کہ خلوت ضروری ہے، جب تک تنہائی اور علیحدگی میں بیٹھ کے انسان کچھ وقت اپنے اللہ کو یاد نہیں کر لیتا، اور دل پر مشق نہیں کرتا، اُس وقت تک دل کی صلاحیتیں اُجاگر نہیں ہوتیں۔ ہندوستان میں ایک قومی شاعر گزرے ہیں اکبر الٰہ آبادی، بہت اچھے شاعر تھے، جس طرح علامہ اقبال ہیں اسی طرح وہ بھی قومی شاعر ہیں، اور اُن کی نظمیں بڑی اچھی اچھی ہیں، اُن کا ایک شعر ہے جو انہی الفاظ پر ہی مشتمل ہے:

خدا کی قدرت دیکھئے، کیا پیچھے ہے کیا پہلے　　　نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

کہ حضور ﷺ کی زندگی میں بدر جیسے معرکے بھی ہوئے، جہاں مخلوق کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، لڑائی ہوئی، تلواریں چلیں، کشاکشی ہوئی، لیکن یہ بدر کی صلاحیت پیدا ہونے سے قبل اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی غار میں ہی وقت گزارنے کا موقع دیا، تو گویا کہ غاروں میں رہنا، تنہائی اختیار کرنا، خلوت میں بیٹھ کے اپنے قلب پر مشق کرنا، اس سے میدان میں اترنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اور آج ہمارے ہاں جو بدنظمی ہے اور بے برکتی ہے (اشارہ کر دوں، اس بات کو سمجھ لیں) کہ جدوجہد تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے بھی زیادہ ہے، درس پہلے سے زیادہ، تقریریں پہلے سے زیادہ، جلسے پہلے سے زیادہ، اور صبح کے وقت شہروں میں جا کے دیکھو، اس وقت سارے شہر لاؤڈ سپیکروں کے ساتھ گونج رہے ہوتے ہیں، علمائے کرام اپنے جوہر دکھاتے ہیں، زور لگا لگا کے خوب بیان کرتے ہیں۔ تو جلسے، جلوس، درس، مدرسے سب کچھ زیادہ ہو گیا، لیکن دن بدن ظلمت بڑھتی جا رہی ہے، اور جو حق کی نورانیت تھی وہ ختم ہوتی جا رہی ہے، ظاہرداری بہت ہو گئی، فیضان نہیں ہے، اور اس کی وجہ اس کے بغیر کچھ نہیں کہ اس دین کی نشر واشاعت کرنے والوں نے خلوت گزینی کی زندگی ترک کر دی، خلوت میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنا، مراقبہ، ذکر اذکار، اس قسم کی چیزیں جن سے قلب میں صلاحیت پیدا ہوتی تھی، پھر وہ صلاحیت ایسی تھی کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب کے اوپر فیضان ہوتا ہے، وہ فیضان پھر مخلوق کے اندر جس وقت جاتا ہے تو پھر ہدایت پھیلتی ہے۔ اور اب ہمارے قلوب تو خالی ہیں، قلوب میں تو صلاحیت ہی نہیں ہے، زبان شور مچاتی چلی جائے، تو یہ ہمیشہ ہے کہ جس وقت بات دِل سے اُٹھتی ہے تو دل پہ گرتی ہے، اور جس وقت شور صرف زبان سے مچایا جاتا ہے، تو کان تک آواز رہتی ہے، قلب تک نہیں جایا کرتی، فارسی کا محاورہ آپ نے سنا ہوگا ''از دل خیزد بردل ریزد'' کہ جو بات دل کی گہرائیوں سے اٹھا کرتی ہے، انسان پورے خلوص کے ساتھ دل کی گہرائی سے کہتا ہے، تو ان لفظوں میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ وہ کان میں جا کے وہ قلب تک ضرور پہنچتے ہیں اور اپنا اثر دکھاتے ہیں، اور جو صرف زبان زبان سے بات ہوتی ہے وہ اتنی ہلکی پھلکی سی ہوتی ہے کہ کانوں سے ٹکرا کے واپس آ جاتی ہے، نہ وہ کوئی قلب میں انقلاب لائے، نہ وہ کوئی دماغ میں انقلاب لائے۔

خلوت میں بیٹھ کر جس طرح سے اپنے قلب کو سنوارا جاتا ہے اُس کی مثال بلاتشبیہ یوں سمجھ لیجئے، کہ آپ نے آتشی شیشے دیکھے ہوں گے، ایک تو یہ عام شیشہ ہے، اور ایک آتشی شیشہ ہوتا ہے، آتشی شیشے کو جس وقت آپ سورج کے بالمقابل کرتے ہیں، تو وہ

سورج کی اتنی حرارت اخذ کرتا ہے کہ پھر جہاں اُس کی شعاع پڑتی ہے وہاں بھی آگ لگا دیتا ہے۔ وہ آگ کیوں لگ جاتی ہے؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس آتشی شیشہ نے سورج کی حرارت کو اتنا اخذ کر لیا، (سورج کے بالمقابل اسے نہ کرو، ویسے یہاں اس کی شعاع ڈالتے رہو، کچھ نہیں بنے گا) سورج کے بالمقابل کر کے اس کی شعاع جس وقت آپ ڈالیں گے تو آگے جو آگ لگتی ہے، دیکھا ہوگا آپ نے کئی دفعہ، اس آگ لگنے کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس شیشے کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ اس نے سورج کی گرمی اتنی اخذ کر لی، کہ اب جو چیز بھی اس کے بالمقابل آئے گی اُس کو آگ لگ جائے گی۔ تو بالکل اسی طرح ماحول کے اندر بعض قلوب اس قسم کے ہوتے ہیں، کہ جن قلوب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان ہوتا ہے، پھر جو قلوب اُس کے بالمقابل آجاتے ہیں، اور عقیدت اور محبت سے اس کے ساتھ جڑ جاتے ہیں، وہ پھر ان فیوض سے محروم نہیں رہتے، اور اگر کوئی قلب بھی اس ماحول کے اندر ایسا نہیں، کہ جس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط صحیح ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے قلب کے اوپر فیضان ہو، جس ماحول کے اندر کوئی قلب بھی ایسا نہ ہو، وہاں نُورِ ہدایت نہیں پھیلتا۔ چاہے ظاہری طور پر آپ کتنا ہی شور مچاتے رہیں، نعرے لگاتے رہیں، تقریریں کرتے رہیں، ہنگامے برپا کرتے رہیں، لیکن قلوب ویران کے ویران ہوں گے، قلوب اگر روشن ہوتے ہیں تو قلوب سے ہی ہوتے ہیں، اور قلوب روشن ہوتے ہیں خلوت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق تفکر و تدبر کرنے سے۔ تو انبیاء ؑ کی زندگی سے بھی سبق ملتا ہے، اور انبیاء ؑ کے بعد اس وقت تک جتنا اولیاء اللہ کا سلسلہ ہے، ہر سلسلہ کے اندر خلوت کی اہمیت موجود ہے۔ صبح کو اٹھو، آدھی رات کے بعد جب ساری مخلوق سوئی ہوئی ہو، ایسے وقت میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرو، اور دن میں بھی زیادہ ہنگامہ آرائی کی بجائے وقت کچھ خلوت میں گزارو، تو علیحدگی میں بیٹھ کے جب اللہ کو یاد کرو گے تو اس طریقہ کے ساتھ قلب آباد ہوتے ہیں، جب ایک قلب آباد ہوتا ہے تو پھر دوسرے جب اُس کے ساتھ جڑتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کا ربط پیدا ہوتا ہے، محبت اور عقیدت کے ساتھ ادھر متوجہ ہوتے ہیں، تو اُن کو بھی ایسے ہی روشنی مل جاتی ہے، جس طرح سے آتشی شیشہ جب سورج کے بالمقابل ہوتا ہے، تو جو چیز اُس کے بالمقابل آجائے تو اُس کو آگ لگ جاتی ہے، انبیاء ؑ کے قلوب ایسے ہوتے ہیں، انبیاء ؑ کے بعد اُن کے جانشینوں کے قلوب ایسے ہوتے ہیں، تو جن کے قلوب روشن ہو جائیں پھر اُن کے ساتھ جڑنے سے آگے فیضان ہوتا ہے، اور ہمارے ہاں یہ قصہ ختم ہوگیا، ہم خلوت میں بیٹھ کے اللہ تعالیٰ کے انوار کو اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہدایت کو اخذ ہی نہیں کرتے اپنے قلوب میں، جب اخذ نہیں کرتے تو مخلوق میں جا کے زبان سے ہم جتنا چاہیں شور مچاتے رہیں، ڈھول کی طرح کھڑکتے رہیں، تو وقتی طور تو شور برپا ہو جائے گا لیکن جب وہاں سے اُٹھ کے جائیں گے تو کپڑے جھاڑ کے چلے جائیں گے اور دل دماغ جیسے تھا ویسے کا ویسے رہ جائے گا، اتنا ہی حاصل ہوتا ہے ہمارے جلسوں کا اور ہمارے اس قسم کے اجتماعات کا، باقی اس سے ہدایت نہیں پھیلتی، وجہ یہی ہے کہ جو پھیلانے کے لئے مامور ہیں، جو پھیلانے کے لیے سامنے آئے ہوئے ہیں، اُن کے قلوب کے اندر کوئی نُورِ الٰہی نہیں ہے۔ حضرت (مولانا عبدالقادر صاحب) رائے پوری ؒ کی سوانح میں لکھا ہے کہ حضرت کی مجلس میں جگر مرادآبادی نے ایک شعر پڑھا جس کو حضرت نے بہت پسند فرمایا:

واعظ کا ہر اِک ارشاد بجا، تقریر بہت دِلچسپ مگر
آنکھوں میں سُرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نُور نہیں (۱)

اس کا مطلب یہی ہے کہ واعظ کا وعظ سنو، ہر بات سولہ آنے صحیح ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور تقریر میں مزہ بھی بہت ہے، باتیں بھی صحیح ہیں اور تقریر بھی بڑی پُرلطف ہے، لیکن چہرے پہ نُورِ یقین نہیں، اور آنکھوں میں سُرورِ عشق نہیں، یہی فرق ہے کہ جس کی وجہ سے آگے اس کے اثرات پیدا نہیں ہوتے، اور آگے لوگوں پہ اس کا فیضان نہیں ہوتا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چلہ کشی گویا کہ یہی بنیاد ہے اولیاء اللہ کی چلہ کشی کی اور خلوت گزینی کی۔

''چالیس دِن'' کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟

اور چالیس دن کو اہمیت اس لیے دی جاتی ہے، کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی خلقت کے اندر بھی چالیس دِن کو تغیر کا ذریعہ بنایا ہے، مشکوٰۃ شریف میں باب القدر کے اندر وہ روایات آپ نے پڑھ لی ہوں گی، (۲) کہ یہ تغیر جو نمایاں ہوتا ہے تو چالیس چالیس دن کے بعد ہی ہوتا ہے، نطفے کی شکل دوسری ہوئی، چالیس دن کے بعد پھر دوسری شکل بدلی، چالیس دن کے بعد پھر تیسری بدلی، چالیس کے بعد جب چار مہینے پورے ہو جاتے ہیں پھر اس پر روح کا فیضان ہوتا ہے، تو یہ اثرات جو ہیں انسان کی طبیعت پر، اس طرح سے چالیس دن تک اگر کوئی چیز پابندی کے ساتھ کر لی جائے تو کچھ عادت پڑ جاتی ہے، اور انسان کی طبیعت کے اندر کچھ تغیر سا آ جاتا ہے۔ یہ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً پر ایک بات ذہن میں آ گئی تھی جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے خلوت میں بلایا، اور ان سے یہ ریاضت اور مجاہدہ خلوت میں کرایا، اور سرورِ کائنات ﷺ کی غارِ حرا کی زندگی بھی بالکل اسی کے مشابہ ہے۔ تو وعدہ فرمالیا، وعدہ فرمانے کے بعد وہ الواح دے دیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور خلیفہ بنانا

تو اس رکوع کے اندر اس واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت گئے تھے تو جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور خلیفہ بنا گئے تھے، آپ سورۂ طٰہٰ کے اندر مفصل پڑھیں گے کہ جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے موقع پر، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر آگ لینے گئے تھے، اور وہاں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ ہو گیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے تبلیغ کرنے پر مکلف کر دیا گیا تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی کہ میرے بھائی کو میرا وزیر بنا دیا جائے، وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ: میرے بھائی کو میرا وزیر بنا دو، اور اس کے ذریعے سے میری قوت کو مضبوط کر دو، اس قسم کے الفاظ سورۂ طٰہٰ کے اندر آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ سے ہارون علیہ السلام کے متعلق مطالبہ کیا تھا، کہ اس کو میرا وزیر بنا دیا جائے، وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ (سورۂ طٰہٰ: ۲۹ تا ۳۲) اس کو بھی میرے اَمرِ تبلیغ میں شریک کر دو۔ چنانچہ پھر ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنا کر اس اَمرِ تبلیغ میں شریک

(۱) سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری ص ۹۰، بعنوان قلب کا خلا اور بگاڑ۔

(۲) مشکوٰۃ ص ۲۰ باب الایمان بالقدر فصل اول۔ بخاری ۱/ ۴۵۶ باب ذکر الملائکۃ۔ ۱/ ۴۶۹ باب خلق آدم۔

کر دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بطور وزیر کے مانگا تھا، ہیں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی۔ تو اصل تو تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی، اور نائب تھے حضرت ہارون علیہ السلام، تو جس طرح سے نائب اصل کے چلے جانے کے بعد اصل ہو جایا کرتا ہے، اور انتظامی اختیارات اُس کو حاصل ہو جاتے ہیں، اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لے جارہے تھے تو اُن کو سارے کا سارا معاملہ سپرد کر گئے، کہ اب میں تو جارہا ہوں، بنی اسرائیل کے حالات کی نگرانی آپ نے کرنی ہے، اور اس میں ہوشیار رہنا، کہ بعض شریر لوگ ہیں جو آئے دن شرارت برپا کرتے رہتے ہیں، کہیں اُن کے راستے پر نہ چل پڑیو، اُن کی بات مان کے کہیں فساد میں نہ آجائیو، یہ ہدایات دے کے چلے گئے۔ اور پھر طور پر کیا معاملہ ہوا، وہ اس رکوع میں مذکور ہے، اور ہارون علیہ السلام کے ساتھ قوم نے کیا کیا، اور قوم کن حالات میں میں مبتلا ہوئی وہ آگے آرہا ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تیس راتوں کا وعدہ کیا، وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ: ان تیس راتوں کو پورا کیا ہم نے دس کے ساتھ، دس کو ان تیس راتوں کا ہم نے تتمہ بنا دیا، پھر پورا ہو گیا اس کے رَبّ کا متعین کیا وقت چالیس راتیں۔ اور کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو، تو میرا جانشین ہو جا میری قوم میں، یعنی میرے بعد تو ہی بااختیار ہے، اور جس قسم کے انتظامی اُمور میں مجھے اختیارات حاصل تھے وہ اب تجھے ہیں۔ ''خلیفہ ہو جا میرا میری قوم میں'' وَاَصْلِحْ: اور حالات کو درست رکھنا، اصلاح کرتے رہنا، نگرانی رکھنا، کسی طرف سے کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔

موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کو ہدایات دینا

وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ: مفسدین کے راستہ کی اتباع نہ کرنا۔ ان مفسدین سے کون مراد ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ جماعت میں، قوم میں کچھ اس قسم کے افراد ہوتے ہیں، جن کو یہ بیماری ہوتی ہے کہ اچھے کام کرنے میں اُن کو لطف نہیں آتا جتنا گڑبڑ کرنے اور شرارت پھیلانے میں اُن کو لطف آیا کرتا ہے، اور یہ لوگ نمایاں ہوتے ہیں کہ جب شرارت ہوگی وہاں سے اٹھے گی، جب فتنہ پھیلائے گا فلاں شخص پھیلائے گا، گڑبڑ جب ہوگی تو فلاں شخص کی طرف سے ہی ہوگی، جس طرح سے شرفاء ممتاز ہوا کرتے ہیں اسی طرح سے قوم کے اندر شرپسند بھی ممتاز ہوتے ہیں، چاہے وہ رعب اور دبدبے میں آکے دبے رہیں، لیکن جب بھی موقع ملے گا کریں گے وہ گڑبڑ ہی، اُن کی طرف سے اصلاح کی توقع کم ہوتی ہے، تو مفسدین کا لفظ بول کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کچھ اسی قسم کے اشخاص کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا ذرا خیال رکھنا، وہ گڑبڑ کرنے نہ پائیں، اور اگر وہ کوئی گڑبڑ کریں تو پھر آپ نے محتاط رہنا ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی کسی غلط راستے پر ڈال دیں، ان کی بات نہ ماننا، ان کی طرف سے ہوشیار رہنا، تو ہو سکتا ہے کہ المفسدین سے اسی قسم کے افراد کی طرف اشارہ ہو جس قسم کے افراد ماحول میں، جماعت میں، قوم میں نمایاں ہوتے ہیں، جن کی فطرت ہوتی ہے عقربی، ڈنک مارنے والی، یا گڑبڑ پھیلانے والی، اُن کو اچھائی کے اندر اتنا لطف نہیں آتا جتنا کہ شرارت کرنے میں، گڑبڑ کرنے میں، دوسروں کو پریشان کرنے میں لطف آتا ہے۔ تو اس قسم کے افراد کی نشاندہی کر دی کہ ان لوگوں کے راستے سے بچ کے رہنا،

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی سازش کر کے کوئی فتنہ اٹھا کے تجھے بھی پھسلا دیں، ان کے راستے کی اتباع نہ کرنا، یہ تو ہدایت دے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے۔

موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے دیدار کا مطالبہ

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا: جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے وقت معین پہ آگئے، وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ: اور وقت گزرنے کے بعد وعدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام ہوئی، جیسے اُس کی شان کے لائق، کسی خاص انداز کے ساتھ، براہِ راست، بلاواسطہ فرشتے کے، فرشتے کا یہاں واسطہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بات کی، جب بات کی تو محبت تو انبیاء علیہم السلام کے قلوب میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلے ہی بہت ہوتی ہے، یعنی ایک چیز اَن دیکھی ہے، اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی، دور رہتے ہوئے، مثال کے طور پر درمیان میں حجاب ہیں، پردے ہیں، آپ غائبانہ عقیدت کے ساتھ ایک شخصیت سے محبت لگائے بیٹھے ہیں، اور اگر کبھی ایسا موقع آجائے کہ بالکل درمیان میں ایک پردہ لٹکا ہوا ہے اور پرلی طرف سے بیٹھے ہوئے وہ آپ سے بات کر رہے ہیں، تو اس وقت پھر دیدار کی تمنا کا اُبھر آنا ایک فطرت ہے، جب اتنا تعلق ہوگیا کہ براہِ راست گفتگو ہو رہی ہے، اور درمیان میں حجاب ہے، اور واسطہ درمیان میں کوئی نہیں، تو ایسے وقت میں پھر کتنی تڑپ ہوتی ہے انسان کے دل میں، کہ ہم اس کو دیکھ بھی لیں، جیسا کہ غالباً مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے کہ:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد(۱)

کہ عشق کا جوش ہمیشہ زیارت کرنے سے اور دیکھنے سے نہیں چڑھا کرتا، کبھی کبھی گفتگو کرنے سے بھی جوش مار آتا ہے، باتیں سننے کے ساتھ بھی کبھی کبھی یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ گفتگو ہوئی، تو وہی عشق بھڑک اٹھا، تو گویا کہ کان تو اللہ تعالیٰ کی کلام کے ساتھ لذت اٹھا ہی رہے تھے، اب آنکھیں جو ترسیں اور جوش جو چڑھا تو اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کر دیا کہ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ: یا اللہ! اتنی سی مہربانی اور کر دے، باتیں تو ہو رہی ہیں، اب اپنے آپ کو مجھے دکھا بھی دے تا کہ میں تجھے دیکھ لوں، رُؤیت کا مطالبہ کر لیا۔

دِیدارِ الٰہی عقلاً ممکن ہے، شرعاً ممتنع ہے

تو موسیٰ علیہ السلام کا یہ مطالبہ کرنا کہ ''اے اللہ! تو مجھے اپنا آپ دکھا دے، میں تجھے دیکھ لوں'' یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کا دیکھا جانا ممکن ہے، عقل اس بات کو گوارا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نظر آجائے، کیونکہ اگر عقل ہی گوارا نہ کرتی اور یہ بات عقل کے ہی خلاف ہوتی، عقلاً ممتنع ہوتی تو نبی جو اپنے وقت میں اعقل الناس ہوتا ہے، سب سے زیادہ عقل مند، وہ اس قسم کی ممتنع چیز کا مطالبہ نہ کرتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ کرنا یہ علامت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے، عقلاً یہ چیز ممکن ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے جواب دینے کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں ہے، (عقلاً) اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے

---

(۱) دیکھئے یوسف زلیخا: بخش ۹ بعنوان داستان دختر۔

لیکن شرعاً ممتنع ہے، اللہ کی مصلحت کا تقاضا نہیں کہ اس طرح کسی کے سامنے نمایاں ہو، کیونکہ اس مادی زندگی میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جس کمزور بنیاد پر قائم کیا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (سورۂ نساء:۲۸)، وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو یہاں رہتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے، ہاں! ایک وقت آئے گا جب رُوحانیت کا غلبہ ہوجائے گا، اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت ہوگی، اور تمام جنتیوں کو ہوگی، جس طرح سے روایاتِ صحیحہ کے اندر موجود ہے...... تو نبی وقت کا اعقل الناس ہوتا ہے، سب سے زیادہ عقل مند، تو جو انبیاء علیہم السلام کے جانشین ہوا کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے ورثاء ہوا کرتے ہیں، وہ بھی عقل مند قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ بزرگی اور مقبولیت انہی میں زیادہ آگئی، آدمی جتنا بڑا پاگل ہوجائے اتنا ہی کہتے ہیں یہ اللہ والا ہے، اور جو آدمی عقل کے مطابق چلنے والا ہو، سمجھ بوجھ کے ساتھ کام کرنے والا ہو، اُس کو کوئی بزرگ ماننے کے لیے جلدی سے تیار نہیں ہوتا، حالانکہ انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ سمجھدار اور عقل مند ہوتے ہیں، اور اُن کے جانشین بھی اسی طرح سے عقل منداور سمجھ دار ہونے چاہئیں، جو سوچ سوچ کے قدم اٹھائیں، سمجھ داری کے ساتھ چلیں، اور ہدایتِ خلق ہمیشہ انہی لوگوں سے ہوا کرتی ہے جو عقل اور سمجھ کے ساتھ چلنے والے ہوتے ہیں یہ ہدایت مجذوبوں سے، دیوانوں سے، پاگلوں سے چاہے وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہی ہوں لیکن ہدایتِ خلق ان سے نہیں ہوتی...... تو ان کا مطالبہ کرنا دلیل ہے کہ عقلاً ممکن ہے، لیکن اللہ کے جواب سے معلوم ہوگیا کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے شرعاً ممتنع ہے، اس لیے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے بیداری میں میں نے ان آنکھوں کے ساتھ اللہ کو دیکھا ہے، اگر کوئی دعویٰ کرے گا تو یہ قرآنِ کریم کی صراحت کے خلاف ہے، ہاں! البتہ مرنے کے بعد جس وقت ہم آخرت میں چلے جائیں گے، وہاں چونکہ رُوحانیت زور پکڑ جائے گی، ہماری یہ ضعیف اور مادی بنیاد نہیں رہے گی، اُس وقت اللہ تعالیٰ صلاحیت پیدا کردیں گے، جنت کے اندر اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، اور یہ اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی، کہ جنتی جتنا اس کے اندر لطف محسوس کریں گے جنت کی کسی نعمت کے اندر اتنا لطف نہیں آئے گا۔

لیلۃ المعراج میں حضور ﷺ کو دیدارِ الٰہی کا ہونا اِس آیت کے منافی نہیں

ہاں البتہ ایک تیسری صورت ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو لیلۃ المعراج میں زیارت ہوئی یا نہیں ہوئی؟ یہ مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مختلف فیہ تھا، لیکن جو یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا ہے، ان پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ حضور ﷺ کی یہ زندگی تو دنیوی زندگی تھی، اس میں اللہ تعالیٰ کو کیسے دیکھ لیا؟ یہی جسم تھا، یہی آنکھیں تھیں، تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کیسے دیکھ لیا؟ تو اس کا جواب علماء کرام یہ دیا کرتے ہیں کہ جس طرح سے ایک ہے زمانِ آخرت، وہ ہے قیامت کے بعد، جب یہ دنیا ختم ہوجائے گی، آخرت کا زمانہ آجائے گا، آخرت کا وقت آجائے گا، اس وقت جا کے حالات وکیفیات بدل جائیں گے، اور ایک ہے مکانِ آخرت، یعنی آسمان کے اُوپر جہاں اللہ تعالیٰ نے جنت بنائی ہوئی ہے، تو کوئی شخص اس دنیا کے اندر رہتا ہوا مکانِ آخرت میں پہنچ جائے تو بھی اس میں وہی آثار پیدا ہوجائیں گے جو زمانِ آخرت کے بعد پیدا ہوں گے، زمین پر رہتے ہوئے آپ کی کیفیت اور ہے، اور اگر آپ کو آسمان پر اٹھالیا جائے اور جنت میں پہنچا دیا جائے تو بالکل وہی آثار آپ پر طاری ہوجائیں گے جو قیامت

کے بعد جنت میں جانے کے بعد طاری ہوتے ہیں، دلیل اس کی کیا ہے؟ دلیل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، انسان ہی ہیں، اگر وہ اس دنیا کے اندر رہتے تو کھانے کے محتاج تھے جیسے قرآنِ کریم میں آتا ہے کَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ (سورۂ مائدہ:۷۵)، اور جس وقت انسان کھانا کھاتا ہے تو کھانا کھانے کے بعد جس قسم کے عوارض طاری ہوتے ہیں پیشاب ہے، پاخانہ ہے، سونا ہے، جاگنا ہے، اس قسم کی چیزیں ساری کی ساری آتی ہیں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سب چیزوں کے محتاج ہوتے، اور محتاج ہونے کے ساتھ انسان کے متعلق جیسے اللہ تعالیٰ کی عادت ہے جوان کی عمر تھی ساٹھ سال، ستر سال، اسی سال، نوے سال، وہ پوری کرتے، پوری کرنے کے بعد لقمۂ اجل ہو جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو جو اٹھالیا اور جنت میں پہنچا دیا اب اُن کی سب کیفیتیں جنت والی ہیں اس لیے جس وقت وہ واپس آئیں گے تو بالکل اسی عمر میں ہوں گے جس عمر میں یہاں سے اٹھائے گئے تھے، اگر چالیس سال کی عمر میں اٹھائے گئے تھے تو جب واپس آئیں گے تو ایسے ہوگا جیسے چالیس سال کے ہی ہیں، کوئی تغیر نہیں آئے گا کسی قسم کا، اور عمر ان کی وہی شمار ہوگی جو انہوں نے دنیا کے اندر گزاری ہے، اُن کی عمر کے متعلق ہم یہ نہیں کہیں گے، کہ اُن کی عمر تین ہزار سال ہوگی، ایسا نہیں ہوگا، عمر اُن کی وہی ہے جو انہوں نے دنیا کے اندر آ کے گزاری ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ہزار سال اگر اللہ نے لکھی تھی تو زمین پر آنے کے بعد انہوں نے شمار پورا کیا، باقی جنت میں جتنے سال گزارے تھے وہ شمار میں نہیں آئے، تو دنیا کے آثار اور ہیں، اور اگر اسی طرح سے اس کو عالمِ آخرت میں جنت کے اندر پہنچا دیا جائے تو وہاں آثار اور ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ آپ گوشت لے آئیں، آپ اپنی الماری میں رکھیں گے تو صبح کو باسی ہو جائے گا، لیکن اگر اس کو ریفریجریٹر میں لگا کے رکھ دیا جائے تو اگر دس سال کے بعد بھی نکالو گے تو تازہ ہی تازہ ہوگا، یہ حالات بدل جاتے ہیں، پھر وہ باسی نہیں ہوتا، اس کے اندر بو پیدا نہیں ہوتی، چاہے جتنی دیر کے بعد ہی نکال لو۔ تو جنت میں پہنچ جانے کے بعد انسان میں تغیر نہیں ہے، اس لیے اگر اللہ تعالیٰ آپ کو جوان کر کے جنت میں لے جائے گا تو تم لاکھ سال رہو، ارب سال رہو، جوان ہی رہو گے، بوڑھے نہیں ہو گے، تندرست بنا کے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنت کے اندر پہنچا دیا تو تم ہزاروں نہیں لاکھوں سال رہو گے تو بھی تمہاری اس تندرستی میں فرق نہیں آئے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت ہے، صحت ہے وہ برقرار رہے گی، جوانی ہے وہ برقرار رہے گی، زندگی ہے وہ برقرار رہے گی، جنت میں جا کے پھر تغیر نہیں ہے، تو اسی طرح سے زمانِ آخرت کے جیسے آثار ہیں مکانِ آخرت کے آثار بھی ویسے ہی ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق اگر یہ قول کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے تو اس دنیا میں رہتے ہوئے نہیں، بلکہ مکانِ آخرت میں جانے کے بعد، تو زمانِ آخرت میں جا کر دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جانا روایاتِ صحیحہ کے اندر موجود ہے، تو مکانِ آخرت کے اندر بھی ویسی صلاحیت پیدا ہو گئی، اس لیے براہِ راست بلا حجاب جس طرح سے اللہ کی شان کے لائق ہے، اگر حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہو تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے، ہاں البتہ اس زمین پہ رہتے ہوئے، اسی زندگی میں، ان آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جا سکتا، اگر کوئی کہے گا تو جھوٹ کہتا ہے۔ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ: اے اللہ! مجھے اپنا آپ دکھا دے، میں تیری طرف دیکھ لوں۔

اِنسان کی جسمانی اور قلبی طاقت میں فرق

قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ: لَنْ استقبال کی نفی کے لیے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو ہرگز مجھے نہیں دیکھے گا، وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ: یہ زیادہ مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ دیکھو! ہم تجھے نمونہ دکھا دیتے ہیں، اس مادّی زندگی کے اندر انسان کا وجود پتھر کے مقابلے میں سخت نہیں ہے، بلکہ پتھر اس سے زیادہ سخت ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ اگر پتھر پر مکا ماریں تو پتھر کا کچھ نہیں بگڑتا، اور اگر پتھر اُٹھا کے آپ کے سر پر مار دیا جائے تو ماشاءاللہ! اچھا خاصا انقلاب آجاتا ہے، پتھر آپ کو مار دیا جائے تو آپ کی ہڈی چور چور ہوسکتی ہے، لیکن اگر آپ پتھر کے اوپر ہاتھ ماریں تو پتھر کا کچھ نہیں بگڑتا، تو پتھر آپ سے زیادہ مضبوط ہے اس مادی زندگی کے اعتبار سے، اس جسم کے اعتبار سے جو خاکی جسم ہے، تو جو چیز پتھر نہیں اٹھا سکتا، وہ آپ اپنے سر اور کندھے پر نہیں اٹھا سکیں گے، کسی چیز میں اتنا وزن ہو کہ جس کے سامنے پتھر چور چور ہو جائے، وہ انسان کے اوپر اگر رکھ دی جائے تو وہ تو بدرجہ اَولیٰ چور چور ہو جائے گا۔ ہاں! البتہ رُوحانیت اور جو اِنسان کے قلب میں صلاحیت ہے پتھر اور پہاڑ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم اتارا حضور ﷺ کے قلب پر نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (سورۂ بقرہ: ۹۷) تو حضور ﷺ کے قلب میں صلاحیت اتنی تھی کہ یہی قرآن اگر کسی پہاڑ پر اتار دیا جاتا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا، لیکن آپ ﷺ کے قلب نے اس کو برداشت کیا، لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا (سورۂ حشر: ۲۱) اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ پھٹ جاتا اور دب جاتا، لیکن حضور ﷺ کا قلب اس کو برداشت کر گیا۔ قلبی صلاحیت کے اعتبار سے، روحانی قوت کے لحاظ سے تو انسان کا مقابلہ کائنات میں سے کوئی چیز نہیں کرسکتی، لیکن جہاں تک اس مادی زندگی کا تعلق ہے تو لوہا اس کو کاٹتا ہے پتھر اس کو کوٹتا ہے، ہر چیز کے مقابلہ میں یہ کمزور ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (سورۂ نساء: ۲۸)۔

اِنسان کی ظاہری آنکھ کمزور ہے

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو! ہم پہاڑ کے اوپر تجلّی ڈالتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قلب تو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو برداشت کیے ہوئے تھا، لیکن وہ تو اِس ظاہری آنکھ سے دیکھنا چاہتے تھے، اور یہ آنکھ پتھر کے مقابلے میں بہت کمزور ہے، اس لیے فرمایا کہ دیکھو! ہم تھوڑی سی تجلّی پتھر پہ ڈالتے ہیں، پہاڑ پہ ڈالتے ہیں اگر تو یہ سنبھال گیا، برداشت کر گیا تو پھر ہمارا وعدہ ہے کہ تُو بھی دیکھ لے گا، یعنی اگرچہ تو کمزور ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ کچھ برداشت کر لے، لیکن اگر پہاڑ ہی نہ برداشت کرسکا تو تُو یقین کر لے کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہ آنکھ ہماری تجلّی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ حجاب کے ساتھ اللہ کی تجلیات ہمارے سامنے نمایاں ہیں، لیکن بالکل واشگاف ہو کے سامنے آجائے تو ساری مخلوق جل کے راکھ ہو جائے گی۔ جس طرح سے یہ سورج ہے، سورج کی روشنی زمین پر پڑتی ہے، اُس کی شعاعیں زمین پر آتی ہیں، یہ کتنا کروڑ ہا میل دُور ہے، اور راستے میں، فضا میں اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر کتنے حجاب ڈالے ہیں، اور ان حجاب کے تحت ہماری آنکھ اس کو برداشت کیے ہوئے ہے، لیکن اگر یہی سورج بلا حجاب آپ کی آنکھ کے سامنے کر دیا جائے تو فوراً آپ اندھے ہو جائیں گے، آنکھ برداشت نہیں کرسکے گی، تو بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان حجاب

سے برداشت کرلیتا ہے، بلاحجاب برداشت نہیں کرسکتا، یہی سورج اگر بلاحجاب آپ کے بالمقابل کردیا جائے تو یقیناً آپ جل کے کوئلہ ہوجائیں گے، آنکھ پر اتنی تیز شعاع ڈال دی جائے، درمیان میں کوئی حجاب نہ ہو تو آنکھ اس کے مقابلے میں اندھی ہوجائے گی۔ کم روشنی ہم دیکھتے ہیں، جس وقت سورج تیز چمک رہا ہوتا ہے اس کی طرف دیکھیں گے تو آپ کی آنکھیں چندھیا جائیں گی، کچھ نظر نہیں آئے گا، تو ایسا ہوتا رہتا ہے، انسان کی آنکھ اس معاملے میں کمزور ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نُور کو بھی یہ برداشت نہیں کرسکتی۔

عدمِ رُؤیتِ باری تعالیٰ پر موسیٰ علیہ السلام کا تاثر

وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ: دیکھ تو پہاڑ کی طرف، فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ: اگر یہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا، اپنی جگہ قرار پکڑے رہا، فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ پھر تو بھی مجھے دیکھ لے گا۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ: جس وقت اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کے لیے تجلی فرمائی، یعنی پہاڑ کے لیے اللہ نمایاں ہوا، ظاہر ہوا، جَعَلَهٗ دَكًّا: دَكًّا اَیْ مَدْكُوْكًا، کردیا اس کو کوٹ کے برابر۔ دَكُّ الارض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا نشیب وفراز اس طرح سے برابر کردیا جائے، کہ اس میں کوئی گڑھا یا کوئی ٹیلا نہ رہے، اس طرح سے پہاڑ کا وہ حصہ جو تھا، چٹان تھی، پتھر تھا، جو بھی تھا، وہ سارا ٹوٹ کے یوں ہوگیا جیسے ریت بکھر جاتی ہے، جَعَلَهٗ دَكًّا: کردیا اس کو ڈھا کے برابر، وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا: اب یہ ہیبت ناک منظر جو فوراً سامنے آیا، موسیٰ علیہ السلام وہاں قریب تھے، تو اس ہیبت کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام پر غشی پڑگئی خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا: گر گئے موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر۔ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آئی، افاقہ ہوا، (افاقہ کا لفظ آپ بولا کرتے ہیں، مرض سے افاقہ ہوگیا، یعنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آئے، مثلاً کسی سے پوچھیں، بخار کا کیا حال ہے، تو کہتے ہیں آج کچھ افاقہ ہے، وہ افاقہ یہی ہوتا ہے۔ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ: جس وقت موسیٰ علیہ السلام سنبھلے اور اپنی اصلی حالت کی طرف واپس آئے، درست ہوئے، ہوش آیا، غشی دور ہوگئی، قَالَ: تو موسیٰ نے کہا سُبْحٰنَكَ: اے اللہ! تو پاک ہے، یہاں سُبْحٰنَكَ کا مطلب یہ ہے کہ تو اس بات سے پاک ہے کہ یہ مادّی آنکھ تجھے اس دنیا میں رہتے ہوئے دیکھ سکے۔ تُبْتُ اِلَیْكَ: میں نے یہ جو مطالبہ کرلیا تھا، میں اس سے توبہ کرتا ہوں، میں معافی چاہتا ہوں، یہ جو مطالبہ میں نے کیا تھا میں اس سے واپس آتا ہوں، تُبْتُ اِلَیْكَ: میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ: اور میں پہلا ایمان لانے والا ہوں۔ پہلا ایمان لانے والے کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے مشاھدۃً عیاناً اس بات کا یقین کرنے والا کہ تو اس دنیا میں رہتے ہوئے نہیں دیکھا جاسکتا، پہلا میں ہی شخص ہوں، کیونکہ یہ تجربہ مجھے ہی ہوا ہے۔ تو یہاں مؤمنین سے مراد ہے جو اس بات کو یقین کرنے والے ہیں کہ دنیا کے اندر رہتے ہوئے اس مادی آنکھ سے تو نہیں دیکھا جاسکتا، اُن میں سے اوّل میں ہوں، سب سے پہلے میں اس بات پہ ایمان لاتا ہوں کہ اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے تو اس مادّی آنکھ کے ساتھ دیکھا نہیں جاسکتا۔

سوال:- کیا کہ جب اللہ نے بتادیا تھا لَنْ تَرٰىنِیْ، تو پھر پہاڑ پر تجلی ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب:- وہ تو زیادہ مطمئن کرنے کے لئے تھا، اللہ نے کہا کہ تو نہیں دیکھ سکے گا، یہ دیکھو! تجھے نمونہ دکھاتے ہیں کہ پہاڑ

پہ تجلی ڈالتے ہیں، تو تجھے مشاہدہ ہوجائے گا کہ پہاڑ برداشت نہیں کر سکا، تو مثال کے ساتھ زیادہ اطمینان ہوجائے گا کہ واقعی اس دنیا میں رہتے ہوئے نہیں دیکھا جاسکتا۔

توراۃ کے متعلق موسیٰ علیہ السلام کو ہدایات

قَالَ یٰمُوْسٰی: تو جس وقت یہ قصہ ہوگیا، اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے کہ رُویت تجھے نہیں ہوئی، تُو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکا، لیکن ہم نے تجھے ممتاز کردیا، اپنے پیغامات تجھے دے دیے، اپنی کلام تجھے دے دی، اب ان کو لے جاؤ اور مضبوطی کے ساتھ تھامو، خود بھی اس پر عمل کرو، اور اپنی قوم سے بھی عمل کرواؤ۔ قَالَ یٰمُوْسٰی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے چُن لیا ہے لوگوں پر، بِرِسٰلٰتِیْ: اپنے پیغامات کے ساتھ، وَبِكَلَامِیْ: اور اپنی کلام کے ساتھ، فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ: جو کچھ میں نے تجھے دیا ہے اسے لے لے، وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ: اور قدردانوں میں سے ہوجا۔ قدردانی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اب ان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرو۔ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ: الواح جمع ہے لوح کی، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تختیوں کی شکل میں توراۃ اُتری تھی، توراۃ اس طرح سے نہیں اُتری جس طرح سے رسول اللہ ﷺ کے قلب پر القاء ہوا، پھر آپ نے زبان سے پڑھا، پھر کتاب میں ضبط کیا گیا، اس طرح سے نہیں، بلکہ لکھی لکھائی اوپر سے آئی تھی وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ: لکھ دیا ہم نے اس موسیٰ کے لیے تختیوں میں مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً ہر قسم کی نصیحت وَّتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ: اور ہر چیز کی تفصیل۔ اور ہم نے کہہ دیا فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ: کہ ان کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا: اور اپنی قوم کو حکم دیجئے کہ ان تختیوں کی بہترین باتوں پر عمل کریں۔ یا تو وہ باتیں ساری کی ساری بہترین ہیں، تو احسن تفضیل کے معنی سے خالی ہے، جیسے کل آپ کی خدمت میں ترجمہ کرتے ہوئے عرض کیا تھا۔ اور اگر تفضیل کے معنی کی رعایت رکھنی ہی ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ اس میں بعض احکام رخصت بھی ہیں، اور بعض عزیمت ہیں، تو آپ اپنی قوم کو یہ کہیے کہ وہ عزیمت اختیار کرنے کی کوشش کریں، اگرچہ ایک چیز کی اجازت دے دی گئی کہ یوں کرلو، لیکن دوسری صورت بہتر ہے تو بہتر کو اختیار کرنے کی کوشش کریں، جیسے بعض بعض احکام کے اندر آپ جانتے ہی ہیں، جیسے میں نے مثال دی تھی کہ سفر میں روزہ چھوڑا بھی جاسکتا ہے لیکن رکھنا افضل ہے، تو احسن رکھنا ہوا، اگرچہ چھوڑنا بھی حسن ہے جب شرعی اجازت کے تحت ہے، اسی طرح سے ظالم کو معاف کردینا احسن ہے، اور اس سے بدلہ لے لینا یہ حسن ہے، اجازت ہے کہ بدلہ لے لیجئے لیکن بہتر ہے کہ معاف کردو۔ تو ترغیب یہ دو کہ ان الواح میں لکھی ہوئی باتوں میں سے جو احسن ہیں ان کو وہ اختیار کریں۔

سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ: عنقریب میں دکھاؤں گا تمہیں فاسقین کا گھر۔ اس کا مطلب دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، یا تو یہ وعید ہے بنی اسرائیل کے لیے، کہ اگر وہ اس پر عمل نہیں کریں گے تو فاسق ٹھہریں گے، اور میں انہیں عنقریب فاسقوں کا ٹھکانا دکھاؤں گا، میں انہیں اس ٹھکانے پر پہنچادوں گا جو فاسقوں کا ٹھکانہ ہے، پھر تو یہ وعید ہے۔ فاسقین کا گھر میں انہیں دکھاؤں گا، یعنی نافرمانوں کا گھر، نافرمانوں کا ٹھکانا، اگر یہ نافرمانی اختیار کریں گے اور ان احکام پر عمل نہیں کریں گے تو میں ان کو فاسقین کے ٹھکانے لگاؤں گا، جو فاسقین کا ٹھکانا ہے، نافرمانوں کا جو ٹھکانا ہے میں عنقریب انہیں وہی دکھاؤں گا، پھر تو اس میں وعید والا معنی

ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو چاہیے کہ اس کتاب پر عمل کریں، شریعت پر عمل کریں یہ نافرمان لوگ جو کہ شام کے علاقہ میں مسلط ہوئے ہیں، میں عنقریب وہ دار ان کو دکھادوں گا، کہ اس کی برکت سے وہ علاقہ فتح ہوگا، اور وہ علاقہ اِن کو مل جائے گا، پھر گویا کہ یہ ایک وعدہ ہے اور بشارت ہے، جس طرح سے فرعونی فاسقین تھے، وہ غرق ہوگئے، اور مصر بھی ایک قسم کا اسرائیلیوں کے قبضے میں۔ اور شام میں عمالقہ مشرک آباد تھے تو اگر یہ شریعت کے مطابق چلتے، اور توراۃ کی تعلیم کے مطابق جہاد کرتے تو وہ فاسقین کا گھر بھی ان کو مل جاتا، اللہ تعالیٰ وہ علاقہ بھی ان کو دکھادیتا، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو وہ علاقہ اِن کو نہیں ملا، چالیس سال کے بعد پھر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جب دوبارہ جہاد کیا تو اللہ نے وہ علاقہ دے دیا، تو دَارَ الْفٰسِقِیْنَ سے وہی شام اور مصر کا علاقہ مراد ہوسکتا ہے، اور فاسقین سے وہی عمالقہ اور فرعونی مراد ہوسکتے ہیں، کہ ہم عنقریب اِن کو اُن کا گھر دکھائیں گے یعنی وہ علاقہ اِن کے قبضے میں دے دیں گے۔ یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے (روح المعانی)۔

تکبر کی نحوست اور متکبرین کا انجام

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِیَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ: اور عنقریب پھیر دوں گا میں اپنی آیات سے (یعنی اُن کو عمل کی توفیق نہیں ہوگی) جو لوگ تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق۔ معلوم ہوگیا کہ تکبر ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، اور وہ توفیق سلب ہوجاتی ہے۔ تکبر کا معنی بڑائی، اپنے آپ کو بڑا سمجھو، اکڑو، کہ میں ہی سب کچھ ہوں، جس کے دل میں اس قسم کے تکبر کے جذبات ہوا کرتے ہیں وہ نیک باتوں پر عمل نہیں کرسکتا، نیک باتوں پر عمل کرنے سے محروم ہوجاتا ہے، اور اپنے اس تکبر اور بڑائی کی بناء پر ہمیشہ وہ بُرا راستہ اختیار کرے گا، اچھائی کی طرف اس کی طبیعت کا میلان نہیں ہوتا۔ تو تواضع، خاکساری، انکساری، طبیعت کے اندر اس قسم کے جذبات، یہ ہیں جو انسان کے لیے سعادت کی کنجی ہیں، کہ جب انسان متواضع ہوتا ہے، تو پھر دوسرے کی نصیحت کو سنے گا سمجھے گا، اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے گا، اور جب انسان متکبر ہوتا ہے تو نہ کسی کی نصیحت سننا گوارہ کرتا ہے، نہ سننے کے بعد اس پر عمل کرنا گوارہ کرتا ہے، تکبر انسان کو ہر قسم کی سعادت سے محروم کردیتا ہے، اور تواضع، انکسار، عاجزی جس طرح انسان کی طبیعت میں ہوتی ہے وہ اس سعادت کی کنجی ہے، اس کے ساتھ انسان کو ہر طرح سے اچھائی نصیب ہوتی ہے۔ ”جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق، میں اُن کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا“، یعنی وہ ان آیات پر عمل نہیں کرسکیں گے۔ اور پھر ان کا حال یہ ہوجائے گا، متکبرین ہمیشہ شرارت کی طرف زیادہ جاتے ہیں ’اگر وہ دیکھیں گے ہدایت کا راستہ تو اس کو راستہ اختیار نہیں کریں گے، اور اگر دیکھیں گے گمراہی کا راستہ تو اس کو راستہ اختیار کرلیں گے‘ ذوق اس طرح سے بگڑ جائے گا، ذوق بگڑنے کے ساتھ پھر ہر وقت انسان کی طبیعت بگاڑ کی طرف ہی جاتی ہے، ایک آدمی کو اگر تلاوت کی عادت پڑی ہوئی ہو تو جس وقت تک وہ تلاوت نہ کرے اُسے چین نہیں آتی، اور اگر ایک آدمی کو ناول پڑھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے تو جب تک وہ ناول نہ پڑھے نیند نہیں آتی، عادت بن جانے کے بعد یوں معاملہ ہوتا ہے، سینما دیکھنے والوں کو اس وقت تک چین نہیں آتی جب تک کہ تین گھنٹے سینما میں نہ بیٹھ آئیں، اور جس کو مسجد میں جانے کی عادت ہے وہ جب تک مسجد میں نہ جائے اُسے روحانی سکون نصیب نہیں

ہوتا۔ پھر اگر طبیعت میں تواضع ہے، نیکی کی طرف رجحان ہے، تو جب ہدایت کا راستہ نظر آئے گا تو انسان اُس کو دوڑ کے اختیار کرے گا، گمراہی کا راستہ نظر آئے گا تو اس سے انسان بچے گا۔ لیکن اس تکبر کے نتیجہ میں مزاج ایسا فاسد ہو جاتا ہے کہ اس فسادِ مزاج کے بعد ہدایت کا راستہ ان کو دکھاؤ تو قطعاً اُدھر نہیں آئیں گے، قبول ہی نہیں کریں گے، شرارت اور گمراہی کا راستہ آئے گا تو فوراً اختیار کرلیں گے۔ تو یہ طبیعت کا بگڑ جانا انسان کے لیے ہر بُرائی کو آسان کر دیتا ہے، اور اگر طبیعت سلیم ہو، اور طبیعت کے اندر حق قبول کرنے کا جذبہ ہو، تکبر اور بڑائی نہ ہو تو ہر نیکی انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے، یہی بنیاد ہے اس کی۔ تکبر کرنے والوں کا آخر حال یہ ہوگا کہ اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں گے تو اُس کو اختیار نہیں کریں گے، اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں گے تو اُس کو اختیار کرلیں گے۔ اور یہ محرومی اُن کو کیوں ہوئی؟ یہ اس وجہ سے کہ یہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، اور ان آیات سے غفلت برتتے تھے، آیات کی تکذیب اور ان پر عمل کرنے سے غفلت کے نتیجے میں محرومی ہی محرومی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ''اور جو لوگ ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں، ان کے اعمال بے کار ہو گئے'' اعمال سے نیک اعمال مراد ہیں، یعنی نہ اُن کے اوپر اللہ تعالیٰ کی رضا مرتب ہوگی، نہ آخرت میں وہ اُن کے لیے کسی قسم کی نجات کا ذریعہ بنیں گے۔ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: نہیں بدلہ دیے جائیں گے وہ مگر اس چیز کا جو وہ کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا

اور بنالیا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ کے چلے جانے کے بعد اپنے زیورات سے بچھڑا یعنی ایک

جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ

دھڑ جس کے لئے گائے کی آواز تھی، کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ بیشک وہ جسد ان کے ساتھ بات ہی نہیں کرتا اور نہ انہیں کوئی راستہ

سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ

بتلاتا ہے، بنالیا انہوں نے اس کو اور وہ لوگ بہت بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے ﴿۱۴۸﴾ جب سقوط کیا گیا ان

اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا

کے ہاتھوں میں اور سمجھ گئے وہ کہ وہ غلطی کرچکے تو کہنے لگے کہ اگر ہم پر رحم نہ کیا

رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ

ہمارے رب نے اور ہمیں نہ بخشا تو البتہ ہو جائیں گے ہم خسارہ پانے والوں میں سے ﴿۱۴۹﴾ جب لوٹے

مُوْسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ

موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصے سے بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے، تو فرمایا موسیٰ نے بُری جانشینی کی تم نے میری

مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ

میرے بعد، کیا تم نے جلدی کرلی اپنے رَبّ کے حکم سے؟ اور ڈال دیا تختیوں کو اور پکڑ لیا

بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا

اپنے بھائی کے سَر کو، کھینچتا تھا اس کو اپنی جانب، کہا اس نے اے میری ماں جائے! بے شک قوم نے مجھ کو کمزور سمجھا اور وہ قریب تھے

یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ٘ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ

کہ مجھے قتل ہی کردیتے، پس تُو خوش نہ کر میری وجہ سے دشمنوں کو اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ قرار دے ﴿۱۵۰﴾ موسیٰ نے کہا کہ

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ٘ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ ع

اے میرے رَبّ! بخش دے مجھے اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہمیں اپنی رحمت میں، اور تُو تمام رحم کرنیوالوں سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے ﴿۱۵۱﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ: بنالیا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے، مِنْۢ بَعْدِهٖ: مِنْ بعدِ ذَهَابِ مُوسٰی، موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد، مِنْ حُلِیِّهِمْ: حُلِیٌّ یہ حِلْیَۃ کی جمع ہے زیور، اپنے زیورات سے عِجْلًا: بچھڑا، جَسَدًا: جسد، ایک وجود، ایک دھڑ، لَّهٗ خُوَارٌ: خُوار کہتے ہیں گائے کی آواز کو، وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ: موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد اپنے زیورات سے بچھڑا یعنی ایک دھڑ جس کے لئے گائے کی آواز تھی، اَلَمْ یَرَوْا: کیا انہوں نے دیکھا نہیں اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ: کہ بیشک وہ جسد ان کے ساتھ بات ہی نہیں کرتا، وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا: اور نہ انہیں کوئی راستہ بتلاتا ہے، اِتَّخَذُوْهُ: بنالیا انہوں نے اس کو، وَكَانُوْا ظٰلِمِیْنَ: اور وہ لوگ بہت بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے، ظالم تھے، ظُلم کا معنی یہی ہوتا ہے وضعُ الشَّیْءِ فی غیرِ مَحَلِّہٖ، یعنی اس بچھڑے کو جو معبود بنالیا اور اس کے لئے اپنی عبادت صرف کردی تو یہ ایک بہت بے ڈھنگا کام تھا جو انہوں نے کیا، "ظلم کرنے والے تھے" وَلَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ: جب سقوط کیا گیا ان کے ہاتھوں میں، لفظی معنی یونہی ہے، جس وقت ان کے ہاتھوں میں سقوط کیا گیا، لیکن یہ کلام بطور محاورے کے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ان کے سامنے نمایاں ہوگئی اور وہ شرمسار ہوگئے، جس وقت کوئی شخص غلطی کرلینے کے بعد حقیقت سمجھ آجانے پہ پچھتاتا ہے شرمسار ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر وہ یوں پیشانی پکڑ کے بیٹھتا ہے، یہ ہے سقوط فی الید، پچھتانا پریشان ہونا، ندامت کے اظہار کے طور پر گویا کہ یہ کیفیت

ہوتی ہے،''جب وہ نادم ہو گئے، جب وہ پچھتانے لگے، حقیقت نمایاں ہو جانے کے بعد جب وہ شرمسار ہو گئے'' ان الفاظ کا مفہوم یہ ہوگا،''جب ان کے ہاتھوں میں سقوط کیا گیا'' یعنی جب وہ پچھتائے، ان کو اپنی غلطی سمجھ میں آئی، نادم ہوئے، وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا: رَاَوْا رُؤیت سے ہے، اور رُؤیت آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ ایک رُؤیت بصری ہوتی ہے اور ایک رُؤیت قلبی، رَاَیْتُ جو ہے یہ افعالِ قلوب میں سے بھی ہے، جس وقت یہ رُؤیت بصری ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے دیکھنا، رَاَیْتُ اَسَدًا میں نے ایک شیر دیکھا، یہ رُؤیت بصری ہے، اور جس وقت یہ افعالِ قلوب میں سے ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے دل سے سمجھنا، آپ نے نحو کے اندر پڑھا رَاَیْتُ زَیْدًا عَالِمًا، حالانکہ زید کا عالم ہونا یہ کوئی آنکھوں سے دیکھنے کی بات نہیں ہے، دل سے جاننے کی بات ہے، تو یہ افعالِ قلوب میں سے ہے، جس کا معنی ہوتا ہے دل سے سمجھ جانا، یہاں بھی رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا: اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا: بیشک وہ لوگ بھٹک گئے، غلط راستے پہ پڑ گئے، یہ بات آنکھوں سے دیکھنے کی نہیں، دل سے سمجھنے کی ہے،''اور سمجھ گئے وہ کہ وہ غلطی کر چکے، اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا: کہ بیشک وہ لوگ بھٹک گئے، یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی، قَالُوْا: کہنے لگے، یہ لَمَّا کا جواب ہے، جب اپنے کیے پہ پچھتائے اور ان کو اپنی غلطی سمجھ میں آ گئی، کہنے لگے لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا: اگر ہم پر رحم نہ کیا ہمارے رَبّ نے وَيَغْفِرْ لَنَا: اور اگر ہمیں نہ بخشا ہمارے رَبّ نے لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: البتہ ہو جائیں گے ہم خسارہ پانے والوں میں سے، لَمْ کا تعلق يَرْحَمْنَا کے ساتھ بھی ہے اور يَغْفِرْ لَنَا کے ساتھ بھی ہے، ''اگر ہم پہ رحم نہ کیا ہمارے رَبّ نے، اگر اس نے ہماری مغفرت نہ کی، ہمیں نہ بخشا، ہماری غلطی معاف نہ کی'' لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: البتہ ہو جائیں گے ہم خسارہ پانے والوں میں سے، وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا: جب لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف، غَضْبَانَ: غصے سے بھرے ہوئے اَسِفًا: افسوس کرتے ہوئے، غمزدہ، قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ: فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے بہت بری نیابت کی تم نے میری میرے بعد، تم بہت برے جانشین ثابت ہوئے میرے بعد، اپنی قوم کو خطاب کر کے کہتے ہیں، بِئْسَ خِلَافَةً خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْ بَعْدِيْ، یہ ''مَا'' جو ہے یہ گویا کہ فاعل بن جائے گا بِئْسَ کا،''بُری ہے وہ چیز، بُری ہے وہ خلافت جو تم نے اختیار کی میرے بعد'' بہت بری جانشینی کی تم نے میری، تم میرے بہت بُرے جانشین ثابت ہوئے،''بُری جانشینی کی تم نے میری میرے بعد'' اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ: عَجِلَ: جلدی کرنا، جلدی میں پڑ جانا، کیا تم نے عجلت کر لی اپنے رَبّ کے حکم سے؟ تم نے جلدی کر لی اپنے رَبّ کے حکم سے؟ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ: الواح لوح کی جمع، كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ جس کا ذکر پیچھے آیا تھا،''اور ڈال دیا تختیوں کو'' وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ: اور پکڑ لیا اپنے بھائی کے سر کو، يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ: کھینچتا تھا اس کو اپنی جانب، قَالَ ابْنَ اُمَّ: قَالَ کی ضمیر اَخِيْهِ کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا مصداق حضرت ہارون علیہ السلام ہیں، ہارون نے کہا، موسیٰ علیہ السلام کے بھائی نے کہا، جن کو سر سے پکڑ کے موسیٰ علیہ السلام گھسیٹ رہے تھے انہوں نے کہا، قَالَ کی ضمیر اسی بھائی کی طرف لوٹ رہی ہے،''کہا اس نے اے میری ماں جائے!'' ابْنَ اُمَّ: کافیہ کے اندر آپ نے اس کی توجیہات پڑھی تھیں، اصل میں ہے ''يَا ابْنَ اُمِّيْ'' ''اے میری ماں کے بیٹے'' تو پھر ''يَا ابْنَ اُمَّا'' بن گیا جیسے ''يَا اَبِيْ'' سے ''يَا اَبَا'' بنا لیا جاتا ہے، پھر الف کی تخفیف کے ساتھ ''يَا ابْنَ اُمَّ'' رہ گیا، یہ کافیہ کے اندر آپ نے پڑھا ہوگا،''اے میری ماں جائے! اے میری ماں کے بیٹے!'' اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ: بیشک قوم نے مجھ کو کمزور سمجھا، اِسْتَضْعَفَ: ضعیف جاننا،''بیشک قوم نے مجھ کو ضعیف جانا'' وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ: اور وہ قریب تھے کہ مجھے قتل ہی کر دیتے، فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ: پس تو خوش نہ کر میری وجہ سے

دشمنوں کو، شُمِتْ إِشمات سے، شماتۃ الاعداء، یہ لفظ عام طور پر آپ سنتے ہوں گے، شماتۃ اعداء کا معنی ہوتا ہے کسی کی تکلیف پر دشمنوں کا خوش ہونا، جیسے آپ کا کوئی دشمن ہے آپ کسی مصیبت میں واقع ہو جائیں تو اس مصیبت پر دشمن خوش ہوتا ہے، اس کو شماتۃ اعداء سے تعبیر کیا جاتا ہے، "میری وجہ سے دشمنوں کو خوش نہ کر" وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ قرار دے، یعنی میرے ساتھ ایسے برتاؤ نہ کر کہ تیرے برتاؤ سے ثابت ہو کہ میں بھی ظالموں میں شامل ہوں، مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ قرار دے، مطلب یہ ہے کہ میں ساتھی نہیں ہوں ظالموں کا، اور تو برتاؤ ایسا نہ کر گویا کہ میں ظالموں کے ساتھ ہوں، "نہ کر تو مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ" قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب! میری بخشش کر دے، مجھے بخش دے، وَلِاَخِيْ: اور میرے بھائی کو بخش دے، وَاَدْخِلْنَا: اور داخل کر ہمیں، فِيْ رَحْمَتِكَ: اپنی رحمت میں، وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ: اور تو ارحم الراحمین ہے، تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور مذکورہ رکوع میں بیان کردہ واقعہ

پچھلے رکوع میں آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے طور پر بلایا تاکہ ایک چلہ گزاریں، چلہ گزارنے کے بعد اُن کو کتاب دی جائے گی، چنانچہ واقعہ ایسے ہی ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر چلے گئے اور جانے کے بعد انہوں نے چلہ گزارا، اور پھر اُن کو کتاب مل گئی، پچھلے رکوع میں یہ واقعہ آیا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر چلے جانے کے بعد قوم میں ایک واقعہ رونما ہوا، اس رکوع میں اس کو ذکر کیا جارہا ہے، اور اس کے ذکر کرنے سے مقصد ہے بنی اسرائیل کی کج روی کا ظاہر کرنا، ناقدری اور ناشکری کا ظاہر کرنا، کہ ابھی کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا تاریخ کی روایات میں جس طرح سے آتا ہے، کہ یہ واقعہ فرعون کے غرق ہونے کے زیادہ سے زیادہ تین مہینے بعد کا ہے، ابھی ابھی انہوں نے غلامی سے نجات پائی، دشمن اُن کا اللہ کے فضل کے ساتھ ایک غیبی مدد سے تباہ ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے شامل حال تھی، یہ ساری کی ساری کرامتیں شرافتیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی تھیں یہ دیکھتے چلے آرہے تھے، لیکن اس کے باوجود جب ذرا موقع ملا تو یہ گمراہی کی طرف اس طرح سے دوڑے جس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی کوئی مرغوب فیہ غذا ہے۔

حاکم قوم کی عادات واطوار کا محکوم پر اثر انداز ہونا

مصری لوگ جو فرعون کے ہم قوم تھے، وہ گائے کا احترام کرتے تھے، جس طرح ہمارے پڑوسی، ہندو لوگ، ہندوستان میں رہنے والے گائے کا احترام کرتے ہیں، گائے کو پوجتے ہیں، تو مصریوں کے اندر بھی گائے تقدس کا درجہ رکھتی تھی اور وہ اس کا احترام کرتے تھے، اور کسی درجہ میں اس کی پوجا کرتے ہوں گے، اور اسرائیلی ان کے غلام ہونے کی حیثیت سے وہاں رہے ہوئے

تھے، اور آپ حضرات کو ابھی تجربہ نہیں ہے، جس وقت تاریخ پڑھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات نمایاں ہو جائے گی، کہ حاکم قوم کے اخلاق اور حاکم قوم کی عادات محکوم پر بہت اثر انداز ہوتی ہیں، چاہے وہ کتنی ہی خلافِ عقل کیوں نہ ہوں، کتنی ہی خلافِ دلیل کیوں نہ ہوں، لیکن محکوم پر حاکم کو جو برتری حاصل ہوا کرتی ہے تو محکوم کو حاکم کی ہر چیز اچھی لگتی ہے، وہ اُس کی ہر معاملے میں نقل اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں، محکوم کے دل میں ان باتوں سے نفرت نہیں رہا کرتی جو حاکم قوم اپنائے ہوئے ہوتی ہے۔ چاہے آپ نے تفصیل کے ساتھ نہیں دیکھا، لیکن کچھ تو آپ کے سامنے نقشہ ہوگا کہ ہندوستان میں انگریز آیا، اور ایک حاکم ہونے کی حیثیت میں ہندوستان پر مسلط ہوا، تو وہ ایک بے غیرت قوم تھی، بے حیا قوم تھی، خدا سے بیزار قوم تھی، مادہ پرست قوم تھی، اُس کی عادات، خلافِ شریعت، خلافِ عقل، لباس کے بارے میں، عورتوں کے بارے میں، عورتوں کو بے پردہ کرنا اور ان کو اس طرح سے نمایاں کرنا، اور اُن کا لباس، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، غرض ان کا ہر طریقہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ برداشت نہیں تھا، لیکن جب وہ ایک حاکم ہونے کی حیثیت سے مسلط ہوئے تو قوم نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کی عادات غلط ہیں، شرافت کے خلاف ہیں، حیاء کے خلاف ہیں، لیکن نقالی شروع کر دی، اور نقالی کرتے کرتے کہ بالکل یوں سمجھو کہ وہ کالے انگریز بن گئے، رنگ تو اپنا نہ تبدیل کر سکے، وہ تو ان کے بس میں نہیں تھا، لیکن کالے ہونے کے باوجود ہر چیز میں، بود و باش میں، تمدن میں، رہائش میں، اخلاق میں انہوں نے انگریز بننے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، تو یوں سمجھ لیجئے کہ یہ کالے انگریز ہو گئے، تو اس طرح سے حاکم قوم کی عادات اور اس کے اطوار محکوموں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے اثرات

بنی اسرائیل اسی طرح تھے، جب یہ مصریوں میں، فرعونیوں میں رہے، تو ان کو گائے کا تقدس کرتے ہوئے اور اس کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا، تو وہی بات ان کے قلوب میں بھی پڑ گئی، جیسے قرآنِ کریم میں آیا وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (سورۂ بقرہ: ۹۳) ان کے دلوں میں بھی بچھڑے کی محبت پیوست کر دی گئی، سرایت کر گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت وہ فرعون سے نجات پا کے آگے آئے تھے، تو اس رکوع سے پچھلے رکوع میں آیا تھا کہ انہوں نے مطالبہ کیا تھا اِجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (سورۂ اعراف: ۱۳۸) کچھ لوگوں کو بت پوجتے ہوئے دیکھا تھا تو فوراً مطالبہ کر لیا کہ موسیٰ! ہمارے لیے بھی کوئی ایسا اِلٰہ بنا دے جیسے لوگوں کے لیے اِلٰہ ہے، یہ وہی جو شرک کی طرف اُن کی طبیعت کا میلان تھا یہ سب اسی کا ظہور ہے۔

سامری کی سازش اور اس کا بنی اسرائیلیوں کو شرک میں مبتلا کرنا

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جس وقت طور پر تشریف لے گئے، گئے تو اسی لیے تھے کہ اپنی قوم کے لیے کوئی شرعی احکام کا مجموعہ لائیں تاکہ قوم اب اطمینان کے ساتھ اللہ کے احکام پر عمل کرے، اور جاتے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کو ہدایات دے گئے تھے کہ میرے بعد تو میرا خلیفہ ہے جانشین ہے، قوم کے حالات کو درست رکھنا، اور مفسدہ پرداز لوگ، فساد اٹھانے والے لوگ اگر کوئی فساد اٹھائیں تو تُو نے اُن کے ساتھ نہیں چلنا، جس طرح سے پیچھے آیا تھا وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ، سب ہدایات دے کے تشریف

لے گئے، لیکن وہ قوم تو تجدد پسند تھی، اُن میں ایک شخص تھا سامری، جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں آئے گا، یہ کوئی منافق تھا، نفاق کے طور پر ان میں شامل ہو یا ہوا تھا، اور شامل ہوا ہی اس لیے تھا تاکہ ان کو برباد کرے، ان کے اندر اس قسم کی چیزیں پھیلا دے جس کے ساتھ قومی شیرازہ بکھر جائے، اور ان کا آپس میں اتحاد و اتفاق نہ رہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع نہ کر سکیں، تو بعض لوگ اس قسم کے فسادی ہوا کرتے ہیں، تو وہ اسی طرح سے اس قوم میں شامل ہو گیا تھا، اور جذبات اُس کے اچھے نہیں تھے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق، موسیٰ علیہ السلام کے طور طریقے کے متعلق۔ تو اس نے ایک ڈھونگ رچا دیا، قوم کے اندر ظاہر پرستی کی رغبت تو پہلے ہی تھی، جیسے انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں الٰہ بنا کر دے جس طرح سے یہ الٰہ بنائے بیٹھے ہیں، تو ممکن ہے کہ اس نے کوئی سکیم اس قسم کی چلا دی ہو کہ موسیٰ علیہ السلام تو طور پر چلے گئے، ہم اتنے دن تک صبر کیسے کریں، آؤ پوجا کرنے کے لیے کوئی چیز بنالیں، مصر میں گائے کے بُت تھے، بچھڑوں کے بت تھے، تو اُس نے بھی پیشکش کر دی کہ میں بھی تمہیں اسی قسم کی ایک چیز بنا دیتا ہوں، اس کے لیے چندہ کیا گیا، یعنی خدا بنانے کے لئے، اپنا معبود بنانے کے لئے چندہ کیا گیا، تو معلوم ایسے ہوتا ہے کہ قوم نے اپنے زیورات سونا چاندی چندے میں دے دیے، مِنْ حُلِيِّهِمْ: یہاں لفظ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زیورات سے بنایا، ''اُن کے زیورات'' یہ اُن کے زیورات کیا تھے؟ تفسیروں میں تو ایک روایت لکھی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصریوں سے کچھ زیورات مستعار لیے ہوئے تھے کسی شادی کے بہانے سے، اور وہ حربیوں کا مال تھا، ان حربیوں کے ہلاک ہونے کے بعد وہ مالِ غنیمت قرار پایا اور مالِ غنیمت سرورِ کائنات ﷺ سے پہلے کسی اُمت کے لیے حلال نہیں تھا، تو یہ زیوارات اُن پر بوجھ بن گئے، کہ یہ تو غیر قوم کے ہیں، اور ہم ان کو استعمال نہیں کر سکتے تو کیا کریں؟ تو جب وہ زیورات ان کے لیے بوجھ بنے تو سامری نے وہ سارے کے سارے اکٹھے کروا لیے، تو جن زیورات کا استعمال اُن کے لیے جائز نہیں تھا اُس کا بچھڑا بنا کے پُوجنا انہوں نے اپنے لیے جائز بنا لیا۔ تو یہ زیورات اصل میں مصریوں کے تھے جو اُن کے ساتھ آ گئے تھے۔ ایسا ہو تو یہ بھی کوئی بعید نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے، قرآنِ کریم میں تو یہ مذکور نہیں ہے کہ یہ زیورات فرعونیوں سے چرا کے لائے تھے، یا مالِ غنیمت کے طور پر لائے تھے، یا مستعار مانگے تھے پھر واپس نہیں لوٹائے، اگر ایسا ہو تو اس میں بھی انکار کی کوئی بات نہیں ہے، ایسا ہو گیا ہوگا، کہ فرعونیوں کے زیورات اُن کے پاس رہ گئے ہوں گے، اور زیورات کو پھر انہوں نے کسی جگہ صرف کرنا چاہا تو یہ ایک شرارتی اٹھ کھڑا ہوا، اُس نے اُن کی اسی بات سے فائدہ اٹھا لیا کہ لاؤ، میرے پاس جمع کرا دو، میں تمہیں ایک عجوبہ بنا دیتا ہوں، اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔ عام تفسیروں میں تفسیر یہی کی گئی ہے کہ وہ زیورات فرعونیوں کے تھے، اور بعض تفسیروں میں یوں بھی تقریر کی گئی ہے کہ جیسے آپ لوگ جس وقت ایک دینی کام کرنے لگتے ہیں تو آپ کے مقرر جس وقت اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں تو اس کام کے لئے چندے کی اپیل کرتے ہیں، اور بسا اوقات وہ اپیل کرنے والا اتنا مؤثر ہوتا ہے کہ قوم کے جذبات کے ساتھ کھیلتا ہے، تو بیگمات، عورتیں، جو تقریر سننے کے لیے آئی ہوتی ہیں، وہ زیورات بھی اتار اتار کے پھینکنے لگ جاتی ہیں، زیورات تک کا لوگ چندہ دے دیتے ہیں، اب یہ تحریک تو ایک بہت بڑی تحریک تھی، کہ اپنے لیے ایک معبود بنانا تھا، جو دین کا ایک مرکز ہے، تو جب اس کے لیے چندے کی اپیل کی ہوگی تو لوگوں کے گھروں میں جو سونا چاندی تھا، زیورات جو پیچھے سے لے کر آئے تھے، جو لوگوں کا گھروں میں ہوتا ہے، وہ سارے کا سارا اٹھا کر انہوں نے سامری کے سپرد کر دیا، کہ لو، معبود کے لئے سب

کچھ قربان کیا جاسکتا ہے، اور جو کچھ سامری کے پاس تھا اُس نے وہ بھی ڈال دیا، فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (سورۂ طٰہٰ:۸۷)، یہ آگے سورۂ طٰہٰ کے اندر آئے گا، یعنی وہ بھی ساتھ شریک ہوا، یہ نہیں کہ لوگوں سے ہی لیا، بلکہ جو کچھ اس کے پاس تھا اس نے وہ بھی ڈال دیا۔

سامری کا کرتب اور قوم میں اِنتشار

جب ڈال دیا تو بُت پرست قوموں کے اندر بت تراشنے کی صنعت بہت ترقی یافتہ ہوتی ہے، تو اُس نے سونا پگھلایا، پگھلانے کے بعد ایک خول سا تیار کرلیا بچھڑے کا، شکل بچھڑے کی بنالی، لیکن آج کل آپ نے دیکھا ہوگا، کہ یہ جاپانی کھلونے جس قسم کے آتے ہیں، اب بنانے والے اُن کے اندر ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں، کہ بس یہ ہے کہ اُس میں ایک جان نہیں ڈالی، جان ڈال نہیں سکے اور وہ کمی بھی سیل رکھ کے تھوڑی دیر کے لیے پوری کردیتے ہیں، اور اس سے وہ ساری اس قسم کی حرکتیں کروالیتے ہیں جس قسم کی حرکتیں ایک جاندار چیز کیا کرتی ہے، ہوتا ہے نا اسی طرح سے؟ ایک کھلونا آپ نے دیکھا ہوگا، چھوٹا سا ہے، اس میں سیل رکھا ہوتا ہے، ذرا بٹن دباؤ، تو اس طرح ہنستا ہے جس طرح بچے ہنستے ہیں، اور جو سننے والے ہوتے ہیں وہ بھی بغیر ہنسے نہیں رہ سکتے، یعنی اگر کوئی شخص سامنے دیکھ نہ رہا ہو کہ یہ کھلونا ہنس رہا ہے، پس دیوار ہو، تو یہی سمجھے گا کہ کوئی بچہ بڑے زور کے ساتھ ہنس رہا ہے، اور اس کو ہنستا ہوا دیکھ آپ سارے بیٹھ کے ہنسنے لگ جائیں گے، اسی طرح سے بلی بنالی، اس میں سیل ڈال کر جب بٹن دبایا جاتا ہے تو ایسے بھاگتی ہے جس طرح سے بلی بھاگتی ہے، یوں ہی لوٹ پوٹ ہوتی ہے جس طرح سے بلی لوٹ پوٹ ہوتی ہے، تو اس قسم کے کھلونے عام طور پر لوگ بناتے ہیں اور ان میں اسی قسم کے اثرات پیدا کردیتے ہیں کرنٹ کے ساتھ، کہ جس طرح سے اصل میں ہوتے ہیں، تصویر کشی کے اندر ان کو اتنی مہارت ہوگئی۔ تو اسی طرح پُرانے زمانے میں جو لوگ بت بناتے تھے تو وہ بھی عجیب عجیب کرتب دکھاتے تھے، تو اُس نے بچھڑے کا بت جو بنایا تو ایسی شکل کا بنا دیا کہ جہاں اُس کو کھڑا کیا ہوگا، تو جس وقت ہوا چلتی ہوگی تو ایک طرف سے ہوا داخل ہو کے دوسری طرف سے نکلتی ہوگی، تو اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جس قسم کی گائے کی آواز ہوتی ہے، بھاں بھاں کرتا تو ایسے معلوم ہوتا جیسے اصلی بچھڑا ہے، تو اُس نے یہ ایک کرشمہ دکھا دیا، ایسا ہوتا ہے نا؟ یعنی ایک کھلونا ایسا بنا دیا جائے کہ جس وقت وہ بولے تو اس سے مے مے کی آواز آنے لگ جائے، جیسے بکری مے مے کر رہی ہے، جیسے میں نے عرض کیا کہ بچے کے ہنسنے کی آواز اس میں اتنی شاندار طریقے سے سپرنگوں کے ذریعے سے پیدا کردی گئی کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ کھلونا ہے یا واقعی کوئی انسان ہنس رہا ہے، تو جیسے انسان کی آواز پیدا کردی گئی، اُس کی ہنسنے کی آواز پیدا کردی گئی، اسی طرح کتے کے اندر اُس کے بھونکنے کی آواز پیدا کردی جائے اسی طرح سپرنگوں کے ذریعے سے، تو اُس بچھڑے کی بھی اس نے ساخت ایسی بنائی کہ جب ایک طرف سے ہوا داخل ہوتی اور دوسری طرف سے نکلتی، جیسے سیٹی بجتی ہے، تو آواز اس سے اس طرح سے پیدا ہوتی گویا کہ ایک بچھڑا جس طرح سے بھوکا ہو، اور دودھ کے لئے وہ منہ کھولتا ہے اور بھاں بھاں کرتا ہے جو اس کی اپنی آواز ہوتی ہے، وہ اس طرح سے اس سے آواز پیدا ہوتی تھی لَّهٗ خُوَارٌ، لیکن تھا وہ کیا؟ جَسَدًا: ایک دھڑ ہی تھا، باقی تو اس میں کچھ تھا نہیں، عِجْلًا کے ساتھ جو جَسَدًا کا لفظ بول دیا تو جَسَدًا کا مطلب یہ ہے کہ ایک بے جان سا دھڑ تھا، لیکن لَّهٗ خُوَارٌ: اُس کے لئے آواز گائے کی پیدا ہوگئی۔ جس

وقت اس نے یہ کرشمہ بنادیا تو ساتھ ہی اُس نے نعرہ لگادیا ﴿هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى﴾ لیجئے! یہی ہے تمہارا اللہ اور یہی ہے موسیٰ علیہ السلام کا اِلٰہ، ﴿فَنَسِيَ﴾ (سورۂ طٰہٰ:۸۸) موسیٰ علیہ السلام تو بھول گئے جو طور پر ملاقات کے لیے چلے گئے۔ ساتھ یہ نعرہ بلند کردیا، اور قوم شرارتی تو تھی ہی، جدت پسند، اس کو تو کوئی نہ کوئی شرارت چاہیے جس میں وہ ہنگامہ آرائی کریں، تو ساری کی ساری قوم ٹوٹ پڑی، سارے کا سارا ریلا ایک طرف ہوگیا۔

قوم کے شرکیہ عمل پر حضرت ہارون علیہ السلام کا ردِّ عمل

اب حضرت ہارون علیہ السلام بچارے شور مچاتے ہیں، جس طرح سے آگے ان کی تقریر آئے گی سورۂ طٰہٰ کے اندر، کہ اے میری قوم! یہ تو تم بھٹک گئے، یہ تم نے کیا کرلیا، یہ اس طرح سے نہیں، انہوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں جب غنڈوں کا ریلا ایک طرف کو چلتا ہے تو شریف آدمی اگر آگے سے سمجھانے کی کوشش کرے تو اُس کی جان کے لاگو ہوجاتے ہیں، کہ خاموش ہوجا، ورنہ ہم تجھے ماریں دیں گے، حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ کچھ لوگ ہوں گے، ساری قوم تو نہیں بھٹکی، لیکن وہ اتنے نہیں تھے کہ قوت اور طاقت کے ساتھ اس فتنے کو دبا دیتے، اب حضرت ہارون علیہ السلام کے سامنے دو راستے تھے، یا تو حضرت ہارون علیہ السلام اس قوم سے علیحدگی اختیار کرلیتے، اور جو چند لوگ ان کے ساتھ تھے حق کو سمجھنے والے وہ بھی ان کے ساتھ مل جاتے، اور یہ اُن کو لے کر ایک طرف ہٹ جاتے، اس برادری سے بالکل ہی جدا ہوجاتے، تو گویا برادری میں پھوٹ پڑ جاتی، برادری دو حصوں میں بٹ جاتی، اور ایک طریقہ یہ تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام انکار کرتے رہیں، سمجھاتے رہیں، لیکن رہیں اندر شامل، قوم کو بٹنے نہ دیں، آپس میں پارٹی بازی نہ ہونے دیں، شامل رہیں۔ یہ دو راستے تھے، تو یہی مقام ہوا کرتا ہے، جس وقت کسی کام کرنے کے دو طریقے ہوں، ایک آدمی کی عقل اس کو ترجیح دیتی ہے، دوسرے آدمی کی عقل اُس کو ترجیح دیتی ہے، تو حضرت ہارون علیہ السلام نے بہتر اسی کو سمجھا کہ میرا چھوڑ کے جانا علیحدہ ہونا مناسب نہیں، اس طرح تو قوم دو حصوں میں بٹ جائے گی، اور بہت زیادہ کام خراب ہوجائے گا، وہ انہی میں شامل رہے، اور اپنی حد تک اُن کو سمجھاتے رہے، قوم نہ مانی، اتنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے کا وقت آگیا۔

واپسی پر موسیٰ علیہ السلام کا قوم کا سمجھانا، اور ہارون علیہ السلام پر غصے کا اظہار

موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہیں طور پر دے دی تھی، کہ تیری قوم کو پیچھے سامری نے بھٹکا دیا ہے، اسی لیے موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو غصے سے بھرے ہوئے، اور غمزدہ تھے، اور آتے ہی پہلے تو لوگوں کو خطاب کیا، لیکن معلوم یوں ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو کچھ سمجھ دار قسم کے تھے، کہ جو ایک دفعہ قوم کا ریلا آیا اس میں بہہ تو نکلے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُن کو حقیقت سمجھ میں آگئی، اور پچھتائے کہ یہ ہم سے غلطی ہوگئی۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک آدمی اٹھ کے نعرہ لگا دیتا ہے، نعرہ اس کا بظاہر خوبصورت ہوتا ہے، تو جہاں باقی ہوتی ہے وہ بھی ساتھ شامل ہوگئے، شامل ہو کے وہ بھی جلوس نکالتے ہیں اور چھلانگیں لگاتے ہیں، اور ہاتھ اٹھا اٹھا کے پتا نہیں کیا

کچھ کرتے ہیں، جس طرف قوم چلی جائے تو یہ سارے ہی دوڑے جارہے ہیں، اور تھوڑی دیر کے بعد جس وقت لیڈر صاحب کی خباثت ظاہر ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوگئی، ہم بھی بے وقوف ہوگئے لوگوں کے ساتھ مل کے، لوگ تو بے وقوفیاں کر ہی رہے تھے، ہم بھی ساتھ مل کے بے وقوف ہوگئے، یہ تو بہت بڑی غلطی کرلی، یہ کچھ سمجھدار قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو تھوڑا سا ساتھ چلنے کے بعد ان کو غلطی سمجھ میں آجاتی ہے تو پچھتانے بھی لگ جاتے ہیں، ہمیشہ تحریکوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک ریلے کے اندر بہہ جاتا ہے، لیکن بہنے کے بعد تھوڑی دیر کے بعد جب اس کو اندر کی خرابی سمجھ میں آتی ہے تو پھر پچھتاتا ہے کہ ہم نے یہ کیا کر لیا، تو کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا ذکر یہاں کیا گیا۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو اُن سمجھ دار قسم کے لوگوں کو کہا کہ ''میرے بعد تم لوگ جانشین تھے، تو یہ کیا کر لیا؟ میں تو اللہ تعالیٰ کے اَحکام لینے کے لئے گیا تھا، تا کہ تمہیں طریقِ عبادت سکھاؤں، تم نے اللہ کا حکم آنے سے پہلے جلدی سے اپنے لیے ایک طریقہ ایجاد کرلیا؟ تم بہت بُرے جانشین ثابت ہوئے'' پہلے تو اُن کو ڈانٹا، اُن پر غصّے کا اظہار کیا، لیکن سب سے زیادہ غصّہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام پر آیا، کیونکہ ذمہ داران کو ٹھہرا کر گئے تھے، اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب ہونے کے باوجود اللہ کے نبی بھی تھے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت دیکھا کہ قوم ساری کی ساری شرک میں مبتلا ہوگئی، تو پیچھے یہ کس مرض کی دوا تھے، انہوں نے حالات کو کیوں کنٹرول نہیں کیا؟ اس لیے حضرت ہارون علیہ السلام جس وقت سامنے آئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے ہوں گے تو حضرت ہارون علیہ السلام سامنے جو آئے، اب وہ تختیاں جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں تھیں جو وہاں سے لے کر آئے تھے، اور حضرت ہارون علیہ السلام کو دیکھتے ہی جو غصّہ چڑھا، غضبان تو تھے ہی، غصّے سے بھرے ہوئے تو تھے ہی، تو ہمیشہ قاعدہ ہے کہ جس وقت کوئی چیز ہاتھ میں ہوتی ہے، اور غصّے میں آکر انسان دوسرے کو ہاتھ ڈالنا چاہیے، تو اپنی وہ چیز جلدی سے ایک طرف رکھتا ہے تو دیکھنے والا کہتا ہے کہ پھینک دی، مثلاً آپ کتاب لیے بیٹھے ہیں، اور آپ کو کسی نے غصّہ چڑھا دیا کسی بات پر، تو آپ کو وہ غصّہ اتنی فرصت ہی نہیں لینے دیتا کہ آپ کتاب ذرا اچھے طریقے سے نرمی سے رکھ دیں، کتاب ہاتھ سے پھینکی اور اس پہ جا جھپٹے، تو نبی کسی صورت میں بھی شرک برداشت نہیں کرسکتا، جس وقت یہ بات سامنے آئی کہ قوم شرک میں مبتلا ہوگئی، اور یہ خیال آیا کہ میں ہارون علیہ السلام کو پیچھے اصلاح کے لیے کہہ کے گیا تھا، تو ہارون علیہ السلام نے قوم کو کیوں نہیں سنبھالا؟ تو شاید اس میں ہارون نے کوئی سستی کی ہے، تو غصّہ جو چڑھا (غصّہ تو ایک فطرت ہے، اور نبی کس طرح سے برداشت کرے اس قسم کے شرک کو اور قوم کی اس قسم کی گمراہی کو) تو جلدی سے الواح جو رکھیں تو ایسے معلوم ہوا جیسے اَلْقَى الْاَلْوَاحَ، گویا کہ اپنے ہاتھ سے پھینک دیں، یہ جلدی سے رکھنے سے کنایہ ہے، ہاتھ خالی کرنے کے لیے جلدی سے جو رکھیں تو ایسے تھا گویا کہ ڈال دیں، اور ایک ہاتھ حضرت ہارون علیہ السلام کے سَر کو ڈالا اور دُوسرا داڑھی کو ڈالا، داڑھی کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں آئے گا لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ، وہاں دو لفظ آئیں گے، تو جس سے حقیقت معلوم ہوئی کہ حضرت ہارون کو غصّے کے ساتھ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے پکڑا ہے تنبیہ کرنے کے لئے، تو ایک ہاتھ یہاں سَر کو ڈالا، دوسرا ہاتھ یہاں (داڑھی کو) ڈالا، اور لگے پکڑ کے کھینچنے، اور زبان سے بھی تنبیہ کی کہ یہ کیا کیا؟ میں تجھے کیا کہہ کے گیا تھا کہ حالات کو سنبھال کے رکھنا، یہ قوم ساری کی ساری کیا ہوگئی؟ تو حضرت ہارون علیہ السلام پر غصّے کا اظہار کیا۔

ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے عذر

لیکن حضرت ہارون علیہ السلام تو اپنی جگہ معذور تھے، انہوں نے تو اپنی وسعت کے مطابق کوشش کی تھی، اس لیے وہ آگے سے ادب سے جواب دیتے ہیں، اگرچہ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے، لیکن اُمورِ نبوت میں یہ تابع تھے، تو یہ گرفت جو ان پر ہو رہی ہے یہ ایسی گرفت ہے جیسے تابع پر کی جاتی ہے، تو وہ آگے سے ادب سے جواب دیتے ہیں، اور خطاب کیسے کرتے ہیں، یہ نہیں کہا یا اخی! اے میرے بھائی! نہیں، بلکہ کہا اے میرے ماں جائے، ماں کی طرف نسبت کی، کیونکہ ماں مرکزِ محبت ہوتی ہے، تو اس میں محبت وشفقت زیادہ نمایاں ہے، یہ نہیں کہ باپ جائے نہیں تھے، باپ بھی ان کا ایک ہی تھا، دونوں کی ماں بھی ایک تھی باپ بھی ایک تھا، لیکن نسبت ماں کی طرف کی۔ اے میری ماں کے بیٹے! اے میری اماں جائے! میری داڑھی کو اور میرے سَر کو نہ پکڑ، اس طرح اگر تُو کرے گا تو دشمن دیکھ دیکھ کے خوش ہوں گے کہ دیکھو! شرارت ہم نے کی تھی رگڑا ہارون کو لگ گیا، تو مجھے اپنے برتاؤ کے ساتھ عملاً ظالموں میں شامل نہ کر، اصل بات یہ ہے کہ جس وقت قوم میں بگاڑ پیدا ہوا تو میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن میرے اندر اتنی قوت اور طاقت رہی نہیں کہ میں ان کا مقابلہ کرتا، انہوں نے مجھے کمزور سمجھا، اور میں زیادہ رُکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا تو اندیشہ تھا کہ مجھے قتل ہی کر دیتے، تو موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تو جو تیرے ساتھ ملنے والے تھے تُو اُن کو ساتھ لے کر میرے پیچھے کیوں نہیں آ گیا، تُو ان کے ساتھ اندر شامل ہو کر کیوں رہا؟ تو حضرت ہارون علیہ السلام جواب دیتے ہیں، کہ میں یہ سمجھا کہ اگر میں نے یوں کر لیا، تُو کہے گا کہ قوم میں پھوٹ ڈال دی، تُو یہیں ٹھہرا رہتا میں آ کے خود سنبھال لیتا۔ دیکھو! وہی ذوق کا اختلاف آ گیا، یعنی موسیٰ علیہ السلام کا خیال تھا کہ تجھے چاہیے تھا، کہ تُو اپنے دو چار ساتھی جو بھی تیرے ساتھ تھے ان کو لے کر میرے پیچھے آ جاتا، وہ کہتے ہیں کہ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ (سورۂ طٰہٰ: ۹۴) میں اس بات سے ڈر گیا کہ تُو کہے گا کہ بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی، دو حصوں میں بانٹ دیے، تُو یہیں ٹھہرا رہتا، یہ پھوٹ نہ پڑنے دیتا، پارٹی نہ بننے دیتا، تُو میرا انتظار کرتا، میں آ کے خود سنبھال لیتا، حضرت ہارون علیہ السلام کا ذوق اس طرح سے تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا اپنے لیے اور ہارون علیہ السلام کے لئے دُعا کرنا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ہارون علیہ السلام کا عذر اچھی طرح سے واضح ہو گیا، تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لیے بھی دُعا کی اور اپنے بھائی کے لیے بھی دُعا کی، کہ اے اللہ! مجھے بھی بخش دے اگر مجھ سے کوئی کمی بیشی ہو گئی، اور میرے بھائی سے اگر کسی قسم کی کم بیشی ہوئی تو اُس کو بھی بخش دے، آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے دُعا ہے۔ آگے دوسرے واقعات آ رہے ہیں۔

سوال:۔ ''جلالین'' میں جو آتا ہے کہ بچھڑے کے منہ میں کچھ ڈالا گیا تھا۔

جواب:۔ اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں آئے گی، لیکن بظاہر معلوم ایسے ہی ہوتا ہے، قرآن کریم میں کہیں صراحت نہیں کہ وہ اصلی بچھڑا بن گیا تھا، تفسیروں کے اندر قول دونوں قسم کے ہیں، یہاں جو جَسَدًا کا لفظ آیا ہے تو اس سے میں نے یہ مفہوم اخذ کیا

کہ وہ ایک دھڑ تھا جس میں اور کچھ نہیں تھا، یعنی دھڑ سا بنا لیا، اور اگر اصلی بچھڑا بنا ہو تو پھر بھی مطلب یہ ہوگا کہ ایک جسد تھا ایک وجود تھا جس میں کمال کوئی نہیں تھا، معبود کوئی کھلونے کے طور پر اختیار نہیں کیا جاتا کہ ایک کھلونا بنا لیں دل بہلانے کے لئے، معبود کا کام ہوتا ہے کہ تمہیں ہدایات دے، تمہاری عبادت کو قبول کرے، آگے کے لئے راہنمائی کرے، اس میں کون سا کمال پایا گیا تھا، جس کی وجہ سے سارے کے سارے بھاگ کے ادھر چلے گئے، ان کو آنکھوں سے نظر آ رہا تھا، سب کچھ یہ سمجھتے تھے کہ نہ یہ بول سکتا ہے، نہ کوئی بات کر سکتا ہے، نہ کوئی ہمیں راستہ دکھا سکتا ہے، تو معبود کوئی کھلونا ہوتا ہے؟ کہ ایک کھلونا بنا کے کھڑا کر لیا جائے، کہ چلو، سارے اس کی پوجا کرنے لگ جاؤ، یہ تو ایک کھلونا تھا جس کے پیچھے لگ گئے۔ معبود کوئی بطور کھلونے کے نہیں ہوتا کہ ایک کھیل تماشا بنا لیا جائے، وہ تو اس لیے ہوتا ہے کہ تم اس کے سامنے نیازمندی کا اظہار کرو، وہ تمہاری نیازمندی کو قبول کرے، آئندہ کے لئے تمہارے لیے ہدایت دے، اور تم سے رابطہ اس طرح سے رکھے کہ تم سے بات کرے، تمہیں ہدایات دے، اور تمہاری عبادت کو قبول کر کے کوئی اجر وثواب کی بات ہو، ان میں سے کون سی بات اس میں پائی جاتی تھی، وہ تو ایک کھلونا تھا جو سامری نے بنا دیا۔ لیکن یہ قرآن اور حدیث میں کہیں صراحت نہیں ہے کہ وہ باقاعدہ زندہ بچھڑا ہو گیا تھا، ہاں! روایاتِ تفسیر یا روایاتِ تاریخ میں یہ قول موجود ہے، دونوں باتیں ہی ہیں، دونوں قول ہی موجود ہیں، کہ وہ اصلی ہو گیا تھا، یا صرف اتنا سا تھا کہ اس میں ایک آواز سی پیدا ہو گئی تھی جس طرح سے کھلونوں میں پیدا ہو جاتی ہے، وہ آواز پیدا کس طرح سے ہو گئی تھی، اس نے اس کی ساخت ایسی بنائی، یا اس میں کوئی ایسے اسپرنگ لگائے اور ایسا کوئی سیل ڈال دیا، کہ جس کے ساتھ وہ اس طرح سے بھاں بھاں کرنے لگ گیا جس طرح سے بچھڑا کیا کرتا ہے، بس اتنا سا کرتب تھا، اور ایسے کرتب آج کل جاپانی بہت دکھا رہے ہیں۔

خلاصۂ آیات

بنا لیا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا، جو محض ایک وجود تھا، دھڑ تھا، جَسَدًا یہ عِجْلًا سے بدل ہے، ایک دھڑ سا بنا لیا، لَّهٗ خُوَارٌ: جس کے لیے گائے کی آواز تھی، کیا وہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ بچھڑا ان سے بات تو کرتا نہیں، اور نہ ان کو راستہ بتلاتا ہے، تو پھر وہ کس کام کا تھا، کیا وہ دیکھ نہیں رہے تھے؟ ان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ نہ وہ ان سے کوئی بات کرتا اور نہ انہیں وہ راستہ دکھاتا ہے۔ ''بنا لیا انہوں نے اس کو'' دوسرا مفعول محذوف ہے۔ بنا لیا انہوں نے اس کو معبود، وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ: اور وہ بہت ظالم تھے، بڑا بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے۔ اور جب ان کے ہاتھوں میں سقوط ہوا، یعنی جب وہ اپنے کیے پر پچھتائے، یہ بعض ہوں گے، کل نہیں، جب وہ اپنے کیے پہ پچھتائے اور وہ سمجھ گئے کہ انہوں نے غلطی کر لی، کہنے لگے کہ اگر نہ رحم کیا ہم پر ہمارے رَبّ نے اور نہ بخشا ہمیں، البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم خسارہ پانے والوں میں سے۔ جب لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غصے سے بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے، یعنی قوم کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے۔ کہنے لگے بہت بری جانشینی کی تم نے میری میرے بعد، کیا تم نے جلدی کر لی اپنے رَبّ کے حکم سے؟ اور ڈال دیا تختیوں کو، اور پکڑا

اپنے بھائی کے سَر کو، اور کھینچنے لگا اس کو اپنی جانب، يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ: پکڑا اپنے بھائی کے سَر کو، کھینچتا تھا اس کو اپنی جانب۔ قَالَ ابْنَ اُمَّ: ہارون نے کہا کہ اے میری ماں جائے! بیشک قوم نے مجھے کمزور سمجھا، اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل ہی کر دیں، میرے سبب سے میری وجہ سے دشمنوں کو خوش نہ کر، اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ قرار دے، یعنی اپنے برتاؤ میں مجھے ایسا نہ کر کہ گویا کہ میں ظالموں کے ساتھ ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور میرے بھائی کو بخش دے، اور داخل کر ہمیں اپنی رحمت میں اور بیشک تو تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ضرور پہنچے گا انہیں غضب

رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝١٥٢

اُن کے رَبّ کی طرف سے اور ذِلّت دُنیوی زندگی میں، اور ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم جھوٹ گھڑنے والوں کو ۝١٥٢

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۫

اور وہ لوگ جو بُرے کام کرلیتے ہیں پھر ان بُرے کاموں کے بعد توبہ کرلیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں،

إِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٥٣ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ

بے شک تیرا رَبّ ان کی توبہ کے بعد البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۝١٥٣ جب موسیٰ علیہ السلام سے غصہ

مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى

زائل ہوگیا تو انہوں نے تختیاں اُٹھالیں، اُن تختیوں کے مضامینِ منقولہ میں ہدایت

وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝١٥٤ وَاخْتَارَ مُوْسٰى

اور رحمت تھی اُن لوگوں کے لیے جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں ۝١٥٤ منتخب کیے موسیٰ علیہ السلام نے

قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ

اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے متعین وقت کے لیے، پس جس وقت اُن کو زلزلے نے پکڑ لیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے

رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ

رَبّ! اگر تُو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں بھی اس سے قبل اور مجھے بھی، کیا تُو ہلاک کرتا ہے ہمیں بسبب اس کام کے جو کیا

السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ

ہم میں سے نادانوں نے، نہیں ہے یہ واقعہ مگر تیری آزمائش، بھٹکاتا ہے تُو اس کے ذریعے سے جس کو چاہتا ہے

وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ

اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، تُو ہمارا کارساز ہے پس تُو ہمیں بخش دے اور ہم پہ رحم کر اور تُو بہترین

الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ

بخشنے والا ہے ﴿۱۵۵﴾ اور لکھ دے ہمارے لیے اس دُنیا میں بھلائی اور آخرت میں،

اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ

بے شک ہم نے تیری طرف رُجوع کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں وہ عذاب جس کو چاہتا ہوں، اور میری رحمت

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

ہر شئ سے وسیع ہے، پس ضرور لکھوں گا میں اس رحمت کو اُن لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ

اور جو لوگ ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں ﴿۱۵۶﴾ جو اِتباع کرتے ہیں رسول کی

النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ

جو نبی ہے اُمّی ہے جس کو پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ

وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور انجیل میں، حکم دیتا ہے وہ انہیں بھلائی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے،

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ

اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ان کے اُوپر رذی چیزوں کو اور گراتا ہے وہ ان سے

إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ

اُن کے بوجھ کو اور اُن طوقوں کو جو ان پر پڑے ہوئے ہیں، پس وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور اُس کی تعظیم کرتے ہیں

وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٥٧﴾

اور اُس کی مدد کرتے ہیں اور اِتباع کرتے ہیں اُس نُور کی جو اُتارا گیا اس کے ساتھ، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿١٥٧﴾

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ

آپ اعلان کردیں اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، ایسے اللہ کا جس کے لیے

مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا

سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، پس تم ایمان لے آؤ

بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ

اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبیٔ اُمّی ہے جو خود بھی اللہ پہ ایمان لاتا ہے اور اس کے اَحکام پہ ایمان لاتا ہے

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾ وَمِن قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ

تم اس نبی کی اِتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿١٥٨﴾ موسیٰ کی قوم سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے ساتھ ہدایت کرتی ہے

بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٩﴾ وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ

اور حق کے مطابق ہی انصاف کرتی ہے ﴿١٥٩﴾ ہم نے ان اسرائیلیوں کو جُدا جُدا کردیا بارہ خاندان مختلف جماعتیں،

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی جس وقت اس سے اُس کی قوم نے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی کے ساتھ

الْحَجَرَ ۖ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ

پتھر کو مار، پس پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے، جان لیا سب لوگوں نے

مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ

اپنے پانی پینے کی جگہ کو، اور سائبان بنادیا ہم نے اُن کے اُوپر بادل کو، اور اُتارا ہم نے ان پر مَن

وَالسَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا
وسلوٰی، (کہا ہم نے کہ) کھاؤ تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں، ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ
اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَكُلُوْا
اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۰﴾ اور جب انہیں کہا گیا کہ سکونت اختیار کرو اس بستی میں اور کھاؤ بیچ
مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ
اس بستی سے جہاں بھی تم چاہو اور حِطّہ حِطّہ کہتے جاؤ اور داخل ہوجاؤ دروازے میں جھکتے ہوئے، تو ہم تمہارے گناہ
لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا
معاف کردیں گے، اچھے کام کرنے والوں کو زیادہ اجر وثواب دیں گے ﴿۱۶۱﴾ پھر بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا اُن میں سے
غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع
قول علاوہ اس قول کے جو ان سے کہا گیا تھا، پھر بھیج دیا ہم نے ان کے اُوپر عذاب آسمان سے بسبب اس کے کہ وہ ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۲﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو بنایا، اتَّخَذُوا کا دوسرا مفعول محذوف ہے، اتَّخَذُوا الْعِجْلَ اِلٰهًا، بیشک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا، سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ: ضرور پہنچے گا انہیں غضب ان کے ربّ کی طرف سے وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: اور ذِلّت دنیوی زندگی میں، وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ: اور ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ہم جھوٹ گھڑنے والوں کو، افترا کرنے والوں کو، افتراء کا معنی ہوتا ہے اپنی طرف سے بات بنالینا، واقعہ نہیں ہوتا اپنی طرف سے بات بنالی جاتی ہے گھڑلی جاتی ہے، وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ: اور وہ لوگ جو بُرے کام کرلیتے ہیں، ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا: پھر ان بُرے کاموں کے بعد توبہ کرلیتے ہیں، وَاٰمَنُوْۤا: اور ایمان لے آتے ہیں، اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: بیشک تیرا ربّ ان کی توبہ کے بعد البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یہ الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ کی خبر پردال ہے، خبر یوں نکل آئے گی "جولوگ بُرے کام کرتے ہیں پھر توبہ کرلیتے ان بُرائیوں کے بعد اور ایمان لے آتے ہیں اللہ انہیں معاف کردیتا ہے، بیشک تیرا ربّ توبہ کے بعد البتہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"، وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ: سَكَتَ سُكُوت: چپ رہنا، چپ ہو جانا، لیکن آگے سَكَتَ کا صلہ عَنْ آگیا، اور غضب اس کا فاعل بنا ہوا ہے، معروف لغوی دلالت کے تحت اس کا ترجمہ ہوگا کہ جب موسیٰ علیہ السلام سے غصہ چپ ہوگیا، سَكَتَ سُكُوت خاموش ہونے کو کہتے ہیں، اور غصہ چپ ہونا، غصہ خاموش ہونا، یہ کوئی محاورہ نہیں

ہے، ہماری اُردو میں غصے کے لئے ''سکوت'' کا لفظ نہیں بولا جاتا، ہمارا محاورہ اس طرح سے نہیں، اس لیے یا تو سَکَتَ سَکَنَ کے معنی میں ہے، ''جب موسیٰ علیہ السلام سے غصہ ساکن ہو گیا، غصے کو سکون آ گیا''، اور یا سَکَتَ کے اندر زَالَ کا معنی مضمن ہے، کیونکہ عادت یہی ہے کہ جس وقت انسان کو غصہ ہوتا ہے تو انسان بولتا بھی ہے شور بھی مچاتا ہے، زبان سے غصے کا اظہار کرتا ہے، اور جب غصہ سکون پکڑ جاتا ہے تو خاموشی بھی آ جاتی ہے، تو سَکَتَ بھی معنی مقصود ہوا چپ ہونا، اور اس کے اندر زوال والا معنی مضمن ہے، جس کے ساتھ تعلق ہو جائے گا عَنْ کا اور غضب کا، جس کا معنی یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام چپ ہو گئے اور ان سے غصہ زائل ہو گیا، پھر مفہوم یہ ہو جائے گا، غصے کے زائل ہونے سے موسیٰ علیہ السلام چپ ہو گئے، جو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے قوم اور اپنے بھائی کو، بول رہے تھے، غصے کا اظہار کر رہے تھے، تو خاموش ہو گئے، تو پھر خاموشی والا معنی بھی رہا، دونوں معنوں کے درمیان فرق آپ کے سامنے آ گیا کہ جب سَکَتَ کو سَکَنَ کے معنی میں لیں گے اس وقت خاموشی والا معنی نہیں ہے اس میں، ''جب موسیٰ علیہ السلام سے غصے کو سکون آ گیا'' پھر مفہوم یہ ہوگا، اور جس وقت زَالَ والا معنی اس کے ضمن میں ڈالیں گے اس وقت خاموشی والا معنی بھی مذکور رہے گا اور غصے کے زائل ہونے والا مفہوم بھی نکل آئے گا، ''موسیٰ علیہ السلام چپ ہو گئے اور ان سے غصہ زائل ہو گیا'' یہ دونوں مفہوم آ جائیں گے، ضمن میں معنی ڈالنے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ لفظ کا اپنا معنی بھی مقصود رہا اور اس کے متعلقات کے قرینے سے اس کے ضمن میں دوسرا معنی مان لیا گیا، اور یہی معنی زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے تاکہ سَکَتَ اپنے ظاہر پر بھی رہے، ''موسیٰ علیہ السلام سے غصہ زائل ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے'' یعنی جو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے وہ بند کر دی، ''جب موسیٰ علیہ السلام سے غصہ زائل ہوا'' حاصل معنی یہ ہوگا، غصہ دُور ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کا، اَخَذَ الْاَلْوَاحَ: موسیٰ علیہ السلام نے تختیاں لیں، وہ تختیاں جن کا ذکر اَلْقَى الْاَلْوَاحَ کے ضمن میں آیا تھا جو پھینک دی تھیں، ''موسیٰ علیہ السلام نے تختیاں اُٹھا لیں'' وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ: نَسْخٌ نقل کرنے کو کہتے ہیں، نسخہ کہتے ہیں جو کسی دوسری جگہ سے نقل کیا ہوا ہوتا ہے، اور یہاں نسخہ منسوخۃ کے معنی میں ہے نقل کیے ہوئے مضامین، ''ان تختیوں کے مضامینِ منقولہ میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں'' ''ان تختیوں میں جو چیز لکھی ہوئی تھی، مضامینِ مکتوبہ، ان تختیوں کے مضامین مکتوبہ میں، ان تختیوں کی تحریر میں، مضامینِ منقولہ میں ہدایت تھی اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، ہدایت اور رحمت دونوں کے درمیان فرق آپ سمجھتے ہیں، ہدایت: راہنمائی، یہ ایک قسم کے عمل کا تقاضا کرتی ہے، رحمت اس کا ثمرہ ہے، کہ پہلے یہ باتیں راہنمائی کا ذریعہ بنتی ہیں، جس وقت کوئی شخص وہاں سے راہنمائی حاصل کر کے ان کے مطابق عمل کر لیتا ہے تو پھر یہی آیات گویا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حاصل ہونے کا ذریعہ بنیں، اور یہ ہدایت اور رحمت سب کے لئے ہی ہیں لیکن استفادہ چونکہ سب لوگ نہیں کرتے، تو نتیجۃً یہ رحمت اور ہدایت ان لوگوں کے لئے ثابت ہوتی ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم میں ابتدا کے اندر ذکر کیا گیا هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ، یہ متقین کے لئے ہدایت ہے، تو اس کا معنی یہی ہے کہ ہدایت تو سب کے لئے ہے، کافروں کے لئے بھی ہدایت ہے فاسقوں کے لئے بھی ہدایت ہے، لیکن اس ہدایت سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جن کے دلوں کے اندر اللہ کا خوف ہوتا ہے، اس لیے واقع کے اعتبار سے نتیجۃً یہ ہدایت متقیوں کے لئے رہ جاتی ہے، کافر اس سے کوئی ہدایت حاصل نہیں کرتے، فاسق اس سے کوئی راہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا: وَاخْتَارَ مُوْسٰى مِنْ قَوْمِهٖ سَبْعِیْنَ رَجُلًا، قَوْمَهٗ یہ منصوب ہے بنزع

الحاصل، موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی منتخب کیے، اِخْتَارَ، اختیار کیے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ستر آدمی، لِمِیْقَاتِنَا: ہمارے متعین وقت کے لئے، میقات کا معنی وقت معینہ، فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ: پس جس وقت ان ستر آدمیوں کو زلزلے نے پکڑ لیا، قَالَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا، رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ: رَبِّ کی باء کی نیچے کسرہ یائے متکلم پر دلالت کرنے والا ہے، اے میرے رَبّ! اگر تُو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں بھی اس سے قبل اور مجھے بھی، اِیَّایَ کا عطف اَهْلَكْتَهُمْ کی ''ھم'' ضمیر پر ہے، ''اگر تُو چاہتا تو ہلاک کر دیتا اِن کو بھی اس سے قبل، اور مجھ کو بھی'' اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا: سفہاء سفیہ کی جمع ہے، سفیہ: نادان، کم عقل، ''کیا ہلاک کرتا ہے تو ہمیں بسبب اس کام کے جو کیا ہم میں سے نادانوں نے'' ہم میں سے نادانوں کی حرکت کی وجہ سے تو ہمیں ہلاک کرتا ہے، اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ: نہیں ہے یہ واقعہ مگر تیری آزمائش، تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ: بھٹکاتا ہے تو اس کے ذریعے سے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اَنْتَ وَلِیُّنَا: تو ہمارا ولی ہے، تو ہمارا کارساز ہے، فَاغْفِرْ لَنَا: پس تُو ہمیں بخش دے، وَارْحَمْنَا: اور ہم پہ رحم کر، وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ: اور تُو بہترین بخشنے والا ہے، وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً: اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی، حسنہ بھلائی کو کہتے ہیں، بھلائی کا مصداق سورۂ بقرہ میں آپ کے سامنے ذکر کیا تھا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (آیت: ۲۰۱) حسنہ اصل میں اچھی حالت کو کہتے ہیں، اے اللہ! ہمیں دنیا میں اچھی حالت دے، اب اس اچھی حالت کا معیار کیا ہے؟ ہمیں دنیا میں اچھی حالت دے اور آخرت میں بھی اچھی حالت دے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے اور آخرت میں بھی ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، یہ مفہوم ہے اُس آیت کا، اچھی حالت، تو اچھی حالت دنیا کے اندر جو مانگی ہے تو اس میں دنیا نہیں مانگی، یہ بہت لوگوں کو مغالطہ ہے کہ دیکھو قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا بھی مانگو اور آخرت بھی مانگو، اور پھر اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جی! جیسے دین کے کام کیے جاتے ہیں ساتھ ساتھ دنیا کے گزارے کے لئے بھی تو کچھ کرنا چاہیے، رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً: دیکھو! دنیا مانگنے کی بھی اللہ نے تلقین کی ہے، یہ مفہوم بالکل غلط ہے، دنیا کے اندر حسنہ مانگی ہے اللہ تعالیٰ سے، حسنہ کا معنی اچھی حالت، اچھی حالت میں کیا آ گیا؟ مفسرین نے جس طرح سے تعیین کی، کہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایسی حالت میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، دنیا میں بھی ہمیں ایسی حالت میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ اور اچھی ہے، اور آخرت میں بھی ہمیں ایسی حالت میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ اور اچھی ہے، تو اس کا مصداق ہے علم، عمل صالح، رزقِ حلال کا میسر آنا، صحت اور عافیت کا حاصل ہونا، فتنہ وفساد سے بچنا کہ ہم کسی فتنے کے اندر نہ پڑیں، ایسے حالات ہمارے اوپر طاری نہ ہوں کہ جن میں ہم تیری اطاعت یا عبادت نہ کر سکیں، تیرے ناشکرے ہو جائیں، بے صبرے ہو جائیں، یہ ساری کی ساری باتیں اس رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً میں ہیں، اور یہی حالت مطلوب ہے، مال کا ملنا اگر ہمارے لیے اچھا ہے تو ہمیں مال دے دے، اگر مال کا نہ ملنا ہمارے لیے تیرے علم میں اچھا ہے تو ہمیں مال سے بچا، کسی بات کی تعیین کرنے کی ضرورت نہیں، اُس میں یہ آ گیا کہ اے اللہ! ہمیں اُس حال میں رکھ جو حال تیرے نزدیک پسندیدہ ہے، تو جس میں یہ بھی مطلب نکل آیا کہ ہمیں ایسی دنیا نہ دینا، ایسا مال نہ دینا، ایسا کاروبار نہ دینا، ایسی ملازمت نہ دینا جس کے نتیجے میں ہم ایسے حال میں مبتلا ہو جائیں کہ جس کو تو نہیں چاہتا، ہم نماز سے محروم

ہوجائیں، روزے سے محروم ہوجائیں، زکوۃ سے محروم ہوجائیں، اور دنیا کے دھندوں میں پھنس کے تجھے ناراض کربیٹھیں، اس سے گویا کہ پناہ مانگی گئی ہے، اور ایسا حال مانگا گیا ہے جو تیرے نزدیک پسندیدہ اور اچھی حالت ہے، بہت جامع دعا ہے اس لیے سرورِکائنات ﷺ یہ دُعا بہت پڑھا کرتے تھے[1] اور طواف میں رُکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان میں جو جگہ ہے اس کے درمیان بھی اسی دُعا کے پڑھنے کی تلقین حدیث شریف میں آئی ہے،[2] اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہاں ستر فرشتے متعین ہیں، جو شخص یہ دُعا کرے فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں،[3] اتنی اہمیت اس دُعا کی دکھائی گئی، اور حج کے ایام میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو ذکر کیا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو یوں دُعا کرتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً، یہ حج کے افعال کے ضمن میں اس کا ذکر آیا ہے منیٰ کے اندر، کہ بعض لوگ اللہ سے صرف دنیا مانگتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ: وہ اللہ سے صرف دنیا مانگتے ہیں، اور ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور بعض لوگ یہ مانگتے ہیں، یہ اللہ کے پسندیدہ ہیں اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا، تو یہ پسندیدہ لوگوں کی حالت ہے، تو یہ بہت جامع دُعا ہے، اس کے اندر ہر وہ چیز آجاتی ہے جو دنیا کے اندر انسان کے لئے مفید ہے، اور ایسی مفید جس کا آخرت میں کوئی نقصان نہ ہو، ورنہ مفید تو انسان یہ بھی سمجھتا ہے کہ مال کثرت سے مل جائے مفید ہے، لیکن اگر وہ مال آخرت میں رگڑا نکال گیا تو وہ کیا مفید ہوا، انسان تو دنیا میں اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ مجھے بہت بڑی ملازمت مل جائے میرے لیے مفید ہے لیکن اگر وہی عذابِ جہنم کا ذریعہ بن گئی تو وہ مفید کیسے ہوئی؟ وہ تو نقصان دِہ ثابت ہوئی، تو اس دُعا کے ضمن میں اللہ تعالیٰ سے دنیا میں ہر وہ چیز مانگی جاتی ہے کہ جس کے نتیجے میں حسنہ ہی حسنہ ہو، بھلائی ہی بھلائی ہو، اس میں کوئی شر کا پہلو نہ ہو، جس کے اندر علم نافع، عمل صالح، رزق حلال، صحت، عافیت، فرمانبردار نیک اچھی بیوی، یہ بھی اس کا مصداق لکھا ہے، اس لیے لکھا ہے بزرگوں نے، کہ جو یہ دُعا کثرت کے ساتھ پڑھتا رہے اللہ تعالیٰ اس کو بیوی نیک دیں گے، کیونکہ نیک بیوی کا مل جانا گھر کے اندر بہت بڑی عافیت کا باعث ہے، اور جہاں خاوند اور بیوی کی آپس میں لڑائی رہے اس گھر میں کبھی امن سکون نہیں آسکتا، تو یہ مفہوم ہے اس کا، اچھی حالت ہمیں عطا فرما، تو اس سے لوگ استدلال کریں کہ اللہ نے دنیا مانگنے کی تلقین کی ہے یہ استدلال غلط ہے، (بلکہ) دنیا میں حسنہ مانگنے کی تلقین کی ہے کہ دنیا میں حسنہ مانگو، حسنہ سے مراد اچھی حالت جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، کہ اے اللہ! ہمیں ایسے حال میں رکھ جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا پسندیدہ ہے؟ کہ ہماری دنیا کی ضرورتیں پوری ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ طاعت اور عبادت سے محرومی نہ ہو یہ حالت اچھی ہے، تو اس کا مصداق سارے ہی آگئے، ہر قسم کی خیر اس میں آگئی جس میں کوئی شر کا پہلو نہ ہو۔ تو یہاں بھی حسنہ کا یہی مصداق ہے وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً: حضرت موسیٰ علیہ السلام دُعا کرتے ہیں، اے اللہ! ہمارے لیے اس دنیا کے اندر حسنہ اور بھلائی لکھ دے، وَّفِي الْاٰخِرَةِ: اور آخرت میں، تو جو دعا وہاں ایامِ منیٰ میں مقبول

(۱) بخاری ۹۴۵/۲ باب قول النبی ربنا آتنا الخ/ مشکوۃ ۲۱۸/۱ باب جامع الدعاء فصل اول۔ كَانَ اَكْثَرُ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا الخ
(۲) ابوداؤد ۲۶۰/۱ باب الدعاء فی الطواف/ مشکوۃ ۲۲۷/۱ باب دخول مکہ، فصل ثانی۔ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ رَبَّنَا اٰتِنَا الخ.
(۳) ابن ماجہ ص ۲۱۲ باب فضل الطواف/ مشکوۃ ۲۲۸/۱ باب دخول مکہ، فصل ثالث۔ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ وُكِّلَ بِهٖ سَبْعُوْنَ مَلَكًا الخ.

بندوں کی اللہ نے نقل کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام وہی دعا فرمارہے ہیں، ''اے اللہ! لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں'' اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ: بیشک ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں، هَادَ يَهُوْدُ رَجَعَ کے معنی میں، بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا، یہ توبہ کے معنی میں ہے اِنَّا تُبْنَا اِلَيْكَ، اس کا وہی معنی ہے، ہم تیری طرف توبہ کرتے ہیں، ہم نے تیری طرف رجوع کیا، قَالَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ: میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں وہ عذاب جس کو چاہتا ہوں، یعنی چاہے مستحق تو بہت لوگ ہوتے ہیں لیکن میں ہر گناہگار کو جلدی عذاب نہیں دیتا، جہاں میری مشیت ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ یہ گناہ گار بہت ہی حد سے بڑھ گیا ہے تب جا کے عذاب دیتا ہوں، جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں یعنی ہر گناہ گار پر لازمی عذاب نہیں آتا، ''میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں وہ عذاب جس کو چاہتا ہوں'' وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ: اور میری رحمت ہر شئی سے وسیع ہے، بہت وسعت ہے جس میں ہر چیز آسکتی ہے، فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ: پس ضرور لکھوں گا میں اس رحمت کو، ان لوگوں کے لئے یعنی لازم کردوں گا ان کے لئے، لکھ دوں گا ان کے حصے میں، لکھوں گا میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: اور زکوۃ دیتے ہیں، وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ: اور جو لوگ ہماری آیات کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، ان کے لئے یہ رحمت میں لکھ دوں گا یعنی ان کے لئے وہ رحمت لازم ہے، اور اس کا مصداق کون لوگ ہوں گے؟ اس دور میں خصوصیت سے (کلام منتقل ہوگئی موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے نزولِ قرآن کے زمانے کی طرف، کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو رحمت مانگی اور ہم نے وہ رحمت لکھنے کا وعدہ کیا اِس دور میں ان لوگوں کے لئے ہے، اور وہی هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ کا مصداق ہیں) اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ: جو اتباع کریں گے رسول کی جو نبی ہے اُمّی ہے، رسول بھی ہے، نبی ہے، اُمّی ہے، اُمّی بھی اس کی صفت ہے، یہ لفظ پہلے اُمِّيّٖنَ کے ضمن میں آپ کے سامنے آیا تھا، تو عرض کیا تھا کہ اُمّی اصل میں نسبت ہے اُمّ کی طرف، اُمّی: ماں کی طرف نسبت رکھنے والا، تو اس میں مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا ویسے ہی رہا، اس نے کسبِ کمال کرنے کے لئے کسی کی شاگردی کسی کا تلمذ اختیار نہیں کیا، کسی کے سامنے اپنا زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، اس کو کہتے ہیں اُمّی، تو یہ سرورِ کائنات ﷺ کی بھی صفت ہے، اور عربی جو تھے وہ بھی اُمِّيُّوْن کہلاتے تھے، هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (سورۂ جمعہ) اُمِّيّٖنَ کا ذکر آیا ہوا ہے، تو اُمِّيّٖنَ سے مراد یہی عرب بنی اسماعیل ہیں، کیونکہ بنی اسرائیل کی طرح ان کے اندر علم کا چرچا نہیں تھا، تو سرورِ کائنات ﷺ کے لئے یہ اُمّی کا لفظ بطورِ ایک ممتاز صفت کے ہے اور یہ مدح ہے، مدح کس لیے؟ کہ ایک شخص کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوا، کسی اُستاد کے سامنے بیٹھا نہیں، کسی کے سامنے زانوِ ادب تہہ نہیں کیا، اور ایسے علوم و معارف ظاہر کیے کہ دنیا کے مسلمہ فلاسفر اور بڑے بڑے حکماء عاجز آگئے، اور ان کے علوم کی دھاک بیٹھ گئی، تو یہ ایک بہت بڑا کمال ہے، کہ انسانوں میں سے کسی انسان کو اُستاذ بنایا نہیں لیکن علوم و معارف کے دریا بہادیے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیضان آتا ہے، اور جس شخص کی یہ پوزیشن نہیں، وہ جاہل کا جاہل، جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا ویسے ہی رہ گیا اس کے لئے یہ اُمّی عیب ہے، اس لیے اُمّی ہونا ہر کسی کے لئے خوبی نہیں، وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ (سورۂ بقرہ: ۷۸) یہودیوں میں سے جو جاہل تھے ان کی اس طرح سے مذمت کی گئی، تو اُمّی ہونا کمال اسی وقت ہی ہے کہ جس وقت براہِ راست علم لدنی کے طور پر اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے ایسے علوم عطا کردے کہ دنیا میں کوئی

محض ان کا مقابلہ نہ کر سکے تو یہ کمال ہے، یہ دلیل ہے کہ براہِ راست اخذِ فیض رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے کیا، اس لیے اُمّی کا لفظ آپ ﷺ کے لئے بطور لقب کے ہے اور اس میں مدح کا پہلو ہے، اور عام لوگوں کے لئے اُمّی کا لفظ اگر بولا جائے اَن پڑھ کے معنی میں تو ان کے لئے یہ عیب ہوتا ہے یہ نقص ہے یہ خوبی نہیں، کیونکہ عام طور پر اللہ تعالیٰ کی عادت کے تحت کسب کمال کرنا پڑتا ہے تب جا کے کمالات حاصل ہوتے ہیں، بغیر کسبِ کمال کے کمالات نہیں آیا کرتے: ''جو لوگ اتباع کرتے ہیں رسول کی جو نبی ہے اُمّی ہے'' اَلَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ: ایسا رسول نبی اُمّی جس کو پاتے ہیں وہ لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں، یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ: حکم دیتا ہے وہ انہیں بھلائی کا، معروف: پہچانی ہوئی چیز، اور منکر: انکار کی ہوئی چیز، جو شرعاً جانی پہچانی چیز ہے اسے ''معروف'' کہتے ہیں، اور جس کے اوپر انکار کیا گیا ہے، اوپری چیز، وہ ''منکر'' ہے، ''حکم دیتا ہے انہیں معروف کا اور روکتا ہے انہیں منکر سے'' وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ: اور حلال کرتا ہے ان کے لئے پاکیزہ چیزیں، پاکیزہ چیزوں میں سے بعض چیزیں ایسی تھیں جو یہود پر حرام کردی گئی تھیں بطور سزا کے، اب جتنی طیبات ہیں ان سب کو حلال کرتا ہے، وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ: اور حرام ٹھہراتا ہے ان کے اوپر خبائث، ردّی، نکمّی چیزوں کو، خبائث خبیثہ کی جمع آگئی، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی تحلیل اور تحریم یہ ایک قسم کی طیب اور خبائث کی تقسیم ہے، جس کو حلال ٹھہرادیا وہ طیب ہے جس کو حرام ٹھہرادیا وہ خبیث ہے، محرم چیز جو ہے جس کو حرام ٹھہرایا گیا اس میں خبث ہی خبث ہے اس میں طیب ہونے کا کوئی پہلو نہیں، اور جس کو رسول اللہ ﷺ نے حلال ٹھہرادیا وہ طیب ہی طیب ہے اس کے اندر خبث کا کوئی پہلو نہیں، چیزیں دو حصوں میں تقسیم ہوگئیں، وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ: یَضَعُ یہ وَضَعَ سے ہے، گراتا ہے وہ نبی رسول ان سے، اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ: اِصر بوجھ کو کہتے ہیں ایسا بوجھ کہ جو انسان کے اوپر پڑ جائے اور انسان اس کے نیچے نقل و حرکت نہ کر سکے، اور اغلال غُل کی جمع ہے، غُل کہتے ہیں جو گردن میں طوق ڈال دیا جاتا ہے، ''گراتا ہے وہ نبی ان سے ان کے بوجھ کو اور ان طوقوں کو جو ان پر پڑے ہوئے ہیں'' فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ: پس وہ لوگ جو اس نبی کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، وَ عَزَّرُوْهُ: اور اس کی تعظیم کرتے ہیں، وَ نَصَرُوْهُ: اور اس کی مدد کرتے ہیں، وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ: اور اتباع کرتے ہیں اس نُور کی جو اتارا گیا اس کے ساتھ، اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ: آپ اعلان کردیں اے لوگو! اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا: میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، کسی ملک کی تخصیص نہیں، کسی قوم کی تخصیص نہیں، کسی قبیلے کی تخصیص نہیں، کسی زمانے کی تخصیص نہیں، جتنے انسان ہیں بنی آدم میں سے سب کی طرف میں بھیجا ہوا ہوں، ایسے اللہ کا رسول ہوں اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی، یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ: وہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ: پس تم ایمان لے آؤ اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ جو نبی اُمّی ہے، الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: جو خود بھی اللہ پر ایمان لاتا ہے وَ كَلِمٰتِهٖ: اور اس کے احکام پر ایمان لاتا ہے، وہ نبی ایسا ہے کہ خود بھی اللہ پہ ایمان لاتا ہے اور اس کے احکام پہ ایمان لاتا ہے، وَ اتَّبِعُوْهُ: اے لوگو! تم اس نبی کی اتباع کرو، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔ وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ: موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے ساتھ ہدایت کرتی ہے وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ: اور حق کے مطابق ہی

انصاف کرتی ہے، وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا: اب یہاں سے لے کے رکوع کے آخر تک جو آیات آپ کے سامنے آرہی ہیں لفظ بلفظ یہ سورۂ بقرہ میں گزری ہیں، اور ان کی تفصیل بھی وہاں گزر گئی، اس کی تفصیل عرض کرنے کی ضرورت نہیں، وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا: اَسباط سِبط کی جمع ہے، یہ جو اولاد الاولاد ہوتی ہے اس کو سبط کہتے ہیں، اور اُمَمًا اُمۃ کی جمع ہے جماعت کے معنی میں، ''ہم نے ان اسرائیلیوں کو جدا جدا کر دیا بارہ خاندان مختلف جماعتیں'' ان کے بارہ خاندان بنا دیے جو مختلف جماعتوں کی صورت میں تھے، وَاَوْحَیْنَا اِلٰی مُوْسٰی: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی، اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗ: جس وقت موسیٰ علیہ السلام سے اس کی قوم نے پانی مانگا، کیا وحی کی؟ آگے اَنْ تفسیر یہ ہے، اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ: اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر کو مار، فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا: فاء سے پہلے مضمون مقدر ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری، ''پس پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے'' قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ: جان لیا سب لوگوں نے مَّشْرَبَهُمْ: اپنے پانی پینے کی جگہ کو، اپنے گھاٹ کو، یعنی بارہ قبیلوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے چشمے کی تعیین کر لی کہ یہ میرا ہے یہ فلاں کا ہے یہ فلاں کا ہے، تاکہ پانی لینے میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہ ہو، وادیٔ تیہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، وَظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ: اور سایہ افگن بنا دیا ہم نے ان کے اوپر، سایہ ڈالنے والا، ظُلّۃ، سائبان بنا دیا ہم نے ان کے اوپر بادل کو، وَاَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی: اور اتارا ہم نے ان پر من وسلویٰ، ''سلویٰ'' یہ ایک پرندہ تھا بٹیر کی طرح جو کثرت کے ساتھ وہاں آنے لگ گیا، وہ پکڑ کے اس کو کھانے لگ گئے، اور ''مَنّ'' یہ ایک چیز تھی جو اوس کی طرح پڑتی تھی اور یہ میٹھی تھی اس کو کھاتے تھے، كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ: کہا ہم نے کہ کھاؤ تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں، وَمَا ظَلَمُوْنَا: ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ: لیکن وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے تھے، وَاِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ: اور جب انہیں کہا گیا کہ سکونت اختیار کرو اس بستی میں، وَكُلُوْا مِنْهَا: اور کھاؤ پیو اس بستی سے حَیْثُ شِئْتُمْ: جہاں بھی تم چاہو، وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ: اور حطہ حطہ کہتے جاؤ، حِطَّةٌ توبہ کے معنی میں، کہ ہمارے گناہ گرا دیے جائیں، توبہ توبہ، اس طرح سے کرتے ہوئے تم بستی میں داخل ہو، اور وہاں تم سکونت اختیار کرو، وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا: اور دروازے میں جھکتے ہوئے جاؤ، داخل ہو جاؤ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے یعنی جھکتے ہوئے، جب تم ایسا کر لو گے نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ: تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ: اچھے کام کرنے والوں کو زیادہ اجر وثواب دیں گے، یعنی گناہ تو معاف ہو جائیں گے سب کے، باقی! آگے جتنا کوئی اچھے کام کرے گا اتنا زیادہ ثواب لے لے گا، فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ: پھر بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے قول سوائے اس قول کے جو ان سے کہا گیا تھا، انہیں جو کہا گیا تھا کہ توبہ توبہ، حطہ حطہ کہتے ہوئے جانا، انہوں نے اس بات کو بگاڑ دیا، جیسے کوئی مذاق بنا لیا جاتا ہے، ''پس بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا تھا ان میں سے قول سوائے اس قول کے جو ان سے کہا گیا تھا'' فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ: پھر بھیج دیا ہم نے ان کے اوپر عذاب آسمان سے بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ: بسبب اس کے کہ وہ ظلم کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی، اللہ تعالیٰ کی آیات کی، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کرتے تھے، حق تلفی کرتے تھے، ظلم کا اصل مفہوم حق تلفی ہوتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط، اور بچھڑے کے پجاریوں کا دُنیا و آخرت میں انجام

اس نویں رکوع کی ابتدائی آیات اسی واقعہ سے متعلق ہیں، جس کا ذکر آپ کے سامنے پچھلے رکوع میں آیا، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد قوم نے بچھڑا بنا لیا تھا، اور اس بچھڑے کی پُوجا میں لگ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت کے اندر تو اُن کی مذمت کی ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا اُن کو اُن کے رَبّ کی طرف سے غضب پہنچے گا، اور دنیوی زندگی میں ذِلت پہنچے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے اور دنیا کے اندر وہ ذلیل ہوئے، جنہوں نے توبہ نہیں کی اور اڑے رہے وہ بھی مقتول ہوگئے ارتداد کی حالت میں، اور جنہوں نے توبہ کی تھی تو اُن کی توبہ کی قبولیت کے لیے بھی شرط ہوئی، کہ انہیں قتل کیا جائے، یہ قتل جو تھا یہ قبولیتِ توبہ کے طور پر تھا، جس طرح ہمارے ہاں بھی بعض گناہ ایسے ہیں کہ جن میں صرف زبان سے توبہ کرنی کافی نہیں ہوتی، بلکہ ساتھ جان کی بازی بھی لگانی پڑتی ہے، فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص زنا کرتا ہوا پکڑا جائے، اور قاضی کے سامنے شہادت مکمل ہوجائے، اور ہو وہ شادی شدہ، اب اس کے لیے صرف زبانی توبہ نہیں ہے، اُس کو اپنی جان بھی پیش کرنی پڑتی ہے، اور حد اُس کے اوپر ایسی لگے گی کہ اُس کو پتھر مار مار کر ماردیں گے، یہ اُس کی قبولیتِ توبہ ہے۔ اور اسی طرح قاتل عمد کہ اگر ایک آدمی دوسرے کو جان بوجھ کر قتل کردے اور پکڑا جائے، شہادت قائم ہوجائے، تو اب اُس کا صرف توبہ کر لینا کافی نہیں، بلکہ اس توبہ کی تکمیل کے طور پر اس کو قتل بھی کیا جاتا ہے، تو اسی طرح جن لوگوں نے یہ بچھڑا پُوجا تھا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قبولیتِ توبہ کے لیے یہ شرط ہوئی کہ جنہوں نے نہیں پُوجا وہ پُوجا کرنے والوں کو قتل کریں، اور جو مقتول ہوئے اُن میں سے جو شرمسار ہوگئے تھے، جنہوں نے صحیح طور پر توبہ کی تھی اُن کا گناہ معاف ہوجائے گا، اور جو اس پر اڑے رہے وہ ایک قسم کے مرتد ہونے کی حیثیت میں قتل ہوگئے، اور اُن کی بُرائی جو ہوئی، مذمت جو ہوئی، یہ سب ذِلت ہے جو دنیوی زندگی میں پہنچی، اللہ کے غضب کا نشانہ بنے۔ ”ضرور پہنچے گا انہیں غضب ان کے رَبّ کی طرف سے اور دنیوی زندگی میں ذِلت۔“

”ایجادِ بدعت“ اِفترا علی اللہ ہے

وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُفۡتَرِيۡنَ: یہاں لفظ آیا مفترین کا، اور مفترین افتراء سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ واقعہ نہ ہو اور بات بنالی جائے، جس کو جھوٹ گھڑنا کہتے ہیں، بہتان لگانا کہتے ہیں۔ ”بہتان لگانے والوں کو ہم بدلہ ایسے ہی دیا کرتے ہیں“ یہاں سے خاص طور پر افترا علی اللہ مراد ہے، کہ اللہ نے بات کہی نہ ہو اور اس کی طرف منسوب کردی جائے، یہ جو اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، اس قسم کے جھوٹ بناتے ہیں، ہم انہیں ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، کیا مطلب؟ یعنی غضب اور دنیوی زندگی میں ذِلت، اور آخرت میں عذاب۔ تو یہاں اِفترا کا اعلیٰ مصداق تو یہ ہے کہ انہوں نے عجل کو الٰہ بنالیا تھا، ورنہ اب آگے مفترین کا لفظ جو بولا گیا ہے یہ عام ہے، جو بھی اِفترا کرے گا ہم اس کو ایسے ہی بدلہ دیں گے۔ اور اس اِفترا کا ایک فرد بدعت کی ایجاد بھی ہے، بدعت

کی ایجاد بھی اِفترا علی اللہ ہے، کیوں؟ بدعت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ایک کام آپ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام اللہ کو پسندیدہ ہے اور اللہ اس کے اوپر ثواب دے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کا پتا کہاں سے چلتا ہے؟ یا اس کی کتاب سے یا اس کے رسول سے، نہ کتاب میں کوئی ایسی آیت آئی کہ جس سے عبارۃ النص کے طور پر، اشارۃ النص کے طور پر، اقتضاء کے طور پر، دلالۃ النص کے طور پر استدلال کر کے اس کو ثابت کیا جاسکے کہ دیکھو! کتاب کا منشا یہ ہے کہ یوں کام کیا جائے تو یہ اللہ کا منشا ہے اور اللہ اس کے اوپر اجر وثواب دے گا۔ جو بھی استدلال کے طریقے ہیں، فقہاء نے جو طریقے اختیار کیے ہیں، عبارۃ النص کے طور پر ہی ہونا ضروری نہیں، عبارت ہو، دلالت ہو، اشارہ ہو، اقتضاء ہو، کسی طریقہ سے ثابت ہو، ایسی بات نہیں، اور نہ ہی اس کام کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے کیا کہ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے، نہ رسول اللہ ﷺ کے قول سے ثابت، نہ رسول اللہ ﷺ کے فعل سے ثابت، اور قول کے اندر یہ بات بھی آجاتی ہے کہ ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ ''(۱) اور قول کے اندر یہ بات بھی آجاتی ہے ''أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمْ اهْتَدَيْتُمْ ''(۲) نہ آپ ﷺ نے صراحتاً فرمایا، نہ کیا، اور نہ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے سیکھ کر یہ بات کی، اس لیے قول صحابی اور فعل صحابی یہ بھی کسی کام کے مسنون اور اچھے ہونے کی دلیل ہے۔ اور پھر سرورِ کائنات ﷺ کے اقوال وافعال سے بھی استدلال واستنباط جس طرح سے فقہاء کرتے ہیں، جو صحیح استدلالات ہیں، اُن میں سے کسی استدلال کے ذریعے سے بھی ایک کام کا اچھا ہونا ثابت نہیں ہوتا، تو پھر پتا کیسے چل گیا کہ یہ کام اللہ کو پسندیدہ ہے؟ شریعت کے کسی اُصول سے نہیں نکلتا، کسی استدلال کے ساتھ یہ ثابت نہیں، نہ قرآن سے، نہ حدیث سے، نہ اقوالِ صحابہ سے، کیونکہ اقوالِ صحابہ بھی حقیقت میں حضور ﷺ کے ہی منظور شدہ ہیں، جیسا کہ سُنّتِ خلفاء کا ذکر آگیا، اور صحابہ کی اتباع کا ذِکر آگیا: ''مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي ''(۳) کے اندر صحابہ کے طریقۂ کار کو بھی رجسٹرڈ کر دیا گیا، کہ یہ بھی پسندیدہ چیز ہے، آپ ﷺ کا طریقہ تو رجسٹرڈ ہے ہی، أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (سورۂ مائدہ: ۹۲، وغیرہ) اور حضور ﷺ نے ''مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي '' کا لفظ بڑھا کر یہ بھی رجسٹرڈ کر دیا۔ اب ان میں سے جو طریقہ آپ کے سامنے آئے گا اس کو تو ہم اللہ کا پسندیدہ کہہ سکتے ہیں، اس کی گارنٹی ہے، سند اس کی موجود ہے، لیکن ایک چیز کو اللہ نے، اللہ کے رسول نے، صحابہ نے، یعنی جو طریقہ بھی دین میں استدلال کا ہے کسی صحیح طریقے کے مطابق اس کا دِین ہونا ثابت نہیں ہے، اور ایک آدمی کہتا ہے کہ یہ بھی دِین ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے اور اللہ کا پسندیدہ ہے، تو یہ بھی اِفترا علی اللہ ہے، اور اس اِفترا علی اللہ کے نتیجے میں ثواب حاصل نہیں ہوگا، اللہ کا غضب اور ذِلّت تو آسکتی ہے، اس لیے بدعت ظاہری طور پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، وہ ایسے ہی ہے جیسے بچھڑا پُوج لیا، چاہے وہ سونے کا ہو، یہ نہیں کہ گوشت اور خون والا بچھڑا پُوجنا بُرا ہے، نہیں! سونے کا بنا کے پُوج لو تو بھی وہی بات ہے، اس طرح سے بدعت ظاہری طور پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ بنالیں، وہ سونے کا بچھڑا ہے، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا غضب اور ذِلّت تو آسکتی ہے، اس کے اوپر ثواب نہیں ملے گا۔ اس لیے اس بارے میں

(۱) ابن ماجہ ص۵۔ ترمذی ۲/۹٦ باب ماجاء فی الاخذ بالسنة/مشکوٰۃ ص۳۰ باب الاعتصام، فصل ثانی، عن العرباض۔

(۲) مشکوٰۃ ۲/۵۵۴ باب مناقب الصحابہ، فصل ثالث، عن عمر بن الخطاب۔

(۳) سنن الترمذی ۲/۹۳ باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامة/مشکوٰۃ ص۳۰ باب الاعتصام، فصل ثانی، عن عبداللہ بن عمر۔

پھونک پھونک کے قدم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان دین اُسے ہی کہے جس کا دین ہونا کتاب وسنت سے ثابت ہو، اور جس کا دین ہونا کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو اُسے انسان دین نہ کہے، یہ اِفتراعلی اللہ ہے، تو کَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ کے اندر اِفترا کرنے والے درجہ بدرجہ شامل ہیں، یہ بہت بڑا اِفترا تھا کہ بچھڑے کو خدا بنالیا، اور اس طرح سے درجہ بدرجہ جس قسم کے کام ہوں گے اسی قسم کا اِفترا ہے، اور اسی قسم کا غضب اور ذلت اللہ کی طرف سے آئے گی، یعنی بات وہی کہو جو واقعہ کے مطابق ہے، اور جو واقعے کے مطابق نہیں اس کو کیوں کہتے ہو، یہ اِفترا ہے۔

درگاہِ باری تعالیٰ نا اُمیدی کی جگہ نہیں

لیکن آگے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا یہ اُس کی مہربانی ہے کہہ دیا کہ جو لوگ بھی بُرے کام کر لیتے ہیں، چاہے کچھ ہی ہو "گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ" کوئی کافر ہے، آتش پرست ہے، بت پرست ہے، تو بھی اس کے باز آنے کی گنجائش باقی ہے، "ایں درگہِ ما، درگہِ نومیدی نیست" ہماری یہ درگارہ نا اُمیدی کی جگہ نہیں ہے۔ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ: جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا: پھر ان بُرے کاموں کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں، یعنی ایمان میں کمال پیدا کر لیتے ہیں، کیونکہ عمل سیئات ایمان کو ناقص کر دیتا ہے، اور توبہ کی جائے، نیک کام کیے جائیں تو ایمان کامل ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس توبہ کے بعد غفور رحیم ہے۔ جس میں بتادیا کہ چاہے عجل پرستی ہو لیکن توبہ کر لیجئے تو توبہ اللہ قبول فرما لیتے ہیں، رحم فرما دیتے ہیں ......تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد قوم تائب ہوئی، جیسے دوسری جگہ واقعہ مفصل ہے، تو اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہوا، جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ تختیاں جو لے کر آئے تھے جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہدایات دی تھیں وہ اٹھائیں۔" اور اُن کے مضمون کے اندر ہدایت ورحمت تھی اُن لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں" اللہ سے ڈرنے والوں کا ذکر اس لیے کر دیا کہ فائدہ یہی اٹھاتے ہیں۔

قومِ موسیٰ کے ستر نمائندوں کا عجیب واقعہ

اب آگے جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا، اور اللہ تعالیٰ کے وقتِ معین پر اُن کو لے گئے، اس واقعے کا حاصل دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، اور سورۂ بقرہ کے اندر بھی اس کا ذکر آیا تھا، بعض مفسرین نے تو یوں ذکر کیا کہ اگرچہ قوم نے توبہ کر لی تھی اور یہ معاملہ نمٹ گیا تھا، لیکن پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے ستر نمائندے لیے، اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کر کے ایک وقت طے کر لیا، کہ یہ فلاں وقت میں آئیں گے، اور ساری قوم کی طرف سے تیرے سامنے آکر خصوصیت کے ساتھ پھر توبہ اور اِستغفار کریں گے، یعنی قوم کی طرف سے معافی مانگیں گے اس عجل پرستی کی، یہ نمائندے تھے جو اللہ تعالیٰ کی دربار میں جارہے تھے قوم کی طرف سے خصوصیت کے ساتھ معافی مانگنے کے لیے، عمومی توبہ اور اِستغفار تو ہو ہی گیا تھا، یہ ستر آدمیوں کو منتخب کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی وقتِ معین پر جو اللہ کی طرف سے طے ہوا تھا اس میں یہ گئے، جب وہاں گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے اوپر اپنے جلال کا اظہار فرمایا، تاکہ یہ قوم کو بتادیں کہ اللہ تعالیٰ کا جلال اس قسم کا ہے، جلال اس طرح ہوا کہ نیچے سے زلزلہ آیا، اور اُوپر سے کڑک ہوئی، بعض آیات کے اندر "صاعقہ" کا ذکر ہے، اور اس میں "رجفہ" کا ذکر ہے،

"رجفه" زلزلے کو کہتے ہیں، "صاعقه" کڑک کو کہتے ہیں، نیچے سے کپکپی ہوئی اور اوپر سے کڑک ہوئی، تو یہ ستر کے ستر دہشت زدہ ہو کے ایسے ہو گئے جیسے نیم مردہ ہوتے ہیں (تفسیر عثمانی)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ منظر دیکھا، منظر دیکھنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے، جس طرح سے انبیاء علیہم السلام کی شان ہوتی ہے، موسیٰ علیہ السلام بھی قوم کے لیے گڑگڑائے اور اِن کے لئے بھی، کہ یا اللہ! اگر تُو نے ان کو ہلاک کرنا ہوتا تو یہاں آنے سے پہلے ہی اس جرم میں ہلاک کر دیتا جو جرم یہ کر بیٹھے تھے، لیکن جب تُو نے وہاں ہلاک نہیں کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جو یہاں بلایا گیا اور لایا گیا تو اُن کو ہلاک کرنا مقصود نہیں ہے، یہ تو تیری ایک آزمائش ہے کہ کون اس آزمائش سے سبق حاصل کرتا ہے، تیرے جلال اور جبروت کو دیکھ کے آئندہ کے لئے تجھ سے ڈرتا رہتا ہے، اور کون اس قسم کے واقعات میں شکوہ شکایت اختیار کر لیتا ہے، میں اپنے لیے بھی اور ان سب کے لیے بھی تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں، تو سب کو معاف کر دے، اور ہم سب کے لیے دنیا و آخرت میں بھلائی لکھ دے، جس طرح سے آگے دُعا آ رہی ہے، نبی اپنی شان کے مطابق اللہ کے سامنے گڑگڑایا، اِن کے لیے بھی دُعا مانگی اور اُن کے لئے بھی مانگی۔ بعض مفسرین نے تو یہ ان آیات کی ترتیب اس طرح سے ذکر کی، گویا کہ گوسالہ پرستی پہلے ہو گئی تھی، بچھڑے کو لوگوں نے پُوج لیا تھا، اور پھر عمومی تحریک کے طور پر توبہ بھی ہو گئی، بعض لوگ قتل ہو گئے اور باقی جو بچے تھے ان کی طرف سے بطور نمائندگی کے اللہ کے سامنے یہ ستر آدمی گئے تھے، تاکہ مزید اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کے رو دھو لیں، اور اپنی قوم کی طرف سے معافی مانگ لیں، اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال کا اظہار فرمایا، اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ شامل کر کے سب کے لیے مغفرت مانگی، رحمت مانگی، دنیا اور آخرت میں حسنہ مانگا۔

توراۃ و اِنجیل میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آج بھی پیش گوئیاں موجود ہیں

جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ٹھیک ہے میرا عذاب تو اسی کو پہنچتا ہے جس کو میں چاہتا ہوں، رحمت میری بہت عام ہے، اور میں ایسے لوگوں کے لیے لکھتا ہوں...... یہاں سے پھر کلام منتقل ہو گئی، کہ ایسے لوگوں کا مصداق نزولِ قرآن کے وقت میں وہ لوگ ہیں جو اس رسول نبی اُمّی کو مانیں گے، یہ گویا کہ کلام منتقل ہو گئی موسیٰ علیہ السلام کی کلام سے موجودہ زمانے کی طرف، کہ جب یہ آیت آئی کہ موسیٰ علیہ السلام کے دُعا کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ "میں رحمت لکھوں گا، اور ایسے لوگوں کے لیے لکھوں گا" یہ تو واقعہ بیان ہوتا آ رہا ہے، ساتھ ہی قرآنِ کریم نے وضاحت کر دی، کہ اس دور میں یہ لوگ کون ہیں جن کے لیے رحمت لکھی جائے گی، اور هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ کا مصداق کون لوگ ہیں؟ وہ تفصیل ساتھ ہی بتا دی کہ آج اس گروہ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو اس موجودہ نبی کو مانیں گے۔ اور یہ موجودہ نبی بھی کوئی معمولی نہیں، توراۃ انجیل میں لکھا ہوا ہے، ان لوگوں کے پاس موجود ہے، کتنے بڑے چیلنج کے ساتھ اور کتنی وضاحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی گئی، اور اس وقت یہود و نصاریٰ نے کوئی آواز بلند نہیں کہ یہ بات غلط ہے، ہمارے پاس توراۃ و انجیل میں کچھ لکھا ہوا نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ و انجیل کے اندر اتنی واضح پیش گوئیاں تھیں کہ اگر دیانت کے ساتھ وہ لوگ اس پر نظر ڈالتے تو يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (سورۂ بقرہ: ۱۴۶) کا مصداق تھے، اس نبی کو ایسے ہی پہچانتے تھے جیسے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، قرآنِ کریم نے جس طرح سے کہا۔ یہ علامت ہے کہ اس وقت بہت پیش گوئیاں موجود

تھیں، اور اسی آیت پر ہمارے سب علماء نے لکھا ہے کہ تحریف در تحریف ہونے کے باوجود توراۃ وانجیل میں آج بھی اس قسم کی پیش گوئیاں موجود ہیں، کہ جن کا مصداق سوائے سرورِ کائنات ﷺ کے کسی کو نہیں بنایا جاسکتا۔ اس لیے جب کبھی مناظرہ، مباحثہ ہوتا ہے تو علماء یہ چیزیں سامنے لاتے ہیں...... پھر تو آیات کی ترتیب اس طرح سے ہوجائے گی۔ اور سرورِ کائنات ﷺ کا تذکرہ کرکے پھر رسول اللہ ﷺ سے عمومی دعوت دلادی گئی، کہ آپ اعلان کردیں کہ میں سب کی طرف رسول بن کر آیا ہوں، اس اللہ کی طرف سے آیا ہوں جو زمین وآسمان کا بادشاہ ہے، اس لیے اب اگر نجات چاہتے ہو تو میری اتباع کرو تو تم ہدایت یافتہ کہلاؤ گے، ورنہ تم ہدایت یافتہ نہیں ہو، تو مضمون کی روش اس طرح سے ہوگئی۔

قومِ موسیٰ کے ستر نمائندوں والے واقعے کی ایک اور تعبیر

اور بعض مفسرین نے اس ستر آدمیوں والے واقعہ کو اس طرح سے بیان کیا، کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ قوم کے سامنے پیش کی تو قوم نے اسی طرح اڑیاں کرنی شروع کردیں جیسے اُن کی فطرت تھی، کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے جس وقت تک کہ اللہ ہمیں خود نہ کہہ دے، کہ یہ میرے احکام ہیں ان کو مانو، تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اچھا! اپنی قوم میں سے ستر نمائندے لے آنا، میں اُن کے سامنے کہہ دوں گا، تو یہ ستر آدمی جس وقت وہاں گئے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی، ان لوگوں نے سنی تو پھر وہاں یہ اوراڑی کرنے لگ گئے کہ کیا پتا کون بول رہا ہے؟ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (سورۂ نساء: ۱۵۳) ہمیں تو کھلم کھلا دکھا، تب ہم یقین کریں گے، تو ایسے موقع پر پھر ان کے اوپر کڑک آئی، اس گستاخی کے نتیجے میں ان سب کو وہاں ڈھیر کردیا گیا، تب موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سامنے گڑگڑائے کہ یا اللہ! ان کو یہاں لاکے ماردینا تو ایسے ہے جیسے میں بھی مرگیا، مجھے قوم کہاں چھوڑے گی کہ ہمارے سرداروں کو لے گیا اور پتا نہیں کہاں مار آیا ہے، یہ تو میری بھی ہلاکت ہے اور ان کی بھی ہلاکت ہے، اگر تُو نے ان کو ہلاک کرنا تھا تو آج تک یہ تھوڑی گستاخیاں کرتے آئے ہیں، تو ان کو پہلے ہی ہلاک کردیتا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک آزمائش ہے جس میں ان کو ڈالا گیا ہے۔ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے، جس کے نتیجے میں اُن کو پھر زندہ کردیا گیا، اٹھادیا گیا، اور موسیٰ علیہ السلام اُن کو لے کر واپس آگئے تھے، اور آکے قوم کے سامنے کہہ دیا تھا کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کو مانو، لیکن پھر ساتھ تھوڑا سا شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ اللہ نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جو بات اس میں سے مشکل معلوم ہو اس پر عمل نہ کرنا، پھر جا کے اس قسم کی بات کہہ دی۔ سورۂ بقرہ کے اندر یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ تو یہ دو واقعے بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ بھی ہوا ہو، اور یہ بھی ہوا ہو، اس میں کوئی بات نہیں، کیونکہ آیات کی روش کی صحیح تفصیل تو ہی بنتی ہے کہ یہ واقعہ دو دفعہ پیش آیا ہو۔ تو پھر کوئی اشکال نہیں رہتا، کہ ایسے بھی ہوا ہو جس طرح سے یہاں ذکر کیا گیا، اور پہلی تفسیر کے طور پر میں نے آپ کے سامنے جو مضمون نقل کیا وہ صورت بھی پیش آئی ہو۔ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ: اَیْ وَاخْتَارَ مُوْسٰى مِنْ قَوْمِهٖ، مِنْ یہاں محذوف ہوگا، اور قَوْمَهٗ منصوب ہے حرفِ جارہ کے حذف کی وجہ سے، جس کو آپ منصوب بنزع الخافض کہا کرتے ہیں۔ پسند کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو ہمارے متعین وقت کے لیے۔ پس جب ان کو پکڑ لیا زلزلے نے، کہا موسیٰ علیہ السلام نے

اے میرے رَبّ! اگر تُو چاہتا تو اِن کو ہلاک کر دیتا اس سے قبل، اور مجھے بھی۔ کیا تُو ہلاک کرتا ہے بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا: کیا ہمیں ہلاک کرتا ہے تُو اس کام کی وجہ سے جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا، اس کا مصداق یا تو گوسالہ پرستی، کہ اس کے نتیجے میں ہم سب کو تُو ہلاک نہ کر۔ یا اس کا مصداق ہے رُؤیت کا مطالبہ (دونوں واقعات کی طرف دیکھتے ہوئے) کہ یہ نادان ہیں، ان کی نادانی کے نتیجے میں سب کو تو ہلاک نہ کر، کیونکہ اس کے نتیجے میں میری بھی ہلاکت ہے، میری ہلاکت ساری قوم کی ہلاکت ہے۔ ''نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش، تُو بھٹکاتا ہے اس کے ساتھ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، تُو ہمارا کارساز ہے، ہمیں معاف کردے، ہم پہ رحم کر، اور تُو بہترین معاف کرنے والا ہے''، ''اور لکھ ہمارے لیے اس دُنیا میں حسنہ اور آخرت میں حسنہ'' اس کی تفصیل میں نے آپ کے سامنے عرض کر دی۔ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ: یعنی اِنَّا تُبْنَآ اِلَيْكَ، ہم نے تیری طرف رجوع کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عذاب، پہنچاتا ہوں میں جس کو چاہتا ہوں، اور میری رحمت وسیع ہے ہر شئ سے، ضرور لکھوں گا میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں، اور وہ ہماری آیات کے ساتھ ایمان لاتے ہیں'' یہاں تک کلام آ گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ۔

مضمون کا موسیٰ علیہ السلام سے حضور ﷺ کی طرف انتقال

یہاں سے مضمون منتقل ہو گیا حضور ﷺ کی طرف، کہ اس دور میں جب قرآنِ کریم اتر رہا ہے، جب یہ واقعہ سنایا جا رہا ہے، یہ موجودہ یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ آج یہ لوگ ہیں اس رحمت کے مستحق جو اتباع کرتے ہیں (سمجھ آ گئی؟ کہ کلام کس طرح منتقل ہو گئی؟ ورنہ جب موسیٰ علیہ السلام سے کلام ہو رہی ہے اس وقت یہ آیات ساتھ نہیں آئیں) یہاں سے کلام منتقل ہو رہی ہے، کہ ''رحمت لکھوں گا ان لوگوں کے لئے جو ہماری آیات کے ساتھ ایمان لاتے ہیں'' اور آپ ﷺ کے دور میں، جب یہ قرآنِ کریم اتر رہا ہے، جب یہ واقعہ موجود یہودیوں کو سنایا جا رہا ہے، آج اس کا مصداق یہ لوگ ہیں'' جو اتباع کرتے ہیں رسول نبی اُمّی کی، جس کو پاتے ہیں اپنے پاس لکھا ہوا توراۃ اور انجیل میں'' اور اُس کی یہ صفتیں ہیں کہ حکم دیتا ہے انہیں اچھی باتوں کا اور روکتا ہے بُری باتوں سے، حلال کرتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزیں، اور حرام ٹھہراتا ہے ان کے اوپر خبیث چیزیں۔

''اِصر و اَغلال'' کا مفہوم و مصداق

اور گراتا ہے ان سے ان کے اِصر و اَغلال۔ دُور ہٹاتا ہے ان سے، گراتا ہے ان سے اِن کے اِصر و اَغلال۔ اصر: بوجھ۔ اغلال: طوق، پابندیاں جو ان کے اوپر عائد ہیں۔ اِصر و اَغلال کا کیا مصداق ہے؟ اس کا مصداق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر بہت مشکل مشکل احکام بھیجے تھے، جن احکام کے اندر یہ جکڑے ہوئے تھے، اُن کے مطابق عمل کرتے ہیں تو انتہائی مشقت ہے، نہیں عمل کرتے تو اللہ کے ہاں جوتے کھائیں گے۔ تو یہ پابندیاں اور جو ان پر مشکل احکام کا جکڑاؤ تھا، رسول اللہ ﷺ دینِ یُسر لے کر آئے، اور اس قسم کی پابندیاں وغیرہ جو کچھ تھیں سب ختم کر دیں، آسان شریعت آ گئی۔ یا تو اصر و اغلال سے وہ مشکل احکام مراد ہیں، کہ جو ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کیے تھے، اور

جن میں جکڑے ہوئے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوب ان کے اوپر تشدد تھا، بعض طیبات ان کے اوپر حرام تھیں، اور بعض اور بھی مشکل مشکل احکام تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے آ کے اُن کو گرا دیا اور ختم کر دیا۔ تو یہ ایک نعمت ہے، اس کی ان کو قدر کرنی چاہیے، یہ اپنے اُوپر اصر و اغلال کو کیوں مسلط کیے بیٹھے ہیں؟ موجودہ نبی کی شریعت کو مانیں، اور ان اصر و اغلال سے نجات حاصل کرلیں، یہ شان ہے اِس نبی کی کہ یہ اِس قوم کو اصر و اغلال سے نجات دلاتا ہے۔

خود عائد کردہ پابندیاں بھی ''اِصر و اغلال'' میں شامل ہیں

لیکن اس کے ساتھ ہی اس ''اصر و اغلال'' میں وسعت ہے، قوم جس وقت جہالت کی طرف جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ چھوڑ دیتی ہے، تو اپنے اُوپر خود اس قسم کی پابندیاں عائد کر لیتے ہیں کہ جن پابندیوں سے جان چھڑانا اب ان کے بس کی بات نہیں ہوتی، خود عائد کردہ پابندیاں ایسی ہوتی ہیں جو پہاڑ کی طرح بوجھ پڑ جاتا ہے، اور انسان ان میں اس طرح سے جکڑا جاتا ہے جس طرح سے طوق گلے میں ڈالا ہوا ہو، اور ان سے نجات حاصل کرنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی، وہ ہیں اپنی قومی رسمیں اور اپنے بنائے ہوئے قاعدے اور طریقے۔

مثلاً جس طرح سے آج ہماری برادری اور قوم بھی اصر و اغلال میں مبتلا ہے، اب ایک نکاح ہے جو زندگی کی ضروریات میں شامل ہے، شریعت نے اس کی کیا حقیقت بتائی؟ کہ لڑکا اور لڑکی دو آدمیوں کی موجودگی میں خود ایجاب وقبول کرلیں، یا اُن کے ورثاء ایجاب وقبول کرلیں نکاح ہوگیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مہر ہو، وہ بھی ادھار ہوسکتا ہے، نقد دینا ضروری نہیں، اور اُس کی کم از کم مقدار یعنی جس پر گزارہ ہوسکتا ہے وہ دس درہم چاندی ہے، جس کی مالیت آج اگر آپ دیکھیں، تو دس درہم چاندی تقریباً پونے تین تولے بنتی ہے، اگر چاندی سو روپے تولہ بھی ہو تو مہر تقریباً پونے تین سو روپے ہے، یہ ایک ضروری خرچ ہے، وہ بھی نقد دینا ضروری نہیں، نَکَحْتُ قَبِلْتُ کرو، اور جاؤ گھر آباد کرلو، ساڑھے تین سو روپیہ ہے تو دے دو، نہیں ہے تو ذِمّے لگ جائے گا، کتنی آسان شریعت ہے، لیکن ہمارے رسم و رواج نے اس کو ہمارے لیے اصر و اغلال بنا دیا، ان شادیوں میں گھر اُجڑ جاتے ہیں، منگنی سے جو حساب شروع ہوتا ہے، پھر شادی تک، پھر وہ جہیز کیا، پھر بارات کیا، پھر برادری کی دعوتیں کیا، لینے دینے اتنے شروع ہو جاتے ہیں، کہ اچھے بھلے لوگ ان شادیوں کے اندر آ کے برباد ہو جاتے ہیں، اور بعض اپنی لڑکیوں کو اس لیے نہیں بیاہ سکتے کہ اُن کے پاس جہیز دینے کی گنجائش نہیں ہے، اور برادریوں کو کھلانے کی گنجائش نہیں ہے، تو یہ کتنا بڑا بوجھ اور کتنا بڑا اِصر ہے جو قوم نے اپنے اُوپر مسلط کرلیا، اب اس میں سے نکلنے کی کسی کے لیے گنجائش ہے؟ تو اگر کوئی شخص اس قسم کی اصلاح کی تحریک اٹھاتا ہے تو وہ ایسے ہی ہوگا گویا کہ قوم کے سر سے اس اِصر اور اغلال کو اتار رہا ہے، اب اُس کی بات مانو، اور اس اصر و اغلال سے نجات حاصل کرلو، تم تو ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے اس کے خلاف کیا تو لوگ کیا کہیں گے، اور ایک آدمی ذمہ داری لیتا ہے کہ تم اس بات کو چھوڑ دو، کچھ نقصان نہیں ہوگا، یہ اصر و اغلال ہے یا نہیں؟

اور اسی طرح مرنے کے بعد (بیاہ شادی بھی خاندان کے لیے ایک مصیبت ہے) اور اگر کوئی بوڑھا مر گیا تو بھی وہ پیچھے

گھر میں جھاڑ و دے جاتا ہے، برادری کے ٹیکس، برادری کی روٹیاں، اور ملّاں ٹیکس، مرنے کے بعد جو یہ ٹیکس عائد ہونے شروع ہوتے ہیں تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ آج کل غلّہ مہنگا ہے، یا گندم ملتی نہیں، اللہ کرے گھر میں کوئی بوڑھا نہ مرے، ورنہ لوگ مرنے کے بعد بھی ویسے ہی مقروض ہوتے ہیں، یعنی مرنے کے ساتھ گھر سے ایک فرد کا بوجھ کم نہیں ہوتا، بلکہ مرنے کے ساتھ پوری کی پوری برادری اور جتنے تعلق والے ہوتے ہیں سارے مسلط ہو جاتے ہیں کھانے پینے کے لئے، یعنی برادری ٹیکس علیحدہ ہے، ملّاں ٹیکس علیحدہ ہے، رسم و رواج علیحدہ ہیں، اس کے ساتھ انسان اچھا خاصا دیوالیہ ہو جاتا ہے، کیا یہ اصر و اغلال نہیں ہیں؟ تو اس نبی کی شریعت کو مانو تو تمام اِصر و اغلال سے جان چھوٹ جائے گی، سارے ٹیکس معاف، نہ کوئی برادری کے لئے، نہ کوئی ملّاں کے لئے۔ گنجائش ہے تو ایصالِ ثواب کے لیے دو، نہیں گنجائش تو چپ کر کے بیٹھ جاؤ، کوئی تم سے کہنے کے لیے نہیں آئے گا کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو، اور ایسے ہی گھروں میں دوسرے رسم و رواج ہیں، خاص طور پر موت اور بیاہ کی رسموں نے تو قوم کی کمر ٹیڑھی کر رکھی ہے، لیکن کسی عقل مند کو یہ ہوش نہیں آتی کہ ہم اس کو چھوڑنے کی تحریک کریں۔ تو اب نبی کی تعلیمات کو اگر عام کیا جائے گا تو یوں سمجھو کہ اِصر و اغلال سے جان چھوٹتی ہے۔ اسی قسم کی رُسوم، ان کے مشائخ نے ان کے پیروں نے، ان کے مولویوں نے، یہود قوم پر اس قسم کی مسلط کر رکھی تھیں، کہ اُن کی بھی کمر ٹوٹی پڑی تھی، تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں اس نبی کو مانو، سب بوجھ ہلکے ہو جائیں گے، کسی رسم کی پابندی نہیں، اور کوئی بوجھ نہیں ہے، سب معاف۔ تو اِصر و اغلال کے اندر یہ باتیں بھی ساری کی ساری داخل ہیں۔ یہاں بھی تو مولویوں کی تجاویز ہیں، کہ تیسرے دن یہ کرو، دسویں دن یہ کرو، چالیسویں دن یہ کرو، سال کے بعد یہ کرو، ہر گیارہویں میں یہ کرو، یہ اس قسم کے لوگ لگاتے ہیں یہ قوم کے اوپر ایک بوجھ ہے، اور یہ شریعت ان سب بوجھوں سے جان چھڑاتی ہے، اِصر و اغلال سارے کے سارے دفع ہو جائیں گے۔

آخری آیات کا مضمون

"پس جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائیں گے، اس کی تعظیم کریں گے، اس کی مدد کریں گے، اور اس نُور کی اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ اتارا گیا" "اس نُور" سے مراد قرآنِ کریم ہے، جو نبی کے ساتھ اتارا گیا، یعنی نبی آیا تو اس نُور کو لے کر آیا، اس نُور سے یہی کتاب اللہ مراد ہے، سراپا نُور ہے۔ "اس نُور کی اتباع کریں گے جو اس نبی کے ساتھ اتارا گیا ہے، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں" رحمت کے مستحق اب یہی ہیں۔ اس مضمون کے ساتھ ہی پھر رسول اللہ ﷺ سے پھر عمومی اعلان کرا دیا گیا، کہ آپ اعلان کر دیں کہ "اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، اس اللہ کا جس کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، حیات و موت اسی کے ہاتھ میں ہے" یُحْیٖ وَیُمِیْتُ یہ خصوصی صفات میں سے ہے، "حیات و موت اسی کے ہاتھ میں ہے، پس ایمان لے آؤ تم اللہ کے ساتھ اور اُس کے رسول نبی اُمّی کے ساتھ" یہاں اُمّی کا لفظ خصوصیت سے آیا ہے، چونکہ

پیچھے بھی اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ کا لفظ آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ وانجیل میں تحریر کچھ اسی قسم کی ہوگی جس میں اُمّی کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہوگا، تو اس موقع محل پر اُمّی کے لفظ کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا۔ ''جو ایمان لاتا ہے اللہ کے ساتھ اور اُس کے احکام کے ساتھ''۔ وَاتَّبِعُوْهُ: اور اس کی اتباع کرو لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تاکہ تم سیدھا راستہ پالو۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ اے لوگو! اگر تم سیدھا راستہ پانا چاہتے ہو تو اب یہی ایک سیدھا راستہ ہے، کہ اس نبی کی اتباع کرو، اور اگر اس نبی کی اتباع نہیں کرو گے تو دوسرا کوئی سیدھا راستہ نہیں جو تمہیں اللہ تعالیٰ تک لے جائے، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کے اندر یہ بات آ گئی۔ اب آگے مضمون پھر وہی آ گیا ماقبل سے متعلق، جیسے کہ قرآنِ کریم کی عادت ہے کہ اگر کسی قوم کی بُرائی کرتا ہے تو اس میں اگر کچھ افراد اچھے ہوتے ہیں تو اُن کو ہمیشہ ممتاز کر لیا جاتا ہے، تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کتنی ہی بگڑی، لیکن ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو حق کے ساتھ ہدایت کرتی رہی، اور اسی کے مطابق انصاف کرتی رہی، اور یہی لوگ تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو فوراً ایمان لے آئے، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، اور ان جیسے انصاف پسند لوگ۔ اگلی آیات کا ترجمہ تفسیر سب پہلے گزر چکی۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ

سوال کیجئے ان سے اُس بستی کے متعلق جو سمندر کے کنارے پر تھی

اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا

جبکہ تجاوز کرتے تھے وہ ہفتے کے بارے میں، جبکہ آتی تھیں اُن کے پاس اُن کی مچھلیاں اُن کے ہفتے کے دِن ظاہر ہوتی ہوئی،

وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ

اور جس دِن وہ ہفتے کے دِن میں نہیں ہوتے تھے وہ مچھلیاں ان کے پاس نہیں آتی تھیں، ایسے ہی ہم اُن کو آزمائش میں ڈالتے تھے

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ

بسبب اس کے کہ وہ نافرمان تھے ﴿۱۶۳﴾ اور جب کہا اُن میں سے ایک جماعت نے کیوں نصیحت کرتے ہو تم ایسے لوگوں کو کہ اللہ

مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ

اُنہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے، انہوں نے کہا عذر زائل کرنے کے لئے تمہارے رَبّ کی طرف اور تاکہ یہ لوگ

وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ

تقویٰ اختیار کر لیں ﴿۱۶۴﴾ جب وہ لوگ بھول گئے ان باتوں کو جن کے ساتھ ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو نجات دی ہم نے اُن لوگوں کو

يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا
جو روکتے تھے برائی سے اور پکڑلیا ہم نے اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا سخت عذاب کے ساتھ ان کے فسق کے
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾
سبب سے ﴿۱۶۵﴾ پھر جب وہ لوگ بالکل ہی سرکش ہوگئے اس کام سے جس سے اُن کو روکا جارہا تھا تو ہم نے کہہ دیا انہیں کہ ہوجاؤ تم ذلیل بندر ﴿۱۶۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ: وَسْـَٔلْ: سوال کرتو، هُمْ: اِن یہود سے جو سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں موجود تھے، پوچھئے ان سے، سوال کیجئے ان سے، عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ: اس بستی کے متعلق جو سمندر کے کنارے پرتھی، سمندر کے کنارے پہ آباد تھی، اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ: جبکہ تجاوز کرتے تھے وہ ہفتے کے بارے میں، اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ: جبکہ آتی تھیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں، حیتان حوت کی جمع ہے، حوت مچھلی کو کہتے ہیں، لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (سورۂ قلم:۴۸)، فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ (سورۂ صافات:۱۴۲) قرآنِ کریم میں یہ الفاظ آئے ہوئے ہیں، ''جبکہ آتی تھیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں'' يَوْمَ سَبْتِهِمْ: ان کے ہفتے کے دن، شُرَّعًا: یہ شارِعة کی جمع ہے، تیرتی ہوئی، ظاہر ہوتی ہوئی، ظاهِرةً کے معنی میں ہے، وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ: اور جس دن وہ ہفتے میں نہیں ہوتے تھے، ہفتے کے دن میں نہیں ہوتے تھے، لَا تَاْتِيْهِمْ: وہ مچھلیاں ان کے پاس نہیں آتی تھیں، آگے لفظ آ گیا كَذٰلِكَ، كَذٰلِكَ کے لفظ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے مابعد میں بھی تین نقطے لگے ہوئے ہیں اور ماقبل میں بھی تین نقطے لگے ہوئے ہیں، تو یہ پہلے بھی آپ کی خدمت میں کئی دفعہ ذکر کیا ہے کہ جس جگہ یہ اشارہ ہو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اس لفظ کو ماقبل کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے اور مابعد کے ساتھ بھی، سورۂ بقرہ کی پہلی آیت میں آپ نے دیکھا تھا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، یہاں فِيْهِ کے اوپر بھی دونوں طرف نقطے لگے ہوئے ہیں تو لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اور فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، ترجمہ دونوں طرح سے صحیح ہے، تو اسی طرح سے یہاں كَذٰلِكَ کو ماقبل کے ساتھ لگا لیجیے لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ، وہ مچھلیاں اس طرح نہیں آتی تھیں، جس طرح سے ہفتے کے روز آتی تھیں اس طرح سے ان کے پاس ہفتے کے بغیر کسی دوسرے دن نہیں آتی تھیں، تو كَذٰلِكَ کا تعلق ماقبل کے ساتھ ہوگیا، اور آگے آیت ہوجائے گی نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: ہم ان کو آزماتے تھے بسبب اس کے کہ وہ نافرمان تھے، ان کے فسق کی وجہ سے ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے۔ اور اگر كَذٰلِكَ کو مابعد کی طرف جوڑیں تو لَا تَاْتِيْهِمْ پر بات ختم ہوگئی، ''جس دن وہ ہفتے میں داخل نہیں ہوتے تھے مچھلیاں ان کے پاس نہیں آتی تھیں'' كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: ایسے ہی ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے بسبب ان کے فسق کے، بسبب اس کے کہ وہ نافرمان لوگ تھے ایسے ہی ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے، تو كَذٰلِكَ کا تعلق مابعد کے ساتھ ہوگیا۔ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ: اور جب کہا ان میں سے ایک جماعت نے، لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا: کیوں نصیحت کرتے ہو تم ایسے لوگوں کو، اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ: کہ اللہ ان کو ہلاک کرنے والا ہے،

أَوْ مُعَذِّبُهُمْ: یا انہیں عذاب دینے والا ہے، عَذَابًا شَدِيدًا: سخت عذاب، ''ان میں سے ایک جماعت نے کہا کہ تم نصیحت کیوں کرتے ہو ایسے لوگوں کو'' یہ لفظ خود اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو تھے مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان لفظوں سے یہ بات خود سمجھ میں آرہی ہے، (تھوڑی سی وضاحت اس لیے کردوں تا کہ لفظوں کا مصداق سمجھ میں آجائے) کہ وہ قریہ والے جو تھے اہل قریہ جو تھے، وہ کئی گروہوں میں بٹ گئے تھے، بعض تو ایسے تھے جنہوں نے مجرمانہ انداز اختیار کرلیا اور ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے لگ گئے، اور بعض ایسے تھے کہ پکڑتے نہیں تھے اور ایک آدھی دفعہ ان کو کہہ کر جب وہ نہیں مانے تو ایک طرف ہو کے بیٹھ گئے، نہ پکڑتے تھے نہ ان کے ہر وقت پیچھے پڑے رہتے تھے، اور ایک گروہ ایسا تھا ہماری تبلیغی جماعت والوں کی طرح وہ ہر وقت پیچھے پڑا رہتا تھا کہ باز آجاؤ، یہ بات اچھی نہیں ہے، اللہ کی نافرمانی نہ کرو، تم پہ عذاب آجائے گا، تو جو لوگ ایک آدھی دفعہ سمجھا کے علیحدہ ہوگئے کہ ہمیں کیا، نہیں مانتے تو اپنے کیے کی سزا خود پائیں گے، یہ لوگ اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو ہر وقت مجرموں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، ہر وقت انہیں سمجھاتے ہیں، تو یہ جماعت اُن کو کہتی ہے کہ ''تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو؟'' ان لوگوں سے مراد وہ جو مجرم ہیں جو مچھلیاں پکڑا کرتے تھے، اب تین گروہ سمجھ میں آگئے ہیں؟، اب یہ بات صاف ہوگئی، ''ان میں سے ایک جماعت نے کہا'' اس جماعت سے مراد وہ ہے جو نہ تو مچھلیاں پکڑتے تھے نہ پکڑنے والوں کے ساتھ زیادہ الجھتے تھے، لِمَ تَعِظُونَ کا خطاب ہے ان لوگوں کو جو ہر وقت ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ باز آجاؤ اور قَوْمًا سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہ مچھلیاں پکڑنے کے مجرم ہیں، تو ان تینوں گروہوں کا تذکرہ اس میں آگیا، ''کہا ان میں سے ایک جماعت نے'' لِمَ تَعِظُونَ: کیوں نصیحت کرتے ہو تم، قَوْمًا: ایسی قوم کو، اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ: کہ اللہ انہیں ہلاک کرنے والا ہے، أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا: یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے، قَالُوا: اس کی ضمیر لوٹے گی ان کی طرف جن کو خطاب تھا لِمَ تَعِظُونَ میں، یعنی وہ نصیحت کرنے والے لوگ جو ہر وقت ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے انہوں نے کہا، مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ: یہ مفعول لہٗ ہے فعل محذوف کا، یعنی ہم جو ان کو نصیحت کرتے ہیں تو ہمارے دو مقصد ہیں، تمہارے رَبّ کی طرف معذرت کے طور پر اور تا کہ یہ لوگ بچ جائیں، یعنی ایک تو یہ ہے کہ ہم الزام اتارنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم معذرت کرسکیں گے کہ ہم نے تو انہیں سمجھایا، ''عذر زائل کرنے کے لئے تمہارے رَبّ کی طرف اور تا کہ یہ لوگ تقویٰ اختیار کرلیں'' فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ: اب نَسُوا کی ضمیر لوٹے گی اس قوم کی طرف جس کا ذکر لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ کے اندر آیا ہوا ہے، تو نَسُوا کی ضمیر ادھر لوٹ رہی ہے، ''جب وہ لوگ بھول گئے'' مَا ذُكِّرُوا بِهِ: ان باتوں کو جن کے ساتھ ان کو نصیحت کی جاتی تھی جب وہ لوگ نصیحت کی باتیں بھول بیٹھے، أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ: نجات دی ہم نے ان لوگوں کو جو کہ روکتے تھے بُرائی سے، وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ: اور پکڑ لیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا سخت عذاب کے ساتھ، بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ: ان کے فسق کے سبب سے، ''مَا'' مصدریہ ہے، ان کے فسق کے سبب سے ہم نے ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا، فَلَمَّا عَتَوْا: جس وقت وہ لوگ بالکل ہی سرکش ہوگئے، یہ تفصیل ہے فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا کی، اسی کو دوسرے انداز میں ذکر کیا جارہا ہے، پھر جب وہ لوگ بالکل ہی سرکش ہوگئے، عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ: سرکش ہوگئے اس کام سے جس سے ان کو روکا جارہا تھا، جس کام سے روکا جارہا تھا اس سے سرکش ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کو کرنے لگ گئے، قُلْنَا لَهُمْ: ہم نے کہہ دیا انہیں، كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ: ہوجاؤ تم ذلیل

بندر، قِرَدَۃً قِرْد کی جمع، قِرْد، بندر کو کہتے ہیں اور خٰسِئِیْنَ یہ خَاسِئٌ کی جمع ہوگئی، ''ذلیل بندر ہو جاؤ''، اور کُوْنُوْا حکم تکوینی کے طور پر ہے جس کے بعد کسی دوسرے کو اختیار نہیں رہتا بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے ظہور کے لئے جیسے کُن ہوتا ہے، فَیَکُوْن اس کے بعد وہ کام واقع ہو جاتا ہے، اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (سورۂ یٰس: ۸۲) تو جب اللہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا حکم صرف کُن ہوتا ہے اور وہ کام ہو جاتا ہے، تو یہ کُوْنُوْا جو ہے یہ اسی کُن سے ہے، ہم نے کہہ دیا کُوْنُوْا، فَیَکُوْنُوْا، پس جیسے ہم نے کہا تھا ویسے وہ ہو گئے یعنی وہ ذلیل بندر بن گئے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط

پیچھے سے سلسلہ چلا آ رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے واقعات کا، اور سرور کائنات ﷺ کے زمانے میں جو یہود موجود تھے اُن کے سامنے اُن کی تاریخ دوہرائی جا رہی ہے، یہ واقعہ جو ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے اس کا اجمالی ذکر پہلے آپ کے سامنے سورۂ بقرہ میں ہو چکا وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ (سورۂ بقرہ: ۶۵)۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ: تمہیں پتا ہے ان لوگوں کا۔ قرآنِ کریم کے مخاطب جو اس وقت کے یہودی تھے اُن کو کتنی پختگی کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں تجاوز کیا تھا، اور ہم نے کہہ دیا تھا کہ ذلیل بندر بن جاؤ، تمہیں پتا ہے ان کا۔ اتنی پختگی کے ساتھ قرآنِ کریم نے اس کو ذکر کیا، اور اس وقت کے یہودیوں نے آگے سے کوئی اعتراض نہیں کیا کہ جی! آپ غلط کہتے ہیں، ہماری تاریخ میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں۔ تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک یہ واقعہ بالکل شہرت کے درجے کا تھا، اور یہود اپنے قومی واقعات کے طور پر اس واقعے کو جانتے پہچانتے تھے، جس طرح سے دوسرے واقعات ہیں اسی طرح سے اس واقعے کو بھی جانتے پہچانتے تھے۔ تو قرآنِ کریم نے انہیں تنبیہ کی ہے کہ پتا ہے؟ ان کا کیا حال ہوا تھا جنہوں نے حیلے بہانے کر کے اللہ کے حکم کو باطل کرنا چاہا تھا، اس واقعے کو یاد رکھو، وہ تمہارے لیے عبرت ہے، اگر آج بھی تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو اسی طرح سے ٹھکراؤ گے یا اسی طرح سے باطل کرنے کی کوشش کرو گے، تو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اُس وقت اُن کو بندر بنا سکتی ہے وہی اللہ کی قدرت آج بھی موجود ہے، اور تم بھی اسی طرح سے اللہ کی گرفت میں آ سکتے ہو، واقعہ یاد کروانے کا مطلب یہ ہوتا ہے، جیسے آپ حضرات کو نصیحت کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ تمہیں پتا ہے فلاں شخص نے ایسے کیا تھا، اس کا کیا انجام ہوا؟ تو یاد دلانا بطور تنبیہ کے ہوتا ہے۔ تو وہاں یہ اجمالاً مذکور تھا اور یہاں اس واقعے کی تفصیل ہے۔

''ایلہ'' بستی کا محلِ وقوع

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ تو یہ قریہ کون سی تھی؟ عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قریہ کا نام اَیلہ ہے، اب آپ کے سامنے وہ

جغرافیائی نقشہ نہیں، ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ نقشے میں آپ کے سامنے ایک سمندر کی شاخ ہے مشرقِ وسطیٰ کے درمیان میں، جس کو ''خلیج عقبہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ جدہ بندرگاہ اسی خلیج میں ہے، اور اس کے بعد ینبوع بندرگاہ ہے سعودی عرب کی، وہ بھی اسی خلیج میں ہے، اس سے آگے اُردن کا علاقہ آجاتا ہے تو اُردن کی بندرگاہ عقبہ اسی خلیج میں ہے، اسی لیے اس کو ''خلیج عقبہ'' کہتے ہیں، اور اس کے بعد اِسرائیل کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ تو آج بھی اس شاخ میں، اس ''خلیج عقبہ'' میں جو اِسرائیل کی بندرگاہ ہے اس کا نام بھی اِیلات ہے، ایلات یہ اسرائیل کی بندرگاہ ہے اسی ''خلیج عقبہ'' میں، تو عام طور پر مفسرین کا رُجحان یہ ہے کہ یہی بستی ''ایلہ'' ہے، اس وقت یہ ''ایلہ'' کہلاتی تھی، اور آج اس کا نام ''اِیلات'' ہے، یہاں وہ یہودی سمندر کے کنارے پر آباد تھے جن کو یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور ان کا زمانہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کے لگ بھگ ہے جب یہ واقعہ پیش آیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے یہ حامل تھے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں، اُن کی شریعت وہی تھی جو توراۃ کی ہے۔ اور توراۃ میں ہفتے کے دِن کو معظم قرار دیا ہوا تھا، کہ ہفتے کے دِن نہ وہ کاروبار کر سکتے تھے، نہ شکار کر سکتے تھے، کوئی کام نہیں کر سکتے تھے، وہ دِن ان کی عبادت کا دِن تھا، سارا دِن ان کو فارغ رکھنا پڑتا تھا، کوئی کاروبار نہیں کر سکتے تھے۔

یہود ونصاریٰ کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے آسانی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری شریعت میں جو آسانیاں فرمائی ہیں توراۃ کی شریعت کے مقابلے میں، اُن میں سے ایک آسانی یہ بھی ہے، کہ یہودیوں کے لیے ایک دن تھا ہفتہ، وہ اُن کو سارے کا سارا فارغ رکھنا پڑھتا تھا، سوائے عبادت کے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے، عیسائیوں کے لیے دن متعین ہوا اتوار، وہ بھی اُن کو سارے کا سارا فارغ رکھنا پڑتا تھا، کوئی کاروبار نہیں کر سکتے تھے، وہ بھی عبادت کا دن تھا، اور مسلمانوں کے لیے دن متعین ہوا جمعہ، اس دن کی تعظیم باقی دنوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے، لیکن ہماری شریعت میں یہ پابندی نہیں کہ جمعہ کا دِن سارا ہی فارغ رکھو! کہ جمعرات کی شام کو سورج غروب ہو تو جمعہ کے سورج غروب ہونے چوبیس گھنٹے تمہیں کوئی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں، کوئی شکار کرنے کی اجازت نہیں، ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آسانی فرمادی کہ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (سورۂ جمعہ:۹) کہ جمعہ کی اذان ہو جائے تو پھر اللہ کے ذکر کی طرف بھاگ کے آیا کرو اور خرید وفروخت چھوڑ دیا کرو، خرید وفروخت کا ذکر اتفاقی ہے، ورنہ جس کام میں بھی انسان لگا ہوا ہو جمعہ کی اذان سننے کے بعد اُس کا چھوڑنا ضروری ہے، جمعہ کی اذان سن لینے کے بعد سوائے نماز کی تیاری کے ہر کام حرام ہے، خاص طور پر طالب علموں کو یہ مسئلہ بھولا ہوا ہے۔

اَذانِ جمعہ کے وقت کے متعلق خطباء کے لئے لمحۂ فکریہ!

اور معاف کرنا، اس مجموعی گمراہی کے اندر قوم کو بدعملی میں ڈالنے والے ہمارے بعض خطباء ہیں، کیونکہ بعض جگہ اَذان تو ہو جاتی ہے ساڑھے بارہ بجے، اور جمعہ ہونا ہوتا ہے ساڑھے تین بجے، اور گرمیوں کے دنوں میں جو اَذان سنتے ہی جا کر مسجد میں بیٹھ جائے وہ تین گھنٹے تک ہوا روک کے رکھے، پیشاب روک کے بیٹھے، گرمی کے مہینے میں بیٹھا ہوا وہاں جھومتا جھولتا رہے، اس کے

علاوہ اس کا اور کیا کام ہوتا ہے، جب نماز کا وقت آئے گا تو اُس کا کچومر نکلا ہوا ہوگا۔ اس لیے پھر لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ اَذان ہوتی ہے تو بے فکر ہو کر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی تو گھنٹے کے بعد مولوی صاحب نے آنا ہے، پھر اس نے خطابت کے جوہر دکھانے ہیں، لیلیٰ مجنوں کے قصے سنانے ہیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ وہ چلے گا، اور پھر چندے کی اپیل ہونی ہے، اس قسم کی باتیں ہونی ہیں، اور جب دوسری اَذان ہوگی، خطبہ شروع ہوگا تو چلے چلیں گے، چنانچہ بیٹھے ہوئے گھڑیاں دیکھتے رہتے ہیں، جب دوسری اَذان کا وقت ہوتا ہے تب خطبہ شروع ہونے پر آتے ہیں، مسجد اس وقت پُر ہوتی ہے، ورنہ دو تین بوڑھے آکے مسجد میں بیٹھ جاتے ہیں، اور مولوی صاحب لاؤڈ سپیکر لگا کر سارا زورِ خطابت اس وقت دکھاتے ہیں۔ اگر طریقہ یہ ہو جس طرح آج بھی حرمین شریفین میں ہے کہ زوال ہوا، اذان ہوئی، سنتیں پڑھیں دوسری اَذان ہوئی اور خطبہ شروع ہو گیا، خطبہ ختم ہوا تو نماز شروع ہو گئی، پینتیس چالیس منٹ میں انسان اچھی طرح سے جمعہ سے فارغ ہو کے گھر آجاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اَذان سے گھنٹہ گھنٹہ پہلے جا کے بیٹھتے ہیں، اور وہ سبقت الی الجمعۃ کی فضیلت حاصل کرتے ہیں اس خیال سے کہ پھر جگہ نہیں ملے گی، اَذان ہونی ہوتی تھی سوا بارہ، ساڑھے بارہ، اور ہماری عادت تھی کہ دس بجے جا کر مسجد میں بیٹھ جاتے، اب دس بجے جا کے بیٹھیں اور بارہ ساڑھے بارہ بجے فارغ ہو کے آجائیں، یہ پاکستان کے جمعوں سے پھر بھی ہلکا جمعہ ہے، کہ یہاں اَذان ہونے کے بعد جائیں تو انسان اتنی جلدی اتنی سہولت سے فارغ ہو کر نہیں آتا، جتنا وہاں دس بجے جا کر سہولت سے انسان فارغ ہو کر آجاتا ہے۔ مجموعی طور پر سُنّت کے خلاف ایک طریقہ اپنایا، اور لوگ اس فضیلت سے محروم ہو گئے، اَذان سننے کے بعد وہ اپنے کاروبار میں ویسے ہی لگے رہتے ہیں، بالکل متوجہ نہیں ہوتے، یہ نمازی قسم کے لوگ! وہ نہیں جو نماز نہیں پڑھتے، نمازی قسم کے لوگ بھی متوجہ نہیں ہوتے، وہ بھی کوشش یہی کرتے ہیں کہ جب دوسری اَذان کا وقت ہوگا اور خطبے کا وقت آئے گا تو چلے جائیں گے، ورنہ یاد رکھیے! سرورِ کائنات ﷺ کے زمانے میں اگرچہ ایک اَذان تھی جو خطبے سے پہلے ہے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دوسری اَذان شروع ہوئی باجماعِ صحابہ، عبارۃ النص کے طور پر تو اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ کا مصداق وہی دوسری اَذان ہے جو اَب خطبے کے وقت کہتے ہیں، لیکن دلالۃ النص کے طور پر، کہ چونکہ یہ جو اَذان ہوتی ہے یہ بھی من یوم الجمعۃ لصلوۃ الجمعۃ ہے، اس لیے دلالۃ النص کے طور پر قرآنِ کریم کی آیت کا مصداق یہ اَذان بھی ہے، عبارۃ النص کے طور پر نہیں، کیونکہ صراحت اسی اَذان کی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں خطبے سے پہلے ہوتی تھی، البتہ دلالۃ النص کے طور پر یہ اَذان بھی اس اَذان کا مصداق ہے، تو جب یہ اَذان کا مصداق ہے تو اسی وقت سعی الی الجمعہ فرض ہو جاتی ہے جس وقت جمعہ کی اَذان ہو، اور سارے کے سارے کام چھوڑنے ضروری ہوتے ہیں۔ کس وقت تک؟ جس وقت تک نماز سے فارغ نہ ہو جائیں۔ اور فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا: جب نماز پوری ہو جائے پھر جاؤ، وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (سورۂ جمعہ: ۱۰) اور اللہ کا رزق تلاش کرو، اللہ کا فضل تلاش کرو، یعنی پھر کاروبار کی اجازت ہے، تو یہ پون گھنٹہ یا گھنٹہ، اتنا وقت ہے جس میں پابندی لگائی گئی، اور دن کے باقی حصے میں کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے، شکار بھی کیا جا سکتا ہے، کھایا پکایا بھی جا سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہودیوں کا اِمتحان اوران کا ''کلابی تقویٰ''

اُن پر یہ پابندی تھی کہ ہفتے کے دِن یہ شکار نہیں کر سکتے تھے، اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس قوم کے اوپر ایک آزمائش آگئی، یہ تھے سمندر کے کنارے پر رہنے والے، اور سمندر و دریا کے کنارے رہنے والے لوگوں کو شکار کا خاص شغف ہوتا ہے، مچھلیاں پکڑنے کا، شکار کرنے کا، خاص طور پر جبکہ معاش بھی اسی سے متعلق ہو کہ گزارہ بھی اسی سے ہوتا ہو۔ تو یہ لوگ بھی ایسے ہی تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آزمائش آئی کہ ہفتے کے دِن تو مچھلیاں اتنی آتیں کہ پانی کے اُوپر تیرتی ہوئی معلوم ہوتیں، سر اُٹھا اُٹھا کے ظاہر ہوتیں، اور جس دن ہفتہ نہ ہوتا اُس دن تلاش کی ہوئی نہ ملتیں۔ اب یہ لوگ کہاں تک صبر کرتے، چونکہ اللہ کی طاعت کی گرفت تو ان پر تھی نہیں، دل میں خدا کا خوف تو تھا نہیں، احکام کے اندر حیلہ جوئی ان کی فطرت تھی، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈالا، اور اس آزمائش میں ناکام ہونے کی صورت میں اللہ کی گرفت میں آگئے۔ اب وہ سوچتے ہیں کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ شریعت کا حکم بھی بچ جائے اور مچھلیاں بھی بچ کر نہ جائیں، دونوں کام ہی کر لیے جائیں، یعنی تقویٰ بھی محفوظ رہ جائے اور مقصد بھی حل ہو جائے۔ جیسے حضرت تھانوی ﷫ فرماتے ہیں کہ ایک تحصیل دار بڑا ''وظیفہ جی'' تھا، وظیفے بہت پڑھا کرتا تھا، فجر کے بعد اِشراق تک مصلیٰ پر بیٹھنے کا عادی تھا، اور اُس وقت میں بولتا بھی نہیں تھا کہ کہیں وظیفے میں فرق نہ آجائے، تو جس وقت صاحبِ معاملہ لوگ آتے، اُن کے ساتھ رشوت اِشاروں سے طے ہوتی، دو سو، تین سو، چار سو، اور ہاتھ نہیں لگاتا تھا، مصلیٰ اُٹھا دیتا، وہ نیچے رکھ دیتے تھے، تو جس وقت اِشراق پڑھ کے فارغ ہوتا تو نیچے بڑا اللہ کا فضل جمع ہوتا تھا، بولتا نہیں تھا کہ وظیفے میں خلل آجائے گا، تو حضرت تھانوی ﷫ فرماتے ہیں کہ اسی طرح سے بعض لوگوں کا تقویٰ ''کلابی تقویٰ'' ہوتا ہے، یہ حضرت تھانوی ﷫ کی اِصطلاح ہے ''کلابی تقویٰ'' کلاب جمع ہے کلب کی، کتوں والا تقویٰ، کہ کتے کہ یہ خاصیت ہے کہ جب پیشاب کرنے لگے تو ٹانگ اٹھا لیتا ہے کہ کہیں چھینٹے نہ پڑ جائیں، لیکن پاخانہ مل جائے تو سارا کھا جاتا ہے۔ تو یہ ''کلابی تقویٰ'' ہوتا ہے کہ انسان اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یوں بھی چاہے کہ تقویٰ کو ٹھیس نہ پہنچے، لیکن در پردہ اللہ کے اَحکام کے خلاف ورزی بھی ہو جاتی ہے، اس طرح سے بعض لوگوں کی یہ فطرت ہوتی ہے، یہ یہودی فطرت ہے، اس یہودی فطرت نے وہاں بھی اپنا رنگ دکھایا، انہوں نے کیا کیا؟ کہ سمندر کے کنارے پر تالاب بنالیے، گڑھے کھود لیے، ہفتے کا دِن جب آنے والا ہوتا تو ان کا منہ کھول دیتے، اور جب ادھر پانی آتا تو مچھلیاں بھی آجاتیں، اور پھر تالابوں کے منہ بند کر دیتے، پھر ہفتہ گزر جاتا، اگلے دِن مچھلیاں پکڑ لیتے، اب مچھلی کو گھیر کے تھوڑے سے پانی میں محبوس کر لینا یہ بھی تو مچھلی کا شکار ہے، یہ طریقہ انہوں نے اپنا لیا۔

اِمتحان کے نتیجے میں قوم کے تین گروہ

جب وہ اس طرح کرنے لگے تو اب قوم تین حصوں میں بٹ گئی، بعض تو ایسے تھے جنہوں نے اس جرم کو اپنایا، اور بعض ایسے تھے کہ اپنایا بھی نہیں، لیکن اتنی شدت کے ساتھ انہیں روکا بھی نہیں، ایک آدھی دفعہ کہہ کے وہ کہنے لگے کہ چھوڑو، جب نہیں باز آتے تو ہمیں کیا، اپنے کیے کی سزا خود بھگتیں گے۔ لیکن ساتھ مچھلیاں پکڑی بھی نہیں۔ اور تیسرے وہ تھے جیسے میں نے عرض کیا کہ

ہمارے تبلیغی بھائیوں کی طرح بیچارے پیچھے پڑے ہوئے تھے، کہ کسی طرح یہ مان جائیں، صبح شام، رات دن ان کے ہاں گشت کررہے ہیں، ان کو کہہ رہے ہیں، سمجھا رہے ہیں۔ تو یہ جو گروہ تھا جو ایک آدھی دفعہ کہہ کے چپ ہوگیا، یا جو نہیں سمجھا رہا تھا، انہوں نے اِن لوگوں سے کہا کہ ان کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو، ان کا تو حال ایسا ہے کہ یا تو اللہ انہیں کسی سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے، یا بالکل ہی ہلاک کرنے والا ہے، یہ تو برباد ہونے والے لوگ ہیں، ان کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ یہ بات وہ کہتے زیادہ سمجھانے والوں کو۔ وہ کہتے کہ بھائی! ہمارے مقصد دو ہیں: اوّل تو ہم مایوس نہیں، ہوسکتا ہے یہ سمجھ ہی جائیں، آج نہیں تو کل سمجھ جائیں گے۔ اور دُوسرا ہمارا مقصد یہ ہے کہ کم از کم اللہ کے سامنے تو ہم معذرت کردیں گے نا، اپنا عذر تو بیان کردیں گے کہ یا اللہ! ہم نے پوری طرح سمجھایا، اور یہ لوگ نہیں سمجھے تو ہم کیا کریں۔ لیکن اتنی کوشش کے باوجود جس وقت وہ لوگ نہیں سمجھے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب وہ سب نصیحتوں کو بھلا بیٹھے اور ہر قسم کے حکم کے مقابلے میں سرکش ہوگئے تو پھر ہماری گرفت میں آگئے، ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر ذلیل بن جاؤ، وہ بندر ذلیل بن گئے، جانوروں میں سے ایک جانور بندر ہی ہے نہایت حیلہ جو، ان کی شکل اس طرح سے مسخ کردی گئی۔ تو اَب ان موجودہ یہودیوں کو یہ واقعہ اسی لیے یاد دلایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی چاہے کسی حیلے کے ساتھ ہو، انسان کو اللہ کے عذاب میں گرفتار کرادیتی ہے۔ تم بھی اپنی اس موجودہ زندگی پر نظر ڈالو کہ تم کس طرح سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کررہے ہو۔ یہ ہے واقعہ جو ان آیات کے اندر ذکر کیا گیا۔

پوچھئے ان سے، سوال کیجئے ان سے بستی کے متعلق جو کہ سمندر کے کنارے پہ تھی، جبکہ وہ تجاوز کرتے تھے ہفتے کے بارے میں، جب کہ آتی تھیں ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے کے دِن تیرتی ہوئی، ظاہر ہوتی ہوئی، شرعاً ظواہر کے معنی میں۔ اور جس دِن وہ ہفتے میں داخل نہیں ہوتے تھے وہ مچھلیاں ان کے پاس ایسے نہیں آتی تھیں، کذالك کو ماقبل کے ساتھ جوڑ لیا۔ اور مابعد کے ساتھ جوڑیں گے تو ''ایسے ہی ہم ان کی آزمائش کرتے تھے بسبب اس کے کہ وہ نافرمان تھے، نافرمانی کی بنا پر ہم نے ان کی آزمائش ایسے ہی شروع کردی۔ جب کہ کہا ان میں سے ایک جماعت نے، یہ جماعت وہ ہے جو ایک آدھی دفعہ سمجھا کے تھک کے بیٹھ گئے، کہ کیوں نصیحت کرتے ہو تم ان لوگوں کو جن کو ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب دینے والا ہے سخت عذاب، وہ کہنے لگے کہ اللہ کی طرف عذر کرنے کے لئے، عذر اتارنے کے لئے، الزام اتارنے کے لئے، اللہ کی طرف معذرت واضح کرنے کے لئے اور شاید کہ یہ متقی ہوجائیں، بچ جائیں، اس جرم کے ارتکاب سے رُک جائیں، فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ: جس وقت بھول بیٹھے وہ ان سب باتوں کو جن کے ساتھ وہ نصیحت کیے جاتے تھے، نجات دی ہم نے ان لوگوں کو جو روکتے تھے بُرائی سے، اور پکڑ لیا ہم نے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا سخت عذاب میں، بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: بسبب اس کے کہ وہ نافرمان تھے۔ پس جب وہ سرکش ہوگئے اس چیز سے جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے کہہ دیا ان کو کہ ہو جاؤ تم ذلیل بندر۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ

یاد کیجئے جب آپ کے رب نے اطلاع دی کہ البتہ ضرور بھیجتا رہے گا وہ ان یہودیوں پر قیامت کے دن تک اس کو جو

يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ

انہیں بدترین تکلیف پہنچاتا رہے گا، بے شک آپ کا رب البتہ جلدی سزا دینے والا ہے

وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٦٧﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ

اور بے شک وہ البتہ بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۶۷﴾ ہم نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا زمین میں مختلف جماعتیں، اُن میں سے

الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ

بعض اچھے لوگ ہیں اور اُن میں سے کچھ اور طرح کے ہیں، اور ہم نے اُن کو آزمایا اچھی حالتوں کے ساتھ اور بُری حالتوں کے ساتھ

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿١٦٨﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ

تاکہ وہ لوٹ آئیں ﴿۱۶۸﴾ جانشین بنے اُن کے بعد نااہل لوگ جو وارث ہوگئے کتاب کے،

يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ

اس قریبی زندگی (یعنی دُنیا) کے سامان کو وہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں عنقریب بخش دیا جائے گا، اور اگر

يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ

اُن کے پاس ویسا ہی اور سامان آجائے تو اُس کو بھی لے لیتے ہیں، کیا اُن پر نہیں لیا گیا کتاب

الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ

کا عہد کہ نہیں بولیں گے اللہ پر مگر سچی بات، اور انہوں نے پڑھ لیا جو کچھ اس کتاب میں ہے،

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦٩﴾ وَالَّذِيْنَ

اور پچھلا گھر بہتر ہے اُن لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿۱۶۹﴾ جو لوگ

يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿١٧٠﴾

کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اَجر کو ضائع نہیں کرتے ﴿۱۷۰﴾

وَاِذْ	نَتَقْنَا	الْجَبَلَ	فَوْقَهُمْ	كَاَنَّهٗ	ظُلَّةٌ	وَّظَنُّوْٓا	اَنَّهٗ

قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ اُٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اُوپر گویا کہ وہ سائبان ہے اور ان لوگوں نے خیال کیا کہ بے شک وہ پہاڑ ان پر

وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

گرنے والا ہے، (ہم نے کہا) پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی قوت کے ساتھ، اور یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں تا کہ تم متقی بن جاؤ ﴿۱۷۱﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ: یاد کیجیے، اِذْ متعلق بِاُذْكُرْ، یا: لِيَذْكُرْ، چاہیے کہ ذکر کیا جائے اس وقت کو جب اطلاع دی آپ کے رب نے، تَاَذَّنَ اطلاع دینے کے معنی میں، اَعْلَمَ کا مفہوم ہے اس میں، اور موجودہ اصطلاح میں تنبیہ کرنا، نوٹس دینا، اس لفظ میں اسی قسم کا مفہوم ہے، ''جب آپ کے رب نے اطلاع دی'' اور یہ اطلاع جو ہے یہ مشتمل ہے وعید کے معنی پر، اس لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے مفہوم کو آج کل نوٹس دینے سے جو تعبیر کیا جاتا ہے نا اس کا یہی مفہوم ہے، کہ اطلاع دی جاتی ہے اور ساتھ اس میں دھمکی اور وعید ہوتی ہے، لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ: البتہ ضرور بھیجے گا اللہ تعالیٰ عَلَيْهِمْ: ان یہودیوں پر، اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: البتہ ضرور بھیجتا رہے گا اللہ تعالیٰ ان پر قیامت کے دن تک، مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ: جو ان کو بدترین تکلیف پہنچاتا رہے گا، يَسُوْمُهُمْ یہ لفظ پہلے آپ کے سامنے گزرا ہے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ، یہ فرعونی تمہیں بدترین عذاب دیا کرتے تھے۔ ''جو انہیں بدترین عذاب پہنچاتا رہے گا'' اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ: اور بیشک آپ کا رب البتہ جلدی سزا دینے والا ہے، وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اور بیشک وہ البتہ بہت بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا: اُمَمًا، اُمۃ کی جمع، ہم نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا زمین میں مختلف جماعتیں، مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ: ان میں سے بعض اچھے لوگ ہیں، وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ: اور ان میں سے کچھ اور طرح کے ہیں، یعنی صالحین کے علاوہ اور، وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ: اور ہم نے ان کو آزمایا اچھی حالتوں کے ساتھ اور بُری حالتوں کے ساتھ۔ حسنات: بھلائیاں، اچھی حالتیں۔ سیئات: بُرائیاں، بُری حالتیں۔ ''ہم نے آزمایا ان کو اچھی حالتوں کے ساتھ اور بُری حالتوں کے ساتھ'' لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: تا کہ وہ لوٹ آئیں۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ: خلف لام کے سکون کے ساتھ کہتے ہیں جانشین کو، اور جانشین بھی وہ جو اچھا نہ ہو، لام کے سکون کے ساتھ جو آتا ہے تو یہ نا اہل جانشین کے لیے بولا جاتا ہے، نالائق جانشین، اور لام کے فتحہ کے ساتھ اگر آئے تو وہ اچھے جانشین کے لئے بولا جاتا ہے، تو لام کا سکون اور لام کا فتحہ یہ دونوں معنوں میں فرق ڈالتا ہے، وَّرِثُوا الْكِتٰبَ: جو وارث ہوگئے کتاب کے، يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى: ادنیٰ دُنُوّ سے ہے، دنو کے معنی قریب ہونا، ادنیٰ کا ہی مؤنث ہے دُنْیَا، افضل کا مؤنث جس طرح سے فُضْلٰی آتا ہے، افعل کا مؤنث فُعْلٰی، اسی طرح سے ادنیٰ کا مؤنث ہے دنیا، ادنیٰ سے مراد ہے قریبی زندگی، دنیا کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے، تو هٰذَا الْاَدْنٰى کا معنی ''اس قریبی زندگی کے سامان کو وہ لیتے ہیں'' اور مراد یہی موت سے پہلے کی یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں یہی ہمارا ادنیٰ اور دنیا ہے، مؤنث کے

طور پر تعبیر کیا جائے حیاتِ دنیا، قریب والی زندگی، اور مذکر کی تعبیر اس کی ادنیٰ کے ساتھ ہے، حالِ ادنیٰ یعنی جو قریبی حال ہے، یہی جس میں ہم گزر رہے ہیں اس کے سامان کو وہ لیتے ہیں، ''دنیوی سامان کو لیتے ہیں، دنیا کے سامان کو وہ لیتے ہیں'' وَيَقُوْلُوْنَ: اور کہتے ہیں، سَيُغْفَرُ لَنَا: ہمیں عنقریب بخش دیا جائے گا، معاف کر دیا جائے گا، وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ: اور اگر ان کے پاس ویسا ہی اور سامان آجائے، عرض سامان کو کہتے ہیں، ویسا ہی اور سامان آجائے يَاْخُذُوْهُ: تو اس کو بھی لے لیتے ہیں، اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ: کیا ان پر نہیں لیا گیا کتاب کا عہد، اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: کہ نہیں بولیں گے اللہ پر مگر سچی بات، وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ: فِيْهِ کی ''ہٗ'' ضمیر کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، جو کچھ کتاب میں ہے انہوں نے اس کو پڑھ بھی لیا، پڑھا انہوں نے جو کچھ کتاب میں ہے، وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ: اور پچھلا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ: يُمَسِّكُوْنَ يَتَمَسَّكُوْنَ کے معنی میں ہے، جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں، کتاب کے ساتھ تمسک کرتے ہیں، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور نماز کو قائم کرتے ہیں، اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ: بے شک ہم اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہ اُٹھایا ہم نے پہاڑ، فَوْقَهُمْ: ان کے اوپر، كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ: گویا کہ وہ سائبان ہے، وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ: اور ان لوگوں نے خیال کیا کہ بیشک وہ پہاڑ ان پر گرنے والا ہے، خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ: ہم نے کہا کہ پکڑ و اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے قوت کے ساتھ، خُذُوْا سے پہلے قُلْنَا کا لفظ محذوف ہے، '' پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی، پکڑو قوت کے ساتھ'' بِقُوَّةٍ کا تعلق خُذُوْا کے ساتھ ہے، وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ: اور یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تم اللہ کے عذاب سے بچ جاؤ، تاکہ تم متقی بن جاؤ، پرہیز گار ہو جاؤ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

یہود کی ذِلّت ایک مسلمہ تاریخی حقیقت

ذکر چلا آرہا ہے بنی اسرائیل کا، خصوصیت کے ساتھ یہود کا، اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ایک بات کی یاددہانی کروائی ہے، کہ تمہیں اطلاع دے دی گئی تھی، کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو قیامت تک تمہارے اوپر ایسے لوگ مسلط ہوتے رہیں گے جو تمہیں بدترین قسم کے عذاب میں مبتلا کریں گے، اور یہود کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ قوم بہت مصیبتوں کی آماجگاہ رہی ہے، زیادہ دُور نہ جائیے، یہی دوسری جنگ عظیم جو ہوئی تھی جو تقریباً ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئی تھی، اور ۱۹۴۳ء میں ختم ہوئی تھی، پانچ سال ساری دُنیا جنگ کی لپیٹ میں رہی، اس جنگِ عظیم میں بھی جتنی مصیبتیں ان یہود پر آئی ہیں شاید کسی پر نہیں آئیں، ہٹلر وغیرہ نے سب سے زیادہ سختیاں ان کے اوپر کی ہیں، تو اس قوم کا شیرازہ ہمیشہ بکھرا رہا، ان کو اکٹھے ہو کے کسی ایک علاقے کے اندر عزت کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا، ان کی تاریخ شاہد ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے دو ہزار سال سے یہ قوم دربدر دھکے کھا رہی ہے، کبھی کسی کی محتاج، کبھی کسی کی ماتحت، باوجود اس بات کہ یہ سُودی کاروبار وغیرہ کرنے کی وجہ سے مال دار ہیں، لیکن

ان کو اجتماعی زندگی میں کہیں بھی عزت نصیب نہیں ہوئی دو ہزار سال سے ان کا یہی قصہ چلا آ رہا ہے کہ کسی جگہ یہ مجتمع نہیں، کسی جگہ ان کی جماعت نہیں تھی، اور در بدر یہ دھکے کھاتے پھرتے تھے، یہ تاریخ کی بالکل ایک مسلمہ حقیقت ہے، اب یہ جو آپ کے سامنے ایک اسرائیلی ریاست بن گئی، جس میں یہود جمع ہو گئے اس ریاست کا وجود ۱۹۴۸ء میں ہوا ہے، یعنی ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا ہے، اور پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء میں فلسطین کو تقسیم کر کے یہودی ریاست کی بنیاد رکھی گئی، تو یہ جو ریاست کی بنیاد رکھی گئی تو یہاں پھر یہود کو اکٹھا کرنا شروع کیا، اب یہ چند لاکھ یہودی اس علاقے کے اندر اکٹھے ہیں، لیکن جو لوگ حالات کو جانتے اور سمجھتے ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت نمایاں ہے کہ یہ ریاست اپنی ذات میں کوئی مستقل نہیں ہے، اصل کے اعتبار سے یورپ نے، برطانیہ، فرانس، امریکا نے، اور در پردہ رُوس کی تائید بھی تھی، مشرقِ وسطیٰ پر کنٹرول کرنے کے لیے اپنے ایجنٹوں کے لیے ایک اُڈا بنایا ہے، اور اب بھی حقیقت کے اعتبار سے یہ امریکا کی فوجی چھاؤنی ہے، باہر کی قومیں اگر اس کو سہارا اور تحفظ نہ دیں تو یہ ریاست اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے ایک دِن بھی اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ تو ان کی اپنی مستقل کوئی حکومت نہیں، غنڈوں کا جیسے گروہ جمع ہو جاتا ہے اسی طرح سے دوسروں کی سرپرستی میں یہ گروہ جمع ہو گیا، اور بڑی قوموں کا مقصد تھا مسلمانوں پر مشرقِ وسطیٰ میں کنٹرول کرنا، تو انہوں نے یہ ایک چھاؤنی قائم کر دی جس کے اندر یہ یہودی اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولیے کہ اسرائیل کے اندر بھی یہود کو امن نہیں ہے، ہر وقت سرحدوں کے اوپر جو جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں، انہوں نے ان لوگوں کو ہر وقت حالتِ جنگ میں رکھا ہوا ہے، تو یہ نہ سمجھیے کہ ان کو امن اور سکون کی زندگی نصیب ہو گئی، ان کو امن اور سکون ابھی بھی ان کی نہیں، ہر وقت میدانِ جنگ میں ہیں، ان جھڑپوں اور لڑائیوں کی وجہ سے جس طرح سے فلسطینی اور دوسرے لوگ کرتے رہتے ہیں، ہر وقت وہ قوم حالتِ جنگ میں ہے۔ اور وہ تھوڑا سا خطہ ہے، کوئی بڑا ملک نہیں ہے، اس لیے جب لڑائی چھڑتی ہے تو یوں سمجھو کہ ساری ریاست ہی میدانِ جنگ بن جاتی ہے۔

کیا ''مہدی'' دُنیا میں صرف ایک ہے؟

اور اس کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت اور بھی یاد رکھیے! حدیث شریف میں آتا ہے کہ آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، اور اُس وقت مہدی جو ہیں (''مہدی'' ان کے لقب کے طور پر ہی ذکر کیا جاتا ہے، نام تو ان کا احمد ہوگا، اور ''مہدی'' کے لقب کے ساتھ وہ ملقب ہوں گے) ''مہدی'' کا معنی ہدایت دیا ہوا، چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق ہی سارا کام کریں گے، اس لیے اُن کو ''مہدی'' کہتے ہیں، ورنہ ''مہدی'' یہ کوئی اکیلے نہیں جن کا آپ انتظار کر رہے ہیں، ''مہدی'' بہت ہوئے ہیں، ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفۂ مہدی ہیں، عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ مہدی ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ خلیفۂ مہدی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ مہدی ہیں، خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہدی ہونے کی دُعا دی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث شریف میں دُعا آتی ہے: ''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا''[1] اور ان خلفائے اَربعہ کے متعلق تو لفظ مشہور ہی ہے، جو آپ استعمال کرتے رہتے

(۱) سنن الترمذی ۲/ ۲۲۴ باب مناقب معاویۃ بن ابی سفیانؓ / مشکوٰۃ ۲/ ۵۷۹ باب جامع المناقب فصل ثانی۔

ہیں ''خلفائے راشدین مہدیین''، ''عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَہْدِیِّیْنَ''(۱) تو مہدیین یہ مہدی کی جمع ہے تو یہ سارے خلیفہ راشد بھی تھے اور مہدی بھی تھے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد مہدی ساری دُنیا سے افضل ہیں، اس لیے آنے والے مہدی کے مقابلے میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں، عمر رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، علی رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں، معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے افضل ہیں۔ وہ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی ہے کہ آخر وقت میں ایک خلیفہ عادل آئے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوگا، آپ کا ہم نام ہوگا، اور وہ زمین کو عدل اور انصاف کے ساتھ بھر دے گا، جس طرح سے کہ پہلے جور و ظلم کے ساتھ زمین بھری ہوئی ہوگی۔(۲)

آخر زمانے میں یہود کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ اور یہود کا خاتمہ

آخر وقت میں مسلمانوں کی لڑائیاں اسی مہدی کی قیادت میں ہیں، اور لڑائیوں کا مرکز مشرقِ وسطیٰ ہے، احادیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ ہے جس میں کوئی تاویل کی گنجائش نہیں، اور جس وقت یہ لڑائیاں انتہا کو پہنچی ہوئی ہوں گی اور ''دمشق'' جو آج شام کا دارالخلافہ ہے، اسی علاقے کے اردگرد مسلمانوں کی صف بندی ہوگی یہود کے مقابلے میں، یہ باتیں حدیث شریف میں نص کے درجے میں ہیں، مسلمانوں کی صف بندی یہود کے مقابلے میں مہدی کی قیادت میں یہیں ہے۔ جس وقت یہ صف بندی ہو رہی ہوگی اور یہود بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ اُس علاقے میں جمع ہوں گے جو علاقہ اُن کے لیے تجویز ہو یا ہوا ہے، تکوینی طور پر یہ میدان بنتا چلا آ رہا ہے، عین ایسے وقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، اور اُس وقت جو یہودیوں کا قائد ہوگا وہ سب سے بڑا دجال ہوگا، سب سے بڑا فتنہ پرداز، یعنی اُس جیسا شرارتی اور فتنہ پرداز پہلے کوئی نہیں آیا ہوگا، اس طرح سے اس نے دنگا مچایا ہوگا، یہود کی قیادت اس کے ہاتھ میں ہوگی، دجال یہودی ہے اور اس کی قیادت میں سارے یہودیوں نے مسلمانوں کے مدمقابل آنا ہے، اور لڑائی کا میدان یہی ہے دمشق اور اس کے اردگرد، جہاں آج کل یہ محاذِ جنگ ہے، شام کی سرحد اور اسرائیل کی سرحد جہاں اکٹھی ہے یہیں ہے سارے کا سارا میدانِ جنگ، اور جس وقت یہ لڑائی ہوگی تو اُس لڑائی میں ان یہودیوں کے قائد دجال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سے مرنا ہے، اور مرنا بھی ہے مقام لد میں۔ ''لُد'' یہ جگہ آج بھی اسرائیل میں ہے، اسی نام کے ساتھ موسوم ہے، اور اس کے قریب ''تل ابیب'' کے نزدیک یہودیوں کا ہوائی اڈا ہے، یہاں اس دجال نے قتل ہونا ہے، اور جس وقت ان کا یہ قائد قتل ہوگا تو اُس کے بعد یہود کا اس طرح قتل عام ہو جائے گا کہ نہ یہ کسی پہاڑ کے پیچھے چھپ کے بچ سکیں گے، نہ کسی درخت کے پیچھے چھپ کے بچ سکیں گے، اور اس طرح سے ان کے خلاف انقلاب آ جائے گا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر یہ کسی پتھر کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں گے تو پتھر انہیں پناہ نہیں دے گا، پتھر مسلمانوں کو آوازیں دے گا: ''یَا مُسْلِمُ! یَا عَبْدَ اللّٰہِ! ہٰذَا

(۱) ابن ماجہ ص ۵۔ ترمذی ۹۶/۲ باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ/ مشکوٰۃ ص ۳۰ باب الاعتصام فصل ثانی۔
(۲) مشکوٰۃ ۴۷۰/۲۔۴۷۱ باب اشراط الساعۃ۔

يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ"(۱) کسی درخت کے پیچھے چھپیں گے تو درخت آوازیں دے گا کہ: "يَا مُسْلِمُ! يَا عَبْدَ اللهِ! هٰذَا يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ" میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اس کو مار دو، یعنی یہ حقیقت بھی ہوسکتی ہے اس میں کوئی شک نہیں، ورنہ یہ مثال ہے جس طرح سے ہم کہتے ہیں کہ کسی جگہ ان کو پناہ نہیں ملے گی، نہ انہیں پہاڑ پناہ دیں گے، نہ انہیں درخت پناہ دیں گے، ایک ایک یہودی چن کے اس وقت قتل کر دیا جائے گا، اور اس وقت اس قوم کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اِسرائیل ریاست اِسرائیلوں کی ہلاکت گاہ ہے!

اور آپ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کو ختم کرنا کوئی آسان ہوتا؟ کہاں کہاں سے تلاش کر کے لاتے؟ یہ تو تکوینی طور پر میدان بنتا جا رہا ہے کہ یہ سارے ایک جگہ اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں، اور احادیث کی روشنی میں محاذِ جنگ یہی ہے، لڑائی یہیں ہونی ہے، اس لیے ان کا یہ آشیاں بندی، یہ جو آشیاں بنا رہے ہیں، یہ ایک ہی بجلی کی زد میں ہوں گے، ایک ہی دفعہ بجلی گرے گی اور سب کو خس وخاشاک کر دے گی۔ تو یہ تو موت کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں، دنیا پر غالب آنے کے لیے اور عزت پانے کے لیے نہیں۔ ہمیں اس بات پر یقین اور ایمان ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کے اقوال کی روشنی میں ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں، اس لیے ان کی یہ عیش وعشرت یا ان کی برتری، اس طرح سے سمجھو جس طرح سے کسی بستی کے اوپر ڈاکو غالب آجائیں، اور چار دِن دندنا لیں، کھا پی لیں اور سمجھیں کہ بس اب ہم برتر ہو گئے، یہ پتا نہیں کہ دوسرے وقت میں ان پر ایسی افتاد پڑے گی کہ تلاش کیے ہوئے ان کا نام ونشان نہیں ملے گا۔ تو یہ ان کا اجتماع کوئی ان کی برتری کی دلیل نہیں ہے، نہ ان کے لیے کوئی عافیت کی علامت ہے، نہ اس علاقے میں اس وقت یہ پُرامن ہیں، اور نہ اس وقت یہ خود اپنے قدموں پر ہے، امریکہ اور دوسرے ممالک اُن کی آج مدد چھوڑ دیں تو یہ آج اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے، اور یہ سارے کے سارے غنڈوں کی طرح جو وہاں اکٹھے ہوئے ہیں ایک وقت میں سب کے خاتمے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں، یہ تکویناً سب اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں، یہی محاذِ جنگ ہے احادیث کی روشنی میں، مشکوۃ شریف، کتاب الفتن کے اندر یہ ساری روایات آپ کے سامنے آئیں گی، اور علاماتِ قیامت میں یہ ساری باتیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس ریاست کا وجود اور اس علاقے کے اندر یہود کا اکٹھا ہو جانا یہ تو سرورِ کائنات ﷺ کی صداقت کی علامت ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے ساتھ قرآنِ کریم کے حقائق کی تردید ہوگئی کہ قرآن تو کہتا ہے کہ ان کی حکومت کبھی نہیں بنے گی، قرآن میں تو یوں آتا تھا، قرآن میں تو یوں آتا تھا، لوگ ذہنی طور پر مفروضے قائم کر لیتے ہیں، اور پھر خود اِشکالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تو آج بھی یہ عزت وآبرو کے ساتھ وقت نہیں گزار رہے۔ یہ اِن کو تنبیہ کر دی گئی تھی، اور یہ ان کرتوتوں سے باز نہیں آئے، جب باز نہیں آئے تو تاریخ شاہد ہے، بالکل بدیہیات میں سے ہے، اجلی بدیہیات میں سے ہے کہ جتنی یہ قوم رُوئے زمین پر ذلیل ہوئی ہے، شاید قومی حیثیت میں ایسی کوئی قوم ذلیل نہیں ہوئی۔ تو یہ گویا کہ آئندہ کے لیے پیش گوئی ہے۔ یاد کیجئے جب اطلاع دے دی تھی آپ کے رَبّ نے کہ البتہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو جو ان کو بدترین

---

(۱) مسلم ۳۹۶/۲ باب ذکر ابن صیاد سے پہلے/مشکوۃ ۴۶۶/۲ باب الملاحم عن ابی ہریرۃ / نیز بخاری ۴۱۰/۱ باب قتال الیھود۔

عذاب پہنچائے گا، بے شک آپ کا ربّ البتہ جلدی سزا دینے والا ہے، اور بے شک وہ البتہ غفور رحیم ہے۔ یہ دونوں شانیں ہیں اللہ کی، کہ وہ غفور رحیم بھی ہے اور سخت سزا دینے والا بھی ہے، یعنی اگر کوئی اس کے احکام کی پابندی کرے تو وہ غفور رحیم ہے، پابندی کا جذبہ ہو پھر غلطیاں ہو جائیں تو بخشتا ہے، نیکی کرو تو قبول کر کے رحمت کرتا ہے، اور اگر اُس کے خلاف کوئی چلتا ہے تو پھر وہ سریع العقاب ہے، جیسے سورۂ حجر میں بھی یہ لفظ آئے گا نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ کہ میرے بندوں کو بتادو، دونوں باتیں ہیں، کہ میں غفور رحیم بھی ہوں، اور میرا عذاب بھی بڑا سخت عذاب ہے، دونوں شانیں نمایاں ہیں۔

حسنات وسیئات دونوں یہود کے لیے ہمیشہ آزمائش کا سبب

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا: پہلے جو آیا تھا کہ ہم نے ان کے بارہ قبیلے بنادیے، یہ بطور انعام کے تھا کہ اس قوم کی کثرت ہے وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا، وہ ایک قومی تقسیم کی طرف اشارہ تھا کہ ان کے بارہ قبیلے ہیں، اور یہ ان کی سزا کے طور پر ہے کہ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ہم نے اُن کو مختلف ٹولیاں بنا کے زمین کے اندر متفرق کر دیا، ان کا قومی اجتماعی وجود نہیں رہا، مختلف جماعتیں بن کے کوئی کدھر نکل گیا، کوئی کدھر نکل گیا، جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی ادھر چلے گئے۔ اس اسرائیلی ریاست کے وجود میں آنے سے قبل کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جس کو آپ یہود کا علاقہ کہیں اور جہاں یہ قومی سطح پر جمع ہوں۔ متفرق ہوئے، ساری دنیا میں بکھر گئے۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ: ان میں سے بعض اچھے بھی تھے وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ: اور بعض اور ہی طرح کے ہیں، ''اور ہی طرح کے'' آپ سمجھتے ہیں کہ صالحین کے علاوہ اور طرح کے کیا ہوتے ہیں۔ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ: ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے رہے، اچھی حالتوں کے ساتھ بھی اور بری حالتوں کے ساتھ بھی۔ تو معلوم ہو گیا کہ اگر یہ یہود قوم کبھی حسنات کی حامل ہو جائے تو یہ بھی ایک ابتلاء ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے اوپر حسنات بھی آئیں اور سیئات بھی آئیں، اور یہ آزمائش کا دور چلتا رہتا ہے، کبھی ان کو سختیوں میں ڈالا کہ ان کا تکبر ٹوٹے، نیکی کی طرف آئیں، اور کبھی ان کو کھلایا پلایا کہ اسی طرح سے احسان مانیں اور سیدھے ہو جائیں، دونوں قسم کی باتیں ان کے اوپر بطور آزمائش کے آئیں، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تا کہ یہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔ بسا اوقات انسان حسنہ کے ساتھ متاثر ہوتا ہے، احسان سے متاثر ہوتا ہے، اور بسا اوقات انسان ترہیب سے متاثر ہوتا ہے۔ (۱)

یہود اپنے بڑوں کے بُرے جانشین

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ: اس میں جو لفظ خلف آیا ہے (لام کے سکون کے ساتھ) یہ اکثر و بیشتر بُرے جانشین کے لیے بولا جاتا ہے، اور خلَف (لام کے فتح کے ساتھ) اچھے جانشین کے لیے بولا جاتا ہے، اس لفظ میں لام کے فتح اور سکون کے ساتھ معنی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ پہلے تو یہود میں دونوں قسم کے لوگ تھے کچھ اچھے اور کچھ بُرے جیسا کہ پیچھے ذکر آیا ہے، لیکن اُن کے بعد جو اُن کے جانشین بنے تو وہ ناخلف تھے، یعنی بُرے جانشین تھے اگر چہ وہ کتاب اللہ کے وارث تو بن گئے، بڑوں سے انہوں نے کتاب تو پڑھ لی، لیکن اس کتاب کے مطابق عمل نہیں کیا، جب بھی کوئی آدمی مسئلہ پوچھنے آتا تو اُس کو

(۱) ریکارڈنگ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کے بعد چند آیات کی تفسیر و ترجمہ ''معارف القرآن'' و ''انوار البیان'' وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

مرضی کا مسئلہ بتا کر اُس سے مال حاصل کرتے گویا کہ انہوں نے کتاب اللہ کو دنیا اکٹھی کرنے کا ذریعہ بنالیا، اور پھر اُن کی یہ عادت بھی تھی کہ جب کبھی اُن کو اپنے اس کام پر شرمندگی ہوتی تو کہتے سَیُغْفَرُ لَنَا عنقریب ہماری بخشش کر دی جائے گی، ہمارا رب ہمیں بخشش دے گا، یا جیسے پہلے آیا تھا کہ ہمارے بڑے سفارش کر کے ہمیں چھڑالیں گے، زبان سے یہ بھی کہتے تھے اور حال یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی اُن کے پاس مال لے کر آتا، تو اُس سے مال لے کر ساتھ ساتھ اُس کی مرضی کے مطابق اللہ کی کتاب میں تحریف کر کے اُس کو مسئلہ بھی ویسا ہی بتا دیتے، یہ اُن کے حبِ مال کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس طرح دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے تھے، اور اپنے پہلے لوگوں کے وہ بُرے جانشین ثابت ہوئے۔

یہود کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ

اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ کیا اُن سے کتاب کے متعلق یہ عہد نہیں لیا گیا تھا، کہ اللہ کے متعلق صرف حق بات ہی کی نسبت کریں گے، جو بات اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اُس کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کریں گے، اور یہ باتیں وہ ہیں جو انہوں نے کتاب میں پڑھ لی ہیں، لیکن اُس کے مطابق عمل نہیں کرتے یاد رکھو! آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، دُنیا کے اندر تم نے جو عیاشی کرنی ہے کرلو، آخرت کا گھر تو متقین کے لیے ہے، اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو آخرت کی نعمتیں ملیں گی، اور بخشش ہوگی اگر اسی طرح اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے رہے، اور اس کتاب کو دنیا کمانے کا ذریعہ بناتے رہے، تو تم متقی نہ ہوئے جب متقی نہ ہوئے تو آخرت کا گھر بھی تمہیں نہیں ملے گا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم سمجھ رکھتے، یعنی اگر سمجھ ہے تو آخرت جو باقی رہنے والی ہے، اُس کو اس فانی دُنیا پر ترجیح دو، عقل اور فہم کا تقاضا یہ ہے کہ باقی رہنے والی چیز کو اختیار کیا جائے اور فانی کو باقی پر ترجیح نہ دی جائے۔

پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں، یعنی اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں، اور اس میں کسی قسم کی تحریف کے مرتکب نہیں ہوتے وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اور نماز کو قائم کرتے ہیں کیونکہ نماز کی یہ شان ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ اور نماز کی پابندی ہوگی تو بے حیائی اور بُرے کاموں سے بچے رہو گے اس لیے نماز کا ذکر خاص طور پر کر دیا اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ تو بے شک ہم مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کرتے، جو مصلح ہوگا، نیکی کو اختیار کرنے والا ہوگا، اُس کا اجر اُس کو ضرور ملے گا، اس کا اجر کبھی بھی ضائع نہیں ہوگا۔

بنی اسرائیل کی بدعہدی اور اُن پر پہاڑ کا معلق ہونا

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، حاصل اُس کا یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کی خواہش کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے شریعت مانگی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے تورات لے کر قوم کے پاس تشریف لائے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ تم نے ایک شریعت کا مطالبہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اتاری ہے اب تم اس کے مطابق عمل کرو، انہوں نے جب اس کتاب کو دیکھا تو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ تو بہت مشکل احکام ہیں ہم سے تو اس پر

عمل نہیں ہو سکے گا، کوئی آسان سی شریعت ہوتی تو ہم مان لیتے اب ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اُس کی جگہ سے اٹھا کر اُس بستی کے اوپر معلق کر دیا، جس بستی میں بنی اسرائیل آباد تھے، اور فرمایا کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، جب اسرائیلیوں نے موت کو اپنے سر پر دیکھا تو فوراً سارے سجدہ میں گر گئے، اور یہ عہد کرنے لگے کہ ہم اُس کے احکام کی پابندی کریں گے، لیکن بعد میں پھر روگردانی کی، اور اپنے عہد سے منحرف ہو گئے، اور وہی حرکتیں کرنے لگے جو اُن کی پہلے تھیں یہ واقعہ سورۂ بقرۃ میں بھی گزر چکا ہے، وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ قابل ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے ان پر کھڑا کر دیا پہاڑ کو، اس پہاڑ سے طور پہاڑ مراد ہے گویا کہ وہ سائبان ہے وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ اور انہوں نے یقین کر لیا، کہ وہ اُن کے اوپر گرنے والا ہے اور ہم نے کہا خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اُس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

ایک اہم اِعتراض کا اِزالہ

اس آیت پر بظاہر ایک چھوٹا سا اِشکال ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں ہے: ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کہ کسی کو زبردستی دینِ حق کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دینِ حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو دونوں آیتوں میں بظاہر تھوڑا سا تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ سورۂ بقرۃ میں جہاں یہ آیت ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' آئی تھی، اُس میں آپ کے سامنے گزر چکا کہ یہ آیت غیر مسلموں سے متعلق ہے، کہ کسی غیر مسلم کو زبردستی دینِ حق قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اور اس واقعے میں بنی اسرائیل کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ یہ تو وہ لوگ تھے جنہوں نے دینِ حق کو قبول کرنے کے بعد توراۃ کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، اور جو شخص ایک مرتبہ قبول کرنے کے بعد انکار کرتا ہے، تو اس کو بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس پر جبر و اکراہ کر کے اُس کو دوبارہ راہِ راست پر لانا ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اس کا تعلق غیر مسلموں سے ہے اور جن کو مجبور کیا جا رہا ہے یہ وہ لوگ ہیں، جو مسلمان ہونے کے بعد توراۃ کے اَحکام کا انکار کر گئے تھے، یہ دونوں باتیں علیحدہ علیحدہ ہیں، ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

وَاِذْ	اَخَذَ	رَبُّكَ	مِنْۢ	بَنِيْٓ	اٰدَمَ	مِنْ	ظُهُوْرِهِمْ	ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ
اور یاد کیجئے جب نکالا آپ کے رَبّ نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو اور گواہ بنایا اُن کو								
عَلٰٓي	اَنْفُسِهِمْ ۚ	اَلَسْتُ	بِرَبِّكُمْ ۭ	قَالُوْا	بَلٰي ۚ	شَهِدْنَا ۚ	اَنْ	
اُن کی جانوں پر، کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں ہے ہم نے اقرار کر لیا، کبھی								

تَقُوْلُوْا	یَوْمَ	الْقِیٰمَةِ	اِنَّا	كُنَّا	عَنْ	هٰذَا غٰفِلِیْنَ ﴿۱۷۲﴾
تم کہنے لگو	قیامت کے دن	کہ	ہم	تو	اِس سے	غافل تھے ﴿۱۷۲﴾

اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْۚ اَفَتُهْلِكُنَا

یا تم کہو کہ شرک کیا ہمارے باپ دادا نے پہلے اور ہم اُن کی اولاد تھے ان کے بعد، کیا تُو ہلاک کرتا ہے ہمیں

بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اُس کام کی وجہ سے جو گمراہ لوگوں نے کیا؟ ﴿۱۷۳﴾ اسی طرح ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں آیتیں تا کہ وہ لوٹ آئیں ﴿۱۷۴﴾

تفسیر

ماقبل سے ربط اور ''عہدِ اَلست'' کی تفصیل

گزشتہ آیات میں ان معاہدوں کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے لیے گئے تھے، کہ تم نے توراۃ کے احکام کی پابندی کرنی ہے، اب ان آیات میں اس عہد کا ذکر ہے، جو اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ آدم سے اس دنیا میں آنے سے پہلے لیا تھا، جس کو ہم طور پر ''عہدِ اَلست'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اس عہد کی تفصیل بہت سی احادیث مبارکہ میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے، ان تمام احادیث کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بات متعین ہے، کہ سیّدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کی تمام اولاد جو قیامت تک آنے والی تھی، اُس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے موجود کر دیا، جنتی، جہنمی جو بھی تھے سب کے سب اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیے اور پھر اُن سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت قوتِ گویائی عطا کی، اور اُن سے ایک سوال کیا جس کا ذکر اس آیت میں بھی ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں، جب اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا تو ساری مخلوق جو وہاں موجود تھی سب نے جواب میں کہا: بَلٰی کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رَبّ ہے اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں، یہ ہے وہ عہد جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولادِ آدم سے لیا تھا، جس کو ''عہدِ اَلست'' کہا جاتا ہے، اب کسی کو کوئی عذر نہیں رہا، اور اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ کوئی شخص توحید سے منہ موڑ کر اور شرک اختیار کر کے یہ کہے کہ مجھے تو کوئی پتا نہیں تھا، اب اس بات کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ایک تو اللہ تعالیٰ کو رَبّ مان کر اس کا اقرار بھی کر چکے ہیں، اور دوسرا یہ کہ اللہ نے ہمیشہ اپنے نمائندے بھیج کر اس عہد کی یاددہانی بھی کرائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھی بھیجتا تب بھی عذر کی گنجائش ختم ہو چکی تھی، کہ اس عہد کا اثر ہے کہ ہر انسان یہ سمجھتا ہے، کہ جس نے مجھے پیدا کیا مجھے اُس کی عبادت ضرور کرنی چاہیے، ہر انسان فطری طور پر کسی ایسی ذات کو تلاش کرتا ہے جس کی وہ عبادت کرے، اور مشرک بھی شرک کو بُرا سمجھتے ہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ شرک بُرا نہیں، کیونکہ یہ تو اس ذات تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ نے تمام اولادِ آدم سے ایک عہد لیا تھا، جس کا تذکرہ اس آیت کے اندر کیا گیا ہے۔

سوالات اور ان کے جوابات

سوال:- اس پر تھوڑا یہ اِشکال ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عہد کس جگہ اور کس وقت لیا تھا؟

جواب:- اس کے متعلق حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے، کہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اُتارا گیا تھا، اُس وقت یہ عہد لیا گیا تھا، اور اس وقت اقرار کی جگہ وادی نعمان تھی جس کو آج کل میدانِ عرفات کہا جاتا ہے، گویا کہ عرفات کے میدان میں یہ عہد لیا گیا تھا۔ (۱)

سوال:- نئی مخلوق جس کو ابھی پوری طرح وجود بھی عطا نہیں کیا گیا تھا، اُن کو کیا معلوم کہ ہمارا بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے، اور ہم نے اُسی کی عبادت کرنی ہے، بظاہر اس مخلوق سے یہ سوال تکلیف مالا یطاق معلوم ہوتا ہے؟

جواب:- اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ، جب تمام اولادِ آدم کو ایک ذرّے کی صورت میں پیدا کر دیا، تو اُس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اُس نے اُن کو بقدرِ ضرورت عقل وفہم اور شعور وادراک بھی عطا کر دیا ہو، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے یہ کوئی بعید نہیں ہے۔

سوال:- یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام انسان ایک ہی میدان میں سما گئے؟

جواب:- ایک حدیث مبارکہ میں ایک بات کی صراحت ہے، کہ جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ذُرّیت نکالی گئی تھی، اُس وقت وہ اپنے اس ڈیل ڈول کے ساتھ نہیں تھی، جس میں وہ دُنیا میں آئیں گے، بلکہ چھوٹی چھوٹی چیونٹی کے جثے میں تھی، اور سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہا، کیونکہ آج تو ایٹم کے اندر تمام نظامِ شمسی کے موجود ہونے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، ٹی وی سکرین کے ذریعے بڑے بڑے پہاڑوں کو ایک نقطے کی مقدار دکھلایا جا رہا ہے، اس لیے اس میں کوئی اِشکال کی بات نہیں، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس "عہدِ اَلست" کے وقت تمام اولادِ آدم کو بہت چھوٹے جثے میں وجود عطا فرمایا ہو۔

سوال:- اس آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشت سے اُن کی ذُرّیت کو نکالا، اور جب کہ احادیث کی طرف دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا گیا، بظاہر دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے؟

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلا واسطہ حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے، پھر اُن کی نسل کی پشتوں سے دوسروں کو اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولادِ آدم پیدا ہونے والی تھی، اسی ترتیب سے اُن کی پشتوں سے نکالا گیا، اور حدیث میں سب کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ آدم سے ان کی اولاد کو، پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو، ترتیب وار پیدا کیا گیا۔

"عہدِ اَلست" کیوں کیا لیا گیا؟

اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ یعنی یہ اقرار ہم نے تم سے لیا ہے کہ قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگ جاؤ کہ ہم تو

(۱) مشکوٰۃ ص ۲۴، عن ابن عباس/ مسند احمد ج ۴ ص ۲۶۷/ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۵۹۳۔

اس سے غافل تھے اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا، کہ اس سوال وجواب کی وجہ سے تمہارے دلوں میں ایمان کی ایسی بنیاد قائم ہوگئی، کہ ذرا غور وفکر سے کام لوگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیت کے اعتراف کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہے گا، اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ اور یہ عہد ہم نے اس لیے بھی لیا ہے، کہ کہیں قیامت کے دن تم یہ عذر نہ کرنے لگ جاؤ کہ اصل میں شرک تو ہمارے آباؤ اجداد نے اختیار کیا تھا، ہم تو اُن کی اولاد تھے، ہمیں صحیح اور غلط کا پتا نہیں تھا، اس لیے جو ہمارے بڑوں نے کیا ہم نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تو بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں مل رہی ہے؟ اس عذر کو ابھی سے دُور کر دیا کہ یہ عہد تم سے لے کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں اپنی رُبوبیت کا تعارف کرا دیا ہے، اب اگر تم شرک اختیار کرتے ہو تو یہ جرم تمہارا ہے، اس لیے اُس کی سزا بھی تمہیں ہی ملے گی وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ یہ لوگ اپنی غفلت سے باز آجائیں، اور اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا اعتراف کر کے اُس کی اطاعت میں لگ جائیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

پڑھیے ان پر خبر اس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیات دیں پھر وہ ان آیات سے نکل گیا

فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا

پھر اُس کے پیچھے شیطان لگ گیا؛ پھر ہوگیا وہ گمراہوں میں سے ﴿۱۷۵﴾ اگر ہم چاہتے تو اس کو اُونچا کر دیتے ان آیات کی برکت سے

وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ

لیکن وہ تو زمین کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، اس کا حال

كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ

کتے کے حال کی طرح ہے اگر تُو اُس پر حملہ کرے تو ہانپتا ہے، اور اگر تُو اس کو چھوڑ دے تو

يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

ہانپتا ہے، یہی مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا الْقَوْمُ

پس بیان کیجئے ان پر واقعہ تاکہ وہ غور کریں ﴿۱۷۶﴾ بری ہے مثال اُن لوگوں کی

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٧٧﴾ مَن يَهْدِ

جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے ہیں ﴿۱۷۷﴾ جس کو اللہ ہدایت دے

اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٧٨﴾

وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جس کو اللہ بھٹکا دے وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿۱۷۸﴾

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ

اور ہم نے پیدا کیا جہنم کے لیے بہت سے جنوں اور انسانوں کو، اُن کے پاس دل ہیں

لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ

لیکن ان دلوں کے ساتھ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن ان کے ساتھ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں

لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ

لیکن ان کے ساتھ سنتے نہیں، یہی لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہی لوگ

الْغَافِلُونَ ﴿١٧٩﴾ وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا

بے خبر ہیں ﴿۱۷۹﴾ اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں، انہی ناموں کے ساتھ اس کو پکارو، اور چھوڑ دو

الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ ۚ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٨٠﴾

اُن لوگوں کو جو اللہ کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں، عنقریب بدلہ دیئے جائیں گے یہ ان کاموں کا جو یہ کرتے تھے ﴿۱۸۰﴾

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿١٨١﴾

جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا اُن میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور حق کے مطابق عدل کرتی ہے ﴿۱۸۱﴾

تفسیر

ایک عالمِ مقتدا کی گمراہی کا واقعہ

ابتدائی آیات میں ایک عالمِ مقتدا کی گمراہی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، یہ شخص کون تھا؟ قرآن کریم میں اس شخص کا نام اور تشخص مذکور نہیں ہے، البتہ ائمہ تفسیر نے اس شخص کا نام "بلعم بن باعوراء" لکھا ہے، جس کا حال ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، یہ

شخص ملکِ شام میں بیت المقدس کے قریب کسی جگہ کا رہنے والا تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہی تھا اور اللہ تعالیٰ کی بعض کتابوں کا علم اس کو حاصل تھا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں اَلَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا کے ساتھ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے، حاصل اس واقعے کا یہ ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین یعنی قومِ عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ملا، اور قومِ جبارین نے جب یہ دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا لشکر لے کر پہنچ گئے ہیں، اور فرعون کے غرق ہونے کا حال اُن کو پہلے سے معلوم تھا، تو اُن کو فکر لاحق ہوئی اور وہ سب کے سب جمع ہو کر اسی بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت سارے لشکر لے کر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ وہ بغیر لڑے ویسے ہی واپس چلے جائیں، اُس کی وجہ یہ تھی کہ اس بلعم بن باعوراء کو اسمِ اعظم معلوم تھا وہ اس کے ذریعے جو دُعا کرتا وہ قبول ہوتی تھی، اس نے کہا مجھے تم پر افسوس ہے، تم کیسی بات کہتے ہو؟ وہ اللہ کے نبی ہیں، اُن کے ساتھ اللہ کی مدد و نصرت اور فرشتے ہیں، میں اُن کے خلاف دُعا کیسے کرسکتا ہوں، اگر میں نے ایسا کیا تو میرا دین و دُنیا تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا تو بلعم نے کہا کہ اچھا میں رَبّ سے معلوم کرلوں، کہ مجھے دُعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ جب اُس نے اپنے علوم کے مطابق جو بھی استخارہ وغیرہ کیا، تو خواب میں اُس کو بتا دیا گیا وہ ہرگز ایسا نہ کرے تو اُس نے قوم کو بتایا کہ مجھے بد دُعا کرنے سے منع کیا گیا ہے، جب قوم کسی طرح بھی منت سماجت کر کے اُس کو بددُعا پر راضی نہ کرسکی، تو قوم نے اُس کو کوئی بڑا ہدیہ پیش کیا جو حقیقت میں رشوت تھی، جب اُس نے اس ہدیہ کو قبول کرلیا تو پھر قوم کے لوگ اُس کے پیچھے پڑ گئے، کہ اب تو ضرور اُن کے خلاف بددُعا کر، اور بعض روایات میں ہے کہ اُس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ ان سے ہدیہ قبول کر کے ان کا کام کر دیں، اُس وقت بیوی کی رضاجوئی اور مال کی محبت نے اُس کو اندھا کر دیا، تو اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے خلاف بددُعا کرنا شروع کر دی، لیکن اُس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار یوں ہوا، کہ وہ جو کلمات بددُعا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے کہنا چاہتا تھا، اُس کی زبان سے وہ بددُعا کے الفاظ اپنی ہی قوم کے لیے نکلے، لوگوں نے جب اُس کو اس طرح بددُعا کرتے ہوئے سُنا تو کہنے لگے تم یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو تم ہمارے خلاف ہی بددُعا کر رہے ہو، اس نے کہا یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں ہے، بے ساختہ یہ جملے میری زبان سے نکل رہے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اُس قوم پر بھی تباہی نازل ہوئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کہ اُس کی زبان اس کے سینے پر لٹک گئی۔ اب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہاری وجہ سے میری تو دُنیا اور آخرت برباد ہوگئی، اب دُعا تو میری چلتی نہیں، لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں، اگر اس میں تم کامیاب ہوگئے تو اس طرح تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آسکتے ہو، وہ یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کر کے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو، اور اُن کو یہ تاکید کر دو کہ وہ لوگ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کریں ان کو کرنے دو، یہ لوگ مسافر ہیں، مدت سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک زنا انتہائی مبغوض چیز ہے، جس قوم میں یہ ہو اس پر ضرور اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے، وہ قوم فاتح نہیں ہوسکتی، اگر تم کرسکتے ہو تو یہ کام کرو، انہوں نے اسی طرح کیا، بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہوگیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس کو روکا مگر وہ باز نہ آیا اور شیطان کے جال میں پھنس گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل میں سخت قسم کا طاعون

پھیلا، جس کی وجہ سے ایک دن میں ہی ستر ہزار اسرائیلی مر گئے، یہاں تک کہ جس شخص نے اس بے حیائی کا ارتکاب کیا تھا اس جوڑے کو قتل کر کے منظرِ عام پر لٹکا دیا تا کہ دوبارہ کوئی شخص یہ حرکت نہ کرے اور توبہ کی تو اس وقت یہ طاعون ختم ہو گیا۔

[(1)]سرورِ کائنات ﷺ کا یہ قول: ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ'' اس وقت تک تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو گا جس وقت تک کہ اپنی خواہش کو جو دین میں لے کے آیا ہوں اس کے تابع نہ کر لے اس وقت تک وہ مؤمن نہیں، یہ کتنا مطابق ہے قرآنِ کریم کی اُس آیت کے اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (سورۂ جاثیہ:۲۳) کہ آپ نے ایسے شخص کو دیکھا؟ کہ جس نے اپنا اِلٰہ ہی اپنی خواہش کو بنا لیا، بہرحال یہود کے اندر یہ بیماری تھی اِتباعِ ہوئی کی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اَحکام دیے تھے، اُن اَحکام کو وہ پروا نہیں کرتے تھے، اس لیے کہیں اُن کی مثال گدھے کے ساتھ دی، کہیں اُن کی مثال کتے کے ساتھ دی، تو جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ آیات کا علم دے اور وہ ان آیات کی پروا نہ کرے بلکہ اپنے خواہشات پہ چلے اور دُنیا کی حرص کے اندر اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو چھوڑ دے اس کی مثال، پڑھا لکھا ہے تو اس کی مثال گدھے جیسی ہے جس نے اپنے اُوپر کتابیں لاد رکھی ہیں، اور پڑھا لکھا نہ ہو تو کتے کی مثال بہرصورت ہے چاہے وہ عالم ہے چاہے وہ جاہل ہے، یعنی حریص آدمی کی مثال کتے کے ساتھ واضح ہے لیکن گدھے کی مثال جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں یہ عالم بے عمل پر بات صادق آئے گی، یہ دونوں مثالیں قرآنِ کریم کے اندر آپ کے سامنے بیان کی ہوئی ہیں، تو یہ متعین شخص ہو تو بھی اس کا حال بیان کر کے متنبہ کرنا مقصود ہے، متعین نہ ہو ایک مثال بیان کی گئی ہو تو بھی اپنی جگہ بات صحیح ہے، اَئمۂ تفسیر کے اس میں دونوں قول ہیں۔

ذرا لفظوں کو پھر دیکھ لیجئے، کوئی بات رہ نہ جائے، ''پڑھیے ان پر (یعنی ان کو پڑھ کے سنایئے) خبر اُس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیات دیں پھر وہ ان آیات سے نکل گیا'' اِنْسَلَخَ مِنَ الثِّیَابِ: تَجَرَّدَ کپڑوں سے نکل جانا، ننگا ہو جانا، یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے اور اس کے اوپر والی کھال ایک طرف رہ جاتی ہے، جس کو آپ کُنج کہتے ہو؟ (جی)، اُردو میں اسے ''کینچلی'' کہتے ہیں۔ فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ: پھر اُس کے پیچھے شیطان لگ گیا۔ دیکھو! آیات سے نکلا تو شیطان اُس کے پیچھے لگا، اگر وہ اللہ کے احکام کی پابندی رہتا تو شیطان کو پاس آنے کی جرأت نہ ہوتی، پہلے انسان ڈھیلا ہوتا ہے شیطان بعد میں آ کر پھر دھکا لگاتا ہے، عمل کرنے والوں کے پاس بھی آتا ہے، لیکن چھیڑنے کی جرأت نہیں ہوتی، پتا ہے کہ یہ ارادے کے پکے ہیں، ان کے سامنے راستہ واضح ہے، ان کو ہزار کہو، یہ کسی کی سننے کے لئے تیار نہیں، اس لیے وہ چکر نکالتا پھرتا رہتا ہے، لیکن جہاں اُس نے ارادے کے اندر کمزوری پائی کہ یہ شخص اب کچھ ڈھیلا ہو رہا ہے، تو پھر وہ آگے دھکا لگانے کے لیے آ جاتا ہے، فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ میں یہی بات ہے کہ پھر شیطان پیچھے لگ گیا، پھر شیطان اس کو ہوئی کو اور مرغوب بنا کے دکھاتا ہے، ہوئی کی اتباع کرے گا تو شیطان کی اور جرأت بڑھتی ہے، یہ پھر دونوں پہیے لگ جاتے ہیں، پھر انسان کی گاڑی خوب اُلٹی چلتی ہے، خواہشات کی اتباع اور شیطان کا پیچھے لگ جانا یہ دونوں ایسے ہیں جیسے گاڑی کے دو پہیے لگ گئے، پھر رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ ''پھر ہو گیا وہ گمراہوں میں سے۔ اگر ہم چاہتے تو ان آیات کی برکت سے اسے اُونچا کر دیتے'' چاہنا وہی کہ اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی کام ہوتا نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کا

(۱) یہاں سے حضرت حکیم العصر کی تقریر ہے۔

ظہورانسان کے ارادے اور عمل کے ذریعے سے ہوتا ہے، جیسے قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے[1] لیکن اللہ کا چاہنا انہی اسباب کے تحت ہی ہے۔ ''اگر چاہتا اللہ تعالیٰ'' یعنی زبردستی اس کو کرنا چاہتا تو یوں کرسکتا تھا، لیکن اللہ نے جب اُس کے ارادے پر اس کو چھوڑا، اُس کو عمل کی چھٹی دی، تو پھر اُس نے جو راستہ اختیار کیا تو اللہ کی مشیت کے تحت وہی نتیجہ نکل آیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو اونچا کردیتے ان آیات کی وجہ سے وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ لیکن وہ تو زمین کی طرف مائل ہوگیا، سفلی خواہشات کی طرف مائل ہوگیا، اُس نے اپنا مقصد انہی چیزوں کو بنالیا جو زمین سے نکلتی ہیں، وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ: اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، یہ اتباعِ ہویٰ والی بات خوب اچھی طرح سے یاد رکھیے۔ یہ بات اگر ذہن نشین ہوجائے یعنی اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ کا مقابلہ، تو انسان کو عملی زندگی اختیار کرنی آسان ہوجاتی ہے، نظریات کی تبدیلی پہلے ہے، اور انسان کا عمل بعد میں سیدھا ہوتا ہے، جب تک انسان کے اندر نظریاتی تبدیلی نہ ہو اس وقت تک عمل درست نہیں ہوا کرتا۔

اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی سزا

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ: اس کا حال کتے کے حال کی طرح ہے، اگر تو اُس پر حملہ کرے تو ہانپتا ہے، اور اگر تو اُس کو چھوڑ دے تو ہانپتا ہے، یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، پس بیان کیجئے ان پر واقعہ، لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ: تاکہ وہ تفکر کریں، سوچیں، غور کریں، کہ تم نے اپنا انجام کتے کی طرح کرنا ہے، تم نے اپنے اوپر مثال کتے جیسی چسپاں کرنی ہے، یا تم نے کامل انسانوں میں شامل ہونا ہے، یہ تفکر کرو، تدبر کرو، اس قسم کی مثالیں سن کر۔ ''بُری ہے مثال ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ اپنے نفسوں پر ہی ظلم کرتے ہیں'' یعنی آیات کی تکذیب کرکے ہمارا نقصان نہیں کرتے، نقصان اپنا ہی کرتے ہیں۔

اِنسان ہدایت یا گمراہی میں مجبور نہیں ہے

''جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جس کو اللہ بھٹکا دے وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں'' جس کے حصے میں ضلالت آگئی وہ خسارہ ہے۔ اور اللہ ہدایت کیسے دیتا ہے؟ اس کے اُصول اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر واضح کردیے، تقویٰ اختیار کرو، خوف اختیار کرو، آخرت کی ترجیح کو اختیار کرو، خواہشات کے مقابلے کو آؤ، تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے راستہ آسان کردیں گے، جس راستے کی طرف چلنا چاہو گے اور اپنی ہمت اور اپنے ارادے کو استعمال کرنا چاہو گے تو اللہ تعالیٰ آسان کردیں گے۔ اس کی مثال آپ کے سامنے روز کی پیش پا اُفتادہ حقیقتیں ہیں، کہ ایک آدمی اَذان کی آواز سنتا ہے تو حواس اُس کے بیدار ہوجاتے ہیں، بستر میں لیٹا ہوا ہے، رضائی میں لپٹا ہوا ہے، خوب اچھی طرح سے نرم اور گرم بستر میں لپٹا ہوا ہے، اور اَذان کی آواز کان میں آئی، انسان کے حواس بیدار ہوگئے، اب جس وقت تک انسان عادی نہ ہو، تو اس وقت انسان کے قلب میں کشاکشی کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، کہ اُٹھوں یا نہ اُٹھوں، بس یہ ''اُٹھوں، نہ اُٹھوں'' یہی ہدایت اور ضلالت کا چکر ہے، اب یہ جو دو خیال آپ کے دِل میں آگئے، اب ایک طرف اور ایک جانب کو آپ نے اپنے ارادے سے تقویت پہنچائی ہے، اگر نہ اُٹھوں کا ارادہ

(۱) پارہ ۱۳ سورۂ ابراہیم آیت ۴۔ پارہ ۱۴ سورۂ نحل آیت ۹۳۔ پارہ ۲۲ سورۂ فاطر آیت ۸۔ پارہ ۲۹ سورۂ مدثر آیت ۳۱۔

کرلیا تو فوراً نیند آجائے گی، اللہ نے وہ بھی آپ کے لیے آسان کردیا، سورج نکلنے تک لیٹے رہو گے، اور اگر آپ نے اُٹھنے کا ارادہ کرلیا تو اللہ وہ بھی آپ کے لیے آسان کردے گا، اُٹھنے والے بھی کوئی وقت محسوس نہیں کرتے، اور ارادہ کرنے کے بعد سونے والے بھی کوئی وقت محسوس نہیں کرتے، یہ ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟ جس وقت آنکھ کھلتی ہے تو قلب میں یہ دونوں باتیں پیدا ہوتی ہیں کہ نہیں ہوتیں؟ (جی) اُٹھوں یا نہ اُٹھوں؟ کبھی خیال آتا ہے کہ اُٹھنا چاہیے، اُٹھ کر نماز پڑھیں، کبھی خیال آتا ہے کہ تھوڑی دیر اور لیٹ لیں، یہ دو جہتیں جو آپ کے ہاں آگئیں یہی اختیار کی بات ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا ہے۔ اگر آپ مجبور ہوتے تو ایک ہی خیال آتا دُوسرا نہ آتا، یا اُٹھنے کا خیال آتا، پھر تو آپ اُٹھنے پر مجبور تھے، یا لیٹے رہنے کا آتا تو آپ لیٹے رہنے پر مجبور تھے، لیکن بیک وقت دونوں خیالوں کا قلب کے اندر آنا کہ اُٹھوں یا نہ اُٹھوں، یہ علامت ہے کہ اس درجے میں اللہ نے آپ کو اختیار دے دیا ہے، اسی لیے تو دونوں خیال آئے۔ اور پھر جب چاہیں آپ دونوں اختیار استعمال کرکے دیکھ لیں، ایک دن یہ ارادہ کرلیں کہ نہیں اُٹھنا تو نہیں اُٹھو گے، سوئے رہ جاؤ گے، اور ایک دن ارادہ کرلو کہ اُٹھنا ہے تو اُٹھ جاؤ گے، یہیں سے آگے آپ کے عمل کی زندگی شروع ہوگئی۔ تو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیار کو استعمال کرنے کے بعد اللہ کی مشیت متعلق ہو کے وہ کوئی نہ کوئی راستہ واضح کردیتی ہے، اس طرف کو چلنا چاہو تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہماری طرف سے بالکل چھٹی ہے، اس طرف کو چلنا چاہو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس کی بھی چھٹی ہے، چاہو تم کفر کرو، چاہو تم ایمان لے آؤ، کفر کرو گے نتیجہ یہ نکل آئے گا، ایمان لاؤ گے نتیجہ یہ نکلے گا، ہر وقت اپنے قلب کی کیفیت دیکھ لیا کرو، اختیار تمہیں خود معلوم ہوگا، کہ اچھائی بُرائی کے خیال دونوں جو قلب کے اندر آتے ہیں، یہ علامت ہے کہ اللہ نے تمہیں اختیار دیا ہے، اور پھر جیسے جیسے ارادہ متعلق کرتے چلے جاؤ گے وہی راستہ آسان ہو چلا جائے گا۔ یہاں چوک میں کھڑے ہو جاؤ اور دیکھو! کہ ایک راستہ مسجد کی طرف جا رہا ہے، دوسرا سینما کو جا رہا ہے، وقت اس کا ہو چکا ہے، اس کا بھی ہو چکا ہے، دونوں خیال آئیں گے کہ اِدھر کو جائیں یا اُدھر کو جائیں، یہ دونوں خیالوں کا آنا علامت ہے کہ آپ کو اختیار ہے، پھر جدھر کو ارادہ کرو گے قدم اُدھر کو اُٹھنے شروع ہو جائیں گے، دونوں ہی راستے آسان ہیں، کیونکہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ جبر نہیں کرتا کہ آپ کو ناک سے پکڑ کر یا کان سے پکڑ کر نیکی کروالے، دُنیا میں یہ اللہ کا اُصول نہیں ہے، اتنا سا اختیار اور طاقت دے کے تمہیں چھوڑ دیا ہے، اب جدھر کو جاؤ گے اللہ تعالیٰ وہ راستہ تمہارے لیے آسان کرتا چلا جائے گا۔ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ: جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے وَمَنْ یُّضْلِلْ: جس کو اللہ بھٹکا دے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ معلوم ہوگیا کہ ضلالت میں پڑنا خسارہ ہے، اور ہدایت جو ہے یہ اصل میں کامیابی ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کلماتِ تسلی

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اطمینان اور تسلی کی بات ہے کہ آپ اتنا سمجھاتے تھے، اتنی اُن کے سامنے وضاحت کرتے تھے اچھائی بُرائی کی، لیکن کچھ لوگ اس بات کو اختیار کرتے تھے، کچھ اختیار نہیں کرتے تھے، تو اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہیں کہ ہم نے پیدا کیا جہنم کے لیے بہت سے جنوں اور انسانوں کو،

جنوں میں سے بھی بہتوں کو، اور انسانوں میں سے بھی بہتوں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، وہ جہنم میں ہی جائیں گے، آپ جتنی چاہے کوشش کرلیں۔

رفعِ تعارض و تطبیق بین الآیات

لیکن یہاں پھر وہ سوال ابھرتا ہے، کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ تو آیا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۂ ذاریات: ۵۶) میں نے جنوں اور اِنسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔ تو وہاں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بہت سارے جہنم کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، تو دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔ اس تعارض کو علمی اصلاح میں اس طرح سے اٹھایا گیا ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے اندر لِيَعْبُدُوْنِ میں جو لام ہے یہ غایت تشریعی ہے، انسان کے مکلّف ہونے کا اور شریعت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر انسان اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ میں جو لام ہے یہ لام عاقبت ہے، لام عاقبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کرنے والے کا ارادہ تو وہ نہیں ہوتا لیکن نتیجہ یہی نکلتا ہے، کرنے والے کا وہ مقصود نہیں ہوتا لیکن نتیجہ یہی نکلتا ہے انجام یہی نکلتا ہے، ''شرح مائۃ عامل'' میں آپ نے اس کی مثال یہ پڑھی تھی (چھوٹی کتابیں یاد نہیں رکھتے، بڑی کتابوں کی بنیاد انہی پر تو ہوتی ہے) لَزِمَ الْفُرُّ لِلشَّقَاوَةِ: اس شخص نے شر کو لازم پکڑا، نتیجہ بدبختی ہے۔ جب کوئی شخص شر کو لازم پکڑتا ہے تو کیا اُس کا مقصود ہوتا ہے کہ میں بدبخت ہو جاؤں؟ بدبخت ہونا اس کا مقصود تو نہیں ہوتا، لیکن جب اُس نے شر کو لازم پکڑا تو نتیجہ بدبختی ہے، لام عاقبت کا یہ معنی ہوتا ہے، یعنی تکوینی طور پر تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ بعض جنت میں جائیں گے اور بعض جہنم میں جائیں گے، لیکن ہم نے جو پیدا کیا ہے تو عبادت کے لیے کیا ہے، ہر کسی سے مطالبہ عبادت کا ہے لیکن نتیجہ یہ نکلے گا کہ بعض لوگ عبادت کریں گے اور جنت میں جائیں گے، اور بعض نہیں کریں گے جہنم میں جائیں گے۔ ''جو نہیں کریں گے جہنم میں جائیں گے'' یوں سمجھو کہ وہ پیدا ہی جہنم کے لیے ہوئے ہیں، تو یہ لام لام عاقبت ہے یہ لام غایت نہیں ہے، کہ متکلم کا مقصود یہ نہیں ہے، فاعل کا مقصود یہ نہیں ہے، ہاں! البتہ نتیجہ ہے۔ ہم نے انسان اور جنوں کو پیدا کیا تاکہ وہ اللہ کی عبادت کر کے جنت حاصل کرلیں، انسان اور جن کو پیدا تو اس لیے کیا، لیکن ہمارے اس پیدا کرنے کے نتیجے میں بہت سارے ایسے ہوں گے جو عبادت نہیں کریں گے اور جہنم میں جائیں گے، بہت ساروں کے متعلق اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ پیدا کیے تھے اور جہنم میں گئے، گویا کہ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ جہنم کے لیے پیدا کیے گئے۔ یہ لام لامِ عاقبت ہے، غایت والی لام نہیں ہے، یعنی نتیجہ یہ نکلے گا۔

اکثریت کا قول حق ہونے کی دلیل نہیں

كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: بڑی تعداد ہو گی، یہ نہیں کہ تھوڑے سے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بہت سارے لوگ مل کر کوئی کام کرنے لگ جائیں، تو یہ اُس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں ہے، تعداد کو دیکھ کے کسی چیز کے حق ہونے کو متعین نہیں کیا جا سکتا، کہ کرنے والے چونکہ بہت سارے ہیں لہٰذا یہ بات صحیح ہے، جیسے آپ نے جمہوریت کا اصول اپنا لیا، کہ جہاں لوگوں نے مل کے

کہہ دیا کہ ٹھیک ہے تو وہاں قانون بن گیا کہ ٹھیک ہے، اور جہاں لوگوں نے مل کے کہہ دیا کہ ٹھیک نہیں ہے وہاں قانون بن گیا کہ ٹھیک نہیں، حق کو اکثریت کے تابع کر دیا کہ اکثریت یہ عنوان ہے حق ہونے کا، یہ نہایت غلط اُصول ہے، اس سے زیادہ بدتر اُصول دینی اعتبار سے اور کوئی نہیں، اب ایک طرف تو امام غزالی رحمہ اللہ ہے مثال کے طور پر، علم والا، فہم والا، عقل والا، اور اس کے مقابلے میں بنادے ہیں گدھے اور بکریاں چرانے والے، جنہوں نے صبح سے لے کر شام تک گدھوں پر اینٹیں ڈھوئی ہیں، یا بکریوں کو جنگل میں چرانا ہے، جن کو اِستنجا کرنے کی تمیز نہیں، اور ووٹ لے لیا گیا کہ یہ کام کیسا ہے، تو ننانوے گدھے ایک طرف ہو گئے، اور ایک امام غزالی رحمہ اللہ ایک طرف ہو گیا، جمہوریت کہتی ہے کہ جو گدھے کہیں وہ ٹھیک ہے، امام غزالی رحمہ اللہ ٹھیک نہیں ہے، جمہوریت کا تو یہی اُصول ہے، اس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے، تولا تو نہیں جاتا کہ وزنی کون ہے، اس لیے اس کا نتیجہ جو آج دنیا بھگت رہی ہے وہ آپ کے سامنے ہے، کہ حق حق رہا ہی نہیں، بس جدھر چند آدمی اکٹھے ہو گئے، جدھر انبوہ لگ گیا، جدھر کٹھ ہو گیا، جدھر اژدحام ہو گیا، بس وہی بات واقعہ بن گئی، دنیا ساری کی ساری بربادی کے کنارے پر آ گئی۔ اور قرآنِ کریم نے کتنا واضح طور پر اعلان کیا کہ ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (سورۂ اَنعام: ۱۱۶) جو لوگ زمین پر موجود ہیں ان میں سے اگر اکثریت کی اتباع کا اُصول اپناؤ گے تو یہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے...... سارا ماحول غلط ہوتا ہے، ایک اللہ کا نمائندہ آتا ہے حق کی آواز اٹھانے والا، حق ایک کے ساتھ ہوتا ہے، ساری کی ساری بستی سارے کا سارا شہر گمراہ ہوتا ہے، تو اطاعتِ اکثریت کس طرح سے حق ہو سکتی ہے؟ انبیاء علیہم السلام جس ماحول میں آتے ہیں تو حق کی آواز اٹھانے والا ایک ہوتا ہے، اور سارا ماحول اس کے خلاف ہوتا ہے، اب اگر اکثریت کو دیکھا جائے تو چاہیے کہ نبی اُن میں مدغم ہو جائے، لیکن حق ایک کے ساتھ ہوتا ہے ساری بستی کے ساتھ نہیں ہوتا، اس لیے حق کی تعیین دلیل کے ساتھ ہوتی ہے، نا کہ سر گننے کے ساتھ، عقل اور بھیجے کے ساتھ تعیین ہوتی ہے کہ یہ حق ہے یا باطل، سر گننے کے ساتھ نہیں ہوتی، کہ سر گن لو، زیادہ کدھر ہیں، چاہے سارے ہی بھیجے سے خالی ہوں۔ اور ایک سر جس میں اللہ تعالیٰ نے عقل اور بھیجا رکھا ہے اس کی بات سب پہ وزنی ہوگی، اور دوسری خالی کھوپڑیوں کو کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ تو یہ بھی جنوں اور انسانوں کا وہاں بڑا اکٹھ ہوگا، اور اتنی اکثریت ہوگی کہ بالکل حقیقت ہے کہ جمہوریت کے تقاضے میں تو جہنم ہی ٹھیک ہے، حدیث شریف میں صاف آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آدم علیہ السلام کو آواز دیں گے کہ جہنم کا لشکر اپنی اولاد میں سے ایک طرف کر دے، آدم علیہ السلام کہیں گے: یا اللہ! وَمِنْ كَمْ کتنوں میں سے کتنے؟ یعنی تناسب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ ”ایک ہزار میں سے نوسو ننانوے“[1] یعنی فی ہزار ایک جنتی، اور نوسو ننانوے جہنمی، بتاؤ! جمہوریت کدھر جا رہی ہے؟ تو یہ جمہوریت کے پجاری وہاں کہیں کھڑے نہ ہو جائیں کہ جی! جمہوریت تو ادھر ہے، ہم تو اسی کو اختیار کریں گے، جو عوام کی پیداوار ہوں گے اور عوام کی رائے کی اتباع کرنے والے ہیں وہ تو کہیں وہاں بھی نہ کہہ دیں کہ جی! یہ تو اکثریت ادھر ہے، عوام کا ہجوم تو ادھر ہے، ہم تو ادھر ہی جائیں گے۔ ایک فی ہزار جنتی ہے، تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ہر دور کے اندر اللہ کے نافرمانوں کی، اللہ کے باغیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور اللہ کے فرمانبردار تھوڑے

(۱) تفسیر ابن کثیر سورۂ حج آیت: ۱/۱۷ / نیز دیکھیں بخاری ۲/۲۷، ۳ باب قصۃ یاجوج وماجوج۔ ولفظه: فَيَقُولُ أَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ قَالَ وَمَا بَعْثُ النَّارِ... الخ.

ہوتے ہیں۔ تو حق کی تعیین بیٹو! دلیل سے ہوتی ہے، حق کی تعیین آدمی گننے کے ساتھ نہیں ہوا کرتی۔ "فکرِ یک کس در مغزِ دو صد خر نے آید"[1] ایک آدمی کا فکر دو سو گدھوں کے دماغ میں نہیں آ سکتا، جو فکر ایک آدمی کا ہو سکتا ہے دو سو گدھوں کے دماغ میں وہ بات نہیں آ سکتی، اس لیے اگر تعداد دیکھو گے تو گدھے زیادہ ہیں۔

تو جہنم میں کافی اکٹھ ہو جائے گا، نتیجہ یہ نکلنے والا ہے، اس لیے آپ یہ فکر نہ کریں کہ یہ مانتے ہیں یا نہیں مانتے، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا، تکوینی طور پر ایسے ہی ہوگا کہ بہت سارے لوگ جہنم میں جائیں گے۔

اِنسان کو حیوان سے کون سی چیز ممتاز کرتی ہے؟

اور اس دنیا میں ان کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس دل ہیں، لیکن ان دلوں کے ساتھ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں اُن کے ساتھ سنتے نہیں، یہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ لیجئے......! یہ ایک بات آ گئی "دل ہیں سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں، کان ہیں سنتے نہیں" اب کیا یہ مشرک، یہ کافر، یہ خدا کے نافرمان یہ سارے ایسے ہیں کہ ان کے پاس دل ہیں سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں، کان ہیں سنتے نہیں، اندھے بہرے، کیا یہ سارے ایسے ہی ہیں، حالانکہ بظاہر معلوم یوں ہوتا ہے کہ وہ آپ سے زیادہ سنتے ہیں، آپ سے زیادہ دیکھتے ہیں، آپ سے زیادہ سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (سورۂ بقرہ:۱۷۱) یہ سارے ہی ایسے ہیں کہ اندھے ہیں، بہرے ہیں، گونگے ہیں، بے عقلے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ چیز تھوڑا سا تدبر کو چاہتی ہے، اللہ نے پتھر پیدا کیا، بظاہر اس میں کوئی صلاحیت نہیں، منطقی اصطلاح میں یہ نامی بھی نہیں، متحرک بالارادہ بھی نہیں۔ اس سے اُوپر درجہ نباتات کا آ گیا، نباتات میں پتھر سے زیادہ صلاحیتیں ہیں، اب اگر ایک درخت کٹ گیا، کٹنے کے بعد وہ نامی نہیں رہا، اس میں بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی، تو اس میں اور پتھر میں کوئی فرق نہیں، جب تک وہ جڑ پہ کھڑا ہے اور بڑھ رہا ہے وہ نامی ہے، لیکن جس وقت وہ کٹ گیا تو اس میں اور حجر میں کوئی فرق نہیں ہے، اب وہ محض جسد ہے، جوہر ہے، اس میں نمو نہیں رہا، اور جہاں تک پتھر کی صلاحیتوں کا تعلق ہے اور اس درخت کی اس کیفیت کا تعلق ہے، تو ان میں کوئی فرق نہیں، یہ درخت بھی پتھر کی طرح ہو گیا۔ اچھا! اس کے بعد آگے حیوانات کا درجہ ہے، یہ آپ کی اصطلاح میں متحرک بالارادہ ہیں، ان کو اللہ نے آنکھیں دی ہیں جن سے یہ دیکھتے بھی ہیں، اُن کو کان دیے ہیں جن سے یہ سنتے بھی ہیں، دل دیا ہے اپنی ضرورت کے مطابق اس سے سوچتے بھی ہیں، یہ حیوانات کا درجہ ہے۔ اور ان حیوانات میں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اور زیادہ ممتاز کر دیا، کہ حیوان ہونے میں تو یہ باقی حیوانات کے اندر مشترک ہے، منطق میں جو پہلا سبق پڑھایا گیا: "کل انسانٍ حیوان" منطق کا پہلا سبق یہی ہے کہ ہر انسان حیوان ہے...... ہم جس وقت "تیسیر المنطق" پڑھتے تھے، مسجد میں بیٹھے ہوئے سبق

(۱) شاید یہ علامہ اقبالؒ کے شعر کی طرف اشارہ ہے، شعر یوں ہے "گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کاری شو...... کہ از مغزِ دو صد خر، فکرِ انسانی نمے آید"۔ اور علامہ اقبالؒ کا دوسرا شعر اردو میں بھی ہے "جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں...... بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے"۔

یاد کر رہے تھے" کل انسانٍ حیوان "،" ہر انسان حیوان ہے"، تو ایک شخص اچھا بھلا سمجھدار، ہائی سکول میں ڈرائنگ ماسٹر تھا، وہ کہنے لگا نہ بھائی! اس طرح سے تو نہ کہو، سارے انسان تو حیوان نہیں ہوتے، کوئی کوئی اچھا بھی ہوتا ہے، یہ آپ کیا کہہ رہے ہو کہ ہر انسان حیوان ہوتا ہے، ہر انسان تو حیوان نہیں ہوتا، کوئی کوئی اچھا بھی ہوتا ہے۔ ہم نے کہا بھائی! یہ حیوان منطقی ہے، یہ دوسرا حیوان نہیں ہے...... تو منطقی اعتبار سے ہر انسان حیوان ہے، اس میں تو آپ سارے کے سارے شریک ہیں۔ اور امتیاز آپ کو کیا حاصل ہوا؟ کہ آپ ناطق ہیں، آپ حیوانِ ناطق ہیں، اس لیے باقی حیوانات سے ممتاز ہو گئے، ناطق ہونے سے کیا مراد ہے؟ نطق آپ کو ظاہری بھی حاصل ہے، اور باطنی بھی حاصل ہے۔ باطنی نطق یہ ہے کہ آپ استدلال کرتے ہیں، استدلال کر کے مجہولات کو معلومات کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں، یہ خاصہ صرف انسان کا ہے، مجہولات کا اکتساب کرنا معلومات کے ذریعہ سے، کہ چند باتیں معلوم ہیں، اُن کو آپ جوڑتے ہیں تو جوڑنے کے بعد ایک مجہول بات کو معلوم کر لیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان صرف ان سطحی چیزوں کو دیکھنے کے لیے نہیں، انہی چیزوں کو سننے کے لئے نہیں، بلکہ یہ کلیات سے نتائج اخذ کرتا ہے، جزئیات سے کلیات بناتا ہے، کلیات سے پھر آگے نتائج اخذ کرتا ہے، یہ ہے اصل کے اعتبار سے انسان کی پوزیشن۔ اب اگر اس انسان کی آنکھ میں، کان میں، فہم میں حیوان کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی ناطقیت سے کام نہیں لیا۔ حیوان کا کیا کام ہے؟ حیوان اپنی خوراک تلاش کرتا ہے جو اس کی حسب منشا ہے، مثلاً درندے ہیں وہ گوشت ہی کھاتے ہیں، وہ گوشت کو تلاش کرتے ہیں، اور گوشت انہیں ملتا ہے، پرندے دانہ چگتے ہیں تو دانہ انہیں ملتا ہے، وہ اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں اور پوری کوشش سے تلاش کرتے ہیں، جو ان کا مقصود ہے اسی کو وہ حاصل کرتے ہیں۔ اور حیوانات اپنے رہنے کے لیے جگہیں بھی بناتے ہیں، چڑیا تک اپنا گھونسلا بناتی ہے، پدی تک اپنا گھونسلا بناتی ہے، چیونٹیاں اپنا بل کھودتی ہیں، چوہے اپنا بل کھودتے ہیں یعنی جیسا انہوں نے اپنے لیے مناسب سمجھا ہے (آپ یہ نہ کہیں کہ جی وہ بلوں میں رہتے ہیں اور ہم کوٹھیوں میں رہتے ہیں، یہ فرق ہے) ارے بھائی! فرق نہیں ہے، اگر تمہیں اُن کی جگہ بل پسند نہیں تو انہیں بھی تمہاری کوٹھی پسند نہیں ہے، وہ تمہاری کوٹھی میں بھی آئیں گے تو اپنی بل کھود کے رہیں گے، یہ تو اپنی اپنی پسند ہے، یعنی اگر ہمیں چڑیوں کا گھونسلا پسند نہیں تو چڑیوں کو ہمارا کمرہ کب پسند ہے؟ وہ بھی جب آتی ہیں، اپنا تنکوں کا گھونسلا بناتی ہیں، وہ اسی پہ مست ہیں، کہ بس ٹھیک ہے، یہی ہماری کوٹھی ہے، اور اس میں وہ اپنی پوری راحت اور آرام کی رعایت رکھتے ہیں جو ان کے لئے مقصود ہے۔ اور حیوانات خواہشات بھی رکھتے ہیں، نر مادہ کا جوڑ بھی ان میں ہے، نر کا رجحان مادہ کی طرف ہے، مادہ کا نر کی طرف ہے، تو اس طرح سے ان کا خاندان بھی بنا ہوا ہے، اور پھر اس کے نتیجے میں اولاد بھی جنتے ہیں، اور اولاد کے ساتھ پیار بھی کرتے ہیں، اولاد کی ضروریات کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ کتیا کو دیکھو! اپنے بچوں کو کس طرح سے پالتی ہے، بندریہ کو دیکھو! کس طرح سے بچے کو سینے کے ساتھ لگائے پھرتی ہے۔ اور ایک لباس کی بات رہ گئی، اللہ تعالیٰ نے اُن کو ویسے ہی مستغنی کر دیا، کہ ان کو اس قسم کے بال اور اس قسم کے پردے دیے کہ جو نہ کبھی میلے ہوتے ہیں نہ پھٹتے ہیں، اُن کی

ضرورت اس طرح سے پوری ہوگئی۔تو یہ چیزیں جن کو آپ بدنی ضرورتیں کہہ سکتے ہیں، ان کے اندر آپ میں اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ ایک بندر کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھ لو، وہ اپنی ہر ضرورت کس انداز کے ساتھ پوری کرتا ہے، اپنے ہم جنس کے ساتھ مل کے کس طرح سے خوش ہوتے ہیں، اگر آپ نے سارے کا سارا عقل وفکر، اپنی آنکھ ناک کان زبان سب کو استعمال کر کے روٹی، کپڑا، مکان ہی لیا، تو آپ کس طرح سے حیوان کی سطح سے اونچے ہوئے؟ یہ آپ نہیں کہہ سکتے کہ جی! ہم تو اچکنیں پہنتے ہیں اور کمبل لیتے ہیں، اُن کے کمبل اور اُن کی اچکنیں تمہارے کمبلوں اور اچکنوں سے ہزار درجہ اچھی ہیں، نہ دھوبی کی محتاج نہ درزی کی محتاج، سردی گرمی سے بچنے کی بات ہے وہ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا شاندار لباس دیا ہوا ہے کہ وہ سردی گرمی سے بچتے ہیں۔ اگر نتیجہ روٹی، کپڑا، مکان ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے آنکھ سے حیوان سے زیادہ کیا کام لیا، اور آپ نے کان سے حیوان سے زیادہ کیا کام لیا، اور آپ نے اپنے دل دماغ سے حیوان سے زیادہ کیا کام لیا، اگر سارے کا سارا چکر اتنا ہی ہے کہ پیٹ کی خواہش پوری کرنی ہے، بطن کی خواہش پوری کرنی ہے، فرج کی خواہش پوری کرنی ہے، اور جیب اور پیٹ بھرا ہوا ہونا چاہیے، اگر آپ کی ساری کی ساری قوتِ فکر یہ اسی نقطے کے اردگرد گھوم رہی ہے تو تم حیوان سے کس طرح ممتاز ہوئے؟

تو اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو صلاحیتیں دی تھیں، جب آپ نے استعمال نہیں کیں اور انہی سفلی خواہشات کے پیچھے لگے رہ گئے اور حیوانی درجے میں رہ گئے تو یوں سمجھو کہ نہ آپ نے آنکھ سے کام لیا، نہ کان سے کام لیا، نہ دل سے کام لیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ صلاحیتیں دی تھیں، آپ نے تو حیوانیت کے دائرے سے نکل کر کچھ آگے کام کرنا تھا، ہوا میں اڑنا حیوانیت سے باہر نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ ہم نے تو جہاز بنا لیے، ہم تو کس طرح اڑے پھرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ابھی تم اس طرح سے اڑنے پر قادر نہیں ہوئے جیسے چڑیا اُڑتی ہے، تم اڑنے کے لیے کس قسم کی مشینریوں کے محتاج ہو، اور اُترنے کے لیے کس قسم کے میدان کے محتاج ہو، اور چڑیا کو نہ ہوائی اڈے کی ضرورت نہ پٹرول کی ضرورت، وہ جب چاہے اڑے جدھر چاہے چلی جائے، باز اُڑتا ہے کس طرح اُڑتا ہے، گدھ اُڑتی ہے کس طرح سے اُڑتی ہے، پرندے اُڑتے ہیں کس طرح سے اُڑتے ہیں۔ پانی میں تم تیرنے لگ گئے، سمندروں کی تہہ میں تم پہنچ گئے، تو حیوانات نہیں پہنچتے؟ وہ پانی میں نہیں تیرتے؟ وہ تمہاری طرح مشین کے محتاج نہیں، لوہے کے محتاج نہیں، لکڑی کے محتاج نہیں، ان میں اس قسم کی صلاحیتیں ہیں، جہاں تک بھی تم اپنی ترقی کو دیکھ لو! جو بھی تمہاری ترقی ہے وہ حیوانیت کی حدود سے باہر نہیں ہے۔تو اگر انسان ہو کے اسی چکر میں رہ گئے، روٹی، کپڑا، مکان اور یہی راحت وآرام، یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ سُور کی طرح ٹکر مار و دوسرے کو اور اوپر چڑھ جاؤ، تو یہ تو مینڈھے بھی مینڈھوں کو مارتے ہیں، سنڈھے بھی سنڈھوں کو مارتے ہیں، اور ہر سنڈھے کی خواہش ہے کہ میں دوسرے کو ایسا دبا لوں کہ یہ میری حدود میں نہ آئے، ایک سنڈھا اگر ایک حدود میں ہوتا ہے دوسرا وہیں آ جائے تو ان کی لڑائی کبھی دیکھی ہے؟ مینڈھے کس طرح سے لڑتے ہیں، اپنی حدود میں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے، تمہاری یہ خصلت بھی حیوانوں میں موجود ہے۔تو یہ روٹی، کپڑا، مکان کا چکر، اپنے مدمقابل پر غلبہ پانے کا جذبہ، ہوا میں

اڑنے اور سمندر کی تہوں میں پہنچنے کی بات ہی اگر آپ نے حاصل کی ہے ساری زندگی میں، تو معاف کرنا آپ حیوانیت کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ جب آپ حیوانیت کی حدود سے باہر نہیں نکلے تو کتنی بڑی حقیقت ہے جس کو قرآن نے کہا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ، اب اس میں کوئی شک کی بات ہے؟ یہ کتنی بڑی حقیقت کی ترجمانی ہے، یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں، اب اس حقیقت میں کوئی شک ہے؟ بالکل واضح بات ہے۔

اِنسان ''بَلْ هُمْ اَضَلُّ'' کا مصداق کب بنتا ہے؟

لیکن نہیں، صرف اتنی بات نہیں کہ یہ چوپایوں کی طرح ہیں، بَلْ هُمْ اَضَلُّ: یہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ ان سے زیادہ بھٹکے ہوئے کیسے؟ کہ چوپایوں کو اللہ نے جس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا اور جتنی صلاحیتیں ان کو دی تھیں وہ سب انہوں نے استعمال کر کے اپنا مقصدِ زندگی پالیا ہے، اُن کے سامنے کوئی اور بات ہے ہی نہیں۔ اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں بہت زیادہ دی تھیں، اور تم رہ گئے صرف حیوان کی حدود تک، تو تم تو زیادہ بھٹکے ہوئے ہو، تمہیں تو اتنی بھی ہدایت نہیں جتنی حیوانات کو ہوتی ہے، کم از کم وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال تو کرتے ہیں، اس طرح سے کہو تو بَلْ هُمْ اَضَلُّ ٹھیک ہے۔ اور اگر ایک بات اور کہہ دوں وہ تھوڑی سی تفصیل طلب ہے، لیکن ہے مزے دار، کہ چیز جتنی اچھی ہوا کرتی ہے، جب بگڑتی ہے تو اُس کا بگاڑ بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے، ایک روٹی ہے، دو دن پڑی رہے، تو کیا ہوگا؟ سوکھ جائے گی، ذرا اکڑ ہی جائے گی، اس میں بو نہیں آئے گی، کیڑے نہیں پڑیں گے۔ لیکن فیرینی ہے، کھیر ہے، اور اس قسم کی چیز جو روٹی کے مقابلے میں بہت لطیف ہے وہ اگر باسی ہوگئی، سڑ گئی تو برتن میں ناک نہیں دیا جاتا۔ تو جو چیز اچھی ہوتی ہے جب اس میں بگاڑ آتا ہے تو اس کا بگاڑ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، اسی طرح انسان جب بگڑتا ہے تو چونکہ ماشاءاللہ! اشرف المخلوقات ہے، تو جب اس اشرف المخلوقات میں بگاڑ آتا ہے پھر بگاڑ بھی آخری سرے کا آتا ہے، یہ صرف مفروضہ نہیں، میں آپ کے سامنے ایک مثال دیتا ہوں...... غصہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی دیا اور حیوان کو بھی دیا، اب حیوان کو کوئی شخص یا دوسرا حیوان چھیڑئے اور اُس کی مرضی کے خلاف کرے تو وہ سینگ مارتا ہے، یہ وہی غصے والی بات ہے کہ اپنی مدافعت کرتا ہے، یا کسی جگہ وہ جارحیت کرتا ہے۔ اچھا! جس وقت وہ جانور جس کے اس نے سینگ مارا تھا ایک دوسرے سے ہٹ جاتے ہیں، تو کیا ان جانوروں کو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بغض رہ جاتا ہے؟ اگر ایک گدھا دوسرے گدھے کو لات مار دے تو کیا وہ گدھا دوسرے گدھے کے باپ سے انتقام لیتا ہے؟ اس کے بیٹے سے انتقام لیتا ہے؟ اس کے خاندان کے پیچھے پڑ جاتا ہے؟ لیکن اگر انسان کو انسان پر غصہ آجائے تو وہ صرف اُسی پر رہتا ہے جس پر آیا تھا؟ یا اُس کی ماں باپ، دادا، بہن بھائی، بیٹوں پوتوں پڑپوتوں تک یہ بات چلتی ہے؟ تو یہ آپ کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے ہے، کہ جہاں غصہ آیا تھا آپ وہیں نہیں رکے، اور اُس غصے نے کہاں تک فساد پھیلا دیا، اتنا سا غصہ تو مناسب تھا کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے تو اُس کا دفعیہ کیجیے، لیکن یہ نسلوں تک جو چلا جاتا ہے پھر اُس کا باپ ہاتھ آجائے اُس کو نہیں چھوڑنا، بیٹا ہاتھ آجائے اُس کو نہیں چھوڑنا، اُس کی جائیداد ہاتھ آجائے وہ برباد

کر دینی ہے، یہ سارے کا سارا غصے کا فساد دیکھو، کہ جہاں غصہ آیا تھا وہیں نہیں رہا، اور وہ کہاں تک پھیل گیا..... اللہ تعالیٰ نے طبیعت کے اندر شہوت کا جذبہ رکھا ہے مرد اور عورت کو جوڑنے کے لئے، جس سے آگے نسل چلتی ہے، یہ ایک مقصد ہے، یہ حیوان میں بھی ہے، انسان میں بھی ہے، حیوان کی نسل بھی اسی اصول سے چلتی ہے، انسان کی نسل بھی اسی اصول سے چلتی ہے، لیکن حیوان کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، کہ اس جذبہ میں بے راہ ہو کے اپنی جنس کے علاوہ کسی دوسرے میں قضائے شہوت کرنے لگ جائے، کوؤں کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ چڑیوں کو پکڑے پھر رہے ہوں، گدھوں کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، کہ بھینسوں کے پیچھے لگے ہوئے ہوں، سنڈھوں کو آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ بکریوں کے پیچھے لگے ہوئے ہوں، اُن کے شہوانی جذبے میں کبھی یہ بگاڑ دیکھا ہے؟ (نہیں)، جو راستہ فطرت نے ان کے لئے متعین کر دیا وہ اُسی پر چلتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اشرف المخلوقات بگڑ جائے تو یہ کیا کیا تماشے دکھاتا ہے؟ جب انسان بھٹکتا ہے تو کیا یہ حیوانوں سے زیادہ نہ بھٹکا؟ حیوان تو جس طرح بھی ہو کسی درجے میں رہ جائیں گے، لیکن جس وقت اِس (انسان) کی شہوت آزاد ہوتی ہے، پھر یہ نہ مرد، مرد کو چھوڑے، نہ بھینس کو چھوڑے، نہ بکری کو چھوڑے، نہ گائے کو چھوڑے، پھر یہ اپنے شہوانی جذبے میں اس طرح سے اندھا ہوتا ہے، کہ جو چیز اس کے سامنے آجائے وہ اس کا شکار ہو جاتی ہے۔ تو انسان میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس طرح آتا ہے، اسی طرح سے باقی چیزیں ہیں، یعنی مدرکِ کلیات ہونے کی وجہ سے پھر یہ کلیے ہی بنا لیتا ہے، اور پھر اس میں سے جزئیات نکالنے کی کوئی حد نہیں ہوتی، کہ اس کے قضائے شہوت کے کتنے طریقے ہیں، کتنے طریقوں کے ساتھ یہ اپنے جذبات کو پورا کرتا ہے آپ شمار نہیں کر سکتے، یہ اس کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ تو اس لیے جب انسان بھٹکتا ہے تو صرف جانور ہی نہیں رہتا، اسی حد تک نہیں رہتا جس حد تک حیوان ہے، بلکہ وہ پھر بَلْ هُمْ اَضَلُّ، وہ اس سے بھی زیادہ آگے نکل جاتا ہے، اس کی ضلالت حیوانات سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ اب یہ جو حقیقت آپ کے سامنے ان الفاظ میں بیان کر دی گئی، اس میں کوئی اشتباہ ہے؟ کہ آپ کہیں کہ کیسے اُن کو جانوروں کی طرح کہہ دیا؟ یہ تو پینٹ پہنتے ہیں، کوٹ پہنتے ہیں، ہوائی جہازوں میں اُڑتے ہیں، سمندروں میں سفر کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں سب کچھ ہونے کے باوجود یہ جانور ہیں، بلکہ جانوروں سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے، لیکن آج ایک پردہ ہے، اور جس دن حقائق رُونما ہوں گے اس دن پتا چلے گا کہ ان میں سے کتنے حقیقت میں بندر تھے جن کے اُوپر رُوپ انسان کا تھا، کتنے ان میں سے خنزیر تھے جن کے اُوپر چمڑا انسان کا تھا، اس طرح کے سب اندر سے اسی طرح نکلیں گے جیسے بندر ہیں، سُور ہیں، گدھے ہیں، سب کی حقیقتیں یہی نکلیں گی، جیسے کہ مولانا رُومی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ:

آناں را کہ بینی خلافِ آدم اند   نیستند آدم، غلافِ آدم اند

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کہ جن کو تم دیکھتے ہو کہ ان کا طریقہ آدمیوں والا نہیں ہے، وہ آدم نہیں ہیں، ان کے اُوپر چمڑا آدم کا چڑھا ہوا ہے، اور حقیقت میں کوئی بندر ہے کوئی سُور ہے کوئی سانپ ہے کوئی بچھو ہے، اور ان کی فطرت انہی چیزوں والی ہے۔ جس وقت حقیقت نمایاں ہوگی سب کو پتا چل جائے گا کہ یہ تو بھٹکے ہوئے جانوروں سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، شکل

انسان کی ہے لیکن حقیقت میں حیوان سے بدتر، جیسے میں نے ایک دو مثالیں آپ کے سامنے دیں کہ جب انسان اس سطح پر اُترتا ہے، خون ریزی پر اُترا، شہوت رانی پر اُترا، تو اُس کی کوئی حد ہے؟ چیرنے پھاڑنے والا درندہ کوئی اس طرح سے درندگی نہیں کرتا جس طرح سے درندگی انسان کرتا ہے، شہوتی جانوروں میں سے سب سے زیادہ شہوتی جانور گدھا مشہور ہے، لیکن جب انسان بے راہ ہوتا ہے تو سو گدھے بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے جتنی یہ شہوت رانی کرتا ہے، جب انسان بگڑتا ہے تو یوں بگڑتا ہے۔ تو اس لیے ہمارے سامنے تو یہ حقیقت اس طرح سے ہے جیسے دوپہر کا سورج، کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ، کسی کو نہ سمجھ میں آئے تو اس کی مرضی۔ قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ اپنے اندر کسی قسم کے دریا اور سمندر لیے ہوئے ہے، حقیقتِ انسانی کو سمجھانے کے لیے کتنی معیاری چیز ہے...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ: یہی لوگ بے خبر ہیں۔ جو اللہ کے احکام کی رعایت نہیں رکھتے وہ غافلون ہیں، اور یہی ہیں جو نہ اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں، اور نہ کانوں سے کام لیتے ہیں، نہ دلوں سے کام لیتے ہیں، جانور کے جانور ہیں، روٹی، کپڑا، مکان ان کا نعرہ ہے، اور اس حد کے اندر رہتے ہوئے یہ حیوانوں سے کبھی برتر نہیں ہوسکتے، اور یہ چیزیں جس طرح سے جانوروں کو میسّر ہیں سکون واطمینان کے ساتھ، ان کو کبھی میسّر نہیں آسکتیں۔

حیوانی حدود سے باہر نکلنے کے لئے عبادت کا طریقہ

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا: اچھے اچھے نام اللہ کے لیے ہیں، اُسی کو پکارا کرو ان ناموں کے ساتھ، یا اسی کے سامنے دُعا کیا کرو ان ناموں کے ساتھ، تاکہ یہ غفلت دُور ہو، غفلت دُور ہوگی تو تم سے حیوانیت چھوٹے گی، اور پھر تم کمال کے درجے کی طرف جاؤ گے، یہ آگے عبادت کا طریقہ بتایا اس حیوانی حدود سے باہر نکلنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں انہی کے ساتھ اس کے سامنے دُعا کرو، انہی ناموں کے ساتھ اس اللہ کو پکارو...... ''اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اللہ کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں'' اللہ کے لیے ناموزوں لفظ استعمال کرتے ہیں، یا اللہ کے نام کسی دوسرے پر چسپاں کرتے ہیں، یا اللہ کے ناموں کو ناجائز کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں، یہ سب الحاد فی اسماء اللہ ہے، جو اللہ کے ناموں میں الحاد اختیار کرتے ہیں ان کو چھوڑو یعنی ان سے کوئی تعلق نہ رکھو سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ عنقریب بدلہ دیے جائیں گے یہ ان کاموں کا جو یہ کرتے ہیں...... وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ: ''جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتی ہے، حق کے مطابق عدل کرتی ہے'' یعنی سارے انسان بُرے نہیں ہیں، جیسے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ کہا کہ انسانوں میں یہ ٹولہ بھی ہے۔ لیکن حق کے مطابق چلنے والے اور حق کے مطابق چلانے والے انسان بھی موجود ہیں، ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ (۱)

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(۱) اس آخری آیت کی مزید تفسیر اگلے درس میں ملاحظہ فرمائیں۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیات کو ہم اُن کو درجہ بدرجہ لیے جا رہے ہیں ایسی جگہ سے کہ اُن کو علم بھی نہیں ﴿۸۲﴾

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ

اور میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میری خفیہ تدبیر مضبوط ہے ﴿۸۳﴾ کیا یہ سوچتے نہیں کہ اُن کے ساتھی کو کوئی

مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ

جنون نہیں، نہیں ہے وہ مگر ڈرانے والا واضح طور پر ﴿۸۴﴾ کیا یہ غور نہیں کرتے آسمانوں اور

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى

زمین کی سلطنت میں اور اس شئ میں جس کو اللہ نے پیدا کیا، اور اس بات میں

اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

کہ شاید اُن کی موت قریب آگئی ہو، اِس کتاب کے بعد یہ کس بات پہ ایمان لائیں گے ﴿۸۵﴾

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ

جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اُس کو کوئی راستہ دِکھانے والا نہیں، اور اللہ تعالیٰ انہیں چھوڑتا ہے ان کی سرکشی میں یہ حیران

يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا

پھرتے ہیں ﴿۸۶﴾ سوال کرتے ہیں آپ سے ساعت (قیامت) کے متعلق کہ کب ہوگا اس کا وقوع، آپ کہہ دیجیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ

اس کا علم میرے رب کے پاس ہے، نہیں ظاہر کرے گا اس ساعت کو اس کے وقت پر مگر وہی، بوجھل ہے وہ ساعت آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْــَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ

اور زمین میں، نہیں آئے گی وہ تمہارے پاس مگر اچانک، یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس قیامت کے متعلق مکمل

عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ

تحقیق کرنے والے ہیں، آپ کہہ دیجیے سوائے اس کے نہیں اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ بے علم ہیں ﴿۸۷﴾ آپ کہہ دیجیے

لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ

کہ نہیں اختیار رکھتا میں اپنے لیے نفع کے حاصل کرنے کا اور نہ نقصان کے دُور ہٹانے کا مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں

اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ

غیب کو جانتا ہوتا۔ تو میں خیر کو کثرت سے حاصل کرلیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ﴿۸۷﴾

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا: اور وہ لوگ جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیات کو، سَنَسْتَدْرِجُهُمْ: استدراج کا معنی ہوتا ہے درجہ بدرجہ لے جانا، درجہ اصل کے اعتبار سے آپ کی جو سیڑھی ہوتی ہے اس کا ایک پائے دان ایک درجہ ہے، دوسرا پائے دان دوسرا درجہ ہے، تو درجات اسی طرح سے ہیں یکے بعد دیگرے، تو ایک درجے سے دوسرے درجے پر آپ چڑھتے چلے جائیں گے تو جو منزل ہوتی ہے، جو مقصود ہوتا ہے وہاں تک انسان پہنچتا ہے، تو اِسْتِدْرَاج کا معنی ہوتا ہے درجہ بدرجہ لے جانا، ''ہم ان کو درجہ بدرجہ لیے جارہے ہیں'' مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ: ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو علم نہیں، ایسی جگہ سے کہ وہ نہیں جانتے، ہم ان کو آہستہ آہستہ لیے جارہے ہیں ایسی جگہ سے کہ اُن کو علم بھی نہیں۔ مفہوم اس کا آگے آجائے گا۔ وَاُمْلِیْ لَهُمْ: اُمْلِیْ یہ املاء سے ہے۔ اور میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں، اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ: بیشک میری کید مضبوط ہے۔ متین متانت سے ہے، اور کید خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، ''بیشک میرا داؤ پکا ہے'' جیسے حضرت شیخ الہند نے ترجمہ کیا، بیشک میری خفیہ تدبیر مضبوط ہے، اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ: اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا میں واؤ کا معطوف علیہ اگر ظاہر کرنا ہو تو اَكَذَّبُوْا وَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا: کیا یہ جھٹلاتے ہی چلے جارہے ہیں اور سوچتے نہیں؟ تفکر نہیں کرتے؟ کس چیز میں تفکر نہیں کرتے؟ وہ یہی بات ہے مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ: صاحب: ساتھ رہنے والا، ساتھی۔ ''ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں'' صاحب سے یہاں سرورِ کائنات ﷺ مراد ہیں، اور ان کو مشرکین کا صاحب قرار دیا جارہا ہے حسی مصاحبت کے اعتبار سے، ان کے ساتھ رہنے والے، ان کے مصاحب، جو ان کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے ساتھی، ان کو کسی قسم کا جنون نہیں، مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ: نکرہ تحت النفی ہے، کسی قسم کا کوئی جنون نہیں، اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ: نہیں ہے وہ مگر ڈرانے والا واضح طور پر، واضح ڈرانے والا ہے، اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کیا یہ غور نہیں کرتے، نظر نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں؟ ملکوت مُلک کے معنی میں ہے، سورۂ انعام میں یہ لفظ گزرا تھا، وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ: اس کا عطف بھی مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ پر ہے، کیا یہ غور نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور اس شئ میں جس کو اللہ نے پیدا کیا۔ مِنْ شَیْءٍ مَا

کا بیان ہے، اس لیے اِس کا ترجمہ اُس کے ساتھ جوڑ کے کر دیا گیا،''اس شیٔ میں جس کو اللہ نے پیدا کیا'' وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ: اور اَنْ عَسٰى میں اَن مابعد کو مصدر کی تاویل میں کرے گا تو اس کا عطف مَاخَلَقَ پر ہے، اسی طرح سے جس طرح مَا خَلَقَ کا عطف مَلَكُوْتِ پر ہے، یہ سب آپس میں معطوف معطوف علیہ مل کر پھر فِیْ کا مجرور بنتے ہیں۔''اور کیا انہوں نے غور نہیں کیا اس بات میں کہ شاید ان کی اَجل قریب آ گئی ہو، ان کی موت قریب آ گئی ہو، ان کے ہلاک ہونے کا وقت قریب آ گیا ہو، کیا وہ اس بات میں غور نہیں کرتے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی ہلاکت کا وقت قریب آ گیا ہو، ان کی اَجل قریب آ گئی ہو، فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ: بَعْدَهٗ میں ''ہٗ'' ضمیر اس کتاب کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے،''اس کتاب کے بعد یہ کس بات پہ ایمان لائیں گے؟'' اور بعض تفسیروں میں بَعْدَهٗ کی ضمیر اَجل کی طرف بھی لوٹائی ہے یعنی جس وقت ان کی موت آ جائے گی، ان کی اجل آ جائے گی، ان کی ہلاکت کا وقت آ جائے گا اس کے بعد یہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ یعنی اس کے بعد پھر کون سی بات باقی ہوگی ایمان لانے کے لئے؟ پھر تو قصہ ہی ختم ہو جائے گا، اس طرح سے بھی اس کا مفہوم ادا کیا جاسکتا ہے۔ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ: جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں، وَیَذَرُهُمْ: اور اللہ تعالیٰ انہیں چھوڑتا ہے فِیْ طُغْیَانِهِمْ: ان کی سرکشی میں، یَعْمَهُوْنَ: یہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ عمہ یہ لفظ پہلے بھی گزرا تھا، عَمِیَ یاء کے ساتھ ہو تو آنکھوں سے اندھا ہونے کو کہتے ہیں، اور عَمِهَ ہاء کے ساتھ ہو تو یہ دل کے بے بصیرت ہونے کو کہتے ہیں، بے سمجھی کی حالت میں جس طرح سے انسان حیران پریشان سرگردان پھرتا ہے اس کا وہی مفہوم ہے،''چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی سرکشی میں، یہ بھٹکتے پھرتے ہیں، حیران پھرتے ہیں'' یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا: سوال کرتے ہیں آپ سے ساعۃ کے متعلق۔ ساعۃ گھڑی کو کہتے ہیں، جس طرح سے چوبیس گھنٹے جو ہیں آپ کے ساعات دن اور رات کے چوبیس شمار کئے جاتے ہیں، گھنٹہ، گھڑی، اور یہاں ساعت سے مراد وہ خاص ساعت ہے جو اس عالم کے لئے فنا کی ساعت کہلاتی ہے، جس طرح سے ہمارے محاورے میں بھی یہ لفظ آتا ہے''ڈرو اس گھڑی سے جو سر پہ کھڑی ہے'' تو وہی ہلاکت اور بربادی والی گھڑی جس میں یہ کائنات برباد ہوگی، یہاں ساعۃ سے وہی ساعۃ مراد ہے، جس کو ہم اپنی زبان میں قیامت کے لفظ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، ورنہ ساعۃ کا معنی گھنٹہ، گھڑی،''سوال کرتے ہیں آپ سے ساعت کے متعلق'' اَیَّانَ مُرْسٰىهَا: کب ہوگا اس کا وقوع؟ مُرْسٰی مصدر میمی ہے قیام کے معنی میں۔ اس کا قیام کب ہوگا؟ اس کا ٹھہرنا کب ہوگا؟ اس کا وقوع کب ہوگا؟ مُرْسٰی کا لفظ آپ کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرے میں بھی آئے گا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (سورۂ ہود: ۴۱) اللہ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ اور مُرْسٰی ظرف کے معنی میں بھی ہوتا ہے، یہ جہازوں کے لنگر انداز ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں جہاں جہاز ٹھہرتے ہیں، لنگر انداز ہوتے ہیں۔ تو''اس کا وقوع کب ہوگا؟'' قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ: آپ کہہ دیجئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے۔ ھَا ضمیر ساعۃ کی طرف لوٹ رہی ہے لیکن اَیَّانَ مُرْسٰىهَا والے مضمون کے ساتھ، ساعۃ کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے، یعنی اس کے وقوع کا متعین علم میرے رَبّ کے پاس ہے، یہ بات ان کے پچھلے سوال کے جواب میں ہے، وہ وقت معین پوچھتے ہیں تو وقت معین اس کا اللہ کے پاس ہے، لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ: نہیں ظاہر کرے گا اس ساعت

کو اس کے وقت پر مگر وہی۔ تجلّی یَتَجَلّٰی: ظاہر ہونا۔ اسی سورت میں یہ لفظ گزرا ہے، اللہ تعالیٰ کی تجلّی جو پہاڑ پر ہوئی تھی۔ اور جلّی یُجَلِّی تَجْلِیَۃً: روشن کرنا، ظاہر کرنا۔ جلو اس کا مادّہ ہے۔ ''نہیں ظاہر کرے گا اس ساعت کو اس کے وقت پر مگر وہی'' ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. ثَقُلَتْ کی ضمیر ساعۃ کی طرف ہی لوٹ رہی ہے۔ ''بوجھل ہے وہ ساعت آسمانوں میں اور زمین میں'' اس کا مفہوم آپ کے سامنے آئے گا کہ دو طرح سے ادا کیا گیا ہے، یا تو یہ ہے کہ زمین و آسمان میں وہ بہت بڑا بھاری حادثہ ہے، یا اسی لفظ کے تحت ہی اس کو ادا کیا جاسکتا ہے کہ زمین و آسمان میں بوجھل ہے، جس طرح سے ایک حاملہ عورت جس کا حمل پورا ہو گیا ہو وہ ایک بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہوتی ہے، پتا نہیں ہوتا کہ یہ کس وقت ظاہر ہو جائے گا، اسی طرح سے یوں سمجھو کہ کائنات کے اندر بھی ساعت ایک بوجھ ہے، اور معلوم نہیں کہ کس وقت اس کا ظہور ہو جائے گا، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ''بوجھل ہے وہ آسمانوں میں اور زمین میں'' لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً: نہیں آئے گی وہ تمہارے پاس مگر اچانک۔ اچانک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کا پہلے انتظار نہیں ہوتا، جلدی سے سامنے آجاتی ہے بغیر انتظار کے۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ: یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، سوال کرتے ہیں، كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا: گویا کہ آپ اس قیامت کے متعلق مکمل تحقیق کرنے والے ہیں، کہ آپ نے سوال کر کر کے اس کا حال پوری طرح سے واضح کر لیا ہے، آپ اس کی حقیقت کو پہچان گئے ہیں، اور وقت آپ کو معلوم ہو گیا، پوری معلومات آپ کو حاصل ہو گئیں، آپ سے یہ اس طرح سے پوچھتے ہیں، ''گویا کہ آپ اس قیامت کے متعلق تحقیق کرنے والے ہیں'' یعنی تحقیق کر چکے ہیں، محقق بن گئے، آپ کو اس کے متعلق ساری معلومات حاصل ہو گئیں کہ یہ کب واقع ہوگی، کب نہیں واقع ہوگی، ''سوال کرتے ہیں آپ سے یہ گویا کہ آپ اس قیامت کے متعلق تحقیق کرنے والے ہیں'' قُلْ: آپ کہہ دیجیے، فیصلے کی بات آخری یہی ہے کہ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ: اس سے زیادہ مجھے کچھ خبر نہیں، ساعت کو جانتا ہوں، اس کے احوال جتنے اللہ نے واضح کر دیے ان کا پتا ہے، لیکن جہاں تک اَیَّانَ مُرْسٰىهَا والی بات ہے، جو اُن کے نزدیک زیر بحث تھی کہ اس کا وقوع کب ہوگا، اس اعتبار سے اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، باقی! قیامت کے احوال کہ اس میں کیا ہوگا، پہاڑوں کا کیا حال ہوگا، سمندروں کا کیا حال ہوگا، باقی کائنات کا کیا حال ہوگا، وہ تو ساری اللہ نے بتا دیں، وہ تو علم میں ہیں، تو جس علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کیا جا رہا ہے وہ علم اسی سوال کے تحت والا ہے اَیَّانَ مُرْسٰىهَا، اس کا وقوع کب ہوگا، اس اعتبار سے اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ بے علم ہیں، وہ جانتے نہیں کہ ہر بات کا علم حاصل ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر بات کا علم حاصل ہونا عام انسانوں کے لئے ممکن ہی نہیں، اور ہر بات کا علم دے دینا اللہ کی حکمت ہی نہیں، اگر یہ باتیں علم میں ہوں تو پھر یہ اس قسم کی چیزوں میں نہ جھگڑیں، یہ بے علمی کی باتیں کرتے ہیں، بے سمجھی کی باتیں کرتے ہیں، اکثر لوگ جانتے نہیں کہ بعض چیزوں کو مخفی رکھنے میں اللہ کی حکمت ہے، اور ہر چیز کی حقیقت کا اظہار یا ہر بات کا اظہار یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا نہیں ہے، اور نہ وہ انسانی دنیا کے لئے مناسب ہے، جس کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا: آپ کہہ دیجیے کہ نہیں اختیار رکھتا میں اپنے لئے، اپنی جان کے لئے، حُصُولُ نفعٍ ولا دفعُ ضَرٍّ، نہ میں اپنے لیے نفع کے حاصل کرنے کا اختیار رکھتا ہوں نہ نقصان کے دُور ہٹانے کا اِختیار رکھتا ہوں، اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: مگر جو اللہ چاہے، جو اللہ چاہے اپنی مشیت کے تحت

نفع کے حصول کی توفیق دے دے، نقصان کے دُور ہٹانے کی توفیق دے دے، جو کچھ ہے اس کی مشیت کے تحت ہے، اس کے بغیر نہ میں نفع کے حاصل کرنے کا اختیار رکھتا ہوں نہ نقصان کو دُور ہٹانے کا۔ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ: تو میں خیر کثیر کو حاصل کر لیتا۔ اِسْتِکْثَار: کثرت سے حاصل کر لینا۔ تو میں خیر کو کثرت سے حاصل کر لیتا، وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ: اور نہ مجھے کوئی تکلیف پہنچتی۔ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: اس میں انتفاءِ ثانی دلیل ہوا کرتا ہے انتفاءِ اول کی، لَوْ کا مسئلہ جس طرح سے پڑھتے رہتے ہو لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۂ انبیاء: ۲۲) اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ کوئی اور اِلٰہ ہوتا تو یہ دونوں خراب ہو جاتے، فساد آ جاتا، لیکن یہ "فسدتا" کا مصداق نہیں ہیں، تو معلوم ہو گیا کہ دوسرا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ تو مجھے تکلیف بھی پہنچتی رہتی ہے اور کئی ساری فائدے کی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو میں حاصل نہیں کر سکتا یہ دلیل ہے اس بات کی کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں، "اگر میں غیب کو جانتا تو میں خیر میں سے کثیر حاصل کر لیتا، بہت سی خیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی" اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ: نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا اور بشارت دینے والا اُن لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط ...... حق قیامت تک ایک طائفہ کی صورت میں ضرور رہے گا

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ایک جماعت ایسی ذکر کی تھی، جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتی ہے اور اسی حق کے مطابق انصاف کرتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری مخلوق گمراہ نہیں، جیسے پیچھے ذکر کیا تھا لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا، تو سارے لوگ اس قسم کے نہیں، ہر دور میں (قلیل کثیر کا فرق ہو سکتا ہے لیکن) ایسے اشخاص ضرور موجود رہتے ہیں جو حق کے حامل ہوتے ہیں، اور دوسرے کی راہنمائی بھی حق کے ساتھ کرتے ہیں، اور جس وقت کوئی معاملہ پیش آ جائے تو اس کا فیصلہ بھی حق کے مطابق ہی کرتے ہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ الفاظ بھی آئے ہیں وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (سورۂ اعراف: ۱۵۹) تو قوم موسیٰ میں بھی اس قسم کے لوگ تھے، اور نزولِ قرآن کے وقت پھر اس کا مصداق سرورِ کائنات ﷺ کی جماعت ہوگئی، آپ ﷺ کی اس کتاب کے حامل، اور آپ ﷺ کے بعد قیامت تک ایک گروہ ایسا ضرور موجود رہے گا جو حق کا حامل ہوگا، حق کے ساتھ ہدایت کرے گا اور حق کے مطابق ہی انصاف کرے گا، جیسا کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، صحیح روایت ہے: "لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ" "میری اُمت میں سے ایک طائفہ ہمیشہ رہے گا جو حق پر قائم ہوں گے، اپنے مخالفین پر دلیل کے اعتبار سے غلبہ پانے والے ہوں گے، اُن کی مخالفت کرنے والا اُن کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، "حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ"[1] یہاں تک کہ اللہ کا امر آ جائے گا، یعنی قیامت تک ایک طائفہ ضرور موجود رہے گا، حق کے اندر اس طرح سے تسلسل ہے۔

---

(۱) مسلم ۲/ ۱۴۳ باب قولہ لا تزال طائفۃ الخ مشکوۃ ۲/ ۵۸۳، کتاب الفتن۔

کُفّار کے پاس کثرتِ اموال نعمت نہیں، عذاب ہے

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ کے اندر مِن تبعیضیہ ہے، مخلوق میں سے بعض، مخلوق میں سے ایک جماعت، تو جس کا معنی یہ ہے کہ بعض لوگ ایسے نہیں بھی ہوتے، نہ وہ حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں، نہ حق کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ اب جس وقت ہم دنیا کے اندر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ جو حق کے مطابق ہدایت نہیں کرتے اور حق کے مطابق انصاف نہیں کرتے، ہے تو یہ فاسقین کا گروہ، جیسا کہ پچھلے رکوع میں ذکر کیا گیا تھا، لیکن یہ بظاہر بڑے عیش وآرام میں نظر آتے ہیں، یہی ایک ابتلا ہے جو انسان کے ذہن میں آتا ہے، کہ بظاہر وہ بڑے آرام میں نظر آتے ہیں، بڑی راحت میں نظر آتے ہیں، دنیا کی زیب وزینت ان کو زیادہ حاصل ہے، تو یہ ایک مغالطہ ہے جو انسان کو لگتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر یہ غلط ہوتے تو ان کو دنیا کے اندر یہ عیش وآرام کیوں حاصل ہوتا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ اگلے الفاظ میں آپ کے ذہن سے یہی مغالطہ دُور کرتے ہیں، اور قرآنِ کریم میں بہت سارے مقامات پر اس پردے کو چاک کیا گیا ہے علمی انداز میں دلائل کے ساتھ، اور اس کا سمجھنا دل دماغ کے اُوپر اس کو جمالینا یہ ضروری ہوتا ہے، تبھی جاکے انسان کے اندر آخرت کی قدر وقیمت آتی ہے، اور دنیا کی ذلت اور دنیا کی کمزوری اور دنیا کے ساز وسامان کا قابلِ قدر نہ ہونا تب درجۂ حال میں آتا ہے، جس وقت انسان ان حقائق کو اپنالیتا ہے، مثلاً سورۂ براءت میں یہ الفاظ آئیں گے وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا (سورۂ توبہ:۸۵) اے مخاطب! ان کے مال اور ان کی اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالے، کہ یہ منافق ایسے بدکردار ہیں، یوں یہ شرارتیں کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کے پاس مال واولاد ہے، مال کی نعمت بھی حاصل ہے، اولاد کی نعمت بھی حاصل ہے، یہ تجھے تعجب میں نہ ڈالے، اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا، یہ مال اور اولاد ان کے حق میں نعمت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا، یہ مال واولاد ان کے لیے عذاب ہے۔ کتنی صفائی کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے، عذاب کیسے ہے؟ کہ اس طرح سے چکر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کمانے میں پریشان، سنبھالنے میں پریشان، اور جتنا اکٹھا کرتے جارہے ہیں آخرت کا عذاب ہی بڑے گا، نتیجہ تو یہی ہے۔ اکٹھا جتنا چاہے کرلیں لیکن آخرت میں یہ باعث عذاب ہے، اور اگر یہ مسکین ہوتے، فقیر ہوتے، ان کے اعوان انصار نہ ہوتے، ان کا خاندان نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ متواضع ہوکر حق قبول کرلیتے۔ تو یہ مال والادان کے لیے تکبر کا باعث بنا، اور یہ تکبر ان کے لیے اللہ کے عذاب کا باعث بن جائے گا، تو یہ مال واولاد ان کے لیے نعمت نہیں، اس لیے اگر ان کے پاس مال واولاد دیکھیں تو تعجب نہ کریں کہ ان کو اللہ نے اتنا کیوں دے رکھا ہے؟ تو وہاں بھی یہی مضمون ہے...... سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں ایک آیت گزری ہے لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ: یہاں بھی حق پرستوں کے ذہن میں یہی ڈالا ہے، کہ ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا، آنا جانا، شہروں میں گھومنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے، کہ تم دیکھتے ہو کہ کبھی قافلے کے ساتھ ادھر کو جارہے ہیں، کبھی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ادھر کو جارہے ہیں، کہیں سے آرہے ہیں، کہیں جارہے ہیں، کہیں سے ان کا مال آرہا ہے، کہیں ان کا مال جارہا ہے، اور آج کل کے حساب سے ہوائی جہاز پر چڑھتے ہیں، کراچی سے لاہور پہنچ جاتے ہیں، لاہور سے

پنڈی پہنچ جاتے ہیں، فضا میں اڑتے پھرتے ہیں، شہروں میں گھومتے پھرتے ہیں، اوران کا تجارت کا سازوسامان سارے ملک میں گشت کرتا پھرتا ہے، خبردار! ان چیزوں کودیکھ کے کہیں دھوکے میں نہ پڑ جائیو کہ یہ لوگ اچھے ہیں، لَا یَغُرَّنَّكَ کتنی تاکید ہے، ہرگز تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے ان لوگوں کا چلنا پھرنا، ان لوگوں کا گھومنا شہروں میں، مَتَاعٌ قَلِیْلٌ یہ تو تھوڑا سا برتنے کا سامان ہے، ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ پھران کا ٹھکانا جہنم ہے۔ تو اگر مال ودولت چند دِن کے لیے دے دیا جائے اور یہ دھوم دھام چند دِن کے لیے ہوجائے، پھر دائمی طور پر جہنم میں ڈال دیا جائے یہ کوئی سودا سستا ہے؟ یہ تو بہت مہنگا سودا ہے، کہ چند دِن کے لیے سونے چاندی کی جھلک دکھائی، اور جھلک دکھانے کے ساتھ دل دماغ الٹ پلٹ ہوگیا، اوراس کے نتیجہ میں ایسے عمل اختیار کرلیے، ایسا کردار اختیار کرلیا کہ نتیجہ جہنم! یہ دیکھ کے کبھی دھوکے میں نہ پڑئیو! مال ودولت جو انسان کو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جانے والا ہے، جو مال اوراولاد کی وجہ سے غرور میں مبتلا ہیں، اور دنیا کی عیش وعشرت میں مبتلا ہیں، خدا کی قسم انتہائی خسارے میں ہیں، کیونکہ اس چندروزہ زندگی میں ان چند ٹکوں کے عوض میں جوانہوں نے ہدایت کو چھوڑا، نیکی کو چھوڑا، اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترک کیا، اوراس کے مقابلہ میں اللہ کی ناراضگی اور اللہ کا غضب اختیار کیا، اگر تمہارے سامنے یہ بات منکشف ہوجائے تو تمہیں پتا چلے کہ یہ کتنے خسارے میں ہیں۔ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں نمایاں کیا، کہ قیامت کے دن جس وقت یہ لوگ اللہ کی گرفت میں آئیں گے، اگر ان کے پاس مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا، زمین کا بھراؤ سونا ہو، یعنی اتنا سونا ان کے پاس ہو کہ آپ زمین کے اوپر ڈھیر لگانا شروع کردیں، اور آسمان تک وہ بھر جائے، اتنا سونا اگر ان کے پاس ہو تو وہ بھی کہیں گے کہ یا اللہ! یہ لے لے اور ہمیں عذاب سے بچالے، لیکن یہ فدیہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ایک ایسی قیمتی چیز ہے، کہ اس کے ساتھ آخرت کے بازار میں جو چیز خریدی جاسکتی ہے، سونے سے بھری ہوئی زمین بھی اس کا بدل نہیں بن سکتی، تو آج اگر دس تولے سونا لے کے، پندرہ بیس تولے سونا لے کے تم ایمان سے ہاتھ دھولو، اوراس نعمت سے محروم ہوجاؤ تو اس سے بڑھ کے اور خسارہ کیا ہوگا؟...... اور سورۂ زخرف کے اندر آپ کے سامنے یہ مضمون آئے گا، کہ اگر ہمیں یہ خیال نہ ہوتا کہ لوگ سارے کے سارے ایک راستے پر چل پڑیں گے، کیونکہ اکثر وبیشتر لوگ کمزور ہیں، اور وہ نقد کو زیادہ چاہتے ہیں ادھار پہ اعتماد نہیں کرتے۔ لوگوں کا دماغ ایسا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کون سا دوبارہ دنیا میں آنا ہے، جتنی عیش ہوسکتی ہے کرلو۔ تو نقد کے اوپر زیادہ مرتے ہیں، ظاہر کو زیادہ دیکھتے ہیں، اس لیے جس وقت لوگ یہ دیکھتے کہ جو شخص کُفر اختیار کرتا ہے اُس کو بہت عیش مل جاتی ہے، تو اکثر وبیشتر لوگ کُفر کی طرف دوڑتے، (تو اللہ فرماتے ہیں) ہم نے انسانوں کو اتنا ابتلا میں نہیں ڈالا، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں اُن کے گھر، اُن کی سیڑھیاں اوراُن کے تکیے یہ سارے کے سارے، ہم سونے اور چاندی کے بنادیتے۔ سورۂ زخرف میں جو زُخْرُفًا کا لفظ آیا ہے، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کررہا ہوں۔ اتنا شدید ہم نے تمہیں ابتلا میں نہیں ڈالا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سونا، چاندی، دنیا کی زیب وزینت ہماری نظر میں اتنی بے قدر ہے کہ اگر باقی لوگوں کے متعلق ابتلا کا خطرہ نہ ہوتا، تو ان کافروں کے کوٹھے بھی ہم سونے کے بنادیتے، ان کی سیڑھیاں بھی سونے کی ہوتیں، اور یہ اسی وجہ سے ہے کہ اس مال ودولت کی اللہ کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے، یہ تو زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ ہے، اوراس زندگی کے اندر اس کو

استعمال کرو، اور مقصدِ حیات کو سامنے رکھو، اس مقصدِ حیات کو سامنے رکھو گے تو یہ آپ کی کامیابی کا باعث ہے، اور اگر ان چیزوں کے اندر اُلجھ کے آپ اپنے مقصدِ حیات کو بھول گئے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لے لی اور آخرت میں عذاب لے لیا تو اس سے بڑھ کے دنیا میں خسارہ کوئی نہیں۔

خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا کمالِ استغناء

بہت ساری آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے، جو لوگ ان حقائق کو سمجھ لیتے ہیں وہ فقیر ہونے کے باوجود بادشاہوں کو نظر میں نہیں لاتے، آپ اپنے اسلاف کے واقعات پڑھیں گے، حکایات پڑھیں گے، تو وہ لطیفے نہیں ہیں کہ حسنِ ظن کے طور پر لوگوں نے بنا بنا کے لکھ دیے ہوں، وہ لطیفے نہیں، واقعات ہیں، کہ یہ لوگ بڑے بڑے رُؤساء کو، بڑے بڑے اُمراء کو، بڑے بڑے سلاطین کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے، کہ یہ کون ہے؟ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے غلاموں کے غلام ہیں، حرص اور آز ہمارے غلام، اور یہ حرص و آز کے غلام، یہ تو ہمارے غلاموں کے غلام ہیں، ان کو ہم کیا جانتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک بزرگ گزرے ہیں خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ، مغلیہ خاندان کا جو بادشاہ ہے جلال الدین اکبر، یہ اُس کے زمانے میں تھے، جلال الدین اکبر کی اولاد نہیں تھی، اور یہ معتقد تھا حضرت خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا، اُن کی خانقاہ میں اس کی آمد و رفت تھی، اور وہاں تعلق کی وجہ سے اس نے اپنا دار الخلافہ بھی فتح پور سیکری کو بنا لیا تھا دہلی کو چھوڑ کر، تاکہ شیخ کے ساتھ قُرب رہے، فتح پور سیکری اس کا دار الخلافہ تھا، دہلی کو یہ چھوڑ گیا تھا، وہاں اپنی رہائش رکھ لی تھی اس قُرب کی وجہ سے۔ اور آپ کو شاید یاد ہوگا، اتنی سی تاریخ تو آپ سنتے رہتے ہیں کہ اکبر کا بیٹا جہانگیر جو اکبر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہوا ہے، جس کا مقبرہ لاہور میں ہے، اس کا اصل نام ''سلیم'' ہے، ''جہانگیر'' اس کا لقب ہے، جس وقت یہ تخت نشین ہوا تو اس نے ''جہانگیر'' لقب اختیار کیا، اس کا نام ''سلیم'' ہے، اور یہ حضرت خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں پیدا ہوا ہے، یعنی جس وقت اکبر کی بیوی قریب الولادت ہوئی تھی، تو اس نے بیوی کو خانقاہ میں بھیج دیا تھا، اکبر اتنی عقیدت رکھتا تھا سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ۔ کہتے ہیں کہ خواجہ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ کسی درویش کو اپنی گدڑی دی، کہ ذرا باہر دُھوپ میں بیٹھ کے دیکھ، اس میں کوئی جوں نہ ہو، جیسے کپڑوں میں جوئیں پڑ جاتی ہیں، سردیوں میں خاص طور پر ایسا ہوتا ہے، تو وہ درویش باہر بیٹھا گدڑی میں جوئیں دیکھ رہا تھا، ادھر سے اُس کی نظر پڑ گئی کہ بادشاہ بمع اپنے خدام اور لاؤ لشکر کے آرہا ہے، تو نظر پڑتے ہی آواز دیتا ہے کہ حضرت! ذرا باہر تشریف لائیے، تو حضرت باہر تشریف لائے، کہنے لگا: وہ بادشاہ آرہا ہے، وہ درویش نیا نیا ہوگا جو صحیح حالات کو جانتا نہیں ہوگا، تو آپ نے فرمایا کہ کمال کر دی، بادشاہ آرہا ہے، یہ بات بھی کوئی مجھے بتانے کی تھی، میں تو سمجھا کہ کوئی موٹی سی جوں پکڑ لی ہوگی، وہ دِکھانی ہے، گدڑی میں سے کوئی موٹی سی جوں پکڑ لی ہوگی شاید اس کو دکھانے کے لئے آواز دی ہے،(1) بادشاہ آرہا ہے تو میں نے اس کو بلایا ہے؟ آرہا ہے تو میں کیا کروں؟ یہ فقرہ ایسے نہیں ہے یعنی اُن لوگوں کی زندگی میں ان واقعات کو اہمیت

---

(1) دیکھئے ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ ص ۴۲

ہے، بادشاہ کا آنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت وہ آ گیا تو حضرت بیٹھے ہوئے تھے، مجلس میں بادشاہ بیٹھا ہوا ہے، اور یہ ٹانگیں دراز کر کے بیٹھ گئے (جس طرح سے لاپروائی میں اپنے خدام اور ساتھیوں میں انسان بیٹھا ہوتا ہے، اب تو ہم ذرا سنبھل کے بیٹھے ہیں، لیکن بے تکلف ساتھیوں میں جب مجلس ہوتی ہے تو ٹانگیں دراز بھی کر لی جاتی ہیں) تو وہ ٹانگیں دراز کر کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ کے ساتھ ایک درباری مولوی تھا، یہ چمچے اور جھولی چک جو ہوا کرتے ہیں یہ اصل سے زیادہ تیز ہوتے ہیں، اُس کو یہ بات ناگوار گزری کہ بادشاہ بیٹھا ہے اور یہ ٹانگیں دراز کر کے بیٹھ گیا، تو کہتا ہے کہ حضرت! یہ عادت کب سے اختیار کر لی؟ ٹانگیں پھیلانے کی عادت کب سے اختیار کر لی؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''جب سے ہاتھ بغل میں لے لیے'' یعنی جب سے ہاتھ بغل میں لے لیے تو ٹانگیں پھیلانے لگ گئے۔ کیا مطلب؟ کہ جن کے ہاتھ یوں (مانگنے کے لئے) پھیلتے ہیں وہ ٹانگ کیسے پھیلائیں گے؟ اور جن کا ہاتھ بغل میں ہے وہ ٹانگیں پھیلائیں، جو چاہیں پھیلائیں، کسی کو کیا اعتراض ہے؟ جن کا ہاتھ دوسرے کے سامنے پھیلا کرتا ہے وہ کسی کے سامنے ٹانگیں نہیں پھیلایا کرتے، جب ہاتھ بغل میں لے لیے تو ٹانگیں پھیلانے میں کیا حرج ہے؟ تو کہتے ہیں کہ اس وقت سے ٹانگیں پھیلانے کی عادت پڑ گئی جب سے ہاتھ بغل میں لے لیے۔[1] اُٹھتے وقت اس بادشاہ یا رئیس نے، جو بھی آیا تھا، دولت کی ایک تھیلی ہدیہ پیش کی حضرت سلیم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے، انہوں نے واپس کر دی، ٹھکرا دی، کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ وہی درباری مولوی صاحب پھر بولے کہ جی! یہ تو آپ اُوپر اُوپر سے ایسا کرتے ہیں، ورنہ حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ ''یَشِیْبُ الْمَرْءُ وَیَشِبُّ فِیْهِ خَصْلَتَانِ'' انسان جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جاتا ہے، اُس میں دو خصلتیں جوان ہوتی جاتی ہیں، ایک حرص علی المال اور ایک حرص علی العمر۔[2] اور آپ اب بوڑھے ہو گئے تو حدیث شریف کی رُو سے حرص علی المال تو آپ کے اندر جوان ہونی چاہیے، اور آپ اُوپر اُوپر سے ٹھکرا رہے ہیں۔ یعنی مولوی صاحب نے علمی نکتہ بیان کر دیا، حدیث سے استدلال کر لیا کہ اندر اندر حرص ہے، کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جیسے جیسے آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے، تو اس کے اندر حرص علی العمر بڑھتی جاتی ہے، جوان ہو جاتی ہے، اور حرص علی العمر بھی جوان ہو جاتی ہے، تو آپ بوڑھے ہیں، تو بوڑھے ہونے کی صورت میں حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حرص علی المال تو ہے، لیکن اُوپر اُوپر سے جیسے تصنع اور بناوٹ ہوتی ہے، آپ حضرات ظاہر یوں کرتے ہیں کہ جیسے ہمیں مال کی ضرورت ہی نہیں۔ تو حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ فوراً بولے کہنے لگے ''مولوی گشتی و آگاہ نیستی'' (اس زمانے میں مسلمانوں کی زبان فارسی تھی، درباری زبان بھی فارسی تھی) کہ مولوی تو بن گئے ہو لیکن عقل ہوش تمہیں کوئی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''یَشِبُّ فِیْهِ خَصْلَتَانِ'' کہ اس شخص کے اندر دو خصلتیں جوان ہوتی جاتی ہیں، اللہ کے بندے! جوان وہ ہوا کرتا ہے جو پیدا تو ہو، اور یہاں تو اللہ کا فضل ہے کہ حرص پیدا ہی نہیں ہوئی، اُس نے جوان کیا ہونا ہے، اپنی خبر لو، کہ جن کا جوانی میں یہ حال ہے، تو بوڑھے ہو جاؤ گے تو کیا ہوگا۔[3]

---

(۱) دیکھیے خطبات حکیم الامت ج ۳۰ ص ۹۷

(۲) مسلم ۱/۳۳۵، باب کراهة الحرص/ مشکوة ۲/۴۴۹، باب الامل۔ ولفظ الحدیث: یَهْرَمُ ابْنُ آدَمَ وَتَشِبُّ مِنْهُ اثْنَتَانِ الْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمُرِ

(۳) دیکھیے خطبات حکیم الامت ج ۲۲ ص ۲۱۰۔

ایمان وعلم کے قلب پر اَثر انداز ہونے کی علامت

تو جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق صحیح ہوجاتا ہے، پھر واقعہ یہ ہے کہ یہ مال دولت، یہ شان وشوکت انسان کو مرعوب نہیں کرتی، بلکہ ایک روایت مجھے یاد آئی، ''مشکوٰۃ شریف'' کتاب العلم میں آپ کے سامنے آئے گی، جس میں سرورِ کائنات ﷺ نے شرحِ صدر کی علامات بیان فرمائی ہیں، حاصل کچھ اُس کا میں اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں، اس سے بھی یہ بات نکلتی ہے، اور ویسے بھی اہل اللہ کے ہاں یہ بات اس طرح سے بیان کی جاتی ہے، کہ علم کی جو دو قسمیں ہیں ایک علم علی اللسان ہے اور ایک علم فی القلب ہے، ایک علم زبان پر ہوتا ہے اور ایک علم دل میں ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں علم کی دو قسمیں ہیں، اور جو علم علی اللسان ہے صرف زبان تک ہے، یہ تو اللہ کی حجت ہے جس کے ساتھ انسان کو پکڑے گا، اور جو علم فی القلب ہے یہ علم نافع ہے جو انسان کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔[1] اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیسے پتا چلے کہ علم نافع حاصل ہے یا نہیں؟ شرحِ صدر کی کیا علامت ہے؟ کہ دین کے بارے میں شرحِ صدر ہوگیا اور علم قلب پہ اثر انداز ہوگیا، اس کی علامات کیا ہیں؟ (میں اپنے الفاظ میں ذکر کرتا ہوں، یہ مضمون قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے، قرآن کریم میں اس کے ماخذ کی طرف میں اشارہ کردوں گا) یہ پتا کیسے چلے کہ ہمارا ایمان درجۂ حال میں ہے یا نہیں؟ اور ہمارا علم قلب پر اثر انداز ہے یا نہیں؟ اس کا پتا کیسے چلے؟ آخر ضرورت تو آپ حضرات محسوس کرتے ہیں، کہ پہچان ہوجائے کہ ہم کس درجے میں ہیں؟ کہتے ہیں کہ علم کے قلب پر اثر انداز ہونے کی علامت یہ ہے کہ جو لوگ علم اور ایمان سے محروم ہیں چاہے وہ کتنے ہی دُنیادار اور مال ودولت والے کیوں نہ ہوں، جس وقت اُن پر نظر پڑے تو انسان کے دل سے یہ آواز آئے کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، کسی کو اچھے لباس میں کار میں بیٹھا ہوا دیکھ کے تم یہ خیال نہ کرو کہ کامیاب تو یہ لوگ ہیں، اگر دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کامیاب تو یہ لوگ ہیں تو آپ دنیادار ہیں، آپ دین دار نہیں ہیں، آپ کے دل کی تہہ میں دنیا کی محبت ہے۔ اور اگر آپ کسی کو اچھی طرح سے سج دھج کے ساتھ بھی دیکھیں، شان وشوکت کے ساتھ بھی دیکھیں لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ یہ نیکی سے محروم ہیں، اس کو عملِ صالح نصیب نہیں ہے یا اس کو ایمان نصیب نہیں ہے، اور آپ کے پھٹے ہوئے کپڑے ہیں، سوکھا ٹکڑا آپ نے کھایا ہے، چٹائی پہ آپ بیٹھے ہیں، لیکن آپ کا دل یہ کہے کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، معلوم نہیں کہ یہیں سے جاتے ہوئے وہیں چوک میں ٹھا ہوجائے گی (ایکسیڈنٹ ہوجائے گا) اُس کے بعد ان کی نہ کار کام آئے گی نہ لباس کام آئے گا، اگلی زندگی کے لیے انہوں نے کیا بنایا؟ تو یہ خیال دل میں آئے کہ یہ لوگ خسارے میں ہیں، یہ بھولے ہوئے ہیں، ان کا یہ طریقہ صحیح طریقہ نہیں ہے، جو اس سج دھج کے اوپر مر رہے ہیں اور آخرت کی فکر نہیں کر رہے۔ ایک ہے زبان سے کہہ دینا جیسے اس وقت میں بھی بول رہا ہوں، اور ایک ہے کہ قلب کے اوپر یہ حال طاری ہو، اگر قلب کے اوپر حال یہ طاری ہو تو یہ علامت ہے کہ آپ کا ایمان آپ کے قلب میں سرایت کرگیا، اور آپ کا علم آپ پر اثر انداز ہے۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، رقم: ۳۴۳۶۱/ الزھد لابن المبارک، رقم ۱۱۶۱، عن الحسن مرسلاً مرفوعاً/ نیز مشکوۃ ۱/ ۳۷، کتاب العلم کا تقریباً آخر، عن الحسن قولہ۔

یہ مضمون کہاں سے ماخوذ ہے؟ یہ ایسے ہی زبان زوری نہیں، واقعہ ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا ماخذ بہت صریح ہے، 5
اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ قصص کے آخر میں قارون کا واقعہ بیان کیا ہے، اور اس میں یہ الفاظ فرمائے ہیں کہ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ وہ ایک دفعہ اپنی قوم پر اپنی سج دھج میں نکلا، بہت خزانوں کا مالک تھا، دنیا کا بہت ساز وسامان اس کے پاس تھا، اتنے خزانوں کا مالک تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اُس کے خزانوں کی چابیاں بھی اگر چند اشخاص اٹھا کر چلتے تو تھک جاتے، بوجھ محسوس کرتے اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ، اتنے اس کے پاس صندوق اور خزانے تھے کہ اس کی چابیاں اٹھا کر اگر چند لوگ چلتے تو بوجھ محسوس کرتے تھے۔ ایک دفعہ سج دھج کے ساتھ وہ اپنی قوم پر نکلا، جس وقت وہ نکلا تو اُس کو دیکھنے والے اسرائیلی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، ایک تو وہ تھے قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ایک گروہ تو یہ ہو گیا، کہا ان لوگوں نے جو دنیوی زندگی چاہتے تھے یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اے کاش! ہمیں بھی وہ چیز مل جائے جو قارون کو ملی ہے، اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ یہ بہت بانصیب ہے، بڑا اچھے نصیب والا ہے، دیکھو! اس کے پاس کتنا سونا، کتنے خادم، کتنے گھوڑے، کتنے غلام، کتنی جائیداد، اور کیسے سج دھج کے نکل رہا ہے اور کیسی ٹھاٹھ باٹھ ہے۔ یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اے کاش! کہ ہمیں بھی یہ چیز مل جائے جو قارون کے پاس ہے اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ یہ بہت صاحب نصیب ہے، یہ کن لوگوں نے کہا؟ اَلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ تو معلوم ہو گیا کہ کسی دُنیا دار کو دیکھ کے اس قسم کی تمنائیں دل کے اندر پیدا ہونا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اس کے دل میں دنیا کی چاہت ہے۔ جس وقت یہ قوم للچائی اور ان کے منہ سے پانی ٹپکا، قارون کو دیکھ ان کی رال ٹپکی، تو دوسرا فریق قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ، اب اَلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا کے مقابلے میں اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ہے، کہا ان لوگوں نے جو علم دیے گئے تھے وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ: وَیْلَكُمْ یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے ہم گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں، تمہارا ستیاناس ہو جائے تم نے یہ کیا کہنا شروع کر دیا، ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ اللہ کا بدلہ جو اللہ کی طرف سے ملے گا وہ بہتر ہے اس سونے چاندی سے، اس سج دھج سے۔ یہ اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کی بات ہوئی۔ دیکھو! اس سے یہ بات نکل آئی کہ علم والے وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جو دنیا داروں کی ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے کے بعد یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ نہ کہیں، کہ ہمیں ایسا مل جائے جیسے یہ ہیں، بلکہ فوراً اُن کے دل کی آواز یہ ہو کہ یہ کوئی چیز نہیں، ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ اللہ کی طرف سے جو ثواب ملے گا وہی بہتر ہے۔ تو یہ اَلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا کے مقابلے میں اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کا قول آ گیا۔ تو یہ ماخذ ہے اس سارے بیان کا جو میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، کہ علم والے حقیقت کے اعتبار سے وہ ہیں کہ دنیا کی سج دھج دیکھ کے اُن کی آنکھیں چندھیاتی نہیں، اُن کی زبان رال نہیں ٹپکاتی، بلکہ اپنے ایمان اور علم کی اتنی قدر وقیمت وہ جانتے ہیں، کہ اُس کے مقابلے میں سونے کے پہاڑ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اگر تو یہ کیفیت قلب میں آ جائے تو پھر انسان کا ایمان محفوظ ہوتا ہے، پھر وہ کسی فتنے میں نہیں پڑتا، اور جب تک دنیا کی محبت دل کے کسی کونے میں بھی چھپی ہوئی ہو تو کسی وقت بھی آپ بازاری چیز بن کے بک جائیں گے، دوسرا کوئی آپ کو خرید لے گا، اگر دل کے کسی کونے کے اندر بھی دنیا کی محبت ہے تو آپ ایک بازاری مال ثابت ہو سکتے ہیں، جس وقت کوئی چاہے گا آپ کو پیسے دے کر آپ سے غلط فتویٰ لے لے، جب کوئی چاہے گا آپ کو پیسے دے کر آپ سے کوئی غلط کام کروا لے،

آپ علم کے زور سے پھر باطل کی حمایت میں نکل جائیں گے، اور آپ اور آپ کا علم ایک بازاری چیز اور بکاؤ مال ہوگا، جیسے بازار میں گاجریں مولیاں بکتی ہیں، اسی طرح سے آپ بھی بکیں گے، اگر دل کے کسی کونے کے اندر بھی دنیا کی عظمت ہے۔

دُنیوی زندگی میں اَمیر، غریب کا کوئی فرق نہیں، صرف سوچ کا فرق ہے

اس لیے ایمان کی حفاظت بھی اسی میں ہے کہ انسان کے دل میں دنیا کی عظمت نہ ہو، آخرت کی عظمت ہو، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ جتنا دے اُس پر انسان شکر کرتا چلا جائے، وقت ہر کسی کا گزر جائے گا، جس طرح سے ایک دفعہ ہمارے ایک ساتھی دو شعر نقل کر رہے تھے، اب شعر ہمیں آتے تو ہیں نہیں، ٹوٹے پھوٹے جیسے ہیں مضمون ادا ہوجاتا ہے، کہ:

عمر اک دن ہو یا سو سال، گزر جاتی ہے — کندھے پر گدڑی ہو یا شال، گزر جاتی ہے

اگر امیروں کی بااقبال گزر جاتی ہے — تو غریبوں کی بھی بہرحال گزر جاتی ہے

یہ تو گزر ہی جاتی ہے، اس نے تو اپنا وقت گزار ہی لینا ہے، دیکھنا تو یہ ہے کہ آگے نتیجہ کیا ہے، کامیابی اور ناکامیابی کا مدار مرنے کے بعد کے حالات پر ہے، ورنہ موت تک آپ کی اور اُن کی زندگی برابر ہے۔

کل پرسوں ہی ہم آ رہے تھے عباسی صاحب[1] کے ساتھ، اور ڈاکٹر یاسین صاحب بھی تھے، راستے میں اس قسم کی گفتگو شروع ہوگئی، تو میں ان کی خدمت میں یہی عرض کیا، میں نے کہا دیکھو! ایک ذہنی مغالطہ بہت زبردست ہے کہ جس کی الماری میں پیسے ہوں وہ کہتا ہے کہ میں مال دار ہوں، میں نے کہا یہ بہت بڑا مغالطہ ہے، انسان کا دماغ اوپر کو چلا جاتا ہے، ورنہ میں پوچھتا ہوں کہ کیا امیر بیمار نہیں ہوتے؟ انہوں نے کہا کہ ہوتے ہیں، میں نے کہا امیر بھی بیمار ہوتے ہیں غریب بھی بیمار ہوتے ہیں۔ کیا امیر مرتے نہیں ہیں؟ تو اَمیر بھی مرتے ہیں، غریب بھی مرتے ہیں، جیسے قلعوں سے جنازے نکلتے ہیں، جھونپڑیوں سے بھی نکلتے ہیں، جیسے کوٹھیوں سے نکلتے ہیں، کچے کوٹھوں (مکانوں) سے بھی نکلتے ہیں، اور میں نے کہا: جہاں تک فاقے کا تعلق ہے (اتفاق ایسا تھا کہ اس دن ہم نے دو پہر کا کھانا بھی کہیں نہیں کھایا، اس دن ہمارا عملاً فاقہ تھا، کہیں کھانا کھانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا) میں نے کہا جہاں تک فاقے کا تعلق ہے، اگر اللہ نے آپ کی قسمت کے اندر رکھا ہے تو آپ ایسے حالات میں پھنس جائیں گے کہ روٹی کھانے کا موقع ہی نہیں ملے گا، یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ نہ سمجھیں لیکن آپ کی قسمت میں فاقہ تھا، اللہ نے کرا لیا۔ تو فاقہ غریب کو بھی آتا ہے، اَمیر کو بھی آتا ہے۔ بظاہر آپ کہیں گے کہ امیر لذیذ چیزیں کھاتا ہے، تو اتنا بیمار بھی زیادہ ہوتا ہے، ساتھ اسے ڈاکٹر کو فیس بھی زیادہ دینی پڑتی ہے، غریب آدمی کو اگر مہینے میں ایک دفعہ جانا پڑتا ہے تو اَمیر کے سرہانے ہر روز ڈاکٹر کھڑے ہوتے ہیں، اس لیے میں نے کہا: اگر حقیقت سمجھو تو کوئی فرق نہیں دُنیوی زندگی میں، صرف نظر کے دیکھنے کا اور دل کے سوچنے کا فرق ہے...... میں نے کہا: حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات ہمیں تو ایسی شاندار معلوم ہوئی کہ سونے کے پانی کے ساتھ لکھنے کے قابل ہے، حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے دل کو سمجھا لیا ہے، کہ یہ سارا سہارن پور کا بازار میرا ہے، اور یہ جتنے

(۱) الحاج غلام محمد عباسی صاحب، مہتمم جامعہ باب العلوم کہروڑپکا، اور الحاج ڈاکٹر غلام یاسین صاحب جامعہ کے نائب مہتمم تھے اب وفات پا چکے ہیں۔

کام کرنے والے ہیں یہ سب میرے نوکر ہیں، اور جتنی ضرورت ہوتی ہے میرے پاس آ جاتا ہے، باقی کا انتظام وہ کرتے ہیں میں نے کہا اہل اللہ کا حال بالکل یہی ہوتا ہے کہ ساری دنیا ان کی ایک قسم کی خادم ہے، اور سارے اُن کے نوکر ہیں، اُن کی کوئی ضرورت اٹکی نہیں ہے، انتظام اُن کے ذِمّے ہے نہیں۔ دُکانیں تم چلاؤ، کاشت تم کرو، زمین داریاں تم کرو، بقدرِ ضرورت ہمارے پاس آئے گا، باقی انتظام تمہارے ذِمّے۔ میں نے کہا یہ صرف ایک نظر کا مغالطہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق دے دے تو خدا کی قسم جتنا اِستغناء دِین میں ہے، اتنا اِستغناء کسی چیز سے آتا ہی نہیں۔ لیکن بات وہی ہے کہ ہم کبھی ان حقائق پر غور نہیں کرتے، اور یہ زبان کی لذت اور پیٹ کا تنور انسان کو کچھ سمجھنے نہیں دیتا، اور کسی چیز کا حقیقت تک پہنچنے نہیں دیتا۔ پیٹ کی آگ بھڑکتی ہے تو انسان کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، آنکھ للچاتی ہے تو کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، زبان سے رال ٹپکتی ہے تو انسان کا کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، عقل اور دماغ کے تقاضے سارے کے سارے چھپ جاتے ہیں۔ بس یہ حقیقت اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دے دے تو دِین میں جتنا اِستغناء کسی چیز میں نہیں ہے۔ یہ دُنیا برابر سرابر گزرتی ہے، آپ بالکل خیال نہ کریں کہ اُن کی زیادہ آرام سے گزرتی ہے، وہ آپ سے زیادہ پریشان ہیں اور آپ سے زیادہ تکلیفوں میں ہیں، تم صبح اُٹھتے ہو، بڑی فراغت کے ساتھ بیت الخلا میں ہو آتے ہو، اور جن کو بیت الخلا میں جانے کے لئے بھی پتا نہیں کتنی دوائیاں کھانی پڑتی ہیں وہ خوش ہیں کہ ہم بڑے دولت مند ہیں، اور جن کو یہ نعمتیں مفت میں حاصل ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دولت مند نہیں ہیں۔ پہلے وہ کھانے پر خرچ کرتے ہیں، پھر نکالنے پر خرچ کرتے ہیں، تمہارا نہ کھانے پہ خرچ ہو، نہ نکالنے پر خرچ ہو، ساری نعمتیں مفت میں حاصل ہیں۔ تو یہی بات یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ واضح کررہے ہیں، بات لمبی ہوگئی، بلا وجہ ہی پھیل گئی۔ یہ بات صرف لفظوں تک نہیں ہے، ان میں جب آپ غور کریں گے اور یہ باتیں جب قلب پر اثر انداز ہوں گی تو تمہیں پتا چلے گا کہ دِین کتنی بڑی نعمت ہے۔

''اِستدراج'' اور اس کا مفہوم

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، ہم اُن کو آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ لیے جارہے ہیں، ایسی جگہ سے کہ جہاں سے اُن کو پتا ہی نہیں، یعنی وہ درجہ بدرجہ جا تو رہے ہیں ہلاکت کے گڑھے کی طرف، اور اُن کو پتا ہی نہیں کہ ہم ہلاکت کی طرف جارہے ہیں۔ ایک سپاہی ہے، وہ سپاہی ہونے کے زمانے میں خوب رشوت لیتا ہے، سپاہی ہونے کے زمانے میں بڑی غلط حرکتیں کرتا ہے، تو اُس کی ترقی ہو جاتی ہے کہ وہ حوالدار بن گیا ہے، اب آپ جانتے ہیں کہ حوالدار کے لیے رشوتیں لینے اور خباثتیں کرنے کا موقع زیادہ ہے بمقابلہ سپاہی کے، اب جس وقت وہ حوالدار بن گیا تو اُس کے لیے اور راستے کھل گئے، پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو گیا، وہ سمجھتا ہے کہ میں ترقی کی طرف جارہا ہوں، اور حوالدار ہونے کے بعد جس وقت اس قسم کی خباثتیں کرتا ہے، شرارتیں کرتا ہے تو بعد میں اس کو تھانیدار بنا دیا جاتا ہے، اب تھانیدار کے لیے جتنے مواقع ہیں اتنے حوالدار کے لیے نہیں تھے، اُس کی اس خباثت کے اندر ترقی ہوتی چلی جارہی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں ترقی کے درجات طے کر رہا ہوں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے اس کو ہلاکت اور خرابی کی طرف اور عذاب کی طرف لے جایا جارہا ہے، یہی اللہ تعالیٰ کا سب

سے بڑا ابتلا ہے، کہ انسان جا رہا ہو ہلاکت کی طرف اور وہ سمجھے کہ میں ترقی کرتا جا رہا ہوں، اس کو کہتے ہیں استدراج۔''استدراج'' کا مفہوم ہوتا ہے رَسّی ڈھیلی چھوڑ دینا، اور کسی کو بُرائیوں اور گناہوں کے باوجود نوازتے چلے جانا، یہ ہے جس سے انسان درجہ بدرجہ ہلاکت کی طرف جاتا ہے، آپ نے ایک غلطی کرلی اور میرے علم میں آ گئی، میں نے اُسی وقت ایک تھپّڑ لگا دیا اور آپ کو سزا دے دی، تو ہوسکتا ہے کہ آپ اس غلطی سے باز آ جائیں، اس غلطی میں آئندہ ترقی نہیں کریں گے، لیکن اگر آپ کی غلطیوں پر اسی طرح نوازشیں جاری رہیں، تو آپ سمجھیں گے کہ یہ تو بس ایسے ہی ہے، تو آج ایک کی ہے، کل کو دو کرو گے، پرسوں کو تین کرو گے، پھر چار کرو گے، پھر خباثت کا جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے جب انسان دیکھتا ہے کہ اس کے باوجود میرے اوپر نوازشات کی بارش ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کسی نے پوچھنا ہی نہیں۔ اور بسا اوقات معاملہ یوں ہوتا ہے کہ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ سخت پکڑنا ہے، کہ پھر یہ چھوٹنے ہی نہ پائے، اگر پہلی غلطی پہ پکڑ لیا تو وہ کہے گا، کہ جی! پہلا موقع ہے مجھے معاف کر دو، اور جس وقت دس کی فہرست پوری ہو جائے گی اس کے بعد پکڑیں گے تو اس کے بعد یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ پہلا موقع ہے۔ تو سخت گرفت کرنے کے لیے اس کی رَسّی تھوڑی سی ڈھیلی کردی، کہ ذرا آگے اور بڑھ جائے، تھوڑا سا اور بڑھ جائے، جب اس کی خباثتیں اتنی ہو جائیں گی اور اتنی طویل فہرست ہو جائے گی کہ پھر جس وقت وہ گرفت میں آئے گا تو اس کے پاس عذر کوئی نہیں ہوگا، بسا اوقات یوں رگڑا نکالنے کے لیے رَسّی ڈھیلی چھوڑی جاتی ہے، تو اللہ کہتا ہے میں نے بھی ان کی رَسّی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے! معلوم نہیں آپ حضرات کا ذوق کیسا ہے، کیسا نہیں ہے؟ کبھی مچھلی کے شکاری مچھلی پکڑتے ہوئے دیکھے ہیں؟ وہ کانٹے کے اوپر گوشت یا کوئی کیڑا لگا کے پانی میں پھینکتے ہیں، اور مچھلی آ کے منہ مارتی ہے، تو جو تجربہ کار شکاری ہوتا ہے وہ ڈور جلدی سے نہیں کھینچتا، بلکہ وہ ڈور ڈھیلی چھوڑتا ہے تا کہ وہ اچھی طرح سے نگل لے، اور جس وقت وہ اچھی طرح سے نگل جاتی ہے تو پھر چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اگر منہ لگاتے ہی وہ ڈور کو جھٹکا دے دے تو پھر ہوسکتا ہے کہ وہ مچھلی بچ جائے، لیکن جب وہ نگل گئے اور نگلنے کے بعد جھٹکا تو پھر جان لیوا ہے، اسی مضمون کو کسی اُردو شاعر نے ان الفاظ میں نقل کیا کہ ۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

تو یہ حساب ہوتا ہے، مچھلی تو خوش ہے کہ دیکھو! مجھے کتنا شاندار لقمہ مل گیا۔ تو بسا اوقات یہ ڈور ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہوتی ہے، یہ اس لیے ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہوتی ہے کہ کانٹا اچھی طرح سے اندر چلا جائے، اور بعد میں جس وقت جھٹکا لگے گا تو چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، اس لیے اگر کسی شخص کو دیکھو! کہ بدمعاشی کے باوجود، گناہوں میں ملوث ہونے کے باوجود، نیکی نہ کرنے کا باوجود اللہ تعالیٰ اس کو خوب کھلا رہا ہے، خوب پلا رہا ہے، لباس کیا، دولت کیا، اور اس قسم کی دوسری چیزیں عزت جاہ دنیا کے اندر اس کو دن بدن حاصل ہوتی جا رہی ہے، باوجود اس کی بدکاریوں کے، باوجود اس کی بدمعاشیوں کے اس کے اوپر نوازشات کی بارش دیکھو تو سمجھو کہ یہ شخص استدراج کا شکار ہو گیا ہے، اب یہ رُکے گا نہیں، اب یہ اُس حد تک جائے گا کہ جب اللہ کی گرفت آئے گی تو پھر اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اور ایک آدمی ایسا ہے کہ غلطی کرتا ہے اور فوراً پکڑا جاتا ہے، تنبیہ ہو جاتی ہے، آپ نے ایک غلطی کی اور

اس کے نتیجے میں آپ کو کوئی مالی نقصان پہنچ گیا، آپ نے ایک گناہ کیا اور اس کے نتیجے میں آپ کو بخار آ گیا اور آپ سمجھتے ہیں کہ دیکھو! آج ہی یہ غلطی کی تھی آج ہی رگڑے میں آ گئے، تو یہ تنبیہ ایسی ہوگی کہ آئندہ آپ کو اس غلطی سے بچا لے گی، یہ اللہ کی توفیق ہے۔ ''ہم ان کو درجہ بدرجہ لیے جا رہے ہیں ایسی جگہ سے جہاں وہ جانتے بھی نہیں۔'' وَاُمْلِیْ لَهُمْ: اور میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں، یہ ڈور ڈھیلی چھوڑی ہے، اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ: میری تدبیر بڑی مضبوط ہے، میں جب پکڑتا ہوں تو ایسی مضبوط تدبیر کے تحت پکڑتا ہوں کہ یہ پھر اس کی تلافی نہیں کر سکتے، تدارک نہیں کر سکتے۔

تدبر و فکر کی دعوت

اب آگے ان کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے (جیسے هُمُ الْغٰفِلُوْنَ کا ذکر آیا تھا) اللہ تعالیٰ متنبہ کرتے ہیں اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ، جس میں رسالت کا مضمون بھی آ جائے گا، اور آگے معاد کا مضمون آ رہا ہے قیامت کے تذکرے کے ساتھ، اور قرآنِ کریم میں یہ بنیادی مضامین توحید رسالت معاد، یہ خلط ملط ہو کے آپ کے سامنے آتے رہتے ہیں، کئی دفعہ یہ طرز آپ پر واضح کیا ہے۔ کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ ان کے ساتھ رہنے والا، اس کو کوئی جنون نہیں ہے کہ یہ جو ہر وقت سمجھانے کے لیے ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ صاحب سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ ان کو کوئی جنون نہیں ہے کہ جنون کی وجہ سے ایسی حرکتیں کرتے ہوں، اگر یہ تفکر کریں تو خود سمجھ میں آ جائے کہ جس شخص نے اتنی زندگی ان میں گزاری ہے، جس کی عقل اور فراست پر ان کو اتنا اعتماد تھا، اور آج بھی اگر یہ وعظ کہنا چھوڑ دیں، اس وعظ کے علاوہ زندگی کے کسی شعبے میں کسی بات پر ان کو اعتراض نہیں ہے۔ ہر بات، ہر عمل، ہر کردار بالکل نپا تلا، جس میں کسی بھی نقص کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، اس وعظ کو چھوڑنے کے بعد ساری کی ساری قوم مداح ہے، اور کوئی نقص نہیں، تو بھلا دیوانے ایسے ہوا کرتے ہیں، ان کا تو کوئی قول اور کوئی عمل کسی معیار پہ نہیں ہوتا، جانور اور دیوانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ تو کیا یہ سوچتے نہیں؟ اگر یہ سوچیں تو ان کی سمجھ میں یہ بات آ جائے، کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے، وہ تو واقعی نذیر ہے کھلم کھلا، جو ان کو عذاب سے ڈراتا ہے، اور ان کا بھلا اسی میں ہے کہ یہ اس چیز سے ڈر جائیں جس سے وہ ڈراتا ہے، اگر غور کریں تو انہیں سمجھ میں آ جائے کہ اس کی عقل میں نقص نہیں ہے، بہت سمجھدار ہیں، ہر طرح سے عقل مند ہیں، اور یہ بات جو انہیں کہتے ہیں یہ ان کے منصب کا تقاضا ہے، یہ کوئی جنون نہیں ہے، اس کو مجنون کی بڑ نہ سمجھیں، یہ حقیقت ہے، اور یہ صریح طور پر ڈرانے والا ہے، اگر یہ غور کریں تو انہیں یہ بات سمجھ میں آ جائے، کیا یہ دیکھتے نہیں آسمان اور زمین کی سلطنت میں، اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو دیکھیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مناظر دیکھیں اس میں غور کریں، اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے، اس میں غور کریں تو اس سے ان کو توحید سمجھ میں آئے، اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے ذہن میں آئے، جس اللہ کی عظمت سے یہ رسول انہیں ڈراتا ہے، اگر ان کو واقعات میں غور کرنے کا موقع ملے یہ غور کریں تو ساری چیزیں ان کی سمجھ میں آ جائیں، کیا یہ اس بات کو سوچتے نہیں؟ کہ شاید ان کا وقت بھی قریب آیا ہوا ہو، یہ چیزیں غور و فکر کی ہیں، آج یہ دندناتے پھرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ وقت سر پہ کھڑا ہے، یہ ہنستے پھرتے ہیں دولتیاں مارتے پھرتے ہیں اور موت سر پہ کھڑی ہے، اس بات میں کبھی انہوں نے غور نہیں کیا؟ ان کے پاس کوئی سرٹیفکیٹ ہے کہ

ہم نے اتنی دیر تک زندہ رہنا ہے؟ موت سر پہ کھڑی ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت کی آیات ان کے ارد گرد محیط ہیں، ڈرانے والا ان کے سامنے موجود ہے اس کے باوجود سرکشی کررہے ہیں۔ اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یہ ہے جسے آپ دعوتِ فکر کہتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں غور کریں جو زمین و آسمان میں ہے، اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا اس میں غور کریں، اور اس بات کو سوچیں کہ شاید ان کا وقت قریب آیا ہوا ہو، اس طرح سے اگر یہ تدبر اور تفکر کریں گے، نظر وفکر سے اگر کام لیں گے تو ان کو ہدایت حاصل ہوسکتی ہے۔ اور اگر اتنا ان کو سمجھانے کے ساتھ بھی یہ نہیں سمجھتے تو فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ تو اس کتاب کے بعد، اس قرآن کے بعد جس میں اتنے حقائق واشگاف کیے گئے ہیں، وہ کون سی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے۔

ہر کیفیت اور ہر حال کا خالق اللہ ہے لیکن اِنسان مجبور نہیں ہے

آگے سرورِ کائنات ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ آپ تو سمجھانے میں کمی نہیں کرتے، لیکن ان کی قسمت کھوٹی ہے کہ آخر نتیجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھٹکا دے اُس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ بھٹکاتا کس کو ہے؟ جو بھٹکنے کے اُصول اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں، جو اُن کو اپنائے گا تو نتیجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوجاتا ہے، جیسے آپ کہیں کہ زہر اور سنکھیا اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جو زہر کھالے وہ مرجاتا ہے، موت بھی اللہ دیتا ہے، لیکن اس کے درمیان میں تھوڑا سا آپ کے عمل کا واسطہ ہے، ہم کہیں گے کہ جو زہر کھاتا ہے مرجاتا ہے یوں بھی کہنا ٹھیک ہے، اور یوں کہنا بھی ٹھیک ہے کہ جو زہر کھالے اللہ اُسے موت دے دیتا ہے، لیکن جتنا اختیار انسان کا آپس میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضلالت کے اصول واضح کردیے کہ یہ گمراہی کے راستے ہیں، جو شخص اُن کے اوپر اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ وہیں گمراہی نمایاں کردیتے ہیں، چونکہ خالق ہر چیز کا اللہ ہے اس لیے خلق کے اعتبار سے نسبت اللہ کی طرف ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے ہدایت کا راستہ واضح کردیا، اب اگر آپ اس راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے تو آپ پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے آثار پیدا فرمادیں گے، جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ حقیقت بھی اتنی واضح ہے کہ جس وقت بھی کسی دوراہے پر آپ کھڑے ہوں تو وہاں سوچ لیا کرو کہ آپ کو قدم اِدھر بھی اُٹھانے کی اجازت ہے، اُدھر بھی اُٹھانے کی اجازت ہے، اِدھر کو اُٹھالو گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت کرتا چلا جارہا ہے، اُدھر (دُوسری طرف) کو اُٹھالو گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو گمراہ کرتا جارہا ہے، اللہ کی طرف نسبت ہے باعتبار خلق کے، ورنہ آپ ہر قدم پر سوچتے جائیے، آپ کو آگے بڑھنے کا بھی اختیار ہے، پیچھے ہٹنے کا بھی اختیار ہے، لیکن ہر کیفیت اور ہر حال کا چونکہ خالق اللہ ہے، اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق نہیں، اس لیے نسبت اللہ کی طرف ہے، تو گمراہ اللہ کن کو کرتا ہے؟ جو گمراہی کے اُصول اپناتے ہیں، ہدایت اللہ کن کو دیتا ہے؟ جو ہدایت کے اُصول اختیار کرتے ہیں، دیتا اللہ ہے لیکن آپ کے عمل کے درمیان میں آپ کے ارادے اور اختیار کا واسطہ آجاتا ہے۔ ''جس کو اللہ بھٹکا دے اُس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی سرکشی میں کہ یہ بھٹکتے پھرتے ہیں، حیران پریشان پھرتے ہیں'' عمہ دل کے بے بصیرت ہوجانے کو کہتے ہیں۔

اِسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ

آگے معاد کا تذکرہ آ گیا ..... یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا: آپ سے ساعت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ یہ اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ ہے، سرورِ کائنات ﷺ جہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا وعظ کہتے تھے، اور اپنی رسالت کا عقیدہ پیش کرتے تھے، دو بنیادی عقیدے یہ ہوگئے، تیسرا یہ عقیدہ ہے، کہ ایک وقت آئے گا کہ سارا عالم فنا ہونا ہے، فنا ہونے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھنا ہے، یہ تیسرا بنیادی عقیدہ ہے، توحید کی طرح اس کی اہمیت ہے، رسالت کی طرح اس کی اہمیت ہے، جو شخص معاد کا قائل نہیں، چاہے وہ توحید و رسالت کا قائل ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔ تو جس وقت حضور ﷺ یہ بیان فرماتے کہ جس طرح سے یہ عالم پہلے نہیں تھا، اللہ نے بنا دیا، اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ اس کو ختم کر دیا جائے گا، دوبارہ پھر اُٹھیں گے۔ اس کا وہ سب سے زیادہ مذاق اُڑاتے تھے، یہ بات اُن کی سمجھ نہیں آتی تھی، وہ یہی کہتے کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ ہمیں اس کا وقت بتاؤ؟ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم میرے رَبّ کے پاس ہے، علم الساعۃ میرے رَبّ کے پاس ہے، لیکن علم الساعۃ سے مراد ہے اس کے وقوع کے وقت کا علم، ورنہ ساعت کا علم کہ قیامت آئے گی اور اس میں یہ کیفیات ہوں گی، یہ حالات طاری ہوں گے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے بتائے بھی ہیں، اور سرورِ کائنات ﷺ نے لوگوں کو سنائے بھی ہیں۔

لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ: نہیں ظاہر کرے گا اس کو اس کے وقت پر مگر وہی، ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: وہ بہت بڑا حادثہ ہے زمین اور آسمان میں۔ ''نہیں آئے گا تمہارے پاس مگر اچانک''۔ اچانک کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں توقع نہیں تھی کہ آج قیامت آنے والی ہے، اور وہ آ جائے گی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب قیامت آئے گی تو دنیا عام اپنے حالات اور معاملات میں لگی ہوئی ہوگی، جس طرح آج یہ حالات ہیں کہ آپ دُکان پر جا کے بیٹھتے ہیں، دُکان دار سے کپڑا پوچھتے ہیں کہ یہ کپڑا کیا بھاؤ ہے؟ وہ کپڑا آپ کے سامنے پھیلا دیتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی نے کپڑا پھیلایا ہوا ہوگا، اور اس کو لپیٹنے نہیں پائے گا کہ قیامت آ جائے گی، ایک آدمی نے اپنی اُونٹنی کا دُودھ نکالا ہوگا، لیکن پینے کی نوبت نہیں آئے گی کہ قیامت آ جائے گی، ایک آدمی اپنے حوض کو دُرست کر رہا ہوگا لیکن اُس میں پانی بھرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ قیامت آ جائے گی، ایک آدمی نے روٹی کھا رہا ہوگا، اس نے لقمہ اُٹھایا ہوا ہوگا لیکن منہ میں ڈالنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ قیامت آ جائے گی۔[1] ان سب آثار کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اپنے معمول کے مطابق عمل میں لگی ہوئی ہوگی، کوئی روٹی کھا رہا ہوگا، کوئی پانی پی رہا ہوگا، کوئی دُودھ نکال رہا ہوگا، کوئی دُکان پہ کپڑے بیچ رہا ہوگا، کوئی خرید رہا ہوگا، اچانک اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وہ صور پھونکا جائے گا اور یہ دُنیا تباہ و برباد ہو جائے گی، یہ نہیں کہ پہلے پتا ہو کہ دس دِن کے بعد آئے گی، پانچ دِن کے بعد آئے گی، ایک مہینہ باقی رہ گیا، ڈیڑھ مہینہ باقی رہ گیا، یہ علم اللہ نے کسی کو نہیں دیا۔

---

(۱) بخاری ۲/ ۹۶۳ باب قول النبی بعثت انا والساعۃ/ مشکوۃ ۲/ ۴۶۵ باب الملاحم کی پہلی حدیث۔

قیامت کے وقوع کے علم کو مخفی رکھنے میں حکمت

لیکن اس علم کے نہ ہونے کو انکار کا ذریعہ بنالینا پرلے درجہ کی بدبختی ہے، بسا اوقات کسی چیز کا مخفی رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے، اس کو میں آپ کے سامنے ایک مثال سے سمجھاتا ہوں تاکہ بات ذہن نشین ہو جائے، آپ کو اپنی موت کا یقین ہے کہ یہ آئے گی؟ (جی) کوئی ایسا بھی ہے جو یہ کہے کہ میں نے نہیں مرنا؟ (نہیں) بالکل یقین ہے؟ (جی) پختہ؟ (جی) لیکن کسی کو اپنی موت کے وقت کا پتا ہے؟ (نہیں)۔ اب کوئی کہے کہ جب مجھے کوئی ڈاکٹر نہیں بتا سکتا، کوئی مجھے طبیب نہیں بتا سکتا کہ میں نے کتنے مہینوں اور کتنے دن کے بعد مر جانا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے ہی افواہ ہے، مرنا مُرنا کوئی نہیں۔ جیسے یہ حماقت ہے ویسے اس دنیا کے متعلق حماقت ہے، یقینی ہے لیکن وقت معلوم نہیں، وقت معلوم نہ ہونے میں ہماری مصلحت ہے، کیوں؟ کہ اگر وقت آپ کو بتا دیا جائے کہ آپ نے اس ہفتے بدھ کے روز عصر کے بعد مر جانا ہے، تو اس کے بعد لوگوں پر دو قسم کے حال طاری ہوں گے، بعض تو لاپروا قسم کے ہوں گے وہ کہیں گے ابھی تو تین دن باقی ہیں کوئی بات نہیں کھا پی لو۔ اور بعض پر ایسی ہیبت طاری ہوگی، کہ وہ آج ہی رونے دھونے بیٹھ جائیں گے، گویا کہ موت آ ہی گئی، دُنیا کا نظم سارا درہم برہم ہو جائے گا، دونوں باتیں ہی خطرناک ہیں۔ جس چیز کا وقت متعین نہ ہو کہ معلوم نہیں کب آ جائے، ایک تو اگر اس سے کوئی خوف کھانا چاہے تو یہ زیادہ ڈرنے کی بات ہے، اگر آپ کو فکرِ آخرت ہے تو آپ یہ سوچیں گے کہ ہر وقت تیاری رکھو، پتا نہیں کب آ جائے، اور اگر آپ کو بتا دیا جائے کہ ابھی تو آپ کے دس سال باقی ہیں، تو آپ کہیں گے چلو آخری سال توبہ واستغفار کے لیے، نو سال عیاشی کے لیے، لیکن اب جب پتا ہی نہیں کہ کس وقت آ جائے تو اب آپ کہہ سکتے ہیں؟ کہ چلو یہ گناہ کر لو، یہ کوتاہی کر لو، بعد میں توبہ کر لیں گے، ہو سکتا ہے توبہ کی مہلت ہی نہ ملے، اور مرنا آپ سب نے ہے، پتا نہیں گھنٹے کے بعد مر جائیں، لیکن وقت متعین نہ ہونے کی بنا پر ایسا استحضار آپ کو نہیں ہے کہ آج ہی آپ کا کھانا پینا چھوٹ جائے، ورنہ پتا ہو کہ دس دن کے بعد مر جانا ہے، پندرہ دن کے بعد مر جانا ہے تو آج ہی ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جاؤ گے اور کام سارے کا سارا مختل ہو جائے گا۔ ہر شخص اسی تمنا پر کام کرتا چلا جا رہا ہے کہ پتا نہیں میری زندگی کتنی لمبی ہے اور میں نے کتنا فائدہ اُٹھانا ہے، اس لیے دنیا کی نقل وحرکت ساری کی ساری جاری ہے۔ تو موت کا وقت متعین ہو جانے کی صورت میں دونوں قسم کی خرابیاں آ سکتی ہیں، بعض میں لاپروائی آ جائے گی، بعض پر اتنا خوف مسلط ہو جائے گا کہ کسی کام کے نہیں رہیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جو اس کو مخفی رکھا ہے اس مخفی رکھنے کی وجہ سے ہی آپ کی یہ نقل وحرکت اور کاروبار اور اس قسم کی چیزیں سب جاری ہیں، ورنہ انسان کہے گا کہ میں نے تو کھانا نہیں، میں نے تو اس سے فائدہ اٹھانا نہیں، میں یہ کام کیوں کروں؟ اور کوئی یوں سوچے گا کہ ابھی تو اتنے دن باقی ہیں، کر لو جو کچھ کرنا ہے، اس کے بعد اپنے آپ کو سنبھال لیں گے، تو یہ نظم ونسق جو قائم ہے موت کا دن متعین ہو جانے کی صورت میں اس میں بڑا خلل آتا۔ تو جیسے اللہ تعالیٰ نے شخصی موت کے وقت کو مخفی رکھا ہے، اور یہی چیز آپ کے لیے مصلحت اور حکمت ہے، تو

عالم کی موت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح سے مخفی رکھا ہے اور اسی میں مصلحت ہے۔ جب وہ آئے گی اچانک آئے گی۔

''آپ سے ایسے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کے متعلق تحقیق کرنے والے ہیں'' کہ آپ نے تحقیق کرلی، پورے محقق بن گئے، اب وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ ہمیں بھی بتادیں، تو جب آپ کو اس کے وقت کی تحقیق نہیں تو ان کو سوال کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ صاف صاف کہہ دیجئے کہ اس کا علم میرے اللہ کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ بعض باتوں کا مخفی رہنا ہی اللہ کی حکمت کے کا تقاضا ہے، وہ بے علمی کی وجہ سے اس قسم کے سولات اٹھاتے ہیں، ان کو علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقت کی تعیین کسی کو نہیں بتائی، اور اسی طرح بعض چیزوں کو مخفی رکھنا ہی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کے پاس ہر چیز کا علم اور مستقل اختیار نہیں تھا

''آپ کہہ دیجئے کہ میں اختیار نہیں رکھتا اپنے نفس کے لیے حصولِ نفع کا نہ دفع مضرت کا مگر جو اللہ چاہے'' جتنا اللہ چاہے اتنا اختیار حاصل ہوگا، ورنہ میرے بس میں کچھ نہیں۔ ''اگر میں عالم الغیب ہوتا تو میں بہت ساری خیر اکٹھی کر لیتا اور مجھے کبھی برائی نہ پہنچتی'' کہ مجھے پتا ہوتا کہ اس کام کا نتیجہ غلط نکلے گا، میں وہ کام نہ کرتا، حالانکہ میری زندگی بھی شاہد ہے کہ اس قسم کے واقعات ہوجاتے ہیں، کہ جس میں نتیجہ جب سامنے آتا ہے تو نقصان بھی ہوتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اگر پہلے پتا ہوتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ جیسے سرورِ کائنات ﷺ جب حج پہ تشریف لے گئے ہیں، تو مدینہ منورہ سے ہدی ساتھ لے گئے تھے، اور بعد میں حالات کچھ ایسے ہوگئے، کہ آپ نے لوگوں کہا جن کے پاس ہدی نہیں ہے، وہ حلال ہوجائیں، احرام کھول دیں، اور جن کے پاس ہدی ہے وہ حلال نہ ہوں۔ تو کچھ لوگوں نے کچھ تردد سا کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْیَ'' اگر میرے اس معاملے کا مجھے پہلے پتا چل جاتا جس کا بعد میں پتا چلا ہے تو میں بھی ہدی ساتھ نہ لاتا۔(۱) تو ایسی باتیں ہوجاتی ہیں کہ اگر کسی تدبیر کا پہلے پتا چل جائے کہ یہ تدبیر خطا جائے گی تو ہم وہ اختیار کیوں کریں؟ اور فلاں کام کرنے میں ہمیں نقصان پہنچے گا تو ہم وہ کام ہی کیوں کریں؟ لیکن میری زندگی میں ایسے واقعات ہیں، کہ جن کو دیکھ کے آپ معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم ایک کام اچھا سمجھ کے کرتے ہیں، نتیجۃً ہمارے لیے نقصان دِہ ہوجاتا ہے، یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا علم ہمیں نہیں دیا۔ جب علم نہیں ہے تو نفع نقصان کا مستقل اختیار بھی نہیں ہے، بس جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملے گا اتنا ہے، اس سے زائد کوئی بات نہیں ہے، نہ علم کا دعویٰ ہے نہ اختیار کا دعویٰ ہے، تو پھر ایسے سوالات کرنا کہ تم یہ کر کے دکھادو، تم فلاں بات بتادو، یہ سوال بے محل ہے، میں ان چیزوں کا مدعی نہیں ہوں۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ: نہیں ہوں مگر ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ان لوگوں کو جو کہ یقین لاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

---

(۱) مسلم ۱/۳۹۰ باب بیان وجوہ الاحرام. واللفظ لہ/ بخاری ۱/۲۲۴ باب تقضی الحائض، نیز ۲/۱۰۷۳/ مشکوٰۃ ۱/۲۲۶ باب قصۃ حجۃ الوداع

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ

وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اُسی ایک نفس سے اُس کی زوجہ کو تاکہ وہ اس زوجہ کی طرف سکون

اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ

پکڑے، پس جب ڈھانپ لیا زوج نے زوجہ کو تو اُس عورت نے ہلکا سا بوجھ اُٹھایا پھر وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہی، جس وقت

اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ

وہ عورت زیادہ بوجھل ہوگئی تو زوجین نے اللہ کو پکارا جو اِن دونوں کا رَبّ ہے، اگر دے دیا تُو نے ہمیں دُرست بچہ تو البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم

الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ

شکر گزاروں میں سے ﴿۱۸۹﴾ اور جب دے دیا اللہ نے دونوں کو تندرست صحیح سالم بچہ تو بنا لیے اُن دونوں نے اللہ کے لئے شرکاء اُس چیز میں جو اللہ نے

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّهُمْ

اُن کو دی تھی، پھر اللہ تعالیٰ بلند و بالاتر ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے ﴿۱۹۰﴾ کیا یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں ایسی چیز کو جو کچھ پیدا نہیں کرتی اور وہ

یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ ۖ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ

خود پیدا کیے ہوئے ہیں ﴿۱۹۱﴾ اور نہیں طاقت رکھتے وہ اِن لوگوں کے لیے مدد کرنے کی، نہ وہ اپنے ہی نفسوں کی

یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ

مدد کرتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اگر تم پکارو انہیں ہدایت کی طرف تو وہ تمہاری اِتباع نہیں کریں گے،

سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ

برابر ہے تم پر کہ تم انہیں پکارو یا تم چپ رہو ﴿۱۹۳﴾ بے شک وہ چیزیں

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ وہ تم جیسے ہی بندے ہیں پھر پکارو تم اُن کو چاہیے کہ وہ تمہاری بات کو

لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ ۫ اَمْ

مان لیں اگر تم سچے ہو ﴿۱۹۴﴾ کیا اُن کے لیے ٹانگیں ہیں جن کے ذریعے سے وہ چلتے ہوں؟ کیا

لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ز

اُن کے لیے ہاتھ ہیں جن کے ذریعے سے وہ پکڑتے ہوں؟ کیا اُن کے لیے آنکھیں ہیں جن کے ذریعے سے وہ دیکھتے ہوں؟

اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ط قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ

کیا اُن کے لیے کان ہیں جن کے ذریعے سے وہ سنتے ہوں؟ آپ کہہ دیجئے! بُلالو اپنے شرکاء کو، پھر تم میرے خلاف تدبیر کرلو

فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِيِّ َۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ز وَهُوَ

اور پھر مجھے مہلت بھی نہ دو﴿۱۹۵﴾ بے شک میرا مددگار تو اللہ ہے جس نے کتاب اُتاری، اور وہ

يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

حمایت کرتا ہے نیکوں کی﴿۱۹۶﴾ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ نہیں طاقت رکھتے وہ

نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى

تمہاری مدد کی، نہ وہ اپنے نفسوں کی مدد کرتے ہیں﴿۱۹۷﴾ اگر تو پکارے انہیں ہدایت کی طرف

لَا يَسْمَعُوْا ط وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

تو وہ سنتے نہیں، اے مخاطب! تو اُن کو دیکھتا ہے کہ وہ تیری طرف جھانکتے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ہیں﴿۱۹۸﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے، وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا: اور بنایا اسی ایک نفس سے اس کی زوجہ کو، لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا: تا کہ وہ اس زوجہ کی طرف سکون پکڑے، فَلَمَّا تَغَشّٰهَا: پس جب ڈھانپ لیا اس مرد نے اس عورت کو۔ تَغَشّٰى یہ مذکر ہے، ''ھا'' ضمیر مؤنث ہے، تو زوجین میں سے زوج کی طرف تَغَشّٰى کی ضمیر، اور زوجہ کی طرف ''ھا'' ضمیر راجع ہے۔ ''جب ڈھانپ لیا زوج نے زوجہ کو'' حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا: تو بوجھ اٹھایا اس عورت نے ہلکا سا بوجھ اٹھانا، فَمَرَّتْ بِهٖ: پھر وہ اس بوجھ کے ساتھ چلتی پھرتی رہی۔ حَمْلًا کو مصدر بھی بنایا جا سکتا ہے جیسے میں نے ترجمہ کیا، اور حمل محمول کے معنٰی میں بھی ہو سکتا ہے، ایک ہلکی سی بوجھل چیز عورت نے اٹھائی، ایک ہلکی سی اٹھائی ہوئی چیز عورت نے اٹھائی، محمول خفیف اٹھایا، یہ معنٰی بن جائے گا، ''اس نے ہلکا سا بوجھ اٹھایا، پھر اس کے ساتھ وہ چلتی پھرتی رہی'' فَلَمَّا اَثْقَلَتْ: جس وقت وہ عورت زیادہ بوجھل ہوگئی دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا: تو زوجین نے اللہ کو پکارا۔ دَعَوَا تثنیہ کا صیغہ آ گیا۔ پکارا ان دونوں نے اللہ کو جو ان دونوں کا رب ہے، لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا: اگر دے دیا تو نے ہمیں دُرست بچہ۔ یہاں صالح سے صالح الأعضاء مراد ہے، چنگا بھلا بچہ،

جس کی آنکھیں، ٹانگیں، بازو ٹھیک ٹھاک ہوں، تو صَالِحًا صحیح اور تندرست کے معنی میں ہے۔ ''اگر دیا تو نے ہمیں ایک درست چنگا بھلا بچہ'' لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ: تو البتہ ضرور ہو جائیں گے ہم شکر گزاروں میں سے۔ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا: اور جب دے دیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو تندرست صحیح سالم بچہ، جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ: بنا لیے ان دونوں نے اللہ کے لئے شرکاء فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا: اس چیز میں جو اللہ نے ان دونوں کو دی تھی، فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: پھر اللہ تعالیٰ بلند و بالا تر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ بلند و بالاتر ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے، ''مَا'' مصدریہ ہو جائے گا۔ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا: کیا یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں ایسی چیز کو جو کچھ پیدا نہیں کرتی، وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ: اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں، وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا: اور نہیں طاقت رکھتے وہ اِن لوگوں کے لئے مدد کرنے کی، وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ: نہ وہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں، نہ وہ اپنے ہی نفسوں کی مدد کرتے ہیں، وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى: اگر تم پکارو۔ تَدْعُوْنَ تھا، نون گر گیا اِنْ کی وجہ سے۔ اگر تم پکارو انہیں ہدایت کی طرف، لَا يَتَّبِعُوْكُمْ: تو وہ تمہاری اتباع نہیں کریں گے۔ هُدٰى مصدر ہے، راہنمائی کرنا۔ اگر تم انہیں بلاؤ ہدایت کی طرف تو وہ تمہاری بات نہیں مانیں گے، تمہاری اتباع نہیں کریں گے، سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ: برابر ہے تم پر، اَدَعَوْتُمُوْهُمْ: کہ تم انہیں پکارو، اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ: یا تم چپ رہو، اِلَى الْهُدٰى کا معنی یہ ہے کہ تم انہیں بلاؤ کہ ہماری راہنمائی کرو، ہمیں ہدایت دو، تو وہ تمہاری بات نہیں مان سکتے، یا یہ مطلب ہے کہ تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ کہ آؤ ہم تمہیں راستہ دکھاتے ہیں، تمہیں ہدایت کرتے ہیں، تو بھی وہ تمہاری اتباع نہیں کر سکتے، تمہاری بات نہیں مان سکتے، اتباع کا یہاں یہی معنی ہے، تمہاری پکار پر چلیں گے نہیں اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ، ''برابر ہے تم پر کہ تم انہیں پکارو یا تم چپ رہو، اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ: یا تم چپ رہنے والے ہو۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: بیشک وہ چیزیں جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ: وہ تم جیسے ہی بندے ہیں۔ عباد عبد کی جمع۔ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ وہ تم جیسے ہی بندے ہیں، فَادْعُوْهُمْ: پھر پکارو تم ان کو، فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ: چاہیے کہ وہ تمہاری بات کو مان لیں، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ: کیا اُن کے لئے ٹانگیں ہیں جن کے ساتھ وہ چلتے ہوں؟ ارجل رجل کی جمع، رجل پوری ٹانگ کو کہتے ہیں۔ کیا اُن کے لئے ٹانگیں ہیں جن کے ذریعے سے وہ چلتے ہوں؟ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ: کیا ان کے لئے ہاتھ ہیں جن کے ذریعے سے وہ پکڑتے ہوں؟ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ: کیا ان کے لئے آنکھیں ہیں جن کے ذریعے سے وہ دیکھتے ہوں؟ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا: کیا ان کے لئے ایسے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے ہوں؟ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی کچھ بھی نہیں، نہ ان کے پاس ایسی ٹانگیں جن کے ساتھ وہ چلیں، نہ ان کے پاس ایسے ہاتھ جن کے ساتھ وہ پکڑیں، نہ ان کے پاس ایسی آنکھیں جن کے ذریعے سے دیکھیں، نہ اُن کے پاس ایسے کان جن کے ذریعے سے سنیں، قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ: آپ کہہ دیجئے پکارو اپنے شرکاء کو، بلالو اپنے شرکاء کو، ثُمَّ كِيْدُوْنِ: كِيْدُوْا امر کا صیغہ ہے كَادَ يَكِيْدُ سے۔ پھر تم میرے خلاف تدبیر کرلو، میرے خلاف کوئی مکر کرلو، کوئی خفیہ تدبیر کرلو میرے خلاف، فَلَا تُنْظِرُوْنِ: فَلَا تُنْظِرُوْنِيْ اور پھر مجھے مہلت بھی نہ دو، خفیہ تدبیر کر کے فوراً اپنی تدبیر کو چالو کر دو، مجھے ڈھیل بھی نہ دو، کرلو، کیا کر سکتے ہو، اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ: بیشک میرا مددگار تو اللہ ہے، الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ: جس نے کتاب اتاری، وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ: اور وہ نیکوں کا متولّی ہوتا ہے، نیکوں کا حمایتی ہوتا ہے، وہ حمایت کرتا ہے نیکوں کی، وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: جن کو تم پکارتے ہو اللہ

کے علاوہ، لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ: نہیں طاقت رکھتے وہ تمہاری مدد کی، وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ: نہ وہ اپنے نفسوں کی مدد کرتے ہیں، وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى: اگر تُو پکارے انہیں ہدایت کی طرف، لَا يَسْمَعُوْا: تو وہ سنتے نہیں، وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ: اے مخاطب! تُو ان کو دیکھتا ہے یعنی جن کو پکارا جارہا ہے، اے مخاطب! تُو ان کو دیکھتا ہے، يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ: کہ وہ تیری طرف جھانکتے ہیں، وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ: حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

تفسیر

ماقبل سے ربط اور گزشتہ آیات پر ایک نظر

پچھلے رکوع میں دین کے تینوں اصولوں میں سے رسالت اور معاد کا ذکر کچھ وضاحت کے ساتھ آیا تھا، اور آخری آیات میں سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے اعلان کروایا گیا تھا اسی مناسبت سے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قیامت آنے والی ہے تو ہمیں اس کا وقت بتاؤ، تو کلام ادھر منتقل ہوگئی تھی، کہ آپ ان کے سامنے اعلان کردیجئے کہ نہ تو میں عالم الغیب ہوں، اور نہ کسی نقصان کا ہٹانا میرے بس میں، نہ نفع کا حاصل کرنا میرے بس میں، نہ کسی کے لیے، نہ اپنے لیے، یہ چیزیں نبوّت کے لوازمات میں سے نہیں ہیں کہ نبی مختارِ کل ہو، نبی عالم الغیب ہو، یہ کوئی ضروری نہیں۔ نبی کا کام ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام لوگوں کو سناتا ہے، اُس کے عذاب سے ڈراتا ہے، ماننے والوں کو بشارت دیتا ہے، وہ کام میں کررہا ہوں، باقی میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم الغیب ہوں، جو پوچھو بتاؤں گا، اور میں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نفع نقصان کا مالک ہوں، جو کہو کر کے دکھادوں گا، یہ حضور ﷺ سے اعلان کروایا گیا تھا، جس کے ضمن میں گویا کہ توحید بھی ثابت ہوگئی، کہ اللہ کی مخلوق میں سے سب سے عظیم المرتبت اللہ کا نبی ہوتا ہے، اور اللہ کے نبیوں میں سے سب سے بڑے سید الرسل، سید الانبیاء، امام النبیین، محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، تو جب ان سے بھی یہ اعلان کروایا کہ مجھے نفع اور ضرر کا اختیار نہیں ہے، اور علم غیب نہیں ہے، تو ''تا بدیگراں چہ رسد'' دوسروں کی کیا پوزیشن رہی؟ تو عقیدۂ توحید کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ کے علاوہ جمیع حالات کو جاننے والا کوئی نہیں، اور اللہ کے علاوہ نفع نقصان کا مالک اور مختار کوئی نہیں۔ تو یہ مضمون آیا اگرچہ اس مناسبت سے تھا کہ وہ کہتے تھے کہ قیامت کا وقت بتاؤ، یا دوسری جگہ جس طرح سے مذکورہ ہے کہ وہ مطالبے کرتے تھے کہ یہ کر کے دکھاؤ، یہ کر کے دکھاؤ، تو سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے یہ اعلان کروایا گیا کہ تمہارے یہ سوال بے محل ہیں، اور ان سوالوں کے جواب پر میری نبوّت یا میری صداقت موقوف نہیں۔ یہیں سے آگے کلام منتقل ہوگئی رَدِّ شرک کی طرف، تو اگلی آیات جو آپ نے تلاوت کی ہیں یہ رَدِّ شرک پر مشتمل ہیں۔

حضرت حوّاء کی تخلیق کس طرح ہوئی؟

پہلی آیت هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تمہیں ایک ہی جان سے۔ تو نفس واحدہ سے آدم مراد

ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ آدم کو پیدا کرنے والا اللہ ہے، اور اس آدم سے اللہ نے تمہیں پیدا کیا، تو خالق تمہارا اللہ ہے۔ تو اللہ کے خلق کا ذکر بھی آ گیا، اور اُس کے انعام کا ذکر بھی آ گیا، کہ اُس نے ہمیں وجود کی نعمت بخشی۔ تو اللہ نے نفس واحدہ کو پیدا کیا تھا، تمہیں اس نفس واحدہ سے پیدا کیا۔ ''اور اس نفس واحدہ کے لیے اُس کی زوجہ کو بنایا'' مِنۡهَا میں ''ھا'' ضمیر مؤنث کی لوٹ رہی ہے نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ کے اعتبار سے، اگرچہ مراد نفسِ واحدہ سے آدم علیہ السلام ہیں لیکن یہ لفظ مؤنث ہے۔ اس نفس واحدہ سے اُس کی زوجہ کو کیسے بنایا، اس کے جوڑے کو کیسے بنایا؟ سورۂ نساء کی ابتدا میں یہ مسئلہ ذکر کیا تھا، کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حوّاء کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اوپر والی پسلی سے تھوڑا سا مادّہ لیا گیا اور اُس پر بنیاد رکھی گئی خلقِ حوّاء کی، جس طرح سے الفاظ آتے ہیں کہ ''خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ اَعْوَجَ''[1] یہ عورتیں ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، پسلیوں میں سے سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر والی پسلی ہے (اور اس میں سے کوئی مادّہ لے کر ان کو پیدا کیا گیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کی خلقت میں ٹیڑھ ہے، ٹیڑھا پن ہے، اس لیے ان سے فائدہ اٹھاؤ ان کو ٹیڑھی رکھتے ہی، اور اگر ان کو زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائیں گی، ان کو توڑ دو گے، اور توڑنا یہ ہے کہ طلاق دے دو گے، گھر سے نکال دو گے۔[2] اس لیے عورت کی فطرت میں بمقابلہ مرد کے کچھ نہ کچھ کجی ہے، خواہ مخواہ کی اَڑی کر لینا، بلاوجہ ضد کر لینا، اور ذرا ذرا بات پر جھگڑے کی صورت نکال لینا، یہ وہی کجی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کی فطرت کے اندر اپنی حکمت کے تحت رکھی ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے ہی حوّاء کو بنایا، لیکن اس طریق سے نہیں جس طرح سے ایک نسل چلتی ہے، بلکہ جیسے براہِ راست آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، تو آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی جزء لے کر اس کے اُوپر حوّاء کی تخلیق کا مدار رکھا، حوّاء کو بنا دیا۔ تو مِنۡهَا (کا مطلب) یہ ہو جائے گا، کہ اسی سے بنایا اُس کی زوجہ کو۔ ان الفاظ کی معروف تفسیر یہی ہے، سورۂ نساء کی ابتدا میں جیسے ذکر کی گئی تھی، اور بعض مفسرین اس طرح سے بھی ذکر کرتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی جنس سے بنایا، جیسا آدم ویسے اُس کے لیے اُس کی بیوی بنا دی۔

زوجین کے تعلق سے اَصل مقصود

ہم جنس کے ساتھ اُنس ہوتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دونوں کو اس طرح بنایا، کہ مرد عورت کی طرف مائل ہو کے سکون حاصل کرتا ہے، یہ مرد اور عورت اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک شاہکار ہے، کہ دونوں کے بدن کی ساخت ایسی رکھی، دونوں کے جذبات ایسے رکھے کہ اُس کا میلان اِدھر، اور اِس کا میلان اُدھر، اور جس وقت تک مرد کے ساتھ عورت نہ ہو تو مرد اپنی زندگی میں اچھا خاصا خلا محسوس کرتا ہے، اور عورت کے لیے مرد نہ ہو تو عورت کی زندگی میں بہت سارا خلا ہے، اور جب یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تو دونوں کی زندگی مکمل ہوتی ہے، پھر یہ معاشرہ کے اندر ایسے ہوتا ہے جیسے کسی گاڑی کے دونوں پہیے ٹھیک ہو گئے، تو پھر معاملہ درست چلتا رہتا ہے، ورنہ مرد کی بہت ساری ضروریات ایسی ہیں، بہت سارے جذبات ایسے ہیں، جو بغیر بیوی کے تسکین نہیں پاتے، اور

(۱) شرح بخاری لابن بطال میں اعوج کا لفظ ہے لیکن کتب حدیث میں نہیں ہے، اور بخاری وغیرہ میں ہے: فَاِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ اَعْلَاهُ.

(۲) بخاری ۱/۴۶۹، کتاب احادیث الانبیاء کی ابتداء۔ ۲/۷۷۹ / مسلم ۱/۴۷۵ باب الوصیة بالنساء / مشکوۃ ۲/۲۸۰ باب عشرۃ النساء کی ابتداء۔

اسی طرح عورت کی بہت ساری ضرورتیں ایسی ہیں کہ وہ مرد سے مستغنی ہو کے اپنا گزارہ نہیں کرسکتی۔تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر کے دونوں کا ایک دوسرے کی طرف میلان رکھا، اور دونوں کے ملنے کے ساتھ زندگی میں سکون آیا، تو زوجین کے تعلق سے اصل مقصود سکون ہے، اسی لیے جہاں زوجین کے تعلق میں سکون نہ ہو وہاں کسی صورت میں بھی گھر کی زندگی اچھی نہیں ہوسکتی، آگے نسل خراب ہوجاتی ہے، گھر کے حالات خراب ہوتے ہیں، مال دولت جائیداد سب کچھ ہونے کے باوجود ان گھروں کے اندر سکون نہیں ہوتا جن میں زوجین کا آپس میں تعلق سکون والا نہیں ہے، تخلیق اس کی اگر ہوئی ہے تو اسی سکون کے نظریے سے ہوئی ہے، اور یہ مقصد تبھی پورا ہوگا جب زوجین آپس میں مل کے سکون حاصل کریں۔اگر خاوند بیوی کے اندر اطمینان کی کیفیت نہیں، تو پھر وہ معاشرہ صحیح نہیں ہوتا، گھر کا ماحول صحیح نہیں ہوتا، سارا برباد ہوجاتا، یہ بات مقصد کے خلاف ہوجاتی ہے۔تو یہ اللہ کا انعام ہے کہ مرد کے لیے عورت کو پیدا کردیا جس کے ساتھ اُس کو سکون حاصل ہوتا ہے، لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا تاکہ وہ نفس..... اب ہم نے اس نفس کا مصداق جو آدم علیہ السلام کو بنایا (اس لیے صیغہ مذکر کا لایا گیا۔آلوسی) تاکہ وہ سکون حاصل کرے اُس عورت کی طرف مائل ہوکر، اس لیے ہم نے اُس کے ساتھ اُس کی بیوی کو بنادیا..... یہ تفسیر کررہا ہوں عام معروف روایات کے مطابق، کہ نفسِ واحدہ سے آدم علیہ السلام مراد ہیں، اور زَوْجَهَا سے حوّا، مراد ہیں۔تو تخلیقِ آدم میں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام ذکر کردیا۔

''فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا'' کی آسان تشریح

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا: اب اللہ تعالیٰ نے یہ زوجین اس طرح سے بنا تو دیے، آگے نسل چلی، چلنے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا..... یہ ایک حال مذکور ہے، کسی متعین شخص کا واقعہ نہیں، یعنی تَغَشّٰهَا میں تغشی کی ضمیر مرد کی طرف لوٹی، اور ''ھا'' ضمیر عورت کی لوٹی، یعنی اللہ تعالیٰ نے یوں نفس پیدا کرکے اُس کے لیے زوجہ بنادی، سلسلہ وہاں سے چل پڑا، وہاں سے اللہ نے تمہیں پیدا کیا۔پیدا کرنے کے بعد پھر انسانی زندگی میں یہ واقعات بھی پیش آئے، کہ مرد نے عورت کو ڈھانپا یعنی دونوں آپس میں اکٹھے ہوئے، مصاحبت ہوئی، تو اس کے نتیجے میں عورت نے ہلکا سا بوجھ اٹھایا، حَمْلًا خَفِیْفًا سے مراد ہے جو حمل کے ابتدائی حالات ہوا کرتے ہیں، نطفے کی شکل میں، اور نطفے کے بعد جو تغیّرات اُس کے اوپر ہوتے ہیں، جبکہ خاص احساس بھی نہیں ہوتا کہ پیٹ میں کوئی بوجھ ہے۔''عورت نے حملِ خفیف اٹھایا، اُس کے ساتھ وہ چلتی پھرتی رہی'' اس نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی، ابتدائی مراحل میں ایسے ہی ہوتا ہے۔فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ: پھر جس وقت وہ بوجھل ہوگئی۔بچہ جس وقت تام الخلقت ہوجاتا ہے، پوری طرح سے محسوس ہونے لگ گیا، کہ واقعی پیٹ میں بچہ ہے، تو بوجھل ہوگئی، پھر اُس کے بعد عورت کے لیے چلنا پھرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔جب یقین ہوگیا کہ اب اس پیٹ میں بچہ ہے، اب خاوند بیوی دونوں اس فکر میں ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بچے کی بنیاد تو رکھ دی، اللہ کرے تندرست بچہ پیدا ہو، صحیح سالم بچہ پیدا ہو، ایسا نہ ہو کہ لنگڑا پیدا ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ اندھا پیدا ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ بہرہ پیدا ہوجائے، اس قسم کی فکر ماں باپ کو لگ جاتے ہیں، جب اس قسم کے فکر لگ جاتے ہیں تو پھر ایسے وقت میں وہ اللہ سے دُعائیں کرتے ہیں، کہ یا اللہ! ہمیں تندرست بچہ دینا، ہمیں صحیح سالم بچہ دینا، چنگا بھلا بچہ ہمارے ہاں پیدا ہو، تو صَالِحًا سے یہاں سے

صالح الاعضاء مراد ہے، یعنی عام انسان میں یہ بات ہے کہ جب ایسی مشکل پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجحان ہوتا ہے، وہ دُعائیں کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر اچھا بچہ پیدا ہوا تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے، شکرگزار ہو جائیں گے۔ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا: تو پکارتے ہیں وہ دونوں اللہ کو جو ان کا رَبّ ہے، لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا: اگر تُو نے ہمیں درست بچہ دے دیا، لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ: تو ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ اس قسم کی تمنائیں ماں باپ کے قلوب میں اُبھرتی ہیں، حمل کے بوجھل ہو جانے کے بعد جب توقع ہوتی ہے کہ اب عنقریب بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی آرزو کے مطابق چنگا بھلا بچہ پیدا کر دیتا ہے، اُس کی آنکھیں ٹھیک ہیں، کان ٹھیک ہیں، زبان ٹھیک ہے، صالح الاعضاء ہے، اب تندرست بچہ پیدا ہو گیا، پیدا ہونے کے بعد پھر لوگ کیا کرتے ہیں؟ کبھی کہیں گے، یہ فلاں پیر نے دیا ہے، کبھی تو اس طرح سے قولاً نسبت ادھر کر دیتے ہیں، اور کبھی یہ ہوگا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد کہتے ہیں کہ فلاں پیر کے دربار پہ لے جانا، وہاں ماتھا ٹیکیں گے، کہ اس پیر کے فیض سے یہ بچہ آیا ہے، اور کبھی بچہ پیدا ہونے پر غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے لگ جاتے ہیں، کہ وہاں جا کے چڑھاوا چڑھا کے آؤ کہ بچہ پیدا ہوا ہے، جس سے اشارہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ گویا کہ بچہ انہوں نے دیا ہے، اور کبھی بچے کا نام اس قسم کا رکھتے ہیں جس میں نسبت غیر کی طرف ہو جاتی ہے، جیسے ''پیر بخش، علی بخش، عبدالشمس، بندۂ علی'' اس قسم کے نام رکھتے ہیں، جس میں گویا کہ لفظاً نسبت دوسرے کی طرف کر کے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ یہ نعمت ہمیں ان کی طرف سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ سارے کے سارے درجہ بدرجہ شرک کے شعبے ہیں، ''پیر بخش'' کا بھی تو یہی معنی ہوتا ہے، پیر کا بخشا ہوا، ''بخشیدن'' مصدر ہے، اور ''بخش'' امر ہے، پیر اسم ہے، اسم اور اَمر مل جائیں تو اسم مفعول کا معنی ادا ہو گیا، پیروں کا بخشا ہوا، پیروں کا دیا ہوا، جس طرح سے ''اللہ بخش'' کا معنی: اللہ کا دیا ہوا، اللہ کا بخشا ہوا، ''خدا بخش'' کا معنی: خدا کا دیا ہوا، خدا کا بخشا ہوا، اسی طرح سے ''پیر بخش'' کا معنی ہو گیا: پیروں کا دیا ہوا، پیروں کا بخشا ہوا، اس قسم کے نام رکھتے ہیں۔ تو گویا کہ اللہ انسانی برادری کی شکایت کر رہا ہے، کہ انسانی برادری یہ نہیں سوچتی کہ پیدا کرنے والے تو ہم ہیں، ان کو بھی ہم نے پیدا کیا اور ان کی بیویوں کو بھی ہم نے پیدا کیا، لیکن اس قسم کے واقعات ہو جاتے ہیں کہ جب خاوند بیوی آپس میں ملتے ہیں، بیوی حاملہ ہوتی ہے، بچہ کے پیدا ہونے کی توقع لگتی ہے، تو اللہ کے سامنے گڑگڑاتے ہیں، تمنائیں ان کے دل سے اُبھرتی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کو اچھا بھلا بچہ دے دیتا ہے، پھر یہ غیروں کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، غیروں کے جا کر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ہمیں فلاں نے دیا، فلاں نے اس طرح کر دیا، یہ سارے کے سارے شرک کرنے لگ جاتے ہیں، یہ انسان کی شکایت ہے کہ دینے والا اللہ ہے، اور پیدا ہونے کے بعد اولاد کے سلسلے میں لوگ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنے لگ جاتے ہیں۔ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا: جب اللہ تعالیٰ انہیں اچھا بچہ دے دیتا ہے، تو کر لیتے ہیں اُس کے لیے شرکاء اُس چیز میں جو اللہ نے اُن کو دی۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: ان کے شریک ٹھہرانے سے اللہ بلند و بالا ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ یہ تفسیر جو میں نے کی اس میں کوئی اشکال نہیں، کہ چاہے پہلے ذکر آدم اور حوّاء کا ہو، لیکن آگے کلام منتقل ہو گئی کہ اُن کی اولاد میں زوجین کی طرف کہ اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ ہوتے ہیں، تو فَلَمَّآ اَثْقَلَتْهُمَا کی ''ھا'' ضمیر اس نفس واحدہ اور اس کے زوج متعین کی طرف نہ گئی، بلکہ نسل کے اندر

جوز وجین کا قصہ چلا تو اُس کا ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے مثال کے طور پر، کسی کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں، زوجین میں ایسے حالات ہوتے ہیں کہ مرد عورت کے پاس جاتا ہے تو بعد میں یہ حالات ہو جاتے ہیں، تو ایک عمومی ضمیر لوٹ گئی جنس کی طرف، کہ جنس انسان میں اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔ تو اس میں کوئی اِشکال نہیں۔ لیکن بعض تفاسیر میں ایک روایت لکھی ہوئی ہے، اور وہ روایت ترمذی شریف میں بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آدم علیہ السلام اور حوّاء کا ہی ہے، اور واقعہ یوں بیان کیا ہوا ہے کہ جس وقت آدم اور حوّاء آپس میں اکٹھے ہوئے، اور یہی صورتِ حال پیدا ہوئی جس کا قرآنِ کریم نے خاکہ کھینچا ہے، تو ابلیس کسی اچھے بھلے آدمی کی شکل میں آیا، ولی کی شکل میں یا کسی اور اچھی صورت میں آ گیا، اور آ کے حوّاء کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا، اور اُسے کہنے لگا کہ جس وقت یہ بچہ پیدا ہوگا تو تم اس کا نام عبدالحارث رکھنا تو پھر یہ بچہ زندہ رہے گا، تو جب وہ بچہ پیدا ہوا تو اَب عبدالحارث لفظ کے اندر کسی قسم کی کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ عبد ہمیشہ عبادت گزار کو تو نہیں کہتے، عبد خادم کو بھی کہتے ہیں، اور حارث کا لفظی معنی پیشہ ور، کام کرنے والا، حرث بونے کو کہتے ہیں، حارث: کاشت کار۔ لوگ حارث نام رکھتے ہیں، تو یہ آدم علیہ السلام اور حوّا اُس کی چال سمجھ نہ سکے، کہ فرشتوں کے اندر شیطان کا ایک نام حارث بھی تھا، اور جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔(1) اب اگرچہ اس میں کوئی ارادہ شرک کا نہیں، نظریات شرک والے نہیں ہیں، لیکن جب اُس کی نسبت اس حارث کی طرف کر دی، تو گویا کہ من وجہ اس کا مفہوم اس قسم کا ہو گیا کہ حارث کی طرف اُس کی نسبت ہو گئی، جیسے ''عبدالنبی'' یا ''عبدالعلی'' کہا جائے، تو عبد کی اس طرح دوسرے کی طرف کی نسبت پسندیدہ نہیں ہے، اور انبیاء علیہم السلام سے اگر کوئی تھوڑی بہت بھی لغزش ہو جائے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو بہت سخت انداز میں بیان کرتے ہیں، کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ اور خوف العبدِ قدرَ التَّقَرُّبِ جتنا کوئی مقرب ہوتا ہے اتنا ہی وہ ڈرتا بھی زیادہ ہے، ان حالات کے تحت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو یہاں ایسے انداز میں ذکر کیا گویا کہ آدم اور حوّا کسی کو شریک ہی کر بیٹھے، یہ روایت اس قسم کی ایک ہے لیکن محققین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں، اسرائیلیات سے ماخوذ ہے (ابن کثیر)، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اس قسم کی باتوں کی نسبت جس وقت تک بہت قوی اور مضبوط دلیل کے ساتھ بات ثابت نہ ہو اس قسم کی کمزور بات پر تفسیر کا مدار نہیں رکھنا چاہیے۔ اب آدم علیہ السلام سے ایک غلطی ہوئی تھی، اس کا ذکر قرآنِ کریم میں صراحتاً ہے، اور قیامت کے دن جس وقت لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، کہ آپ چل کے ہماری سفارش کریں، تو آدم علیہ السلام اپنی اسی لغزش کو یاد کریں گے، کہ مجھے اللہ نے منع کیا تھا کہ درخت نہیں کھانا، میں نے درخت کھا لیا تھا، آج میں اللہ کے سامنے نہیں جاتا، کسی روایت میں بھی یہ نہیں کہ آدم علیہ السلام یہ کہیں کہ میں اللہ کے سامنے نہیں جاتا، کہ مجھ سے یہ غلطی ہو گئی تھی، کہ میں نے بچے کا ایسا نام رکھ لیا تھا جو شرک کی طرف موہم تھا، یا اس میں کوئی اس قسم کا کوئی معنی نکلتا تھا، کسی روایت میں کوئی مذکور نہیں ہے، اس لیے وہ روایت اس درجے کی نہیں کہ اس پر تفسیر کا مدار رکھا جائے، اگرچہ اس روایت کو لینے کے بعد توجیہ اُس کی ہو سکتی ہے، جس طرح سے میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ تو اس کی صحیح، آسان اور بے غبار تفسیر یہی ہے کہ تَغَشّٰھَا کی ضمیر اس نفسِ واحدہ متعینہ اور زوجہ متعینہ کی طرف نہ لوٹائی جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ایک نسل انسان کو ذکر کیا، کہ ایک آدم کو پیدا کیا،

(1) ترمذی ۲/ ۱۳۸، ابواب التفسیر۔ تفسیر سورۃ اعراف۔

حوّاء کو پیدا کیا، اسی سے تم سب انسانوں کو پیدا کیا، اور پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد عورت کے پاس جاتا ہے، تو یہ حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو تَغَشّٰهَا کی ضمیر عام زوج اور زوجہ کی طرف لوٹ جائے گی جس طرح سے بیان میں میں عرض کر رہا ہوں، بہر حال یہ ایک شکوہ ہے انسان کا، کہ اولاد دیتا اللہ ہے، اور اولاد ہو جانے کے بعد پھر لوگ چڑھاوے دوسروں کے چڑھاتے ہیں۔

مشرکین نے اپنا معبود بے جان چیزوں کو بھی بنایا ہے

اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ: یہاں سے صراحتاً ان شرکاء کی تردید آ گئی۔ ''کیا شریک ٹھہراتے ہیں یہ ایسی چیزوں کو جو کچھ پیدا نہیں کرتیں، اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں'' پیدا نہیں کرتے خود پیدا کیے جاتے ہیں، خود کچھ بنا نہیں سکتے خود بنائے جاتے ہیں، خود مخلوق ہیں خالق نہیں ہیں، ایسی چیزوں کو یہ لوگ شریک ٹھہرانے لگ جاتے ہیں؟ اب ان چیزوں سے کیا چیز مراد ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں نے انبیاء ﷩ کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرایا اور وہ بھی مشرک ہیں، اگر کوئی شخص نبی کو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے تو وہ بھی مشرک ہے، عیسیٰ ﷤ کو اِلٰہ قرار دیا، عیسیٰ ﷤ کی والدہ کو اِلٰہ قرار دیا، عزیر ﷤ کے متعلق اس قسم کے لفظ استعمال کیے، یا دوسرے انبیاء ﷩ کے متعلق جہلاء نے اگر اس قسم کے عقیدے رکھے ہیں تو وہ بھی مشرک ہیں، اور اس قسم کے شرک کا وجود بھی ہے کہ انبیاء ﷩ کو اللہ کا شریک ٹھہرایا گیا، اس کی تردید نہیں ہے، اور ایسا بھی ہے کہ اولیاء اللہ کو شریک ٹھہرایا گیا، اور ایسا بھی ہے کہ ملائکہ کو شریک ٹھہرایا گیا، اور ایسا بھی ہے کہ جنات کو شریک ٹھہرایا گیا، جنات، ملائکہ، اولیاء، انبیاء ان سب کے متعلق لوگوں نے شرک والے نظریات رکھے اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، چاہے قدرت میں، چاہے علم میں، چاہے تصرف میں، چاہے کسی چیز میں ہو، ان کو ویسا قادر مانا جس طرح سے اللہ قادر ہے، ویسا متصرف مانا جس طرح سے اللہ متصرف ہے، ویسا عالم الغیب مانا حاضر وناظر مانا جس طرح سے اللہ عالم الغیب اور حاضر ناظر ہے، یہ سب شرک کے شعبے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ لوگوں نے ان کے علاوہ اور چیزوں کی بھی پُوجا کی، سورج کو پُوجا، چاند کو پُوجا، حیوانات میں سے بعض جانوروں کو پُوجا، اِسرائیلیوں کا ذکر تو آپ کے سامنے ہو ہی چکا کہ عجل کو پُوجا، بچھڑے کو معبود بنایا (بات ذرا اچھی طرح سے سمجھتے جاؤ) سورج کو پُوجا، چاند کو پُوجا، ستاروں کو پُوجا، اور حیوانات میں سے بعض حیوانوں کو پُوجا، حتیٰ کہ تاریخ کے اندر مذکور ہے کہ لوگوں نے سانپ تک کو پُوجا، پانی کی عبادت کی، آگ کی عبادت کی، اور حد یہ ہے کہ مشرکین میں بعض قومیں ایسی بھی گزری ہیں جو مرد اور عورت کے اعضائے تناسل کی بھی عبادت کرتے ہیں، اس کے سامنے بھی سجدہ ریز ہوتے ہیں، اور اُس کو بھی سلام کرتے ہیں اور اس دلیل کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں بنایا ہے۔ میرے سامنے ایک مجلس میں ایک دفعہ اس کا ذکر ہوا تو میں نے کہا وہ بڑے بے وقوف ہیں۔ تو یہ کتابوں میں مستقل مذکور ہے، ان کے پُوجنے والے بھی گزرے ہیں، وہ کہتے ہیں یہ ہمارے خالق ہیں۔ میں نے کہا اُن سے کوئی پوچھے کہ یہ پہلے ہیں یا ہم پہلے ہیں؟ اگر تو پہلے یہ ہیں اور ان کی وساطت سے آدم وجود میں آیا، پھر تو مغالطہ کی گنجائش تھی، اور اگر آدم پہلے بنا اور یہ اس کی وساطت سے آئے تو پھر ان کی نسبت کس طرح درست ہوئی؟ یہ تو متعین بات ہے کہ آدم تو ان کی وساطت سے نہیں آیا، نہ حوا ان کی وساطت سے آئی ہے، بلکہ یہ ان دونوں کی وساطت سے آئے ہیں۔ بہر حال دنیا کے اندر پاگلوں کی کمی نہیں

ہے، اپنی عقل کو دوڑا کے لوگ کہاں تک پہنچے، سانپ کو پُوجا، مختلف جانوروں کو پُوجا، پانی کو، آگ کو، درختوں کو پُوجا، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پتھر کی مورتیاں بھی بنائیں، تصویریں بھی بنائیں، تصویریں بناتے وقت چاہے اُن کا خیال یہ ہے کہ یہ ہم فرشتوں کی تصویر بنا رہے ہیں، ہم جنات کی تصویر بنا رہے ہیں، یا کسی پیر، پیغمبر کی تصویر بنا رہے ہیں، نظریہ ابتداءً یہی ہے، لیکن پھر جہالت نے جس وقت زور مارا تو شخصیات نظروں سے مخفی ہوگئیں اور تصویریں ہی سامنے رہ گئیں، مشرکین کے شرک میں یہ سب مثالیں موجود ہیں، یہ سب واقعات ہیں، حتیٰ کہ بخاری شریف میں ایک روایت آتی ہے ایک صحابی خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ہم جن دِنوں میں پتھروں کو سجدہ کرتے تھے، تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک پتھر ہم نے تراش کے رکھا ہوا ہے، جس کو ہم سجدہ کرتے تھے، چلتے چلتے اگر اُس سے کوئی اچھا پتھر مل جاتا تھا تو پہلے کو پھینک دیتے اور دُوسرا اٹھا لیتے تھے۔[1] تو اس قسم کے شرک کی ساری کی ساری مثالیں موجود ہیں، میں پھر کہہ دوں، آپ شاید میرے مضمون کو صحیح طرح سمجھ نہیں رہے، میں آپ کے سامنے عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس بات میں شرک بند نہیں ہے، کہ ہر مشرک کا معبود نبی یا فرشتہ یا ولی یا جن ہی ہے، اور بے جان چیزوں کو لوگوں نے نہیں پُوجا۔ بلکہ بے جان چیزوں کو لوگوں نے پُوجا ہے، اور ان جاندار چیزوں کو، علم والوں کو، عقل والوں کو، صلاحیت والوں کو بھی پُوجا ہے، میں ان کی نفی نہیں کر رہا کہ انبیاء اور اولیاء کو شریک نہیں بنایا گیا، جنات کو نہیں بنایا گیا، ملائکہ کو نہیں بنایا گیا، نہیں، بلکہ نصوص قطعیہ قرآنِ کریم میں موجود ہیں، اس کا کون انکار کرسکتا ہے۔ لیکن ساتھ یہ کہتا ہوں کہ مشرک قوموں کے اندر محض بت پرستی بھی ہوئی، کہ اُن کے سامنے وہ پتھروں کی تصویریں ہیں، پیتل کی تصویریں ہیں، اور شخصیات نظروں سے اوجھل ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہی ہیں جو کچھ ہیں۔ جب کبھی میں یہ بات کرتا تو لوگ کہتے کہ جی! وہ اتنے پاگل تھے؟ کہ پتھروں کی تصویروں کو سب کچھ سمجھنے لگ گئے۔ تو میں انہیں کہا کرتا تھا کہ بھائی! کوئی نبی کو شریک بنائے وہ بھی پاگل ہے، کوئی ولی کو بنائے وہ بھی پاگل ہے، تو آپ کیا کہیں گے کہ جنہوں نے نبیوں اور ولیوں کو شریک بنایا وہ عقل مند تھے؟ جب عقل انسان کی اکھڑی تو شرک تو ہے ہی سراسر خلافِ عقل، جیسے "رَبّ رُسے تے مت کھسے" یہ ایک محاورہ ہے، کہ جب کسی سے رَبّ رُس جاتا ہے (ناراض ہوجاتا ہے) تو اس سے مت کھَس لیتا ہے (عقل چھین لیتا ہے)، اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی، پھر وہ جس قسم کی احمقانہ حرکتیں کرے کرسکتا ہے۔ اس لیے یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے تصویروں کو بھی معبود سمجھا، آلہہ کا مصداق بنایا، اور شخصیات اُن کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اتنی تعمیم کے ساتھ اگر آپ شرکاء کے وجود کو سمجھیں گے تو قرآنِ کریم کی آیات حل کرنے میں آپ کو کہیں بھی کوئی اِشکال پیش نہیں آئے گا۔ لہٰذا جہاں کہیں شرک کی تردید کی گئی ہو اور شرکاء کے حالات ذکر کیے گئے ہوں، تو ضروری نہیں کہ اُن سب کو آپ انبیاء علیہم السلام پر ہی صادق کریں، اولیاء پہ صادق کریں، ملائکہ پر صادق کریں، جنات پہ صادق کریں، یہ ضروری نہیں کہ سب آیتیں اُٹھا کے آپ انہی پر ہی فٹ کریں۔ عیسائیوں کی تردید میں جہاں بات آئے گی، ٹھیک ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کو اِلٰہ کہتے تھے، تو وہاں جو باتیں ہوں گی وہ ان پر صادق آئیں گی، اور مشرکینِ مکہ ملائکہ کی پُوجا کرتے تھے، تو ملائکہ کی تردید کے بارے میں بھی آیات ہیں، لیکن شرک کی تردید میں جو آیت آئے

(۱) بخاری ۲/۶۲۸ باب وفد بنی حنیفہ۔ ولفظہ: كُنَّا نَعْبُدُ الْحَجَرَ فَإِذَا وَجَدْنَا حَجَرًا هُوَ أَخْيَرُ مِنْهُ أَلْقَيْنَاهُ وَأَخَذْنَا الْآخَرَ

آپ اسے کہیں کہ اس کا اولیاء مصداق ہیں، انبیاء مصداق ہیں، ملائکہ مصداق ہیں، جنات مصداق ہیں، اس بات کے ہم قائل نہیں ہیں، بلکہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو ان پر صادق نہیں آتیں بلکہ بے جان چیزوں پر ہی صادق آتی ہیں، میرے یہ باتیں ذہن میں رکھو، کسی وقت آپ کو یہ کام آجائیں گی۔

مذکورہ دعویٰ پر قرآنی دلائل

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں جس قسم کا شرک تھا، بنیاد اس کی چاہے کسی چیز پہ ہو کہ انہوں نے تصویریں بنائی تھیں اور کس نظریہ سے بنائی تھیں؟ فرشتوں کی بنائی تھیں، اولیاء کی بنائی تھیں، انبیاء کی بنائی تھیں، اس سے بحث نہیں ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں جو بُت انہوں نے بنائے ہوئے تھے، اس وقت جہالت اس درجہ پر تھی کہ وہ قوم انہی بتوں کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی جو سامنے رکھی ہوئی تصویریں تھیں، شخصیات ان کے سامنے نہیں تھیں اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ (سورۂ صافات: ۹۵) تَعْبُدُوْنَ کا مفعول کیا چیز ہے؟ مَا تَنْحِتُوْنَ۔ کیا تم ایسی چیزوں کو پُوجتے ہو جس کو خود تراشتے ہو، یہ صاف لفظی ترجمہ ہے، تو کیا وہ فرشتوں کو خود تراشتے تھے؟ انبیاء اور اولیاء کو تراشتے تھے؟ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ کیا اس کی پُوجا کرتے ہو جس کو خود تراشتے ہو؟ تو اس سے معلوم ہو گیا لکڑی اور پتھر کا تراش کے جو بناتے تھے اُن کی عبادت کا تعلق اسی کے ساتھ تھا۔

۲۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت بت پرستی کی تردید کی ہے، تو تردید کرنے کے لیے کیا تدبیر کی تھی؟ ٹکڑے کیے تھے نا؟ سارے توڑ پھوڑ دیے تھے نا؟ اور اس توڑنے پھوڑنے کو اس بات کی دلیل بنایا تھا کہ یہ خود عاجز ہیں، اپنے آپ کو نہیں بچا سکے، تمہیں کیا بچائیں گے، اور جس وقت بت خانے کے اندر گئے تھے، ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ دائیں ہاتھ کے ساتھ جو مارنا شروع کیا تھا تو ساتھ یہ بھی کہتے تھے اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۞ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ، اس کے مارا کہ تُو کھاتا کیوں نہیں؟ اس کے مارا (اور کہا) او تُو بولتا کیوں نہیں؟ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ کا قصہ جو سورۂ صافات میں ہے وہ یہی ہے نا؟ کہ کسی کے مارتے ''او تُو بولتا کیوں نہیں؟'' کسی کے مارتے ہیں اور کہتے ہیں یہ چڑھاوا پڑا ہے اس کو کھاتا کیوں نہیں؟ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا (سورۂ انبیاء: ۵۸ تا ۶۷) سب ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اور جب وہ قوم آئی تو ان کی حماقت اور بے عقلی اسی سے واضح کی کہ ان کو پُوجتے ہو جو اپنے آپ کو نہیں بچا سکے؟ انہوں نے کہا تھا کہ ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ، سوال کیا تھا نا؟ کہ ہمارے آلہہ کا یہ حال تُو نے کیا ہے اے ابراہیم؟ پھر ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہا کہ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ: کہ بھئی! بڑا یہ کھڑا ہے، اور ان سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں۔ تو انہی ٹوٹے ہوؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا نا؟ کہ فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ: اگر یہ بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو۔ انہوں نے آگے سے کہا تھا ابراہیم! تجھے پتا تو ہے کہ یہ تو نہیں بول سکتے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر کہا تھا کہ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: تُف ہے تم پر اور تمہاری ان چیزوں پر جن کو تم اللہ کے علاوہ پُوجتے ہو، کہ جو بول نہیں سکتے، تُف ہے تمہارے لیے اور تمہارے معبودوں کے لیے جن کو تم پُوجتے ہو۔ ایک آدمی ایک شخص کی تصویر لیے بیٹھا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں اس تصویر کو نہیں پُوجتا، میں نے تو اس کو صرف یاد دہانی کے طور پر رکھا ہوا ہے، پُوجتا تو میں فلاں آدمی کو ہوں جو پیچھے شخصیت ہے، تو کیا اس کی تصویر پھاڑ دینے

سے اُس کا عاجز ہونا لازم آ جائے گا؟ آپ کہیں کہ بھٹو کوئی چیز نہیں ہے، دیکھو! ہم نے اس کی تصویر پھاڑ دی، تو تصویر کے پھاڑ دینے سے کسی کا عجز معلوم ہوتا ہے؟ تو اگر شخصیت اور ہے اور یہ محض یاددہانی کے طور پر سامنے رکھی ہوئی چیزیں ہیں، تو ان کی تصویریں توڑنے سے یا ان کے پھاڑنے سے اُن کا عاجز ہونا کیسے لازم آ گیا؟ تو معلوم ہو گیا کہ یہی جن کو توڑا جا رہا ہے اُن کی عقیدت انہی کے ساتھ ہے، چاہے ان کی بنیاد کچھ ہو، لیکن جہالت کے زور سے آخر وہ شخصیات نظروں سے اوجھل ہو گئیں، اور یہ جو کچھ سامنے رکھا ہوا تھا سارے کے سارا مرکزِ توجہ یہی بن گیا، اس لیے ان کا توڑ دینا ان کے عجز کی دلیل ہے، ان کا نہ بولنا ان کے عجز کی دلیل ہے، ان کا اپنے آپ کو نہ بچا سکنا ان کے عجز کی دلیل ہے ...... اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (سورۂ حج: ۷۳) یہ تو اتنے عاجز ہیں کہ اگر مکھی ان کے چڑھاوں سے کوئی چیز اٹھا کر لے جائے تو یہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ یہ ساری کی ساری صورت انہی پر صادق آتی ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم کی آیات جہاں آ جائیں وہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ آپ ان کو انبیاء علیہم السلام پہ فٹ کریں، اولیاء پہ فٹ کریں، ملائکہ پہ فٹ کریں۔ بے جان معبود ان کے تھے، اور بعض بعض آیات ایسی ہیں جو صراحتاً انہی پر ہی صادق آتی ہیں۔

زیرِ درس آیات کا تعلق بے جان معبودوں کے ساتھ ہے

اسی سے تعلق ہے ان آیات کا جو میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ اب دیکھیے! آگے جو الفاظ آئیں گے ان الفاظ کے اندر یہ بات ہے کہ یہ مخلوق ہیں خالق نہیں ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کرتے ہیں کہ یہ کسی کو بنا نہیں سکتے خود بنائے ہوئے ہیں، تَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ میں جس طرح سے آیا، خود کچھ نہیں بنا سکتے بلکہ یہ خود بنائے ہوئے ہیں۔ اب یہ بات کہ خالق اللہ ہے اور باقی سب مخلوق ہے، یہ انبیاء علیہم السلام پر بھی صادق آتی ہے، اولیاء پر بھی صادق آتی ہے، ملائکہ پر بھی صادق آتی ہے، یہاں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا: ان کے لیے کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جس طرح سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم اگر ان کو مدد کے لیے پکاریں تو یہ مدد کے لیے آتے ہیں (اللہ فرماتے ہیں) یہ مدد نہیں کر سکتے، اور نہ وہ اپنی خود ہی مدد کر سکتے ہیں، اُن کے اندر جان ہی نہیں، اُن کے اندر طاقت ہی نہیں کہ اپنے آپ کو بچا لیں، اگر اُن کو کوئی توڑنا چاہے کوئی پھوڑنا چاہے کوئی مارنا چاہے تو یہ اپنی مدد خود نہیں کر سکتے۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ: اگر تم انہیں بلاؤ کہ وہ تمہاری راہنمائی کریں تو تمہاری بات وہ مانتے نہیں، کہ تم انہیں کہو کہ ہمیں راستہ دکھا دو۔ کیونکہ معبود انسان کی زندگی کی ایک ضرورت ہے، وہ صرف دل کا بہلاوا نہیں، بلکہ زندگی کی ضرورت ہے، اور بڑی ضرورت یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ ہماری راہنمائی کرے کہ ہم یہ کام کس طرح کریں، تو یہ انسان کی ایک بڑی بنیادی ضرورت ہے۔ اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ کہ ہماری ہدایت کرو، ہمیں کوئی راہنمائی کرو تو لَا يَتَّبِعُوْكُمْ: یہ تمہاری بات نہیں مان سکتے، تمہاری اتباع نہیں کریں گے (عام تفاسیر)، یا (مطلب یہ ہے کہ) تم انہیں خود بلاؤ کہ آؤ ہم تمہیں راستہ دکھاتے ہیں، تم اس راستے پر چلو، تو یہ ساتھ چلنے کی طاقت نہیں رکھتے (نسفی)۔ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ: برابر ہے کہ تم انہیں پکارو یا تم چپ رہو، دونوں صورتیں برابر ہیں، نہ ان کو پکارنے کا پتا، نہ نہ پکارنے کا پتا۔ اچھا! آگے یہ بات آ گئی کہ "جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، وہ تمہاری طرح بندے ہی ہیں، انہیں پکارو، چاہیے کہ یہ تمہاری بات کو مانیں اگر تم سچے ہو" پھر اللہ تعالیٰ اُن کے عجز کو

زیادہ نمایاں کرتا ہے کہ ''جن کو تم پکار رہے ہو، کیا ان کے پاس ایسی ٹانگیں ہیں جن کے ساتھ یہ چلتے ہوں؟ کیا ان کے پاس ایسے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ یہ پکڑتے ہوں؟ کیا ان کے لیے ایسی آنکھیں ہیں جن کے ذریعے سے دیکھتے ہوں؟ کیا ان کے لیے ایسے کان ہیں جن کے ذریعے سے سنتے ہوں؟'' یہ سارا انہی کے معبودوں پر تبصرہ چلا آ رہا ہے، تو یہ آیتیں زیادہ صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں ان پتھروں کے معبودوں پر اور بے جان چیزوں پر بمقابلہ اس کے کہ ان کو کسی دوسرے پر صادق کرنے کی کوشش کی جائے (چاہے وہ بھی تھے، اُن کی تردید کے لیے دوسری آیات ہیں)۔ کیوں؟ کہ اگر ہم اس سے فرشتے مراد لے لیں تو کیا ان پر یہ بات صادق آتی ہے کہ اُن کے کان بھی نہیں ہیں، اُن کی آنکھیں بھی نہیں ہیں، وہ چل پھر بھی نہیں سکتے، کسی کی بات سن بھی نہیں سکتے۔ یہاں فرشتے جو اس وقت بیٹھے ہیں، اس مجلس میں بھی تو ہیں، تو کیا ان کی آنکھیں نہیں ہیں جن کے ذریعے سے وہ دیکھتے ہوں؟ کان نہیں ہیں جن کے ذریعے سے سنتے ہوں؟ اور اگر کسی نے زندہ پیر کو معبود بنالیا (آخر زندہ پیر کو بھی تو لوگ معبود سمجھتے ہیں، کہ یہی خدا ہے جو ہمارے سامنے آ گیا، اس کو سجدہ کرتے ہیں، اسی کی طرف منہ کر کے سب کچھ کرتے ہیں) تو کیا زندہ پیر پر یہ آیتیں صادق آئیں گی؟ کہ اس کے پاس تو ٹانگیں ہی نہیں ہیں جن کے ساتھ وہ چلے۔ وہ کہے گا ٹانگیں تو ہیں میں تو چلتا ہوں۔ ان کے پاس ہاتھ ہی نہیں ہیں جن کے ذریعے سے یہ پکڑیں، اُن کے پاس آنکھیں ہی نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ دیکھیں، ان کے پاس کان ہی نہیں ہیں جن کے ذریعے سے سنیں، اس لیے یہ آیات اس پر صادق نہیں آئیں گی۔ ملائکہ کو اگر شریک کیا ہے تو ان کی تردید کے لیے اور آیات ہیں، انبیاء علیہم السلام کو اگر شریک کیا ہے تو اُن کی تردید کے لیے اور آیات ہیں، لیکن یہ آیات زیادہ صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں بے جان چیزوں پر، لیکن چونکہ وہ ان کی شکلیں انسانوں جیسی بناتے تھے، تو یہ کہا گیا ہے کہ اگر زیادہ سے زیادہ ان کو کہو گے تو یہ انسان ہیں لیکن پھر بھی تم جیسے ہی ہیں، جیسے تم اللہ کے پیدا کیے ہوئے ویسے یہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے، اس سے بڑھ کر اور حقیقت تو کوئی نہیں ہے۔ تو یہ الفاظ ان (بتوں) پر زیادہ صادق آتے ہیں...... اور اس سے آگے ایک اور بھی زیادہ واضح بات آ گئی کہ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ: تو دیکھتا ہے کہ یہ تیری طرف جھانک رہے ہیں۔ تو کیا یہ بات ملائکہ پر صادق آتی ہے؟ تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری طرف جھانک رہے ہیں؟ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ: دیکھ رہے ہو کہ وہ تمہاری طرف جھانک رہے ہیں، حالانکہ انہیں نظر کچھ نہیں آتا۔ یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ یہ جو پتھر کا بت تراش کے اتنی بڑی بڑی آنکھیں بنا کے رکھا ہوا ہے، جس طرح کاغذ کے اوپر فوٹو ہوتا ہے کہ بیٹھا یوں جھانک رہا ہے، آنکھیں اس کی کھلی ہوئی ہیں، تو ہم کہیں گے کیوں اس کو پوج رہے ہو؟ نہ اس کی ایسی آنکھیں جن کے ساتھ دیکھے، نہ اس کے ایسے کان جن کے ساتھ سنے، نہ اس کی ایسی ٹانگیں جن کے ساتھ یہ چلے، نہ اس کے ایسے ہاتھ جن کے ساتھ یہ پکڑے، تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری طرف یہ جھانک رہے ہیں حالانکہ نظر انہیں کچھ نہیں آتا، معلوم ایسے ہوتا ہے جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے تمہیں دیکھ رہے ہیں لیکن نظر انہیں کچھ نہیں آتا۔ اب اگر خواہ مخواہ ان آیات کو ہم فرشتوں پر لگائیں یا دوسروں پر لگائیں تو اشکالات پیش آئیں گے، کہ اگر کسی نے زندہ کو معبود بنالیا، تو اس پر یہ بات کیسے صادق آ گئی؟ کیا فرشتوں کی آنکھیں نہیں ہیں جو دیکھیں؟ کیا فرشتوں کے کان نہیں ہیں جو سنیں؟ کیا فرشتے کسی کو دیکھ نہیں سکتے؟ اور یہ فرشتے جو ہمارے پاس ہیں کیا یہ ہماری بات نہیں سنتے؟ خواہ مخواہ کے اِشکالات پیدا ہوتے ہیں، پھر پیچ وتاب کھانے پڑیں گے کہ جی! ایک اسباب کے مطابق ہوتا ہے، اور

ایک اسباب کے خلاف ہوتا ہے، مافوق الاسباب ہوتا ہے، تو مافوق الاسباب کوئی نہیں سن سکتا، مافوق الاسباب کوئی نہیں دیکھ سکتا، تو خواہ مخواہ ایک پیچیدہ بات ہو کر چیستان بن جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو اگر شریک ٹھہرایا گیا تو وہ بھی غلط، اس کی تردید کے لیے بھی قرآنِ کریم میں آیات ہیں، فرشتوں کو بنایا گیا، جنات کو بنایا گیا، سب کو بنایا گیا، اور سارے کے سارے جتنے بھی مشرک ہیں، چاہے وہ انبیاء علیہم السلام کو شریک بناتے ہوں، چاہے اولیاء کو بناتے ہوں، چاہے جنات کو بناتے ہوں، کسی کو بناتے ہوں وہ سب مشرک ہیں شرک کرنے والے ہیں، لیکن ان کی تردید کے لیے قرآنِ کریم میں مختلف جگہ پر مختلف آیات ہیں۔ اور یہ مشرکینِ مکہ سارے کے سارے زیادہ تر تصویروں میں ہی الجھے ہوئے تھے، بنیاد اُن کی چاہے اس سے اٹھائی گئی ہو کہ یہ مختلف شخصیات کی تصویریں ہیں، لیکن بعد میں جہالت نے جوزور مارا تو ان کے سامنے صرف وہ تصویریں اور بت ہی رہ گئے، پھر شخصیات بھی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ اس لیے ایسی آیات جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بت شکنی کرنا اور ان کو توڑ کے ان کے عجز پر استدلال کرنا، اور یہ کہنا کہ تو بولتے کیوں نہیں ہو...... اب تردید تو کرنی ہے آپ نے ایک آدمی کی جس کو لوگوں نے بنالیا کہ یہی سب کچھ ہے، اور آپ اُس کی تصویر پر جوتے مار مار کے کہیں کہ تو بولتا کیوں نہیں؟ تیرے سامنے یہ چیز رکھی ہوئی ہے تو اس کو کھاتا کیوں نہیں؟ اب یہ بھلا کوئی عقل مندی معلوم ہے؟ اس تصویر کو آپ بااختیار سمجھیں گے تو یہ بات صادق آتی ہے نا، اور اگر اس تصویر کو بااختیار سمجھتے ہی نہیں پھر اُس کو کہنا کہ تو کھاتا کیوں نہیں، تو بولتا کیوں نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تو تو کچھ نہیں، یہ بات عقل کے مطابق نہیں ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام جو کہ اعقل الناس ہوتے ہیں وہ اس قسم کی بے معنی گفتگو نہیں کرتے، جب وہ ان بتوں کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے...... جس طرح اسرائیلیوں نے بچھڑے کو خدا بنایا تو بچھڑے کو ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ذبح کر کے اُس کا عجز ظاہر کیا، اور قرآنِ کریم نے یہی کہا کہ دیکھتا ہی نہیں، کہ نہ وہ ان سے کوئی بات کرتا ہے، نہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے، نہ ان کو کوئی ہدایت کرتا ہے، اس عجل کو انہوں نے اِلٰہ کیسے بنالیا...... تو اس قسم کے حالات ان چیزوں پر صادق آتے ہیں، جن کی آنکھیں لوگوں نے بنائی ہیں لیکن بینائی نہیں ہے، ٹانگیں بنائی ہیں لیکن چلنے کی طاقت نہیں ہے، ہاتھ بنائے ہیں لیکن پکڑنے کی طاقت نہیں ہے، انہیں پکارتے رہو وہ تمہاری بات کو سنتے نہیں، تم چیخو چلاؤ جو کچھ کرو وہ نہیں سنتے، اُن میں سننے کی طاقت ہی نہیں ہے، ان کے پاس ایسے کان ہی نہیں جن کے ساتھ وہ سنیں، تو اس قسم کی عاجز مخلوق کو تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟ تو اگلے الفاظ میں اسی طرح سے اُن کے شرکاء پر تبصرہ ہے کہ یہ عاجز ہیں، یہ شریک ٹھہرانے کے قابل نہیں، جن چیزوں کو انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔

خلاصۂ آیات

کیا شریک ٹھہراتے ہیں ایسی چیز کو جو پیدا نہیں کرتی کچھ بھی، اور وہ پیدا کیے جاتے ہیں، نہیں طاقت رکھتے وہ ان کے لیے مدد کی، اور نہ وہ اپنے نفسوں کی مدد کرتے ہیں، اگر تم ان کو پکارو ہدایت کی طرف تو یہ تمہاری اتباع نہیں کرتے، برابر ہے تم پر کہ تم ان کو پکارو یا تم چپ رہو، ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں ہے، نہ پکارنے سے کچھ پتا چلے، نہ چپ رہنے سے۔ بیشک وہ چیزیں جن کو تم

پکارتے ہو اللہ کے علاوہ وہ تم جیسے ہی بندے ہیں، یعنی زیادہ سے زیادہ تم نے ان کی شکلیں جو انسانوں جیسی بنا لیں، تو یہ انسان بھی ہوتے تو تم جیسے ہی بندے تھے، اس سے زیادہ بڑھ کر تو کوئی بات نہیں ہے۔ فَادْعُوْهُمْ: تم انہیں پکارو، فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ: چاہیے کہ وہ تمہاری بات کو مانیں، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے لئے ٹانگیں ہیں جن کے ذریعے سے یہ چلتے ہوں؟ کیا ان کے لئے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ یہ پکڑتے ہوں؟ کیا ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ یہ دیکھتے ہوں؟ یعنی ان کے ہاتھ ہیں تو سہی لیکن پکڑنے کی طاقت نہیں ہے، ٹانگیں ہیں تو سہی لیکن ٹانگوں کے ساتھ چلنے کی طاقت نہیں ہے، کان تم نے بنا تو رکھے ہیں لیکن یہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے، ایسے ہی آنکھیں تم نے ان کی بنا تو دیں لیکن ان کے ذریعے سے دیکھ نہیں سکتے۔ یہ سب بات بتوں پر اور فوٹوؤں اور تصویروں پر صادق آتی ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ بلاؤ تم اپنے شرکاء کو، لے آؤ، ان سب کو اکٹھا کر لو، ثُمَّ كِيْدُوْنِ: پھر میرے خلاف تم تدبیر کر لو، فَلَا تُنْظِرُوْنِ: پھر مجھے مہلت بھی نہ دو۔ میں دیکھوں گا تم میرا کیا کر لیتے ہو، میرا کیا بگاڑ لیتے ہو۔ میرا کارساز تو اللہ ہے جس نے کتاب اُتاری، اور وہی متولی ہے نیکوں کا۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، (یعنی پہلے ان کے شریک بننے کے قابل نہ ہونے کو بیان کیا تھا، اب قصداً ان کے عجز کو ظاہر کیا جا رہا ہے) جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، نہیں طاقت رکھتے تمہاری مدد کرنے کی، نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو سنتے ہی نہیں (تو لَا يَتَّبِعُوْا اور لَا يَسْمَعُوْا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہوا) دیکھتا ہے تو ان کو کہ جھانکتے ہیں تیری طرف، وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ: حالانکہ وہ دیکھتے نہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَاِمَّا
درگزر کرنے کو اختیار کیجئے اور حکم دیجئے اچھے کام کا اور جاہلوں سے اعراض کیجئے ﴿١٩٩﴾ اور اگر
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ
شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیش آجائے تو اللہ کی پناہ میں آجایئے، بے شک وہ سننے والا
عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ
جاننے والا ہے ﴿٢٠٠﴾ بے شک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں جس وقت شیطان کی طرف سے ان کو کوئی خیال چھوتا ہے
تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي
تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں پس اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ﴿٢٠١﴾ اور شیاطین کے بھائی، شیاطین اُن کو کھینچتے ہیں

الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ

گمراہی میں، پھر وہ کوتاہی نہیں کرتے ﴿۲۰۲﴾ اور جب تُو نہ لائے اُن کے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہیں چُن لایا تُو اس نشانی کو،

قُلْ إِنَّمَآ أَتَّبِعُ مَا يُوْحٰىٓ إِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ

آپ کہہ دیجئے کہ سوائے اس کے نہیں کہ میں پیروی کرتا ہوں اس چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے میرے رَبّ کی جانب سے،

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَإِذَا

یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رَبّ کی طرف سے اور راہنمائی ہے اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں ﴿۲۰۳﴾ اور جب

قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

قرآن پڑھا جائے تو اُس کو توجہ سے سُنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۲۰۴﴾

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ

یاد کر تُو اپنے رَبّ کو اپنے دِل میں عاجزی کرتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور بُلند آواز سے کم آواز کے ساتھ

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ

(یاد کر تُو) صبح وشام اور غافلوں میں سے نہ ہو ﴿۲۰۵﴾ بےشک وہ لوگ جو تیرے رَبّ کے پاس ہیں

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ۩

نہیں تکبّر کرتے اُس کی عبادت سے اور اُس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اسی کے لئے سجدہ کرتے ہیں ﴿۲۰۶﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ خُذِ الْعَفْوَ: خُذْ: اختیار کیجئے، الْعَفْوَ: عفو کو۔ عفو کو اختیار کیجئے، درگزر کرنے کی عادت ڈالئے، وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ: عرف معروف کے معنی میں ہے، معروف کہتے ہیں نیکی کے کام کو، اصل اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ایسا کام جو کہ عقلاً، فطرۃً، شرعاً پہچانا ہوا ہے، جانا ہوا ہے، معروف ہے، اور منکر کہتے ہیں جس کے اوپر عقلاً، شرعاً انکار کیا ہوا ہو، تو اس کا مفہوم ہوتا ہے بُرائی۔ ''حکم دیجئے بھلائی کا، حکم دیجئے اچھے کام کا'' وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ: اور جاہلوں سے اعراض کیجئے، وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ: إِمَّا: إن ما، ما زائدہ اور اِن شرطیہ۔ اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیش آجائے۔ نزغۃ کہتے ہیں چوکا لگانے کو، شیطان کوئی چوکا لگادے، شیطان کی طرف سے وسوسہ آجائے، کوئی چھیڑ چھاڑ ہوجائے شیطان کی طرف سے،

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ: تو اللہ کی پناہ میں آجایئے، اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ: بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ پناہ طلب کیجئے اللہ کی، بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا: بیشک وہ لوگ جوتقوی اختیار کرتے ہیں، اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ: طائف اصل میں گھومنے والے کو کہتے ہیں، طَافَ یَطُوْفُ: گھومنا یہاں سے وہی! خیال اور وسوسہ مراد ہے۔ جس وقت شیطان کی طرف سے ان کو کوئی خیال چھوتا ہے، تَذَكَّرُوْا: تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ: پس اچانک وہ مبصر بن جاتے ہیں، پس اچانک وہ مبصر ہوتے ہیں، یعنی ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، ان کو بصیرت حاصل ہوجاتی ہے، وَاِخْوَانُهُمْ: اور شیاطین کے بھائی، یَمُدُّوْنَهُمْ: شیاطین ان کو کھینچتے ہیں، اِخْوَانُهُمْ کی ''هم'' ضمیر شیاطین کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور شیاطین کے بھائی، شیاطین ان کو کھینچتے ہیں، فِی الْغَیِّ: گمراہی میں، ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ: پھر وہ کوتاہی نہیں کرتے، وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ: اور جب تُو نہ لائے اُن کے پاس کوئی نشانی، قَالُوْا: کہتے ہیں: لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا: کیوں نہیں چن لایا تو اس نشانی کو، کیوں نہیں چھانٹ لایا تو اس نشانی کو، قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ: آپ کہہ دیجئے کہ سوائے اس کے نہیں کہ میں پیروی کرتا ہوں اس چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے میرے رَبّ کی جانب سے، هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ: بصائر بصیرت کی جمع ہے، بصیرت دل کی روشنی کو کہتے ہیں، هٰذَا کا اشارہ قرآنِ کریم کی طرف ہے۔ ''یہ قرآنِ کریم تمہارے رَبّ کی طرف سے روشنیاں ہیں'' یعنی روشنی کے دلائل ہیں روشنی کے اسباب ہیں، اگر ان کے اندر غور کرو گے تدبر کرو گے تو اس سے تمہیں روشنی حاصل ہوگی، ''یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رَبّ کی طرف سے اور راہنمائی ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان لاتے ہیں'' ھُدیً ہے اپنے ابتدائی مراحل کے اعتبار سے، اور جس وقت اس سے راہنمائی حاصل کی جائے تو نتیجۂ رحمت ہے۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ: اور جب قرآن پڑھا جائے، فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ: تو اس کو توجہ سے سنا کرو، وَاَنْصِتُوْا: اور خاموش رہا کرو، لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ: یاد کرتو اپنے رَبّ کو اپنے دل میں، تَضَرُّعًا: زاری کرتا ہوا، عاجزی کرتا ہوا، وَّخِیْفَةً: ڈرتا ہوا، وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ: اور بلند آواز سے کم آواز کے ساتھ، جھر من القول سے کم کے ساتھ، زیادہ بلند آواز سے کم کے ساتھ، ایسی آواز سے جو کہ پکارنے سے کم ہو، چیخنے چلّانے سے کم ہو، جھر من القول سے کم درجہ ہو۔ ''یاد کر تو اپنے رَبّ کو'' بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: صبح شام۔ غدو: صبح۔ اور اصال: شام۔ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ: اور غافلوں میں سے نہ ہو۔ ''بیشک وہ لوگ جو تیرے رَبّ کے پاس ہیں، نہیں تکبر کرتے اس کی عبادت سے اور اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اسی کے لئے سجدہ کرتے ہیں۔''

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

تفسیر

ماقبل سے ربط، مذکورہ آیات کا مضمون

سورۂ اعراف کی یہ آخری آیات ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو اور آپ کی وساطت سے آپ کے ماننے والوں کو کچھ نصیحتیں فرمائی ہیں، کچھ احکام دیے ہیں، ساری سورت کے مضامین آپ کے سامنے بالتفصیل گزر گئے، آپ

نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر مشرکین کی تردید کی گئی ہے، اور خاص طور پر ان آخری رکوعوں میں اور پھر اسی رکوع میں جو آپ کے سامنے گزر رہا ہے، ان کے معبودوں پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور جب اس قسم کے حالات ہوں تو جاہل آدمی، جس وقت اس کے خیال کی تردید کی جائے، اور اس کے مسلک کا حماقت ہونا ظاہر کیا جائے، تو جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ آئے تو بسا اوقات جاہل گالی گلوچ پر اتر آتا ہے، جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ آئے تو گالی گلوچ شور شرابا، کچھ اس قسم کی بات پہ آجاتے ہیں، تو ایسے وقت میں اہلِ حق کو بھی غصہ آسکتا ہے، اور غصہ آجانے کی صورت میں پھر دنگا فساد شروع ہو جائے گا، اور یہ دنگا فساد ایک ایسی صورت ہے کہ جب بھی آپس میں ایک دفعہ ہو جائے تو جانبین میں ضد آجاتی ہے، پھر کوئی کسی کے سمجھانے سے سمجھا نہیں کرتا، اور یہ روزمرہ کے واقعات ہیں آپ کے سامنے، کہ جہاں کسی بات میں اختلاف ہوا، اور اس اختلاف کو دنگا فساد کا ذریعہ بنالیا گیا تو اس کے بعد پھر ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، پھر ہزار کوشش کرو، دلیل کا جواب کسی پاس ہو یا نہ ہو، لیکن آپ کی بات مانے گا کوئی نہیں، اس دنگا فساد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔

متبعینِ سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نصیحت

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں، اور آپ کی وساطت سے آپ کے متبعین کے لیے بھی یہی نصیحت ہے خُذِ الْعَفْوَ کہ درگزر کرنے کی عادت ڈالیے، اس لیے ان باتوں کو سن کے اگر کوئی شخص اشتعال میں آجائے، اور آپ کے سامنے کوئی اشتعال انگیزی کرے، بدتمیزی کرے تو آپ اس سے انتقام لینے کی کوشش نہ کریں، بلکہ درگزر کر جائیں اور نیکی کی تلقین کرتے رہیں، اچھی باتیں انہیں سکھاتے رہیں، باقی جاہلوں سے منہ موڑ لو، جاہل اگر کسی قسم کی جہالت کرتا ہے تو اس کے ساتھ الجھو نہیں، جیسے کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی اچھے لوگوں کی یہی علامت ذکر کی گئی اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (سورۂ فرقان: ۶۳) کہ جب جاہل لوگ ان سے کسی قسم کا خطاب کرتے ہیں، تو یہ لوگ سلامتی کی بات کہہ کے چلتے لگتے ہیں، اُن کے ساتھ کسی قسم کے اُلجھتے نہیں۔ ایک جگہ یہ لفظ بھی ہیں لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ (سورۂ قصص: ۵۵) کہ وہ یوں کہہ دیتے ہیں کہ ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے، جاہلوں سے اُلجھنا ہمارا کام نہیں ہے۔ تو اس لیے اگر کوئی شخص جہالت کی بات کرتا ہے، اشتعال انگیزی کی بات کرتا ہے (جہالت سے اشتعال انگیزی مراد ہے، حلم کے مقابلے میں اس کا معنی مراد ہوتا ہے) اگر کوئی اشتعال انگیزی کی بات کرتا ہے، جہالت کی وجہ سے بڑیں مارتا ہے تو اس سے اُلجھو نہیں، بلکہ اس سے منہ پھیر جاؤ، اس سے درگزر کر جایئے، اعراض کر جایئے۔

اچھے اخلاق کے مظاہرے کا فائدہ

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ: اور ایسے موقع پر اگر شیطان کوئی چوکا لگائے، اور تمہیں بھی اشتعال دلائے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو، جس طرح عام طور پر آپ لوگوں نے سبق پڑھ رکھا ہے، کہ ''اینٹ کا جواب پتھر، تبھی جا کے حالات ٹھیک ہوتے ہیں!'' ایسی بات نہیں ہے، جہالتوں کو برداشت کرنا اور اُن کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا، درگزر سے کام لینا، نیکی کی تلقین

کرتے رہنا، اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا، بسا اوقات اس کے ساتھ حالات جلدی سنبھلتے ہیں بمقابلہ اس کے کہ اینٹ کے جواب میں پتھر اٹھایا جائے۔ تو اگر شیطان اس قسم کا کوئی وسوسہ ڈالے اور تمہیں بہکائے، اُکسائے تو فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ فوراً اللہ کی پناہ میں آجایا کرو، اللہ کی پناہ طلب کیا کرو۔ جس وقت اللہ سے پناہ طلب کرو گے تو شیطانی اثرات ختم ہوجائیں گے۔ چنانچہ غصہ جس وقت آتا ہے تو شیطانی اثرات انسان کے اندر اُبھرتے ہیں لڑائی بھڑائی کے لئے، ایک روایت میں ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے، ایک شخص کو بہت غصہ آیا ہوا تھا، آپ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص پڑھ لے تو اس کا غصہ چلا جائے گا، اور وہ کلمہ یہی فرمایا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ''۔(۱) تو غصے کی حالت میں اگر یہ کلمہ پڑھ لیا جائے تو غصہ فرو ہوجاتا ہے۔ جیسے ایک روایت میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے، اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہوا ہے، اس کو پانی سے بجھایا کرو۔(۲) چنانچہ غصے کی حالت میں ٹھنڈا پانی پینا مفید ہوتا ہے، اس سے غصہ ہلکا ہوجاتا ہے، غصے کی حالت میں پانی پیا جائے تو اس سے بھی غصے کے جذبات سرد ہوجاتے ہیں۔ تو اللہ کی پناہ لو۔ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے، سب حالات سنتا ہے، سب کے حالات جانتا ہے، وہ آپ کی حفاظت کرے گا۔

بوقتِ وسوسۂ شیطانی متقی لوگوں کی شان

آگے ایک بات عام ضابطے کے طور پر ذکر کردی، کہ متقی لوگوں کی یہ شان ہے کہ اگر کبھی اُن کو شیطانی وسوسہ آجاتا ہے، شیطان اُن کے دل میں خیال تو ڈالتا ہے، شیطانی وسوسہ اگر کبھی آجاتا ہے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں، اُن کو اللہ یاد آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان شیطانی حرکات پر جو وعیدیں ہیں وہ یاد آجاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام یاد آجاتے ہیں، فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ: اچانک اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بس اللہ کی طرف دھیان گیا فوراً دل کے اندر ایک روشنی پیدا ہوجاتی ہے، اور اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، سیدھی راہ اُن کے سامنے واضح ہوجاتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ شیطان ہمیشہ غافل قلب کے اندر وسوسہ ڈالتا ہے، شیطان انسان کے دل پر بیٹھا رہتا ہے، اور اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کے اس کے اندر وسوسہ ڈالتا ہے، اور جس وقت انسان اللہ کو یاد کرتا ہے تو پھر یہ خَنَّس پیچھے کو ہٹ جاتا ہے۔(۳) چنانچہ شیطان کے ناموں میں سے ایک نام خناس بھی ہے، خناس کا معنی پیچھے کو ہٹنے والا، کہ اللہ کا نام سن کر فوراً یہ پیچھے کو ہٹتا ہے، تو جہاں غفلت آئے گی وہاں شیطان کا وسوسہ آئے گا، اور جہاں اللہ یاد رہے، اللہ کی طرف دھیان رہے تو ایسی صورت میں پھر شیطان کے حملہ سے انسان محفوظ رہ جاتا ہے۔ تو وہ لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں چونک جاتے ہیں، پس اچانک اُن کو سمجھ آجاتی ہے، اُن کے دل روشن ہوجاتے ہیں، ہدایت کی راہ اُن کے سامنے واضح ہوجاتی ہے...... اور جو اللہ کو یاد نہیں کرتے، بلکہ شیطانوں کے بھائی بنے ہوئے ہیں، اللہ سے غافل ہوکر اُن

(۱) بخاری ۲/ ۹۰۳ باب الحذر من الغضب/ مشکوۃ ۱/ ۲۱۳ باب الدعوات فی الاوقات، فصل اول۔

(۲) ابوداؤد ۲/ ۳۰۴ باب ما یقال عند الغضب/ مشکوۃ ۲/ ۴۳۴ باب الغضب، فصل ثانی۔

(۳) مشکوۃ ۱/ ۱۹۹ باب ذکر اللہ، فصل ثالث۔ ولفظہ: الشیطان جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللہ خنس واذا غفل وسوس

کی دوستی شیطانوں کے ساتھ ہی ہے تو شیاطین اُن کو گمراہی میں کھینچتے ہیں، کھینچنے کا معنی کہ مزید ترقی دیتے رہتے ہیں، ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ: پھر وہ کوتاہی نہیں کرتے، بلکہ پوری کوشش کے ساتھ اُن کو گمراہ کرتے ہیں، اور یہ گمراہی سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے، اس طرح پھر شیاطین اُن کو گمراہی کی انتہا کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لیے جاہلوں کی اشتعال انگیزی پر اگر کوئی اس قسم کا دل کے اندر وسوسہ آتا ہے، تو اس کا علاج اللہ کی یاد سے کیجئے، اور استعاذہ کیجئے۔

منہ مانگے معجزے کے متعلق عادۃ اللہ

اور ان جاہلانہ باتوں میں سے ایک بات یہ بھی تھی، جیسے مثال کے طور پر آ گئی، کہ ان کے سامنے ہزار دلائل پیش کرو، ہزار معجزات پیش کرو، لیکن اُن کی پھر وہی بات ''مرغی کی ایک ٹانگ'' کہ جیسا معجزہ ہم مانگتے ہیں تم ویسا کیوں نہیں لاتے، اور یہ بہت دفعہ آپ کی خدمت میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ ہر انسان کے منہ کی مانگی ہوئی بات اُس کے سامنے ظاہر نہیں کرتا، اگر ایسا کرے تو پھر حجت ختم ہو جاتی ہے، پھر تباہی آ جاتی ہے، آپ کے سامنے واقعات میں یہ بات گزری ہے کہ جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام سے کوئی خاص معجزہ مانگا اور نبیوں نے ظاہر کیا، پھر وہ نہیں مانے تو اُن کو برباد کر دیا گیا۔ ورنہ نبوت کے لیے دلائل قائم ہونے چاہئیں، جب وہ دلائل قائم ہو جائیں تو ہر شخص جو منہ سے کہے، اُس کی بات کا پورا کرنا ضروری نہیں ہوتا، اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو یہ بات کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتی، ایک آدمی کہے گا یہ کر کے دکھاؤ، دوسرا کہے گا یہ کر کے دکھاؤ، تیسرا کہے گا یہ کر کے دکھاؤ، یہ تو سارے کا سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا، ایک دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل چاہیے، اور ایک دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے گواہ چاہئیں، گواہوں پر آپ جرح کر سکتے ہیں کہ یہ گواہ صحیح نہیں، یہ سچا نہیں، یہ دلیل صحیح نہیں، اس کا یہ مقدمہ غلط ہے، یہ تو آپ جرح کر سکتے ہیں، باقی آپ یہ کہیں کہ میں اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک فلاں آدمی شہادت نہ دے، یہ دنیا کی عدالت کا اُصول نہیں ہے، جو گواہ پیش کیے جا رہے ہیں اُن پر جرح کیجئے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط ہیں، جو دلیل دی جا رہی ہے اُس کا مقدمہ توڑیے کہ یہ دلیل صحیح ہے یا غلط، باقی یہ کہنا کہ فلاں شخص اگر کہے گا تو میں مانوں گا، یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ اسی طرح سے جو معجزات پیش کیے گئے ہیں وہی دلیل نبوت ہیں، ان پر تو آپ اعتراض کیجئے کہ ان میں کیا خامی ہے، باقی تم یہ کہو کہ فلاں چیز دکھاؤ گے تب ہم مانیں گے یہ کوئی اُصول نہیں ہے۔ ''جب آپ اُن کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے''، یعنی اُن کی مانگی ہوئی، جیسی وہ کہتے ہیں ''تو وہ کافر کہتے ہیں کیوں نہیں چھانٹ لائے آپ ان نشانیوں کو'' یعنی وہ اس بات میں اشارہ کرتے تھے، گویا کہ یہ قرآنِ کریم کی آیات اور یہ باتیں تو تم پچھلی تاریخوں سے چھانٹ چھانٹ کر ہمارے پاس لا رہے ہو اور ہمیں سنا رہے ہو، یہ آپ کے بنائے ہوئے قصے کہانیاں ہیں، جیسی نشانی ہم کہتے ہیں آپ اس کو کہیں سے چھانٹ کر کیوں نہیں لے آتے، مقصد ان کا یہ تھا۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ چھانٹ کے لانا تو میرے بس کی بات نہیں، اللہ کی طرف سے مجھے جو وحی ملتی ہے میں تو اُسی کی اتباع کرتا ہوں'' یہ ہے آگے سے شریفانہ بات کہ بھئی! جو تم کہتے ہو یہ بات تو ہمارے اختیار میں ہے نہیں، ہم تو اللہ کے احکام کے متبع ہیں، جیسی وحی آتی ہم ویسا کام کر لیتے ہیں۔

آدابِ تلاوتِ قرآنِ کریم

باقی یہ کتاب جو تمہارے سامنے پیش کی جارہی ہے، یہ تمہارے رَبّ کی طرف سے بصیرتیں ہیں، بصیرت کے دلائل ہیں، دل کی روشنی حاصل کرنے کے دلائل ہیں، اس کی ایک ایک بات بصیرت کا باعث ہے، واضح نشانیاں ہیں، بصائر بصیرت کی جمع ہے، بصیرت دل کی روشنی کو کہتے ہیں، یعنی یہ کتاب بصائر ہے، یعنی اس کی جتنی آیات ہیں وہ ساری کی ساری دل کی روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، ان میں غور کرو۔ ''یہ ہدایت ورحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین لاتے ہیں۔'' لیکن اس سے فائدہ کب اٹھاسکو گے؟ یہ بصائر ہے یہ ہدیٰ ہے یہ رحمت ہے، لیکن اس فائدہ کب اٹھاؤ گے؟ جب اس میں تدبر کرو گے، تفکر کرو گے، سوچو گے، توجہ سے سنو گے، سمجھنے کی کوشش کرو گے۔ اور کافروں نے دوسرا طریقہ اپنا رکھا تھا وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (سورۂ حم سجدہ: ۲۶) کافر ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ جب یہ قرآن پڑھا جائے تو سنا نہ کرو، اور شور مچانا شروع کردیا کرو، ہوسکتا ہے کہ اس طریقے سے تم غالب آجاؤ، اور ان کی آواز کو دبالو، وہ کہتے تھے کہ اس کو سنو ہی نہیں، جب یہ پڑھنے لگیں تو شور مچانا شروع کردیا کرو، اور جب تم شور مچانا شروع کرو گے تو تمہارے سامنے ایک آدمی کی آواز دب جائے گی، جب تم یہ طریقہ اپناؤ گے کہ سننے کی تم کوشش نہیں کرتے، غور اس میں تم نہیں کرتے، تو تمہیں ہدایت کیسے حاصل ہوگی؟ اس لیے طریقہ یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اُس کو توجہ سے سنا کرو اور چپ ہوجایا کرو، تاکہ تم پر رحم ہو، پھر اللہ کی رحمت حاصل ہوگی، اگر توجہ کے ساتھ سنو گے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرو گے۔ ''خاموش ہوجاؤ اور توجہ کے ساتھ سنو'' یہ آیت جیسا کہ روایات حدیث دلالت کرتی ہیں خطبے کے متعلق اُتری یا نماز باجماعت کے متعلق اُتری، جس سے احناف استدلال کرتے ہیں کہ جب امام قرآن پڑھ رہا ہو تو اس وقت پچھلوں کے لیے پڑھنا جائز نہیں ہے، اس آیت سے بھی استدلال کیا گیا ہے، اور اسی طرح سے خطبے کے دوران بھی بات کرنی درست نہیں ہے، اور عام حالات میں جس طرح آپ بیٹھ کے تلاوت کیا کرتے ہیں، وہاں بھی ادب یہی ہے کہ اگر کوئی پڑھ رہا ہو تو اس کو توجہ کے ساتھ سنو، خاموش ہوکر بیٹھو، کان لگاؤ، ویسے عام حالات میں ضروری نہیں۔ مفسرین نے یہیں لکھا ہے کہ جہاں لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوں، یا دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہوں وہاں بلند آواز سے قراءت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ وہ اپنے کام کاج کی وجہ سے توجہ دے نہیں سکیں گے، اور یہ بلند آواز سے پڑھنے والا خواہ مخواہ اُن کو گناہ میں مبتلا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ خود گناہ گار ہوگا، تو ایسی جگہ بلند آواز سے قراءت نہیں کرنی چاہیے جہاں لوگ متوجہ نہ ہوں۔ ''جب پڑھا جائے قرآنِ کریم تو اُس کے لیے کان لگایا کرو اور خاموش ہوجایا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

ذکر اللہ تمام کامیابیوں کے لیے مفتاح

''اور اپنے رَبّ کو یاد کرتے رہا کرو'' یہی غفلت کو دُور کرنے والی بات ہے، کثرتِ ذکر اللہ تمام کامیابیوں کے لیے ایک مفتاح ہے، کہ جب اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کیا جائے تو دل کے اندر صلاحیت پیدا ہوتی ہے، شیطانی اثرات ختم ہوتے ہیں، غفلت دُور ہوتی ہے، ہر نیکی کا کام آسان ہوجاتا ہے اللہ کے ذکر کے ساتھ۔ اور شیطانی اثرات سے بچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ذکر اللہ

ہے۔ ''اپنے رَبّ کو یاد کیجئے اپنے دل میں'' دل میں یاد کرنے کی صورت یہی ہے، سوچو اللہ کی صفات کو، اللہ کی وعیدوں کو، اللہ کی بشارتوں کو، دل میں سوچتے رہو یہ ذکرِ قلبی ہے، اور ساتھ ساتھ زبان سے کچھ پڑھتے رہو آہستہ آہستہ چپکے چپکے یہ بھی ٹھیک ہے، یہ ذکرِ لسانی ہے، تو ذکرِ قلبی اور ذکرِ لسانی کو اگر جمع کر لیا جائے تو بالاتفاق یہ سب سے افضل ہے، اور اگر کوئی زبان سے نہ پڑھے صرف دل کے اندر اللہ کو یاد کرے تو یہ بھی اچھا طریقہ ہے، اور اگر دل غافل ہو اور زبان سے ذکر کیا جائے تو اس میں خاص برکات نہیں ہیں اگرچہ نفع سے وہ بھی خالی نہیں، جیسے کہ حدیث شریف میں ذکر کیا گیا ہے: ''لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ'' تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر کے ساتھ تروتازہ رہنی چاہیے۔[1] اور کل ہی ''مشکوٰۃ'' میں آپ پڑھ رہے تھے، کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''علیك بمجالس اھل الذکر'' اہلِ ذکر کی مجلسوں میں بیٹھو اور ''اِذَا خَلَوْتَ فَحَرِّكْ لِسَانَكَ مَا اسْتَطَعْتَ بِذِكْرِ اللهِ''[2] جب خلوت میں چلے جاؤ، اہلِ ذِکر کے پاس بیٹھنے کا موقع تمہیں نہ ہو، خلوت میں چلے جاؤ، تو جہاں تک ہو سکے اللہ کے ذِکر کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت دیتے رہو۔ تو زبان کو حرکت دیتے رہو یہ ذِکرِ لسانی ہے، لیکن دل اگر غافل ہو تو اتنے منافع حاصل نہیں ہوتے، اگرچہ پھر بھی نفع سے خالی نہیں ہے۔

ذِکر اللہ کے لئے بہتر طریقہ اور اوقاتِ مفیدہ

اللہ کو یاد ایسی صورت میں کیجئے کہ دل بھی متوجہ ہو اور زبان پر بھی اس کا نام ہو تسبیح ہو، تحمید ہو، تلاوت ہو، یہ سارے ذکر اللہ کے طریقے ہیں، یہ ذِکرِ لسانی ہو گیا، یہ تو ہے چپکے چپکے، اور اگر بلند آواز کے ساتھ ہی کرنا ہو تو چیخو چلاؤ نہیں، بلکہ جھر من القول سے کم آواز کے ساتھ، یعنی تھوڑے سے جہر کے ساتھ بھی اللہ کا ذکر کر سکتے ہو، اور بسا اوقات جہر کے ساتھ ذکر مفید ہوتا ہے، کہ اس کو قطعِ وسواس میں زیادہ دخل ہے، اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے حالات کے مطابق اس پر عمل کیا جاتا ہے، کہیں ذکر سری زیادہ نافع ہوتا ہے، کہیں جہر کرنا ہی مفید ہوتا ہے، قرآنِ کریم کی تلاوت میں بھی ایسے ہی ہے، چپکے چپکے تلاوت کرو تو آپ کی مرضی، اور اگر بلند آواز سے کرنا چاہتے ہو تو اتنی بلند آواز رکھو جو اپنے کانوں کو سنائی دے اور دوسرے لوگوں کو پریشان نہ کرے، یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہے۔ تہجد میں قرآن پڑھتے وقت بھی اسی طرح سے ہے، کبھی سراً پڑھو کبھی جہراً پڑھو، سرورِ کائنات ﷺ کی عادت بھی ایسے ہی تھی۔ ''اور صبح و شام اللہ کو یاد کرو'' صبح و شام سے یا تو صبح و شام کے اوقات مراد ہیں، جن کی زیادہ اہمیت ہے، چنانچہ اولیاء اللہ کے ہاں ہمیشہ صبح و شام ذکر کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، سورج نکلنے سے پہلے (یہ وقت جو چلا جا رہا ہے) اس میں بہت فضیلت ہے ذکر کرنے کی اور اللہ کو یاد کرنے کی، کہ اگر کوئی شخص فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سورج نکلنے تک ان لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، تو اس کی بہت فضیلت حدیث میں آئی ہے۔ تو اس میں اللہ کو یاد کیجئے، سورج نکلنے تک یہ خاص وقت ہے، اسی طرح سے شام کو عصر کے بعد مغرب تک، ان دو اوقات کے اندر زیادہ اہتمام کیا گیا، جیسے قرآنِ کریم میں لفظ آئے ہیں قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ

(۱) ترمذی ۲/۱۷۵، باب ما جاء فی فضل الذکر / مشکوٰۃ ۱/۱۹۸، باب ذکر اللہ، فصل ثالث۔

(۲) مشکوٰۃ ۲/۴۲۷، باب الحب فی اللہ، فصل ثالث، عن ابی رزینؓ / شعب الایمان، رقم ۸۶۰۸۔

وَّقَبْلَ غُرُوْبِهَا (سورۂ طٰہٰ: ۱۳۰)۔ یا صبح وشام کا لفظ بول کے دوام مراد ہے، جیسا کہ حاصل آ گیا کہ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ: غافلوں میں سے نہ ہوؤ، صبح وشام اللہ کو یاد کرو، ہر وقت اللہ کو یاد رکھو۔ تو زبان پہ تسبیح وتحمید ہو یہ بھی ٹھیک ہے، ورنہ اللہ کی یاد کا سب سے اعلیٰ معیار یہ ہے کہ جس وقت اللہ کی طرف سے جو حکم آئے اُس کی تعمیل کرتے چلے جاؤ، کبھی بھی غافل نہ ہوؤ کہ تمہیں اللہ کا حکم دیا نہ رہے۔ اور ایسے ہی سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے جو مختلف اوقات میں دُعائیں منقول ہیں، اُن دُعاؤں کا پڑھتے رہنا یہ بھی دائماً اللہ کو یاد کرنے کا طریقہ ہے، یعنی ایک شخص ہے، گھر میں داخل ہوتا ہے تو گھر میں داخل ہونے کی دُعا پڑھتا ہے، مجلس میں داخل ہوتا ہے تو مجلس میں داخل ہونے کی دُعا پڑھتا ہے، مسجد میں جاتا ہے تو مسجد میں داخل ہونے کی دُعا پڑھتا ہے، باہر آتا ہے تو نکلنے کی دُعا پڑھتا ہے، بازار میں جاتا ہے تو بازار کی دُعا پڑھتا ہے، یہ دُعائیں اگر پڑھتا رہے تو یہ بھی ایک قسم کا دائماً اللہ کو یاد کرنے والا ہو گیا، گویا کہ یہ غافل نہیں ہے، ''كَانَ يَذْكُرُ اللهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ ''(۱) حضور ﷺ ہر وقت اللہ کو یاد کرتے تھے۔ تو ہر وقت اللہ کو یاد کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی طرف دھیان رہے، اور جو وقتاً فوقتاً سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے دُعائیں مختلف اوقات اور مختلف حالات میں آئی ہیں، اُن کو پڑھتے رہیں تو یہ بھی دائماً اللہ کو یاد رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ تو غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ، صبح شام اللہ کو یاد کرو۔

فرشتوں کی تسبیح کا ذِکر اور اس کا مقصد

آگے ترغیب دینے کے لیے فرمایا دیا کہ جو تیرے ربّ کے پاس ہیں، یعنی فرشتے وہ تو اُس کی عبادت سے بالکل نہیں اکڑتے، تکبر نہیں کرتے، اُس کی تسبیح بیان کرتے ہیں، اور اُسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔ تو وہ مقرب ہیں، فرشتے ہیں، اعلیٰ معیار کے ہیں، تو باوجود اس بات کے کہ اللہ کے مقرب ہیں، پھر بھی اُس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، ہر وقت اُس کی تسبیح بیان کرتے ہیں، اور اُس کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔ ترغیب دینی مقصود ہے کہ تمہیں بھی ایسے ہی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر نہ کرو، بلکہ تواضع اور انکساری اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ اللہ کی عبادت کرتے رہو، اور اُس کی پاکی بیان کرو، اور سجدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھو، کیونکہ نماز کے ارکان میں سے سجدہ ایک رکن ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قرب انسان کو سجدے کی حالت میں سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے، جس کی بنا پر یہاں سجدہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ تو کثرتِ سجود یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے، لیکن کثرتِ سجود کا مطلب ہے کثرتِ صلوٰۃ، اور اگر بغیر نماز کے ویسے ہی سجدہ میں پڑ کے دُعا کرنا چاہیں وہ بھی جائز ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ زیادہ کرنے کا مطلب احادیث سے سمجھ یہی آتا ہے کہ نوافل کثرت سے پڑھے جائیں۔ تو فرضوں کے علاوہ اور نمازیں پڑھو جن میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ، عام حالات میں سجدہ میں پڑ کے اللہ کے سامنے دُعا کرو، تو یہ اللہ کو یاد کرنے کا طریقہ ہے، اور فرشتے اسی طرح سے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اُس کی عبادت کرتے ہیں۔ تو آخری آیت کے اندر یہ ترغیب دے دی گئی کہ اللہ کے مقرب فرشتے جس طرح سے اُس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، ہر وقت تسبیح وتحمید میں رہتے ہیں اور اللہ کو سجدے کرتے ہیں، تو کامل انسانوں کو چاہیے کہ وہ بھی ایسے ہی کریں، اگر وہ ایسا کریں گے تو یوں سمجھو کہ فرشتوں کی صف میں شامل

---

(۱) مسلم ۱/ ۱۶۲ باب ذکر الله فی حال الجنابة/ بخاری ۱/ ۴۴ باب تقضی الحائض/ مشکوٰۃ ۱/ ۴۹ باب مخالطة الجنب.

ہو گئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا قول ہے ''اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ''[1] جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے ساتھ ہوں، جو شخص مجھے یاد کرے میں اس کا ساتھی ہوں، میں اس کے ساتھ ہوں۔ تو خود یاد کرنے سے بھی اللہ کی معیت ملتی ہے، اور اللہ والوں کے ساتھ بیٹھنے سے بھی اللہ کی معیت ملتی ہے، جس طرح سے مولانا رومی ؒ کہتے ہیں:

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا گو نشیند در حضورِ اولیاء

یہ عنوان اسی حدیث سے ماخوذ ہے، جو شخص اللہ کے ساتھ ہم نشینی چاہتا ہے اُسے یہ کہہ دو کہ اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھا کرے، اگر وہ اولیاء اللہ کی صحبت میں بیٹھے گا تو اولیاء چونکہ ہر وقت اللہ کو یاد کرنے والے ہوتے ہیں، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ'': جو مجھے یاد کرے میں اس کے ساتھ ہوں، تو اولیاء اللہ کو ہر وقت اللہ کی معیت حاصل ہے عام انسان سے زائد، تو جس وقت آپ ان کی مجلس کے اندر بیٹھیں گے تو آپ کو بھی معیت حاصل ہو جائے گی، فرشتوں والی خصلتیں آپ کے اندر بھی آجائیں گی۔ تو ''عَلَیْكَ بِمَجَالِسِ اَهْلِ الذِّکْرِ'' (حوالہ گزر چکا) میں بھی اسی لیے ترغیب دی گئی ہے کہ شیطانی حملوں سے بچنے کے لیے خود ذاکر ہونا، ذاکروں کے پاس بیٹھنا، اہل اللہ کی مجلس کو اختیار کرنا، یہ گویا کہ فرشتوں والی خصلت کو اپنانے کا ایک ذریعہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معیت کو حاصل کرنے کے لیے ایک بہت آسان چیز ہے۔

سوال:- جب قرآن میں آ گیا کہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا، تو غیر مقلد حدیث کو کیسے دلیل بناتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قراءت کرنی چاہیے؟

جواب:- اصل یہ ہے کہ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا میں عبارۃ النص کے طور پر فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ ذکر نہیں کیا گیا، لیکن الفاظ کو اگر عام لے لیا جائے تو اس سے استدلال ہو سکتا ہے، یہ استدلال ظنی ہے، اس لیے بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ اِمام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہیے تو ان کا قول یہ ہے کہ سکتات یعنی جس وقت اِمام خاموش ہوتا ہے، تو درمیان میں پڑھو، جس وقت اِمام پڑھ رہا ہے تو ایسی صورت میں خاموش ہو جاؤ۔ ہمارا تو اِستدلال ہے، میں ویسے ہی کہہ رہا ہوں، کہ یہ ایسی قطعی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر ہم یہ کہیں کہ جو کوئی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے گا وہ قرآنِ کریم کا مخالف ہے، اتنا تشدّد میری طبیعت میں نہیں۔ روایات اور آیات کی طرف دیکھتے ہوئے مسئلہ مختلف فیہ ہے، اگر اس کو فاتحہ خلف الامام پر محمول کیا جائے اور اس کا مطلب یہ ہو کہ قرآنِ کریم میں یہ آیت اُتری ہی اس مسئلے کو بیان کرنے کے لئے ہے، اور اس کا معنی یہی ہے کہ جب امام پڑھیں تو مقتدی چپ رہیں، اگر اس کا یہی مطلب متعین ہوتا تو ائمہ ہدیٰ اس مسئلے کے اندر اختلاف نہ کرتے، ان الفاظ سے اِستیناس کیا جا سکتا ہے، یعنی اپنے مسلک کا اُنس حاصل ہوتا، کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے، تو توجہ سے سننا اور خاموش رہنا یہی رحمت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ تو جب ہم اکٹھے نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں تو اِمام قرآن پڑھتا ہے تو ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم چپ

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ ۱/ ۱۰۸، باب الرجل یذکر اللہ وھو علی الخلاء/ تفسیر قرطبی آل عمران آیت ۱۹۰ کے تحت/ نوٹ: کعب احبار سے موسیٰ کا اللہ سے مکالمہ منقول ہے، اس میں اللہ کا یہ قول ہے۔ اور بخاری ۲/ ۱۱۲۲، کتاب التوحید، باب قول اللہ لا تحرك، پر یہ لفظ ہیں اَنَا مَعَ عَبْدِیْ حَیْثُمَا ذَکَرَنِیْ وَتَحَرَّکَتْ بِیْ شَفَتَاهُ۔ اور ۲/ ۱۱۰۱ پر الفاظ ہیں: اَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ.

رہیں اور توجہ کے ساتھ سنیں، اور حدیث شریف میں یہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ "لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ" (ابوعوانہ:۱۶۶۸)، یا "لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ"[1] اس قسم کے الفاظ بھی ہیں، تو اس کو ہم محمول کرتے ہیں منفرد پر، یا محمول کرتے ہیں امام پر جو اپنی نماز کا خود ضامن ہے۔ کیونکہ جہاں امام کے مسئلے بیان کیے گئے ہیں جس کو حدیثِ اہتمام کہتے ہیں جس میں اقتداء کے مسئلے بیان کیے گئے ہیں، وہاں حضور ﷺ کا قول صحیح روایات میں یہ آتا ہے "اِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوْا" جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہا کرو، "اِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا" جس وقت امام رکوع کرے تو تم بھی رکوع کیا کرو۔ سارے ارکان کے اندر اسی طرح سے ہے، اور اسی میں اضافہ ہے کہ "اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا"[2] جس وقت وہ قرآن پڑھے، جس وقت وہ قراءت کرے تو تم چپ رہا کرو۔ اس قرینے سے ہم کہتے ہیں کہ مقتدی کے لئے حکم اِنصات کا ہے، اور نماز میں قرآن پڑھنا اس کے لئے ہے جو مقتدی نہیں، "مقتدی نہیں" اس میں پھر دو آ گئے امام اور منفرد، کہ امام بھی مقتدی نہیں ہوتا، اور منفرد بھی مقتدی نہیں ہوتا، ان کو تو قرآن پڑھنا چاہیے، اور جو نہ امام ہے نہ منفرد ہے، بلکہ وہ مقتدی ہے تو اس کے بارے میں آ گیا "اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا"، جب امام قراءت کرے تو تم چپ رہا کرو۔ بہرحال فقہاء میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اُمت کے بہت سارے اچھے اچھے لوگ ایسے ہیں جو امام کے پیچھے بھی فاتحہ پڑھتے ہیں، اور اُمت کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے جواز کا قول نہیں کرتے۔ مسئلہ مختلف فیہ ہونے کی صورت میں ہم اس کو ایسا قطعی قرار نہیں دے سکتے کہ جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ یہ تو وعظ و تلقین کے متعلق ہے جو کہا جا رہا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے، تمہیں ہدایت کے لئے سنایا جائے تو ایسی صورت میں تمہیں چاہیے کہ توجہ سے سنو، تبھی تم اس سے ہدایت حاصل کر سکو گے۔ اگر وہ طریقہ تم نے اپنا لیا کہ "جب قرآن پڑھا جائے شور مچانا شروع کر دیا کرو" پھر چاہے یہ بصائر ہیں، اللہ کی طرف سے ہدایت ہے، اللہ کی طرف سے رحمت ہے، لیکن تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو جب پڑھا جائے تمہیں سنانے کے لئے، تو اس وقت تم توجہ کیا کرو، چپ رہا کرو، غور کیا کرو، تب جا کر اللہ کی رحمت حاصل ہوگی، اصل محمل اس آیت کا یہ ہے۔ لیکن عمومِ الفاظ سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ جب بھی تلاوت ہو تو دوسروں کو چاہیے چپ کر کے سنیں، اب امام نے تو لازماً پڑھنا ہے، اس کی قراءت تو متفق علیہ ہے، وہ تو سکوت اختیار نہیں کر سکتا، تو جب امام پڑھے گا تو اس صورت میں مقتدیوں کا فریضہ معلوم بھی ہوتا ہے، یعنی اقرب الی الفاظ القرآن یہ مسلک ہے کہ مقتدیوں کو چپ ہو کر سننا چاہیے۔ اگرچہ اس کو ہم قطعی قرار نہیں دیتے لیکن اقرب الی الفاظ القرآن یقیناً ہے، اس لیے اَحناف اور دیگر اَئمہ کے نزدیک امام کی قراءت کی صورت میں مقتدی کے لئے قراءت کرنا درست نہیں۔ مسئلہ مختلف فیہ، قطعی کوئی جانب نہیں، بات سمجھ گئے؟ تو ہمارے ذہن میں اس قسم کا تشدد نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ "یہ کرنے والے قرآن کے خلاف، وہ کرنے والے قرآن کے خلاف" جو مسئلہ مجتہد فیہ ہوتا ہے تو اس میں دونوں طرف ہی گنجائش ہوتی ہے، لیکن اقرب الی الفاظ القرآن مسلک اَحناف کا ہے کہ امام کی قراءت کے وقت میں سکوت اختیار کرنا چاہیے، توجہ

---

(۱) مسلم ۱/۱۶۹، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ الخ نیز بخاری ۱/۱۰۴، باب وجوب القراءۃ الخ۔ ولفظہ لا صلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۱۱۵۔ نیز دیکھیں: مسلم ۱/۱۷۴، باب التشہد فی الصلاۃ۔ نسائی ۱/۱۰۷، باب تاویل قولہ واذا قرئ القرآن۔ ابن ماجہ ص ۶۱، باب اذا قرأ الامام الخ

سے سننا چاہیے اِذَا قُرِئَ فَاَنْصِتُوْا، حدیث شریف کے اندر بھی اسی طرح سے آیا ہے۔

سوال:- بعض احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے نہ پڑھا کرو مگر فاتحہ۔

جواب:- یہ روایات بھی ہیں، مشکوۃ شریف میں بھی آئیں گی، دوسری کتابوں میں بھی ہیں، ترمذی کے اندر بھی غالباً یہ روایت ہے، لیکن یہ اس درجے کی روایات نہیں جہاں سے فرضیت ثابت کی جاسکے، جو کہتے ہیں کہ پڑھنی چاہیے وہ تو فرض کہتے ہیں کہ اس کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں، تو فرضیت کے ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل چاہئیں یہ روایتیں اس درجے کی نہیں ہیں۔ ان میں تاویل کی گنجائش ہے، ہمارے اکابر اس کو ابتدائی دور پر محمول کرتے ہیں، کہ پہلے صحابہ کرام علیہم سورت بھی ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے، فاتحہ بھی پڑھ لیتے تھے، پھر سورت سے روک دیا، فاتحہ کی اجازت ہوئی، اور اس کے بعد پھر فاتحہ سے بھی روک دیا گیا، ہمارے ہاں ترتیب اس طرح سے ہے۔ تو ان روایات کی تاویل بھی حدیث شریف کے سبق میں آجائے گی، اور ویسے یہ روایات صحت کے لحاظ سے، سند کے لحاظ سے اس قوت میں نہیں ہیں کہ جن کے ساتھ فرضیت کو ثابت کیا جاسکے۔[1] اس کے مقابلے میں اِذَا قُرِئَ فَاَنْصِتُوْا، اور اس قسم کی روایتیں زیادہ قوت رکھتی ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(۱) مشہور غیر مقلد عالم علامہ البانی نے اپنی کتاب "ضعیف ابی داؤد" میں اس قسم کی تمام روایات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ان کا ضعف ثابت کیا ہے۔